دار العلم ممبئی

العواصم من القواصم اور المنتقی سے اہم ترین حواشی کے ساتھ

مِنهَاجُ السُّنَّة

مکمل تخریج حدیث اور معتبر اہل کتب سے مفید حواشی کے ساتھ

تالیف

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ

اختصار و ترجمہ

پیرزادہ شفیق الرحمٰن شاہ الدراوی حفظہ اللہ

ناشر

دار العلم ممبئی

سلسلہ مطبوعات دار العلم نمبر 210

نام کتاب	:	مِنهَاجُ السُّنَّة (جلد دوم)
تالیف	:	شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ
ناشر	:	دار العلم، ممبئی
طابع	:	محمد اکرم مختار
تعداد اشاعت	:	ایک ہزار
تاریخ اشاعت	:	۲۰۱۴ء
مطبع	:	بھاوے پرائیویٹ لمیٹڈ

دار العلم ممبئی

DARUL ILM

PUBLISHERS & DISTRIBUTORS

242, J.B.B. Marg, (Belasis Road),
Nagpada, Mumbai-8 (INDIA)
Tel. (+91-22) 2308 8989, 2308 2231
Fax : (+91-22) 2302 0482
E-mail : ilmpublication@yahoo.co.in

فہرست موضوعات

فصل:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر الزامات ❶

[اعتراضات]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ''جہاں تک عثمان رضی اللہ عنہ کا تعلق ہے اس نے نااہل لوگوں کو بڑے بڑے منصب عطا کیے تھے۔ ان میں سے بعض خائن و فاسق بھی تھے۔ اپنے اقارب کو ولایات عطا کیں۔ اور کئی بار کے عتاب کے باوجود اس سے باز نہ رہے۔ ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کو عامل مقرر کیا اس نے نشہ کی حالت میں نماز پڑھائی۔ سعید بن عاص رحمہ اللہ ❷ کو کوفہ کا والی مقرر کیا اس نے وہاں ایسے کام کیے جن کی بنا پر اسے کوفہ سے نکال دیا گیا۔ بلاد مصر میں عبد اللہ بن

---

❶ اعداء صحابہ نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کو جن مطاعن کا نشانہ بنایا ہے قاضی ابوبکر بن العربی رحمہ اللہ نے ان کا نام قواصم رکھا ہے۔ اور ہر ''قاصمہ'' کا جواب کتاب و سنت کے دلائل و براہین سے ''عاصمہ'' کے نام سے دیا ہے اس مجموعے کا نام ''العواصم من القواصم'' ہے جس پر علامہ محب الدین رحمہ اللہ نے بڑے عالمانہ حواشی تحریر کیے ہیں۔ صحابہ کے بغض و عناد سے نجات حاصل کرنے کے لیے اس کا مطالعہ بے حد مفید ہے۔ اعداء صحابہ نے اپنی تصانیف کو جھوٹ کا پلندہ بنا دیا تھا۔ یہ جھوٹ لوگوں میں خوب پھیلتا رہا اور بعض مسلمان حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم سے بددل ہونے لگے قاضی ابن العربی رحمہ اللہ کی اس قابل قدر تصنیف کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے حق کا بول بالا کیا اور لوگ بڑی حد تک مستفید ہوئے۔ وللہ الحمد۔

❷ سیدنا سعید بن عاص فصحائے قریش میں سے تھے۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے جب قرآن کریم لکھوانا شروع کیا تو سعید بن عاص رضی اللہ عنہ کو بلا کر اس کی عبارت درست کی، کیوں کہ سعید کا لہجہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت ملتا جلتا تھا۔ سعید اس حد تک مخلص مسلمان تھے کہ جب ایک مرتبہ سیدنا عمر نے کہا کہ: ''میں نے تمہارے والد کو قتل نہیں کیا، بلکہ اپنے ماموں عاص بن ہشام کو قتل کیا تھا۔'' اس کے جواب میں سعید نے کہا: ''اگر آپ قتل بھی کرتے تو آپ حق پر ہوتے اور وہ باطل پر۔'' سعید بن عاص نے طبرستان کا علاقہ فتح کیا اور جرجان پر بھی چڑھائی کی تھی۔ آپ کی فوج میں سیدنا حذیفہ اور دیگر کبار صحابہ شامل تھے۔ سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ ایک عورت دھاری دار چادر لے کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہا اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! میں نے نذر مانی تھی کہ یہ چادر اس شخص کو دوں گی جو عرب بھر میں سب سے زیادہ باعزت ہو۔ آپ نے فرمایا، اس لڑکے کو دے دو۔'' (الاصابہ (۲/٤٨) مختصر تاریخ دمشق لابن عساکر (٦/١٣٤)۔ وہ لڑکا نامی گرامی مجاہد و فاتح سعید بن عاص رضی اللہ عنہ تھا۔ جس کے بارے میں رافضی نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ پر تنقید کی ہے کہ انھوں نے اسے کوفہ کا والی مقرر کیا۔ اگر قرآن کی عربیت کی تصحیح شیعہ کے نزدیک قابل فخر کارنامہ نہیں ہے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا سیدنا سعید رضی اللہ عنہ کو اکرم العرب قرار دینا یقیناً دین و دنیا میں باعث فخر ہے۔ سیدنا سعید رضی اللہ عنہ میں صرف ایک ہی عیب پایا گیا ہے اور وہ یہ کہ آپ نے طبرستان کو فتح کیا اور کبار صحابہ نے اس کے قائد کی حیثیت سے جرجان پر حملہ کر کے اہل ایران کو مجوسیت سے نکال کر دین اسلام سے روشناس کرایا۔ سیدنا سعید کی مرویات صحیح مسلم، نسائی اور ترمذی میں موجود ہیں۔ محدث طبرانی بطریق محمد بن قانع بن جبیر بن مطعم وہ اپنے باپ سے اور وہ دادا سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سعید بن عاص کی عیادت کرتے دیکھا۔ آپ ایک کپڑے کو گرم کر کے سعید کو ٹکور کر رہے تھے۔ (الاصابۃ: ۲/٤٨)

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ واقعہ سعید بن عاص رضی اللہ عنہ کے دادا سے متعلق ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ سعید بن عاص رضی اللہ عنہ اکرم العرب ہے، اعلام نبوت میں سے ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نور وحی کے ذریعہ یہ بات معلوم ہوگئی تھی کہ سعید رضی اللہ عنہ بہت بڑے فاتح ہوں گے اور اسی طرح اکرم العرب قرار پائیں گے۔ ابن ابی خیثمہ بطریق یحییٰ بن سعید روایت کرتے ہیں کہ محمد بن عقیل بن ابی طالب رحمہ اللہ اپنے والد کے پاس آئے اور پوچھا سب لوگوں میں سے افضل کون ہے؟ فرمایا: میں اور میرا بھائی۔'' سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے: ''سعید بن عاص رضی اللہ عنہ قریش کے نور نظر ہیں۔''

سعید بن عاص رضی اللہ عنہ بڑے سخی تھے۔ جب سائل کوئی چیز مانگتا اور آپ کے پاس موجود نہ ہوتی تو اسے لکھ کر دے دیتے کہ میں فلاں چیز تجھے دے دوں گا۔ جب فوت ہوئے تو ان پر اسی ہزار دینار قرض تھا جو ان کے بیٹے عمرو نے ادا کیا۔ صالح بن کیسان روایت کرتے ہیں کہ سعید رضی اللہ عنہ بڑے باوقار اور متحمل مزاج تھے، جب کسی چیز کو پسند یا ناپسند کرتے تو اس کا اظہار نہیں کیا کرتے تھے۔ ان کا قول ہے: ''دل کی حالت بدلتی رہتی ہے، یہ موزوں نہیں کہ آدمی ایک چیز کی آج تعریف کرے اور کل اسی کی مذمت کرنے لگے۔''

یہ ہیں سیدنا سعید بن عاص اموی رضی اللہ عنہ کے فضائل و مناقب جن کے بارے میں رافضی امیر المومنین عثمان رضی اللہ عنہ کو مطعون کرتا ہے کہ انھوں نے سعید کو والی کوفہ مقرر کیا۔

ابی سرح رضی اللہ عنہ [1] کو حاکم مقرر کیا جہاں اس نے بہت مظالم ڈھائے۔ لوگوں نے جب اسکی شکایت کی تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے پوشیدہ طور پر اسے لکھا کہ وہ اپنے عہدے پر ڈٹا رہے۔ یہ اس کھلے خط کے خلاف تھا جو اس کے نام لکھا گیا تھا۔ اور حکم دیا کہ محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کو قتل کر دے۔ [2] حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو امیر بلادِ شام مقرر کیا جہاں اس نے کئی طرح کے فتنے بپا کیے۔ حضرت عبد اللہ بن عامر رضی اللہ عنہ کو بصرہ کا والی مقرر کیا جہاں اس نے بہت برے کام

---

[1] عبداللہ بن سعد بن ابی سرح رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہیں۔ یہ سیدنا عثمان کے رضاعی بھائی تھے۔ فتح مکہ کے روز سیدنا عثمان نے جب ان کے لیے پناہ طلب کی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو پناہ دے دی۔ یہ مخلص مسلمان اور عظیم مجاہد و فاتح تھے۔ جب ملک مصر دین اسلام کے حلقہ میں داخل ہوا تو ابن ابی سرح ان مجاہدین صحابہ کے سرخیل تھے۔ جن کو مصر فتح کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ جہاد مصر میں یہ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے لشکر کے دائیں بازو میں تھے اور بڑے کارہائے نمایاں انجام دیے۔ ابن سعد نے طبقات میں ابن ابی سرح کا ذکر ان صحابہ میں کیا ہے جنھوں نے مصر میں بود و باش اختیار کر لی تھی۔ حافظ ابن حجر نے الاصابہ (۲/۳۱۷) میں البرقی کی تاریخ سے بروایت ابی صالح کاتب لیث بن سعد امام مصر سیدنا لیث بن سعد سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا: ''خلافت فاروقی میں ابن ابی سرح رضی اللہ عنہ علاقہ الصعید کے حاکم تھے۔ جب سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ منصب خلافت پر فائز ہوئے تو آپ نے مصر کا سب علاقہ ان کو تفویض کر دیا۔ مصر کے عظیم امام و فاضل سیدنا لیث بن سعد کے مندرجہ بالا بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ روافض نے ابن ابی سرح پر کس قدر جھوٹ باندھا ہے۔ ۲۵ھ میں ابن ابی سرح پورے مصر کے حاکم اعلیٰ تھے۔ ۲۷ھ میں پورا افریقہ فتح ہو گیا۔ یہ عظیم ترین فتح تھی جو مسلمانوں کو حاصل ہوئی، مال غنیمت کی یہ فراوانی تھی کہ ایک سوار کے حصہ میں تین ہزار دینار آئے۔ چاروں عبادلہ (عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن زبیر، عبداللہ بن عباس اور عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہم اجمعین) جلالت قدر کے باوصف ابن ابی سرح کے زیر قیادت تھے۔ شمالی افریقہ فتح ہونے کے بعد بھی ابن ابی سرح نے ۳۱ھ تک جہاد کا سلسلہ جاری رکھا۔ ۳۴ھ میں ذات السواری پر چڑھائی کی۔ اسی دوران باغیوں نے سیدنا عثمان کے خلاف خروج کیا۔ ابن ابی سرح نے سیدنا عثمان کو لکھ کر امداد کی پیشکش کی اور براستہ عریش و عقبہ مدینہ پہنچنے کی اجازت چاہی۔ سائب بن ہشام بن عمیر کو حاکم مقرر کیا۔ ابھی مدینہ نہیں پہنچ سکے تھے کہ ابن ابی سرح کو سیدنا عثمان کی شہادت کی خبر پہنچی اور آپ مصر لوٹ آئے۔ مصر پر ابن ابی حذیفہ نے قبضہ جما لیا تھا۔ اس نے ابن ابی سرح کو حدود مصر میں داخل ہونے سے روکا، چنانچہ آپ فلسطین چلے گئے اور عسقلان و رملہ کے درمیان سکونت اختیار کی۔ ۵۷ھ تک فلسطین میں گوشہ نشین رہے۔
بغوی نے بسند صحیح یزید بن ابی حبیب سے روایت کیا ہے کہ اس نے کہا: ابن ابی سرح مقام رملہ کی طرف چل دیے، جب صبح ہوئی تو کہا ''اے اللہ! اس صبح کو میرا آخری عمل بنا دے۔'' پھر وضوء کیا اور نماز ادا کی۔ پھر دائیں جانب سے سلام پھیرا۔ جب بائیں جانب سلام پھیرنے لگے تو ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔'' اسد الغابہ (۲/۲٦٤)۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ روایت اسی سند سے ذکر کی ہے۔ تاریخ کبیر (۵/۲۹) مختصراً۔

[2] العواصم من القواصم، ص (۱۰۹۔۱۱۰)، نیز (۱۲۶۔۱۲۹) کے حواشی پر اس خط کے بارے میں علمی تحقیق ہے جو بقول شیعہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ یا مروان نے ابن ابی سرح رضی اللہ عنہ کے نام ارسال کیا تھا۔ نیز سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے اظہار حیرت کرنے پر گفتگو کی ہے کہ عراقی فتنہ پرداز اور مصر کے شریر لوگ مختلف راستوں سے بیک وقت مدینہ پہنچ گئے جیسے پہلے انھوں نے یہ بات طے کر رکھی ہو، حالانکہ عراق والوں کو مطلقاً اس خط کا علم نہ تھا جو اہل مصر نے حامل خط سے لے لیا تھا۔ جب سیدنا علی نے اس پر اظہار تعجب کیا تو اہل عراق نے کہا: ''کیا آپ نے ہمیں تحریر نہیں کیا تھا۔ کہ واپس مدینہ آ جاؤ۔'' سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے حلف اٹھا کر کہا کہ انھیں اس خط کا کوئی علم نہیں۔'' مندرجہ بالا بیان اس حقیقت کا مظہر ہے کہ دو جعلی خط تحریر کیے گئے تھے۔ ایک سیدنا علی کی جانب سے اہل عراق کے نام اور دوسرا سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف سے اہل مصر کی طرف۔ یہ بات عقل و قیاس کے منافی ہے کہ یہ خط سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ یا مروان نے ابن ابی سرح کے نام لکھا۔ خصوصاً جب کہ انھیں معلوم تھا کہ اس نے مدینہ حاضر ہونے کی اجازت چاہی ہے اور وہ اس وقت فلسطین اور مدینہ کے درمیان غالباً عقبہ کے مقام پر پہنچ چکا تھا۔ جب ابن بی سرح مصر میں موجود ہی نہیں تھے۔ تو یہ خط ان کی جانب مصر کیوں کر بھیجا گیا؟
فتنہ سبامانی کے دور کی تاریخ لکھنے والے مصنفین اس حقیقت سے مطلع نہ ہو سکے کہ جب عراق و مصر کے انقلابی مدینہ سے چلے گئے تھے تو انقلاب کے دور عظیم لیڈر اور سیدنا عثمان کے شدید مخالف یعنی اشتر نخعی و حکیم بن جبلہ مدینہ سے نہیں گئے تھے۔ مدینہ قیام پذیر رہنے سے ان کا مقصد وحید یہ تھا کہ جس مشن کے لیے وہ مدینہ آئے تھے (سیدنا عثمان کا قتل) اس کو بہر صورت پایہ تکمیل تک پہنچایا جائے، چنانچہ انھوں نے سیدنا عثمان و علی کی جانب سے دو جعلی خط تیار کیے اور زکوٰۃ کے اونٹوں میں سے دو اونٹ کرایہ پر لے کر دو اعرابیوں کے ذریعہ ایک کو مشرقی راستہ سے عراق اور دوسرے کو مصریوں کی طرف بھیجا جو غربی جانب ساحل کے ساتھ ساتھ جا رہے تھے۔ خطوط نویسی کا واحد مقصد سوئے ہوئے فتنہ کو جگانا اور از سر نو شر کو امت میں پھیلانا تھا۔ فتنہ کے ان دونوں بانیوں کے سوا کسی اور کو اس فتنہ پردازی میں ہرگز دلچسپی نہ تھی۔ مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے: العواصم من القواصم۔

کیے۔[1] مروان کو والی مقرر کرکے اپنی انگوٹھی اس کے حوالے کردی[2] جس کا نتیجہ قتل عثمان رضی اللہ عنہ کی صورت میں ظہور پذیر ہوا۔اور اس کی وجہ سے امت میں بہت بڑا فتنہ پیدا ہوا۔حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بیت المال سے اپنے اقارب کو بہت زیادہ

[1] امت محمدی کے مجوس (شیعہ) کی نگاہ میں سیدنا عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ کا بدترین فعل یہ تھا کہ اس نے ایران میں کسریٰ کی حکومت کا خاتمہ کردیا۔ چنانچہ عبد اللہ بن عامر کے عہد امارت میں فارس کے آخری بادشاہ یزدگرد کو قتل کر دیا گیا تھا۔ جب عبداللہ بن عامر پیدا ہوئے اور انھیں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں لایا گیا تو آپ نے بنوعبد شمس کو مخاطب کرکے فرمایا: ''یہ بچہ تمہاری نسبت ہم سے زیادہ ملتا جلتا ہے۔'' آپ بچے کے منہ میں تھوک ڈالتے جاتے تھے اور وہ نگلتا جاتا تھا آپ نے فرمایا: ''یہ بچہ تر و تازہ ہے۔'' نبی کریم ﷺ کے ارشاد مبارک کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابن عامر رضی اللہ عنہ جس زمین میں بھی کام کرتے، وہاں پانی نکل آتا۔ابن عامر پہلا شخص ہے جس نے عرفات میں حوض بنائے اور چشمے کا پانی وہاں پہنچایا۔مستدرك حاكم(۳/ ٦٣٩۔ ٦٤٠) وسنده ضعيف۔

ابن عامر بڑے سخی، شجاع اور نیک فال تھے۔سیدنا عثمان نے ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے بعد ۲۹ ھ میں ابن عامر کو بصرہ کا والی مقرر کیا، پھر عثمان بن ابو العاص کے بعد فارس کا علاقہ بھی ان کو سونپ دیا۔ ابن عامر نے پورا خراسان۔ اطراف فارس و سیستان اور کرمان کے ممالک فتح کر لیے اور غزنہ کے قریب جا پہنچے۔ ان فتوحات کا شکریہ ادا کرنے کے لیے ابن عامر نے نیشا پور سے احرام باندھا اور حالت احرام میں پاپیادہ حجاز پہنچے۔ اتفاق سے وہ سردی کا موسم تھا۔ جب سیدنا عثمان کی خدمت میں پہنچے تو آپ نے ملامت کی اور فرمایا: ''آپ نے یہ اقدام فریب دہی کیلئے کیا ہے۔'' ان فتوحات سے کثیر مال غنیمت ہاتھ آیا۔ یہ ہیں سیدنا عبد اللہ بن عامر رضی اللہ عنہ کے وہ افعال ''شنیعہ'' جن پر رافضی قلم کار نقد و جرح کر رہا ہے۔ اس پر جس قدر حیرت و استعجاب کا اظہار کیا جائے کم ہے۔ یہ مجاہدین و فاتحین شیعہ کی نگاہ میں مذموم ہیں اور ان کے مقابلہ میں ہلاکو خاں اور سلطان خدابندہ تک اس کی نسل قابل مدح و ستائش ہے۔ نبی کریم ﷺ نے سچ فرمایا: کہ بروز حشر آدمی کو اس شخص کی رفاقت نصیب ہوگی۔ جس کے ساتھ وہ محبت رکھتا ہو۔''

شیعہ کی یہ تضاد خیالی صرف دینی مرض ہی نہیں، بلکہ عقلی و اخلاقی بیماری بھی ہے۔ ''وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ عَافَانَا مِمَّا ابْتَلٰی بِهٖ كَثِیْرًا مِّنْ خَلْقِهٖ''

[2] انگوٹھی سپرد کرنے سے رافضی مصنف کا اشارہ اس جعلی خط کی جانب ہے۔ قائد کوفہ اشتر نخعی اور قائد بصرہ حکیم بن جبلہ جب اپنے مقصد میں ناکام رہے اور کوفہ و بصرہ کے انقلابی سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے دلائل سے مطمئن ہو کر واپس چلے گئے۔ عراقیوں نے مشرق کی جانب عراق کا رخ کیا اور مصری جانب غرب عازم مصر ہوئے؟ یہ دونوں لیڈر مدینہ میں مقیم رہے اور اپنے رفقاء کے ساتھ واپس نہ گئے۔ چند دنوں کے بعد بیک وقت دو سوار مصری و عراقی قافلہ سے ملے جو سوار مصری قافلہ سے ملا تھا وہ ان کے قریب پہنچ کر عجیب و غریب حرکات کرنے لگا۔ جب اسے یقین ہوگیا کہ قافلہ والوں نے اسے دیکھ لیا ہے تو پھر چھپنے کی کوشش کی، جب انھوں نے وجہ پوچھی تو اس نے ایک خط دکھایا جس پر سیدنا عثمان جیسی مہر لگی تھی، اس نے بتایا کہ وہ یہ خط لے کر امیر مصر عبداللہ بن ابی سرح کی طرف جا رہا ہے۔ خط میں لکھا تھا کہ محمد بن ابی بکر کو قتل کردو۔ بعینہٖ اسی وقت عراقی قافلہ کو ایک شخص ملا جس کے پاس ایک خط تھا جس پر سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی مہر کی مانند مہر لگی ہوئی تھی، خط میں لکھا تھا کہ ''مدینہ واپس آجاؤ۔'' جب دونوں فریق مدینہ پہنچے تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور اکابر صحابہ وجہ دریافت کرنے کے لیے نکلے، مصری لوگوں نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے جعلی خط کا ذکر کیا۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے پھر عراقیوں سے وجہ دریافت کی انھوں نے کہا کیا آپ نے خط کے ذریعہ ہمیں واپس آنے کا حکم نہیں دیا؟ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے حلف اٹھا کر کہا کہ مجھے اس خط کے بارے میں کچھ علم نہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ سیدنا عثمان و علی کے نام سے یہ جعلی خط تیار کیے گئے تھے خصوصاً جب کہ سیدنا عثمان و مروان کو معلوم تھا کہ عبداللہ بن ابی سرح مصر میں موجود ہی نہیں۔ مروان ایک ادنیٰ آدمی کے ساتھ بھی خیانت کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ پھر وہ از راہ خیانت سیدنا عثمان کی انگوٹھی کیوں کر استعمال کر سکتے تھے جو امور خلافت میں بڑی اہم چیز سمجھی جاتی ہے بفرض محال اگر سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی انگوٹھی از راہ فریب مروان نے استعمال کی تھی تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی انگوٹھی استعمال کرنے والا کون تھا؟ روافض اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں کہ مروان وہ شخص ہے کہ سیدنا زین العابدین رحمہ اللہ جیسے لوگ اس سے دینی احکام پر مشتمل روایات اخذ کرتے ہیں۔ مروان سے جن لوگوں نے روایت کی ہے ایک سیدنا زین العابدین علی بن حسین رضی اللہ عنہ بھی ہیں۔ جن حفاظ و ائمہ حدیث نے یہ بات بیان کی ہے ان میں سے آخری محدث حافظ ابن حجر عسقلانی ہیں جنھوں نے ''الاصابہ'' میں اس پر روشنی ڈالی ہے۔

آپ کے شاگردوں میں سرخیل تابعین سعید بن مسیب اور ان کے برادر فقہائے سبعہ ابوبکر بن عبد الرحمٰن و عبید اللہ بن عبداللہ و عروہ بن زبیر اور ان کے نظائر و امثال مثلاً عراک بن مالک غفاری مدنی جو صائم الدہر تھے۔ نیز عبد اللہ بن شداد جو سیدنا عمر و علی و معاذ سے روایت اخذ کیا کرتے تھے۔ عروہ بن زبیر کی مروان سے روایت صحیح بخاری، کتاب الوکالۃ میں شامل ہے۔ نیز دیکھیے مسند احمد (۳/ ۳۲۱، ۳۲۳، ۳۲۶، نیز ۵/ ۱۸۹)۔ عراک کی مروان سے روایت امام اہل مصر لیث بن سعد نے یزید بن حبیبہ سے ذکر کی ہے دیکھیں مسند احمد (۴/ ۳۲۸) عبد اللہ بن شداد کی مروان سے روایت مسند احمد (۶/ ۳۱۷ و ۳۲۳) پر موجود ہے۔ مروان کے رواۃ و تلامذہ میں امام یمن عبد الرزاق کا نام بھی شامل ہے جس پر شیعہ ہونے کی تہمت ہے، جب مروان امام زین العابدین سے لے کر عبد الرزاق بن ہمام صنعانی جیسے ائمہ حدیث کے نزدیک قابل اعتماد ہے تو ایک رافضی کا اسے مورد طعن بنانا کیوں کر صحیح ہو سکتا ہے۔

نوازتے اور انہیں دوسروں پر ترجیح دیتے تھے۔ قریش میں ان کے چار داماد تھے، انہیں چار لاکھ دینار عطا کیے۔ [1] مروان کو دس لاکھ دینار دیے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو مورد طعن بناتے اور ان کی تکفیر کیا کرتے تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کو اس قدر پٹوایا کہ ان کی موت واقع ہوگئی۔ عمار رضی اللہ عنہ کو اس قدر پٹوایا تھا کہ ان کو فتق کا عارضہ لاحق ہو گیا تھا۔ حالانکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: ''عمار میرا نور نظر ہے، اسے ایسی باغی جماعت قتل کرے گی جو میری شفاعت کی مستحق نہیں ہے۔'' عمار رضی اللہ عنہ بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر طعن کیا کرتے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے چچا حَکَم اور اس کے بیٹے مروان کو مدینہ سے نکال دیا تھا، وہ عہد رسالت مآب میں اور عہدِ صدیقی و فاروقی میں مدینہ بدر ہی رہا۔ عثمان رضی اللہ عنہ نے پھر مدینہ میں بلالیا۔ اور مروان کو اپنا مشیر اور کاتب بنالیا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَ هُمْ اَوْ اَبْنَآءَ هُمْ﴾ [المجادلة ۲۲]

''اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھنے والوں کو آپ اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرنے والوں سے دوستی رکھتے ہوئے ہرگز نہ پائیں گے گو وہ ان کے باپ یا ان کے بیٹے ہی کیوں نہ ہوں۔''

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کو انتہائی سخت مار پیٹ کر ربذہ کی طرف نکال دیا تھا۔ [2] حالانکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:

''اس کرۂ ارضی کے اوپر اور فلک نیلگوں کے نیچے ابوذر سے زیادہ سچا اور کوئی نہیں۔''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا تھا: ''بیشک اللہ تعالیٰ نے میری طرف وحی کی ہے کہ وہ میرے صحابہ میں سے چار افراد سے محبت کرتا ہے' اور مجھے حکم دیا ہے کہ میں بھی ان سے محبت کروں۔'' آپ سے پوچھا گیا: یارسول اللہ! وہ کون لوگ ہیں؟ آپ نے فرمایا: ''ان چاروں کے سردار حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں؛ اور ان کے علاوہ سلیمان' مقداد اور ابوذر رضی اللہ عنہم اجمعین۔''

''حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں شرعی حدود کی پروا نہیں کی جاتی تھی۔ چنانچہ امیر المؤمنین کے آزاد کردہ غلام ہرمزان کے قصاص میں عبید اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو قتل نہیں کیا تھا؛ حالانکہ وہ [ہرمزان] اسلام لا چکا تھا۔ امیر المؤمنین نے عبید اللہ کو قصاص کے لیے طلب کیا تھا۔ مگر وہ بھاگ کر معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس چلا گیا۔ ولید رضی اللہ عنہ جب شراب نوشی کا مرتکب ہوا تو عثمان رضی اللہ عنہ اس پر حد نہیں لگانا چاہتے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حد شرعی قائم کی اور فرمایا: ''میری موجودگی میں شرعی حدود کو پامال نہیں کیا جاسکتا۔ جمعہ کے دن ایک اذان کا اضافہ کیا جو کہ بدعت ہے۔ مسلمانوں نے عثمان رضی اللہ عنہ کی مخالفت کی اور اس کے کاموں پر تنقید کی۔ یہاں تک کہ ان کو قتل کردیا گیا۔ لوگوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کہا تھا آپ نے بدر میں شرکت نہ کی۔ اور غزوۂ احد کے دن بھاگ گئے۔

---

[1] قبل ازیں اس کا جواب دیا جاچکا ہے کہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ اپنے ذاتی مال سے یہ عطیہ جات دیا کرتے تھے۔

[2] یہ صاف جھوٹ ہے۔ مورخ ابن خلدون اپنی تاریخ ج2، صفحہ:۱۳۹ پر لکھتے ہیں: ''سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ نے امیر المومنین عثمان سے مدینہ سے باہر جانے کی اجازت حاصل کر لی تھی۔ ابوذر نے کہا: '' مجھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مامور فرمایا تھا کہ جب مدینہ کی آبادی سَلع نامی مقام تک پہنچ جائے تو اس سے نکل جائیں۔'' چنانچہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کو اجازت دے دی تھی۔ (مستدرک حاکم (۳/۳۴۳)، ابوذر رضی اللہ عنہ ربذہ نامی جگہ میں قیام پذیر ہوئے اور وہاں مسجد بنوائی۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے ابوذر کو اونٹوں کا ایک ریوڑ اور دو غلام عطا کیے تھے۔ ان کی تنخواہ بھی مقرر کردی تھی۔ سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ مدینہ میں آیا جایا کرتے تھے، وہ جگہ جہاں وہ اقامت پذیر تھے مدینہ سے تین میل کے فاصلہ پر تھی۔ مشہور جغرافیہ دان یاقوت لکھتا ہے: ''مدینہ کے راستہ پر یہ بہترین جگہ تھی۔''

بیعت الرضوان میں بھی شامل نہ ہوئے۔ ❶ خلاصہ یہ کہ ایسے واقعات لاتعداد ہیں۔'' (شیعہ مصنف کا بیان ختم ہوا)

[سلسلہ جوابات]:

شیعہ مصنف کے وارد کردہ جملہ اعتراضات کا جواب علی الترتیب یہ ہے کہ اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عمال و حکام نے ان سے خیانت کی اور ان کی نافرمانی کا ارتکاب کیا تھا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نائبین اس ضمن میں ان سے دو قدم آگے ہی تھے۔ لوگوں نے اس مسئلہ پر مستقل کتابیں لکھی ہیں کہ جن لوگوں کو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنا نائب مقرر کیا تھا مگر انہوں نے مال لے لیا اور آپ کے ساتھ خیانت کی۔ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے جا ملے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے قاتل عبید اللہ بن زیاد کے والد زیاد بن ابی سفیان کو والی مقرر کیا تھا۔ آپ نے اشتر نخعی اور محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ جیسے لوگوں کو بھی حاکم مقرر کیا تھا۔ حالانکہ کسی بھی عاقل کو اس بات میں ذرا بھر بھی شک نہیں ہوسکتا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ان سب سے بہتر تھے۔

یہ امر باعث حیرت ہے کہ شیعہ جس امر میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ہدف ملامت بناتے ہیں اسی بات کے بارے میں یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے سبقت لے گئے تھے۔ مثلاً شیعہ کہتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے قرابت دار اور بنو امیہ کو مناصب جلیلہ پر فائز کیا تھا۔ دوسری جانب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے والد اور والدہ کی جانب سے اپنے قرابت داروں کو حاکم و والی مقرر کیا۔ مثلاً حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے بیٹے عبید اللہ رضی اللہ عنہ بن عباس کو یمن پر والی مقرر کیا؛ نیز قُثَم بن عباس رضی اللہ عنہ مکہ اور طائف پر والی بنایا۔ مدینہ پر سہیل بن حنیف کو اور کہا جاتا ہے کہ ثمامہ بن عباس رضی اللہ عنہ کو والی بنایا۔ بصرہ پر عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما۔ [یہ سب حضرت علی رضی اللہ عنہ کے چچا زاد بھائی تھے]۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے محمد بن ابی بکر کو والی مصر مقرر کیا جو آپ کا تربیت کردہ تھا۔ [کیوں کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے انتقال کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کی والدہ

---

❶ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ بیعت الرضوان میں اس لیے شرکت نہ کر سکے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں قریش مکہ کی طرف سفیر بنا کر بھیجا تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سفارت کا منصب پہلے سیدنا عمر کو پیش کیا انھوں نے کہا اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! مکہ میں میرے قبیلہ کا ایک آدمی بھی نہیں جو میری حفاظت کر سکے۔ میں آپ کو ایک شخص بتاتا ہوں جو اس مقصد کے لیے مجھ سے زیادہ موزوں ہے...... وہ عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ ہے'' ...... چنانچہ آپ نے سیدنا کو بلا کر اس خدمت پر مامور کیا۔ اگر مسلمانوں میں کوئی اور شخص ہوتا جو وادی مکہ میں زیادہ پرقوت و شوکت ہوتا تو آپ عثمان رضی اللہ عنہ کی جگہ اسے اس کام پر مامور فرماتے۔ (صحیح بخاری، حوالہ سابق سیرۃ ابن ہشام (ص: ۵۰۲۔ ۵۰۳)

تاریخ اسلام کی اس اوّلین سفارت کے جرم میں عثمان رضی اللہ عنہ مکہ میں چند روز محبوس رہے۔ چنانچہ مسلمانوں میں یہ خبر مشہور ہوئی کہ عثمان رضی اللہ عنہ قتل کر دیے گئے ہیں۔ نبی کریم نے سیدنا عثمان کا قصاص لینے کے لیے صحابہ سے بیعت رضوان لی۔ اس سے معلوم ہوا کہ بیعت رضوان سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی عظمت و فضیلت کا بین ثبوت ہے۔ عظمت عثمان رضی اللہ عنہ کی اس سے بڑی دلیل اور کیا ہوگی کہ آپ کا انتقام لینے کے لیے اسلام کی پوری قوت و شوکت سید الاولین والآخرین صلی اللہ علیہ وسلم کے زیر قیادت اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اس داماد سے کتنی گہری الفت و محبت رکھتے تھے۔

جب سب صحابہ عقد بیعت کے لیے جمع ہو گئے تو اس آخری لمحہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پتہ چلا کہ عثمان رضی اللہ عنہ بخیر و عافیت ہیں۔ تاہم آپ نے بیعت کے معاملہ کو تشنۂ تکمیل چھوڑنا مناسب خیال نہ کیا۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کو دہرا شرف یہ حاصل ہوا کہ بیعت کرتے وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے ہاتھ کی جگہ کام کیا۔ چنانچہ آپ نے اپنے دائیں ہاتھ کو سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کا ہاتھ قرار دیا اور کہا: ''یہ عثمان کا ہاتھ ہے'' پھر اسے دوسرے ہاتھ پر مار کر فرمایا: ''یہ بیعت عثمان کے لیے ہے۔'' صحیح بخاری، حوالہ سابق۔ مقام افسوس ہے کہ شیعہ تاریخ اسلام کی اس عظیم مدح و ثنا کو نقص و عیب پر محمول کرتے ہیں، رفض کی اصل حقیقت یہی ہے، اگر وہ یوں نہ کرتے تو رافضی نہ کہلاتے۔ یہ بیعت اتنی اہم تھی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زیر قیادت اسلام کی پوری قوت اٹھ کھڑی ہوئی اور اسی سابقہ بیعت نے صحابہ کرام کو شہادت عثمان رضی اللہ عنہ پر قصاص کا مطالبہ کرنے پر مجبور کر دیا ورنہ انھیں سیدنا علی سے کوئی عناد نہ تھا۔

کے ساتھ نکاح کر لیا تھا۔حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی ہمشیرہ ام ہانی رضی اللہ عنہا کے بیٹے جعدہ بن ابی ہبیرہ کو خراسان کا والی مقرر کیا تھا]۔

امامیہ کا دعویٰ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی اولاد کو صراحۃً والی و امیر مقرر کیا تھا۔ یہ ایک بدیہی بات ہے کہ اگر اقارب کو عہدے تفویض کرنا جرم ہے تو ان کو بعض علاقوں کی ولایت کی نسبت سے خلافت عظمیٰ پر فائز کرنا جرم عظیم ہے۔ نیز یہ کہ چچا زاد بھائیوں کی نسبت اولاد کو والی مقرر کرنا مذموم تر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علماء کرام رحمہم اللہ کے ایک قول کے مطابق جو وکیل [ایجنٹ] یا ولی اپنے ذات کے لیے لین دین کرنے کا مجاز نہ ہو' وہ اپنی اولاد کے لیے بھی لین دین نہیں کرسکتا۔ اور ایک قول کے مطابق جس انسان نے وکیل کو کچھ مال دیا ہو کہ وہ جسے چاہے نواز دے؛ وہ اس میں سے نہ ہی خود کچھ رکھ سکتا ہے اور نہ ہی اپنی اولاد کو دے سکتا ہے۔

ایسے ہی خلافت کے بارے میں بھی اختلاف ہے کہ کیا خلیفہ اپنی اولاد کے لیے وصیت کرسکتا ہے یا نہیں؟ اس میں دو قول ہیں۔ باپ کی گواہی بیٹے کے حق میں نا قابل اعتماد ہے؛ اکثر علماء کا یہی مسلک ہے۔ جب کہ اپنے چچازادوں کے بارے میں یہ گواہی رد نہیں کی جاسکتی۔ اسی طرح دیگر احکام میں بھی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

''تم اور تمہارا مال تمہارے باپ کے لیے ہو۔'' [رواہ ابن ماجة ۲/ ۷۶۹]

نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ:

''کسی بھی ہبہ کرنے والے کو اپنے ہبہ میں رجوع کرنے کا اختیار نہیں سوائے والد کے؛ وہ اپنے بیٹے کو کئے گئے ہبہ میں رجوع کرسکتا ہے۔'' [رواہ أبو داؤد ۳/ ۳۹٤؛ والترمذي ۳/ ۲۹۹]

اگر شیعہ کہے کہ: ''حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نص کی وجہ سے ایسا کیا ہے۔''

تو اس کا جواب یہ ہے کہ: اولاً: ہمارا اعتقاد ہے کہ جیسے حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ راشد ہیں ایسے ہی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بھی خلیفہ راشد ہیں۔ لیکن اس سے قبل کہ ہم ان میں سے ہر ایک کے اعمال و افعال پر اس کی دلیل کو جانیں؛ یہ جاننا ضروری ہے کہ [ایسے مسائل میں بحث کرنے سے] جو تہمتیں اور بدگمانیاں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق پیدا ہوتی ہیں وہ ان تہمتوں سے کہیں بہت بڑھ کر ہیں جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے متعلق پیدا ہوتی ہیں۔

اور اگر کوئی یہ کہے کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس [اپنے افعال و اعمال پر] دلیل و حجت موجود ہے۔

تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ: اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ معصوم ہونے کے باوجود اس اقارب نوازی کا ارتکاب کرسکتے ہیں اور کسی شخص کو بنا بر عصمت آپ پر حرف گیری کی مجال نہیں ہے۔ تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مدافعت اس دعویٰ سے ممکن ہے کہ آپ ایک مجتہد تھے۔ لہٰذا یہ امور ان سے اجتہادی غلطی کی بنا پر صادر ہوئے۔ ظاہر ہے کہ یہ دعویٰ عقل و نقل سے زیادہ میل کھاتا ہے۔

شیعہ کی بڑی مشکل یہ ہے کہ: جب ایسے اشخاص کا تذکرہ کرتے ہیں جن میں سے بعض لوگ صحیح منقول اور صریح معقول دلائل کی روشنی دوسرے بعض افراد سے افضل و اکمل ہوتے ہیں۔ مگر یہ لوگ فاضل کو قابل مذمت ٹھہراتے ہوئے اس پر قدح اور طعن کرنا شروع کر دیتے ہیں ؛ اور مفضول کو معصوم اور قابل مدح و تعریف ٹھہراتے ہیں۔ ان کا یہ فعل بالکل نصاریٰ کے فعل کی جنس سے ہے۔ نصاریٰ جب ان انبیاء کرام علیہم السلام کا ذکر کرتے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے آپس میں ایک دوسرے پر فضیلت

سے نوازا ہے ۔تو مفضول نبی کو خدا بنالیتے ہیں اور فاضل نبی کو حضرت مسیح علیہ السلام کے حواریوں سے بھی پیچھے کر دیتے ہیں ۔ ایسا کرنے سے حقائق بالکل الٹ جاتے ہیں ۔اور اس سے بھی عجیب بات یہ ہے کہ عیسائی حضرت عیسی علیہ السلام کے حوارین کو جو کہ نبی نہیں ہیں ؛ خطاؤں سے معصوم مانتے ہیں ؛ اور اس کے ساتھ ہی حضرت سلیمان علیہ السلام جیسے جلیل القدر انبیاء کرام علیہم السلام کی شان میں توہین و تنقیص اور گستاخی کا ارتکاب کرتے ہیں ۔

یہ بات معلوم ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابراہیم علیہ السلام بہت سارے دلائل کی روشنی میں حضرت مسیح علیہ السلام کی نسبت افضل ہیں ۔ بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی آپ سے افضل ہیں ۔تو پھر کیسے وہ حضرت عیسی علیہ السلام کے ساتھیوں کو محمد اور ابراہیم علیہم الصلوات والسلام سے افضل ٹھہراتے ہیں ؟

یہ سب کچھ اس جہالت اور غلو کا آئینہ دار ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے ۔ارشادِ الٰہی ہے :

﴿یٰٓاَھْلَ الْکِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ وَ لَا تَقُوْلُوْا عَلَی اللّٰہِ اِلَّا الْحَقَّ اِنَّمَا الْمَسِیْحُ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ رَسُوْلُ اللّٰہِ وَ کَلِمَتُہٗٓ اَلْقٰھَآ اِلٰی مَرْیَمَ وَ رُوْحٌ مِّنْہُ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَ رُسُلِہٖ وَ لَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَۃٌ اِنْتَھُوْا خَیْرًا لَّکُمْ اِنَّمَا اللّٰہُ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ سُبْحٰنَہٗٓ اَنْ یَّکُوْنَ لَہٗ وَلَدٌ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ وَ کَفٰی بِاللّٰہِ وَکِیْلًا ☆﴾ [النساء ۱۷۱]

’’اے اہل کتاب اپنے دین کے بارے میں حد سے نہ گزر جاؤ اور اللہ پر بجز حق کے کچھ نہ کہو، مسیح عیسیٰ بن مریم (علیہ السلام) تو صرف اللہ کے رسول اور اس کے کلمہ (کن سے پیدا شدہ) ہیں جسے مریم رضی اللہ عنہا کی طرف سے ڈال دیا گیا تھا اور اس کے پاس کی روح ہیں اس لئے تم اللہ کو اور اس کے سب رسولوں کو مانو اور یہ نہ کہو کہ اللہ تین ہیں ؛اس سے باز آ جاؤ یہ تمہارے لئے بہتری ہے ،عبادت کے لائق تو صرف ایک اللہ تعالیٰ ہی ہے اور وہ اس سے پاک ہے کہ اس کی اولاد ہو، اسی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے ۔اور اللہ تعالیٰ کافی ہے کام بنانے والا ۔‘‘

یہی حال اس امت میں رافضیوں کا ہے ؛ یہ بھی انتہائی سخت غلو کا شکار ہیں ۔ان میں بھی ایسے لوگ ہیں جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو رب مانتے ہیں ۔ یہ لوگ عیسائیوں سے بھی برے ہیں ۔اور پھر ان میں سے بعض شیعہ ایسے ہیں جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو نبی مانتے ہیں ۔اور جو کوئی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی نبی کو مانتا ہے وہ مسیلمہ کذاب کے اور دوسرے جھوٹے انبیاء کے پیروکاروں سے مشابہت رکھتا ہے ۔ بیشک حضرت علی رضی اللہ عنہ ان تمام قسم کے دعووں سے [اس طرح] بری ہیں [جس طرح بھیڑیا حضرت یوسف علیہ السلام کے خون سے بری تھا]۔بخلاف ان لوگوں کے جو اپنے لیے خود نبوت کا دعوی کرتے ہیں جیسے مسیلمہ کذاب اور دوسرے لوگ [اصل میں یہ خود حقیقی مجرم ہیں]۔

امامیہ دعوی کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امامت نص سے ثابت ہے ۔ نیز آپ اور آپ کی بہت ساری اولاد معصوم تھے ۔اور لوگوں نے آپ پر ظلم کیا اور آپ کا حق غصب کیا ۔

معصوم ہونے کا دعوی بھی نبوت کے دعوی کی طرح ہے ۔اس لیے کہ معصوم جو کچھ بھی کہتا ہے اس میں اس کی اتباع واجب ہوتی ہے ۔اور کسی چیز میں بھی اس کی مخالفت کرنا ہرگز جائز نہیں ہوتی ۔ یہ بات تو صرف انبیاء کرام علیہم السلام کے ساتھ ہی خاص ہے ۔یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں حکم دیا ہے کہ جو کچھ بھی انبیاء پر نازل ہوا ہے 'اس پر ایمان لائیں ؛ ارشاد فرمایا :

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَ مَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ وَ مَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَ عِيْسٰى وَ مَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ﴾ [البقرة ۱۳۶]

''اے مسلمانو! تم سب کہو کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس چیز پر بھی جو ہماری طرف اتاری گئی اور اس چیز پر بھی جو ابراہیم، اسماعیل اسحاق اور یعقوب علیہ السلام اور ان کی اولاد پر اتاری گئی اور جو کچھ اللہ کی جانب سے موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام اور دوسرے انبیا علیہم السلام کو دیے گئے۔ ہم ان میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے، ہم اللہ کے فرمانبردار ہیں۔''

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ وَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَ اِلَيْكَ الْمَصِيْرُ﴾ [البقرة ۲۸۵]

''رسول ایمان لایا اس چیز پر جو اس کی طرف اللہ تعالیٰ کی جانب سے اترے اور مومن بھی ایمان لائے یہ سب اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے، اس کے رسولوں میں سے کسی میں ہم تفریق نہیں کرتے انہوں نے کہہ دیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی، ہم تیری بخشش طلب کرتے ہیں اے ہمارے رب اور ہمیں تیری ہی طرف لوٹنا ہے۔''

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ لٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَ الْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ﴾ [البقرة ۱۷۷]

''لیکن نیکی یہ ہے کہ جو اللہ تعالیٰ پر، قیامت کے دن پر، فرشتوں پر، کتاب اللہ اور نبیوں پر ایمان رکھنے والا ہو۔''

انبیاء کرام علیہم السلام کے لائے ہوئے پیام پر ایمان لانے اور اس کا اپنی زبان سے اقرار کرنے کا ہمیں حکم دیا گیا ہے۔ یہ ان امور میں سے ہے جس پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ: تمام انبیاء کرام پر ایمان لانا واجب ہے۔ اور جو کوئی کسی ایک نبی کا انکار کرتا ہے گویا کہ وہ تمام انبیاء کا انکار کرتا ہے۔ اور جو کوئی کسی نبی کو گالی دیتا ہے تو بالاتفاق اس کو قتل کرنا واجب ہو جاتا ہے۔

یہ حکم انبیاء کرام علیہم السلام کے علاوہ کسی دوسرے کے لیے نہیں ہے۔ بھلے کسی کو امام کا خطاب دیا جائے یا ولی ہونے کا یا حکیم ہونے کا یا عالم کہا جائے؛ یا اس طرح کا کوئی دوسرا نام دیا جائے [مگر حقیقت یہ ہے کہ کسی بھی دوسرے کے لیے یہ خصوصیت نہیں ہے سوائے انبیاء کے]۔ پس جو کوئی انبیاء کرام کے بعد کسی کو معصوم مانتا ہے کہ اس کے ہر قول پر ایمان لانا واجب ہے' تو یقیناً وہ اسے نبوت کے معانی دیتا ہے اگر چہ وہ الفاظ میں اسے نبی نہ بھی کہے۔

ایسے آدمی سے کہا جائے گا کہ: اس معصوم اور بنی اسرائیل کے انبیاء کرام علیہم السلام جو کہ شریعت موسوی [تورات] کی اتباع کے لیے مامور تھے؛ ان کے مابین کون سا فرق باقی رہ گیا؟

بہت سارے گمراہ صوفی بھی اپنے مشائخ کے متعلق اس قسم کا اعتقاد رکھتے ہیں۔ لیکن وہ کہتے ہیں: شیخ گناہ سے محفوظ ہے۔ اور یہ صوفیا اپنے شیخ کے ہر حکم میں اس کی اتباع کا حکم دیتے ہیں؛ کسی بھی چیز میں شیخ کی مخالفت نہیں کی جا سکتی۔ یہ بھی

رافضیوں؛اسماعیلیوں اور عیسائیوں کی مانند غلو ہے۔ جو اپنے اماموں کے متعلق دعوی کرتے ہیں کہ ان کے امام معصوم ہیں۔

ابن تومرت جس نے مہدی ہونے کا دعوی کیا تھا؛ اس کے ساتھی بھی یہی دعوی کرتے ہیں کہ ابن تومرت معصوم ہے۔ وہ اپنے جمعہ کے خطبہ میں یوں کہا کرتے تھے: ''امام معصوم اور مہدی معلوم۔''

اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انہوں نے بہت سارے ان لوگوں کو قتل کر دیا تھا جو ابن تومرت کو معصوم نہیں مانتے تھے۔

یہ بات سبھی کو معلوم ہے کہ یہ تمام اقوال وعقائد کتاب وسنت اور اجماع امت اور [ائمہ سلف وخلف کے اقوال] کی روشنی میں اسلام کے خلاف ہیں۔اس لیے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ﴾ [النساء ۵۹]

''فرمانبرداری کرو اللہ تعالیٰ کی اور فرمانبرداری کرو رسول اللہ ﷺ کی اور تم میں سے اختیار والوں کی۔ پھر اگر کسی چیز پر اختلاف کرو تو اسے لوٹا، اللہ تعالیٰ کی طرف اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف۔''

آیت مبارکہ میں اختلاف کے وقت ہمیں صرف اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ پس جو انسان رسول اللہ ﷺ کے علاوہ کسی اور کو معصوم مانتا ہے؛ وہ حقیقت میں اس کی طرف رجوع کرنے کو واجب ٹھہراتا ہے۔اس لیے کہ وہ یہ بات کہنا چاہتا ہے کہ اس معصوم کے پاس رسول کی طرح حق کے سوا کچھ بھی نہیں۔ یا عقیدہ ونظریہ قرآن کے صریح خلاف ہے۔اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ معصوم کی اطاعت مطلق طور پر بغیر کسی قید کے واجب ہوتی ہے۔اور اس کی مخالف وعید کا مستحق ہوتا ہے۔جب کہ قرآن اس وصف کو صرف رسول کے ساتھ خاص مانتا ہے۔[اور کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہے]۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ مَنْ یُّطِعِ اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَ الصِّدِّیْقِیْنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَ الصّٰلِحِیْنَ وَ حَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِیْقًا﴾ [النساء ۶۹]

''اور جو بھی اللہ تعالیٰ کی اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمانبرداری کرے، وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوگا جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام کیا، جیسے نبی اور صدیق اور شہید اور نیک لوگ، یہ بہترین رفیق ہیں۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَمَنْ یَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا اَبَدًا ﴾ [الجن ۲۳]

''جو بھی اللہ اور اس کے رسول کی نہ مانے گا اس کے لئے جہنم کی آگ ہے جس میں ایسے لوگ ہمیشہ رہیں گے۔''

قرآن نے کئی ایک جگہ پر یہ بات دلائل کے ساتھ واضح کی ہے کہ جو کوئی بھی رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کرے گا اس کا شمار اہل سعادت میں سے ہوگا؛ اس میں کسی اور معصوم کی اطاعت کی کوئی شرط نہیں لگائی گئی۔

اور جو کوئی رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی کرے گا وہ وعید کا مستحق ٹھہرے گا۔ بالفرض اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ کوئی انسان کسی کی اطاعت اس لیے کرتا ہے کہ وہ اسے معصوم خیال کرتا ہے۔مگر پھر بھی [یہ معلوم ہونا چاہیے کہ] رسول اللہ ﷺ ہی وہ ہستی ہیں جن کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے اہل جنت اور اہل جہنم ؛ نیکوکار اور بدکردار؛ حق اور باطل ؛ کامیابی اور ناکامی ؛ سرکشی

اور اطاعت وفرمانبرداری اور گمراہی اور ہدایت کے مابین تفریق کی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو قاسم [تقسیم کرنے والا] بنایا تھا۔ آپ کے ذریعہ لوگوں کو دو گروہوں نیک بخت اور بد بخت میں تقسیم کر دیا تھا۔ جن لوگوں نے آپ کی اطاعت کی وہ نیک بخت ٹھہرے ؛ اور جن لوگوں نے آپ کی نافرمانی اور مخالفت کی وہ بد بخت قرار پایا۔ یہ مرتبہ آپ ﷺ کے علاوہ کسی بھی دوسرے انسان کو حاصل نہیں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اہل علم -اہل کتاب و سنت- کا اتفاق ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے علاوہ جتنے بھی لوگ ہیں ؛ ہر ایک کی بات قبول بھی کی جا سکتی ہے اور رد بھی کی جا سکتی ہے ؛ مگر رسول للہ ﷺ کی بات صرف قبول ہی کی جا سکتی ہے۔ آپ ﷺ کی بتائی ہوئی باتوں کی تصدیق کرنا اور آپ کے ہر ایک حکم کی تعمیل کرنا واجب ہے۔ اس لیے کہ آپ ہی وہ معصوم ہستی ہیں جو اپنی مرضی سے بات تک نہیں کرتے۔ بلکہ آپ جو کچھ بھی ارشاد فرماتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی ہوتا ہے۔ اور روز قیامت لوگوں سے آپ ہی کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَلَنَسْئَلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَ لَنَسْئَلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ﴾ [الأعراف ٦]

''پھر ہم ان لوگوں سے ضرور پوچھیں گے جن کے پاس پیغمبر بھیجے گئے تھے اور ہم پیغمبروں سے بھی ضرور پوچھیں گے۔''

آپ ہی وہ ہستی ہیں جن کی بابت قبروں میں لوگوں سے امتحان ہوگا۔ مردوں سے پوچھا جائے گا:

تمہارا رب کون ہے؟ تمہارا دین کیا ہے؟ اور تمہارا نبی کون ہے؟

اور کہا جائے گا: ''اس آدمی کے بارے میں تم کیا کہتے ہو جو تم میں مبعوث کیا گیا تھا؟

پس اللہ تعالیٰ ایمان والے کو ثابت قدم رکھے گا ؛ اور وہ کہے گا: ''وہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ آپ ہمارے پاس واضح دلائل اور ہدایت کی باتیں لیکر آئے۔ ہم آپ پر ایمان لائے اور آپ کی اتباع کی۔ اگر کوئی انسان رسول اللہ ﷺ کی بجائے صحابہ ؛ ائمہ ؛ تابعین اور علماء میں سے کسی کا نام لے گا تو اسے اس کا کچھ بھی فائدہ نہ ہوگا۔ اور رسول اللہ ﷺ کے علاوہ کسی دوسرے انسان کے بارے میں قبر میں امتحان نہیں ہوگا۔

یہاں پر یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف منکرات کے بارے میں جو جواب یا عذر پیش کیا جائے گا اس سے بڑا عذر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ہاں موجود ہے۔ اس لیے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت اور ولایت کے لیے لوگوں سے جنگ کی جس میں خلق خدا کی بہت بڑی تعداد قتل ہوئی۔ آپ کی خلافت کے دوران مسلمانوں کو کوئی فائدہ حاصل نہ ہوسکا۔ نہ ہی کفار سے جہاد جاری رہا ؛ اور نہ ہی مزید کوئی شہر فتح ہوا۔ اور نہ ہی مسلمانوں کو کوئی بڑی خیر نصیب ہوئی۔ اور آپ نے اپنے اقارب میں سے کئی لوگوں کو والی یا گورنر بنایا۔ اقارب کو ولایات پر مامور کرنے کا اقدام مشترکہ ہے۔ بس اتنا فرق ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے نائبین بہت ہی اطاعت گزار تھے۔ جب کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نائبین اطاعت سے بہت دور اور شر کے زیادہ قریب تھے۔

جب کہ اموال کے تقسیم کرنے میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ایسے ہی متأول تھے جیسے حضرت علی رضی اللہ عنہ لوگوں کا خون بہانے میں۔ حالانکہ خون کا معاملہ مال کی نسبت زیادہ سخت اور خطرناک ہوتا ہے۔

دوسری بات: ان سے کہا جائے گا کہ: جس نص کا آپ دعوی کرتے ہیں ؛ تمہارا آپس میں اس نص کے بارے میں اتنا

اختلاف ہے جس سے وجوباً علم ضروری حاصل ہوتا ہے کہ یہ نص تمہارے ہاں قابل اعتماد نہیں ہے۔ بلکہ تم میں سے ہر ایک گروہ جیسے چاہتا ہے ویسی روایات گھڑ لیتا ہے۔

جمہور مسلمین کہتے ہیں: ہم یقینی ہی نہیں بلکہ ضروری طور پر جانتے ہیں کہ نصوص جھوٹی ہیں۔ یہ بات ہم نے کئی جگہ پر واضح کی ہے۔[یعنی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین پر یہ جو الزامات لگائے جارہے ہیں سب جھوٹ ہیں]۔

تیسری بات: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی حجت دوسرے لوگوں پر غالب ہی رہے گی؛ اس لیے کہ آپ کے بارے میں یہ عذر بھی صحیح ہے کہ بنوامیہ کو عہدہ ہائے جلیلہ عطا کرنے میں ان کے سامنے اسوۂ نبوی موجود تھا۔ اور نبی کریم ﷺ کے بعد ان لوگوں نے بھی امویوں کو عہدوں پر تعینات کیا جن پر قرابت کا الزام بھی نہیں لگایا جاسکتا؛ ان میں حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما بھی شامل ہیں۔ عرب قبائل میں سے کوئی بھی قبیلہ ایسا نہیں جس میں بنوعبدالشمس کی نسبت رسول اللہ ﷺ کے عمال کی تعداد زیادہ ہو۔ اس کی وجہ ہے کہ:

۱۔ بنوعبدشمس تعداد میں زیادہ تھے۔

۲۔ ان میں سیادت وقیادت اور شرف کا عنصر موجود تھا۔

سرور کائنات ﷺ نے اسلام کے غلبہ اور عزت کے دور میں:

۱۔ عتاب بن اُسید بن ابوالعیص بن امیہ اموی رضی اللہ عنہ کو حاکم مکہ مقرر کیا؛ جو کہ روئے زمین کا سب سے محترم گوشہ ہے۔ [1]

۲۔ اور ابوسفیان بن حرب بن امیہ اموی رضی اللہ عنہ کو نجران کا عامل مقرر فرمایا۔

۳۔ خالد بن سعید بن العاص اموی رضی اللہ عنہ کو صنعاء یمن اور بنی مذحج سے صدقات وصول کرنے پر عامل مقرر کیا تھا۔ آپ رسول اللہ ﷺ کی وفات تک اسی منصب پر فائز رہے۔

۴۔ حضرت عثمان بن سعید ابن العاص رضی اللہ عنہ کو تیماء؛ خیبر؛ اور عرینہ کی بستیوں پر عامل مقرر فرمایا تھا۔

۵۔ ابان بن سعید بن العاص رضی اللہ عنہ کو پہلے بعض سرایا پر امیر مقرر کیا اور پھر آپ کو بحرین کا والی مقرر کیا۔ آپ حضرت العلاء الحضرمی رضی اللہ عنہ کے بعد نبی کریم ﷺ کی وفات تک اس منصب پر فائز رہے۔

۶۔ اسی طرح نبی کریم ﷺ نے جب ولید بن عقبہ بن ابی معیط رضی اللہ عنہ کو[بنی ابیرق کے صدقات وصول کرنے پر] عامل مقرر کیا تو یہ آیت نازل ہوئی:

﴿اِنْ جَآئَکُمْ فَاسِقٌ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوْا اَنْ تُصِیبُوْا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ﴾ [الحجرات۶]

''تمہیں کوئی فاسق خبر دے تو تم اس کی اچھی طرح تحقیق کرلیا کرو ایسا نہ ہو کہ نادانی میں کسی قوم کو ایذا پہنچا دو۔''

نظر بریں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ میں نے انہی افراد اور اسی جنس وقبیلہ کے لوگوں کو عہدے عطا کیے ہیں جن کو نبی کریم ﷺ دیا کرتے تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ وعمر رضی اللہ عنہ بھی اسی ڈگر پر گامزن رہے۔ چنانچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فتوحات شام کے سلسلہ میں یزید بن ابوسفیان بن حرب رضی اللہ عنہ کو حاکم مقرر کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے اس عہدہ پر قائم رکھا۔

[1] سنن نسائی، کتاب الاذان، باب کیف الاذان(ح:٦٣٢)، سنن ابن ماجة۔ کتاب الاذان۔ باب الترجیع فی الاذان (ح:٧٠٨) و کتاب التجارات، باب النهی عن بیع ما لیس عندك(ح:٢١٨٩)۔

پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت یزید رضی اللہ عنہ کے بعد ان کے بھائی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو یہ منصب عطا کیا۔ بنوامیہ کو حاکم و عامل مقرر کرنے کی روایت نبی کریم ﷺ سے نہ صرف ثابت و مشہور بلکہ اہل علم کے نزدیک متواتر کی حد تک معروف ہے۔علماء یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں' ان میں سے کسی ایک نے اس کا انکار نہیں کیا۔

لہٰذا اس سے بنوامیہ کو عہدے عطا کرنے پر احتجاج کرنا نبی کریم ﷺ کی نص کے مطابق اور ہر عاقل کے نزدیک خلافت کو بنی ہاشم کے ایک ہی فرد میں محدود کرنے کی نسبت اظہر ہے۔ کیوں کہ بنو ہاشم میں مناصب جلیلہ کو محدود کرنے کا دعویٰ باتفاق محدثین کذب و دروغ گوئی ہے اور بنوامیہ کو عہدے تفویض کرنے کی روایت بالاتفاق اہل علم والنقل صدق ہے۔ جہاں تک بنو ہاشم کو عامل و حاکم بنانے کا تعلق ہے نبی ﷺ نے صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یمن کا حاکم مقرر کیا اور حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کو اپنے آزاد کردہ غلام زید بن حارثہ اور عبداللہ ابن رواحہ رضی اللہ عنہما کی معیت میں غزوہ موتہ کا سپہ سالار بنا کر بھیجا تھا۔

دیکھ لیجیے! اس موقع پر نبی کریم ﷺ اپنے آزاد کردہ غلام زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو سالار لشکر بنا کر روانہ فرمارہے ہیں؛ حالانکہ آپ کا تعلق قبیلہ کلب سے تھا۔ اوران کے ساتھ مأمورین میں جعفر بن ابو طالب ہیں [جو آپ کے چچازاد بھائی تھے] اور یہ بھی روایت کیا گیا ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے آپ سے ولایت طلب کی تھی؛ مگر آپ نے انہیں والی نہیں بنایا۔

بنی ہاشم میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت حمزہ؛ جعفر بن ابو طالب؛ اور عبید بن حارث بن مطلب رضی اللہ عنہم اجمعین سے بڑھ کر کوئی بھی افضل نہیں تھا۔ عبید بن حارث بدر کے دن شہید ہوئے۔ ایسے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو بھی کوئی ولایت عطا نہیں کی؛ اس لیے کہ آپ غزوہ احد میں شہید کردیئے گئے تھے۔

بعض ترک اوران کے مشائخ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے متعلق جو کچھ روایت کرتے ہیں؛ اور جو کچھ ان کے بارے میں ترکوں کے ہاں متداول ہے؛ جس میں آپ کی کئی جنگوں اور محاصروں کا ذکر ہے؛ یہ تمام جھوٹ اور من گھڑت ہے۔ یہ بالکل اسی جنس سے ہے جیسے جھوٹے لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق من گھڑت جنگی کہانیاں مشہور کر رکھی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ایسے جھوٹ رسول اللہ ﷺ کے متعلق بھی گھڑے گئے ہیں۔ یہ تمام واقعات ابوالحسن البکری کی سیرت کی کتاب ''أنوار التنقلات'' میں بیان کیے گئے جھوٹ کی جنس سے ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے غزوات اہل علم کے ہاں معروف ہیں۔ اوروہ ان واقعات کو ضبطِ تحریر میں لا چکے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے غزوات کی تعداد بیس سے زیادہ [ستائیس] ہے۔ لیکن ان میں سے صرف نو غزوات میں قتال کی نوبت آئی: غزوہ بدر؛ غزوہ احد؛ خندق؛ بنی مصطلق؛ الغابہ؛ فتح خیبر؛ فتح مکہ؛ حنین اور طائف۔ طائف وہ آخری غزوہ ہے جس میں قتال تک نوبت پہنچی۔ اس کے بعد غزوہ تبوک کا واقعہ پیش آیا۔ یہ غزوہ تعداد کے لحاظ سے بہت زیادہ؛ اور تیاری کے لحاظ سے بڑا پر مشقت تھا۔ اسی غزوہ میں اللہ تعالیٰ نے سورت برأت [توبہ] نازل فرمائی۔ اس غزوہ میں بھی قتال تک نوبت نہیں پہنچی۔

اور جاہل حجاج تبوک کے محاصرہ کا جو ذکر کرتے ہیں' اس کی کوئی اصل نہیں۔ تبوک میں نہ ہی کوئی قلعہ تھا اور نہ ہی قتال ہوا۔ نبی کریم ﷺ نے بیس روز تک وہاں قیام کیا اور پھر واپس مدینہ تشریف لائے۔

حضرت جعفر رضی اللہ عنہ اپنی زندگی میں بنی ہاشم میں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد افضل انسان تھے۔ مگر اس کے باوجود آپ

نے قبیلہ کلب کے ایک آدمی زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو آپ پر امیر بنایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ تقدیم فضیلت ایمان؛ تقویٰ اور بعض دوسرے امور مصالح کی وجہ سے ہوتی ہے نسب کی وجہ سے نہیں۔ یہی وجہ تھی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اقارب پر حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو مقدم رکھا کرتے تھے۔ بلا شک وشبہ آپ اللہ کے رسول تھے اور اللہ کے حکم کے مطابق ہی حکم دیا کرتے تھے۔ آپ ان بادشاہوں میں سے نہیں تھے جو اپنی خواہشات کی وجہ سے اپنے عزیز و اقارب اور دوست و احباب کو مقدم کرتے ہوں۔ یہی حال حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کا بھی تھا۔ یہاں تک کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''جو حاکم اپنی قرابت یا دوستی کی وجہ سے کسی کو تعینات کرے؛ حالانکہ مسلمانوں میں اس سے بہتر لوگ موجود ہوں؛ تو یقیناً اس نے اللہ اور اس کے رسول سے اور مؤمنین سے خیانت کی۔''

فصل:

[نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد معصوم ہونے کا اعتقاد؟]

قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی کے بھی معصوم ہونے کا اعتقاد نہیں رکھتے۔ بلکہ خلفاء اور غیر خلفاء سب سے غلطی ہونے کا امکان موجود ہے۔ اور ان لوگوں سے جو گناہ واقع ہوتے ہیں؛ بسا اوقات وہ ان سے توبہ کر لیتے ہیں۔ اور کبھی نیکیوں کی بہتات کی وجہ سے ان کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ اور کبھی اللہ تعالیٰ انہیں مصائب میں مبتلا کر دیتے ہیں؛ اور وہ مصائب ان کے لیے گناہوں کا کفارہ ہو جاتے ہیں۔ اور کبھی ان کے علاوہ کسی دوسرے سبب کی بنا پر ان کے گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔

[ہم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے معصوم ہونے کے مدعی نہیں ہیں لیکن] حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں جو کچھ بھی منقول ہے؛ وہ زیادہ سے زیادہ خطأ یا گناہ ہو سکتا ہے۔ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے لیے اتنے اسباب مغفرت موجود ہیں [جن کی وجہ سے ان کے گناہ معاف ہو گئے ہوں گے۔ ان اسباب میں سے:]

آپ کو ایمان لانے میں سبقت حاصل ہے۔ آپ نے جہاد میں حصہ لیا۔ اور ان کے علاوہ دیگر اطاعت کے کام بھی ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو ایک بلوہ کی وجہ سے جنت کا مژدہ بھی سنایا تھا۔ نیز یہ کہ عام طور پر آپ کے بارے میں جن باتوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے' آپ نے ان سے توبہ کر لی تھی۔ نیز یہ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایک بہت بڑی آزمائش سے دو چار کیا۔ اس کی وجہ سے بھی اللہ تعالیٰ نے آپ کے گناہ معاف کر دیئے۔ آپ نے آزمائش کی گھڑی میں صبر کیا یہاں تک کہ مظلومیت کی حالت میں شہید کر دیئے گئے۔ یہ سب سے بڑی اور اہم ترین وجہ جو اللہ کے ہاں گناہوں کا کفارہ ہو سکتی ہے۔

ایسے ہی خوارج یا کچھ دوسرے لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جن چیزوں کا انکار کرتے ہیں ان کی آخری حد یہ ہو سکتی ہے کہ یہ امور گناہ یا خطاء ہوں۔ اور آپ کے لیے بھی ایسے ہی بہت سارے اسباب مغفرت موجود ہیں۔ ان میں سے یہ بھی ہے کہ:

آپ کو ایمان لانے میں سبقت حاصل ہے۔ آپ نے جہاد میں حصہ لیا۔ اور ان کے علاوہ دیگر بھی اطاعت کے کام ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو جنت کا مژدہ بھی سنایا تھا۔ نیز یہ کہ عام طور پر آپ کے بارے میں جن باتوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے' آپ نے ان میں سے بہت سارے امور سے توبہ کر لی تھی؛ اور آپ ان امور کے سرزد ہو جانے پر نادم و پشیمان تھے۔

اور آخر کار آپ کو شہید کر دیا گیا۔

یہ قاعدہ کلیہ ہمیں اس بات سے بے نیاز کر دیتا ہے کہ ہم ان میں سے کسی ایک کے فعل کو بغیر کسی ضرورت کے واجب یا پھر مستحب شمار کرنے لگ جائیں۔

اس باب میں منحرف ہو جانے والے لوگوں کے دو گروہ ہیں:

۱۔ قادحون: [طعن و تشنیع اور جرح و قدح کرنے والے] جو کسی بنا پر ایسے افراد پر قدح کرتے ہیں جن کی اللہ تعالیٰ نے مغفرت کر دی ہے۔ یہ اتنی جفا پر اتر آتے ہیں کہ ایک گناہ کو بھی ساری نیکیوں کو ختم کرنے والا عمل شمار کرتے ہیں۔

۲۔ مادحون: [بے جا تعریف کرنے والے]: وہ لوگ ہیں جو امور مغفورہ کو سعی مشکور کے باب میں سے شمار کرتے ہیں۔ یہ لوگ کسی انسان کی مدح سرائی میں اتنے رطب اللسان ہو جاتے ہیں اور اس کی شان میں اتنا غلو کرتے ہیں کہ اس کی برائیوں کو بھی نیکیاں شمار کرنے لگتے ہیں۔

تمام مسلمانوں -حتی کہ خوارج - تک کا اجماع ہے کہ توبہ سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں ۔اور بعض گناہ ایسے ہیں جو نیکیوں سے مٹ جاتے ہیں ۔اور کسی ایک کے لیے بھی یہ کہنا خارج از امکان ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے گناہوں سے توبہ نہیں کی تھی۔

یہ خارجیوں پر حجت ہے جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کافر کہتے ہیں ۔ اور ان شیعہ پر بھی حجت ہے جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ پر طعن کرتے ہیں ۔اور ان نواصب پر بھی حجت ہے جو صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں قدح کرتے ہیں۔

جب کہ اہل سنت حضرت عثمان و حضرت علی رضی اللہ عنہما اور دیگر تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے محبت کرتے ہیں اور ان سے دوستی کا دم بھرتے ہیں ۔اور شیعیت اور دین میں تفرقہ پیدا کرنے والے ان تمام گروہوں سے برأت کا اظہار کرتے ہیں جو کسی ایک کی محبت کو واجب کہتے ہیں اور دوسرے صحابہ کرام سے دشمنی رکھتے ہیں۔اہل سنت والجماعت کے مابین یہ امر معلوم چلا آ رہا ہے کہ ان چاروں خلفاء کرام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت کی بشارت دی تھی۔اور ان کے علاوہ حضرت زبیر؛ اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہما اور ان کے علاوہ دیگر وہ صحابہ جنہیں جنت کی بشارت ملی ہے [وہ سب جنتی ہیں]۔اس موضوع پر ہم نے اپنے مقام پر تفصیل سے کلام کیا ہے۔سلف میں سے ایک گروہ کا یہ بھی خیال تھا کہ جنتی ہونے کی گواہی صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہی دی جا سکتی ہے۔یہ قول محمد بن الحنفیہ؛ امام اوزاعی اور بعض دوسرے محدثین جیسے علی المدینی رحمہ اللہ کا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ: وہ صحابہ کرام [جن کے لیے جنت کی بشارت دی گئی ہے] وہ جنت میں ہیں۔لیکن وہ یہ نہیں کہتے تھے کہ: ہم ان کے لیے جنت کی گواہی دیتے ہیں۔حق بات تو یہ ہے کہ جیسے ہم نے اہل سنت والجماعت کے مذہب میں پایا ہے؛ ہم ان حضرات کے لیے اپنی زبانوں سے جنتی ہونے کی گواہی دیتے ہیں۔اس مسئلہ میں امام احمد بن حنبل اور علی المدینی کا مناظرہ بھی ہوا ہے۔ رحمہ اللہ۔

ایک گروہ ان کی شان میں غلو کرتے ہوئے انہیں معصوم یا معصوموں جیسے قرار دیتے ہیں۔اور کچھ ناکارہ لوگ ایسے بھی ہیں جو ان حضرات پر بعض امور کی وجہ سے طعن و تشنیع کرتے ہیں اور انہیں برا بھلا کہتے ہیں۔حالانکہ یہ امور اگر سچے تھے تو تب

بھی ان لوگوں کے گناہ اللہ تعالیٰ نے معاف کر دیئے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ ان امور کی وجہ سے ان حضرات سے کوئی مؤاخذہ نہیں کرے گا۔ اس لیے کہ ان کے جتنے بھی وہ افعال ہیں جن پر لوگوں کو اعتراض ہے یا تو وہ خطأ ہیں۔ یا پھر اجتہادی امور ہیں۔

[اسبابِ مغفرت]:

اگر انہیں خطاء شمار کیا جائے تو اللہ تعالیٰ نے اس امت سے خطا پر مؤاخذہ ختم کر دیا ہے۔ جب کہ گناہ کے بخشے جانے کے کئی ایک اسباب ہیں جو کہ ان حضرات کے ہاں پائے جاتے تھے۔ ان اسباب کے دو اصول ہیں: خاص اور عام۔

عام: عامۃ المسلمین میں سے کسی ایک شخص میں مخلوط اعمال جمع ہوتے ہیں۔ ایسے اعمال بھی ہوتے ہیں جن پر وہ ثواب کا مستحق ہے' اور ایسے اعمال بھی جن پر وہ سزا کا مستحق ہے۔ اس عموم میں صحابہ' تابعین اور مسلمان ائمہ سب لوگ شامل ہیں۔

اس مسئلہ میں اختلاف خوارج اور معتزلہ کے ساتھ ہے۔ وہ کہتے ہیں: آخرت میں لوگ دو ہی قسم کے ہیں

۱۔ جنہیں ثواب دیا جائے گا۔

۲۔ جنہیں عذاب دیا جائے گا۔ اور جو کوئی جہنم میں داخل ہو گیا وہ کبھی بھی جہنم سے باہر نہیں آئے گا؛ نہ ہی کسی شفاعت کی بنا پر اور نہ ہی کسی اور بنا پر۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ: کبیرہ گناہ تمام نیکیوں کو ختم کر دیتے ہیں۔ اور ایسے انسان کے پاس ایمان نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہتی۔

حالانکہ نبی کریم ﷺ سے مشہور اسناد کے ساتھ ثابت ہے کہ کچھ لوگوں کو جل کر کوئلہ بن جانے کے بعد جہنم سے نکالا جائے گا اور ایسے ہی نبی کریم ﷺ کی اپنی امت کے کبیرہ گناہ والے لوگوں کے متعلق شفاعت کرنا بھی صحیح احادیث سے ثابت ہے۔ اس بارے میں نبی کریم ﷺ سے منقول احادیث اتنے بڑے تواتر کے ساتھ ثابت ہیں کہ ایسا تواتر؛ چوری کے نصاب؛ زانی کے رجم؛ زکوٰۃ کے نصاب؛ وجوب شفعہ؛ دادا کی میراث اور ان جیسی دوسری احادیث کو نصیب نہیں ہوا۔ لیکن اس اصل کی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جیسے لوگوں کے لیے کوئی ضرورت نہیں ہے جنہیں جنت کی بشارت دی گئی ہے۔ اور یہ کہ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو گیا تھا؛ اور وہ آخرت میں انہیں کوئی سزا نہیں دے گا۔ بلکہ ہم یہ بھی گواہی دیتے ہیں کہ عشرہ مبشرہ جنتی ہیں۔ اور بیعت رضوان کرنے والے جنتی ہیں۔ اہل بدر جنتی ہیں۔ جیسا کہ صادق و مصدوق رسول اکرم ﷺ؛ جو کہ وحی کے بغیر اپنی زبان سے بات تک نہیں کرتے؛ بلکہ آپ جو کچھ کہتے ہیں وہ وحی ہوتا ہے؛ آپ سے یہ روایات ثابت ہیں۔

[جب مسلمانوں میں فتنہ پیدا ہوا تو] جن لوگوں کے لیے جنت کی گواہی دی گئی ہے' ان میں سے بھی کئی حضرات اس فتنہ میں داخل ہو گئے۔ جس نے حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کو قتل کیا؛ اس کا نام ابو غادیہ تھا؛ یہ بھی بیعت رضوان میں شرکت کرنے والے صحابی تھے۔ ابن حزم نے یقین کے ساتھ دوٹوک طور پر آپ کا نام لیا ہے۔

ہم حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے جنتی ہونے کی گواہی دیتے ہیں۔ اور آپ کا قاتل اگر واقعی بیعت رضوان والوں میں سے تھا تو اس کے لیے بھی جنتی ہونے کی گواہی دیتے ہیں۔ جب کہ حضرت عثمان' حضرت علی حضرت طلحہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہم اجمعین دوسرے حضرات کی نسبت ان کی قدر و منزلت تو بہت ہی بلند ہے۔ اگر ان سے کچھ بھی ہو گیا ہوتا تب بھی ہم یہ نہیں کہتے کہ ان میں سے کوئی ایک گناہ نہیں کر سکتا۔ بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ اگر ان میں سے کسی ایک سے کوئی گناہ ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اسے آخرت میں

عذاب نہیں دیں گے۔ اور نہ ہی انہیں جہنم میں داخل کرے گا۔ بلکہ ہم بغیر کسی شک و شبہ کے کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں جنت میں داخل کرے گا۔ آخرت کی سزا ان سے کئی اسباب کی بنا پر ختم ہو سکتی ہے:

۱۔ توبہ کرنے کی وجہ سے۔ ۲۔ ان کی نیکیوں کی کثرت کی وجہ سے۔

۳۔ دنیا میں پیش آنے والے ان مصائب کی وجہ سے جو گناہوں کا کفارہ بن جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی کئی اسباب ہو سکتے ہیں۔ اس موضوع پر ہم تفصیل سے کلام کر چکے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مطلق طور پر مؤمنین کے گناہ ان کے لیے عذاب کا سبب بنتے ہیں؛ لیکن آخرت میں تقریباً دس اسباب کی بنا پر سزا کو ختم کر دیا جاتا ہے۔

پہلا سبب توبہ: بیشک گناہ سے توبہ کرنے والا ایسے ہی ہے جیسے اس نے کوئی گناہ کیا ہی نہ ہو۔ اور ہر گناہ جیسے کفر، فسق، نافرمانی وغیرہ سے توبہ قبول کی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿قُلْ لِّلَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اِنْ یَّنْتَھُوْا یُغْفَرْ لَھُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ ﴾ [الأنفال ۳۸]

’’آپ ان کافروں سے کہہ دیجئے کہ اگر یہ لوگ باز آ جائیں تو ان کے سارے گناہ جو پہلے ہو چکے ہیں سب معاف کر دیے جائیں گے۔‘‘

اس بارے میں نبی کریم ﷺ سے بہت ساری احادیث ثابت ہیں۔ صحابہ کرام جو کہ اس امت کے افضل ترین قرون کے لوگ تھے؛ یہ زمانہ سب سے زیادہ معرفت الٰہی رکھنے والوں کا زمانہ تھا۔ اور وہ لوگ اللہ تعالیٰ سے بہت زیادہ ڈرنے والے ہوا کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں اور آپ کی موت کے بعد بھی سب سے زیادہ توبہ پر قائم رہنے والے لوگ تھے۔ پس جو کوئی ان صحابہ کرام کے عیب تو شمار کرتا ہے؛ مگر ان کی توبہ کا ذکر نہیں کرتا جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کے درجات بلند کیے ہیں؛ وہ انسان یقیناً ان صحابہ کرام پر ظلم کرنے والا ہے۔ جس طرح کے بعض صحابہ کے ساتھ حدیبیہ کے موقع پر پیش آیا۔ اور پھر انہوں نے اپنی اس حرکت پر توبہ کر لی۔ حالانکہ صحابہ کرام کا ارادہ محض خیر کا تھا۔ اور ایسے حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ کا قصہ بھی ہے؛ جس سے آپ نے توبہ کر لی۔ اور زانیہ کا قصہ جس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’تحقیق اس نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر ناجائز ٹیکس وصول کرنے والا بھی ایسی توبہ کرتا تو اسے معاف کر دیا جاتا۔ اور حضرت ماعز بن مالک نے توبہ کی اور نبی کریم ﷺ کے پاس حاضر ہوئے تاکہ آپ پر حد قائم کر کے پاک کیا جائے۔ ایسے ہی ان کے بعد غامدیہ کا واقعہ بھی ہے۔ یہی حال حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں تھا۔ اگر کوئی انسان شراب پی لیتا تو وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا؛ اور کہتا: اے امیر المؤمنین مجھ پر حد قائم کر کے مجھے پاک کیجیے۔ یہ اس انسان کا فعل ہے جس سے کبیرہ گناہ کا ارتکاب ہوا اور وہ اس کی حرمت کو جانتا ہو۔ تو پھر ان لوگوں کے بارے میں کیا کہا جائے گا جن سے کوئی صغیرہ گناہ ہوا ہو؛ یا انہوں نے کسی تاویل کی بنا پر کوئی کام کیا ہو۔ اور پھر بعد میں اس کے لیے خطاء واضح ہوئی ہو؟

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر جن امور کا انکار کیا جاتا تھا؛ جب آپ کے لیے واضح ہو گیا کہ واقعی یہ کام برے ہیں تو آپ نے ان سے توبہ کر لی تھی۔ یہ آپ کی سیرت میں مشہور و معروف ہے۔

ایسے ہی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بصرہ کی طرف کوچ کرنے پر ندامت اختیار کی۔اور جب آپ اپنے اس خروج کا ذکر کرتیں تو اس قدر روتیں کہ آپ کی اوڑھنی تر ہو جاتی۔

ایسے ہی حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ سے نصرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں جو تفریط واقع ہوئی ؛ اس پر آپ بہت ہی نادم تھے۔ زبیر رضی اللہ عنہ جنگ جمل پر نادم تھے۔

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ قتال کے علاوہ اپنے کئی ایسے امور پر نادم تھے۔آپ صفین کی راتوں کے بارے میں فرمایا کرتے تھے:

''اللہ ہی کے لیے اس مقام کی بھلائی ہے جس پر عبداللہ بن عمر اور سعد بن مالک رضی اللہ عنہم اجمعین ہیں ۔اگر وہ مقام نیکی تو پھر اس کا اجر بہت زیادہ ہے۔اور اگر گناہ ہے تو اس کا خطرہ بہت کم ہے۔''

اور آپ فرمایا کرتے تھے:''اے حسن !اے حسن ! تیرے باپ کا یہ خیال نہیں تھا کہ معاملہ یہاں تک پہنچے گا۔اور تیرے باپ کو یہ بات پسند تھی کہ وہ اس دن سے بیس سال پہلے مرگیا ہوتا۔''

جب آپ صفین سے واپس پلٹے تو آپ کی رائے بدل چکی تھی ۔آپ فرمایا کرتے تھے:''معاویہ رضی اللہ عنہ کی امارت کو برا نہ سمجھو؛ اگر تم اس امارت کو ختم کردو گے تو تم دیکھو گے کہ کندھوں سے سر اڑ رہے ہیں۔''

یہ بات حضرت علی رضی اللہ عنہ سے دو یا تین اسناد کے ساتھ نقل کی گئی ہے۔اور آخری عمر میں آپ سے ان احوال کی کراہت تواتر کے ساتھ منقول ہے۔یہ تمام احوال ایسے تھے کہ اگر آپ کو اس معاملے کا پہلے سے اندازہ ہوتا تو آپ نے جو کچھ کیا وہ ہر گز نہ کرتے۔

خلاصہ کلام! ہمارے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم ہر ایک کی توبہ سے آگاہ ہوں۔لیکن ہم یہ جانتے ہیں کہ توبہ ہر انسان کے لیے مشروع ہے۔انبیاء کرام کے لیے بھی اور ان کے علاوہ دوسرے لوگوں کے لیے بھی۔اور یہ کہ اللہ تعالیٰ جب کسی انسان کو کسی ایسے گناہ میں مبتلا کرتے ہیں جس سے توبہ کی جائے تو پھر توبہ کی وجہ سے اپنے بندے کا مقام و درجہ بھی بلند کرتے ہیں۔ مقصود خاتمہ کا کمال ہے ابتداء کا نقص نہیں ۔بیشک اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں سے اور پاک رہنے والوں سے محبت کرتے ہیں۔اور توبہ کی وجہ سے گناہوں کو نیکیوں سے بدل دیتے ہیں۔

دوسرا سبب: استغفار: استغفار کا مطلب ہے دعا اور سوال کے ذریعہ مغفرت طلب کرنا۔غالب طور پر استغفار توبہ کے ساتھ ملا ہوا ہوتا ہے۔اور توبہ کی طرح استغفار بھی مامور بہ ہے۔لیکن ایسے بھی ہوتا ہے کہ کبھی انسان توبہ تو کرتا ہے مگر دعا نہیں کرتا اور کبھی دعا تو کرتا ہے مگر توبہ نہیں کرتا۔

تیسرا سبب: اعمال صالحہ : اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿إِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ﴾ (هود ١١٤)

''بیشک نیکیاں برائیوں کو ختم کر دیتی ہیں۔''

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

''تم جہاں کہیں بھی ہو اللہ سے ڈرتے رہو۔اور برائی کے بعد نیکی کرو؛ یہ نیکی اسے مٹا دے گی ؛ اور لوگوں کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آؤ۔'' [رواه الترمذي ٣/ ٢٣٩]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''پانچ نمازیں اور ایک جمعہ سے دوسرے جمعہ تک اور رمضان سے رمضان تک اپنے درمیان سرزد ہونے والے گناہوں کے لئے کفارہ بن جاتے ہیں جب تک کبیرہ کا ارتکاب نہ کرے۔'' [صحیح مسلم: جلد اول: حدیث نمبر ۵۵۲]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالی عنہ روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ:

''اگر کسی کے دروازے پر کوئی نہر جاری ہو، اور وہ اس میں ہر روز پانچ مرتبہ نہاتا ہو، تو تم کیا کہتے ہو کہ یہ (نہانا) اس کے میل کو باقی رکھے گا؟ صحابہ نے عرض کیا کہ: ''اس کے جسم پر بالکل میل نہ رہے گا۔'' آپ نے فرمایا کہ: ''پانچوں نمازوں کی یہی مثال ہے، اللہ تعالی ان کے ذریعہ گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔'' [صحیح بخاری: ج ۱: ح ۵۰۳]

آیات و احادیث سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ سب گناہ بخش دیتے ہیں۔ نمازوں سے بھی گناہوں کی مغفرت ہو جاتی ہے۔ یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ نماز کے درمیانی اوقات میں جو گناہ ہوتے ہیں جب وہ نمازوں سے معاف ہو جاتے ہیں تو پھر جمعہ، رمضان، عرفہ و عاشوراء کے روزہ سے کون سے گناہ معاف کیے جاتے ہیں۔

بعض لوگ اس سوال کا یہ جواب دیتے ہیں کہ جب گناہ باقی نہ ہوں تو ان کے درجے بلند کیے جاتے ہیں۔ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ جن اعمال سے گناہوں کو معاف کیا جاتا ہے وہ اعمال مقبولہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللَّهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ﴾ (المائدۃ:۲۷)

''اللہ تعالیٰ متقیوں کے اعمال کو قبول کرتے ہیں۔''

علماء کے اس آیت کی تفسیر میں تین اقوال ہیں:

۱۔ خوارج و معتزلہ کا قول ہے کہ جو شخص کبائر سے بچتا ہے اسکے اعمال قبول کیے جاتے ہیں۔ ان کے نزدیک صاحب کبائر کا کوئی عمل مقبول نہیں۔ پس ان کے نزدیک کبیرہ گناہ کے مرتکب سے کوئی بھی نیکی کسی بھی طرح قبول نہیں کی جاتی۔

۲۔ مُرجیہ کہتے ہیں کہ جو شرک سے اجتناب کرتا ہے وہ متقیوں میں داخل ہے۔ اگرچہ وہ کبائر کا ارتکاب کرتا ہو۔

۳۔ علمائے سلف و ائمہ کہتے ہیں کہ جو شخص خلوص دل سے اور خوف الٰہی سے کوئی کام کرتا ہے تو اس کا وہ عمل قبول کیا جاتا ہے۔

حضرت فُضَیل بن عیاض رحمہ اللہ آیت کریمہ ﴿لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا﴾ ''تاکہ وہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کون اچھے عمل کرتا ہے۔'' تفسیر میں فرماتے ہیں کہ ''احسن'' سے مراد وہ عمل ہے جو شرعاً درست ہو اور خلوص پر مبنی ہو۔ آپ سے پوچھا گیا کہ اس سے کیا مراد ہے تو آپ نے فرمایا: ''عمل اگر پرخلوص بھی ہو مگر شرعاً درست نہ ہو تو وہ مقبول نہیں ہو گا اور اگر شرعاً درست ہو اور خلوص سے عاری ہو تب بھی قبول نہیں کیا جائے گا۔ عمل خالص کا مطلب یہ ہے کہ صرف اللہ کے لیے ہو اور شرعاً درست ہونے کا مطلب یہ ہے کہ سنت نبوی کے مطابق ہو۔

کبیرہ گناہ کا مرتکب جب کسی بھی عمل میں اللہ ڈرتے ہوئے خالص اس کی رضا کے لیے انجام دے تو اللہ تعالیٰ اسے شرف قبولیت بخشتے ہیں۔ اور اگر اس سے کوئی افضل انسان کوئی عمل کرے؛ مگر وہ اپنے اس عمل میں اللہ تعالی سے ڈرنے والا نہ ہو تو اللہ تعالیٰ اس کا یہ عمل قبول نہیں کریں گے؛ اگرچہ کسی دوسرے عمل کو قبول بھی کر لیں۔

بس اللہ تعالیٰ اسی عمل کو قبول کرتے ہیں جو اس کے حکم کے مطابق ادا کیا جائے۔ سنن میں حضرت عمار رضی اللہ عنہ سے مروی

ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا'' بعض آدمی نماز سے فارغ ہوتے ہیں اوران کی نصف یا تہائی یا چوتھائی نماز لکھی جاتی ہے۔ آپ نے یہاں تک فرمایا کہ بعض آدمیوں کو نماز کا دسواں حصہ (۱/۱۰) نصیب ہوتا ہے۔ [1]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں تمھیں نماز [روزہ، حج اور جہاد] میں سے صرف اسی عبادت کا ثواب ملے گا جو عقل و فہم سے ادا کرو۔

اور ایک حدیث میں آتا ہے:'' بسا اوقات روزہ دار کے حصہ میں پیاس کے علاوہ کچھ بھی نہیں آتا۔اور بسا اوقات تہجد گزار کے لیے اس کے حصہ میں رتجگے کے علاوہ کچھ بھی نہیں آتا۔'' یہی حال حج اور جہاد کا بھی ہے۔

حضرت معاذ بن جبل سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشادفرمایا:

'' جہاد دوطرح کا ہے۔ایک وہ جہاد ہے جو رضا الٰہی کی خاطر کیا جاتا ہے اوراس میں امام کی فرمانبرداری کی جاتی ہے اور بہتر سے بہتر مال اس میں خرچ کیا جاتا ہے ساتھی کے ساتھ نرمی برتی جاتی ہے۔اورفساد سے پرہیز کیا جاتا ہے پس ایسے جہاد میں تو سونا اور جاگنا بھی عبادت ہے۔دوسرا جہاد وہ ہے جس میں فخر شامل ہواور جو دکھانے اور سنانے کی غرض سے کیا جاتا ہے جس میں امام کی نافرمانی ہواور زمین میں فساد مطلوب ہو ایسے جہاد کا کوئی اجر نہیں۔'' [2]

بعض سلف صالحین کے سامنے ذکر کیا گیا کہ حاجی بہت زیادہ ہوگئے ہیں۔تو انہوں نے فرمایا:'' حاجی بہت کم ہوگئے ہیں اور بوجھ اٹھا کر چلنے والے بہت زیادہ ہوگئے ہیں۔

بہرکیف گناہوں سے معافی ایسے اعمال کی بنا پر ملتی ہے جو بارگاہ ربانی میں مقبول ہوں۔اکثر لوگ نیکیوں کے بجالانے میں کوتاہی کے مرتکب ہوتے ہیں؛ یہاں تک کہ نماز پڑھنے میں بھی کوتاہی کرتے ہیں۔وہ خوش نصیب آدمی ہوگا جس کی آدھی نماز قبولیت سے مشرف ہو۔اندریں صورت کچھ گناہ مقبول نمازوں سے معاف ہو جائیں گے اور جو بچیں گے وہ جمعہ ورمضان سے معاف ہوں گے۔معافی کا امکان صغائر و کبائر دونوں قسم کے گناہوں میں ہے۔

ایک ہی قسم کا عمل کبھی انسان پوری طریقہ سے ادا کرتا ہے؛اس میں کامل اخلاص اور عبودیت ہوتی ہے؛ تو اللہ تعالیٰ اس کی وجہ سے کبیرہ گناہ بھی معاف فرمادیتے ہیں۔

ترمذی اور ابن ماجہ میں سیدنا عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت کیا گیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''بروز قیامت میری امت کے ایک شخص کو لوگوں کے روبرو پکارا جائے گا۔اس کے سامنے ننانوے رجسٹر کھول کر رکھ دیے جائیں گے جن میں اس کے اعمال قبیحہ درج ہوں گے، ہر رجسٹر وہاں تک پھیلا ہوا ہوگا جہاں تک نظر پہنچے۔اس سے کہا جائے گا۔ان میں جو اعمال مندرج ہیں کیا تم ان میں سے کسی کے منکر ہو؟ وہ کہے گا،نہیں،اے میرے رب! پھر اللہ تعالیٰ فرمائیں گے:تم پرظلم نہیں کیا جائے گا، پھر کاغذ کا ایک ٹکڑا ہتھیلی کے برابر لایا جائے گا جس میں'' لا الہ الا اللہ'' تحریر ہوگا۔وہ شخص کہے گا، کاغذ کا یہ پرزہ ان رجسٹروں کے مقابلہ میں کیا حیثیت رکھتا ہے؟ چنانچہ یہ پرزہ ایک پلڑے

---

[1] سنن ابی داؤد۔ کتاب الصلاۃ، باب ما جاء فی نقصان الصلاۃ، (حدیث:۷۹۶)

[2] سنن ابوداد:ج ۲ ، ح ۷۵۰۔

میں اور وہ رجسٹر دوسرے پلڑے میں رکھے جائیں گے۔ کاغذ کے پرزے والا پلڑا جھک جائے گا اور رجسٹروں والا پلڑا اوپر کو اٹھ جائے گا۔'' ❶

اس میں مذکور ہے کہ اس کا عمل سب گناہوں پر چھا جائے گا، یہ اس شخص کا حال ہے جس کے اعمال صدق و اخلاص اور عجز و انکسار کے آئینہ دار ہوں، ورنہ اہل کبائر جو دوزخ میں داخل ہوں گے وہ سبھی کلمہ گو ہوں گے۔ ابو ہریرہ سے روایت ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''ایک آدمی چل رہا تھا، اسی دوران میں اسے پیاس لگی وہ ایک کنویں میں اترا اور اس سے پانی پیا، کنویں سے باہر نکلا تو دیکھا کہ ایک کتا ہانپ رہا ہے اور پیاس کی وجہ سے کیچڑ چاٹ رہا ہے، اس نے کہا کہ اس کو بھی ویسی ہی پیاس لگی ہوگی جیسی مجھے لگی تھی، چنانچہ اس نے اپنا موزہ پانی سے بھرا پھر اس کو منہ سے پکڑا پھر اوپر چڑھا اور کتے کو پانی پلایا اللہ نے اس کی نیکی قبول کی، اور اس کو بخش دیا۔'' [صحیح بخاری:ج۱: ح۲۲۲۵]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ:

''ایک کتا ایک کنویں کے گرد گھوم رہا تھا معلوم ہوتا تھا کہ پیاس سے مر جائے گا اتفاق سے کسی بدکار اسرائیلی عورت نے اس کتے کو دیکھ لیا اور اس زانیہ نے اپنا جوتا اتار کر کنویں سے پانی نکال کر اس کتے کو پانی پلا دیا جس سے اللہ تعالی نے اس کو اسی بات پر بخش دیا۔'' ❷

اور صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ:

''ایک آدمی راستے میں جا رہا تھا کہ اس نے راہ میں کانٹا پڑا ہوا دیکھا تو اسے ہٹا دیا' اور اللہ تعالیٰ نے اس کی نیکی قبول کی اور اس کی مغفرت کر دی۔'' [صحیح بخاری:۱/ ۱۲۸؛ مسلم۳/ ۱۵۲۱]

عبداللہ بن عمر سے روایت ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''ایک عورت ایک بلی کے متعلق عذاب میں مبتلا کی گئی جسے اس نے باندھ رکھا تھا یہاں تک کہ وہ بھوک کے سبب سے مر گئی، چنانچہ وہ عورت دوزخ میں داخل ہوگئی، اور آپ نے فرمایا کہ اللہ زیادہ جانتا ہے کہ تو نے نہ اسے کھانا کھلایا اور نہ پانی پلایا، جب کہ تو نے اسے باندھ رکھا تھا اور نہ تو نے اسے چھوڑ دیا کہ زمین کے کیڑے مکوڑے کھا کر گزارہ کرتی؛ یہاں تک کہ وہ بلی مر گئی۔'' [صحیح بخاری:جلد اول:حدیث نمبر۲۲۲۷]

پہلی عورت نے کتے کو اخلاص قلب اور ایمان ویقین کے ساتھ پانی پلایا تو اللہ تعالیٰ نے اس کی مغفرت کر دی۔ ورنہ ایسے نہیں ہے کہ جو بھی زانیہ عورت کتے کو پانی پلائے اس کی مغفرت کر دی جائے گی۔ اور ایسے ہی جس آدمی نے راستہ سے کانٹا ہٹایا؛ اس نے یہ کام اخلاص اور ایمان کی بنیاد پر کیا۔ ایمان اور اخلاص اس کے دل میں موجود تھے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس وجہ سے اس کی بھی مغفرت کر دی۔ پس اس سے ظاہر ہوا کہ دل میں موجود اخلاص وایمان کی بنا پر اعمال کا تفاضل ہوتا ہے۔ یہ

❶ سنن ترمذی کتاب الایمان ، باب ما جاء فیمن یموت و هو یشهد ان لا اله الا الله (حدیث:۴۳۰۰)، سنن ابن ماجة کتاب الزهد، باب ما یرجی من رحمة الله یوم القیامة(حدیث:۴۳۰۰)

❷ صحیح بخاری ، کتاب احادیث الانبیاء ، باب(۵٤)، (حدیث:۳٤٦۷)، صحیح مسلم ، کتاب السلام ، باب فضل سقی البهائم المحترمة(حدیث:۲۲٤۵)۔

امر بھی قابل غور ہے کہ دو آدمی نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں اور ان کی نمازوں میں اتنا فرق ہوتا ہے جتنا کہ فاصلہ مشرق و مغرب میں پایا جاتا ہے۔ایسا بھی نہیں ہے کہ راستہ سے ہر کانٹا ہٹا دینے والے کی مغفرت کر دی کجائے گی۔

نبی کریم ﷺ کا ارشادگرامی ہے:

''اگر تم میں سے کوئی شخص احد پہاڑ جتنا سونا بھی خرچ کرے تو وہ صحابہ کے عشر عشیر کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔''

ابوبکر بن عیاش فرماتے ہیں: حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حصہ میں جو فضیلت آئی وہ کثرت صوم وصلوٰۃ کی وجہ سے نہیں، بلکہ اس (صدق وخلوص) کی وجہ سے حاصل ہوئی جو آپ کے دل میں جاگزیں تھا۔''

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے اپنا سر آسمان کی طرف اٹھا کر فرمایا:

''ستارے آسمان کے لیے باعث امن ہیں جب ستارے رخصت ہو جائیں گے تو آسمان سے جس چیز کا وعدہ کیا گیا ہے وہ پورا کر دیا جائے گا۔اسی طرح میری ذات صحابہ کے لیے باعث امن وسکون ہے جب میں نہیں ہوں گا تو صحابہ موعود مصائب سے دوچار ہو جائیں گے۔میرے صحابہ میری امت کے لیے باعث امن ہے جب میرے صحابہ رخصت ہو جائیں گے تو امن وامان اٹھ جائے گا۔''[صحیح مسلم، ح:۲۵۳۱]

احادیث صحیحہ میں آیا ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

''لوگوں پر ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ ایک جماعت مصروف جنگ ہوگی۔ان سے دریافت کیا جائے گا، کیا تم میں کوئی صحابی ہے؟ وہ کہیں گے''ہاں'' چنانچہ انھیں فتح نصیب ہوگی۔پھر ایک ایسا زمانہ آئے گا کہ لوگوں کی ایک جماعت جنگ کر رہی ہوگی۔اس سے پوچھا جائے گا کیا تم میں کوئی ایسا شخص موجود ہے جس نے کسی صحابی کو دیکھا ہو؟ کہیں گے:'' ہاں'' چنانچہ ان کو فتح حاصل ہوگی۔پھر ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ ایک جماعت مصروف پیکار ہوگی۔اس سے پوچھا جائے گا کیا تم میں سے کسی نے کسی تابعی کو دیکھا ہے؟ کہیں گے:''ہاں'' چنانچہ وہ فتح ونصرت سے ہم کنار ہوں گے۔[1]

حدیث ہذا کے تمام طرق میں تینوں طبقات (صحابہ تابعین، تبع تابعین) کا ذکر کیا گیا ہے۔چوتھے طبقے کا ذکر بعض روایات میں ملتا ہے۔[2] متعدد روایات صحیحہ میں آیا ہے کہ آپ نے قرون ثلاثہ کی مدح وستائش فرمائی۔[3]

مقصود یہ ہے کہ اعمال کی فضیلت کا انحصار ان کی ظاہری صورت پر نہیں، بلکہ ان کی روحانی کیفیت پر ہے جو کہ دل میں پنہاں ہوتی ہے۔ظاہر ہے کہ اس میں بڑا فرق وامتیاز پایا جاتا ہے۔اس سے ان علماء نے احتجاج کیا ہے جو کہتے ہیں کہ ہر صحابی بعد میں آنے والے ہر شخص سے افضل ہے۔جمہور علماء اس مسئلہ میں متحد الخیال ہیں کہ جملہ صحابہ جملہ تابعین سے افضل ہیں، البتہ اس بات میں اختلاف پایا جاتا ہے کہ آیا ہر صحابی ہر تابعی سے افضل ہے یا نہیں؟ اسی قاعدہ کے مطابق کیا حضرت معاویہ عمر رضی اللہ عنہ بن عبدالعزیز سے افضل ہیں یا نہیں؟

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الجهاد۔ باب من استعان بالضعفاء والصالحين في الحرب (حدیث:۲۸۹۷)، صحيح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب فضل الصحابة ثم الذين يلونهم (حدیث:۲۵۳۲)

[2] صحیح مسلم، حواله سابق(حدیث:۲۰۹/ ۲۵۳۲)

[3] صحیح بخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ، باب فضائل أصحاب النبی ﷺ(ح:۳۶۵۰، ۳۶۵۱)، صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب فضل الصحابة ثم الذين يلونهم(ح: ۲۵۳۳۔ ۲۵۳۵)۔

قاضی عیاض وغیرہ ۔نے اس مسئلہ میں دو قول ذکر کیے ہیں۔ اکثر علماء صحابہ کے ہر فرد کو ہر تابعی سے افضل قرار دیتے ہیں۔حضرت عبداللہ بن مبارک اور احمد بن حنبل سے یہی منقول ہے۔ان کی دلیل یہ ہے کہ اگر چہ تابعین کے اعمال صالحہ صحابہ کے مقابلہ میں زیادہ ہیں۔ اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ بن عبدالعزیز امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے زہد و عدل میں بڑھ کر تھے۔مگر فضیلت کا انحصار حقیقت ایمان پر ہے جو کہ ایک قلبی چیز ہے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

''اگر تم میں سے کوئی شخص احد پہاڑ جتنا سونا بھی خرچ کرے تو صحابہ کے عشر عشیر کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔[سبق تخريجه]

اس نظریہ کے حامل علماء یہ کہتے ہیں کہ بلا شبہ بعض تابعین کے اعمال صحابہ سے بڑھ کر تھے،مگر ہم یہ کیسے معلوم کر سکتے ہیں کہ ان کا ایمان بھی صحابہ کے ایمان پر فائق تھا۔اس حدیث میں نبی کریم نے فرمایا کہ متاخرین جو صلح حدیبیہ کے بعد اسلام لائے اگر سونے کا پہاڑ بھی خرچ کریں تو اوّلین صحابہ کے نصف مد (ایک عربی پیمانہ جو کہ قریباً گیارہ چھٹانک کا ہوتا ہے) کے برابر بھی نہیں ہوسکتا۔

اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بن عبدالعزیز نے لوگوں کے حقوق ادا کیے اور عدل وانصاف کے تقاضوں کو پورا کیا۔اگر فرض کیا جائے کہ آپ نے لوگوں کو جو کچھ دیا وہ آپ کی ملکیت تھا اور آپ نے صدقہ کر دیا۔تاہم اس سے صحابہ کے انفاق فی سبیل اللہ کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔اور احد پہاڑ جتنا سونا آئے کہاں سے کہ اسے خرچ کیا جا سکے؟ پھر جب کہ بفرض محال اسے خرچ بھی کیا جائے تو بقول نبی کریم وہ نصف مد کے برابر بھی نہ ہوگا۔

علماء سلف میں سے بعض کا قول ہے کہ:''سرور کائنات ﷺ کی رفاقت میں جو غبار حضرت معاویہ کی ناک میں داخل ہوا وہ عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے سب اعمال سے افضل ہے۔''

چوتھا سبب: مؤمنین کی دعا: میت پر مسلمانوں کا نماز جنازہ پڑھنا؛ اور اس کے لیے مغفرت کی دعا کرنا گناہ بخشے جانے کے اسباب میں سے ایک ہے۔ایسے ہی نماز جنازہ کے علاوہ دعا کرنا اور اس میت کے لیے استغفار کرنا بھی مغفرت کے اسباب میں سے ہے۔صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے لوگ آج تک دعا کرتے چلے آرہے ہیں۔

پانچواں سبب: نبی کریم ﷺ کی دعا اور استغفار: (اپنی زندگی میں اور موت کے بعد): جیسا کہ روز قیامت نبی کریم ﷺ کی شفاعت؛ اس لیے کہ آپ کی دعا اور شفاعت آپکی حیات و ممات میں سب سے خاص ہے۔

چھٹا سبب: نیک اعمال کا ھدیہ: مثال کے طور پر میت کی طرف سے صدقہ کرنا؛اس کی طرف سے حج کرے' اور روزے رکھے۔حدیث میں یہ ثابت ہے کہ ان اعمال کا ثواب میت کو پہنچتا ہے' اور اس سے انہیں فائدہ ہوتا ہے۔ یہ اولاد کی دعا کے علاوہ ہے۔اس لیے کہ اولاد خود انسان کے اعمال میں شمار ہوتی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''جب انسان مر جاتا ہے تو تین اعمال کے علاوہ تمام اعمال منقطع ہو جاتے ہیں صدقہ جاریہ یا وہ علم جس سے نفع اٹھایا جائے یا نیک اولاد جو اس کے لیے دعا کرتی رہے۔''[صحيح مسلم:٤/ ١٩٩٢١ والترمذي ٢/ ٢٢٠۔]

انسان کی اولاد بھی اس کی کمائی میں سے ہے۔ان کی دعا اس انسان کے اعمال میں شمار ہوتی ہے۔بخلاف اولاد کے علاوہ دوسرے لوگوں کی دعا کے۔اس کا شمار اس کے اپنے اعمال میں تو نہیں ہوتا؛ لیکن اللہ تعالیٰ اس سے نفع دیتا ہے۔

ساتواں سبب: دنیاوی مصائب: جن سے اللہ تعالیٰ گناہوں کو ختم کر دیتے ہیں۔صحیح حدیث میں ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کسی مومن آدمی کو جب بھی کوئی تکلیف یا ایذا یا کوئی بیماری یا رنج یہاں تک کہ اگر اسے کوئی فکر ہی ہو یا اگر کوئی کانٹا چبھتا ہے تو اللہ اس کے بدلہ میں اس کا ایک گناہ مٹا دیتا ہے۔'' [صحیح مسلم:ج۳:ح ۲۰٦٤]

[حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے فضائل]:

یہ سبھی کو معلوم ہے نبی کریم ﷺ کے بعد افضل ترین زمانہ خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم اجمعین کا زمانہ تھا۔ان کے بعد مسلمان بادشاہوں کے زمانوں میں امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانہ سے بڑھ کر بہتر زمانہ کسی کا بھی نہیں دیکھا گیا۔اور نہ ہی کسی بادشاہ کے زمانہ میں مسلمانوں کی حالت اتنی بہتر اور اچھی رہی ہے جیسے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں تھی۔یہ اس وقت ہوگا جب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور کا مقابلہ بعد میں آنے والوں کے ادوار سے کیا جائے۔اور اگر اس دور کا مقابلہ پہلے کے زمانوں سے کیا جائے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے زمانے کی فضیلت ظاہر اور غالب ہے۔

ابوبکر الاثرم رحمہ اللہ نے قتادہ رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے آپ فرماتے ہیں: ''اگر تم حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ جیسے کام کرنے لگو تو لوگ پکار اٹھیں یہ مہدی ہے۔'' حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اگر تم امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا زمانہ پالیتے تو کہتے: یہ مہدی ہے۔''

احمد بن جواس کہتے ہیں مجھے ابو ہریرہ المکتب نے بتایا کہ اعمش رحمہ اللہ کے ہاں عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ اور ان کے عدل وانصاف کا ذکر چل پڑا تو اعمش نے کہا: ''اگر تم حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا عہد خلافت دیکھ لیتے تو پھر کیا ہوتا؟ لوگوں نے کہا: ''کیا آپ معاویہ کی بردباری کے بارے میں کہہ رہے ہیں؟'' اعمش نے کہا: ''نہیں اللہ کی قسم! میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عدل کی بات کر رہا ہوں۔''

ابوبکر ابن عیاش رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ابو اسحٰق رحمہ اللہ سے روایت ہے آپ کہتے ہیں: جب حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ تو لوگوں کے لیے ان کے باپ دادا کے حساب سے عطیات دینے شروع کیے؛ جب میری باری آئی تو مجھے تین سو درہم ملے۔''

ابو اسحٰق السبیعی رحمہ اللہ کے سامنے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا ذکر کیا گیا تو آپ نے فرمایا: ''اگر تم ان کا دور پالیتے؛ یا فرمایا: تم انہیں پالیتے تو کہتے یقیناً یہی مہدی ہے۔'' نیز آپ یہ بھی فرماتے ہیں: ''میں نے معاویہ کے بعد کوئی آپ جیسا نہیں دیکھا۔''

امام بغوی نے اپنی سند سے ابو قیس سے روایت کیا ہے: آپ فرماتے ہیں: ''امیر معاویہ نے ہر قبیلہ پر ایک آدمی مقرر کیا ہوا تھا۔ہم میں ایک آدمی تھا جس کی کنیت ابو یحییٰ تھی۔وہ ہر دن صبح کے وقت مجالس کا چکر لگاتا؛ اور پوچھتا: کیا کسی کے گھر بچہ پیدا ہوا ہے؟ کیا آج رات کوئی واقعہ پیش آیا ہے؟ کیا آج تمہارے ہاں کوئی نیا آدمی آیا؟ تو لوگ کہتے: ہاں آج رات یمن سے ایک آدمی اپنے اہل وعیال کے ساتھ آیا ہے؛ پھر اس کا اور اس کے عیال کا نام لیتے۔جب یہ نگران اس مہم سے فارغ ہو جاتا تو وظائف کا رجسٹر لایا جاتا؛ اور ان لوگوں کے نام اس میں لکھ دیئے جاتے۔

عطیہ بن قیس فرماتے ہیں: میں معاویہ بن ابو سفیان کو سنا' وہ ہمیں خطبہ دے رہے تھے؛ آپ کہہ رہے تھے:
''تم لوگوں کے وظائف دینے کے بعد بھی بیت المال میں کچھ مال بچ گیا ہے۔بیشک میں وہ مال تمہارے درمیان تقسیم کرنے والا ہوں۔اگر آئندہ سال بھی ایسے ہی زیادہ مال آ گیا تو میں آپ لوگوں میں تقسیم کردوں گا۔اور اگر ایسا نہ ہوا تو

مجھ پر کوئی عیب نہ لگانا۔ بیشک یہ میرا مال نہیں ہے۔ بیشک یہ وہ مال ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے آپ لوگوں کو نوازا ہے۔''

سیرت و کردار اور عدل و احسان کے اعتبار سے حضرت معاویہ کا دامن ایسے فضائل و مناقب سے پر ہے۔

حدیث صحیح میں آیا ہے کہ ایک شخص نے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے عرض کیا۔ امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ ایک رکعت وتر پڑھتے ہیں۔ اس مسئلہ میں آپ کی کیا رائے ہے؟ حضرت ابن عباس نے کہا: معاویہ نے ٹھیک کیا، وہ فقیہ ہیں۔''❶

حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ کا قول ہے:'' میں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر کسی شخص کو نہیں دیکھا جس کی نماز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت زیادہ ملتی جلتی ہو۔''❷

یہ ہے حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کی شہادت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے تدین و تفقہ کے بارے میں! فقاہت معاویہ رضی اللہ عنہ کے گواہ ابن عباس رضی اللہ عنہما ہیں، اور حسن صلوٰۃ کی گواہی دینے والے حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ، دونوں جس پایہ کے صحابی ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔اس کے موید آثار اور بھی بہت ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سابقین اوّلین صحابہ میں شمار نہیں ہوتے۔ بخلاف ازیں کہا گیا ہے کہ آپ فتح مکہ کے موقع پر اسلام لائے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ آپ فتح مکہ سے پہلے مسلمان ہو چکے تھے۔ حضرت معاویہ خود اس بات کے معترف تھے کہ وہ فضلاء صحابہ میں شامل نہیں ہیں۔ اس کے باوصف آپ کثیر اوصاف کے حامل تھے۔ آپ کی سلطنت حدود خراُسان سے لے کر مغرب میں بلاد افریقہ اور قبرص سے لے کر یمن تک پھیلی ہوئی تھی، اس بات پر سب مسلمانوں کا اجماع ہے کہ معاویہ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہ تو درکنار عظمت و فضیلت میں حضرت عثمان و علی کے قریب بھی نہ تھے۔ پھر کسی اور بادشاہ کو ان کے مشابہ کیوں کر قرار دیا جا سکتا ہے؟ نیز مسلم سلاطین میں سے کوئی مسلم سلطان سیرت و کردار کے اعتبار سے حضرت معاویہ کا حریف کیسے ہو سکے گا؟

یہاں پر مقصود یہ بیان کرنا ہے کہ امت میں جو فتنے پیدا ہوئے اور جو گناہ سرزد ہوئے ان سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو کہیں بہت دور کا اور بہت کم ہی واسطہ ہوگا۔لیکن اس کے ساتھ ہی گناہوں کا کفارہ بننے والے امور و اعمال موجود ہیں ۔ جب کہ جمہور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم افاضل لوگ ہیں ۔ اور ان کی اکثریت فتنوں میں شریک نہیں ہوئی۔

اکابر صحابہ نے فتنہ پردازی میں حصہ نہیں لیا تھا ایوب سجستانی رحمہ اللہ ابن سیرین سے نقل کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا: جب فتنہ کی آگ بھڑکی تو اس وقت دس ہزار صحابہ بقید حیات تھے، مگر سو صحابہ نے بھی فتنہ پردازی میں شرکت نہ کی، بلکہ بالفاظ صحیح تر تیس صحابہ بھی اس میں شریک نہیں ہوئے۔ یہ ابن سیرین کا قول ہے جو زہد و ورع کی وجہ سے بڑی محتاط گفتگو کرنے کے خوگر تھے۔ منصور بن عبدالرحمان نے کہا کہ امام شعبی کا قول ہے:

''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے جنگ جمل میں صرف حضرت علی، عمار، طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہم اجمعین شامل ہوئے، اگر کوئی شخص پانچویں صحابی کا نام بتا دے تو میں کاذب ٹھہروں گا۔'' امام شعبی رحمہ اللہ کا مطلب سابقین مہاجرین صحابہ کا ذکر کرنا تھا۔

عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:'' جنگ صفین میں ستر بدری صحابہ رضی اللہ عنہم نے شرکت کی تھی۔''

جب شیعہ نے یہ بات سنی تو انھوں نے کہا اللہ کی قسم! یہ جھوٹ ہے، صرف خزیمہ بن ثابت نے صفین میں شرکت کی تھی۔

---

❶ صحیح بخاری، باب ذکر معاویۃ رضی اللہ عنہ (حدیث:۳۷٦۵) ❷ طبرانی کما فی المجمع (۳۵۷/۹)۔

امام ذہبی فرماتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جمل و صفین میں بہت تھوڑے صحابہ شامل ہوئے تھے۔

آٹھواں سبب: فتنہ قبر: جن اسباب کی بنا پر ایک مومن عذاب دوزخ سے نجات پائے گا۔ ان میں وہ تکلیف بھی شامل ہے جو مومن قبر میں اٹھائے گا۔ نیز منکر و نکیر کا سوال کرنا اور روز محشر کا درد و کرب سب اس میں داخل ہے۔

نواں سبب: محشر کي سختياں: میدان محشر کے خوف اور سختیوں کی وجہ سے بھی لوگوں کے گناہ معاف کیے جائیں گے۔

دسواں سبب: پل صراط کا عبور: بخاری و مسلم میں مروی ہے کہ مومن جب پل صراط سے گزریں گے تو جنت و جہنم کے درمیان انھیں ایک پل پر ٹھہرا لیا جائے گا، جہاں وہ ایک دوسرے سے بدلہ لینے کے بعد پاک صاف ہو کر جنت میں جا داخل ہوں گے۔ ❶

یہ ایسے امور ہیں جو شاذ و نادر ہی مسلمانوں کی نگاہوں سے اوجھل ہوتے ہیں، پھر صحابہ خیر القرون کے مصداق ہونے کے باوجود انھیں کیوں کر نظر انداز کر سکتے ہیں۔ یہ ان گناہوں کے بارے میں جو حقیقت میں سرزد ہوئے ہوں۔ پھر ان کا کیا کہنا ہوگا جو آپ کے ذمہ جھوٹ موٹ لگا دیئے گئے ہوں؟ یا وہ امور جو حقیقت میں تو نیکیاں اور اچھائیاں ہیں' مگر جان بوجھ بدل کر برائیوں کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے؟

یہ صحیح روایت ہے کہ ایک شخص نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی موجودگی میں حضرت عثمان پر تنقید کی اور کہا کہ وہ جنگ احد میں بھاگ گئے تھے؛ بدر میں شریک نہیں ہوئے تھے۔ اور بیعت رضوان میں شرکت نہیں کی تھی۔ یہ سن کر ابن عمر رضی اللہ عنہ نے کہا:

''احد میں بھاگ جانے پر اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ لغزش معاف کردی تھی۔ ایک روایت میں ہے:' آپ نے فرمایا:

وہ احد کے دن بھاگے اللہ تعالیٰ نے یہ لغزش معاف کر دی؛ مگر تم اسے گناہ سمجھ کر ابھی تک معاف نہیں کر رہے ہو۔ جب کہ بدر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اپنی بیٹی کی تیمار داری کے لیے پیچھے چھوڑ دیا اور مال غنیمت میں سے ان کو حصہ بھی دیا تھا۔ جب کہ بیعت رضوان حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہی کی وجہ سے عمل میں آئی تھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی جگہ بیعت کرتے وقت اپنا ہاتھ استعمال کیا تھا اور آپ کا ہاتھ عثمان رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے بہتر تھا۔ ❷

[معائب صحابہ حسد یا کذب پر مبنی]:

[حضرات صحابہ پر وارد کیے جانے والے عام اعتراضات یا تو بغض و حسد کے آئینہ دار ہیں یا کذب و دروغ گوئی پر مبنی ہیں]۔

[اعتراض]: شیعہ مصنف کا یہ قول کہ ''حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے نا اہل لوگوں کو عہدے عطا کیے تھے۔''

[جواب]: اس کے جواب کی دو صورتیں ہیں:

پہلا جواب یہ ہے کہ یہ دعوے ہی سرے سے باطل ہے۔ اس لیے کہ آپ نے صرف وہی لوگ مناصب پر تعینات کیے تھے جو ان کے اہل تھے۔ [کسی نا اہل کو ہرگز کوئی منصب نہیں دیا]۔

دوسرا جواب: یہ ہے کہ [بالفرض اگر مان لیا جائے کہ] آپ نے نا اہل لوگوں کو منصب عطا کیے تھے۔ تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ

---

❶ صحیح بخاری ، کتاب الرقاق ، باب القصاص ، یوم القیامة ، (حدیث:٦٥٣٥)

❷ صحیح بخاری ، کتاب فضائل اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم ، باب مناقب عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ (حدیث:٣٦٩٩)

ایسا کرنے میں ایک مجتہد کی حیثیت رکھتے تھے۔ان سے اجتہادی غلطی سرزد ہوئی۔آپ یہ خیال کرتے ہوں گے کہ یہ انسان اس منصب کا اہل مگر حقیقت میں وہ اس کا اہل نہ ہوا ہو۔[یہ ایسی غلطی ہے جو اللہ تعالیٰ نے معاف کردی] ۔تو پھر ایسی بات آپ کی شان میں قدح کا موجب نہیں ہوسکتی۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ تفسیر و حدیث اور سیرت کی کتابوں میں یہ واقعہ بڑا مشہور ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ولید بن عقبہ بن معیط کو کچھ قبائل سے صدقات لینے کے لیے والی مقرر فرمایا۔ جب یہ ان کی بستی کے قریب پہنچا تو وہ لوگ اس کے استقبال کے لیے نکلے ؛[چونکہ ان کے مابین کچھ پرانی رنجشیں تھیں ؛اس وجہ سے یہ غلط سمجھا] اس نے سوچا یہ لوگ مجھ سے لڑنا چاہتے ہیں ۔اور اس نے رسول اللہ ﷺ کے پاس پیغام بھیجا کہ وہ لوگ تو جنگ کرنے پر اتر آئے ہیں ۔رسول اللہ ﷺ نے اس قبیلہ کی سرکوبی کے لیے لشکر روانہ کرنے کا ارادہ فرمایا؛ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

﴿یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوْا اَنْ تُصِیْبُوْا قَوْمًۢا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِیْنَ﴾ [الحجرات ٦]

''اے مسلمانو! اگر تمہیں کوئی نا قابل اعتماد آدمی کوئی خبر دے تو تم اس کی اچھی طرح تحقیق کرلیا کرو ایسا نہ ہو کہ نادانی میں کسی قوم کو ایذا پہنچادو پھر اپنے لئے پریشانی اٹھاؤ۔''

اگر ایک عامل کا حال نبی کریم ﷺ پر مخفی رہ سکتا ہے تو پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر کیسے مخفی نہیں رہ سکتا۔

اگر یہ کہا جائے کہ عثمان رضی اللہ عنہ نے اس کے بعد بھی ایسے لوگ تعینات کیے؟

تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ: توبہ کا دروازہ کھلا ہے۔اس کی مثال یہ ہے کہ عبد اللہ بن سعد رضی اللہ عنہ مرتد ہو گیا تھا، پھر مسلمان ہوکر بارگاہ نبوی میں حاضر ہوا، تو آپ نے اس کی معذرت قبول کی حالانکہ آپ نے اسے مباح الدم قرار دیا تھا۔مزید یہ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھی اس سے سابقہ پڑا تھا اور عمال کی ایسی حرکات ان کے علم میں آئیں جن کی آپ کو توقع نہ تھی۔ایسی باتیں نہ ہی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شان میں موجب طعن ہیں اور نہ ہی کسی دوسرے کی شان میں۔اس باب میں زیادہ سے زیادہ یہی کہا جاسکتا ہے کہ: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ علم ہونے کے باوجود کہ دوسرے افراد اس کام کے لیے زیادہ مناسب ہیں' پھر بھی انہی کو تعینات کیا۔تو یہ مسئلہ اصل میں اجتہاد کے باب سے تعلق رکھتا ہے۔

اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ:'' آپ کے اقارب کی محبت نے آپ کو ان کی طرف مائل کردیا تھا؛ یہاں تک کہ آپ ان لوگوں کو دوسرے لوگوں کی نسبت سے زیادہ حق دار سمجھنے لگے۔یا پھر یہ کہا جاسکتا ہے کہ جو کچھ آپ نے کیا؛ وہ گناہ کا کام تھا۔''

اس سے پہلے یہ بیان گزر چکا ہے کہ آپ کے گناہوں پر آخرت میں مؤاخذہ نہیں کیا جائے گا۔

[اعتراض]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:'' آپ کے بعض عمال سے فسق و فجور کے کام سرزد ہوئے اور بعض نے خیانت کی۔''

[جواب] :اس سے کہا جائے گا کہ: ولایت مل جانے کے بعد کسی چیز کا ظاہر ہونا اس بات کی دلیل نہیں ہوسکتا کہ یہ مرض اس سے پہلے بھی موجود تھا۔اور نہ ہی یہ لازم آتا ہے کہ آپ نے یہ علم ہونے کے بعد انہیں ولایت پر تعینات کیا تھا۔ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو علم ہوا کہ ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ نے شراب پی ہے' تو آپ نے اسے بلا کر اس پر حد قائم کی۔اور آپ ان لوگوں کو معزول بھی کیا کرتے تھے جنہیں معزول کرنے کا مستحق سمجھا کرتے تھے۔اور جسے حد کا مستحق سمجھتے تھے اس پر حد بھی

قائم کیا کرتے تھے۔

[اعتراض]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ''حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے اقارب میں مال تقسیم کیا تھا۔''

[جواب]: ہم کہتے ہیں کہ حد سے زیادہ یہ گناہ ہوسکتا ہے؛ پھر یہ ایسا گناہ نہیں جس پر آخرت میں سزا دی جائے۔ اسے ایک اجتہادی غلطی بھی قرار دے سکتے ہیں۔ کیونکہ یہ ایک اجتہادی مسئلہ ہے۔

یہ مسئلہ علماء کے یہاں مختلف فیہا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی زندگی میں جن اختیارات سے بہرہ ور تھے۔ آپ کے امام و خلیفہ کو وہ اختیارات حاصل ہوں گے یا نہیں؟ اس میں علماء کے دو قول ہیں۔ اور ایسے ہی اس مسئلہ میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے کہ جب یتیم کا ولی دولت مند ہو تو کیا وہ یتیم کے مال میں سے اپنی اجرت وصول کرسکتا ہے یا نہیں؟ نیز یہ کہ آیا اجرت کا ترک کرنا واجب ہے یا افضل؟ جو علماء تونگری کے باوجود یتیم کے مال میں سے اجرت لینے کو جائز تصور کرتے ہیں، ان کے نزدیک امام و خلیفہ بھی بیت المال میں سے اپنی اجرت وصول کرسکتا ہے۔ اسی طرح قاضی و حاکم کو بھی یہ حق حاصل ہے۔

اور جو علماء یتیم کے مال میں سے اجرت وصول کرنے کو ناروا تصور کرتے ہیں، ان میں سے بعض بیت المال میں سے اپنی اجرت لینے کو جائز قرار دیتے ہیں، جس طرح زکوۃ وصول کرنے والا تونگری کے باوجود اس میں سے اپنی اجرت لینے کا مجاز ہے۔ یتیم کے ولی کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ مَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ وَ مَنْ كَانَ فَقِيرًا فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوفِ﴾ (النساء: ٦)

''جو دولت مند ہو وہ اس سے پرہیز کرے اور جو تنگ دست ہو وہ حسب دستور اس میں سے کھا لیا کرے۔''

بعض فقہاء نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ اقارب کا حصہ خلیفہ و امام کے رشتہ داروں کو ملے گا۔ حضرت حسن [بصری] اور ابوثور رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اقارب کو بحکم ولایت عطیہ جات دیا کرتے تھے۔ اکثر علماء کے نزدیک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے آپ کے اقارب کا حق ساقط ہوگیا۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا نظریہ یہی ہے۔

جب آپ کا حق ساقط ہوگیا تو اب اس ساقط شدہ حق کے متعلق علماء کی ایک جماعت یہ نظریہ رکھتی ہے کہ اس سے گھوڑے اور دیگر سامان حرب خریدنے پر خرچ کیا جائے؛ اور مصلحت کے امور پر خرچ کیا جائے۔ جیسا کہ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما اسی پر عمل فرماتے تھے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ: اس حق پر اب آپ کے بعد خلیفہ کا حق ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اسی تاویل سے کام لیا تھا، ان سے منقول ہے کہ آپ نے خود اس کا ذکر کیا تھا کہ وہ اپنے کام کی اجرت لے لیا کرتے تھے، اور ایسا کرنا آپ کے لیے جائز تھا۔ اگرچہ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کا طرز عمل بلاشبہ افضل تھا۔ تاہم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ دونوں باتوں پر عمل کرنے کے مجاز تھے۔ اور جو مال آپ کے لیے مخصوص ہوا کرتا تھا اس میں سے اپنے اقارب کو دیا کرتے تھے۔

وہ اپنے اقارب کو اس خیال سے عطیہ جات دیا کرتے تھے کہ وہ بقول مجوزین امام و خلیفہ کے اقارب تھے۔

خلاصہ کلام! جو لوگ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بعد منصب خلافت پر فائز ہوئے وہ اپنے اقارب کو مال دیا کرتے تھے یا ان کو مناصب جلیلہ پر فائز کیا کرتے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی اپنے اقارب کو بعض علاقوں کا والی مقرر کیا تھا۔

[اعتراض]: شیعہ مصنف کا یہ قول کہ: ''ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کو عامل مقرر کیا اس نے نشہ کی حالت میں نماز پڑھائی۔

[جواب]: اس میں کوئی ملامت والی بات نہیں ۔ کیونکہ جب آپ کو اس چیز کا علم ہوا تو آپ نے ولید بن عقبہ کو بلا بھیجا ؛ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی موجودگی میں ان پر حد قائم کی؛ بلکہ آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ اٹھیے اور انہیں کوڑے لگایئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حسن رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ آپ کوڑے لگائیں مگر انہوں نے بھی ایسا نہیں کیا۔ پھر حضرت عبداللہ بن جعفر سے کہا: آپ اٹھیں اور انہیں کوڑے لگائیں؛ پھر آپ نے انہیں چالیس کوڑے لگائے۔ پھر فرمایا: رک جاؤ۔ رسول اللہ ﷺ نے چالیس کوڑے ہی لگائے تھے؛ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے بھی چالیس کوڑے لگائے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسی کوڑے لگائے؛ ان میں سے ہر ایک سنت ہے؛ مگر یہ عدد میرے نزدیک زیادہ پسندیدہ اور محبوب ہے۔[رواہ مسلم]۔

جب آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے سے اور ان کے سامنے حد قائم کی تو یقیناً آپ نے واجب ادا کردیا۔

[اعتراض]: شیعہ مصنف کا یہ قول کہ ''سعید بن عاص رضی اللہ عنہ کو کوفہ کا والی مقرر کیا اس نے وہاں ایسے کام کیے جن کی بنا پر اسے کوفہ سے نکال دیا گیا۔''

[جواب]: جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ اہل کوفہ نے سعید بن عاص رضی اللہ عنہ کے خلاف خروج کیا اور انھیں کوفہ سے نکال دیا تھا تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ سعید قصوروار بھی ہوں اور آپ کو وہاں سے نکالنا واجب ہو چکا ہو۔ اس لیے کہ اہل کوفہ اپنے امراء کے خلاف ہمیشہ بغاوت و سرکشی کا مظاہرہ کرنے کے خوگر تھے۔ اسی قدیم عادت کے پیش نظر انھوں نے سعید رضی اللہ عنہ سے یہ سلوک روا رکھا حالانکہ آپ نے ہی شہر فتح کئے تھے؛ اور کسری کے لشکروں کی کمر توڑ کر رکھ دی تھی۔ آپ چھ اہل شوری میں سے ایک تھے۔ سعید رضی اللہ عنہ جیسا امیر کوفہ والوں کو نصیب نہیں ہوسکا۔ اہل کوفہ تو ان کے علاوہ دوسرے امراء کی بھی شکایات کرتے رہے ہیں۔ انہوں نے عمار بن یاسر؛ سعد بن ابی وقاص؛ مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہم اجمعین اور دوسرے صحابہ کرام کے ساتھ یہی سلوک کیا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان پر بددعا کی تھی:

''اے اللہ! انہوں نے مجھ پر اس امارت کو ملتبس [خلط ملط] کردیا ہے تو ان پر اس کو ملتبس کردے۔''

اور اگر مان لیا جائے کہ آپ نے کوئی گناہ کا کام کیا تھا۔ تو اس سے کہیں بھی یہ لازم نہیں آتا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اس گناہ پر راضی بھی تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نائبین نے بہت ہی زیادہ گناہ کیے تھے۔ بلکہ رسول اللہ ﷺ کے متعین کردہ نائبین سے کئی غلطیاں سرزد ہوئیں۔ امام تو اس وقت [شریک گناہ یا] گنہگار ہوتا ہے جب وہ اپنا واجب فریضہ چھوڑ دے اور ان پر حد قائم نہ کرے۔ یہ کسی کا حق پورا نہ کرے؛ یا کسی پر ظلم و تعدی کا ارتکاب کرے۔ اور اگر گناہ تسلیم بھی کرلیا جائے تو پھر بھی اس بارے میں تفصیل سے کلام پہلے گزر چکا ہے۔

[عبداللہ بن ابی سرح رضی اللہ عنہ کے نام خط کا مسئلہ]:

[اعتراض]: شیعہ مصنف کا یہ قول کہ: بلاد مصر میں عبداللہ بن ابی سرح رضی اللہ عنہ کو حاکم مقرر کیا جہاں اس نے بہت مظالم

❶ ہم قبل ازیں سعید بن عاص رضی اللہ عنہ کے سیرت و سوانح اور مکارم اخلاق پر روشنی ڈال چکے اور بتا چکے ہیں کہ انھوں نے دعوت اسلام کو فروغ دینے میں کس حد تک مساعی جمیلہ انجام دی تھیں۔ اہل کوفہ کی یہ حالت تھی کہ اگر ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو بھی ان کا امیر بنا دیا جاتا تو ان کے ساتھ وہ وہی سلوک کرتے جو سعید بن عاص رضی اللہ عنہ کے ساتھ روا رکھا تھا۔

ڈھائے۔لوگوں نے جب اسکی شکایت کی تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے پوشیدہ طور پر اسے لکھا کہ وہ اپنے عہدے پر ڈٹا رہے۔ یہ اس کھلے خط کے خلاف تھا جو اس کے نام لکھا گیا تھا۔'' [جس میں اسے معزول کیا گیا تھا]۔

[جواب]: یہ صریح جھوٹ ہے اس لیے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حلف اٹھا کر کہا تھا کہ انھوں نے یہ نہیں لکھا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ یقیناً اپنی قسم میں سچے اور حق پر تھے۔ بلکہ حد سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ مروان نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بتائے بغیر یہ خط لکھ دیا تھا۔ جب انھوں نے مروان کو ان لوگوں کے سپرد کرنے کا مطالبہ کیا تھا تا کہ وہ اسے قتل کر دیں۔ تو آپ نے اس سے انکار کر دیا۔

اگر مروان کا قتل ناروا تھا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنا واجب ادا کر دیا[تو پھر آپ کا یہ اقدام درست ٹھہرا]۔ اور اگر اسے قتل کرنا جائز تھا اور واجب نہ تھا؛ تو آپ نے ایک جائز کام کیا۔ اور اگر وہ واجب القتل تھا؛ تو یہ اجتہادی مسئلہ ہے۔ اس لیے کہ آپ کے ہاں کسی بھی دلیل سے مروان کا شرعاً واجب القتل ہونا ثابت نہیں ہو سکا تھا۔ اس لیے کہ محض جھوٹی باتیں گھڑ لینے سے کوئی واجب القتل نہیں ہو جاتا۔

اور اگر فرض کر لیا جائے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مروان کو قتل نہ کر کے ایک گناہ کا ارتکاب کیا ہے۔ تو ہم اس بارے میں تفصیلی کلام کر چکے ہیں۔ [نیز ہم نے یہ دعویٰ کب کیا ہے کہ عثمان رضی اللہ عنہ گناہوں سے پاک تھے؟ اس میں شبہ نہیں کہ آپ نے بے شمار اچھے کام بھی کیے ہیں۔ مزید برآں آپ بدری صحابہ میں شامل ہیں، جن کی مغفرت کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا ہے]۔

[اعتراض]: شیعہ مصنف کا یہ قول کہ: '' حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے کا حکم دیا تھا۔''

[جواب]: یہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر صریح افتراء پردازی ہے۔ جو شخص حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی سیرت و کردار سے آگاہ ہے، اور وہ ذرا بھر بھی عدل و انصاف سے کام لینے والا ہے تو وہ جانتا ہے کہ یہ کھلا ہوا جھوٹ ہے۔ آپ نے کبھی بھی محمد بن ابو بکر یا ان جیسے کسی بھی دوسرے انسان کو قتل کرنے کا حکم نہیں دیا۔ اور نہ ہی آپ کے بارے میں کبھی یہ ثابت ہو سکا ہے کہ آپ نے کسی ایسی بات پر کسی کو قتل کروایا ہو۔ [بلکہ] لوگ ان کو قتل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کچھ لوگوں کے ساتھ محمد بن ابو بکر رضی اللہ عنہ آپ کے گھر میں داخل ہوئے تھے۔ آپ نے کسی ایک کو بھی اپنی ذات کے دفاع کے لیے لڑنے کا حکم دیا۔ تو پھر آپ ایک معصوم الدم کو بلا وجہ کیوں کر قتل کر سکتے تھے؟

اگر یہ ثابت ہو جائے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اسے قتل کرنے کا حکم دیا تھا؛ تب بھی یہ بات آپ پر موجب طعن نہیں ہو سکتی۔ بلکہ اگر آپ نے محمد بن ابو بکر رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے کا حکم دیا تھا[تو اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ کے شر کا ازالہ کیا جائے۔ لہٰذا امت کی مصلحت کے نقطۂ خیال سے ایسا کیا۔ اور اگر آپ نے ایسا حکم دیا تھا] تو آپ ان لوگوں کی نسبت اطاعت کے زیادہ حق دار تھے جو مروان کو طلب کر رہے تھے تا کہ اسے قتل کیا جائے۔

اس لیے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہدایت کے امام ہیں۔ آپ خلیفہ راشد ہیں۔ اور امت کی مصلحتوں کی رعایت کرتے ہوئے ان کی سیاست کرنا آپ کی ذمہ داری تھی۔ [اور آپ پر]واجب تھا کہ ان لوگوں کو قتل کر دیا جائے جن کے قتل کے بغیر شر و فساد کا خاتمہ ہونا ممکن نہ ہو۔ جب کہ مروان کو قتل کرنے کے لیے طلب کرنے والے کچھ باغی لوگ تھے جن کے پیش نظر زمین میں فساد پھیلانے کے علاوہ کوئی کام نہ تھا۔ نہ ہی انہیں کسی ایک کو قتل کرنے کا اختیار حاصل تھا اور نہ ہی کسی پر حد قائم

کرنے کا اختیار تھا۔ان کی انتہائی غایت یہ ہوسکتی ہے کہ بعض امور میں ان پر ظلم ہوا ہو۔تو کسی بھی مظلوم کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ ظلم کرنے والے کواپنے ہاتھوں سے قتل کردے ۔ بلکہ انہیں تو کسی پر حد قائم کرنے کا بھی اختیار حاصل نہیں۔

مروان محمد بن ابوبکر سے بڑھ کر شریر اور فسادی نہ تھے۔اور نہ ہی محمد بن ابوبکر علم اور دین داری میں مروان سے زیادہ مشہور تھا۔ بلکہ صحاح ستہ کے مصنفین نے اپنی کتابوں میں مروان سے کئی ایک احادیث روایت کی ہیں۔اور اہل علم وفتوی کے ساتھ اس کے اقوال بھی نقل کیا جاتا ہے۔آپ کے صحابی ہونے کے بارے میں اختلاف ہے۔

جب کہ محمد بن ابو بکر رضی اللہ عنہ کو لوگوں کے ہاں یہ مقام حاصل نہیں ۔ انہوں نے ذوالقعدہ سے لیکر ربیع الاول کے شروع تک کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے صرف چند ماہ پائے ہیں۔اس لیے کہ آپ کی پیدائش پچیس حجۃ الوداع والے سال ذوالقعدہ کے مہینے میں ذوالحلیفہ کے مقام پر ہوئی۔ جب کہ مروان کا شمار حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے ہم پلہ ومعاصرین میں سے ہوتا ہے۔انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ کو پایا ہے۔اور ممکن ہے کہ فتح مکہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا بھی ہو؛ یا پھر حجۃ الوداع کے سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہو۔اور جن لوگوں کا کہنا ہے کہ آپ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں دیکھا اس لیے کہ آپ اپنے والد کے ساتھ طائف میں تھے۔اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوا تو ان کے والد طائف میں ہی تھے۔ اور آپ بھی اپنے والد کے ساتھ ہی تھے۔ اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے والد کو طائف کی طرف جلا وطن کر دیا تھا۔ بہت سارے اہل علم اس کا انکار کرتے ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ وہ اپنی مرضی سے طائف گئے تھے۔آپ کو جلا وطن کرنے کی کوئی روایت صحیح سند سے ثابت نہیں ہے۔

یہ فتح مکہ کے بعد کی بات ہے۔ فتح مکہ کے موقع پر ان کے والد سارے آزاد کردہ لوگوں کے ساتھ مکہ میں موجود تھے۔ اور اس مروان کی عمر حدِ تمیز[بلوغت کے قریب] کو پہنچ چکی تھی۔اس بنا پر یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آپ کے والد نے جب لوگوں کے ساتھ حج کیا تو آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دیدار بھی کیا ہو۔اور یہ بھی ممکن ہوسکتا ہے کہ آپ مدینہ آئے ہوں'اور وہاں پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہو۔الغرض شرف دیدار کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ جب کہ آپ کے معاصر حضرت عبداللہ بن زبیر؛ حضرت مسور بن مخرمہ؛ یہ لوگ مدینہ میں موجود تھے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کا سماع ثابت ہے۔

[اعتـــراض]: شیعہ مصنف کا یہ قول کہ:'' حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا معاملہ تو یہ ہے کہ حضرت عثمان نے ان کو والی شام مقرر کیا اور آپ نے وہاں پر نئے نئے فتنے پیدا کیے۔''

[جـــواب] :معاویہ رضی اللہ عنہ کو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اس وقت اس منصب پر تعینات کیا تھا جب ان کے بھائی یزید بن ابوسفیان رضی اللہ عنہما کا انتقال ہوگیا۔ بھائی کی جگہ یہ منصب آپ کو تفویض کیا۔اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت میں آپ اسی منصب پر قائم رہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے آپ کی ولایت میں وسعت دیدی تھی۔حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی سیرت اپنی رعایا کے ساتھ تمام والیوں سے زیادہ بہتر تھے۔لوگ آپ کو ٹوٹ کر چاہتے تھے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح حدیث مبارک میں ثابت ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا ہے:

''تمہارے بہترین حکمران وہ ہیں جن کو تم چاہتے ہو اور جو تمہیں چاہتے ہوں تم ان کے حق میں دعا کرتے ہو اور وہ تمہارے حق میں،تمہارے بدترین حکام وہ ہیں جن سے تم بغض رکھتے ہو اور جو تم سے بغض رکھتے ہوں،جن پر تم لعنت

بھیجتے ہو اور جو تم پر لعنت بھیجتے ہوں۔'' [اس کی تخریج گزر چکی ہے]۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے حوادثات اور فتنے اس وقت ظہور پذیر ہوئے جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا گیا۔ یہ ایسا اور اتنا سخت فتنہ تھا کہ اس نے تمام لوگوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا؛ صرف حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ خاص نہیں تھا۔ بلکہ [حق تو یہ ہے کہ] حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ دوسرے کئی لوگوں سے بڑھ کر امن و سلامتی کے طلبگار تھے۔ اور بہت سے لوگوں کی نسبت شر و فساد سے بہت زیادہ دور رہنے والے تھے۔

حضرت معاویہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے وُلاۃ و حکام مثلاً اَشتر نخعی و محمد بن ابی بکر و عبید اللہ بن عمر؛ و ابو اعور سلمی ؛ ہاشم بن ہاشم بن ہاشم المرقال؛ اشعث بن قیس الکندی؛ اور بشر بن ارطاۃ کے علاوہ دوسرے جو لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے؛ ان سے یقیناً افضل تھے۔

[اعتـــراض] : شیعہ مصنف کا یہ قول کہ:'' آپ نے عبداللہ بن عامر رحمہ اللہ کو بصرہ کا والی بنایا؛ جس نے بہت سارے برے کام کیے۔''

[جواب] :حضرت عبداللہ بن عامر رحمہ اللہ کی اتنی نیکیاں ہیں اور لوگ آپ سے اس قدر محبت کرتے تھے جو کہ بیان محتاج نہیں۔ بالفرض اگر آپ نے کوئی گناہ کا کام کیا بھی تھا تو اس کا بوجھ آپ پر ہی ہے۔ یہ کس نے کہہ دیا کہ کسی برائی پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ راضی تھے؟

[اعتراض] :شیعہ مصنف کا یہ قول کہ:'' آپ نے مروان کو والی مقرر کر کے اپنی انگوٹھی اس کے حوالے کر دی جس کا نتیجہ قتل عثمان رضی اللہ عنہ کی صورت میں ظہور پذیر ہوا۔ اور اس کی وجہ سے امت میں بہت بڑا فتنہ پیدا ہوا۔''

[جواب] : حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کیے جانے کا سبب صرف اکیلے حضرت مروان نہیں تھے۔ بلکہ اس میں کئی امور جمع ہو چکے تھے۔ ان جملہ امور میں سے وہ امور بھی تھے جن کا مروان پر انکار کیا جاتا ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بڑی عمر کے ہو چکے تھے۔ یہ لوگ بعض ایسی حرکات کرتے جن کے بارے میں آپ کو نہیں بتایا کرتے تھے۔ پس آپ نے انہیں ایسے امور کے کرنے کا نہیں حکم دیا جن کا تم انکار کرتے ہو۔ بلکہ آپ رضی اللہ عنہ ایسی باتوں سے دور رہنے؛ اور انہیں ختم کرنے کا حکم دیا کرتے تھے۔ پس کبھی ایسے کیا کرتے اور کبھی ایسے کیا کرتے تھے۔ اس کا عام جواب پہلے گزر چکا ہے۔

جب مفسدین مدینہ میں آ دھمکے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے کئی باتوں کی شکایت کی۔ جناب عثمان رضی اللہ عنہ نے ان تمام شکایتوں کو ازالہ کیا۔ اور جن لوگوں کو ان فسادیوں نے معزول کرنے کا مطالبہ کیا تھا؛ انہیں معزول کیا۔ اور یہ بھی اعلان کیا کہ بیت المال کا کنٹرول ان لوگوں کے ہاتھوں میں دیا جائے گا جنہیں وہ پسند کرتے ہوں گے۔ اور یہ کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے مشورہ اور ان کی رضامندی کے بغیر کسی کو کچھ بھی نہیں دیا جائے گا۔ اب ان کا کوئی مطالبہ باقی نہ رہا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرمایا کرتی تھیں:

''انہیں تم نے ایسے نچوڑ دیا جیسے کپڑے کو نچوڑ دیا جاتا ہے' اور پھر تم نے ان کا قصد کیا اور ان پر ظلم کرتے ہوئے قتل کر دیا۔'' [مسلم ۳/ ۱۴۸۱]

یہ بھی کہا گیا ہے کہ آپ کے نام سے ایک جھوٹا خط لکھ لیا گیا تھا؛ جس میں ان لوگوں کے قتل کا حکم دیا گیا تھا۔ اور انہوں

نے یہ خط راستہ میں پایا ۔حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس خط کا بھر پور انکار کیا تھا۔آپ اپنے قول میں بالکل سچے تھے ۔ پھر انہوں نے اس کا الزام مروان پر لگایا؛ اور آپ سے مطالبہ کیا کہ مروان کو ان کے حوالہ کیا جائے تا کہ وہ اسے قتل کرسکیں ۔لیکن آپ نے ایسا کرنے سے انکار کردیا۔

اگر مان لیا جائے کہ بات صحیح بھی ہے ؛ تو پھر بھی جو کچھ ان لوگوں نے عثمان کے ساتھ کیا ؛ وہ اس بات کی بنا پر مباح یا جائز نہیں ہوسکتا تھا۔اس کی زیادہ سے زیادہ حد یہ ہوسکتی ہے کہ مروان ان لوگوں کو قتل کروانے کے اپنے ارادہ میں گنہگار ہو۔ لیکن اس کی مراد پوری نہ ہوسکی ۔ جو کوئی کسی انسان کو قتل کرنے کی کوشش کرے ،مگر اسے قتل نہ کرے؛ تو صرف اس کوشش کی وجہ سے اس کو قتل کرنا واجب نہیں ہوجاتا ۔ پس ایسے معمولی سے مسئلہ کی بنا پر مروان کو قتل کرنا واجب نہیں ہوگیا تھا۔ ہاں ایسے لوگوں کو بچنا ضروری تھا جو اس قسم کی حرکات کرتے ہوں ۔اور ان لوگوں کو ان کے مناصب سے سبکدوش کرکے ادب سکھانا چاہیے تھا۔لیکن قتل کرنا یہ بہت ہی خطرناک معاملہ ہے۔

[اقرباء پروری کی حقیقت کیا ہے]:

[اعتــــراض] : شیعہ مصنف کا یہ قول کہ:'' حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بیت المال سے اپنے اقارب کو بہت زیادہ نوازتے رہتے ؛ اورانہیں دوسرے لوگوں پر ترجیح دیتے تھے۔قریش میں سے ان کے چار داماد تھے،ان کو چار لاکھ دینار عطا کیے ۔مروان کو دس لاکھ دینار دیے۔''

[جــــواب] : پہلی بات: اس واقعہ کی نقل کہاں ثابت ہے؟اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ اپنے اقارب کو بھی بیت المال میں سے ایسے ہی دیا کرتے تھے جیسے دوسرے لوگوں کو دیا کرتے تھے۔آپ تمام مسلمانوں کے ساتھ احسان کرنے والے تھے۔لیکن جس صورت میں یہ واقعہ نقل کیا گیا ہے اس کو صحیح ثابت کرنا بھی چاہیے۔[یہ محض جھوٹ ہے]۔

دوسری بات: یہ تو ایک کھلا ہوا جھوٹ ہے۔نہ ہی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور نہ ہی خلفاء راشدین میں سے کسی دوسرے خلیفہ نے اپنے اقارب کو اس قدر مال دیا۔یہ بات سبھی کو معلوم ہے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ لوگوں کی تألیف قلب کے لیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے بہت زیادہ دیا کرتے تھے۔مگر اس کے باوجود آپ نے تیس لاکھ درہم دیئے۔اور کہا جاتا ہے کہ اتنی بڑی رقم کبھی کسی کو نہیں دی گئی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اپنے بعض اقارب کو دیا کرتے تھے۔جس کی وجہ سے آپ پر انکار بھی کیا گیا۔مگر اس کی تاویل پہلے گزر چکی ہے کہ آپ ایسا کیوں کرتے تھے۔جب کہ اس بارے میں عام جواب آگے آئے گا۔

اپنے اقارب کو نوازنے میں آپ دو تاویلوں کا شکار تھے؛ ان میں سے ہر تأویل فقہاء ایک طائفہ کا مذہب ہے۔

پہلی تأویل: ...... اللہ تعالیٰ نے مال غنیمت میں جو حصہ اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا رکھا تھا؛ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کے خلفاء کا حق ہے۔فقہاء کی ایک جماعت کا یہی مذہب ہے۔اس بارے میں اس مسند اور معروف حدیث روایت کی گئی ہے۔اس کے جزئیات کی تفصیل بیان کرنے کا یہ موقع نہیں۔

ان لوگوں کا کہنا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں جیسے لوگ آپ کے ذوالقربی تھے ؛[یعنی مال غنیمت میں ان کا حصہ متعین تھا] آپ کے بعد ویسے ہی لوگ آپ کے خلفاء اور جانشینوں کے ذوالقربی ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ: حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما

کے اتنے زیادہ رشتہ دار نہیں تھے جتنے زیادہ رشتہ دار حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے تھے۔ اس لیے کہ بنو عبد شمس قریشی قبائل میں سے سب سے بڑا قبیلہ تھا؛ ان کے برابر کا قبیلہ صرف بنو مخزوم تھے۔ اور انسان کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے مال میں سے اپنے خونی رشتہ داروں پر خرچ کرے۔ جب ان کا اعتقاد یہ تھا کہ ولی امر کے پاس وہ مال آتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے ذوالقربی کا حصہ مقرر کیا ہے؛ تو اس بات پر وہ مستحق ٹھہرتے ہیں کہ وہ مال انہیں دیا جائے جسے اللہ تعالیٰ نے ان کا حصہ کہا ہے۔ اس لیے کہ وہ خلیفہ یا امام کے قریبی رشتہ داروں میں سے ہیں۔ اس لیے کہ ولی امر کی مدد اور اس کا دفاع کرنا فرض ہے۔ اور جس طرح اس کے اقارب اس کی مدد یا دفاع کر سکتے ہیں' ایسے کوئی دوسرا انسان نہیں کر سکتا۔

خلاصہ کلام! ہر حاکم کے لیے ایسے لوگوں کا ہونا ضروری ہے جو اپنی جانوں پر کھیل کر اس کی مدد کریں۔ اور جو لوگ اسے ضرر پہنچانا چاہتے ہوں' ان سے دفاع کریں۔ جیسا کہ لوگ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ تھے۔ اور پھر ان لوگوں کی بھی کفائت [اور کفالت] کا کچھ بندوبست ہونا چاہیے۔ یہ ایک تأویل ہے۔

دوسری تأویل: آپ ان اموال میں تصرف کیا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ [زکوٰۃ و صدقات کے مصارف بیان کرتے ہوئے] فرماتے ہیں: ﴿وَالْعٰمِلِیْنَ عَلَیْهَا﴾ [التوبہ ۶۰]

''اور اس میں کام کرنے والوں کا بھی حصہ ہے۔''

صدقات اور زکوٰۃ وصول کرنے والا عامل اپنی تونگری کے باوجود اس مال میں سے اپنی اجرت لینے کا مجاز ہے۔ اس پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے۔

یتیم کے مال کی دیکھ بھال کرنے والے کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ مَنْ کَانَ غَنِیًّا فَلْیَسْتَعْفِفْ وَ مَنْ کَانَ فَقِیْرًا فَلْیَاْکُلْ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ (النساء: ۶)

''جو دولت مند ہو وہ اس سے پرہیز کرے اور جو تنگ دست ہو وہ حسب دستور اس میں سے کھا لیا کرے۔''

اس میں اختلاف ہے کہ کیا بیت المال کا والی؛ ناظرِ وقف بھی صدقہ وصول کرنے والے اور یتیم کے مال کی دیکھ بھال کرنے والے کی طرح ہیں؟ اس میں دو قول ہیں۔

اگر امام یا خلیفہ کو صدقات وصول کرنے والے عامل کی طرح سمجھا جائے تو وہ غنی ہونے کے باوجود اس مال میں سے لینے کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ اور اگر اسے یتیم کے ولی کی طرح سمجھا جائے تو پھر اس میں دو قول ہیں۔ سب ملا کر کل یہ تین قول ہوئے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حق میں ان میں سے دو قول تھے۔

آپ کے لیے مالدار ہونے کے باوجود اس مال میں سے لینا جائز تھا۔ یہ فقہاء کا مذہب ہے؛ اس میں بادشاہوں کی سی اغراض کو کوئی دخل نہیں جن پر کوئی بھی اہل علم موافقت نہ کرتا ہو۔ یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ اگر یہ تأویلات شریعت کے مطابق راجح ہیں تو پھر ان میں کسی کو کوئی کلام نہیں ہونا چاہیے۔ اور اگر یہ تاویلات مرجوح ہیں؛ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جو کچھ ہوا؛ اور مسلمانوں کے مابین جتنی خونریزی ہوئی وہ اس سے زیادہ تاویل یا عذر کی مستحق نہیں ہو سکتی۔ ان اقوال سے حجت اخذ کرنا ان لوگوں کی حجتوں سے زیادہ مضبوط ہے جن کی رائے کی وجہ سے جنگوں کی آگ بھڑکی۔

[حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور جناب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ]:

[اعتراض] : شیعہ مصنف کا یہ قول کہ: ''حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو مورد طعن بناتے اور ان کی تکفیر کیا کرتے تھے۔''

[جواب] : یہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے بارے میں ایک جھوٹا الزام ہے۔ علماء کرام اچھی طرح جانتے ہیں کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی تکفیر نہیں کیا کرتے تھے۔ بلکہ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنایا گیا تو آپ کوفہ تشریف لے گئے اور وہاں پر فرمایا:

''ہم نے اپنے سے سب سے اعلی اور اونچا مقام رکھنے والے کو والی مقرر کیا ہے؛ اور اس میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔''

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلافت کے پہلے چند سال نظام بالکل درست چلتا رہا۔ جب آخری چند سال آئے تو آپ پر اعتراضات کیے جانے لگے۔ بعض امور ایسے تھے جن میں لوگ معذور تھے۔ اور بہت سارے امور ایسے تھے جن میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ معذور تھے۔

ان جملہ امور میں سے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا معاملہ بھی ہے۔ آپ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے اس لیے ناراض ہو گئے تھے کہ آپ نے قرآن کریم کی کتابت ان کی بجائے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو سپرد کی تھی [1] اور باقی صحابہ کو حکم دیدیا تھا کہ اپنے پاس موجود مصاحف کو دھو کر ختم کر دیں۔ جمہور صحابہ اس ضمن میں حضرت عثمان کے ساتھ تھے۔ اس سے پہلے جمع

[1] ابوعبداللہ زنجانی ایک شیعہ معاصر نے اپنی کتاب تاریخ القرآن کے صفحہ ۴۶ پر لکھا ہے کہ علی بن موسیٰ المعروف ابن طاؤس المتوفی (۵۸۹۔۶۶۴) ایک شیعہ عالم نے اپنی کتاب ''سعد السعود'' میں علامہ شہرستانی کی تفسیر کے مقدمہ سے بروایت سوید بن علقمہ رضی اللہ عنہ نقل کیا ہے کہ میں نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے سنا فرماتے تھے: ''ارے لوگو! اللہ سے ڈرو اور عثمان رضی اللہ عنہ کے معاملہ میں مبالغہ آمیزی سے کام نہ لو اور یہ نہ کہو کہ انھوں نے قرآن کے اوراق جلا دیے تھے۔ اللہ کی قسم یہ اوراق انھوں نے صحابہ کی ایک جماعت کے روبرو جلائے تھے۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے ہمیں جمع کیا اور کہا: ''ان مختلف قراءتوں کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے۔ ایک شخص دوسرے سے مل کر کہتا ہے کہ میری قراءت تم سے بہتر ہے اس کا نتیجہ کفر کی صورت میں برآمد ہوگا۔'' ہم نے کہا آپ کی کیا رائے ہے؟ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا: ''میں لوگوں کو ایک قرآن پر جمع کرنا چاہتا ہوں۔ اگر قراءت قرآن میں ابھی تمہارے یہاں اختلاف پیدا ہو گیا۔ تو بعد میں آنے والے مسلمان شدید اختلافات میں مبتلا ہو جائیں گے۔'' ہم نے کہا: ''آپ ٹھیک فرماتے ہیں۔'' خطیب نے العواصم من القواصم ص: ۶۳۔۶۴، کے حواشی میں لکھا ہے کہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے جملہ بلاد اسلامیہ میں قرآن کے ایک ہی نسخہ کو پھیلانا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو اس بات پر متفق کرنا چاہا۔ مصحف عثمانی ہی قرآن کریم کا وہ کامل نسخہ ہے جو قرآن کریم کی اس قراءت کے مطابق ہے جس کے مطابق سیدنا جبرائیل نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری مرتبہ قرآن کریم سنایا تھا۔ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ چاہتے تھے کہ کتابت قرآن کی خدمت انھیں سپرد کی جائے، آپ یہ بھی چاہتے تھے کہ قبل ازیں قرآن کا جو نسخہ وہ جمع کر چکے ہیں اسے باقی رکھا جائے۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ دونوں باتیں تسلیم نہ کیں۔

سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو یہ خدمت تجویز کرنے کی وجہ یہ تھی کہ سیدنا ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما نے آپ کو خلافت صدیقی میں اس کام پر مامور فرمایا تھا۔ کیوں کہ آخری مرتبہ جس قراءت کے مطابق قرآن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سنایا گیا تھا۔ سیدنا زید رضی اللہ عنہ کو وہ قراءت یاد تھی، لہٰذا سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ سیدنا زید رضی اللہ عنہ کو یہ خدمت تفویض کرنے میں حق بجانب تھے۔ یہ مطلب نہیں کہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے علم و فضل اور صدق ایمان سے آگاہ نہ تھے۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ اس فعل میں بھی حق بجانب تھے کہ آپ نے قرآن کریم کے تمام نسخوں کو دھو ڈالا تھا، اس میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا مصحف بھی شامل تھا۔ اجماع صحابہ کے مطابق پوری امت کو قرآن کریم کے ایک صحیح تر اور کامل نسخہ پر جمع کرنا سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کا عظیم ترین کارنامہ ہے۔ تاہم سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قدر افزائی کرتے رہے اور اس میں کچھ فرق نہ آیا۔ اسی طرح سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے مطیع فرمان رہے اور انھیں سب مسلمانوں سے افضل خیال کرتے رہے، کیوں کہ آپ نے صدق دل سے ان کی بیعت کی تھی اور آخری دم تک اس پر قائم رہے تھے۔

مصحف کے سلسلہ میں حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما بھی حضرت زید رضی اللہ عنہ کی خدمات حاصل کر چکے تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بھی اسی کی خدمات حاصل کیں جیسے حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما قرآن کی جمع و تدوین پر مامور فرما چکے تھے۔ یہ اختیار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نزدیک بہت محبوب تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آخری مرتبہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کو جب قرآن مجید سنایا تھا، حضرت زید رضی اللہ عنہ اس قراءت کے دیگر صحابہ سے زیادہ واقف تھے۔

جب ولید بن عقبہ نے شراب پی۔ ❶ تو عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس کی مذمت کی تھی۔ پھر ابن مسعود رضی اللہ عنہ مدینہ آئے۔ ابھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کا سانحہ پیش نہیں آیا تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو شادی کرنے کے لیے کہا۔

حقیقت تو یہ ہے کہ اہل بدعت رافضیوں کا وظیفہ حیات یہی ہے کہ یہ خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کی تکفیر اور تفسیق ایسے امور کی بنا پر کرتے رہیں جن کی وجہ سے کسی بھی حاکم کو کافر یا فاسق نہیں کہا جاسکتا۔ تو پھر خلفاء راشدین کے بارے ایسی بات کہنا کیونکر روا ہوسکتی ہے؟ اور یہ بات بھی معلوم شدہ ہے کہ متنازع فریقین میں سے کسی ایک قول کی بنا پر دونوں میں سے کسی ایک پر بھی قدح وارد نہیں ہوتی۔ اور نہ ہی دو جھگڑا کرنے والوں میں سے کسی ایک کا کلام دوسرے پر قدح کا موجب ہوسکتا ہے۔

ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر بفرض محال ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر طعن کیا تھا تو یہ امر دونوں حضرات کے لیے موجب قدح ہے صرف حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہی کے لیے نہیں، بلکہ اسے دونوں کی اجتہادی غلطی پر محمول کرنا زیادہ بہتر ہے۔ یہ دونوں حضرات جلیل القدر بدری صحابہ میں شامل تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی خطائیں معاف کردی ہیں، اور ان کی نیکیوں پر ان کو اجر و ثواب سے نواز دیا۔ اور اگر ان دونوں میں سے کسی ایک سے کوئی گناہ ہوا تھا؛ تو ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک اللہ کا ولی تھا؛ [انہیں جنت کی بشارت دی گئی تھی۔ اس لیے] وہ اہل جنت میں سے ہے؛ اور ان میں سے کوئی بھی جہنم میں نہیں جائے گا۔ ان میں سے کسی ایک کو بھی اللہ تعالیٰ اس کے گناہ پر آخرت میں عذاب نہیں دیگا۔ پھر یہ امر بھی پیش نظر ہے کہ مشاجرات صحابہ کے بارے میں زبان کو بند رکھنا اولیٰ و افضل ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ان تمام لوگوں سے افضل ہیں جو آپ کی شان میں جرح و قدح کرتے ہیں۔ آپ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے اور حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ اور ابوذر رضی اللہ عنہ سے کئی وجوہات کی بنا پر افضل ہیں۔ یہ بات بہت سارے دلائل کی روشنی میں ثابت شدہ ہے۔

مفضول کا کلام فاضل میں قدح ہونے کی بجائے اس بات کا زیادہ مستحق ہے کہ وہ خود مفضول کی ذات پر ہی قدح ہو۔ بلکہ اگر ان دونوں کے مابین علم کی روشنی میں عدل کیساتھ کلام کرنا ممکن ہو تو ٹھیک ؛ ورنہ اس طرح کلام کیا جائے جس سے دونوں کی فضیلت اور دین داری معلوم ہو۔ اس لیے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے مابین جو جھگڑے پیش آئے ان کا انجام کار آخر اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سلف صالحین اس سلسلہ میں ہمیں اپنی زبانوں کو کنٹرول میں رکھنے کی وصیت کرتے ہیں۔ اس لیے کہ ہم سے ان کے بارے میں نہیں پوچھا جائے گا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے:

❶ حقیقت یہ ہے کہ خلافت عثمانی کے مخالفین اور ولید بن عقبہ کے دشمنوں نے ولید پر افتراء باندھا تھا۔ ولید کے خلاف شراب نوشی کی شہادت دینے والے سب جھوٹے، چور اور کمینے آدمی تھے۔ ان کی یہ شہادت صاف جھوٹ تھی۔ دیکھیے: (العواصم من القواصم: ۹۴۔۹۹)

''اللہ تعالیٰ نے میرے ہاتھ کو صحابہ رضی اللہ عنہم کے خون سے آلودہ نہیں کیا۔ میں اپنی زبان کو بھی اس سے ملوث نہیں کرنا چاہتا۔''

کسی دوسرے نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار یوں کیا ہے:

﴿ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ لَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ وَ لَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾

''یہ ایک امت تھی جو گزر چکی، اس کے لیے وہ ہے جو اس نے کمایا اور تمھارے لیے وہ جو تم نے کمایا اور تم سے اس کے بارے میں نہیں پوچھا جائے گا جو وہ کیا کرتے تھے۔'' (البقرۃ ۱۳۴)

لیکن جب ایسے مبتدعین ظاہر ہوں جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر طعن و تنقید کر رہے ہوں' تو اس وقت ان کا دفاع کرنا؛ اور باطل کی حجتوں کو علم اور عدل کے ساتھ ختم کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔

[حضرت عمار اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما]:

ایسے ہی حضرت عمار سے منقول روایت بھی ہے کہ آپ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر تنقید کیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ انھوں نے کہا: ''عثمان رضی اللہ عنہ صراحۃً کافر ہو گئے تھے۔''

حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے حضرت عمار رضی اللہ عنہ کی یہ بات ناپسند کی تھی؛ اور اس کا انکار کیا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ انھوں نے کہا:

''اے عمار رضی اللہ عنہ! کیا آپ اس اللہ سے منکر ہیں جس پر عثمان رضی اللہ عنہ ایمان لائے تھے؟

ہم اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ بعض اوقات ایک ولی اللہ اور مومن شخص دوسرے ولی کی از راہ خطا تکفیر کرتا ہے، وہ اپنے اس اعتقاد [اور قول] میں غلطی پر ہوتا ہے۔ مگر اس کے باوصف دونوں کے ایمان میں قدح وارد نہیں ہوتی۔

صحیح حدیث میں آیا ہے کہ اُسید بن حضیر رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ سے کہا تھا کہ:

''تو منافق ہے اور منافقین کی وکالت کرتا ہے۔''[1]

اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حاطب رضی اللہ عنہ کے بارے میں کہا تھا:

''اے اللہ کے رسول! مجھے اجازت دیجیے کہ اس منافق کی گردن اڑا دوں۔''

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''حاطب رضی اللہ عنہ غزوہ بدر میں شرکت کر چکا ہے۔ اور تمھیں کیا پتہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہل بدر کی طرف جھانک کر دیکھا ہے؛ اور فرمایا ہے: ﴿اِعْمَلُوْا مَاشِئْتُمْ فَقَدْ غَفَرْتُ لَكُمْ﴾ (جو اعمال چاہو انجام دو میں نے تمھیں بخش دیا۔''[2]

پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے افضل ہیں۔ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ سے کئی درجہ

---

[1] صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب حدیث الافک (حدیث:٤١٤١)، وصحیح مسلم، کتاب التوبة، باب فی حدیث الافک (حدیث:٢٧٧٠)

[2] صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب فضل من شهد بدراً (حدیث:٣٩٨٣، ٤٢٧٣)، صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل حاطب بن ابی بلتعة رضی الله عنه (حدیث:٢٤٩٤)

افضل ہیں۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جو کچھ حاطب رضی اللہ عنہ کے لیے کہا ؛ اس میں ان کی حجت عمار رضی اللہ عنہ کی حجت کی نسبت زیادہ ظاہر ہے۔مگراس کے باوجود دونوں حضرات اہل جنت میں سے ہیں۔تو پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت عمار رضی اللہ عنہ جنتی کیسے نہیں ہوسکتے۔جب ان دونوں میں سے کوئی ایک دوسرے کو ایسی ویسی بات کہہ دے۔حالانکہ علماء کرام کی ایک جماعت نے انکار کیا ہے کہ حضرت عمار رضی اللہ عنہ نے کوئی بھی ایسی بات نہیں کہی۔

[ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی پٹائی کا واقعہ]:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:

''حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو اس قدر پیٹا کہ ان کی موت واقع ہوگئی۔''

[جواب]: یہ بڑا ذلیل اور گھٹیا جھوٹ ہے۔اس لیے کہ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خلیفہ بن گئے تو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو کوفہ میں ان کے منصب پر بحال رکھا۔یہاں تک عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا وہ واقعہ پیش آیا۔اور یہاں تک کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا ؛ آپ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بالکل نہیں پیٹا۔[یہ بھی کہا گیا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے عمار اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما دونوں کو پیٹا تھا]۔بشرط صحت اگر ہم اس واقعہ کو درست مان بھی لیں تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خلیفہ تھے اور بنا براجتہاد انھیں تعزیر کا حق حاصل تھا خواہ یہ اجتہاد صحیح ہو یا غلط۔اس سے ان حضرات میں سے کسی ایک کی شان میں بھی کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ اور ہم اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ یہ تینوں حضرات [ان شاء اللہ] جنت میں ہوں گے۔اور یہ حضرات اللہ تعالیٰ کے بڑے متقی ولیوں میں سے ہیں۔ہم اس سے پہلے بیان کر چکے ہیں کہ کبھی ولی اللہ سے کوئی غلطی یا گناہ سرزد ہوجاتا ہے جس پر وہ شرعاً سزا کا مستحق ہوتا ہے تو پھر تعزیر کیوں نہیں ہوسکتی ؟

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کو درّہ سے مارا جب دیکھا کہ لوگ آپ کے پیچھے پیچھے چل رہے ہیں۔ انہوں نے پوچھا: اے امیر المؤمنین! یہ کیا کر رہے ہیں؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:''یہ متبوع کے لیے باعث فتنہ اور تابع کی رسوائی کا موجب ہے۔''

اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں کو کچھ ادب سکھایا تھا؛ یا تو اس تأدیب میں حق پر تھے؛ اس لیے کہ آپ کو ایسا کرنے کا استحقاق حاصل تھا۔ یا پھر جس بات پر ان لوگوں کی تعزیر کی ہوگی ؛ اس پر انہوں نے پہلے سے توبہ کرلی ہوگی۔ یا اس تعزیر کی وجہ سے ان کا کفارہ ہوگیا ہوگا؛ یا دیگر مصائب و آلام ان خطاؤں کا کفارہ بن گئے ہوں گے۔ یا کوئی اور ایسا سبب پیش آ گیا ہوگا۔

یا تو پھر یہ کہا جائے کہ: جن لوگوں کی تعزیر کی گئی وہ بالکل مظلوم تھے۔تو جیسے آپ ان حضرات کے بارے میں کوئی بات کہیں گے وہی بات حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف سے بھی عذر ہوگی۔اس لیے کہ بلا ریب آپ ان لوگوں سے افضل تھے۔اور آپ رحمت و مغفرت کے زیادہ مستحق تھے۔

بسا اوقات امام سزا دینے میں اجتہاد سے کام لیتا ہے ؛ اس پر اسے ثواب بھی ملتا ہے۔اور مجتہدین اپنے اجتہاد کی وجہ سے جو کام کرتے ہیں' اس پر انہیں کوئی گناہ نہیں ہوتا۔ بلکہ ان کے اجتہاد کی وجہ سے انہیں ثواب ملتا ہے ۔جیسا کہ حضرت ابو بکرہ رضی اللہ عنہ نے حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ پر گواہی دی تھی۔ حضرت ابو بکرہ رضی اللہ عنہ کا شمار نیک و صالحین مسلمانوں میں سے ہوتا

ہے۔ وہ اپنے اس گواہی دینے میں اجر وثواب کی امید رکھتے تھے۔ اور ایسے ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ حد قائم کرنے میں اجر وثواب کے مستحق تھے۔ تو اس میں کوئی مانع نہیں ہوسکتا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جو کچھ سلوک حضرت عبداللہ بن مسعود اور عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما سے کیا؛ وہ بھی اسی باب سے ہو۔

جب ایک دوسرے کو قتل کرنے والوں میں سے ہر ایک مجتہد اور اس کے گناہ وخطائیں بخشا گیا ہوتا ہے تو پھر آپس میں اختلاف کرنے والے بھی بدرجہ اولی حق پر ہو سکتے ہیں۔

یا تو پھر یہ کہا جائے کہ: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بھی مجتہد تھے؛ اور دوسرے صحابہ بھی اجتہاد پر تھے۔ ایسے واقعات بہت زیادہ پیش آتے ہیں۔ کوئی انسان کوئی کام اپنے اجتہاد سے کرتا ہے۔ اور مسلمان حکمران کا خیال ہوتا ہے کہ اس حرکت پر اسے لازمی سزا ملنی چاہیے۔ جیسا کہ کسی ظلم کرنے والے سرکش کو سزا ملتی ہے۔ بھلے وہ حاکم کے پاس پیش ہونے کے بعد توبہ ہی کیوں نہ کر لے۔ بیشک زانی؛ شرابی اور چور جب عدالت میں پیش ہونے اور ان پر جرم ثابت ہونے کے بعد توبہ کریں تو اس توبہ سے حد ساقط نہیں ہوتی۔ بلکہ انہیں اپنے جرم کی سزا ملے گی۔ اور توبہ کی وجہ سے وہ جنت کے مستحق ٹھہریں گے۔ اور حد کا لگنا بھی ان امور میں سے ہوگا جس پر انہیں اجر وثواب ملے گا۔ اور اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ان کے وہ گناہ معاف کردے گا جنہیں ابھی تک معاف کرنے کی ضرورت ہوگی۔

مثال کے طور پر اگر ایک آدمی کسی ایسے آدمی کو قتل کردے جو قتل کرنے کی وجہ سے قصاص کا مستحق ہو؛ یا اس کا مال یہ سمجھ کر لے لے کہ حقیقت میں وہ اسی کا مال ہے۔ پھر مقتول کے وارث یا مال والے حاکم کے پاس اپنے حق کا دعوی دائر کردیں اور حاکم ان لوگوں کے حق میں فیصلہ دیدے۔ اور جو انسان ان کا حق انہیں تسلیم کرنے سے انکار کرے تو حاکم اسے سزا دیگا؛ بھلے وہ آدمی کسی تاویل کی وجہ سے ہی ایسا کررہا ہو۔ بلکہ وہ باطن میں اسے بری ہی کیوں نہ ہو۔

نبیذ جو کہ متنازع فیہ ہے؛ اکثر فقہاء نبیذ پینے پر بھی حد لگانے کا فتوی دیتے ہیں۔ اگرچہ یہ انسان متاول ہی کیوں نہ ہو۔ ایسے ہی متاول باغی کو بھی اس کی بغاوت سے نجات حاصل کرنے کے لیے قتل کرنے کا فتوی دیتے ہیں۔ مگر اس کی تاویل کی وجہ سے اس پر فاسق ہونے کا فتوی نہیں لگاتے۔

صحیح بخاری میں ثابت ہے کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عمار اور حسن رضی اللہ عنہما کو کوفہ بھیجا تاکہ وہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے خلاف کمک جمع کرسکیں؛ تو حضرت عمار رضی اللہ عنہ جانتے تھے کہ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا دنیا میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیوی ہیں اور آخرت میں بھی۔ اس کے باوجود فرمایا کرتے:

''سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں آزمایا ہے کہ آیا تم حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اطاعت کرتے ہو یا سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی۔ ❶

حضرت عمار رضی اللہ عنہ لوگوں کو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے خلاف جنگ آزما ہونے پر ابھارتے بھی تھے تاکہ آپ کی خلاف قتال کے ذریعہ یا دیگر کسی بھی طرح سے ہر ممکن دفاع کیا جاسکے۔ تاہم سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو جنتی اور آخرت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیوی قرار دیتے تھے۔

---

❶ صحیح بخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ، باب فضل عائشۃ رضی اللہ عنہا۔ (حدیث:۳۷۷۲، ۷۱۰۰)۔

جب حضرت عمار رضی اللہ عنہ اماں عائشہ رضی اللہ عنہا سے برسرِ پیکار ہونے کے باوجود جنتی ہونے کی گواہی دے سکتے ہیں تو پھر کون سی چیز مانع ہوسکتی ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ آپ کے جنتی ہونے کی گواہی نہ دیں؟

احادیث صحیحہ میں آیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''عمار میرا نورِ نظر ہے، اسے ایسی باغی جماعت قتل کرے گی جو روزِ قیامت میری شفاعت کی مستحق نہیں ہوگی۔''

اس میں سے صحیح صرف اتنا جملہ ہے: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''عمار کو ایک باغی جماعت قتل کرے گی۔''❶

علماءِ کرام کی ایک جماعت نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے۔ ان علماء میں سے ایک حسین الکرابیسی بھی ہیں۔ اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے بھی ایسے ہی نقل کیا گیا ہے۔

اس روایت کے یہ الفاظ: ''روزِ قیامت میری شفاعت کی مستحق نہیں ہوگی۔''

یہ حدیث میں اپنی طرف سے جھوٹ داخل کیا گیا ہے۔ کسی بھی اہل علم نے معروف سند کے ساتھ یہ روایت نقل نہیں کی۔

ایسے ہی یہ جملہ: ''عمار میرا نورِ نظر ہے۔'' کسی بھی معروف سند کے ساتھ کسی محدث نے نقل نہیں کیا۔

اور اگر ایسا جملہ ثابت بھی ہو جائے تو یہ بھی اس صحیح حدیث کی طرح ہے جس میں ثابت ہیکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''فاطمہ میرا جگر پارہ ہے، مجھے بھی وہ چیز شک میں ڈالتی ہے جو اسے شک میں ڈالتی ہے۔''❷

اور صحیح حدیث میں ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر فاطمہ رضی اللہ عنہا بنت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی چوری کرتی تو میں ان کا ہاتھ بھی کاٹ ڈالتا۔''❸

صحیح حدیث میں ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ سے محبت کیا کرتے تھے؛ اور دعا فرمایا کرتے تھے:

''اے اللہ! میں اس سے محبت کرتا ہوں' تو بھی اس سے محبت کر۔''[البخاری ٥/ ٢٣؛ صحیح مسلم:٣/ ١٣١٥]

مگر اس کے باوجود جب آپ نے ایک آدمی کو قتل کر دیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر بہت سخت انکار کیا؛ آپ نے فرمایا:

''اے اسامہ! کیا لا الٰہ الا اللہ کہنے کے بعد بھی تم نے اسے قتل کر ڈالا؟ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! اس نے اپنی جان بچانے کے لئے ایسا کہا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بار بار یہی فرماتے تھے۔ یہاں تک کہ مجھے بار بار آرزو ہونے لگی کہ کاش میں آج سے پہلے مسلمان نہ ہوا ہوتا۔'' [صحیح مسلم:ج١:ح٢٧٨]

اور صحیح بخاری میں ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''اے رسول اللہ کے چچا عباس بن عبدالمطلب! میں تمہیں اللہ کے عذاب سے کچھ بھی نہیں بچا سکتا،...... اور اے فاطمہ ...... میں اللہ کے عذاب سے تمہیں نہیں بچا سکوں گا......'' [صحیح بخاری:ج٢:ح٢٦]

یہ بھی صحیح حدیث میں ثابت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عبد اللہ بن الحمار نامی ایک شخص پر کئی بار شراب کی حد قائم کی۔ مگر اس کے باوجود آپ نے فرمایا: ''یہ اللہ و رسول سے محبت رکھتا ہے۔'' [صحیح بخاری، کتاب الحدود، ح: ٦٧٨٠]

---

❶ صحیح بخاری، کتاب الجهاد، باب مسح الغبار عن الرأس فی سبیل الله (حدیث:٢٨١٢)۔

❷ بخاری۔ رضی اللہ عنہا (ح:٣٧٢٩) و صحیح مسلم(ح٢٤٤٩) مفصل تخریج گزر چکی ہے۔

❸ صحیح بخاری، کتاب الحدود ، باب اقامة الحدود علی الشریف والوضیع (حدیث: ٦٧٨٧، ٦٧٨٨)۔

ایسے ہی رسول اللہ ﷺ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ﷺ اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار قرار دیا کرتے تھے۔لیکن جب حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے جب غلطی سے بنو جذیمہ کو قتل کر دیا تو نبی کریم ﷺ نے دعا کی:

''اے اللہ! جو کچھ خالد نے کیا ہے' میں اس سے برأت کا اظہار کرتا ہوں۔''[البخاري ٤/ ١٠٠]

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا:''تم مجھ سے ہو اور میں تجھ سے ہوں۔''

لیکن اس کے باوجود حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جب ابوجہل کی بیٹی سے نکاح کرنے کا ارادہ کیا تو آپ نے فرمایا:

''بنی ہشام بن مغیرہ نے مجھ سے اپنی بیٹی کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نکاح میں دینے کی اجازت طلب کی ہے۔''

واضح رہے کہ میں اس کی اجازت نہیں دیتا، میں اس کی اجازت نہیں دیتا، میں اس کی اجازت نہیں دیتا،[آپ نے تین مرتبہ یہ الفاظ دہرائے]۔البتہ علی رضی اللہ عنہ اگر میری بیٹی کو طلاق دے دیں تو ان کی بیٹی کے ساتھ نکاح کر سکتے ہیں۔اللہ کی قسم!اللہ کے نبی کی بیٹی اور اللہ کے دشمن کی بیٹی ایک ہی آدمی کے نکاح میں نہیں رہ سکتی۔''[اس کی تخریج گزر چکی هے۔]

اور ایک حدیث میں آتا ہے کہ آپ نے دیکھا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ حالت احرام میں اپنے غلام کو پیٹ رہے تھے تو آپ نے فرمایا:''دیکھو یہ محرم کیا کر رہا ہے۔''[ابو داؤد ٢/ ٢٢٣ و ابن ماجة ٢/ ٤٣٢۔]

[حدود وتعزیرا اور مصائب گناہوں کا کفارہ ہیں:]

کبھی کوئی انسان اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو محبوب ہوتا ہے۔مگر اس میں کوئی چیز مانع نہیں ہوتی کہ اسے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم سے ادب سکھایا جائے۔رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

''کسی مومن آدمی کو جب بھی کوئی تکلیف یا ایذا یا کوئی بیماری یا رنج یہاں تک کہ اگر اسے کوئی فکر ہی ہو یا اگر کوئی کانٹا چبھتا ہے تو اللہ اس کے بدلہ میں اس کا ایک گناہ مٹا دیتا ہے۔''[صحیح مسلم:ج٣ : ح ٢٠٦٤]

جب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:﴿ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ ﴾ [النساء ١٢٣]

''جو کوئی برائی کرے گا اسے اس کا بدلہ دیا جائے گا۔''

تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا:کمر توڑنے والی آیت نازل ہوگئی۔تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''کیا تمہیں کبھی کوئی غم نہیں پہنچتا؟ کیا تمہیں تھکاوٹ نہیں ہوتی؟ کیا تمہیں کوئی پریشانی لاحق نہیں ہوتی؟ یہی وہ چیزیں جو بدلہ میں تمہیں دی جاتی ہیں۔[مسند أحمد ١/ ١٨١]

حدیث میں ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:''حدود مجرم کے لیے گناہوں کا کفارہ ہوتی ہیں۔''[مسند البزار٦/ ٣٦٥]

صحیحین میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''تم لوگ مجھ سے اس بات پر بیعت کرو کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا اور چوری نہ کرنا اور زنا نہ کرنا اور اپنی اولاد کو قتل نہ کرنا اور نہ ایسا بہتان (کسی پر) باندھنا جس کو تم (دیدہ ودانستہ) بنالاؤ۔اور کسی اچھی بات میں اللہ اور رسول کی نافرمانی نہ کرنا پس جو کوئی تم میں سے (اس عہد کو) پورا کرے گا، تو اس کا ثواب اللہ کے ذمہ ہے۔اور جو کوئی ان (بری

باتوں) میں سے کسی میں مبتلا ہو جائے گا اور دنیا میں اس کی سزا اسے مل جائے گی تو یہ سزا اس کا کفارہ ہو جائے گی اور جو ان (بری) باتوں میں سے کسی میں مبتلا ہو جائے گا اور اللہ اس کو دنیا میں پوشیدہ رکھے گا تو وہ اللہ کے حوالے ہے، اگر چاہے تو اس سے درگذر کر دے اور چاہے تو اسے عذاب دے۔'' [البخاری:ج ۱ :ح:۱۷]

جب آسمانی مصائب و آفات جو کہ انسان کے فعل کے بغیر حاصل ہوتے ہیں' اللہ تعالیٰ ان کی وجہ سے انسان کے گناہوں کو مٹا دیتے ہیں۔ پس پھر جو انسانوں کی طرف سے ظلم کیا جاتا ہے؛ یا خلق کی طرف سے تکلیف پہنچتی ہے تو یہ بطریق اولی انسان کے گناہوں کا کفارہ بنتی ہے۔ جیسے کفار کی طرف سے مجاہدین کو پہنچنے والی تکلیف۔ اور جیسے انبیاء کرام علیہم السلام کو ان کے جھٹلانے والوں کی طرف تکلیف پہنچتی ہے۔ اور جیسے مظلوم کو ظالم کی طرف سے تکلیف پہنچتی ہے۔ جب یہ امور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کی وجہ سے پیش آتے ہیں [اور اللہ تعالیٰ انہیں گناہوں کا کفارہ بنا دیتا ہے] تو اسی طرح حاکم کی طرف سے لگائی جانے والی حد یا تعزیر کی سزا بالاولی گناہوں کا کفارہ بنتی ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں یہ حال تھا کہ اگر کوئی انسان شراب پی لیتا تو وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا؛ اور کہتا: اے امیر المؤمنین مجھ پر حد قائم کر کے مجھے پاک کیجیے۔

حضرت ماعز بن مالک رضی اللہ عنہ اور غامد یہ عورت خود رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے اور انہیں گناہ سے پاک کرنے کا مطالبہ کیا تھا۔

پس جب کوئی انسان اللہ کا ولی ہو تو اس بات میں کوئی چیز مانع نہیں ہوسکتی کہ اسے یہ بھی ضرورت پیش آئے کہ کوئی چیز اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کا کفارہ بنا دے۔ ولی امر کی تادیب سے بھی یہ مقصود حاصل ہو جاتا ہے اور دوسرے امور سے بھی۔

اگر یہ کہا جائے کہ ان صحابہ کرام سے جو کچھ ہوا تھا؛ اس میں وہ مجتہد اور معذور تھے؛ تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں بالاولی کہا جا سکتا ہے کہ آپ بھی انہیں ادب سکھانے میں مجتہد اور معذور تھے۔ اس لیے کہ آپ امام اور خلیفہ ہونے کی وجہ رعیت کی تادیب و اصلاح پر مأمور تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خواہشاتِ نفس سے بہت زیادہ دور تھے۔ اور ان حضرات کو ادب سکھانے میں عدل و انصاف اور علم کے زیادہ قریب تھے۔ رضی اللہ عنہم اجمعین۔

اگر کوئی انسان حضرت علی رضی اللہ عنہ پر قدح کرے کہ آپ نے جناب حضرت زبیر حضرت طلحہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہم اجمعین سے جنگ کی۔

تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ علم و عدل میں ان لوگوں کی نسبت اولی اور افضل ہیں جنہوں نے آپ سے جنگ کی۔ ایسے ہرگز جائز نہیں ہے کہ آپ سے جنگ کرنے والوں کو تو عادل کہا جائے اور آپ کو ظالم کہا جائے۔

بالکل اسی طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حدود قائم کرنے کا مسئلہ بھی ہے۔ آپ ان لوگوں کی نسبت علم و عدل کے زیادہ قریب اور ان لوگوں سے افضل تھے۔ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ پر تنقید کرنے والوں سے آپ کا دفاع واجب ہوتا ہے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر تنقید کرنے والوں سے آپ کا دفاع بالاولی واجب ہوتا ہے۔

[حکم بن العاص کی جلاوطنی کی حقیقت]:

[اعتراض] : شیعہ مصنف لکھتا ہے:

''نبی ﷺ نے عثمان رضی اللہ عنہ کے چچا حکم بن العاص اور ان کے بیٹے کو مدینہ سے نکال دیا تھا۔ حکم اور اس کا بیٹا عہد رسالت مآب میں اور عہدِ صدیقی و فاروقی میں مدینہ بدر ہی رہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے پھر واپس مدینہ میں بلا لیا۔ اور مروان کو اپنا مشیر اور کاتب بنالیا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لَا تَجِدُ قَوْمًا یُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ یُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَلَوْ کَانُوْٓا اٰبَآءَ ھُمْ اَوْ اَبْنَآءَ ھُمْ﴾ [المجادلۃ ۲۲]۔

''اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھنے والوں کو آپ اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرنے والوں سے محبت رکھتے ہوئے ہرگز نہ پائیں گے گو وہ ان کے باپ یا ان کے بیٹے ۔'' [شیعہ کا بیان ختم ہوا]

[جواب] : حکم ابن العاص فتح مکہ کے موقع پر اسلام لانے والوں میں سے ایک ہے۔ اس وقت اسلام قبول کرنے والے تقریباً دو ہزار افراد تھے۔ تب تک مروان ابھی چھوٹا بچہ تھا۔ اس کا شمار ابن زبیر اور مسور بن مخرمہ کے معاصرین میں ہوتا ہے۔ فتح مکہ کے موقع پر یہ سن تمیز کو پہنچ چکا تھا یعنی سات سال یا اس سے کم وبیش عمر تھی۔ مروان کا کوئی ایسا گناہ نہیں تھا جس کی وجہ سے نبی کریم ﷺ اپنے وقت میں انہیں جلاوطن کرتے ۔

رسول اللہ ﷺ کے عہدِ مسعود میں طلقاء مکہ مدینہ میں بود و باش نہیں رکھتے تھے۔ بالفرض اگر نبی کریم ﷺ نے کسی کو جلاوطن کیا بھی ہوگا تو مکہ سے کیا ہوگا؛ مدینہ سے نہیں۔ اگر آپ مدینہ سے جلاوطن کرتے تو پھر مکہ کی طرف بھیجتے۔ بہت سارے اہل علم نے جلاوطن کیے جانے کی روایت پر تنقید کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ اپنے اختیار سے گیا تھا۔

خود حکم کا قصہ صحاح ستہ میں نہیں ہے۔ اور نہ ہی اس کی کوئی معروف سند ہے جس سے اس کا اصل حال معلوم ہو سکے۔ لوگوں میں سے بعض کہتے ہیں کہ اس نے چلنے میں نبی کریم ﷺ کی نقل اتاری تھی۔ اور بعض کہتے ہیں: اسے طائف کی طرف جلاوطن کیا گیا تھا۔ جولوگ فتح مکہ کے دن مسلمان ہوئے تھے۔ (طلقاء) ان میں سے کسی نے بھی ہجرت نہیں کی تھی۔

نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:''لَا هِجْرَةَ بَعْدَ الْفَتْحِ ولکن جهاد و نية۔'' [1]

''فتح مکہ کے بعد ہجرت نہیں لیکن جہاد اور اس کی نیت ہے۔''

یہی وجہ تھی کہ جب صفوان بن امیہ رضی اللہ عنہ ہجرت کر کے مدینہ وارد ہوئے تو نبی کریم ﷺ نے انہیں مکہ لوٹ جانے کا حکم دیا۔ [2]

جب رسول اللہ ﷺ کے چچا حضرت عباس ایک آدمی کو لیکر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تا کہ اس سے ہجرت پر

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الجهاد، باب فضل الجهاد والسیر، (حدیث:۲۷۸۳)، صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب المبایعة بعد فتح مکة، علی الاسلام (حدیث: ۱۳۵۳)۔

[2] سنن نسائی، کتاب البیعة۔ باب ذکر الاختلاف فی انقطاع الهجرة (حدیث: ٤١٧٤)، مسند احمد(۳/ ٤٠١) طبقات ابن سعد(٥/ ٤٤٩)، اسد الغابة(۳/ ۲٦)۔

بیعت لی جائے؛ تو انہوں نے ایسا کرنے کی قسم اٹھالی۔آپ نے اس آدمی کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا:''میں صرف اپنے چچا کی قسم پوری کررہا ہوں۔فتح مکہ کے بعد کوئی ہجرت نہیں ہے۔''

حکم کو مدینہ سے جلاوطن کرنے کا واقعہ بلا سند ہے۔اگر اس کی اسناد ہوتی تو اس کی صحت معلوم کی جاسکتی تھی۔اگر خارج از بلد کیا بھی تھا تو مکہ سے کیا ہوگا نہ کہ مدینہ سے،اور اگر مدینہ سے نکالا تھا تو وہاں سے مکہ جانے کا حکم دیا ہوگا۔

فتح مکہ کے سال حضرت عباس رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کے مکہ مکرمہ پہنچے سے پہلے وہاں مدینہ کی طرف ہجرت کی نیت سے نکل چکے تھے۔رسول اللہ ﷺ سے آپ کی ملاقات راستے میں ہوئی۔[تفصیل پہلے گزر چکی ہے]۔

[جلاوطنی کے مستحق کون؟]:

خارج از بلد[جلاوطن] کرنے کی سزا تعذیراً زانی یا مخنث کو دی جاسکتی ہے۔اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ نبی کریم ﷺ نے کسی کو جلاوطن کیا تھا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ہمیشہ کے لیے اس شہر میں قدم نہ رکھ سکے۔یہ سزا شرعاً کسی جرم میں بھی ثابت نہیں کہ دائماً کسی شخص کو خارج از بلد کردیا جائے۔بخلاف ازیں جلاوطن کرنے کی سزا سنت میں صرف ایک سال کے لیے ہے۔یہ سزا زنا کار اور مخنث کے لیے ہے۔یہاں تک کہ وہ توبہ کرلیں۔جب حاکم کسی بات پر تعزیراً سزا اس لیے دے کہ مجرم توبہ کرلے؛ تو جب بھی وہ توبہ کرلے گا؛ تعزیر ساقط ہوجائے گی۔اور اگر وہ اپنے گناہ پر ہی قائم رہے تو یہ ایک اجتہادی معاملہ ہے اس میں بھی کوئی متعین سزا نہیں ہے۔اور نہ ہی اس کا کوئی وقت مقررہ ہے۔

اگر اس بات کو تسلیم کرلیں؛ تو جلاوطنی کی سزا ہجرت کے آخری دور میں شروع ہوئی؛ تو اس کی مدت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کے زمانے تک طول نہیں پکڑتی۔حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور تک تو مدت اور ہی لمبی ہوجاتی ہے۔نیز یہ کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے عبد اللہ بن ابی سرح کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کے پاس سفارش کی تھی۔عبد اللہ بن ابی سرح رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے پاس کاتب وحی تھا۔پھر اسلام سے مرتد ہوگیا۔نبی کریم ﷺ نے باقی لوگوں کے ساتھ اسے بھی مباح الدم قرار دیدیا تھا۔پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اسے لیکر نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے؛ تو آپ ﷺ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی سفارش قبول کرلی؛ اس کی بیعت لے لی۔تو پھر یہ کیسے ممکن ہوسکتا تھا کہ حکم کے بارے میں آپ کی شفاعت قبول نہ کی جاتی؟۔

یہ بات قطعی طور پر معلوم ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ سے حکم کو واپس بلانے کی اجازت طلب کی تھی اور آپ نے انہیں یہ اجازت دیدی تھی۔

ہم یہ بات بھی یقینی طور پر جانتے ہیں کہ حکم بن العاص کا گناہ عبد اللہ بن ابی سرح کے گناہ سے کئی درجہ کمتر تھا۔عبد اللہ کا قصہ ثابت شدہ اسناد کے ساتھ مشہور ومعروف ہے۔جب کہ حکم کا قصہ جن لوگوں نے ذکر کیا ہے؛ عام طور پر انہوں نے مرسل سند کے ساتھ ذکر کیا ہے۔اور اس قصہ کے ذکر کرنے والے بھی ایسے مؤرخ ہیں جن کے ہاں بہت زیادہ جھوٹ پایا جاتا ہے۔ان کے ہاں بہت کم ہی کوئی روایت کمی یا زیادتی سے محفوظ رہتی ہے۔اس لیے کوئی ایسی ثابت شدہ روایت نہیں مل سکی جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کم درجہ بھی کسی انسان کی شان میں قدح کا موجب بن سکتی ہو۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے فضائل؛ نبی کریم ﷺ کی آپ سے محبت؛ آپ تعریف وتوصیف بزبان رسالت مآب؛ اور

خصوصی طور پر اپنی دو بیٹیوں کی ان سے شادی؛ آپ کے لیے جنت کی شہادت؛ اور صلح حدیبیہ کے موقع پر بحیثیت سفیر آپ کی مکہ مکرمہ روانگی؛ اور آپ ﷺ کا اپنے ہاتھ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا ہاتھ قرار دے کر ان کی طرف بیعت کرنا؛ اور صحابہ کرام کا خلافت کے لیے آپ کو مقدم کرنا؛ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کا گواہی دینا کہ رسول اللہ ﷺ جب فوت ہوئے تو آپ سے راضی تھے؛ [یہ باتیں] سب کو معلوم ہیں۔ ان کے علاوہ دیگر بھی کچھ امور ایسے ہیں جن کی بنا پر ہم قطعی طور پر کہہ سکتے ہیں کہ آپ بہت بڑے متقین اولیاء اللہ میں سے تھے۔ آپ ان لوگوں میں سے تھے جو اللہ تعالیٰ سے راضی ہو گئے تھے اور اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو گیا تھا۔ ان امور کو کسی ایسی روایت کی وجہ سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جس کی سند ہی ثابت نہ ہو۔ اور نہ ہی یہ پتہ ہو کہ یہ واقعہ کیسے پیش آیا۔ اور پھر ایسے امور کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا گناہ قرار دیا جائے جن کی حقیقت کا کوئی پتہ ہی نہ ہو۔ بلکہ اس کی مثال تو ان لوگوں کی طرح ہے جو اللہ تعالیٰ کی کتاب سے محکم آیات کے مقابلہ میں متشابہ آیات پیش کرتے ہیں۔ حقیقت میں یہ ان لوگوں کا فعل ہے جن کے دلوں میں کجی ہے اور جو فتنہ تلاش کرنے میں لگے رہتے ہیں؛ [اس کے علاوہ ان کا کوئی کام نہیں ہوتا]۔

اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ کج رو روافض ان شرار الخلق لوگوں میں سے ہیں جو ہمیشہ فتنہ مچانے کی سوچتے رہتے ہیں اور ان کی مذمت اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے کی ہے۔

خلاصہ کلام! ہم یہ بات قطعی طور پر جانتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے کسی بھی انسان کو ہمیشہ کے لیے جلا وطن نہیں کیا تھا؛ کہ پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرتے ہوئے اسے واپس بلا لیتے؛ اور مسلمانوں میں سے کوئی بھی اس پر اعتراض نہ کرتا اور سب خاموش رہتے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اللہ تعالیٰ سے بہت زیادہ ڈرنے والے تھے۔ آپ اس بات سے بری ہیں کہ کوئی بھی ایسا کام کریں۔ بلکہ یہ کام اجتہادی امور میں سے ہے۔ [حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حکم بن العاص کو نافرمانی اور اسلام کی تذلیل کے لیے مدینہ نہیں بلایا تھا، بلکہ اس لیے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خیال میں حکم کی حالت سدھر گئی تھی۔ یہ معلوم نہیں کہ آپ کا یہ اجتہاد صحیح تھا یا غلط]۔ [1]

---

[1] قاضی ابن العربی العواصم من القواصم، ص: ۷۷ پر لکھتے ہیں: ''ہمارے علماء کا قول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حَکَم کو مدینہ واپس آنے کی اجازت دے دی تھی۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے جب ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما سے اس کا ذکر کیا تو انھوں نے فرمایا: ''اگر آپ اس بات کا کوئی گواہ پیش کریں تو ہم حکم کو واپس بلا لیں گے۔'' سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ منصب خلافت پر فائز ہوئے تو اپنے علم کے مطابق انھوں نے حکم کو واپس بلا لیا۔ مشہور محدث امام ابن حزم رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''الامامت والمفاضلہ'' میں جو ان کی کتاب الفصل کی جلد چہارم میں شامل ہے، صفحہ: ۱۵۴، پر علماء کا یہ قول نقل کیا ہے کہ حکم کو جلا وطن کرنا ایک واجب حد شرعی کی حیثیت نہیں رکھتا اور ہمیشہ کے لیے بھی نہ تھا۔ بخلاف ازیں آپ نے حکم کو کسی جرم کی سزا دی تھی جس کی بنا پر وہ خارج از بلد ہونے کا مستحق قرار پایا۔ دین اسلام میں توبہ کا دروازہ ہر وقت کھلا ہے، بصورت توبہ اس کی یہ سزا باتفاق اہل اسلام ساقط ہو جائے گی اور وہ جہاں چاہے جا سکتا ہے۔''
فرقہ زیدیہ کے عظیم مجتہد سید محمد بن ابراہیم الوزیر یمنی المتوفی ۸۴۰ھ نے اپنی کتاب الروض الباسم (۱/۱۴۱۔۱۴۲) پر مشہور شیعہ معتزلی محسن بن کرامہ کی کتاب ''سرح العیون'' سے نقل کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کو اجازت دے دی تھی کہ حکم کو مدینہ بلا لیں۔ ابن الوزیر کہتے ہیں۔ معتزلہ اور شیعہ زیدیہ کو چاہیے کہ اس حدیث کو قبول کر کے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کو مورد طعن بنانا ترک کر دیں، کیونکہ اس حدیث کا راوی شیعہ کے نزدیک قابل اعتماد ہے اور صحت عقیدہ و علم و فضل کے لحاظ سے بھی ممتاز ہے۔ پھر ابن الوزیر نے اس پر مکمل کر کلام کیا ہے اور امیر المومنین عثمان رضی اللہ عنہ سے دفاع کرنے میں دلائل و براہین کا انبار لگا دیا ہے جو تین صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ اس حدیث کا راوی ایک شیعہ عالم ہے، ابن الوزیر جنھوں نے سیدنا عثمان کی مدافعت میں دلائل دیے ہیں وہ بھی زیدی شیعہ ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ شیعہ و اہل سنت علماء سب سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی بریت پر متفق ہیں۔

شاید ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما نے اس لیے اسے واپس نہیں بلایا کہ اس نے خود اس کا مطالبہ ہی نہ کیا ہو۔ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مطالبہ کیا تو آپ نے اس کا مطالبہ پورا کر دیا۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے لیے اس کی توبہ واضح نہ ہوئی ہو اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے لیے توبہ واضح ہوگئی [تو آپ نے اسے واپس بلالیا]۔

اور آخر میں انتہاء درجہ کی یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ آپ سے اجتہادی غلطی یا گناہ کا کام سرزد ہوگیا ہو تو اس بارے میں مفصل کلام پہلے گزر چکا ہے۔

جہاں تک مروان کو کاتب بنانے پر اعتراض ہے تو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ مروان کا اس میں کوئی گناہ نہیں تھا۔ اس لیے کہ مروان اس وقت چھوٹا تھا اس وقت تک شرعی احکام کا مکلف نہیں ٹھہرا تھا۔ جب نبی کریم ﷺ کا انتقال ہوا اس وقت تک مروان بلوغت کی عمر تک نہیں پہنچا تھا۔ اس پر تمام اہل علم کا اتفاق ہے۔ بلکہ اس وقت تک اس کی زیادہ سے زیادہ عمر دس سال یا اس کے قریب قریب ہوسکتی ہے۔ [مروان میں خامیاں ہوسکتی ہیں]، مگر اس کے ظاہراً و باطناً مسلمان ہونے میں شبہ نہیں وہ قرآن کریم کی تلاوت کیا کرتا اور اس پر عمل پیرا رہتا تھا؛ دین کی فقہ و سمجھ حاصل کرتا۔ اس فتنہ [قتل عثمان رضی اللہ عنہ] سے پہلے اس کا کوئی ایسا گناہ معروف نہیں تھا جس کی وجہ سے اس پر اعتراض کیا جا سکے۔ لہٰذا یہ اعتراض لغو ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اسے کاتب کیوں مقرر کیا۔

لیکن جب فتنہ پھیلا تو اس کا شکار وہ لوگ بھی ہوگئے جو مروان سے کئی درجہ افضل و بہتر تھے۔ مروان ان لوگوں میں سے نہیں تھا جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کرتے ہوں۔ جب کہ اس کے باپ حکم کا شمار بھی طلقاء میں ہوتا ہے۔ اور طلقاء میں سے اکثر لوگ بہت اچھے مسلمان ثابت ہوئے ہیں۔ جب کہ بعض کی سیرت محل نظر ہے۔ [لیکن ان تمام باتوں کے باوجود] صرف ایسے گناہ کی وجہ سے باطن میں نفاق کا ہونا لازم نہیں آتا جس گناہ پر تعزیر ہوسکتی ہو۔

منافقین پر ظاہری طور پر اسلامی احکام جاری ہوتے ہیں۔ فتح مکہ کے بعد طلقاء میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں تھا جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کا اظہار کرتا ہو۔ بلکہ وہ [اسلامی اصولوں کے مطابق] وراثت پاتے تھے اور وراثت چھوڑتے تھے۔ ان پر نماز جنازہ پڑھی جاتی تھی۔ انہیں مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جاتا تھا۔ اور ان پر اسلامی احکام ایسے ہی جاری ہوتے تھے جیسے دوسرے مسلمانوں پر جاری ہوتے تھے۔

اوس اور خزرج کی ایک جماعت کا نفاق صاف واضح اور معلوم شدہ تھا: جیسے عبد اللہ بن ابی ابن سلول اور اس کے امثال وہمنوا۔ مگر اس کے باوجود کبھی کبھار مسلمان اس کے لیے تعصب کر جاتے تھے۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے عبد اللہ بن ابی کے بارے میں تعصب کا اظہار کیا تھا۔ اور انہوں نے سعد بن معاذ سے کہا:

''اللہ کی قسم! تم اسے قتل نہیں کرو گے اور نہ ہی ایسا کرنے پر قدرت رکھتے ہو۔''

اگرچہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کا ایسا کہنا بھی غلطی تھی؛ لیکن اس غلطی کی وجہ سے آپ اسلام سے خارج نہیں ہوئے۔ بلکہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ اہل جنت میں سے ہیں۔ آپ کا شمار سابقین اولین انصار میں سے ہوتا ہے۔ تو پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر اعتراض کیسے ہوسکتا ہے کہ انہوں نے ایک ایسے آدمی کو ٹھکانہ دیا جس کا منافق ہونا معلوم ہی نہیں۔

اگر مروان منافق ہوتا تو پھر بھی اس کے ساتھ احسان کرنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی ذات پر قدح کا موجب نہیں ہوسکتا۔

اس لیے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْا اِلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ﴾ [الممتحنة ۸]

''جن لوگوں نے تم سے دین کے بارے میں لڑائی نہیں لڑی اور تمہیں جلا وطن نہیں کیا ان کے ساتھ سلوک و احسان کرنے اور منصفانہ بھلے برتا کرنے سے اللہ تعالیٰ تمہیں نہیں روکتا؛ بلکہ اللہ تعالیٰ تو انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔''

صحیح بخاری میں حضرت اسما بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا سے روایت ہے آپ کہتی ہیں کہ میرے پاس میری ماں آئی جو مسلمان نہیں ہوئی تھی [اسلام میں رغبت رکھتی تھی]۔ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: کیا میں اس سے صلہ رحمی کروں؟ تو آپ نے فرمایا: ''ہاں! اس سے صلہ رحمی کرو۔'' [صحيح بخاری: ح: ۹۲٤]

حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا بنت حیي بن اخطب اپنے یہودی رشتہ داروں کے ساتھ صلہ کرنے کی وصیت کیا کرتی تھیں۔''

جب کوئی مسلمان اپنے کسی کافر رشتہ دار کے ساتھ صلہ رحمی کرنے کی وجہ سے اسلام سے خارج نہیں ہوتا تو پھر اپنے مسلمان رشتہ دار کے ساتھ صلہ رحمی کرنے کی وجہ سے کیسے اسلام سے خارج ہوسکتا ہے؟

حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کا والد حیي بن اخطب بڑے سرداروں میں سے تھا؛ اور بڑا سرکش کافر تھا؛ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے دشمنی روا رکھتا تھا؛ مگر حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا ام المؤمنین ہیں؛ آپ انتہائی نیک اور دیندار عورت تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو جنت کی بشارت سنائی ہے۔ جب آپ کا انتقال ہونے والا تھا تو آپ نے اپنے بعض قریبی یہودی رشتہ داروں کے ساتھ بھلائی کرنے وصیت کی تھی۔ اس پر آپ کی تعریف و توصیف اور مدح کی جاتی ہے؛ مذمت نہیں کی جاتی۔

اس سے فقہاء نے استدلال کیا ہے کہ مسلمان اہل ذمہ کے ساتھ صدقہ و خیرات کر کے اور ان کے لیے وصیت کر کے صلہ رحمی کرسکتا ہے۔ تو پھر امیر المؤمنین پر اعتراض کیسے ہوسکتا ہے کہ انہوں نے اپنے اس چچا کے ساتھ احسان اور صلہ رحمی کا برتاؤ کیا جو اسلام کا اظہار کرتا تھا۔

حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ نے مشرکین کے نام خط لکھا تھا؛ جس میں انہوں نے قریش کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فتح مکہ کے پیش نظر پیش قدمی کی اطلاع دی تھی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بارے میں فرمایا: ''حاطب رضی اللہ عنہ غزوہ بدر اور بیعت رضوان میں شرکت کر چکا ہے؛ اس وجہ سے وہ اہل جنت میں سے ہے۔ اور جس نے حاطب کو منافق کہا تھا؛ اس سے مخاطب ہوکر فرمایا:

''اور تمہیں کیا پتہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہل بدر کی طرف جھانک کر دیکھا اور فرمایا ہے:

((اِعْمَلُوْا مَاشِئْتُمْ فَقَدْ غَفَرْتُ لَكُمْ .))

''جو اعمال چاہو انجام دو میں نے تمہیں بخش دیا۔'' [اس کی تخریج گزر چکی ہے]۔

کہاں حاطب اور کہاں عثمان رضی اللہ عنہ؟ - العیاذ باللہ - اگر یہ تصور بھی کرلیا جائے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بھی اسی طرح کا کام کیا تھا؛ تو تب بھی ہمارے قول کی بھلائی اس میں تھی کہ ہم آپ کے لیے جنت کی گواہی دیں؛ آپ حاطب سے زیادہ اس احسان کے حق دار ہیں۔

[حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی مدینہ بدری کی حقیقت:]

[اعتراض] : شیعہ مصنف کہتا ہے: [حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے] حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کو انتہائی سخت مار پیٹ کر ربذہ کی طرف نکال دیا تھا۔* حالانکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:

''اس کرۂ ارضی کے اوپر اور فلک نیلگوں کے نیچے ابوذر سے زیادہ سچا اور کوئی نہیں۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا تھا:'' بیشک اللہ تعالیٰ نے میری طرف وحی کی ہے کہ وہ میرے صحابہ میں سے چار افراد سے محبت کرتا ہے' اور مجھے حکم دیا ہے کہ میں بھی ان سے محبت کروں۔'' آپ سے پوچھا گیا: یارسول اللہ! وہ کون لوگ ہیں؟ آپ نے فرمایا:'' ان چاروں کے سردار حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں ؛ اور ان کے علاوہ سلیمان' مقداد اور ابوذر رضی اللہ عنہم اجمعین ۔''

[جواب] : جہاں تک ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کا تعلق ہے آپ نے ربذہ میں ہی سکونت اختیار کی اور وہیں پر وفات پائی۔ اس کی وجہ آپ کے اور لوگوں کے مابین ہونے والی چپقلش تھی۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ انتہائی نیک اور صالح انسان تھے۔ آپ کا زاویہ نگاہ یہ تھا کہ جو مال بھی ضرورت سے زائد ہو اسے خرچ کر دینا چاہیے۔ جو شخص ایسا مال جمع کرے گا بروز قیامت اس مال کو آگ میں گرم کرکے اس شخص کو داغا جائے گا۔ وہ اس آیت سے استدلال کیا کرتے تھے:

﴿وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَ لَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ﴾ (التوبة ۳۴) ❶

''اور جو لوگ سونا چاندی کا خزانہ رکھتے ہیں اور اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ،انہیں دردناک عذاب کی خبر پہنچا دیجئے'۔

نیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول پیش کرتے تھے:

''اے ابوذر! میں نہیں چاہتا کہ میرے پاس خود احد پہاڑ کے برابر سونا ہو۔ تیسری رات گزر جائے اور اس میں سے ایک دینار بھی میرے پاس باقی ہو؛ سوائے اس دینار کے جس قرض ادا کرنے کے لیے روک رکھا ہو۔'' ❷

نیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

''زیادہ مال دار لوگ بروز قیامت کم درجہ والے ہوں گے سوا ان لوگوں کے جو مال کو ادھر اُدھر بکھیر دیں۔'' ❸

جب حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے وفات پائی اور بہت سا مال پیچھے چھوڑا تو حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے اسے کنز (خزانہ) پر محمول کیا جس پر سزا دی جائے گی۔ اس ضمن میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ابوذر رضی اللہ عنہ سے تبادلۂ افکار کررہے تھے۔ اتنے میں کعب رضی اللہ عنہ داخل ہوئے اور انھوں نے عثمان رضی اللہ عنہ کی تائید کی تو ابوذر رضی اللہ عنہ نے ان کو پیٹا۔ انہی نظریات کی بنا پر حضرت

---

❶ صحیح بخاری، کتاب الزکاۃ، باب ما اُدی زکاته فلیس بکنز (حدیث: ۱۴۰۶، ۱۴۰۸)، صحیح مسلم، کتاب الزکاۃ، باب فی الکنازین للاموال (حدیث:۹۹۲)۔

❷ مستدرك حاکم ۳۰/ ۳۴۴)

❸ صحیح بخاری، کتاب الرقاق۔ باب المکثرون هم المقلون(حدیث:٦٤٤٤)، صحیح مسلم۔ کتاب الزکاۃ، باب الترغیب فی الصدقة(حدیث:۳۲/ ۹۴)۔

* حضرت عبداللہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی بیوی ام ذر رضی اللہ عنہا نے کہا:'' اللہ کی قسم! حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ابوذر رضی اللہ عنہ کو ربذہ کی طرف نہیں نکالا بلکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوذر رضی اللہ عنہ کو فرمایا تھا کہ جب مدینہ کی آبادی سلع تک پہنچ جائے تو وہاں سے نکل جانا۔'' بخاری (ح:٦٤٤٤)۔ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:''اللہ کی پناہ اللہ کی قسم! کہ ابوذر رضی اللہ عنہ کو حضرت عثمان نے مدینہ سے نکالا ہو۔''

ابوذر رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے مابین ملک شام میں اختلاف پیدا ہو گیا تھا۔

عباد اور زاہدین کی ایک جماعت نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے مؤقف کی حمایت کی ہے۔جیسا کہ عبدالواحد بن زید کے متعلق کہا جاتا ہے۔اور بعض لوگ شبلی کو بھی انہی لوگوں میں سے شمار کرتے ہیں جن کا یہ مسلک ہے۔مگر پوری امت خلفاء راشدین؛ جمہور صحابہ اور تابعین [اور علماء کی رائے] اس کے خلاف ہے۔

صحیح بخاری میں یہ حدیث ثابت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''پانچ اوسق سے کم میں زکوٰۃ نہیں؛ اور نہ ہی پانچ اونٹ سے کم میں زکوٰۃ ہے اور نہ ہی پانچ اوقیہ چاندی سے کم میں زکوٰۃ ہے۔'' [صحيح بخاری:ج ۱ :ح:١٤٠٦]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پانچ وسق سے کم غلے پر زکوٰۃ کی نفی کی ہے۔اور اس میں یہ شرط نہیں لگائی کہ وہ اس مال کا محتاج ہو یا نہ ہو۔جمہور علماء کرام کا کہنا ہے کہ جس مال میں سے زکوٰۃ ادا نہ کی جائے وہ کنز ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ورثاء کے حصص مقرر کیے ہیں۔ظاہر ہے کہ میراث اسی شخص کی ہوتی ہے جس نے اپنے پیچھے مال چھوڑا ہو۔نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں بھی صحابہ میں ایسے لوگ کثیر التعداد تھے جن کے پاس بہت سا مال تھا مگر کسی نے ان کو ہدف ملامت نہ بنایا۔بہت سے انبیاء علیہم السلام بھی مال دار ہوئے۔حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ لوگوں پر وہ چیز واجب کرنا چاہتے تھے جو اللہ تعالیٰ نے ان پر واجب نہیں کی۔اور اس چیز میں لوگوں کی مذمت کرنا چاہتے تھے جس میں اللہ تعالیٰ نے ان کی مذمت نہیں کی۔اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ اپنے اس قول میں مجتہد تھے۔اور آپ کو اس اطاعت گزاری پر اللہ تعالیٰ اجر سے نوازیں گے جس طرح آپ کی مانند دوسرے تمام مجتہدین کو اجر وثواب ملے گا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان میں: ''میں نہیں چاہتا کہ میرے پاس خود احد پہاڑ کے برابر سونا ہو۔تیسری رات گزر جائے اور اس میں سے ایک دینار بھی میرے پاس باقی ہو۔'' مال کو تیسرے دن سے پہلے نکال دینے کا استحباب ہے وجوب نہیں۔اور ایسے ہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان: ''زیادہ مال دار لوگ بروز قیامت کم درجہ والے ہوں گے۔'' یہ اس بات کی دلیل ہے کہ جس کا مال بہت زیادہ ہوگا روزِ قیامت اس کی نیکیاں اتنی ہی کم ہوں گی؛ ایسا اس وقت ہوگا جب وہ اس مال میں سے اسی کثرت کے ساتھ خرچ نہیں کرے گا۔اس سے یہ واجب نہیں ہوتا کہ جس کی نیکیاں کم ہوں گی وہ جہنم میں جائے گا؛ جب تک کہ وہ کبیرہ گناہ کا ارتکاب نہ کرے؛ یا پھر اللہ تعالیٰ کے عائد کردہ فرائض میں سے کسی فریضہ کو ترک نہ کرے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ پوری طرح سے اپنی رعایا کی نگہبانی اور اصلاح کیا کرتے تھے۔ان میں سے کسی کو ظلم کرنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی؛ نہ ہی اغنیاء کو اور نہ ہی فقراء کو۔جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا دور آیا تو مالدار لوگوں نے دنیا میں بڑی وسعت اختیار کر لی۔یہاں تک کہ بہت سارے لوگ مباحات میں انواع واقسام اور مقدار کے لحاظ سے بہت آگے نکل گئے۔ادھر حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے اس میں اس حد تک مبالغہ آمیزی سے کام لیا کہ لوگوں کو ایک مباح چیز سے بھی روک دیا؛ یہی بات فتنہ کا سبب بنی اور پھر حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ ان سے الگ ہو گئے۔اس کے علاوہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے کوئی دوسری غرض نہیں تھی۔

'' حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کا سچے لہجے والا ہونا'' اس سے کہیں بھی یہ لازم نہیں آتا کہ آپ دوسرے لوگوں افضل ہوں۔بلکہ

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ مومن تھے مگر ان میں کمزوری موجود تھی۔ نبی کریم ﷺ نے ان کو مخاطب کرکے فرمایا تھا:

اے ابوذر! میں دیکھتا ہوں کہ تم کمزور ہو میں تمہارے لیے وہی چیز پسند کرتا ہوں جو اپنے لیے۔ دیکھیے دو آدمیوں کا بھی امیر نہ بننا۔ اور نہ کسی یتیم کے سرپرست بننا۔'' ❶

اور یہ بھی صحیح اور ثابت شدہ حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

''طاقت ور مومن اللہ تعالیٰ کو کمزور مومن سے عزیز تر ہے۔ یوں دونوں اچھے ہیں۔'' ❷

چونکہ اہل شوریٰ صحابہ رضی اللہ عنہم حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ اور ان کے امثال کی نسبت اقوی ہیں، یہ لوگ ضعیف اور کمزور ہیں۔ پس وہ اہل ایمان جو خلافت نبوت کے اہل ہیں جیسے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ بدیں وجہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ اور ان کے امثال سے افضل ہیں۔

اور مذکورہ بالا حدیث جن الفاظ میں رافضی نے ذکر کی ہے؛ صرف ضعیف ہی نہیں بلکہ موضوع ہے؛ اس کی کوئی سند نہیں ہے جس سے حجت قائم ہو سکے۔

حدود الٰہی کی پامالی کا الزام اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ:

[اعتراض]: شیعہ مصنف کا یہ قول کہ: ''حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں شرعی حدود کی پرواہ نہیں کی جاتی تھی۔ چنانچہ امیر المؤمنین کے آزاد کردہ غلام ہرمزان کے قصاص میں عبید اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو قتل نہیں کیا تھا؛ حالانکہ وہ اسلام لا چکا تھا۔ امیر المؤمنین نے عبید اللہ کو قصاص کے لیے طلب کیا تھا۔ مگر وہ بھاگ کر معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس چلا گیا۔ ولید رضی اللہ عنہ جب شراب نوشی کا مرتکب ہوا تو عثمان رضی اللہ عنہ اس پر حد نہیں لگانا چاہتے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حد شرعی قائم کی اور فرمایا میری موجودگی میں شرعی حدود کو پامال نہیں کیا جا سکتا۔'' [شیعہ کا بیان ختم ہوا]

[جواب]: پہلی بات: شیعہ مصنف کا قول کہ: ''ہرمزان امیر المؤمنین کا آزاد کردہ غلام تھا۔''

ہم کہتے ہیں یہ صاف جھوٹ ہے۔ [یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا آزاد کردہ غلام نہ تھا] بلکہ ہرمزان ان فارسیوں میں سے تھا جنہیں کسریٰ نے مسلمانوں سے جنگ کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ مسلمانوں نے اسے قید کیا تھا، اور پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے پیش کیا۔ اس نے اسلام کا اظہار کیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس پر احسان کرکے اسے آزاد کردیا تھا۔ اگر اس پر کسی کی ولایت تھی تو وہ مسلمانوں کی تھی۔ اور اگر آزاد کرنے کی وجہ سے کسی کی ولایت اس پر تھی تو پھر وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہیں۔ اور اگر اس پر کسی کی کوئی ولایت نہیں تھی؛ بلکہ اس کا معاملہ ان قیدیوں کی طرح تھا جنہیں اگر احسان کرکے آزاد کردیا جائے تو ان پر کوئی ولایت نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ علماء کرام کا اختلاف ہے کہ اگر قیدی اسلام قبول کرلے تو کیا وہ اپنے اسلام کے باوجود غلام بن جائے گا یا پھر آزاد ہی رہے گا۔ اس پر احسان کرکے آزاد کرنا اور اس کے بدلہ میں فدیہ لے کر آزاد کرنا دونوں امر جائز ہیں؛ جیسے اسلام سے پہلے تھا؟ حالانکہ اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ قیدی اسلام لانے کی وجہ سے معصوم الدم ہوگیا ہے۔

❶ صحیح مسلم، کتاب الامارة، باب کراهة الامارة بغیر ضرورة (حدیث: ١٨٢٦)۔

❷ صحیح مسلم، کتاب القدر، باب الایمان بالقدر والاذعان له (حدیث: ٢٦٦٤)۔

اس مسئلہ میں دو قول مشہور ہیں ۔اور امام احمد رحمہ اللہ کے مذہب میں بھی دو قول ہیں ۔

اس کو غلام بنانے اور آزاد کرنے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جہد و سعی کو کوئی دخل نہیں ہے ۔

جب حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو قتل کیا گیا تو آپ کو قتل کرنے شخص حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کا مجوسی غلام ابولولؤ فیروز تھا۔ ابولولؤ اور ہرمزان کے مابین مجانست پائی جاتی تھی ۔ اور عبید اللہ بن عمر رحمہ اللہ کو بتایا گیا کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو قتل کیا گیا؛ اس وقت ابولولؤ کو ہرمزان کے ساتھ دیکھا گیا تھا۔ ہرمزان اس بات سے متہم تھا کہ اس نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قاتل کی امداد کی ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو قتل کیا گیا تو آپ نے ان سے کہا تھا:

''تم باپ بیٹا دونوں یہ چاہتے تھے کہ مدینہ میں عجمی کافروں کی بھرمار ہو جائے گی۔''

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے دریافت کیا: ''ہم ان کو قتل نہ کر دیں۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''تم جھوٹ بولتے ہو؛ جب یہ تمہاری بولی بولنے لگے اور تمہارے قبلہ کی طرف متوجہ ہو کر نماز پڑھنے لگے ہیں تو تم ان کو کیوں کر قتل کر سکتے ہو؟

غور کیجیے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فقاہت اور دینداری کے باوجود حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مدینہ میں پائے جانے والے عجمی کفار کو قتل کرنے کی اجازت طلب کرتے ہیں۔ اس لیے ان کا اعتقاد تھا کہ جب وہ فساد بپا کرتے ہیں تو پھر ان کا قتل کرنا جائز ہے ۔ پھر عبید اللہ ہرمزان کے قتل کو کیوں کر جائز نہ سمجھتے ہوں گے؟

جب عبید اللہ نے ہرمزان کو قتل کر دیا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مسند خلافت پر متمکن ہوئے تو آپ نے عبید اللہ کو ہرمزان کے قصاص میں قتل کرنے کے بارے میں صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ لیا۔ متعدد صحابہ نے اس کو قتل نہ کرنے کا مشورہ دیا اور کہا ابھی کل اس کے والد حضرت عمر رضی اللہ عنہ شہید ہوئے اور آج اسے قتل کر دیا جائے تو اس سے بڑا فساد رونما ہوگا۔

گویا ان کے نزدیک ہرمزان کا معصوم الدم ہونا مشتبہ تھا۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہرمزان کا شمار ان حملہ آور فسادیوں میں تھا جن سے دفاع کرنے کا استحقاق حاصل ہے ۔ یا پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قتل میں شریک لوگوں میں سے تھا جن کا قتل جائز تھا؟

علماء وفقہاء کا قتل میں شریک لوگوں کے بارے میں؛ جب بعض قتل کریں اور بعض اس کے پیچھے کارفرما ہوں؛ تو اس میں اختلاف ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ قصاص صرف براہ راست قتل کرنے والے سے لیا جائے گا۔ یہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا قول ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ: جب سبب قوی ہو تو مباشر [براہ راست قتل کرنے والا] اور متسبب [اس کا سبب بننے والا] دونوں کو قصاص میں قتل کیا جائے گا؛ جیسے کہ مجبور کیا گیا اور مجبور کرنے والا ۔ اس کی مثال زنا اور قصاص کے گواہوں کی ہے جب وہ اپنی گواہی سے رجوع کریں اور کہیں کہ ہم نے جان بوجھ کر یہ جھوٹی گواہی دی تھی ۔ جمہور جیسے امام مالک' امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ کا یہ مسلک ہے۔

پھر اگر ایک نے پکڑا ہو اور دوسرے نے قتل کیا ہو؛ تو امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں: پکڑنے والے اور قتل کرنے والے دونوں کو قصاص میں قتل کیا جائے گا۔ امام احمد رحمہ اللہ سے بھی دو روایتوں میں سے ایک یہی ہے ۔ اور دوسری روایت یہ ہے کہ قتل کرنے والے کو قتل کیا جائے گا اور پکڑنے والے کو تا حیات قید کیا جائے گا؛ یہاں تک کہ وہ مر جائے ۔ جیسا کہ حضرت ابن

عباس رضی اللہ عنہ سے بھی روایت کیا گیا ہے کہ قصاص صرف قتل کرنے والے پر ہے ۔ یہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب ہے۔

پھر ایسے ہی قتل کا حکم دینے والے کے بارے میں بھی اختلاف ہے جب وہ قتل کرنے پر مجبور نہ کرے؛ اور کسی ایسے آدمی کو قتل کرنے کا حکم دے جس کے قتل کرنے کو وہ حرام سمجھتا بھی ہو۔تو کیا اس صورت میں حکم دینے والے کو بھی قتل کیا جائے گا یا نہیں؟اس میں دو قول ہیں۔

جب کہ مددگار؛ راہزنی یا اس طرح کے کاموں میں جس کی مدد کی ضرورت ہوتی ہے؛[اس کے بارے میں] جمہور علماء کرام رحمہم اللہ کا مذہب یہ ہے کہ مددگار اور براہ راست مجرم دونوں پر حد جاری کی جائے گی ۔ امام ابوحنیفہ' امام مالک ؛ اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ کا یہی مذہب ہے۔حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ڈاکوؤں کے لیے راستہ کی نگرانی وحفاظت کرنے والے کو بھی قتل کرنے کا حکم دیا کرتے تھے۔

جب ہرمزان کا شمار حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قتل پر مدد کرنے والوں میں ہوتا ہے تو ایک قول کے مطابق اس کو قصاص میں قتل کرنا جائز تھا۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ صنعاء میں قتل ہونے والے آدمی کے متعلق فرمایا کرتے تھے :

''اگر اس پر تمام صنعاء والے ٹوٹ پڑے ہوں تو میں اس کے بدلے میں ان سب کو قتل کردوں۔''

[حکمران کے قاتل کی سزا]:

ایسے ہی حکمران کو قتل کرنے والے کے بارے میں اختلاف ہے ۔کیا حاکم کے قاتل کو قصاص میں قتل کیا جائے گا یا حد میں قتل کیا جائے گا؟ اس میں امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب اور باقی مذاہب میں دو قول ہیں ۔

پہلا قول: انہیں حد میں قتل کیا جائے گا۔ جیسے بغاوت میں قتل کرنے والے کو حد لگا کر قتل کیا جاتا ہے۔اس لیے کہ حکمران کو قتل کرنے میں ڈاکہ زنی اور رہزنی سے بڑھ کر فساد ہے۔پس حکمران کو قتل کرنے والا اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرنے والا اور زمین میں فساد پھیلانے کی کوشش کرنے والا ہے ۔اسی پر حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما کے قتل کو قیاس کیا گیا ہے ؛ جب انہوں نے اپنے باپ کے قاتل عبدالرحمٰن بن ملجم کو قتل کردیا تھا۔ایسے ہی قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کا مسئلہ بھی ہے۔

جب ہرمزان حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قتل پر مدد کرنے والوں میں سے تھا تو اس کا شمار زمین میں فساد پھیلانے والے اور اعلان جنگ کرنے والوں میں سے ہوا؛ اس وجہ سے اس کو قتل کرنا واجب ٹھہرا۔

اگر فرض کرلیا جائے کہ قاتل ہرمزان معصوم الدم تھا۔تاہم عبید اللہ نے تاویل کی بنا پر اس کے قتل کو حلال تصور کیا تھا۔ اس لیے کہ اس کا شبہ صاف ظاہر تھا۔پس اس شبہ کی بنا پر قاتل کو قتل نہیں کیا جا سکتا تھا۔جس طرح حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے اس شخص کو قتل کردیا تھا جس نے لا الہ الا اللہ پڑھا تھا؛ آپ یہ سمجھے تھے کہ اس کلمہ کے پڑھنے سے یہ قتل سے نہیں بچ سکتا۔نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کی زبانی تعزیر کی ؛ اور ان کو قتل نہیں کیا اس لیے کہ آپ متاول تھے۔ [1]

---

[1] صحیح بخاری ، کتاب الدیات باب ومن احیاھا؛(حدیث:٦٨٧٢) ، صحیح مسلم ، کتاب الایمان ، باب تحریم قتل الکافر بعد قوله لااله الا الله (حدیث: ٩٦)۔

لیکن جس کو حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے قتل کیا؛ وہ قتل سے پہلے مباح الدم تھا؛ لیکن اس کے کلمہ پڑھ لینے کی وجہ سے اس کے معصوم الدم ہونے میں شک ہوگیا تھا۔

جب عبید اللہ بن عمر متاول تھے؛ اور ان کا اعتقاد تھا کہ ہرمزان نے ان کے والد کے قتل میں مدد کی ہے؛ اور ان کے لیے اب جائز ہوگیا ہے کہ وہ اسے قتل کر دیں۔ اس شبہ کی وجہ سے مجتہد کے لیے جائز ہو جاتا ہے کہ وہ اسے قصاص میں مانع قرار دے۔ اس لیے کہ قصاص کے مسائل میں بہت سارے مسائل اجتہادی ہیں۔

علاوہ ازیں ہرمزان کے خون کا مطالبہ کرنے والا بھی کوئی نہ تھا؛ بلکہ اس کے خون کا وارث حاکم ہی تھا۔ جب ایسی صورت حال ہو تو حاکم وقت کو شرعاً اختیار حاصل ہے کہ قاتل کو معاف کر دے یا اسے قتل کر دے یا دیت وصول کرے؛ تاکہ مسلمانوں کے حقوق ضائع نہ ہوں۔ بنا بریں حضرت عثمان نے آل عمر رضی اللہ عنہ کو معاف کر دیا اور ان سے دیت وصول نہ کی۔

جب اس طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے معاف کر کے عبید اللہ کی جان بچالی تھی؛ اور آپ کا یہ بھی خیال تھا کہ آل عمر کو بھی دیت کے قدر ادا کر دیا جائے؛ اس لیے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر تقریباً اسی ہزار قرض تھا۔ اور انہوں نے حکم دیا تھا کہ یہ قرض ان کی اولاد کے اموال سے ادا کیا جائے۔ ورنہ بنو عدی اور پھر قریش کے اموال سے یہ قرض ادا کیا جائے۔ اس لیے کہ کسی انسان کے رشتہ دار ہی اس کی طرف سے کوئی بوجھ برداشت کرتے ہیں۔ دیت کا مطالبہ اگر چہ عبید اللہ نے کیا تھا؛ یا عبید اللہ کے دیگر عصبی رشتہ داروں نے کیا تھا۔ جب یہ مسئلہ قتل خطاً کا تھا؛ یا پھر اس کے بدلہ میں معاملہ دیت پر آ گیا تھا۔ اب معاملہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قرض کا تھا؛ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قرض ادا کرنے میں ان کے اہل خانہ کی مدد کی۔ یہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ان محاسن میں سے ہے جن پر آپ کی مدح کی جانی چاہیے نہ کہ مذمت۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بیت المال میں مال کی بہت کثرت تھی۔ آپ لوگوں کو اس سے کئی گنا زیادہ عطیات دیا کرتے تھے۔ تو پھر آل عمر کو اس میں سے کیوں نہ دیتے؟۔

بہر حال کچھ بھی ہو یہ اجتہادی مسئلہ تھا؛ اجتہادی مسئلہ ہونے کی وجہ سے بہت سارے صحابہ کرام کی رائے یہ تھی کہ اسے قتل نہ کیا جائے۔ اور کچھ دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی رائے تھی کہ اسے قتل کیا جائے۔ لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جو کچھ اپنے اجتہاد کی وجہ سے کیا؛ صحابہ کرام میں سے کسی ایک نے بھی اس پر اعتراض نہیں کیا۔ اور نہ ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اجتہادی فیصلوں پر کسی نے کلام کیا۔

ہم نے حاکم کے قتل کے بارے میں ائمہ کرام رحمہم اللہ کا اختلاف ذکر کیا ہے۔ کیا یہ مسئلہ قتل زمین پر فساد پھیلانے کے باب سے تعلق رکھتا ہے کہ حاکم کے قاتل کو حتمی طور پر قتل ہی کیا جائے گا [اس میں دیت یا معافی کی کوئی گنجائش نہیں]۔ جیسے کہ ڈاکوؤں یا مال و اسباب چھیننے والوں کو حتمی طور پر قتل ہی کیا جا سکتا ہے؛ یا باقی عام قتل کی طرح یہ بھی ایک قتل ہی ہے کہ کوئی کسی کو اپنی کسی خاص غرض کی وجہ سے قتل کرتا ہے تو اس صورت میں قاتل کو قصاص میں قتل کیا جاتا ہے۔ اس مسئلہ میں ہم نے دو قول ذکر کیے ہیں۔ امام احمد رحمہ اللہ کے مذہب میں بھی یہی دو قول ہیں انہیں قاضی ابو یعلی رحمہ اللہ اور دوسرے لوگوں نے ذکر کیا ہے۔

جو لوگ کہتے ہیں کہ: اسے حد میں قتل کیا جائے گا۔ ان کا کہنا ہے کہ: حکمران کو قتل کرنے کے جرم سے اتنا فتنہ و فساد پھیلتا ہے کہ اتنا فساد ڈاکہ زنی یا راہزنی کی وجہ سے نہیں پھیلتا۔ تو حاکم کو قتل کرنے والا ایسے ہی ہے جیسے اللہ اور اس کے رسول سے

اعلان جنگ کرنے والا اور زمین میں فساد پھیلانے والا۔

اس کی دلیل صحیح حدیث میں ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جب تمہارے پاس کوئی آئے اور تمہارا نظام ایک آدمی کے ہاتھ میں ہو اور وہ تمہاری جماعت میں تفریق پیدا کرنا چاہتا ہو تو اسے قتل کر دو؛ خواہ وہ کوئی بھی ہو۔'' [صحیح مسلم ۳/ ۱۴۷۹؛ وسنن ابو داؤد ٤/ ٣٣٤]

پس آپ ﷺ نے جماعت میں تفریق پیدا کرنے کا ارادہ کرنے والے کو بھی قتل کرنے کا حکم دیا ہے۔تو پھر اس کا کیا حکم ہوگا جو مسلمان حکمران کو قتل کرے اور مسلمانوں کی جماعت میں تفریق پیدا کرے۔

جن لوگوں کا یہ قول ہے؛ وہ کہتے ہیں کہ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قاتل کو قتل کرنا حتمی طور پر واجب ہوگیا تھا۔اور ایسے ہی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں کو قتل کرنا بھی واجب ہوگیا تھا؛ اور ایسے ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے والے کو قتل کرنا حتمی طور پر واجب ہوگیا تھا۔

یہی جواب حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما کی طرف سے ان لوگوں کو دیا جاتا ہے جو آپ پر اعتراض کرتے ہیں۔ہم کہتے ہیں: انہوں نے [یعنی حضرت حسن نے] قاتل علی رضی اللہ عنہ کو کیسے قتل کر دیا جب کہ آپ کے وارثوں میں چھوٹے بھی تھے؛ بڑے بھی؛ اور چھوٹے بچے ابھی تک بلوغت کی حد کو نہیں پہنچے تھے؟ [یعنی ممکن ہے ان میں سے کوئی ایک دیت یا معاف کرنا چاہتا ہو]۔

تو حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی طرف سے اس کے دو جواب دیئے جاتے ہیں:

۱۔ اس قاتل کو قتل کرنا حتمی طور پر واجب ہوگیا تھا۔

۲۔ اس لیے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور آپ کے امثال کا قتل زمین میں سب سے بڑا فساد اور اللہ اور اس کے رسول سے جنگ ہے۔[زمین میں فساد پھیلانے والے کی حتمی سزا قتل ہے؛ لہٰذا آپ کا اقدام درست ہے]۔

ان میں سے بعض یہ جواب بھی دیتے ہیں کہ قصاص لینے کا اختیار صرف بڑی عمر کے افراد کو ہوتا ہے۔جیسا کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور امام مالک رحمہ اللہ کا مذہب ہے' اور امام احمد رحمہ اللہ سے بھی ایک روایت میں منقول ہے۔

حضرت عمر و عثمان اور علی رضی اللہ عنہم اجمعین کا قتل محاربہ کے باب سے ہے۔محاربہ میں براہ راست قتل کرنے والا اور اس کی مدد کرنے والا دونوں برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ پس اس بنا پر جس نے بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قاتلوں کی مدد کی تھی؛ بھلے وہ ایک کلمہ بول کر ہی کیوں نہ کی ہو؛ تو اس کا قتل کرنا واجب ہوگیا تھا۔اور ہرمزان ان لوگوں میں سے تھا جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قتل میں مدد کرنے والا تھا۔ جب معاملہ ایسے ہی تھا تو اس کو قتل کرنا واجب ہوگیا تھا۔لیکن اسے قتل کرنے کا اختیار حاکم وقت کو تھا۔لیکن عبید اللہ بن عمر نے اسے قتل کر کے غلطی کی تھی؛ اور امام کو یہ حق حاصل تھا کہ اس غلطی کو معاف کر دے۔ [1]

---

[1] یہ عجیب بات ہے کہ ہرمزان کے خون کا دعویٰ کھڑا کیا جاتا ہے حالانکہ وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قتل سے متہم تھا۔اس کے برعکس امام المسلمین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خون کا کچھ احترام ملحوظ نہیں رکھا جاتا۔جن کو بے گناہ ہونے کی حالت میں قتل کیا گیا تھا۔نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:''تین باتیں ہیں جس نے ان سے نجات حاصل کرلی وہ فلاح و بہبود سے ہم کنار ہوا۔(۱) میری وفات (۲) خلیفہ مظلوم کا ناحق قتل (۳) دجال۔'' مسند احمد (٤/ ١٠٥ - ١٠٦)، مستدرك حاكم (٣/ ١٠١)۔

[حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ہرمزان کا قصاص]:

❀ باقی رہا رافضی کا یہ قول کہ: ''حضرت علی رضی اللہ عنہ ہرمزان کے بدلہ میں عبید اللہ کو قتل کرنا چاہتے تھے۔''

❀ [ہم کہتے ہیں]: اگر یہ روایت صحیح بھی ثابت ہو جائے تو یہ بجائے خود حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں موجب قدح ہے۔ رافضہ کی کوئی عقل نہیں ہوتی۔ وہ ایسی باتوں پر مدح کرتے ہیں جو حقیقت میں مذمت کے قریب تر ہوتی ہیں۔اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ایک اجتہادی مسئلہ تھا۔ حاکم وقت کے عصمت الدم [معاف کرنے] کا فیصلہ کر دیا تھا۔تو پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے اس فیصلہ کو توڑنا کیونکر روا ہو سکتا تھا؟۔حضرت علی رضی اللہ عنہ مقتول کے وارث بھی نہیں تھے۔اور نہ ہی مقتول کے وارثوں نے قصاص کا مطالبہ کیا تھا۔جب اس کا حق بیت المال میں شمار ہوتا تھا تو پھر اس صورت میں امام وقت کو یہ اختیار حاصل تھا کہ وہ معاف کر دے۔ یہی بات حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے معاف کرنے میں بیان کی جاتی ہے۔ ہرمزان کا کوئی عصبی وارث نہیں تھا سوائے حاکم وقت کے ولی ہونے کے۔جب کوئی ایسا آدمی قتل ہو جائے جس کا کوئی ولی و وارث نہ ہو تو حاکم کو یہ اختیار حاصل ہوتا ہے کہ وہ اس قاتل کو قتل کر دے۔اور اسے یہ بھی اختیار حاصل ہوتا ہے کہ وہ اسے قتل نہ کرے' بلکہ دیت لے لے؛ یہ دیت مسلمانوں کا حق ہوگی۔اسے بیت المال کے مصارف میں خرچ کیا جائے گا۔ جب آپ نے آل عمر کے لیے دیت ترک کر دی تو یہ [اس وجہ سے کہ یہ] مسلمانوں پر ان کے حق کا کچھ حصہ تھا۔

بہر کیف جو بھی ہو؛ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انہیں معاف کر دیا تھا؛ تو اس کے بعد قتل کا مطالبہ بالکل بے معنی ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ اس مسئلہ میں مسلمانوں کا کوئی اختلاف ہو۔تو پھر یہ کیسے جائز ہو سکتا ہے کہ ایسا فعل حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کیا جائے؟

پھر ان سے یہ بھی سوال کیا جائے گا کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کب عبید اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو قتل کرنا چاہا تھا۔اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کب یہ قدرت حاصل ہوگئی تھی کہ وہ عبید اللہ کو قتل کر سکیں؟ اور آپ کو یہ فرصت ہی کب ملی تھی کہ حضرت عبید اللہ بن عمر ہی کے بارے میں سوچتے رہے ہوں؟ عبید اللہ کے ساتھ ہزاروں اس کے چاہنے والے تھے۔اس کے ساتھ معاویہ رضی اللہ عنہ بھی تھے۔اور وہ لوگ بھی جن میں عبید اللہ بن عمر کی نسبت بہت بڑی خیر پائی جاتی تھی۔حضرت علی رضی اللہ عنہ سے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو معزول نہیں کیا جا سکا۔بس صرف آپ کو معزول کرنا تھا۔تو پھر یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ آپ عبید اللہ کو قتل کر لیتے؟

جب سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا انتقال ہو گیا تو لوگ متفرق ہو گئے۔حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ ایک نیک انسان تھے؛ آپ مکہ چلے گئے۔آپ نے کسی ایک کی بھی بیعت نہ کی۔آپ فتنہ سے اس وقت تک علیحدہ رہے یہاں تک کہ لوگ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ پر جمع ہو گئے۔حالانکہ آپ کی محبتیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھیں۔اور یہ یقین رکھتے تھے کہ خلافت حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حق ہے۔اس لیے آپ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بہت زیادہ تعظیم کرتے تھے اور آپ سے دوستی رکھتے تھے اور آپ کی مذمت کرنے والوں سے آپ کا دفاع کیا کرتے تھے۔لیکن آپ مسلمانوں کو قتل کرنے کے مسئلہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نظریہ کے خلاف تھے۔اور آپ مسلمانوں کے ساتھ جنگ و قتال کے علاوہ ہر مسئلہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کر دیے جانے کے بعد عبید اللہ بن عمر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے جا ملے۔جس طرح دوسرے وہ لوگ جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف میلان اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بغض رکھنے والے تھے؛ وہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے

جا ملے تھے ۔ مگر اس کے باوجود عبید اللہ بن عمر کے بارے میں اس قدر فتنہ و فساد برپا کرنے کی خبر نہیں ملی جس قدر فتنہ و فساد محمد بن ابوبکر اور اشتر نخعی اور ان کے امثال نے برپا کیا تھا۔ بیشک یہ سارے لوگ جنگ کے بعد فتنہ میں مبتلا ہو گئے ۔ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت سے پہلے کچھ لوگ تھے جو مسلمانوں میں فتنہ پیدا کرنا چاہتے تھے ۔[مگر اللہ تعالیٰ نے محفوظ رکھا تھا]۔

یہ عجیب بات ہے کہ ہرمزان کے خون کا دعویٰ کر کے قیامت قائم کی جاتی ہے حالانکہ وہ نفاق سے متہم تھا؛ اس نے زمین میں فساد پھیلانے کی کوشش کر کے اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کی تھی؛ [اور وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قتل میں مدد سے متہم تھا]۔ اس کے برعکس امام المسلمین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خون کا کچھ احترام ملحوظ نہیں رکھا جاتا۔[جن کو بے گناہ ہونے کی حالت میں قتل کیا گیا تھا]۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو جنت کی بشارت دی تھی ۔ آپ اپنے دونوں بھائیوں [ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما] کی طرح انبیاء کرام علیہم السلام کے بعد اس امت کے افضل ترین انسان تھے ۔

یہ بات سبھی کو معلوم ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ امت کے خون سے سب سے زیادہ بچنے والے تھے ۔ اور جو کچھ تکالیف آپ کو پہنچی تھیں ان پر سب سے زیادہ صبر کرنے والے تھے ۔ جب آپ کا محاصرہ کیا گیا؛ اور آپ کو قتل کرنے کی کوشش کی گئی؛ اور ان فسادی لوگوں کے ارادے بھانپ لیے گئے تھے کہ وہ آپ کو قتل کرنا چاہتے ہیں ۔ اس وقت ہر طرف سے مسلمان آپ کی حفاظت اور مدد کے لیے آپ کے پاس پہنچنا شروع ہو گئے ؛ اور آپ کو ان لوگوں سے جنگ و قتال کا مشورہ دینے لگے ؛ مگر آپ رضی اللہ عنہ لوگوں کو برابر جنگ سے رکے رہنے کا حکم دیتے رہے ۔ اور آپ اپنے اطاعت گزاروں کو حکم دیتے کہ ان لوگوں سے جنگ نہ کی جائے ۔ اور یہ بھی روایت کیا گیا ہے کہ آپ نے اپنے غلاموں سے کہا تھا: جو کوئی جنگ سے اپنے ہاتھوں کو روکے رکھے؛ وہ آزاد ہے ۔'' آپ سے یہ بھی کہا گیا: آپ شام چلے جائیں؟ تو آپ نے فرمایا: '' میں اپنے دارِ ہجرت کو نہیں چھوڑوں گا ۔ تو آپ سے کہا گیا: پھر آپ ان باغیوں سے قتال کریں؟ فرمایا: میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں پہلا تلوار چلانے والا نہیں بننا چاہتا۔

مسلمانوں کے ہاں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی یہ بہت بڑی فضیلت تھی کہ آپ نے صبر کیا یہاں تک کہ آپ کو قتل کر دیا گیا۔ یہ بات بھی سب کو معلوم ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اجتہاد کی وجہ سے جو جنگ لڑی؛ اس میں جتنے لوگوں کا خون بہایا گیا؛ اس سے پہلے کبھی بھی مسلمانوں کا اتنا خون نہیں بہایا گیا۔ پس اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فعل آپ کی شان میں قدح کا موجب نہیں ہو سکتا؛ بلکہ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ خوارج اور نواصب جیسے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں قدح کرنے والے لوگوں سے آپ کا دفاع کرنا واجب تھا؛ تو اس میں بھی کوئی شک و شبہ نہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر ظلم کرنے والوں سے لڑنا بدرجہ اولی واجب اور حق پر تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نسبت مسلمانوں کے خون کو مباح جاننے سے بہت ہی دور تھے ۔ اور جو کوئی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر الزام لگاتا ہے کہ آپ مسلمانوں کے خون کو حلال و مباح سمجھتے تھے؛ حقیقت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ پر قدح و طعن کا دروازہ کھولنا چاہتا ہے؛ [اس لیے کہ آپ کے دور میں بہت زیادہ مسلمان قتل ہوئے ہیں]۔ اور جو لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بغض و دشمنی رکھتے ہیں؛ اور جنہوں نے آپ سے جنگ کی؛ ان کے لیے یہ کہنے کا جواز پیدا کرنا چاہتا ہے کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں کے بارے اللہ تعالیٰ کی حدود کو معطل کیا ۔ اس بارے میں اللہ تعالیٰ کی حد کو پامال کرنا ہرمزان کے قتل میں حدود کی پامالی سے زیادہ فساد پر مبنی ہے ۔

اور اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دفاع واجب ہے کہ آپ مجتہد اور معذور تھے ؛ یا عاجز آگئے تھے ؛ تو پھر اسی طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف سے عذر پیش کرنا زیادہ مناسب اور اولی ہے۔

[ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ پر حد]:

[اعتــــراض] : شیعہ مصنف کا یہ قول کہ:''ولید رضی اللہ عنہ جب شراب نوشی کا مرتکب ہوا تو عثمان رضی اللہ عنہ اس پر حد نہیں لگانا چاہتے تھے۔حتی کہ امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حد شرعی قائم کی۔''

[جــــواب] : یہ بیان ان دونوں حضرات [عثمان و علی رضی اللہ عنہما] پر جھوٹ ہے۔اصل حقیقت یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حکم سے ولید پر حد لگائی تھی۔صحیحین میں یہ ثابت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان پر حد لگاتے ہوئے تخفیف کی اور صرف چالیس کوڑے لگائے تھے۔اگر آپ اسی کوڑے لگاتے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اس پر اعتراض نہ کرتے۔ [1]

رافضی کا یہ قول کہ''میری موجودگی میں شرعی حدود کو پامال نہیں کیا جا سکتا۔''

یہ صریح کذب ہے۔اگر اس واقعہ کو سچا بھی تسلیم کرلیں تو یہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بہت بڑی فضیلت اور مدح کا موجب ہے ؛ کیونکہ آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول مان لیا ؛ اور آپ کو حد قائم کرنے سے نہیں روکا۔حالانکہ اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ حد قائم نہ کرنا چاہتے ہوتے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو روک سکتے تھے۔اس لیے کہ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کسی چیز کا ارادہ کرتے تھے تو پھر اسے کر گزرتے تھے۔اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بس میں نہیں تھا کہ آپ کو روک سکتے ۔اگر ایسا نہ ہوتا؛ حضرت علی رضی اللہ عنہ آپ کو کسی بھی کام سے جسے آپ برا سمجھتے ہوں' روکنے کی قدرت رکھتے ہوتے ؛ تو پھر اس کی باوجود جن باتوں کی وجہ سے آپ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر انکار نقل کیا جاتا ہے ؛ مگر اس کے باوجود حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آپ کو ان کاموں سے روکا نہیں؛ تو یہ امر خود حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں قدح و اعتراض کا موجب ہوتا۔

جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آپ کو حد قائم کرنے کا حکم دیا ؛ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ بات مان بھی لی ؛ تو اس سے آپ کا عدل و انصاف اور دین داری ظاہر ہوتی ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مذکورہ بالا ولید بن عقبہ کو کوفہ پر والی تعینات کیا تھا۔شیعہ کے نزدیک ایسا کرنا جائز نہ تھا۔اگر اسے والی تعینات کرنا حرام تھا؛ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اس سے روکنے پر قادر تھے؛ تو آپ پر واجب تھا کہ اس سے منع کرتے۔ جب

---

[1] صحیح مسلم:ح ۱۹۶۵ میں یہ حدیث اس طرح ہے کہ: حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر ہوا۔ان کے پاس ولید بن عقبہ کو لایا گیا ......اور اس کے خلاف دو آدمیوں نے گواہی دی۔ ان میں سے ایک نے گواہی دی کہ اس (ولید) نے شراب پی ہے۔دوسرے نے گواہی دی کہ اس نے اسے قے کرتے دیکھا ہے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اس نے شراب پیئے بغیر قے نہیں کی۔اے علی رضی اللہ عنہ! اٹھو اور اسے کوڑے لگا۔حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حسن رضی اللہ عنہ سے کہا اٹھو اور کوڑے مارو۔حضرت حسن نے کہا خلافت کی گرمی بھی اسی کے سپرد کریں جو اس کی ٹھنڈک کا والی ہے۔علی رضی اللہ عنہ نے اس بات کی وجہ سے حسن رضی اللہ عنہ سے ناراضگی کا اظہار فرمایا اور فرمایا اے عبداللہ بن جعفر اٹھو اور اسے کوڑے مارو۔پس انہوں نے اسے کوڑے مارے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ شمار کرنے لگے۔ یہاں تک کہ چالیس تک پہنچے تو فرمایا ٹھہر جا۔ پھر فرمایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے چالیس اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے بھی چالیس اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسی کوڑے لگوائے اور سب سنت ہیں اور مجھے یہ (چالیس کوڑے) زیادہ پسندیدہ ہیں۔[الدراوی؛ کشمیری]

آپ نے منع نہیں کیا تو یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاں جائز ہونے کی دلیل ہے۔ یا پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ ایسا کرنے سے عاجز تھے۔

اگر آپ اس کو والی بننے سے روکنے میں عاجز تھے ؛ تو پھر حد قائم کرنے سے عاجز نہیں آگئے؟ تو معلوم ہوا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بذات خود ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ پر حد قائم کرنے پر قادر نہ تھے اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ایسا نہ چاہتے ہوتے۔ جب عثمان رضی اللہ عنہ بھی حد قائم کرنا چاہتے تھے تو یہ ان کی دین داری اور عدل وانصاف کی دلیل ہے۔

یہ امر باعث حیرت و استعجاب ہے کہ شیعہ خود اس بات کے دعوے دار ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی موجودگی میں حدود کو پامال کیا جاتا رہا؛ حتی کہ خود حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں شرعی حدود کو پامال کیا جاتا رہا اور آپ تقیہ کی بنا پر خاموش رہا کرتے تھے۔ اگر آپ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی موجودگی میں یہ بات کہی بھی تھی تو اس لیے کہی ہوگی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور اس کے اعوان وانصار اقامت حدود میں ان کی اعانت کرتے تھے، اگر آپ اس سے تقیہ کرتے ہوتے تو یوں نہ کہتے۔ اور یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ان حضرات سے بڑھ کر حدود شریعت قائم کرنے پر قادر تھے۔ اس لیے کہ شیعہ کے قول کے مطابق تو حضرت علی رضی اللہ عنہ ان لوگوں کے سامنے حق کا اظہار کرنے پر قادر نہ تھے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ان لوگوں کی موجودگی میں عبید اللہ بن عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مقرر کردہ نائب ولید بن عقبہ پر حد قائم نہ کرسکے تھے۔

رافضیوں کا المیہ یہی ہے کہ یہ ایسی باتیں کرتے ہیں جو آپس میں متناقض ہوا کرتی ہیں۔

[عہد عثمانی اور اذان کا اضافہ]:

[اعتـــراض] :شیعہ مصنف لکھتا ہے:''عثمان رضی اللہ عنہ نے جمعہ میں ایک اذان کا اضافہ کیا جو بدعت ہے؛ یہ اذان اب تک سنت سمجھی جاتی ہے۔''

[جواب] : ہم کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عہدِ عثمانی میں بھی اس پر موافقت کا اظہار کیا تھا؛ اور اپنے عہد خلافت میں اسی پر عمل کیا اور اس اذان کو بند نہ کیا۔ حالانکہ اس کا بند کرنا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو معزول کرنے اور ان کے خلاف نبرد آزما ہونے سے آسان تر تھا۔ جیسا کہ آپ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد میں کئی ایک لوگوں کو والی بنانے پر اعتراض کیا تھا۔ بلکہ آپ نے مشورہ دیا تھا کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو ان کے منصب سے معزول کیا جائے۔ یہ بات معلوم شدہ ہے کہ ان والیان کو معزول کرنے اور ان کے ساتھ اُس جنگ کرنے کی نسبت بہت آسان تھا جس جنگ میں آخر کار آپ عاجز آگئے۔ [اگر زیادہ نہیں تو] کم از کم کوفہ اور اپنی عملداری کے دیگر علاقوں سے اس بدعت کو ختم کرنا تو آپ کے لیے آسان تھا۔ اور ایسا کرنا آپ کی قدرت واستطاعت سے باہر بھی نہ تھا۔ اور اگر آپ نے اس اذان کو بند کیا ہوتا تو لوگ یہ خبر نقل کرتے [اور تاریخ کی کتابوں میں اس کا کوئی وجود ہوتا]۔

اگر کہا جائے کہ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ اس اذان کو بند کردیتے تو لوگ اس کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔''

ہم کہیں گے کہ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ لوگ اس اذان کے مستحب ہونے میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ہم نوا تھے۔ اس کی حد یہ ہے کہ حضرت عمار بن یاسر، سہل بن حُنَیف اور دیگر سابقین اوّلین صحابہ رضی اللہ عنہم بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے موید تھے۔ اور اگر یہ اکابر صحابہ اس کا انکار کرتے تو کوئی بھی ان کی مخالفت نہ کرتا۔ مزید برآں اگر یہ بھی تسلیم کرلیا جائے کہ ان میں سے کسی ایک نے اختلاف بھی کیا تھا تو اجتہادی امور میں اختلاف ایک عام بات ہے۔ اس کی وجہ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر کوئی عیب

نہیں لگایا جاسکتا۔

اور اگر کہا جائے کہ یہ اذان بدعت ہے۔ اور اس سے مراد یہ ہو کہ یہ اذان اس سے پہلے موجود نہیں تھی۔ تو ہم کہیں گے کہ اہل قبلہ سے لڑنا بھی بدعت ہے۔ اس لیے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پہلے کسی حاکم نے اہل قبلہ سے قتال نہیں کیا۔[خود انصاف کیجیے] اس آذان کو اہل قبلہ کے ساتھ قتال سے کیا نسبت ہے؟۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ: یہ اذان اس لحاظ سے بدعت ہے کہ اس پر کوئی شرعی دلیل موجود نہیں۔ تو ان سے کہا جائے گا کہ: تمہیں یہ کیسے معلوم ہو گیا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے تو بغیر شرعی دلیل کے اس آذان کا اضافہ کیا؛ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس اہل قبلہ کو قتل کرنے کے لیے شرعی دلیل موجود تھی؟

مزید برآں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں جامع مسجد میں دوسری نماز عید کی بدعت کا اضافہ کیا۔ جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر و عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے دور میں ایک شہر میں ایک ہی جمعہ ہوا کرتا تھا۔ اور عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے موقع پر صرف ایک ہی بار عید کی نماز پڑھی جاتی تھی۔ جمعہ کی نماز لوگ مسجد میں پڑھا کرتے تھے اور عید کھلے میدان میں پڑھا کرتے تھے۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عرفہ کے دن اور جمعہ کے دن نماز سے پہلے خطبہ دیا کرتے تھے۔ اور عید کے دن نماز کے بعد خطبہ دیا کرتے تھے۔ جب کہ استسقاء کی نماز کے بارے میں اختلاف ہے۔

جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کا عہد آیا تو آپ سے کہا گیا: '' شہر میں ایسے کمزور اور معذور لوگ ہیں جو عید گاہ کی طرف نکلنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک نائب مقرر فرمایا جو مسجد میں ان لوگوں کو عید پڑھایا کرتا۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے تکبیرات کے ساتھ دو رکعت پڑھائیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ چار رکعت بغیر تکبیرات کے پڑھائیں۔

ایسے ہی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں بصرہ میں عرفہ کے دن خطبہ دیا۔ مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس پر کوئی انکار نہیں کیا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد میں جس اذان کا اضافہ کیا تھا؛ بعد میں لوگوں کا اس پر اتفاق ہو گیا۔ جیسے کہ اہل مذاہب اربعہ اور دوسرے لوگوں کے ہاں موجود ہے۔ جیسا کہ لوگوں کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اس سنت پر اتفاق ہو گیا تھا کہ رمضان میں تراویح کے لیے لوگوں کو ایک ہی امام پر جمع کر دیا۔

جب کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جو دو عیدیں پڑھنا شروع کی تھیں اس میں علماء کرام رحمہم اللہ کا اختلاف ہے۔ پھر عجیب بات یہ ہے کہ رافضی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر ان چیزوں کا انکار کرتے ہیں جو آپ نے حضرات صحابہ مہاجرین و انصار کی موجودگی میں اور ان کی موافقت سے کی تھیں؛ اور تمام مسلمانوں نے اس پر ان کی اتباع کی۔ جیسے جمعہ کے دوسری آذان۔ جب کہ خود شیعہ نے اذان میں "حَيَّ عَلٰى خَيْرِ الْعَمَلِ" اپنے مخصوص شعار [نشان] کا اضافہ کیا ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں، اور نہ ہی کسی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی کوئی چیز روایت کی ہے کہ آپ نے یہ الفاظ کہنے کا حکم دیا ہو [تو کیا یہ بدعت نہیں؟]

اگر نقلاً یہ ثابت ہو بھی جائے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ ابن عمر رضی اللہ عنہ بعض اوقات یہ الفاظ بطور تاکید کہا کرتے تھے۔ جس طرح بعض صحابہ "حَيَّ عَلَى الصَّلٰوةُ ، حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ" کے درمیان یہ الفاظ کہا کرتے تھے: اس کو نداء الامرا کہتے تھے اکثر علماء کے نزدیک یہ مکروہ ہے۔ بعض علماء کرام نے ایسا کہنے کی رخصت دی ہے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما اور دوسرے لوگوں سے اس کی کراہت منقول ہے۔

ہم یہ بات اضطراری طور پر جانتے ہیں کہ مدینہ طیبہ میں نبی کریم ﷺ کی مسجد میں جو اذان حضرت بلال اور ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہما دیا کرتے تھے؛ اور جو آذان حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہ مکہ میں دیا کرتے تھے؛ اور سعد القرظ مسجد قباء میں دیا کرتے تھے ؛ اس میں یہ مخصوص الفاظ نہیں ہیں جو کہ رافضی شعار سمجھے جاتے ہیں۔ اگر کہیں بھی کوئی ایسی بات ہوتی تو مسلمان اس کو ضرور نقل کرتے اور اس میں کوئی سستی یا کمی بیشی نہ کرتے۔ جیسا کہ اس سے بہت کم درجہ کی چیزیں بھی انہوں نے نقل کی ہیں۔ جب حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کی نقل کردہ آذان میں مذکورہ الفاظ نہیں تھے؛ اور کسی نے یہ زیادہ کردہ الفاظ نقل نہیں کیے تو اس سے معلوم ہوا کہ ایک باطل امر اور بدعت ہے۔

یہ چاروں حضرات نبی کریم ﷺ کی اجازت سے آذان دیا کرتے تھے۔ انہوں نے نبی کریم ﷺ سے ہی آذان سیکھی تھی۔ اور افضل ترین مساجد میں آذان دیا کرتے تھے؛ مسجد الحرام مکہ مکرمہ؛ مسجد نبوی مدینہ طیبہ؛ مسجد قباء؛ مدینہ طیبہ۔ اور ان کی آذان عوام وخواص کے ہاں تواتر کے ساتھ مشہور ہے۔

یہ بات بھی سبھی جانتے ہیں کہ مسلمانوں کے ہاں قرآن کے اعراب سے بڑھ کر تواتر کے ساتھ آذان نقل کی گئی ہے۔ جیسا کہ ﴿وَ أَرْجُلَكُمْ﴾ کا اعراب وغیرہ۔ اسلامی شعائر میں نماز سے بڑھ کر مشہور کوئی دوسری چیز نہیں۔ بقیہ تمام اسلامی شعائر سے بڑھ کر شہرت آذان کو حاصل ہوئی ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ آذان کی صفات کے بارے میں اختلاف ہے۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ: احادیث میں جو بھی نقل صحیح سند کے ساتھ ثابت ہے؛ وہ سنت ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہ کو جو آذان سکھائی تھی؛ اس میں ترجیع ہے۔ اور اس کی اقامت آذان کی طرح دو دو بار ہے۔ اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ﷺ نے جو آذان سکھائی تھی؛ اس میں آذان کے کلمات دو دو بار ہیں' جب کہ اقامت کے کلمات ایک ایک بار ہیں۔ ان کی آذان میں ترجیع نہ تھی۔ اس لیے اقامت کے الفاظ کو افراد میں نقل کرنا بھی صحیح اور ثابت ہے۔ اور دو دو بار کے الفاظ بھی بغیر کسی شک وشبہ کے صحیح ہیں۔ محدثین کرام نے ان دونوں طریقوں کو صحیح کہا ہے۔

اس کی دوسری مثال تشہد کے الفاظ کا متعدد طرق سے روایت کیا جانا ہے۔ لیکن آخر کار حجاز میں اقامت کے اکہرے کلمات مشہور ہوگئے؛ جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو تعلیم دی تھی۔ جب کہ ترجیع کے کلمات سراً کہے جاتے ہیں۔ اور بعض لوگوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ابو محذورہ رضی اللہ عنہ کو یہ الفاظ ترجیع کے ساتھ اس لیے سکھائے تھے کہ ایمان آپ کے دل میں جڑ پکڑ جائے۔ ترجیع کے کلمات آذان کا حصہ نہیں تھے۔ لیکن اس بات پر اتفاق ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ابو محذورہ رضی اللہ عنہ کو ان کلمات کی تلقین کی تھی۔ تو اس وجہ سے لوگوں کے مابین معروف آذان میں کوئی اختلاف باقی نہ رہا۔ [1]

[1] ترجیع یہ ہے کہ جب مؤذن آذان دیتے ہوئے أشہد أن محمداً رسول اللہ کہتا تو پھر دوبارہ سے دو دو بار اشہد أن لا إلہ إلا اللہ اور أشہد ان محمداً رسول اللہ کہتا۔ اس صورت میں آذان دینے کو ترجیع کہتے ہیں۔ اور جب آذان ایسے دی جائے تو اقامت میں ایک بار کلمات کہے جائیں۔ یہ سنت ہے۔

[کیا مسلمان حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف تھے؟]:

[اعتراض]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ''سب مسلمان حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کو قتل کر دیا گیا۔ مسلمانوں نے عثمان رضی اللہ عنہ کی مخالفت کی اور اس کے کاموں پر تنقید کی۔ یہاں تک کہ ان کو قتل کر دیا گیا۔ لوگوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کہا تھا آپ نے بدر میں شرکت نہ کی۔ اور غزوۂ احد کے دن بھاگ گئے۔ بیعت الرضوان میں بھی شامل نہ ہوئے۔ خلاصہ یہ کہ ایسے واقعات لاتعداد ہیں۔''

[جواب]: رافضی کا اعتراض: ''سب مسلمان حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کو قتل کر دیا گیا۔''

اگر اس سے مراد یہ ہے کہ مسلمان حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اس حد تک مخالف تھے کہ وہ آپ کو مباح الدم خیال کرتے تھے اوران تمام نے آپ کو قتل کرنے کا حکم دیا تھا۔ اور آپ کے قتل پر راضی رہے تھے؛ یا آپ کے قتل میں مددگار ثابت ہوئے تھے۔ تو پھر اس کے بارے میں ہر انسان جانتا ہے کہ یہ صریح کذب و بہتان ہے۔ اس لیے کہ آپ کو چند ظالم باغیوں نے قتل کیا تھا۔ [سابقین اوّلین صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین اس پر رضا مند نہ تھے]۔ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

''خدا قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ پر لعنت کرے، وہ چوروں کی طرح بستی کی پچھلی جانب سے داخل ہوئے۔ اللہ ان کو ہر طرح سے غارت کرے۔ ان میں سے وہی لوگ بھاگنے میں کامیاب ہوئے جو راتوں رات بھاگ گئے تھے اور مسلمانوں کو خبر بھی نہ تھی۔ مدینہ میں جو لوگ موجود تھے انھیں معلوم نہ تھا کہ یہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کرنا چاہتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ آپ کو شہید کرنے میں کامیاب ہوگئے۔''

اور اگر اس سے مراد یہ ہو کہ: تمام مسلمان آپ کے خلاف ہوگئے تھے؛ آپ کے ہر ایک فعل میں آپ کی مخالفت کرتے تھے۔ یہ جن امور میں بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر انکار کیا گیا ہے' ان میں تمام مسلمان آپ کے مخالف تھے؛ تو یہ کہنا بھی بالکل جھوٹ ہے۔ اس لیے کہ کوئی بھی چیز ایسی نہیں جس میں سب لوگ آپ کے خلاف ہوگئے ہوں، بلکہ اکثر آپ کے ہم خیال تھے۔ آپ پر جو جو اعتراضات کیے گئے تھے۔ ان میں اکثر مسلمان آپ کو حق بجانب قرار دیتے تھے۔ اس کی حد یہ ہے کہ جو شیعہ علماء مداہنت فی الدین کے عادی نہیں ہیں وہ بھی حضرت عثمان کی تائید کرتے ہیں۔ جن لوگوں نے ان اعتراضات کے بارے میں حضرت عثمان کا ساتھ دیا ہے وہ ان مسلمانوں کی نسبت اکثر و افضل ہیں جنھوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر وارد کردہ مطاعن سے متعلق جملہ امور یا اکثر امور میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی پشت پناہی کی تھی۔ یا تو تمام امور میں ہی ایسا تھا یا پھر غالب امور میں ایسا تھا۔ بہت سارے امور میں حق بات حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہوا کرتی تھی۔ بعض امور میں آپ مجتہد تھے؛ اور بعض امور میں آپ کے مخالف اجتہاد پر تھے۔ خواہ یہ اجتہاد درست ہو یا خطأ۔

جب کہ آپ کے قتل میں شریک لوگ سارے کے سارے خطا پر تھے۔ یہی نہیں بلکہ ظالم اور باغی اور سرکشی کرتے تھے۔ اگر یہ بات تسلیم بھی کر لی جائے کہ ان میں کوئی ایسا انسان بھی ہوسکتا ہے جس کے گناہ اللہ تعالیٰ نے معاف کر دیے ہوں تو پھر بھی اس سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مظلوم مقتول [اور جنتی] ہونے میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

[اعتراض] شیعہ مصنف لکھتا ہے: ''لوگوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کہا: آپ نے بدر میں شرکت نہ کی۔ آپ احد

میں بھاگ گئے اور بیعت رضوان میں شریک نہیں ہوئے تھے۔''

[جواب]: ہم کہتے ہیں یہ جاہل شیعہ کا قول ہے] مسلمانوں یہ بات بہت کم ہوئی ہے[جہالت کی وجہ سے] دو یا تین افراد نے یہ اعتراض کیا تھا۔ حضرت عثمان و ابن عمر رضی اللہ عنہما نے ان معترضین کو جواب دیا تھا کہ:

۱۔ بدر کے دن غائب رہنے کی وجہ یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیٹی سیدہ رقیہ رضی اللہ عنہا کی تیمارداری کے لیے حضرت عثمان کو مدینہ میں رہنے دیا تھا۔ واپسی پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے مال غنیمت میں سے آپ کو بھی حصہ دیا تھا۔

۲۔ بیعت رضوان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا ہاتھ قرار دیکر ان کی طرف سے بیعت کی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ آپ کے ہاتھ سے ہر حال میں بہتر اور افضل تھا۔ اس بیعت کا سبب بھی آپ ہی تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو سفیر بنا کر مکہ بھیجا تھا۔ جب آپ کو خبر پہنچی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کر دیا گیا ہے تو آپ نے صحابہ سے موت کی بیعت لی۔ تو اس بیعت میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بھی شریک تھے۔ اس لیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو خاص طور پر قریش کے پاس روانہ فرمایا تھا تاکہ آپ قریش سے مل کر بات کر سکیں۔ قریش نے آپ کو کہا کہ: آپ بیت اللہ کا طواف کر لیں؛ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور باقی صحابہ کرام کو رہنے دیں؛ تو آپ نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ آپ نے فرمایا: اس وقت تک میں بیت اللہ کا طواف نہیں کر سکتا جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیت اللہ کا طواف نہ کر لیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے ارادہ کیا تھا کہ اس کام کے لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو روانہ کیا جائے۔ مگر آپ نے گزارش کی کہ مکہ مکرمہ میں ان کے حمایتی نہیں ہیں۔ جب کہ اس کام کے لیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مناسب ہیں؛ بنو امیہ کی بڑی تعداد آپ کی حمایت کے لیے مکہ میں موجود ہے۔ آپ کا شمار بھی مکہ کے سرداروں میں سے ہوتا ہے' اس لیے قبیلہ کے لوگ آپ کی حمایت کریں گے۔

۳۔ صحابہ میں سے جو لوگ جنگ احد سے واپس آ گئے تھے اللہ تعالیٰ ان کو معاف کر دیا تھا اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿إِنَّ الَّذِينَ تَوَلَّوْا مِنكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ إِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطَانُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوا وَلَقَدْ عَفَا اللَّهُ عَنْهُمْ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ حَلِيمٌ﴾ (آل عمران:۱۵۵)

''بے شک وہ لوگ جو تم میں سے اس دن پیٹھ پھیر گئے جب دو جماعتیں لڑ پڑیں، شیطان نے انھیں ان بعض اعمال ہی کی وجہ سے پھسلایا جو انھوں نے کیے تھے اور بلاشبہ یقیناً اللہ نے انھیں معاف کر دیا، بیشک اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت بردبار ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے احد کے دن پلٹ کر واپس چلے جانے والے تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عام معافی کا اعلان کر دیا تھا۔ تو اس معافی میں وہ لوگ بھی داخل تھے جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے بہت کم درجہ کے تھے۔ پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اس میں کیسے داخل نہیں ہو سکتے کہ آپ کی اتنی بڑی فضیلت ہے' اور آپ کی نیکیاں اور بھلائیاں انتہاء درجہ کی ہیں۔

❁❁❁❁

فصل:

[مسلمانوں کے مابین اختلافات]

[اشکال]: رافضی کہتا ہے:''علامہ شہرستانی جو کہ امامیہ کے خلاف انتہائی سخت متعصبین میں سے ہے' اس نے ذکر کیا ہے کہ: ابلیسی شبہ کے بعد فساد کی سب سے پہلی کڑی رسول اللہ ﷺ کی بیماری میں واقع ہونے والا اختلاف ہے ۔ پہلا اختلاف آپ ﷺ کی بیماری میں ہی پیدا ہوا ۔ جسے امام بخاری نے اپنی سند سے نقل کیا ہے۔ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب نبی کریم ﷺ کی مرض الموت کی تکلیف بڑھ گئی تو آپ نے فرمایا:''قلم دوات لاؤ کہ میں تمھیں کچھ لکھ دوں، جس کی موجودگی میں تم میرے بعد گمراہ نہ ہوگے۔ عمر رضی اللہ عنہ نے کہا:''آپ کے حواس بجا نہیں ہمارے لیے اللہ کی کتاب کافی ہے۔'' جب شوروغل بپا ہوا تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''میرے یہاں سے چلے جاؤ نبی کے پاس شوروغل زیب نہیں دیتا۔'' [انتہیٰ کلام الرافضی]

[جواب]: جو کچھ علامہ شہرستانی یا ان جیسے دوسرے مصنفین نے''الملل و النحل ''میں نقل کیا ہے۔اس میں عام طور پر یہ لوگ ایک دوسرے سے ہی نقل کرتے ہیں۔اور بہت سارے اقوال اس میں نقل نہیں بھی کیے گئے۔ اور ایسے عام ہی عام طور پر نقل کیے جانے اقوال کی سند نہیں ذکر کی گئی۔ بلکہ انہوں نے عقائد اور فرق کے بارے میں پہلے سے تحریر شدہ کتابوں سے نقل کی ہے۔مثلاً: ابوعیسی الوراق؛ یہ رافضی مصنف تھا؛ اس پر بھی بہت زیادہ نقل کی تہمت ہے ۔اور ایسے ہی ابو یحی اور ان کے علاوہ دوسرے شیعہ مصنفین ۔ اور ایسے ہی انہوں نے زیدیہ اور معتزلہ کی کتابوں سے بھی نقل کی ہے حالانکہ یہ دونوں فرقے بہت سارے صحابہ کرام پر طعنہ زنی کے مرتکب ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ آپ دیکھ سکتے ہیں کہ: امام اشعری رحمہ اللہ نے جو کچھ نقل کیا ہے' وہ ان کی نقل سے بہت زیادہ صحیح ہے۔اس لیے کہ آپ فرقوں اور عقائد کے ماہر تھے۔اور اس بارے میں جھوٹوں کے جھوٹ سے بہت زیادہ بچ کر رہنے والے تھے۔مگر اس کے باوجود آپ کی منقولات میں اور عام طور پر ان مصنفین کی منقولات میں جو کہ سند اور صاحب قول کے الفاظ کا لحاظ کئے بغیر کلام نقل کر دیتے ہیں' ایسی غلطیاں پائی جاتی ہیں جن کی وجہ سے ان لوگوں کے عقیدہ اور ان سے نقل کئے گئے الفاظ میں فرق صاف ظاہر نظر آتا ہے۔ یہاں تک کہ فقہاء کرام جب ایک دوسرے کا مذہب نقل کرتے ہیں تو اس میں بھی بہت زیادہ غلطیاں پائی جاتی ہیں۔اگرچہ نقل کرنے والے کا مقصد کذب بیانی نہیں ہوتا۔اور ایسے لوگوں کے بارے میں غلط بیانی ہوجاتی ہے جس کے بارے میں جھوٹ بولنے میں کوئی مقصد یا غرض نہیں ہوتی؛ بلکہ وہ انسان اس دوسرے کی تعظیم بجالانے والا اور اس کے پیروکاروں میں سے ایک ہوتا ہے۔

تمام مسلمانوں کا رسول اللہ ﷺ کی تعظیم' آپ سے دوستی و موالات اور آپ کی اتباع کے واجب ہونے پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے۔مگر اس کے باوجود علماء حدیث کے علاوہ بہت سارے دوسرے علماء سے آپ سے حدیث روایت کرنے میں غلطی ہوجاتی ہے۔اور کبھی آپ ﷺ کے کلام میں ایسی کمی و زیادتی ہوجاتی ہے جس سے معنی بدل جاتا ہے۔ بلکہ

ان امور کی معرفت میں بھی غلطی ہو جاتی ہے جو کہ عام اہل علم کے ہاں بھی تواتر کے ساتھ مشہور و معروف ہوتے ہیں۔

ہم نے اگر چہ رافضی مصنف کی نقل کردہ روایات میں بہت سارے جھوٹ کو واضح کیا ہے؛ لیکن یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ بہت ساری منقولات میں یہ جان بوجھ کر جھوٹ نہیں بولتا۔ نہ ہی یہ اور نہ ہی اس جیسے دوسرے مصنفین۔ لیکن پھر بھی کبھی عمداً جھوٹ واقع ہو جاتا ہے اور کبھی غلطی یا حافظہ کی خرابی کی وجہ سے۔ پھر باقی لوگ اسے یا تو اپنی خواہشات کی وجہ سے قبول کر لیتے ہیں یا پھر انہیں اس کا صحیح علم نہیں ہوتا۔ خواہشات نفس انسان کو اندھا اور بہرا کر دیتی ہیں۔ خواہش پرست اپنی خواہش کے موافق چیز کو بغیر کسی دلیل کے بھی قبول کر لیتا ہے۔ اور اپنے مخالف کی بات کو بغیر کسی دلیل اور حجت کے رد کر دیتا ہے۔

❀ تمام فرقوں میں کوئی فرقہ ایسا نہیں جو کہ رافضیوں سے بڑھ کر حق بات کی تکذیب اور باطل کی تصدیق کرنے والا ہو۔ اس لیے کہ اس مذہب کے سرغنے اور مؤسسین جنہوں نے اس فرقہ کی بنیاد رکھی؛ وہ زندیق اور ملحد لوگ تھے۔ جیسا کہ کئی ایک اہل علم نے یہ بات بیان کی ہے؛ اور غور کرنے والے کے لیے یہ معاملہ بالکل ظاہر ہے۔

❀ جب معاملہ ایسے ہی ہے تو ہم کہتے ہیں: صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے جو فضائل و مناقب اور محاسن کتاب و سنت اور نقل متواتر سے ثابت ہیں' ان کو منقطع اور محرّف اور نا قابل حجت روایات سے رد نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے کہ یہ اصول ہے کہ یقین کو شک کی بنیاد پر رد نہیں کیا جا سکتا۔ اور ہمیں اس بات پر یقین ہے جس پر کتاب و سنت اور ہم سے پہلے سلف صالحین کا اجماع اور منقولات متواترہ کے ساتھ ساتھ عقل بھی دلالت کرتی ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین انبیاء کرام علیہم السلام کے بعد سب سے افضل ترین مخلوق ہیں۔ پس ان پر مشکوک اور قابل قدح امور کی بنیاد پر شک نہیں کیا جا سکتا۔ تو پھر وہ امور ان کی شان میں کیسے قابل قدح ہو سکتے ہیں جن کا باطل ہونا سب کو معلوم ہے۔

❀ رافضی کا یہ کہنا کہ: ''شہرستانی امامیہ مذہب کے خلاف سخت ترین تعصب رکھنے والوں میں سے تھا۔''

❀ [جواب: ہم کہتے ہیں]: ایسا ہرگز نہیں تھا۔ بلکہ وہ بہت ساری باتوں میں شیعہ مذہب کی طرف میلان رکھتا تھا۔ بلکہ کبھی کبھار ان میں سے اسماعیلیہ ملاحدہ کا کلام نقل کرتا اور اس کی توجیہ کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ بعض لوگوں نے اس پر اسماعیلی ہونے کا الزام لگایا ہے۔ اگر چہ حقیقت میں معاملہ ایسے نہیں تھا۔ جن لوگوں نے اس پر یہ تہمت لگائی ہے؛ انہوں نے اپنے اس دعوی پر شہرستانی کے کلام اور اس کی سیرت سے کچھ شواہد بھی پیش کیے ہیں۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ بعض وجوہات کی بنا پر شیعہ کے ساتھ تھا اور بعض وجوہات کی بنا پر امام اشعری رحمہ اللہ کے ساتھ تھا۔

❀ اس طرح کی باتیں بہت سارے واعظین اور متکلمین کے کلام میں آ جاتی ہیں۔ یہ لوگ صحیفہ علی بن حسین میں ماثور دعائیں مانگا کرتے تھے۔ حالانکہ ان میں سے اکثر دعائیں علی بن حسین رضی اللہ عنہ پر جھوٹ گھڑی گئی ہیں۔

خلاصہ کلام! شہرستانی کا شیعہ مذہب کی طرف میلان صاف ظاہر ہے۔ بھلے وہ باطن میں بھی ایسا ہی تھا یا پھر صرف بطور مداہنت و لجاجت کے ایسا کرتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کتاب ''الملل والنحل'' اس نے ایک شیعہ رئیس کے لیے تصنیف کی تھی۔ اسے ولایت دیوانیہ حاصل تھی۔ اور شہرستانی کا مقصد یہ تھا کہ اس کا دل نرم کیا جائے۔ ایسے ہی اس شیعہ رئیس کے لیے ایک اور کتاب "المصارعة" بھی تصنیف کی گئی ہے؛ جس میں اس کے مابین اور ابن سینا کے مابین تقابل و نزاع

کا بیان ہے۔ اس لیے کہ یہ مصنف خود شیعیت اور فلسفہ کی طرف مائل تھا۔ اس کا سب سے بہتر حال یہ ہوسکتا ہے کہ اگر یہ خود اسماعیلی یا ملحد نہ بھی ہو تب بھی شیعہ ضرور ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کتاب میں واضح طور پر شیعہ مذہب کی طرف میلان ظاہر کیا گیا ہے۔

❀ اگر چہ اس کے علاوہ اس کی دیگر کتابوں میں امامیہ مذہب کو باطل ثابت کیا گیا ہے؛ تو یہاں پر یہ واضح ہو جاتا ہے جس شیعہ رئیس کی خاطر یہ کتاب لکھی گئی ہے' اس کی محبت حاصل کرنے کے لیے مداہنت سے کام لیا گیا ہے۔

❀ ایسے ہی وہ شبہ جسے شہرستانی نے اپنی کتاب ''الملل والنحل'' کے شروع میں نقل کیا ہے جو ابلیس اور ملائکہ کے مابین مناظرہ کا واقعہ ہے؛ اس طرح کی چیزیں تو منقولات کی بنیاد پر ہی معلوم ہوسکتی ہیں؛ مگر اس نے اس واقعہ کی کوئی سند ذکر نہیں کی۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس واقعہ کی کوئی سند ہی نہیں۔ اس لیے کہ یہ قصہ نہ ہی نبی کریم ﷺ سے منقول ہے اور نہ ہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی ایک سے۔ نہ ہی مشہور ائمہ اسلام میں سے کسی ایک نے یہ قصہ ذکر کیا اور نہ ہی اہل کتاب کے ہاں اس قسم کی کوئی روایت پائی جاتی ہے۔ حالانکہ اس قسم کے واقعات انبیاء کرام علیہم السلام سے منقول ہونے کی بنیاد پر ہی معلوم ہو سکتے ہیں۔ البتہ اس قصہ کا کچھ حصہ نصاری کی بعض کتابوں میں اور بعض دوسرے فرقوں کی کتابوں میں پایا جاتا ہے۔

❀ شہرستانی اکثر طور پر فرقوں کے عقائد معتزلہ کی کتابوں سے نقل کرتا ہے۔ حالانکہ یہ لوگ تقدیر کے منکر ہیں۔ پس یہاں سے یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ تقدیر کو جھٹلانے والے بعض لوگوں نے یہ قصہ گھڑ لیا ہوتا کہ تقدیر کو ثابت ماننے والے لوگوں پر حجت قائم کی جاسکے۔ واللہ اعلم۔ جیسا کہ یہ لوگ یہودیوں کی زبانی شعر بھی گھڑ لیا کرتے تھے۔

ہم نے دیکھا ہے کہ منکرین تقدیر اکثر طور پر کفار کی زبانی ایسے قصے گھڑ لیتے ہیں جنہیں وہ اللہ تعالیٰ پر حجت بنا سکیں۔ ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ کیسے تقدیر کو جھٹلایا جاسکے۔ اور جو کوئی اس کی تصدیق کرتا ہے یقیناً وہ اللہ تعالیٰ کے خلاف مخلوق کے حق میں حجت قائم کرسکیں۔ جیسا کہ ہم نے یہ بھی دیکھا ہے کہ بہت سارے شیعہ یہود کی زبان پر حجتیں گھڑ لیتے ہیں اور پھر اہل سنت والجماعت سے کہتے ہیں: یہودیوں کے اس شبہ کا جواب دو۔ اور ایسی باتیں ان عوام الناس کے سامنے کرتے ہیں جو اس حجت کے فساد و بطلان کو نہیں جانتے۔

❀ رافضی مصنف کا یہ کہنا کہ: ''ابلیسی شبہ کے بعد فساد کا سب سے پہلا اختلاف رسول اللہ ﷺ کی بیماری کے متعلق واقع ہوا۔''

❀ [جواب]: یہ ایک باطل دعوی اور کھلا ہوا جھوٹ ہے۔ اگر اس سے رافضی کی مراد یہ ہے کہ یہ سب سے پہلا گناہ کا کام تھا جس کا ارتکاب کیا گیا؛ تو یہ کئی ایک وجوہات کی بنا پر باطل ہے:

❀ پہلی وجہ: ابلیسی شبہ کی بنیاد پر ملائکہ میں کوئی اختلاف پیدا نہیں ہوا۔ اور نہ ہی یہ شبہ بنی آدم نے ابلیس سے سنا کہ ان کے مابین اختلاف پیدا کیا جائے۔

❀ دوسری وجہ: بنی آدم کے مابین حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ سے اختلاف چلا آرہا ہے۔ اسلام سے پہلے لوگوں کے مابین

جو اختلاف پایا جاتا تھا؛ وہ اسلام میں پائے جانے والے اختلاف کی نسبت بہت زیادہ تھا۔فرمان الٰہی ہے:

﴿ كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ وَ مَا اخْتَلَفَ فِيْهِ إِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِإِذْنِهٖ وَ اللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴾ [البقرۃ ۲۱۳]

’’دراصل لوگ ایک ہی گروہ تھے اللہ تعالیٰ نے نبیوں کو خوشخبریاں دینے اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا؛ اوران کے ساتھ سچی کتابیں نازل فرمائیں، تا کہ لوگوں کے ہر اختلافی امر کا فیصلہ ہو جائے۔صرف ان ہی لوگوں نے جو اسے دیئے گئے تھے، اپنے پاس دلائل آچکنے کے بعد آپس کے بغض وعناد کی وجہ سے اس میں اختلاف کیا؛ اس لئے اللہ پاک نے ایمان والوں کی اس اختلاف میں بھی حق کی طرف اپنی مشیت سے رہبری کی ؛ اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہے سیدھی راہ کی طرف رہبری کرتا ہے۔‘‘

❀ بدر کے موقع پر مسلمانوں کے مابین مال غنیمت کے مسئلہ میں اختلاف پیدا ہوا۔ مال جمع کرنے والوں نے کہا: یہ ہمارا حصہ ہے۔ اور دشمن کا پیچھا کرنے والوں نے کہا: اس پر ہمارا حق ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی حفاظت پر مامور حضرات کہنے لگے: یہ ہمارا حق ہے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

﴿يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ﴾ [الأنفال ۱]

’’آپ سے انفال کے متعلق پوچھتے ہیں۔ آپ فرما دیجیے: یہ اموال اللہ اوراس کے رسول کیلئے ہیں۔ پس تم لوگ اللہ سے ڈرتے رہو اور اپنے باہمی تعلقات درست رکھو۔‘‘

❀ واقعہ افک کے متعلق انصار کے مابین اختلاف پیدا ہوگیا تھا۔قریب تھا کہ دوگروہ آپس میں لڑ پڑتے؛ تو رسول اللہ ﷺ نے ان لوگوں کو خاموش کرادیا۔ یہ اختلاف ایک آدمی کے متعلق ہوا تھا کہ کیا اسے قتل کرنا جائز ہے یا ناجائز۔

❀ ایک بار انصار کے مابین ایک یہودی کی وجہ سے اختلاف پیدا ہوگیا جو کہ انہیں عہد جاہلیت کی ان جنگوں کی یاد دلا رہا تھا جو کہ اوس وخزرج کے مابین واقع ہوئیں۔ یہاں تک یہ دوگروہ آپس میں لڑ پڑے؛ قریب تھا کہ ایک دوسرے کو قتل کرنے لگ جائیں؛ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں:

﴿يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كٰفِرِيْنَ ☆ وَ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ وَ اَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَ فِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ وَ مَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾ [آل عمران ۱۰۰۔۱۰۱]

’’اے ایمان والو! اگر تم اہل کتاب کی کسی جماعت کی باتیں مانو گے تو وہ تمہارے ایمان لانے کے بعد مرتد وکافر بنا دیں گے۔ (گویا یہ ظاہر ہے کہ) تم کیسے کفر کر سکتے ہو؟ باوجودیکہ تم پر اللہ تعالیٰ کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں اور تم میں رسول اللہ (ﷺ) موجود ہیں جو شخص اللہ کے دین کو مضبوط تھام لے تو بلا شبہ اسے راہ راست دکھا دی گئی۔‘‘

صحیح احادیث میں ثابت ہے کہ: صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایک سفر میں تھے۔ان میں سے ایک مہاجر اور ایک انصاری آپس میں لڑ پڑے۔مہاجر نے آواز دی: اے مہاجرو! اور انصاری نے آواز لگائی: اے انصار۔تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''کیا تم جاہلیت کی پکار پکارتے ہو اور میں تمہارے درمیان موجود ہوں؛ اسے چھوڑ دو کیونکہ یہ ناز یبا بات ہے۔'' [البخاري ٦/ ١٥٣،مسلم ٤/ ١٩٩٨]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات مبارک میں بھی ایسا ہوتا تھا کہ صحابہ کرام کے مابین مرادِ رسول سمجھنے پر اختلاف ہو جاتا۔ جیسا کہ صحیحین میں ہے: حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہم لوگوں سے فرمایا:

''تم میں سے کوئی عصر کی نماز نہ پڑھے مگر بنی قریظہ میں پہنچ کر۔'' چنانچہ بعض لوگوں کے راستہ میں ہی عصر کا وقت ہوگیا۔تو بعض نے کہا کہ ہم نماز نہیں پڑھیں گے جب تک کہ بنی قریظہ تک نہ پہنچ جائیں۔ان لوگوں نے وہاں پہنچ کر غروب آفتاب کے بعد عصر کی نماز پڑھی۔اور بعض نے کہا: ''ہم تو نماز پڑھیں گے؛ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقصد یہ نہ تھا کہ ہم قضاء کریں۔ جب اس کا ذکر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی کو ملامت نہ کی۔'' [صحيح بخاری:ح٩٠٣۔مسلم ٣/ ١٣٩١]

❀ اور صحیح بخاری میں ہے: ''بنوتمیم کے سوار[وفد] آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آئے تو ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کی: ان کا امیر قعقاع بن معبد بن زرارہ کو بنایئے۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: نہیں ؛ بلکہ اقرع بن حابس کو بنائے۔

تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: تم صرف مجھ سے اختلاف کرنا چاہتے ہو۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: میرا مقصد آپ سے اختلاف کرنا نہیں۔

دونوں میں تکرار ہوئی یہاں تک کہ ان کی آوازیں بلند ہوگئیں۔تو اسی بارے میں یہ آیت نازل ہوئی:

﴿يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ﴾ [الحجرات ٢]

''اے ایمان والو! اپنی آوازیں نبی کی آواز سے بلند نہ کرو۔'' [صحيح بخاری : ج : دوم : ح ١٥٢٤]

اس واقعہ کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ انتہائی پست آواز میں گفتگو کیا کرتے تھے۔

❀ تیسری وجہ: آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مرض الموت میں جو واقعہ پیش آیا وہ انتہائی آسان ترین اور واضح تھا۔صحیح بخاری میں ہے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیماری کی حالت میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو مخاطب کرکے فرمایا:

''اپنے والد اور بھائی کو بلاؤ تاکہ میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کے لیے ایک عہد نامہ لکھوا دوں ؛ تاکہ میری بعد لوگ آپ کے مسئلہ میں کوئی اختلاف نہ کریں۔'' پھر اس کے بعد ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ اور مومنین ابوبکر رضی اللہ عنہ کے سوا کسی کو (خلیفہ) تسلیم نہیں کر سکتے۔'' [صحيح بخاری:٥٦٦٦)]

پھر جب جمعرات کا دن آیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارادہ کیا کہ ایک تحریر لکھوا دیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: بخار کی حالت میں کچھ کہہ رہے ہیں۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس بات کا پتہ نہ چل سکا کہ آپ یہ حکم شدت مرض کی وجہ سے دے

رہے ہیں یا حسب معمول (بقائمی ہوش وحواس) صحیح حالت میں یہ بات فرما رہے ہیں۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خوف محسوس ہورہا تھا کہ کہیں آپ بیماری کی حالت میں ایسا نہ فرمارہے ہوں ۔ جیسا کہ مریض کے ساتھ حالت مرض میں ہوتا ہے؛ یا آپ کا عام عرف کے مطابق کلام تھا جس کی اطاعت کرنی واجب تھی؛ یہ بات آپ پر ایسے ہی مخفی رہی تھی جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی موت مخفی رہی تھی ۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ قول بھی شک پر مبنی تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فوت نہیں ہوئے ۔ یہاں تک کہ دلیل و برہان سے آپ کی وفات ثابت ہوگئی۔''

پھر بعض لوگ کہہ رہے تھے: قلم کاغذ لیکر آؤ؛ اور بعض کہہ رہے تھے: ان کے لانے کی کوئی ضرورت نہیں ۔[نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم وہ عہد نامہ لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے جس کا ذکر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ہو چکا تھا]۔ جب آپ نے دیکھا کہ اب لوگ شک میں مبتلا ہو گئے ہیں تو آپ نے سوچا کہ اب یہ عہد نامہ لکھنے سے بھی شک کا ازالہ نہ ہوگا۔لہٰذا اب اس کے لکھنے کا کچھ فائدہ نہیں۔''اس لیے کہ لوگ سوچیں گے کہ کیا آپ نے بیماری کی حالت میں تبدیلی احوال کی بنا پر یہ عہد نامہ لکھوایا ہے یا پھر صحیح سلامتی کی حالت میں۔'' پس یہ تنازعہ اب ختم نہیں ہوگا۔''اس لیے آپ نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔

❀ یہ عہد نامہ لکھوانا ان امور میں سے نہیں تھا جو کہ اللہ تعالیٰ نے آپ پر واجب کیا ہو کہ اسے لوگوں کے لیے تحریر کروایا جائے یا پھر اس وقت میں اس کی تبلیغ کی جائے ۔اگر واقعی ایسا ہوتا تو پھر آپ اللہ تعالیٰ کے حکم کو کبھی بھی تعمیل کئے بغیر نہ چھوڑتے ۔لیکن آپ مصلحت اسی چیز میں سمجھتے تھے کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے بارے میں نزاع ختم کرنے کے لیے ایسا کرنا چاہتے تھے۔مگر جب آپ نے دیکھا کہ اب تو یہ اختلاف ہو کر ہی رہے گا ؛[اس لیے آپ نے اپنا ارادہ ترک کردیا]۔

❀ اس سے قبل آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب سے تین چیزیں مانگی تھیں؛ اللہ تعالیٰ نے دو چیزیں عطا فرمادیں' اور ایک سے منع کر دیا۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے سوال کیا کہ: آپ کی امت کو عام قحط سالی سے ہلاک نہ کرے۔اللہ تعالیٰ نے یہ چیز آپ کو دے دی۔ پھر آپ نے دعا مانگی کہ: ان کے اپنے علاوہ ان پر کوئی دشمن بھی مسلط نہ کرے۔'' یہ بھی آپ کو مل گیا۔ اور اللہ عزوجل سے سوال کیا کہ ان کی آپس میں ایک دوسرے سے لڑائی نہ ہو؛ تو اس سوال سے منع کر دیا گیا۔''[1]

❀ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول کہ:''مصیبت اس انسان کے لیے ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد لکھنے میں حائل ہوا۔'' یہ صحیح احادیث میں ثابت ہے۔ بلاشبہ عہد نامہ کا نہ لکھنا اس انسان کے لیے باعث مصیبت ہے جو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خلافت میں شک کرتا ہے؛ یا اس پر یہ امر مشتبہ ہے اگر آپ عہد نامہ لکھوا دیتے تو شک کا ازالہ ہو جاتا۔

❀ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما یہ بات اس وقت کہنا شروع کی جب خوارج اور روافض نے پر و پرزے نکالنے شروع کئے۔

---

[1] صحیح مسلم:ح ۲۷٦۱: میں اس کی تفصیل ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن بنو معاویہ کی مسجد کے پاس سے گزرے تو اس میں تشریف لے گئے اور اس میں دو رکعتیں ادا کیں ؛ اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب سے لمبی دعا مانگی پھر ہماری طرف متوجہ ہو کر فرمایا میں نے اپنے رب سے تین چیزیں مانگیں پس دو چیزیں مجھ کو عطا کر دیں گئیں اور ایک چیز سے مجھے روک دیا میں نے اپنے رب سے مانگا کہ میری امت کو قحط سالی کے ذریعہ ہلاک نہ کرے پس یہ مجھے عطا کر دیا گیا اور میں نے اللہ عزوجل سے مانگا کہ میری امت کو غرق کر کے ہلاک نہ کر پس اللہ عزوجل نے یہ چیز بھی مجھے عطا کر دی اور میں نے اللہ عزوجل سے سوال کیا کہ ان کی آپس میں ایک دوسرے سے لڑائی نہ ہو تو مجھے اس سوال سے منع کر دیا گیا۔[دراوی؛ کشمیری]

وگرنہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کتاب اللہ کے مطابق فتوی دیا کرتے تھے۔ اور اگر کتاب اللہ میں کوئی چیز نہ پاتے تو سنت رسول اللہ ﷺ کے مطابق فتوی دیا کرتے۔ اور اگر سنت رسول اللہ ﷺ میں بھی کوئی چیز نہ ملتی تو پھر آپ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے فتوی کے مطابق فتوی دیا کرتے تھے۔ یہ حدیث ابن عیینہ کی سند سے عبداللہ بن ابی یزید سے ثابت ہے؛ انہوں نے اسے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے۔

- حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے احوال کی معرفت رکھنے والا جانتا ہے کہ آپ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو حضرت علی رضی اللہ عنہ پر افضلیت اور ترجیح دیا کرتے تھے۔
- پھر یہ کہ رسول اللہ ﷺ نے عہد نامہ لکھوانے کا ارادہ اپنی مرضی سے ترک کیا۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں تھا۔ اگر آپ اس عہد نامہ کے لکھوانے پر اصرار کرتے تو کسی کے بس میں نہیں تھا کہ آپ کو اس سے منع کرتا۔
- اس قسم کے؛ بلکہ ان سے بڑھ کر تنازعات تو رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں پیش آئے ہیں۔ اہل قباء کے مابین پیش آنے والا معاملہ اس سے بڑھ کر تھا۔ جس کے متعلق یہ آیات نازل ہوئیں:

﴿وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا﴾ [الحجرات ۹]

''اور اگر مسلمانوں کی دو جماعتیں آپس میں لڑ پڑیں تو ان میں میل ملاپ کرا دیا کرو۔''

لیکن روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ انہوں نے اس لڑائی میں کھجور کی شاخوں اور جوتوں کا استعمال کیا تھا۔

- رافضی اپنی جہالت کی وجہ سے یہ گمان کرتے ہیں کہ شائد رسول اللہ ﷺ یہ تحریر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے لیے لکھوانا چاہتے تھے۔ اس پورے قصہ میں کوئی بھی بات ایسی نہیں ہے جو کسی بھی طرح اس موقف پر دلالت کرتی ہو۔ اور نہ ہی محدثین اور اہل علم کے ہاں کوئی ایسی معروف روایت پائی جاتی ہے جس میں یہ اشارہ ملتا ہو کہ آپ ﷺ نے اپنے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنایا تھا۔ جیسا کہ صحیح احادیث میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے دلائل پائے جاتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود یہ لوگ دعوی یہ کرتے ہیں کہ: رسول اللہ ﷺ سے ایسی نص جلی و قطعی کی روشنی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت ثابت ہے کہ جس کے بعد اس کے نہ ماننے کا کوئی عذر باقی نہیں رہتا۔ ہم کہتے ہیں: اگر واقعی رسول اللہ ﷺ نے ایسے کیا تھا تو پھر کوئی عہد نامہ لکھوانے کی ضرورت ہرگز نہ تھی۔ اور اگر معاملہ ایسے تھا کہ اس وصیت کے سننے والے آپ کی اتباع نہیں کریں گے تو پھر یہ احتمال بھی مکمل طور پر موجود تھا کہ وہ لکھی ہوئی بات کو بھی نہیں مانیں گے۔ تو پھر شیعہ گمان کے مطابق ایسا کوئی عہد نامہ لکھوا لینے میں کون سا فائدہ مضمر تھا۔

جیش اسامہ رضی اللہ عنہ کا من گھڑت قصہ:

[اعتـــــــراض]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ''دوسرا اختلاف: جو کہ آپ کی بیماری کی حالت میں پیش آیا کہ: نبی کریم ﷺ نے مرض الموت کی حالت میں متعدد بار فرمایا: اسامہ رضی اللہ عنہ کا لشکر بھیج دو۔ اللہ اس پر لعنت کرے جو اس لشکر میں شامل نہ ہو۔'' تو بعض لوگ کہنے لگے: ہم پر آپ کا حکم ماننا واجب ہے۔ اور اسامہ رضی اللہ عنہ تیار ہو چکے ہیں۔ اور کچھ لوگ کہنے لگے: ''آپ کی بیماری بہت بڑھ گئی ہے۔ اس حالت میں ہمارے دل آپ کی جدائی گوارہ نہیں کرتے۔''

[جواب] :اس قصہ کے جھوٹ ہونے پر تمام اہل علم کا اتفاق ہے۔ رسول ﷺ نے ہرگز یہ نہیں فرمایا:''اللہ اس پر لعنت کرے جو اس لشکر میں شامل نہ ہو۔'' اور نہ ہی یہ بات کسی ثابت شدہ سند کے ساتھ آپ سے منقول ہے۔ بلکہ کتب حدیث میں اس کی سرے سے کوئی سند ہی نہیں۔اور اصحاب اسامہ کو ان کے ساتھ جانے سے کوئی روکنے والا بھی نہیں تھا۔ بلکہ خود حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے خروج سے توقف کیا تھا۔ اس لیے کہ آپ کو رسول اللہ ﷺ کی وفات کا اندیشہ تھا؛ اس لیے یوں عرض گزار ہوئے تھے:''میں کیسے چلا جاؤں اور آپ کی یہ حالت ہے؟ کیا میں قافلوں سے آپ کے متعلق پوچھتا رہوں۔تو رسول اللہ ﷺ نے آپ کو کچھ دن رکنے کی اجازت مرحمت فرما دی۔ اگر رسول اللہ ﷺ جزم کے ساتھ آپ کو جانے کا حکم دیتے تو آپ کے لیے اطاعت کے علاوہ کوئی چارہ کار نہ تھا۔اور اگر اسامہ روانہ ہو جاتے تو آپ کے ساتھیوں میں سے کوئی ایک بھی پیچھے نہ رہتا۔ یہ تمام لوگ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد اس غزوہ پر روانہ ہوئے اور ان میں سے کوئی ایک بھی پیچھے نہیں رہا۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جیش اسامہ میں ہرگز نہیں تھے؛ اس پر تمام اہل علم کا اتفاق ہے۔البتہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں روایات میں آتا ہے کہ آپ اس لشکر میں شامل تھے۔اور آپ بعد میں ان کے ساتھ جانا چاہتے تھے؛ مگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اسامہ سے اجازت طلب کی کہ عمر رضی اللہ عنہ کو مدینہ میں رہنے دیا جائے؛ وہاں پر ان کی سخت ضرورت ہے۔تو آپ نے اس کی اجازت دیدی۔ حالانکہ جب رسول اللہ ﷺ کا انتقال ہوا تو جیش اسامہ رضی اللہ عنہ کی روانگی کے لیے سب سے زیادہ حریص انسان حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تھے۔ جمہور صحابہ نے دشمن کے خوف کے اندیشہ سے یہ مشورہ دیا تھا کہ جیش اسامہ کو ان حالات میں روانہ نہ کیا جائے۔ لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ فرمایا:

''اللہ کی قسم ! میں اس جھنڈے کو کبھی نہیں کھول سکتا جسے رسول اللہ ﷺ نے باندھا ہو۔''

جیش اسامہ کی روانگی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے شروع کے ایام میں سب سے بڑے مصلحت خیز کاموں میں سے تھی۔اس میں کوئی بھی چیز سبب اختلاف تھی ہی نہیں۔

❀ شہرستانی کو حدیث اور آثار صحابہ و تابعین کا کوئی علم و تجربہ نہیں۔یہی وجہ ہے کہ شہرستانی نے اپنی اس کتاب میں وہ اختلافات بھی نقل کیے ہیں جو مسلمانوں اور غیر مسلموں کے مابین نقل کیے جاتے ہیں۔لیکن اس کے باوجود اس نے اصول میں صحابہ و تابعین اور ائمہ اہل اسلام کا مذہب نقل نہیں کیا۔اس لیے کہ یہ اور اس جیسے دوسرے لوگ اصل میں اس چیز کی معرفت ہی نہیں رکھتے۔اور وہی چیز نقل کر دیتے ہیں جسے کتب مقالات میں پاتے ہیں۔اور ان کتابوں میں بہت سارے ایسے جھوٹ پائے جاتے ہیں جیسا کہ تاریخ کی کتابوں میں جھوٹ پایا جاتا ہے۔

❀ لیکن افتراء پرداز یہ گمان کرتے ہیں کہ: اس لشکر میں حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما بھی تھے۔اور ان کو اس لشکر میں نکالنے کا مقصد یہ تھا تاکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ خلافت کے مسئلہ پر اختلاف نہ کر سکیں۔ بلاشک و شبہ یہ جھوٹ اور بہتان وہی شخص گھڑ سکتا ہے جو رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے احوال سے سب سے بڑا جاہل ہو۔اور جان بوجھ کر سب لوگوں سے بڑھ کر جھوٹ بولنے والا ہو۔ورنہ نبی کریم ﷺ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو مرض وفات کے تمام ایام میں [

نمازیں پڑھانے کے لیے امام مقرر کر رکھا تھا]؛ آپ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کرتے تھے کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں۔ حالانکہ اس وقت سبھی لوگ موجود ہوا کرتے تھے۔

اگر رسول اللہ ﷺ لوگوں پر کسی بھی انسان کو والی بنا دیتے تو لوگ ضرور آپ کی اطاعت کرتے۔ مہاجرین و انصار اس انسان سے لڑ پڑتے تھے جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی کسی بات میں اختلاف کرتا ہو۔ یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے شروع سے آخر تک اللہ تعالیٰ کے دین کی نصرت کی تھی۔

❀ اور اگر رسول اللہ ﷺ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو نمازیں پڑھانے کے لیے امام بناتے تو کسی میں مجال نہیں تھی کہ اسے رد کر سکے۔ اور اگر حج میں آپ کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور باقی لوگوں پر امیر بنانا چاہتے تو پھر بھی کسی میں اختلاف یا رد کرنے کی جرأت نہیں تھی۔ اور ایسے ہی اگر رسول اللہ ﷺ صحابہ کرام سے یہ فرما دیتے: یہ میرے بعد تمہارا امیر اور امام ہے۔ تو کیا کوئی آپ کی بات کو رد کر سکتا تھا؟

❀ آپ کے ساتھ مہاجرین و انصار مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد تھی۔ یہ سبھی لوگ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کا دم بھرنے والے تھے؛ ان میں سے کوئی ایک بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بغض رکھنے والا نہیں تھا۔ اور نہ ہی کوئی ان لوگوں میں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اختلاف و بغض رکھنے والا تھا جن کے کسی قریبی کو آپ نے کسی غزوہ میں قتل کیا ہو۔

❀ رسول اللہ ﷺ فتح مکہ کے سال مکہ میں داخل ہوئے تو آپ کے ساتھ دس ہزار کا لشکر تھا۔ ایک ہزار مجاہدین بنو سلیم سے تھے' ایک ہزار بنو مزینہ سے' جہینہ سے ایک ہزار' بنی غفار سے ایک ہزار۔ اور باقی لشکر بھی اسی طرح سے تھا۔ اور رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے: ''قبیلہ اسلم کو اللہ تعالیٰ نے سالم رکھا؛ اور قبیلہ غفار کی اللہ تعالیٰ نے بخشش فرما دی۔'' اور فرمایا کرتے تھے: ''قریش انصار جہینہ مزینہ اسلم اور غفار کے قبائل میرے دوست ہیں اوران کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی دوستی حاصل ہے۔'' [صحیح بخاری:ج:۲؛ ح ۷۳۸]

❀ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں میں سے کسی ایک کو بھی قتل نہیں کیا۔ اور نہ ہی انصار میں سے کسی ایک کو قتل کیا۔ اس کے برعکس حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب سے اسلام لائے؛ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نسبت مشرکین سے بہت سخت دشمنی رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مشرکین بھی سب صحابہ سے بڑھ کر آپ سے نفرت رکھتے تھے۔ لوگ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سختی اور شدت کی وجہ سے آپ سے دور بھاگتے تھے۔ ایسا حال حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نہیں تھا۔ ان سے لوگ اتنا بغض و نفرت نہیں رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آپ کو خلیفہ متعین کیا تو بعض لوگوں نے اس بات کو ناپسند کیا۔ اور بعض لوگوں نے تو حق کی ناپسندیدگی کی وجہ سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے تکرار بھی کیا۔ اس لیے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اللہ کے معاملہ میں کسی ملامت گر کی ملامت کی پرواہ نہیں کیا کرتے تھے۔ پس یہاں کوئی ایسا سبب نہیں پایا جاتا تھا کہ جس کو رسول اللہ ﷺ اپنی نبوت والی زبان سے خلیفہ و امام مقرر کر دیں؛ اور اس کے متعلق نص موجود ہو' اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کو پیچھے کر دیں اور جس کا حق بعد میں ہوا سے [یا بغیر حق کے کسی کو] آگے کر دیں یا صاحب حق کو حق سے محروم کر دیں۔

❀ اور اگر رسول اللہ ﷺ نے کسی خوف کے پیش نظر ان دو کو جیش اسامہ رضی اللہ عنہ میں نکالا بھی ہوتا تو آپ لوگوں کو یہ بھی کہہ

دیتے کہ ان دونوں کی بیعت نہیں کرنا۔ ہائے افسوس! کوئی یہ تو بتائے کہ رسول اللہ ﷺ کو کس سے خوف لاحق تھا؟ اللہ تعالیٰ نے آپ کی مدد فرمائی' آپ کو غلبہ اور سربلندی عطا فرمائی؛ آپ کے ارد گرد مہاجرین و انصار کی ایک جماعت تھی جنہیں اگر رسول اللہ ﷺ یہ حکم دیتے کہ اپنے والدین اور بیٹوں کو قتل کر ڈالو' تو وہ ضرور ایسا کر گزرتے۔

❀ اللہ تعالیٰ نے سورت برأت نازل فرمائی؛ جس میں منافقین سے پردہ چاک کیا؛ اور مسلمانوں کو ان کی پہچان کروائی۔ یہ لوگ رسول اللہ ﷺ اور عام مسلمانوں کے نزدیک پست' ذلیل اور سرنگوں و حقیر تھے۔ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما رسول اللہ ﷺ کے قریب ترین اشخاص میں سے تھے۔ اور آپ کے نزدیک لوگوں میں سب سے زیادہ عزت مند' محبوب' اور خاص الخواص تھے۔ دن اور رات میں ہر وقت باقی تمام لوگوں سے بڑھ کر آپ کی صحبت میں رہنے والے تھے۔ اور سب سے بڑھ کر رسول اللہ ﷺ کی موافقت اور محبت رکھنے والے تھے۔ آپ ﷺ کے حکم کی تعمیل اور اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے سب سے بڑھ کر حریص تھے۔ تو پھر کوئی مسلمان کیسے اس بات کو جائز سمجھ سکتا ہے کہ: یہ دونوں حضرات رسول اللہ ﷺ کے نزدیک منافقین کی جنس سے تعلق رکھتے تھے۔ منافقین کے بارے میں صحابہ کو علم تھا کہ رسول اللہ ﷺ ان سے بے رخی برتتے تھے؛ اور آپ کے نزدیک سب سے بڑھ کر ذلیل یہی لوگ تھے۔ سورت برأت نازل ہونے کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین ان کے قریب بھی نہیں پھٹکتے تھے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کا تو یہ فرمان ہے:

﴿لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ وَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّ الْمُرْجِفُوْنَ فِي الْمَدِيْنَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُوْنَكَ فِيْهَآ اِلَّا قَلِيْلًا۝مَّلْعُوْنِيْنَ اَيْنَمَا ثُقِفُوْٓا اُخِذُوْا وَ قُتِّلُوْا تَقْتِيْلًا﴾ [الأحزاب ٦٠۔٦١]

''اگر منافق لوگ اور وہ جن کے دلوں میں مرض ہے اور مدینہ میں دہشت انگیز افواہیں پھیلانے والے باز نہ آئے تو ہم آپ کو ان کے خلاف اٹھا کھڑا کریں گے۔ پھر وہ تھوڑی ہی مدت آپ کے پڑوس میں رہ سکیں گے۔ یہ لوگ ملعون ہیں جہاں بھی یہ پائے جائیں انہیں پکڑ کر بری طرح قتل کر دیا جائے گا۔''

ان آیات کے نزول کے بعد یہ لوگ نفاق کا اظہار کرنے سے باز آ گئے۔

جب کہ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما رسول اللہ ﷺ کے نزدیک انتہائی محبوب اور سب سے بڑھ کر عزت والے تھے۔

[رسالت مآب ﷺ کی وفات میں اختلاف]:

[اشکال]: رافضی نے کہا ہے: ''تیسرا اختلاف: نبی کریم ﷺ کی موت میں واقع ہوا۔''

[جواب]: اس میں کوئی شک نہیں کہ شروع میں آپ ﷺ کی وفات کا معاملہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر مخفی رہا۔ پھر دوسرے دن اس کا اقرار کرلیا۔ اور یہ اعتراف کرلیا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کا انکار کرنے میں خطاء پر تھے۔ پس یہ اختلاف ختم ہوگیا۔ یہ حدیث کے الفاظ ویسے نہیں ہیں جس طرح شہرستانی نے ذکر کئے ہیں۔

صحیح بخاری و مسلم میں [ابوسلمہ کا بیان ہے کہ] حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ باہر نکلے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ لوگوں سے گفتگو کر رہے تھے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا کہ: بیٹھ جاؤ۔ انہوں نے انکار کر دیا۔ پھر کہا کہ: بیٹھ جاؤ۔ انہوں نے پھر انکار کیا۔

چنانچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے تشہد پڑھا لوگ ان کی طرف متوجہ ہوئے اور عمر کو چھوڑ دیا؛ آپ نے فرمایا:

((أما بعد! فمن كان منكم يعبد محمداً صلى الله عليه وسلم فإن محمداً صلى الله عليه وسلم قد مات ومن كان يعبد الله فإن الله حي لا يموت . قال الله تعالى:

﴿وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ وَ مَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا وَ سَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ﴾ [آل عمران ۱۴۴]

''امابعد! تم میں سے جو شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کرتا تھا۔ تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا گئے ہیں۔ اور جو کوئی اللہ کی عبادت کرتا تھا تو اللہ زندہ ہے، نہیں مرے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

''(حضرت) محمد صلی اللہ علیہ وسلم صرف رسول ہی ہیں۔ آپ سے پہلے بہت سے رسول ہو چکے۔ کیا اگر ان کا انتقال ہو جائے یا شہید ہو جائیں تو تم اسلام سے اپنی ایڑیوں کے بل پھر جاؤ گے اور جو کوئی پھر جائے اپنی ایڑیوں پر تو اللہ تعالیٰ کا کچھ نہ بگاڑے گا عنقریب اللہ تعالیٰ شکر گزاروں کو نیک بدلہ دے گا۔''

[آپ فرماتے ہیں:] بخدا اس سے پہلے لوگ گویا جانتے ہی نہ تھے کہ اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی ہے، یہاں تک کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی لوگوں نے یہ آیت ان سے سن کر اخذ کی اور کوئی شخص سنا نہیں جاتا تھا مگر اس کی تلاوت کرتا تھا۔ [صحيح بخاري:ج ۱:ح ۱۱۷۷]

حضرت سعید بن مسیب رحمہ اللہ فرماتے ہیں: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اللہ کی قسم! میں نے جب سنا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اس کی تلاوت فرما رہے تھے؛ یہاں تک کہ میری ٹانگوں نے جواب دیدیا اور میں زمین پر گر پڑا اور مجھے علم ہو گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انتقال فرما گئے ہیں۔'' [البخاری ۲/ ۷۲]

[امامت میں اختلاف]:

[اعتـــــراض]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ''چوتھا اختلاف: امامت میں واقع ہوا۔ امت میں سب سے بڑا اختلاف امامت کا اختلاف ہے۔ کہ اس طرح اسلام کی چھاؤنی پر تلوار لہرائی گئی جیسا کہ ہر دور میں امامت پر تلوار آویزاں رہی ہے۔''

[جواب]: ہم کہتے ہیں: یہ سب سے بڑی غلط بات ہے۔ الحمد للہ کہ حضرت ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین کے زمانے میں اسلام پر کوئی تلوار آویزاں نہیں تھی۔ اور نہ ہی ان حضرات کے دور میں مسلمانوں میں کوئی اختلاف پایا جاتا تھا۔ اور نہ ہی اس دور میں مسئلہ امامت میں کوئی اختلاف تھا۔ چہ جائے کہ تلوار چل رہی ہو۔ اور نہ ہی ان کے مابین کسی دینی معاملہ پر تلوار سونتی گئی تھی۔ بعض انصار نے کچھ ایسی باتیں کی تھیں کہ ان کے بڑوں نے ہی ان باتوں کو رد کر دیا؛ جیسا کہ حضرت اسید بن حضیر اور عباد بن بشر رضی اللہ عنہما وغیرہ جو کہ سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ سے بھی ذاتی اور خاندانی طور پر افضل ہیں۔

❀ صحیحین میں کئی اسناد سے ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''سب سے بہترین انصاری گھرانہ بنی نجار کا ہے پھر بنی عبدالاشہل پھر بنی حارث بن خزرج اور بنی ساعدہ کا ہے اور ویسے تو ہر انصاری گھرانہ میں بہتری ہے۔'' [صحیح بخاری: ج: دوم: ح994]

❀ فضیلت والے تین گھرانے یہ ہوئے: بنی نجار؛ پھر بنی عبدالاشہل پھر بنی حارث بن خزرج۔'' ان میں سے کسی ایک کے

بارے میں بھی معلوم نہیں ہوسکا کہ اس نے امامت کے بارے میں کوئی اختلاف یا تنازع کیا ہو۔ بلکہ بنی نجار کے لوگ جیسے حضرت ابوایوب الانصاری' اور ابی طلحہ اور ابی ابن کعب رضی اللہ عنہم اجمعین ان تمام حضرات نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے علاوہ کسی دوسرے کو بیعت کے لیے پسند ہی نہیں کیا۔

- حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ فتح مکہ کے موقع انصار کے سالار تھے۔آپ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بائیں جانب تھے اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ دائیں جانب۔ اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ کا تعلق بنی عبد الاشہل سے تھا۔ آپ لوگوں کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بیعت کرنے کے لیے حکم دے رہے تھے؛ یہی حال دوسرے انصار کا بھی تھا۔
- مسئلہ خلافت میں اختلاف کرنے والے حضرت سعد بن عبادہ اور حباب ابن منذر کے علاوہ ایک چھوٹا سا گروہ تھا۔ پھر ان لوگوں نے اپنے مؤقف سے رجوع کرلیا اور سوائے حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے سب نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت کرلی۔
- حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ ایک نیک انسان تھے ؛لیکن آپ معصوم نہیں تھے۔ بلکہ آپ کے گناہ بھی تھے جنہیں اللہ تعالیٰ نے معاف کردیا۔بعض مسلمان ان چیزوں کو جانتے تھے۔آپ انصار میں سے سابقین اولین میں سے تھے ؛رضی اللہ عنہم اجمعین ؛ اور آپ کا شمار اہل جنت [عشرہ مبشرہ رضی اللہ عنہم] میں سے ہوتا ہے۔
- شہرستانی نے جولکھا ہے کہ: انصار حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کی تقدیم پر متفق ہوگئے تھے؛ تمام اہل علم اصحاب روایت و درایت اس بات کے باطل ہونے پر متفق ہیں۔ صحیح اور ثابت شدہ احادیث اس کے خلاف ہیں۔شہرستانی اور اس کے امثال اگر چہ خود جان بوجھ کر جھوٹ نہیں بھی بولتے ؛مگر پھر بھی وہ ایسے لوگوں کی کتابوں سے روایات نقل کرتے ہیں جو جان بوجھ کر جھوٹ بولتے ہیں۔
- ایسے ہی کہنے والے کا یہ قول بھی ہے کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق آپ کی تجہیز و تکفین اور قبر کے امور میں مشغول ہوگئے تھے۔'' یہ ایک کھلا ہوا جھوٹ ہے۔اور ان کے دعوی کے متناقض بھی ہے۔اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تدفین رات کو عمل میں آئی ۔ یہ کام دن کو نہیں ہوسکا۔اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ: آپ کی تدفین آنے والی رات میں ہوئی ۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو بھی اپنی قبر کے ساتھ لگے رہنے کا حکم نہیں دیا؛ اور نہ ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایسا کیا۔ بلکہ آپ کی قبر اطہر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں تھی ۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ ام المؤمنین کے لیے نامحرم تھے۔
- پھر آپ کو اپنی قبر پر لگے رہنے کا حکم بھی کیسے دیا جاسکتا ہے جب کہ ان لوگوں کے خیال مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو اپنے بعد امام متعین کیا تھا۔
- دوسری بات یہ ہے کہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تجہیز و تکفین میں صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ اکیلے ہی مصروف نہیں تھے۔ بلکہ آپ کے ساتھ حضرت عباس اور ان کے بیٹے بھی تھے ؛رضی اللہ عنہم اجمعین ۔آپ کا غلام شقران رضی اللہ عنہ بھی تھا؛ اور بعض انصار بھی اسی کام میں لگے ہوئے تھے۔ جب کہ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما گھر کے دروازہ پر بیٹھے ہوئے تھے۔غسل اور تجہیز کے وقت یہ حضرات حاضر اور موجود تھے؛ اس وقت سقیفہ بنی ساعدہ میں نہیں تھے۔

❀ سنت یہ ہے کہ: میت کی تجہیز و تکفین اس کے گھر والے کریں۔ پس آپ کے اہل بیت کے افراد نے آپ کو غسل دیا۔ اور تدفین میں تأخیر اس لیے ہوئی تا کہ مسلمان آپ پر درودِ شریف پڑھ لیں۔ اس لیے کہ لوگ آپ پر انفرادی طور پر درود پڑھتے تھے۔ خواتین و حضرات کی ایک بہت بڑی تعداد تھی؛ اسی لیے غسل اور تکفین کے باوجود پیر کے روز تدفین ممکن نہ ہوسکی۔ بلکہ منگل کے روز بھی لوگ آکر درود و سلام پڑھتے رہے اور بدھ کے روز تدفین عمل میں آئی۔

❀ مزید برآں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں جو جنگیں ہوئیں' وہ امامت کے مسئلہ پر نہیں ہوئیں۔ اس لیے کہ اہل جمل' اہل صفین' اور اہل نہروان ہرگز یہ نہیں چاہتے تھے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ہٹا کر کسی دوسرے کو خلیفہ بنایا جائے۔ نہ ہی حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا دعویٰ یہ تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جگہ میں امیر ہوں اور نہ ہی طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما نے ایسی کوئی بات کہی۔

❀ تحکیم الحکمین سے قبل جن لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جنگیں لڑیں انہوں نے کوئی دوسرا امام بھی مقرر نہیں کیا ہوا تھا جس کی اطاعت کی خاطر جنگ لڑی جاتی۔ نہ ہی ان جنگوں کا مقصد قواعد امامت میں سے کسی قاعدہ پر جنگ کرنا تھا۔ اور نہ ہی ان متحارب گروہوں میں سے کوئی خلفاء ثلاثہ کی خلافت پر تنقید کرتے ہوئے لڑ رہا تھا۔ اور نہ ہی کسی ایک نے ان کے علاوہ کسی اور کے لیے کسی نص کا دعویٰ کیا۔ اور نہ ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے جواز پر تنقید کی۔

❀ امامت کے جس مسئلہ لوگوں کے مابین اختلاف پیدا ہوا ہے' جیسے کہ روافض' معتزلہ اور خوارج اور دوسرے لوگوں کا اختلاف؛ اس پر صحابہ کرام میں سے کسی ایک نے کوئی جنگ کی ہی نہیں۔ اور نہ ہی کسی نے یہ دعویٰ کیا کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ منصوص علیہ امام ہیں۔ اور یہ کہ پہلے تین خلفاء کی خلافت باطل تھی۔ اور نہ ہی ان میں سے کسی ایک نے یہ کہا کہ: حضرت علی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما اور جو کوئی ان سے دوستی رکھے' سب کافر ہیں۔

❀ پھر کسی مدعی کا یہ دعویٰ کرنا کہ اہل قبلہ کے مابین سب سے پہلے تلوار مسئلہ امامت اختلاف کی وجہ سے آویزاں ہوئی؛ یہ ایک کھلا ہوا جھوٹ ہے جو کسی ایک پر بھی مخفی نہیں۔ ان واقعات کا معمولی سا علم رکھنے والا ایک ادنیٰ غور و فکر کے بعد اس جھوٹ کو سمجھ سکتا ہے۔

❀ اس میں کوئی شک و شبہ: الی بات نہیں کہ بہت سارے علماء کے نزدیک یہ فتنہ کی جنگیں تھیں۔ اور بہت سارے علماء اسے اہل عدل اور اہل بغاوت کی جنگیں قرار دیتے ہیں۔ یہ ایسی جنگیں تھیں جو غیر امام کی اطاعت پر تأویل کی وجہ سے ہوئیں۔ کسی دینی قاعدہ کی بنیاد پر نہیں تھیں۔

❀ اور اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے تنازعہ کرنے والے امامت کے مسئلہ میں اختلاف کرتے اور آپ ان لوگوں سے قتال کرتے تو آپ کا قتال کرنا بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قتال کی جنس سے ہی ہوتا۔ اگرچہ ان لوگوں کے مابین کسی دینی قاعدہ کی بنیاد پر کوئی اختلاف نہیں تھا۔

❀ اسلام میں دینی اختلاف کی بنیاد پر سب سے پہلے جو تلوار اٹھائی گئی وہ خوارج کی تلوار تھی۔ اور ان کے جنگ بہت بڑی جنگ تھی۔ ان لوگوں نے ایسے عقائد گھڑ لیے تھے جو صحابہ کرام کے عقائد کے خلاف تھے۔ پھر ان کی بنیاد پر انہوں نے جنگیں لڑیں۔ ان کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا تھا: ''مسلمانوں کی تفرقہ بندی کے وقت ایک فرقہ کا ظہور ہوگا'

اور فریقین میں سے ان کو وہ لوگ قتل کریں گے جو حق کے زیادہ قریب ہونگے۔'' [مسلم ۲/ ۷٤٥؛ ابو داؤد ٤/ ۳۰۰]۔

❀ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جنگیں لڑنے والوں میں سے کسی ایک نے بھی امامت کے مسئلہ پر جنگ نہیں لڑی۔ اور نہ ہی آپ نے کسی ایک سے اپنی امامت منوانے کے لیے لڑائی کی۔ اور نہ ہی آپ کے عہد میں کسی نے یہ دعویٰ کیا کہ وہ آپ سے بڑھ کر خلافت و امامت کا حق دار ہے۔ نہ ہی حضرت عائشہ' نہ ہی حضرت طلحہ و زبیر؛ نہ ہی حضرت امیر معاویہ اور ان کے اصحاب رضی اللہ عنہم اجمعین؛ اور نہ ہی خوارج نے ایسا کوئی دعویٰ کیا۔ بلکہ تمام امت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت اور سابقت اسلام کا اعتراف کرتی تھی۔ اور آپ کے عہد خلافت میں صحابہ کرام میں کوئی دوسرا فرد ایسا بھی نہیں تھا جو کہ آپ کا ہم پلہ و ہمسر ہو۔ جیسا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اپنے دور میں تھے۔ اور ایسا بھی ہرگز نہیں ہوا کہ مسلمانوں میں سے کسی ایک نے آپ سے خلافت و امامت کے مسئلہ پر قتال کیا ہو۔ اور نہ ہی دو افراد اس بات میں اختلاف کرنے والے تھے کہ آپ کے علاوہ کوئی دوسرا آپ سے زیادہ خلافت کا حق دار ہے۔ چہ جائے کہ کوئی اس بات پر جنگ کرتا۔ یہی حال حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کا بھی تھا۔

❀ خلاصہ کلام! جو انسان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے احوال کا علم رکھتا ہے؛ وہ علم ضروری کے طور پر جانتا ہے کہ مسلمانوں کے گروہوں کے مابین خلفاء ثلاثہ کی امامت کے مسئلہ پر کوئی اختلاف نہیں تھا۔ چہ جائے کہ اس بات پر جنگیں ہوتیں؟

❀ یہی حال حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بھی تھا۔ کسی ایک گروہ نے بھی اس بات پر جنگ نہیں کی کہ کوئی دوسرا حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر خلافت کا حق دار ہے۔ اگرچہ لوگوں میں کچھ ایسے بھی ہوں گے جو خلفاء اربعہ کی خلافت کو ناپسند کرتے ہوں گے۔ ایسا ہونا ضروری ہے۔ اس لیے کہ لوگوں میں ایسے افراد بھی موجود تھے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو بھی ناپسند کرتے تھے۔ تو پھر بعض خلفاء کی خلافت کو ناپسند کرنے والے کیوں نہیں ہو سکتے؟

❀ لیکن اس مسئلہ میں بھی لوگوں میں کوئی ظاہری اختلاف نہیں تھا؛ کجا کہ وہ ایک دوسرے پر تلواریں سونت لیں۔ جیسا کہ اہل علم کے مابین عقائد اور علمی مسائل میں اختلاف مشہور ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ دو اختلاف کرنے والے گروہ مل بیٹھتے ہیں اور بعض علمی مسائل میں آپس میں مناظرہ کرتے ہیں۔

❀ خلفاء اربعہ کے دور میں کوئی دو گروہ ایسے نہیں تھے جن میں کھلا ہوا اختلاف ہو۔ اور نہ ہی حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو ان کے بعد میں آنے والوں پر تقدیم و فضیلت اور ان کی امامت کی صحت کے مسئلہ پر کوئی اختلاف تھا۔ نہ ہی ان کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی فضیلت و صحت امامت میں کوئی اختلاف ہوا۔ اور نہ ہی ان تین یاروں کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت و امامت کے مسئلہ پر کسی کوئی اختلاف ہوا۔ اور ان چار یاروں کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین میں کوئی ایسا بھی نہیں تھا جو ان سے افضل ہو۔ اور نہ ہی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد مسلمانوں میں سے کسی ایک نے اس بات پر اختلاف کیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں ان سے بہتر بھی کوئی انسان موجود ہے۔ مسلمانوں کے معروف گروہوں میں سے کسی ایک نے حضرت طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما کو بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ پر فضیلت نہیں دی چہ جائے کہ وہ حضرت معاویہ کو فضیلت دیتے۔ اگرچہ ان لوگوں پیش آمدہ شبہ کی بنیاد پر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جنگ بھی لڑی۔ لیکن یہ جنگ ہرگز نہ اس بنیاد پر تھیں کہ

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر افضل کوئی دوسرا ہے' اور نہ ہی اس بنیاد پر تھیں کہ آپ کے علاوہ کوئی دوسرا خلیفہ و امام ہے۔ اور نہ ہی حضرت طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما میں سے کسی نے اپنے آپ کو امیر المؤمنین کہا؛ اور نہ ہی کسی ایک نے اس بات پر ان میں سے کسی ایک کی بیعت کی۔

جب کہ بہت سارے مسلمانوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی تھی۔ اہل مدینہ کے اکثر لوگ آپ کو امیر المؤمنین مانتے تھے۔ جب کہ کسی ایک نے بھی حضرات طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما میں سے کسی کی بھی بیعت نہیں کی تھی۔ اور نہ ہی ان میں سے کسی ایک نے لوگوں کو اپنی بیعت کرنے کی دعوت دی۔ اور نہ ہی لوگوں نے یہ کہا کہ: آپ اپنی بیعت لے لیجیے۔ ان دونوں حضرات کا مقام و مرتبہ اس سے بہت زیادہ بلند اور جلیل القدر تھا کہ یہ حضرات کوئی ایسی حرکت کرتے۔

❀ یہی حال حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا بھی تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد کسی ایک نے بھی آپ کی بیعت اس بات پر نہیں کی کہ آپ امام اور خلیفہ ہیں۔ اور نہ ہی جب آپ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے برسر پیکار تھے تو کسی نے آپ کو امام قرار دیکر آپ کی بیعت کی۔ اور نہ ہی آپ اپنے آپ کو امیر المؤمنین کہلاتے تھے۔ نہ ہی لوگوں میں سے کسی ایک نے آپ کو یہ خطاب دیا۔ اور نہ ہی تحکیم الحکمین سے قبل امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے ولایت کا مطالبہ کیا۔

❀ جب کہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اپنی خلافت کا تمام عرصہ خود کو امیر المؤمنین لکھا کرتے تھے۔ اور مسلمان آپ کو امیر المؤمنین کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ لیکن جن لوگوں نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے ملکر آپ سے جنگیں لڑیں وہ آپ کو امیر المؤمنین نہیں مانتے تھے۔ اور نہ ہی وہ آپ کے حلقہ اطاعت میں داخل ہوئے۔ حالانکہ وہ اس بات کے معترف تھے کہ لوگوں میں اب آپ سے افضل کوئی دوسرا باقی نہیں بچا۔ لیکن ان لوگوں کے اپنے اتنے تحفظات تھے جن کی بنا پر وہ آپ کی اطاعت میں داخل نہ ہو سکے۔ لیکن اس کے باوجود کسی ایک نے آپ سے اس بات پر جنگ نہیں کی کہ آپ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی بیعت کریں' اور نہ ہی آپ کو یا آپ کے ساتھیوں میں سے کسی ایک کو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی بیعت کی دعوت دی گئی اور نہ ہی یہ کہا گیا کہ: اگرچہ آپ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے افضل ہیں؛ مگر وہ آپ سے زیادہ خلافت کے حق دار ہیں۔ آپ پر واجب ہوتا ہے کہ ان کی اطاعت کریں ورنہ ہم آپ سے جنگ کریں گے۔

❀ جیسا کہ بہت سارے زیدی شیعہ کہتے ہیں کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین سے افضل تھے۔ لیکن مصلحت کا تقاضا یہ تھا کہ ان لوگوں کی خلافت منعقد کی جائے۔ اس لیے کہ بہت سارے لوگوں کے دلوں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف اس وجہ سے نفرت تھی کہ آپ نے ان کے بہت سارے اقارب کو قتل کیا تھا۔ تو یہ ممکن نہیں تھا کہ آپ کی خلافت پر تمام لوگوں کا اتفاق ہو جاتا۔ اس وجہ سے مفضول کو خلیفہ مقرر کیا جانا جائز تھا۔

❀ یہ قول ان لوگوں کا ہے جو شیعہ کے بہترین طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان لوگوں کا بھی یہی عقیدہ تھا کہ باقی لوگوں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ افضل ہیں۔ لیکن پھر بھی یہ لوگ یہی کہتے ہیں: حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی خلافت برحق ہے؛ اس میں کسی طرح بھی تنقید کرنا ممکن نہیں۔ اس طرح سے یہ لوگ اپنی کوشش کے مطابق جامع القولین ہیں۔

❀ ان لوگوں کا عذر وہ آثار ہیں' جو انہوں نے سن رکھے تھے؛ اور وہ امور تھے جو ان کے ذہن میں کھٹکتے تھے؛ ان کا تقاضا تھا

کہ یہ لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو باقی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین پر افضلیت دیں۔ جیسا کہ عوام الناس کے مابین مشہور اس طرح کے دیگر مسائل میں بھی ہوتا ہے؛ جن میں حق ان دو میں سے ایک گروہ کے ساتھ ہوتا ہے۔ مگر دوسرے گروہ کے پاس بھی ایسی منقولات ہوتی ہیں جن کے متعلق ان کا خیال ہوتا ہے کہ یہ بھی سچ اور درست ہیں۔ لیکن انہیں اس بات کی خبر نہیں ہوتی کہ یہ آثار جھوٹ و اختراع ہیں۔ اور ان کے پاس جو آیات اور صحیح احادیث ہیں' ان میں وہ لوگ اپنے گمان کی وجہ سے تاویلات کا شکار ہو گئے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ نص سے یہی مراد ہے۔ حالانکہ معاملہ ایسے نہ تھا۔ اور ان لوگوں کے پاس ایک نوعیت کی قیاس اور رائے ہیں جن کے متعلق ان کا خیال ہے کہ یہ حق ہیں۔ جبکہ وہ باطل ہیں۔

❀ تمام باتوں کا مجموعہ یہی تمام سرمایہ ہے جس کی وجہ سے شکوک و شبہات پیدا ہوئے ہیں۔ اگر انسانی نفوس ہوائے نفس سے خالی ہوں تو یہ شبہات پیدا نہیں ہو سکتے۔ مگر بہت کم ہی لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے دل ہوائے نفس سے پاک ہوں۔ جیسا کہ خود اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ وَلَقَدْ جَآءَ هُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى﴾ [النجم ۲۳]

''یہ لوگ صرف اٹکل کے اور اپنی نفسانی خواہشوں کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں اور یقیناً ان کے رب کی طرف سے ان کے پاس ہدایت آ چکی ہے۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا خوارج سے قتال کرنا نص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اجماع صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کی روشنی میں تھا۔

❀ جب کہ جمل اور صفین کی جنگوں کے بارے میں خود حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ذکر کیا ہے کہ آپ کے پاس اس سلسلہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول کوئی نص نہیں تھی؛ بلکہ یہ محض آپ کی رائے تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر صحابہ نے اس قتال میں آپ کی موافقت نہیں کی تھی۔ بلکہ اکثر کبار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین جیسے: حضرت سعد بن ابی وقاص' عبداللہ بن عمر' اسامہ بن زید؛ محمد بن مسلمہ؛ اور ان کے امثال سابقین اولین مہاجرین و انصار رضی اللہ عنہم اور ان کے بعد تابعین نے ان میں سے کسی بھی گروہ کا ساتھ نہیں دیا۔ حالانکہ یہ سبھی لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بہت زیادہ تعظیم بجالانے والے تھے۔ آپ سے محبت کرتے؛ دوستی رکھتے؛ اور باقی لوگوں پر آپ کو مقدم رکھتے تھے۔ اور آپ کے زمانہ میں آپ سے بڑھ کر کسی دوسرے کو خلافت کا حق دار نہیں سمجھتے تھے۔ لیکن جنگ کے مسئلہ میں آپ کی رائے کی موافقت نہیں کی۔

❀ ان لوگوں کے پاس ایسی نصوص تھیں جو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سن رکھی تھیں' جن کی دلالت کا تقاضا تھا کہ جنگ اور فتنہ میں داخل ہونے سے بہتر یہ ہے کہ قتال اور جنگ کو ترک کر دیا جائے۔ ان نصوص میں قتال سے ممانعت کی روایات بھی تھیں۔ اس بارے میں معروف آثار تو بہت زیادہ اور کثرت کیساتھ تھے۔

❀ جب کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ مشہور سابقین اولین میں سے کوئی ایک بھی نہیں تھا۔ بلکہ سابقین اولین میں سے بعض لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے۔ ان کی اکثرت فتنہ سے الگ اور دور رہی۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کیساتھ ان میں سے کوئی نہیں تھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ بعض سابقین اولین حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کیساتھ بھی تھے۔ حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے والے حضرت ابو الغادیہ رضی اللہ عنہ اہل بیعت رضوان میں سے تھے۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں

سابقین اولین کہا جاتا ہے۔ یہ بات ابن حزم رحمہ اللہ اور بعض دیگر علماء نے ذکر کی ہے۔

❀ یہاں پر مقصود یہ بیان کرنا ہے کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کسی نے بھی اس وجہ سے جنگ نہیں کی کہ کوئی دوسرا انسان امام یا خلیفہ ہے۔اور نہ ہی کسی نے آپ کو کسی دوسرے کے پرچم تلے آنے کو کہا۔ پھر یہ کہ جب مصاحف بلند کیے گئے ؛ اور آپس میں فیصلہ کرنے کی طرف دعوت دی جانے لگی ؛ اوراس بات پر ان کا آپس میں اتفاق بھی ہوگیا ۔اوراگلے سال جب جمع ہوئے تو فیصلہ کرنے والوں نے یہ فیصلہ کیا کہ: حضرت امیر معاویہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہما دونوں کو معزول کردیا جائے ؛ اور مسلمانوں کی خلافت کا مسئلہ شوری کے ذریعہ حل کیا جائے۔

حکمین میں سے ایک نے کہا: اس نے اپنی ساتھی کو معزول کردیا ہے'اور میں اپنے ساتھ کو معزول نہیں کررہا۔حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کا میلان تھا کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنادیا جائے۔ اس پر ابن عمر رضی اللہ عنہ بہت غصہ ہوئے۔ان لوگوں کا اتفاق اس بات پر نہیں تھا کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو امیر المؤمنین کے منصب سے معزول کیا جائے۔ اس لیے کہ اس سے پہلے آپ نے امیر المؤمنین نہیں تھے۔ بلکہ آپ کو شام کی ولایت سے معزول کرنے پر اتفاق تھا۔ اس لیے کہ آپ یہ کہتے تھے: مجھے اس سے پہلے دو خلفاء حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما نے والی مقرر کیا ہے۔اور میں اس وقت تک اپنی ولایت پر باقی رہوں گا یہاں تک کہ لوگوں کا ایک خلیفہ پر اتفاق ہوجائے۔

❀ حکمین کا اتفاق ہوگیا تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو امیر المؤمنین کے منصب سے معزول کیا جائے۔ اور معاویہ کو شام کی ولایت سے معزول کیا جائے۔ان میں سے ایک کا مقصد یہ تھا کہ اس کا ساتھی اپنے منصب پر باقی رہے' مگر اس نے اس چیز کا اظہار نہیں کیا۔ جب اس نے اپنے دل کی بات کہہ ڈالی تو لوگ بغیر کسی اتفاق کے منتشر ہوگئے' اوراس کے بعد کوئی جنگ وقتال نہیں ہوا۔

❀ اگر یہ بات مان لی جائے کہ: اس واقعہ کے بعد امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بجائے خود امیر المؤمنین ہونے کا دعوی کیا تھا؛ تو پھر بھی شیعہ کے لیے یہ کہنا ممکن نہیں ہے کہ اس کے بعد امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی امامت تسلیم کروانے کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جنگ کی گئی۔

❀ اس سے واضح ہوگیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جنگیں اس وجہ سے نہیں لڑی گئیں کہ آپ کے علاوہ کوئی دوسرا امام تھا اور آپ کے اطاعت گزار۔ بلا ریب جو لوگ امامت کے مستحق تھے' جیسے حضرت ابوبکر حضرت عمر وحضرت عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین ؛ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس بات میں اللہ تعالیٰ کا بہت زیادہ ڈروخوف رکھتے تھے کہ وہ ان کے خلاف اپنے قول یا فعل سے خروج کریں۔ بلکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بیعت باقی تمام لوگوں سے پہلے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کی۔ جب کہ معاویہ رضی اللہ عنہ کا معاملہ مختلف ہے۔اس عہد کے لوگ اتنے عادل اور صاحب علم تھے کہ ان میں سے کسی ایک سے بھی یہ توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ کوئی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہے کہ: آپ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی بیعت کریں۔ بلکہ کوئی آپ کو حضرت طلحہ وزبیر رضی اللہ عنہما کی بیعت کرنے کا کہنے والا بھی نہیں تھا۔ حالانکہ یہ دونوں حضرات اہل شوری میں سے تھے۔

❀ حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کا انتقال خلافت عثمانی میں ہوگیا تھا؛ اب حضرت عثمان کی وفات کے بعد چار حضرات

رہ گئے تھے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ اس سارے فتنہ سے الگ تھلگ رہے۔ آپ نے مسلمانوں کے مابین قتال میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ اور ان سب کے بعد تک زندہ رہے۔ عشرہ مبشرہ میں سے سب سے آخر میں وفات آپ کی ہوئی۔ آپ فتنہ سے الگ ہوکر وادی عقیق میں عزلت نشین ہوگئے تھے۔ جب آپ کا انتقال ہوا تو آپ کا جنازہ کندھوں پر اٹھا کر لایا گیا اور بقیع میں تدفین عمل میں آئی۔

❀ مقصود یہ ہے کہ: صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے مابین قواعد اسلام میں سے کسی قاعدہ پر اختلاف کی وجہ سے ہرگز کوئی جنگ نہیں ہوئی۔ اور نہ ہی قواعد اسلام میں ان کے متعلق ان کے مابین سرے سے کوئی اختلاف تھا۔ نہ ہی اللہ تعالیٰ کی صفات کے متعلق' نہ ہی تقدیر کے متعلق؛ نہ ہی اسماء و احکام کے متعلق؛ نہ ہی امامت کے مسئلہ میں۔ ان مسائل میں تو کسی کا زبان اختلاف بھی نہیں ہوا چہ جائے کہ ایک دوسرے پر تلواریں سونت لی جائیں۔ بلکہ یہ تمام لوگ اللہ تعالیٰ کی ان صفات کو ثابت مانتے تھے جن کے متعلق اس نے خود خبر دی ہے' اور اس کے ساتھ مخلوق کے ساتھ ان صفات کی مماثلت کی نفی کرتے تھے۔ تقدیر کو ویسے ہی مانتے تھے جیسے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی ہے۔ اور کسی ایک نے امامت کے مسئلہ پر بھی کوئی لڑائی نہیں لڑی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت سے پہلے ان کے مابین امامت کے مسئلہ پر کوئی جنگ نہیں ہوئی۔ اور آپ کے عہد ولایت میں بھی کسی ایک نے آپ سے اس بات پر جنگ نہیں کی آپ اس کی اتباع کریں[یا پھر وہ خلافت کا حق دار یا دعویدار ہے۔] اور اس [حسد کی] بنیاد پر بھی آپ سے کوئی جنگ نہیں کہ آپ میں کوئی ایسا خاص وصف پایا جاتا ہے جو آپ سے پہلے خلفاء میں نہیں تھا۔ بلکہ جن لوگوں نے آپ سے جنگ لڑی وہ آپ سے پہلے کے خلفاء کی امامت و خلافت کو تسلیم کرتے تھے۔ اور یہ بات ان کے مابین مشہور تھی کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آپ سے افضل ہیں۔ اور آپ سے بھی تواتر کے ساتھ منقول ہے کہ آپ برسر منبر اس بات کا اعلان فرمایا کرتے تھے۔ قرن اول کے شیعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرات ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما پر ہرگز کوئی فضیلت نہیں دیتے تھے؛ کجا کہ وہ ان کی خلافت پر جرح و تنقید کرتے۔

❀ بہرحال جو بھی ہو؛ اہل سنت اور اہل بدعت کا ہر خاص و عام انسان جانتا ہے کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں آپ کے اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے مابین جنگ اس وجہ سے ہوئی کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے آپ کی بیعت نہیں کی تھی۔ اس کی وجہ ہرگز یہ نہیں تھی کہ اہل شام نے حضرت ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین کی بیعت کیوں کی۔ اور جو لڑائی حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما کے مابین ہوئی' ان میں سے ہر فریق یہ گمان کر رہا تھا کہ وہ فریق مخالف کے حملہ سے اپنا دفاع کر رہا ہے۔ اس لڑائی نہ ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کوئی غرض تھی اور نہ ہی حضرت طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما کی کوئی غرض۔

❀ بلکہ یہ لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے وہاں آنے سے پہلے قاتلین عثمان کا مطالبہ کر رہے تھے۔ اور ان قاتلین کے بڑے بڑے قبیلے تھے جو ان کا دفاع کر رہے تھے۔ اس وجہ سے وہ کسی کے کنٹرول میں نہیں آ رہے تھے۔ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ تشریف لائے' اور انہوں نے بھی اپنا مقصد بیان کیا؛ اور آپ نے اپنا نقطہ نظر بیان کیا کہ میری بھی یہی رائے ہے؛ لیکن اس وقت یہ ممکن نہیں ہے یہاں تک کہ حالات سنبھل جائیں۔ جب بعض قاتلین کو اس بات کا علم ہوا انہوں نے ایک

لشکر پر حملہ کر دیا۔ وہ لوگ یہ گمان کرنے لگے کہ دوسرے فریق نے جنگ شروع کر دی ہے۔ پس یہ جنگ اہل فتنہ کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے پیش آئی؛ اس میں سابقین اولین کا کوئی دخل نہیں تھا۔

❀ یہ اسلام میں ولایت کے بڑے واقعات ہیں۔ جو اس پر قائم رہے؛ یا جنہوں نے حکام کے خلاف خروج کیا؛ ان میں سے کسی ایک نے بھی اس عقیدہ امامت کی بنیاد پر کوئی جنگ نہیں لڑی جس میں شیعہ سنی اختلاف ہے۔ یہی عقیدہ اس وقت ظاہر ہوا جب کچھ لوگوں نے رافضیت کی دعوت پھیلانا شروع کی۔ اور خود کو بلا وجہ امیر المؤمنین کہلانے لگے؛ اور پھر اس عقیدہ پر انہوں نے جنگیں لڑیں۔ ان لوگوں نے اپنی شاہی قائم کی؛ اور یار و مددگار مہیا کیے۔ یہ معاملہ بنی عبید اللہ القداح کے دور میں پیش آیا۔ جنہوں نے ایک مدت تک مغرب کے کچھ علاقے پر حکومت کی اور مصر پر تقریباً دو سو سال تک حکمران رہے۔

❀ ان لوگوں کے ملحد ہونے اور ان کا نسب باطل ہونے پر تمام اہل علم و دین کا اتفاق ہے۔ نہ ہی ان کا نسب رسول اللہ ﷺ سے ملتا تھا اور نہ ہی یہ لوگ آپ کے دین پر تھے۔ ان لوگوں نے نسب کا جھوٹا دعوی کیا؛ اور اپنے آپ کو شیعہ ظاہر کرنے لگے۔ تاکہ اس طرح وہ شیعہ لوگوں کو اپنے حلقہ ارادت میں داخل کر سکیں۔ اس لیے کہ تمام گروہوں میں سب سے کم عقل اور بے دین؛ سب سے بڑے جاہل شیعہ ہوتے ہیں۔ وگرنہ یہ عبیدیہ جو کہ اپنے آپ کو اسماعیل بن جعفر کی طرف منسوب کرتے ہیں؛ ان کا معاملہ اتنا کھلا ہوا اور واضح ہے کہ کسی بھی مسلمان پر کوئی چیز پوشیدہ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تمام مسلمان۔ جو کہ اہل ایمان ہیں۔ بشمول اہل سنہ و اہل شیعہ ان لوگوں سے برأت کا اظہار کرتے ہیں۔ زیدیہ اور امامیہ انہیں کافر قرار دیتے ہیں؛ اور ان سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں۔ بیشک اسماعیلیہ ملاحدہ خود کو ان کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ لیکن اسماعیلیہ خود یہود و نصاری سے بڑے کافر ہیں۔ جیسا کہ ابن الصباح کافر؛ جس نے ان لوگوں کے لیے چھری نکالی تھی۔

❀ ابو سعید الجنابی کے پیروکاران بحرین کے قرامطی شیعہ ان سے بھی برے ہیں۔ اس لیے کہ یہ لوگ تو بالکل اسلام کا نام بھی نہیں لیتے تھے۔ بلکہ ان لوگوں نے [بیت اللہ میں] حجاج کرام کو قتل کیا؛ اور حجر اسود اکھاڑ کر لے گئے۔

❀ یہ ان جنگوں کے واقعات ہیں جو اہل اسلام کے مابین پیش آئے۔ ان میں کوئی ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ہے جو کہ امامت کے قاعدہ پر اختلاف کی وجہ سے پیش آیا ہو؛ جیسا کہ رافضی شیعہ کا دعوی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض شہروں میں خروج کرنے والے خوارج نے اپنی ذات کے لیے امامت کا دعوی کیا تھا۔ اور ان کے ساتھ لڑنے والے لوگ بھی تھے۔ سو یہ بھی اہل بوادی؛ پہاڑی اور چھوٹے شہروں میں بسنے والے روافض کی جنس سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ ایک بہت چھوٹی سی جماعت تھی؛ جن کی عام جماعت مسلمین کے سامنے کوئی اہمیت نہیں تھی۔ ان کے پاس اتنی قوت و طاقت نہیں تھی کہ مسلمانوں پر اپنی تلوار آویزاں کر سکیں۔ تاکہ کسی کہنے والے کو یہ کہنے کا موقع مل جائے کہ امت میں واقع ہونے والا سب سے بڑا اختلاف مسئلہ امامت کی وجہ سے تھا۔ یا پھر کوئی یہ کہہ سکے کہ: اسلام میں ایسے تلوار کسی چیز پر نہیں سونتی گئی جیسے ہر زمانہ میں امامت پر تلوار سونتی گئی۔

❀ اگر یہ بات کہنے والے کی مراد یہ ہے کہ: ''لوگوں کے مابین مسئلہ امامت کی وجہ سے لڑائیاں پیش آتی رہیں؛ جو کہ اس زمانے میں ایک شخص کی ولایت سے عبارت تھی۔ سو لوگوں کا ایک گروہ امام کے ساتھ مل کر لڑتا تھا اور دوسرا گروہ امام کے خلاف بغاوت کرتا تھا۔'' تو پھر آگاہ رہنا چاہیے کہ اہل سنت اور شیعہ دونوں کے مذہب میں کوئی بھی ایسی چیز نہیں۔ یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ جب ایک نبی اور ایک دین پر ایمان رکھنے والے لوگ آپس میں لڑ پڑتے ہیں تو ان میں سے ہر ایک گروہ کے پاس ایک ایسا آدمی ضرور ہونا چاہیے جسے وہ آگے بڑھائیں اور اپنا متولی بنائیں۔ تو پھر ان میں سے ہر گروہ اپنے متعین کردہ امیر یا بڑے کی سرکردگی میں لڑ سکتی ہے۔

❀ لیکن ان لوگوں کی لڑائی کسی دینی قاعدہ کی وجہ سے نہیں تھی۔ نہ ہی کسی کا یہ دعوی تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امامت نص سے ثابت ہے؛ اور نہ ہی کوئی خلفاء ثلاثہ کی خلافت و امامت کو باطل کہتا تھا۔ بلکہ ان کے اکثر لوگ خلفاء ثلاثہ کی خلافت و امامت کے معترف تھے۔

❀ پھر یہ بھی واضح ہو چکا کہ حضرت ابوبکر و عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین کے دور میں صحابہ کرام کے مابین کوئی جنگ نہیں ہوئی؛ تو پتہ چلا کہ ان حضرات کے عہد خلافت میں کسی پر کوئی تلوار مسلط نہیں تھی۔ یہ تلوار حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں مسلط ہوئی۔ اگر تلوار کا ایسے چلنا موجب قدح ہے تو پھر یہ قدح اس شخصیت پر ہوگی جس کے دور میں تلوار چلی ہوگی۔

❀ خوارج کی یہ حجت تھی۔ ان کی حجت شیعہ کی حجت کی نسبت قوی تر ہے۔ جیسا کہ ان لوگوں کی تلواریں شیعہ کی تلواروں سے قوی تر ہیں۔ اور ان کی نسبت خوارج کا دین بھی صحیح ہے۔ اور وہ ہیں سچے لوگ؛ شیعہ کی طرح جھوٹے اور کذاب نہیں۔ مگر اس کے باوجود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول مشہور سنت کی روشنی میں اور باجماع صحابہ یہ لوگ گمراہ' بدعتی اور خطاء کار ہیں۔ تو پھر رافضیوں کا کیا حال ہوگا جو کہ علم و عقل؛ دین و صداقت؛ شجاعت و ورع اور دیگر خیر و بھلائی کی خصلتوں سے بہت دور کے لوگ ہیں۔

❀ کسی بھی گروہ سے ایسے جنگیں نہیں لڑی گئیں جیسے خوارج کے ساتھ لڑی گئی۔ مگر اس کے باوجود ان لوگوں نے حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی خلافت کے مسئلہ پر کوئی لڑائی نہیں لڑی۔ بلکہ یہ لوگ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی ولایت و امامت پر متفق تھے۔

[وراثت فدک میں اختلاف]:

[اعتــــــراض] :شیعہ مصنف لکھتا ہے: ''پانچواں اختلاف فدک اور توارث کے مسئلہ میں ہے۔ اہل سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت بیان کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: ''نحن معاشر الأنبیاء لا نُوْرِثُ، مَا تَرَكْنَاهُ صَدَقَةٌ.''

''ہم انبیاء کی جماعت وراثت نہیں چھوڑتے۔ جو کچھ ہم چھوڑتے ہیں وہ صدقہ ہوتا ہے۔''

[جــواب] :ہم کہتے ہیں: ''یہ ایک شرعی مسئلہ میں اختلاف تھا جو اب زائل ہو چکا ہے۔ اس میں جو اختلاف تھا وہ اس اختلاف سے کم ہے جو اس مسئلہ میں پایا جاتا ہے کہ میت کے بھائیوں کو دادا اور چچا کی موجودگی میں کیا حصہ ملے گا؟ علاوہ ازیں مسئلہ اقاربہ اور اس مسئلہ میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے کہ دادی کو اس کے بیٹے کی موجودگی میں کیا حصہ ملے گا؟ اسی طرح وہ مسئلہ بھی اختلافی ہے کہ ماں کی موجودگی میں دو بھائیوں کو حصہ نہیں ملے گا۔ نیز یہ کہ اگر میت کا دادا اور ماں دونوں زندہ ہوں

تو دادا اس وقت باپ کا حکم رکھتا ہے اور اس قسم کے دیگر مسائل۔

❀ ظاہر ہے کہ ان مسائل میں مسئلہ فدک کی نسبت عظیم تر اختلاف پایا جاتا ہے۔اس کی کئی وجوہات ہیں:

پہلی وجہ: ان کا اس مسئلہ میں اختلاف ہوا ہے' اور کسی ایک قول پر ایسے اتفاق نہیں ہوسکا جیسا کہ اس مسئلہ پر اتفاق ہوا تھا کہ نبی کریم ﷺ کی وراثت نہیں [بلکہ ان کا متروکہ مال صدقہ ہوتا ہے]۔

دوسری وجہ: یہ ہے کہ باقی مسائل میں ایسی صریح نصوص روایت نہیں کی گئیں جیسا کہ نبی کریم ﷺ کی وراثت کے مسئلہ میں روایت کی گئی ہیں۔

تیسری وجہ: یہ اختلاف مکرر نہیں، بلکہ ایک ہی معاملہ پر مبنی ہے۔جب کہ دیگر مسائل میں اختلاف بھی متعدد جنس کا ہے۔ علاوہ ازیں یہ اختلاف بھی معمولی سے مال میں تھا؛ کہ کیا یہ چند متعین لوگوں کے ساتھ خاص ہے؟ حالانکہ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما نے فدک کی جاگیر سے کئی گنا زائد مال بیت المال سے اہل بیت کو عطا کیا تھا۔اگر اس بات کو تسلیم کرلیا جائے کہ نبی کریم ﷺ کا ترک کردہ مال وراثت تھا؛ حالانکہ یہ نظریہ ہی باطل ہے؛ تو پھر بھی آپ نے اہل بیت سے ایک چھوٹا سا گاؤں لیا تھا؛ کوئی بڑا گاؤں یا بڑا شہر نہیں تھا۔[جس سے کئی گنا زائد اہل بیت کو دے بھی دیا تھا۔]

❀ بیشک علماء کرام کے مابین فرائض کے اور دیگر مسائل میں اختلاف واقع ہوا ہے۔ ہاشمیوں اور دیگر لوگوں کے اموال میں اختلاف فدک کے مسئلہ سے کئی گنا زیادہ تھا۔مگر ان میں اختلاف کرنے والوں کو ظالم نہیں کہا جاتا۔اس لیے کہ اس میں اجتہاد سے فیصلہ کیا گیا۔

❀ فرض کرلیجیے: خلفاء نے اجتہاد کیا؛ اور میراث غیر مستحق کو دیدی۔اجتہاد کرنے والے علماء کرام سے اس سے بھی بڑے بڑے واقعات صادر ہوجاتے ہیں۔ اور ان علماء کا مقام بھی ان ائمہ کی نسبت کم تر ہوتا ہے۔مگر اس کی وجہ سے ان میں سے کسی ایک کی دین داری پر کوئی تنقید اور قدح نہیں کی جاتی۔ بالفرض اگر یہ مان لیں کہ انہوں نے باطن میں غلطی کی ہے' اس لیے کہ انہوں نے اپنے اجتہاد سے فیصلہ کیا ہے؛ تو پھر خلفاء راشدین کے متعلق کیسے کوئی بات کہی جاسکتی ہے۔

❀ اصل قصہ یہ ہے کہ جہلاء اور شرارت پسند لوگ بات کا بتنگڑ بنا کر فدک کے واقعہ کو پیش کرتے ہیں،اور ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین پر جھوٹ اور بہتان کے شر کا دروازہ کھول سکیں۔اس ضمن میں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ان حضرات کے بعد خلیفہ بنے۔آپ کے عہد خلافت میں فدک اور دیگر جملہ اموال آپ ہی کے زیر تصرف تھے،مگر آپ نے اولاد فاطمہ کو واپس نہیں کیے تھے؛اور نہ نبی کریم ﷺ کا ترکہ ورثاء میں تقسیم کیا۔نہ ہی ازواج مطہرات سے کچھ لیا دیا اور نہ ہی اولاد عباس سے۔ بقول شیعہ اگر مان لیں کہ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما نے ظلم کیا تھا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں جب صاحب استطاعت و قدرت تھے؛ تو اس کا ازالہ کیوں نہ کیا؟ حالانکہ اس ظلم کا ازالہ کرنا حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے لشکر سے لڑنے کی نسبت بہت آسان تھا۔کیا آپ یہ سوچ سکتے

ہیں کہ آپ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے جنگ تو لڑلیں؛جس کے نتیجہ میں اتنا بڑا شر وفساد پیدا ہوا؛مگر ان مستحقین کو معمولی سا حق بھی نہ دیتے حالانکہ ایسا کرنا آپ کے لیے بہت آسان بھی تھا۔

[منکرین زکوٰۃ سے جنگ اور شیعہ کا اعتراض]:

[اعتراض]:شیعہ مصنف لکھتا ہے:

''چھٹا اختلاف منکرین زکوٰۃ کے متعلق ہے۔حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان سے جنگ کی تھی ۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں اجتہاد سے کام لے کر لونڈی،غلام اور مال ان کو واپس کیا اور قیدیوں کو رہا کر دیا۔'' [شیعہ کا بیان ختم ہوا]

[جواب] :ہم کہتے ہیں: یہ ایسا کھلا ہوا جھوٹ ہے جو مسلمانوں کے احوال کا علم رکھنے والے کسی بھی انسان پر مخفی نہیں۔ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما دونوں منکرین زکوٰۃ کے خلاف جنگ آزما ہونے میں متفق تھے۔اس سے قبل حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ سے اس مسئلہ پر بحث وتکرار کی تھی۔صحیح بخاری اور مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جناب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں گزارش کی :اے خلیفہ رسول! آپ لوگوں سے کیسے جنگ کریں گے حالانکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

''مجھے لوگوں سے لڑنے کا حکم دیا گیا ہے یہاں تک کہ وہ اس بات کی شہادت دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں۔جب یہ بات کہہ دی تو ان کا خون و مال محفوظ ہوگیا۔یہ دوسری بات ہے کہ اسلام کے کسی حق کی وجہ سے ان کا خون و مال مباح ٹھہرے اور ان کا حساب اللہ پر ہوگا۔''

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:''کیا یہ نہیں کہا:مگر اسلام کے حق کے ساتھ؛ اور ان کا حساب اللہ پر ہوگا۔'' بلا شک وشبہ ''زکوٰۃ بھی حقوق اسلامی میں سے ایک ہے۔اور اللہ کی قسم! اگر مجھ سے ایک جانور بھی روکیں گے جو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں دیا کرتے تھے؛ تو میں اس کے روکنے پر بھی ان سے جنگ کروں گا۔''حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں سمجھ گیا کہ:اللہ تعالیٰ نے آپ کا سینہ قتال کے کھول دیا ہے؛ اور میں جان گیا کہ یہ حق ہے۔''[1]

اور صحیحین کی ایک روایت سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے اس فہم کی تصدیق ہوتی ہے۔حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: بیشک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((أمِرت أن أقاتِل الناس حتی یقولوا:لا إله إلا الله وأني رسول اللهِ، ویقِیموا الصلاة، ویؤتوا الزکاة، فإذا فعلوا ذلك عصموا مِني دِمائهم وأموالهم إلا بِحقِها)).

''مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے اس وقت تک جنگ کروں یہاں تک کہ وہ کہہ دیں اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الزکاۃ۔ باب وجوب الزکاۃ، (ح: ۱۳۹۹، ۱۴۰۰)، صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب الامر بقتال الناس حتی یقولوا لا اله الا الله (حدیث:۲۰)، سنن نسائی(۳۹۷۶)۔

معبود برحق نہیں' اور بیشک میں اللہ کا رسول ہوں ۔ اور نماز قائم کریں اور زکوۃ ادا کریں۔ جب وہ ایسا کریں تو مجھ سے اپنے خون اور اموال محفوظ کرلیں گے مگر اسلام کے حق کے ساتھ ۔'' [بخاری ۱/ ۱۰؛ مسلم ۱/ ۵۳]

چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی مرتدین سے جنگ کے مسئلہ میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی موافقت کی ؛ انہوں نے باتفاق صحابہ رضی اللہ عنہم منکرین زکوۃ سے جنگ کی تھی ۔ حتی کہ ان لوگوں نے زکوۃ روک لینے کے بعد پھر سے اس کا اقرار کرلیا تھا۔ آپ نے کسی کو قیدی بنایا نہ کسی کو محبوس رکھا ۔ بلکہ مدینہ میں خلافت صدیقی میں سرے سے کوئی قید خانہ ہی نہ تھا؛ اور نہ ہی عہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں کوئی قید خانہ تھا۔ تو پھر قید خانہ میں موت کی خبر کیسے درست ہوسکتی ۔ لہٰذا یہ جھوٹ ہے کہ بہت سے لوگ قید خانہ میں مرگئے ۔

اسلام میں سب سے پہلا قید خانہ مکہ مکرمہ میں بنایا گیا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صفوان بن امیہ سے اس کا گھر خرید کر اسے قید خانہ بنایا تھا۔ لیکن کچھ لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ : حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان کی عورتوں اور بچوں کو قیدی بنایا تھا۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ افراد ان کے اہل خانہ کو واپس کردیئے تھے ۔ اگر ایسا ہوا بھی ہو تو پھر بھی یہ اس چیز کی دلیل نہیں ہے کہ ان حضرات کے مابین کوئی اختلاف تھا۔ یہ بہت ہی ممکن ہے کہ جب انہیں قیدی بنایا گیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی اس نظریہ کے موافق ہوں؛ مگر بعد آپ نے یہ قیدی واپس کردیئے ۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تھا کہ بنی ہوازن کے قیدی انہیں واپس کردیئے تھے ۔ حالانکہ یہ قیدی مسلمانوں کے مابین تقسیم کردیئے گئے تھے ۔ جن لوگوں نے اپنی خوشی سے قیدی واپس کردے تو یہ بہت اچھا ہوا؛ ورنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو ان کا معاوضہ دیکر قیدی واپس دلوائے ۔ اس لیے کہ ان کے اہل خانہ مسلمان ہوکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے؛ اور اپنے قیدی واپس کرنے کے لیے عرض گزاری کی تھی ۔

حضرت ابوبکر و عمر اور دیگر تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کا اس بات پر اتفاق ہوگیا تھا کہ مرتدین کو نہ ہی گھوڑے سوار ہونے دیا جائے اور نہ ہی اسلحہ اٹھا کر چلنے کی اجازت ہو۔ بلکہ انہیں ایسے چھوڑ دیا جائے کہ مال مویشی کے پیچھے لگے رہیں ۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ خلیفہ رسول اور اہل ایمان کو دکھا دے کہ یہ لوگ اچھے مسلمان ہوگئے ہیں ۔ جب حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے لیے ان لوگوں کا اچھا مسلمان ہونا ظاہر ہوگیا تو آپ نے ان کے قیدی واپس کردیئے؛ اور ایسا کرنا جائز تھا۔

[حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا تعین بطور خلیفہ]:

[اعتراض] : شیعہ مصنف لکھتا ہے: ساتواں اختلاف: حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی طرف سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بطور خلیفہ متعین کرنا ہے۔ ''لوگ ابوبکر رضی اللہ عنہ پر اعتراض کرتے تھے کہ تو نے ایک سنگ دل آدمی (حضرت عمر) کو ہمارا حاکم بنادیا۔''

[جواب] : ایسی بات کو کس نے اختلاف کہہ دیا؟ ایسی باتیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں بھی ہوا کرتی تھیں ۔ ایسی باتوں کو اختلاف پر محمول کرنا متکلم کے جاہل اور بدعتی ہونے کی دلیل ہے ۔ صرف طعن کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ بعض صحابہ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو امیر بنانے پر معترض ہوئے تھے، مگر اس کا نتیجہ کچھ بھی نہ نکلا ۔ اور بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ان کے بیٹے حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کو امیر بنانے پر اعتراض کیا تھا۔ ایسے بہت سارے صحابہ ان امراء پر اعتراض کیا کرتے تھے جنہیں حضرت ابوبکر یا حضرت عمر رضی اللہ عنہما تعینات کیا کرتے تھے ۔ یہ بھی معلوم ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی

امارت پر اعتراض حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے کیا تھا۔ بعد ازاں انہوں نے اپنے اس مؤقف سے رجوع کر لیا تھا؛ اور وہ سب لوگوں سے زیادہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تعظیم بجا لایا کرتے تھے۔ جیسا کہ حضرت زید اور حضرت اسامہ رضی اللہ عنہما کی امارت پر اعتراض کرنے والوں نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت میں اپنے مؤقف سے رجوع کر لیا تھا۔

[شورائے عمر رضی اللہ عنہ]:

[اعتـــراض]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ''آٹھواں اختلاف: شوریٰ کا معاملہ ہے۔ اختلاف کے بعد صحابہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت پر جمع ہو گئے تھے۔''

[جـــواب]: ہم کہتے ہیں: یہ جھوٹ ہے، جو شیعہ کی فطرت میں داخل ہو چکا ہے۔ مؤرخین و محدثین کا اس واقعہ کے جھوٹ ہونے پر اتفاق ہے۔ اس لیے کہ خلافت عثمان رضی اللہ عنہ میں کسی نے بھی اختلاف نہیں کیا تھا۔ لیکن یہ ہوا تھا کہ حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ تین روز تک لوگوں سے مشورہ کرتے رہے تھے۔ مشورہ کے بعد آپ نے بتایا کہ لوگوں کی نگاہ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا کوئی ہم سر نہیں ہے۔ آپ نے گھروں کے پردہ نشین دوشیزاؤں تک سے اس بارے میں مشورہ کیا تھا۔ اگر کوئی شخص آپ کی بیعت میں اختلاف کرتا؛ یا اس کے دل میں کوئی ناپسندیدہ بات ہوتی تو تاریخ اسے ضرور نقل کرتی۔ لیکن کسی بھی ایسی چیز کا نقل نہ کیا جانا اس بات کی دلیل ہے کہ کسی نے کچھ بھی اعتراض نہیں کیا۔ حالانکہ ایسے کاموں میں ایسی باتیں ہوتی رہتی ہیں۔ جس چیز میں مشاورت سے کوئی بات طے کی جائے وہاں پر لوگ باتیں کرتے ہیں اور اپنا نقطہ نظر پیش کرتے ہیں۔ لیکن کسی ایسی بات کے متعلق بغیر کسی دلیل کے دوٹوک طور پر کہنا ممکن نہیں۔

ہمیں صحیح روایات کی روشنی میں یہ بات معلوم ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی ولایت میں کوئی اختلاف نہیں تھا۔ اور نہ ہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے کسی گروہ نے یہ بات کہی کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ یا کسی دوسرے کو ولایت تفویض کی جائے۔ اگر کسی نے ایسا کچھ کہا ہوتا تو اس کا قول ہم تک پہنچ کر رہتا جیسے انصار کا یہ قول ہم تک پہنچ گیا کہ ایک امیر ہم میں سے ہوگا اور ایک تم میں سے۔''

❀ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو لوگ اتنے باہمت بھی تھے' اور ایسے اسباب بھی موجود تھے کہ اعتراض آگے نقل کیا جاتا۔ جیسا کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے خلافت کے بارے میں بعض انصار کا اختلاف نقل کیا گیا ہے۔ تو اس سے پتہ چلا کہ اس قسم کے اعتراض کا دعوی کرنے والا جھوٹا اور بہتان تراش ہے۔

یہی وجہ ہے کہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''کسی خلیفہ کی بیعت پر اس قدر اتفاق نہیں ہوا جیسا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بیعت پر ہوا تھا۔''

❀ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو مسلمانوں نے تین دن کی مشاورت کے بعد ولایت تفویض کی تھی۔ اس پر ان تمام کا اتفاق واتحاد تھا۔ وہ آپس میں ایک دوسرے سے محبت و الفت رکھنے والے تھے۔ اللہ تعالیٰ کی اجتماعیت کے ساتھ مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو غلبہ عطا کیا تھا۔ اور ان لوگوں کے ذریعہ اپنے اس دین کو غالب کیا جو دین دے کر محمد ﷺ کو مبعوث کیا گیا تھا۔ کفار کے خلاف ان کی مدد کی؛ اور ان کے ہاتھوں پر بلاد شام؛ عراق اور خراسان کے

کچھ علاقے فتح ہوئے۔

❀ یہ لوگ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے برابر کسی کو بھی نہیں سمجھتے تھے۔ جیسا کہ حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو اس بات سے آگاہ کیا تھا۔ اسی لیے حضرت عبدالرحمن رضی اللہ عنہ نے آپ کی بیعت کرلی۔

❀ بعض حضرات نے جو ذکر کیا ہے کہ: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر یہ شرط لگائی کہ آپ شیخین کی سیرت پر عمل پیرا رہیں گے تو آپ نے اس کا جواب نہ دیا۔'' ایسا یا تو عاجزی و کمزوری کی وجہ سے تھا کہ ان جیسے حضرات کی سیرت پر عمل کیسے ممکن ہے' یا پھر اس لیے کہ آپ یہ خیال کرتے تھے کہ: تقلید واجب یا جائز نہیں۔ اور جب حضرت علی رضی اللہ عنہ پر یہ شرط لگائی تو آپ نے اس بات کو قبول کرلیا۔ اس کی یا تو اس بات کا امکان تھا کہ آپ ان حضرات کی سیرت پر عمل کرسکتے تھے: یا پھر آپ تقلید کو جائز سمجھتے تھے۔'' یہ ایک باطل نقل ہے؛ اس کی کوئی ثابت شدہ اصل نہیں۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ یہ خودساختہ روایت اس صحیح اور ثابت شدہ روایت کے خلاف ہے؛ جس میں ہے کہ حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ تین دن اور تین رات تک بغیر آرام کیے لوگوں سے مشورہ کرنے میں مشغول رہے۔ آپ تمام مسلمانوں سے مشورہ کررہے تھے۔ اور یہ بات کھل کر آپ کے سامنے آرہی تھے کہ لوگ کسی کو بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے برابر نہیں سمجھتے۔ بلکہ لوگ دوسروں سے بڑھ کر آپ کو خلافت و ولایت کا حق دار سمجھتے تھے۔ حضرت عبدالرحمن بن عوف نے ان حضرات پر سوائے عدل کے کوئی شرط نہیں لگائی۔ آپ نے ان دونوں حضرات سے کہا تھا:

''تمہیں اللہ کی قسم دیتا ہوں! اگر میں نے ولایت تمہیں سونپ دی تو تم عدل وانصاف کرو گے۔ اور اگر تم پر امیر مقرر کردیا تو تم اس کی بات سنو گے اور اطاعت کرو گے۔'' تو ہر ایک نے یہی جواب دیا:''ہاں ہم ضرور ایسا کریں گے۔''

❀ پس متولی پر عدل کی شرط لگانا اور متولی علیہ پر سمع واطاعت کی شرط لگانا اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام میں سے ہے جس پر کتاب وسنت دلالت کرتے ہیں۔

[صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین میں اختلافات]:

[اعتراض]: شیعہ مصنف کا یہ قول کہ ''صحابہ میں لاتعداد اختلافات پیدا ہوگئے تھے۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حکم بن امیہ کو واپس مدینہ بلا لیا۔ حالانکہ اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھگا دیا تھا۔ اور اسے طرید رسول کہا کرتے تھے۔ آپ نے حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے پاس ان کی خلافت کے ایام اس کے لیے سفارش کی تھی؛ مگر انہوں نے یہ بات نہیں مانی۔ بلکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے اس کی جگہ سے چالیس فرسخ تک یمن کے اندر بھگا دیا تھا۔''

[جواب]: ہم کہتے ہیں کہ: اگر ایسی معمولی باتوں کا نام اختلاف ہے تو خلیفہ جو حکم بھی صادر کرے گا اور دوسرا کوئی اس کی خلاف ورزی کرے تو اس کا نام اختلاف رکھا جائے گا؛ اس طرح اختلاف ایک غیر محدود چیز ٹھہرے گا۔ جس کا کوئی ٹھکانا ہی نہیں۔ اس سے پہلے آپ کی جانب سے وہ مسائل ذکر کیے گئے ہیں جن میں اختلاف واقع ہوا تھا جیسا کہ: وراثت اور طلاق کے مسائل اور دیگر امور؛ جو کہ صحیح بھی ہیں اور فائدہ مند بھی۔ بلاشبہ ان امور میں اختلاف صحیح روایات سے ثابت ہے جسے اہل علم نے نقل کیا ہے۔ اور ایسے مسائل میں بحث ومناظرہ کرنے سے لوگوں کو فائدہ بھی حاصل ہوتا ہے۔ یہ ایک امر کلی

میں اختلاف ہے جو اس لائق ہے کہ اس میں مناظرہ کیا جائے۔

❀ جب کہ یہ امور ایسے ہیں کہ ان کی زیادہ سے زیادہ ان کے جزئی امور ہونے پر ختم ہوتی ہے۔ انہیں اختلافی امور قرار نہیں دیا جاسکتا جن میں لوگ مناظرے کرتے پھریں۔

❀ اس کے باوجود مصنف نے جو کچھ بیان کیا ہے' اس میں بہت زیادہ جھوٹ ہے۔ ان ہی میں سے ایک معاملہ حکم بن امیہ کا بھی ہے۔ یہ کہ رسول اللہ ﷺ نے اسے بھگا دیا تھا۔ اور لوگ اسے راندہء رسول کہا کرتے تھے۔ اور آپ نے حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے پاس ان کی خلافت کے ایام اس کے لیے سفارش کی تھی؛ مگر انہوں نے یہ بات نہیں مانی۔ بلکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے اس کی جگہ سے چالیس فرسخ تک یمن کے اندر بھگا دیا تھا۔ ہم پوچھتے ہیں: یہ واقعہ کس نے نقل کیا ہے؟ اس کی سند کہاں ہے؟ اور حکم کب یمن گیا؟ اور آپ کے دعوی کے مطابق جب نبی کریم ﷺ نے اسے طائف میں چھوڑ دیا تھا تو پھر کس سبب کی بنیاد پر اسے یمن کی طرف بھگایا گیا؟ حالانکہ طائف مکہ اور مدینہ سے زیادہ قریب تھا۔ جب رسول اللہ ﷺ نے اسے مکہ و مدینہ کے قریب برقرار رکھا تھا تو پھر کیونکر اسے یمن بھگایا گیا؟

❀ بہت سارے اہل علم نے ذکر کیا ہے کہ حکم کی جلاوطنی کا قصہ باطل ہے۔ اس لیے کہ نبی کریم ﷺ نے اسے طائف کی طرف جلاوطن نہیں کیا تھا بلکہ وہ خود طائف چلا گیا تھا۔ اور بعض نے کہا ہے کہ: اسے نکالا گیا تھا۔ مگر ان میں سے کسی ایک نے بھی اس واقعہ کی کوئی صحیح سند اور کیفیت ذکر نہیں کی۔

[حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی مدینہ بدری]:

[اعتراض]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کو ربذہ کی طرف نکال دیا تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنی بیٹی مروان بن حکم کے نکاح میں دے دی تھی۔ آپ نے مروان کو افریقہ کے مال غنیمت کا خُمس (۱/۵) دیا جس کی مالیت دو لاکھ دینار تھی۔''

[جواب]: ہم کہتے ہیں کہ: ابوذر رضی اللہ عنہ کے واقعہ سے متعلق جواب پہلے گزر چکا۔ جب کہ مروان بن حکم سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بیٹی کی شادی کے واقعہ کا اختلاف سے کیا تعلق؟ نیز اس کی دلیل کیا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اسے افریقہ کے مال غنیمت سے (۱/۵) پانچواں حصہ مال دیا تھا؟ اور یہ واقعہ کس نے نقل کیا ہے؟ اس سے پہلے یہ بات گزر چکی ہے کہ آپ نے مروان کو دس لاکھ دینار دیے تھے۔ جب کہ یہ بات مشہور و معروف ہے کہ افریقہ کے مال غنیمت کا خمس اس مقدار کو نہیں پہنچتا تھا۔

[عبداللہ بن ابی سرح رضی اللہ عنہ کا واقعہ]:

[اعتراض]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ''سرور کائنات ﷺ نے ابن ابی سرح رضی اللہ عنہ کو مباح الدم قرار دیا تھا مگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس کو پناہ دی تھی۔ اور پھر اسے مصر کا والی مقرر کر دیا۔''

[جواب] : ہم کہتے ہیں: اگر رافضی مصنف کی مراد یہ ہے کہ ابن ابی سرح رضی اللہ عنہ اس وقت تک مباح الدم ہی تھے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انہیں مصر کا والی مقرر کردیا؛ جیسا کہ اس کے کلام سے ظاہری طور پر سمجھا جارہا ہے۔تو ایسی بات وہی انسان کہہ سکتا ہے جو رسول اللہ ﷺ کی سیرت اور احوال سے بہت بڑا جاہل ہو۔فتح مکہ کے موقع پر نبی کریم ﷺ نے لوگوں کی ایک جماعت کیساتھ اسے مباح الدم قرار دیا۔مگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اسے لیکر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔اور کچھ مراجعت واصرار کے بعد رسول اللہ ﷺ نے اسے بیعت کردیا۔اوراس کا خون محفوظ ہوگیا۔اوراس کا شمار معصوم الدم مسلمانوں میں ہونے لگا؛اس کے بھی وہی حقوق تھے جو باقی مسلمانوں کے تھے اوراس پر بھی وہی واجبات تھے جو باقی لوگوں پر تھے۔

شروع میں یہ سب سے لوگوں سے بڑھ کر رسول اللہ ﷺ سے دشمنی رکھتا تھا۔پھر اس نے اسلام قبول کیا تو اچھا مسلمان ثابت ہوا۔اوراس کا خون بھی اسی طرح مباح قراردیا گیا تھا جیسے دوسرے کچھ لوگوں کا خون ان کے سخت کفر یا سخت ارتداد کی وجہ سے مباح قراردیا تھا؛ جیسا کہ مقیس بن صبابہ کا خون۔

❀ اصل واقعہ یہ ہے کہ ابن ابی سرح ہجرت واسلام سے مشرف ہوکر مدینہ میں کتابت وحی پر مامور تھا۔پھر مرتد ہوکر مشرکین سے جاملا اور آپ ﷺ کے خلاف افتراء پردازی کرنے لگا۔جب مکہ فتح ہوا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اسے بارگاہ نبوی میں پیش کیا تو آپ نے منہ پھیرلیا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے عرض کیا:''اے اللہ کے رسول! عبداللہ کو بیعت فرمایئے۔مگر آپ نے جواب نہ دیا۔اور دو دفعہ یا تین دفعہ اعراض فرمایا؛ پھر بیعت کرلیا اور فرمایا:''تم میں کوئی دانش مند آدمی نہیں تھا جو مجھے دیکھتا اور جب میں نے اعراض کیا تھا اس وقت اس کا کام تمام کردیتا۔''ایک انصاری نے عرض کیا:''آپ نے مجھے اشارہ کردیا ہوتا۔''

آپ ﷺ نے فرمایا:

''نبی کے لیے موزوں نہیں کہ اس کی آنکھ خیانت کار ہو۔'' ❶

اس کے بعد عبداللہ بن ابی سرح رضی اللہ عنہ خلوص دل سے اسلام لایا اور بہت اچھا مسلمان ثابت ہوا۔اوراس سے کوئی برا کام منقول نہیں۔یہ اپنی رعیت میں بھی قابل تعریف انسان تھا۔غزوات میں بڑا مجاہد اور جانباز سپاہی تھا۔جب کہ مکہ کے بعض دوسرے طلقاء اس سے بھی بڑے دشمن تھے۔مثلاً صفوان بن امیہ؛عکرمہ بن ابی جہل؛ سہیل بن عمرو؛ اور ابوسفیان بن حرب وغیرہ اور دوسرے لوگ۔مگر یہ سب لوگ مسلمان ہوگئے تھے۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَ الَّذِيْنَ عَادَيْتُمْ مِّنْهُمْ مَّوَدَّةً وَاللّٰهُ قَدِيْرٌ﴾ (الممتحنة:۷)

---

❶ سنن نسائی، کتاب تحریم الدم۔ باب الحکم فی المرتد، (حدیث:۴۰۷۲)، سنن ابی داؤد، کتاب الجھاد۔ باب قتل الاسیر (حدیث:۲۶۸۲)۔

''عین ممکن ہے کہ جن کے ساتھ تمہاری عداوت ہے، اللہ تعالیٰ ان کے اور تمہارے درمیان دوستی پیدا کر دے وہ اس بات پر بخوبی قدرت رکھتا ہے۔''

❀ پس اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے اور نبی کریم ﷺ کے مابین وہ محبت پیدا کر دی جس نے اس دشمنی کو ختم کر دیا۔ اللہ تعالیٰ دلوں کے احوال بدلنے پر قادر ہے۔ اور وہ بہت ہی بخشنے والا اور مہربان ہے۔ اللہ نے ان لوگوں کی سابقہ برائیوں کو ان کی نئی نیکیوں کی وجہ سے معاف کر دیا۔ اللہ تعالیٰ ہی بندوں کی توبہ قبول کرنے والا' اور ان کے گناہ معاف کرنے والا ہے۔ وہ تمہارے ہر کام کو جانتا ہے۔

[حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی ولایت]:

❀ شیعہ مصنف لکھتا ہے: ''آپ کے لشکر میں معاویہ بن ابوسفیان بلاد شام کا گورنر تھا۔ کوفہ کا گورنر سعید بن العاص تھا۔ اس کے بعد عبداللہ بن عامر کو متعین کیا گیا۔ اور ولید بن عقبہ بصرہ کا گورنر تھا۔''

❀ جواب : جب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے بھائی یزید بن ابی سفیان کا انتقال شام میں ہو گیا تو اس کی جگہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے آپ کو شام کا والی بنا دیا۔ پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بھی آپ کو اس ولایت پر باقی رکھا بلکہ شام کا سارا علاقہ آپ کے زیر نگین کر دیا۔ اہل شام میں آپ کی سیرت بہترین سیرت کے طور پر مشہور و معروف تھی۔ اور آپ کی رعیت آپ سے سب سے بڑھ کر محبت کرنے والی تھی۔ صحیح مسلم میں ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

''تمہارے بہترین حکمران وہ ہیں جن کو تم چاہتے ہو اور جو تمہیں چاہتے ہوں تم ان کے حق میں دعا کرتے ہو۔''

یہی عالم حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا تھا۔ رعیت ان سے محبت کرتی تھی اور ان کے لیے دعا گو رہتی تھی۔ اور آپ رعیت سے محبت کرتے اور ان کے لیے دعا گو رہتے تھے۔

❀ جہاں تک حضرت سعید بن العاص کی ولایت کا تعلق ہے؛ تو اہل کوفہ ہمیشہ اپنے عمال کی شکایت کرتے رہتے تھے۔ اس سے پہلے ان پر سعد بن ابی وقاص؛ ابوموسیٰ اشعری' عمار بن یاسر؛ مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہم اجمعین کو والی مقرر کیا گیا تھا؛ مگر یہ لوگ پھر بھی شکایت ہی کرتے رہتے تھے۔ حالانکہ ان جلیل القدر صحابہ کرام کے اخلاق و عادات اور مشہور و معروف تھے۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں ان کی شکایتیں بڑھ گئی تھیں۔ اور یہ بھی سبھی کو معلوم ہے کہ حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے اقارب کو ولایت کے مناصب تفویض کیے تھے جس کی وجہ سے لوگوں کو بھی باتیں کرنے کا موقع مل گیا اور بعض دوسری برائیاں بھی سامنے آئیں۔

[حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں اختلاف]:

[اشکال] : شیعہ مصنف لکھتا ہے: ''نواں اختلاف: وہ ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت پر اتفاق اور آپ کی بیعت کرنے کے بعد پیدا ہوا۔ پہلے طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما نے مکہ کی طرف خروج کیا۔ پھر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو لیکر بصرہ گئے؛ اور وہاں پر جنگ لڑی۔ یہ جنگ جمل کے نام سے معروف ہے۔ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ و معاویہ رضی اللہ عنہ کے مابین اختلاف رونما ہوا۔ جس کا نتیجہ

جنگ صفین کی صورت میں برآمد ہوا۔ پھر ابو موسیٰ کے خلاف عمرو بن عاص کی وعدہ خلافی قابل ذکر ہے ۔ پھر مارقہ کا ظہور ہوا۔ جو کہ دین اسلام سے نکلے ہوئے تھے؛ اور ان کے خلاف نہروان کا واقعہ پیش آیا۔

❀ خلاصہ کلام! حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ برحق تھے؛ اور حق آپ کے ساتھ تھا۔ اور ایسے ہی خوارج نے آپ کے خلاف خروج کیا۔ مثلاً اشعث بن قیس و مسعر بن فدکی و زید بن حصن الطائی وغیرہ۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں عبداللہ بن سبا❶ جیسے غالی پیدا ہوئے اور ان دونوں فرقوں سے بدعت و ضلالت نے پر پرزے نکالے۔ ان پر رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث صادق آتی ہے:''محب غال و مبغض قالٍ۔'' ''محبت کی وجہ سے غلو کرنے والا اور بغض کی وجہ سے کوتاہی کرنے والا۔''

❀ پس چاہیے کہ اس انسان کے کلام کو انصاف کی نظر سے دیکھا جائے کیا یہ شخص اپنے مشائخ کے موجب فتنہ سے نکل سکا ہے یا پھر ان سے بھی آگے بڑھ گیا ہے۔'' [انتہیٰ کلام الرافضی]

[جواب] : ہم کہتے ہیں کہ: شہرستانی کی اس کتاب میں موجود اس کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شیعیت کی طرف میلان رکھتا تھا۔ وگرنہ اس نے ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کا ذکر کیا ہے' مگر کہیں پر یہ نہیں کہا کہ ان کے مخالفین کے برعکس حق ان کے ساتھ تھا۔ [حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پہلے تینوں خلفاء بھی حق و صداقت کے حامل تھے]۔ لیکن جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ذکر آیا تو کہہ دیا کہ:''خلاصہ کلام کہ حق علی کے ساتھ تھا اور علی حق کے ساتھ تھے۔''

❀ وہ ناقل جسے کسی سے کوئی غرض نہ ہو' اسے چاہیے کہ یا تو جملہ امور کو امانت کے ساتھ نقل کرے' یا پھر ہر حق دار کو اس کا حق ادا کرے۔ مدعی کا صرف یہ دعوی کر لینا کہ:''حق علی کے ساتھ تھا اور علی حق کے ساتھ تھے'' اور ابوبکر و عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین کو چھوڑ کر صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ حق کو خاص کرنا ایسی بات ہے کہ شیعہ کے علاوہ کوئی بھی مسلمان یہ نہیں کہتا۔

❀ شیعہ مصنف کے دعویٰ کا فساد اور بوداپن اس کے اس کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ:'' حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں اتفاق اور ان کی بیعت منعقد ہونے کے بعد اختلاف پیدا ہو گیا تھا۔''

❀ حالانکہ یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ: مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد نے آپ کی بیعت نہیں کی تھی۔ حتی کہ بہت سارے اہل مکہ و مدینہ جنہوں نے آپ کو دیکھا ہوا بھی تھا؛ انہوں نے بھی آپ کی بیعت نہیں کی تھی۔ دور کے لوگوں کو تو چھوڑے جیسے کہ: اہل شام نے بالاتفاق حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت نہیں کی تھی۔ بہت سے اہل مصر اور اہل مغرب؛ اہل عراق و خراسان نے بھی اس میں بیعت شرکت نہیں کی تھی۔ پھر یہ بات اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حق میں نہیں کہی جا سکتی؛ جن کی بیعت پر دو مسلمانوں نے بھی اختلاف نہیں کیا؛ تو پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حق میں کیسے کہی جا سکتی ہے؟

حضرت عائشہ اور طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہم اجمعین کی معذرت اور رجوع کا ذکر کیے بغیر ان پر زبان طعن دراز کرنا بہت بڑی زیادتی ہے۔ اہل علم اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ طلحہ و زبیر اور حضرت علی رضی اللہ عنہم اجمعین میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کے خلاف لڑنا نہیں

---

❶ اس شخص نے یہ عقیدہ اختراع کیا تھا کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کے وصی ہیں، جس طرح یوشع علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام کے وصی تھے اس کے بعد دوسرا مخترع شیطان الطاق محمد بن جعفر رافضی تھا جس نے یہ عقیدہ گھڑ لیا تھا کہ امامت کے منصب پر چند مخصوص اشخاص فائز ہوں گے۔

چاہتا تھا بلکہ یہ لڑائی اچانک بپا ہوگئی تھی۔ ایسے ہی اہل شام کے ساتھ بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ جنگ نہیں لڑنا چاہتے تھے۔ اور نہ ہی وہ لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے لڑنا چاہتے تھے؛ مگر ان کے ارادہ واختیار کے بغیر یہ فتنہ پیدا ہوگیا۔

❀ جنگ جمل فریقین کے ارادہ و اختیار کے بغیر بپا ہوئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ فریقین صلح پر آمادہ ہو گئے تھے اور بالاتفاق یہ طے پایا کہ قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ سے انتقام لیا جائے۔ دوسری جانب قاتلین عثمان نے جیسے پہلی بار فتنہ پیدا کیا تھا؛ ایسے ہی دوبارہ فتنہ پردازی پر اتر آئے؛ اور انھوں نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اور طلحہ وزبیر رضی اللہ عنہما کی جماعت پر دھاوا بول دیا۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے رفقاء نے اسے حملہ سمجھ کر مدافعت کی سعی کی۔ ادھر قاتلوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بتایا کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی فوج نے حملہ کر دیا۔ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مدافعت کی کوشش کی۔ اس اعتبار سے فریقین اپنا اپنا دفاع کر رہے تھے۔ ابتداء حملہ کرنے والا کوئی بھی نہ تھا۔

❀ بہت سارے اہل علم اور سیرت نگاروں نے ایسے ہی تحریر کیا ہے۔ اس لیے کہ یہ معاملہ اس طرح پیش آیا کہ اس پر کسی فریق پر کوئی بات اور ملامت نہیں کی جاسکتی۔ اگر ان دونوں میں سے کسی ایک فریق سے یا دونوں فریقوں سے کوئی گناہ یا خطاء واقع ہوئی ہو تو کتاب وسنت کی روشنی میں یہ بات معلوم ہے کہ یہ سبھی لوگ بہترین اولیاء اللہ اور اہل تقوی میں سے؛ اللہ کی کامیاب جماعت اور نیکوکار بندے تھے۔ اور یہ سبھی اہل جنت تھے۔

[شہرستانی پر اعتراض]:

❀ رافضی مصنف نے کہا ہے: ''پس چاہیے کہ اس انسان کے کلام کو انصاف کی نظر سے دیکھا جائے کیا یہ شخص اپنے مشائخ کے موجب فتنہ سے نکل سکا ہے یا پھر ان سے بھی آگے بڑھ گیا ہے۔'' [انتہیٰ کلام الرافضی]

❀ جواب: ان سے کہا جائے گا کہ: ''اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام میں فتنہ وفساد شیعہ کی وجہ سے پیدا ہوا۔ اور یہ قوم ہر فتنہ و فساد اور شر کی اصل جڑ ہیں۔ بلکہ یہ لوگ فتنہ کی چکی کے پاٹ ہیں۔ اسلام میں سب سے پہلا فتنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کی وجہ سے ظہور پذیر ہوا۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے؛ آپ نے فرمایا:

''تین چیزیں ایسی ہیں جو ان کے شر سے بچ گیا؛ وہ نجات پا گیا۔ میری موت؛ صابر خلیفہ کا ناحق قتل کیا جانا اور دجال کا خروج۔'' [المسند ٤/ ١٠٥]

❀ جو انسان بھی دنیا بھر کے تمام فرقوں کے احوال کا مطالعہ کرے گا؛ تو اسے پتہ چلے گا کہ: رشد و ہدایت پر اتفاق میں' اور فتنہ' تفرقہ بازی اور اختلاف سے دور صحابہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کوئی اور گروہ نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس بات کی گواہی دی ہے کہ جماعت دنیا کے تمام لوگوں سے بہتر جماعت تھی۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ﴾

''تم بہترین امت ہو جنہیں لوگوں کے لیے نکالا گیا ہے' نیکی کا حکم دیتے ہو برائی سے منع کرتے ہو' اور اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہو۔''

اور ہدایت یافتہ اور کامیاب و منصور جماعت کی راہ رافضیوں سے بڑھ کر کوئی دوسرا گروہ دور نہیں۔اس لیے کہ اہل قبلہ کی جانب گروہوں میں روافض سے بڑھ کر جاہل اور ان سے بڑا ظالم کوئی دوسرا گروہ نہیں۔اس امت کے بہترین لوگ صحابہ کرام تھے۔اس امت میں دین حق پر اجتماعیت و اتفاق اور افتراق اور اختلاف سے دور صحابہ کرام سے بڑھ کر کوئی بھی نہیں تھا۔صحابہ کرام کے متعلق جو بھی نقص وعیب کی بات نقل کی جاتی ہے اگر اسے امت میں موجود معائب و نقائص کے ساتھ قیاس کیا جائے تو وہ نہ ہونے کے برابر ہوگی۔

❀ رہا یہ معاملہ کہ لوگ اپنی طرف سے جو کچھ تخلیق کردہ امور بیان کرتے ہیں ؛ ان کا کوئی اعتبار نہیں۔کوئی ائمہ میں سے اپنی طرف سے معصوم گردانتا ہے۔اور دوسرا گروہ معصوم جیسی کوئی دوسری چیز تراش لیتا ہے اگر چہ وہ معصوم نہ بھی ہو۔پس نئے القاب و خطاب گھڑے جاتے ہیں جیسے : العالم' الشیخ ؛ الملک' الأمیر وغیرہ اس طرح کے دیگر القابات۔

روافض بھی عجیب لوگ ہیں سچی بات کہتے ہیں نہ سچی بات مانتے ہیں۔ہر چیخ و پکار پر سر دھننے لگتے ہیں۔صحابہ کبار کے جانی دشمن اور اعداء اسلام تاتاریوں کے گہرے دوست ہیں۔اہل سنت عوام کو ایذاء پہنچانے کے لیے تاتاری کفار کی طرف طلب امداد کا ہاتھ بڑھاتے ہیں۔عراق و دیگر بلاد و امصار کو برباد کرنے کا فن کوئی ان سے سیکھے جیسے خلافت عباسیہ کے وزیر ابن العلقمی نے کیا تھا۔اس نے ہلاکو خاں سے مراسلت کر کے اسے عراق آنے کی دعوت دی۔چنانچہ وہ بڑے پختہ ارادے کے ساتھ عراق آیا اور ہر طرف تباہی پھیلا دی۔بغداد میں خون کی ندیاں بہادیں۔علوی و عباسی خواتین کو قیدی بنالیا۔مسلمانوں کی اولاد کفر و شرک کی گود میں پرورش پانے لگی۔بہر کیف شیعہ کا وجود اسلام اور اہل اسلام کے لیے مار آستین سے کم نہیں۔وہ ملاحدہ اور غالی روافض کی تعظیم بجالاتے ہیں اور اصحاب رسول سے بغض و کینہ رکھتے ہیں۔

گویا روافض صحیح معنی میں اس آیت کے مصداق ہیں:

﴿اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ اُوْتُوا نَصِیْبًا مِّنَ الْکِتٰبِ یُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ وَ یَقُوْلُوْنَ لِلَّذِیْنَ کَفَرُوْا هٰٓؤُلَآءِ اَهْدٰی مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سَبِیْلًا﴾ (النساء: ۵۱)

''کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن کو کتاب کا ایک حصہ دیا گیا ہے وہ جبت و طاغوت پر ایمان رکھتے اور کافروں کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ اہل ایمان کی نسبت زیادہ صحیح راستہ پر ہیں۔''

شیعہ کا طرز فکر و عمل:

اس بات کا کیا علاج کہ شیعہ جھوٹی روایات سے ہمارے خلاف احتجاج کرتے ہیں اور منقولات میں سے صرف انہی دلائل کو قبول کرتے ہیں جو ان کی خواہشات کے موافق ہوں، وہ معرفت اسناد سے بے گانہ اور فن حدیث سے نابلد محض ہیں، جب ان میں سے کوئی شخص جھوٹی یا سچی کوئی دلیل پیش کرتا ہے تو وہ اس سے کتاب و سنت کی دلیل کا مطالبہ نہیں کرتے اور نہ یہ دیکھتے ہیں کہ کون سی دلیل اس کی معارض ہے۔جب ان کی تردید میں مخالف احادیث صحیحہ پیش کرتا ہے تو ضد و عناد سے ان کی تکذیب کرتے ہیں۔آیات قرآنیہ کی تحریف کرتے ہیں۔اگر مخالف بالا دست ہو اور شیعہ اس سے خائف ہوں تو فوراً اس کے پیش کردہ دلائل کی تائید کرتے اور کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں اس وقت وہ امامیہ سے اظہار براءت کرنے لگتے

ہیں، ظاہر ہے کہ ایسے منافقین سے مناظرہ کا حق کون ادا کر سکتا ہے؟

شیعہ نے تین اصول مقرر کر رکھے ہیں:

۱۔ ائمہ معصوم ہیں۔

۲۔ جو بات ائمہ سے نقل کی جائے وہ اسی طرح ہے جیسے نبی کریم ﷺ سے منقول ہو۔

۳۔ اہل بیت کا اجماع حجت ہے۔

شیعہ کے ائمہ اہل بیت میں شامل ہیں، اس لیے گویا ان کے ہاں کوئی شرعی دلیل ہے نہ تعلیل۔ یہی وجہ ہے کہ شیعہ فقہ و تحقیق اور علم و توفیق سے محروم ہیں۔ شیعہ جن مسائل میں باقی امت سے منفرد ہیں ان میں شیعہ کا اعتماد انہیں اصول سہ گانہ پر ہے جو کتاب و سنت، عقل و فکر اور اجماع امت کے خلاف ہیں۔

❁❁❁❁

تیسری فصل:

امامت علی رضی اللہ عنہ کے دلائل

شیعہ مصنف لکھتا ہے:

''تیسری فصل میں رسول اللہ ﷺ کے بعد امیر المؤمنین حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی امامت کے دلائل بیان کیے جائیں گے۔ اس بارے میں دلائل اتنے زیادہ ہیں کہ ان کا شمار ممکن نہیں۔ لیکن ہم ان میں سے اہم ترین دلائل ذکر کریں گے۔ اور ان دلائل کو چار طریقوں پر پیش کریں گے:

پہلا طریقہ: عقلی دلائل: اس کی پانچ اقسام ہیں:

اول: [ہم کہتے ہیں کہ] امام کا معصوم ہونا ضروری ہے۔ اگر امام کے لیے عصمت کی شرط تسلیم کر لی جائے تو اس سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا امام ہونا خود بخود لازم آتا ہے۔

پہلا مقدمہ: [امام کا وجود اس لیے ضروری ہے کہ] انسان اپنی طبیعت کے لحاظ سے [مدنی] اجتماعی زندگی گزارنے والا ہے' تنہا زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ وہ اپنی بقاء میں کھانے پینے، لباس اور جائے سکونت کا محتاج ہے۔ یہ سارے کام وہ اکیلا نہیں کر سکتا؛ بنا بریں قیام نوع کے لیے وہ اعوان و انصار کا محتاج ہے۔ تاکہ ان میں سے ہر ایک اپنے بھائی کی ضرورت پوری کرے۔ اور اس زندگی کا گزارنا ممکن ہو۔ جب بہت سے انسان ایک جگہ اکٹھے ہوں گے تو ان میں ایک دوسرے پر غلبہ پانے اور حسد کی وجہ سے دنگہ وفساد کا خطرہ لاحق ہو گا، اس لیے کہ بسا اوقات انسان کو ایسی چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے جس پر دوسرا شخص قابض ہوتا ہے۔ چنانچہ قوت شہوانیہ اسے وہ چیز جبراً حاصل کرنے پر مجبور کرتی ہے جس کا نتیجہ فتنہ وفساد اور قتل وغیرہ کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ اس لیے ایک امام معصوم کے متعین کرنے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے جو ان کو ظلم وفساد اور سرکشی سے روکے۔ اور ایک دوسرے پر غلبہ حاصل کرنے کی کوششوں سے منع کرے۔ مظلوم کو ظالم سے انصاف دلائے۔ اور حق دار کو اس کا حق پہنچائے۔ اس امام سے سہو وخطاء اور گناہ کا صادر ہونا ممکن نہ ہو' ورنہ ایک اور امام کی ضرورت پڑے گی۔ اس لیے کہ امام کو اس ضرورت کے پیش نظر نصب کیا گیا تھا کہ امت سے خطاء کا صدور ممکن ہے۔ اگر امام سے بھی خطاء سرزد ہو سکتی ہو تو کسی اور امام کی ضرورت پڑے گی۔ اگر وہ امام خطاء سے معصوم ہوا تو پھر اس کی امامت درست ہے ورنہ ایک اور امام نصب کرنا پڑے گا، اور اس طرح تسلسل لازم لائے گا۔

دوسرا مقدمہ: صاف ظاہر ہے کہ ابوبکر وعمر وعثمان [رضی اللہ عنہم اجمعین] بالاتفاق معصوم نہ تھے جب کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ معصوم تھے لہٰذا وہی امام ہوں گے۔''

[جواب]: ہم جواباً کہتے ہیں کہ یہ دونوں مقدمات باطل ہیں۔ [تفصیلی جواب اس طرح سے ہے:]

[رافضي کا شبہ] پہلا مقدمہ: رافضی کا کہنا کہ: ایک امام معصوم کی ضرورت لاحق ہوتی ہے جو ان کو ظلم وفساد اور

سرکشی سے روکے۔اور ایک دوسرے پر غلبہ حاصل کرنے کی کوششوں سے منع کرے۔مظلوم کو ظالم سے انصاف دلائے۔اور حق دار کو اس کا حق پہنچائے۔اس امام سے سہو و خطاء اور گناہ کا صادر ہونا ممکن نہ ہو؛ ورنہ ایک اور امام کی ضرورت پڑے گی۔اس لیے کہ امام کو اس ضرورت کے پیش نظر نصب کیا گیا تھا کہ امت سے خطاء کا صدور ممکن ہے۔اگر امام سے بھی خطاء سرزد ہو سکتی ہو تو کسی اور امام کی ضرورت پڑے گی۔اگر وہ امام خطاء سے معصوم ہوا تو پھر اس کی امامت درست ہے ورنہ ایک اور امام نصب کرنا پڑے گا۔''

[ردشبہ] : ہم کہتے ہیں: اگر اس مقدمہ کی صحت کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو معصوم صرف رسول ﷺ کی ذات ہوتی ہے؛ اور اطاعت بھی آپ ہی کی ہر انسان پر اور ہر زمانے میں واجب ہوتی ہے۔رسول اللہ ﷺ کے اوامر و احکام کا علم اس امت کو بھر پور طریقہ سے حاصل ہے؛ بہ نسبت امام غائب یا امام منتظر کے اوامر ونواہی اور احکام کے۔رسول اللہ ﷺ امام معصوم ہیں' اور امت آپ کے اوامر ونواہی کو جانتی ہے۔جب کہ ان کے معصوم کا معاملہ ایک غائب منتظر پر جا کر رک جاتا ہے۔جس کو اگر معصوم تسلیم بھی کر لیا جائے تو امت میں سے کسی ایک کو اس کے کسی حکم یا نہی کا کوئی علم نہیں۔بلکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رعیت بھی آپ کے اوامر ونواہی کو ایسے نہیں جانتی تھی جس طرح یہ امت رسول اللہ ﷺ کے اوامر ونواہی کو جانتی تھی۔بلکہ امت محمد ﷺ کے پاس آپ کے احکام و اوامر ونواہی کا اتنا علم ہے جس کی موجودگی میں اللہ تعالیٰ نے انہیں کسی دوسرے امام سے بے نیاز کر دیا ہے۔اور انہیں دوسرے کسی ایسے متولی کی کوئی حاجت نہیں جو انہیں ان کے دین کی پہچان کرائے۔اور نہ ہی انہیں اس شریعت پر عمل کرنے کے لیے کسی کے تعاون کی کوئی ضرورت ہے۔اگر امام کے وجود کو علی التقدیر تسلیم بھی کر لیا جائے تو پھر بھی [اہل سنت] اپنے نبی ﷺ کے اوامر ونواہی کو امام منتظر کی رعیت کے کسی بھی فرد سے بڑھ کر جانتے ہیں۔

اور رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سوا کسی ایک بھی ایسے کو مسلمانوں پر متولی نہیں بنایا جس کے لیے عصمت کا دعوی کیا گیا ہو۔یہ بات قطعی طور سے معلوم ہے کہ آپ کی رعیت یمن و خراسان اور دیگر بلاد اسلامیہ میں تھے۔اور ان میں ایسے بھی تھے جن کو شرعی اوامر ونواہی کا کچھ پتہ نہ تھا۔بلکہ آپ کے متعین کردہ نائبین بھی ایسے امور میں بھی تصرف کرتے تھے جن سے حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی واقف نہ ہوتے تھے۔

جب کہ محمد ﷺ کے وہ وارث جنہوں نے یہ علم آپ سے وراثت میں حاصل کیا ہے' وہ آپ ﷺ کے احکام' اوامر و نواہی کو بہت اچھی طرح جانتے تھے' اور آپ ﷺ کی طرف سے ملنے والے خبروں کی تصدیق کرتے تھے؛ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نائبین سے بڑھ کر رسول اللہ ﷺ کے اوامر ونواہی کے عالم اور باخبر تھے۔جب کہ شیعہ ایک معصوم اور زندہ امام موجود ہونے کو لازمی قرار دیتے ہیں۔[مزید براں جو صفات شیعہ نے امام میں ضروری قرار دی ہیں، ایسا امام ہمارے زمانے میں کہیں موجود نہیں۔شیعہ کے نزدیک وہ مفقود اور بے حقیقت ہے۔بھلا ایسے امام سے امامت کے مقاصد کس حد تک پورے ہو سکتے ہیں؟ ایسے فرضی امام سے تو ایک جاہل و ظالم بھی بہتر ہے۔امام کی ضرورت اس لیے پیش آتی ہے کہ اس سے علم حاصل کیا جائے اور اس کے اعمال کی پیروی کی جائے]۔

❀**[شبہ نمبر۲]** : شیعہ کا یہ قول'' کہ زندہ امام معصوم کا تقرر ضروری ہے۔''

❀**جواب** : یہ کلام کئی وجوہات کی بنا پر باطل ہے۔

پہلی وجہ : بیشک امام موصوف اس صفت کیساتھ کہیں بھی نہیں پایا جاتا۔ جبکہ ہمارے اس زمانے میں کوئی ایسا معروف امام معلوم نہیں ہوسکا جس کے بارے میں ان صفات کا دعوی کیا جاتا ہو۔اور نہ ہی کسی نے خود اپنے لیے ایسا دعوی کیا ہے۔ بلکہ ایسا امام اس کے ماننے والوں کے ہاں غائب اور مفقود ہے ؛ اور اہل عقل کے ہاں معدوم ہے' اس کی کوئی حقیقت نہیں ۔ اور حقیقت میں ایسے لوگوں سے مقصود امامت سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا ۔ بلکہ اگر لوگوں پر کسی ایسے انسان کو حاکم اور امام بنادیا جائے جس میں اگر چہ کچھ جہالت اور ظلم کا عنصر بھی پایا جاتا ہو' اس کا ہونا اس امام سے بہتر جس سے کسی طرح بھی کوئی فائدہ حاصل نہ ہوسکتا ہو۔

جو لوگ اپنے آپ کو اس امام معصوم کی طرف منسوب کرتے ہیں وہ دوسرے لوگوں کے علاوہ اپنا کوئی مددگار نہیں پائے ۔ بلکہ جو لوگ اپنے آپ کو امام معصوم کی طرف منسوب کرتے ہیں ؛ وہ بڑے بڑے کافروں اور ظالموں سے مدد حاصل کرتے ہیں۔ جب اس امام معصوم کی تصدیق کرنے والوں کو نہ ہی کوئی دینی فائدہ حاصل ہوا اور نہ ہی دنیاوی' اور نہ ہی ان میں سے کسی ایک کو مقاصد امامت میں سے کچھ بھی مقصود حاصل ہوا ۔ جب مقصود میں سے کچھ بھی حاصل نہ ہو' تو پھر اس کے لیے ہمیں کسی وسیلہ کے ثابت کرنے کی ہرگز کوئی ضرورت نہیں۔اس لیے کہ وسائل سے مراد تو اصل میں مقاصد سے حاصل ہوتی ہے۔ جب ہم یقینی طور پر مقاصد کے حصول کی نفی کرتے ہیں' تو اس کے وسائل میں کلام کرنا ایک بیکار کوشش ہے۔اور کی مثال یوں بیان ہوسکتی ہے کہ جیسے کوئی کہے : '' لوگوں کو ضرورت ہے کہ کوئی انہیں کھانا کھلائے اور پانی پلائے ؛ اور اس کے لیے ضروری ہے کہ کھانا اس طرح کا ہو' اور پینا ان اوصاف کا ہو' اور ایسا فلاں گروہ کے لیے ؛ اور ایسا فلاں گروہ کے لیے۔ حالانکہ یہ بات سب کو معلوم ہو کہ وہ لوگوں میں سب سے زیادہ فقیر ہے ؛ وہ لوگ بھی اپنے افلاس میں معروف ہیں۔

جس کا معدوم ہونا معلوم ہو' اس کے طلب کرنے میں کون سا فائدہ ہے ؟ اور جس سے حقیقت میں کوئی فائدہ حاصل نہ ہوسکتا ہو' اس کی اتباع کیسی ؟ ۔ حالانکہ امام کی ضرورت دو چیزوں کے لیے ہوتی ہے :

یا تو علم کے لیے' تا کہ اس کی تعلیم و تبلیغ کی جاسکے ۔

یا پھر عمل کے لیے تا کہ وہ اپنی قوت و شوکت کی بنا پر [اس علم پر] عمل کے لیے لوگوں کی مدد کر سکے۔

جب کہ اس امام سے نہ پہلا فائدہ حاصل ہوا اور نہ ہی دوسرا۔ بلکہ شیعہ کے پاس جو علم ہے' وہ اس [امام غائب] سے پہلے کے ائمہ کے اقوال و اعمال سے منقول ہے۔ اگر اس میں کوئی چیز مسلمانوں کے موافق ہوتی ہے تو اس کے لیے مسلمانوں سے مدد حاصل کرتے ہیں' اور اگر ایسا نہ ہو تو کفار' ملحدین اور ان جیسے لوگوں سے مدد حاصل کرتے ہیں۔

یہ لوگ عمل کی دنیا میں سب سے زیادہ عاجز ہیں۔اور علم کے میدان میں سب لوگوں سے بڑھ کر جاہل ہیں ۔ حالانکہ وہ اس امام معصوم کے پیروکار ہونے کے دعویدار ہیں جس سے مقصود علم و قدرت ہے۔ مگر نہ ہی انہیں علم حاصل ہوا اور نہ ہی قدرت ۔ تو پتہ چلا کہ ان کے دعوی کی کوئی حقیقت نہیں۔

مزید براں کہ امت کو ان بارہ ائمہ میں سے کسی ایک سے بھی امامت کے پورے مقاصد حاصل نہیں ہوئے ۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علاوہ جتنے بھی ائمہ ہیں' لوگ ان کے علم سے ایسے ہی مستفید ہوئے ہیں جیسے ان کے ہم مثل دوسرے علماء سے۔

حضرت علی بن حسین' ان کے بیٹے ابوجعفر؛ ان کے بیٹے جعفر بن محمد لوگوں کو ایسے ہی اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا علم سکھاتے؛ جس طرح ان کے زمانے کے علماء لوگوں کو تعلیم دیا کرتے تھے۔ اور ان کے زمانے میں ایسے لوگ بھی تھے جو ان سے بڑھ کر عالم اور امت کے لیے زیادہ فائدہ مند تھے۔ یہ اہل علم کے ہاں معروف ہے۔ اگر یہ بات تسلیم کر لی جائے کہ یہ ائمہ اپنے زمانے میں سب سے بڑے عالم اور دیندار تھے۔ تو فقط ان اہل علم و دین سے وہ فائدہ حاصل نہیں ہوتا جو صاحب قوت و شوکت حکمران سے ہوتا ہے؛ وہ لوگوں پر حق کی پیروی کو لازم ٹھہراتا ہے اور برائی و باطل سے بزور باز و منع کرتا ہے۔ ان تین ائمہ کے بعد آنے والوں کے پاس اتنا علم نہیں تھا جس سے امت فائدہ حاصل کرے۔ اور نہ ہی انہیں قوت و شوکت حاصل تھی کہ وہ [نیک اعمال و نفاذ احکام شریعت میں] امت کی مدد کرتے۔ بلکہ ان جیسے دوسرے لوگوں یعنی بنی ہاشم کو مقام و مرتبہ اور منزلت حاصل تھی۔ اور انہیں دین اسلام کے ضروری مسائل کی معرفت بھی حاصل تھی۔ جیسے کہ بہت سارے عام مسلمان بھی یہ مسائل جانتے تھے۔

البتہ وہ علوم جو ماہرین اہل علم کے ساتھ خاص ہیں' ان کے بارے ان کی کوئی شہرت نہیں تھی۔ اس لیے اہل علم نے اس سے کوئی روایت نقل نہیں کی جیسے کہ ان سے پہلے کے تین ائمہ سے نقل کرتے آئے ہیں۔ اگر ان کے پاس کوئی نفع بخش علم ہوتا تو لوگ ان سے وہ علم حاصل کرتے۔ اس لیے کہ طالب علم کو اپنے مقصد کی معرفت ہوتی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بہت بڑے عالم تھے' اور امت یہ بات جانتی تھی۔ اس لیے ان سے فائدہ حاصل کیا اور عوام و خواص میں ان کا ذکر ہونے لگا۔ ایسے ہی امام شافعی رحمہ اللہ کے پاس نفع بخش علم و فقہ تھا؛ لوگوں نے اس سے فائدہ اٹھایا' اور ان کا نام علم فقہ کے میدان میں ایک روشن ستارہ ہے۔

لیکن جب انسان دیکھتا ہے کہ اس کا مقصود کسی جگہ پر نہیں مل رہا' تو وہ وہاں اس چیز کا طلب گار نہیں بنتا۔ کیا آپ دیکھتے نہیں کہ اگر کسی انسان کے بارے میں کہا جائے کہ وہ بہت بڑا طبیب ہے' یا بہت بڑا نحوی ہے' اور اس کی ایسی عظمت بیان کی جائے کہ اس سے علم حاصل کرنے کے لیے اہل طب اور نحوی حضرات حاضر ہو جائیں۔ مگر وہ دیکھیں کہ انہیں طب و نحو میں جس چیز کی ضرورت ہے' وہ اس آدمی کے پاس نہیں مل رہی؛ تو وہ اس سے منہ موڑ کر چلے جائیں گے۔ فقط جاہل لوگوں کا دعوی کرنا اس کی تعظیم بجالانا انہیں کوئی فائدہ نہ دے گا۔

امامیہ نے معتزلہ سے یہ عقائد لیے ہیں کہ اللہ تعالیٰ پر اقدار' تمکین اور لطف واجب ہے جن سے مکلّف اصلاح کے قریب تر اور فساد سے دور ہوتا ہے۔ باوجودیکہ اسے دونوں حالتوں [اصلاح اور فساد] پر قدرت حاصل ہوتی ہے۔

پھر [اس کے بعد شیعہ حضرات] کہنے لگے: ''امامت واجب ہے۔ بلکہ ان کے نزدیک امامت کا وجوب نبوت کے وجوب سے بڑھ کر ہے۔ کیونکہ [احکام شرعی] کی تکلیف میں اس سے مہربانی حاصل ہوتی ہے۔

نیز یہ بھی کہتے ہیں: ہم عادات اور زمانہ میں تجربات کی روشنی میں یہ بات یقینی طور پر جانتے ہیں کہ جب کسی جماعت کا کوئی با ہیبت امیر ہو' لوگ جس سے ڈرتے ہوں' اور اس کا حکم لوگوں پر چلتا ہو؛ تو اس امیر کی موجودگی میں لوگ اصلاح کے قریب تر اور فساد سے بعید ہوتے ہیں۔ اگر ان کا کوئی امیر نہ ہو' تو لوگوں میں دنگا و فساد اور قتل و غارت واقع ہوتے ہیں۔ اس وقت لوگ اصلاح سے بعید اور فساد کے قریب تر ہوتے ہیں۔

یہ حالت عقلی طور پر معلوم شدہ ہے۔اس کا انکار صرف وہی انسان کرسکتا ہے جو عادات سے جاہل ہو۔ اور کسی قاعدہ کا تسلسل کے ساتھ جاری رہنا عقلی طور پر معلوم نہیں ہوسکا۔ تو کہتے ہیں: جب ایسا ہونا تکلیف شرعی میں مہربانی ہے تو اس کا وجوب لازم آتا ہے۔ پھر اس کے بعد عصمتِ امام کی باقی صفات شمار کی ہیں۔

[اپنے آپ سے سوال]:

ان میں سے کچھ لوگوں نے اپنے آپ سے سوال کیا: جب تم کہتے ہو کہ امام کا ہونا اللہ تعالیٰ کا لطف و کرم اور مہربانی ہے' اور امام تم سے غائب ہے' تو اس غیب کی وجہ سے تمہیں کونسی مہربانی حاصل ہوئی؟ اگر امام کی غیبت کے ساتھ لطف حاصل نہیں ہوسکتا تو تکلیف جائز ہوئی۔ تو اس سے امام کے دین میں لطف و مہربانی ہونے کا نظریہ باطل ہوا۔ تو اس وقت پھر امام معصوم ہونے کے عقیدہ کی کوئی اہمیت باقی نہ رہی۔

پھر خود ہی اس سوال کے جواب میں کہنے لگے: ''بیشک یہ لطف و مہربانی ان عارفین کو امام کے غائب ہونے کی حالت میں حاصل ہے جو اس کی حالت ظہور کے واقف کار ہیں۔ یہ مہربانی ان لوگوں کو حاصل نہیں ہوسکتی جو امامت کے واجب ہونے کا انکار کرتے ہیں۔ جیسا کہ یہ مہربانی اس انسان کو حاصل نہیں ہوسکتی جن کو اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل نہیں ہوتی۔ اور ان لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو اس کی معرفت رکھتے ہیں۔ کہنے لگے کہ: اس سے یہ سوال ساقط ہوگیا۔ اور معصوم کی امامت کا عقیدہ واجب ہوگیا۔ پھر ان سے کہا گیا کہ: اگر حالت غیبت میں یہ لطف و مہربانی ایسے ہی حاصل ہے جیسے کہ حالت ظہور میں؛ تو پھر واجب ہوتا ہے کہ وہ اس کے ظہور سے بے نیاز ہوجائیں۔ اور مرتے دم تک اس کی اتباع کرتے رہیں۔ یہ بات انکے عقیدہ کے خلاف ہے۔

کہنے لگے: ''عارفین کے ہاں لطف و مہربانی غیبت کی حالت میں تنفیر وتبعید عن القبائح کے باب سے ہے' جیسا کہ حال ظہور میں ہوتا ہے۔ لیکن ہم امام کا ظہور کسی دوسری وجہ سے واجب قرار دیتے ہیں۔ وہ وجہ یہ ہے کہ مؤمنین سے ظالموں کا غلبہ ختم کیا جائے۔ اور ظالم لوگوں سے مال لیکر انہیں ان کی اصل جگہ پر واپس کیا جائے۔ اور ان ظالم حکومتوں کا خاتمہ کیا جائے جن کو ختم کرنا ہمارے بس کی بات نہیں۔ اور کفار سے جہاد کیا جائے' جو کہ امام کے ظہور کے بغیر ممکن نہیں۔

ان سے کہا جائے گا کہ: ''اس کلام کا باطل ہونا ظاہر ہے۔'' اس لیے کہ جس امام کو تم لطف قرار دیتے ہو؛ جس پر عادات وعقول گواہ ہیں؛ جیسا کہ تم نے خود ذکر کیا ہے۔ تم کہتے ہو: ''جب جماعت کے لیے پر ہیبت' صاحب اطاعت' متصرف اور زور آور امیر ہو تو اس کے وجود کی صورت میں لوگ اصلاح کے قریب تر ہوتے ہیں اور فساد سے بہت دور ہوتے ہیں۔ اور اس کے لیے تم نے معصوم ہونے کی شرط لگائی۔ اور آپ نے یہ بھی کہا کہ: اس کے بغیر ڈراوے کا مقصود حاصل نہیں ہوسکتا۔ اور یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ جو ائمہ اس منتظر سے پہلے موجود تھے؛ ان میں سے کسی ایک میں بھی یہ اوصاف نہ پائے جاتے تھے۔ ان میں سے کسی ایک کو بھی نہ ہی قوت و شوکت حاصل تھی اور نہ ہی وہ لوگوں کے معاملات میں تصرف کرنے کا اختیار رکھتا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ خلافت پر متمکن ہوئے' مگر آپ کو وہ قوت اور تصرف حاصل نہ ہوسکا جو آپ سے پہلے کے خلفاء کو تھا۔ ان کے بعد آنے والے ائمہ میں سے تو کسی کو بھی نہ ہی کوئی قوت حاصل ہوئی اور نہ ہی لوگوں پر کوئی با تصرف اختیار چلا۔ بلکہ ان میں

سے بھی کسی ایک کو وہی مقام حاصل ہوا کرتا تھا جو ان کے دوسرے ہم پلہ [علماء و اکابر] کو حاصل ہوتا تھا۔

جب کہ امام غائب کو تو ان امور کچھ بھی حاصل نہیں تھا۔اس لیے کہ جو کوئی امام کے وجود کا اقرار کرتا ہے؛ اسے پتہ ہے کہ امام ساڑھے چار (اب بارہ) سو سال سے غائب ہے۔اور وہ خوف سے لرزیدہ ہے' اس کا ظہور ممکن بھی نہیں؛ چہ جائے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی حدود قائم کرے؛ اور نہ ہی وہ کسی کو کوئی حکم دے سکتا ہے اور نہ ہی منع کر سکتا ہے؛ اور امت میں قتل و غارت گری اور دنگا و فساد بھی اب تک موجود ہے۔ نیز آپ دیکھ سکتے ہیں رافضی دیگر سب فرقوں سے زیادہ دنگا و فساد کرنے والے ہیں۔ ان میں زبانوں اور رنگ و نسل کے باوجود آپس میں ایک دوسرے پر بھی بہت بڑا وہ ظلم و تعدی اور اختلاف پائے جاتے ہیں جو کہ کفار سے دوستی رکھنے والوں کے مابین بھی نہیں؛ چہ جائے کہ وہ مسلمانوں سے محبت اور دوستی رکھنے والوں میں پائے جائیں۔تو پھر ان لوگوں کو اس امام کی وجہ سے کونسا لطف اور مہربانی حاصل ہوئی؟

جن بستیوں اور شہروں کے رہنے والے امام منتظر ماننے والے اور اس کا عقیدہ رکھنے والے ہیں' آپ ان کا مقابلہ ان شہروں اور بستیوں سے کیجیے جو اس کا عقیدہ نہیں رکھتے؛ تو آپ دیکھیں کہ مؤخر الذکر لوگ معاش و معاد کے لحاظ سے ہر طرح سے اچھی حالت میں ہے۔ یہاں تک کہ احوال عالم پر نظر رکھنے والا جانتا ہے کہ کافروں کے شہر جہاں منتظمین اور رؤساء موجود ہیں' جو ان کی دنیاوی مصلحتوں کو پورا کرنے کی کوششیں کرتے ہیں' وہ ان لوگوں سے اچھی حالت میں ہیں جو اپنے آپ کو اس امام کی متابعت کی طرف منسوب کرتے ہیں؛ مگر اس امام کی وجہ سے ان کے لیے نہ کوئی دنیاوی مصلحت پوری ہوتی ہے اور نہ ہی دینی۔ اگر یہ بات مان لی جائے کہ وہ امام کے وجود کے اعتراف کے ساتھ گناہ کرتے ہوئے ڈرتے بھی ہیں کہ اگر امام ظاہر ہو گیا تو انہیں گناہوں پر سزا دے گا؛ تو پھر بھی یہ بات سبھی جانتے ہیں سزا میں مشہور حکمرانوں کا لوگوں پر خوف ان [امامیہ] لوگوں کے امام منتظر کے خوف سے بڑھ کر ہے۔

پھر یہ بھی ہے کہ گناہ کی دو قسمیں ہیں: ان میں سے کچھ گناہ ظاہری ہوتے ہیں۔ جیسے لوگوں پر ظلم کرنا' ظاہری فحاشی [وغیرہ]۔ان گناہوں میں لوگ ڈرتے ہیں کہ حاکم انہیں سزا دے گا۔ یہ خوف امامیہ کے امام منتظر کی سزا کے خوف سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جب لطف و مہربانی کو واجب قرار دیتے ہیں' وہ نہ ہی اس منتظر کے عارفین کے لیے حاصل ہوئی اور نہ ہی کسی دوسرے کے لیے۔

❀ شیعہ کا یہ کہنا: ''یہ لطف امام کے عارفین کے لیے [ایسے ہی] حاصل ہوتا ہے جیسا کہ حالت ظہور میں حاصل ہو''؟

❀ یہ ایک کھلی ہوئی معاندانہ اور سرکشی کی بات ہے۔ اس لیے کہ اس میں کوئی شک نہیں جب امام مہدی کا ظہور ہوگا' وہ شرعی حدود قائم کرے گا' اور وعظ و نصیحت کا کام کرے گا اور ایسے امور سرانجام دے گا جن امور کا لطف ہونا واجب ہوگا' اور یہ امور عدم ظہور کے ساتھ حاصل نہیں ہو سکتے۔

لطف کے باب میں ان کا امام کی معرفت کو اللہ تعالیٰ کی معرفت سے تشبیہ دینا' اور یہ کہنا کہ: اس سے عارفین کو لطف و مہربانی حاصل ہوتے ہیں دوسروں کو نہیں؛ یہ ایک فاسد قیاس ہے۔ اس لیے کہ یہ معرفت کہ: اللہ تعالیٰ زندہ موجود اور قادر ہے؛ بھلائی کا حکم دیتا ہے' اور اس [کے بجالانے] پر ثواب سے نوازتا ہے' اور برائی سے منع کرتا ہے اور اس [کے ارتکاب] پر سزا دیتا

ہے[یہ معرفت] اللہ تعالیٰ کے خوف اور اس سے امید کے بڑے اسباب میں سے ہے۔ یہ معرفت ثواب اعمال کے حصول میں رغبت پیدا کرے گی؛ اس بنا پر انسان مامور افعال کو بجالائے گا اور ممنوعہ کاموں کو اس کے عذاب کے خوف سے ترک کر دیگا۔ کیونکہ انسان جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے؛ اور اس کی سنت نیکوکاروں کو ثواب دینا اور بدکرداروں کو سزا دینا ہے۔

رہا ایسا شخص جس کے بارے میں لوگ جانتے ہوں کہ ساڑھے چار [اب بارہ] سو سال سے مفقود ہے؛ [اس کا کوئی اتا پتہ ہی نہیں] اور نہ ہی اس نے کسی کو [نیکی پر] ثواب دیا؛ اور نہ ہی کسی کو [بدی پر] سزا دی۔ بلکہ اگر وہ ظاہر ہو جائے تو اسے اپنی جان کا خوف دامن گیر ہو؛ بجائے اس کے کہ وہ لوگوں کو نیکی کا حکم دے اور برائی سے منع کرے؛ تو پھر ایسے امام کی معرفت مامور کو بجالانے اور ممنوع کے ترک کر دینے کے لیے داعی [اور سبب] کیسے ہو سکتی ہے؟ بلکہ جب کسی کو امام کے عجز و خوف کا پتہ چلے گا تو وہ زیادہ بے خوف ہو کر گندے افعال کا ارتکاب کرے گا۔ خصوصاً جب ایک لمبا زمانہ گزر جائے' اور وقت یہ وقت گزرتا جائے اس دوران نہ ہی کسی کو [بدعملی کی] سزا ملی ہو اور نہ ہی کسی کو [نیک عمل پر] انعام ملا ہو۔

بلکہ اگر مان لیا جائے [جیسے بعض شیعہ دعوی کرتے ہیں] کہ: امام ہر سو سال میں ایک بار ظاہر ہوتا ہے؛ اور سزا دیتا ہے۔ تو پھر بھی اس امام سے وہ لطف و مہربانی حاصل نہیں ہو سکتی جو کسی ادنیٰ سے مسلمان حکمران سے حاصل ہو سکتی ہیں۔ بلکہ اگر یہ بھی کہہ لیا جائے کہ [یہ امام] ہر دس سال بعد ظاہر ہوتا ہے؛ یا ہر سال بعد ایک بار ظاہر ہوتا ہے' تب بھی اس امام سے کوئی ایسی منفعت حاصل نہیں ہو سکتی جو اس حکمران سے حاصل ہو سکتی ہے جو ہر وقت لوگوں کے درمیان ظاہر اور موجود ہو۔ بلکہ یہ حکمران - بھلے یہ حکمران بعض گناہوں کے مرتکب بھی ہوں' اور بعض امور میں ظالم بھی ہوں پھر بھی - اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے اسباب مہیا کیے ہیں۔ یہ جو لوگوں کو سزائیں دیتے ہیں' اور نیکی کے کاموں میں رغبت دلاتے ہیں' [اس کا فائدہ] اس سے بہت بڑھ کر ہے جو ایک عرصہ کے بعد ظاہر ہو؛ پھر اس کا کیا عالم ہو گا جو بالکل ہی مفقود ہو۔ جمہور عقلاء جانتے ہیں اس امام کا حقیقت میں کوئی وجود ہی نہیں۔ اس امام کے وجود کا اقرار کرنے والے یہ بھی جانتے ہیں کہ [اگر وہ امام بالفرض موجود بھی ہے تو] وہ انتہائی عاجز اور خوف زدہ ہے۔ اس نے کبھی بھی کوئی فعل سرانجام نہیں دیا جیسے لوگوں میں سے کوئی بھی کوئی کام کر سکتا ہو۔ چہ جائے کہ اس کا مقابلہ کسی حکمران سے کیا جائے۔ [جو احکام جاری کرتا ہو' اور قانون نافذ کرتا ہو]۔

اس امام غائب کی کون سی ہیبت ہے؟ اور کیسی اطاعت گزاری ہے؟ کون سا تصرف ہے اور کیسی دسترس حاصل ہے؟ تاکہ جب لوگوں کے لیے ایک باہیبت' مطاع؛ متصرف اور دسترس رکھنے والا امام [تصور کیا جائے] جس کے دور میں لوگ اطاعت و اصلاح کے قریب تر ہوتے ہیں۔

جس انسان کو ان باتوں کا علم وہ جانتا ہے کہ شیعہ انتہائی سرکشی' جہالت' عداوت اور حماقت کا شکار ہیں۔ اس لیے کہ یہ لوگ امام کی غیبت و عاجزی کی حالت میں اس سے وہ لطف و مہربانی جوڑتے ہیں جو اس کے ظہور کی حالت میں ہونی چاہیے۔ اور یہ کہتے ہیں کہ: اس امام کے خوف' عاجزی' اور فقدان کے باوجود اس کی معرفت لطف و مہربانی ہے؛ جیسا کہ اگر وہ ظاہر و قادر ہوتا' اور اسے امن حاصل ہوتا [تو وہ لطف و مہربانی حاصل ہوتی]۔ اور پھر یہ بھی کہتے ہیں کہ: مجرد اس معرفت کا ہونا بھی ایسے لطف و مہربانی ہے جیسے اللہ تعالیٰ کی معرفت لطف و مہربانی ہے۔

دوسری وجہ: تمہارا یہ قول کہ: ''امام معصوم کو مقرر کیا جانا ضروری ہے جو ان افعال کو انجام دے۔''

❀ ہم پوچھتے ہیں کہ اس کا کیا مطلب ہے؟ آیا تمہاری مراد یہ ہے کہ ایسے امام کو پیدا کرنا اور نصب کرنا اللہ کے لیے ضروری ہے جو ان صفات سے متصف ہو؟ یا یہ مطلب ہے کہ لوگوں کیلئے ان صفات سے متصف امام کی بیعت کرنا ناگزیر ہے؟

❀ اگر تم نے جواب دیا کہ ہمارا مقصود پہلا قول ہے؛ تو [ہم کہتے ہیں کہ] اللہ تعالیٰ نے ان صفات سے متصف کسی ایک کو بھی پیدا نہیں کیا۔ آپ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ: ''بیشک علی رضی اللہ عنہ معصوم تھے؛ مگر اللہ تعالیٰ نے انہیں اختیار نہ دیا' اور آپ کی تائید نہ فرمائی۔ نہ ہی خود مدد کی؛ اور نہ ہی کسی لشکر سے؛ تاکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ وہ افعال سرانجام دیں جن کا تم نے ذکر کیا ہے۔

❀ مگر تم کہتے ہو: حضرت علی رضی اللہ عنہ خلفاء ثلاثہ کے زمانہ میں مسند خلافت پر متمکن نہ ہو سکے، بلکہ آپ عاجز و مغلوب اور مظلوم رہے۔ جب آپ کو خلافت حاصل ہوگئی؛ تو ایک دوسرا لشکر کھڑا ہوگیا؛ جنہوں نے آپ سے جنگ و قتال کیا؛ یہاں تک کہ آپ وہ کام بھی نہ کر سکے جو آپ سے پہلے تین خلفاء نے کئے تھے؛ جو تمہارے نزدیک ظالم ہیں۔ اسکا مطلب یہ ہوا کہ شیعہ کے نزدیک اللہ تعالیٰ نے تین ظالموں کو یکے بعد دیگرے خلافت پر فائز کیا اور انھوں نے امت کے لیے بڑے مفید کام کیے، مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ توفیق نہ بخشی اور اللہ تعالیٰ نے ایسی ضرورت کے زمانہ میں اس معصوم کو پیدا نہ کیا۔

❀ اگر شیعہ کہیں کہ: ''امت کے لیے ایسے امام کا تقرر اور اس کی اعانت ضروری ہے۔''

❀ تو ہم کہیں گے: ''یقیناً لوگوں نے بھی ایسا نہیں کیا خواہ وہ ماننے والے ہوں یا نہ ماننے والے۔ بہر تقدیر ہر صورت تمہارے نزدیک ان معصومین میں سے کسی ایک کو بھی تائید حاصل نہ ہوسکی۔ نہ ہی خواص کی طرف اور نہ ہی عوام کی طرف سے۔ جن مصلحتوں کا تم نے ذکر کیا ہے' ان کا حصول تائید کے بغیر ناممکن ہے۔ جب تائید نہیں ہوئی تو وہ مصالح بھی حاصل نہ ہوسکے جو ہونے چاہیے تھے۔ بلکہ اس کے فقط اسباب حاصل ہوئے تھے' مگر فقط اسباب سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔

تیسری وجہ: یہ کہا جائے گا کہ: جب ان کے وجود سے جملہ مقاصد حاصل نہیں ہوئے بلکہ اس کی بہت سی شرائط فوت ہوگئیں؛ تو عصمت کی شرط کس لیے باقی رکھی جائے؟ علاوہ ازیں جب عدم عصمت یا معصوم کے عاجز ہونے کی وجہ سے مقصود حاصل نہ ہو تو عصمت کا وجود و عدم یکساں ہے۔ پھر عقلی دلیل کی مدد سے یہ کیوں کر ثابت ہوا کہ امام معصوم کا پیدا کرنا اللہ تعالیٰ کے لیے ضروری ہے؟ بیشک اس امام کا پیدا کیا جانا صرف اس وجہ سے تھا تاکہ مصالح العباد حاصل ہوں۔ اور جب اسے عاجز پیدا کیا گیا' وہ ان مصلحتوں میں کسی چیز پر قدرت بھی نہیں رکھتا؛ بلکہ اس امام کی وجہ سے وہ فساد پیدا ہوا کہ اگر اس امام کا وجود نہ ہوتا تو یہ فساد پیدا نہ ہوتا۔ جیسا کہ چوتھی وجہ میں یہ باتیں ظاہر ہو جائیں گی۔

چوتھی وجہ: اگر اللہ تعالیٰ ایسا امام پیدا نہ کرتا تو وہ شر پیدا نہ ہوتا جیسا شر دیکھنے میں آرہا ہے۔ جب اس کے وجود سے کسی شر کو ختم نہیں کیا جاسکا؛ حتی کہ یہ کہا جائے کہ اس [امام] کے وجود سے اس [شر] کا ختم کرنا ممکن ہوا۔ بلکہ اس کے وجود نے جمہور کو تکذیب پر برانگیختہ کیا؛ اور انہوں نے شیعہ سے عداوت کی ٹھان لی۔ انہوں نے اس امام پر اور اس کے ماننے

والوں پر ظلم کیا؛ اور اتنا شر و فساد پیدا ہوا جس کو صحیح معنوں میں اللہ ہی جانتا ہے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ یہ امام معصوم ہے۔ اور اگر بالفرض تسلیم کرلیں کہ: حضرت علی معصوم نہیں' اور نہ ہی باقی بارہ اماموں میں سے کوئی ایک معصوم ہے؛ اور تینوں خلفاء بھی مقرر نہ ہوئے ہوتے؛ بنو امیہ اور بنو عباس کو حکومت بھی نہ ملی ہوتی تو پھر بھی اس [نظریہ] میں [بذات خود] شر و فساد موجود ہے۔ یہ اس صورت میں ہے اگر ان ائمہ کو معصوم تسلیم کرلیا جائے۔ معصوم ماننے کی صورت میں ان میں سے کسی ایک نے بھی کوئی شر ایسے ختم نہیں کیا مگر جیسے دوسرے غیر معصوم لوگوں نے ختم کیا؛ تو معاملہ یہاں پہنچا کہ ان کے معصوم ہونے [کے عقیدہ] کی وجہ سے شر و فساد ہی پیدا ہوا' کوئی خیر و مصلحت حاصل نہیں ہوسکی۔

حکیم کے متعلق کیسے یہ بات جائز سمجھی جاسکتی ہے کہ وہ کسی چیز کو پیدا کرے تاکہ اس سے خیر و بھلائی حاصل ہو؛ مگر پھر اس سے سوائے شر کے کوئی بھلائی و خیر حاصل نہ ہو؟

❀ [شیعہ کی جانب سے] اگر یہ کہا جائے کہ: یہ شر لوگوں کے اس امام پر ظلم کی وجہ سے حاصل ہوا۔''

❀ تو اس کے جواب میں کہا جائے گا: وہ حکیم جس نے اسے پیدا کیا' جب اس نے اس غرض سے پیدا کیا تھا تاکہ اس سے ظلم ختم ہو؛ اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ جب وہ اسے پیدا کرے گا تو ظلم اور بڑھ جائے گا؛ تو پھر یہ حکمت کی بنا پر تخلیق نہیں ہوئی' بلکہ اس میں حماقت کا کردار ہے۔ یہ تو ایسے ہی جیسے کوئی انسان اپنا بیٹا اصلاح کی غرض سے کسی ایسے انسان کے سپرد کرے جو اسے نیکی اور اصلاح کا حکم دے؛ مگر اس کے ساتھ وہ جانتا بھی ہو کہ وہ اس کی بات نہیں مانے گا' بلکہ پہلے سے زیادہ بگڑ جائے گا۔ تو کیا یہ کسی دانشمند کا فعل ہوسکتا ہے؟

اس کی مثال ایسے ہی ہے جیسے کوئی انسان راستے میں سرائے تعمیر کرائے تاکہ گزرنے والے قافلے یہاں پر پناہ حاصل کریں۔ اور اپنے آپ کو کفار و رہزنوں سے بچاسکیں۔ اور اسے پتہ ہو کہ جب وہ اس تعمیر کو مکمل کرلے گا تو کفار اس کو اپنا قلعہ بنالیں گے؛ اور راہزن اسے اپنا ٹھکانہ بنالیں گے۔

دوسری مثال اس انسان کی ہے جو کسی آدمی کو مال دے تاکہ وہ مجاہدین اور سپاہیوں میں تقسیم کرے' اور اس کو یہ علم بھی ہو کہ [جب مال اس انسان کے ہاتھ میں آجائے گا تو] اسے کفار اور برسر پیکار لوگوں پر اور رسول اللہ ﷺ کے دشمنوں پر خرچ کرے گا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ان رافضہ قدریہ نے یہ حجتیں معتزلہ قدریہ کے اصولوں سے اخذ کی ہیں۔ جب معتزلہ اللہ تعالیٰ پر اصلاح اور اصلح کو واجب قرار دیتے تھے' تو انہوں نے بھی ان سے یہ عقیدہ اخذ کرلیا۔ اور ان [معتزلہ] کے اللہ تعالیٰ پر واجب قرار دینے کی اصل یہ ہے کہ: وہ ہر مکلف کیساتھ ایسا سلوک کرے جو اس کے دین و دنیا کے اعتبار سے اصلح [مناسب تر] ہو۔ یہ ایک بیکار و فاسد اصل ہے۔ اس لیے کہ رب تعالیٰ اپنی حکمت و رحمت سے اپنی خلقت کے لیے وہی کرتے ہیں جو ان کے دین و دنیا میں ان کے لیے مناسب تر اور صالح ہو۔

[روافض و نصاریٰ کی مشابہت]:

روافض کا یہ قول نصاریٰ کے اس قول کی مانند ہے کہ: ''اللہ تعالیٰ مجسم ہو کر اتر آیا؛ یا اس نے اپنے بیٹے کو زمین پر بھیجا تاکہ اسے سولی دیا جائے اور یہ سولی دیا جانا سب بنی آدم کی مغفرت کا باعث ہو اور شیطان کو بھی اس سے دور کیا جائے۔''

❀ نصاریٰ کو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ جب مسیح کا قتل وصلب اور تکذیب عظیم شرارت وضلالت ہے تو گویا اس نے خود بہت بڑے گناہ کا ارتکاب کر کے چھوٹے گناہ کو معاف کرنا چاہا۔ اس کے باوجود اس نے شر کو کم کرنے کے بجائے اس میں اور اضافہ کیا۔ تو کسی مقصود کے لیے کیسے کچھ کیا جاسکتا ہے جب کہ جو حاصل ہے وہ مقصود کا الٹ ہے۔

[معصومیت ائمہ کا مسئلہ]:

[[**شبہ**: شیعہ مصنف لکھتا ہے:

''جب انسان مدنی الطبع ہے تو اہل مدینہ سے شر کو دور کرنے کے لیے امام معصوم کا تقرر ضروری ہے۔'']]

جواب: پانچویں وجہ: جب انسان مدنی الطبع ہے اور اہل مدینہ سے ظلم وفساد کے خاتمہ کے لیے امام کا مقرر کیا جانا ضروری ہے۔ تو [ہم شیعہ سے پوچھتے ہیں] کیا آپ کا عقیدہ ہے کہ جب سے اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کو پیدا کیا ہے، کیا ہر شہر میں ایک ایسا امام معصوم موجود رہا ہے جو ان سے ظلم کا ازالہ کرتا رہا ہو یا نہیں؟

[ہم دوسرا سوال کرتے ہیں]: کیا اہل کتاب اور مشرکین کے شہروں میں بھی امام معصوم کا ہونا ضروری ہے؟

پھر یہ سوال بھی پیدا ہوگا کہ آیا شام میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ہاں بھی کوئی معصوم امام موجود تھا؟

اگر شیعہ اس کا جواب دیں کہ: تمام شہروں کے لیے امام معصوم ایک ہی ہوتا ہے' مگر اس کے نائبین ہر جگہ موجود ہوتے ہیں تو یہ خلاف ظاہر ہے۔ اور اگر کہیں کہ ان کے نائب بعض شہروں میں ہوتے ۔

تو پھر ہم سوال کریں گے کہ: کیا ہر امام معصوم کے نواب تمام شہروں میں موجود ہوتے ہیں' یا بعض شہروں میں؟۔

اگر شیعہ کہیں کہ امام معصوم کے نائبین ہر جگہ موجود ہوتے ہیں تو یہ خلاف ظاہر ہے۔

اور اگر کہیں کہ ان کے نائب بعض شہروں میں ہوتے ہیں اور بعض میں نہیں ہوتے۔ تو پھر تمہارے عقیدہ کے مطابق یہ اللہ پر واجب کیسے ہوا؟ جب کہ سارے کے سارے شہر اس ایک امام معصوم کے محتاج ہیں؟

چھٹی وجہ: ہم شیعہ سے پوچھتے ہیں: کیا یہ امام اکیلا ہی معصوم ہوتا ہے یا پھر اس کے نائبین بھی معصوم ہوتے ہیں؟ ان لوگوں کو نائبین کو معصوم کہنے کی جرأت کبھی بھی نہیں ہوگی۔ جو کہ کھلم کھلا انکار ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نواب بھی معصوم نہیں ہوا کرتے تھے۔ اور نہ ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نواب معصوم تھے۔ بلکہ آپ کے بعض نوابین میں وہ شر اور معصیت تھی جو کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے نوابین میں نہیں تھی۔ تو پھر عصمت کہاں گئی؟

اور اگر شیعہ کہیں کہ: ''عصمت کی شرط صرف اکیلے امام کے لیے ہے۔'' تو ہم کہیں گے: ''تو پھر وہ شہر جو امام غائب سے دور ہیں؛ خصوصاً جب امام معصوم وہاں کے نواب پر غالب ہونے کی طاقت بھی نہیں رکھتا؛ اور بلکہ امام اس سے عاجز ہے۔ تو لوگوں کو امام معصوم سے کیا فائدہ پہنچا؟ خصوصاً جب کہ وہ غیر معصوم کی اقتداء میں نماز پڑھتے ہیں؛ غیر معصوم ان پر حکم چلاتا ہے اور یہ اس کی اطاعت کرتے ہیں۔ اور ان لوگوں سے مال [زکوٰۃ وصدقات] بھی غیر معصوم لیتا ہے۔

اگر شیعہ کہیں کہ ان امور کا ذمہ دار امام معصوم ہے۔ تو ہم اس کے جواب میں کہیں گے کہ: اگر وہ حضرت ابوبکر وعمر و عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین کی طرح با اقتدار ہو تب بھی اس کا عدل جو کہ اس پر واجب ہے؛ سب لوگوں تک نہیں پہنچ سکے گا۔ اس کی زیادہ

سے زیادہ حد یہ ہوسکتی ہے کہ ہر شہر کے لیے ایک طاقت ور اور افضل نواب کو مقرر کیا جائے۔ اور جب عادل کا دستیاب ہونا یوں بھی مشکل ہو یا ظالم کے علاوہ کوئی بھی میسر نہ آئے تو پھر یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ امام پر عادل و قادر نواب کو مقرر کیا جائے؟ جب امام معصوم کو ایسا شخص نہیں مل سکے گا تو اس سے یہ فریضہ ساقط ہو جائے گا۔

اب سوال یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ پر قادر اور عادل مطلق کو پیدا کرنا واجب نہیں ہے؛ بلکہ اللہ پر وہی کچھ واجب ہے جس کے کرنے پر وہ قادر ہے۔[امام معصوم کا تقرر پھر اللہ پر واجب کیسے ٹھہرا؟]۔ پس ایسے ہی لوگوں پر واجب ہے کہ وہ مخلوق الٰہی میں سے نیک لوگوں کو اپنا حاکم بنائیں۔ اگرچہ اس میں بعض پہلوؤں کے لحاظ سے نقص بھی موجود ہو؛ جیسے قدرت و عدل۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ دعا فرمایا کرتے تھے: ''اے اللہ میں تیری بارگاہ میں شکایت کرتا ہوں فاجر انسان کی بہادری اور ثقہ [نیک] کی عاجزی کی۔'' دنیا کی سیاست حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرح دوسرا کوئی انسان نہیں کرسکا۔ تو پھر آپ کے علاوہ کسی دوسرے انسان کے متعلق کیا خیال ہوگا؟

اور یہ اس وقت ہوسکتا ہے جب متولی خود قادر و عادل ہو۔ تو جب امام معصوم خود عاجز ہو؛ تو پھر کیا عالم ہوگا؛ اور پھر جب امام بالکل ہو مفقود ہو تو کیا کہہ سکتے ہیں۔ اور پھر کون ہوگا جو رعیت کا رابطہ امام سے کرائے گا' اور امام کو امت کے احوال کی خبر دے گا؟ اور کون امت پر اس امام کی اطاعت کو لازم ٹھہرائے گا' تاکہ وہ امام مطاع تصور ہو۔ اور جب بعض نواب اس کی اطاعت کا اظہار کریں تو وہ انہیں اپنا نائب مقرر کردے۔ اور پھر وہ [نائب] جیسے چاہے لوگوں سے اموال وصول کرے۔ اور بادشاہوں کے شہروں میں بسیرا کرے؛ تو امام معصوم کا اس میں کیا حیلہ و چارہ باقی رہ جاتا ہے؟

اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ صرف اکیلے امام معصوم سے مقصود حاصل نہیں ہوسکتا بھلے وہ قوت اور شوکت والا بھی ہو۔ اور پھر اس وقت کیا عالم ہوگا جب وہ خود مغلوب و عاجز ہو؟ اور اس سے بھی آگے بڑھ کر جب امام بالکل ہی مفقود اور غائب ہو' اور کوئی انسان اس سے بات چیت کرنے پر قادر ہی نہ ہو' اور اس معدوم امام کی کوئی حقیقت ہی نہ ہو[[کیونکہ یہ امام معصوم شیعہ کے نزدیک عاجز ہے اور ہمارے نزدیک معدوم ہے]]۔

ساتویں وجہ : ہم یہ کہتے ہیں کہ: امام معصوم اسی صورت میں ظلم کا ازالہ کرسکتا اور اپنی رعیت سے عدل و انصاف کا سلوک کرسکتا ہے جب وہ ظلم کے روکنے اور اپنا حق وصول کرنے پر قدرت رکھتا ہو۔ جب وہ خود ہی عاجز و مغلوب ہو اور اپنے نفس سے ظلم کو نہ روک سکتا ہو؛ اپنا حق وصول نہ کرسکتا ہو نہ ہی ولایت سے اور نہ ہی مال سے؛ اور نہ ہی اپنی بیوی کی میراث کا حق وصول کرسکتا ہو؛ تو پھر رعیت سے ظلم کو کیوں کر دور کرسکے گا؛ اور لوگوں کو کون سا حق ادا کرے گا؟

اور پھر اس وقت کیا عالم ہوگا جب امام خود ہی معدوم ہو' یا پھر اتنا ڈرپوک ہو کہ ظالموں کے ظلم یا قتل کیے جانے کے خوف سے کسی شہر یا گاؤں میں ظاہر ہونے کی ہمت نہ کرسکتا ہو۔[شیعہ خود اعتراف کرتے ہیں کہ ان کا امام خائف ہے] اور خوف قتل کی بنا پر چار سو ساٹھ سال سے باہر نہیں نکل رہا۔ اور زمین ظلم و فساد سے بھری ہوئی ہے؛ اور وہ اتنی طاقت نہیں رکھتا کہ کم از کم اپنے آپ کا تعارف ہی کرا سکے۔ تو پھر وہ مخلوق سے ظلم کو کیسے ختم کرسکتا ہے؟ یا مستحق کو اس کا حق کیسے دلوا سکتا ہے؟ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ان لوگوں پر کس طرح برابر صادق آتا ہے؛[اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں]:

﴿اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُوْنَ اَوْ يَعْقِلُوْنَ اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا﴾ [الفرقان ۴۴]

''یا آپ گمان کرتے ہیں کہ واقعی ان کے اکثر سنتے ہیں یا سمجھتے ہیں، وہ نہیں ہیں مگر چوپاؤں کی طرح، بلکہ وہ راستے کے اعتبار سے زیادہ گمراہ ہیں۔''

آٹھویں وجہ: یہ کہا جائے گا کہ: ''کیا اللہ تعالیٰ قبیح حرکت کا ارتکاب کرتا ہے''؛ اس مسئلہ میں علماء کے دو قول ہیں:

❀ بعض لوگ کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ سے ظلم کا صدور ممتنع ہے؛ اور قبیح کا ارتکاب مستحیل۔ اللہ تعالیٰ جو کچھ کرتے ہیں وہ حسن ہوتا ہے۔شیعہ کے ہاں یہ کہنا ممتنع ہے کہ اس سے بہتر یہ ہے۔ چہ جائیکہ کوئی اسے واجب قرار دے۔

دوسرا قول: ان لوگوں کا ہے جو کہتے ہیں کہ: چونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نفس پر واجب قرار دیا ہے' اس لیے عدل و رحمت اللہ تعالیٰ پر واجب ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ﴾ (الانعام: ۱۲)

''تمہارے پروردگار نے رحمت کو اپنی ذات پر لکھ رکھا ہے۔''

اور اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ پر ظلم کو حرام کر رکھا ہے۔صحیح حدیث میں ہے کہ:

''اے میرے بندو! میں نے اپنی ذات پر ظلم کو حرام قرار دیا ہے؛ اور اسے تمہارے درمیان بھی حرام کرتا ہوں' پس تم ایک دوسرے پر ظلم نہ کرنا۔''[1] اس عقیدہ کے قائلین کہتے ہیں: یہ چیز عقل سے واجب ہوتی ہے۔

بہر کیف حال میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے ظلم کا ارتکاب ہوتا ہے نہ وہ امر واجب میں خلل ڈالتا ہے۔اس نے امر واجب کو پورا کر دیا ہے۔مگر اس کے باوجود جن مصالح کا ظہور امام معصوم سے ضروری تھا وہ بروئے کار نہیں آئے۔اگر ان مصالح کا حصول صرف امام کی تخلیق سے ہی پورا کر دیا ہے اور وہ حاصل نہیں ہوئے تو امام کو پیدا کرنا واجب نہیں ہوگا۔اور اگر ان مقاصد و مصالح کا حصول تخلیق امام کے علاوہ چند دیگر امور کے پیدا کرنے پر موقوف تھا اور ان دونوں کے مجموعہ سے مقصد کا حاصل ہونا ضروری تھا تو اس نے وہ مجموعہ پیدا نہیں کیا۔بھلے اس مجموعہ میں کچھ بھی نہ پیدا کیا ہو؛ یا بعض چیزیں نہ پیدا کی ہوں۔ قلیل ہو یا کثیر اخلال بالواجب اللہ تعالیٰ پر ممتنع ہے۔ بنا بریں دونوں صورتوں میں ان مقاصد کے موجبات کا پیدا کرنا اس پر ضروری نہ ٹھہرا۔اور جب واجب نہ ہوا تو اس میں کچھ فرق نہیں کہ وہ معصوم کو پیدا کرے جس سے یہ مقصد حاصل نہ ہو یا اسے پیدا نہ کرے اور اس پر یہ واجب بھی نہ ہو۔ بنا بریں اس کا وجود بھی ضروری نہ ہوگا۔لہٰذا ہر صورت میں اس کے وجود کو ضروری قرار دینا باطل ٹھہرے گا۔

اگر کوئی یہ کہے: ''بیشک مقصود امام معصوم کی پیدائش اور مخلوق کی اس کی اطاعت کرنے سے حاصل ہوگا۔''

تو ان سے کہا جائے گا: اگر مکلفین کی اطاعت گزاری اللہ تعالیٰ کے اختیار میں تھی؛ مگر اس نے پیدا نہیں کیا؛ تو اس نے اس امام معصوم سے حاصل ہونے والی مصلحت کو بھی پیدا نہیں کیا۔تو پھر ایسا کرنا اس پر واجب نہ ہوا؟ اور اگر اس کے اختیار میں نہ ہو تو پھر اس کے بغیر مکلف کے حق میں بھی واجب نہ ہوگا تو اللہ تعالیٰ کے حق میں کیسے واجب ہو سکتا ہے؟

اور جس چیز کے بغیر واجب پورا نہیں ہو سکتا؛ وہ سرے سے موجود ہی نہیں پھر اس صورت میں امر واجب نہیں ہوگا۔

---

[1] صحیح مسلم۔ کتاب البر والصلة۔ باب تحریم الظلم (حدیث:۲۵۷۷)۔

کیا آپ دیکھتے نہیں ہیں کہ جو مصلحت کسی دوسرے فعل کے بغیر حاصل نہ ہو سکتی ہو؛ اس کا کرنا واجب نہیں ہوتا۔ سوائے اس صورت کہ کوئی دوسرا اس فعل کے کرنے پر مدد کرے؟ جیسا کہ جمعہ کی نماز صرف اس صورت میں واجب ہوتی ہے جب امام موجود ہو؛ اور جمعہ پڑھنے والی کی مطلوبہ تعداد پائی جاتی ہو۔ کسی انسان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ بغیر دوسرے لوگوں کے اور بغیر امام کے اکیلا ہی جمعہ پڑھنا شروع کردے۔ اور حج جو کہ اس انسان پر واجب ہوتا ہو جس کے لیے ایسے ساتھی کا ہونا ضروری ہو جس کی معیت میں وہ پر امن ہو۔ یا پھر اس کے ساتھ اس کے لیے کرایہ کی سواری کا بندوبست کرے۔ اگر ان امور کو بجالانے والا فرد میسر نہ ہو تو حج واجب نہیں ہوتا۔ ایسے ہی جب ظلم کا ختم کرنا انصار و مددگار کے بغیر ممکن نہ ہو تو اس اکیلے انسان پر ظلم سے دفاع کرنا واجب نہیں ہو جاتا۔

اگر وہ کہیں کہ:'' بیشک اللہ تعالیٰ پر اپنے بندوں کے لیے ان مصلحتوں کا پورا کرنا واجب ہوتا ہے جو کہ معصوم کے پیدا کرنے سے حاصل ہوتی ہیں؛ اور یہ مصلحتیں اس وقت تک پوری نہیں ہوسکتیں جب تک اس امام کی اطاعت کرنے والے موجود نہ ہوں۔ اگر اس بات کو تسلیم کرلیا جائے تو اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو اس کے اطاعت گزار بنادے۔ تو پھر معصوم کو پیدا کرنا بھی اس پر واجب نہ ہوگا۔ اس لیے کہ جس چیز کے بغیر واجب پورا نہیں ہوسکتا' وہ سرے سے موجود ہی نہیں۔ اور اکیلے امام معصوم سے یہ مقصود حاصل نہیں ہوسکتا۔

اگر یہ کہیں کہ:'' اللہ کو پیدا کرنا چاہیے' شاید کہ کچھ لوگ اس کی اطاعت کرلیں۔''

جواب: ان سے کہا جائے گا یہ اس کے لیے ممتنع ہے جو عاقبت امور کو جانتا ہے۔ نیز ان سے یہ بھی کہا جائے گا:'' جب مطلوب کی شرط کبھی حاصل ہوتی ہو اور کبھی حاصل نہ ہوتی ہو؛ اور یقیناً غالب اوقات میں یا اکثر و بیشتر اوقات میں یہ حاصل نہیں ہوتی؛ تو پھر ممکن ہے وہ[ایسے] غیر معصوم کو پیدا کرے جو اکثر اوقات یا بعض اوقات میں عدل و انصاف کرنے والا ہو۔ اس لیے کہ جو اکثر اوقات میں عدل و انصاف کرتا ہو؛ اور بعض اوقات میں ظلم کرتا ہو؛ اور جب اس کے وجود کی مصلحت اس کے فساد سے زیادہ ہو؛ [اس کا ہونا] اس امام کے ہونے سے بہتر ہے جو کسی بھی حال میں کبھی بھی انصاف نہ کرسکتا ہو؛ اور نہ ہی کسی سے ظلم کو ختم کرسکتا ہو؛ اس لیے نہ اس امام کے ہونے میں کسی طرح کی بھی کوئی مصلحت نہیں ہے۔

اگر کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ پر معصوم کو پیدا کرنا واجب تھا، وہ اس نے کردیا۔ مگر لوگوں نے اس کی نافرمانی کرکے اس مصلحت کو پورا نہ ہونے دیا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ لوگ مصلحت کی تحصیل کے سلسلہ میں امام معصوم کے ساتھ تعاون نہیں کریں گے، بلکہ نافرمانی کرکے عذاب میں مبتلا ہوں گے تو اس کا پیدا کرنا واجب نہ ہوا۔ اور نہ اس میں کچھ حکمت و مصلحت مضمر ہوئی۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ سب لوگ اس کے نافرمان نہیں بخلاف ازیں کچھ لوگ نافرمانی کرتے ہیں اور بعض اس کی اطاعت کا دم بھرتے ہیں، پھر وہ ان لوگوں کو اطاعت کی توفیق کیوں نہیں دیتا۔

اور اگر وہ کہیں کہ:'' ان ظالموں نے لوگوں کو اس کی اطاعت سے روک کر رکھا۔''

ان سے کہا جائے گا: جب اللہ تعالیٰ ظالموں کو روکنے پر قادر تھا' تو پھر انہیں ان کے اس عمل سے روکا کیوں نہیں؟ اور اگر

اس کے اختیار وقدرت میں نہیں تھا؛ اور اسے علم تھا کہ مصلحت کا حصول اس کی قدرت سے باہر ہے تو پھر اسے چاہیے تھا کہ وہ ایسا نہ کرے۔ تو پھر اس تقدیر کی بنا پر آپ کیسے یہ کہہ سکتے ہیں کہ: اس کے لیے نبی کے علاوہ غیر معصوم کا پیدا کرنا اس کے اختیار میں تھا؟ یہ قول ان کے ساتھ لازم ہے۔ اگر وہ کہتے ہیں کہ: اللہ تعالیٰ بندوں کے افعال پیدا کرنے والا ہے؛ تو پھر اس کے لیے یہ بھی ممکن ہے کہ وہ ظلم کے دواعی کو ختم کرے تاکہ لوگ اس کی اطاعت کرنے پر قادر ہو جائیں۔

اور اگر کہیں کہ: اللہ تعالیٰ بندوں کے افعال پیدا کرنے والا نہیں ہے۔'' تو اس وقت کہا جائے گا کہ: ''عصمت اس وقت ہوتی ہے جب فاعل نیکیاں چاہتا ہو؛ اور برائیوں کا اس کا کوئی ارادہ نہ ہو۔ جب وہ آپ کے نزدیک کسی ایک کا ارادہ تبدیل کرنے پر قادر نہیں ہے تو پھر کسی کو معصوم بنانے پر بھی قادر نہیں ہے۔

یہ بذات خود مخلوق میں سے کسی ایک کو معصوم پیدا کرنے کے نظریہ کے بطلان کی دلیل ہے۔ قدریہ کے قول کے مطابق عصمت اس وقت ہو سکتی ہے جب انسان کا ارادہ صرف نیکیوں کا ہو؛ اسے برائیوں کا خیال تک نہ آئے۔ جب وہ خود ہی ارادہ کا پیدا کرنے والا ہے؛ قدریہ کے ہاں اللہ تعالیٰ کسی کے ہاں ارادہ پیدا کرنے پر قادر نہیں ہے؛ تو پھر کسی کو معصوم بنانا بھی ممتنع ہوا۔ اور اگر وہ کہیں کہ: ''وہ ایسا پیدا کرتا ہے جس کا ارادہ خیر کی طرف مائل ہو۔''

جب اس طرح کی راہ موجود ہو؛ تو پھر تکلیف کا حکم ختم ہو جاتا ہے۔ جب کوئی راہِ پناہ موجود نہ ہو تو اس کا کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ اور اگر ایسا کرنا تمہارے نزدیک اس کے اختیار میں تھا تو اس نے تمام لوگوں کے لیے ایسا کیوں نہیں کیا؟ اس لیے کہ ایسا کرنا تمام لوگوں کے لیے زیادہ بہتر تھا۔ تمہارے نزدیک اللہ تعالیٰ پر واجب ہوتا ہے کہ وہ بندوں کی بہتری کے لیے تخلیق کرے۔ ایسا کرنے سے تمہارے ہاں ثواب میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔ جیسا کہ اس طرح کا فعل تمہارے نزدیک امام کے حق میں ممتنع نہیں ہے۔

نویں وجہ: عصمت ائمہ کا مسئلہ اس لیے بھی درست نہیں کہ شہر کی اصلاح کے لیے جس قدر ایک ناظم و مدبّر کی ضرورت ہوتی ہے اس سے کہیں زیادہ اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ آدمی بذات خود اپنے بدن کی اصلاح کرے۔ جب اللہ تعالیٰ نے نفس انسانی کو معصوم پیدا نہیں کیا تو اس پر معصوم رئیس کو پیدا کرنا کیوں کر واجب ٹھہرا؟

اور اس کے ساتھ ہی انسان کے لیے یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اپنے باطن میں کفر چھپائے رکھے؛ یا باطن میں نافرمان ہو؛ اور ظلم و فساد اور بہت سارے امور میں منفرد ہو؛ مگر امام یہ باتیں نہ جانتا ہو۔ اور اگر امام کو پتہ بھی چل جائے تو ان کے ازالہ پر قدرت نہ رکھتا ہو۔ اگر یہ [یعنی لوگوں پاکیزہ و معصوم باطن پیدا کرنا] واجب نہیں ہے تو پھر کوئی دوسری چیز کیسے واجب ہو سکتی ہے؟

دسویں وجہ: ایک سوال یہ بھی ہے کہ معصوم کو پیدا کرنے کا مقصد آیا دنیا سے فساد کو ختم کرنا ہے یا کم کرنا؟ یا یہ کہ انسان ان ائمہ کے ساتھ فساد سے دور تر اور اصلاح کے قریب تر ہوتا ہے؟ یعنی اگر امام معدوم ہو جائیں تو کوئی ان کے قائم مقام نہ ہو؟ یا پھر یہ مقصود ہے کہ ایسی اصلاح ہو جائے جس کے ساتھ فساد کا کوئی وجود باقی نہ رہے؟ یا پھر ایک خاص مقدار میں اصلاح مقصود ہے؟ [اگر ختم کرنا مقصود ہے تو دنیا میں ایسا کبھی نہیں ہوا اور اگر فساد کی تقلیل مقصود ہے تو یہ کام معصوم کے بغیر بھی اکثر حکمرانوں کے ذریعہ ممکن ہے۔ یہ مقصود حضرت ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین کے عہد خلافت میں اس فساد میں جو کمی آئی تھی وہ

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں رونما نہیں ہوئی ۔اسی طرح بنوامیہ اور بنوعباس کے خلفاء دور میں جو اصلاح ہوئی وہ بارہ ائمہ کے وجود سے بہت بڑھ کرتھی ۔اس طرح کی اصلاح روم' ترک اور ہند کے بادشاہوں کے ہاتھوں بھی ہوتی ہے جو کہ امام غائب المنتظر کے ہاتھ پر ہونے والی اصلاح سے بہت زیادہ اور بڑھ کر ہوتی ہے ۔اس لیے کہ کوئی بھی حاکم ایسا نہیں ہوتا جس کو اگر معدوم مان لیا جائے تو اس کے نہ ہونے کی صورت میں پیدا ہونے والا فساد اس کے وجود سے بڑھ کر ہوتا ہے ۔لیکن ایسے ہوسکتا ہے کہ اس حاکم کی نسبت کسی دوسرے میں اصلاح کا پہلو بہت زیادہ ہو ۔جیسا کہ کہا گیا ہے کہ:

''ظالم امام کے زیر تسلط ساٹھ سال بسر کرنا ایک رات بدوں امام وحاکم گزارنے سے بہتر ہے ۔''

اگر شیعہ یہ کہیں کہ:''وجودِ امام سے ایسی اصلاح مقصود ہوتی ہے جس کے ساتھ کوئی فساد باقی نہ رہے ۔''

تو ان سے کہا جائے گا:''ایسا کبھی بھی نہیں ہوا ۔اور اللہ تعالیٰ نے کسی کو بھی ایسا پیدا نہیں کیا ۔اور نہ ہی ایسے اسباب پیدا کیے ہیں جو اس کو لامحالہ طور پر واجب کریں ۔جس اس کو واجب کہتا ہے' وہ اس کے لوازمات کو اللہ تعالیٰ پر واجب قرار دیتا ہے ۔ایسا کہنا یا تو اس کے عقل میں فساد کی وجہ سے ہے ؛ یا پھر وہ اللہ تعالیٰ کی مذمت کرنا چاہتا ہے ۔اور ایسی مخلوق کو پیدا کرنا جس کے وجود کے ساتھ یہ سب ممکن ہو؛ صرف اس طرح سے حاصل نہیں ہوسکتا' جب تک وہ اسباب نہ پیدا کردیئے جائیں ۔

اس کی مثال افعال عباد میں بیان کی جاسکتی ہے ۔لیکن معصوم کے بارے میں کوئی بات کہنا بہت خطرناک ہے ۔اس لیے کہ امام کی مصلحت اس کی قدرت سے خارج کے اسباب پر موقوف ہے ۔صرف یہی نہیں' بلکہ شیعہ کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی قدرت سے بھی باہر ہے ۔ یہ حقیقت میں رافضیوں کے معتزلی ہیں ۔اللہ تعالیٰ پر ان چیزوں کو واجب کرنے کا عقیدہ ہر انسان کے لیے اس کی مصلحت پیدا کرنے کے عقیدہ سے بڑھ کر فاسد ہے ۔

گیارھویں وجہ :شیعہ مصنف لکھتا ہے:''اگر امام معصوم نہ ہو تو کسی اور امام کی ضرورت لاحق ہوگی ۔اس لیے کہ حاجتِ امام کی علت امت کے لیے خطاء واقع ہونے کا جواز ہے ۔اگر یہ کہیں کہ امام سے بھی خطاً ہوسکتی ہے تو پھر ایک ایسے امام کی ضرورت پڑے گی جو خطاء سے پاک وصاف ہو ۔''

جواب : ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں: ایسے کہنا کیوں جائز نہیں ہوسکتا کہ جب امام سے غلطی صادر ہو تو امت کا کوئی فرد اس کی اصلاح کردے ، تاکہ سب لوگوں کا غلطی پر جمع ہونا لازم نہ آئے ۔جس طرح رعیت کا کوئی فرد غلطی کررہا ہو تو امام یا اس کا نائب یا ان کا کوئی دوسرا فرد اس کی اصلاح کرتا ہے ۔ایسے ہی جب امام یا اس کے نائب سے غلطی ہوجائے تو امت کا کوئی فرد ان کی اصلاح پر تنبیہ کردے ۔جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سب لوگ گناہ سے بچ جاتے ہیں اور اس پر جمع نہیں ہوتے ؛ نہ کہ امت کا ہر ایک فرد معصوم ٹھہرتا ہے ؛ جیسا کہ اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے ۔

اس کی نظیر یہ ہے کہ خبر متواتر میں ایک ایک کرکے ہر شخص کے بارے میں کذب وخطا کا احتمال ہوتا ہے ۔اور ایسے بھی ہوسکتا ہے کہ کوئی ایک فرد جان بوجھ کر جھوٹ بولتا ہو ۔مگر بہ حیثیت مجموعی عادۃً یہ احتمال باقی نہیں رہتا ۔ایسی ہی مثال چاند دیکھنے والوں یا دیگر دقیق اشیاء میں غور کرنے والوں کی ہے ۔ایسے ہی ہوسکتا ہے کہ ان میں سے کسی ایک سے غلطی ہوجائے ۔ مگر ان سب لوگوں کا غلطی پر اجماع ہونا ناممکن ہوتا ہے ۔ایسے ہی حساب اور ہندسہ [انجینئرنگ] کے امور میں غور وفکر کرنے

والوں کا حال ہوتا ہے ۔ ان میں سے کسی ایک سے ایک یا دو مسائل میں غلطی کا ہوجانا ممکن ہوتا ہے ۔ مگر جب کسی فن کے ماہرین کی بڑی تعداد کسی مسئلہ پر جمع ہوجائے تو عادتاً ان سے غلطی کا امکان باقی نہیں رہتا ۔

یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ: جب کسی قوم کا ایک بات پر اتفاق ہوجائے' ان کے لیے عصمت ثابت کرنا عقل اور وجود کے زیادہ قریب تر ہے بہ نسبت ایک انسان کے لیے اس کے اثبات کے ۔ جب ایک [اہل علم وفن] بڑی تعداد کا جب کسی مسئلہ پر اجماع ہوجائے ؛ اور ان کے لیے عصمت کا حصول ممکن نہ ہو' تو پھر یہ زیادہ مناسب ہے کہ اکیلا آدمی بھی معصوم نہ ہو۔ اور اگر فرد واحد کے لیے عصمت کا حصول ممکن ہے تو پھر اس جیسے لوگوں کی جماعت اور ایک بڑی تعداد کے لیے عصمت کا حاصل ہونا زیادہ اہم ہے ۔

بنابریں بہ حیثیت مجموعی پوری امت کو معصوم قرار دینا ایک شخص کو معصوم قرار دینے سے بہتر ہے، اس سے عصمت امام کا مقصد پورا ہوجاتا ہے اور امام کو معصوم قرار دینے کی ضرورت نہیں رہتی ۔

رافضی جہالت کا ثبوت:

روافض کی جہالت کا یہ عالم ہے کہ ان کے خیال میں سب اہل اسلام غلطی پر ہوسکتے ہیں جب ان میں ایک معصوم امام نہ ہو، مگر ایک شخص کا غلطی سے پاک ہونا ضروری ہے۔ صریح معقول اس بات کا گواہ ہے کہ جب بڑی تعداد میں علماء اپنے اجتہادات میں اختلاف کے باوجود کسی بات پر جمع ہوجائیں تو اس بات کا درست ہونا ؛ فرد واحد کی رائے سے زیادہ قریب تر ہوتا ہے۔اور جب خبر واحد سے علم کا حصول ممکن ہے تو پھر متواتر خبر سے علم کا حصول زیادہ اولی ہے ۔

اس کی مزید وضاحت اس امر سے ہوتی ہے کہ: عام مصالح میں امام لوگوں کے ساتھ شریک ہوتا ہے۔ اس طرح کے اگر وہ اکیلا ہو تو ان امور کو بجالانے پر قادر نہ ہو سوائے اس صورت کے کہ وہ لوگوں کے ساتھ اس کام میں شریک ہو۔ امام کے لیے حدود کا قائم کرنا 'لوگوں کے حقوق کا ادا کرنا ؛ لوگوں سے اپنا حق وصول کرنا ان کی مدد کے بغیر ممکن نہیں ؛ اور نہ ہی اس کی معاونت کے بغیر دشمن سے جہاد ممکن ہے ؛ بلکہ امام کے لیے باجماعت نماز ادا کرنا یا جمعہ پڑھنا بھی اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک اس کے ساتھ لوگ نماز نہ پڑھیں ۔ اور نہ ہی عام لوگوں کے لیے امام کے اوامر ونواہی پر عمل کرنا ممکن ہوتا ہے جب تک اس کے اعوان وانصار اس کا ساتھ نہ دیں ۔ جب یہ لوگ ارادہ وقدرت میں امام کے ساتھ شریک ہیں' تو پھر وہ ان سے منفرد نہیں ہوسکتا ۔ ایسے ہی علم ورائے میں بھی یہ واجب نہیں ہوسکتا کہ امام منفرد ہو' بلکہ دوسرے لوگ اس کے ساتھ شریک ہوتے ہیں ۔ وہ آپس میں ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں ۔ جیسا کہ امام اپنے اختیارات کے استعمال میں ان لوگوں کی مدد کے بغیر عاجز آجاتا ہے ؛ ایسے ہی اسے اپنے علم میں بھی دوسرے لوگوں کی معاونت کی ضرورت ہوتی ہے ۔

بارھویں وجہ: وہ دینی علم جس کی ائمہ اور امت کو ضرورت ہوتی ہے ؛ اس کی دو قسمیں ہیں: علم کلی: جیسے پانچ نمازوں کی فرضیت ؛ ماہ رمضان کے روزے ؛ زکوۃ اور حج ۔ زنا' چوری ؛ اور شراب کا حرام ہونا اور اس طرح کے دیگر مسائل ۔

علمی جزئی: جیسا کہ فلاں انسان پر حد واجب ہوتی ہے ؛ اور فلاں انسان پر زکوۃ واجب ہوتی ہے ؛ وغیرہ ۔

پہلی قسم: بیان شریعت اس قسم میں مستقل ہے ۔ اس کے لیے کسی امام کی ضرورت نہیں ۔ اس لیے کہ نبی کریم ﷺ نے یا

تو کلیات شریعت کو نص کے ساتھ بیان کر دیا ہے' یا پھر کہیں پر جہاں قیاس کی ضرورت تھی ؛ وہاں ویسے چھوڑ دیا ہے ۔ اور اگر اس کا تعلق پہلی قسم سے ہے تو مقصود حاصل ہو گیا؛ اور اگر دوسری قسم سے ہے تو قیاس سے حاصل ہو جائے گا۔

اگر کوئی یہ کہے کہ: آپ ﷺ نے ایسے امور کا بیان ترک کر دیا ہے جو نہ تو نص سے معلوم ہو سکتے ہیں اور نہ ہی قیاس سے ۔ بلکہ وہ صرف امام کے قول سے معلوم ہو سکتے ہیں ؛ تو[اس سے لازم آتا ہے کہ] یہ امام نبوت میں شریک ٹھہرا پھر نائب باقی نہ رہا۔اس لیے کہ جب امام نبی کریم ﷺ سے بغیر کسی سند کے لوگوں پر احکام کو واجب کرے' اور ان پر حرام و حلال ٹھہرائے تو یہ خود مستقل شارع ہوا؛ پیغمبر کا اتباع کار نہ رہا۔اب یہ صرف نبی ہی ہو سکتا ہے ۔اس لیے کہ جو نبی کا خلیفہ یا نائب ہو' وہ مستقل شارع نہیں ہوا کرتا۔

ایسے ہی جب قیاس حجت ہے تو لوگوں کو اسکا حوالہ دینا جائز ہے ۔ اور اگر یہ حجت نہیں ہے تو پھر نبی کریم ﷺ پر واجب ہوتا تھا کہ آپ کلیات میں اس کو بیان کرتے ۔ نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾ [المائدہ ۳]

'' آج کے دن ہم نے آپ کے لیے آپ کا دین مکمل کر دیا ، اور آپ پر اپنی نعت پوری کر دی ، اور آپ کے لیے دین اسلام کو پسند کر لیا۔''

یہ واضح نص ہے کہ دین اسلام مکمل ہے' اس کے ساتھ کسی دوسری چیز کی کوئی ضرورت نہیں ۔

جب جزئیات کے ہر ایک مسئلہ پر نص کا ہونا ممکن نہیں ہے ۔ بلکہ اس میں اجتہاد کا ہونا ضروری ہے تاکہ شرعی احکام کو اس کے ساتھ ملایا جائے ۔ مثال کے طور پر شارع کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ ہر انسان کو جا کر بتائے کہ اس کا قبلہ کس طرف بنتا ہے ۔ اور حاکم ہر گواہ کی عدالت کے متعلق نہیں بتا سکتا۔ اس کی مثال اور بھی ہیں ۔

اگر ان کا دعوی ہو کہ امام جزئیات میں معصوم ہے تو یہ ایک کھلا ہوا جھوٹ اور حقیقت کا انکار ہے ۔ اس کا دعوی کسی ایک نے بھی نہیں کیا۔ اس لیے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایسے لوگوں کو بھی نائب مقرر کیا تھا جن سے خیانت و عاجزی ظاہر ہوئی تھی ۔ آپ نے دو آمیوں کی گواہی کی بنیاد پر ایک آدمی کا ہاتھ کاٹ دیا۔

پھر وہ گواہ کہنے لگے : ہم سے غلطی ہو گئی۔

تو آپ نے فرمایا: اگر مجھے یہ پتہ چل جائے کہ تم دونوں نے جان بوجھ کر اس کے خلاف ایسا کیا ہے' تو میں تمہارے ہاتھ کاٹ دیتا۔

یہی معاملہ نبی کریم ﷺ کا تھا۔ آپ نے فرمایا:

''تم اپنا جھگڑا میرے پاس لاتے ہو اور ہو سکتا ہے کہ تم میں سے کوئی اپنی دلیل کو دوسرے سے عمدہ طریقے سے بیان کرنے والا ہو اور میں اس کے لیے فیصلہ کر دوں اس بات پر جو میں نے اس سے سنی پھر میں جس کے لیے اس کے بھائی کا حق دلا دوں تو اسے نہ لے کیونکہ میں اس کے لیے جہنم کا ایک ٹکڑا کاٹ کر دے رہا ہوں۔'' ❶

اہل خیر کے کچھ لوگوں نے اہل شر بنو ابیرق کے لوگوں پر دعوی کیا کہ انہوں نے ہمارے غلہ اور اسلحہ کی چوری کی ہے ۔ یہ

لوگ آئے اور انہوں نے نبی کریم ﷺ کے پاس اپنی برأت کا اظہار کیا: نبی کریم ﷺ نے ان کو سچا خیال کیا؛ مگر فوراً ہی یہ آیات مبارکہ نازل ہوئیں:

﴿إِنَّآ أَنزَلْنَآ إِلَيْكَ الْكِتَٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ أَرَىٰكَ اللَّهُ وَلَا تَكُن لِّلْخَآئِنِينَ خَصِيمًا ۞ وَٱسْتَغْفِرِ اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ كَانَ غَفُورًا رَّحِيمًا ۞ وَلَا تُجَٰدِلْ عَنِ الَّذِينَ يَخْتَانُونَ أَنفُسَهُمْ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ مَن كَانَ خَوَّانًا أَثِيمًا﴾ [النساء ١٠٥۔١٠٧]

''یقیناً ہم نے تمہاری طرف حق کے ساتھ اپنی کتاب نازل فرمائی ہے تاکہ تم لوگوں میں اس چیز کے مطابق فیصلہ کرو جس سے اللہ نے تم کو شناسا کیا ہے اور خیانت کرنے والوں کے حمایتی نہ بنو۔ اور اللہ تعالیٰ سے بخشش مانگو بیشک اللہ تعالیٰ بخشش کرنے والا، مہربانی کرنے والا ہے۔ اور ان کی طرف سے جھگڑا نہ کرو جو خود اپنی ہی خیانت کرتے ہیں، یقیناً دغا باز گنہگار اللہ تعالیٰ کو اچھا نہیں لگتا۔'' ❷

جملہ طور پر امور کی دو قسمیں ہوتی ہیں: کلیہ عامہ جزئیہ خاصہ۔

جزئیات خاصہ میں سے وہ جزئیہ بھی ہے جس میں کسی دوسرے کے شریک ہونے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ مثال کے طور پر کسی خاص میت کی میراث؛ اور کسی خاص گواہی کی دینداری اور شرعی عدالت؛ فلاں بیوی کے اخراجات۔ اس شوہر سے طلاق کا واقع ہونا۔ فسادی انسان پر حد کا قیام وغیرہ۔

ان امور میں کسی نبی یا ولی یا کسی امام کے لیے ہرگز یہ ممکن نہیں ہے کہ ہر انسان کے متعلق حکم بیان کیا جائے۔ اس لیے کہ بنی آدم کے ہر ایک انسان اور اس کے جزئی مسائل کی معرفت حاصل کرنے سے ہر ایک عاجز ہے۔ کسی انسان کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ ہر فرد کے ساتھ پیش آنے والے احکام کی معرفت حاصل کر سکے۔ بلکہ اس کی غایت یہ ہے کہ انسان کلیات کا علم حاصل کرے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میں جامع کلمات دیکر مبعوث کیا گیا ہوں۔''

[البخاری ٤/ ٥٤۔مسلم ١/ ٣٧١]

امام کے لیے تمام رعیت کے لیے حکم بغیر عام قضایا کلیات پر انحصار کیے حکم جاری نہیں کر سکتا۔ ایسے ہی قاعدہ کلیہ کے بغیر ممکن نہیں ہے کہ کسی کو نواب مقرر کیا جائے؛ یا کسی کو ولی عہد بنایا جائے۔ پھر اعیان کو ان ہی کلیات کی روشنی میں دیکھا جائے گا۔ یا کسی خاص کو عام کے تحت میں داخل کیا جاتا ہے۔ جس میں نظر و اجتہاد ضروری ہوتا ہے؛ جس میں کبھی مجتہد سے اصابت رائے ہوتی ہے' اور کبھی وہ غلطی بھی کر جاتا ہے۔

اگر ان میں ہر ایک کے لیے عصمت کی شرط رکھی جائے؛ تو نواب کو پھر ان اعیان میں بھی عصمت کی شرط رکھنی پڑے گی۔ اس کے منتفی ہونے پر تمام عقلاء کا اتفاق ہے۔

اگر کلیات پر اکتفاء کیا جائے؛ تو نبی کریم ﷺ کے لیے ممکن ہے کہ وہ آپ کلیات کے متعلق حکم جاری فرمائیں۔ جیسا

❶ صحیح مسلم: ج ٢ : ح ١٩٨١۔

❷ جامع ترمذی: ج ٢: ح ٩٨٥۔

کہ ہمارے نبی کریم ﷺ شریعت لے کر آئے ہیں۔ جس میں بیان کیا گیا ہے کہ عورتوں میں سے کون سی حلال ہیں اور کون سی حرام ہیں۔

کسی انسان کی قریبی رشتہ دار عورتیں اس پر حرام ہیں سوائے چچا زاد؛ پھوپھی زاد؛ ماموں زاد؛ خالہ زاد لڑکیوں کے۔ ان کا ذکر قرآن مجید کی سورت احزاب میں آیا ہے۔

ایسے ہی پینے کی چیزوں میں سے ہر وہ چیز حرام ہے جس کے نوش کرنے سے نشہ آتا ہو۔ جس سے نشہ نہ آتا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے محرمات کو ان آیات میں بیان کیا ہے؛ ارشاد فرمایا:

﴿قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ مَا بَطَنَ وَ الْاِثْمَ وَ الْبَغْیَ بِغَیْرِ الْحَقِّ وَ اَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ یُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّ اَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ [الأعراف ۳۳]

''آپ فرما دیجیے کہ البتہ میرے رب نے صرف حرام کیا ہے ان تمام فحش باتوں کو جو اعلانیہ ہیں اور جو پوشیدہ ہیں اور ہر گناہ کی بات کو ناحق کسی پر ظلم کرنے کو اس بات کو کہ اللہ کے ساتھ کسی ایسی چیز کو شریک ٹھہرا جس کی اللہ نے کوئی سند نازل نہیں کی اور اس بات کو تم لوگ اللہ کے ذمے ایسی بات نہ لگا دو جس کو تم جانتے نہیں۔''

پس یہاں پر جو کچھ بھی حرام ذکر کیا گیا ہے' وہ مطلق طور پر حرام ذکر کیا گیا ہے؛ یہ کسی حال میں بھی حلال نہیں ہوسکتا۔ جیسا کہ خنزیر' یا خون' مردار کا حکم ہے۔

تمام واجبات کو اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بیان فرمایا ہے:

﴿قُلْ اَمَرَ رَبِّیْ بِالْقِسْطِ وَ اَقِیْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّ ادْعُوْهُ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ﴾

''فرما دیجئے: میرے رب نے حکم دیا ہے انصاف کا اور یہ کہ تم ہر سجدہ کے وقت اپنا رخ سیدھا رکھا کرو اور اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طور پر کرو کہ اس عبادت کو خاص اللہ ہی کے واسطے رکھو۔'' [الاعراف ۲۹]

پس تمام تر واجبات حقوق اللہ اور حقوق العباد میں محصور ہیں۔ اللہ کا بندوں پر حق یہ ہے کہ وہ صرف اس ایک اللہ کی بندگی کریں' اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں۔ اور بندوں کے حقوق اس کا عدل ہے۔ جیسا کہ صحیح حدیث میں آتا ہے:

حضرت معاذ سے روایت کرتے ہیں کہ: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیچھے سوار تھا۔ آپ نے فرمایا:

''اے معاذ! کیا تم جانتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کا حق اس کے بندوں پر کیا ہے؟ میں نے عرض کیا: اللہ اور اس کا رسول ہی خوب جانتے ہیں۔'' آپ نے فرمایا:'' اللہ کا حق بندوں پر یہ ہے کہ اس کی عبادت کریں، اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں اور بندوں کا حق اللہ پر یہ ہے کہ جو شخص اس کے ساتھ شرک نہ کرتا ہو، اس کو عذاب نہ دے۔''[1]

پھر اللہ تعالیٰ نے دوسرے مواقع پر فحاشی؛ گناہ' اور حقوق العباد کی اقسام بیان کی ہیں۔ پس وراثت کے احکام کی تفصیل بیان ہوئی ہے۔ اور بتایا ہے کہ کون وراثت کا مستحق ہے اور کون اس کا مستحق نہیں ہے۔ اور وارث کی وراثت کی حیثیت کیا ہے اور یہ بھی بیان کیا کہ کون سے نکاح جائز ہیں اور کون سے نکاح ناجائز ہیں۔

---

[1] رواه البخاري ۸/ ۱۰۵۔ مسلم ۱/ ۵۸۔

اگر نصوص کلیہ اس کی تمام انواع کو شامل ہیں' تو رسول اللہ ﷺ امام کی بہ نسبت اس کے بیان کے زیادہ حق دار ہیں' اور اگر ایسا کرنا ممکن نہیں تو امام رسول اللہ ﷺ سے بڑھ کر بے بس ہیں۔ معین محرمات پر نصوص کے ہونے کی کوئی راہ نہیں ہے۔ نہ ہی رسول اللہ ﷺ کے لیے ایسا ممکن تھا؛ اور نہ ہی امام کے لیے۔ بلکہ ان میں اجتہاد کیا جانا ہی لازمی تھا۔ اور مجتہد صحیح فیصلہ بھی کرتا ہے اور کبھی اس سے غلطی بھی ہو جاتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب حاکم کسی چیز میں اجتہاد کرے' اور حق کو پالے تو اس کے لیے دوہرا اجر ہے۔ اور جب اجتہاد کرے اور حق کو نہ پا سکے تو اس کے لیے ایک اجر ہے۔''❶

رسول اللہ ﷺ نے بنی قریظہ کے موقع پر۔ جب ایک خاص معاملہ میں فیصلہ کرنے کا وقت تھا' تاکہ زیادہ مناسب فیصلہ کیا جائے۔ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے فیصلہ کیا کہ ان کے لڑنے والوں کو قتل کر دیا جائے؛ اور بچوں اور عورتوں کو قیدی بنالیا جائے؛ تو [آپ نے] فرمایا: ''آپ نے سات آسمانوں کے اوپر اللہ کے فیصلہ کے مطابق فیصلہ کیا ہے۔''❷

جب رسول اللہ ﷺ کسی سریہ یا لشکر کو روانہ فرماتے تو اس کے امیر کو نصیحت فرمایا کرتے تھے:

''جب تم کسی قلعہ والوں کو محاصرہ کرلو اور وہ قلعہ والے یہ چاہتے ہوں کہ تم انہیں اللہ کے حکم کے مطابق قلعہ سے نکالو تو تم اللہ کے حکم کے مطابق نہ نکالو بلکہ انہیں اپنے حکم کے مطابق نکالو کیونکہ تم اس بات کو نہیں جانتے کہ تمہاری رائے اور اجتہاد اللہ کے حکم کے مطابق ہے یا نہیں۔''❸

اس سے واضح ہوا کہ امام کے لیے کوئی ایسی عصمت نہیں ہے جو اس سے پہلے رسول کے لیے موجود نہ ہو۔ ولله الحمد والمنه. واقعات اس کے موافق ہیں۔

بیشک ہم دیکھتے ہیں جو کوئی بھی اتباع سنت اور اتباع صحابہ کے قریب تر ہوتا ہے؛ اس کی دین و دنیا کی مصلحتیں زیادہ کامل ہوتی ہیں۔ اور جو کوئی بھی کتاب و سنت سے دور ہوتا ہے؛ وہ مصلحت کے حصول سے بھی اتنا ہی دور ہوتا ہے۔

شیعہ لوگوں میں سے اس معصوم کی اتباع سے سب سے زیادہ دور ہیں جس کے معصوم ہونے میں کوئی شک نہیں؛ اور وہ معصوم ہیں جناب محمد رسول اللہ ﷺ۔ جنہیں اللہ تعالیٰ نے دین حق اور ہدایت دیکر ڈرانے والا اور خوشخبری سنانے والا اور اللہ کی طرف بلانے والا بنا کر مبعوث فرمایا' جنہوں نے کتاب اللہ کے ذریعہ لوگوں کو کفر و گمراہی کے اندھیروں سے ہدایت اور صراط مستقیم کی طرف نکالا۔ حق اور باطل؛ ہدایت و گمراہی؛ ناکامی و کامیابی؛ نور و ظلمت؛ اہل شقاوت و اہل سعادت کے درمیان تفریق کی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو تقسیم کرنے والا بنایا تھا؛ جنہوں نے اس کے بندوں کو نیک بخت اور بد بخت دو گروہوں میں تقسیم کر دیا۔ سعادت مند وہ ہیں جو آپ پر ایمان لائے۔ اور بد بخت وہ ہیں جنہوں نے آپ کو جھٹلایا اور آپ کی اطاعت سے روگردانی کی۔

شیعہ جو امام معصوم کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں' وہ حقیقی معصوم کی اتباع سے کوسوں دور ہیں۔ تو پھر یقینی طور پر آپ یہ بھی دیکھ سکتے ہیں کہ یہ لوگ دینی اور دنیاوی ہر مصلحت کے اعتبار سے لوگوں میں سب سے زیادہ محروم ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ آپ دیکھیں

❶ البخاری ۹/ ۱۰۸۔ مسلم ۳/ ۱۳۴۲۔

❷ البخاری ٤/ ٦٤۔ مسلم ۳/ ۱۳۸۳۔ ❸ صحیح مسلم ۳/ ۱۳۵٦۔

گے کہ یہ لوگ دنیا کے ظالم ترین اور گمراہ ترین بادشاہوں کی سیاست کے زیر اثر زندگی گزار رہے ہوتے ہیں۔اوران کے لیے خیر صرف ان لوگوں کے ذریعہ سے حاصل ہوتی ہے جو ان میں سے نہیں ہوتے [یہ خود صرف شر کے پتلے ہیں]۔

اسی وجہ سے شیعہ اپنے بہت سارے احوال میں یہودیوں سے مشابہت رکھتے ہیں۔ان میں سے ایک مشابہت کا عنصر یہ بھی ہے کہ یہ جہاں کہیں بھی پائے جائیں اللہ تعالیٰ نے یہودیوں پر ذلت اور مسکنت مسلط کر دی ہے؛[فرمان الٰہی ہے]:

﴿ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ أَيْنَ مَا ثُقِفُوٓا إِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ حَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَ بَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ﴾ [آل عمران ۱۱۲]

''ان کو ہر جگہ ذلت کی مار پڑی الا یہ کہ اللہ تعالیٰ کی پناہ یا لوگوں کی پناہ میں ہوں یہ غضب الٰہی کے مستحق ہو گئے اور ان پر فقیری ڈال دی گئی۔''

یہ صرف اسی صورت میں زمین میں زندگی بسر کرتے ہیں کہ بعض ایسے حکمرانوں کی پناہ میں رہتے ہیں جو خود معصوم نہیں ہوتے۔اس وجہ سے یہ لازمی طور پر اپنے آپ کو اسلام کی طرف منسوب کرنے کے لیے زبان سے ایسی باتوں کا اظہار کرتے ہیں جو ان کے دل میں نہیں ہوتیں۔جو کچھ کتاب و سنت لے کر آئے ہیں ان میں اللہ تعالیٰ ہم پر پورے عالم میں' اور خود ہمارے اندر اپنی نشانیاں ظاہر کر رہا ہے؛ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿سَنُرِيهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ﴾ [فصلت ۵۳]

''عنقریب ہم انہیں اپنی نشانیاں آفاق عالم میں بھی دکھائیں گے اور خود ان کی اپنی ذات میں بھی یہاں تک کہ ان پر کھل جائے کہ حق یہی ہے۔''

جو کچھ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اپنی نشانیاں دکھائی ہیں' ہم نے دیکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جو حقیقت میں امام معصوم ہیں؛ کے سچے پیروکار مصلحت دینی اور دنیاوی حصول کے اعتبار سے بزعم خود اس امام کی طرف نسبت رکھنے والوں سے بہترین حال میں ہوتے ہیں۔اگر ان کا خیال یہ ہو کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی اتباع کرنے والے ہیں تو یہ جان لینا چاہیے کہ شیعہ لوگوں میں سب سے بڑھ کر رسول اللہ ﷺ کے اقوال و افعال اور سنن سے جاہل اور لا بلد ہوتے ہیں۔پورے عالم پر نظر دوڑانے والا انسان اس بات کا ادراک کر سکتا ہے۔اور اس بارے میں ہم سے ان ثقہ لوگوں نے بھی بیان کیا ہے جنہیں جہاں بھر کی خبریں ہوتی ہیں' اور وہ دنیا کے بسنے والوں کے احوال پر نظر رکھتے ہیں۔

اس کی ایک مثال یہ ہے کہ: بلاد حجاز اور شام کے ساحلی علاقوں میں ایسے رافضی پائے جاتے ہیں جو اپنے آپ کو امام معصوم کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ہم نے ان لوگوں کا حال دیکھا ہے جو شام کے ساحلی علاقوں پر رہا کرتے تھے؛ مثلاً جبل کسروان کے رہنے والے۔اور ہم تک ان لوگوں کی خبریں پہنچتی رہتی ہیں۔ہم نے ان سے بڑھ کر دینی اور دنیاوی لحاظ سے بد حال فرقہ کوئی اور نہیں دیکھا۔اور یہ بھی دیکھا ہے کہ جن حکمرانوں کے زیر سایہ وہ زندگی گزار رہے ہوتے ہیں وہ علی الاطلاق ان سے کئی درجہ بہتر ہوتے ہیں۔

جو لوگ کافر حکمرانوں کے زیر سایہ رہتے ہوں' ان کی حالت ملحدین' نصیریہ' اور اسماعیلیہ وغیرہ سے بہتر ہوتی ہے جو رسول

اللہ ﷺ کے علاوہ دوسرے لوگوں کے لیے الوہیت اور نبوت کا عقیدہ رکھتے ہیں ۔

ہر وہ گروہ جو اہل سنت بادشاہوں کے زیر سایہ رہا ہے؛ بھلے وہ بادشاہ دین و دنیا کے اعتبار سے ظالم ترین بادشاہ ہو' مگر اس کی رعیت کی حالت دوسرے لوگوں کی نسبت سے بہتر ہوتی ہے۔ اس لیے کہ جو بات اہل سنت کے مابین مشترک ہے' اور جس کی وجہ سے اہل سنت اہل رفض سے جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں' اور جن امور پر دین و دنیا کی مصلحتیں منحصر ہیں' اس کی کئی وجوہات ہیں۔

وہ معاملہ جو رافضیوں کے مابین مشترک ہے' اور اہل سنت اس سے ممتاز ہیں' اس پر نہ ہی کسی شہر کی کوئی مصلحت منحصر اور نہ ہی گاؤں کی؛ اور کسی گاؤں یا شہر کے رہنے والوں کو آپ ایسا نہیں پائیں گے جن پر رافضیت غالب ہو؛ مگر وہ اپنی بقاء و قیام کے لیے دوسرے لوگوں کا سہارا لیکر چلتے ہیں خواہ یہ دوسرے لوگ اہل سنت مسلمان ہوں یا پھر کوئی کافر۔

صرف اکیلے رافضی اپنی بقاء کو ہرگز قائم نہیں رکھ سکتے۔ جیسا کہ یہودی اکیلے اپنے معاملات نہیں نبھا سکتے۔ بخلاف اہل سنت والجماعت کے۔ آپ دیکھ سکتے ہیں کہ اہل سنت والجماعت کے بہت سارے شہر و ملک آباد ہیں جن کا نظام چلانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے نہ ہی کسی کافر کا محتاج کیا ہے اور نہ ہی کسی رافضی کا۔

خلفاء ثلاثہ نے ملکوں کے ملک اور شہروں کے شہر فتح کیے؛ مشرق و مغرب میں اسلام کا جھنڈا لہرایا: ان کے ساتھ کوئی رافضی نہیں تھا۔ ان کے بعد بنو امیہ آئے۔ باوجود اس کے کہ ان میں سے بہت سارے لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منحرف ہو چکے تھے' اور ان میں سے بعض حضرت علی رضی اللہ عنہ پر طعنہ زنی کرتے تھے؛ مگر وہ مشرق و مغرب کے تمام اسلامی شہروں پر غالب آ گئے تھے۔ بعد میں آنے والے زمانہ کی نسبت سے ان کے دور میں اسلام بہت ہی معزز و غالب تھا۔ بنو امیہ کا دور ختم ہونے کے بعد ایسا اتفاق و اتحاد پیدا نہ ہو سکا۔ جب بنو عباس کی حکومت قائم ہوئی' اس وقت عبدالرحمن بن ہشام الداخل بلاد مغرب کی طرف چلا گیا۔ جسے قریش کا شاہین کہا جاتا ہے۔ اس نے مغرب میں اپنا قبضہ جما لیا اور وہاں پر اسلام کا جھنڈا گاڑ دیا۔ اپنے گرد و نواح کے کفار کا قلعہ قمع کیا۔ دین و دنیا میں ان کی سیاست لوگوں میں بہت معروف رہی ہے۔

یہ لوگ اہل عراق کے مذہب سے بہت دور تھے۔ چہ جائے کہ شیعہ کے اقوال کو قبول کرتے۔ اہل مغرب اہل مدینہ کے مذہب پر عمل کرتے تھے۔ اہل عراق اور اہل شام امام اوزاعی کے مذہب پر تھے۔ یہ لوگ اہل حدیث کی بڑی تعظیم کیا کرتے تھے۔ اور بہت سارے امور میں ان کی مدد کیا کرتے تھے۔ یہ لوگ شیعہ کے مذہب سے سب سے دور رہتے تھے۔ ان میں بہت سارے لوگ ہاشمی اور حسینی بھی تھے۔ ان میں سے اہل سنت والجماعت کے مذہب کے مطابق وہاں کے عمال اور امراء بھی متعین ہوئے۔

ان میں ایسے بھی لوگ تھے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے بارے میں سکوت اختیار کرتے تھے۔ اس لیے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں امت کا ایک خلیفہ پر اجماع نہیں ہو سکا۔ اور آپ کو گالی بھی نہیں دیتے تھے جیسے بعض شیعہ کرتے ہیں۔

بعض اہل مغرب علماء نے فتوحات پر بڑی بڑی کتابیں تحریر کی ہیں۔ جن میں انہوں نے نبی کریم ﷺ اور آپ کے بعد خلفاء راشدین ابوبکر و عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین کی فتوحات کا ذکر کیا ہے۔ مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کسی فتح کا ذکر نہیں ملتا؛ حالانکہ

وہ لوگ آپ سے محبت اور دوستی رکھتے تھے۔ اس لیے کہ آپ کے زمانے میں کوئی نئی فتح نہیں ہوئی۔

تمام علماء اہل سنت والجماعت : امام مالک اور ان کے ساتھی؛ امام اوزاعی اور ان کے ساتھی؛ امام شافعی اور ان کے ساتھی ؛ امام احمد بن حنبل اور ان کے ساتھی ؛ امام ابوحنیفہ اور ان کے ساتھی ؛ اور ان کے علاوہ دیگر علماء کرام رحمہم اللہ ؛ یہ تمام ان خلفاء سے محبت کرتے اور ان سے دوستی رکھتے تھے۔ اور ان کے خلفاء برحق ہونے کا ایمان رکھتے تھے۔ اور جو کوئی ان میں سے کسی ایک کا برائی کے ساتھ تذکرہ کرتا تو اس پر رد کیا کرتے تھے۔ یہ تمام حضرات خوارج اور روافض کی طرح صحابہ میں سے کسی ایک کو نہ ہی حضرت علی اور نہ ہی حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کو برائی کے ساتھ یاد کرنے کو جائز سمجھتے تھے۔

پھر خوارج اور روافض کے کچھ گروہ مغرب میں پہنچ گئے۔ جیسا کہ یہ لوگ پہلے سے مشرق میں اور بہت سارے اسلامی شہروں میں موجود تھے۔ لیکن ان شہروں کی اساس ان لوگوں کے مذہب پر قائم نہیں ہوسکی۔ بلکہ اگر کسی وقت تھوڑے سے عرصہ کے لیے اگر ان لوگوں کا غلبہ بھی ہوگیا تو اللہ تعالیٰ نے دین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے پیروکاروں کو کھڑا کیا؛ جنہوں نے دین حق کا پھریرا کیا' اور باطل کو پیوند زمین کر کے چھوڑا۔

بنوعبید شیعیت کا مظاہرہ کرتے تھے۔ یہ لوگ مغرب کے کچھ علاقوں پر غالب آگئے ؛ اور وہاں پر امام بارگاہیں قائم کیں۔ پھر وہاں سے مصر کی طرف آئے۔ اور وہاں پر دو سو سال تک غالب رہے۔ ایسے ہی ایک سو سال تک حجاز اور شام پر غالب رہے۔ بساسیری فتنہ کے وقت بغداد پر غالب آگئے۔ ان کے ساتھ زمین کے مشرق و مغرب سے دیگر ملحدین بھی مل گئے۔ اہل بدعت و ضلال بھی جو کہ ان سے محبت کرتے تھے؛ ان کے ہاتھوں میں ہاتھ دینے لگے۔ مگر اس کے باوجود یہ لوگ ہمیشہ اہل سنت والجماعت کے محتاج رہے۔ ان کی حرفہ گری کے حاجت مندر ہے؛ اور ان کے ساتھ تقیہ سے پیش آتے رہے۔

رافضیوں کا رأس المال تقیہ ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اپنے باطن کے خلاف ظاہر کیا جائے جیسے منافقین کرتے ہیں۔ مسلمان شروع میں انتہائی کمزور تعداد میں بہت کم تھے؛ مگر اس کے باوجود بھی وہ اپنا دین چھپاتے نہیں تھے۔ رافضیوں کا خیال ہے کہ وہ اس آیت پر عمل کرتے ہیں:

﴿لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً وَ يُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ﴾ [آل عمران ۲۸]

''ایمان والے مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست مت بنائیں اور جو ایسا کرے گا وہ اللہ کی طرف سے کسی چیز میں نہیں مگر یہ کہ تم ان سے بچو، کسی طرح بچنا اور اللہ تمھیں اپنے آپ سے ڈراتا ہے۔''

ان کا گمان ہے کہ یہی لوگ مؤمن ہیں۔ جب کہ باقی تمام اہل قبلہ کفار ہیں۔ حالانکہ ان کے ہاں جمہور کی تکفیر کے بارے میں دو قول پائے جاتے ہیں۔ مگر ہم نے دیکھا ہے کہ ان کے بڑے بڑے مفتی اور ائمہ اپنی کتابوں اور فتاوی میں جمہور مسلمانوں کو کافر قرار دیتے ہیں۔ اور انہیں مرتد کہتے ہیں۔ اور ان کے علاقے مرتدین کے علاقے ہیں۔ ان کے ہاں کی مائع چیزوں کو نجس کہتے ہیں۔ اور ان کا کہنا ہے کہ جو کوئی ان کے مذہب کو چھوڑ کر جمہور کا مذہب قبول کر لے' اور پھر اس کے بعد وہ توبہ کرے' تو اس کی توبہ قبول نہیں ہوگی۔ ان کا عقیدہ ہے کہ وہ مرتد جو فطرت پر پیدا ہوتا ہے اس کا اسلام کی طرف رجوع قبول

نہیں کیا جائے گا۔

اسلام سے مرتد ہونے والے کے بارے میں سلف کے کئی اقوال ہیں ۔امام احمد سے بھی ایک روایت میں یہی منقول ہے۔ وہ کہتے ہیں : جو مرتد کافر تھا؛ پھر وہ مسلمان ہوگیا ؛ پھر وہ کفر کی طرف واپس لوٹ گیا ؛ اس کا معاملہ اس انسان سے مختلف ہے جو مسلمان پیدا ہوا ہو۔ جب کہ شیعہ کا یہی عقیدہ پوری امت کے متعلق ہے۔ پوری امت کے لوگ شیعہ کے نزدیک کفار ہیں ۔ پس جو کوئی اہل سنت کے مذہب پر چلا' شیعہ کے نزدیک مرتد ہوگیا۔ یہ آیت ان پر حجت ہے۔اس آیت میں اولاً ان مؤمنین سے خطاب ہے جو نبی کریم ﷺ کے ساتھ تھے ۔ان سے کہا جائے گا:[اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں]:

﴿لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ [آل عمران ۲۸]

''ایمان والے مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست مت بنائیں ۔''

باتفاق علماء یہ آیت مدنی ہے اس لیے کہ پوری سورت آل عمران' سورت بقرہ' سورت نساء اور سورت مائدہ مدنی ہیں۔ یہ بات بھی سبھی جانتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے مبارک عہد میں مدینہ میں اہل ایمان میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں تھا جو اپنا ایمان چھپاتا ہو' اور کافروں کے لیے ظاہر کرتا ہو کہ وہ بھی ان ہی میں سے ہے۔جیسا کہ رافضی جمہور سے کرتے ہیں ۔مفسرین کا اتفاق ہے کہ یہ آیت بعض ان مسلمانوں کے بارے میں نازل ہوئی جو کفار کے ساتھ محبت اظہار کرتے تھے ؛ اس آیت میں انہیں اس محبت سے روکا گیا ہے۔رافضی جمہور مسلمانوں سے محبت نہیں کرتے ۔امام ضحاک رحمہ اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں :آپ فرماتے ہیں: حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کے یہودی حلفاء تھے۔آپ نے عرض کیا: یارسول اللہ! میرے ساتھ پانچ سو یہودی ہیں ۔میرا خیال ہے کہ میں ان سے دشمنی کا اظہار کروں ۔تو یہ آیت نازل ہوئی۔

ابو صالح روایت کرتے ہیں: عبد اللہ بن ابی اور اس کے منافق ساتھی یہودیوں سے دوستی رکھتے رضی اللہ عنہما تھے اور ان تک مسلمانوں کی خبریں پہنچاتے تھے۔اور ان کے لیے نبی کریم ﷺ پر فتح حاصل ہونے کی امیدیں لگائے رکھتے تھے۔تو اللہ تعالیٰ نے مؤمنین کو ان منافقین جیسا برا کردار ادا کرنے سے منع کردیا۔

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا گیا ہے : کچھ یہودی انصار کے ساتھ بظاہر محبت کا دعوی کرتے تھے تاکہ انہیں ان کے دین میں فتنہ کا شکار کرسکیں۔مسلمانوں میں سے کچھ لوگوں نے انہیں ایسا کرنے سے منع کیا؛ کہ ان یہودیوں سے بچ کر رہو؛ مگر وہ باز نہ آئے۔تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

مقاتل بن سلیمان اور مقاتل بن حیان سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں:''یہ آیت حاطب بن ابی بلتعہ جیسے لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی ؛ جو کفار مکہ کیساتھ محبت کا اظہار کرتے تھے۔اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسا کرنے سے منع کیا۔

رافضی لوگوں میں سب سے بڑھ کر اہل سنت والجماعت سے محبت کا اظہار کرتے ہیں؛ ان میں سے کوئی ایک بھی ان کے سامنے اپنے دین کا اظہار نہیں کرتا' بلکہ ان لوگوں نے صحابہ کرام کے فضائل اور ان کی مدح کے قصیدے یاد کررکھے ہوتے ہیں۔اس کے ساتھ ہی خود رافضی اپنی ہجو میں اشعار یاد کررکھتے ہیں جن کے ذریعہ سے اہل سنت والجماعت کیساتھ محبت کا اظہار کرنا چاہتے ہیں۔جیسا کہ مؤمنین اہل کتاب اور مشرکین کے لیے محبت کا اظہار کرتے تھے۔تو اس سے معلوم ہوا کہ رافضی

اس آیت پر عمل کے لحاظ سے کوسوں دور ہیں ۔ رہا یہ فرمانا کہ: ﴿اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰةً﴾ [آل عمران ۲۸]
''مگر یہ کہ تم ان سے بچو، کسی طرح بچنا۔''

مجاہد کہتے ہیں: اس سے مراد ہے تصنع کرنا۔ یہاں ''تـقـة'' سے مراد [تقیہ کرنا] نہیں کہ میں جھوٹ بولوں، اور اپنی زبان سے وہ بات کہوں؛ جو کہ میرے دل میں نہیں۔ بلکہ یہ ہے کہ مجھے وہ کچھ کرنا چاہیے جس پر مجھے قدرت حاصل ہے۔ جیسا کہ صحیح حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((من رأى منكم منكراً فليغيّره بيده ، فإن لم يستطع فبلسانه ، فإن لم يستطع فبقلبه ، وذلك أضعف الإيمان)) [مسلم ۱۸۶]

''جو کوئی تم میں سے برائی کی بات دیکھے اسے چاہیے کہ وہ اسے اپنے ہاتھ سے مٹا دے، اگر اس کی طاقت نہ رکھتا ہو تو اسے اپنی زبان سے منع کرے، اور اگر اس کی بھی طاقت نہ رکھتا ہو تو اسے دل میں برا جانے، اور یہ ایمان کا کم ترین درجہ ہے۔''

پس جب کوئی مؤمن کفار و فجار کے درمیان رہ رہا ہو اور اس کے لیے اپنی عاجزی کی وجہ سے ہاتھ سے جہاد کرنا ممکن نہ ہو؛ لیکن اس کے لیے زبان سے منع کرنا یا دل میں برا جاننا ممکن ہوتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی اس نے [ڈر کر] جھوٹ نہیں بولنا؛ اور زبان سے اس چیز کا اظہار نہیں کرنا جو اس کے دل میں نہ ہو۔ خواہ وہ اپنا دین ظاہر کرے یا چھپائے رکھے۔ مگر کسی بھی صورت میں ان کے دین پر موافقت نہ کرے۔ بلکہ زیادہ سے زیادہ آل فرعون کے اس مؤمن - یا فرعون کی بیوی - کی طرح ہو؛ یہ لوگ فرعون کے پورے دین پر اس کے ساتھ موافق نہیں تھے۔ اور نہ ہی جھوٹ بولتے تھے؛ اور نہ ہی اپنی زبان سے ایسی بات کہتے تھے جو ان کے دل میں نہ ہو۔ بلکہ وہ اپنے ایمان کو چھپائے ہوئے تھے۔

اپنے دین کو چھپانا ایک اور چیز ہے؛ جبکہ باطل دین کا اظہار کرنا ایک علیحدہ چیز ہے۔ ایسا کرنے کو اللہ تعالیٰ نے کبھی بھی جائز نہیں ٹھہرایا؛ سوائے اس صورت کے انسان کو کلمہ ء کفر کہنے پر مجبور کیا جائے۔ اس صورت میں اس کے لیے بامر مجبوری زبان سے کلمہ کفر بولنے کی اجازت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے منافق اور مکرہ [مجبور] کے مابین فرق کھول کر بیان کیا ہے۔

رافضیوں کا حال تو منافقین کے حال جیسا ہے۔ ان کا حال اس مجبور جیسا نہیں جسے کلمہ کفر کہنے پر مجبور کیا جائے؛ اور اس کا دل ایمان پر مطمئن ہو۔ یہ اکراہ بھی تمام جمہور بنی آدم کے ساتھ نہیں ہو سکتا۔ اس کی صورت یہ ہے کہ انسان کافروں کے پنجے میں قید ہو؛ یا کسی جگہ بلاد کفر میں اکیلا ہو۔ [ہاں] اگر اسے کوئی کلمہ کفر کہنے پر مجبور نہ کرے؛ اور نہ ہی وہ اپنی زبان پر ایسا کلمہ لائے؛ اور نہ ہی اپنی زبان سے ایسی بات کہے جو اس کے دل میں نہ ہو۔ تو کبھی یہ ضرورت پیش آ سکتی ہے کہ کفار کے ساتھ نرمی سے پیش آئے؛ تاکہ وہ اسے اپنا گمان کریں؛ مگر اس کے ساتھ زبان سے خلاف دل کوئی بات نہ کہے؛ بلکہ اپنے دل میں ایمان کو چھپائے رکھے۔ جھوٹ بولنے اور بات چھپانے میں جو فرق ہے وہ صاف واضح ہے۔ چھپانا اس کو کہتے ہیں کہ انسان کے دل میں کوئی چیز ہو، مگر وہ اس کے ظاہر کرنے میں اللہ کے ہاں معذور ہو۔ جیسے کہ آل فرعون کے مومن کا حال تھا۔

اس کے برعکس جو انسان کفریہ کلمات کہے؛ اور اس کا عذر صرف مجبور ہونے کی صورت میں قبول کیا جائے گا۔ منافق جو

جھوٹ بولتا ہے اس کا عذر کسی بھی حال میں قبول نہیں کیا جائے گا۔اس کے [چہرہ کے] اثرات سے جھوٹ کا پتہ چل جاتا ہے۔ پھر جو مؤمن اپنا ایمان چھپاتا ہے وہ کفار کے مابین بود و باش رکھنے والا ہوتا ہے جہاں کے لوگ اس کے دین و ایمان کو نہیں جانتے ۔اس کے ساتھ ہی وہاں کے لوگ اس سے محبت کرتے ہیں اور اس کا اکرام کرتے ہیں۔اس لیے کہ اس انسان کے ایمان کا تقاضا ہے کہ لوگوں کے ساتھ سچائی اور امانت کا اور خیر خواہی کا معاملہ کرے۔ اور ان کی بھلائی کا خواہاں رہے۔ اگر چہ وہ ان کے دین پر ان سے موافقت نہ رکھتا ہو۔ جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کفار مصر کے درمیان معاملات چلا رہے تھے۔ اور جیسے آل فرعون کا مؤمن اپنا ایمان چھپائے ہوئے تھا۔مگر اس کے باوجود موسیٰ علیہ السلام کی تعظیم کرتا تھا؛ اور کہتا تھا:

﴿ اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ یَّقُوْلَ رَبِّیَ اللّٰهُ ﴾ [غافر ۲۸]

''کیا تم ایسے آدمی کو قتل کرتے ہو جو کہتا ہے میرا رب اللہ ہے۔''

رافضی کسی کے ساتھ بغیر نفاق استعمال کیے بود و باش نہیں رکھتا۔ اس لیے کہ اس دل میں جو دین ہے وہ انتہائی درجہ کا فاسد دین ہے۔ جو اسے جھوٹ بولنے اور خیانت کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔لوگوں سے دھوکہ بازی پر ابھارتا ہے۔اور ان کے ساتھ برائی کا سبق دیتا ہے۔ یہ لوگ کسی کی دوستی کی کوئی پرواہ نہیں کرتے۔اور کوئی بھی شر کا کام ایسا نہیں جس کے کرنے پر قدرت رکھتے ہوں' مگر اسے کر گزرتے ہیں۔ جو لوگ انہیں نہیں بھی جانتے ان کے ہاں بھی یہ لوگ عتاب کا نشان رہتے ہیں۔ اگر چہ وہ نہ بھی جانتے ہوتے کہ یہ رافضی ہے؛ تب بھی اس کے چہرے پر نفاق کی علامات اور بول چال میں کجی سے معلوم ہو جائے گا [یہ کون ہے]۔اس لیے آپ دیکھیں گے کہ رافضی کمزور ترین لوگوں کے ساتھ اور ان کے ساتھ بھی منافقت کرے گا جن کیساتھ اس کا کوئی تعلق ہی نہیں۔ اس لیے کہ رافضی کے دل میں منافقت ہے جس نے اسے کمزور کر دیا ہے۔

مؤمنین ایمان کی عزت اور غلبہ میں ہوتے ہیں۔عزت اللہ اور اس کے رسول کے لیے اور مؤمنین کے لیے ہے۔ پھر یہ لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ صرف ہم ہی مؤمن ہیں۔ جب کہ مسلمانوں کے تمام گروہوں سب سے بڑھ کر ذلت و رسوائی روافض میں پائی جاتی ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَیَوْمَ یَقُوْمُ الْاَشْهَادُ ﴾ [غافر ۵۱]

''یقیناً ہم اپنے رسولوں کی اور ایمان والوں کی مدد زندگانی دنیا میں بھی کریں گے اور اس دن بھی جب گواہی دینے والے کھڑے ہوں گے۔''

رافضی اس نصرت سے اہل اسلام کے تمام گروہوں میں سب سے زیادہ حق سے دور ہیں؛ اور ذلت و رسوائی کے سب سے زیادہ مستحق ہیں۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل اسلام کے گروہوں میں نفاق سے قریب تر اور ایمان سے بعید تر گروہ رافضیوں کا ہے۔اس کی نشانی یہ ہے کہ حقیقت میں وہ منافق جن میں ایمان کا کوئی حصہ نہیں ہوتا؛ وہ ملحدین ہیں؛ جو کہ رافضیوں کی طرف میلان رکھتے ہیں۔اور رافضی سب سے بڑھ کر ان کی طرف میلان رکھتے ہیں۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''روحیں جند مجند ہیں؛ جن کا آپس میں تعارف ہوا وہ مالوف ہوں گی۔اور جو اوپری رہیں وہ اختلاف میں رہیں۔''

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: لوگوں کو ان کے دوستوں سے پہچانو۔''

اس سے معلوم ہوا کہ رافضہ اور منافقین کی روحوں کے مابین خالص اتحاد اور یگانگت پائی جاتی ہے۔ اور ان کے مابین مشترکہ اقدار اور مشابہات موجود ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رافضیوں میں بنیادی طور پر منافقت پائی جاتی ہے۔ منافقت کی کئی ایک اقسام ہیں۔ جیسا کہ صحیحین میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

''جس شخص میں یہ چاروں خصلتیں جمع ہو جائیں تو وہ خالص منافق ہے۔ اور جس میں ان میں سے کوئی ایک خصلت پائی جائے تو سمجھ لو کہ اس میں منافق کی ایک خصلت پیدا ہوگئی جب تک کہ اس کو چھوڑ نہ دے: جب بات کرے تو جھوٹ بولے۔ جب عہد کرے تو توڑ ڈالے۔ جب اسے امانت دی جائے تو خیانت کرے۔ اور جب جھگڑا کرے تو آپے سے باہر ہو جائے۔'' [صحیح مسلم: ح ۲۱۲]

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

''منافق کی تین علامتیں ہیں جب بات کرے تو جھوٹ بولے جب وعدہ کرے تو خلاف ورزی کرے اور جب اس کے پاس امانت رکھوائی جائے تو اس میں خیانت کرے۔'' [صحیح مسلم: ح: ۲۱۳]

اور مسلم کی ایک روایت میں یہ الفاظ بھی زیادہ ہیں: ''اور اگرچہ وہ روزہ رکھتا ہو اور نماز پڑھتا ہو اور اپنے آپ کو مسلمان سمجھتا ہو۔'' اہل قبلہ میں سے یہ تین نشانیاں جس گروہ میں سب سے زیادہ پائی جاتی ہیں' وہ رافضہ کا گروہ ہے۔

قرآن اس بات پر گواہی دیتا ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے کئی ایک مواقع پر منافقین کے غدر و خیانت اور جھوٹ کے اوصاف بیان کیے ہیں۔ یہ اوصاف رافضیوں سے بڑھ کر کسی دوسرے گروہ میں نہیں پائے جاتے۔ اور نہ ہی صحابہ کرام کی راہ پر چلنے والے اہل سنت والجماعت سے کوئی فرقہ اتنا دور ہے جتنا دور یہ لوگ ہیں۔ اہل سنت والجماعت شعب ایمان کے زیادہ مستحق اور نفاق سے بہت زیادہ دور ہیں۔ جب کہ رافضی ایمان کے شعبوں سے بہت زیادہ دور اور نفاق کے شعبوں کے بہت زیادہ قریب ہیں۔ سارے گروہوں کا یہی حال جو سنت سے جتنا زیادہ قریب ہوگا وہ ایمان کے اتنا زیادہ قریب ہوگا اور جو بدعت کے جتنا زیادہ قریب ہوگا وہ ایمان سے اتنا دور اور نفاق کے اتنا ہی قریب ہوگا۔

ان تمام باتوں سے واضح ہو جاتا ہے کہ رافضی اس امام معصوم کی اتباع سے بہت زیادہ دور ہیں جس کے معصوم ہونے میں کوئی شک ہی نہیں؛ وہ امام ہیں خاتم المرسلین محمد رسول اللہ ﷺ۔ سنت کے برخلاف رافضی جن ائمہ کے معصوم ہونے کا دعوی کرتے ہیں حقیقت میں یہ ایک منافق زندیق کی پیدا کردہ بدعت ہے۔ جیسا کہ اہل علم نے اس کا ذکر کیا ہے۔

[رافضیت کا بانی کون؟]:

متعدد علماء نے ذکر کیا ہے کہ جس شخص نے تشیع کی بنا ڈالی اور بنا بر نص حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ قرار دیا وہ ایک زندیق تھا اور دین میں بگاڑ پیدا کرنے کے لیے اس نے ایسا کیا تھا۔ وہ مسلمانوں کے ساتھ وہی سلوک کرنا چاہتا تھا جو پولوس نے نصاریٰ کے ساتھ کیا تھا مگر اسے اپنے مقصد میں وہ کامیابی حاصل نہ ہو سکی جو پولوس کو ہوئی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ نصاریٰ ضعیف العقل والدین تھے۔ حضرت مسیح علیہ السلام آسمان پر اٹھا لیے گئے تھے اور آپ کے پیرو ایسے نہ تھے جو صحیح معنی میں دین عیسوی سے باخبر ہوں اور اس پر عمل پیرا بھی ہوں۔ جب پولوس نے حضرت مسیح کے بارے میں غلو کا عقیدہ اختراع کیا تو بہت سے عیسائی اس

کی پیروی کرنے لگے، انہوں نے مسیح کی شان میں غلو کو بہت اچھا سمجھا؛ یہی نہیں بلکہ بہت سے سلاطین اس کے ہم نوا بن گئے۔ نصاریٰ کی ایک جماعت نے جب ان کی تردید کا بیڑا اٹھایا تو پولوس کے ہم نوا سلاطین نے ان کو موت کے گھاٹ اتار دیا، بعض نصاریٰ نے بادشاہوں کے ساتھ رواداری کا سلوک کیا اور عبادت گاہوں میں عزلت گزیں ہو گئے۔

وللہ الحمد کہ امت مسلمہ کا معاملہ نصاریٰ سے یکسر مختلف ہے۔ حدیث نبوی کے مطابق مسلمانوں کی ایک جماعت حق و صداقت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑے گی۔ [1] بنا بریں کوئی ملحد و بے دین اپنے غلو کی بنا پر یا حق پر غلبہ پا کر اس میں بگاڑ نہیں پیدا کر سکتا۔ البتہ جو شخص اس کی پیروی کرے گا وہ یقیناً گمراہ ٹھہرے گا۔

علاوہ ازیں امام معصوم کے نائب جن کے متعلق رافضیوں کا دعویٰ ہے کہ وہ جزئیات میں معصوم نہیں ہو سکتے؛ اگر بات ایسے ہی ہے تو ان سے کہا جائے گا کہ: اگر جزئیات میں عصمت کا وقوع تسلیم نہیں کرتے؛ اس کے باوصف اکثر بلکہ تمام امور وہی فیصل کرتے ہیں۔ اب کلیات میں معصوم ہونے کا مسئلہ باقی رہا۔ تو اس ضمن میں واضح ہو کہ اللہ تعالیٰ کلیات کی اسی طرح تصریح کر سکتا ہے کہ اس کی موجودگی میں کلیات کی معرفت حاصل کرنے میں امام یا کسی دوسرے کی کوئی ضرورت ہی پیش نہ آئے۔ وہ اس بات پر بھی قادر ہے کہ نص نبوی کو نص امام سے اکمل بنا دے۔ تو پھر اس صورت میں کلیات و جزئیات دونوں میں عصمت امام کی چنداں ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔

تیرھویں وجہ: ہم شیعہ سے دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ ان کی رائے میں عصمت امام سے کیا مراد ہے؟

کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ امام اداء عبادات یا ترک معاصی میں مختار ہے؟ حالانکہ شیعہ کے نزدیک اللہ تعالیٰ اس کے اختیار کا خالق نہیں ہے۔ یا اس کا یہ مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے ارادہ کا خالق ہے یا یہ معنی کہ وہ معصیت کی قدرت کو سلب کر سکتا ہے۔

اگر تم کہو گے کہ: ہماری مراد پہلی بات ہے: [تو یہ غلط ہے] حالانکہ شیعہ کے نزدیک اللہ تعالیٰ فاعل کے اختیار کا خالق نہیں ہے۔ اس سے یہ لازم آیا کہ اللہ تعالیٰ معصوم کو پیدا کرنے پر قادر نہیں ہے۔

اگر تم کہو کہ ہماری مراد دوسری بات ہے؛ تو شیعہ کا تقدیر کے بارے میں اصولی نظریہ باطل ٹھہرتا ہے۔

اگر تم کہو کہ: اس سے ہماری مراد یہ ہے کہ وہ معصیت سلب کرنے پر قدرت رکھتا ہے۔ تو گویا کہ تمہارے ہاں معصوم گناہ کا کام کرنے سے ہی عاجز ہے۔ جیسا کہ کوئی اندھا قرآن کی ورق گردانی سے اور کوئی اپاہج انسان چلنے پھرنے سے عاجز و قاصر ہوتا ہے۔ اور جو کوئی کسی چیز سے عاجز ہوتا ہے' اسے تو نہ ہی کسی بات کا حکم دیا جاتا ہے اور نہ ہی کسی چیز سے منع کیا جاتا ہے۔ اور اگر اسے کسی چیز سے منع کیا جائے یا حکم دیا جائے تو پھر بھی اس کو اس اطاعت پر کوئی ثواب نہیں ملے گا[اس لیے کہ وہ اطاعت پر مجبور ہے؛ کیونکہ اس سے گناہ کی صلاحیت ہی سلب کر لی گئی ہے]۔ پس اس سے ثابت ہوا کہ تمہارے ہاں امام معصیت ترک کرنے پر کسی ثواب کا مستحق نہیں ٹھہرتا اور نہ ہی اطاعت کے کام بجالانے پر اسے کوئی اجر ملے گا؛ یہی تمہارے

---

[1] صحیح بخاری، باب(۲۸) (ح:۳٦٤٠)مسلم، باب قوله ﷺ "لا تزال طائفة من امتی ....." (ح: ۱۹۲۰)۔

مذہب میں انتہائی بڑا تناقض پایا جاتا ہے۔

تو پھر اس وقت کوئی بھی مسلمان اس امام معصوم سے بہتر ہوگا جو کہ گناہ کرے اور پھر توبہ کرے۔ اس لیے کہ توبہ کرنے سے گناہ مٹ جاتے ہیں۔ بلکہ ہر گناہ کو نیکی سے بدل دیا جاتا ہے' اور اس کی سابقہ نیکیوں میں اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ تو پھر اس صورت میں مکلفین کا ثواب اس امام معصوم سے بہتر ہوگا۔ یہ بھی ان کے عقیدہ میں انتہائی تناقض ہے۔

[دوسرے مقدمہ پر رد]:

اگر یہ مان لیا جائے کہ: ایک معصوم کا ہونا ضروری ہے: تو پھر شیعہ کا یہ قول: ''علی رضی اللہ عنہ کے سوا کوئی بھی معصوم نہیں۔''

[یہ صحیح نہیں] بلکہ بالاتفاق ممنوع ہے۔ اس لیے کہ بہت سے عابد و زاہد؛ صوفیہ اور عساکر اور عوام شیعہ کی طرح اپنے مشائخ کو معصوم قرار دیتے ہیں۔ ان کا دعوی بھی بالکل ویسے ہی ہے جیسے اثنا عشریہ رافضیہ کا دعوی۔ بسا اوقات اس کے لیے اصطلاح استعمال کرتے ہیں کہ ''شیخ گناہوں سے محفوظ ہوتا ہے۔''

یہ عقیدہ رکھنے کے باوجود ان کا عقیدہ ہے کہ عام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین ان کے شیوخ سے افضل ہیں۔ خلفائے راشدین تو بالاولی افضل ہوں گے۔ بہت سارے لوگوں میں اپنے شیوخ کے متعلق بالکل ایسے ہی غلو پایا جاتا ہے جیسے اثنا عشری رافضیوں میں ان کے ائمہ کے بارے میں غلو پایا جاتا ہے۔

فرقہ اسماعیلیہ والے اپنے اماموں کو معصوم سمجھتے ہیں، ان کے امام بارہ اماموں سے الگ ہیں۔

بنوامیہ کے اکثر یا بہت سارے متبعین کہا کرتے تھے کہ خلفاء پر حساب و کتاب یا عذاب نہیں ہوگا۔ اور اللہ تعالیٰ ان سے ان امور میں کوئی مؤاخذہ نہیں کریں گے جس میں وہ امام کی اطاعت کرر ہے ہیں۔ بلکہ ان پر ہر بات میں امام کی اطاعت واجب ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسا کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس بارے میں ان کا کلام بڑا معروف ہے۔

یزید بن عبدالملک نے کوشش کی تھی کہ وہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی سیرت پر گامزن ہو؛ مگر اس کے پاس ان کے مشائخ کی ایک جماعت پیش ہوئی؛ اور انہوں نے اس کے سامنے اللہ وحدہ لاشریک کی قسم اٹھائی کہ جب اللہ تعالیٰ کسی انسان کو حاکم بنا دیتا ہے تو پھر اس کی نیکیاں قبول کرتا ہے اور برائیوں کو معاف کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بڑے مشائخ کے کلام میں ولی امر کی مطلق اطاعت کے متعلق بہت زیادہ تاکید پائی جاتی ہے۔ اور ان کا کہنا ہے کہ جو کوئی حاکم کی اطاعت کرتا ہے گویا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی ضرب المثل بیان کی جاتی تھی کہ:

''اگر اطاعت ہو تو اہل شام کی سی اطاعت ہو۔''

یہ لوگ بھی یہی کہتے ہیں: ان کا امام و حاکم انہیں اسی چیز کا حکم دیتا ہے جس کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے۔ ان میں سے کوئی ایک بھی شیعہ نہیں ہے۔ بلکہ ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بغض رکھتے ہیں آپ پر سبّ و شتم کرتے ہیں۔

جو شخص یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ امام جس چیز کا بھی حکم دیتا ہے اصل میں وہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہوتا ہے۔ اور وہ اپنے حکم میں واجب الاطاعت ہے؛ اور اللہ تعالیٰ اس اطاعت پر ثواب دیگا۔ اور ترک اطاعت پر سزا دے گا۔ اسے اپنے امام کے علاوہ کسی معصوم کی ضرورت نہیں۔

اس وقت ان کا جواب دو طرح سے دیا جائے گا:

پہلا جواب: ان سے کہا جائے گا کہ: ان میں سے کسی بھی گروہ سے جب کہا جائے گا کہ امام معصوم کا ہونا ضروری ہے؛ تو وہ کہہ سکتا ہے میرے لیے اس امام کی عصمت ہی کافی ہے جس کا میں پیرو ہوں۔ مجھے بارہ ائمہ کے معصوم ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ نہ ہی علی اور نہ ہی کسی دوسرے کی کوئی ضرورت ہے۔ اور دوسرا کہے گا: میرے شیخ یا امیر کی عصمت ہی میرے لیے کافی ہے؛ وہی میرا امام و پیشوا ہے۔ تیسرا کہے گا: میرا امام اموی ہے؛ اسماعیلی ہے۔ اور بہت سارے لوگ یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ بادشاہوں کی اطاعت کرنے میں ان پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ خواہ وہ کوئی بھی بادشاہ ہو۔ اس کی دلیل میں وہ یہ آیت پیش کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ﴾ (النساء: ۵۹)

''اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو اور رسول ﷺ اور اپنے اولی الامر کی اطاعت کرتے رہو۔''

اگر شیعہ کہیں کہ ان لوگوں کی مخالفت کچھ اہمیت نہیں رکھتی تو یہ بات نا قابل قبول ہے۔ یہ لوگ تو رافضہ اور اسماعیلیہ سے بہر کیف بہتر ہیں۔ اس لیے کہ وہ جس امام کے پیرو ہیں وہ موجود ہے۔ بخلاف ازیں روافض جس امام کی پیروی کے مدعی ہیں وہ امام منتظر معدوم ہے جس کی اطاعت قطعی طور پر بے سود ہے۔

اور اس کے ساتھ ہی رافضیوں کا یہ دعویٰ بھی باطل ہو گیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور اہل بیت کے علاوہ کسی دوسرے کے لیے معصوم ہونے کا دعویٰ نہیں کیا گیا۔

اگر یہ کہا جائے کہ: صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین میں کوئی ایک بھی ایسا نہیں تھا جو حضرت ابو بکر و عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے معصوم ہونے کا دعویٰ کرتا ہو؟ تو اس کے جواب میں کہا جائے گا: اگر واقعی ان میں کوئی ایسا نہیں تھا جو معصوم ہونے کا دعویٰ کرتا ہو تو تمہارا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے معصوم ہونے کا دعویٰ باطل ٹھہرا۔ اور اگر ان میں کوئی ایسا تھا جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے معصوم ہونے کا دعویٰ کرتا ہو تو پھر خلفاء ثلاثہ کی عصمت کا دعویٰ کرنے والوں کے موجود ہونے میں کوئی بات رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ بلکہ ان لوگوں کے لیے عصمت کا دعویٰ کیا جانا زیادہ اولیٰ ہے۔ اس لیے کہ ہم یقینی طور پر جانتے ہیں کہ جمہور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کو باقی صحابہ پر ترجیح اور فضیلت دیا کرتے تھے۔ بلکہ خود حضرت علی رضی اللہ عنہ انہیں اپنے سے افضل سمجھتے تھے۔ جیسا کہ آپ سے تواتر کے ساتھ منقول ہے۔ پس اس وقت حضرات شیخین کی عصمت کا دعویٰ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عصمت کے دعویٰ کی نسبت زیادہ اولیٰ ہوگا۔

اگر یہ کہا جائے کہ: ایسا دعویٰ صحابہ کرام سے نقل نہیں کیا گیا؟

تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ: ''اصحاب رسول ﷺ تابعین اور اصحاب علم میں سے کوئی بھی عصمتِ علی کا مدعی نہیں ہے۔ اور ہم بھی ان میں سے کسی ایک فریق کے بھی معصوم ہونے کا عقیدہ نہیں رکھتے۔ لیکن ہم کہتے ہیں: حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عصمت کا دعویٰ کرتے ہوئے کسی ایک کے لیے ممکن نہیں ہے کہ وہ باقی خلفاء ثلاثہ کی عصمت کی نفی کرے۔ کسی کے لیے بھی یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اس فرق کا دعویٰ کر سکے۔ اور نہ ہی کسی ایک سے ایسا کوئی دعویٰ نقل کیا گیا ہے۔ پس یہ بات زمانہ نہیں جانتا کہ کسی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ یا بارہ اماموں میں سے کسی دوسرے امام کے معصوم ہونے کا دعویٰ کیا ہو۔ پس شیعہ کا یہ دعویٰ باطل

ٹھہرا کہ خلفاء ثلاثہ تو معصوم نہیں ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عصمت کے بارے میں اختلاف واقع ہوا ہے۔[البتہ جاہل امامیہ اس دعویٰ میں اسی طرح منفرد ہیں جس طرح گمراہ خوارج حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کافر قرار دینے میں اور نواصب آپ کو فاسق تصور کرتے ہیں]۔

چودھویں وجہ : ہم شیعہ سے کہیں گے کہ اب دو ہی صورتیں ممکن ہیں:

۱۔ ہر زمانے میں امام معصوم کا وجود ضروری ہے۔ ۲۔امام معصوم کا وجود ضروری نہیں۔

بصورت ثانی شیعہ کا قول باطل ٹھہرا۔اور اگر امام معصوم کا وجود ضروری ہے تو ہم اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ وہ معصوم علی رضی اللہ عنہ ہیں اور خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم معصوم نہیں ہیں۔ بخلاف ازیں اگر یہ نظریہ درست ہے تو معصوم صرف حضرت ابوبکر وعمر و عثمان رضی اللہ عنہم ہوں گے، اس لیے کہ اہل سنت ان کو بالاتفاق حضرت علی رضی اللہ عنہ سے افضل قرار دیتے ہیں اور اگر حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما معصوم ہونے کے زیادہ مستحق ہیں۔اگر یہ حضرات معصوم نہیں تو حضرت علی رضی اللہ عنہ بالاولیٰ معصوم نہیں ہو سکتے۔اگر یہ عصمت ممکن ہے تو پھر ان حضرات کے زیادہ قریب ہے۔ اور اگر ممکن نہیں تو پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی کافی دور ہے۔اہل سنت والجماعت میں کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہے جو حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کو چھوڑ کر صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کو معصوم مانتا ہو۔وہ اصحاب ثلاثہ سے صرف اسی صورت میں عصمت کی نفی کر سکتے ہیں جب یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی منفی ہو۔حضرت علی رضی اللہ عنہ کو چھوڑ کر ان تین خلفاء کے معصوم ہونے کی نفی کی جائے؛ اہل سنت والجماعت اس کو نہیں مانتے۔

اس کی نظیر یہ ہے کہ مسلمان موسیٰ وعیسیٰ علیہما السلام کی نبوت کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے پہلو بہ پہلو تسلیم کرتے ہیں۔ مسلمانوں میں کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کی نبوت کو مانتا ہو۔ بلکہ مسلمانوں اس شخص کے کافر ہونے پر اتفاق ہے جو بعض انبیاء کرام علیہم السلام کی نبوت کو مانتا ہو اور بعض کی نبوت کا انکار کرتا ہو۔اور جو کوئی ان دونبیوں کی نبوت کو مانے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا انکار کرے' وہ اس سے بڑا کافر ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو مانتا ہو مگر عیسیٰ یا موسیٰ علیہما السلام میں سے کسی ایک کی نبوت کا انکار کرتا ہو۔

اگر یہ کہا جائے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا ان دونوں سابقہ انبیاء پر ایمان لانے کو مستلزم ہے؛ تو پھر ایسے ہی ان دونوں انبیاء علیہما السلام پر ایمان محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایمان لانے کو مستلزم ہے۔یہی معاملہ نفی عصمت اور ثبوت ایمان وتقوی اور ولایت الٰہی کا ہے۔

اہل سنت والجماعت اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ایمان وتقوی اور ولایت کو اصحاب ثلاثہ کے ایمان وتقوی اور ولایت سے مقرون ومتصل مانتے ہیں۔اصحاب ثلاثہ سے جب عصمت کی نفی کی جائے گی تو اس کے پہلو بہ پہلو عصمت علی کو بھی رد کر دیا جائے گا۔اس کا معنی یہ ہے کہ اہل سنت والجماعت کے ہاں ان کے مابین اس طرح کا فرق باطل ہے۔

❀ شیعہ کا یہ قول کہ ''حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امامت اجماع سے ثابت ہے، مگر اصحاب ثلاثہ کی امامت اجماعاً ثابت نہیں۔''

❀ جواب: یہود کے اس قول سے بڑی حد تک ملتا جلتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت اجماع سے ثابت ہے جب کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اجماع سے ثابت نہیں۔ یا نصاریٰ کے اس قول کی مانند کہ محمد و موسیٰ علیہما السلام اجماع کی رو سے الٰہ نہیں مگر عیسیٰ الٰہ ہیں۔''

جب کہ مسلمان حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے الہ و معبود یا رب ہونے کی بھی اسی طرح ہی کرتے ہیں جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور جناب سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی الوہیت کی نفی کرتے ہیں۔ ایسا ہرگز ممکن نہیں ہے کہ موسیٰ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے تو الوہیت کی نفی کریں مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لیے اس کو ثابت مانیں۔ اگر نصرانی کہے کہ: ہمارا اتفاق ہے کہ یہ دونوں انبیاء [حضرت موسیٰ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم] الہ نہیں ہیں۔ اور اب ہمارا اختلاف صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق باقی رہ گیا۔ تو اللہ تعالیٰ کے لیے ضروری ہے کہ وہ بشر کی صورت میں ظاہر ہو؛ تو اب یہ مقام حضرت مسیح علیہ السلام کے علاوہ کسی کے لیے باقی نہیں رہا۔ یہ بالکل رافضی کی تقریر کی طرح ہے جو کہتا ہے: امام معصوم کا ہونا ضروری ہے' اور یہ مقام حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علاوہ کسی اور کے لیے نہیں ہوسکتا۔ ہم بداہۃً اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ حضرت عیسیٰ میں الوہیت کی ایسی کوئی خصوصیت موجود نہیں جو محمد و موسیٰ علیہ السلام میں موجود نہ ہو۔ اسی طرح ہمیں قطعیت کے ساتھ اس مسلمہ صداقت کا علم حاصل ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ میں ایسی کوئی مزیت نہیں پائی جاتی جس سے حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہ محروم ہوں۔ اور جو کوئی ان میں تفریق ڈالنا چاہیے ہم اسے روکیں گے۔ ہم کہیں گے کہ: ہم ہر دو طرح سے ان حضرات میں برابری چاہتے ہیں۔ اگر نفی ہے تو نفی میں اور اگر اثبات ہے تو اثبات میں۔

اگر کہا جائے کہ: تم تو تینوں خلفاء سے عصمت کی نفی کے قائل ہو تو؟

ہم کہیں گے: ہم ایسے ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھی معصوم نہیں مانتے۔

ہم شیعہ سے پوچھتے ہیں کہ انھیں یہ بات کیوں کر معلوم ہوئی کہ علی معصوم تھے اور ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہ معصوم نہ تھے؟

اگر شیعہ کہیں کہ ہمیں اجماع سے اس بات کا علم حاصل ہوا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سوا کوئی بھی معصوم نہ تھا۔

ہم اس کے جواب میں کہیں گے کہ: اگر اجماع دین میں حجت نہیں ہے تو شیعہ کا دعویٰ غلط ٹھہرا۔ اور اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عصمت کے اثبات میں اجماع حجت ہے جو کہ اصل ہے تو آپ کی عصمت سے جو چیز مقصود ہے یعنی شریعت کے حفظ و نقل کے بارے میں بھی اجماع حجت ہوگا۔ یہ عجیب بات ہے کہ شیعہ اجماع کو حجت قرار نہیں دیتے مگر اپنے نظریات کے اثبات میں اجماع سے احتجاج کرتے ہیں۔ تو پھر ان کو کیسے معلوم ہوگیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی معصوم ہیں دوسرا کوئی معصوم نہیں؟

[حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عصمت]:

❀ اگر شیعہ کہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا معصوم ہونا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے خبر متواتر سے ثابت ہے

❀ [جواب]: یہ دعویٰ تو اسی طرح ہے جیسے ان کا یہ دعویٰ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت نص سے ثابت ہے۔ تو اس صورت میں ان کے ہاں کوئی دوسری مستند دلیل نہ ہوگی۔

چوتھا جواب: مزید براں شیعہ کے نزدیک اجماع اس صورت میں حجت ہے جب اس میں معصوم کا قول ثابت ہو۔ اگر معصوم کی معرفت اجماع پر موقوف ہو تو دور لازم آئے گا۔ اس لیے کہ اس امام کا معصوم ہونا اس کے اپنے قول پر منحصر ہے۔ اور اس کے قول کا حجت ہونا اسی صورت میں پہچانا جاتا ہے جب یہ بات معلوم ہو کہ وہ معصوم ہے۔ لہٰذا دونوں میں سے کوئی بات بھی ثابت نہ ہوگی۔ تو اس سے امام کے معصوم ہونے کی ان کی حجت کا بطلان ثابت ہوگیا۔

اس سے یہ بھی اچھی طرح واضح ہوگیا کہ رافضیوں کے ہاں اس اصل میں کوئی مستند علمی دلیل ہی موجود نہیں کہ اجماع

حجت نہیں ہوتا۔ بلکہ ان کے ہاں اجماع اس وقت تک ممکن نہیں ہوسکتا جب تک اس میں امام معصوم شامل نہ ہو۔ بیشک حجت ان کے ہاں صرف واحد امام معصوم کا قول ہے۔ سو اس صورت میں انہیں ایک مستقل شخص کے علم کی ضرورت ہوگی؛ تاکہ پتہ چل سکے اس کا قول حجت ہے۔ پس جب وہ اجماع سے حجت پیش کریں تو اس سے شیعہ کے ہاں حجت اس وقت تک قائم نہیں ہوسکتی جب تک اس میں امام معصوم کا قول شامل نہ ہو۔ ان کے اس قول کا خلاصہ کلام یہ ہوگا کہ: 'فلاں شخص اس لیے معصوم ہے کہ اس نے کہا میں معصوم ہوں [اور میرے سوا کوئی بھی معصوم نہیں ہے۔'']

جب ان سے پوچھا جائے کہ: تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ یہی امام معصوم ہے؛ اس کے علاوہ کوئی اور معصوم نہیں ہے؟

تو اس کے جواب میں کہتے ہیں: اس لیے کہ اس نے کہا میں معصوم ہوں اور میرے سوا کوئی بھی معصوم نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر شخص یہ بات کہہ سکتا ہے یہ اسی طرح ہے جیسے کوئی شخص کہے'' میری ہر بات سچی ہے۔'' اگر اس کی سچائی اسی بات پر موقوف ہے تو اس کی صداقت معلوم نہ ہوگی۔

[حضرت علی رضی اللہ عنہ اور نص امامت؟]:

ان کی یہ دلیل بھی ان کے ملحدین بھائیوں اسماعیلیہ کی دلیل کی جنس میں سے ہے۔

اسماعیلیہ کا دعویٰ بھی اسی طرح ہے وہ کہتے ہیں کہ امام معصوم ہوتا ہے اور اس پر امامت کا نشان لگا ہوتا ہے۔ اسماعیلیہ کہتے ہیں حصول علم کا ذریعہ سمع وعقل ہے اور اس کی صحت نشان زدہ امام معصوم اور اس کی تعلیمات سے حاصل ہوتی ہے۔ جب کسی معین ومخصوص امام کے معصوم ہونے کی دلیل پوچھی جائے تو وہ اس کا جواب نہیں دے سکیں گے اور ثابت ہو جائے گا کہ ان کے قول میں تناقض پایا جاتا ہے۔ اگر ہم حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس قول پر عمل کرنے کے لیے تیار بھی ہوں کہ'' میں معصوم ہوں'' تو ہم شیعہ سے پوچھتے ہیں کہ یہ قول ان سے کس نے نقل کیا؟ بخلاف ازیں بتواتر آپ سے اس کے خلاف منقول ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے قاضیوں کو بتاکید حکم دیا تھا کہ ان کی رائے کے برخلاف فیصلہ صادر کریں، بہ نقل صحیح ثابت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''میری اور عمر رضی اللہ عنہ کی رائے اس بات پر متفق ہوگئی تھی کہ صاحب اولاد لونڈیوں کو فروخت نہ کیا جائے۔ اب میں ان کے فروخت کرنے کے حق میں ہوں۔''

یہ سن کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قاضی عبیدہ سلمانی نے کہا:

''حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ آپ کی متفقہ رائے ہمیں آپ کی انفرادی رائے سے عزیز تر ہے۔''[1]

قاضی شریح اپنے اجتہاد کے مطابق فیصلہ کیا کرتے تھے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مشورہ نہیں لیا کرتے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس ضمن میں ان کے مؤید تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے اجتہاد کے مطابق فتوی دیتے اور فیصلہ صادر کیا کرتے تھے، پھر اپنے اجتہاد ہی سے اپنے سابقہ فتویٰ سے رجوع کیا کرتے تھے۔ اس ضمن میں آپ کے اقوال باسانید صحیحہ ثابت ہیں۔

پھر نصوص کے مخالف آپ کے اتنے اقوال پائے جاتے ہیں کہ اتنے اقوال حضرت عمر اور حضرت رضی اللہ عنہما سے نصوص کے

[1] مصنف عبد الرزاق، (١٣٢٢٤)، کتاب الام للامام الشافعی (٧/ ١٥٧)، سنن کبریٰ، بیھقی (١٠/ ٣٤٨)۔

خلاف نہیں ملتے۔امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس سلسلہ میں ایک خاص کتاب جمع کی ہے جس میں حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے اقوال میں اختلاف کو جمع کیا گیا ہے۔ جب اہل عراق آپ سے مناظرہ کرتے تھے تو کہتے تھے: ''علی اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما نے یوں فرمایا۔'' ان دونوں حضرات کے قول سے دلیل لیتے ۔تو پھر امام شافعی نے ایک کتاب میں ان کے وہ اقوال جمع کر دیئے جو ان لوگوں نے چھوڑ دیئے تھے۔اس کے بعد محمد بن نصر المروزی نے کتاب ''رفع الیدین'' میں اس سے کئی گنا زیادہ متروکہ اقوال جمع کر دیئے ۔اس کی وجہ یہ ہوئی کو انہوں نے امام محمد بن نصر کے خلاف نماز میں رفع یدین کے مسئلہ میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے قول سے دلیل اختیار کی تھی۔

یہ کوفہ کے ان علماء کرام کے بارے میں کلام ہے جو شرعی دلائل سے استدلال کیا کرتے تھے جیسے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے اصحاب میں سے محمد بن الحسن رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے امثال ؛ اس لیے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے اکثر مناظرے محمد بن الحسن اور ان کے ساتھیوں کے ساتھ ہوا کرتے تھے۔آپ نے نہ ہی ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کو پایا اور نہ ہی کبھی ان سے مناظرہ کیا۔اور نہ ہی ان سے کوئی حدیث سنی۔ بلکہ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے عراق میں داخل ہونے سے پہلے ہی ہو چکا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ آپ کی کتابوں میں امام ابو یوسف کے اقوال امام محمد رحمہما اللہ کی سند کے ساتھ پائے جاتے ہیں۔

جب کہ روافض کی تہی دامنی کا یہ عالم ہے کہ امام علی رضی اللہ عنہ کے معصوم ہونے اور دوسروں سے عصمت کی نفی پر اپنے حق میں اپنے ہی اقوال سے استدلال کرتے ہیں ۔یعنی جہالت کو جہالت سے ثابت کرتے ہیں ۔

میں نے ان کے مشائخ کی کتابوں میں دیکھا ہے کہ جب ان کے مابین کسی مسئلہ میں دو اقوال پر اختلاف ہو جاتا ہے؛ ایک قول کا قائل معلوم ہو اور دوسرے کے قائل کو کوئی پتہ نہ ہو؛ تو ان کے ہاں وہ قول حق اور درست ہوگا جس کے کہنے والے کا کوئی پتہ نہ ہو؛[اس کی وجہ بتاتے ہوئے کہتے ہیں]: جب کسی قول کا قائل معلوم نہ ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ امام معصوم کا قول ہے۔کیا یہ بات انتہائی بڑی جہالت کے سوا بھی کچھ ہوسکتی ہے؟ انہیں یہ کیسے پتہ چل گیا کہ وہ دوسرا قول جس کا کوئی کہنے والا معلوم نہیں ؛ وہ امام معصوم کا قول ہے؟ بالفرض اگر امام معصوم کے وجود کو مان بھی لیا جائے تو پھر بھی یہ معلوم نہیں ہوسکتا کہ اس نے یہ کہا ہے ۔جیسا کہ اس کوئی اور دوسرا کہنے والا بھی موجود نہیں ہے۔اور اگر ایسے ہی ہے تو پھر وہ قول امام کا کیوں نہیں ہوسکتا جس کا کہنے والا معلوم ہے ؛ اور کسی دوسرے کے بارے میں علم ہے کہ فلاں آدمی نے یہ بات کہی ہے۔جیسا کہ دیگر بھی بہت سارے اقوال ایسے ہیں جن میں دوسرے لوگ بھی ان کی موافقت کرتے ہیں۔جب کہ دوسرے قول کے بارے میں کچھ معلوم نہیں کس نے کہا؛ اور کہنے والے کو پتہ نہیں کہ وہ کیا کہہ رہا ہے ؛ممکن ہے کہ یہ شیاطین جن وانس میں سے کسی ایک نے کہا ہو؟

پس رافضی کسی قول کے قائل اور اس کی صحت کا علم نہ ہونے کو اس قول کی صحت شمار کرتے ہیں۔جیسا کہ ان کا یہ قول ہے کہ: کسی دوسرے کے معصوم نہ ہونے کا علم ہونا ان کے امام کے معصوم ہونے کی دلیل ہے۔اور پھر یہ کہ جس بات کے کہنے والے کا کوئی پتہ نہ ہو تو اس کے بارے میں کہہ دیتے ہیں کہ یہ امام معصوم کا فرمان ہے۔ جو لوگ بھی اللہ تعالیٰ کی مبعوث کردہ انبیاء کرام علیہم السلام کی سنتوں کے نور سے اعراض کرے گا ان کا یہی حال ہوگا۔ وہ ایسی بدعات کی گہری کھائیوں میں جا گرے گا جس کے اندھیرے ایک دوسرے کے اوپر [یعنی بڑھ کر] ہوں گے ۔[اعاذنا اللہ من شرھم ؛ آمین]۔

فصل:

[امام کا تقرر کیسے ہوگا؟]

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:

''دوسری وجہ: یہ واجب ہے کہ خلیفہ و امام کا تقرر نص کی بنا پر ہو، اس لیے کہ ہم طریق انتخاب کا بطلان ثابت کر چکے ہیں۔ وجہ بطلان یہ ہے کہ بعض لوگ جو امام کو منتخب کرتے ہیں، وہ دوسرے لوگوں سے افضل نہیں ہیں جو کسی اور امام کا انتخاب عمل میں لاتے ہیں، ورنہ تنازع بپا ہو جائے گا، پس اس طرح امام کا انتخاب بہت بڑے فساد کا ذریعہ بنے گا۔ جب کہ ادنی سے درجہ کے فساد کو ختم کرنے کے لیے ہم نے امام کے متعین ہونے کو واجب کہا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سوا دوسرے ائمہ و خلفاء بالاتفاق منصوص علیہ نہ تھے، لہٰذا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سوا کوئی بھی امام برحق نہ ہوگا۔''

[جواب]: [اس رافضی مصنف کے مقدمات کے کئی ایک جواب ہیں]:

[پہلا جواب]: ہم ان دونوں مقدمات کو تسلیم نہیں کرتے۔ لیکن دوسرے مقدمہ میں پہلے مقدمہ کی نسبت اختلاف زیادہ واضح ہے۔ علمائے سلف و خلف محدثین و فقہاء اور اہل کلام رحمہم اللہ کی کئی جماعتوں کے نزدیک حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت نص سے ثابت ہے۔ ایک قلیل جماعت کے نزدیک حضرت عباس رضی اللہ عنہ بھی منصوص علیہ امام تھے۔ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے منصوص علیہ امام ہونے پر اجماع کیسے رہا؟ اور یہ کیسے ہوگیا کہ آپ کے علاوہ کوئی بھی منصوص علیہ امام نہ تھا؟ یہ ایک یقینی اور کھلا ہوا جھوٹ ہے۔

[دوسرا جواب]: اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علاوہ دوسرے لوگوں کے منصوص علیہ ہونے کی نفی پر کوئی اجماع نہیں ہے۔ یہ رافضی مصنف اگرچہ اپنی جنس کے لوگوں میں سے افضل اور چنیدہ قسم کے لوگوں میں شمار ہوتا ہے؛ لیکن یہ پورے کا پورا طائفہ ہی جاہل لوگوں پر مشتمل ہے۔ ورنہ جس کو لوگوں کے عقائد و نظریات کی معرفت حاصل ہو؛ اس انسان سے اس قسم کے دعوی کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

[تیسرا جواب]: اس موقع پر ہم ایک تیسرا جواب بھی دیتے ہیں۔ ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ دو ہی صورتیں ممکن ہیں:

(۱) خلیفہ کے تقرر میں نص معتبر ہے۔

(۲) خلیفہ کے تقرر میں نص معتبر نہیں ہے۔

بصورت اوّل ہم کہیں گے کہ پھر دوسرا مقدمہ ناقابل اعتبار ٹھہرا اور نص حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے حق میں ثابت ہے [نہ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں]۔ بصورت ثانی اگر نص معتبر نہیں تو شیعہ کا پہلا دعویٰ باطل ٹھہرا۔

[چوتھا جواب]: ہم کہتے ہیں کہ: شیعہ کے نزدیک امام معصوم کا قول حجت ہے اور اجماع حجت نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اثبات نص کے لیے امام معصوم کا قول ضروری ہوگا اور اس طرح نص ثابت ہوگی نہ امام کی معصومیت۔ بخلاف ازیں اس کی صورت منطقی اعتبار سے یوں ہوگی کہ جو انسان دعوی کرے گا کہ:

''میں امام معصوم ہوں اور میری امامت نصوص سے ثابت ہے؛ میں خود ہی معصومیت کی دلیل ہوں۔''
یہ دعویٰ کرنے والے کا قول حجت ہوگا؛ اگر چہ اس قول کا کہنے والا معلوم نہ ہو۔ یہ جہالت کی انتہاء ہے۔ یہ دلیل بھی اپنے سے پہلی دلیل کی مانند ہے۔

[پانچواں جواب]: ہم شیعہ سے پوچھتے ہیں کہ تمہارے اس قول کا کیا مطلب ہے کہ امام کا معصوم اور منصوص علیہ ہونا واجب ہے؟ آیا اس کا مطلب یہ ہے کہ نبی ﷺ بصراحت فرمائیں کہ فلاں شخص میرے بعد امام و خلیفہ ہوگا؛ اس کی بات سنو اور اطاعت کرو؟ تو صرف اس حکم کی بنا پر امامت ثابت ہو جائے گی؟ یا یہ کہ اس کی امامت اس وقت تک درست نہ ہوگی جب تک اس کی بیعت خلافت نہ کی جائے؟ پہلی صورت میں نص کا ہونا ضروری نہیں؛ اس صورت میں نص کے وجوب کو ہم تسلیم نہیں کرتے۔ شیعہ کا فرقہ زیدیہ اہل سنت کی طرح ایسی نص کا انکار کرتا ہے۔ زیدیہ ان شیعہ میں سے ہیں جو حضرت علی رضی اللہ عنہ پر کوئی بہتان یہ تہمت نہیں لگاتے۔

[حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی افضلیت]:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ''امام معصوم نہ ہونے کی صورت میں تنازع اور جھگڑا پیدا ہوگا۔''

[جواب]: ہم کہتے ہیں: ''جن نصوص سے نظر و استدلال کی بنا پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی افضلیت اور امامت ثابت ہوتی ہے، ان سے مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ تمام احکام پر ایسی نص جلی نہیں ہوتی کہ اسے ہر خاص و عام برابر سمجھ لے۔ جب ان امور کلیہ کی معرفت ہر زمانے میں واجب تھی؛ تو ان امور میں اتنی ہی نص کافی سمجھی جاتی ہے۔ تو پھر ایک جزوئی معاملہ یعنی امام کے نصب و تعین کے لیے یہ نص بدرجہ اولی کافی و وافی ہے۔ ہم اس سے پہلے بیان کر چکے ہیں کہ کلیات پر تو انبیاء کرام علیہم السلام سے نص ثابت ہو سکتی ہے مگر ہر ہر جزئیہ پر ایسی نصوص کا ثابت ہونا ناممکن ہے۔

جب اس جماعت کے کچھ لوگوں کی افضلیت کے دلائل صاف ظاہر تھے؛ اور یہ دلائل بھی موجود تھے کہ وہ دوسرے لوگوں سے خلافت کے زیادہ حق دار ہیں۔ تو پھر ان دلائل کی موجودگی خلیفہ کا نام لیکر متعین کرنے سے بے نیاز کرتی ہے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی افضلیت اور خلافت کے مستحق ہونے کے دلائل انتہائی صاف واضح اور ظاہر ہیں۔ ان میں کسی صحابی نے کوئی اختلاف نہیں کیا۔ جن انصار نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے اختلاف کیا تھا وہ اس بات کے ہرگز منکر نہیں تھے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مہاجرین میں سے افضل ترین ہستی ہیں۔ ان کا اختلاف صرف یہ تھا کہ ایک خلیفہ مہاجرین میں سے ہونا چاہیے اور ایک خلیفہ انصار میں سے۔

[چھٹا جواب]: ان سے کہا جائے گا کہ: احکام پر نص دو طرح کی ہوتی ہے:

۱۔ نص کلی: جو عام ہو اور اس کے تمام اعیان کو شامل ہو۔

۲۔ نص جزئی: جو جزئیات کو شامل ہو۔

آپ کہتے ہیں کہ امام کے لیے نص کا موجود ہونا ضروری ہے۔ اگر تمہاری مراد نص کلی اور عام مراد ہے یعنی امام کے لیے کیا شروط ہیں؛ اس پر واجب کیا ہے؛ اور امام کے لیے کیا واجب ہے۔ جیسے کہ حکام؛ مفتیان؛ شہود؛ نماز پڑھانے والے ائمہ؛

مؤذنین اور جہاد کے لیے امراء کے لیے شروط ہیں؛ اور ان کے علاوہ دوسرے لوگوں کے لیے کیا شروط ہیں جو مسلمانوں کے معاملات میں ان کی بات مانیں گے اور ان کے نقش قدم پر چلیں گے؛ تو الحمد للہ یہ نصوص ثابت ہیں۔ جیسا کہ باقی تمام احکام کی نصوص ثابت ہیں۔

اور اگر آپ یہ کہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ: والی یا خلیفہ بننے والے افراد کا متعین کیا جانا ضروری ہے۔'' تو اس کا جواب یہ ہے کہ: قبل ازیں ہم بیان کر چکے ہیں کہ احکام کی جزئیات پر نص کا ہونا واجب نہیں۔ بلکہ ایسا کیا جانا ممکن ہی نہیں۔

منصب امامت بھی من جملہ احکام میں سے ایک حکم ہے۔ اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ قیامت تک آنے والے مسلمان حکمرانوں کو نصوص کے ذریعہ متعین کیا جانا نہ ہی ایسا ہوا ہے اور نہ ہی ایسا ہونا ممکن ہے۔ کسی متعین امام کی طرف سے کسی دوسرے کو امام متعین کرنے کی نص صرف اس متعین شخص تک محدود ہوگی تمام معینین کو شامل نہیں ہوگی ❀۔

اس صورت میں ان سے کہا جائے گا کہ: امام کا منصوص علیہ ہونا ممکن ہے۔ اور یہ نص ان کو بھی تفویض ہوسکتی ہے جو اس کے بعد خلیفہ یا نائب مقرر ہوگا۔ اور یہ بھی ممکن ہوسکتا ہے کہ [یہ پہلا حاکم] اپنے بعد اپنا نائب مقرر کرے۔ یا کسی کو اپنا وزیر مقرر کرے۔ اس صورت میں نص اپنے مقصد میں زیادہ بلیغ ہوگی۔

مزید برآں یہ کہ وہ متعین منصوص علیہ امام کیا اپنے بعد کسی کو متعین کرنے میں بھی معصوم ہے یا اس میں معصوم نہیں؟

اگر اس میں معصوم ہے تو اس سے لازم آتا ہے کہ اس کے تمام نائبین بھی معصوم ہوں۔ یہ تمام باتیں ضروری طور پر باطل ہیں۔ اگر ایسا نہیں تو پھر یہ ممکن ہے کہ امام اپنے بعد کسی غیر معصوم کو اپنا نائب مقرر کردے۔ جب غیر معصوم نائب مقرر ہوگئے تو پھر امام معصوم کے وجود سے باقی تمام زمانے کے لوگوں کو کچھ بھی فائدہ حاصل نہ ہوا۔

اگر [شیعہ کی طرف سے] یہ کہا جائے کہ امام اپنی زندگی کے بعد نائب مقرر کرنے میں معصوم ہے؛ جب کہ اپنی زندگی میں ایسا کرنا ضروری نہیں۔

تو اس کے جواب میں کہا جائے گا: ضرورت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ امام اور اس کا نائب دونوں معصوم ہوں۔ اور جو آدمی امام کے پاس حاضر اور موجود ہو اس کے بارے میں مستقبل میں آنے والے کی نسبت زیادہ علم ہوتا ہے۔ تو پھر آنے والا کیسے معصوم ہوسکتا ہے جب کہ جو حاضر اور موجود ہے وہ معصوم نہیں ہے؟

اگر یہ کہا جائے کہ: نص کا ہونا ممکن ہے؛ اس لیے کہ نبی کریم ﷺ نے نص کے ذریعہ نائب مقرر کیا تھا۔

تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ: نبی کریم ﷺ کا اپنے بعد [کسی متعین] خلیفہ مقرر کرنا ایسے ہی ہے جیسے اپنی زندگی میں کسی کو اپنا نائب مقرر کرنا۔ لیکن ہم ان میں سے کسی ایک کے لیے بھی معصوم ہونے کی شرط نہیں لگاتے۔

[ساتواں جواب]: ان سے کہا جائے گا کہ: تم شیعہ کے نزدیک نص کا وجود قطع نزاع کے لیے ضروری ہے، تاکہ اس سے کوئی ایسا بڑا فساد پیدا نہ ہو۔ جس فساد کو ختم کرنے کے لیے آپ نے امام کے متعین ہونے کو واجب کہا ہے۔

❀ [وضاحت: مطلب یہ ہے کہ جب کوئی حاکم اپنے بعد کسی دوسرے کو اپنا نائب یا حاکم مقرر کردے؛ تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ قیامت تک تمام آنے والے حکمرانوں کو متعین کرسکتا ہے۔ بلکہ یہ حکم صرف اس متعین فرد تک محدود ہوگا جسے اس پہلے حاکم نے اپنی جگہ کیلئے منتخب کیا ہے۔ (دراوی جی)]

مگر یہاں تو معاملہ اس کے برعکس ہوا۔ حضرت ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین کے بعد دیگرے منصب خلافت پر فائز ہوئے مگر کوئی فساد و نزاع نہ ہوا۔ فتنہ و فساد کا آغاز اس امام کے وقت میں شروع ہوا جو بقول شیعہ امام منصوص و معصوم تھے۔ آپ کے خلیفہ قرار پائے جانے کے بعد تو فتنہ بازی اوج کمال پر پہنچ گئی۔ تو جس کم درجہ کے فساد کو ختم کرنے کے لیے تم نے امام کو متعین کرنا واجب قرار دیا تھا؛ گویا کہ امام معصوم سے جو مقصود تھا وہ حاصل نہ ہوا بلکہ جس چیز کے لیے تم نے نصب امام کو وسیلہ بنایا تھا اس مقصود کا الٹ حاصل ہوا۔ اور تمہارے اس وسیلہ کے بغیر یہ مقصود [پہلے تین خلفاء کے دور میں] حاصل ہو گیا۔ پس جو وسیلہ تم نے اپنے دعووں میں ذکر کیا تھا وہ سب باطل ٹھہرا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے اپنی طرف سے اللہ تعالیٰ پر وہ چیزیں واجب کر دیں جو کہ اس پر واجب نہیں تھیں۔ اور ایسی چیزوں کی خبریں دینے لگے جن کا کوئی وجود واقع ہی نہیں ہوا تھا۔ ان کے اس جھوٹ اور جہالت کی وجہ سے ان کے اقوال میں تناقض کا لازم آنا ناگزیر ہو گیا تھا۔

[آٹھواں جواب]: ہم کہتے ہیں کہ: کسی امام کے بارے میں وجود نص سے فساد کا ازالہ ہو جاتا ہے۔ نص کے متعدد طرق ہیں:

۱۔ نص کا ایک طریق یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کسی شخص کی خلافت کے بارے میں پیش گوئی فرمائیں اور اس کی تعریف کریں۔ امت کو اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اگر یہ شخص مسند امارت پر فائز ہوا تو لوگوں کے حق میں مفید ثابت ہو گا۔ بلاشبہ اس سے نزاع اٹھ جاتا ہے۔ اگرچہ آپ یہ نہیں فرماتے کہ فلاں شخص کو امام مقرر کر لو۔ ظاہر ہے کہ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں آپ ﷺ نے ایسی پیش گوئی فرمائی تھی۔

۲۔ نص کا دوسرا طریق یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ ایسے امور کی پیش گوئی فرمائیں جو کسی شخص کی خلافت و امارت کی عمدگی کی دلیل ہوں جیسے آپ نے فارس[1] و روم کے فتح ہونے کی بشارت دی تھی۔[2] جو خلافت صدیقی و فاروقی میں پوری ہوئی ہیں۔

۳۔ تیسرا طریقہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ اپنے بعد میں آنے والے کو کسی شخص کے پاس جانے کا حکم دیں، یہ حکم اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہ شخص خلیفہ ہو گا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ واقعہ پیش آ چکا ہے۔

۴۔ چوتھا طریقہ یہ ہے کہ آپ خلافت کے بارے میں ایک عہد نامہ لکھنا چاہتے ہوں اور جب اس کی تکمیل نہ ہو سکے تو فرمائیں: ''اللہ تعالیٰ اور مومن ابوبکر رضی اللہ عنہ کے سوا کسی کو خلیفہ تسلیم نہیں کر سکتے۔''[3]

جیسے آپ نے فرمایا تھا، اسی طرح وقوع پذیر ہوا۔

۵۔ پانچواں طریقہ: نبی کریم ﷺ اپنے بعد کسی شخص کی پیروی کا حکم صادر کریں اور وہ منصب خلافت پر فائز بھی ہو جائے۔

۶۔ چھٹا طریقہ یہ ہے کہ آپ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم اجمعین کی سنت کی پیروی کا حکم دیں اور ان کی مدت خلافت کی تعیین کر دیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مدت کے اندر اندر جو لوگ منصب امامت پر فائز ہوں گے وہ خلیفہ راشد اور

---

[1] صحیح بخاری، کتاب فضائل المدینۃ۔ باب من رغب عن المدینۃ، (حدیث: ۱۸۷۵)، صحیح مسلم، کتاب الحج، باب ترغیب الناس فی المدینۃ (حدیث: ۱۳۸۸)

[2] مسند احمد (۵/ ۲۸۸)

[3] صحیح مسلم۔ کتاب فضائل الصحابۃ، باب من فضائل ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہ (حدیث: ۲۳۸۷)۔

ہدایت یافتہ ہوں گے۔

۷۔ ساتواں طریقہ یہ ہے کہ آپ کسی شخص کو چند باتوں کے ساتھ مختص کر دیں جو اس بات کی مقتضی ہوں کہ یہ سب پر فائق ہے، یہ صفت صرف ابوبکر میں موجود تھی۔

[نواں جواب]: یہ ہے کہ ترک نص رسول کے لیے موزوں تر ہے۔ اس لیے کہ اگر نص معصوم کے حق میں ہو تو نبی کریم ﷺ کے بعد کوئی شخص معصوم نہیں۔ اور اگر غیر معصوم کے حق میں ہو تو اس کی ہر بات کے واجب الاطاعت ہونے میں بعض اوقات نص سے احتجاج کرنا پڑتا ہے۔ حالانکہ رسول ﷺ کی وفات کے بعد اس بات کا امکان باقی نہیں رہتا کہ آپ سے مراجعت کر کے اس امام وخلیفہ کی بات کو مسترد کر دیا جائے یا اسے معزول کیا جائے۔ اس لیے منصوص علیہ خلیفہ کا نہ ہونا اس کے ہونے سے بہتر تھا۔ یہ اس کے برعکس ہے جس کو رسول اللہ ﷺ اپنی زندگی میں نائب یا والی مقرر کریں۔ اس لیے کہ جس شخص کو نبی کریم ﷺ اپنی زندگی میں تعینات کریں؛ اس لیے کہ اگر اس سے کوئی گناہ ہو جائے یا غلطی ہو جائے تو ممکن ہے کہ آپ اسے غلطی پر متنبہ کر سکیں گے اور اسے اس منصب سے معزول بھی کر سکیں گے۔ جب کہ موت کے بعد ایسا کرنا ممکن نہیں۔ اور امت کے لیے بھی اس امام یا نائب کو معزول کرنا ممکن نہیں رہے گا؛ اس لیے کہ اسے رسول اللہ ﷺ نے متعین کیا ہے۔ پس کسی متعین شخص پر نہ ہونا مسلمانوں کے لیے زیادہ بہتر اور مصلحت پر مبنی تھا۔ اور ایسے ہی ہوا۔ اگر رسول اپنے بعد کسی کو بصراحت اس بات کے لیے مقرر فرمائیں کہ ہم اس سے دین اخذ کریں؛ جیسے رافضی کہتے ہیں؛ تو اللہ کی حجت باطل ٹھہرے گی اور رسول کے سوا دوسرا کوئی شخص اس کا اہل بھی نہیں ہو سکتا کیوں کہ معصوم صرف رسول ہی ہوتا ہے دوسرا کوئی شخص معصوم نہیں ہوتا۔

جو شخص ان باتوں پر اور دوسرے امور پر غور کرے گا اسے علم ہو جائے گا کہ جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی محمد ﷺ کے لیے اختیار کیا تھا وہ زیادہ کامل واکمل امور تھے۔

[جزئیات کی تنصیص ممکن نہیں]:

[دسواں جواب]: جزئیات کی تنصیص ممکن نہیں اور کلیات قبل ازیں منصوص ہیں۔ اگر رسول کسی مخصوص آدمی کو اس منصب پر مقرر کر دیتے اور کلیات کی تنصیص میں اس کی اطاعت کا حکم صادر کرتے تو یہ باطل ہوتا۔ اور اگر جزئیات میں اس کی اطاعت کا حکم دیتے؛ خواہ وہ جزئیات کلیات کے موافق ہوں یا مخالف تو یہ بھی باطل ہوتا۔ اور اگر جزئیات میں اس کی اطاعت اس صورت میں ضروری ٹھہرائی جائے جب وہ کلیات سے ہم آہنگ ہوں؛ تو ہر والی ایسا حکم صادر کرتا ہے۔

اور اگر رسول ﷺ تصریحاً بھی کسی متعین شخص کو اس منصب پر مقرر کر دیتے؛ تو جو اس کے بعد امام یا خلیفہ بنتا؛ اس کے ساتھ کوئی نص نہ ہوتی۔ تو کوئی بھی خیال کرنے والا یہ خیال کرتا کہ اس کی اطاعت امام سابق کی طرح نہیں کی جا سکتی، کیوں کہ پہلے امام کی اطاعت نص کی روشنی میں واجب تھی جب کہ دوسرے امام کی امامت کسی نص قطعی سے ثابت نہیں ہوئی۔

اگر یہ کہا جائے کہ ہر امام اپنے بعد والے امام کا ذکر تصریحاً کرتا ہے تو یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب دوسرا امام معصوم ہو۔ حالانکہ نبی کریم ﷺ کے بعد کوئی شخص معصوم نہیں۔ بنا بریں قول بالنص عصمت امام کے عقیدہ کی فرع ہے۔ اس قول کا

فاسد ترین قول ہونا صاف ظاہر ہے۔

اسی طرح اس سے مراد یہ ہوسکتی ہے کہ روافض جس نص کے دعوے دار ہیں کہ حاکم و امیر کی ہر بات واجب الاطاعت ہوا کرتی ہے اور اختلاف کے وقت اسے کتاب و سنت کے معیار پر رکھ کر پرکھنے کی ضرورت نہیں، یہ بھی فاسد ہے۔ اگر ہم ارشاد باری کے مطابق اختلاف کے وقت اپنے قول کو کتاب و سنت پر پرکھ کر دیکھیں تو نص کی حاجت باقی نہیں رہتی۔ اس لیے کہ دین محفوظ ہے۔ اور دین ان حکام یا ولاۃ کے بغیر بھی محفوظ رہے گا۔

خلاصہ کلام! کسی متعین شخص پر نص کے ہونے سے: اگر یہ مراد ہے کہ اس منصوص علیہ کی اس طرح اطاعت کی جائے جیسے رسول اللہ ﷺ کی اطاعت ان کے ہر حکم و نہی میں اور مباح میں کی جاتی ہے؛ اور کسی ایک کو اس سے اختلاف کرنے کا حق حاصل نہیں؛ جس کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اختلاف کرے؛ اور اس کے احکام کو ہر صورت میں نافذ کیا جائے؛ اور امت اس کے ساتھ اس طرح رہے جیسے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھی؛ تو ایسا رسول اللہ ﷺ کے بعد کسی کے لیے نہیں ہوسکتا: اور نہ ہی کسی دوسرے کے لیے ایسا ممکن ہے۔ اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد کسی ایک پر بھی وحی نہیں آتی جیسا کہ آپ ﷺ پر وحی آیا کرتی تھی۔ اور آپ کے بعد کسی کو ہر ایک چیز کا علم ایسے حاصل نہیں ہے جیسے رسول اللہ ﷺ کو حاصل تھا۔ تو اس کی اطاعت کی کوئی راہ باقی نہ رہی؛ نہ ہی اپنی جہت سے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے۔

اور اگر اس نص سے مراد یہ لی جائے کہ آپ ﷺ امت کے لیے بیان فرمادیں کہ یہ انسان تمہارا والی بننے میں دوسروں کی نسبت زیادہ حق دار ہے۔ اور اس کی ولایت و امامت اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ہاں زیادہ محبوب اور پسندیدہ ہے۔ اور تمہارے لیے تمہاری دنیا اور دین دونوں اعتبار سے زیادہ بہتر اور مصلحت پر مبنی ہے۔ یا اس طرح کا کوئی دیگر کلام ارشاد فرمادیں جس سے ظاہر ہوتا ہو کہ خلافت نبوت میں فلاں شخص دوسروں کی نسبت زیادہ حق دار ہے۔ تو پھر اس میں کوئی شک نہیں کہ اس طرح کی بہت ساری نصوص حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے بارے میں وارد ہوئی ہیں۔

اور اگر اس سے مراد یہ لی جاتی ہے کہ آپ ﷺ نے انہیں اس امام کی اتباع کرنے کا حکم دیا تھا جیسے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کو حکم دیا تھا کہ وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اتباع کریں۔ اور اس بارے میں امت سے کوئی عہد بھی لیا تھا۔ جب اس کے بارے میں معلوم ہوجائے کہ امت ایسا ہی کرے گی تو پھر اس عہد کا ترک کرنا ہی بہتر تھا۔ اور اگر آپ کو اندیشہ ہو کہ امت آپ کے حکم کے بغیر ایسا نہیں کرے گی؛ تو پھر حکم دینا زیادہ اولیٰ تھا۔

یہی وجہ ہے کہ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خوف محسوس ہوا کہ آپ کے بعد امت میں اختلاف پیدا ہوجائے گا تو آپ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لیے عہد لے لیا [انہیں اپنا ولی عہد مقرر کردیا]۔ اور جب رسول اللہ ﷺ کو معلوم ہوگیا تھا کہ امت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کرلے گی تو پھر آپ نے اس بارے میں کوئی حکم جاری نہ فرمایا۔

صحیحین میں ہے آپ ﷺ نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا: ''اپنے باپ اور بھائی کو بلاؤ تاکہ میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ایک عہد نامہ لکھ دوں۔'' پھر فرمایا: اللہ تعالیٰ اور مسلمان ابوبکر رضی اللہ عنہ کے سوا کسی کو خلیفہ تسلیم نہیں کریں گے۔''❶

❶ صحیح مسلم (حدیث: ۲۳۸۷) واللفظ له۔ صحیح بخاری۔ ك (حدیث: ٥٦٦٦) سبق تخریجه۔

آپ ﷺ کو معلوم ہوگیا تھا کہ اللہ تعالیٰ ابو بکر رضی اللہ عنہ کے علاوہ کسی کو خلیفہ نہیں بنائے گا۔ اور اہل ایمان ابو بکر رضی اللہ عنہ کے علاوہ کسی کی بیعت نہیں کریں گے۔ ایسے ہی ساری صحیح احادیث دلالت کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو یہ معلوم ہوگیا تھا۔ بیشک علم ہو جانے کے بعد حکم کا ترک کرنا افضل تھا۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے کیا تھا۔ اس لیے کہ امت آپ ﷺ کی طرف سے لازم کیے بغیر اگر اپنی مرضی سے ہی آپ کو منتخب کرلے گی تو یہ بہت اچھا ہوگا؛ اور اللہ اور اس کا رسول ﷺ اس پر راضی ہیں؛ اس لیے کہ آپ سب امت میں سے افضل انسان تھے۔ آپ کا علم و دینداری اس کی واضح دلیل ہیں۔

اس لیے کہ اگر امت پر اس امر کو لازم کردیا جاتا تو یہ بھی کہا جاسکتا تھا کہ امت کو حق ماننے پر مجبور کیا گیا۔ امت آپ کو منتخب نہیں کرنا چاہتی تھی؛ جیسا کہ بنی اسرائیل میں ہوا کرتا تھا۔ تو کوئی بدگمانی کرنے والا یہ بھی کہہ سکتا تھا کہ ابھی تک ان لوگوں میں جاہلیت کا عنصر یعنی نسب کی وجہ سے مقدم کرنے کی روش باقی ہے۔ اور امت صرف ان لوگوں کو منتخب کرنا چاہتی تھی جو بنو عبد مناف سے تعلق رکھتے ہوں۔ جیسا کہ ابوسفیان اور دوسرے لوگوں کی رائے تھی۔ اگر مہاجرین و انصار پر اس امر کو لازم کر دیا جاتا؛ تو کوئی بھی کہنے والا کہہ سکتا تھا کہ یہ بالکل ابوسفیان اور اس کے امثال کے فعل کی جنس سے ہے۔

لوگ اولاً و آخراً نبی کریم ﷺ کے ساتھ ابو بکر رضی اللہ عنہ کے اختصاص؛ اور آپ کے ساتھ ظاہری و باطنی موافقت کو اچھی طرح سے جانتے تھے۔ کوئی کہنے والا یہ بھی کہہ سکتا تھا: یہ لوگ باطن میں اس کو ناپسند کرتے تھے کہ ان پر کوئی ایسے حکم چلائے جیسے انہیں رسول اللہ ﷺ حکم دیا کرتے تھے۔ لیکن جب رسول اللہ ﷺ نے ان پر اس کو لازم کردیا تو پھر وہ اس کو ماننے کے لیے مجبور ہوگئے۔ [تو اس صورت میں] اگرچہ اور کچھ بھی نہ ہوتا تو پھر بھی رسول اللہ ﷺ کی اطاعت گزاری پر ان کی مدح و تعریف کی جاتی۔

تو پھر جب انہوں نے بغیر اس کے کہ ان پر لازم کیا جائے؛ اپنی مرضی اور اختیار سے ایسے آدمی کو خلیفہ چن لیا جس پر اللہ اور اس کا رسول راضی ہوں؛ یہ بات اللہ کے ہاں ان کی بہت بڑی قدر و منزلت اور اعلیٰ درجات اور بہت بڑے ثواب کی دلیل ہے۔ اور جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے اور اس کے رسول ﷺ نے اہل ایمان کے لیے اختیار کرلیا تھا؛ وہ ان [عوام اور خلیفہ] کے حق میں سب سے بہتر اور افضل تھا۔

ذرا غور تو کیجیے! رسول اللہ ﷺ نے زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو امیر سریہ مقرر فرمایا۔ اور پھر ان کے بعد ان کے بیٹے حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو امیر بنایا۔ بعض لوگوں نے اس پر اعتراض کیا۔ مگر اس کے باوجود وہ [اللہ اور اس کے رسول اور] ان امراء کی اطاعت پر کاربند رہے۔ پس اگر امت پر لازم کردیا جاتا کہ ان میں سے کسی ایک کو امیر مقرر کیا جائے۔ تو کوئی یہ بھی گمان کرسکتا تھا کہ ایسی بات ان کے دلوں میں بھی تھی۔ پھر اس سے ان لوگوں کے ہاں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی کوئی اس طرح کی خاص منزلت باقی نہ رہتی کہ اس میں کوئی بھی انسان بات نہ کرسکتا۔

جب لوگ خود آپ رضی اللہ عنہ کی بیعت پر متفق ہوگئے اور مہاجرین و انصار میں سے کسی ایک نے بھی یہ دعوی نہ کیا کہ میں صدیق رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر خلیفہ بننے کا حق دار ہوں۔ اس لیے کہ انصار نے شروع میں جو اختلاف کیا تھا؛ وہ اختلاف حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے ساتھ نہیں تھا۔ بلکہ ان کا مطالبہ یہ تھا کہ ایک امیر قریش میں سے ہو؛ اور ایک امیر انصار میں سے۔

یہ اختلاف تمام قریش کے ساتھ عام تھا۔ جب ان کے سامنے دلیل کی روشنی میں واضح ہوگیا کہ امارت وخلافت قریش کا حق ہے؛ تو انہوں نے اپنے اختلاف کو ختم کردیا۔ اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں سے کہا تھا:

''ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ یا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ میں سے کسی ایک کی بیعت کرلو۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''بلکہ آپ ہمارے سردار ہیں اور ہم میں سب سے بہتر ہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی سب سے زیادہ آپ کو چاہتے تھے۔ اللہ کی قسم! اگر میری گردن ماردی جائے' تو مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں ہوگی؛ اور یہ میرے نزدیک اس بات سے زیادہ پسندیدہ ہے کہ مجھے اس قوم پر امیر بنادیا جائے جس میں ابوبکر رضی اللہ عنہ موجود ہوں۔''[1]

اور آپ [حضرت عمر رضی اللہ عنہ] نے سب لوگوں کی موجودگی میں ارشاد فرمایا تھا:

''آپ ہمارے سردار ہیں' اور ہم سب سے بہتر ہیں۔ اور ہم سب سے بڑھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو محبوب ہیں۔''[2]

پھر اس کے بعد لوگوں نے بغیر کسی لالچ کے؛ بغیر کسی خوف کے؛ اور بغیر کسی رشوت کے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کی۔ ان لوگوں نے آپ کی بیعت کی جنہوں نے درخت کے نیچے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کی تھی۔ اور جن لوگوں نے عقبہ کی رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کی تھی۔ اور جنہوں نے ہجرت کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کی تھی۔ اور ان لوگوں نے بھی بیعت کی جنہوں نے ہجرت کے بغیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر اسلام قبول کرتے ہوئے بیعت کی تھی۔ جیسے طلقاء مکہ؛ اور دوسرے حضرات۔

ان میں سے کسی ایک نے بھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر امر خلافت کا حق دار ہوں۔ اور نہ ہی آپ کی بیعت کرتے ہوئے کسی ایک نے یہ کہا کہ: ''فلاں آدمی آپ سے زیادہ اس امر کا حق دار تھا۔''

بیشک بعد میں جن لوگوں نے یہ بات کہی کہ: آل بیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے زیادہ حق دار تھے؛ ان میں جاہلیت کے عربی اور فارسی فرق کا اثر باقی تھا۔ لیکن اتنا فرق ہے کہ جاہلیت میں عرب رؤساء کے اہل بیت کو مقدم سمجھا جاتا تھا اور اہل فارس میں بادشاہ کے اہل بیت کو مقدم سمجھا جاتا تھا۔

بعض لوگوں سے اس قسم کی باتیں نقل کی گئی ہیں؛ جیسے حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ وغیرہ۔

اس رائے کا اظہار کرنے والے کی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کوئی غرض نہ تھی۔ بلکہ اس کی رائے کی روشنی میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نسبت خلافت کے زیادہ حق دار تھے۔ اگر یہ بات تسلیم بھی کر لی جائے کہ آپ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ہی ترجیح دیتے تھے۔ تو اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ آپ جانتے تھے کہ اسلام میں تقویٰ اور ایمان داری کو نسب پر ترجیح حاصل ہے۔ تو آپ کا خیال یہ تھا کہ اس سے جاہلیت اور اسلام کے حکم کے مابین یگانگت قائم ہوجائے گی۔

مگر جو لوگ صرف اور صرف اسلام کے مطابق چلنا چاہتے تھے' اور اسلام کے علاوہ کسی حکم پر راضی نہیں تھے؛ یعنی ایمان اور تقویٰ کو ہی مقدم کرنا جانتے تھے؛ ان میں سے دو افراد نے بھی ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت پر اختلاف نہیں کیا۔ نہ اس قول کے قائلین نے اختلاف کیا اور نہ ہی کسی دوسرے نے کہ ان لوگوں میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر مضبوط ایمان اور تقویٰ والا

---

[1] بخاري، باب قول النبي صلى الله عليه وسلم "لو كنت متخذا خليلا" (ح:٣٦٦٨)۔ [2] البخاري ٥/ ٧۔

کوئی انسان ان میں موجود ہو۔تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو اپنے اختیار سے اور اطاعت گزاری کے ساتھ ان لوگوں نے باقی امت پر مقدم کیا۔ پس لوگوں کو آپ کو خلافت کے لیے مقدم کرنا آپ کے کمال ایمان وتقوی اور لوگوں کی آپ کی اطاعت گزاری کی دلیل ہے۔اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے بھی اپنے نبی کو تقوی کی بنیاد پر تقدیم کے پیغام کے ساتھ مبعوث کیا تھا۔اس لیے اللہ تعالیٰ جو چیز [یعنی ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خلافت وامامت] اپنے نبی اور اس کی امت کے لیے اختیار کی تھی ؛ وہ ان سب کے حق میں افضل و بہتر تھی۔پس اللہ تعالیٰ ہی کے لیے تمام تر تعریف ہے کہ اس نے اس امت کو ہدایت بخشی ۔اور ہمیں ان کے اطاعت گزاروں میں سے بنایا۔

فصل:

امام معصوم کا تصور اور فہم کتاب وسنت

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:

''تیسری بات یہ ہے کہ: امام کا حافظ شرع ہونا ضروری ہے، اس لیے کہ وحی ختم ہو چکی ہے اور کتاب وسنت میں ان جزئیات کی تفصیل نہیں ہے جو قیامت تک پیش آنے والے ہیں۔لہٰذا ایک منصوص من اللہ امام کا وجود ناگزیر ہے، جو خطاء اور کجی سے معصوم بھی ہو، تاکہ شرعی احکام میں عمداً یا سہواً کمی بیشی نہ کردے۔یہ ظاہر ہے کہ بالا جماع حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سوا دوسرا کوئی شخص ان صفات کا حامل نہ تھا۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جواب]: پہلی وجہ : ہم اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ امام کا حافظ شریعت ہونا ضروری ہے۔بخلاف ازیں امت کا حافظ شرع ہونا ضروری ہے۔یہ مقصد جس طرح ایک سے حاصل ہوتا ہے اجتماعی طور پر بھی حاصل ہوسکتا ہے۔بلکہ اہل تواتر کا شریعت کو نقل کرنا ایک شخص کے نقل کرنے سے بہتر ہے۔جب اگر ہر گروہ میں سے ایک جماعت کے روایت نقل کرنے سے حجت قائم ہو جاتی ہے؛ تو اس سے مقصود حاصل ہو جاتا ہے۔

تمام بنی آدم کے ہاں اہل تواتر کے نقل کرنے میں اتنی بڑی عصمت پائی جاتی ہے کہ ایسی عصمت انبیاء کرام علیہم السلام کے علاوہ کہیں بھی نہیں پائی جاتی۔اگر حضرت ابو بکر وعمر وعثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم اجمعین کے بارے میں اگر کہا جائے کہ یہ معصوم ہیں' تو جو کچھ باقی مہاجرین وانصار کی جماعت نے نقل کیا وہ ان کی نقل سے زیادہ بلیغ ہے۔

مزید برآں کہ [جب نقل کرنے والا ایک ہو تو] بہت سارے لوگ ناقل کی عصمت پر تنقید کرتے ہیں؛ تو اس سے مقصود حاصل نہیں ہوتا۔تو پھر اس صورت میں کیا کہا جاسکے گا جب کسی راوی کو امت کے بہت سارے لوگ کافر کہتے ہوں؟

جب بہت سارے خبر دینے والے لوگ کسی چیز کے بارے میں خبر دے رہے ہوں تو اسے مقصودِ تواتر حاصل ہو جاتا ہے اگر چہ ان کی عدالت کے بارے میں علم نہ بھی ہو۔

دوسری وجہ : ان سے پوچھا جائے گا کہ: کیا تمہاری مراد یہ ہے کہ امام کو شریعت کا محافظ ہونا چاہیے؛ اگرچہ وہ معصوم نہ بھی ہو؟ یہ شریعت کا محافظ صرف وہی ہوسکتا ہے جو معصوم بھی ہو؟ اگر اس کے جواب میں وہ کہیں کہ معصوم ہونا شرط

ہے؛تو یہ پہلی وجہ ہے؛ اس کا جواب کئی بار گزر چکا ہے۔ اور اگر کہیں کہ صرف شریعت کی حفاظت شرط ہے تو پھر ہم اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کتاب و سنت کے سب سے بڑے محافظ تھے؛ اور ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما سے بڑے عالم تھے۔ بلکہ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما آپ سے بڑھ کر عالم دین تھے۔لہٰذا شیعہ کا اجماع کا دعوی باطل ٹھہرا۔

تیسری وجہ: ان سے پوچھا جائے گا کہ: کیا آپ محافظ شریعت اور معصوم ہونے سے یہ مراد لیتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ معصوم تھے، لہٰذا شرع کی صحت معلوم کرنے کے لیے کسی مسئلہ کا آپ سے منقول ہونا ضروری ہے۔تو پھر کیا کسی چیز کا صحیح ہونا آپ سے منقول ہوئے بغیر بھی معلوم ہوسکتا ہے؟ اگر شیعہ جواب میں کہیں کہ ایسا ہوسکتا ہے؛ تو پھر ہمیں نہ ہی کسی محافظ شریعت کی ضرورت ہے؛ اور نہ ہی کسی معصوم کی۔ اس لیے اس کے بغیر بھی شریعت کی حفاظت ممکن ہے۔کوئی بھی دوسرا یہ خدمت سرانجام دے سکتا ہے۔ یہاں تک پوری شریعت کی حفاظت بغیر معصوم کے ممکن ہے۔

اور اگر شیعہ کہیں کہ: ایسا نہیں بلکہ کسی بھی چیز کی صحت کی معرفت کے لیے اس کا محافظ شرع امام معصوم سے معلوم ہونا ضروری ہے۔تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ: تو پھر اس صورت میں امام معصوم سے منقول ہوئے بغیر اہل ارض پر حجت قائم نہیں ہوسکتی۔ اس سے یہ لازم آیا کہ اہل زمین پر حجت قائم کرنے کے لیے آپ سے نقل کا ہونا ضروری ہے۔ اور نقل کی صحت اس وقت تک معلوم نہیں ہوتی جب تک آپ کا معصوم ہونا ثابت نہ ہو جائے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے معصوم ہونے کا علم ہمیں اس بات سے حاصل ہوا کہ دوسرا کوئی شخص بالا جماع معصوم نہیں۔اگر معصومین کا اجماع ہو تو شریعت کی حفاظت اس سے ممکن ہے اور اگر وہ معصومین کا اجماع نہیں ہے تو ہمیں اس کا غلطی سے پاک ہونا بھی معلوم نہیں ہے۔

چوتھی وجہ: جو لوگ محمد ﷺ کی نبوت کا اقرار کرتے ہیں' ان کے ہاں آپ کی نبوت کس چیز سے ثابت ہوتی ہے؟

اگر اس کے جواب میں کہیں کہ: ''امام کے نبی کریم ﷺ کے معجزات بیان کرنے سے۔''

تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ: ''جو نبی کریم ﷺ کی نبوت کو نہ مانتا ہو؛ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امامت کو بھی نہیں مانے گا۔ بلکہ ان کی امامت بطریق اولی قدح کریگا۔ بلکہ وہ نبوت اور امامت دونوں میں قدح کرے گا۔

اور اگر وہ کہیں کہ: پوری امت نبی کریم ﷺ کے جو معجزات تواتر کیساتھ نقل کرتی چلی آئی ہے؛ جیسے قرآن وغیرہ سے؛ [ان کے ہاں نبوت محمدی ثابت ہوگی]۔

تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ: ''جب امت کے تواتر کے ساتھ نقل کرنے سے حجت اور اصل نبوت ثابت ہوتی ہے؛ تو پھر اس سے شریعت کے فروعی مسائل کیسے ثابت نہیں ہو سکتے؟

پانچویں وجہ: ہم شیعہ سے پوچھتے ہیں کہ کیا امام ہر فرد بشر تک شرعی احکام کو بتواتر پہنچا سکتا ہے؟ یا یہ کہ شرعی احکام ایک معصوم سے دوسرے معصوم تک منتقل ہوتے رہتے ہیں؟

اگر امام کے لیے ایسا کرنا ممکن ہے تو رسول ﷺ کے لیے بطریق اولیٰ ممکن ہے۔ اندریں صورت نقل امام کی حاجت نہ ہوگی۔ اور اگر شیعہ کہیں کہ امام ایسا نہیں کرسکتا؛ تو اس سے یہ لازم آیا کہ دین اسلام کا نقل کرنے والا اقارب رسول میں سے ایک شخص فرد واحد ہوتا ہے۔ جس کے بارے میں منکر رسالت قدح کرتے ہوئے یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ اقارب جو چاہتے ہیں

رسول کے بارے میں کہتے ہیں۔اس طرح مسلمانوں کا دین یہود و نصاری کے دین سے بھی برا ہو جائے گا جو علم دین کی روایت و نقل کو صرف اپنے علماء کے ساتھ خاص مانتے ہیں۔

چھٹی وجہ: انہوں نے جو کچھ بیان کیا ہے؛ اس سے قدر نبوت میں نقص واقع ہو رہا ہے۔اس لیے کہ جس کے بارے میں معصوم اور محافظ شریعت ہونے کا دعوی کیا جا رہا ہے؛ وہ نبی کریم ﷺ کے اقارب میں سے ہے۔اس سے نبوت پر بہت بڑی تہمت لگتی ہے۔اعتراض کرنے والا کہہ سکتا ہے کہ:''اس سے یہ لازم آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ حکومت و سلطنت کے حریص اور طلبگار تھے؛ انہوں نے اپنے اقارب کے لیے عہد لیا؛ اور اب آپ کے بعد ان کے اقارب امور سلطنت کی دیکھ بھال کر رہے ہیں۔اور کسی دوسرے سے کوئی دین کی بات معلوم نہیں ہو سکتی۔اس صورت میں یہ معاملہ انبیاء کے حکم کے بجائے بادشاہوں کے حکم کے مشابہ لگتا ہے۔

ساتویں وجہ: ہم کہتے ہیں کہ بلاشبہ دین کے تحفظ اور اس کی نشر و اشاعت کیلئے معصومین کی ضرورت ہے۔آخر اس میں کیا قباحت ہے کہ صحابہ کرام ہی وہ معصوم ہوں جنہوں نے قرآن و حدیث کی حفاظت کی؛ جن سے دین کا مقصد پورا ہوا اور جنھوں نے دین کو کائنات ارضی کے گوشہ گوشہ تک پہنچایا۔اور اس میں کیا برائی ہے کہ ہر گروہ کو تحفظِ دین اور اسکی نشر و اشاعت کے سلسلہ میں اسی قدر عصمت حاصل ہو جس حد تک وہ اس کا حامل ہے۔یہ بات معلوم شدہ ہے کہ دین کی تبلیغ اور حفاظت میں عصمت کا مقصد اس کے نقل [روایت] کرنے والوں سے حاصل ہو جاتا ہے اگر چہ وہ امام نہ بھی ہوں۔

آٹھویں وجہ: ان سے پوچھا جائے گا کہ: ایسے جائز کیوں نہیں ہے کہ دین کی حفاظت اور تبلیغ کے لیے ہر گروہ کے اس کے تحمل شریعت کے مطابق معصوم قرار دیا جائے۔مثلاً قراء حفظ قرآن اور اس کی تبلیغ میں معصوم ہیں۔اسی طرح محدثین احادیث صحیحہ کے حفظ و ابلاغ میں معصوم ہیں۔اور فقہاء فہم کلام اور استدلال اور احتجاج میں معصوم ہیں۔یہی وہ چیز ہے جس کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک معدوم امام سے بے نیاز کر دیا ہے۔

نویں وجہ: اگر شریعت کے حفظ و ابلاغ کا کام ایک معصوم ہی انجام دے سکتا ہے جو دوسرے معصوم سے اخذ کر رہا ہو تو یہ کیا بات ہے کہ چار سو ساٹھ سال کے طویل عرصہ میں کسی نے امام منتظر سے ایک مسئلہ بھی نہیں سیکھا؟ اب سوال یہ ہے کہ پھر شیعہ نے قرآن کریم اور دین کا علم کہاں سے حاصل کیا؟ اور کیا یہ ممکن نہیں کہ جو قرآن وہ پڑھ رہے ہیں وہ اس قرآن سے الگ ہو جو نازل ہوا تھا؟ بلکہ اس میں کلام اللہ کا ایک حرف بھی نہ ہو [جیسا کہ بعض شیعہ کا عقیدہ ہے]۔

ہم شیعہ سے پوچھتے ہیں کہ تمھیں نبی کریم ﷺ اور [حضرت علی رضی اللہ عنہ] کے حالات اور احکام سے کیوں کر آگاہی ہوئی۔جب کہ بذات خود تم نے کسی معصوم سے اس ضمن میں کچھ نہیں سنا۔اس لیے کہ وہ امام یا تو مفقود ہے یا پھر معدوم ہے۔

اگر شیعہ کہیں کہ: ہمارے نزدیک ائمہ معصوم سے اس کی نقل تواتر کی حد تک معروف ہے۔

تو ہم کہیں گے کہ جب تمہارے ائمہ کا تواتر تحفظ شرع کا موجب ہے تو پوری امت کا تواتر اس کی نسبت اولیٰ واحریٰ ہے کہ اس پر اعتماد کیا جائے نہ کہ ایک شخص کی نقل کو دوسرے سے معتبر تسلیم کیا جائے۔

شیعہ کہتے ہیں: ان کے پاس قبل از امام منتظر لوگوں سے منقول جو موروثی علم موجود ہے؛ اس نے انہیں بے نیاز کر دیا ہے

کہ امام منتظر سے کوئی نئی چیز حاصل کریں ۔ [اگر واقعی ایسے ہی ہے] تو پھر جو کچھ امت کے پاس نبی کریم ﷺ سے منقول علم موجود ہے [اور جس صحت بھی ثابت ہے] یہ علم آپ کو دوسرے لوگوں سے علوم اخذ کرنے سے بے نیاز کیوں نہیں کر دیتا؟ جب یہ لوگ یہ دعوی کر سکتے ہیں کہ بارہ اماموں میں سے کوئی ایک بھی جو روایت نقل کرتا ہے؛ وہ ان کے ہاں ثابت ہوتی ہے تو پھر جو روایات باقی امت نبی کریم ﷺ سے نقل کرتی ہے؛ وہ ثابت کیوں نہیں ہو سکتی؟

یہ بات سب لوگ جانتے ہیں کہ مجموعی طور پر امت رافضیوں سے کئی گنا زیادہ اور بڑھ کر ہے ۔ اور وہ رافضہ کی نسبت دین کی حفاظت اور اس کی تبلیغ میں بڑے حریص بھی ہیں ۔ اور رافضیوں کی نسبت اقوال کی حفاظت اور ان کے نقل کرنے پر زیادہ قدرت بھی رکھتے ہیں ۔ یہ بات کسی بھی ادنی معرفت رکھنے والے انسان پر بھی مخفی نہیں ۔

دسویں وجہ : شیعہ مصنف سے کہا جائے گا کہ تمہارا یہ قول کہ ''وحی منقطع ہو جانے کی وجہ سے نصوص تفاصیل احکام سے قاصر ہیں ۔''اس سے تم کیا مراد لیتے ہو؟ کیا تمہاری مراد کسی خاص جزئیہ کے بیان میں قصور یا کمی ہے؟ یا پھر تمہاری مراد کلی قصور جو تمام جزئیات کو شامل ہے؟

اگر تم کہو گے کہ میری مراد پہلی ہے ۔ تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ ہر امام کا کلام اسی منزلت پر ہوتا ہے ۔ ہر امیر کا طریق کار یہی ہوتا ہے ۔ امیر جب عوام الناس سے مخاطب ہوتا ہے تو عوامی طرز تخاطب اختیار کرتا ہے ۔ جو کہ افراد اور افعال کو شامل ہوتا ہے؛ اور اس کے لیے یہ ممکن نہیں ہوتا کہ فاعل کے ہر فعل کو ہر وقت میں معین کر دے ۔ پس اس کے لیے صرف خطاب عام اور کلی کا ہونا ہی ممکن ہے ۔ جہاں تک خطاب عام کلی کا تعلق ہے اور خطاب عام کلی رسول کے لیے بھی ممکن ہے ۔

اگر روافض کہیں کہ نصوص رسول اللہ ﷺ قواعد کلیہ کی حیثیت نہیں رکھتے ۔ تو ہم کہیں گے کہ یہ ممنوع ہے ۔ اور اگر نصوص رسول اللہ ﷺ کے بارے میں تمہارا نظریہ مان لیا جائے؛ حالانکہ رسول اللہ ﷺ تو سب سے کامل و اکمل ہیں ۔ تو پھر یہ بھی یہ ماننا پڑے گا کہ امام کی نصوص کی کامل و کلی نہیں ہو سکتیں ۔ پس اس صورت میں شیعہ کو خطاب امام میں دو میں سے ایک چیز کی ضرورت ہو گی:

۱۔ عموم الفاظ کا ثبوت ۔ ۲۔ یا پھر عموم معانی کا ثبوت ۔

ان میں سے جو بات بھی امام کے لیے ثابت کی جائے گی؛ وہ خطاب رسول اللہ ﷺ کے لیے خود بخود ثابت ہو گی ۔ اندریں صورت ہمیں بیان احکام کے لیے کسی امام کی کوئی ضرورت نہیں ہو گی ۔

گیارھویں وجہ : اس سے کہا جائے گا کہ: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ﴾ [ابراهيم ۴]

''ہم نے ہر ہر نبی کو اس کی قومی زبان میں ہی بھیجا ہے تا کہ ان کے سامنے وضاحت سے بیان کر دے ۔''

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ﴾ [النساء ١٦٥]

''تا کہ لوگوں کی کوئی حجت اور الزام رسولوں کے بھیجنے کے بعد اللہ تعالی پر رہ نہ جائے ۔''

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ إِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِيْنُ ﴾ [النور ۵۴]

''رسول کے ذمے تو صرف صاف طور پر پہنچا دینا ہے۔''

ان کے علاوہ بھی اس طرح کی کئی آیات ہیں۔تو ہم شیعہ سے پوچھتے ہیں: کیا مخلوق پر رسول کے اس بیان کے بعد حجت قائم ہوگئی ہے یا نہیں؟ اگر حجت قائم نہیں ہوئی تو پھر یہ آیات اور ان کے معانی باطل ٹھہرے۔اور راگر حجت قائم ہوگئی ہے تو پھر اس کے بعد کسی دوسرے متعین شخص کی حاجت باقی نہ رہی جو لوگوں کے لیے مزید کوئی چیز بیان کرے۔ چہ جائے کہ وہ تبلیغ دین کا محافظ بھی ہو۔اور اللہ تعالیٰ نے انسان کے کلام میں اپنے رسول ﷺ کی حدیث روایت اور بیان کرنے کی وجہ سے جو قوت نافعہ رکھی وہ کافی وشافی ہے۔خصوصاً جب کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی حفاظت کا ذمہ خود لیا ہے، بنا بریں کلام پاک تبدیل وتغییر سے مامون ومصؤن ہے۔

خلاصہ کلام! شیعہ کا یہ دعوی کا دین اسلام کی حفاظت اور اس کا فہم صرف ایک معین شخص کے ذریعہ ہی ممکن ہے؛ یہ اصول دین میں بہت بڑا فساد اور بگاڑ ہے۔اس قول کے لوازم کو جانتے ہوئے صرف وہی شخص کہہ سکتا ہے جو پکا زندیق اور ملحد ہو۔جس کا مقصد دین اسلام کی بنیادوں پر وار کرنا ہو۔اور اس قول کو لوگوں میں صرف جاہل اور گمراہ انسان ہی پھیلا سکتا ہے[جو کہ نام نہاد محبت آل بیت کے نعرہ کا شکار ہو کر ان کے دام فریب میں پھنس جائے]۔

بارھویں وجہ: ان سے کہا جائے گا: پھر یہ بات ہر کس و ناکس کو معلوم ہے کہ اکثر مسلمانوں کو قرآن وحدیث کا علم حضرت علی رضی اللہ عنہ کی وساطت کے بغیر حاصل ہوا۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے جب بلاد و امصار کو فتح کیا تو وہاں ایسے معلم صحابہ بھیجے، جنھوں نے لوگوں کو دینی وفقہی مسائل کی تعلیم دی۔ پھر ان لوگوں کی بدولت باقی مسلمانوں نے علم دین سیکھا۔حضرت علی رضی اللہ عنہ نے علم دین کو اسی حد تک پہنچایا جیسے حضرت عبد اللہ بن مسعود، معاذ بن جبل، ابی بن کعب اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین نے پہنچایا۔ یہ بات سب کو معلوم ہے۔اگر ہم شیعہ کا دعوی مان لیں کہ دین صرف حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے ذریعہ سے ہی پہنچ سکتا ہے تو[تمام بلاد وامصار کے] عوام الناس کا دین باطل ٹھہرے گا۔[کیونکہ ان تک حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایات نہیں پہنچی؛]یا بہت کم روایات پہنچی ہیں جن سے دین کا مقصد حال نہیں ہوسکتا۔اور یہ روایات بھی متواتر نہیں ہیں۔اور ہمارے زمانے میں کوئی معصوم بھی نہیں ہے جس کی طرف رجوع کرنا ممکن ہو۔

لا حول و لا قوۃ إلا باللہ ؛ ما شاء اللہ ! روافض کی جہالت اور حماقت کے کیا کہنے؟

امام معصوم کا تعین قدرت الٰہی کی دلیل؟:

[اشکال] :شیعہ مصنف لکھتا ہے:

''چوتھی بات: اللہ تعالیٰ نصب امام کی قدرت سے بہرہ ور ہے اور اس میں کچھ خرابی بھی نہیں۔ بلکہ دنیا کی ضرورت اس کی داعی ہے، اور امام نصب کرنا واجب ہے۔ جب بالاجماع حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سوا کسی اور میں یہ اوصاف موجود ہی نہیں تو صرف وہی خلیفہ برحق ہوں گے۔اللہ تعالیٰ کا اس قدرت سے بہرہ ور ہونا صاف ظاہر ہے؛ اور دنیا کی ضرورت وحاجت

کا ہونا بھی ظاہر ہے؛ اس لیے کہ ہم عالم میں اختلاف کے واقع ہونے کو پہلے بیان کر چکے ہیں۔ اس سے خرابی کی نفی بھی ظاہر ہے؛ اس لیے کہ خرابی تو امام کے نہ ہونے کی وجہ سے ظاہر ہوتی ہے۔ جب کہ امام کو نصب کرنے کا وجوب اس لیے ہے کہ جب قدرت بھی ثابت ہوگئی؛ اور دنیا کی ضرورت بھی ثابت ہوگئی؛ اور خرابی کی نفی بھی ہوگئی تو اب امام کو متعین کرنا ہی واجب ہوگیا۔'' [اشکال ختم ہوا]۔

[جواب]: یہ محض تکرار ہے ہم قبل ازیں بیان کر چکے ہیں؛ اور اس کا جواب دیا جا چکا ہے۔ اس لیے کہ اس کا پہلا مقدمہ ہی باطل ہے؛ اور اس کے استدلال کی خرابی بھی صاف ظاہر ہے۔ اس لیے کہ اس کے بیان کی بنیاد اجماع سے حجت پکڑنے پر ہے۔ [ہم بیان کر چکے ہیں کہ] اجماع اگر معصوم ہے تو عصمت علی رضی اللہ عنہ کی حاجت نہیں۔ اور اگر اجماع معصوم نہیں تو عصمت علی رضی اللہ عنہ پر اس کا دلالت کرنا باطل ہے۔ ہر دو صورتوں میں شیعہ کی دلیل باطل ٹھہرتی ہے۔

بڑی عجیب بات تو یہ ہے کہ رافضی جن چیزوں سے اپنے اصول دین ثابت کرتے ہیں' انہیں وہ اجماع اور نصوص کا نام دیتے ہیں۔ حالانکہ پوری امت میں نصوص اور اجماع کی معرفت اور ان سے طریقہ استدلال سے رافضیوں سے بڑھ کر جاہل کوئی دوسرا نہیں۔ بخلاف اہل سنت والجماعت: اس لیے کہ سنت نصوص کو متضمن ہے؛ اور جماعت اجماع کو متضمن ہے؛ پس اہل سنت والجماعت نصوص اور اجماع کے پیروکار ہیں۔

اب ہم رافضی کے اس بیان کے فاسد ہونے پر بات کرتے ہیں: اس بیان کے خراب و فاسد ہونے کی کئی وجوہات ہیں:

پہلی وجہ: ہم یہ بات تسلیم نہیں کرتے کہ امام نصب کرنے کی کسی حاجت کی وجہ موجود ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ امت کی عصمت انہیں امام کی عصمت سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ علماء کرام نے اس امت کی عصمت کی حکمتوں میں یہ ذکر کیا ہے۔

وہ علماء کرام فرماتے ہیں: ''اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم سے پہلی امتوں میں جب لوگ دین میں کوئی تبدیلی کر دیتے تو اللہ تعالیٰ انبیاء کرام علیہم السلام کو مبعوث فرماتے؛ تاکہ وہ ان کے لیے حق بات کو واضح کر دیں۔ چونکہ اس امت کے بعد کوئی نبی نہیں ہے؛ اس وجہ سے ان کی عصمت نبوت کے قائم مقام ہے۔ کسی کے لیے بھی یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ دین میں سے کوئی چیز بدل دے۔ جب بھی کوئی ایسا کرے گا اللہ تعالیٰ کسی ایسے انسان کو کھڑا کر دیں گے جو اس میں تبدیل کردہ غلطی کو واضح کر دے گا۔ پس ایسا کبھی نہیں ہوسکتا کہ پوری امت گمراہی پر جمع ہو جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

''میری امت میں سے ایک جماعت ہمیشہ اللہ کے حکم کو قائم کرتی رہے گی جو ان کو رسوا کرنا چاہے گا یا مخالفت کرے گا تو ان کا کچھ بھی نقصان نہ کر سکے گا اور وہ لوگوں پر غالب رہیں گے۔'' [صحيح مسلم: ح٤٥٨]

اور سنن ابی داؤد کی روایت میں ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ نے تمہیں اپنے نبی کی زبان پر اس بات سے بچالیا ہے کہ تم گمراہی پر جمع ہو جاؤ۔'' [أبو داود ٤/ ١٢٩]

ان کے علاوہ بھی کئی ایک دلائل ہیں جن کی روشنی اجماع کا درست ہونا ثابت ہوتا ہے۔

دوسری وجہ: اور اگر شیعہ یہ کہیں کہ ہماری مراد یہ ہے کہ معصوم کے موجود ہونے کی صورت میں امت کی حالت اکمل ہوگی؛ تو بلاشبہ معصوم نائبین کی موجودگی میں بھی ان کی حالت تمام و کمال سے بہرہ ور ہوگی اور اگر وہ بذات خود معصوم ہوں تو یہ

اور بھی بہتر ہے، اور ایسا نہیں ہے کہ ہر وہ چیز جسے لوگ مانتے ہوں؛ [یا اپنے حق میں بہتر خیال کرتے ہوں] اللہ تعالیٰ بھی وہی کرے؛ اور اللہ تعالیٰ پر ایسا کرنا واجب بھی نہیں ہے۔ [اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی مصلحتوں سے خوب واقف ہے]۔

اگر شیعہ کہیں کہ ہماری مراد یہ ہے کہ ''جب معصوم نہ ہوگا تو لوگ جہنم میں جائیں گے اور دنیا میں زندہ نہ رہ سکیں گے یا یہ کہ سخت مصیبتیں آئیں گی۔''

ہم کہتے ہیں کہ بفرض محال اگر یہ درست ہے؛ تو تم نے یوں کیوں نہ کہا کہ مصائب و آلام کا ازالہ ضروری ہے؟ ظاہر ہے کہ دنیا میں بیماریاں اور ہموم و غموم موجود ہیں۔ اس کے علاوہ گھر بار اور مال میں مصائب؛ گرانی اور حوادث و آلام بھی پائے جاتے ہیں۔ پھلوں [اور فصلوں] کو مصیبت کا پہنچنا بھی موجود ہے۔ امام مظلوم کے ظہور پذیر ہونے کی صورت میں اسے جو ضرر لاحق ہوتا وہ ان مصائب سے زیادہ نہ ہوتا اور اللہ تعالیٰ نے اس کا ازالہ بھی نہیں کیا۔

تیسری وجہ: شیعہ کا کہنا ہے کہ: ''قدرت اور داعی کے ثبوت؛ اور صارف کی نفی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ پر امام کو نصب کرنا واجب ہو گیا۔

اس سے پوچھا جائے کہ: اس نے یہ کیوں نہیں کہا کہ: داعی ثابت ہے' اور صارف کی نفی ہے؟

اور شیعہ کا قول: ''عالم [دنیا] کی ضرورت امام نصب کیے جانے کی داعی ہے؟۔''

اس سے کہا جائے گا کہ: ''داعی تو وہ ہوتا جس کسی فاعل کا داعی ہو۔ تو تم نے یہ کیوں کہا کہ صرف ضرورت اللہ تعالیٰ کے لیے امام نصب کرنے کی داعی ہے۔''

ایسے ہی شیعہ نے ''انتفاء صارف'' کا کہا ہے۔ اس نے صرف اس کے داعی میں خرابی کے نہ ہونے کو انتفاء صارف [اور نصب امام کی ضرورت کے] طور پر ذکر کیا ہے۔ یہ کیوں نہیں کہا کہ اس میں سرے سے کوئی خرابی ہے ہی نہیں۔ اس پر مزید یہ کہ بشری حوائج و ضروریات کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ مثلاً انسان کو صحت و قوت مال و سرور اور لاتعداد امور کی ضرورت ہے۔

چوتھی وجہ: شیعہ کا کہنا ہے کہ: ''بیشک اللہ تعالیٰ امام معصوم کے نصب کرنے پر قادر ہے۔''

کیا اس سے اس کی مراد ایسا معصوم ہے جو کہ نیکی کے کام بھی اپنے اختیار سے کرتا ہے اور برائی کے کام بھی اپنے اختیار سے کرتا ہے؛ اور اللہ تعالیٰ اس کے اختیار کو پیدا کرتا ہے؛ جیسا کہ شیعہ کا عقیدہ ہے؟ یا پھر تمہاری مراد یہ ہے کہ امام معصوم اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ اختیار کے بغیر ہی اطاعت گزاری کے کام کرتا ہے؟

اگر شیعہ کہیں کہ ہماری مراد پہلی ہے تو ان کے اصولوں کے مطابق یہ باطل ہے۔ شیعہ کے اصول کو پیش نظر رکھا جائے تو اللہ تعالیٰ اس تفسیر کے مطابق معصوم مؤن کو پیدا کرنے پر قادر نہیں؛ جیسا کہ ان کے ہاں اللہ تعالیٰ مومن و کافر کو پیدا کرنے پر قادر نہیں ہے۔ اس لیے کہ شیعہ کے عقیدہ کے مطابق اللہ تعالیٰ زندہ اور مختار کے فعل پر قدرت نہیں رکھتا۔ اور نہ ہی برائی کو چھوڑ کر محض نیکی کا ارادہ پیدا کرتا ہے۔

اگر شیعہ کہیں کہ ہماری مراد دوسرا نکتہ ہے۔ تو پھر اس معصوم کو نیکی کا کام کرنے پر اور برائی کے ترک کرنے پر کوئی ثواب نہیں ملے گا۔ تو اس صورت میں وہ تمام لوگ جو نیکی کا کام کرنے پر اور برائی کے ترک کرنے پر اجر و ثواب سے نوازے جائیں

گے وہ اس امام معصوم کی نسبت بہتر ٹھہرے ۔ [کہ اسے عمل کے باوجود اجر نہیں مل رہا؛ لیکن لوگ عمل کر کے اجر کمار ہے ہیں]۔
تو پھر وہ امام معصوم اہل ثواب لوگوں سے افضل کیونکر ہوسکتا ہے جس کے پاس کوئی ثواب ہی نہ ہو۔؟

[اب سوال یہ ہے کہ وہ معصوم کو پیدا کرنے پر کس طرح قادر ہے؟ یہ بات پہلے گزر چکی ہے] اس سے شیعہ مذہب کا تناقض بھی کھل کر سامنے آیا۔ ایک طرف ان کا یہ دعویٰ ہے کہ معصوم کو پیدا کرنا اللہ تعالیٰ پر واجب ہے۔ دوسری جانب ان کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے اختیار سے کسی کو اس طرح معصوم نہیں بنا سکتا کہ اسے طاعات وعبادات کا اجر دیا جائے اور معاصی کی سزادی جائے۔ ❶

پانچویں وجہ: شیعہ سے پوچھا جائے گا: تمہارا یہ قول مجمل ہے کہ: ''اللہ تعالیٰ امام معصوم کے نصب کرنے پر قادر ہے۔''
بیشک یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ: '' اللہ تعالیٰ اس بات پر بھی قادر ہے کہ اس جسم کو کالا اور سفید؛ متحرک اور ساکن؛ زندہ اور مردہ بنادے۔ یہ صحیح ہے۔ اس کا معنی یہ ہوگا کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو سفید بنادے ؛ وہ چاہے تو کالا بنادے۔ وہ چاہے تو اسے زندگی دیدے اور چاہے تو اسے ماردے لیکن اس سے مراد یہ نہیں ہوسکتی کہ ایک ہی حالت میں کالا اور سفید بنادے؛ اس لیے کی دووالٹ چیزوں کا جمع ہونے بذات خود ممنوع ہے۔ جو کوئی چیز نہ ہو؛ اسے آپ چیز نہیں کہہ سکتے ۔ اس پر لوگوں کا اتفاق ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول میں داخل نہیں:

﴿وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ [البقرة ۲۸۴]۔
''اور اللہ تعالیٰ ہر ایک چیز پر قادر ہے۔''

بات جب ایسے ہی ہے؛ تو پھر تمہارا یہ عقیدہ کہ: '' اللہ تعالیٰ امام معصوم کے نصب کرنے پر قادر ہے'' اگر اس سے تمہاری مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ وہ امام مقرر کرے' اور نیکی کے کام بجالانے اور برائی ترک کرنے کا الہام کرے ؛تو اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہے؛ جیسا کہ وہ اس بات پر بھی قادر ہے کہ امام کی طرح تمام بشریت کو معصوم بنادے اور بشریت میں سے ہر ایک آدمی کو نبی بنادے۔ اور اس طرح کے دیگر امور بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت میں ہیں ۔

اور اگر اس سے تمہاری مراد یہ ہے کہ اس کے ساتھ وہ حکمت حاصل ہوتی ہے جو اس کے وجود کے منافی ہے؛ یعنی اس حکمت کا وجود اس کے عدم کے ساتھ ہوتا ہے۔ تو اس میں دووالٹ چیزوں کا اجتماع [اکٹھا ہونا] لازم آتا ہے۔ آپ نے یہ کہاں سے سیکھا ہے کہ: '' حکمت کی تمام اقسام اس کے وجود کے منافی ہیں۔''

اور اگر لوگوں کے لیے امام نہ ہو؛ اور اطاعت گزاروں کے لیے اتنے بڑے اجر کے علاوہ کچھ بھی نہ ہو؛ تو پھر اس صورت میں اطاعت کی معرفت اور اس پر عمل لوگوں پر بہت شاق گزرتا۔ اور اس کا ثواب بہت زیادہ ہوتا۔ اور یہ ثواب امام معصوم کے وجود کی صورت میں فوت ہوجاتا ہے۔

---

❶ ہم شیعہ سے پوچھتے ہیں کہ کیا معصوم تحصیل مصالح اور ازالہ مفاسد پر قادر ہے یا نہیں؟ نیز یہ کہ آیا معصوم عاجز ہونے کی صورت میں بھی معصوم رہے گا؟ ہم یہ بات تسلیم نہیں کر سکتے کہ بصورت عجز بھی وہ معصوم ہی رہے گا، کیوں کہ عاجز سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوسکتا، بلکہ قدرت کا ہونا اس میں شرط ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ وہ تحصیل مصالح پر قادر ہے تو یہ بات اس سے ظاہر نہیں ہوئی، لہٰذا یا وہ معصوم نہیں بلکہ عاصی ہوگا اور یا عاجز ہوگا۔

ایسے ہی لوگوں کا شریعت کی حفاظت کرنا؛ دین کی سمجھ اور سوجھ بوجھ حاصل کرنا؛ اور دین کی معرفت کے لیے ان کا اجتہاد کرنا امام معصوم کے وجود کی صورت میں ختم ہو جاتا اور یہ حکمتیں اور مصلحتیں بھی ختم ہو جاتیں۔

ایسے ہی امام معصوم کے وجود کو تسلیم کرنے کی صورت میں غیر نبی کو نبی کے برابر قرار دیا جاتا ہے۔ یہ نبی کریم ﷺ کے اقارب و خواص پر سب سے بڑا شبہ ہو سکتا ہے۔ اس لیے کہ جب یہ واجب ہے کہ امام کے ہر ایک قول پر ایمان لایا جائے؛ جس طرح کہ نبی کریم ﷺ کے ہر ایک فرمان پر ایمان لانا واجب ہے؛ تو پھر اس میں نبوت کی کوئی خصوصیت باقی نہ رہی۔ اللہ تعالیٰ نے تو ہمیں یہ حکم دیا ہے کہ اس نے جو کچھ بھی ان تمام انبیاء کرام علیہم السلام کو دیا ہے؛ ہم اس پر ایمان رکھیں۔ اگر کوئی اور انسان بھی معصوم ہونے میں ان انبیاء کرام علیہم السلام کے برابر ہو تو پھر اس کے بھی ہر ایک قول پر ایمان لانا واجب ہو جائے؛ اس طرح نبی اور غیر نبی کے درمیان فرق ختم ہو جائے گا۔

چھٹی وجہ: شیعہ سے پوچھا جائے کہ: وہ معصوم جس کی ضرورت کا داعیہ موجود ہے؛ کیا وہ امام مصلحتوں کے حصول اور مفاسد کے ختم کرنے پر قادر ہے؟ یا پھر وہ ان امور کو بجالانے سے عاجز ہے؟۔ اس کا عاجز ہونا ممنوع ہے۔ اس لیے کہ عاجز سے نہ تو کوئی مصلحت حاصل ہو سکتی ہے اور نہ ہی کسی فساد کا ازالہ ہو سکتا ہے۔ بلکہ قادر ہونا اس کے لیے شرط ہے۔ اس لیے کہ معصوم ہونے کا فائدہ یہی ہے کہ اصلاح کا پہلو اور عنصر موجود ہو۔ لیکن قادر ہونے کے بغیر داعی کا ہونا حصول مطلوب کو واجب نہیں کرتا۔

اگر جواب میں یہ کہا جائے کہ: ''امام معصوم اس پر قادر ہے۔''

تو اس سے کہا جائے گا کہ: یہ بات نہیں پائی جاتی۔ اگر یہ بارہ امام اس امر [فساد کے خاتمہ؛ اور اصلاح] پر قادر تھے؛ اور انہوں نے پھر بھی ایسا نہیں کیا؛ تو اس سے لازم آتا ہے کہ وہ نافرمان اور گنہگار تھے۔ اور اگر اس پر قدرت نہیں رکھتے تھے تو اس سے لازم آتا ہے کہ وہ عاجز تھے۔ ان دو باتوں میں سے کوئی ایک بات قطعی طور پر لازم ہے۔ یا پھر دونوں ہی باتیں لازم ہیں کہ ائمہ نہ ہی معصوم ہیں؛ اور نہ ہی قدرت رکھتے ہیں' بلکہ عاجز بھی ہیں۔ معاملہ جب ایسے ہی ہے تو ضرورت کے تحت اس امام معصوم کے وجود پر استدلال کا منفی ہونا جانتے ہیں؛ اس لیے کہ ضروریات کا استدلال سے تعارض نہیں ہو سکتا۔

ساتویں وجہ: یہ مسئلہ ہر زمانے کی طرح اس زمانے میں بھی ایسے ہی باقی ہے۔ اس زمانے میں بھی کسی کیلئے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ جان سکے کہ امام معصوم نے کیا کہا ہے [اور کس چیز کا حکم یا منع کیا ہے]۔ چہ جائے کہ اس امام سے کوئی فائدہ حاصل ہو؛ یا اس سے کسی خرابی کا خاتمہ ہوا ہو۔ پس اس وجہ سے جو کچھ رافضی مصنف نے ذکر کیا ہے وہ سب باطل ہے۔

آٹھویں وجہ: اللہ سبحانہ و تعالیٰ امام معصوم کے نصب کرنے پر قادر ہے۔ ہم یہ بات تسلیم نہیں کرتے کہ اس امام کے نصب کرنے میں کوئی خرابی نہیں ہے۔ یہ جو عموم نفی کی گئی ہے اس کے لیے دلیل کا ہونا ضروری ہے؛ اس کے لیے خرابی کے علم کا نہ ہونا کافی نہیں ہے۔ اس لیے کہ کسی چیز کا علم نہ ہونا یہ معنیٰ نہیں رکھتا کہ وہ چیز ہی معدوم ہے۔ اس میں سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ غیر نبی کی اطاعت اور تصدیق کو نبی کی اطاعت اور اس کی تصدیق کے مساوی کیا جا رہا ہے۔ جو کوئی دوسرا نبی کے ساتھ ہر بات کی اطاعت میں اور ہر چیز کی تصدیق میں اور ان سے ہر غلطی کی نفی میں برابر کا شریک ہو؛ تو پھر ہم پوچھتے ہیں کہ نبی

کے وہ کون سے انفرادی خصائص باقی رہ گئے جن کی وجہ سے یہ نبی ہو گئے؟

اگر یہ کہا جائے کہ: نزول وحی کی خصوصیت باقی رہتی ہے۔

تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ: اگر یہ [اصلاح کا] مقصود نزول وحی سے حاصل ہو گیا تھا؛ تو الحمد للہ اس تھکاوٹ اور سختی سے نجات مل گئی جو انبیاء کرام برداشت کرتے ہیں' اور وہ اس مقصود میں شریک ہو گیا۔

مزید برآں عصمت حق تعالیٰ کی طرف سے اسے الہام کرنے سے حاصل ہوتی ہے؛ اسی کو وحی کہتے ہیں۔

نیز یہ کہ یہ امام یا تو انہی چیزوں کی خبر دے گا جن کی خبر رسول اللہ ﷺ نے دی ہے؛ اور وہی حکم دے گا جو نبی نے دیا ہے۔ اور اسی چیز سے منع کرے گا جس سے نبی نے منع کیا ہے۔ یا ان سے کچھ زیادہ احکام جاری کرے گا۔

پہلی صورت میں اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اور نہ ہی اس میں کوئی فائدہ ہے۔ اس لیے کہ یہ باتیں تو رسول اللہ ﷺ کے بتانے اور آپ کے حکم دینے سے معلوم ہو گئی ہیں۔ اور آپ ان احکام کے بتانے میں معصوم ہیں [یہی نبوت ہے] اور آپ خود نبی ہیں؛ کسی دوسرے کی طرف سے کوئی پیغام نہیں پہنچاتے رہے۔

اور اگر شیعہ یہ کہیں کہ: امام معصوم کا کام رسول اللہ ﷺ کی لائی ہوئی شریعت کو محفوظ رکھنا ہے۔

تو اس سے پوچھا جائے گا: کیا وہ شریعت کو اپنی ذات کے لیے محفوظ کرے گا یا اہل ایمان کے لیے؟ اگر وہ شریعت کو اپنی ذات کے لیے محفوظ کرے گا تو پھر لوگوں کو ایسی شریعت کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اور اگر مقصد یہ ہے کہ وہ شریعت کو لوگوں کے لیے محفوظ کرے گا [تو پھر سوال یہ ہے کہ] وہ شریعت لوگوں تک کیسے پہنچے گی؟ کیا وہ خبر متواتر سے لوگوں تک پہنچے گی یا پھر خبر واحد سے؟ اور جو لوگ امام معصوم سے غائب ہیں ان تک شریعت کیسے پہنچے گی؟ کیا واسطوں بغیر کسی رسول کے ذریعہ سے ان تک پہنچے گی؟

خلاصہ کلام! رسول اللہ ﷺ کے بعد اس امام معصوم کے وجود میں کوئی مصلحت نہیں ہے۔ ہر مصلحت اس امام کے بغیر بھی حاصل ہو سکتی ہے۔ اس امام معصوم کا عقیدہ و نظریہ رکھنے میں اتنی بڑی خرابی ہے جو کہ اس کے نہ ہونے سے ہی ختم ہو سکتی ہے۔ پس اس بنا پر شیعہ کا یہ کہنا کہ: ''حاجت امام کی داعیہ ہے۔'' ایک باطل اور بے اصل قول ہے۔

اور ایسے ہی یہ کہنا کہ: ''امام کے نہ ہونے میں خرابی ہے'' یہ بھی بے بنیاد اور ممنوع نظریہ و عقیدہ ہے۔

بلکہ حقیقت میں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ خرابی تو امام کے ساتھ موجود ہے۔ اور اس کے ساتھ کوئی منفعت نہیں ہے۔

جب اس امام کا صرف اعتقاد رکھنے سے اتنی بڑی خرابی پیدا ہوئی ہے تو پھر اگر امام صاحب خود موجود ہوتا تو کیا حال ہوتا؟

[عصمت امام کی ایک اور اندھی بہری دلیل]:

[اشکال] : شیعہ مصنف لکھتا ہے:

''پانچویں وجہ: امام کا اپنی رعیت سے افضل ہونا ضروری ہے، یہ ایک بدیہی بات ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ فاضل دوراں

ویکتائے زمان تھے،لہٰذا وہی امام ہوں گے اس لیے کہ فاضل کی موجودگی میں مفضول کا تقدم عقلاً وشرعاً قبیح ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اَفَمَنْ یَّهْدِیْٓ اِلَی الْحَقِّ اَحَقُّ اَنْ یُّتَّبَعَ اَمَّنْ لَّا یَهِدِّیْٓ اِلَّآ اَنْ یُّهْدٰی فَمَا لَكُمْ كَیْفَ تَحْكُمُوْنَ﴾ [یونس ۳۵]

''پھر آیا جوشخص حق کا راستہ بتاتا ہو وہ زیادہ اتباع کے لائق ہے یا وہ شخص جس کو بغیر بتائے خود ہی راستہ نہ سوجھے پس تم کو کیا ہوگیا ہے کہ تم کیسے فیصلے کرتے ہو۔'' [انتھی کلام الرافضی]

[جواب] :اس کے جواب میں کئی نکات ہیں:

پہلی بات: مصنف کا قائم کردہ دوسرا مقدمہ ممنوع ہے۔ہم اس بات کوتسلیم نہیں کرتے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے زمانے میں سب سے افضل تھے۔ ❶ بلکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابو بکر وعمر رضی اللہ عنہما اس امت کے افضل ترین لوگ تھے۔جیسا کہ خود حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دوسرے لوگوں سے بھی ثابت ہے۔اس کا تفصیلی جواب آگے آئیگا۔[اور پہلے بھی گزر چکا ہے]۔

دوسری بات: ہمارے اصحاب اور دوسرے لوگوں میں سے جمہور سب کا یہی کہنا ہے کہ امکان موجود ہونے کی صورت میں افضل انسان کو والی بنانا واجب ہے۔لیکن اس رافضی مصنف نے اپنے اس مقدمہ پر کوئی دلیل پیش نہیں کی۔اس میں بہت سارے علماء کرام کے مابین اختلاف بھی ہے۔جب کہ مذکورہ بالا آیت میں اس رافضی کے حق میں کوئی دلیل نہیں ہے۔اس لیے کہ اس آیت میں بیان ہے کہ جوکوئی خود حق کی طرف راستہ بتانے والا یا پھر جسے بتائے بغیر راستہ کا پتہ ہی نہ چلتا ہو۔اور مفضول پر راستہ پانا اس وقت تک واجب نہیں ہے جب تک فاضل اسے راستہ نہ دیکھا دے۔بلکہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ بہت سارے لوگ فاضل سے تعلیم حاصل کیے بغیر بہت کچھ سیکھ جاتے ہیں۔اور ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ مفضول فاضل سے زیادہ علم والا ہو۔اور ایسا بھی ہوسکتا ہے افضل انسان کی موت آجائے'اور یہ جو زندہ موجود ہے اس نے افضل سے کچھ بھی تعلیم حاصل نہ کی ہو۔

پس مطلق طور پر حق کی طرف ہدایت دینے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے۔اور جو راہ بتائے بغیر ہدایت یافتہ نہیں ہوسکتا وہ ساری مخلوق ہے۔مخلوق کو جب تک اللہ تعالیٰ ہدایت سے نہ نوازیں اس وقت تک ہدایت نہیں پاسکتے۔اوراس آیت سے مقصود یہ بتانا ہے کہ مخلوق کی نسبت اللہ تعالیٰ عبادت کا زیادہ حق دار ہے؛ جیسا کہ اس آیت کے سیاق میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ یَّهْدِیْٓ اِلَی الْحَقِّ قُلِ اللّٰهُ یَهْدِیْ لِلْحَقِّ اَفَمَنْ یَّهْدِیْٓ اِلَی الْحَقِّ اَحَقُّ اَنْ یُّتَّبَعَ اَمَّنْ لَّا یَهِدِّیْٓ اِلَّآ اَنْ یُّهْدٰی﴾ [یونس ۳۵]

''آپ فرما دیجیے:تمہارے شرکاء میں کوئی ایسا ہے کہ حق کا راستہ بتاتا ہے؟ آپ کہہ دیجئے کہ اللہ ہی حق کا راستہ بتاتا ہے تو پھر آیا جوشخص حق کا راستہ بتاتا ہو وہ زیادہ اتباع کے لائق ہے یا وہ شخص جس کو بغیر بتائے خود ہی راستہ نہ سوجھے۔''

ان آیات کی ابتداء اللہ تعالیٰ نے اپنے اس فرمان سے شروع کی تھی:

---

❶ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کوفہ کے منبر پر کھڑے ہوکر فرمایا تھا:''اس امت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے افضل ابوبکر اور پھر عمر رضی اللہ عنہما ہیں۔'' سنن ابن ماجۃ، باب فضائل عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ (ح: ۱۰۶)، مسند احمد(۱/ ۱۰۶)۔

﴿قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ مَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ ﴾

''آپ فرمادیجیے: وہ کون ہے جوتم کو آسمان اور زمین سے رزق پہنچاتا ہے یا وہ کون ہے جو کانوں اور آنکھوں پر پورا اختیار رکھتا ہے اور وہ کون ہے جو زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے۔'' [یونس ۳۱]

اور یہ بیان آگے تک جاری رہا؛ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد فرمایا:

﴿قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ ﴾ [یونس ۳۵]

''فرمادیجیے: تمہارے شرکاء میں کوئی ایسا ہے کہ حق کا راستہ بتاتا ہے؟''

مزید براں اکثر علماء کے نزدیک افضل کو حاکم تعینات کرنا واجب ہوتا ہے۔ جب مفضول کو والی بنانے میں کوئی راجح مصلحت نہ پائی جاتی ہو؛ اور افضل کی ولایت میں کوئی خرابی نہ ہو۔ ان مباحث پر وہ لوگ گفت وشنید کرتے ہیں جن کا خیال ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما سے افضل ہیں۔ شیعہ کا فرقہ زیدیہ؛ بعض معتزلہ؛ اور متوقفہ یہی نظریہ رکھتا ہے۔ جب کہ اہل سنت والجماعت اس مقدمہ کے امتناع کے محتاج نہیں ہیں۔ بلکہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ان کے نزدیک تمام امت کے لوگوں میں سب سے افضل ہیں۔ مگر یہاں پر ہمارا مقصد یہ ہے کہ ہم رافضیوں کے لیے واضح کردیں کہ اگر یہ حق کہنا چاہیے تو اس پر کسی صحیح دلیل سے استدلال کرنا ان کے بس کا کام نہیں۔ اس لیے کہ انہوں نے اپنی ذات کے لیے بہت سارے علم کے دروازے بند کردیے ہیں۔ اس وجہ سے حق بیان کرنے سے عاجز آگئے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کے لیے یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ خوارج کے سامنے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ایمان ثابت کرسکیں۔ اور نہ ہی مروانیہ فرقہ اور آپ سے جنگ کرنے والوں کے سامنے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امامت ثابت کرسکتے ہیں۔ اس لیے کہ جن دلائل سے رافضی استدلال کرے گا اسی جنس کے دلائل ان کے پاس بھی موجود ہیں۔ اس لیے کہ یہ لوگ جانتے ہیں کہ ان کی جہالت اور خواہش پرستی؛ اور لاعلمی کی وجہ سے ان کے باطل اقوال پر کتنا فساد اور تناقض لازم آتا ہے۔

[رافضی مصنف کے بودے دلائل]:

[اشکال]: شیعہ مصنف امامت علی رضی اللہ عنہ پر قرآنی دلائل پیش کرتے ہوئے لکھتا ہے: ''دوسرا منہج: قرآن سے ماخوذ دلائل اور براہین جو کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امامت پر دلالت کرتی ہیں؛ بہت کثرت کے ساتھ ہیں۔''

اول:......اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ هُمْ رٰكِعُوْنَ ﴾

''بیشک تمہارا دوست خود اللہ ہے اور اسکا رسول ہے اور ایمان والے ہیں جو نمازوں کی پابندی کرتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور رکوع (خشوع وخضوع) کرنے والے ہیں۔'' [المائدۃ ۵۵]

علماء کا اجماع اس بات پر منعقد ہو چکا ہے کہ یہ آیت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ ثعلبی حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ: ''میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے ان دو کانوں کے ساتھ سنا اور اگر نہ سنا ہو تو یہ بہرے ہو جائیں۔ اور میں نے اپنی ان دو آنکھوں سے دیکھا؛ اگر نہ دیکھا ہو تو میری دونوں آنکھیں اندھی ہو جائیں۔ فرماتے

تھے: ''علی رضی اللہ عنہ نیکوں کے قائد اور کفار کے قاتل ہیں، جوان کی مدد کرے گا اس کی مدد کی جائے گی، اور جو ان کو بے یار و مددگار چھوڑے گا تو اسے بے یار و مددگار چھوڑ دیا جائے گا۔'' میں نے ایک دن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ظہر کی نماز ادا کی۔ اتنے میں ایک سائل نے آکر سوال کیا مگر کسی نے اسے کچھ بھی نہ دیا، اس نے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا: ''اے اللہ! تو گواہ رہ کہ میں نے تیرے نبی کی مسجد میں سوال کیا اور مجھے کچھ بھی نہیں دیا گیا۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ رکوع کی حالت میں تھے آپ نے حالت رکوع میں اپنی چھوٹی انگلی کی جانب اشارہ کیا؛ آپ نے اس میں انگوٹھی پہن رکھی تھی۔ سائل نے آگے بڑھ کر آپ کی انگوٹھی اتار لی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ ماجرا دیکھ رہے تھے، جب نماز سے فارغ ہوئے تو آسمان کی جانب سر اٹھا کر کہا: اے اللہ! موسیٰ علیہ السلام نے تجھ سے سوال کیا تھا:

﴿قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ☆وَ يَسِّرْلِيْ اَمْرِيْ☆وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ☆ يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ☆وَ اجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ☆هٰرُوْنَ اَخِي☆اشْدُدْ بِهٖٓ اَزْرِيْ☆وَ اَشْرِكْهُ فِيْٓ اَمْرِيْ﴾ [طه ۲۵۔ ۳۲]

''اس نے کہا اے میرے رب! میرے لیے میرا سینہ کھول دے۔ اور میرے لیے میرا کام آسان کر دے۔ اور میری زبان کی گرہ کھول دے کہ وہ میری بات سمجھ لیں۔ اور میرے لیے میرے گھر والوں میں سے ایک بوجھ بٹانے والا بنا دے۔ ہارون کو، جو میرا بھائی ہے۔ اس کے ساتھ میری پشت مضبوط کر دے۔ اور اسے میرے کام میں شریک کر دے۔''

ان کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿قَالَ سَنَشُدُّ عَضُدَكَ بِاَخِيْكَ وَ نَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطٰنًا فَلَا يَصِلُوْنَ اِلَيْكُمَا بِاٰيٰتِنَآ﴾ [القصص ۳۵]

''اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم تیرے بھائی کے ساتھ تیرا بازو مضبوط کر دیں گے اور تم دونوں کو غلبہ دیں گے فرعونی تم تک پہنچ ہی نہ سکیں گے۔''

آپ نے دعا کی: اے اللہ! میں محمد ہوں تیرا نبی اور تیرا برگزیدہ؛ اے میرے رب! میرے لیے میرا سینہ کھول دے۔ اور میرے لیے میرا کام آسان کر دے۔ اور میری زبان کی گرہ کھول دے کہ وہ میری بات سمجھ لیں۔ اور میرے لیے میرے گھر والوں میں سے ایک بوجھ بٹانے والا بنا دے یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو؛ اور اس کے ساتھ میری پشت مضبوط کر دے۔ حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: آپ اپنی گفتگو ختم نہ کر پائے تھے کہ جبرائیل مذکورہ بالا آیت لے کر حاضر ہوئے۔ [اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں]:

﴿اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ هُمْ رٰكِعُوْنَ﴾

''بیشک تمہارا دوست خود اللہ ہے اور اسکا رسول ہے اور ایمان والے ہیں جو نمازوں کی پابندی کرتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور رکوع (خشوع و خضوع) کرنے والے ہیں۔'' [المائدۃ ۵۵]

فقیہ ابن المغازی الواسطی الشافعی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ یہ آیت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ اس آیت میں جو ولی کا لفظ مذکور ہے اس سے متصرف مراد ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے جس طرح اپنے اور رسول علیہ السلام کے لیے ولایت فی الامہ کا اثبات کیا ہے، اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے بھی کیا۔'' (شیعہ کا بیان ختم ہوا)

[جواب]: اس کا جواب کئی طرح سے دیا جا سکتا ہے:

پہلی بات: اس کا جواب یہ ہے کہ شیعہ مصنف نے جو کچھ ذکر کیا ہے کہ وہ اس قابل نہیں ہے کہ عقلاً قبول کیا جائے۔ بلکہ اس کا ذکر کردہ واقعہ صاف جھوٹ پر مبنی ہے۔ اور وہی فلاسفہ وحمقاء کے کلام کی جنس سے تعلق رکھتا ہے۔ اور اگر اسے عقلی طور پر مان لیا جائے تو پھر اسے برہان کہنا انتہائی منکر اور بری بات ہے۔ اس لیے کہ قرآن میں اور دوسرے مقامات پر برہان کا لفظ اس چیز کے لیے استعمال ہوتا ہے جس سے علم اور یقین کا فائدہ حاصل ہو۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ قَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾ [البقرہ ۱۱۱]

''یہ کہتے ہیں کہ جنت میں یہود و نصاریٰ کے سوا اور کوئی نہ جائے گا، یہ صرف ان کی آرزوئیں ہیں، ان سے کہو کہ اگر تم سچے ہو تو کوئی دلیل تو پیش کرو۔''

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اَمَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾ [النمل ۶۴]

''کیا وہ جو مخلوق کی اول دفعہ پیدائش کرتا ہے پھر اسے لوٹائے گا اور جو تمہیں آسمان اور زمین سے روزیاں دے رہا ہے کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود ہے کہہ دیجئے کہ اگر سچے ہو تو اپنی دلیل لاؤ۔''

سچے کو اپنی سچائی پر دلیل و برہان چاہیے۔ اور دوٹوک سچائی وہی ہوتی ہے جس کے بارے میں معلوم ہو کہ یہ سچ ہے۔ اس رافضی مصنف نے جتنی بھی حجتیں پیش کی ہیں' ان میں جھوٹ ہے۔ اس کے بس میں نہیں کہ اپنے تمام مقدمات پر ایک بھی سچی حجت پیش کر سکے۔ کیونکہ سچے مقدمات کے لیے ممکن نہیں ہے کہ ان کی بنیاد جھوٹ اور باطل پر رکھی جائے۔ ہم ان شاء اللہ اس کی ایک ایک بات کا تار و پود کھول کر رکھ دیں گے جس سے اس کا جھوٹ بالکل واضح ہو جائے گا۔ ایسی حجتوں کو براہین کا نام دینا بذات خود بہت بڑا جھوٹ ہے۔

پھر یہ رافضی مصنف قرآن کی تفسیر میں بعض لوگوں سے نقل کیے گئے اقوال پر اعتماد کرتا ہے۔ حالانکہ بسا اوقات اس میں بھی راوی پر جھوٹ گھڑ لیا گیا ہوتا ہے۔ اور اگر سچ بھی ہو تو بہت سارے علماء کرام نے اس کی مخالفت کر کے اس نظریہ یا تفسیر کو رد کیا ہوتا ہے۔ اگر کہیں پر واحدی کا قول نقل کیا گیا ہے تو واحدی کی صداقت خود مجہول ہے؛ نیز بہت سارے علماء کرام نے دلائل و براہین کی روشنی میں اس کے خلاف حق کو بھی بیان کیا ہوتا ہے۔ اس لیے کہ واحدی کے اقوال کے خلاف اسی جنس کے بہت سارے اقوال ہیں جو اس کے متناقض ہیں۔ جب براہین کا تعارض اقوال سے ہو جائے تو اقوال متناقض شمار ہوتے ہیں جب کے اقوال کے مقابلہ میں براہین متعارض نہیں ہو سکتیں۔

بلکہ ہم ان شاء اللہ اس رافضی کی نام نہاد براہین کے خلاف حقیقی براہین قائم کریں گے جن کا آپس میں کوئی تعارض بھی نہیں ہوگا۔ اور رافضی کے اکثر اقوال میں جھوٹ بالکل ظاہر ہوتا ہے۔ یہ جھوٹ صرف ان لوگوں پر مخفی رہ سکتا ہے جن کے دلوں

کو اللہ تعالیٰ نے اندھا کر دیا ہو۔ [اور واضح کریں گے کہ] رسول اللہ ﷺ کی نبوت پر دلالت کرنے والی براہین برحق ہیں۔ اور بیشک قرآن بھی حق ہے۔ اور یہ کہ دین اسلام حق ہے ۔ یہ ان تمام چیزوں سے متناقض ہیں جنہیں رافضی نے براہین کا نام دیا ہے۔ اگر عقلمند انسان کچھ دیر کے لیے غور کرے گا تو اس پر واضح ہو جائے گا کہ رافضی مصنف جن دلائل کو براہین کا نام دیتا ہے اس کے لوازم سے ایمان وقرآن اور رسول اللہ ﷺ پر قدح وارد ہوتی ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ رافضیت کی اصل بنیاد کچھ زندیق لوگوں کے ہاتھوں پر اٹھائی گئی ہے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ پر؛ قرآن پر اور دین اسلام پر اعتراضات اور قدح کی جائے۔ اس غرض کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے انہوں نے ایسی روایات گھڑ لیں جن کو سچا ماننے سے دین اسلام پر طعن لازم آتا ہے۔ پھر انہوں نے اپنی وضع کردہ روایات کو لوگوں میں عام اور مشہور کر دیا۔ لوگوں میں جاہل بھی تھے اور ہوئی پرست بھی۔ ان لوگوں نے اپنی ہوئی پرستی کی وجہ سے ان حکایات و روایات کو قبول کر لیا؛ مگر یہ نہ دیکھا کہ ان کی اصل حقیقت کیا ہے؟

ان میں سے بعض اہل نظر لوگ بھی تھے جنہوں نے ان میں غور وفکر کیا تو پتہ چلا کہ یہ روایات دین اسلام کی حقانیت پر قدح کرتی ہیں۔ چنانچہ انہوں نے ان روایات کے موجب عقیدہ اپنا لیا ؛ اور دین اسلام پر قدح کرنے لگے۔ اس کی وجہ شروع سے ہی ان کے دین و اعتقاد کی خرابی تھی۔ یا پھر اس کا یہ اعتقاد تھا کہ یہ روایات صحیح ہیں ؛ اور جو کچھ وہ دین اسلام کا عقیدہ رکھتا تھا اس پر قدح وارد ہوتی تھی۔ [لہٰذا اس نے ان روایات کو قبول کر لیا]۔

[اسماعیلیہ اور نصیریہ کی گمراہی کی وجہ]:

یہی وجہ ہے کہ اکثر زنادقہ اسلام میں تشیع کے دروازہ سے داخل ہوئے، اور ان اکاذیب کے بل بوتے پر اسلام کو مطعون کرنا شروع کیا۔ وہ جہلاء ان مکذوبات کی بنا پر شبہات کا شکار ہو گئے جنہیں یہ علم نہ تھا کہ یہ روایات جھوٹی ہیں؛ بس انہیں صرف اتنا پتہ تھا کہ دین اسلام ایک سچا مذہب ہے۔

فرقہ ہائے اسماعیلیہ و نصیریہ بھی اسی وجہ سے گمراہ ہوئے۔ جھوٹی اور من گھڑت روایات قرآن کی تفسیر اور حدیث کی شرح میں پیش کرتے ہوئے شیعہ کی روایت کردہ اکاذیب پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ چنانچہ انھوں نے سب سے پہلے آل محمد پر اظہار رحم و کرم کا آغاز کیا، پھر صحابہ پر نقد و جرح اور گالی گلوچ کا بیڑا اٹھایا۔ بعد ازاں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ہدف ملامت بنایا، کیوں کہ آپ یہ سب باتیں سن کر خاموش رہے تھے، پھر رسول علیہ السلام کو تنقید کا نشانہ بنایا اور بعد ازاں اللہ کی تردید و تکذیب پر اتر آئے۔ جیسا کہ صاحب البلاغ الاکبر نے اس ترتیب پر روشنی ڈالی ہے۔ جیسا کہ عبیدی ائمہ کی بنیاد رافضیوں کے من گھڑت واقعات پر ہے؛ تاکہ اس طرح سے گمراہ شیعہ لوگوں کو اپنا شکار کر سکیں۔ پھر اس کے بعد صحابہ کرام میں طعن کرنا شروع کرتے ہیں؛ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں قدح کرتے ہیں' پھر رسول اللہ ﷺ کی شان میں اور پھر الٰہیات میں طعنہ زنی کرتے ہیں جیسا کہ "البلاغ الاکبر اور الناموس الاعظم" کے مصنف نے ان کے لیے درجات مقرر کیے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ رافضیت کفر و الحاد کا رئیسی دروازہ اور دھلیز شمار ہوتی ہے۔

دوسری بات: ہم کہتے ہیں: اس آیت کے جواب میں کئی امور ہیں:

اول: ہم اس روایت کی صحت کا مطالبہ کرتے ہیں۔سب سے پہلے حدیث کو اس انداز میں پیش کیا جائے جس سے حجت قائم ہوسکتی ہو۔ کیونکہ صرف تفسیر ثعلبی کی طرف منسوب کر لینا؛ یا ان لوگوں سے اجماع نقل کرنا جو منقولات کا علم ہی نہیں رکھتے ؛ اگر چہ وہ نقل کرنے میں سچے بھی ہوں ؛ اہل علم کے ہاں بالا جماع یہ حجت نہیں ہوسکتا۔ اگر اس کی اسناد کی معرفت ثابت نہ ہو۔

ایسے ہی جب ثعلبی ابو بکر وعمر رضی اللہ عنہما کی فضیلت میں کوئی روایت نقل کرے ؛ تو صرف اس روایت کے موجود ہونے کی وجہ سے اس فضیلت کے ثابت ہونے کا اعتقاد رکھنا جائز نہیں ۔اس پر اہل علم کا اجماع ہے۔

اہل سنت والجماعت کسی چیز کے ثابت کرنے کے لیے یہ طریقہ نہیں اپناتے ۔ نہ ہی کوئی فضیلت ثابت کرنے کے لیے اور نہ ہی حکم ثابت کرنے کے لیے۔اور نہ ہی دیگر کسی مسئلہ میں ۔اور ایسے ہی شیعہ [کو بھی کرنا چاہیے]۔

جب تمام لوگوں کا اتفاق ہے کہ صرف روایت کا موجود ہونا حجت نہیں ہوسکتا[جب تک کہ اس کی صحت ثابت نہ ہو جائے] بلکہ اس سے استدلال کرنا باطل ہے۔ایسے ہی ہر وہ قول جسے ابونعیم ؛ثعلبی ؛ نقاش؛ اور ابن مغازلی جیسے لوگوں کی طرف منسوب کیا جائے۔[وہ صرف روایت کے موجود ہونے کی وجہ سے حجت نہ ہوگا]۔

دوم: شیعہ مصنف کا دعوی ہے کہ:''اس آیت کے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہونے پر اجماع ہے۔''

[جواب]: ہم کہتے ہیں: یہ سب سے بڑا جھوٹا دعوی ہے۔ بلکہ اجماع اس بات پر منعقد ہوا ہے کہ یہ آیت خاص طور پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل نہیں ہوئی۔اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نماز کی حالت میں اپنی انگوٹھی بطور صدقہ نہیں پیش کی۔اور محدثین کرام کا اجماع ہے کہ شیعہ کی بیان کردہ روایت صاف جھوٹ ہے۔

اور جو کچھ اس نے ثعلبی کی تفسیر سے نقل کیا ہے ؛ محدثین کرام کا اجماع ہے کہ ثعلبی ایک گروہ سے موضوعات اور من گھڑت روایات نقل کرتا ہے۔جیسا کہ ہر سورت کے شروع میں اس نے حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے اس سورت کی فضیلت میں ایک روایت نقل کی ہے۔ثعلبی اور اس کا تلمیذ واحدی دونوں اور ان کے امثال ''حاطب لیل (رات کا لکڑ ہارا جو خشک و تر میں تمیز کیے بغیر ہر قسم کی لکڑیاں جمع کرتا ہے) تھے ۔ ہر صحیح وضعیف [بلکہ موضوع] روایات تک نقل کرتے تھے۔[علاوہ ازیں شیعہ مصنف کے ذکر کردہ دلائل سب باطل ہیں اور وہی شخص ان کو تسلیم کر سکتا ہے جو گونگا، بہرہ، صاحب ہوئی و ضلالت ہو اور اللہ تعالیٰ نے اس کے دل کو قبول حق سے اندھا کر دیا ہو]۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ حدیث کے بڑے عالم تھے ؛ثعلبی اور واحد سے بڑھ کر علم رکھتے تھے۔آپ کی تفسیر ثعلبی کی تفسیر سے مختصر کی گئی ہے۔آپ نے اپنی تفسیر میں ان موضوع احادیث میں سے کوئی بھی روایت نقل نہیں کی جو کہ ثعلبی نے اپنی تفسیر میں نقل کی ہیں۔اور نہ ہی اہل بدعت کی تفسیر نقل کی ہے جیسے کہ ثعلبی نے نقل کی ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ ثعلبی میں خیر اور دین داری ہے ؛لیکن صحیح اور ضعیف احادیث کے بارے میں آپ کی معلومات بہت کمزور ہیں۔اور بہت سارے اقوال میں سنت اور بدعت میں تمیز نہیں کر پاتا۔

جب کہ بڑے اور مشہور اہل علم مفسرین جیسے: محمد بن جریر الطبری ؛ بقی بن مخلد ؛ ابن ابی حاتم ؛ ابن المنذر ؛ عبد الرحمٰن بن ابراہیم دحیم اور ان کے امثال نے اپنی تفاسیر میں ان موضوع روایات میں سے کوئی بھی روایت نقل نہیں کی۔

اہل علم محدثین کا اجماع ہے کہ کسی ایک کے مجرد روایت کرنے سے استدلال نہیں کیا جا سکتا؛ اسی جنس سے ثعلبی؛ واحدی اور نقاش اور ان جیسے دوسرے لوگ بھی تعلق رکھتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ لوگ اپنی تفاسیر میں اکثر وہ احادیث روایت کرتے ہیں جو کہ ضعیف ہی نہیں بلکہ موضوع ہوتی ہیں۔ اگر ہمیں چند دوسری وجوہات کی بنا پر بھی ان لوگوں کا جھوٹا ہونا معلوم نہ ہوتا تو پھر بھی ان کی روایات پر اس لیے اعتماد کرنا جائز نہ ہوتا کہ انہیں ثعلبی اور اس کے امثال نے روایت کیا ہے۔ تو پھر جب ہمیں اس جھوٹ کا پتہ بھی ہے تو ان روایات پر کیسے اعتماد کیا جا سکتا ہے؟

ہم ان شاء اللہ وہ دلائل ذکر کریں گے جن سے ان کا جھوٹ عقلاً و نقلاً کھل کر سامنے آجائے گا۔ یہاں پر صرف اس مصنف کی افترا پردازی اور کثرت جہالت کا بیان کرنا ہمارا مقصد ہے۔ کیونکہ اس کا دعوی ہے کہ: ''اس پر اجماع ہے کہ یہ آیت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی۔'' صد افسوس کہ اس بیچارے کو یہ بھی علم ہوتا کہ اہل علم میں سے جو لوگ ایسے امور میں اجماع کے حقائق کا علم رکھتے ہیں' ان میں سے کس نے یہ اجماع نقل کیا ہے؟ اس لیے کہ ایسے امور میں غیر اہل علم کا نقل کردہ اجماع ہرگز قبول نہیں ہوتا۔ اور پھر اس میں اجماع بھی نہیں' بلکہ اختلاف ہے۔

اس لیے کہ متکلم؛ مفسر اور مؤرخ جب بلا سند کوئی روایت نقل کر کے کسی معاملے کا دعوی کریں تو ان کی بات پر اعتماد نہیں کیا جاتا۔ تو پھر جب وہ اجماع کا دعوی کرے تو کیسے قابل قبول ہو سکتا ہے؟

تیسری بات: اس سے پوچھا جائے کہ: شیعہ مصنف نے اپنی تائید میں ثعلبی کا حوالہ دیا ہے، وہ مفسرین جن کی کتابوں سے یہ تفسیر نقل کی گئی ہے؛ وہ ثعلبی سے زیادہ جانتے ہیں۔ انہوں نے اس کے برعکس نقل کیا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ ثعلبی نے حضرت ابن عباس کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ یہ آیت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی شان میں نازل ہوئی۔''

نیز ثعلبی نے عبد الملک سے نقل کیا ہے کہ میں نے ابو جعفر باقر سے اس آیت کی تفسیر پوچھی۔ تو انھوں نے فرمایا: ''اس سے سب مومن مراد ہیں۔'' میں نے عرض کیا، بعض لوگ اس سے حضرت علی رضی اللہ عنہ مراد لیتے ہیں۔

یہ سن کر امام باقر رحمہ اللہ نے فرمایا: ''اہل ایمان میں علی رضی اللہ عنہ بھی شامل ہیں۔'' ضحاک اور سدی سے بھی یہی مروی ہے۔

علی بن ابی طلحہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت کی تفسیر میں نقل کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا:

''سب مومن و مسلم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے ولی ہیں۔''

چوتھی بات: ہم شیعہ کے ادعاء اجماع کو معاف کرتے اور ان سے مطالبہ کرتے ہیں کہ اپنے دعویٰ کے اثبات میں ایک سند صحیح ہی پیش کریں۔ ثعلبی سے ذکر کردہ روایت ضعیف ہے اور اس کے راوی متہم بالکذب ہیں۔ باقی رہا فقیہ ابن المغازلی واسطی تو اس کی کتاب اکاذیب کا پلندہ ہے۔ اس حقیت سے ہر وہ شخص آشنا ہے جو علم حدیث سے معمولی سی واقفیت بھی رکھتا ہے۔ اور ہمارا صحیح سند کا مطالبہ ہر دو کتابوں کو شامل ہے۔

پانچویں بات: اگر آیت کا مطلب یہ قرار دیا جائے کہ حالت رکوع میں بھی زکوۃ ادا کی جائے؛ جیسا کہ ان کا کہنا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حالت نماز میں اپنی انگوٹھی صدقہ کی تھی؛ تو اس سے وجوباً موالات کی شرط ٹھہرے گی؛ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سوا کوئی مسلمان ولی نہیں بن سکے گا۔ بنا بریں حسن و حسین رضی اللہ عنہما بھی موالات [دوستی] کے مستحق نہیں ہوں گے۔ اور

نہ ہی باقی بنی ہاشم سے کوئی موالات و دوستی ہوگی ۔ یہ بات سب مسلمانوں کے اجماع کے خلاف ہے ۔

چھٹی بات: علاوہ ازیں اس آیت میں ﴿الذین﴾ جمع کا صیغہ ہے۔لہٰذا فرد واحد حضرت علی رضی اللہ عنہ اس کا مصداق نہیں ہو سکتے ۔

ساتویں بات: علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے تعریف صرف کسی اچھے کام پر کی جاتی ہے۔وہ اچھا کام یا تو واجب ہوگا یا پھر مستحب۔صدقہ ؛ غلام آزاد کرنا؛ ہبہ؛ ہدیہ؛ اجارہ؛ نکاح؛ طلاق وغیرہ عقود کے معاملات نماز میں نہ ہی واجب ہیں اور نہ ہی مستحب ؛اس پر تمام مسلمانوں کا اتفاق و اجماع ہے ۔ بلکہ اکثر علماء کا کہنا ہے کہ ایسا کرنے سے نماز باطل ہوجائے گی اگر چہ وہ زبان سے بات نہ بھی کرے۔ بلکہ ایسے اشارہ سے بھی نماز باطل ہوجاتی ہے جس کا مفہوم سمجھا جا سکتا ہو۔علماء کرام کے ایک گروہ کا کہنا ہے کہ: ایسا کرنے سے شرعی ایجاب نہ ہونے کی بنا پر ملکیت حاصل نہیں ہوگی ۔

ظاہر ہے کہ نماز میں یہ کام کرنا فعل محمود نہیں ہے، اگر یہ اچھا[مستحب] کام ہوتا تو نبی کریم ﷺ بھی ایسا کرتے اور اس کی ترغیب دیتے ۔ نیز حضرت علی رضی اللہ عنہ بار بار یہ فعل سرانجام دیتے ۔لہٰذا یہ فعل نماز کے منافی ہے پھر یہ کہنا کس حد تک درست ہے کہ ولی وہی شخص ہوگا جو حالت رکوع میں سجدہ کرے ۔

جب نماز میں کوئی ایسی بات مشروع نہیں ہے۔تو اس سے معلوم ہوا کہ نماز میں صدقہ کرنا اعمال صالحہ میں سے نہیں ہے اور سائل کو دینے کا موقع ختم نہیں ہوسکتا ؛ جب انسان نماز سے فارغ ہوجائے تب بھی وہ صدقہ کرسکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ نماز میں ایک طرح کا انہماک ہوتا ہے۔[اور اس میں حرکت یا فعل اس انہماک کے منافی ہے]۔

آٹھویں بات: اگر یہ بات مان لی جائے کہ نماز میں صدقہ دینا مشروع ہے۔تو پھر بھی رکوع کو اس کام کے لیے خاص نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ قیام یا قعود کی حالت میں ایسا کرنا زیادہ آسان تھا۔تو پھر کیسے یہ کہا جاسکتا ہے کہ تمہارا ولی وہی ہوسکتا ہے جو صرف رکوع کی حالت میں زکوٰۃ ادا کرے۔تو کیا اگر کوئی حالت قیام یا قعود میں صدقہ کرے تو وہ موالات اور دوستی کا مستحق نہیں ہوگا؟

❀ اگر [شیعہ]اس کے جواب میں یہ کہیں کہ: اس سے مراد خصوصی طور پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تعریف بیان کرنا ہے ۔

❀ تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ: ''حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اوصاف جن کی وجہ سے آپ مشہور ہیں' وہ بہت زیادہ اور صاف ظاہر ہیں ۔ پھر معروف باتوں کو چھوڑ کر ایسی باتیں کیوں بیان کی جاتی ہیں جنہیں کوئی جانتا ہی نہ ہو؟

جمہور مسلمین نے یہ خبر نہیں سنی ۔اور نہ ہی مسلمانوں کی کسی معتمد کتاب میں ایسی کوئی چیز پائی جاتی ہے ۔نہ ہی صحاح ستہ میں ؛ نہ ہی سنن میں ؛ نہ ہی جوامع اور معجمات میں اور نہ ہی امہات الکتب میں سے کسی ایک کتاب میں ایسی کوئی چیز پائی جاتی ہے۔تو اب دو باتوں میں سے ایک بات لازم آتی ہے:

۱۔ اگر اس سے مقصود وصف کی مدح کرنا ہے تو یہ محال اور باطل ہے۔

۲۔ اور اگر اس سے مقصود حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تعریف بیان کرنا تو بھی باطل ہے ۔

نویں بات: علاوہ ازیں اس سے کہا جائے گا کہ: ﴿وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ﴾ تمہارے قول کے مطابق اس آیت کا تقاضا

ہے کہ زکوٰۃ ادا کرنے والا رکوع کی حالت میں ہو۔عہد رسالت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ تنگ دست تھے اور زکوٰۃ ان پر فرض نہ تھی۔ چاندی کی زکوٰۃ اس شخص پر فرض ہوتی ہے جو نصاب کا مالک ہو اور اس پہ ایک سال گزر جائے، مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ صاحب نصاب نہ تھے۔

دسویں بات: مزید براں اکثر علماء کے نزدیک زکوٰۃ میں انگوٹھی کا دینا کافی نہیں ہے۔اس کی صرف یہ صورت ہوسکتی ہے جب زیور پر بھی زکوٰۃ کو فرض مان لیا جائے۔اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ زیور کی اسی جنس سے زکوٰۃ نکالی جائے گی۔جن لوگوں نے اس کے بجائے قیمت ادا کرنے کو جائز کہا ہے تو ایسے چیزوں میں کوئی متعین قیمت مقرر کرنا مشکل ہوتا ہے۔اس لیے کہ احوال کے اختلاف کی وجہ سے ان کی قیمتیں بھی بدلتی رہتی ہیں۔

گیارھویں بات: حقیقت یہ ہے کہ شیعہ مصنف کی ذکر کردہ آیت مندرجہ ذیل آیات کی مانند ہے اور ان میں کوئی فرق نہیں پایا جاتا ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

۱.....﴿وَ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَارْکَعُوْا مَعَ الرّٰکِعِیْنَ﴾ (البقرۃ:۴۳)

''اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔'' یہاں پر رکوع کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

۲.....﴿اُقْنُتِیْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِیْ وَارْکَعِیْ مَعَ الرّٰکِعِیْنَ﴾(آل عمران:۴۳)

''اپنے رب کی اطاعت کرو اور سجدہ کرو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کر۔''

یہ بھی کہا گیا ہے کہ: یہ ذکر ان الفاظ میں اس لیے کیا گیا ہے کہ وہ لوگ جماعت کے ساتھ نماز پڑھتے تھے۔اس لیے کہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے والا جب رکوع کو پالے تو اسے رکعت مل جاتی ہے؛ بخلاف اس کے جو صرف حالت سجدہ میں نماز کو پاتا ہے؛ اور رکوع اس سے چھوٹ جاتا ہے۔اس سے رکعت بھی رہ جاتی ہے۔قیام میں ادراک شرط نہیں ہے۔

بارھویں وجہ: سلف وخلف تمام مفسرین کے ہاں یہ بات عام طور سے معروف ہے کہ زیر نظر آیت موالات کفار سے روکنے اور اہل اسلام کے ساتھ دوستانہ مراسم استوار کرنے کے سلسلہ میں نازل ہوئی۔غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سیاق کلام بھی اسی پر دلالت کرتا ہے۔نیز اس میں اہل ایمان کے ساتھ دوستی کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔جب بعض منافقین جیسے عبد اللہ بن ابی ابن سلول سے دوستی رکھتا تھا؛ اور وہ کہتا تھا: میں گردش ایام سے ڈرتا ہوں۔'' اہل ایمان میں سے حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ نے کہا: یارسول اللہ! میں اللہ اور اس کے رسول سے دوستی کرتا ہوں؛ میں ان کفار کے ساتھ اپنے اتحاد اور دوستی سے اللہ اور اس کے رسول کی جناب میں برأت کا اظہار کرتا ہوں۔

یہی وجہ ہے کہ بنوقینقاع والے دن عبد اللہ بن ابی ابن سلول کی چالوں کی وجہ سے ان لوگوں پر وہ دن آ گیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔جس میں عمومی طور پر اہل ایمان کی محبت کو واجب کیا گیا تھا۔اور کفار کے ساتھ محبت اور دوستی سے منع کیا گیا تھا۔اس سے پہلے صحابہ اور تابعین رحمہم اللہ کا کلام گزر چکا ہے کہ یہ آیت صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ خاص نہیں۔

[متنازعہ آیت کی صحیح تفسیر]:

تیرھویں وجہ: غور کرنے والے کے لیے یہ بات واضح ہوسکتی ہے کہ اس آیت کا سیاق ہمارے اس موقف پر دلالت کرتا

ہے۔اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْیَھُوْدَ وَ النَّصٰرٰٓی اَوْلِیَآءَ بَعْضُھُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ وَ مَنْ یَّتَوَلَّھُمْ مِّنْکُمْ فَاِنَّہٗ مِنْھُمْ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ﴾ [المائدۃ ۵۱]

''اے ایمان والو!تم یہود و نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ یہ تو آپس میں ہی ایک دوسرے کے دوست ہیں۔تم میں سے جو بھی ان میں سے کسی سے دوستی کرے وہ بیشک انہی میں سے ہے، ظالموں کو اللہ تعالیٰ ہرگز راہ راست نہیں دکھاتا۔''

اس آیت میں یہود و نصاریٰ کے ساتھ دوستانہ مراسم قائم کرنے سے منع کیا گیا ہے۔اس کے بعد فرمایا:

﴿فَتَرَی الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِھِمْ مَّرَضٌ یُّسَارِعُوْنَ فِیْھِمْ یَقُوْلُوْنَ نَخْشٰٓی اَنْ تُصِیْبَنَا دَآئِرَۃٌ فَعَسَی اللّٰہُ اَنْ یَّاْتِیَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِہٖ فَیُصْبِحُوْا عَلٰی مَآ اَسَرُّوْا فِیْٓ اَنْفُسِھِمْ نٰدِمِیْنَ ٭ وَ یَقُوْلُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَھٰٓؤُلَآءِ الَّذِیْنَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰہِ جَھْدَ اَیْمَانِھِمْ اِنَّھُمْ لَمَعَکُمْ حَبِطَتْ اَعْمَالُھُمْ فَاَصْبَحُوْا خٰسِرِیْنَ﴾ [المائدۃ ۵۲۔۵۳]

''جن لوگوں کے دلوں میں کھوٹ ہے آپ دیکھتے ہیں کہ وہ بھاگ بھاگ کر ان (یہود و نصاریٰ) کی طرف جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں (ان کے ساتھ دوستی نہ لگانے کی صورت میں) کسی مصیبت میں گرفتار ہوجانے کا اندیشہ ہے۔ اللہ تعالیٰ عنقریب ہی کسی فتح یا کسی اور بات کی بشارت سنائے گا.جس سے وہ ان باتوں پر نادم ہوں گے، جو انھوں نے اپنے جی میں پوشیدہ رکھی تھیں۔اور ایماندار کہیں گے، کیا یہی وہ لوگ ہیں جو بڑے مبالغہ سے اللہ کی قسمیں کھا کھا کر کہتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ان کے اعمال غارت ہوئے اور یہ ناکام ہوگئے۔''

یہ ان لوگوں کا وصف بیان کیا جارہا ہے جن کے دلوں میں بیماری ہے [نفاق کا مرض ہے]۔جو کہ کفار اور منافقین سے دوستی رکھتے ہیں۔پھر اس کے بعد فرمایا:

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَنْ یَّرْتَدَّ مِنْکُمْ عَنْ دِیْنِہٖ فَسَوْفَ یَاْتِی اللّٰہُ بِقَوْمٍ یُّحِبُّھُمْ وَ یُحِبُّوْنَہٗٓ اَذِلَّۃٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اَعِزَّۃٍ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ یُجَاھِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَ لَا یَخَافُوْنَ لَوْمَۃَ لَآئِمٍ ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ وَ اللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ٭﴾ [المائدۃ ۵۴]

''اے ایمان والو!تم میں سے جو شخص اپنے دین سے پھر جائے تو اللہ تعالیٰ بہت جلد ایسی قوم کو لائے گا جو اللہ کی محبوب ہوگی اور وہ بھی اللہ سے محبت رکھتی ہوگی وہ نرم دل ہونگے مسلمانوں پر سخت اور تیز ہونگے کفار پر، اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ بھی نہ کریں گے یہ ہے اللہ تعالیٰ کا فضل جسے چاہے دے، اللہ تعالیٰ بڑی وسعت والا اور زبردست علم والا ہے۔''

اس میں اللہ تعالیٰ نے مرتدین کا ذکر کیا؛ اور یہ بھی بیان فرمایا کہ وہ اللہ تعالیٰ کو ہرگز کوئی نقصان نہیں دے سکتے۔اور اللہ تعالیٰ ان کی جگہ ایک دوسری قوم کو لے آئے گا۔پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰہُ وَ رَسُوْلُہٗ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوا الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَ یُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَ ھُمْ

رٰکِعُوْنَ☆ وَ مَنْ یَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ﴾ [المائدۃ ۵۵۔۵۶]

''بیشک (مسلمانوں!) تمہارا دوست خود اللہ ہے اور اسکا رسول ہے اور ایمان والے ہیں جو نمازوں کی پابندی کرتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور رکوع (خشوع وخضوع) کرنے والے ہیں۔ اور جو شخص اللہ تعالیٰ سے اور اس کے رسول سے اور مسلمانوں سے دوستی کرے، وہ یقین مانے کہ اللہ تعالیٰ کی جماعت ہی غالب رہے گی۔''

یہ کلام ان لوگوں کے احوال کو متضمن ہے جو منافقین میں سے اسلام میں داخل ہوئے۔ اور مرتدین کے حال کو بھی متضمن ہے۔ اور ان لوگوں کے حال کو بھی شامل ہے جو ظاہری و باطنی طور پر اسلام وایمان پر ثابت قدم رہے۔

اس سیاق پر جو بھی انسان غور وفکر کرے گا؛ اسے علم الیقین حاصل ہو جائے گا یہ آیت ان تمام مؤمنین کے لیے عام ہے جو ان صفات سے موصوف ہیں۔ کسی ایک کے ساتھ خاص نہیں۔ نہ ہی حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ اور نہ ہی عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ نہ ہی عثمان و علی رضی اللہ عنہما اور کسی دوسرے کے ساتھ۔ مگر یہ حضرات سابقین اوّلین صحابہ ان میں بالاولیٰ داخل ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ اور مخالفین پر کامیابی؟:

چودھویں وجہ: جو شخص بھی اس روایت کے مذکورہ الفاظ میں غور وفکر کرے گا اس پر شیعہ مصنف کی نبی کریم ﷺ پر دروغ گوئی واضح ہو جائے گی۔: ''علی رضی اللہ عنہ تمام نیکوں کے قائد نہیں ہیں؛ بلکہ تمام نیکوں کے قائد محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔ اور ایسے ہی آپ تمام کفار کے قاتل بھی نہیں ہیں، بلکہ آپ نے بعض کفار کو قتل کیا ہے؛ جیسا کہ آپ کے علاوہ دوسرے لوگوں نے بھی بعض کفار کو قتل کیا ہے۔ آپ بھی کفار کو قتل کرنے والے مجاہدین میں سے ایک تھے۔ اور بعض کفار آپ نے ضرور قتل کیے ہیں۔

ایسے ہی شیعہ کا قول کہ: ''جو ان کی مدد کرے گا اس کی مدد کی جائے گی۔ اور جو ان کو بے یار و مددگار چھوڑے گا تو اسے بے یار و مددگار چھوڑ دیا جائے گا۔''

یہ خلاف واقع ہے۔ نبی کریم ﷺ حق بات کے علاوہ کچھ بھی نہیں فرماتے۔ خصوصاً شیعہ کے قول کے مطابق۔ اس لیے کہ شیعہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ پوری امت نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت تک حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بے یار و مددگار چھوڑے رکھا۔ [اور اگر شیعہ کی ذکر کردہ تفسیر صحیح ہوتی تو جن لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ساتھ چھوڑا تھا اور ان کی مدد کا حق ادا نہیں کیا تھا وہ ذلیل وخوار ہو جاتے حالانکہ ایسا نہیں ہوا۔ بلکہ وہ مظفر و منصور ہوئے اور انھوں نے بلاد فارس و روم اور قبط کو فتح کیا۔] یہ تاریخ کی مسلمہ حقیقت ہے کہ امت مسلمہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت تک ہر میدان میں کامیاب و کامران اور منصور رہی، ایسا غلبہ بعد میں کبھی حاصل نہیں ہوا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد امت کا شیرازہ بکھر گیا۔ ایک گروہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا معاون تھا اور دوسرا مخالف۔ تیسرا گروہ بالکل غیر جانبدار تھا۔ انہوں نے کسی بھی فریق کا ساتھ نہیں دیا۔ اور جن لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ساتھ دیا اور جنگیں لڑیں۔ وہ دوسرے لوگوں پر حتی کہ کفار پر بھی غالب نہ آسکے۔ بلکہ دوسرے لوگ ہی ان پر غالب رہے۔ اور اس معاملہ کی ڈور ان کے ہاتھوں میں رہی۔ اس کے جب حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ خلیفہ بن گئے تو مسلمانوں کو پھر سے کفار پر فتح نصیب ہوئی۔ انہوں نے علاقے فتح کرنا شروع کیے۔ ہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے دوسرے

بھائیوں کی طرح خوارج پر منصور و کامیاب رہے ہیں۔

اس کے برعکس وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین جنہوں نے کفار اور مرتدین سے قتال کیا تھا؛ اللہ تعالیٰ نے ان کی نصرت فرمائی اور بہت بڑی کامیابی سے نوازا۔ اور ایسے ہی نصرت نصیب ہوئی جیسے اللہ کا وعدہ تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿إِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ﴾ [غافر ۵۱]

''یقیناً ہم اپنے رسولوں کی اور ایمان والوں کی مدد زندگانی دنیا میں بھی کریں گے اور اس دن بھی جب گواہی دینے والے کھڑے ہوں گے۔''

وہ قتال جس کا حکم اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا تھا؛ جو مؤمنین نے آپ کے ساتھ مل کر کفار و[منافقین] مرتدین اور خوارج سے کیا؛ اس میں یقیناً تقوی و صبر کی وجہ سے کامیاب رہے اور بہت بڑی نصرت و فتح نصیب ہوئی۔ اس لیے کہ تقوی اور صبر و بنیادی ایمانی عنصر ہیں کے ساتھ فتح و نصرت معلق رہتی ہے۔

ایسے ہی [شیعہ مصنف کی ذکر کردہ] وہ دعا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انگوٹھی صدقہ کرنے کے بعد کی ؛ اس کا جھوٹ ہونا صاف ظاہر ہے۔ یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے ضرورت کے وقت کہیں بہت زیادہ اللہ کی راہ میں خرچ کیا جس کا بہت بڑا فائدہ بھی حاصل ہوا؛ یہ صدقہ یقیناً انگوٹھی کے صدقہ کرنے سے بہت زیادہ تھا۔

صحیحین میں ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: '' مجھے کسی کے مال نے اتنا فائدہ نہیں دیا ؛ جتنا فائدہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے مال نے دیا ہے۔'' ''میں سب لوگوں سے زیادہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے مال اور رفاقت کا ممنون ہوں۔'' اگر میں اہل زمین سے کسی کو گہرا دوست بنانے والا ہوتا تو ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بناتا۔ البتہ اسلامی اخوت و مودت کسی شخص کے ساتھ مختص نہیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے سوا کسی شخص کی کھڑکی مسجد کی جانب کھلی نہ رہے۔'' [اس کی تخریج گزر چکی ہے]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے غزوہ تبوک کے موقع پر اللہ کی راہ میں ایک ہزار اونٹ صدقہ میں دیئے۔ یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: '' آج کے بعد عثمان رضی اللہ عنہ جو بھی کرے گا' اسے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔'' [الترمذي ٥/ ٢٨٩]

شروع اسلام میں انفاق سبیل اللہ اور دین کی اقامت کے لیے خرچ کرنا ایک سائل پر خرچ کرنے سے بہت زیادہ باعث عظمت [واجر وثواب] تھا۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

'' میرے صحابہ کو گالی نہ دو۔ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے ! ، اگر تم میں سے کوئی شخص احد پہاڑ کے برابر سونا خرچ کر دے تو ان کے پاسنگ کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔'' [اس کی تخریج گزر چکی ہے]

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لَا يَسْتَوِي مِنْكُمْ مَنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْ بَعْدُ وَقَاتَلُوْا وَكُلًّا وَعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى﴾ [الحديد ١٠]

'' تم میں سے جنہوں نے فتح سے پہلے فی سبیل اللہ دیا ہے اور قتال کیا ہے وہ (دوسروں کے) برابر نہیں بلکہ ان کے بہت بڑے درجے ہیں جنہوں نے فتح کے بعد خیراتیں دیں اور جہاد کیا، ہاں بھلائی کا وعدہ تو اللہ تعالیٰ کا ان سب سے ہے۔''

ایسے ہی اسلام کے شروع کے ایام میں اقامت دین کے لیے جو کچھ اللہ کی راہ میں خرچ کیا گیا؛ اس کی کوئی مثال باقی نہیں رہی۔ جب کہ سائل کو ضرورت کے وقت کچھ دے دینا ایسی نیکی ہے جو قیامت تک کے لیے باقی ہے۔ جب اتنے عظیم الشان اور نفع بخش اور اہم ترین صدقات کے لیے بھی نبی کریم ﷺ نے کوئی ایسی دعا نہیں فرمائی تو پھر ایک سائل کو انگوٹھی دینے کی وجہ سے ایسی دعا کر سکتے ہیں؛ حالانکہ یہ احتمال بھی ہے کہ وہ سائل اپنے سوال میں جھوٹا ہو؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ روایت اور اس جیسی دوسری روایات ایک جاہل انسان کا من گھڑت جھوٹ ہے جس میں وہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی برابری کرنا چاہتا ہے۔ [ابوبکر رضی اللہ عنہ کی شان میں] اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى ۞الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى ۞ وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰى ۞ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ۞وَلَسَوْفَ يَرْضٰى﴾ [الليل ۱۷۔۲۱]

''اور عنقریب اس سے وہ بڑا پرہیز گار دور رکھا جائے گا۔ جو اپنا مال (اس لیے) دیتا ہے کہ پاک ہو جائے۔ حالانکہ اس کے ہاں کسی کا کوئی احسان نہیں ہے کہ اس کا بدلہ دیا جائے۔ مگر (وہ تو صرف) اپنے اس رب کا چہرہ طلب کرنے کے لیے (دیتا ہے) جو سب سے بلند ہے۔ اور یقیناً عنقریب وہ راضی ہو جائے گا۔''

[من گھڑت روایت کا پس پردہ محرک]:

[رافضی مصنف چاہتا ہے کہ] اس طرح کے فضائل جناب حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے بھی ثابت کیے جائیں۔ پس وہ ایسا نہیں کر سکا کہ شروع اسلام کے دنوں کے متعلق کوئی روایت گھڑ لیتا؛ تو اس کی جگہ یہ روایت گھڑ لی جسے صرف جاہل لوگوں میں پذیرائی حاصل ہو سکتی ہے۔ [جو حقائق جاننے والے لوگ ہوں وہ اس جھوٹ کو فوراً پکڑ لیتے ہیں]۔

نیز نبی کریم ﷺ کے لیے مدینہ طیبہ ہجرت کرنے اور نصرت و مدد حاصل ہونے کے بعد یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ یہ دعا فرمائیں کہ اے اللہ! میرے اہل خانہ میں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو میرا وزیر بنا دے؛ اور اس سے میری پشت کو مضبوط کر دے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی نصرت سے اور پھر مؤمنین کے ذریعہ آپ کی مدد فرمائی؛ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ﴾ [الأنفال ۶۲]

''[اللہ آپ کو کافی ہے] اسی نے اپنی مدد سے اور مومنوں سے آپ کی تائید کی ہے۔''

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا﴾ [التوبة ۴۰]

''اگر تم ان (نبی ﷺ) کی مدد نہ کرو تو اللہ ہی نے ان کی مدد کی اس وقت جبکہ انہیں کافروں نے (دیس سے) نکال دیا تھا، دو میں سے دوسرا جبکہ وہ دونوں غار میں تھے جب یہ اپنے ساتھی سے کہہ رہے تھے کہ غم نہ کر اللہ ہمارے ساتھ ہے۔''

جس وقت کفار نے آپ کو نکالا؛ اور اللہ تعالیٰ نے آپ کی مدد فرمائی اس وقت آپ دو تھے ایک رسول اللہ ﷺ اور دوسرے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ۔ اور غزوہ بدر کے موقع پر جب نبی کریم ﷺ کے لیے جھونپڑہ یا خیمہ لگایا گیا؛ تمام صحابہ

کرام میں سے اس خیمہ میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ داخل ہونے والے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ تھے۔تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کا رسول اللہ ﷺ کی نصرت میں مبارک حصہ اور قابل صد شکر کوششیں ہیں۔[اللہ انہیں جزائے خیر سے نوازے]۔

اور یہ بھی روایت کیا گیا ہے کہ جب احد کے دن حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنی تلوار لیکر آئے تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو دیتے ہوئے کہا:'' اسے دھوڈالو؛ اس میں مذمت کی کوئی بات نہیں' آج اس نے مجھے سچا کر دکھایا ہے۔تو نبی کریم ﷺ نے اس پر یہ فرمایا:'' اگر تم نے یہ اچھائی اور نیکی کی ہے تو یقیناً فلاں اور فلاں اور فلاں نے بھی ایسی کارکردگی دیکھائی ہے۔''[تاریخ ابن کثیر ٤/ ٤٧]

رسول اللہ ﷺ کی نصرت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے امثال وہمنو اصحابہ کو چھوڑ کر صرف آپ کی کوئی خصوصیت نہیں ہے۔ اور نہ ہی کسی ایسے موقع کا علم ہوسکا ہے جہاں پر نبی کریم ﷺ کو باقی صحابہ کو چھوڑ کر صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مدد کی ضرورت پڑی ہو۔نہ ہی زبانی کلامی مدد کی ضرورت پڑی اور نہ ہی جانی طور پر۔

[اہل اسلام پر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بغض کا الزام]:

یہ ایک بدیہی بات ہے کہ لوگوں کا نبی کریم ﷺ پر ایمان اور آپ کی اطاعت شعاری حضرت علی رضی اللہ عنہ کی وجہ سے نہ تھی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں کو دعوت دی ہو؛ اور نہ ہی اس کے علاوہ کوئی اور خاص سبب تھا جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کے مابین اسباب تھے۔بخلاف ازیں بنی اسرائیل ہارون علیہ السلام کو بے حد چاہتے تھے اور موسیٰ علیہ السلام سے خائف وہراساں رہتے تھے۔ہارون علیہ السلام ان سے الفت ومحبت کا سلوک روا رکھتے تھے۔

روافض کا دعویٰ ہے کہ اہل اسلام حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بغض رکھتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ انھوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت نہ کی اور ان کے بارے میں جونص تھی اس کو پوشیدہ رکھا۔پھر یہ کہنا کیوں کر درست ہے کہ نبی ﷺ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اسی طرح محتاج تھے جس طرح موسیٰ ہارون کے؟ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو لیجیے؛ ان کے دستِ حق پرست پر عشرہ مبشرہ میں سے چھ صحابہ نے اسلام قبول کیا تھا؛ ان صحابہ کے نام یہ ہیں: عثمان،طلحہ، زبیر؛ سعد،عبدالرحمن بن عوف،ابوعبیدہ (رضی اللہ عنہم اجمعین)۔

مگر ہمیں نہیں معلوم کہ سابقین اوّلین مہاجرین وانصار صحابہ میں سے کسی نے بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ یا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا ہو۔حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ سابقین صحابہ میں شامل ہیں۔عقبہ کی رات جب انصار نے رسول اللہ ﷺ کی بیعت کی تو رسول اللہ ﷺ نے انہیں مدینہ طیبہ روانہ فرمایا۔ان کے ہاتھ پر انصار کے سرداران جیسے حضرت اُسید بن حضیر رضی اللہ عنہ اور سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کیا تھا۔سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ وہ انسان ہیں جن کی موت پر اللہ تعالیٰ کا عرش کانپ گیا تھا۔

موسم حج میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نکلتے اور کفار کو اسلام کی دعوت دیتے۔اور دعوت کے میدان میں آپ کی بہت بڑی مدد کرتے۔بخلاف دوسرے لوگوں کے [انہیں شروع ایام اسلام میں یہ سعادت نصیب نہ ہوئی تھی]۔

یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا تھا:

'' اگر میں اہل زمین میں سے کسی کو گہرا دوست بنانے والا ہوتا تو ابو بکر رضی اللہ عنہ کو بناتا۔''[حوالہ گزر چکا ہے]۔

اور رسول اللہ ﷺ نے یہ بھی فرمایا تھا:

اے لوگو! مجھے تمہاری طرف مبعوث کیا گیا؛ میں نے کہا: میں اللہ کا رسول ہوں؛ تم نے کہا: جھوٹ بولتے ہو۔ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا: آپ سچ فرماتے ہیں۔ کیا تم میرے دوست کو یوں چھوڑ کر جا رہے ہو۔'' [البخاری ۵/ ۵]۔

پھر موسی علیہ السلام نے یہ دعا کفار کو اسلام کی دعوت پہنچانے سے پہلے کی تھی؛ تاکہ آپ کو مددگار میسر آجائے۔ اور ہمارے نبی کریم ﷺ نے مبعوث ہونے کے وقت سے اکیلے ہی لوگوں تک دین کی دعوت پہنچانی شروع کر دی تھی۔ اور باتفاق اہل علم سب سے پہلے جو لوگ ایمان لائے وہ چار ہیں: مردوں میں سے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ؛ عورتوں میں سے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا؛ بچوں میں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ؛ اور غلاموں میں سے حضرت زید رضی اللہ عنہ۔

اس جماعت میں سے دعوت کے میدان میں سب سے نفع بخش ہستی بالاتفاق حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ تھے۔ پھر ان کے بعد حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا۔ اس لیے کہ آزاد مردوں بالاتفاق حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ ایمان لانے والے پہلے شخص تھے۔ اور اس کے ساتھ ہی آپ اپنی جان و مال سے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ احسان کرنے میں پیش پیش رہتے تھے۔ مگر اس کے باوجود رسول اللہ ﷺ نے کبھی یہ دعا نہیں فرمائی کہ اللہ تعالیٰ کسی کے ذریعہ ان کی پشت کو مضبوط کر دے؛ نہ ہی ابو بکر رضی اللہ عنہ کے لیے یہ دعا کی اور نہ ہی کسی دوسرے کے لیے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت گزاری کرتے ہوئے؛ اس پر توکل کرتے ہوئے صبر و استقامت کے ساتھ ویسے ہی اٹھ کھڑے ہوئے جیسے اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿قُمْ فَأَنذِرْ ☆وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ☆وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ☆وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ☆وَلَا تَمْنُن تَسْتَكْثِرُ ☆وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ﴾ [المدثر ۲۔۷]

''اٹھ کھڑا ہو، پس ڈرا۔ اور اپنے رب ہی کی پس بڑائی بیان کر۔ اور اپنے کپڑے پس پاک رکھ۔ اور پلیدگی کو پس چھوڑ دے۔ اور (اس نیت سے) احسان نہ کر کہ زیادہ حاصل کرے۔ اور اپنے رب ہی کے لیے پس صبر کر۔''

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ﴾ [ھود ۱۲۳]

'پس تجھے اس کی عبادت کرنی چاہیے اور اسی پر بھروسہ رکھنا چاہیے۔''

پس جو انسان یہ خیال کرتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے سوال کیا تھا کہ وہ لوگوں میں سے کسی شخص کے سبب سے آپ کی پشت مضبوط کر دے؛ جس طرح حضرت موسی علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے سوال کیا تھا کہ میرے بھائی ہارون علیہ السلام سے میری پشت کو مضبوط کر دے؛ تو یقیناً اس انسان نے رسول اللہ ﷺ کے حق میں کوتاہی کی؛ اور آپ پر اپنی طرف سے ایک بہتان گھڑ لیا۔

اور اس میں کوئی شک نہیں کہ رافضیت شرک و نفاق اور الحاد سے نکلی ہوئی ہے۔ کبھی ان سے اس الحاد کا اظہار ہو جاتا ہے اور کبھی مخفی و پوشیدہ رہتا ہے۔

[موالات (دوستی) کی حقیقت]:

پندرھویں وجہ: ان سے کہا جائے گا کہ: اہل ایمان پر اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے دوستی رکھنا واجب ہے۔ پس وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی دوستی رکھتے ہیں۔ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت و دوستی ہر ایمان والے انسان پر ایسے ہی واجب ہے جیسے دوسرے اہل ایمان کی محبت و دوستی اہل ایمان پر واجب ہے۔

اللہ تعالیٰ موالات کے بارے میں فرماتے ہیں:

﴿وَاِنْ تَظٰهَرَا عَلَيْهِ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰهُ وَجِبْرِيْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ [التحریم ۴]

''اور اگر تم نبی کے خلاف ایک دوسرے کی مدد کروگی پس یقیناً اس کا کارساز اللہ ہے اور جرائیل اور نیک ایماندار۔''

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو بھی صالح مومن ہو اللہ تعالیٰ، اور جبریل امین سب رسول اللہ ﷺ کے مولیٰ ہیں اور آپ ان کے مولیٰ ہے۔ جب صالح مؤمنین آپ کے مولیٰ ہیں؛ اللہ تعالیٰ بھی آپ کا مولیٰ ہے؛ جبریل امین بھی آپ کے مولیٰ ہیں؛ اس کا معنی یہ نہیں کہ نبی کریم ﷺ ان کے متولی و متصرف ہونگے۔ جیسے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ﴾ (التوبۃ: ۷۱)

مومن مرد اور عورتیں باہم ایک دوسرے کے مولیٰ ہیں۔''

آیت سے معلوم ہوا کہ ہر مومن و متقی اللہ کا ولی ہے اور اس کا دوست ہے۔ اس سے کہیں بھی یہ مراد نہیں نکلتی کہ وہ آپ میں ایک دوسرے پر امیر ہوں یا معصوم ہوں؛ یا پھر اس مولیٰ کے بغیر کوئی دوسرا متولی نہیں ہوسکتا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ☆اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ كَانُوْا يَتَّقُوْنَ﴾

''آگاہ رہو کہ اللہ کے دوستوں پر نہ کوئی اندیشہ ہے اور نہ وہ غمگین ہوتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور (برائیوں سے) پرہیز رکھتے ہیں۔'' [یونس ۶۲۔۶۳]

پس ہر اہل ایمان والا مؤمن شخص اللہ کا دوست اور اللہ اسے دوست رکھتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ (البقرۃ: ۲۵۷)

''اللہ تعالیٰ اہل ایمان کا دوست ہے۔''

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاَنَّ الْكٰفِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ ﴾ [محمد ۱۱]

''وہ اس لئے کہ ایمان والوں کا کارساز خود اللہ تعالیٰ ہے اور اس لئے کہ کافروں کا کوئی کارساز نہیں۔''

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ الَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا .... وَ اُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ﴾ [الأنفال ۷۲۔۷۵]

''جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور اپنے مالوں اور جانوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور جن لوگوں نے ان کو پناہ

دی اور مدد کی ....اور رشتے ناطے والے ان میں سے بعض بعض سے زیادہ نزدیک ہیں اللہ کے حکم میں بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔''

ان تمام نصوص میں اہل ایمان کے مابین موالات اور دوستی ثابت ہے۔ یہ اس کا دوست ہے؛ وہ اس کا ولی و دوست ہے ؛ اور تمام اہل ایمان اللہ کے ولی اور آپس میں دوست ہیں' اور اللہ اور اس کا رسول اور فرشتے بھی اہل ایمان کے دوست ہیں۔
مذکورہ صدر آیات میں یہ کہیں بھی مذکور نہیں کہ جو کسی کا ولی ہوگا وہ اس کا متولی بھی ہوگا، اس کے علاوہ کوئی بھی اس کا متولی نہیں ہوگا۔ اور اس ولی کو اس پر متصرف بھی سمجھا جائے گا؛ باقی لوگوں کو نہیں۔

[ولی اور متولی میں فرق]:

سولھویں وجہ: وِلایت [واؤ کے نیچے زیر کے ساتھ]اور وَلایت [واؤ کے اوپر زبر کیساتھ] کا فرق علماء میں عام طور پر معروف ہے۔ وَلایت عداوت کی ضد ہے؛ ان نصوص میں اسی کا ذکر کیا گیا ہے۔اس سے وِلایت مراد نہیں جو کہ حکومت اور امارت کے معنی میں ہے۔ شیعہ کی جہالت کا یہ عالم ہے وہ ولی کو امیر سمجھتے ہیں۔اور وَلایت اور وِلایت میں کوئی فرق نہیں کر پاتے۔ چنانچہ امیر کو والی کہتے ہیں اور ولی نہیں کہتے۔ ہاں اسے ولی الامر کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے: (ولیت أمرکم) یعنی تمہارے امور کی زمام کار مجھے سونپی گئی ہے۔
جب کہ ولی کے ارادہ سے مولی کا لفظ بولنا بھی اہل عرب کے ہاں معروف نہیں ہے۔ [وہ اس لفظ کو ان معانی میں استعمال کرنا جانتے ہی نہیں]۔ بلکہ ولی کو مولی کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے والی کے معنی میں نہیں۔
یہی وجہ ہے کہ فقہاء نے اس مسئلہ میں اختلاف کیا ہے کہ جب والی اور ولی دونوں جنازہ میں موجود ہوں تو جنازہ کون پڑھائے ؛بعض نے کہا ہے کہ والی کو مقدم کیا جائے گا؛ یہ اکثر علماء کا قول ہے۔اور بعض کہتے ہیں: ولی کو مقدم کیا جائے گا۔
اس سے معلوم ہوا کہ موالات معادات کی ضد ہے۔ یہ وَلایت تمام اہل ایمان کے مابین ثابت ہے۔اور یہ وصف خلفاء اربعہ؛ تمام اہل بدر اور اہل بیعت رضوان کے مابین بھی ثابت ہے۔ان میں سے ہر ایک دوسرے کا ولی اور دوست ہے۔اس آیت میں کہیں بھی یہ دلیل نہیں ہے کہ ان میں سے کوئی ایک دوسرے پر امیر ہے۔ بلکہ یہ نظریہ کئی وجوہات کی بنا پر باطل ہے۔
اگر اس سے شیعہ مصنف کی اس سے ولایت سے مراد امارت ہو؛ تو اسے یوں کہنا چاہیے تھا: بیشک تم پر اللہ اور اس کا رسول اور اہل ایمان متولی ہیں۔اس نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے لیے متولی کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ کیونکہ عربی زبان میں دوست کے ولی اور حاکم کے لیے متولی یا والی کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ کیونکہ لفظ ولی اور ولایت میں اور والی میں بہت بڑا فرق ہے۔ یہ آیت تمام مؤمنین کے لیے عام ہے جب کہ امارت تمام لوگوں کے لیے عام نہیں ہوسکتی۔
سترھویں وجہ: اگر اس ولایت سے مراد امارت ہوتی تو یوں کہا جاتا: ''بیشک تم پر اللہ اور اس کا رسول اور اہل ایمان متولی ہیں۔اس نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے لیے متولی کا لفظ استعمال نہیں کیا۔اس لیے کہ جس کو امیر بنایا جاتا ہے اس کے لیے والی کا لفظ استعمال کرتے ہیں کیونکہ عربی زبان میں دوست کے ولی اور حاکم کے لیے متولی یا والی کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔
اٹھارھویں وجہ: اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے لیے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ اپنے بندوں پر متولی ہے۔ یا وہ ان کا امیر ہے۔ اللہ تعالیٰ کی شان اس سے بہت بلند ہے۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہی ان کا خالق و مالک ؛ اور رازق ہے؛ ان کا رب اور بادشاہ ہے۔ تمام خلقت اسی کی ہے؛ اور حکم اس کا چلتا ہے۔ ایسے نہیں کہا جاسکتا کہ اللہ تعالیٰ امیر المؤمنین ہے؛ جیسا کہ متولی کو کہا جاتا ہے۔ مثلاً

حضرت علی رضی اللہ عنہ امیر المؤمنین ۔ بلکہ رسول اللہ ﷺ کے لیے بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ آپ لوگوں پر متولی ہیں ۔ یا آپ ان کے امیر ہیں ۔ اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ کی شان اس سے بہت بلند ہے ۔ بلکہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بھی صحابہ کرام امیر المؤمنین نہیں کہا کرتے تھے؛ بلکہ آپ خلیفہء رسول اللہ ﷺ کے لقب سے یاد کرتے تھے ۔ سب سے پہلے جن کے لیے امیر المؤمنین کا لفظ استعمال کیا گیا وہ حضرت امیر المؤمنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ہیں ۔

ایک روایت میں آتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ ایک سریہ پر امیر تھے ۔ تو آپ کو امیر المؤمنین کہہ کر پکارا گیا ۔ لیکن آپ کی یہ امارت اس سریہ کے ساتھ خاص تھی ۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے پہلے کسی کو بھی مسلمانوں کی امارت کی وجہ سے امیر المؤمنین کہہ کر نہیں پکارا گیا ۔ اور حقیقت میں آپ ہی اس نام کے سب سے زیادہ حق دار تھے ۔

ولایت عداوت کی ضد ہے ۔ بیشک وہ [اللہ تعالیٰ] نیک اہل ایمان سے دوستی رکھتا ہے ۔ اہل ایمان اس سے محبت کرتے ہیں اور وہ اہل ایمان سے محبت کرتا ہے ۔ وہ ان سے راضی ہوتا ہے؛ یہ اس سے راضی ہوتے ہیں ۔ اور جو اللہ کے کسی ولی سے دشمنی رکھتا ہے گویا کہ وہ اللہ تعالیٰ سے اعلان جنگ کرتا ہے ۔ یہ ولایت اس کی رحمت اور احسان ہے ۔ یہ مخلوق کی آپس میں ولایت اور دوستی کی طرح نہیں ہے جو کسی ضرورت پر مبنی ہوتی ہے ۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّ لَمْ یَكُنْ لَّهٗ شَرِیْكٌ فِی الْمُلْكِ وَ لَمْ یَكُنْ لَّهٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ﴾

''اور یہ کہہ دیجئے کہ تمام تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں جو نہ اولاد رکھتا ہے نہ اپنی بادشاہت میں کسی کو شریک ساجھی رکھتا ہے اور نہ وہ کمزور ہے کہ اسے کسی کی ضرورت ہو ۔'' [الإسراء ۱۱۱]

پس ایسا نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کمزور ہے کہ اسے کسی کی ضرورت ہو؛ بلکہ اللہ تعالیٰ تو خود یہ فرماتے ہیں:

﴿مَنْ كَانَ یُرِیْدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِیْعًا﴾ [فاطر ۱۰]

''جو شخص عزت حاصل کرنا چاہتا ہو تو اللہ تعالیٰ ہی کی ساری عزت ۔''

بخلاف بادشاہوں کے؛ بادشاہ جن لوگوں سے دوستی کرتے ہیں' وہ اپنی ضرورت کے لیے اس سے دوستی کرتے ہیں ۔ [اس لیے کہ وہ اس طرح سے اپنے مددگار پیدا کرتے ہیں] ورنہ ان کا کوئی مددگار نہیں ہوتا ۔

انیسویں وجہ: جس پر بھی کوئی عادل امام حاکم بن جائے اس کے لیے لازمی نہیں ہے کہ اللہ کی جماعت میں سے ہو' اور ہمیشہ غالب ہی رہے ۔ بلکہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ عادل حکمران کفار اور منافقین پر بھی حکومت کرتے ہیں ۔ مدینہ طیبہ میں رسول اللہ ﷺ کے حکم کے تحت منافق اور ذمی بھی رہتے تھے ۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حکمرانی میں کفار بھی تھے اور منافقین بھی ۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَمَنْ یَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ۝﴾ [المائدة ۵۶]

''اور جو شخص اللہ تعالیٰ سے اور اس کے رسول سے اور مسلمانوں سے دوستی کرے، وہ یقین مانے کہ اللہ تعالیٰ کی جماعت ہی غالب رہے گی ۔''

اگر یہاں پر مراد امارت یا حکومت ہوتی تو پھر معنی یہ ہوتا کہ جو کوئی بھی اہل ایمان پر والی بن جائے ؛ وہ اللہ کی غالب آنے والی جماعت میں سے ہوگا ۔ ایسا نہیں ہے ۔ اس لیے کہ کفار اور منافقین اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کی قضاء وقدر کے ماتحت

ہیں' حالانکہ اللہ تعالیٰ کفار سے دوستی نہیں کرتا؛ بلکہ ان سے نفرت کرتا ہے۔

امام علی رضی اللہ عنہ کے اثبات میں دوسری دلیل:

اشکال: شیعہ مصنف لکھتا ہے:''امامت علی رضی اللہ عنہ (بلا فصل) کی دوسری دلیل یہ آیت قرآنی ہے:

﴿يَاۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَ اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ﴾ [المائدة ٦٧]

''اے رسول جو کچھ بھی آپ کی طرف آپ کے رب کی جانب سے نازل کیا گیا ہے پہنچا دیجئے۔اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو آپ نے اللہ کی رسالت ادا نہیں کی۔''

بالاتفاق یہ آیت کریمہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی۔-جمہور میں سے-ابونعیم اپنی سند سے ابن عطیہ سے روایت کرتے ہیں' آپ بیان کرتے ہیں کہ یہ''آیت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں اتری۔''

تفسیر ثعلبی میں ہے:اس کا معنی یہ ہے کہ:''آپ کے رب نے آپ پر جو کچھ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضائل کے بارے میں نازل کیا ہے؛اس کی تبلیغ کیجیے۔اس کے نزول کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا:''مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَعَلِيٌّ مَوْلَاهُ۔''''جس کا میں مولی ہوں' علی بھی اس کا مولی ہے۔''

ظاہر ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ وعمر رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ کرام کے اجماعاً مولیٰ تھے، بنا بریں حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کے بھی مولیٰ ہوں گے۔لہٰذا وہی امام برحق ہوں گے۔

تفسیر ثعلبی میں ہے:''سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے غدیر خُم کے روز صحابہ کو پکارا جب سب جمع ہو گئے تو آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا:'' مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَعَلِيٌّ مَوْلَاهُ۔''

چنانچہ یہ بات جنگل کی آگ کی طرح مشہور ہوگئی، جب حارث بن نعمان فہری رضی اللہ عنہ نے آپ کا یہ ارشاد مبارک سنا تو اپنی اونٹنی پر سوار ہو کر مدینہ پہنچا۔اپنا اونٹ وادی میں بٹھایا اور اس کو باندھ دیا؛ پھر وہ بارگاہ رسالت میں حاضر ہوا۔آپ چند صحابہ رضی اللہ عنہم سمیت تشریف فرما تھے۔اس نے کہا:

''اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! آپ نے ہمیں دو شہادتوں کا حکم دیا؛ ہم نے آپ کی بات مان لی۔پھر آپ نہیں ہمیں پانچ نمازوں کا حکم دیا؛ ہم نے آپ کی بات مان لی، پھر آپ نے ہمیں اپنے اموال سے زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم دیا؛ ہم نے آپ کی بات مان لی؛ اور آپ نے ہمیں حکم دیا کہ ماہ رمضان کے روزے رکھیں؛ ہم نے آپ کی بات مان لی؛ آپ نے ہمیں بیت اللہ کا حج کرنے کا حکم دیا؛ ہم نے آپ کی بات مان لی۔پھر آپ اس پر بھی راضی نہیں ہوئے۔اب آپ نے اپنے چچازاد بھائی علی کا سر اونچا کر دیا اور اس کو ہم پر فوقیت بخشی ہے،اور آپ نے فرمایا:'' مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَعَلِيٌّ مَوْلَاهُ ۔''کیا آپ اپنی طرف سے یہ کہہ رہے ہیں یا اللہ کے حکم سے یہ بات کہہ رہے ہیں؟

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر فرمایا: اللہ کی قسم! یہ اللہ کا حکم ہے۔'' چنانچہ حارث یہ کہتے ہوئے اپنی سواری کی طرف رخصت ہو گیا کہ:''اے اللہ! اگر یہ بات تیری جانب سے حق ہے تو ہم پر پتھروں کی بارش برسا یا ہمیں دردناک عذاب میں مبتلا کر۔''

ابھی وہ منزل مقصود پر نہیں پہنچا تھا کہ ایک پتھر اس کے سر پر گرا اور دُبر سے نکل گیا جس سے اس کی موت واقع ہوگئی۔

تب یہ آیت اتری: [اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں]:

﴿سَاَلَ سَآئِلٌ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ ☆لِّلْكٰفِرِينَ لَيْسَ لَهٗ دَافِعٌ ☆مِّنَ اللّٰهِ﴾ [المعارج ۱۔۳]

''ایک سوال کرنے والے نے اس عذاب کا سوال کیا جو واضح ہونے والا ہے۔کافروں پر، جسے کوئی ہٹانے والا نہیں۔اللہ کی طرف سے۔''نقاش نے بھی اپنی تفسیر میں یہ روایت بیان کی ہے۔(شیعہ مصنف کا بیان ختم ہوا)

جواب: اس کے جواب میں کئی نکات ہیں:

پہلی وجہ: ہم کہتے ہیں کہ یہ دلیل پہلی دلیل سے بھی زیادہ جھوٹی ہے۔ہم آگے چل کر اس کی تفصیل بیان کریں گے۔ انشاء اللہ وتعالی۔رافضی کا یہ قول کہ یہ آیت بالاتفاق حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی۔'' یہ بہت بڑا اور صریح کذب ہے جو کہ اس آیت کی تفسیر میں کہا گیا ہے۔ بلکہ یہ بات کسی بھی ایسے عالم نے نہیں کہی جو تفسیر کو اچھی طرح جانتا ہے۔

باقی رہیں ابونعیم، ثعلبی اور نقاش اور واحدی کی تصانیف تو محدثین کرام کا اتفاق ہے کہ ان کتب میں لا تعداد جھوٹی روایات موجود ہیں۔اور ثعلبی کی اس روایت کے بارے میں بھی محدثین کا اتفاق ہے کہ یہ موضوع اور جھوٹی روایت ہے۔ہم آگے چل کر دلائل کے ساتھ واضح کریں گے کہ یہ روایت جھوٹی ہے۔اور ثعلبی کا شمار محدثین میں نہیں ہوتا۔

لیکن ہمارا مقصد یہ ہے کہ یہاں پر ایک قاعدہ کی یاددلائی جائے۔منقولات میں بہت ساری جھوٹی روایات بھی ہیں اور بہت ساری سچی روایات بھی ہیں۔احادیث وروایات میں [صحیح اور موضوع میں فرق] کے بارے میں ان علماء پر اعتماد کیا جائے گا جو حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے امین ہیں۔جس طرح نحوی مسائل میں علمائے نحو کی طرف رجوع کیا جاتا ہے اور قراءت، لغت کے مسائل میں اہل لغت کی طرف اور طب کے مسائل میں ان علماء کی طرف رخ کیا جاتا ہے جو ان علوم میں ماہرانہ بصیرت رکھتے ہیں اس لیے کہ ''لِكُلِّ فَنٍّ رِجَالٌ۔'' ''ہر فن کے لیے اس کے اہل لوگ ہوتے ہیں۔''

[محدثین کرام اور ان کی خدمات جلیلہ]:

محدثین کرام بہت زیادہ قدر ومنزلت رکھتے ہیں۔سب لوگوں کی نسبت حق وصداقت کے زیادہ طلب گار تھے۔ان کی منزلت باقی علماء سے بہت اونچی ہے؛اور ان میں دین داری زیادہ پائی جاتی ہے۔یہ لوگ سچائی اور امانت داری میں باقی سب لوگوں پر فائق ہیں۔جرح وتعدیل کے بیان کرنے میں ان کا علم اور تجربہ بہت زیادہ ہے۔

[[جیسا کہ علم حدیث سے واقفیت رکھنے والے حضرات کلیۃً اس سے آگاہ ہیں۔چنانچہ جس روایت کو وہ بالاتفاق ضعیف یا لغو قرار دیں وہ ساقط عن الاحتجاج ہوگی اور جس کی صحت پر متفق ہوں وہ صحیح ہوگی اور جس میں وہ مختلف الخیال ہوں اس میں عدل وانصاف کے تقاضا کے مطابق غور وفکر کیا جائے گا۔محدثین کرام علم حدیث کا معیار ومدار ہیں۔شہرۂ آفاق محدثین حضرات کے اسماء گرامی حسب ذیل ہیں]]:

امام مالک، شعبہ، اوزاعی، لیث، سفیان بن عیینہ، سفیان ثوری، ذوالنون، حماد، ابن مبارک، یحییٰ قطان، عبدالرحمن بن مہدی، وکیع، ابن علیہ، شافعی، عبدالرزاق، فریابی، ابونعیم، قعنبی، حمیدی، ابوعبید، ابن المدینی، احمد، اسحاق، ابن معین،

ابو بکر رضی اللہ عنہ بن ابی شیبہ، ذہلی، بخاری، ابوزرعہ، ابو حاتم، ابو داود، مسلم، موسیٰ بن ہارون، صالح جزرہ، نسائی، ابن خزیمہ، ابو احمد بن عدی۔ ابن حبان، دارقطنی اور دیگر محدثین و ماہرین علم الرجال و جرح وتعدیل (رحمہم اللہ)۔

معرفت رجال کے موضوع پر متعدد چھوٹی بڑی کتب تصنیف کی گئی ہیں۔ چند ایک کتب کے نام حسب ذیل ہیں۔

طبقات ابن سعد، تاریخ صغیر بخاری، تاریخ کبیر بخاری، کلام ابن معین، کلام احمد بروایت تلامذہ، کتاب یحییٰ بن سعید القطان، کتاب علی بن مدینی، تاریخ یعقوب الفسوی، ابن ابی خیثمہ، ابن ابی حاتم، عقیلی، ابن عدی، ابن حبان، دارقطنی، مسند طبرانی، مسند احمد، مسند اسحاق، مسند ابوداود، مسند ابن ابی شیبہ، مسند العدنی، مسند ابن منیع، مسند ابویعلی، مسند بزار۔

مندرجہ ذیل کتب حدیث فقہی ابواب کی ترتیب کے مطابق جمع کی گئی ہیں:

موطا، سنن سعید بن منصور، صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ترمذی، سنن نسائی، سنن ابی داؤد، سنن ابن ماجہ اور دیگر لا تعداد کتب حدیث جن کا ذکر طوالت کا موجب ہے۔ یہ عظیم الشان علم باقی تمام اسلامی علوم میں عظمت و منزلت رکھتا ہے۔

خلاصہ کلام! اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ رافضی اس علم میں بہت ہی کم معرفت رکھتے ہیں تمام بدعتی اور گمراہ فرقوں میں اس علم میں رافضیوں سے بڑھ کر کوئی دوسرا جاہل نہیں۔

باقی گمراہ فرقوں میں اس علم کے بارے میں کوتاہی پائی جاتی ہے؛ جیسے معتزلہ؛ مگر معتزلہ بھی خوارج سے زیادہ عالم ہوتے ہیں اور خوارج اپنی جہالت کے باوجود روافض سے زیادہ سچے؛ ان سے بڑے عالم؛ زیادہ دین دار؛ اور خوف الٰہی رکھنے والے ہوتے ہیں۔ بلکہ یہ حقیقت ہے کہ خوارج جان بوجھ کر جھوٹ نہیں بولتے۔ بلکہ وہ دیگر لوگوں کی نسبت زیادہ سچے ہوتے ہیں۔ معتزلہ بھی باقی تمام فرقوں کی طرح ہیں۔ ان میں سچے بھی ہیں اور جھوٹے بھی؛ لیکن ان میں حدیث اور علوم حدیث کا وہ اہتمام نہیں پایا جاتا جو کہ اہل سنت والجماعت کے ہاں پایا جاتا ہے۔ اس لیے کہ یہ لوگ حدیث کو دین کا حصہ سمجھتے ہیں' [اس لیے انہیں معرفت حدیث کی ضرورت پڑتی ہے]۔ تو ضرورت ہوتی ہے کہ سچائی کو پہچان سکیں۔ جب کہ خوارج ایک دوسری راہ کے مسافر ہیں جسے انہوں نے خود ہی گھڑ لیا ہے' اور اسی پر ان کا اعتماد ہے [وہ نہ جھوٹی روایات سے احتجاج کرتے ہیں اور نہ ہی صحیح روایات سے۔ انھوں نے از خود کچھ قواعد گھڑ رکھے ہیں اور وہ انہی کو پیش نظر رکھتے ہیں]۔ جس میں ان کے ہاں حدیث کا ذکر تک نہیں پایا جاتا؛ بلکہ وہ اپنے اصول میں قرآن تک کو ذکر نہیں کرتے۔ صرف اس سے تقویت حاصل کرنے کے لیے؛ اعتماد کے لیے نہیں۔

روافض کا یہ عالم ہے کہ عقل و نقل دونوں سے تہی دامن ہیں۔ نہ ہی وہ کسی روایت کی اسناد دیکھتے ہیں اور نہ ہی باقی ساری شرعی اور عقلی دلیلوں کا خیال کرتے ہیں کہ کیا یہ ان کے موافق ہیں یا مخالف۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں کوئی بھی صحیح اور متصل سند نہیں پائی جاتی۔ بلکہ ان کے ہاں جو بھی سند متصل ہوگی؛ اس میں کوئی نہ کوئی راوی ضرور ایسا ہوگا جس پر جھوٹ بولنے کی تہمت ہوگی یہ پھر وہ کثرت کے ساتھ غلطیاں کرنے والا ہوگا۔

رافضی اس باب میں یہودیوں سے مشابہت رکھتے ہیں۔ ان کے ہاں بھی کوئی سند نہیں پائی جاتی۔ جب کہ اسناد اس امت کی خصوصیات میں سے ہے۔ اور پھر اہل اسلام میں احادیث وآثار اور اسانید کی پہچان اہل سنت والجماعت کا خاصہ بن

کر رہ گیا ہے۔ روافض کے نزدیک کسی حدیث کی صحت کی علامت یہ ہے کہ وہ اس کے افکار و معتقدات سے ہم آہنگ ہو، امام عبد الرحمٰن بن مہدی فرماتے ہیں:

''اہل علم موافق و مخالف سب احادیث لکھتے ہیں، مگر مبتدعین وہی روایات لکھتے ہیں جن سے انکے نظریات کی تائید ہوتی ہو۔''

پھر یہ کہ ان کے پہلے لوگ بہت زیادہ جھوٹ بولتے تھے۔ان کی روایات ان لوگوں تک منتقل ہوئیں جو صحیح اور سقیم کی معرفت سے عاری تھے۔پس ان کے بس میں صرف اتنا ہی تھا کہ یا تو تمام روایات کی تصدیق کریں اور یا پھر تمام روایات کی تکذیب کریں۔اور غیر مستند اور منفصل دلائل سے استدلال کرتے رہیں۔

ہم شیعہ سے پوچھتے ہیں کہ آیا تم نقاش وثعلبی وابونعیم کی مرویات ہر حال میں قبول کرتے ہو، مخالف یا موافق ہوں؟ یا مطلقاً ان کو ٹھکرا دیتے ہو؟ یا موافق روایات کو قبول کرتے اور مخالف کی تکذیب کرتے ہو؟

ابونعیم نے اپنی کتاب ''الحلیہ'' میں فضائل صحابہ رضی اللہ عنہم جمع کیے ہیں۔ان میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے مناقب پر ایک کتاب ہے۔ ایسے ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مناقب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مناقب موجود ہیں۔ ان میں صحیح روایات بھی ہیں' ضعیف بھی ہیں؛ بلکہ بعض منکر روایات بھی موجود ہیں ۔ ابونعیم اپنی منقولات کا خوب علم رکھنے والے انسان تھے۔لیکن آپ اور آپ کے امثال ہر طرح کی روایات جمع کرتے ہیں تا کہ یہ پتہ چل جائے کہ اس باب میں یہ روایت بھی موجود ہے۔اور لوگوں کو روایات کے موجود ہونے کا پتہ چل جائے۔ان کی مثال اس مفسر کی ہے جو تفسیر میں لوگوں کے اقوال نقل کرتا ہے؛ اور فقیہ جو فقہ میں لوگوں کے اقوال ذکر کرتا ہے ؛ اور مصنف جو لوگوں کے دلائل ذکر کرتا ہے ۔ تا کہ لوگوں کو ان چیزوں کا پتہ چل جائے۔ اگر چہ وہ ان میں سے بہت ساری چیزوں کے صحیح ہونے کا اعتقاد نہیں بھی رکھتا؛ بلکہ انہیں ضعیف سمجھتا ہے۔اس لیے کہ وہ خود کہتا ہے: میں نے وہی چیزیں ذکر کی ہیں جو میرے علاوہ دوسرے لوگوں نے نقل کی ہیں۔اس کی ذمہ داری اس کے قائل پر ہوتی ہے نقل کرنے والے پر نہیں۔

بہت ساری ایسی کتابیں جو کہ عبادات کے فضائل اور فضائل اوقات یا اس طرح کے دیگر عنوانات پر لکھی گئی ہیں؛ ان میں بہت ساری ضعیف احادیث کو جمع کر دیا گیا ہے' بلکہ موضوع روایات تک موجود ہیں۔اس پر اہل علم کا اتفاق ہے۔جیسا کہ رجب کے روزوں کے بارے میں جو احادیث بیان کی جاتی ہیں اہل علم کے ہاں وہ تمام ضعیف ہی نہیں بلکہ جھوٹی ہیں۔

ایسے ہی صلاۃ رغائب جو رجب کے پہلے جمعہ کی رات کو پڑھی جاتی ہے؛ اور نصف شعبان کا الفیہ ؛ اور فضائل عاشوراء محرم کے بارے میں جو اہل و عیال کے اخراجات میں وسعت دینے کی روایت ہے؛ اور مصافحہ کے فضائل ؛ اور مہندی اور خضاب کے فضائل ؛غسل وغیرہ کے فضائل ؛ عاشوراء کے دن کی نماز ۔ یہ تمام روایات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ ہیں۔ عاشوراء کے روزہ کے علاوہ اس دن کی فضیلت کے بارے میں کوئی بھی صحیح روایت موجود نہیں۔

امام حرب الکرمانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:''میں نے احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے اس روایت کے متعلق پوچھا کہ: جو کوئی عاشوراء کے دن اپنے اہل خانہ کے کھانے میں وسعت کرتا ہے' اللہ تعالیٰ سارے سال کے لیے اس کے رزق میں

وسعت پیدا کر دیتے ہیں۔تو آپؒ نے فرمایا: اس روایت کی کوئی اصل [بنیاد] ہی نہیں ہے۔''

فضائل صحابہ حضرت علی اور دوسرے اصحاب کے بارے میں بہت سارے لوگوں نے کتابیں لکھی ہیں ؛ مثلاً : خیثمہ بن سلیمان طرابلسی وغیرہ۔خیثمہ ابونعیم سے پہلے گزرے ہیں۔ابونعیم ان سے ان کی اجازت سے نقل کرتے ہیں۔ابونعیم اور اس کے امثال کی عادت ہے کہ جو کچھ بھی اس باب میں موجود ہوتا ہے اور جو کچھ سنتے ہیں وہ تمام روایات نقل کر دیتے ہیں۔

اگر شیعہ ہر حال میں ان کتابوں میں موجود تمام روایات قبول کرتے ہیں؛ تو ان کتابوں میں بہت ساری ایسی روایات بھی ہیں جو ان کے عقیدہ سے ٹکراؤ رکھتی ہیں۔اور اگر تمام روایات کو رد کرتے ہیں تو پھر روایت کو محض ان کی طرف منسوب کرنے سے ہی ان سے استدلال کرنا باطل ٹھہرا۔ ور اگر موافق روایات کو قبول اور مخالف روایات کو رد کرتے ہیں تو ان کے مخالف کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ کہے کہ اس طرح کا کلام باطل ہے[اور ان کی مقبول روایات کو مسترد کر دے۔اور ان کی رد کردہ روایات سے استناد کرے۔لوگوں میں یہ بات عام طور سے رائج ہے کہ وہ مناقب ومثالب کے بارے میں ہر قسم کی روایات کو قبول کر لیتے ہیں]۔

حقیقت تو یہ ہے کہ ایسی روایات سے مذہب کی صحت پر استدلال کرنا ہرگز جائز نہیں۔اس لیے کہ اس سے کہا جاسکتا ہے کہ: اگر تم اپنے مذہب سے ہٹ کر اس حدیث کی صحت کو جانتے تھے ؛ تو پھر اپنے مذہب کے صحیح ہونے پر دلیل لاؤ۔اور اگر تم اس بنا پر اس روایت کو صحیح سمجھتے ہو کہ یہ تمہارے مذہب کے موافق ہے ؛ تو اپنے مذہب کی بنیاد پر روایت کو صحیح کہنا ممتنع ہے۔ اس لیے کہ اس صورت میں مذہب کا صحیح ہونا اس حدیث پر موقوف ہوگا۔اور حدیث کا صحیح ہونا مذہب پر موقوف ہوگا۔اس سے دور لازم آئے گا۔ جب کہ دور کا لازم آنا ممتنع ہے۔

مزید برآں کہ اگر تم نے کسی اور سند سے اس روایت کی صحت معلوم کی تھی ؛ تو اس سے اس سند کا بھی صحیح ہونا لازم نہیں آتا۔اس لیے کہ کبھی کبھار انسان کسی دوسرے پر کچھ جھوٹ بھی بول لیتا ہے اگر چہ وہ بات حق ہی کیوں نہ ہو۔ بہت سارے لوگ نبی کریم ﷺ سے ایسے اقوال روایت کرتے ہیں؛ جو اقوال بذات خود حق ہیں ؛ لیکن رسول اللہ ﷺ کا فرمان نہیں ہیں۔پس کسی چیز کے سچا ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ رسول اللہ ﷺ نے بھی فرمایا ہو۔

اور اگر تمہیں اس کی صحت اسی طریق سے معلوم ہوئی ہے ؛ تو یہ بھی ممنوع ہے۔کیونکہ ایسا نہیں ہوسکتا کہ کسی چیز کے صحیح ہونے سے اس کی اصل صحت کو ثابت کیا جائے ؛ اس سے دور لازم آئے گا۔

پس یہ بات ثابت ہوگئی کہ اپنے مذہب کی موافقت ثابت کرنے کے لیے اس حدیث کی صحت ثابت نہیں ہوسکتی ؛ خواہ مذہب کی صحت معلوم ہو یا نہ معلوم ہو۔

ہر وہ انسان جس کو منقولات سے ادنی سا بھی واسطہ ہے ؛ وہ جانتا ہے کہ ان میں سچ اور جھوٹ ہر طرح کی چیزیں پائی جاتی ہیں۔اور لوگوں نے عیب جوئی اور فضائل بیان کرنے کے لیے بہت سارے جھوٹ بھی گھڑ لیے ہیں۔جیسا کہ دوسرے کئی امور میں بھی جھوٹ بولا گیا ہے۔اور ان روایات میں بھی جھوٹ ہے جو ان کے موافق یا مخالف ہیں۔

ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ حضرت ابوبکر و عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین کے فضائل میں بہت سارا جھوٹ بھی شامل ہے جیسا کہ

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضائل میں بھی بہت ساری روایات جھوٹی ہیں۔لیکن جتنے بھی بدعتی اور ہویٰ پرست گروہ ہیں؛ ان میں رافضیوں سے بڑھ کر جھوٹا کوئی نہیں ہے۔ بخلاف دوسرے لوگوں کے؛ بلاشبہ خوارج بہت کم جھوٹ بولتے ہیں؛ بلکہ وہ اپنی بدعت اور گمراہی کے باوجود لوگوں میں سب سے سچے شمار ہوتے ہیں۔

جب کہ اہل علم اور اہل دین لوگ کسی روایت کی تصدیق یا تکذیب صرف اس بنا پر نہیں کرتے کہ وہ ان کے عقیدہ کے موافق ہے۔ بلکہ کبھی کوئی انسان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اس امت کے فضائل میں بہت ساری احادیث نقل کرتا ہے تو انہیں صرف اس وجہ سے رد کر دیتے ہیں کہ وہ ان کا جھوٹ ہونا جانتے ہیں۔اور بہت ساری احادیث کو ان کے صحیح ہونے کی وجہ سے قبول کر لیتے ہیں۔اگر چہ ان کا ظاہر ان کے عقیدہ کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ اس لیے کہ یا تو ان کے بارے میں وہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ یہ احادیث منسوخ ہیں؛ یا پھر ان کی کوئی ایسی تفسیر ہے جس کی مخالفت وہ نہیں کرتے۔

منقولات میں اصل یہ ہے کہ ائمہ نقل اور اس فن کے علماء کی طرف رجوع کیا جائے۔اور جو کوئی ان کیساتھ اس علم میں شریک ہوتا ہے؛ وہ بھی ان کے علوم سے آگاہ ہو جاتا ہے۔اور یہ ضروری ہے کہ کسی روایت کے صحیح یا ضعیف ہونے پر علیحدہ سے تفصیل ہونی چاہیے؛ وگرنہ صرف کسی کے اتنا کہہ دینے سے کہ ''فلاں نے اسے روایت کیا ہے'' قابل حجت نہیں ہوسکتا؛ نہ ہی اہل سنت کے ہاں اور نہ ہی اہل شیعہ کے ہاں۔اور مسلمانوں میں کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو ہر مصنف کی ہر روایت سے استدلال کرنے لگ جائے؛ پس ہر وہ حدیث جسے بطور حجت پیش کیا جائے ہم سب سے پہلے اس کی صحت کا مطالبہ کریں گے۔

اہل علم کا اتفاق ہے کہ صرف کسی روایت کو ثعلبی کی طرف منسوب کر دینے سے اس کی صحت ثابت نہیں ہو جاتی۔یہی وجہ ہے کہ وہ علماء حدیث جو مرجع سمجھے جاتے ہیں انہوں نے اپنی کتابوں میں کوئی ایسی روایت نقل نہیں کی۔نہ ہی صحاح وسنن میں نہ ہی مسانید و معاجم میں؛ اور نہ ہی کسی دوسری معتبر کتاب میں۔اس لیے کہ ایسی روایات کا جھوٹ ہونا کسی ادنی علم رکھنے والے پر بھی مخفی نہیں رہ سکتا۔

[بے بنیاد روایات]:

ایسی روایات اہل علم کے ہاں گمان کے درجہ میں ہوتی ہیں۔ہم کہتے ہیں کہ یہ روایت باتفاق محدثین جھوٹی ہے اور حدیث کی کسی قابل اعتماد کتاب میں مندرج نہیں۔اس حدیث کی صحت کا دعویٰ وہی شخص کرتا ہے جو اس حد تک جھوٹا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مذاہب اربعہ میں سے کسی ایک کا پیرو خیال کرتا ہے اور اس بات کا دعویٰ دار ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور دیگر ائمہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے پیدا ہوئے ہیں۔ یا جس طرح ترکوں کا ایک گروہ کہتا ہے کہ سید الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے بہت سی لڑائیاں لڑی تھیں اور وہ ان لڑائیوں کا ذکر بھی کرتے ہیں، حالانکہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے بدر میں شرکت کی تھی اور غزوہ احد میں شہادت سے مشرف ہوئے۔یا جس طرح بہت سے عوام یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ اور سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا دمشق میں مدفون ہیں۔یا عوام کا یہ نظریہ کہ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا جامع دمشق کے باب القبہ میں احادیث روایت کیا کرتی تھیں۔اسی طرح یہ افواہ بھی بے بنیاد ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نجف میں مدفون ہیں، حالانکہ اہل علم سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ و معاویہ رضی اللہ عنہ اور عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما کو قصر الامارت میں دفن کیا گیا تھا کیونکہ اس بات کا خطرہ

دامن گیر تھا کہ خوارج ان کی قبریں نہ کھود ڈالیں۔ ❶

اس لیے کہ خوارج نے ان تینوں حضرات کو قتل کرنے کے لیے قسمیں اٹھائی تھیں۔ پس اس کے نتیجہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا گیا؛ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ زخمی ہوئے۔ جبکہ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے اپنی جگہ نماز پڑھانے کیلئے خارجہ نامی ایک آدمی کو مقرر کیا تھا؛ جب قاتل نے حملہ کر دیا تو اسے معلوم ہوا کہ یہ حضرت عمرو بن العاص نہیں' بلکہ خارجہ ہے؛ تو اس نے کہا: ''میں تو عمرو کو قتل کرنا چاہتا تھا اور اللہ تعالیٰ کا ارادہ خارجہ کا تھا۔'' یہ بات لوگوں میں ضرب المثل بن گئی۔

اس طرح کی بہت ساری چیزیں ہیں جو جہلاء کے خیالات پر مبنی ہیں۔ اور منقولات کا علم رکھنے والے جانتے ہیں کہ ان روایات کی اصل میں کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔

....

دوسری وجہ: ہم کہتے ہیں کہ: بذات خود اس روایت میں ایسی باتیں موجود ہیں جو کئی لحاظ سے اس کے جھوٹا ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ اس میں ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غدیر کے موقع پر موجود تھے .... الخ۔

جواب: اس بات پر علماء کا اتفاق ہے کہ ''غدیر خم'' پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو الفاظ ارشاد فرمائے؛ وہ حجۃ الوداع سے واپسی کے وقت کہے تھے۔ شیعہ اس کو تسلیم کرتے ہیں۔ اس کی دلیل شیعہ کا یہ عمل ہے کہ وہ اٹھارہ ذی الحجہ کو عید مناتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع کے بعد پھر کبھی مکہ تشریف نہ لائے۔ بلکہ آپ حجۃ الوداع سے مدینہ واپس تشریف لائے؛ ذوالحجہ کے باقی ایام؛ محرم اور صفر مدینہ طیبہ میں قیام کیا؛ اور ربیع الاول میں آپ کا انتقال ہو گیا۔

اس حدیث [کے اندر ایسے شواہد موجود ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ من گھڑت حدیث ہے۔ اس میں] ہے کہ آپ نے جب غدیر خم کے مقام پر یہ الفاظ ارشاد فرمائے تو یہ بات جنگل میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ مثلاً یہ الفاظ کہ آپ مکہ میں بطحاء کے مقام پر تشریف فرما تھے کہ ''حارث آپ کے پاس آیا۔'' یہ ایسے جاہل انسان کا جھوٹ ہے جسے یہ بھی پتہ نہیں ہے کہ یہ

❶ کوفہ کا قصر الامارت جس میں سیدنا علی مدفون ہیں جامع کوفہ سے جانب قبلہ واقع ہے۔ مشہور شیعہ مورخ لوط بن یحییٰ کہتا ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ جامع کوفہ کے ایک کونہ اور قصر الامارت کے صحن میں ابواب کندہ کے قریب دفن کیے گئے تھے۔ شیعہ نے تیسری صدی ہجری میں سیدنا علی اور سیدنا حسن و حسین رضی اللہ عنہم اجمعین کے ایک مدت بعد یہ دعویٰ کیا کہ آپ نجف میں مدفون ہیں، حقیقت شناس لوگوں کا قول ہے کہ نجف میں جو قبر سیدنا علی کی جانب منسوب ہے دراصل وہ سیدنا مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی قبر ہے۔ دمشق کا قصر الامارت جہاں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ مدفون ہیں اس کو الخضراء کہتے ہیں، یہ مسجد دمشق کی اس دیوار سے متصل ہے جو جانب قبلہ واقع ہے، اس کی مشرقی جانب جیرون نامی حوض ہے۔ مغرب میں باب البرید اور جنوب میں قصر اسعد پاشا واقع ہے۔ دمشق کے معمر لوگ اپنے آباؤ اجداد سے نقل کرتے ہیں کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ اس دیوار کے نیچے مدفون ہیں جو جامع دمشق اور الدار الخضراء کے درمیان واقع ہے دولت عباسیہ کے عہد اقبال میں متقدمین نے جامع دمشق کی قبلہ والی دیوار پر سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی قبر کے نزدیک ایک کتبہ لگا دیا تھا جس پر لکھا تھا: ''یہ اللہ کے نبی ہود علیہ السلام کی قبر ہے۔''

اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ حاسد لوگ آپ کی قبر نہ کھود ڈالیں۔ الدار الخضراء میں ایک اور قبر بھی تھی جو آج کل ''المزوریہ'' نامی بازار میں واقع ہے۔ غالباً یہ معاویہ رضی اللہ عنہ بن یزید بن معاویہ رضی اللہ عنہ کی قبر ہے۔ سیدنا عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے عید الفطر ۴۳ھ میں وفات پائی آپ کے بیٹے عبد اللہ نے نماز جنازہ پڑھائی، مجھے تادم تحریر اس بات کی کوئی دلیل معلوم نہیں ہو سکی کہ آپ دار الامارۃ میں مدفون ہیں۔ مشہور یہ ہے کہ آپ وادی المعظم میں گھاٹی کے دروازہ کے نزدیک مدفون ہیں، صحابہ کا نقطہ نظر یہ تھا کہ آدمی اعمال سے زندہ جاوید ہوتا ہے، پکی قبر سے نہیں، یہی وجہ ہے کہ فراعنہ و جبابرہ کی طرح وہ اس بات کو پسند نہیں کرتے تھے کہ صلحاء اور نامور فاتحین صحابہ کی قبروں پر مقبرے بنائے جائیں اور ان پر عالی شان عمارتیں تعمیر کی جائیں۔

واقع کب پیش آیا۔

نیز یہ بات کہ پھر ﴿ سَأَلَ سَائِلٌ﴾ والی آیت نازل ہوئی ۔ یہ سورت بالاتفاق مکی ہے ۔ہجرت سے پہلے مکہ میں نازل ہوئی تھی ۔ یہ سورت غدیرخم کے واقعہ سے دس سال یا اس سے بھی زیادہ عرصہ پہلے نازل ہو چکی تھی ۔تو پھر یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ اس واقعہ کے بعد نازل ہوئی ۔

علاوہ ازیں یہ آیت ﴿وَ اِذْ قَالُوا اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ ﴾ یہ سورت الانفال کی آیت ہے ۔ یہ سورت بالاتفاق غزوہ بدر کے بعد غدیرخم سے کئی سال پہلے نازل ہوئی تھی ۔ مفسرین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ آیت مشرکین مکہ مثلاً ابوجہل وغیرہ کے ان اقوال کی وجہ سے نازل ہوئی تھی جو انہوں نے ہجرت سے قبل رسول اللہ ﷺ سے کہے تھے ۔اس واقعہ میں اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو ان لوگوں کی باتیں یاد دلاتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ان لوگوں نے کہا تھا:

﴿وَ اِذْ قَالُوا اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ ﴾

یعنی اے پیغمبر! وہ وقت یاد کرو جب وہ لوگ آپ سے ایسی باتیں کہہ رہے تھے ۔ یہ بالکل ان آیات کی طرح ہے:

﴿وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ ﴾ اور وہ وقت یاد کرو جب آپ کے رب نے فرشتوں سے کہا۔

اور فرمایا: ﴿وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ﴾ اس وقت کو بھی یاد کرو جب صبح ہی صبح آپ اپنے گھر سے نکل گئے ۔

اس طرح کی دیگر بھی بہت ساری آیات ہیں ۔ان میں حکم دیا جاتا ہے کہ آپ گزرے ہوئے واقعات کو یاد کریں ۔تو اس سے واضح ہوگیا کہ یہ واقعہ اس سورت کے نازل ہونے سے پہلے کا ہے ۔

اور ایسے ہی جب ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ سے عذاب کی دعا مانگی تو اللہ تعالیٰ نے واضح کردیا کہ تم پر اس وقت تک عذاب نازل نہیں ہوگا جب تک تم میں محمد ﷺ موجود ہیں ۔ ارشاد فرمایا:

﴿وَ اِذْ قَالُوا اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴾ [الأنفال ۳۲]

''اور جب کہ ان لوگوں نے کہا کہ اے اللہ! اگر یہ قرآن آپ کی طرف سے واقعی ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسایا ہم پر کوئی دردناک عذاب واقع کردے۔''

پھر اس کے بعد [عذاب نہ آنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے] فرمایا:

﴿وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَ اَنْتَ فِيْهِمْ وَ مَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ﴾[الأنفال ۳۳]

''اور اللہ تعالیٰ ایسا نہ کرے گا کہ ان میں آپ کے ہوتے ہوئے ان کو عذاب دے اور اللہ ان کو عذاب نہ دے گا اس حالت میں کہ وہ استغفار بھی کرتے ہوں ۔''

علماء کرام کا اتفاق ہے کہ اس کے باوجود اہل مکہ پر پتھر نہیں برسائے گئے تھے ۔ اگر یہ واقعہ درست ہوتا کہ پتھر حارث کے سر پر گرا اور دبر کے راستہ نکل گیا تو اصحاب الفیل کے واقعہ کی طرح یہ عظیم معجزہ تھا اور ہر کس و ناکس اس کو جانتا ہوتا' حالانکہ ایسا نہیں ہے ۔

جب علم نقل کرنے والے علماء کی ایک جماعت موجود تھی۔ اور کسی بھی اہل علم' مستند مصنف نے اس روایت کو اپنی تصنیف میں ذکر نہیں کیا؛ نہ ہی مسند میں نہ ہی صحاح میں؛ نہ ہی فضائل میں؛ نہ تفسیر میں نہ ہی سوانح میں؛ بلکہ اسے روایت کرنے والے وہی لوگ ہیں جو اس طرح کی منکر روایات جمع کرتے رہتے ہیں؛ تو اس سے معلوم ہوا یہ روایت باطل اور جھوٹ ہے۔

اس حدیث میں یہ بھی ذکر کیا گیا ہے کہ ان الفاظ کے کہنے والے نے اسلام کے پانچ بنیادی ارکان کا تذکرہ بھی کیا تھا؛ اس بنیاد پر وہ مسلمان تھا؛ کیونکہ وہ کہہ بھی رہا تھا: ہم نے آپ کی بات مان لی۔ یہ بات ضرورت کے تحت سبھی جانتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے دور میں کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا۔ اور نہ ہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین میں اس نام کا کوئی معروف آدمی تھا۔ بلکہ یہ نام بھی ان اسماء کی جنس سے ہے جسے طرقیہ ذکر کرتے ہیں اور یہ واقعہ بھی عنتر اور دلہمہ کے افسانوی قصوں کی طرح ہے۔

بہت سارے علماء کرام رحمہم اللہ نے ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے نام جمع کئے ہیں جن سے کوئی بھی روایت منقول ہے۔حتی کہ ضعیف احادیث بھی ذکر کی ہیں۔ جیسے: ابن عبد البر کی کتاب ''الاستعیاب'' ابن مندہ کی کتاب: ابونعیم اصفہانی کی کتاب؛ حافظ ابوموسیٰ کی کتاب؛ اور اس طرح کی دیگر کتابیں۔ان میں سے کسی ایک نے بھی اس آدمی کا ذکر تک نہیں کیا۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ اس نام کے کسی آدمی سے کوئی روایت ذکر نہیں کی گئی۔ اس لیے کہ یہ لوگ صرف وہی روایات ذکر کرتے ہیں جو اہل علم کے ہاں متداول ہوں۔ اور اہل طریقت وغیرہ کی روایات نقل نہیں کرتے؛ جیسا کہ تنقلات الکبری میں الکبری کذاب نے کیا ہے۔

❀❀❀

تیسری وجہ: ہم پوچھتے ہیں کہ تمہارا دعوی یہ تھا کہ تم امامت کو قرآنی نصوص سے ثابت کرو گے۔ قرآن کے ظاہر میں اصل میں کوئی ایسی چیز موجود ہی نہیں۔ جو آیت تم نے پیش کی تھی:

﴿ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ﴾ [المائدۃ ٦٧]

'' کچھ بھی آپ کی طرف آپ کے رب کی جانب سے نازل کیا گیا ہے پہنچا دیجئے۔''

یہ الفاظ تو عام ہیں؛ جو کچھ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ہے' اس سب کو شامل ہیں۔ کسی بھی متعین چیز کی اس میں کوئی دلیل نہیں پائی جاتی۔

مدعی کا یہ دعوی کہ امامت علی رضی اللہ عنہ بھی ان ہی امور میں سے ایک ہے جن کی تبلیغ آپ ﷺ نے کی تھی؛ یا آپ کو اس کی تبلیغ کرنے کا حکم دیا گیا تھا؛ محض قرآن سے ایسی کوئی چیز ثابت نہیں ہو سکی۔ اس لیے کہ قرآن میں ایسی کسی متعین چیز کی کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔

اگر ایسی کوئی بات نقل سے ثابت ہو جائے تو حدیث یا خبر سے ثابت تصور ہوگی نہ کہ قرآن سے۔ پس جو کوئی یہ دعوی کرتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امامت قرآن سے ثابت ہے؛ اور آپ ﷺ کو اس کی تبلیغ کا حکم بھی دیا گیا تھا؛ یقیناً ایسا انسان قرآن پر بہتان تراشی کرتا ہے۔قرآن میں کوئی بھی عام یا خاص ایسی دلیل موجود نہیں ہے۔

❀❀❀

چوتھی وجہ :ان سے یہ کہا جائے گا کہ : نبی کریم ﷺ کے جو احوال معلوم ہیں ؛ ان کی روشنی میں یہ آیت تمہارے دعوی کے الٹ پر دلالت کرتی ہے۔وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے نہ ہی کوئی ایسا حکم نازل کیا ؛ اور نہ ہی اس کی تبلیغ کا حکم دیا۔اس لیے کہ اگر ایسی کوئی بھی چیز ہوتی جس کی تبلیغ کا آپ ﷺ کو حکم دیا جاتا تو آپ ضرور ایسا کرتے ؛ اور لوگوں تک یہ بات پہنچاتے۔اس لیے کہ آپ کسی طرح بھی اللہ کی نافرمانی کرنے والے نہ تھے۔

یہی وجہ ہے کہ اماں عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: '' جو کوئی یہ خیال کرتا ہے کہ محمد ﷺ نے وحی میں سے کوئی چیز چھپائی تھی تو اس نے جھوٹ بولا۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿يَآيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ﴾ [المائدة ٦٧]

'' اے رسول جو کچھ بھی آپ کی طرف آپ کے رب کی جانب سے نازل کیا گیا ہے پہنچا دیجئے۔اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو آپ نے اللہ کی رسالت ادا نہیں کی۔''

اہل علم بہت اچھی طرح جانتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امامت کے بارے میں کوئی بات نہیں کہی۔اس بات کو ثابت کرنے کے لیے ان کے پاس کئی ایک دلائل موجود ہیں۔

- علم نقل کرنے والوں کی ایک جماعت موجود تھی ؛ اور نقل علم کے دواعی و اسباب بھی پائے جاتے تھے۔اگر اس روایت کی کوئی اصل ہوتی تو جیسے اس طرح کی دوسری روایات نقل کی گئی ہیں ؛ ایسے ہی یہ روایت بھی ضرور نقل کی جاتی۔خصوصاً جب کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضائل میں بہت ساری ایسی روایات بھی نقل کی گئی ہیں جن کی کوئی اصل ہی نہیں۔تو پھر وہ حقانیت اور سچائی کیونکر نقل نہ کی جاتی جسے لوگوں تک پہنچا دیا گیا تھا۔اور رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت کو حکم دیا تھا کہ وہ جو بات بھی آپ ﷺ سے سنیں اسے آگے لوگوں تک پہنچائیں۔امت کے لیے بھی کسی ایک علمی بات کا چھپانا ہرگز جائز نہ تھا جس کی تبلیغ کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہو۔
- جب نبی کریم ﷺ کی وفات ہوگئی۔اور بعض انصار نے مطالبہ کیا کہ ایک امیر ان میں سے ہو ؛ اور ایک امیر مہاجرین میں سے ہو ؛ تو اس بات پر انکار کیا گیا۔اور مہاجرین نے کہا کہ : امارت صرف قریش میں ہی ہو سکتی ہے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کئی ایک متفرق مواقع پر ارشاد فرمائی گئی حدیث نقل کی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: '' امامت صرف قریش میں ہوگی۔'' اس مجلس میں یا کسی بھی دیگر موقع پر کسی ایک نے بھی یہ نہیں کہا کہ امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حق ہے۔

مسلمانوں نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کی ؛ بیعت کرنے والوں میں اکثر لوگ بنو عبد مناف - بنو امیہ اور بنو ہاشم وغیرہم - سے تعلق رکھتے تھے۔ان کا بڑا مضبوط میلان حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف تھا کہ آپ کو ولایت کے لیے اختیار کیا جائے۔مگر ان میں سے کسی ایک نے بھی یہ نص ذکر نہیں کی۔اور معاملہ ایسے ہی حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کے دور میں بھی رہا۔اور پھر آپ کے عہد میں جب آپ خلافت و امارت کے مرتبہ پر فائز ہو گئے تو پھر بھی نہ ہی آپ نے ؛ نہ ہی اہل بیت میں سے کسی ایک نے ؛ اور نہ ہی معروف صحابہ میں سے کسی ایک نے یہ نص ذکر کی۔یہ نص اس کے بہت بعد میں سامنے آئی۔

سنت اور حدیث کا علم رکھنے والے اہل علم جیسے امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے ائمہ کرام حضرت علی رضی اللہ عنہ سے محبت کرتے ہیں اور آپ سے دوستی رکھتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ: آپ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد خلیفہ برحق تھے۔ اہل علم کی ایک جماعت نے اس میں اختلاف بھی کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ: آپ کا زمانہ امت میں فتنے اور اختلاف کا زمانہ تھا۔ آپ کے دور میں امت کا اتفاق نہ ہی آپ پر ہوسکا اور نہ ہی کسی دوسرے پر۔

ایک دوسری جماعت کرامیہ کا کہنا ہے کہ: آپ بھی خلیفہ برحق تھے؛ اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ بھی خلیفہ برحق تھے۔ اور یہ لوگ ضرورت کے تحت دو خلیفہ ہونے کو جائز کہتے ہیں۔ ایسے ہی یہ لوگ حضرت ابن زبیر اور یزید کے دور کے متعلق بھی کہتے ہیں۔ اس لیے کہ لوگوں کا ایک خلیفہ پر اتفاق نہیں ہوسکا تھا۔

- امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ اپنے زمانے میں حدیث کے سب سے بڑے امام تھے؛ آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت پر اس حدیث سے استدلال کیا ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

''میرے بعد خلافت نبوت تیس سال تک ہوگی؛ پھر اس کے بعد بادشاہی ہوگی۔'' [سنن الترمذي ۳/ ۳٤۱]

بعض لوگوں نے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے۔ مگر امام احمد اور دوسرے علماء کرام اسے صحیح ثابت کرتے ہیں۔

یہ حدیث ان کے مذہب میں خلافت علی رضی اللہ عنہ پر نصوص کی اساس اور سرمایہ ہے۔ اگر یہ کوئی ایسی صحیح اور مستند یا مرسل حدیث پالیتے جو ان کی خواہشات کے مطابق ہوتو پھر ان کی خوشی کی کوئی انتہاء نہ رہتی۔

اس سے معلوم ہوگیا کہ رافضی جس نص کے بارے میں دعوی کرتے ہیں؛ اہل علم نے قدیم و حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال سے کوئی ایسی بات نہیں سنی۔ یہی وجہ ہے کہ اہل علم ضرورت کے تحت ایسی روایات کے جھوٹ کو خوب اچھی طرح سے جانتے ہیں۔ ان کے سامنے تمام جھوٹی روایات واشگاف ہوتی ہیں۔

جب تحکیم الحکمین کا واقعہ پیش آیا۔ اس وقت اکثر لوگ آپ کے ساتھ تھے۔ اس وقت مسلمانوں میں کوئی ایک بھی ایسا نہیں تھا جس نے یہ نص بیان کی ہو؛ نہ ہی آپ کے ساتھیوں میں سے اور نہ ہی دوسرے لوگوں میں سے۔ حالانکہ اس وقت آپ کے شیعہ بھی کثرت سے تھے۔ ان میں کوئی ایک بھی ایسا نہ تھا جس نے یہ روایت بطور حجت پیش کی ہو۔ حالانکہ یہ ایسا موقع تھا کہ ایسی نصوص کو ہر حال میں سامنے لانا چاہیے تھا۔

اور یہ بھی طے شدہ بات ہے کہ اگر شیعان علی رضی اللہ عنہ کے پاس ہی کوئی اس قسم کی نص موجود ہوتی تو معروف عادت کا تقاضا تھا کہ کوئی بھی یہ کہہ دیتا کہ آپ کی خلافت کے بارے میں یہ نص موجود ہے؛ لہٰذا حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ پر آپ کو مقدم کرنا واجب ہے۔ حضرت ابو موسی رضی اللہ عنہ خود انتہائی نیک دل مسلمانوں میں سے تھے۔ اگر آپ کو یہ علم ہوتا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نص موجود ہے تو آپ کبھی بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو معزول کرنے کی بات نہ کرتے۔ اور اگر آپ ایسی بات کرتے بھی تو اس کا انکار کیا جاتا کہ آپ کیسے اس انسان کو معزول کرنے کا کہہ رہے ہیں جس کی خلافت پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نص موجود ہے؟۔

شیعہ نے ایک حجت یہ بھی پیش کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''عمار کو ایک باغی جماعت قتل کرے گی۔''

یہ حدیث خبر واحد ہے؛ یا پھر اس کو روایت کرنے والے دو یا تین افراد ہیں' متواتر نہیں ہے۔ اور نص کے لیے متواتر ہو ضروری ہے۔

واہ سبحان اللہ! عجیب بات ہے کہ شیعہ حضرات صحیح منقول اور صریح معقول کو چھوڑ کر ایسی روایات سے استدلال کرتے ہیں؛ کیا ان میں سے کوئی ایک بھی کوئی نص پیش نہیں کر سکتا؟

امامت علی رضی اللہ عنہ کی تیسری دلیل:

اشکال: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ''امام علی رضی اللہ عنہ کی تیسری دلیل یہ آیت ہے:

﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾

''آج میں نے تمہارے لئے دین کو کامل کر دیا اور تم پر اپنا انعام بھرپور کر دیا اور تمہارے لئے اسلام کے دین ہونے پر رضامند ہوگیا۔'' [المائدۃ ۳]

ابونعیم اپنی سند سے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو غدیر خم پر بلایا۔ اور درخت کے نیچے سے کانٹے اور جھاڑیاں ہٹانے کا حکم دیا۔ پھر آپ نے کھڑے ہو کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دونوں بازو تھام لیے اور انہیں بلند کیا، یہاں تک کہ لوگوں کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بغلوں کی سفیدی نظر آنے لگی۔ ابھی لوگ جدا نہیں ہو پائے تھے کہ یہ آیت اتری: ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ کا شکر ہے کہ اس نے دین کو تکمیل بخشی؛ اپنی نعمت پوری کی؛ اور میری رسالت اور علی کی ولایت پر رضامندی کا اظہار کیا، پھر فرمایا: "مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَعَلِيٌّ مَوْلَاهُ؛ اللهم وال من والاه و عاد من عاداه وانصر من نصره و اخذل من خذله۔" ''جس کا میں مولی ہوں علی بھی اس کا مولی ہے۔'' یا اللہ جو علی سے دوستی رکھے تو بھی اس سے دوستی رکھ اور جو اس سے دشمنی رکھے تو بھی اس سے دشمنی رکھ؛ اور جو اس کی مدد کرے تو بھی اسکی مدد کر اور جو اس کی نصرت و تائید سے ہاتھ کھینچ لے تو اس کی مدد نہ کر۔'' [رافضی کا بیان ختم ہوا]۔

جواب: اس کا جواب کئی طرح سے ہے:

پہلی بات: استدلال کرنے والے پر واجب ہے کہ وہ اس کی حدیث کی صحت پیش کرے۔ بالاتفاق علماء شیعہ و اہل سنت صرف ابونعیم کی طرف منسوب کر لینے سے روایت کی صحت ثابت نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ ابونعیم نے بہت ساری ضعیف ہی نہیں بلکہ موضوع احادیث تک روایت کی ہیں؛ اس پر بھی تمام شیعہ اور اہل سنت علماء کرام و محدثین کا اتفاق ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ابونعیم حافظ الحدیث تھے؛ اور آپ کی روایات کا باب بھی بہت وسیع ہے؛ لیکن روایت کرنے میں جیسا کہ ان جیسے محدثین کی عادت ہے؛ اس باب میں جو بھی روایت موجود ہوتی ہے؛ سب کو نقل کرتے ہیں۔ اس سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کو اس روایت کی معرفت حاصل ہو جائے۔ وگرنہ ان کی تمام روایات قابل احتجاج نہیں؛ ان میں سے بعض روایات ایسی ہیں جن سے استدلال کیا جا سکتا ہے۔

اہل علم کی اپنی تصنیفات کے سلسلہ میں کئی اقسام ہیں:

ان میں ایسے محدثین بھی ہیں جنھیں اگر کسی بارے میں جھوٹ ہونے کا علم ہو جائے تو اس سے روایت نہیں لیتے ۔ جیسے امام مالک؛ شعبہ؛ یحیٰ بن سعید؛ عبدالرحمن بن مہدی؛ اور احمد بن حنبل رحمہم اللہ وغیرہم ۔ یہ محدثین کسی بھی ایسے شخص سے روایت نہیں کرتے جو ان کے ہاں ثقہ نہ ہو ۔ اور نہ ہی کوئی ایسی روایت نقل کرتے ہیں جس کے بارے میں انہیں علم ہو کہ یہ روایت جھوٹ ہے ۔ ایسے جھوٹے لوگوں کی احادیث روایت نہیں کرتے جن کے بارے میں عمداً جھوٹ بولنا معروف ہو ۔ لیکن کبھی ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ جس سے روایت کرتے ہیں' وہ اس روایت میں غلطی کر رہا ہوتا ہے ۔

دوسری بات : ہم کہتے ہیں موضوعات کے علماء کے نزدیک یہ حدیث بالاتفاق جھوٹ ہے ۔ جو لوگ اس باب میں مرجع سمجھے جاتے ہیں' وہ اس حدیث کو جھوٹ روایت قرار دے رہے ہیں ۔ اسی لیے حدیث کی وہ اہم ترین کتب جو کہ مرجع سمجھی جاتی ہیں' ان میں اس روایت کا نام ونشان تک نہیں ۔

تیسری بات : احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ یہ آیت غدیر خم کے واقعہ سے [نوروز] پہلے اس وقت نازل ہوئی جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عرفات میں قیام پذیر تھے ۔ [1]

ایک یہودی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا تھا : اے امیر المؤمنین ! تمہاری کتاب قرآن مجید میں ایک آیت ہے جسے تم پڑھتے ہو؛ اگر ہم یہودیوں پر وہ آیت نازل ہوئی ہوتی تو ہم اس دن کو عید کا دن بنا لیتے ۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا : وہ کون سی آیت ہے؟ تو یہودی نے کہا : اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان :

﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾

تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا : میں جانتا ہوں یہ آیت کس دن نازل ہوئی ؛ اور کس جگہ پر نازل ہوئی ؛ یہ آیت عرفہ کے دن میدان عرفات میں نازل ہوئی ۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عرفات میں وقوف کیے ہوئے تھے ۔

یہ روایت کئی دوسری اسناد کے ساتھ بھی مشہور ہے ۔ اور اہل اسلام کی کتابوں : صحاح ؛ مسانید ؛ معاجم اور سنن ؛ تفاسیر اور سیرت میں یہ روایت نقل کی گئی ہے ۔

تیسری بات : یہ آیت غدیر خم کے واقعہ سے نوروز پیشتر نازل ہوئی تھی ۔ یہ جمعہ کا دن تھا اور نو ذوالحجہ کی تاریخ تھی ۔ تو پھر یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ یہ آیت غدیر خم کے موقع پر نازل ہوئی ۔

چوتھی بات : اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امامت کی طرف کسی طرح کا بھی کوئی اشارہ بھی نہیں پایا جاتا ۔ بلکہ اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف اس دین کے مکمل ہونے اور اہل ایمان پر اس کی نعمت کے پورا ہونے اور دین اسلام پر رضامندی کی خبر دی گئی ہے ۔ نظر بریں شیعہ کا یہ دعویٰ کہ قرآنی دلائل سے امامت علی کا ثبوت ملتا ہے صاف جھوٹ ہے ۔ [البتہ صحیح احادیث سے انھیں اس بات کا ثبوت پیش کرنا چاہیے] ۔

---

[1] البخاری ، باب زیادة الایمان و نقصانه ، (ح:٤٥) مسلم ـ باب فی تفسیر آیات متفرقة (ح:٣٠١٧)۔

❀ اگر شیعہ کہیں کہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے۔ تو ان سے کہا جائے گا کہ: اگر حدیث صحیح سند سے ثابت ہو تو پھر دلالت حدیث سے ہوگی؛ آیت سے نہیں ہوگی۔ اور اگر حدیث صحیح نہ ہوئی تو پھر اس کے لیے نہ ہی آیت میں کوئی حجت ہے اور نہ ہی حدیث میں۔ پس دونوں لحاظ سے اس آیت میں کوئی دلیل نہیں پائی جاتی۔ اس سے مذکورہ روایت کا جھوٹا ہونا بھی ظاہر ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ [شیعہ مصنف نے] نزول آیت کا سبب اس روایت میں بیان کیا ہے' حقیقت میں یہاں پر اس کی کوئی دلیل نہیں پائی جاتی۔

پانچویں بات: اس روایت میں مذکور الفاظ: اللهم وال من والاه و عاد من عاداه وانصر من نصره و اخذل من خذله۔" "اے اللہ جو علی سے دوستی رکھے تو بھی اس سے دوستی رکھ۔ جو اس سے دشمنی رکھے تو بھی اس سے دشمنی رکھ؛ جو اس کی مدد کرے تو بھی اس کی مدد کر اور جو اس کی نصرت و تائید سے ہاتھ کھینچ لے تو اس کی مدد نہ کر۔" باتفاق محدثین جھوٹ ہیں۔ البتہ اس سے پہلے کے الفاظ: "مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَعَلِيٌّ مَوْلَاهُ؛" "جس کا میں مولی ہوں علی بھی اس کا مولی ہے" کے بارے میں ہم اپنی جگہ پر ان شاء اللہ تفصیل سے گفتگو کریں۔

چھٹی بات: نبی کریم ﷺ کی دعا مجاب [مقبول] ہوتی ہے۔ جب کہ یہ دعا قبول نہیں ہوئی۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ یہ اصل میں رسول اللہ ﷺ کی دعا نہیں ہے۔ یہ بات سبھی لوگ جانتے ہیں کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے تو لوگ اس وقت تین گروہوں میں بٹ چکے تھے۔ ایک گروہ ان لوگوں کا تھا جو آپ سے مل کر لڑ رہے تھے۔ دوسرا گروہ وہ ہے جو آپ سے لڑ رہا تھا۔ اور تیسرا گروہ وہ تھا جو بالکل الگ تھلگ ہو کر بیٹھ گئے تھے۔ ان میں اکثر سابقین اولین تھے۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ بعض سابقین اولین نے قتال میں حصہ لیا تھا۔ ابن حزم نے لکھا ہے کہ حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کو ابو الغادیہ رضی اللہ عنہ نامی صحابی نے قتل کیا تھا۔ یہ ابو الغادیہ رضی اللہ عنہ سابقین اولین میں سے ہیں؛ اور ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے بیعت رضوان میں حصہ لیا تھا۔ ان تمام کے بارے میں صحیحین میں ثابت ہے کہ ان میں سے کوئی بھی جہنم میں نہیں جائے گا۔

صحیح مسلم میں سرور کائنات ﷺ یہ ارشاد ہے کہ:

"درخت کے نیچے بیعت کرنے والوں میں سے کوئی بھی آگ میں نہیں جائے گا۔" (صحیح مسلم:ح٢٤٩٦)

ان میں وہ لوگ بھی تھے جنہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے قتال کیا؛ جیسے حضرت طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما؛ اگر چہ ان میں حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے قاتل بھی تھے؛ تاہم یہ لوگ دوسروں کی نسبت زیادہ آگے تک پہنچے ہوئے تھے۔

اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ مل کر لڑنے والوں میں سابقین اولین میں سے بھی کچھ لوگ موجود تھے؛ جیسے حضرت سہیل بن حنیف اور حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ۔ مگر جو لوگ اس جنگ سے اپنا دامن بچا کر بیٹھے رہے وہ لوگ زیادہ افضل تھے جیسے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے ان کے ساتھ مل کر قتال نہیں کیا۔ اس وقت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد ان سے افضل کوئی دوسرا صحابی نہیں تھا۔ اور ایسے ہی انصار میں سے حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ سرور کائنات ﷺ نے یہ فرمایا تھا کہ: "فتنہ و فساد سے محمد بن مسلمہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔" [ابو داؤد ٤/ ٣٠٠]۔ آپ بھی اس جنگ سے الگ تھلگ رہے۔ اس سے استدلال کیا گیا ہے کہ یہ جنگیں تاویل کی وجہ سے فتنہ کی جنگیں

تھیں ۔ اس کا واجب یا مستحب جہاد سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کی نسبت زیادہ حق پر تھے۔ صحیح حدیث میں یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا:

مسلمانوں کے مابین تفرقہ بازی کے وقت ایک فرقہ کا ظہور ہوگا' اور ان دو گروہوں میں سے ان کو وہ لوگ قتل کریں گے جو حق کے زیادہ قریب ہوں گے۔'' [مسلم ۲/ ۷۴۵، سنن ابو داؤد ٤/ ۳۰۰]

پس یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی ان کے ساتھ لڑنے والوں کی نسبت حق پر تھے۔ اس لیے کہ آپ نے ہی مسلمانوں کی تفرقہ بندی کے وقت خوارج کو قتل کیا۔ اس وقت مسلمانوں کی ایک جماعت آپ کے ساتھ تھی اور ایک جماعت آپ کے خلاف تھی۔ پھر جن لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جنگ کی تھی وہ بھی بے یار و مددگار نہیں چھوڑے گئے ۔ بلکہ وہ برابر کفار کو قتل کرتے رہے؛ اور مختلف شہر فتح کرتے رہے۔ صحیحین میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''میری امت میں سے ایک گروہ ہمیشہ حق پر قائم رہے گا؛ ان کی مخالفت کرنے والے یا ان کا ساتھ چھوڑنے والا ان کو کوئی نقصان نہیں دے سکے گا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا حکم آجائے۔'' [البخاری ۹/ ۸۲؛ مسلم ۳/ ۱۵۲۳]

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: یہ لوگ اہل شام ہیں۔

جن لوگوں نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ مل کر قتال کیا؛ وہ کبھی بھی بے یار و مددگار نہیں چھوڑے گئے [اور نہ ہی انہیں کوئی رسوائی اٹھانا پڑی ہے] بلکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ جنگ کرنے میں بھی انہیں ناکامی نہیں اٹھانا پڑی۔ تو پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دعا کہاں گئی جس میں آپ نے اللہ سے مانگا تھا:

"وانصر من نصره و اخذل من خذله ۔"

''جو اس کی مدد کرے تو بھی اس کی مدد کر اور جو اس کی نصرت و تائید سے ہاتھ کھینچ لے تو اس کی مدد نہ کر۔''

بلکہ شیعہ خود کو خواص حضرت علی رضی اللہ عنہ میں سے شمار کرتے ہیں مگر وہ ہمیشہ بے یار و مددگار اور رسوا ہی رہے؛ اور لوگوں کا سہارا لیے بغیر انہیں کوئی کامیابی نصیب نہیں ہوسکی۔ خواہ مسلمانوں کا سہارا لیں یا کفار کا سہارا لیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ یہ لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے انصار ہیں تو پھر اللہ کی مدد و نصرت کہاں ہے؟ ان باتوں سے اس روایت کا جھوٹ ہونا واضح ہو جاتا ہے۔

امامت علی کی چوتھی دلیل:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:''امامت علی کی چوتھی دلیل یہ آیت ہے:

﴿وَالنَّجْمِ إِذَا هَوٰى ☆مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى﴾

''اور ستارے کی قسم! جب وہ ٹوٹ جائے۔ کہ تمہارا ساتھی (رسول) نہ راہ بھولا ہے اور نہ غلط راستے پر چلا ہے۔''

فقیہ ابن مغازلی شافعی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ: میں بنی ہاشم کی ایک جماعت کے ساتھ بارگاہ نبوی میں بیٹھا تھا کہ اتنے میں آسمان کا ایک ستارہ ٹوٹا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کے گھر میں یہ ستارہ ٹوٹا وہ میرے بعد میرا وصی ہوگیا۔ چنانچہ نوجوانوں کا ایک گروہ اس کی کھوج لگانے کے لیے چلا گیا؛ معلوم ہوا کہ وہ ستارہ حضرت علی

رضی اللہ عنہ کے گھر پر ٹوٹا ہے۔تو وہ نوجوان کہنے لگے کہ:'' آپ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت میں سیدھی راہ سے بھٹک گئے ہیں:''
تب یہ آیت اتری:﴿وَالنَّجْمِ إِذَا هَوٰى☆مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى﴾ [انتہی کلام الرافضی]

[جواب]: پہلی بات: ہم اس روایت کی صحت کا مطالبہ کرتے ہیں؛ جیسا کہ اس سے پہلے بھی ہم بار ہا یہ مطالبہ کر چکے ہیں۔ہم کہتے ہیں یہ کھلا ہوا جھوٹ ہے اور بلا علم و معرفت اللہ کے بارے میں کوئی بات کہنا حرام ہے؛اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ﴾ (الاسراء:۳۶)

''جس بات کا آپ کو علم نہیں وہ بیان نہ کریں۔''

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْإِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَأَنْ تُشْرِكُوا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهِ سُلْطٰنًا وَأَنْ تَقُولُوا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ﴾ [الأعراف ۳۳]

''کہہ دے میرے رب نے تو صرف بے حیائیوں کو حرام کیا ہے، جو ان میں سے ظاہر ہیں اور جو چھپی ہوئی ہیں اور گناہ کو اور ناحق زیادتی کو اور یہ کہ تم اللہ کے ساتھ اسے شریک ٹھہراؤ جس کی اس نے کوئی دلیل نہیں اتاری اور یہ کہ تم اللہ پر وہ کہو جو تم نہیں جانتے۔''

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿هٰأَنْتُمْ هٰؤُلَاءِ حَاجَجْتُمْ فِيمَا لَكُمْ بِهِ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَاجُّونَ فِيمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهِ عِلْمٌ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ﴾ [آل عمران ٦٦]

''دیکھو تم وہ لوگ ہو کہ تم نے اس بات میں جھگڑا کیا جس کے متعلق تمھیں کچھ علم تھا،تو اس بات میں کیوں جھگڑتے ہو جس کا تمھیں کچھ علم نہیں اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔''

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ﴾ [الحج ۳]

''اور لوگوں میں سے کوئی وہ ہے جو اللہ کے بارے میں کچھ جانے بغیر جھگڑتا ہے۔''

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿الَّذِينَ يُجَادِلُونَ فِي آيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطَانٍ أَتَاهُمْ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ الَّذِينَ آمَنُوا﴾

''وہ لوگ جو اللہ کی آیات میں جھگڑتے ہیں، بغیر کسی دلیل کے جو ان کے پاس آئی ہو، بڑی ناراضی کی بات ہے اللہ کے نزدیک اور ان کے نزدیک جو ایمان لائے۔''[غافر ۳۵]۔

اس کی طرف سے دی گئی سلطان سے مراد حجت اور دلیل ہے۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿أَمْ أَنْزَلْنَا عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا فَهُوَ يَتَكَلَّمُ بِمَا كَانُوا بِهِ يُشْرِكُونَ﴾ [الروم ۳۵]

''یا ہم نے ان پر کوئی دلیل نازل کی ہے کہ وہ بول کر وہ چیزیں بتاتی ہے جنھیں وہ اس کیساتھ شریک ٹھہرایا کرتے تھے۔''

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اَمْ لَكُمْ سُلْطَانٌ مُّبِيْنٌ ☆فَاْتُوا بِكِتٰبِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ ﴾ [الصافات ۱۵۶۔۱۵۷]

''یا تمھارے پاس کوئی واضح دلیل ہے؟ تو لاؤ اپنی کتاب، اگر تم سچے ہو۔''

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اِنْ هِيَ اِلَّا اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطَانٍ﴾ [النجم ۲۳]

''یہ (بت) چند ناموں کے سوا کچھ بھی نہیں ہیں، جو تم نے اور تمھارے باپ دادا نے رکھ لیے ہیں، ان کی کوئی دلیل اللہ نے نازل نہیں فرمائی۔''

جو چیز انبیاء کرام علیہم السلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے لیکر آئے ہیں اسے سلطان ''دلیل'' کہتے ہیں۔ ایسے ہی سنت بھی سلطان ہے۔ مگر سنت کی معرفت بھی اس وقت ہوتی ہے جب وہ صحیح سند کے ساتھ منقول ہو۔ جو شخص حدیث نبوی سے استدلال کرنا چاہے اس پر لازم ہے کہ احتجاج کرنے سے قبل اس کی صحت معلوم کرلے۔ اور جب اس سے کسی دوسرے کے خلاف احتجاج کرے تو ساتھ ہی اس کی صحت بھی بیان کردے۔ ورنہ اس کا شمار بغیر علم کے بات کرنے والوں میں اور بغیر علم کے استدلال کرنے والوں میں ہوگا۔ جب یہ بات معلوم ہے کہ فضائل وغیرہ جیسے موضوعات پر لکھی گئی کتابوں میں جھوٹی روایات بھی پائی جاتی ہیں تو صرف ان کتابوں میں روایت کے موجود ہونے کی بنا پر اس پر اعتماد کرنا اسی طرح ہے جیسے فاسق کی شہادت سے استدلال کرنا جو سچ بھی بولتا ہو اور جھوٹ بھی۔ اگر ہمیں یہ علم ہوجائے کہ اس میں جھوٹ ہے؛ تو اس روایت سے ہمیں کوئی علمی فائدہ اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک ہمیں کسی صحیح روایت کا علم نہ ہوجائے جسے ثقہ علماء نے روایت کیا ہو۔

ہمارے اور رسول اللہ ﷺ کے مابین کئی صدیوں کا فاصلہ ہے۔ ہم اچھی طرح سے جانتے ہیں لوگ جو کچھ رسول اللہ ﷺ سے یا کسی دوسرے سے نقل کرتے ہیں' اس میں جھوٹ بھی آجاتا ہے اور سچ بھی ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے یہ بھی روایت کیا گیا ہے کہ آپ نے فرمایا تھا: ''عنقریب مجھ پر جھوٹ بولا جائے گا۔'' اگر یہ حدیث سچی ہے تو پھر [پیغمبر کی بات سچ ثابت ہونے کے لیے] ضروری ہے کہ آپ پر جھوٹ بھی بولا جائے۔ اور اگر یہ روایت جھوٹ ہے تو پھر یقیناً آپ پر جھوٹ بولا گیا ہے۔ جب یہ مسئلہ اس طرح سے ثابت ہوگیا تو پھر کسی انسان کے لیے ہرگز جائز نہیں ہے کہ وہ کسی فرعی مسئلہ میں کسی حدیث سے استدلال کرے یہاں تک کہ اس حدیث کی صحت ثابت ہوجائے۔ تو پھر اصولی مسائل میں اس طرح کا استدلال کیوں کر جائز ہوسکتا ہے جس کی وجہ خیر القرون کے جمہور اہل اسلام؛ اہل تقوی اور اولیاء اللہ کے سرداروں پر اعتراض وارد ہوتا ہو؛ اور خود اس روایت کے صحیح ہونے کا کوئی علم ہی نہ ہو؟

ایسے انسان سے اگر پوچھا جائے: کیا تم حقیقت میں جانتے ہو کہ ایسا واقعہ پیش آیا تھا؟ اگر وہ جواب میں کہے: ہاں تو یقیناً اس نے جھوٹ بولا۔ اس لیے کہ اسے کس طرح پتہ چلا کہ یہ واقعہ پیش آیا ہے؟ اس سے پھر پوچھا جائے گا: تمہیں اس واقعہ کے سچا ہونے کا کیسے پتہ چلا؟ یہ بات اس وقت تک معلوم نہیں ہوسکتی جب تک واقعہ کی اسناد اور راویوں کے احوال معلوم نہ ہوں۔ جب کہ ان چیزوں کے بارے میں تمہیں کوئی علم ہی نہیں ہے۔ اگر تمہیں راویوں کے احوال معلوم ہوتے تو تم جان

لیتے کہ یہ روایت جھوٹی ہے۔

اگر [شیعہ] اس کے جواب میں کہے: ''مجھے اس کا کوئی پتہ نہیں؟

تو [پھر ہم اس سے پوچھتے ہیں] جس چیز کے صحیح ہونے کا تمہیں کوئی پتہ نہیں' اس سے استدلال کرنا کیسے جائز ہوا؟

[روایت کی حقیقت]:

دوسری بات: محدثین کرام رحمہم اللہ کا اس روایت کے جھوٹ ہونے پر اتفاق ہے۔ مغازلی کا شمار محدثین میں نہیں ہوتا۔ ابونعیم اور اس کے امثال بھی علوم [روایات] کو جمع کرنے والوں میں سے ہیں۔ ایسے لوگوں کی غالبیت ایسی روایات جمع کرتے ہیں جو حق ہوتی ہیں؛ لیکن ان میں سے بعض باطل چیزیں بھی لے آتے ہیں؛ جیسے ثعلبی اور ان کے امثال۔ بلکہ ان لوگوں کا اصل کام حدیث کی جانچ پرکھ نہیں تھا؛ اس لیے انہوں نے لوگوں کی کتابوں میں فضائل علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں جو کچھ بھی دیکھا؛ اس سب کو جمع کر دیا۔ جیسا کہ خطیب خوارزمی نے کیا ہے۔ یہ دونوں حضرات حدیث کی گہرائیوں سے لاعلم ہیں۔ ان میں سے ہر ایک وہ روایات بھی جمع کر لیتا ہے جو لوگوں نے اپنی طرف فضائل کے باب میں جھوٹ گھڑلی ہوتی ہیں۔ حدیث کے علوم سے ادنی شناسائی رکھنے والوں پر بھی ان روایات کا جھوٹ ہونا مخفی نہیں رہتا۔

ہم نہیں جانتے کہ ان حضرات میں سے کوئی ایک بھی جان بوجھ کر جھوٹ بولتا ہوگا۔ لیکن ہم یہ بات یقینی طور پر کہہ سکتے ہیں کہ جو روایات انہوں نے نقل کی ہیں ان میں بہت زیادہ جھوٹ بھی ہے؛ اور اہل علم کا اس پر اتفاق ہے۔ ان کو اس سے پہلے بھی اہل علم نے جھوٹ کہا ہوتا ہے؛ مگر جب یہ لوگ روایت کرتے ہیں تو انہیں علم نہیں ہوتا کہ اس میں جھوٹ ہے۔ اور بسا اوقات انہیں اس کے جھوٹ ہونے کا علم بھی ہوتا ہوگا۔ [مگر پھر بھی اس لیے روایت کرتے ہیں تاکہ لوگوں کو یہ پتہ چل جائے کہ اس طرح کی روایات بھی اس بارے میں موجود ہیں]۔ لیکن ہمیں یہ پکا علم نہیں کہ کیا ان حضرات کو یہ علم تھا کہ یہ روایات جھوٹ ہیں؛ یا انہیں اس بارے میں کوئی علم نہیں تھا؟

علاوہ ازیں محدث ابن الجوزی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو بالفاظ دیگر موضوعات میں شمار کیا ہے۔ ابن الجوزی رحمہ اللہ نے یہ حدیث بروایت محمد بن مروان ذکر کی ہے، اس نے کلبی سے، اس نے ابوصالح سے، اس نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے سنا کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ساتویں آسمان کی سیر کرائی گئی اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو بہت سے عجائبات دکھائے تو علی الصبح آپ نے وہ واقعات بیان کر دیے۔ اہل مکہ میں سے کچھ لوگوں نے آپ کی تکذیب کی؛ کچھ لوگوں نے آپ کی تصدیق کی۔ اسی دوران آسمان سے ایک ستارہ ٹوٹا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس کے گھر میں یہ ستارہ گرے گا وہ میرے بعد میرا خلیفہ ہوگا؟ چنانچہ وہ ستارہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گھر میں گرا۔ اہل مکہ کہنے لگے محمد گمراہ ہو گئے اپنے اہل بیت کی محبت میں گمراہ ہو گئے اور اپنے چچا زاد بھائی کی طرف جھک گئے۔ تب یہ آیت اتری:

﴿وَالنَّجْمِ إِذَا هَوٰى ☆ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى﴾

محدث ابن الجوزی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ حدیث موضوع ہے، اس کا واضع کتنا برا آدمی ہے اور اس نے کس قدر بعید از عقل بات بیان کی ہے۔ اس کی سند میں اندھیرا ہی اندھیرا (کذاب راوی) ہے۔ مثلاً ابو صالح نیز کلبی اور محمد بن مروان

سدی، کلبی متہم بالکذب ہے۔ ابو حاتم بن حبان لکھتے ہیں:

''کلبی ان لوگوں میں سے تھا جو کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ فوت نہیں ہوئے اور وہ لوٹ کر دنیا میں آئیں گے۔ جب بادل کو دیکھتا تو کہتا اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔ اس کی روایت سے احتجاج کرنا حلال نہیں ہے۔''

حیرانی کی بات ہے اس حدیث کو وضع کرنے والے نے یہ بھی نہ سوچا کہ یہ عقل کے منافی ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ستارہ کسی جگہ گرے اور وہ اتنی دیر وہاں موجود رہے کہ دوسرا شخص اسے دیکھ سکے۔ اس کی حماقت کا اندازہ لگائیے کہ اس نے اس روایت کو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کیا ہے، حالانکہ ابن عباس کی عمر رضی اللہ عنہ اس وقت دو سال تھی۔ پھر ابن عباس رضی اللہ عنہ اس واقعہ کے شاہد کیسے ہو سکتے تھے اور یہ روایت کیسے نقل کر سکتے تھے؟''

[محدث ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں]: ''میں کہتا ہوں چونکہ یہ روایت کلبی کی معروف تفسیر میں نہیں ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ حدیث اس کے بعد وضع کی گئی ہے۔ اقرب الی الصحت یہی بات ہے۔ ابوالفرج ابن الجوزی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''بعض لوگوں نے اس حدیث کے الفاظ چرا لیے، اس کی اسناد تبدیل کر دی اور ایک غریب سند کیساتھ اسے ابوبکر العطار سے؛ اس نے سلیمان بن احمد المصری سے ابو قضاعۃ ربیعہ بن محمد کی سند سے نقل کیا ہے' وہ کہتے ہیں: ہم سے ثوبان بن ابراہیم نے بیان کیا؛ وہ کہتا ہے ہم سے مالک بن غسان النہشلی نے بیان کیا اس نے حضرت انس سے روایت کیا ہے:

''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ایک ستارہ ٹوٹا تو آپ نے فرمایا: ''جس کے گھر میں یہ ستارہ گرے گا وہ میرے بعد میرا خلیفہ ہوگا؟ چنانچہ وہ ستارہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گھر میں گرا۔ اہل مکہ کہنے لگے محمد گمراہ ہو گئے اپنے اہل بیت کی محبت میں گمراہ ہو گئے اور اپنے چچازاد بھائی کی طرف جھک گئے۔ تب یہ آیت اتری:

﴿وَالنَّجْمِ إِذَا هَوٰى ☆مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى﴾

ابوالفرج ابن الجوزی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''یہ حدیث حقیقت میں وہ پہلے والی حدیث ہے۔ بعض لوگوں نے اس حدیث کے الفاظ چرا لیے، اس کی اسناد تبدیل کر دی۔ اس کی غفلت کی انتہاء یہ ہے کہ اس نے یہ روایت حضرت انس رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کی ہے۔ حالانکہ معراج کے زمانہ میں حضرت انس رضی اللہ عنہ مکہ میں موجود ہی نہیں تھے۔ اور نہ ہی اس سورت کے نزول کے وقت موجود تھے۔ معراج کا واقعہ ہجرت مدینہ سے ایک سال پہلے پیش آیا۔ اور حضرت انس رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ طیبہ میں آمد کے بعد پہچانا ہے۔ اس کی سند میں اندھیرا ہی اندھیرا (کذاب راوی) ہے۔ مالک النہشلی کے بارے میں ابو حاتم بن حبان لکھتے ہیں:

''یہ ایسی روایات ثقات کے سر تھوپتا ہے جو کہ اصل میں جھوٹ ہوتی ہیں۔''

جب کہ ثوبان کے بارے میں کہا ہے: ''یہ ذوالنون مصری کا بھائی ہے۔ حدیث میں بہت ہی کمزور ہے۔

ابو قضاعہ منکر الحدیث ہے اس کی روایت قبول نہیں کی جاتی۔

ابوبکر العطار اور سلیمان بن احمد دونوں مجہول ہیں۔

تیسری بات: جس چیز سے اس روایت کا جھوٹ ظاہر ہوتا ہے وہ راوی کا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے متعلق کہنا ہے کہ

سورت نجم کے نزول کے وقت جب ستارہ ٹوٹ کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گھر پر گرا تو اس وقت موجود تھے۔ سورت نجم پر لوگوں کا اتفاق ہے کہ مکہ میں نازل ہونے والی ابتدائی سورتوں میں سے ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت بھی نوخیز لڑکے تھے؛ ابھی بلوغت کی عمر کو بھی نہیں پہنچے تھے۔ بخاری و مسلم میں یہ بات ثابت ہے۔

تو اس اعتبار سے ان آیات کے نزول کے وقت یا تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما پیدا ہی نہیں ہوئے تھے؛ اور اگر پیدا ہو بھی گئے تھے تو ابھی ناسمجھ بچے تھے۔ اس لیے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کی اس وقت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی عمر تقریباً زیادہ سے زیادہ پانچ سال ہوگی۔ حق بات یہ ہے کہ اس سورت کے نزول کے وقت ابن عباس پیدا ہی نہیں ہوئے تھے؛ اس لیے کہ سورت نجم قرآن کی انتہائی ابتدائی سورتوں میں سے ایک ہے۔ [1]

چوتھی بات: مزید براں ستارہ ٹوٹنے کا واقعہ صحیح نہیں۔ مکہ و مدینہ بلکہ کسی جگہ بھی یہ واقعہ پیش نہیں آیا۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تھے اس وقت بکثرت انگارے آسمان سے پھینکے جانے لگے۔ مگر کوئی ستارہ زمین پر نہیں اترا۔ یہ واقعہ ان خارق عادت امور میں سے نہیں جنہیں دنیا جانتی ہو؛ بلکہ ان امور میں سے جن کے بارے میں کسی کو کچھ بھی علم نہیں۔

بایں ہمہ ایسی من گھڑت روایت بیان کرنا بڑے جرأت مند ڈھیٹ اور دینداری کے لحاظ سے انتہائی بے حیاء آدمی کا کام ہے۔ اور ایسے واقعات کو صرف ایسے لوگوں میں ہی پذیرائی حاصل ہوسکتی ہے جو لوگوں میں سب سے جاہل اور احمق ہوں اور علمی لحاظ سے بالکل تہی دامن۔

پانچویں بات: سورت نجم اسلام کے ابتدائی دور میں نازل ہوئی تھی۔ اس وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ بالکل بچے تھے۔ بلوغت کی عمر کو بھی نہیں پہنچے تھے؛ اور نہ ہی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے شادی ہوئی تھی؛ اس وقت نماز بھی فرض نہیں ہوئی تھی۔ نہ ہی زکوٰۃ اور حج اور رمضان کے روزے فرض ہوئے تھے۔ اور نہ ہی اسلام کے عام قواعد مستحکم ہوئے تھے۔

اور اگر ان لوگوں کے دعوی کے مطابق امامت کے لیے وصیت کا واقعہ غدیر خُم کے موقع پر پیش آیا تو پھر اس سورت کے

[1] شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا کلام بالکل درست ہے۔ اعلان نبوت کے پانچویں سال بیت اللہ میں تلاوت قرآن کا واقعہ پیش آیا؛ اور آپ نے سورت نجم کی آیات تلاوت کیں؛ قرآن کی اثر آفرینی کا یہ عالم تھا کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس آیت پر پہنچے ﴿فاسجدوا لِلهِ واعبدوا﴾ اب اللہ کے سامنے سجدے کرو اور (اسی کی) عبادت کرو۔'' مسلمانوں کے ساتھ کافر بھی بے اختیار سجدہ ریز ہو گئے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سورت میں سجدہ کیا اور آپ کے پیچھے جتنے لوگ بیٹھے تھے (خواہ مسلمان تھے یا مشرک) سب نے سجدہ کیا بجز ایک شخص امیہ بن خلف کے، اس نے مٹھی بھر مٹی لی (منہ سے قریب کی) پھر اس پر سجدہ کیا...... الخ۔ (بخاری، کتاب التفسیر)۔ اسی موقعہ سے متعلق مشہور ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیات پڑھیں: ﴿افرأیتم اللات والعزی ومنواۃ الثالثۃ الاخری﴾ تو شیطان نے آپ کی آواز جیسی آواز میں آگے یہ الفاظ پڑھ دیے۔ (تلك الغرانیق العلی وإن شفاعتہن لترتجی) ''یہ تینوں بلند مرتبہ دیویاں ہیں اور ان کی شفاعت متوقع ہے۔'' اور بعض کے نزدیک یہ واقعہ یوں ہوا کہ جب قریشیوں نے بھی مسلمان کے ساتھ مل کر سجدہ کر لیا تو بعد میں انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ ہم سے یہ کیا حماقت سرزد ہوگئی تب انہوں نے یہ الفاظ اپنی طرف سے گھڑے اور کہہ دیا: کہ ہم نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے یہ الفاظ سنے تھے اور سمجھے کہ اب وہ بھی ہمارے دین کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔ اس لیے ہم نے ان کے ساتھ مل کر سجدہ کیا تھا۔ یہ واقعہ جو کچھ بھی تھا، یہ خبر یا افواہ اتنی مشہور ہوئی کہ حبشہ کی طرف ہجرت کرنے والوں نے، جنہوں نے رجب ۵ نبوی میں ہجرت کی تھی۔ جب ایسی صلح یا سمجھوتے کی خبر سنی تو شوال ۵ نبوی میں مکہ واپس آ گئے۔ مگر مکہ آ کر انہیں معلوم ہوا کہ یہ تو سب کچھ ایک افسانہ تھا۔ چنانچہ وہ دوبارہ ہجرت کر کے حبشہ کی طرف واپس چلے گئے۔ [دراوی، کشمیری]۔

نزول کے وقت وصیت کرنے کی کیا حقیقت باقی رہ جاتی ہے؟

چھٹی بات: مفسرین کرام رحمہم اللہ کا اس کے خلاف پر اتفاق ہے۔ سورت نجم میں جن ستاروں کی قسم اٹھائی گئی ہے وہ یا تو آسمان کے ستارے ہیں یا پھر قرآن کے ستارے۔ مگر ان میں سے کسی ایک نے بھی یہ نہیں کہا کہ مکہ میں کسی کے گھر میں ستارہ ٹوٹ کر گرا تھا۔

ساتویں بات: جو کوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کہے: ''آپ گمراہ ہوگئے'' تو وہ کافر ہوجاتا ہے۔ اور کفار کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم شہادتین کے اقرار اور اسلام میں داخل ہونے سے پہلے فروعی احکام کا حکم نہیں دیا کرتے تھے۔

آٹھویں بات: اگر ستارے کا ٹوٹنا آسمان سے گرنے والی [بجلی] آگ تھی؛ تو پھر کسی کے گھر میں بجلی کا گرنا اس کی کرامت نہیں ہوتی۔ اور اگر یہ ستارہ آسمانی ستاروں میں سے تھا تو یہ ستارے اپنے فلک سے باہر نہیں نکلتے۔ اور اگر یہ کوئی شہابیہ تھا تو شہابیے شیاطین کو مارنے کے لیے چھوڑے جاتے ہیں۔ شہابیے زمین پر نازل نہیں ہوتے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ واقعی شیطان دوڑ کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گھر تک پہنچا تھا اور شہابیے نے اس کا پیچھا کر کے جلا دیا تو اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی پھر بھی کوئی کرامت نہیں ہے۔ حالانکہ ایسا کوئی واقعہ پیش ہی نہیں آیا۔

امامت علی کی پانچویں دلیل:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ''پانچویں دلیل قرآن کریم کی یہ آیت ہے:

﴿إِنَّمَا يُرِيدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا﴾ [الأحزاب ۳۳]

''اے اہل بیت نبی اللہ تو یہ چاہتا ہے کہ تم سے ناپاکی کو دور کر کے اچھی طرح پاک صاف بنا دے۔''

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے اپنی مسند میں واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ: ''میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ان کے گھر میں تلاش کیا۔ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے بتایا کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف گئے ہیں۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علی رضی اللہ عنہ دونوں آئے۔ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا بھی وہاں پہنچ گئیں، آپ نے علی رضی اللہ عنہ کو بائیں جانب اور فاطمہ رضی اللہ عنہا کو دائیں طرف اور حسن و حسین رضی اللہ عنہما کو اپنے سامنے بٹھایا پھر ان پر اپنی چادر تان لی اور فرمایا:

﴿إِنَّمَا يُرِيدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا﴾

''اے اہل بیت نبی اللہ تو یہ چاہتا ہے کہ تم سے ناپاکی کو دور کر کے اچھی طرح پاک صاف بنا دے۔''

---

(1) دلدار کہتا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس سورت کے نزول کے وقت بہت کم عمر تھے؛ اور آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں پرورش پا رہے تھے۔ آپ کا علیحدہ سے کوئی گھر نہیں تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں آپ کے دوسرے لے پاک جو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی اولاد تھے وہ بھی رہا کرتے تھے؛ اور آپ کا آزاد کردہ غلام حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ بھی ہوا کرتے تھے۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ اگر یہ ستارہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے والد ابو طالب کے گھر پر گرا تو پھر ان کے دوسرے بھائی بھی مسلمان تھے؛ جو آپ سے بڑے بھی تھے؛ تو ان میں سے صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ اور امام ہونے کے لیے کیسے چنا گیا؟ اور اگر یہ ستارہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہی گھر پر گرا تھا تو حضرت زید بن حارثہ؛ حضرت ہالہ اور دوسرے لوگوں کو چھوڑ کر آپ کو متعین امام اور وصی مقرر کرنے کے لیے کوئی خاص دلیل ہونی چاہیے؛ ورنہ یہ تمام لوگوں کے لیے عام ہے؛ کوئی بھی دوسرا اس کا مستحق ہو سکتا ہے۔ لیکن کیا کریں رافضی بیچارے عقل و علم سے بالکل کورے ہوتے ہیں؛ ان کو تو ڈھنگ سے جھوٹ بولنا بھی نہیں آتا۔ [دراوی؛ کشمیری]

اور پھر فرمایا: ''اے اللہ ! یہ میرے سچے اہل بیت ہیں۔'' حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کا قول ہے کہ نبی کریم ﷺ اس وقت میرے گھر میں تشریف فرما تھے ۔تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا پتھر کی ایک ہانڈی لیکر آئیں جس میں حریرہ تھا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''اپنے شوہر اور دونوں بیٹوں کو بلا لاؤ۔ تو آپ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حسن و حسین رضی اللہ عنہما کو بلا لائیں۔ یہ سب لوگوں گھر میں داخل ہوئے اور گھر میں بیٹھ کر حریرہ کھانے لگے ۔رسول اللہ ﷺ اس وقت ایک خیبری چادر پر بیٹھے ہوئے تھے۔اور میں اپنے حجرہ میں کھڑی نماز پڑھ رہی تھی۔اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

﴿اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَھْلَ الْبَیْتِ وَیُطَھِّرَکُمْ تَطْھِیْرًا﴾

آپ فرماتی ہیں: رسول اللہ ﷺ نے ان لوگوں کو اپنی چادر کے باقی حصہ میں داخل کرلیا؛ اور پھر اپنے ہاتھ باہر نکال کر آسمان کی طرف بلند کیے اور یہ دعا فرمائی:

''یا اللہ یہ میرے اہل بیت ہیں، ان سے گناہ کی نجاست دور کردے اور انکو بخوبی پاک کردے۔'' آپ نے کئی بار ایسے فرمایا۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: میں نے اپنا سر اندر داخل کیا؛ اور عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! میں بھی ان کیساتھ ہوں (یعنی چادر میں آنے کا ارادہ کیا)۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تم اپنی جگہ رہو تم خیر پر ہو۔

مذکورہ صدر آیت میں ان کے معصوم ہونے کی دلیل ہے۔اور ﴿اِنَّمَا﴾ کے بعد اس کی خبر پر ''لام'' داخل کیا گیا ہے یہ لفظ بتاکید اس خطاب میں اہل بیت کے اختصاص پر دلالت کرتا ہے۔اور پھر ﴿یطھرکم﴾ کے لفظ سے اس مضمون کو دھرایا گیا ہے' اور ﴿تطھیرا﴾ کے لفظ سے اس کی تاکید کی گئی ہے۔اس سے بھی تاکید کا مفہوم نکل رہا ہے، اس آیت سے مستفاد ہوا کہ اہل بیت کے سوا کوئی بھی معصوم نہیں۔ لہٰذا امام صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ ہوں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے متعدد اقوال میں اس کا دعویٰ کیا ہے، جیسے آپ کا یہ قول:

''ابن ابی قحافہ نے یہ لباس اوڑھا (منصب خلافت پر فائز ہوئے) حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ مجھے وہی مرتبہ حاصل ہے جو ایک چکی میں درمیانی سیخ کو حاصل ہوتا ہے۔'' علاوہ ازیں آپ سے نجاست کی نفی بھی کردی گئی ہے، لہٰذا حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی خلیفہ صادق ہوں گے۔'' [انتھی کلام الرافضی]

[آیت تطہیر سے شیعہ کا استدلال]:

ہم کہتے ہیں یہ حدیث صحیح ہے، یہ ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ فاطمہ رضی اللہ عنہا حسن رضی اللہ عنہ اور حسین رضی اللہ عنہ کو بلوایا اور ان سب پر ایک چادر ڈال دی۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ دعا کی:

''یا اللہ یہ میرے اہل بیت ہیں، ان سے گناہ کی نجاست دور کردے اور انکو بخوبی پاک کردے۔''

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم صبح کے وقت اس حال میں نکلے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اوپر ایک ایسی چادر اوڑھے ہوئے تھے کہ جس کے کناروں پر ہانڈیوں کے نقش سیاہ بالوں سے بنے ہوئے تھے۔اسی دوران میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ آگئے تو آپ نے ان کو اپنی اس چادر کے اندر کرلیا پھر حضرت حسین رضی اللہ عنہ بھی آگئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بھی اپنی چادر کے اندر کرلیا پھر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا آئیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بھی اپنی چادر میں کرلیا پھر

حضرت علی رضی اللہ عنہ آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بھی اپنی چادر میں کر لیا پھر آپ نے یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی:

﴿اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَیْتِ وَیُطَهِّرَكُمْ تَطْهِیْرًا﴾

''اے اہل بیت نبی اللہ تو یہ چاہتا ہے کہ تم سے ناپاکی کو دور کر کے اچھی طرح پاک صاف بنا دے۔''[1]

سنن میں سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے یہ روایت زیادہ مشہور ہے۔[2] مگر اس میں عصمت و امامت کا کوئی ذکر نہیں پایا جاتا۔

حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کا مضمون دو جگہ پر پایا جاتا ہے:

پہلا مقام: اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَیْتِ وَیُطَهِّرَكُمْ تَطْهِیْرًا﴾

یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے:

﴿ مَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیَجْعَلَ عَلَیْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ ﴾

''اللہ تعالیٰ تمہیں کسی حرج میں مبتلا نہیں کرنا چاہتے۔''

مندرجہ ذیل آیات بھی اسی قبیل سے ہیں:

۱.....﴿ یُرِیْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْیُسْرَ وَ لَا یُرِیْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ﴾ (البقرة:۱۸۵)

''اللہ تعالیٰ تمہارے لیے آسانی چاہتا ہے اور وہ تمہارے ساتھ کوئی تنگی نہیں کرنا چاہتا۔''

۲.....﴿یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُبَیِّنَ لَكُمْ وَ یَهْدِیَكُمْ سُنَنَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ یَتُوْبَ عَلَیْكُمْ وَ اللّٰهُ عَلِیْمٌ حَكِیْمٌ﴾ (النساء:۲۶)

''اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ تمہارے واسطے خوب کھول کر بیان کرے اور تمہیں تم سے پہلے کے (نیک) لوگوں کی راہ پر چلائے اور تمہاری توبہ قبول کرے اور اللہ تعالیٰ جاننے والا حکمت والا ہے۔''

۳.....﴿وَ اللّٰهُ یُرِیْدُ اَنْ یَّتُوْبَ عَلَیْكُمْ وَ یُرِیْدُ الَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوٰتِ اَنْ تَمِیْلُوْا مَیْلًا عَظِیْمًا ﴾

''اور اللہ چاہتا ہے کہ تمہاری توبہ قبول کرے اور جو لوگ خواہشات کے پیرو ہیں وہ چاہتے ہیں کہ تم اس سے بہت دور ہٹ جاؤ۔'' (النساء:۲۷)

ان آیات میں ارادہ سے مراد محبت و رضا ہے۔ اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کے لیے ایسا مشروع کیا ہے' اور انہیں ایسا کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس میں کہیں بھی یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسا کچھ پیدا کر دیا ہے اور یہ مطلب بھی نہیں کہ اس نے یہ بات مقدر کر دی ہے یا اسے ایجاد کر دیا ہے۔ اور نہ ہی یہ مقصد ہے کہ ہر حال میں ایسا ہو کر ہی رہے گا۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے اللہ یہ میرے گھر والے ہیں تو ان سے نجاست کو دور کر دے۔''

---

[1] صحیح مسلم۔ کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل اهل بیت النبی ﷺ (حدیث:۲۴۲۴)

[2] سنن ترمذی۔ کتاب المناقب۔ باب ما جاء فی فضل فاطمة رضی اللہ عنہا (حدیث: ۳۸۷۱)۔

نبی کریم ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے دربار میں یہ التجا کی ہے کہ ان سے نجاست کو دور کر دے اور انہیں ہر طرح سے پاک کر دے۔ اگر آیت کا مطلب ہوتا کہ اہل بیت کو پاک کیا جا چکا ہے تو دعا کی حاجت نہ تھی۔

[ارادہ الٰہی کی اقسام]:

فرقہ قدریہ (منکرین تقدیر) کے قول کے مطابق یہ بات اور بھی واضح ہے۔ اس لیے کہ قدریہ کے نزدیک اللہ کے ارادہ کے لیے وجود مراد ضروری نہیں۔ بلکہ بعض اوقات وہ ارادہ کرتا ہے اور وہ چیز وقوع میں نہیں آتی اور بعض دفعہ وہ چیز ظہور پذیر ہوتی ہے جس کا وہ ارادہ نہیں کرتا۔

یہ رافضی اور اس کے امثال قدریہ وہ اس آیت: ﴿إِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ﴾ سے کیسے اپنی مراد کے واقع ہونے پر استدلال کرتے ہیں؟ کیا شیعہ اپنا قانون فاسد بھی بھول گئے؟

ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ نے ارادہ کیا تھا کہ تمام اہل زمین ایمان لے آئیں، مگر اللہ کا ارادہ پورا نہ ہو سکا۔

تقدیر کا اثبات کرنے والے [اہل سنت] کی رائے میں کتاب اللہ میں ارادہ کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ ارادہ شرعیہ دینیہ: جو اللہ تعالیٰ کی محبت و رضا کو متضمن ہے جیسا کہ مذکورہ صدر آیات ہیں:

۲۔ ارادہ کونیہ قدریہ: یہ اللہ تعالیٰ کی خلق و تقدیر کو شامل ہے۔

ارادہ کی پہلی اقسام کی مثالیں:

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ وَ مَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَآءِ﴾ (الانعام: ۱۲۵)

''سو جس شخص کو اللہ تعالیٰ راستہ پر ڈالنا چاہے اس کے سینہ کو اسلام کے لئے کشادہ کر دیتا ہے جس کو گمراہ رکھنا چاہے اس کے سینے کو بہت تنگ کر دیتا ہے جیسے کوئی آسمان پر چڑھتا ہے۔''

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَ لَا يَنْفَعُكُمْ نُصْحِيْٓ اِنْ اَرَدْتُّ اَنْ اَنْصَحَ لَكُمْ اِنْ كَانَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يُّغْوِيَكُمْ﴾ [هود ۳۴]

''تمہیں میری خیر خواہی کچھ بھی نفع نہیں دے سکتی، گو میں کتنی ہی تمہاری خیر خواہی کیوں نہ چاہوں، بشرطیکہ اللہ کا ارادہ تمہیں گمراہ کرنے کا ہو۔''

بہت سارے مشتبہ اور قدریہ ارادہ کی صرف ایک ہی قسم شمار کرتے ہیں۔ جیسا کہ ارادہ اور محبت کو بھی ایک ہی چیز کہتے ہیں۔ پھر قدریہ آیات تقدیر میں واضح ارادہ [بمعنی تقدیر] کی نفی کرتے ہیں۔ اور دوسرا گروہ ایک ارادہ بمعنی تشریع کی نفی کرتا ہے۔ ان کے نزدیک ہر وہ چیز جس کے بارے میں کہا جا سکتا ہو کہ یہ مراد ہے تو اس مراد کا پورا ہونا ہر حال میں ضروری ہے۔

جب کہ اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ وہ مؤمنین کی توبہ قبول کرنا اور انہیں پاک کرنا چاہتا ہے۔ لیکن لوگوں میں کچھ ایسے ہوتے ہیں جو توبہ کرتے ہیں [تو اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول کرتے ہیں] اور کچھ لوگ توبہ نہیں کرتے۔ ان میں کچھ ایسے ہوتے

ہیں جو پاک وصاف ہوجاتے ہیں اور کچھ پاک نہیں ہوتے۔

جب آیت دلالت کرتی ہے کہ ان [اہل بیت] کو پاک کرنے کا اور ان سے نجاست دور کرنے کا اللہ تعالیٰ کے ارادہ کا وقوع ہوا ہے؛ تو اس سے یہ لازم نہیں آتا [انہیں فی الفور پاک کر بھی دیا گیا ہو] جیسا کہ مصنف کا دعوی ہے۔

اس کی مزید وضاحت اس سے ہوتی کہ زیر نظر آیت کے آغاز میں ازواج النبی ﷺ کا ذکر کیا گیا ہے۔اور یہ کلام ان ہی کی طہارت کے واجب ہونے کے بارے میں ہے؛ اور جو کوئی ایسا کرے گا اس کے لیے اس فعل پر ثواب کا وعدہ ہے؛ اور اس کے ترک پر سزا کا بیان ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ مَنْ یَّاْتِ مِنْکُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَیِّنَةٍ یُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَیْنِ وَ کَانَ ذٰلِكَ عَلَی اللّٰهِ یَسِیْرًا ٭ وَ مَنْ یَّقْنُتْ مِنْکُنَّ لِلّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ تَعْمَلْ صَالِحًا نُّؤْتِهَآ اَجْرَهَا مَرَّتَیْنِ وَ اَعْتَدْنَا لَهَا رِزْقًا کَرِیْمًا ٭ یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ لَسْتُنَّ کَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَیْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَیَطْمَعَ الَّذِیْ فِیْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّ قُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ٭ وَ قَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ وَ لَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِیَّةِ الْاُوْلٰی وَ اَقِمْنَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتِیْنَ الزَّکٰوةَ وَ اَطِعْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُذْهِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَیْتِ وَیُطَهِّرَکُمْ تَطْهِیْرًا ٭﴾ [الأحزاب ۳۰۔۳۳]

''اے نبی کی بیویو! تم میں سے جو بھی کھلی بے حیائی (کا ارتکاب) کرے گی اسے دوہرا دوہرا عذاب دیا جائے گا اور اللہ تعالی کے نزدیک یہ بہت ہی سہل (سی بات) ہے۔اور تم میں سے جو کوئی اللہ کی اور اسکے رسول کی فرماں برداری کرے گی اور نیک کام کرے گی ہم اسے اجر (بھی) دوہرا دیں گے اور اس کے لئے ہم نے بہترین روزی تیار کر رکھی ہے۔اے نبی کی بیویو! تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو؛ اگر تم پرہیزگاری اختیار کرو تو نرم لہجے سے بات نہ کرو کہ جس کے دل میں روگ ہو وہ کوئی برا خیال کرے اور ہاں قاعدہ کے مطابق کلام کرو۔اور اپنے گھروں میں قرار سے رہو اور قدیم جاہلیت کے زمانے کی طرح اپنے بناؤ کا اظہار نہ کرو اور نماز ادا کرتی رہو اور زکوۃ دیتی رہو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت گزاری کرو اللہ چاہتا ہے: نبی کی گھر والیو! کہ وہ تم سے گندگی کو دور کر دے اور تمہیں خوب پاک کر دے۔''

یہ پورا خطاب نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات سے ہے۔اس میں امر و نہی وعد و وعید سب چیزیں موجود ہیں۔لیکن جب اس خطاب کے فائدہ [اور عموم حکم] کی بات ہے تو یہ اہل بیت اور غیر اہل بیت تمام عورتوں کو شامل ہے۔اس لیے یہ خطاب ان الفاظ میں وارد ہوا ہے۔ بنا بریں یہ خطاب ازواج سے ہے۔نجاست دور کرنے کا ارادہ اور تطہیر اہل بیت صرف ازواج ہی کے ساتھ مختص نہیں بلکہ سب اہل بیت اس میں شامل ہیں۔ بلاشبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ و فاطمہ و حسن و حسین رضی اللہ عنہما باقی اہل بیت کی نسبت اخص ہیں یہی وجہ ہے کہ دعا میں خصوصیت سے ان کا ذکر کیا۔

یہ خطاب اللہ تعالیٰ کے اس قول کی مانند ہے: ﴿لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَی التَّقْوٰی مِنْ اَوَّلِ یَوْمٍ﴾ [التوبہ ۱۰۸]

''یقیناً وہ مسجد جس کی بنیاد پہلے دن سے تقوی پر رکھی گئی۔''

یہ آیت مسجد قباء کے بارے میں نازل ہوئی؛ مگر اس کا حکم مسجد قباء کے لیے بھی اور اس مسجد کے لیے بھی جو اس سے زیادہ

اس حکم کی حق دار ہے یعنی مسجد نبوی شریف۔ یہ تو جیہ خود نبی کریم ﷺ سے بھی حدیث مبارک میں ثابت ہے۔ آپ سے پوچھا گیا کہ: ''وہ مسجد کون سی ہے جو تقوی کی بنیاد پر تعمیر کی گئی ہے؟ تو آپ نے فرمایا: ''میری یہ مسجد۔''[ترمذي ٤/ ٣٤٤]۔

اور احادیث مبارکہ میں یہ بھی ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہر ہفتہ کو پیدل یا سوار ہو کر مسجد قباء آیا کرتے تھے۔ جمعہ اپنی مسجد میں پڑھایا کرتے تھے [اور وہاں قیام کرتے]۔ اور ہفتہ کو مسجد قباء میں تشریف لاتے۔ ان دونوں مساجد بنیاد تقوی پر رکھی گئی۔ ایسے ہی نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات؛ حضرت علی؛ حضرت فاطمہ اور حضرات حسن و حسین رضی اللہ عنہم یہ تمام لوگ اہل بیت میں سے ہیں۔لیکن رسول اللہ ﷺ نے اپنی دعا میں حضرت علی؛ حضرت فاطمہ اور حضرات حسن و حسین رضی اللہ عنہم اجمعین ازواج کی نسبت زیادہ خاص ہیں' یہی وجہ ہے کہ دعا میں بطور خاص ان کا ذکر کیا ہے۔

علماء کرام رحمہم اللہ کے مابین اختلاف ہے کہ آل محمد ﷺ سے کون لوگ مراد ہیں؟

ایک جماعت کا قول یہ ہے کہ اس سے مراد نبی کریم ﷺ کی امت ہے؛ یہ امام مالک اور امام احمد رحمہ اللہ کا قول ہے۔

دوسرا قول: اس سے مراد امت محمد ﷺ کے متقی لوگ مراد ہیں۔اس کی تائید میں وہ یہ روایت پیش کرتے ہیں:

''ہر متقی مؤمن آل محمد ہے۔'' [رواہ الخلال وتمام فی "الفوائد"]

امام احمد کے اصحاب میں سے ایک گروہ نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے۔ یہ حدیث موضوع ہے۔اس روایت کو صوفیاء کی ایک جماعت نے اپنے نظریات وعقیدہ کی بنیاد بنایا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ: آل محمد ﷺ سے مراد خاص اولیاء ہیں۔حکیم ترمذی نے ایسے ہی ذکر کیا ہے۔

صحیح یہ ہے کہ آل محمد سے مراد آپ ﷺ کے اہل بیت ہیں۔ یہ قول امام شافعی رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ سے منقول ہے اور سید ابو جعفر رحمہ اللہ نے اسے ہی اختیار کیا ہے۔لیکن کیا رسول اللہ ﷺ کی ازواج مطہرات آپ کے اہل بیت میں سے ہیں؟ اس بارے میں دو قول ہیں؛ اور امام احمد رحمہ اللہ سے بھی دو روایتیں منقول ہیں۔

پہلا قول: ازواج مطہرات اہل بیت میں سے نہیں ہیں۔ زید بن ارقم سے ایسے ہی روایت کیا گیا ہے۔

دوسرا قول: ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن اہل بیت میں سے ہیں۔ یہی صحیح قول ہے۔ اس لیے کہ احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ان کو یہ دعا سکھائی:

" اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّاَزْوَاجِهٖ وَ ذُرِّيَاتِهٖ . "

''اے اللہ! رحمتیں نازل فرما محمد ﷺ پر اور آپ کی ازواج پر اور آپ کی اولاد پر۔''

اور اس لیے بھی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیوی کا شمار آپ کے اہل بیت میں سے کیا گیا ہے؛ حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی کا شمار آپ کی آل اور اہل بیت میں سے کیا گیا ہے۔اس پر قرآن کی واضح دلالت موجود ہے۔تو پھر نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کا شمار آپ کی آل اور اہل بیت میں کیوں نہیں ہوسکتا۔

یہ آیت بھی دلالت کرتی ہے کہ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کا شمار آپ کے اہل بیت میں سے ہوتا ہے۔اگر ایسا نہ ہوتا تو پھر یہ سارا کلام بے معنی ہو کر رہ جاتا۔جب کہ رسول اللہ ﷺ کی امت کے متقی بھی آپ کے اولیاء [دوست] ہیں۔جیسا کہ صحیح

حدیث میں ثابت ہے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''بیشک بنی فلاں میرے دوست نہیں ہیں؛ بیشک میرا دوست اللہ تعالیٰ ہے اور نیکو کار اہل ایمان ہیں۔'' [مسلم ۱/ ۱۹۷]

اس حدیث میں آپ نے بیان کردیا ہے کہ آپ کے اولیاء اور دوست صالح و نیکو کار اہل ایمان ہیں۔ ایسے ہی ایک دوسری حدیث میں آتا ہے؛ آپ ﷺ نے فرمایا:

''بیشک میرے دوست متقی لوگ ہیں وہ جہاں بھی ہوں اور جیسے بھی ہوں۔'' [المسند ۵/ ۲۳۵]

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَاِنْ تَظٰهَرَا عَلَيْهِ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰهُ وَجِبْرِيْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ [التحریم ۴]

''اور اگر تم نبی کے خلاف ایک دوسرے کی مدد کروگی پس یقیناً اس کا کارساز اللہ ہے اور جبرائیل ہیں اور نیک ایماندار۔''

صحاح ستہ میں ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''مجھے یہ بات پسند تھی کہ میں اپنے بھائیوں کو دیکھ لیتا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! کیا ہم آپ کے بھائی نہیں ہیں؟ آپ نے فرمایا: نہیں تم میرے اصحاب ہو؛ میرے بھائی وہ لوگ ہیں جو میرے بعد آئیں گے اور مجھ پر ایمان لائیں گے حالانکہ انہوں نے مجھے دیکھا نہیں ہوگا۔''[1]

آیت تطہیر اور شیعی دعویٰ کی حقیقت:

اگر شیعہ کہیں کہ فرض کیجیے قرآن کریم سے اہل بیت کی طہارت اور پاکیزگی ثابت نہیں ہوتی، مگر نبی کریم ﷺ کی دعا سے معلوم ہوتا ہے کہ فی الواقع ان سے نجاست کا ازالہ کردیا گیا ہے۔ اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ کی دعا مستجاب ہوتی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ہمارا مقصد یہ بتانا ہے کہ صرف قرآن کریم سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اہل بیت سے نجاست کو دور کردیا گیا ہے۔ باقی رہی عصمت و امامت تو قرآن میں اس کا کوئی ذکر ہی نہیں پایا جاتا۔ جب کہ حدیث سے استدلال کا ایک علیحدہ مقام ہے۔

پھر ہم یہ بھی کہتے ہیں: بالفرض اگر قرآن سے ان کی طہارت اور ان سے نجاست کا دور ہونا ثابت ہو بھی جائے؛ جیسے آپ ﷺ کی دعاء مستجاب ہوتی ہے؛ ایسا ہونا ہر حال میں لازمی ہے۔ تو اس میں خطاء سے عصمت کہاں سے لازم آئے گی؟

---

[1] صحیح مسلم میں ہے: رسول اللہ ﷺ قبرستان تشریف لائے اور فرمایا سلامتی ہو تم پر مومنوں کے گھر، ہم بھی ان شاء اللہ تم سے ملنے والے ہیں میں پسند کرتا ہوں کہ ہم اپنے دینی بھائیوں کو دیکھیں، صحابہ کرام نے عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا ہم آپ ﷺ کے بھائی نہیں ہیں آپ نے فرمایا: تم تو میرے صحابہ ہو اور ہمارے بھائی وہ ہیں جو ابھی تک پیدا نہیں ہوئے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: آپ ﷺ اپنی امت کے ان لوگوں کو اے اللہ کے رسول! کیسے پہچانیں گے جو ابھی تک نہیں آئے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: بھلا تم دیکھو اگر کسی شخص کی سفید پیشانی والے سفید پاؤں والے گھوڑے سیاہ گھوڑوں میں مل جائیں تو کیا وہ اپنے گھوڑوں کو ان میں سے پہچان نہ لے گا صحابہ کرام نے عرض کیا کیوں نہیں یا رسول اللہ! آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ لوگ جب آئیں گے تو وضو کے اثر کی وجہ سے ان کے چہرے ہاتھ اور پاؤں چمکدار اور روشن ہوں گے اور میں ان سے پہلے حوض پر موجود ہوں گا اور سنو بعض لوگ میرے حوض سے اس طرح دور کیے جائیں گے جس طرح بھٹکا ہوا اونٹ دور کردیا جاتا ہے میں ان کو پکاروں گا ادھر آؤ تو حکم ہوگا کہ انہوں نے آپ ﷺ کے وصال کے بعد دین کو بدل دیا تھا تب میں کہوں گا دور ہو جاؤ دور ہو جاؤ۔ صحیح مسلم: ح:584۔ یہ صحاح ستہ کی روایت ہے۔ [الدراوی]

نیز اس کی دلیل کیا ہوگی کہ اہل بیت اور ازواج مطہرات میں سے کسی ایک سے سہو و خطا کا صدور نہیں ہوسکتا۔ ازواج مطہرات کو جو احکام اس آیت میں دیے گئے ہیں۔ ان سے ہرگز یہ مقصود نہیں کہ ان سے غلطی سرزد نہیں ہوگی۔ بلکہ ان سے خطاء ہوسکتی ہے؛ لیکن اس کی خطاؤں کو اللہ تعالیٰ نے پہلے سے ہی معاف کردیا ہے۔

آیت کے سیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے خبث و فواحش کو دور کرنا چاہتا ہے۔ اور ان کو فواحش و منکرات اور دیگر گناہوں سے پاک کرنا چاہتا ہے۔

گناہوں سے پاکیزگی دو طرح سے ہوتی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ﴾ [المدثر ۴]

''اور اپنے کپڑے پس پاک رکھ۔''

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿إِنَّهُمْ أُنَاسٌ يَتَطَهَّرُونَ﴾ [الأعراف ۸۲]

''بیشک یہ لوگ بڑے پاک صاف بنتے ہیں۔''

اور ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّأْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ﴾ [الأحزاب ۳۰]

''اے نبی کی بیویو! تم میں سے جو بھی کھلی بے حیائی (کا ارتکاب) کرے گی اسے دوہرا دوہرا عذاب دیا جائے گا۔''

یا تو انسان کسی گناہ کے کام کا ارتکاب ہی نہ کرے۔ یا پھر گناہ کے بعد اس سے توبہ کرلے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَ تُزَكِّيْهِمْ بِهَا﴾ [التوبة ۱۰۳]

''آپ ان کے مالوں میں سے صدقہ لیجیے، جس کے ذریعہ سے آپ ان کو پاک صاف کردیں۔''

لیکن جس چیز کا اللہ تعالیٰ نے ارادہ کرتے ہوئے ابتداء میں حکم دیا ہے؛ وہ فحاشی اور بے حیائی کے امور سے نہی و ممانعت کو شامل ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ فی الحال ایسے واقع ہوچکا ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ ان امور سے منع کررہے ہیں؛ اور جن سے کوئی حرکت سرزد ہوگئی ہے؛ انہیں توبہ کرنے کا حکم دے رہے ہیں۔

جیسا کہ صحیح مسلم میں ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعا فرمایا کرتے تھے:

((اَللّٰهُمَّ بَاعِدْ بَيْنِيْ وَ بَيْنَ خَطَايَايَ كَمَا بَاعَدْتَ بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ ط اَللّٰهُمَّ نَقِّنِيْ مِنْ خَطَايَايَ كَمَا يُنَقَّى الثَّوْبُ الْاَبْيَضُ مِنَ الدَّنَسِ ط اَللّٰهُمَّ اغْسِلْنِيْ مِنْ خَطَايَايَ بِالْمَآءِ وَالثَّلْجِ وَالْبَرَدِ)) (متفق عليه)

''اے اللہ دوری کردے درمیان میرے اور گناہوں کے جیسے دوری پیدا فرمائی تو نے مشرق اور مغرب کے درمیان۔ اے اللہ! مجھے صاف کردے میرے گناہوں سے جس طرح صاف کیا جاتا ہے سفید کپڑے کو میل کچیل سے۔ اے اللہ! مجھے دھودے میرے گناہوں سے برف اور پانی اور اولوں سے۔''

صحیحین میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے واقعہ افک میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ابھی آپ کی برأت کا علم نہیں ہوا تھا؛ اور

❶ البخاري كتاب احاديث الانبياء (ح:۳۳۶۹)، مسلم، كتاب الصلاة باب الصلاة على النبي بعد التشهد (ح: ۴۰۷)۔

اس معاملہ میں سخت بے چینی کا شکار تھے؛ تو آپ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا:

''اے عائشہ مجھے تیرے بارے میں ایسی ایسی خبر پہنچی ہے پس اگر تو پاک دامن ہے تو عنقریب اللہ تیری پاکدامنی واضح کر دیگا اور اگر تم گناہ میں ملوث ہو چکی ہو تو اللہ سے مغفرت طلب کرو اور اس کی طرف رجوع کرو پس بے شک بندہ جب گناہ کا اعتراف کر لیتا ہے پھر توبہ کرتا ہے تو اللہ بھی اس پر اپنی رحمت کے ساتھ رجوع فرماتا ہے۔'' [مسلم:ح2521۔]

خلاصہ کلام! لفظ ''رجس'' اصل میں ناپاکی کے لیے بولا جاتا ہے اور اس سے مراد شرک ہوتا ہے؛ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ ﴾ [الحج ۳۰]

''پس تمہیں بتوں کی گندگی سے بچتے رہنا چاہیے۔''

اور اس سے کھانے پینے کی وہ گندی چیزیں بھی مراد لی جاتی ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے حرام ٹھہرایا ہے۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ﴾ [الأنعام ۱۴۵]

''آپ فرما دیجئے جو کچھ احکام بذریعہ وحی میرے پاس آئے ان میں تو میں کوئی حرام نہیں پاتا کسی کھانے والے کے لئے جو اس کو کھائے، مگر یہ کہ وہ مردار ہو یا کہ بہتا ہوا خون ہو یا خنزیر کا گوشت ہو، کیونکہ وہ بالکل ناپاک ہے۔''

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَ الْمَيْسِرُ وَ الْاَنْصَابُ وَ الْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ﴾ [المائدۃ ۹۰]

''اے ایمان والو! بات یہی ہے کہ شراب اور جوا اور تھان اور فال نکالنے کے پانسے سب گندی باتیں، شیطانی کام ہیں۔''

اس قسم کی ناپاکی کو ختم کرنے سے مراد [اپنے جنس کی] تمام ناپاکی کو ختم کرنا ہے۔ ہم اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں کہ ان اکابر اہل بیت کو اللہ تعالیٰ شرک و خبائث کو دور کر کے ان کو فواحش و منکرات اور دیگر گناہوں سے پاک کر دیا تھا۔

''رجس'' کا لفظ عام ہے؛ جو تمام قسم کی ناپاکی کو شامل ہے؛ اور اس کا تقاضا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے ہر قسم کی ناپاکی دور کر دی ہو؛ اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کے لیے ایسی ہی دعا فرمائی تھی۔

جب کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان: "وتطهرهم تطهيرا۔" اور انہیں ہر طرح سے پاک و صاف کر دے۔ یہ مطلق طور پر سوال ہے [ہر اس چیز کو شامل جس کے لیے] طہارت کا لفظ استعمال کیا جاتا ہو۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ لفظ مطلق ہے؛ طہارت کا کوئی ایک عنصر بھی پایا جانے سے مقصود حاصل ہو جاتا ہے۔ ایسے قیاس و عبرت کے لیے بولا جاتا ہے جیسے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْاَبْصَارِ ﴾ [الحشر ۲]

''پس اے آنکھوں والو! عبرت حاصل کرو۔''

حاصل کلام! طہارت کا اعتبار اس کے اطلاق کے لحاظ سے ہوگا۔ جیسا کہ اگر کسی سے کہا جائے کہ: '' أكرم هذا'' اس کا اکرام کرو۔ تو اس سے مراد یہ ہے کہ اس کے ساتھ ایسا سلوک کرو جسے عرف میں اکرام کہا جاتا ہے۔

ایسے ہی '' طاہر '' کا لفظ بھی '' طیب '' کی طرح ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَالطَّيِّبَاتُ لِلطَّيِّبِينَ وَالطَّيِّبُونَ لِلطَّيِّبَاتِ﴾ [النور ۲٦]

''اور پاک عورتیں پاک مردوں کے لائق ہیں اور پاک مرد پاک عورتوں کے لائق ہیں۔''

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿الْخَبِيثَاتُ لِلْخَبِيثِينَ وَالْخَبِيثُونَ لِلْخَبِيثَاتِ﴾ [النور ۲٦]

''''خبیث عورتیں خبیث مرد کے لائق ہیں اور خبیث مرد خبیث عورتوں کے لائق ہیں۔''

ایسے روایت کیا گیا ہے کہ [حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس بیٹھا ہوا تھا حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ نے اجازت طلب کی] نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''ان کو اجازت دو؛ خوش آمدید پاکیزہ فطرت شخص کے لئے۔''[سنن ابن ماجہ:ج: ۱ : ح ۱٤٦]

یہ لفظ بھی '' المتقی '' اور لفظ '' المزکی '' کی طرح ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا ☆ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّاهَا﴾ [الشمس ۹۔۱۰]

''جس نے اسے پاک کیا وہ کامیاب ہوا۔ اور جس نے اسے خاک میں ملا دیا وہ ناکام ہوگا۔''

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا﴾ (التوبة:۱۰۳)

''ان کے مالوں سے صدقہ لے کر اس سے ان کو پاک کیجیے اور ان کا تزکیہ فرمایئے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكَّى﴾ [الأعلی ۱۴]

''وہ انسان کامیاب ہوگیا جس نے تزکیہ نفس کیا۔''

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ مَا زَكَا مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ أَبَدًا وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يُزَكِّي مَنْ يَشَآءُ﴾

''اگر اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم تم پر نہ ہوتا تو تم میں سے کوئی بھی کبھی بھی پاک صاف نہ ہوتا۔ لیکن اللہ تعالیٰ جسے پاک کرنا چاہے، کر دیتا ہے۔''

مگر متقی کے لیے یہ ضروری نہیں کہ اس سے صغیرہ گناہ بھی صادر نہ ہو۔ اور نہیں اس کے لیے خطاء اور گناہوں سے پاک ہونا شرط ہے۔ اگر متقی کے لیے یہ بات شرط ہوتی تو پوری امت میں ایک بھی متقی نہ ہوتا۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے جو بھی گناہوں سے توبہ کرلے اس کا شمار متقین میں سے ہوگا؛ اور ایسے ہی جو شخص بھی نیک اعمال سے اپنے گناہوں کو زائل کرے وہ متقی ہوگا۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿إِنْ تَجْتَنِبُوا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُدْخَلًا كَرِيمًا﴾ [النساء ۳۱]

''اگر تم بڑے گناہوں سے بچتے رہو گے جس سے تم کو منع کیا جاتا ہے تو ہم تمہارے چھوٹے گناہ دور کر دیں گے اور عزت و بزرگی کی جگہ داخل کریں گے۔''

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ان حضرات کو پاک کرنے کے لیے دعا ایسے ہی جیسے آپ دعا فرمائیں کہ: ان کا تزکیہ نفس ہو جائے؛

اور انہیں پاک کر دیا جائے؛ اور انہیں نیک و متقی بنادیا جائے۔ اور یہ بات معلوم ہے کہ جس بارے میں پاک و صاف ہونا ثابت ہو جائے وہ اس حکم میں شامل ہے۔[اہل بیت کے لیے کی گئی]یہ دعاء رسول اللہ ﷺ کی اپنی ذات کے لیے کی گئی دعا سے بڑھ کر نہیں ہے؛ آپ نے یوں دعا فرمائی تھی:

''اے اللہ! مجھے صاف کر دے میرے گناہوں سے جس طرح صاف کیا جاتا ہے سفید کپڑے کو میل کچیل سے۔اے اللہ! مجھے دھو دے میرے گناہوں سے برف اور ٹھنڈے پانی اور اولوں سے۔''

پس جس کسی سے اگر گناہ سرزد ہو جائے' یا تو وہ مغفرت کے لائق ہوتا ہے' یا پھر اللہ تعالیٰ کسی چیز کو اس کا کفارہ بنا کر اسے بالکل پاک کر دیتے ہیں۔لیکن جو کوئی اپنی گناہوں میں لت پت مر گیا وہ اپنی اس زندگی میں ان گناہوں سے پاک نہیں ہو سکا۔اور کبھی اللہ تعالیٰ انہیں صدقات کی وجہ سے گناہوں سے بالکل پاک کر دیتے ہیں۔صدقہ لوگوں کی میل کچیل ہوتی ہے۔پس جب نبی کریم ﷺ کوئی دعا فرماتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اس کے موقع محل اور استعداد و اہلیت کے مطابق اسے قبولیت سے نوازتے ہیں۔ جب رسول اللہ ﷺ اہل ایمان خواتین و حضرات کے استغفار کرتے ہیں تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اہل ایمان میں کوئی گنہگار ہی نہیں پایا جائے۔ اگر حقیقت حال میں واقعی ایسا ہوتا تو کسی اہل ایمان کو دنیا یا آخرت میں کوئی عذاب نہ دیا جاتا۔ بلکہ بعض افراد کی توبہ و استغفار کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کر دیتے ہیں؛ اور بعض لوگوں کی نیکیاں ان کے گناہوں کو مٹا کر رکھ دیتی ہیں۔اور کسی کے بہت سارے گناہ اللہ تعالیٰ دیگر کسی وجہ سے معاف کر دیتے ہیں۔

حاصل بحث یہ ہے کہ آیت میں جس تطہیر کا ذکر کیا گیا ہے اور آپ نے جو دعا فرمائی تھی اس سے بالاتفاق اہل بیت کا معصوم ہونا مراد نہیں۔ جہاں تک اہل سنت کے نقطہ نظر کا تعلق ہے، وہ رسول ﷺ کے لیے عصمت کا اثبات کرتے ہیں۔ شیعہ نبی کے علاوہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ائمہ کو بھی معصوم قرار دیتے ہیں۔ پس شیعہ اور اہل سنت کا اتفاق ہے کہ عصمت نبی کریم ﷺ کے ساتھ خاص ہے[اور شیعہ کے نزدیک]امام بھی معصوم ہوتا ہے۔ بنا بریں نبی کریم ﷺ کی ازواج و بنات اور دیگر عورتیں عصمت کے حکم میں داخل نہ ہوں گی۔

جب یہ بات ہے تو جن چار اکابر کے حق میں تطہیر کی دعا کی گئی ہے وہ اس عصمت کو شامل نہ ہوگی جو نبی اور[شیعہ کے ہاں] امام کیساتھ مخصوص ہے۔تو نبی کریم ﷺ کی دعا سے ان کے لیے یہ عصمت حاصل نہ ہوگی؛ نہ ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے اور نہ ہی کسی دوسرے کے لیے۔اس لیے کہ آپ نے چاروں کے لیے مشترکہ دعا کی ہیں ان میں سے کسی ایک کو خاص نہیں کیا۔

علاوہ ازیں گناہوں سے معصوم ہونے اور تطہیر کی دعا قدریہ کے قاعدہ کے مطابق ممتنع ہے(شیعہ بھی قدریہ یعنی منکرین تقدیر میں داخل ہیں) اس لیے کہ افعال اختیاریہ یعنی واجبات کا بجالانا اور منکرات کا ترک کرنا قدریہ کے نزدیک اللہ کی قدرت میں داخل نہیں ہے۔جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کو پاکیزہ و اطاعت گزار بنا سکتا ہے نہ ہی نافرمان۔نہ ہی گناہوں سے پاک بنا سکتا ہے اور نہ ہی ناپاک۔لہٰذا اس اصل کی بنا پر فعل خیرات اور ترک منکرات کی دعا کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔

قدریہ کے نزدیک اللہ کی عطا کردہ قدرت نیک و بد دونوں قسم کے افعال کی صلاحیت رکھتی ہے۔جس طرح تلوار سے

مسلمان کو بھی قتل کر سکتے ہیں اور کافر کو بھی۔ یا مال کو اطاعت میں بھی خرچ کر سکتے ہیں اور معصیت کے کاموں میں بھی۔ اسی طرح بندہ اللہ کی عطا کردہ قدرت سے اچھے کام بھی انجام دیتا ہے اور برے بھی۔

شیعہ کی پیش کردہ حدیث ان کے خلاف حجت ہے جس سے ان کے بنیادی اصولوں پر وار ہوتی ہے؛ کیوں کہ اس حدیث میں آپ نے اہل بیت کے لیے تطہیر کی دعا فرمائی ہے۔

اگر شیعہ کہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اہل بیت کی مغفرت فرمائے گا اور وہ بروز آخرت ماخوذ نہیں ہوں گے۔ تو اس سے عصمت کے اثبات پر استدلال کرنا بالکل ہی غلط ہوگا۔ تو واضح ہوا کہ اس حدیث میں عصمت کے اثبات پر کوئی دلیل نہیں پائی جاتی۔ اور مطلق طور پر عصمت [یعنی فعل مامور کا بجالانا اور حرام کا ترک کرنا] شیعہ کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی قدرت میں نہیں ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ انسان کو پاکیزہ و اطاعت گزار بنا سکتا ہے نہ ہی نافرمان؛ نہ ہی نبی کو اور نہ ہی کسی دوسرے کو۔

شیعہ کے ہاں جو کوئی اپنی زندگی میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت گزاری کو اختیار کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی توفیق و ہدایت سے اس اسے اختیار نہیں کرتا۔ [شیعہ کے نزدیک گناہوں سے معصوم رہنے کی دعاء بھی ممنوع ہے]۔

اس سے شیعہ مذہب کا عصمت کے مسئلہ میں تناقض واضح ہوتا ہے۔ بفرض محال اگر عصمت ثابت بھی ہو جائے تاہم ہمارے نزدیک یہ امامت کے لیے مشروط نہیں ہے؛ اور نہ ہی ائمہ کے علاوہ کسی دوسرے سے عصمت کی نفی پر کوئی اجماع ہے۔ پس اس صورت میں ہر لحاظ سے ان کی حجت باطل ہو جاتی ہے۔

[حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دعویٰ امامت؟]:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:

''حضرت علی رضی اللہ عنہ امامت کے مدعی تھے اور نجاست کا ازالہ بھی ثابت ہو چکا ہے۔ لہٰذا آپ ہی امام صادق ہوں گے۔''

[جواب]: ہم اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کبھی اس قسم کا دعویٰ کیا ہو۔ بلکہ ہم علم یقینی اور قطعی کے طور پر جانتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے شہادت عثمان رضی اللہ عنہ تک نے اپنی امامت کا کوئی دعویٰ نہیں کیا۔ یہ کہا گیا ہے کہ: بیشک آپ دل سے امامت کے خواہاں تھے، مگر آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ میں امام یا معصوم ہوں۔ نہ یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعد مجھے امام بنایا اور میری اطاعت لوگوں پر واجب ٹھہرائی ہے۔ اور نہ اس قسم کے دیگر الفاظ ارشاد فرمائے۔

بخلاف ازیں ہم اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں کہ جس شخص نے آپ کی نسبت سے اس قسم کے الفاظ نقل کیے ہیں وہ کاذب ہے۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ صحیح معنی میں متقی تھے اور ایسے صریح کذب کا دعویٰ نہیں کر سکتے تھے جس کا کذب ہونا سب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین پر عیاں ہو۔

شیعہ مصنف نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ: ''ابن ابی قحافہ نے یہ لباس اوڑھا (منصب خلافت پر فائز ہوئے) حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ مجھے وہی مرتبہ حاصل ہے جو ایک چکی میں درمیانی تیخ کو حاصل ہوتا ہے۔''

ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں:

پہلی بات: اس قول کی سند کہاں ہے؟ جس میں ثقہ لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ تک اس قول کو ثقات سے نقل کیا ہو۔

ایسا ہرگز اس روایت میں کچھ بھی نہیں پایا جاتا۔

[یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول نہیں ہے]۔ البتہ یہ قول نہج البلاغہ اور اس جیسی بعض دوسری کتابوں میں موجود ہے۔ اہل علم سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ نہج البلاغہ کے اکثر خطبات خود ساختہ اور جھوٹے گھڑ کر حضرت علی رضی اللہ عنہ پر تھوپ دیئے گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ کسی قدیم کتاب میں درج نہیں۔ [1] اور نہ ان کی کوئی سند معروف ہے۔تو پھر ناقل نے کہاں سے نقل کیا ہے؟

یہ خطبات اسی طرح ہیں جیسے کوئی شخص کہے کہ میں علوی یا عباسی ہوں۔ حالانکہ ہمیں علم ہو کہ اس کے اسلاف میں سے کسی نے بھی یہ دعویٰ نہیں کیا۔اور نہ ہی اس کے لیے ایسا کوئی دعوی [اس سے پہلے کیا گیا تھا]۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ دعوی بے بنیاد ہے۔ اس لیے کہ نسب اپنی اصل کے اعتبار سے جانا پہچانا ہوتا ہے اور اسی طرح وہ اپنی فرع سے مل جاتا ہے۔

ایسے ہی منقولات کے لیے ضروری ہے کہ صاحب قول سے لیکر ہم تک اس کی معروف سند ہونی چاہیے۔ اگر کوئی انسان کتاب لکھے ؛ جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر وعمر اور عثمان وعلی رضی اللہ عنہم اجمعین کے بہت سارے خطبات جمع کردے۔ لیکن اس سے پہلے کسی بھی دوسرے فرد نے یہ خطبات کسی معروف سند سے نقل نہ کیے ہوں؛ تو ہم یقینی طور پر اس کے جھوٹا ہونے کو جان لیتے ہیں۔ یہی حال نہج البلاغہ کے خطبات کا ہے۔ ہمیں یقینی طور پر علم حاصل ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس کے برعکس فرمایا تھا۔ اس موقع پر ہمارا مقصد اس کا جھوٹ واضح کرنا نہیں' بلکہ ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ اس روایت کی کوئی صحیح سند پیش کی جائی ۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق پر کسی ایسی چیز کی تصدیق کو واجب نہیں کیا جس کے سچا ہونے کی کوئی دلیل موجود نہ ہو۔

نہج البلاغہ کے خطبات میں بعض باتیں ایسی بھی ہیں جو کہ بالاتفاق ممتنع ہیں۔اور خصوصاً جبکہ '' تکلیف مالا یطاق'' کا قول بھی ممتنع ہو۔ بیشک یہ سب سے بڑی'' تکلیف مالا یطاق'' ہے۔ پھر ہم چوتھی صدی ہجری میں جب ہر طرف جھوٹے لوگ بڑھ گئے تھے؛ اس وقت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دعوائے خلافت کو ان لوگوں کے اقوال کی بنا پر کیوں کر تسلیم کر سکتے ہیں جو متہم بالکذب تھے؟ ۔[چوتھی صدی ہجری میں] ان شیعہ لوگوں کی حکومت عمل میں آ چکی تھی؛ جہاں پر یہ لوگ جس قسم کا بھی جھوٹ بولتے اسے پذیرائی حاصل ہوتی۔ ان کے ہاں اقوال کی سچائی کا مطالبہ کرنے والا کوئی بھی نہیں تھا۔ اس مسئلہ میں ہمارا یہ بنیادی جواب ہے۔ یہ ہمارے اور اللہ کے مابین ہے۔

ہم یہ بھی کہتے ہیں: فرض کیجیے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایسا کہا تھا؛ تو تم نے یوں کیوں کہا کہ:'' حضرت علی رضی اللہ عنہ نے امام منصوص ومعصوم ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ ممکن ہے کہ آپ یہ بتانا چاہتے ہوں کہ وہ دوسروں کی نسبت خلافت کے لیے موزوں تر ہیں۔ اس لیے کہ آپ کا اعتقاد تھا کہ وہ دوسروں سے افضل ہیں؛ اور خلافت کے زیادہ حق دار ہیں۔ لہٰذا اس کا یہ مطلب نہ ہوگا

---

[1] اس کی حد یہ ہے کہ کتب ادب جن میں سند مذکور نہیں ہوتی ان میں بھی یہ الفاظ مذکور نہیں ہیں۔ مثلاً جاحظ کی ''البیان والتبیین'' میں سیدنا علی کا یہ خطبہ صرف چند سطروں تک محدود ہے۔ اگر اس خطبہ کا تقابل نہج البلاغہ میں ذکر کردہ خطبہ کے ساتھ کیا جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ نہج البلاغہ میں اس خطبہ کو بہت بڑھا چڑھا کر بیان کیا گیا ہے اور وہ اضافہ کیا گیا ہے جو جاحظ کے زمانہ تک موجود نہ تھا۔ مشہور شیعہ عالم رضی اور ان کے بھائی مرتضی نے نہج البلاغہ میں جس جعل سازی سے کام لیا ہے وہ یہ ہے کہ ایک ثابت شدہ چیز پر بے بنیاد باتوں کا اضافہ کرتے ہیں۔''لقد تقمصا'' کا جملہ بھی اسی میں شامل ہے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ نہج البلاغہ میں ذکر کردہ اقوال سیدنا علی کے معروف ارشادات کی نقیض ہوتے ہیں اور ان کی کوئی سند ہوتی ہے نہ دلیل۔ روافض کی ستم ظریفی ملاحظہ فرمائیے کہ اس طرح انھوں نے سیدنا علی کے اقوال میں تناقض ثابت کر دیا جس سے ان کا دامن پاک تھا۔

کہ آپ نے دانستہ جھوٹ کا ارتکاب کیا، بلکہ یہ بات آپ نے اپنے اجتہاد کی بنا پر کہی ہوگی۔اور مجتہد کے رائے مبنی بر صواب بھی ہوسکتی ہےاور خطاء بھی ہوسکتی ہے۔

اس بات پر اتفاق ہے کہ ناپاکی کی نفی کرنے سے یہ واجب نہیں ہوتا کہ کوئی معصوم عن الخطاء بھی ہو۔اس کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مراد یہ نہیں تھی کہ وہ اہل بیت سے خطاء کو بھی ختم کردے۔کیونکہ شیعہ کے نزدیک اللہ تعالیٰ ایسا کرنے پر قادر نہیں ہے۔ جب کہ خطاء قابل مغفرت ہوتی ہے؛ اوراس کا وجود کوئی نقصان نہیں دیتا۔

مزید برآں کہ خطاء میں عمومِ رجس (ناپاکی) شامل نہیں۔

نیز یہ کہ رسول اللہ ﷺ کے علاوہ کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو خطاء سے معصوم ہو۔شیعہ اپنے ائمہ کو بھی خطاء سے معصوم مانتے ہیں۔ جب کہ ناپاکی کے دور کیے جانے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اور دوسرے اہل بیت بھی شریک ہیں۔

ہم یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ اللہ تعالیٰ سے بہت زیادہ ڈرنے والے تھے وہ اس بات سے بری ہیں کہ کوئی جھوٹ بولیں۔جیسا کہ حضرت ابوبکر وعمر اور عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین اللہ کے متقی والے تھے اور اس بات سے بری تھے کہ جان بوجھ کر کوئی جھوٹ بولیں۔

لیکن اس آیت سے استدلال کرنے والے رافضی سے پوچھا جائے گا کہ تم نے جھوٹ کے پلید ہونے پر کوئی دلیل ذکر نہیں کی۔ جب اس پر کوئی دلیل نہیں ہے تو پھر اس سے کسی جھوٹ کو ختم کرنا لازم نہیں آتا۔اگر یہ بات مان لی جائے کہ ناپاکی کو ختم کردیا گیا ہے؛ تو یہ کہنے والا کا شماران لوگوں میں ہوتا جو قرآن سے دلیل پیش کرتے ہیں؛ قرآن میں اس ناپاکی کے دور ہوجانے پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔اور نہ ہی اس بات کی کوئی دلیل ہے کہ جھوٹ اور خطاء بھی ناپاکی میں شمار ہوتے ہیں۔ اور نہ ہی اس بات کی کوئی دلیل ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کبھی کچھ ایسا فرمایا ہو۔ بہرکیف اگر ان میں سے کوئی بات ثابت ہو بھی جائے تو وہ قرآن سے ماخوذ نہ ہوگی؛ اس کی بنیاد ایسے مقدمات پر ہوگی جو قرآن سے نہیں ہوں گے۔ پھر شیعہ مصنف کے قرآنی دلائل کہاں ہیں جن کا وہ ڈھنڈورا پیٹتا ہے؟ ایسے جھوٹے دعوے تو صرف وہی انسان کرسکتا ہے جو اہل رسوائی و ندامت میں سے ہو۔

امامت علی رضی اللہ عنہ کی چھٹی دلیل:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے کہ:''امامت علی رضی اللہ عنہ کی چھٹی دلیل قرآن کریم کی یہ آیت ہے:

﴿فِیْ بُیُوتٍ اَذِنَ اللّٰہُ اَنْ تُرْفَعَ وَیُذْکَرَ فِیْھَا اسْمُہٗ یُسَبِّحُ لَہٗ فِیْھَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ☆ إلی قوله تعالیٰ.... یَخَافُوْنَ یَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِیْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ﴾ (النور: ۳۶۔۳۷)

''ان گھروں میں جن کے بلند کرنے اور جن میں اپنے نام کی یاد کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے؛ وہاں صبح وشام اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرو۔......اس دن سے ڈرتے ہیں جس دن بہت سے دل اور بہت سی آنکھیں الٹ پلٹ ہوجائیں گی۔''

ثعلبی نے حضرت انس و بریدہ رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ایک شخص نے کھڑے ہوکر کہا اے اللہ کے رسول! ﴿فی بیوت﴾ سے کون سے گھر مراد ہیں؟ آپ نے فرمایا:''انبیاء کے گھر'' حضرت

ابو بکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! کیا یہ گھر یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ و فاطمہ رضی اللہ عنہا کا گھر بھی ان میں شامل ہے؟ آپ نے فرمایا: ''یہ ان میں سے افضل ترین گھروں میں سے ہے۔اس میں وہ اوصاف بیان کیے گئے ہیں جو افضلیت پر دلالت کرتے ہیں؛ تو اس سے لازم آتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی امام ہوں ورنہ فاضل پر مفضول کی تقدیم لازم آئے گی۔'' [شیعہ مصنف کا بیان ختم ہوا]۔

جواب: اس کا جواب کئی وجوہ سے دیا جاسکتا ہے:

پہلی وجہ: ہم شیعہ مصنف سے پوچھتے ہیں: اس دعوی کی صحت پر اس کی دلیل کیا ہے؟ [ہمارا دعویٰ ہے کہ وہ ہرگز اس کی دلیل پیش نہیں کرسکتا]۔ کسی روایت کو ثعلبی کی طرف منسوب کردینا حجت نہیں ہوسکتا۔اس پر شیعہ اور اہل سنت کا اتفاق ہے۔جمہور میں سے کوئی ایک اگر کسی روایت کو نقل کرلیتا ہے تو یہ نقل جمہور کے ہاں حجت نہیں بن جاتی۔ بلکہ جمہور کا تو یہ اتفاق ہے کہ ثعلبی اور اس کے امثال کی روایات حجت نہیں ہوسکتی۔نہ ہی حضرت ابوبکر و عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین کے فضائل میں اور نہ ہی شرعی احکام میں۔اس کی صرف یہ صورت ہوسکتی ہے کہ کسی ثابت شدہ سند سے اس روایت کی صحت ثابت ہوجائے۔

پس کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ ہم آپ کے خلاف ایسی روایت سے دلیل پیش کرتے ہیں جو جمہور میں سے کسی ایک نے نقل کی ہے۔ یہ قول تو ایسے ہی ہے جیسے کوئی کہے: میں تم پر تمہارے خلاف جمہور کی گواہی کی روشنی میں فیصلہ دیتا ہوں۔تو کیا علماء جمہور نے یہ کہا ہے کہ: ان میں سے جو کوئی بھی؛ جیسی بھی گواہی دے گا وہ عدل و انصاف پر مبنی ہوگی۔ یا کسی ایک نے یہ کہا ہے کہ: جمہور میں سے جو کوئی بھی؛ کوئی بھی روایت نقل کرے گا وہ ہر حال میں صحیح ہی ہوگی۔

پھر جمہور علماء کرام رحمہم اللہ کا اتفاق ہے کہ ثعلبی اور اس کے امثال صحیح و ضعیف ہر قسم کی روایات نقل کرتے ہیں۔اور جمہور کا یہ بھی اتفاق ہے کہ: صرف ثعلبی کے نقل کرنے کی وجہ سے اتباع واجب نہیں ہوجاتی۔اسی لیے کہا جاتا ہے کہ ثعلبی تو ''حاطب لیل'' ہے؛ جو بھی روایت پاتا ہے اسے نقل کرلیتا ہے؛ خواہ وہ روایت صحیح ہو یا ضعیف۔ثعلبی کی تفسیر میں اگرچہ اکثر احادیث صحیح ہیں لیکن باتفاق اہل علم اس میں ایسی روایات بھی موجود ہیں جو کہ جھوٹ اور موضوع ہیں۔

دوسری وجہ: محدثین کرام رحمہم اللہ کے ہاں یہ حدیث بلاشبہ جھوٹ ہے۔یہی وجہ ہے کہ محدثین میں سے کسی ایک نے بھی اپنی کسی معتمد کتاب میں اس روایت کو جگہ نہیں دی۔ یہ روایت نہ ہی صحاح ستہ میں ہے؛ نہ ہی سنن میں؛ نہ ہی مسانید میں۔ حالانکہ ان میں سے بعض کتابوں میں ضعیف احادیث پائی جاتی ہیں۔ بلکہ بعض موضوع روایات کا بھی پتہ چلتا ہے۔لیکن موضوع روایات بہت ہی کم ہیں؛ جب کہ مذکورہ بالا روایت ایسا واضح جھوٹ تھا کہ کسی نے اس کا ذکر تک نہیں کیا۔

تیسری وجہ: مزید براں یہ آیت بالاتفاق مساجد سے متعلق ہے۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان سے صاف ظاہر ہے:

﴿فِیْ بُیُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَیُذْكَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ یُسَبِّحُ لَهٗ فِیْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ﴾

حضرت علی رضی اللہ عنہ یا کسی دوسرے کے گھر کی یہ صفات نہیں ہوسکتیں۔

چوتھی وجہ: ہم شیعہ سے کہتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا گھر باتفاق مسلمین حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گھر سے افضل تھا؛ مگر وہ اس خطاب میں شامل نہیں۔اس لیے کہ آپ کے گھر میں کوئی مرد نہیں تھا۔ بلکہ آپ کے گھر میں خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی کوئی زوجہ

محترمہ موجود ہوا کرتی تھی۔ جب اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کے گھر کا ذکر نا چاہا تو صاف الفاظ میں کیا؛ ارشاد فرمایا:

﴿لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتَ النَّبِیِّ﴾ [الأحزاب ۵۳]

''تم نبی کے گھروں میں نہ جایا کرو۔''

اور ارشاد فرمایا: ﴿وَاذْكُرْنَ مَا یُتْلٰی فِیْ بُیُوْتِكُنَّ﴾ [الأحزاب ۳۴]

''اور تمہارے گھروں میں اللہ کی جو آیتیں اور رسول کی جو احادیث پڑھی جاتی ہیں ان کا ذکر کرتی رہو۔''

پانچویں وجہ: یہ کہنا کہ ''اس سے مراد انبیاء کے گھر ہیں'' صاف جھوٹ ہے۔ اگر واقعی ایسا ہوتا تو اہل ایمان کا اس میں کوئی نصیب نہ ہوتا۔ جب کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿یُسَبِّحُ لَهٗ فِیْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ٭ رِجَالٌ لَّا تُلْهِیْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَیْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ﴾ [النور ۳۶]

''وہاں صبح و شام اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرو۔ ایسے لوگ جنہیں تجارت اور خریداری اللہ کے ذکر سے اور نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے سے غافل نہیں کرتی۔''

ان تمام لوگوں کو شامل ہے جو ان صفات سے موصوف ہوں۔

چھٹی وجہ: اس آیت کریمہ میں ﴿فِیْ بُیُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ﴾ لفظ بیوت کو نکرہ موصوفہ لایا گیا ہے؛ اس میں کوئی تعین نہیں ہے۔ جب کہ اس سے آگے فرمایا ہے: ﴿اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَیُذْكَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ﴾ اگر اس خطاب سے مراد وہ ذکر و اذکار اور نمازیں ہوں جو مساجد کے ساتھ خاص نہیں بلکہ گھروں میں ادا کیے جاتے ہیں؛ تو اس میں اہل ایمان کے دیگر بہت سارے ایسے گھر بھی داخل ہوتے ہیں جو ان صفات سے موصوف ہیں؛ تو پھر یہ آیت انبیاء کرام علیہم السلام کے گھروں کے ساتھ خاص نہ ہوئی۔

اور اگر اس سے مراد پانچ نمازیں اور ان کے ساتھ ذکر و اذکار ہیں؛ تو پھر یہ آیت مساجد کے ساتھ خاص ہے۔ جب کہ انبیاء کرام علیہم السلام کے گھروں میں مساجد کی خصوصیت نہیں پائی جاتی۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ انہیں انبیاء کرام علیہم السلام کے مسکن ہونے کا اعزاز و فضیلت حاصل ہیں۔

ساتویں وجہ: شیعہ سے یہ بھی کہا جائے گا کہ اگر انبیاء کرام علیہم السلام کے گھروں سے مراد وہ گھر ہیں جن میں نبی کریم ﷺ نے قیام کیا تھا؛ تو پھر مدینہ طیبہ میں ازواج مطہرات کے گھروں کے علاوہ کسی بھی نبی کا کوئی گھر نہیں تھا۔ تو ان گھروں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا گھر داخل نہ ہوا۔ اور اگر اس سے مراد وہ گھر ہوں جن میں انبیاء کرام علیہم السلام میں سے کوئی ایک داخل ہوا ہے تو پھر نبی کریم ﷺ بہت سارے صحابہ کرام کے گھروں میں داخل ہوئے ہیں۔ جو بھی بات مان لی جائے؛ کسی بھی صورت میں حضرت ابو بکر و عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین کے گھروں کو چھوڑ کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گھر کی کوئی فضیلت و خصوصیت ثابت نہیں ہوتی۔ جب آپ کی کوئی خصوصیت ثابت نہیں ہوتی تو پھر مردوں کے مابین بہت سارے امور مشترک ہوتے ہیں جن میں حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی برابر کے شریک ہیں۔

آٹھویں وجہ: اس شیعہ سے یہ بھی کہا جائے گا کہ: وہ مرد جن کی صفت اللہ تعالیٰ نے یوں بیان کی ہے:

﴿رِجَالٌ لَا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ﴾ [النور ۳٦]

''ایسے لوگ جنہیں تجارت اور خرید وفروخت اللہ کی یاد اور نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے سے غافل نہیں کرتی۔''

اس آیت سے کہیں بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ مرد دوسرے لوگوں سے افضل ہیں۔اور ان آیات میں اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ کسی بھلائی کا وعدہ بھی نہیں کیا؛ بلکہ ان کے اس فعل پر ان کی تعریف کی گئی ہے۔لیکن ایسا ہرگز نہیں ہے کہ جس کسی کی بھی کوئی تعریف کی جائے یا اسے جنت کی خوشخبری سنائی جائے تو وہ دوسروں سے افضل ہو جائے گا۔اس سے یہ بھی لازم نہیں آتا کہ وہ انسان انبیاء کرام علیہم السلام سے بھی افضل ہو۔

نویں وجہ: تصور کیجیے اس آیت سے ان لوگوں پر فضیلت ثابت ہوتی ہے جو ان صفات سے موصوف نہیں ہیں؛ تو پھر آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ یہ صفت صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ خاص ہے؟ بلکہ ہر وہ انسان جسے تجارت اور خرید وفروخت اللہ کے ذکر سے اور نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے سے غافل نہیں کرتی؛ اور وہ آخرت کے دن کا بھی خوف رکھتا ہے؛ تو وہ اس صفت سے موصوف ہے۔آپ پھر یہ کیونکر کہتے ہیں کہ: یہ صفت صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ میں پائی جاتی ہے؟ جب کہ آیت کا لفظ دلالت کرتا ہے کہ وہ بہت سارے لوگ ہیں؛ صرف کوئی ایک مرد نہیں ہے۔یہ اس بات کی دلیل ہے کہ آیت کریمہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ خاص نہیں ہے۔بلکہ آپ اور دوسرے لوگ اس صفت میں مشترک ہیں۔پس اس بنیاد پر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آپ اپنے مشارکین سے افضل ہوں۔

دسویں وجہ: اگر تسلیم کر لیا جائے کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ اس صفت میں باقی لوگوں سے افضل ہیں۔تو پھر بھی اس سے امامت کا وجوب کہاں سے لازم آ گیا؟۔

جب کہ مفضول کو فاضل پر مقدم کرنے کے امتناع کے مسئلہ کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو بیشک ایسا ان مجموعی صفات میں ہوتا ہے جو کہ امامت کے لیے مناسب ہوتی ہیں۔ورنہ ایسا نہیں ہے کہ ہر وہ انسان جسے خیر کی کسی ایک خصلت میں دوسروں پر فضیلت حاصل ہو تو وہ امامت کا مستحق ہو جائے گا۔اگر ایسا جائز ہو تو پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین میں ایسے لوگ بھی تھے جنہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نسبت بہت زیادہ کفار کو موت کے گھاٹ اتارا۔اور ان میں ایسے بھی ہیں جنہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نسبت سے بہت زیادہ مال اللہ کی راہ میں خرچ کیا۔اور ایسے بھی ہیں جنہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نسبت سے اللہ کی راہ میں بہت زیادہ تکلیف دی گئی۔ایسے بھی تھے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نسبت سے عمر میں زیادہ بڑے بھی تھے۔ایسے بھی تھے جن کے پاس وہ علم تھا جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس نہیں تھا۔

خلاصہ کلام! انبیاء کرام علیہم السلام میں سے کسی بھی نبی کے لیے بھی یہ ممکن نہیں ہے کہ کسی دوسرے نبی کی صفات ہر لحاظ سے اس میں موجود ہوں۔اور نہ ہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین میں سے کسی ایک میں دوسری صحابی کی کوئی صفت ہر لحاظ سے پوری طرح موجود ہو سکتی ہے۔بلکہ مفضول میں بھی کوئی نہ کوئی ایسی یگانہ چیز ہوتی ہے جس میں وہ فاضل سے آگے ہوتا ہے؛ لیکن بات یہ ہے کہ مجموعی طور پر ساری صفات کو جمع کر کے انہیں معتبر سمجھا جاتا ہے۔

امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ساتویں دلیل:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:''امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ساتویں دلیل یہ آیت ہے:

﴿لَا اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى﴾ [الشوری ۲۳]

''میں اس پر تم سے کوئی بدلہ نہیں چاہتا مگر محبت رشتہ داری کی ۔''

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اپنی مسند میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی:

﴿لَا اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى﴾ [الشوری ۲۳]

''میں اس پر تم سے کوئی بدلہ نہیں چاہتا مگر محبت رشتہ داری کی ۔''

تو صحابہ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ ﷺ کون سے قریبی رشتہ دار ہیں جن سے محبت رکھنا ہمارے لیے ضروری ہے؟ آپ نے فرمایا:''علی و فاطمہ رضی اللہ عنہما اور ان کے دونوں بیٹے ۔''

تفسیر ثعلبی اور بخاری و مسلم میں بھی اسی طرح مروی ہے ۔ چونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سوا دیگر تینوں خلفاء وصحابہ سے محبت رکھنا واجب نہیں ۔ لہٰذا حضرت علی رضی اللہ عنہ ان سے افضل ٹھہرے اور وہی امام ہوں گے ۔ بنا بریں ان کی مخالفت محبت کے منافی ہے اور محبت کا مطلب یہ ہے کہ ان کی اطاعت کی جائے ، لہٰذا آپ واجب الاطاعت ہوئے ۔امامت سے یہی مراد ہوتی ہے ۔'' [شیعہ کا کلام ختم ہوا]۔

[جواب]: اس کا جواب کئی طرح سے دیا جاسکتا ہے:

پہلی وجہ: ہم اس حدیث کی صحت ثابت کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں ۔ شیعہ کا یہ کہنا کہ: امام احمد نے اپنی مسند میں روایت کیا ہے'' ایک کھلا ہوا جھوٹ ہے ۔ مسند احمد کے کئی نسخے موجود ہیں ۔ان میں سے کسی ایک میں بھی یہ روایت موجود نہیں ہے ۔ اس سے بھی بڑا جھوٹ یہ ہے کہ شیعہ کہتا ہے: یہ حدیث بخاری و مسلم میں موجود ہے ۔ حالانکہ ان دونوں کتابوں میں کوئی ایسی روایت موجود نہیں ۔ بلکہ مسند اور صحیحین میں ایسی احادیث موجود ہیں ، جو اس کی نقیض ہیں ۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ رافضی مصنف اور اس جیسے دوسرے ان کے علماء اہل علم کی کتابوں سے جاہل ہیں ۔ نہ ہی ان کا مطالعہ کرتے ہیں اور نہ ہی ان کو یہ علم ہوتا ہے کہ ان کتابوں میں کیا ہے ۔ میں نے ان میں سے ایک کو دیکھا؛ اس نے احادیث کی متعدد کتابوں سے ایک کتاب جمع کی تھی ۔ اس کی روایات کو کبھی بخاری کی طرف منسوب کرتا اور کبھی مسلم کی طرف ؛ کبھی مسند احمد کی طرف اور کبھی مغازلی اور موفق کی طرف ؛ اور کبھی خطیب خوارزمی اور ثعلبی اور ان جیسے لوگوں کی طرف ۔ اس نے اپنی اس کتاب کا نام رکھا تھا:''الطرايف في الرد علی الطوائف ۔'' اور ایک دوسرے ابن بطریق نامی شیعہ مصنف نے ایک ایسی ہی کتاب تصنیف کی اور اس کا نام رکھا:''العمدۃ ۔''

اپنی روایات میں کثرت کے ساتھ جھوٹ بولنے کے باوجود یہ لوگ پھر بھی ابوجعفر محمد بن علی اور اس کے امثال سے کسی قدر بہتر ہیں ۔ ابوجعفر نے بھی ان لوگوں کے لیے تصانیف لکھی ہیں ؛ اور ان میں جھوٹ کی اس قدر بھرمار ہے کہ یہ جھوٹ صرف انتہائی جاہل ترین انسان پر ہی مخفی رہ سکتا ہے ۔ اور میں نے دیکھا ہے کہ یہ لوگ بہت ساری روایات کو بخاری و مسلم اور

مسند احمد کی طرف منسوب کرتے ہیں ؛ حالانکہ ان کتابوں میں کوئی ایسی روایت موجود نہیں ہوتی ۔ مسند احمد کی طرف ایسی روایات منسوب کرتے ہیں جن کی اصل میں کوئی حقیقت ہی نہیں ۔

پھران لوگوں کی جہالت کی انتہاء یہ ہے کہ انہوں نے امام احمد رحمہ اللہ کی مسند کا نام سن لیا ہے ۔ان کا خیال ہے کہ مسند اُحمد میں جو کچھ ہے وہ سب امام احمد کا روایت کردہ ہے ۔ چنانچہ امام احمد کی مسند میں جو قطیعی کی زیادہ کردہ روایات ہیں؛ وہ ان کو بھی امام احمد کی روایات شمار کرنے لگ گئے ۔ اور بسا اوقات قطیعی کی روایات پر بھی زیادہ کردیتے ہیں ؛ اس لیے کہ یہ لوگ جھوٹ سے ہرگز نہیں بچ سکتے ۔ یہی وجہ ہے کہ ''الطرائف'' اور ''العمدۃ'' کے مصنفین کبھی امام احمد کی طرف ایسی روایات منسوب کرتے ہیں ؛ جو تو امام احمد نے نہ ہی کسی کتاب میں روایت کی ہوتی ہیں ؛ اور نہ ہی آپ نے کبھی وہ روایات سنی ہوں گی ۔اس میں زیادہ سے زیادہ یہ ہوسکتا ہے کہ : وہ روایات قطیعی نے زیادہ کی ہوں ۔ اور قطیعی نے جو من گھڑت اور جھوٹی روایات اس میں داخل کی ہیں ؛ وہ کسی بھی عالم پر مخفی نہیں ہیں ۔ [1]

اس رافضی کذاب کی نقول بھی ''العمدۃ'' اور ''الطرائف'' کے مصنفین کی جنس سے تعلق رکھتی ہیں ۔ یہ معلوم نہیں کہ اس مصنف نے انہی کتابوں سے یہ سب کچھ نقل کیا ہے ؛ یا پھر ان کے ناقلین سے نقل کیا ہے ۔ وگرنہ جس انسان کو علم کی ادنی سی بھی معرفت ہو ؛ اسے ایسی روایات صحیحین یا مسند احمد کی طرف منسوب کرنے سے حیاء آتی ہے ۔ صحیحین اور مسند کے نسخوں سے زمین بھری ہوئی ہے ؛ ان میں کہیں بھی اس قسم کی کوئی روایت نہیں پائی جاتی ۔ بلکہ حقیقت میں کسی بھی قابل اعتماد اہل علم نے اسے روایت نہیں کیا ۔ اس قسم کی روایات وہی نقل کرتے ہیں جو رات کے اندھیرے میں لکڑیاں چن رہے ہوتے ہیں ۔ جیسے ثعلبی اور اس جیسے دوسرے مصنفین ؛ جو کہ ہر موٹی اور چھوٹی چیز کو جمع کر لیتے ہیں مگر صحیح اور خراب کی تمیز سے عاری ہوتے ہیں ۔

دوسری وجہ : یہ حدیث باتفاق محدثین واہل علم جھوٹ ہے ۔ حدیث کی کسی بھی مستند کتاب میں اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا ۔ اس حدیث کی حقیقت جاننے کے لیے ان ہی سے پوچھنا چاہیے کہ کہاں سے گھڑ لائے ہیں ؟

تیسری وجہ : اس پر مزید یہ کہ مذکورہ صدر آیت سورۂ شوریٰ میں شامل ہے، جو بالاتفاق مکی سورۃ ہے ۔ بلکہ تمام وہ سورتیں جو ''حٰـــم'' سے شروع ہوتی ہیں ؛ وہ مکہ میں نازل ہوئی ہیں ۔ یہ بھی معلوم شدہ بات ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نکاح سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ مدینہ میں ہوا تھا ۔ اسی طرح حضرت حسن ۳ھ میں اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما ۴ھ میں پیدا ہوئے تھے ۔ اس طرح یہ سورت حسن و حسین رضی اللہ عنہما کے وجود سے بھی کئی سال پہلے نازل ہوئی تھی ۔ تو پھر اب سوال یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک مکی آیت کی تفسیر میں ان لوگوں کی محبت کو کیوں کر واجب قرار دے سکتے تھے ؛ جو کہ ابھی تک نہ ہی پیدا ہوئے ' اور نہ ہی ان کو کوئی پہچانتا تھا ۔

---

[1] امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے خلفاء اربعہ کے فضائل و مناقب میں ایک کتاب تصنیف کی تھی جس میں صحیح و سقیم ہر قسم کی روایات موجود ہیں ۔ بعد ازاں امام احمد کے بیٹے عبداللہ اور القطیعی نامی عالم نے بھی اس میں بہت کچھ اضافہ کیا تھا جس میں جھوٹی اور ضعیف روایات شامل کرلیں ۔ جہلاء نے سمجھا کہ یہ سب امام احمد کی مرویات ہیں حالانکہ یہ بدترین غلطی ہے ۔ عبداللہ کی زیادات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ انھوں نے اپنے والد حضرت امام احمد رحمہ اللہ سے روایت نہیں کیں ۔ القطیعی کی زیادات بھی عبداللہ بن احمد کی بجائے دیگر راویوں سے منقول ہیں ۔ [الدراوی ؛ کشمیری]

چوتھی وجہ: صحیح بخاری میں حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت کے بارے میں پوچھا گیا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ قُلْ لَّا اَسْاَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى﴾ [الشوری ۲۳]

''کہہ دیجئے! کہ میں اس پر تم سے کوئی بدلہ نہیں چاہتا مگر محبت رشتہ داری کی۔''

تو میں نے کہا: اس سے مراد یہ ہے کہ محمد ﷺ کو ان سے قرابت کا تعلق رکھنے والوں اذیت نہ دو۔'' اس پر حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرمانے لگے: ''تم نے بہت جلدی کی؛ قریش کی کوئی بھی شاخ ایسی نہیں ہے جس کیساتھ رسول اللہ ﷺ کا تعلقِ قرابت داری نہ ہو۔ یہ سن کر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: '' آپ نے جلد بازی سے کام لیا، قریش کا کوئی چھوٹا بڑا قبیلہ بھی ایسا نہ تھا جس کے ساتھ نبی کریم ﷺ کے قرابت دارانہ روابط نہ ہوں۔ اس لیے فرمایا ﴿لَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا﴾ یعنی اس قرابت داری کی بنا پر جو میں آپ سے رکھتا ہوں میں چاہتا ہوں تم مجھ سے محبت کا سلوک روا رکھو۔''[1]

آپ نے مفسر قرآن حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا بیان ملاحظہ کیا جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد سب اہل بیت میں بہت بڑے عالم تھے۔ آپ فرماتے ہیں: اس سے مراد یہ نہیں کہ میں اپنے قریبی رشتہ داروں کی محبت کا سوال کرتا ہوں۔ بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ: اے اہل عرب! اے قریش کی جماعت! میں آپ سے یہ سوال کرتا ہوں کہ جو میرے اور آپ کے درمیان تعلق ہے: اس صلہ رحمی کا خیال کیجیے۔ اس پر کسی قسم کی سرکشی اور ظلم نہ کرو؛ اور مجھے اللہ کے دین کی دعوت دینے دو۔

پانچویں وجہ: اللہ تعالیٰ یوں فرماتے ہیں:

﴿ قُلْ لَّا اَسْاَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى﴾ [الشوری ۲۳]

''کہہ دیجئے! کہ میں اس پر تم سے کوئی بدلہ نہیں چاہتا مگر محبت رشتہ داری کی۔''

یہ امر قابل غور ہے کہ آیت کے الفاظ ہیں ﴿ اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى﴾ یوں نہیں فرمایا: ﴿اِلَّا الْمَوَدَّةَ لِلْقُرْبٰى﴾ اور یوں بھی نہیں فرمایا: ﴿اِلَّا الْمَوَدَّةَ لِذَوِي الْقُرْبٰى﴾ اور اگر وہ مطلب مراد ہوتا جو شیعہ کہتے ہیں تو آیت کے الفاظ اس طرح ہوتے ﴿اِلَّا الْمَوَدَّةَ لِذَوِي الْقُرْبٰى﴾ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ مندرجہ ذیل آیات ملاحظہ فرمائیے:

۱....﴿وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَ لِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى ﴾ (الانفال ۴۱)

''جان لو کہ تم جس قسم کی جو کچھ غنیمت حاصل کرو اس میں سے پانچواں حصہ اللہ کا ہے اور رسول کا اور اہل قرابت کا۔''

۲....﴿مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى ﴾ (الحشر:۷)

''بستیوں والوں کا جو (مال) اللہ تعالیٰ تمہارے لڑے بھڑے بغیر اپنے رسول کے ہاتھ لگائے وہ اللہ کا ہے اور رسول کا اور قرابت والوں کا۔''

۳.... ﴿فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَ الْمِسْكِيْنَ وَ ابْنَ السَّبِيْلِ﴾ (الروم:۳۸)

''قرابت داروں کو ان کا حق ادا کیجیے؛ اور مساکین کو اور مسافروں کو بھی۔''

---

[1] صحیح بخاری، کتاب التفسیر، سورۃ الشوری (حدیث:۴۸۱۸، ۳۴۹۷)۔

۴.... ﴿وَ اٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِی الْقُرْبٰى﴾ (البقرۃ:۱۷۷)

''اور اللہ کی محبت میں مال دیجیے اپنے قرابت داروں کو۔''

اس طرح کی آیات دیگر بھی کئی مقامات پر آئی ہیں۔

قرآن کریم میں جہاں جہاں اقارب کے حق میں وصیت کی گئی ہے اسی قسم کے الفاظ آئے ہیں۔[وہاں پر ان کے حق میں وصیت ہے تو] اس کے لیے ﴿ذوالقربیٰ﴾ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔[یہاں پر بھی] اگر اقارب مراد ہوتے تو الفاظ یوں ہوتے :﴿اَلْمَوَدَّةَ لِذَوِی الْقُرْبٰى﴾ یہاں پر ﴿في القربیٰ﴾ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔تو معلوم ہوا کہ یہاں اہل قرابت کی محبت کا سوال نہیں' بلکہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ قرابت کی محبت کی رعایت کا کہا گیا ہے۔

چھٹی وجہ: اگر یہاں پر اقارب مراد ہوتے تو الفاظ یوں ہوتے:﴿اَلْمَوَدَّةَ لِذَوِی الْقُرْبٰى﴾ ﴿في القربیٰ﴾ کے الفاظ نہ ہوتے۔اس لیے کہ عربی محاورہ میں یوں نہیں کہتے:﴿اَسْئَلُكَ الْمَوَدَّةَ فِی فُلَانٍ﴾ بلکہ ''لفلان'' بولتے ہیں۔

ساتویں وجہ: ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ رسول تبلیغ شریعت کی اجرت ہرگز طلب نہیں کرتا، بلکہ وہ صرف اللہ سے اجرت کا طلب گار ہوتا ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿قُلْ مَا اَسْاَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ﴾ (الفرقان:۵۷)

''کہہ دیجیے کہ میں تم سے اس پر کوئی بدلہ طلب نہیں کرتا اور نہ میں تکلف کرنے والوں میں سے ہوں۔''

نیز فرمایا:﴿اَمْ تَسْئَلُهُمْ اَجْرًا فَهُمْ مِنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ﴾ (الطور:۴۰)

''کیا آپ اجرت طلب کرتے ہیں کہ وہ تاوان کے بوجھ تلے دبے جا رہے ہیں۔''

ارشاد ہوتا ہے:﴿قُلْ مَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ﴾ (سباء ۴۷)

''فرما دیجیے: جو بدلہ تم سے مانگوں وہ تمہارے لئے ہے میرا بدلہ تو اللہ ہی کے ذمے ہے۔''

لیکن یہاں پر استثناء منقطع ہے۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿قُلْ مَا اَسْاَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا﴾ [الفرقان ۵۷]

''کہہ دیجیے کہ میں قرآن کے پہنچانے پر تم سے کوئی بدلہ نہیں چاہتا مگر جو شخص اپنے رب کی طرف راہ پکڑنا چاہے۔''

اس میں شبہ نہیں کہ اہل بیت کی محبت واجب ہے، مگر اس کا وجوب اس آیت سے ثابت نہیں ہوتا۔ان کی محبت کو رسول کی اجرت بھی نہیں کہہ سکتے، بلکہ یہ ان امور میں سے ہے جن کا حکم اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا ہے۔وہ دیگر شرعی مامورات کی طرح عبادات کی حیثیت رکھتی ہے۔

حدیث صحیح میں آیا ہے کہ سرور کائنات ﷺ نے غدیر خم پر خطبہ دیتے ہوئے فرمایا:

''میں تمھیں اپنے اہل بیت کے بارے میں اللہ کو یاد دلاتا ہوں۔میں تمھیں اپنے اہل بیت کے بارے میں اللہ کو یاد دلاتا ہوں۔''[1]

---

[1] صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل علی بن ابی طالب، رضی اللہ عنہ (حدیث:۲۴۰۸)۔

ابوداؤد و ترمذی و نسائی و ابن ماجہ میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''مجھے اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! لوگ اس وقت تک جنت میں نہیں جا سکیں گے جب تک اللہ تعالیٰ اور میری قرابت کی وجہ سے اہل بیت کو چاہنے نہ لگیں۔''❶

لیکن جس کسی نے اہل بیت کی محبت کو رسول اللہ ﷺ کی اجرت قرار دیا ہے؛ یقیناً اس نے بہت بڑی غلطی کی ہے۔ اگر اہل بیت سے ہماری محبت آنحضرت ﷺ کی اجرت رسالت میں داخل ہوتی تو ہمیں اس کا اجر و ثواب نہ دیا جاتا۔ اس لیے کہ ہم نے آپ کی وہ اجرت ادا کی تھی جس کا آپ رسالت کی بنا پر استحقاق رکھتے تھے۔ کیا کوئی مسلمان یہ بات کہنے کیلئے تیار ہے؟ یہ بات ہمیں تسلیم ہے کہ دیگر دلائل کی بنا پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت ہمارے لیے ضروری ہے، مگر اس سے ان کی افضلیت اور امامت و خلافت کیوں کر ثابت ہوئی؟

[إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى] سے استدلال:

آٹھویں وجہ: یہاں پر ﴿الْقُرْبٰى﴾ کا لفظ ''ال'' لگا کر معرفہ بنا کر لایا گیا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ یہ قرابت دار مخاطبین کے ہاں معروف ہوں؛ جنہیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ: ﴿ قُلْ لَّا اَسْاَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا﴾ [الشوری ۲۳]

''کہہ دیجئے! کہ میں اس پر تم سے کوئی بدلہ نہیں چاہتا۔''

ہم پہلے یہ بیان کر چکے ہیں کہ جب یہ آیات نازل ہوئیں اس وقت تک ابھی حسن و حسین رضی اللہ عنہما پیدا ہی نہیں ہوئے تھے؛ اور نہ ہی حضرت علی اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہما کی شادی ہوئی تھی۔ پس آیت میں جن اہل قرابت کے لیے خطاب کیا گیا ہے؛ بہت ناممکن ہے کہ یہ لوگ ہوں۔ بخلاف اس قرابت داری کے جو آپ کے اور قریش کے مابین تھی۔ یہ تعلق و قرابت اس وقت کے لوگوں میں معروف تھا۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے آپ فرما رہے ہوں: میں تم سے اس خونی رشتہ داری کی رعایت کا سوال کرتا ہوں جو میرے اور آپ کے مابین ہے۔ جیسا کہ کوئی کہتا ہے: میں آپ سے اپنے اور آپ کے مابین عدل کا سوال کرتا ہوں۔ اور کوئی دوسرا کہتا ہے کہ: میں صرف آپ سے یہ سوال کرتا ہوں کہ اس معاملہ میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو۔

نویں وجہ: ہم تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت اس آیت سے استدلال کیے بغیر بھی واجب ہے۔ لیکن آپ کی محبت اور دوستی کے واجب ہونے سے کہیں بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ امامت صرف آپ کے لیے ہی خاص ہے؛ اور نہ ہی آپ کی کوئی خاص فضیلت ثابت ہوتی ہے۔

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ''خلفاء ثلاثہ سے محبت رکھنا ضروری نہیں ہے۔''

[جواب]: یہ بات ہمارے لیے ناقابل قبول ہے، بلکہ اہل بیت کی الفت و محبت کے دوش بدوش اصحاب ثلاثہ کی محبت بھی ناگزیر ہے۔ یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ خلفائے ثلاثہ سے محبت رکھتے ہیں اور جس سے اللہ تعالیٰ محبت رکھتے ہوں اس سے الفت و محبت کا سلوک روا رکھنا ہم پر واجب ہے ''اَلْحُبُّ فِي اللّٰهِ وَالْبُغْضُ فِي اللّٰهِ'' ❷ اسلام کا

❶ سنن ابن ماجة، المقدمة، باب فضل العباس بن عبد المطلب رضی الله عنه، (حدیث: ۱۴۰)، مستدرك حاكم(۴/ ۷۵) و سنده ضعيف لانقطاعه اس کی سند منقطع ہے۔

❷ سنن ابی داؤد۔ كتاب السنة۔ باب مجانبة أهل الاهواء (حديث:۴۵۹۹)۔

طرہ امتیاز اور ایمان کی مضبوط ترین کڑی ہے۔ خلفائے ثلاثہ رضی اللہ عنہم اجمعین کبار اہل تقوی اولیاء اللہ میں سے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے دوستی رکھنے کو واجب قرار دیا ہے۔ بلکہ کتاب وسنت کی روشنی میں یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہے۔ اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے ہیں۔ اس پر قرآنی نصوص موجود ہیں۔ ہر وہ شخص جس سے اللہ راضی ہو جائے تو یقینا اللہ تعالیٰ اس سے محبت کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اہل تقوی سے؛ احسان کرنے والوں سے؛ عدل وانصاف کرنے والوں سے ؛ اور صبر کرنے والوں سے محبت کرتے ہیں۔ یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ان لوگوں میں سے افضل ترین لوگ ہیں جو ان نصوص میں داخل ہیں۔

[تمام صحابہ رضی اللہ عنہم واجب الاحترام ہیں]:

بخاری ومسلم میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''مسلمانوں کے باہمی رحم وکرم اور الفت ومحبت کی مثال ایک جسم جیسی ہے کہ جب اس کا کوئی عضو بیمار پڑتا ہے تو پورا جسم بخار وبیداری سے بے قرار ہو جاتا ہے۔''❶

اس حدیث میں ہمیں خبر دی گئی ہے کہ اہل ایمان آپس میں محبت کرتے ہیں' ایک دوسرے پر شفقت کرتے ہیں اور رحم کی دعا کرتے ہیں۔ اور اس باب میں وہ ایک جسم کی مانند ہیں۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کا ایمان نصوص کتاب وسنت اور اجماع امت کی روشنی میں ثابت ہے ؛ جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ایمان ثابت ہے۔ اور جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی شان میں قدح کرنا چاہیے تو وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ایمان کبھی بھی ثابت نہیں کرسکتا۔ بلکہ ہر وہ دلیل جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ایمان پر دلالت کرتی ہے ؛ وہ باقی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے ایمان پر بہت زیادہ قوت کے ساتھ دلالت کرتی ہے۔ اور جو بات بھی باقی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی شان میں قدح کے طور پر بیان کی جاتی ہے وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں بدرجہ اولی قدح کا موجب بنتی ہے۔ اس لیے کہ جو رافضی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے تعصب کرتا ہے' اور باقی صحابہ پر قدح کرتا ہے ؛ یہود ونصاری کی طرح اس کی حجت بالکل ناکارہ اور بودی ہے ؛ جو حضرت عیسی اور موسی علیہما السلام کی نبوت تو ثابت کرنا چاہتے ہیں مگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر قدح واعتراض کرنا چاہتے ہیں۔

ایک رافضی قوت دلیل سے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بغض رکھنے والے اور آپ کے ایمان پر قدح کرنے والے خوارج و نواصب کو قائل نہیں کرسکتا۔ جیسا کہ اس مکالمہ سے ظاہر ہے۔ اگر خارجی و ناصبی ایک شیعہ سے کہیں تمھیں کیوں کر معلوم ہوا کہ علی اللہ کے ولی اور متقی مؤمن ہیں؟''

اگر شیعہ اس کے جواب میں کہے کہ'' مجھے تواتر سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ولی اللہ ہونا معلوم ہوا کیوں کہ آپ مسلمان تھے اور اعمال صالحہ انجام دیتے تھے۔'' تو خارجی و ناصبی اس کے جواب میں کہہ سکتے ہیں کہ ''نقل متواتر تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ کے بارے میں بھی موجود ہے۔ بلکہ ان لوگوں کی نیکیوں کے بارے میں موجود تواتر کسی بھی معارض سے محفوظ ہے۔

❶ صحيح بخاري، كتاب الأدب، باب رحمة الناس والبهائم (حديث: ٦٠١١)، صحيح مسلم كتاب البر والصلة. باب تراحم المؤمنين (حديث: ٢٥٨٦).

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں نقل کردہ تواتر سے بڑھ کر ہے۔''

اور اگر شیعہ کہے کہ قرآن سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ولی اللہ ہونا ثابت ہے۔

تو خوارج ونواصب کہہ سکتے ہیں کہ'' قرآنی عمومات میں تو دیگر صحابہ بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ شامل ہیں؛ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ [الفتح ۱۸]

''یقیناً اللہ تعالیٰ مومنوں سے خوش ہوگیا۔''اور اس طرح کی دوسری آیات بھی ہیں۔

مگر تم شیعہ اکابر صحابہ کو ان عمومات سے خارج کرتے ہو؛ تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اتنی بڑی جماعت کی بجائے آسان تر صرف ایک حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ان سے خارج کردیا جائے۔

اگر شیعہ کہے کہ'' احادیث نبویہ سے اور ان کی شان میں قرآن کے نزول سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ولی ہونا ثابت ہے۔''

تو اس کا جواب یہ ہے کہ دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے فضائل و مناقب کی احادیث اکثر واضح ہیں مگر شیعہ ان پر قدح وارد کرتے ہیں۔ دوسری جانب فضیلت علی رضی اللہ عنہ میں شیعہ جو روایات بیان کرتے ہیں ان کے ناقل وہی صحابہ ہیں جو شیعہ کے نزدیک مطعون ہیں۔اب دو ہی صورتیں ہیں:

۱۔ اگر صحابہ پر شیعہ کی جرح وقدح درست ہے تو فضیلت علی رضی اللہ عنہ میں ان کی روایات بھی معتبر نہیں ہیں۔

۲۔ اگر فضیلت علی رضی اللہ عنہ کی روایات قابل اعتماد ہیں تو صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین پر شیعہ کے مطاعن لغو ہیں۔

اگر روافض کہیں کہ فضیلت علی رضی اللہ عنہ کی روایات شیعہ کی نقل اور تواتر کے مطابق معتبر ہیں۔

تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ: صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں کوئی بھی رافضی نہیں تھا۔اور معدودے چند کے سوا شیعہ کے نزدیک سب صحابہ رضی اللہ عنہم مطعون ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ دس سے زائد صحابہ ایسی روایات کے نقل کرنے میں یک زبان ہیں، جب روافض جمہور صحابہ کی مرویات کو صحیح تسلیم نہیں کرتے تو معدودے چند صحابہ رضی اللہ عنہم کی روایت کردہ احادیث کیوں کر ان کے نزدیک حجت ہوں گی؟ اس مسئلہ پر اپنی جگہ پر تفصیل سے بحث کی جا چکی ہے۔ [1]

یہاں پر مقصود یہ ہے کہ شیعہ کا قول کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علاوہ تینوں خلفاء کرام رضی اللہ عنہم کی محبت واجب نہیں۔'' جمہور کے ہاں یہ کلام باطل ہے۔ بلکہ اہل سنت والجماعت کے ہاں ان تینوں حضرات کی محبت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت سے بڑھ کر واجب ہے۔اس لیے کہ محبت فضیلت کی مقدار کے لحاظ سے واجب ہوتی ہے۔ پس جس کی جتنی زیادہ فضیلت ہوگی؛ اس کی محبت بھی اتنی زیادہ واجب ہوگی۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

---

[1] کافی میں ہے: ابوجعفر- علیہ السلام- سے روایت ہے' وہ فرماتے ہیں:'' نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد لوگ مرتد ہوگئے تھے' سوائے تین کے۔ میں نے کہا: وہ تین کون تھے۔فرمایا: اور تین ہیں: حضرت مقداد بن اسود؛ اور حضرت ابوذر غفاری؛ اور حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہم۔ پھر تھوڑے ہی عرصہ کے بعد لوگوں نے پہچان لیا۔اور فرمایا یہی لوگ تھے جن پر-ظلم کی- چکی چلی۔ اور انہوں نے بیعت کرنے سے انکار کیا۔ یہاں تک کہ امیر المؤمنین کو زبردستی پکڑ کر لائے' اور انہوں نے نہ چاہتے ہوئے بھی بیعت کی۔'' روضۃ الکافی ۸/ ۲۴۵-۲۴۶' روایت نمبر ۳۴۱۔ [دراوی؛ کشمیری]

﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمَٰنُ وُدًّا﴾ [مریم ۹۶]۔

''بیشک جو ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے شائستہ اعمال کیے ہیں ان کے لئے اللہ رحمٰن محبت پیدا کر دے گا۔''

اس کی تفسیر میں علماء کرام فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ خود بھی ان سے محبت کرتا ہے' اور لوگوں کے دلوں میں بھی ان کے لیے محبت ڈال دیتا ہے۔ یہ جماعت اس امت میں نبی کریم ﷺ کے بعد تمام لوگوں میں سے افضل ترین لوگ تھے جو ایمان لائے اور نیک اعمال کیے۔ [1] جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ تَرَاهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِم مِّنْ أَثَرِ السُّجُودِ ذَٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الْإِنجِيلِ كَزَرْعٍ أَخْرَجَ شَطْأَهُ فَآزَرَهُ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوَىٰ عَلَىٰ سُوقِهِ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِنْهُم مَّغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًا﴾ [الفتح ۲۹]

''محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں کافروں پر سخت ہیں آپس میں رحمدل ہیں، تو انہیں دیکھے گا رکوع اور سجدے کر رہے ہیں اللہ تعالیٰ کے فضل اور رضامندی کی جستجو میں ہیں، ان کا نشان ان کے چہروں پر سجدوں کے اثر سے ہے۔ ان کی یہی مثال تورات میں ہے اور ان کی مثال انجیل میں ہے۔ مثل اس کھیتی کے جس نے انکھوا نکالا پھر اسے مضبوط کیا اور وہ موٹا ہو گیا پھر اپنے تنے پر سیدھا کھڑا ہو گیا اور کسانوں کو خوش کرنے لگا تا کہ ان کی وجہ سے کافروں کو چڑائے، ان ایمان والوں سے اللہ نے بخشش کا اور بہت بڑے ثواب کا وعدہ کیا ہے۔'' [2]

[یہ درست ہے کہ محبوب اللہ و رسول ﷺ ہونے کے اعتبار سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت ہم پر واجب ہے۔ تاہم دیگر صحابہ کی محبت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا]۔ بخاری و مسلم میں ہے کہ نبی کریم ﷺ سے دریافت کیا گیا تھا کہ:

''سب لوگوں میں سے آپ کو عزیز تر کون ہے؟ فرمایا: ''عائشہ۔''

''عرض کیا گیا مردوں میں سے کون عزیز ہیں؟ فرمایا: ''ان کے والد ابو بکر رضی اللہ عنہ صدیق۔'' [3]

---

[1] یعنی دنیا میں لوگوں کے دلوں میں اس کی نیکی اور پارسائی کی وجہ سے محبت پیدا کر دے گا، جیسا کہ حدیث میں آتا ہے: جب اللہ تعالیٰ کسی (نیک) بندے کو اپنا محبوب بنا لیتا ہے تو اللہ جبرائیل علیہ السلام کو کہتا ہے، میں فلاں بندے سے محبت کرتا ہوں تو بھی اس سے محبت کر۔ پس جبرائیل علیہ السلام بھی اس سے محبت کرنی شروع کر دیتے ہیں پھر جبرائیل علیہ السلام آسمان میں منادی کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فلاں آدمی سے محبت کرتا ہے، پس تمام آسمان والے بھی اس سے محبت کرنے لگتے ہیں، پھر زمین میں اس کے لئے قبولیت اور پذیرائی رکھ دی جاتی ہے۔ (صحیح بخاری)۔

[2] یعنی مسلمان پہلے صرف ایک تھا اور وہ تھی رسول اللہ کی ذات اقدس جو اپنی نبوت پر سب سے پہلے خود ایمان لائے۔ پھر ایک سے دو ہوئے، دو سے تین، تین سے سات۔ اسی طرح رفتہ رفتہ اسلام کا پودا زمین سے باہر نکل آیا۔ فتح مکہ کے دن یہ پودا ایک مضبوط اور تناور درخت کی شکل اختیار کر گیا۔ جب یہ مضبوط درخت بن کر اپنی جڑوں پر استوار ہو گیا۔ اس درخت کی آبیاری اور نگہداشت کرنے والی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی وہ مقدس جماعت تھی جو نبی آخر الزمان پر ایمان لائے تھے پھر عمر بھر دل و جان سے آپ کی اطاعت کرتے اور آپ کے اشاروں پر چلتے رہے۔ ایسے لوگوں کا اللہ کے ہاں اجر بھی بہت زیادہ ہے جو ان کی چھوٹی چھوٹی لغزشوں کو معاف کر کے انہیں جنت کے بلند درجات عطا فرمائے گا۔ اس آیت سے بعض علما نے یہ استنباط کیا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے جلنے والا اور ان کے متعلق بغض اور کینہ رکھنے والا شخص کبھی مسلمان نہیں ہو سکتا۔ [الدراوی]۔

[3] صحیح بخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ۔ باب قول النبی ﷺ "لو کنت متخذا خلیلا" (ح:۳٦٦٢)، صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہ (ح:۲۳۸٤)۔

صحیح حدیث میں آیا ہے کہ سقیفہ بنی ساعدہ کے دن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو مخاطب کرکے کہا تھا:

''آپ ہمارے سردار اور ہم سب سے بہتر اور نبی کریم ﷺ کو ہم سب سے عزیز ہیں۔'' [1]

اس کی تصدیق ان احادیث مبارکہ سے بھی ہوتی ہے جو صحاح ستہ کی دوسری کتابوں میں مشہور ہیں۔ سرور کائنات ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

''اگر میں اس امت میں سے کسی کو گہرا دوست بنانا چاہتا تو ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بناتا؛ لیکن اسلام کی محبت [سب کیلئے ہے]'' [2]

اس سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ روئے زمین بسنے والوں میں رسول اللہ ﷺ کی محبت کے سب بڑے حق دار ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔ اور جو رسول اللہ ﷺ کو محبوب ہو؛ وہ اللہ تعالیٰ کو بھی محبوب ہوتا ہے۔ اور جو اللہ اور اس کے رسول کا محبوب ہو؛ وہ اس بات کا بہت زیادہ حق دار ہے کہ اہل ایمان ان سے محبت کرتے رہیں۔اس لیے کہ اہل ایمان اسی سے محبت کرتے ہیں جس سے اللہ اور اس کے رسول محبت کرتے ہوں۔ اور اس طرح محبت کرتے ہیں جس طرح اللہ اور اس کا رسول محبت کرتے ہوں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اس محبت کے سب بڑے حق دار ہونے کے دلائل بہت سارے ہیں۔تو پھر یہ بات کہنے کی کیا گنجائش باقی رہ جاتی ہے کہ مفضول سے محبت کرنا تو واجب ہے؛ مگر افضل سے محبت کرنا واجب نہیں ہے۔

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:'' حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مخالفت ان کی محبت کے منافی ہے۔آپ کے احکامات کی تعمیل کرنا آپ کی محبت ہے؛ تو آپ واجب الاطاعت ٹھہرے؛ یہی امامت کا معنی ہے۔''

[جواب]: اس کا جواب کئی طرح سے دیا جاسکتا ہے:

پہلا جواب: یہ ہے کہ اگر کسی سے محبت رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی اطاعت واجب ٹھہرتی ہے تو اقارب کی اطاعت بھی ضروری ہوگی، اس لیے کہ ان کی محبت واجب ہے۔جس سے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کا امام ہونا لازم آتا ہے۔اور اگر یہ باطل ہے تو پھر باقی امور بھی اسی کی طرح باطل ہیں۔

دوسرا جواب: محبت کے واجب ہونے کی صورت میں محبت و مودت کسی طرح بھی امامت کو مستلزم نہیں۔اور نہ ہی جس کسی کی محبت واجب ہو تو وہ امام بن جائے گا۔اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما کی محبت ان کے امام بننے سے پہلے بھی واجب تھی۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں امام نہیں تھے؛ پھر بھی آپ کی محبت واجب تھی۔ بلکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل ہونے تک بھی آپ کی محبت واجب تھی۔

تیسرا جواب: اگر محبت کو امامت کا ملزوم قرار دیا جائے تو ملزوم کا انتفاء لازم کی نفی کا تقاضا کرتا ہے۔ بنا بریں صرف اسی شخص کی محبت لازم ہوگی جو امام معصوم ہو۔تو اس صورت میں کسی بھی مؤمن سے محبت نہیں کی جائے گی؛ اور نہ ہی کسی اہل ایمان سے محبت و مودت رکھنا واجب ہوگی؛ اس لیے کہ وہ امام نہیں۔ نہ ہی شیعان علی اور نہ ہی کوئی دوسرا۔یہ بات اجماع کے بھی خلاف ہے اور اسلام میں ضرورت کے تحت معلوم شدہ امور کے بھی خلاف ہے۔

[1] صحیح بخاری حوالہ سابق(حدیث:٣٦٦٨)، مطولاً۔

[2] صحیح بخاری حوالہ سابق (حدیث:٣٦٥٨)، عن عبد اللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہ۔ صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة باب من فضائل ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہ (حدیث:٤/ ٢٣٨٣) عن عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ۔

چوتھا جواب: شیعہ کا یہ قول ہے کہ" مخالفت محبت کے منافی ہے۔"

ہم پوچھتے ہیں: ایسا کب ہوگا؟ جب محبت واجب ہوگی یا پھر مطلق طور پر؟ مطلق کہنے کی صورت میں یہ ممنوع ہے۔ وگرنہ جو کوئی کسی دوسرے پر کوئی ایسی چیز واجب کرتا جو اللہ تعالیٰ نے اس پر واجب نہیں کی؛ تو پھر اگر وہ اس کا حکم ماننے میں اس کی مخالفت کرے گا تو اس سے محبت کرنے والا نہیں ہوگا۔ اور کوئی مؤمن کسی مؤمن سے اس وقت تک محبت کرنے والا نہیں ہوسکتا جب تک اسکی اطاعت کے واجب ہونے کا یقین نہ کرلے؛ اس نظریہ کی خرابی صاف ظاہر ہے۔

پہلی صورت میں: جب مخالفت صرف اسی صورت میں محبت میں قادح ہوتی ہے جب وہ شخص واجب الاطاعت ہو۔ اس صورت میں پہلے وجوب اطاعت کا علم ضروری ہے۔ تاکہ اس کی مخالفت کی صورت میں اس کی محبت پر قدح کرسکیں۔ جب اطاعت کو اس لیے واجب قرار دیا جائے گا کہ محبت واجب ہے تو دور لازم آئے گا؛ جو کہ ممتنع ہے۔ اس لیے کہ کسی مخالفت سے اس وقت تک محبت پر قدح نہیں کی جاسکتی جب تک اس کی اطاعت کا واجب ہونا معلوم نہ ہو۔ اور اطاعت کا واجب ہونا اس وقت تک معلوم نہیں ہوسکتا جب تک یہ معلوم نہ ہو جائے کہ وہ امام ہے۔ اور امام ہونے کا اس وقت تک علم نہیں ہوسکتا جب تک اس کی محبت واجب ہونے کا علم نہ ہو' اور یہ علم ہو کہ اس کی مخالفت محبت میں قدح کا سبب ہوگی۔

پانچواں جواب: [ہم پوچھتے ہیں] کیا مخالفت محبت میں اسی صورت میں قادح ہوسکتی ہے [جب وہ شخص امام ہو] اور اس کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہو یا نہ دیا گیا ہو؟۔

دوسرے جواب کی ضرورت کے تحت نفی کی گئی ہے۔ جب کہ پہلے جواب کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خلفائے ثلاثہ کے زمانہ میں آپ نے ایسا نہیں کیا تھا۔

چھٹا جواب: یہی بات حضرات خلفاء ثلاثہ کے متعلق بھی کہی جاسکتی ہے۔ حضرت ابوبکر وعمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کی محبت و اطاعت بھی واجب ہے۔ اوران کی مخالفت ان کی محبت میں قادح ہے۔

ساتواں جواب: اس حدیث میں سے ترجیح کے امور: اس لیے کہ شیعہ نے اپنی ولایت ومحبت اور اطاعت کے دعوی کے ساتھ ساتھ امامت کا بھی دعوی کیا ہے۔ اور [ان کا دعوی ہے کہ] اللہ تعالیٰ نے ان کی اطاعت واجب کی ہے۔ اوران کی مخالفت ان کے ساتھ محبت میں قادح ہے۔ بلکہ اللہ اوراس کے رسول کی محبت میں بھی قدح کا سبب ہے۔ اوراس میں کوئی شک نہیں کہ جس نے رافضیت کی بدعت کو ایجاد کیا؛ وہ اللہ اوراس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت رکھنے والا نہیں تھا۔ بلکہ حقیقت میں وہ اللہ تعالیٰ کا پکا دشمن تھا۔

ان لوگوں کا اہل سنت کے ساتھ ایسے ہی معاملہ ہے جیسا عیسائیوں کا مسلمانوں کے ساتھ۔ اس لیے کہ عیسائی حضرت عیسی علیہ السلام کو تو رب قرار دیتے ہیں' اور حضرت ابراہیم؛ موسی؛ اور محمد علیہم السلام کو ان حواریوں سے بھی کم درجہ کا سمجھتے ہیں جو حضرت عیسی علیہ السلام کے ساتھ تھے۔

یہی حال شیعہ کا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو امام معصوم؛ یا نبی یا پھر خدا تک قرار دیتے ہیں' اور باقی خلفاء رضی اللہ عنہم کو اشتر نخعی؛ اوراس جیسے ان لوگوں سے بھی کم تر قرار دیتے ہیں جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ مل کر برسرپیکار تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی

جہالت اور دروغ گوئی اتنی بڑھی ہوئی ہے کہ اسے احاطہ تحریر میں نہیں لایا جا سکتا۔ ان کا بڑا سہارا جھوٹی منقولات؛ متشابہ الفاظ ؛ فاسد قیاس؛ اور اس طرح کی چیزیں ہیں مگر اس پر مستزاد یہ کہ یہی منقولات اور تواتر؛ واضح دلائل ونصوص اور صریح معقولات کا دعوی کرتے ہیں۔

امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی آٹھویں دلیل:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:''امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی آٹھویں دلیل یہ آیت ہے:

﴿وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاةِ اللّٰهِ﴾ (البقرۃ ۲۰۷)

''اور بعض لوگ وہ بھی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی رضامندی کی طلب میں اپنی جان تک بیچ ڈالتے ہیں۔''

ثعلبی کہتے ہیں: جب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کا ارادہ کیا تو قرض اور امانتوں کی ادائیگی کیلئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مکہ میں ہی رہنے دیا۔ جس رات آپ غار کی جانب چلے اور کفار قریش نے آپ کے گھر کا محاصرہ کر لیا تھا تو آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ آپ کی سبز چادر اوڑھے آپ کے بستر پر سو رہیں۔ آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا:''یا علی! میری سبز حضرمی چادر اوڑھ کر میرے بستر پر لیٹ جاؤ کفار آپ کو کوئی تکلیف نہیں دے سکیں گے۔ ان شاء اللہ۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے تعمیل ارشاد کر دی۔ اللہ تعالیٰ نے جبرئیل و میکائیل کی طرف وحی کی کہ میں نے تمہارے درمیان مواخات کا رشتہ قائم کیا ہے؛ اور ایک کی عمر دوسرے سے طویل کر دی ہے۔ بتائیے تم میں سے کون اپنی زندگی کا حصہ دوسرے کو عطا کرتا ہے۔ دونوں نے جینے کو پسند کیا اور کوئی بھی ایثار نہ کر سکا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:''تم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تقلید نہ کی۔ میں نے محمد و علی کے درمیان بھائی چارہ قائم کیا تھا۔ علی محمد کے بستر پر سو گئے اور ان کے لیے یہ ایثار قبول کیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے دونوں کو زمین پر اترنے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حفاظت کا حکم دیا۔ جبرائیل حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سر کے پاس کھڑے ہو گئے اور میکائیل پاؤں کے پاس۔ جبرائیل نے کہا:''شاباش! اے علی! تیرے جیسا اور کون ہوگا۔ اللہ تعالیٰ تیری وجہ سے فرشتوں پر فخر کرتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عازم مدینہ تھے کہ مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی:

﴿وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاةِ اللّٰهِ﴾ (البقرۃ ۲۰۷)

''اور بعض لوگ وہ بھی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی رضامندی کی طلب میں اپنی جان تک بیچ ڈالتے ہیں۔''

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: یہ آیت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت میں نازل ہوئی جب آپ مکہ سے غار ثور کی طرف جا رہے تھے۔ اس فضیلت حضرت علی رضی اللہ عنہ منفرد ہیں۔ بنا بریں یہ واقعہ باقی تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ کی فضیلت پر زبردست دلیل ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ آپ ہی امام ہیں۔ (شیعہ مصنف کا بیان ختم ہوا۔)

جواب: اس کا جواب کئی طرح سے ہے:

پہلی بات: ہم شیعہ مصنف سے اس واقعہ کی صحت نقل کا مطالبہ کرتے ہیں۔ کسی روایت کو ثعلبی یا اس کے امثال کا نقل کر لینا حجت کے لیے کافی نہیں؛ بلکہ ان کی طرف منسوب کرنے میں ہی اس کا جھوٹ ہونا ثابت ہو رہا ہے۔ ان کی روایت باتفاق شیعہ و اہل سنت حجت نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ بہت ہی متاخر مرسل ہے۔ اور روایت کی اسناد ذکر نہیں کرتا۔ اس کی

روایات میں اسرائیلیات ؛اسلامیات اور ایسے امور پائے جاتے ہیں جن کا موضوع ہونا صاف ظاہر ہوتا ہے ۔ اگر چہ ثعلبی خود جان بوجھ کر جھوٹ نہ بھی بولتا ہو۔

دوسری بات: یہ روایت باتفاق محدثین و مفسرین اور سیرت نگاروں کے جھوٹ ہے ۔[اس لیے اسے بطور حجت پیش نہیں کیا جا سکتا]۔

تیسری بات: حقیقت یہ ہے کہ جب نبی کریم رضی اللہ عنہ نے ہجرت فرمائی ۔قریش مکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے قطعی طور پر بے تعلق تھے ۔ ان کا اصلی مطلوب نبی کریم رضی اللہ عنہ کی ذات گرامی اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ تھے ۔قریش مکہ نے انعام بھی انہی دو حضرات کو پکڑنے والے کے لیے مقرر کیا تھا۔ جیسا کہ روایات صحیحہ میں مذکور ہے ؛ جن کی صحت میں کسی بھی عاقل کو ادنیٰ شک بھی نہیں ہوسکتا ۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو آپ کے بستر پر سلانے کا مقصد صرف یہ تھا کہ قریش اس وہم میں مبتلا رہیں کہ آپ گھر ہی میں ہیں اور آپ کی تلاش نہ کریں ۔ جب صبح ہوئی تو انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو وہاں پر سوئے ہوئے پایا ؛ تو قریش پر ان کی ناکامی کا راز فاش ہوا ۔ تاہم انھوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کچھ ایذاء نہ پہنچائی ۔ ان سے صرف یہ دریافت کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کہاں ہیں ؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا ۔❀

❀ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کسی کی بھی طرف سے ہرگز کوئی خوف ہی نہیں تھا ۔خوف تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بارے میں تھا ۔ اگر انھیں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کوئی پرخاش ہوتی تو وہ انھیں ضرور تکلیف پہنچاتے ۔ کفار مکہ کا حضرت علی رضی اللہ عنہ سے تعرض نہ کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ان کا کوئی واسطہ نہ تھا ۔تو پھر کون سی جاں نثاری اور قربانی کا ذکر کیا جا رہا ہے ؟

جس شخص نے قصداً آپ کا دفاع کیا ؛ اور اس کے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر آگے بڑھے ؛ وہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے ،خود آپ کو بھی خطرہ لاحق تھا ۔ مگر پھر بھی آپ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کے نقطہ خیال سے دوران سفر کبھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے ہوتے اور کبھی پیچھے ۔ ❶

جب آپ کو پیچھے تلاش کرنے والوں کا خیال آتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے ہو لیتے ؛ اور جب آگے گھات کا خیال آتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے ہو جاتے ۔ اور آگر نکل کر خبر لیتے کہ کہیں کوئی انتظار میں یا گھات لگائے ہوئے تو نہیں ۔ جب کوئی خوف محسوس ہوتا تو آپ چاہتے کہ یہ پریشانی انہی پر آئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نہ آئے ۔

کئی صحابہ نے مختلف لڑائیوں میں اپنی جانیں تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نثار کی تھیں ۔بعض شہید ہوئے اور بعض کے اعضاء تک شل ہو گئے ۔ مثلاً طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ کا ہاتھ کٹ گیا تھا ۔ ❷

❀ البخاری باب هجرة النبی ﷺ و اصحابه (ح:٣٩٠٦)سیرة ابن هشام(ص:٢٢٢) مسند احمد(١/ ٣٤٨)۔

❶ سیرة النبی لابن کثیر(١/ ٤٥٦) ، مستدرك حاکم(٣/ ٦) دلائل النبوة(٢/ ٤٧٦) عن محمد بن سیرین مرسلاً

❷ صحیح بخاری، کتاب المغازی باب ﴿ إِذْ هَمَّتْ طَائِفَتَانِ مِنكُمْ ....﴾ (حدیث:٤٠٦٣)۔

نبی کریم ﷺ کی تائید و نصرت مسلمانوں پر واجب ہے۔ اگر مان لیا جائے کہ مکہ مکرمہ میں بستر پر لیٹنا جان نثاری تھی؛ اور اس میں فضیلت کا پہلو موجود ہے تب بھی یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کوئی خصوصیت نہیں ؛ بلکہ دوسرے لوگ بھی اس میں آپ کے شریک ہیں۔ اس لیے کہ دوسرے کئی صحابہ کرام نے بھی کئی مواقع پر رسول اللہ ﷺ پر جان نثاری کا حق ادا کیا ہے۔ تو پھر جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کوئی خطرہ ہی نہ تھا تو یہ کیسے خصوصیت ہوئی ؟

سیرت ابن اسحاق میں ہے- حالانکہ ابن اسحاق کا شمار متولین علی رضی اللہ عنہ اور ان کی جانب میلان رکھنے والوں میں ہوتا ہے -اس نے ہجرت کی رات مکہ مکرمہ میں اپنے گھر سے نبی کریم ﷺ کے خروج اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بستر پر لیٹانے کا واقعہ لکھا ہے؛[وہ لکھتا ہے]: جبرائیل امین نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا آج رات آپ اپنے بستر پر نہ سوئیں۔ رات کے اندھیرے میں کفار آپ کے دروازے پر جمع ہو کر انتظار کرنے لگے کہ جب سو جائیں تو آپ پر حملہ کر دیں۔

ان کو کھڑے دیکھ کر آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا: ''میرے بستر پر میری سبز حضرمی چادر اوڑھ کر سو جائیں کفار آپ کو کوئی تکلیف نہیں پہنچا سکیں گے۔'' [سیرۃ ابن ھشام(ص:۲۲۲) ، مسند احمد(۱/ ۳٤۸)]

واقعہ ہجرت:

محمد بن کعب القرظی سے روایت ہے کہ:

جب کفار مکہ نبی کریم ﷺ کی تلاش میں جمع ہوئے تو ان میں ابوجہل بھی تھا۔ اس نے کہا: محمد کہتے ہیں: ''اگر تم ان کی پیروی کرو گے تو عرب و عجم کے بادشاہ بن جاؤ گے اور موت کے بعد جب دوبارہ زندہ ہو گے تو تمھیں ایسے باغات ملیں گے جیسے اردن کے باغات ہیں اور اگر تم نے ان کی پیروی نہ کی تو وہ تمھیں ہلاک کر ڈالیں گے اور بعد از موت جب اٹھائے جاؤ گے تو تمھیں آگ میں جلایا جائے گا۔''

راوی کا بیان ہے کہ نبی کریم ﷺ گھر سے نکلے اور مٹھی بھر مٹی ان پر دے ماری، پھر فرمایا: ہاں میں یوں ہی کہتا ہوں۔ ابوجہل کو مخاطب کر کے فرمایا: تو بھی آگ میں جلنے والوں میں سے ایک ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کفار کی قوت بصارت سلب کر لی اور وہ آپ کو دیکھ نہ سکے۔ یہ مٹی ان سب آدمیوں کے سر پر پڑی۔ کوئی بھی ایسا نہیں بچا جس کے سر پر وہ مٹی نہ پڑی ہو۔ اور وہ ادھر ادھر منتشر ہو گئے۔ پھر ایک شخص ان کے پاس آیا؛ جو ان کے ساتھ نہیں تھا؛ اس نے کہا: ''تم یہاں کس کا انتظار کر رہے ہو؟''

انھوں نے کہا: ''محمد کا۔''

وہ کہنے لگا: ''اللہ کی قسم! محمد جا چکے ہیں تم اپنے مقصد میں ناکام ہوئے۔ جاتے جاتے وہ تمہارے سروں پر خاک بھی جھونک گئے ہیں۔'' کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے۔

چنانچہ کفار میں سے ہر آدمی نے اپنا ہاتھ اپنے سر میں ڈالا تو دیکھا کہ ان کے سر پر مٹی پڑی ہے۔ پھر وہ گھر میں ادھر ادھر جھانکنے لگے کیا دیکھتے ہیں کہ علی رضی اللہ عنہ آپ کی چادر اوڑھے سوئے ہیں۔ وہ کہنے لگے: اللہ کی قسم! محمد ﷺ اپنی چادر

تانے سو رہے ہیں۔ اتنے میں صبح ہوگئی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اٹھ کھڑے ہوئے؛ تو کفار نے کہا: ''اس شخص نے سچی بات کہی تھی کہ محمد ﷺ یہاں سے چلے گئے ہیں۔ تب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی:

﴿وَ اِذْ یَمْکُرُبِکَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لِیُثْبِتُوْکَ اَوْ یَقْتُلُوْکَ اَوْ یُخْرِجُوْکَ وَ یَمْکُرُوْنَ وَ یَمْکُرُ اللّٰهُ وَ اللّٰهُ خَیْرُ الْمٰکِرِیْنَ﴾ [الانفال: ۳۰]

''وہ وقت کو یاد کیجیے جب کافر آپ کے خلاف تدبیریں کر رہے تھے کہ آپ کو قید کریں یا قتل کر ڈالیں یا مکہ سے نکال دیں ادھر یہ تدبیریں کر رہے تھے اور ادھر اللہ تعالیٰ بھی تدبیر کر رہا تھا اور اللہ بہتر تدبیر کرنے والا ہے۔'' [سیرۃ ابن ہشام، ص: ۲۲۱]

نیز یہ آیت بھی نازل ہوئی: ﴿اَمْ یَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَیْبَ الْمَنُوْنِ﴾ [الطور ۳۰]

''یا وہ کہتے ہیں کہ یہ ایک شاعر ہے جس پر ہم زمانے کے حوادث کا انتظار کرتے ہیں۔''

اس وقت اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو ہجرت کی اجازت عطا فرمائی۔ اس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ ان لوگوں کو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کوئی غرض نہیں تھی۔''

مذکورہ صدر روایت سے یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہ فرمایا تھا کہ: ''میرے بستر پر میری سبز حضرمی چادر اوڑھ کر سو جائیں کفار آپ کو کوئی تکلیف نہیں پہنچا سکیں گے۔''

بنا بریں حضرت علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے وعدہ کی روشنی میں ہر طرح سے مسرور و مطمئن تھے۔

چوتھی بات: خود اس روایت میں اس کے جھوٹ ہونے کے وہ دلائل موجود ہیں جو کسی پر بھی مخفی نہیں رہ سکتے۔ اس لیے کہ ملائکہ کے بارے میں ایسی باطل باتیں نہیں کہی جا سکتیں جو ان کی شایان شان نہ ہوں۔ ان میں سے کوئی ایک بھوکا نہیں تھا کہ دوسرے کو کھانے میں ترجیح دیتا۔ اور نہ ہی ان کے لیے کوئی خوف تھا کہ امن والا خوف والے کو ترجیح دیتا۔ تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف یہ بات کیسے منسوب کی جا سکتی ہے کہ اس نے فرشتوں سے کہا: تم میں سے کون ہے جو اپنے ساتھی کی زندگی کو ترجیح دے؟ نیز فرشتوں کے مابین اصل میں کوئی مواخات نہیں۔ بلکہ جبریل کی اپنی خاص ذمہ داری ہے؛ میکائیل کی اپنی خاص ذمہ داری ہے جو جبریل کی نہیں۔ جیسا کہ احادیث مبارکہ میں آتا ہے؛ کہ وحی لیکر آنا اور مدد لیکر نازل ہونا جبریل امین کی ذمہ داری ہے۔ اور روزی اور بارش پہنچانا میکائیل کی ذمہ داری ہے۔

پھر اگر اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ کر ہی دیا تھا کہ ان میں سے ایک کی عمر دوسرے کی نسبت زیادہ ہوگی؛ تو پھر ویسے ہی ہونا تھا جیسے اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کر دیا تھا۔ پھر اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسا فیصلہ بھی ہو گیا تھا؛ اور اب مشیت الٰہی یہ تھی کہ دونوں کا لمبی عمر پر اتفاق ہو جائے؛ یا ایک اپنی عمر کا کچھ حصہ دوسرے کو دیدے اور دونوں اس پر راضی بھی ہوں تو پھر اس میں کسی کلام کی کوئی گنجائش باقی نہیں۔ اور اگر وہ اس پر راضی نہیں تھے؛ بلکہ اس کو ناپسند کرتے تھے تو پھر اللہ تعالیٰ کی حکمت اور رحمت کے لیے کیسے یہ مناسب ہو سکتا ہے کہ وہ فرشتوں کے مابین بغض و عداوت ڈالے۔ یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب اس بات کو سچ تسلیم کر لیا جائے۔ مگر اللہ تعالیٰ ایسی بودی اور بیہودہ باتوں سے بہت بلند و بالا اور منزہ و مبرا ہے۔

پھر اگر اس بات کو۔ بطور مناظرہ۔ باطل ہونے کے باوجود صحیح بھی مان لیں تو پھر یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ فرشتوں کی

تخلیق آدم علیہ السلام کی پیدائش سے بہت پہلے ہوئی ہے؛ اس وقت سے لیکر ہجرت کے بعد تک اس معاملہ میں تاخیر کیوں کی گئی؟ اگر واقعی کچھ ایسا ہی تھا تو پھر ان فرشتوں کی پیدائش کے فوراً بعد اس کے بارے میں فیصلہ ہو جانا چاہیے تھا۔

پانچویں بات: حضرت علی رضی اللہ عنہ کی سرور کائنات ﷺ سے مواخات کی روایت بھی صحیح نہیں اور نہ ہی آپ نے کسی دوسرے سے کوئی مواخات قائم کی۔ اس بارے میں جو کچھ روایت کیا جاتا ہے؛ وہ سب جھوٹ اور دروغ گوئی ہے۔ حدیث مواخات جو اس بارے میں روایت کی جاتی ہے؛ اس میں ضعف و بطلان کے باوجود واضح ہے کہ مواخات مدینہ طیبہ میں ہوئی تھی۔ امام ترمذی نے ایسے ہی روایت کیا ہے۔ جبکہ مکہ میں مواخات کی روایت ہر دو لحاظ سے باطل ہے۔ لیکن یہ بھی اس روایت میں کہیں بھی جانثاری؛ یا اپنی زندگی پر ترجیح دینے کا کوئی ذکر نہیں۔ اس پر تمام علماء کا اتفاق ہے۔

چھٹی بات: جبریل و میکائیل دو فرشتوں کا ایک انسان کی حفاظت کے لیے نازل ہونا سب سے بڑی جھوٹی بات ہے۔ اس لیے کہ جب اللہ تعالیٰ چاہے تو اپنی مخلوق میں سے کسی کی حفاظت اس کے بغیر بھی کر سکتا ہے۔ ان فرشتوں کا بدر کے دن جنگ کرنے کے لیے اور اس طرح کے بڑے اور اہم ترین امور میں نازل ہونا ثابت ہے۔ اگر انہوں نے کسی ایک آدمی کی حفاظت کے لیے نازل ہونا تھا تو پھر رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کے لیے نازل ہوتے؛ جن کی تلاش میں ہر طرف سے کفار امڈ پڑے تھے؛ اور ان دونوں حضرات یعنی نبی کریم ﷺ اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ پر انہوں نے انعام بھی مقرر کر رکھے تھے۔ اور یہی دو حضرات کفار پر سخت گراں بھی تھے۔

ساتویں بات: علاوہ ازیں یہ آیت ﴿مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ﴾ سورۂ بقرہ میں ہے جو بالاتفاق مدنی سورت ہے۔ سورت بقرہ ہجرت کے بعد مدینہ میں نازل ہوئی۔ ہجرت تک اس کا نزول نہیں ہوا تھا۔ بعض مفسرین کا قول ہے کہ یہ آیت اس وقت اتری جب حضرت صہیب رضی اللہ عنہ نے ہجرت کی اور مشرکوں نے آپ کو پکڑنا چاہا تو آپ نے اپنا مال ان کو دے دیا اور خود مدینہ پہنچ گئے۔ نبی ﷺ نے انھیں دیکھ کر فرمایا: ''ابو یحییٰ! یہ سودا سود مند ہے۔'' (یہ واقعہ متعدد تفاسیر میں مذکور ہے) [1]

یہ ممکن ہے؛ اس لیے کہ حضرت صہیب رضی اللہ عنہ نے مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کی تھی۔ ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: مفسرین کرام کا اختلاف ہے کہ یہ آیت کس کے بارے میں نازل ہوئی؟ اور اس سے کون مراد ہے؟

ابو قتادہ کا قول ہے کہ یہ آیت مجاہدین مہاجرین کے بارے میں نازل ہوئی؛ اور اس سے مراد مجاہدین فی سبیل اللہ ہیں۔

عکرمہ کہتے ہیں یہ آیت حضرت صہیب و ابوذر رضی اللہ عنہما کے بارے میں اس وقت نازل ہوئی جب بدر والوں نے ابوذر رضی اللہ عنہ کو پکڑ لیا مگر وہ ان سے چھوٹ کر بارگاہ نبوی میں پہنچ گئے۔ جب واپس لوٹے تو کفار پھر مرّ الظہر ان میں مل گئے آپ دوبارہ ان سے چھوٹ گئے۔

جب کہ حضرت صہیب رضی اللہ عنہ کو ان کے گھر والوں نے پکڑ لیا تھا۔ آپ نے فدیہ دے دے کر ان سے رہائی حاصل کر لی۔ پھر ہجرت کرتے ہوئے نکل پڑے کہ قنفذ بن نفیل بن جدعان نے آپ کو پکڑ لیا۔ آپ کے پاس جو مال رہ گیا تھا؛ وہ اسے دیکر جان چھڑائی۔ علاوہ ازیں آیت کے الفاظ عام ہیں اور رضائے الٰہی؛ اور اطاعت و جہاد فی سبیل اللہ کیلئے اپنی جان کو فروخت

[1] تفسير ابن جرير (٤/ ٢٤٨)، مستدرك حاكم (٣/ ٤٠٠، ٤٩٨)

کرنے والا ہر شخص اس میں داخل ہے۔ یہ بھی معلوم ہے کہ بیعت الرضوان میں شمولیت کرنے والوں نے رسول اللہ ﷺ سے موت کی بیعت کی تھی۔[بخاری ح:٤١٦٩، مسلم، ح: ١٨٦٠]

یہ قول ابن عباس اور حضرت عمر رضی اللہ عنہم اجمعین کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ ان کا فرمان ہے کہ: اس آیت کے نزول کا سبب حضرت صہیب رضی اللہ عنہ تھے۔''

آٹھویں بات: اس آیت کے الفاظ مطلق ہیں۔اس میں کسی کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ پر ہر وہ انسان جو اپنے آپ کو اللہ کی رضامندی کے لیے بیچ ڈالے وہ اس آیت کے عموم میں داخل ہے۔ اور سب سے پہلے جو اس میں داخل ہونے کے بڑے حق دار ہیں وہ جناب محمد رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ساتھی حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔ انہوں نے اپنی جانوں کو اللہ کی راہ میں پیش کر دیا تھا؛ اور اس وقت میں ہجرت کی جب دشمن ہر طرف سے آپ کی تلاش میں تھا۔

نویں بات: اس میں شبہ نہیں کہ غار میں جو فضیلت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو حاصل ہوئی اس میں وہ دیگر صحابہ سے منفرد ہیں۔ کتاب و سنت اور اجماع اس پر دلالت کرتے ہیں۔ جو فضیلت آپ کے لیے ثابت ہے وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہما اور دوسرے صحابہ کرام کے لیے بھی ثابت نہیں۔ پس اس بنا پر آپ ہی امام ہوئے۔ اسی طرح واقعہ ہجرت میں نبی کریم ﷺ کی رفاقت کا شرف بھی صرف حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے حصہ میں آیا۔ لہٰذا حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی خلیفہ برحق تھے۔ یہ وہ سچی دلیل ہے جس میں کوئی شبہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿إِلَّا تَنصُرُوهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللَّهُ إِذْ أَخْرَجَهُ الَّذِينَ كَفَرُوا ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا﴾ (التوبة:٤٠)

''اگر تم اس کی مدد نہیں کرتے تو اللہ نے اس کی مدد کی تھی جب کفار نے ان کو نکال دیا تھا وہ دو اشخاص کا دوسرا تھا۔ جب وہ دونوں غار میں تھے اور اپنے ساتھی سے کہہ رہے تھے کہ غم نہ کر اللہ ہمارے ساتھ ہے۔''

اس طرح کی فضیلت حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے علاوہ کسی دوسرے کے لیے کبھی بھی ہرگز حاصل نہیں ہوسکی۔ بخلاف اپنی جان نثار کرنے کے۔ اس لیے کہ کئی ایک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنی جانوں کے نذرانے پیش کر کے رسول اللہ ﷺ کے لیے جانثاری کا حق ادا کیا تھا۔ ہر مسلمان پر ایسا کرنا واجب ہے۔ یہ صرف اکابر صحابہ کرام کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔

فضیلت خصوصیات کی بنا پر ثابت ہوتی ہے؛ مشترکہ امور کی بنا پر نہیں۔ یہ بات واضح ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے بستر پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کسی نے کوئی تکلیف نہیں دی۔ حالانکہ نبی کریم ﷺ کی حفاظت میں دیگر صحابہ کو جسمانی تکلیفیں پہنچی تھیں۔ کبھی ان کو مارا گیا؛ کبھی زخمی ہوئے؛ اور کئی حضرات قتل کر دیے گئے۔ پس جو اپنی جان پیش کرے اور اسے اذیت بھی دی جائے وہ اس آدمی سے بڑھ کر ہے جو اپنی جان تو پیش کرے؛ مگر اسے کوئی تکلیف نہ پہنچے۔

علماء کرام رحمہم اللہ فرماتے ہیں: '' حضرت علی رضی اللہ عنہ کے جو فضائل صحیح اسناد کے ساتھ ثابت ہیں ؛ وہ دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ مشترک ہیں۔ بخلاف صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے؛ آپ کے فضائل بہت زیادہ ہیں۔ اور ان میں سے اکثر صرف آپ کے ساتھ ہی خاص ہیں' ان میں کوئی دوسرا آپ کا شریک نہیں ہے۔ یہ مسئلہ کافی تفصیل طلب ہے۔

امامت علی رضی اللہ عنہ کی نویں دلیل:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:

''حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امامت کی نویں دلیل آیت مباہلہ ہے؛ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَ اَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَ نِسَآءَكُمْ وَ اَنْفُسَنَا وَ اَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ﴾ [آل عمران ۶۱]

''اس لیے جو شخص آپ کے پاس اس علم کے آ جانے کے بعد بھی آپ سے اس میں جھگڑے تو آپ کہہ دیں کہ آ ؤ ہم تم اپنے اپنے فرزندوں کو اور ہم تم اپنی اپنی عورتوں کو اور ہم تم خاص اپنی اپنی جانوں کو بلا لیں، پھر ہم عاجزی کے ساتھ التجا کریں اور جھوٹوں پر اللہ کی لعنت کریں۔''

جمہور کا قول ہے کہ اس آیت میں ﴿ اَبْنَاءَ نَا ﴾ کا اشارہ حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما کی طرف ہے۔ ﴿ نِسَاءَ نَا ﴾ سے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا مراد ہیں اور ﴿ اَنْفُسَنَا ﴾ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ۔

یہ آیت امامت علی رضی اللہ عنہ کی زبردست دلیل ہے۔ اس لیے کہ آیت زیر دست میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ''نفس رسول'' قرار دیا ہے۔ یہ ایک بدیہی بات ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علی رضی اللہ عنہ ایک تو ہو نہیں سکتے۔ لہٰذا دونوں کی مساوات کا مطلب یہ ہوگا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ آپ کے قائم مقام ہیں۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اگر دوسرا کوئی شخص فضیلت میں ان کا ہم سر ہوتا تو اللہ اس کو بھی ساتھ لے جانے کا حکم صادر کرتے، کیونکہ قبولیت دعا کے لیے ان کی ضرورت تھی جب اہل بیت سب سے افضل ہوئے تو پھر امام بھی وہی ہوں گے۔ یہ آیت اس قدر واضح ہے کہ اس کی دلالت صرف اس شخص پر پوشیدہ رہ سکتی ہے جس پر شیطان نے قبضہ جما رکھا ہو؛ اور اس کے دل کو مکمل طور پر اپنے قبضہ میں کر لیا ہو۔ اور دنیا کو اس کیلئے محبوب بنا دیا گیا ہو؛ وہ اسے اہل حق سے ان کا حق روکے بغیر حاصل نہ کر سکتا ہو۔'' (شیعہ مصنف کا بیان ختم ہوا)۔

جواب: جہاں تک مباہلہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ و فاطمہ رضی اللہ عنہا اور ان کے دونوں بیٹوں کے لے جانے کا تعلق ہے؛ یہ صحیح ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے ایک طویل حدیث میں مروی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی:

﴿ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَ اَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَ نِسَآءَكُمْ وَ اَنْفُسَنَا وَ اَنْفُسَكُمْ﴾ [آل عمران ۶۱]

''آپ فرما دیں: آ ؤ ہم تم اپنے اپنے فرزندوں کو اور ہم تم اپنی اپنی عورتوں کو اور ہم تم خاص اپنی اپنی جانوں کو بلا لیں۔''

تو آپ نے حضرت علی حضرت فاطمہ اور حسن و حسین رضی اللہ عنہم اجمعین کو بلا کر فرمایا: ''یا اللہ! یہ میرے گھر کے لوگ ہیں۔''[1]

مگر اس سے افضلیت اور امامت کیوں کر ثابت ہو گئی؟

[اشکال] : شیعہ کا یہ قول حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ''نفس رسول'' بنا دیا تھا۔ اتحاد محال ہے [یعنی رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علی رضی اللہ عنہ ایک تو ہو نہیں سکتے]۔ اب مساوات باقی رہ گئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عام ولایت حاصل تھی؛ پس آپ کے مساوی کے

[1] صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة۔ باب من فضائل علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ (حدیث: ۳۲/ ۲۴۰۴)۔

لیے بھی ایسے ہی ولایت ہوگی۔''

[جواب]: ہم اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ مساوات کی علاوہ کوئی چیز باقی نہیں بچی۔ اس کی کوئی دلیل موجود نہیں۔ بلکہ اسے مساوات پر محمول کرنا ممتنع ہے، کیوں کہ کوئی بھی شخص رسول ﷺ سے مساوی نہیں ہوسکتا؛ نہ ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ اور نہ ہی کوئی دوسرا۔

علاوہ ازیں ''اَنْفُسَنَا'' کا لفظ لغت میں مساوات کے لیے نہیں بولا جاتا۔ افک کے قصہ میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ لَوْ لَا اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا﴾ (النور: ۱۲)

''اسے سنتے ہی مومن مردوں عورتوں نے اپنے حق میں نیک گمان کیوں نہ کیا۔''

اس سے مومن مردوں اور عورتوں کا مساوی ہونا لازم نہیں آتا۔

نیز فرمایا: ﴿فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ﴾ (البقرۃ: ۵۴)

''اب تم اپنے خالق کی طرف رجوع کرو، اپنے آپ کو آپس میں قتل کرو، تمہاری بہتری اللہ تعالیٰ کے ہاں اسی میں ہے۔''

یعنی آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرو۔ اس سے لازم نہیں آیا کہ یہ تمام لوگ آپس میں مساوی ہوں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ جن لوگوں نے بچھڑے کی پوجا کی تھی وہ ان لوگوں کے مساوی ہیں جنھوں نے اسے نہیں پوجا تھا۔

دوسری جگہ ارشاد فرمایا: ﴿وَ لَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ﴾ (النساء: ۲۹)

''اور اپنے آپ کو قتل نہ کرو۔''

مطلب یہ ہے کہ ایک دوسرے کو قتل نہ کرو۔ اگر چہ وہ برابر نہ بھی ہوں۔ [یہ مراد نہیں کہ وہ سب لوگ مرتبہ میں مساوی تھے۔ بخلاف ازیں ان میں بہت کچھ فرق مراتب پایا جاتا تھا]۔

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ﴾ (الحجرات ۱۱)

''اور آپس میں ایک دوسرے کو عیب نہ لگاؤ''

کوئی آپس میں ایک دوسرے پر طعنہ زنی یا ٹھٹھہ جوئی نہ کریں۔ یہ ممانعت تمام اہل ایمان کے لیے ہے۔ یعنی کوئی بھی کسی دوسرے کے ساتھ اس طرح کی عیب جوئی یا طعنہ زنی نہ کرے؛ حالانکہ تمام اہل ایمان آپس میں مساوی نہیں ہے۔ نہ ہی احکام میں اور نہ ہی فضیلت میں؛ جیسے ظالم اور مظلوم؛ اور امام اور مأموم وغیرہ۔

اسی طرح سے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ﴾ (البقرۃ: ۸۵)

''لیکن پھر بھی تم نے آپس میں ایک دوسرے کو قتل کیا''، یعنی بعض لوگ دوسرے بعض لوگوں کو قتل کرنے لگے۔

جب اس آیت میں یہ لفظ: ﴿وَ اَنْفُسَنَا وَ اَنْفُسَكُمْ﴾ [آل عمران ۶۱] ان دوسری آیات میں وارد لفظ کی طرح تھا؛ جیسا کہ ﴿وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ﴾ (الحجرات ۱۱) ﴿لَوْ لَا اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا﴾ (النور: ۱۲)؛ حالانکہ یہاں پر مساوات واجب ہی نہیں بلکہ ممتنع ہے؛ ایسے ہی شیعہ مصنف کے استدلال میں بھی یہ لفظ مساوات پر دلالت نہیں کرتا۔ بلکہ یہ لفظ مختلف امور کی مشابہت و مماثلت پر دلالت کرتا ہے۔ مماثلت اور مشابہت بعض امور

میں اشتراک کی وجہ سے ہوتی ہے۔جیسا کہ ایمان میں اشتراک ؛ تمام اہل ایمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔اللہ تعالیٰ کے اس فرمان: ﴿ لَوْ لَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا﴾(النور: ۱۲) ؛ میں یہی مراد ہے۔اور ایسے ہی اس آیت میں بھی: ﴿وَلَا تَلْمِزُوْا اَنْفُسَكُمْ﴾ یہی مراد ہے۔

کبھی یہ اشتراک [ظاہر] دین میں پایا جاتا ہے ؛ جب ان میں کوئی منافق بھی موجود ہو۔جیسا کہ اسلام میں منافقین کا مسلمانوں کے ساتھ ظاہری اشتراک ۔اور اگر اس کے ساتھ نسب میں بھی اشتراک ہوتو زیادہ پختہ ہو جاتا ہے۔موسیٰ علیہ السلام کی قوم کو''اپنے نفوس''اسی اعتبار سے کہا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان:

﴿تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَ نَا وَ اَبْنَآءَ كُمْ وَنِسَآءَنَا وَ نِسَآءَ كُمْ وَ اَنْفُسَنَا وَ اَنْفُسَكُمْ ﴾ [آلعمران ۶۱]

''تو آپ فرمادیں آؤ ہم تم اپنے اپنے فرزندوں کواور ہم تم اپنی اپنی عورتوں کواور ہم تم خاص اپنی اپنی جانوں کو بلا لیں۔''

اس سے مراد یہ ہے کہ ہم اپنے مردوں کو بلاتے ہیں اور تم اپنے مردوں کو بلاؤ۔یعنی وہ مرد جو دین اور نسب میں ہماری جنس سے ہیں' اور وہ مرد جو تمہاری جنس سے ہیں۔یا پھر یہاں پر مجانست سے مراد صرف قرابت ہے۔اس لیے کہ آیت میں یوں فرمایا گیا ہے: ﴿اَبْنَآءَ نَا وَ اَبْنَآءَ كُمْ وَنِسَآءَنَا وَ نِسَآءَ كُمْ﴾ [آلعمران ۶۱]

''اپنے اپنے فرزندوں کواور ہم تم اپنی اپنی عورتوں کو۔''

یہاں پر اولاد ؛عورتوں اور مردوں کا ذکر کیا گیا ہے۔اس سے معلوم ہوا کہ قریبی رشتہ داروں کی اولاد عورتیں اور مرد اور اہل عصبہ کی اولاد مراد ہیں ۔یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اولاد میں حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما کو بلایا؛ مستورات میں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو اور مردوں میں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو۔ظاہر ہے کہ عصبات میں سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ترین رشتہ دار حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے، پھر آپ نے ان پر اپنی چادر بھی تان دی تھی۔مباہلہ میں قریبی رشتہ داروں کو شامل کیا جاتا ہے ،دور کے رشتہ داروں کو اگر چہ افضل ہوں تب بھی شامل نہیں کیا جاتا۔کیونکہ اس سے مقصود حاصل نہیں ہوتا۔مراد یہ تھی کہ وہ بھی اپنے اقارب کو بلائیں جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اقارب کو بلایا ہے۔انسانی نفوس قریبی رشتہ داروں پر بڑی شفقت کے پیکر ہوتے ہیں۔ایسی شفقت غیروں کے بارے میں نہیں پائی جاتی۔نصاریٰ جانتے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ اوران کواس بات کا بھی علم تھا کہ اگر انہوں نے مباہلہ کیا تو اس کی ساری مصیبت ان پر ہی گرے گی۔اس وجہ سے انہیں اپنی جانوں کا اوراپنے عزیز و اقارب کا خوف لاحق ہوا۔یہی وجہ تھی کہ وہ لوگ مباہلہ کرنے سے پیچھے ہٹ گئے ۔وگرنہ انسان پر کبھی ایسا بھی موقع آجاتا ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ میں اگر مر بھی جاؤں تو میرا بیٹا زندہ رہے ۔بوڑھی عمر کا انسان مرنے کو بھی گوارا کر لیتا ہے حب اس کے اہل وعیال و اقارب عیش وآرام میں رہ جائیں۔اس کی مثالیں بہت ساری موجود ہیں ۔یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں سے مطالبہ کیا گیا کہ مباہلہ کے لیے اپنے آپ کو اپنے بیٹوں کو؛ اپنی عورتوں کو اور قریبی مرد رشتہ داروں کو لائیں۔

آیت مباہلہ ۱۰ ھ میں وفد نجران کے وارد مدینہ ہونے پر نازل ہوئی تھی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس اس وقت زندہ تھے، باقی چچا سب فوت ہو چکے تھے۔حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو سبقت اسلام حاصل تھی اور نہ آپ کے ساتھ کوئی

اور خصوصیت تھی جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خصوصیت تھی۔ جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زادوں میں بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ جیسا کوئی بھی نہ تھا۔ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ اس سے پہلے سن آٹھ ہجری میں غزوہ موتہ میں شہید ہو چکے تھے۔

ان لوگوں کا متعین ہونا اس وجہ سے تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقارب میں کوئی بھی اور ایسا نہیں تھا جو ان کے قائم مقام ہو سکتا۔ مگر اس سے یہ واجب نہیں ہوتا کہ یہ کسی بھی چیز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مساوی تھے۔ بلکہ اس سے یہ بھی لازم نہیں آتا کہ اس وجہ سے آپ باقی تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سے علی الاطلاق افضل ہوں۔ بلکہ مباہلہ کی وجہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ایک گونہ فضیلت حاصل ہے۔ اور یہ فضیلت بھی حضرت علی؛ حضرت فاطمہ اور حسن و حسین رضی اللہ عنہم کے مابین مشترک ہے۔ یہ امامت [ولایت] کی خصوصیات میں سے نہیں ہے۔ اس لیے کہ امامت کے خصائص عورتوں کے لیے ثابت نہیں ہو سکتے۔ اور اس کا تقاضا یہ بھی نہیں ہے کہ آپ کو مباہلہ کے لیے ساتھ لینے کی وجہ سے آپ باقی تمام صحابہ کرام سے افضل ہو گئے۔ جیسا کہ اس سے یہ بھی واجب نہیں ہوا کہ حضرت فاطمہ اور حسن و حسین رضی اللہ عنہم اجمعین باقی تمام صحابہ سے افضل ہو جائیں۔

[آیت مباہلہ سے استدلال]:

[اشکال]: شیعہ مصنف کا یہ قول کہ: ''اگر کوئی اور شخص اہل بیت کے مساوی ہوتا یا اللہ تعالیٰ کے ہاں دعا کی قبولیت میں ان سے افضل ہوتا: تو آپ اس کو بھی مباہلہ میں شریک کر لیتے۔ اس لیے کہ یہ ضرورت کا وقت تھا۔''

[جواب]: یہاں پر اجابت دعا مقصود نہ تھی۔ ورنہ اکیلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا ہی اس مقصد کے لیے کافی ہوتی۔ اگر ان لوگوں کو ساتھ لینے سے مراد استجابت دعا ہوتی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تمام اہل ایمان کو ساتھ بلا لیتے؛ اور ان کے ساتھ مل کر دعا کرتے۔ جیسا کہ نماز استسقاء کے لیے انہیں ساتھ لیکر دعا فرمایا کرتے تھے۔ اور پھر فقراء مہاجرین سے فتح کی دعا کروایا کرتے تھے اور ارشاد فرمایا کرتے تھے:

''کیا تم مدد کیے جاتے ہو اور روزی دیئے جاتے ہو مگر تمہارے کمزور لوگوں کی وجہ سے؛ ان کی دعاؤں؛ ان کی نمازوں اور ان کے اخلاص کی وجہ سے۔''

یہ بات سب کو پتہ تھی کہ یہ لوگ مستجاب الدعوات ہیں۔ دعاء میں زیادہ کثرت ہونے سے قبولیت کے امکان زیادہ بڑھ جاتے ہیں۔ لیکن یہاں پر مقصود یہ نہیں تھا کہ کسی کو اس کے مستجاب الدعا ہونے کی وجہ سے بلایا گیا ہے۔ بلکہ اہل خانہ اور اہل خانہ کے مقابلہ کے طور پر بلایا گیا تھا۔

ہم اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں کہ اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر و عمر عثمان و علی؛ طلحہ و زبیر؛ ابن مسعود اور ابی بن کعب؛ یا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہم اجمعین اور دیگر کبار صحابہ کو اس مقصد کے لیے طلب کرتے تو یہ سب لوگ تعمیل ارشاد کے لیے حاضر تھے، اور ان حضرات کی دعا بھی اجابت میں زیادہ بلیغ [اثر رساں] ہوتی؛ مگر اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو اپنے ساتھ لے جانے کا حکم نہیں دیا تھا؛ اس لیے آپ نے ایسا نہیں کیا تھا۔ کیوں کہ اس سے مباہلہ کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ نجران کے نصاریٰ اپنے ان اقارب و اعزہ کو مجلس مباہلہ میں لا رہے تھے جن پر فطری طور پر ان کے دل میں شفقت تھی؛ جیسے کہ ان کے بیٹے؛ عورتیں اور اپنے قریب ترین رشتہ دار مرد۔ اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اجنبی لوگوں کو بھی اس

میں آنے کی دعوت دیتے تو نصاریٰ بھی ایسے لوگوں کو اپنے ساتھ شامل کر لیتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ ایسے اجنبی اشخاص کی معیت میں مباہلہ میں شرکت کرنا ان پر کچھ بھی شاق نہ گزرتا جس طرح اقارب کے ہوتے ہوئے ان پر گراں گزر سکتا تھا۔ یہ بات انسان کی فطرت میں داخل ہے کہ اقارب کی تکلیف کا احساس اس سے خائف و ہراساں رکھتا ہے اجانب کا الم و رنج اسے اس قدر پریشان نہیں کرسکتا۔

جب کسی قوم سے مصالحت کرنا مقصود ہوتو ہر فریق دوسرے سے کہتا ہے کہ اپنے بیوی بچے ہمارے یہاں رہن رکھ دو۔ اس کے برخلاف اگر وہ کچھ اجنبی لوگوں کو ان کے پاس گروی رکھ دیں تو وہ اس پر رضا مند نہیں ہوں گے۔ ایسے ہی اگر رسول اللہ ﷺ اجنبی لوگوں کو بلا لاتے تو فریق مخالف اس پر ہرگز راضی نہ ہوتا۔ کسی شخص کے اہل بیت ہونے کا یہ لازم نہیں ہوتا کہ وہ دوسروں کی نسبت افضل ہیں۔

اس سے واضح ہوگیا کہ اس آیت مبارکہ میں اصل میں رافضی کے مطلب کی کوئی دلیل سرے سے موجود ہی نہیں۔لیکن یہ رافضی اور اس کے امثال جن کے دلوں میں کجی پائی جاتی ہے ؛ان نصاری کی طرح ہیں جو کہ مجمل الفاظ کا سہارا لیتے ہیں اور صریح نصوص کو ترک کر دیتے ہیں۔ پھر اپنے اس جھوٹے گمان کی بنیاد پر امت کے بہترین لوگوں میں قدح کرنا ؛ اور ''انفس'' کے لفظ سے مساوات مراد لینا یہ لغت عرب کے بھی خلاف ہے۔

دوسری بات جس سے معاملہ کی مزید وضاحت ہوتی ہے کہ ''نســـاء نـــا '' یعنی ''ہماری عورتیں'' کا لفظ صرف حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ بلکہ اس میں دوسری بیٹیاں بھی اسی منزلت پر ہیں ۔لیکن اس وقت رسول اللہ ﷺ کے پاس صرف حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا موجود تھیں ؛ جب کہ ام کلثوم ؛ زینب اور رقیہ رضی اللہ عنہن پہلے ہی فوت ہوچکی تھیں۔ہم کہتے ہیں کہ اگر نبی کریم کی دوسری بیٹیاں بقید حیات ہوتیں تو آپ ان کو مباہلہ میں ضرور شریک کرتے۔

ایسے ہی ''انفسنا '' کا لفظ بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کیساتھ خاص نہیں ہے۔ بلکہ یہ جمع کا صیغہ ہے؛ جیسا کہ ''نساء نا ''میں جمع کا صیغہ ہے ۔ایسے ہی'' ابناء نا'' بھی جمع کا صیغہ ہے۔ جب کہ آپ نے صرف حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما کو بلایا تھا؛ اس لیے کہ ان کے علاوہ رسول اللہ ﷺ کے پاس اس وقت کوئی ایسا نہیں تھا جسے آپ کا بیٹا کہا جاسکتا ہو۔اگر آپ کا بیٹا ابراہیم اس وقت موجود بھی تھا تو وہ اتنا چھوٹا بچہ تھا کہ اسے بلایا نہیں جاسکتا تھا؛[اگر وہ جانا پہچانا ہوتا تو آپ اسے بھی مجلس مباہلہ میں ضرور لاتے]۔ابراہیم ماریہ قبطیہ سے پیدا ہوا تھا؛ جو مصر کے بادشاہ مقوقس نے آپ کو ہدیہ میں بھیجی تھی ۔اس نے آپ ﷺ کیلئے ایک خچر؛ حضرت ماریہ؛ اور حضرت سیرین ہدیہ بھیجے تھے ۔سیرین آپ نے حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کو دے دی۔ جب ماریہ اپنے لیے رکھ لی ۔ان سے ابراہیم پیدا ہوا؛ جو کہ تقریباً ایک سال کی عمر پا کر وفات پا گیا۔اس پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا تھا:

''اس کے لیے جنت میں ایک دودھ پلانے والی مقرر کی گئی ہے جو اس کی مدت رضاعت پوری کرے گی۔''

مقوقس کی طرف سے یہ ہدیے صلح حدیبیہ؛ بلکہ غزوہ حنین کے بعد آئے تھے۔ ❀

❀ [ان دلائل و براہین کی روشنی میں شیعہ کو چاہیے کہ وہ نصوص صریحہ کو نظر انداز کر کے مجمل الفاظ کا سہارا نہ لیں اور نہ کسی کو رسول کریم ﷺ کا ہم سرو ہم پلہ قرار دیں۔اسی طرح اگر نبی کریم ﷺ کے چچا سید الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ زندہ ہوتے تو وہ بھی مباہلہ میں ضرور شرکت کرتے۔[الدراوی]

امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی دسویں دلیل:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ''امامت علی رضی اللہ عنہ کی دسویں دلیل یہ آیت ہے:

﴿فَتَلَقّٰی اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَیْهِ﴾ (البقرۃ:۳۷)

''آدم علیہ السلام نے اپنے رب سے کچھ کلمات حاصل کیے اور ان کے ذریعہ توبہ کی۔''

فقیہ ابن المغازلی نے اپنی سند کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جب دریافت کیا گیا کہ ان ''کَلِمَاتِ'' سے کیا مراد ہے جو حضرت آدم علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے سیکھے تھے اور ان پر توبہ قبول کی تھی؟ تو آپ نے فرمایا: حضرت آدم علیہ السلام نے بحق محمد و علی و فاطمہ و حسن و حسین رضی اللہ عنہم اپنے گناہ کی بخشش چاہی تھی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کا یہ گناہ معاف کر دیا۔'' پس اس سے معلوم ہوا کہ آپ ہی امام ہوں گے اس لیے کہ آپ اللہ کی بارگاہ میں توسل حاصل کرنے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ برابر ہیں۔'' [شیعہ کا بیان ختم ہوا]۔

[جواب]: اس کا جواب کئی طرح سے دیا جا سکتا ہے:

پہلا جواب: ہم اس روایت کی صحت کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اہل علم کا اتفاق ہے کہ صرف ابن مغازلی کے روایت کر لینے کی بنا پر کسی روایت سے احتجاج کرنا جائز نہیں ہو جاتا۔

دوسرا جواب: اہل علم کا اتفاق ہے کہ یہ روایت موضوع ہے۔ [ہمارا دعوی ہے کہ یہ روایت اللہ و رسول پر بدترین جھوٹ ہے۔ اور روافض اس کی صحت ثابت نہیں کر سکتے]۔ محدث ابن الجوزی رحمہ اللہ اپنی کتاب ''الموضوعات'' میں امام دارقطنی کی سند سے نقل کیا ہے۔ امام دارقطنی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''الأفراد والغرائب'' میں ذکر کیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

یہ روایت بیان کرنے میں عمرو بن ثابت منفرد ہے۔ اس نے اپنے باپ سے نقل کیا ہے؛ وہ ابوالمقدام سے روایت کرتا ہے۔ ابوالمقدام حسین الاشقر یہ روایت بیان کرنے میں منفرد ہے۔

یحی بن معین رحمہ اللہ فرماتے ہیں: عمرو بن ثابت ثقہ اور مأمون نہیں ہے۔

ابن حبان رحمہ اللہ فرماتے ہیں: وہ ثقہ راویوں سے موضوع روایتیں بیان کیا کرتا ہے۔

تیسرا جواب: جو کلمات حضرت آدم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے سیکھے تھے؛ قرآن کریم میں خود اس کی تفسیر مذکور ہے۔ فرمایا:

﴿قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَ اِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَ تَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ﴾ (الاعراف:۲۳)

''دونوں نے کہا اے ہمارے رب! ہم نے اپنا بڑا نقصان کیا اور اگر تو ہماری مغفرت نہ کرے گا اور ہم پر رحم نہ کرے گا تو واقعی ہم نقصان پانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔''

بعض سلف سے یہ بھی روایت کیا گیا ہے؛ اور کچھ اس کے مشابہ تفاسیر بھی ہیں۔ لیکن اس شیعہ نے جو تفسیر وسیلہ کی ذکر کی ہے اس کی کوئی بھی سند ثابت نہیں ہے۔

چوتھا جواب: یہ ایک بدیہی بات ہے کہ توبہ کرنے میں حضرت آدم علیہ السلام کی کوئی تخصیص نہیں بلکہ جب کوئی کافر و فاسق بھی اللہ کے حضور میں توبہ کرے تو اس کی توبہ قبول ہوتی ہے؛ چاہے وہ اللہ کی بارگاہ میں کسی کا وسیلہ دے یا نہ دے۔ تو پھر

حضرت آدم علیہ السلام کو توبہ کرنے میں کسی ایسی چیز کی ضرورت کیونکر ہو سکتی ہے جس کی ضرورت کسی عام گنہگار کو بھی نہ ہو خواہ وہ مسلمان ہو یا کافر؟ ایک جماعت سے روایت کیا گیا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلہ سے اللہ کی بارگاہ میں توبہ کی تھی؛ تو اللہ تعالیٰ نے توبہ قبول کر لی۔ یہ بھی جھوٹ ہے۔ اس بارے میں امام مالک رحمہ اللہ اور منصور کے مابین جو حکایت نقل کی گئی ہے وہ بھی جھوٹ ہے۔ اگرچہ یہ روایت قاضی عیاض رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''الشفاء'' میں نقل کی ہے۔

پانچواں جواب: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کسی کو یہ کلمات پڑھ کر توبہ کرنے کا حکم نہیں دیا۔ بلکہ کسی کو بھی یہ حکم نہیں دیا کہ وہ توبہ کرتے ہوئے یا دعا میں اس طرح کے الفاظ استعمال کرے۔ اور نہ ہی آپ نے اپنی امت کے لیے یہ مشروع کیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو مخلوق میں سے کسی کا واسطہ یا قسم دیکر سوال کریں۔ اگر ایسی دعا مشروع ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کو اس سے ضرور آگاہ فرماتے۔

چھٹا جواب: اللہ تعالیٰ کو ملائکہ یا انبیاء کرام علیہم السلام کی قسم یا وسیلہ دینے کی کوئی بھی دلیل کتاب و سنت میں موجود نہیں ہے۔ بلکہ کئی ایک بڑے علماء کرام رحمہم اللہ جیسے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے فتوی دیا ہے کہ:

''اللہ تعالیٰ کو مخلوق میں سے کسی کی قسم دینا جائز نہیں۔'' ہم اپنے موقع پر اس کی اچھی طرح وضاحت کر چکے ہیں۔

ساتواں جواب: [مان لیجیے کہ] اگر ایسا کرنا مشروع ہی تھا؛ تو حضرت آدم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ نبی ہیں۔ تو پھر آپ اللہ کو کسی ایسے کا وسیلہ کیونکر دیتے آپ خود جس سے افضل ہیں؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت آدم علیہ السلام سے افضل ہیں؛ حضرت آدم علیہ السلام حضرت علی؛ و فاطمہ اور حسن و حسین رضی اللہ عنہم اجمعین سے افضل ہیں۔

آٹھواں جواب: [اگر اس کو ہم تسلیم بھی کر لیں تو پھر بھی] یہ ائمہ کی خصوصیت نہ ہوئی؛ اس لیے کہ یہ فضیلت تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے لیے بھی ثابت ہے۔ جب کہ ائمہ کی خصوصیات عورتوں کے لیے ثابت نہیں ہوتیں۔ اور جو چیز ان کی خصوصیات میں سے نہ ہو؛ اس سے امامت لازم نہیں آتی۔ کیونکہ یہ لازم ہے کہ امامت کی دلیل مدلول کے ساتھ لازم و ملزوم ہو۔ اگر یہ روایت امامت کی دلیل ہو سکتی ہے تو پھر جو بھی اس تعریف کے دائرہ میں آتا ہو وہ امامت کا مستحق ہوگا؛ حالانکہ نص و اجماع کی روشنی میں عورت امامت کی مستحق نہیں ہو سکتی۔

امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی گیارھویں دلیل:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ''امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی گیارہویں دلیل یہ آیت کریمہ ہے:

﴿اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا قَالَ وَ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ﴾ (البقرۃ:۱۲۴)

''بیشک میں آپ کو پیشوا بنانے والا ہوں' فرمایا: اور میری اولاد میں سے۔''

فقیہ ابن المغازلی شافعی حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یہ دعا مجھ پر اور علی پر پہنچ کر ختم ہو گئی، ہم میں سے کسی نے بھی بت کو سجدہ نہیں کیا۔ چنانچہ اللہ نے مجھے نبی اور علی کو وصی بنایا۔'' یہ دلیل اس بات میں نص کی حیثیت رکھتی ہے۔'' [شیعہ کا بیان ختم ہوا]۔

[جواب]: اس کا جواب کئی وجوہ سے دیا جا سکتا ہے:

- پہلی وجہ: ہم اس حدیث کی صحیح سند پیش کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔
- دوسری وجہ: یہ حدیث بالاتفاق اہل علم محدثین جھوٹی ہے۔
- تیسری وجہ: رافضی کا یہ قول کہ: ''یہ دعا ہم تک پہنچ کر ختم ہوگئی'' ایسا کلام ہے جس کو نبی کریم ﷺ کی طرف منسوب کرنا جائز نہیں۔ اس لیے کہ اگر اس سے مراد یہ ہے کہ یہ دعا اس سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے کسی کو نہیں پہنچی تو ایسا کہنا غلط ہے۔ اس لیے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے جتنے بھی انبیاء کرام علیہم السلام گزرے ہیں وہ اس دعا میں داخل ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ نَافِلَةً وَ كُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِيْنَ ☆وَ جَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَ اِقَامَ الصَّلٰوةِ وَ اِيْتَآءَ الزَّكٰوةِ﴾ [الأنبیاء ۷۲۔۷۳]

''اور ہم نے اسے اسحاق ویعقوب اس پر مزید عطا فرمایا اور ہر ایک کو ہم نے صالح بنایا۔ اور ہم نے انہیں پیشوا بنا دیا کہ ہمارے حکم سے لوگوں کی رہبری کریں اور ہم نے ان کی طرف نیک کاموں کے کرنے اور نمازوں کے قائم رکھنے اور زکوٰۃ دینے کی وحی (تلقین) کی۔''

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَ جَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ﴾ [الإسراء ۲]

''ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اور اسے بنی اسرئیل کے لئے ہدایت بنا دیا۔''

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ جَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا وَ كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ﴾ [السجدۃ ۲۴]

''اور جب ان لوگوں نے صبر کیا تو ہم نے ان میں سے ایسے پیشوا بنائے جو ہمارے حکم سے لوگوں کو ہدایت کرتے تھے، اور وہ ہماری آیتوں پر یقین رکھتے تھے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ نُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ وَ نَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّ نَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ☆وَ نُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ﴾ [القصص ۵۔۶]

''پھر ہماری چاہت ہوئی کہ ہم ان پر کرم فرمائیں جنہیں زمین میں بیحد کمزور کر دیا گیا تھا، اور ہم انہیں کو پیشوا اور (زمین) کا وارث بنائیں۔''

قرآن کریم میں کئی ایک نصوص ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ ہم سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں کئی امتیں گزر چکی ہیں۔

اور اگر اس سے مراد یہ ہے کہ یہ دعا ''یہ دعوت ہم پر ختم ہوگئی ہے'' ہمارے بعد کسی کو نہیں پہنچے گی تو اس سے لازم آیا کہ حسن و حسین رضی اللہ عنہما اور ان کے بعد باقی اماموں کی امامت درست نہ ہوگی۔ باقی رہی یہ بات کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بت کو سجدہ

نہیں کیا تو ان کے بعد امت کے سارے لوگوں میں بھی یہ علت موجود ہیں۔

❀ چوتھی وجہ: کسی شخص کا بتوں کو سجدہ نہ کرنا ایسی فضیلت ہے جس میں وہ تمام لوگ شریک ہیں جو اسلام کے بعد پیدا ہوئے ۔حالانکہ سابقین اولین ان لوگوں سے بدر جہا افضل ہیں ۔تو پھر فاضل کو چھوڑ کر مفضول کو یہ درجہ کیوں دیا جارہا ہے؟

❀ پانچویں وجہ: اگر یہ کہا جائے کہ آپ نے بتوں کو اس لیے سجدہ نہیں کیا کہ آپ بلوغ کی عمر کو پہنچنے سے پہلے ہی اسلام لے آئے تھے۔اور اسلام لانے کے بعد آپ نے بتوں کو سجدہ نہ کیا۔تو سب مسلمانوں کا یہی حال ہے۔ بچے غیر مکلف ہوتے ہیں۔اور اگر یہ کہا جائے کہ آپ نے اسلام لانے سے قبل کبھی بھی بت کو سجدہ نہیں کیا۔تو پھر یہ نفی غیر معلوم ہے۔اور نہ ہی اس کی خبر دینے والے کوئی ثقہ آدمی ہے۔

نیز[اس جواب میں] ان[شیعہ] سے یہ بھی کہا جائے گا کہ: ایسا نہیں ہے کہ ہر وہ انسان جس نے کفر نہ کیا ہو' یا کسی کبیرہ گناہ کا ارتکاب نہ کیا ہوتو وہ اس انسان سے مطلقاً افضل ہو جائے گا جس نے کفر یا کبیرہ گناہ کے بعد اس سے توبہ کر لی ہو۔ بلکہ قرآنی دلائل کی روشنی میں بیشتر اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ گناہ یعنی کفر وفسق اور معاصی سے توبہ کرنے والا اس انسان سے افضل ہوتا ہے جس نے کفر یا گناہ کا ارتکاب ہی نہ کیا ہو۔اللہ تعالیٰ نے فتح سے پہلے اسلام لانے والوں ؛ جہاد کرنے والوں اور اس کی راہ میں خرچ کرنے والوں کو ان لوگوں پر بہت بڑی فضیلت دی ہے جنہوں نے فتح کے بعد اسلام قبول کیا اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا ؛ اور اللہ کی راہ میں خرچ کیا۔ یہ تمام لوگ کفر کے بعد اسلام لائے تھے۔اور ان بعد میں اسلام لانے والوں میں ایسے لوگ بھی تھے جن کی پیدائش اسلام پر ہوئی تھی۔

مزید برآں اللہ تعالیٰ نے سابقین اولین کو تابعین پر فضیلت دی ہے ۔ جب کہ تابعین وہ لوگ ہیں جو اکثر اسلام پر پیدا ہوئے اور سابقین اولین میں اکثر وہ لوگ ہیں جو کفر کے بعد اسلام لائے تھے۔[تو کیا جنھوں نے کسی بت کو سجدہ نہیں کیا،تو کیا وہ بھی امام ٹھہریں گے؟ بخلاف ازیں عام صحابہ جو بتوں کے پجاری رہ چکے تھے وہ اپنی اولاد سے بالاتفاق افضل ہیں]۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ حضرت لوط علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام پر ایمان لائے تھے حالانکہ وہ نبوت سے سرفراز تھے۔[ایسے ہی] حضرت شعیب علیہ السلام نے فرمایا تھا:

﴿قَدِ افْتَرَيْنَا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اِنْ عُدْنَا فِيْ مِلَّتِكُمْ بَعْدَ اِذْ نَجّٰنَا اللّٰهُ مِنْهَا وَ مَا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّعُوْدَ فِيْهَآ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّنَا﴾ (الاعراف: ۸۹)

''ہم تو اللہ تعالیٰ پر بڑی جھوٹی تہمت لگانے والے ہو جائیں گے اگر ہم تمہارے دین میں آ جائیں اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ہم کو اس سے نجات دی اور ہم سے ممکن نہیں کہ تمہارے مذہب میں پھر آ جائیں،لیکن ہاں یہ کہ اللہ ہی نے جو ہمارا مالک ہے مقدر کیا ہو۔''

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ اَرْضِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا﴾ [ابرھیم ۱۳]

''کافروں نے اپنے رسولوں سے کہا ہم تمہیں ملک بدر کر دیں گے یا تم پھر سے ہمارے مذہب میں لوٹ آؤ۔''

اللہ تعالیٰ نے ہمیں قرآن میں حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کے سلوک کے متعلق خبر دی ہے۔اور پھران کی توبہ کی خبر بھی دی ہے۔یہی وہ بارہ گروہ تھے جن کے بارے میں ہمیں سورت بقرہ اورآل عمران میں حکم دیا گیا ہے کہ ان پر نازل ہونے والی کتابوں پر ایمان لائیں۔

ان میں سے کوئی ایک بعد میں نبی بھی ہوا ہوگا۔اور یہ بات سب کو معلوم ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام دوسرے لوگوں کی نسبت افضل ہوا کرتے ہیں۔

اس مسئلہ میں رافضہ کا دوسرے لوگوں کے ساتھ اختلاف ہے۔ان کا کہنا ہے کہ جس سے کسی گناہ کا صدور ہوا ہوتو وہ نبی نہیں بن سکتا۔اور جولوگ اسلام لائے ہیں ان کے بارے میں بھی بہت بڑا اختلاف ہوا ہے۔لیکن معتبر وہی چیز ہوگی جس پر کتاب وسنت سے دلائل موجود ہونگے۔جولوگ اس سے منع کرتے ہیں ان کے مذہب کی اساس اس عقیدہ پر ہے کہ گناہ سے توبہ کرنے والا ناقص اور مذموم ہوتا ہےاس لیے وہ نبوت کا مستحق ہرگز نہیں ہوسکتا؛ بھلے وہ لوگوں میں سے سب سے بڑا عبادت گزار بن جائے۔یہی وہ بنیادی مسئلہ جس میں اختلاف واقع ہوا ہے۔کتاب وسنت اور اجماع اس قول کے باطل ہونے پر متفق ہیں۔

امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بارھویں دلیل:

[اشکال] : شیعہ مصنف لکھتا ہے:''حضرت علی رضی اللہ عنہ کے امام ہونے کی بارہویں دلیل یہ آیت ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوْا الصَّالِحَاتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا﴾ (مریم:۹۶)

''بیشک جوایمان لائے ہیں اور جنہوں نے شائستہ اعمال کیے ہیں ان کے لئے اللہ رحمٰن محبت پیدا کردے گا۔''

حافظ ابونعیم الاصفہانی رحمۃ اللہ علیہ اپنی سند سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ یہ آیت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی:'' وُدًّا '' سے وہ الفت ومحبت مراد ہے جو مومنوں کے دلوں میں موجود ہو۔تفسیر ثعلبی حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

''اے علی! آپ کہہ دیں کہ اے اللہ! میرے لیے اپنے پاس عہد مقرر کردے اور مومنوں کے دلوں میں میری محبت پیدا کردے۔'' تب یہ آیت نازل ہوئی:﴿إِنَّ الَّذِينَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوْا الصَّالِحَاتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا﴾

چونکہ یہ خصوصیت کسی اور میں نہیں پائی جاتی۔لہٰذا حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی امام ہوں گے۔''[شیعہ کا بیان ختم ہوا]۔

جواب: اس کا جواب کئی وجوہ سے دیا جاسکتا ہے:

پہلی وجہ: ہم کہتے ہیں بیان کردہ روایت کی صحت نقل ثابت کرنے کے لیے دلیل کی ضرورت ہے،ورنہ مقدمات کو ثابت کیے بغیر استدلال کرنا باطل اورقول بلا برہان ہے۔اور انسان کواس بات کے کہنے سے یا استدلال کرنے سے روکا گیا ہے جس کا اسے کوئی علم نہ ہو۔باتفاق شیعہ واہل سنت مذکورہ بالانسبت روایت کے ثابت ہونے کا فائدہ نہیں دیتی۔

دوسری وجہ: مزید براں شیعہ مصنف کی پیش کردہ دونوں روایتیں باتفاق محدثین واہل علم موضوع ہے۔

تیسری وجہ: نیز یہ کہ آیت زیر نظر:﴿اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ کے الفاظ تمام اہل ایمان کے لیے عام ہیں۔ یہ آیت حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھی شامل ہے اور دیگر صحابہ کو بھی۔ لہٰذا اسے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر محدود و مقصور کرنا درست نہیں۔ بلکہ شیعہ جن کی تعظیم کرتے ہیں یہ آیت ان کو بھی یعنی سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا اور حسن و حسین رضی اللہ عنہما کو بھی شامل ہے۔ لہٰذا اس سے معلوم ہو کہ اہل سنت و شیعہ کا اجماع ہے کہ یہ آیت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ مختص نہیں ہے۔

شیعہ مصنف کا یہ کہنا کہ: ''چونکہ یہ خصوصیت کسی اور میں نہیں پائی جاتی۔''

ایسا کہنا بالکل غلط ہے۔ جیسا کہ ہم اس سے پہلے بھی بیان کر چکے ہیں۔ بیشک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین خیر القرون کے لوگ ہیں۔ ان ادوار میں جو لوگ ایمان لائے اور نیک اعمال کیے وہ باقی تمام زمانوں میں ایمان لانے والوں سے افضل ہیں۔ اور وہ اس اعتبار سے ہر دور کے لوگوں سے اکثر و افضل ہیں۔

چوتھی وجہ: اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ بیشک جو لوگ ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے شائستہ اعمال کیے ہیں ان کے لئے اللہ رحمٰن محبت پیدا کر دے گا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا سچا وعدہ ہے۔ [اللہ تعالیٰ چونکہ اپنے وعدہ کی خلاف ورزی نہیں کرتا اس لیے اس نے قلوب مومنین میں محبت پیدا کرنے کے وعدہ کو پورا کر دیا ہے] چنانچہ اللہ تعالیٰ نے سب مسلمانوں کے دلوں میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین عموماً اور خلفاء راشدین کی محبت اور ان میں سے حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی محبت و الفت بطور خاص پیدا کر دی۔ عام صحابہ...... جن میں حضرت علی رضی اللہ عنہ پیش پیش تھے...... اور تابعین حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ سے محبت و الفت رکھتے تھے۔ یہ خیر القرون کے لوگ تھے۔ [کوئی صحابی ایسا نہ تھا جو ان دونوں حضرات کو برا بھلا کہتا ہو]۔

یہ خصوصیت حضرت علی رضی اللہ عنہ میں نہیں پائی جاتی؛ اس لیے کہ صحابہ کی ایک جماعت حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نالاں اور شاکی رہتی اور انہوں نے حضرت کی شان میں سخت وسست الفاظ کہے تھے اور آپ سے برسرپیکار رہتے تھے ❶۔ جبکہ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما سے بغض رکھنے والے اور ان پر سبّ و شتم کرنے والے صرف رافضہ، نصیریہ اور غالیہ اسماعیلیہ ہیں اور یہ بات بھی

---

❶ یہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مابین اس چپقلش کا ذکر ہو رہا ہے جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد ان مخصوص حالات کی وجہ سے پیدا ہو گئی تھی۔ ورنہ حاشا وکلا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین حضرت علی سے لڑتے بھڑتے یا گالیاں دیتے ہوں۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت و رفاقت کے لیے بہترین لوگوں کا انتخاب کیا تھا۔ اور انہیں اللہ تعالیٰ نے باہم شیر و شکر کر دیا تھا۔ جیسا کہ خود اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَ اذْکُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَیْکُمْ اِذْ کُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِکُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا﴾ [آل عمران ۱۰۳]

''اللہ کے اس احسان کو یاد رکھو جو اس نے تم پر کیا ہے۔ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، اس نے تمہارے دل جوڑ دیے اور اس کے فضل و کرم سے تم بھائی بھائی بن گئے۔''

اور سورت فتح کی آخری آیت میں اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام کے آپس میں شیر و شکر ہونے پر تعریف کی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان کے مابین جو کچھ واقعات پیش آئے اصل میں وہ ان بلوائیوں کی سازش کا نتیجہ تھے جنہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کیا تھا۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود صحابہ کرام بشر تھے؛ اور ان سے نفوس بشری کی تحت ہونے والی کوتاہیوں کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اس کے باوجود ہم یقین رکھتے ہیں کہ حضرات صحابہ کرام کے آپس میں سخت و درشت کلام اور باہمی جھگڑوں کو بھی ایک دوسرے کے گناہوں کا کفارہ بنا دیں گے اور یہ سب لوگ یقیناً جنتی ہیں۔ ایسے واقعات کی وجہ سے کسی بھی صحابی کی شان میں تنقیص کرنا اور دوسرے کی محبت میں غلو کرنا مسلمان کو زیب نہیں دیتا۔ [دراوی؛ کشمیری]

معلوم شدہ ہے کہ جولوگ ان دو حضرات سے محبت رکھتے تھے وہ بغض رکھنے والوں کی نسبت سے افضل اور تعداد میں اکثر تھے۔ جولوگ ان سے بغض رکھتے تھے وہ اسلام سے بہت زیادہ دور اور تعداد میں بہت ہی کم تھے۔ بخلاف حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ؛ جنہوں نے آپ سے جنگ کی اور آپ سے ناراض ہو گئے تھے ؛ وہ حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما سے بغض رکھنے والوں کی نسبت بہت ہی افضل تھے۔ بلکہ وہ شیعان عثمان رضی اللہ عنہ جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بغض رکھتے ہیں اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے محبت کرتے ہیں وہ بھی ظالم اور بدعتی ہونے کے باوجود ان سے افضل ہیں۔

پس وہ شیعان علی رضی اللہ عنہ جو حضرت سے محبت رکھتے ہیں' اور جناب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے بغض رکھتے ہیں ؛ وہ علم و دین میں کم تر اور ظلم و جہالت میں بڑھے ہوئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اہل ایمان کے دل میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین کی جو محبت پیدا کر دی تھی۔ دوسروں کو یہ مرتبہ حاصل نہیں ہو سکا۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ: ''حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے رب اور نبی ہونے کا دعوی بھی کیا گیا ہے۔''

تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ کو تمام خوارج کافر کہتے ہیں ؛ مروانیہ آپ سے بغض رکھتے ہیں ؛ حالانکہ یہ لوگ ان رافضیوں سے بہت بہتر و افضل ہیں جو حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما سے بغض رکھتے ہیں' اور انہیں گالیاں دیتے ہیں ؛ غالیہ کی تو کوئی بات ہی نہیں۔ [جس طرح خوارج کے کافر کہنے سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ایمان میں فرق نہیں پڑتا ؛ ایسے ہی غالیہ اور اسماعیلیہ کے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو رب یا نبی ماننے سے بھی آپ کی صحابیت اور بشریت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔]

امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تیرھویں دلیل:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:

''امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تیرھویں دلیل یہ آیت ہے: ﴿ اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّ لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ﴾ (الرعد:۷)

''بات یہ ہے کہ آپ تو صرف آگاہ کرنے والے ہیں اور ہر قوم کے لئے ہادی ہے۔''

''کتاب الفردوس میں حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: ''میں منذر [ڈرانے والا] ہوں اور علی ہاد (رہنما و پیشوا) ہے۔ اے علی! ہدایت پانے والے تجھ سے ہدایت پاتے ہیں۔'' ابونعیم نے بھی اسی طرح روایت کیا ہے یہ حدیث حضرت علی رضی اللہ عنہ کے امام اور خلیفہ ہونے کی صریح دلیل ہے۔ [انتہی کلام الرافضی]۔

جواب: اس کا جواب کئی پہلوؤں سے دیا جا سکتا ہے:

پہلی بات: شیعہ نے اس روایت کے صحیح ہونے کی کوئی دلیل پیش نہیں کی ؛ لہٰذا اس سے احتجاج جائز نہیں۔ دیلمی کی کتاب الفردوس موضوعات کا پلندہ ہے۔ اس بات پر علماء کا اجماع ہے کہ کسی روایت کے کسی کتاب میں مندرج ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ صحیح بھی ہے۔ ایسے ہی ابونعیم کا کسی روایت کو نقل کر لینا اس کے صحیح ہونے پر دلالت نہیں کرتا۔

دوسری بات: باتفاق محدثین و اہل علم یہ روایت جھوٹی اور من گھڑت ہے۔ اس کی جھٹلانا اور رد کرنا واجب ہے۔

تیسری بات: یہ ان قبیح ترین روایات میں سے ہے جن کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنا بھی جائز نہیں۔

اس روایت میں یہ قول کہ: آپ نے فرمایا: ''میں منذر [ڈرانے والا] ہوں اور علی ہاد (رہنما و پیشوا) ہے۔ اے علی!

ہدایت پانے والے تجھ سے ہدایت پاتے ہیں۔'' حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ہادی قرار دینے کا مطلب یہ ہے کہ لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بجائے ان سے ہدایت پاتے ہیں۔ یہ ایسی بات ہے کہ کوئی مسلمان اسے زبان پر لانے کے لیے تیار نہیں۔ اس روایت کے ظاہر سے لگتا ہے کہ ڈرانے کا اور ہدایت دینے کا کام ان دونوں حضرات کے مابین تقسیم کر دیا گیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صرف ڈرانے والے ہیں؛ ان سے ہدایت نہیں مل سکتی۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ہدایت ملتی ہے۔ ایسی بات کوئی بھی مسلمان اپنی زبان سے نہیں کہہ سکتا۔

چوتھی وجہ: اللہ تعالیٰ نے نص قرآنی کی بنا پر صرف سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو ہادی بنا کر بھیجا تھا۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿وَ اِنَّكَ لَتَهْدِيْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ☆ صِرَاطِ اللّٰهِ﴾ (الشوریٰ: ۵۲)

''بلاشبہ آپ سیدھی راہ کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ جو کہ اللہ کی راہ ہے۔''

پھر جس کی یہ صفت اللہ نے بیان کی ہو؛ اسے چھوڑ کر کسی ایسے کو ہادی کیوں مانا جا سکتا ہے جس میں یہ وصف موجود نہ ہو؟

پانچویں وجہ: شیعہ کا قول کہ ''ہدایت یافتہ لوگ آپ (حضرت علی) سے راہ پاتے ہیں۔'' اس کا مطلب یہ ہے کہ امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں سے جس مسلمان نے بھی ہدایت پائی اس نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ذریعہ ہی پائی۔ یہ واضح جھوٹ ہے اس لیے کہ لاتعداد لوگ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے ہدایت پا کر جنت کے وارث بنے؛ اور انھوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایک لفظ تک نہیں سنا۔ اکثر لوگ جو ایمان لائے تھے ان میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا کچھ بھی کردار نہیں۔ جب بیرونی بلاد و امصار فتح ہوئے تو وہاں کے لوگوں نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے ہاتھوں پر اسلام قبول کیا اور ان سے فیض ہدایت حاصل کیا۔ [انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی صورت تک بھی نہیں دیکھی؛ اس لیے کہ آپ ان دنوں مدینہ میں بود و باش رکھتے تھے]۔ جمہور اہل اسلام نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کچھ بھی نہیں سنا؛ تو پھر شیعہ کا دعویٰ کیوں کر درست ہو سکتا ہے کہ ہدایت پانے والے آپ سے پاتے ہیں؟

چھٹی وجہ: یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ قول: ''بیشک آپ ڈرانے والے ہیں؛ اور ہر قوم کو ہدایت دینے والا ہوتا ہے'' اس سے مراد اللہ تعالیٰ ہیں۔ یہ قول انتہائی ضعیف ہے۔ اور ایسے ہی جن لوگوں نے یہ تفسیر کی ہے: آپ ڈرانے والے ہیں اور ہر قوم کو ہدایت دینے والے ہیں۔ یہ بھی ضعیف قول ہے۔ اس کا صحیح معنی یہ ہے کہ: بیشک آپ ڈرانے والے ہیں؛ جیسا کہ آپ سے پہلے ڈرانے والے بھیجے گئے تھے۔ اور ہر امت میں ڈرانے والا ہوتا ہے جو انہیں ہدایت کی راہ دکھاتا ہے؛ یعنی خیر کی طرف بلاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ اِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ ☆﴾ [فاطر ۲۴]۔

''اور کوئی امت ایسی نہیں ہوئی جس میں کوئی ڈر سنانے والا نہ گزرا ہو۔''

مفسرین کرام رحمہم اللہ کی ایک جماعت جیسے حضرت قتادہ؛ عکرمہ؛ ابوالضحیٰ؛ اور عبدالرحمن بن زید کا یہی قول ہے۔

نیز یہ کہ اس آیت کی تفسیر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کرنا؛ محض باطل ہے۔ اس لیے کہ ارشاد ربانی ہے: ﴿ وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ﴾ [جملہ اقوام عالم کے بارے میں فرمایا گیا ہے] اس کا تقاضا ہے کہ ان لوگوں کا کوئی ہادی ہو؛ بعد میں آنے والوں کے لیے کوئی ہادی ہو۔ یعنی متعدد لوگ ہدایت کی راہ دکھانے والے ہوں۔ تو پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اوّلین و آخرین سب کے لیے ہادی کیسے

بنایا جاسکتا ہے؟

ساتویں وجہ: یہ امر بھی قابل غور ہے کہ کسی سے ہدایت حاصل کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ وہ امام وخلیفہ بھی ہو۔ جیسا کہ علماء کرام سے ہدایت حاصل کی جاتی ہے۔ جیسا کہ حدیث میں آتا ہے:

((أصحابي كالنجوم فبأيهم اقتديتم اهتديتم)) [رواه ابن عبد البر و الآجري في الشريعة؛ وهو ضعيف]

''میرے صحابہ کرام ستاروں کی مانند ہیں؛ ان میں جس کی بھی اقتداء کرو گے؛ تم ہدایت پالو گے۔''

اس میں کہیں بھی امامت کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ لہٰذا شیعہ مصنف کا یہ دعویٰ باطل ہے۔

آٹھویں وجہ: ارشاد ربانی: ﴿ وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ﴾ میں لفظ ''هَادٍ'' نکرہ لایا گیا ہے۔ یہ کسی متعین شخص پر دلالت نہیں کرتا۔ پس اس آیت سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امامت کے اثبات کا دعوی کرنا باطل ٹھہرا۔ اور حدیث سے استدلال کرنا قرآن سے استدلال کی طرح نہیں ہے۔ حالانکہ اس ضمن میں پیش کی جانے والی احادیث بھی باطل ہیں۔

نویں وجہ: ارشاد ربانی: ﴿ وَلِكُلِّ قَوْمٍ ﴾ میں عموم کا صیغہ ہے۔ اگر اس مراد یہ لی جائے کہ تمام لوگوں کیلئے صرف ایک ہی ہدایت کی راہ دکھانے والا ہے تو سارے لوگ ہادی ہوئے۔ اور یہ نہ کہا جاتا کہ ہر قوم کے لیے ہادی ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اقوام [زمانہ وجگہ کے اعتبار سے] مختلف ہوتی ہیں۔ اور یہ بھی نہیں کہا گیا کہ تمام اقوام کے لیے ہادی ہیں۔ اور ایسا کہا بھی نہیں جاسکتا۔ بلکہ لفظ ''کل'' کو نکرہ کی طرف مضاف کیا ہے؛ معرفہ کی طرف نہیں کیا۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے:

''تمام لوگ جانتے ہیں کہ وہاں پر کچھ اقوام ہیں؛ اور اقوام متعدد ہوتی ہیں۔ اور ہر ایک قوم کو کوئی ایسا راہ دکھانے والا ہوتا ہے جو کہ دوسری قوم میں نہیں پایا جاتا۔''

اس سے ان لوگوں کا قول باطل ہوگیا جو کہتے ہیں کہ ہادی سے مراد اللہ تعالیٰ ہیں۔ اور ایسے ہی ان لوگوں کے قول کا باطل ہونا بھی صاف ظاہر ہے کہ اس سے مراد حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔

امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی چودھویں دلیل:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ''امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی چودھویں دلیل یہ آیت ہے:

﴿ وَقِفُوْهُمْ اِنَّهُمْ مَسْئُوْلُوْنَ ﴾ (الصافات: ٢٤)

''انہیں ٹھہراؤ؛ بیشک ان سے سوال کیا جائے گا۔''

ابونعیم بطریق شعبی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کرکے اس آیت: ﴿ وَقِفُوْهُمْ اِنَّهُمْ مَسْئُوْلُوْنَ ﴾ کا یہ معنی بیان کرتے ہیں کہ: ''لوگوں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ولایت وامارت کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔''

اسی طرح کتاب الفردوس میں حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ: ''بروز قیامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔''

جب آپ کی ولایت کے بارے میں سوال کیا جانا ہے تو اس سے واجب ہوتا ہے کہ آپ کی ولایت وامامت حقیقت

میں بھی ثابت ہو۔ یہ فضیلت آپ کے علاوہ کسی دوسرے صحابی کے لیے ثابت نہیں ہے۔ تو معلوم ہوا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی امام ہوں گے۔'' [شیعہ کا بیان ختم ہوا]

جواب: اس کا جواب کئی پہلوؤں سے دیا جا سکتا ہے:

پہلی بات: ہم اس روایت کی صحیح سند پیش کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ محض دیلمی یا ابونعیم کی طرف منسوب کر لینے سے روایت قابل حجت نہیں ہو جاتی۔ اس بات پر علماء کا اجماع ہے۔

دوسری بات: اس روایت کے من گھڑت اور جھوٹ ہونے پر علماء کرام کا اتفاق ہے۔

تیسری بات: شیعہ کا یہ جھوٹ آیت ہذا کے سیاق سے معلوم ہو جاتا ہے؛ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿احْشُرُوا الَّذِينَ ظَلَمُوا وَأَزْوَاجَهُمْ وَمَا كَانُوا يَعْبُدُونَ ۞ مِن دُونِ اللَّهِ فَاهْدُوهُمْ إِلَىٰ صِرَاطِ الْجَحِيمِ ۞ وَقِفُوهُمْ إِنَّهُم مَّسْئُولُونَ ۞ مَا لَكُمْ لَا تَنَاصَرُونَ ۞ بَلْ هُمُ الْيَوْمَ مُسْتَسْلِمُونَ﴾

''اکٹھا کرو ان لوگوں کو جنھوں نے ظلم کیا اور ان کے جوڑوں کو اور جن کی وہ عبادت کیا کرتے تھے اللہ کے سوا۔ پھر انھیں جہنم کی راہ کی طرف لے چلو۔ اور انھیں ٹھہراؤ، بے شک یہ سوال کیے جانے والے ہیں۔ تمھیں کیا ہوا، تم ایک دوسرے کی مدد نہیں کرتے؟ بلکہ آج وہ بالکل فرماں بردار ہیں۔'' [الصافات ۲۲۔۲۶]

اس آیت کریمہ میں خطاب کفار قریش سے متعلق ہے جو کہ آخرت کے دن کو جھٹلاتے تھے۔ ان سے اللہ تعالیٰ کی توحید اور رسولوں پر اور آخرت کے دن پر ایمان کے بارے میں دریافت کیا جائے گا۔ اس میں ان سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت کے بارے میں سوال کرنے کا کیا مطلب ہے؟ کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ اگر وہ مشرک اور کافر ہوتے ہوئے بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے محبت رکھیں گے تو انھیں اس کا کوئی فائدہ پہنچے گا؟۔ یا پھر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ اس سے مراد حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بغض ہے؛ تو اس بغض کو حضرات انبیاء کرام علیہم السلام سے بغض اور کتاب اللہ اور دین الٰہی سے بغض کے ساتھ کیا نسبت ہے؟ اللہ کی پناہ! کہ کتاب الٰہی کو ایسے غلط معنی پہنائے جائیں۔ کوئی یہ کہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تفسیر کی ہے؛ ایسی بات تو صرف کوئی زندیق اور ملحد ہی کہہ سکتا ہے جس نے دین کو کھلواڑ بنالیا ہو اور وہ اسلام پر طعنہ زنی کرنا چاہتا ہو۔ یا پھر وہ انسان جو انتہائی سخت جہالت کا شکار ہو۔ اور اسے یہ بھی پتہ نہ ہو کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ اور پھر یہ بات بھی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دیگر حضرات صحابہ طلحہ و زبیر؛ سعد و ابوبکر؛ عمر و عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین کی محبت کے مابین آخر ایسا کون سا فرق پایا جاتا ہے۔

اگر کوئی کہنے والا یہ کہے کہ: اس سے مراد یہ ہے کہ لوگوں سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی محبت کے بارے میں سوال کیا جائے گا تو اس کا یہ قول ان لوگوں کے قول کی نسبت زیادہ غلط نہیں ہوگا جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت کے بارے میں سوال کیے جانے کے دعویدار ہیں۔ نیز آیت میں بھی کوئی ایسی دلیل نہیں ہے جس کی روشنی میں ان لوگوں کے قول کا راجح ہونا ظاہر ہو۔ بلکہ [اس تفسیر کی روشنی میں] یہ آیت ان دونوں حضرات کے محبت کے ثبوت یا نفی پر برابر دلالت کرتی ہے۔ جب کہ حضرت

ابو بکر رضی اللہ عنہ سے محبت واجب ہونے کے دلائل زیادہ قوی ہیں۔

چوتھی بات: [آیت کریمہ میں وارد لفظ] ''مسؤلون'' مطلق ہے؛ اس کی ضمیر کا صلہ کسی بھی چیز کیساتھ مختص نہیں۔ اور اس کے سیاق میں بھی کوئی ایسی چیز نہیں پائی جاتی جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت پر دلالت کرتی ہو۔ پس اس آیت کو لے کر مدعی کا دعوی کرنا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت کے بارے میں سوال کیا جائے گا یہ بہت بڑا جھوٹ و بہتان اور باطل کلام ہے۔

پانچویں بات: اگر کوئی یہ دعوی کرے کہ لوگوں سے ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کی محبت کے بارے میں سوال کیا جائے گا؛ تو اس کا دعوی کسی طرح بھی باطل نہیں کیا جا سکتا؛ مگر اس کے ساتھ ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت کے سوال کا دعوی بھی فی الفور ہی پوری قوت کے ساتھ باطل ہو جائے گا۔

امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی پندرھویں دلیل:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ''امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی پندرھویں دلیل یہ آیت ہے:

﴿وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِيْ لَحْنِ الْقَوْلِ﴾ (محمد: ۳۰)

''اور یقیناً تو انہیں ان کی بات کے ڈھب سے پہچان لے گا۔''

ابو نعیم اپنی سند سے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان: ﴿وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِيْ لَحْنِ الْقَوْلِ﴾ سے بغض علی مراد ہے۔ یہ خصوصیت دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم میں نہیں پائی جاتی۔ لہٰذا حضرت علی رضی اللہ عنہ اس وجہ سے ان سے افضل ٹھہرے؛ تو پھر آپ ہی امام ہوں گے۔'' [شیعہ کا بیان ختم ہوا]۔

جواب: پہلی بات: ہم اس روایت کی صحیح سند پیش کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔

دوسری بات: ہم کہتے ہیں کہ اہل علم محدثین جانتے ہیں کہ یہ حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ پر افتراء ہے۔

تیسری بات: اگر یہ بات ثابت بھی ہو جائے کہ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے یہ فرمایا تھا؛ تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے صرف کسی ایک صحابی کا قول؛ جب کہ باقی صحابہ اس کی مخالفت کر رہے ہوں تو حجت نہیں ہو سکتا۔ اس پر اہل علم کا اتفاق ہے۔ حالانکہ بہت سارے صحابہ کرام کے متعلق یہ بھی معلوم ہے کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر تنقید کیا کرتے تھے۔ ان پر بھی حجت صرف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی ایک کے قول سے قائم نہیں ہو سکتی بلکہ کتاب و سنت سے ہوتی ہے۔

چوتھی بات: ہم یقینی طور پر جانتے ہیں کہ عام منافقین حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عداوت میں مبتلا نہ تھے۔ پھر اس آیت کی ان الفاظ میں تفسیر کرنا ایک کھلا ہوا جھوٹ ہے۔

پانچویں بات: پھر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کفر کی دشمنی میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ فاروق سے زیادہ نہ تھے۔ بلکہ کفار و منافقین حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے شدید عداوت رکھتے تھے۔ اور جتنی تکلیف حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کافروں کو پہنچتی تھی ایسی تکلیف کسی دوسرے سے نہیں پہنچتی تھی۔ بلکہ ہمیں کسی ایک کے بارے میں یہ معلوم نہیں ہو سکا جس سے کفار اتنی

تکلیف پاتے ہوں اور اس سے بغض رکھتے ہوں۔

چھٹی بات: صحیح حدیث میں ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''منافق کی علامت انصار سے بغض ہے اور ایمان کی علامت انصار سے محبت ہے۔''❶

اور ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ:

''ایسا آدمی انصار سے بغض نہیں رکھے گا جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو۔''❷

منافقین کو انصار کے بغض کی وجہ سے اپنے کلام میں کجی کی بنا پر پہچان لیے جانے کی تفسیر زیادہ اولی ہوسکتی ہے۔

اس باب میں سب سے صحیح روایت حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ سے عہد کیا تھا کہ مجھ سے مومن ہی محبت کرے گا اور مجھ سے بغض منافق ہی رکھے گا۔'' [صحیح مسلم:ج ۱:ح ۲٤۲]

یہ حدیث روایت کرنے میں امام مسلم رحمہ اللہ منفرد ہیں؛ آپ نے یہ روایت عدی بن ثابت سے نقل کی ہے؛ وہ زر بن حبیش سے وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس حدیث سے اعراض کیا ہے۔ بخلاف انصار کے فضائل کی احادیث کے۔ ان احادیث پر تمام اہل صحاح کا اتفاق ہے۔ اور اہل علم جانتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یقینی طور پر یہ ارشاد فرمایا ہے؛ کیونکہ بعض لوگوں کو ان روایات میں شک گزرا ہے۔

ساتویں بات: نفاق کی بہت سی علامات ہیں۔ جیسا کہ صحیحین میں ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''منافق کی تین نشانیاں ہیں جب گفتگو کرے تو جھوٹ بولے جب امانت دی جائے تو اس میں خیانت کرے اور جب وعدہ کرے تو اس کے خلاف کرے۔'' [صحیح بخاری:ج ۱:ح ۲۵۲۳]

یہ نشانیاں صاف ظاہر ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ منافقت کی نشانیاں کسی شخص یا کسی گروہ کی محبت و نفرت کے ساتھ خاص نہیں ہیں۔ اگرچہ یہ بھی ان نشانیوں میں سے ہی ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ جو شخص حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اللہ کی رضا کی خاطر محبت کرتا ہو؛ وہ اللہ تعالیٰ کی محبت کا مستحق ٹھہرتا ہے؛ اور یہ محبت اس کے ایمان کی نشانی ہے۔ یا جو انسان نصرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بنا پر انصار کو چاہتا ہے تو یہ اس کے ایمان کی علامات ہے۔ بخلاف ازیں جو شخص حضرت علی رضی اللہ عنہ و انصار کو انہی اوصاف [یعنی اللہ اور اس کے رسول پر ایمان اور جہاد فی سبیل اللہ] اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید و نصرت کے جرم میں نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے وہ منافق ہے۔

علاوہ ازیں جو شخص کسی طبعی امر مثلاً رشتہ داری یا کسی دنیوی امر کی بنا پر ان سے محبت رکھتا ہے تو یہ اسی قسم کی محبت ہے جیسے ابوطالب کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھی۔ ایسی محبت اللہ کے ہاں کچھ بھی کام نہ آئے گی۔ اور ایسے ہی جو شخص انصار؛ یا حضرت

❶ صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار۔ باب حب الانصار، من الایمان، (حدیث: ۳۷۸۳، ۳۷۸٤)، صحیح مسلم۔ کتاب الإیمان۔ باب الدلیل علی ان حب الانصار......'' (حدیث:۷٤، ۷۵)۔

❷ صحیح مسلم، کتاب الإیمان باب الدلیل علی ان حب الانصار و علی رضی اللہ عنہم... (حدیث:۷۸)۔

مسیح علیہ السلام یا حضرت موسیٰ علیہ السلام و علی رضی اللہ عنہ یا کسی بھی نبی کے بارے میں غلو سے کام لیتے ہوئے محبت کرتا؛ اوران کے بارے میں ان کے مرتبہ سے بالاتر اعتقاد رکھتا ہے؛[اوران کے بارے میں مبالغہ آمیزی کرنے والے کو بنظر استحسان دیکھتا ہے تو یہ شخص مبالغہ آمیزی وغلو کا ارتکاب کرتا ہے]حقیقت میں یہ کوئی محبت نہیں کررہا۔اس لیے کہ اس کی محبت ایسی چیزوں سے ہے جن کا کوئی وجود ہی نہیں۔ جس طرح حضرت مسیح علیہ السلام کی شان میں نصاریٰ نے مبالغہ آمیزی سے کام لیا تھا۔حالانکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام حضرت علی رضی اللہ عنہ سے افضل تھے۔تاہم یہ محبت نصاریٰ کے لیے مفید ثابت نہ ہوئی۔محبت وہی سودمند ہے جو اللہ کے لیے ہو، نہ کہ وہ جس میں کسی کو اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرایا جائے۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ﴾

''بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو اللہ کے شریک اوروں کو ٹھہرا کر ان سے ایسی محبت رکھتے ہیں، جیسی محبت اللہ سے ہونی چاہیے اور ایمان والے اللہ کی محبت میں بہت سخت ہوتے ہیں۔''[البقرة ١٦٥]

منافقت کی نشانیاں اور اسباب رافضیوں سے بڑھ کر امت کے کسی بھی گروہ میں نہیں پائی جاتی۔ یہاں تک کہ ان میں ایسا غلیظ اور کھلا ہوا نفاق پایا جاتا ہے کہ کسی بھی دوسرے میں اس قسم کا نفاق نہیں پایا جاتا۔ان کے دین کا شعار ہی ''تقیہ'' ہے یعنی اپنی زبان سے وہ بات کہنا جو دل میں نہیں ہے؛ اصل میں یہ منافقت کی بڑی نشانی ہے۔

یہاں پر مقصود یہ ہے کہ یہ کہنا بالکل محال ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بغض کے علاوہ منافقت کی کوئی نشانی نہیں۔صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین میں سے کسی ایک نے بھی ایسی کوئی بات نہیں کہی۔لیکن اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ آپ سے بغض رکھنا نفاق کی منجملہ نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔جیسا کہ صحیح حدیث میں ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا:'' مجھ سے بغض منافق ہی رکھے گا۔'' یہ اس کی ایک توجیہ ہوسکتی ہے۔اس لیے کہ جس انسان کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمات جلیلہ اور آپ کے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر ایمان اور جہاد فی سبیل اللہ کا علم ہو؛ اور پھر وہ آپ سے دشمنی رکھے؛ ایسا انسان یقیناً منافق ہے۔

ایسے نفاق کی نشانیوں میں سے انصار رضی اللہ عنہم اجمعین کے ساتھ بغض رکھنا بھی ہے۔انصار بہت بڑا عظیم قبیلہ تھا؛ اور مدینہ ان کا شہر تھا۔ یہی انصار وہ لوگ تھے جو ایمان لائے ؛ مہاجرین کو پناہ دی؛ ان کے پاس ہجرت کرکے آنے سے اسلام و ایمان کو عزت نصیب ہوئی۔اہل ایمان کو غلبہ حاصل ہوا۔اورانہیں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت و اکرام کا وہ اعزاز حاصل ہوا جو کسی دوسرے شہر والے کو اور نہ ہی اس قبیلہ کے علاوہ کسی دوسرے قبیلہ کو نصیب ہوسکا۔پس ان سے منافق کے علاوہ کوئی انسان بغض رکھ ہی نہیں سکتا۔لیکن اس قدر و منزلت کے باوجود یہ لوگ مہاجرین سے افضل نہیں ہیں؛ مہاجرین کو اللہ تعالیٰ نے ان پر فضیلت سے نوازا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ کسی انسان سے بغض کے منافقت کی نشانی ہونے سے یہ لازم نہیں آجاتا کہ وہ دوسرے تمام لوگوں سے افضل ہے۔اور جو کوئی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے احوال اور سوانح جانتا ہے اسے علم ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر کفار اور منافقین کے دشمن تھے۔اور آپ اسلام کی عزت افزائی؛ نصرت اور کفار کی رسوائی و ذلت پر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر اثر انداز ہوئے تھے۔اور اللہ اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن کفار و منافقین حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر حضرت

عمر رضی اللہ عنہ سے دشمنی رکھتے تھے۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے والا وہ انسان تھا جو اسلام؛ رسول اللہ ﷺ اور آپ کی امت سے بغض رکھتا تھا۔ اللہ اور اس کے رسول سے اور دین اسلام سے بغض رکھنے کی وجہ سے اس قاتل نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو قتل کیا۔ جب کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے والا نمازی؛ روزہ دار؛ اور قرآن کی تلاوت کرنے والا انسان تھا؛ اور وہ آپ کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت کی وجہ سے قتل کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی تئیں اسی محبت کی وجہ سے اس نے آپ کو قتل بھی کیا۔ حالانکہ وہ اپنے اس اعتقاد میں گمراہ اور بدعت پر تھا۔

مقصود یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بغض رکھنے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بغض رکھنے کی نسبت زیادہ کھلا ہوا نفاق پایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رافضی اس امت میں سب سے بڑے منافق ہونے کی وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس امت کا فرعون کہتے ہیں۔ اور آپ کے قاتل معلون ابو لؤلؤ فیروز مجوسی سے محبت کا دم بھرتے ہیں؛ حالانکہ وہ بہت بڑا کافر اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا دشمن تھا۔ [شیعہ اس مجوسی کو اپنا باپ تصور کرتے ہوئے اسے ''بابا'' کہہ کر پکارتے ہیں۔

امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی سولھویں دلیل:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ''سولھویں دلیل قرآن کریم کی یہ آیت ہے:

﴿ وَالسَّابِقُوْنَ السَّابِقُوْنَ ☆ اُوْلٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ﴾ (الواقعہ ۱۰۔۱۱)

''اور جو آگے والے ہیں وہ تو آگے والے ہیں۔ وہ بالکل نزدیکی حاصل کئے ہوئے ہیں۔''

ابو نعیم نے اس آیت کی تفسیر میں حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ: اس امت میں سے سابق حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔''

فقیہ ابن المغازلی الشافعی نے امام مجاہد سے اس آیت ﴿وَالسَّابِقُوْنَ السَّابِقُوْنَ﴾ کی تفسیر میں روایت کیا ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

یوشع بن نون حضرت موسی علیہ السلام کی طرف سبقت لے گئے۔ حضرت موسی حضرت ہارون کی طرف سبقت لے گئے۔ اور صاحب یس حضرت عیسی علیہ السلام کی طرف سبقت لے گئے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ محمد ﷺ کی طرف سبقت لے گئے۔''

یہ فضیلت آپ کے علاوہ کسی دوسرے کو حاصل نہیں ہو سکی۔ تو پھر آپ ہی امام ہوں گے۔'' [شیعہ کا بیان ختم ہوا]۔

جواب: اس کے کئی ایک جواب ہیں:

پہلی بات: ہم کہتے ہیں کہ یہ روایت صحیح نہیں۔ ہم اس کی صحیح سند پیش کرتے ہیں' اس لیے کہ بہت ساری ایسی جھوٹی باتیں بھی ہوتی ہیں جنہیں مصنفین [نوٹ کے طور پر] روایت کر لیتے ہیں۔

دوسری بات: اس روایت کی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف نسبت کرنا بھی باطل ہے۔ اگر بشرط صحت آپ سے یہ روایت ثابت بھی ہو جائے؛ تب بھی حجت نہیں ہو سکتی۔ اس لیے کہ دوسری روایات میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے قوی لوگوں نے اس سے اختلاف کیا ہے۔

تیسری بات: بیشک اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَالسَّابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهَاجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ﴾
''مہاجرین وانصار میں سے اوّلین سابقین اور وہ لوگ جنھوں نے نیک اعمال میں ان کی پیروی کی اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو گئے۔'' (التوبۃ: ۱۰۰)

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ وَ مِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ وَ مِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ [فاطر ۳۲]

''پھر ہم نے ان لوگوں کو (اس) کتاب کا وارث بنایا جن کو ہم نے اپنے بندوں میں پسند فرمایا۔ پھر بعضے تو ان میں اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے ہیں اور بعضے ان میں متوسط درجے کے ہیں اور بعضے ان میں اللہ کی توفیق سے نیکیوں میں ترقی کئے چلے جاتے ہیں۔''

سابقین اولین وہ صحابہ ہیں جنھوں نے فتح مکہ سے قبل اللہ کی راہ میں مال خرچ کیا اور جہاد کیا۔ یہ ان لوگوں سے افضل ہیں جنھوں نے فتح کے بعد اللہ کی راہ میں خرچ کیا اور جہاد کیا۔ اس میں وہ صحابہ بھی شامل ہیں جنھوں نے بیعت رضوان میں شرکت کی تھی؛ ان کی تعداد چودہ سو سے زیادہ تھی۔ پھر یہ بات کیوں کر صحیح ہو سکتی ہے کہ پوری امت میں ایک ہی سابق (حضرت علی) تھے؟

چوتھی بات: شیعہ مصنف کا یہ کہنا کہ: ''یہ فضیلت آپ کے علاوہ کسی دوسرے کو حاصل نہیں ہو سکی۔''

یہ بالکل غلط بات ہے۔ علماء کرام رحمہم اللہ کا اختلاف ہے کہ سب سے پہلے کون اسلام لایا تھا؟ ایک قول یہ ہے کہ حالانکہ مردوں میں سب سے پہلے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اسلام لائے تھے؛ اس لحاظ سے آپ کا ایمان لانا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ایمان لانے سے پہلے تھا۔ اور ایک قول یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ آپ سے پہلے ایمان لائے تھے۔ لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ اس وقت بالکل چھوٹے تھے۔ اس بات میں علماء کا اختلاف ہے کہ آیا بچے کا اسلام لانا شرعاً معتبر بھی ہے یا نہیں؟ لیکن اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا اسلام باقی سب کی نسبت اکمل وانفع تھا۔ پس اس لحاظ سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بالاتفاق سابق بالایمان ہیں۔ اور دوسرے قول کے مطابق آپ کو علی الاطلاق سبقت حاصل ہے۔ تو پھر بغیر کسی دلیل کے کیسے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ان پر سبقت حاصل ہے؟

پانچویں بات: اس آیت میں سابقین اولین کو فضیلت دی گئی ہے۔ اس میں کوئی ایسی دلیل نہیں ہے کہ جس کا اسلام جتنا پہلے ہوگا اسے دوسروں پر اتنی زیادہ فضیلت حاصل ہوگی۔ بس اس میں اتنی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سابقین کو شرف و فضیلت سے نوازا ہے؛ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْ بَعْدُ وَقَاتَلُوْا وَ كُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى﴾ [الحدید ۱۰]

''تم میں سے جنھوں نے فتح سے پہلے فی سبیل اللہ دیا ہے اور قتال کیا ہے وہ (دوسروں کے) برابر نہیں بلکہ ان کے بہت بڑے درجے ہیں جنھوں نے فتح کے بعد خیراتیں دیں اور جہاد کیا، ہاں بھلائی کا وعدہ تو اللہ تعالیٰ کا ان سب سے ہے۔''

جب یہ تمام لوگ اسلام ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے شرف سے مشرف ہیں ؛ اور ان دونوں آیات میں کوئی ایسی چیز موجود نہیں ہے جو مطلق افضلیت کا تقاضا کرتی ہو؛ تو پھر ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ جو لوگ اسلام لانے کے ساتھ ساتھ انفاق فی سبیل اللہ اور جہاد و قتال میں بھی سبقت رکھتے ہوں۔ [اور ان اوصاف کی وجہ سے انہیں سبقت حاصل ہو]۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جو کہ صرف انتالیس افراد کے بعد اسلام لائے تھے؛ وہ صحیح نصوص اور اجماع صحابہ و تابعین کی روشنی میں ان میں سے اکثر لوگوں سے افضل تھے۔ ہمیں کبھی بھی یہ علم حاصل نہیں ہوسکا کہ کسی نے یہ کہا ہو کہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے افضل ہیں۔ حالانکہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے پہلے ایمان لائے تھے۔ اور کسی نے یہ بھی نہیں کہا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے افضل ہیں۔ حالانکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے پہلے ایمان لائے تھے۔

جب انفاق فی سبیل اللہ اور جہاد کی وجہ سے بھی فضیلت حاصل ہوتی ہے تو پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا اس باب میں خاص اور یگانہ مقام ہے۔ آپ سے پہلے کسی دوسرے نے نہ ہی زبان سے جہاد کیا اور نہ ہی مال سے۔ بلکہ آپ جب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تھے اس وقت سے حسب امکان اللہ کی راہ میں خرچ کرتے رہے اور جہاد فی سبیل اللہ کا حق ادا کرتے رہے۔ آپ نے کئی ایک ان بے بس غلاموں کو خرید کر آزاد کیا جنہیں اسلام لانے کی وجہ سے تکلیف دی جاتی تھی۔ نیز آپ قتال کا حکم نازل ہونے سے پہلے بھی اور بعد میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مل کر جہاد کیا کرتے تھے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَجَاهِدْهُم بِهِ جِهَادًا كَبِيرًا﴾ [الفرقان ۵۲]

''اور قرآن کے ذریعے ان سے پوری طاقت سے بڑا جہاد کریں۔''

پس حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جہاد بالمال اور جہاد بالنفس میں سب سے زیادہ کامل اور لوگوں پر سبقت رکھتے تھے۔

صحیحین میں ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: '' مجھے کسی کے مال نے اتنا فائدہ نہیں دیا؛ جتنا فائدہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے مال نے دیا ہے۔'' ''میں سب لوگوں سے زیادہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے مال اور رفاقت کا ممنون ہوں۔''

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خود خبر دے رہے ہیں کہ آپ کی صحبت اور آپ کے مال خرچ کرنے کی وجہ سے سب سے زیادہ فائدہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچا ہے۔

امامت علی رضی اللہ عنہ کی سترہویں دلیل:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:''امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی سترہویں دلیل یہ آیت قرآنی ہے:

﴿اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ﴾ (التوبۃ:۲۰)

''جو لوگ ایمان لائے، ہجرت کی، اللہ کی راہ میں اپنے مال اور اپنی جان سے جہاد کیا وہ اللہ کے ہاں بہت بڑے مرتبہ والے ہیں۔''

''رزین بن معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنی کتاب "الجمع بین الصحاح الستة" میں روایت کیا ہے کہ یہ آیت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی جب آپ حضرت طلحہ بن شیبہ رضی اللہ عنہ کیساتھ ایک دوسرے پر اپنے فخر کا اظہار کررہے تھے۔ یہ فضیلت آپ کے علاوہ کسی بھی دوسرے صحابی کے لیے ثابت نہیں ہے۔اس لیے آپ سب سے افضل ہوئے اور ساتھ امام اور خلیفہ بھی۔'' [شیعہ کا کلام ختم ہوا]۔

جواب: اس کے جواب میں کئی اہم باتیں ہیں:

- پہلی بات: ہم شیعہ مصنف سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ اس روایت کی صحت ثابت کرے۔ محدث رزین [کی یہ عادت ہے کہ وہ اپنی جانب سے روایت میں بعض الفاظ بڑھا دیا کرتا ہے۔اور] اپنی کتاب میں ایسی روایات نقل کر دیتا ہے جو صحاح میں نہیں ہوتی۔
- دوسری بات: صحیح حدیث وہ نہیں ہے جسے رزین نے نقل کیا ہے؛ بلکہ صحیح وہ حدیث ہے جس کے راوی حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ ہیں۔انھوں نے کہا کہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر کے پاس بیٹھا تھا، ایک شخص نے کہا:

''میں اسلام لانے کے بعد صرف حاجیوں کو پانی پلاؤں گا اور کچھ نہیں کروں گا۔ دوسرے نے کہا: میں صرف خانہ کعبہ کو آباد کروں گا۔ دوسرا کوئی کام نہیں کروں گا۔ تیسرے نے کہا: جو کچھ تم نے کہا ہے جہاد ان سب سے بہتر ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انھیں ڈانٹ کر کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر کے پاس آواز بلند نہ کرو۔ میں نماز جمعہ سے فارغ ہو کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوں گا اور تمہارے اختلافی مسائل کا حل دریافت کروں گا۔'' تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی:

﴿اَجَعَلْتُمْ سِقَایَةَ الْحَآجِّ وَ عِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ جٰهَدَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ﴾ (التوبہ: ۱۹۔۲۰)

''کیا تم نے حاجیوں کے پانی پلانے اور خانہ کعبہ کے آباد کرنے والے کو اس شخص کی مانند قرار دیا ہے جو اللہ تعالیٰ اور روز آخرت پر ایمان رکھتا اور اللہ کی راہ میں جہاد کرتا ہو۔''[1]

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ جنھوں نے جہاد کو، حاجیوں کو پانی پلانے اور کعبہ کی حفاظت کی نسبت

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب فضل الشهادة فی سبیل الله(حدیث:۱۸۷۹)۔

افضل قرار دیا تھا، حق بجانب تھے۔ ان کے مقابلہ میں اس شخص کا قول درست نہیں جس نے ان امور کو افضل تصور کیا تھا۔ اس سے یہ بھی واضح ہوا کہ مسئلہ متنازعہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس اپنے حریف کی نسبت حق و صداقت کا زیادہ علم تھا۔

جب کہ ایمان و ہجرت اور جہاد فی سبیل اللہ کی وجہ سے فضیلت ان تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے حق میں ثابت ہے جو ایمان لائے ؛ پھر ہجرت اور جہاد کے شرف سے بہرہ ور ہوئے۔ یہاں پر کوئی ایسی فضیلت بیان نہیں کی گئی جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ خاص ہو؛ جس کے بارے میں یہ کہنا ممکن ہو کہ یہ فضیلت کسی دوسرے کے لیے ثابت نہیں ہے۔

حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کی رائے متعدد امور میں حکم ربانی سے ہم آہنگ رہی تھی۔ آپ ایک بات فرماتے اور اس کی تائید میں قرآن کریم نازل ہو جاتا۔ ایک مرتبہ آپ نے کہا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کاش! ہم مقام ابراہیم کو مصلی بناتے۔ پس اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

﴿ وَ اتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ﴾ [البقرة ۱۲۵]

''اور مقام ابراہیم کو جائے نماز بنالو۔''

[آپ فرماتے ہیں]: اور حجاب کی آیت بھی میری خواہش کے مطابق نازل ہوئی۔ کیونکہ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کاش آپ اپنی بیویوں کو پردہ کرنے کا حکم دیں، اس لئے کہ ان سے ہر نیک و بد گفتگو کرتا ہے۔ پس حجاب کی آیت نازل ہوئی۔ اور ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیویاں آپ پر نسوانی جوش میں آ کر جمع ہوئیں، تو میں نے ان سے کہا کہ اگر تم باز نہ آئیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم تم کو طلاق دے دیں گے، تو عنقریب آپ کا پروردگار تم سے اچھی بیویاں آپ کو بدلے میں دے گا، جو مسلمان ہوں گی، تب یہ آیت نازل ہوئی:

﴿عَسٰى رَبُّهٗۤ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ يُّبْدِلَهٗۤ اَزْوَاجًا خَيْرًا مِّنْكُنَّ مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰٓئِبٰتٍ﴾ [التحریم ۵]

''اگر وہ (پیغمبر) تمہیں طلاق دے دیں تو بہت جلد انہیں ان کا رب تمہارے بدلے تم سے بہتر بیویاں عنایت فرمائے گا جو اسلام والیاں توبہ کرنے والیاں، عبادت بجالانے والیاں ہوں گی۔''

❀ **تیسری بات:** اگر یہ بات تسلیم کر لی جائے کہ یہ فضیلت حضرت علی رضی اللہ عنہ کیساتھ خاص ہے تو اس سے ان کی امامت ثابت نہیں ہوتی اور نہ یہ کہ آپ امت میں سب سے افضل تھے۔ خضر کو ایسے مسائل معلوم تھے جو حضرت موسیٰ کو معلوم نہ تھے، تو اسکا یہ مطلب نہیں کہ آپ حضرت موسیٰ سے افضل تھے، اس سے بڑھ کر یہ کہ ہدہد نے حضرت سلیمان علیہ السلام سے کہا تھا:

﴿اَحَطْتُّ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ﴾ [النمل ۲۲]

''جو بات مجھے معلوم ہے آپ نہیں جانتے۔''

حالانکہ ہدہد حضرت سلیمان علیہ السلام سے بڑا عالم نہیں تھا۔

❀ **چوتھی بات:** ٹھیک ہے حضرت علی رضی اللہ عنہ یہ مسئلہ جانتے تھے؛ تو پھر یہ کہاں سے ثابت ہو گیا کہ دوسرے صحابہ کرام کو اس کا کوئی علم نہیں تھا۔ اس مسئلہ کا خصوصی طور پر آپ کو علم ہونے کا دعویٰ کرنا باطل ہے۔ اس وجہ سے آپ کی خصوصیت بھی باطل ہوئی۔ بلکہ تواتر کے ساتھ یہ بات بھی معلوم شدہ ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ [بالاولیٰ اس آیت کے مصداق تھے؛

اس لیے] آپ اپنے مال کیساتھ جہاد کرنے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ پر فضیلت رکھتے تھے۔حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مال دار انسان تھے اور جہاد بالمال اور جہاد بالنفس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کرتے تھے۔نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:'' مجھے کسی کے مال نے اتنا فائدہ نہیں دیا؛ جتنا فائدہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے مال نے دیا ہے''

حضرت علی رضی اللہ عنہ تنگ دست تھے،خرچ کرنے کے لیے ان کے پاس مال موجود ہی نہ تھا بخلاف ازیں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ غنی تھے اور انھوں نے اللہ کی راہ میں کثیر مال صرف کیا تھا۔اس کی تفصیل ہم آگے بیان کریں گے ۔ان شاء اللہ تعالیٰ۔

امامت علی رضی اللہ عنہ کی اٹھارھویں دلیل:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:'حضرت علی رضی اللہ عنہ کے منصب خلافت پر فائز ہونے کی اٹھارھویں دلیل یہ آیت ہے :

﴿إِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُولَ فَقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوَاكُمْ صَدَقَةً﴾ (المجادلة:۱۲)

''اے مسلمانو! جب تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سرگوشی کرنا چاہو تو اپنی سرگوشی سے پہلے کچھ صدقہ دے دیا کرو۔''

حافظ ابونعیم نے اپنی سند سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے آپ فرماتے ہیں:''اللہ تعالیٰ نے صدقہ کرنے سے پہلے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ گفتگو کرنے کو حرام قرار دیا تھا۔باقی صحابہ آپ سے کلام کرنے سے قبل صدقہ کرنے میں بخل سے کام لیا کرتے تھے۔صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ صدقہ دیتے تھے۔''مسلمانوں میں سے کسی اور کو یہ سعادت حاصل نہیں ہوئی۔تفسیر ثعلبی میں ہے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ تین اوصاف کے حامل تھے اگر مجھ میں ان تین باتوں میں سے ایک بھی ہوتی تو مجھے سرخ اونٹوں سے زیادہ عزیز تھا:

۱۔سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ شادی۔

۲۔غزوۂ خیبر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جھنڈا اعطا کرنا۔ ۳۔آیت نجویٰ۔

''رزین بن معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنی کتاب ''الجمع بین الصحاح الستۃ'' میں روایت کیا ہے حضرت علی رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے:'' اس آیت پر میرے سوا کسی نے عمل نہیں کیا اور میری وجہ سے اللہ تعالیٰ نے امت کا بوجھ ہلکا کر دیا۔''مذکورہ صدر اقوال سے باقی صحابہ پر علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت ثابت ہوتی ہے،لہٰذا آپ احق بالامامت ہوں گے۔'' [شیعہ کا بیان ختم ہوا]۔

جواب: ہم کہتے ہیں کہ:''صحیح بات جو ثابت ہے وہ یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس آیت پر عمل کیا؛اور پھر یہ جلد ہی کسی دوسرے کے عمل کرنے سے پہلے منسوخ ہوگئی۔[یعنی دیگر صحابہ کو اس پر عمل کرنے کا شرف حاصل ہونے کا موقع ہی نہ مل سکا]۔علاوہ ازیں اس آیت میں صدقہ کو واجب قرار نہیں دیا گیا۔بلکہ یہ حکم دیا گیا تھا کہ جب رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے رازدارانہ طور پر کوئی بات کرنا چاہیں تو صدقہ ادا کریں،جو شخص ایسی بات نہ کرنا چاہتا ہو اس کے لیے صدقہ ادا کرنا ضروری نہیں۔چونکہ سرگوشی واجب نہ تھی لہٰذا غیر واجب چیز کو ترک کرنے میں کسی پر کوئی حرج نہیں یا ملامت نہیں۔یہ بھی ممکن ہے کہ جو شخص صدقہ ادا کرنے پر قادر نہ ہو اور اس کی نیت یہ ہو کہ بشرط قدرت وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بات چیت کرے گا اور صدقہ دے گا تو اسے اس کی نیت کا اجر وثواب مل جائے گا۔

جس شخص کو نبی کریم ﷺ سے ایسی خفیہ بات کرنے کی ضرورت لاحق نہ ہو تو اسے ناقص قرار نہیں دیا جائے گا۔ البتہ جس شخص کو ایسی ضرورت لاحق ہوئی ہو مگر اس نے بخل سے کام لے کر آپ سے خفیہ بات نہ کی تو اس نے ایک مستحب فعل کو ترک کیا۔ خلفاء کے بارے میں ہرگز یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ بخیل تھے، یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ اصحاب ثلاثہ اس آیت کے نزول کے وقت موجود تھے۔ بلکہ اس بات کا بھی امکان ہے کہ بعض ان میں سے موجود نہ ہوں۔ یا اپنی ضروریات میں مشغول ہوں؛ یا انھیں نبی کریم ﷺ کے ساتھ راز دارانہ بات کرنے کی ضرورت پیش نہ آئی ہو۔

یہ حکم زیادہ دیر تک باقی نہیں رہا جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ اتنے لمبے عرصہ میں لازمی طور پر لوگوں کو سرگوشی کرنے کی ضرورت پیش آئی ہو۔ اور اگر فرض کر لیا جائے کہ اصحاب ثلاثہ رضی اللہ عنہم نے ایک مستحب فعل کو ترک کر دیا تھا؛ تو ہم اس سے پہلے کئی بار بیان کر چکے ہیں کہ مستحب پر عمل کرنے والا علی الاطلاق دوسروں سے افضل نہیں ہو سکتا۔

صحیح حدیث میں آیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے دریافت فرمایا:

''تم میں سے آج کون روزہ سے ہے؟'' ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: میں ہوں۔

فرمایا کہ ''تم میں سے کسی نے جنازہ کو الوداع کہا ہے؟'' ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: یا رسول اللہ! میں نے جنازہ پڑھا ہے۔

پھر آپ نے دریافت کیا: ''کیا تم میں سے کسی نے صدقہ دیا ہے؟'' ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: اے اللہ کے رسول! میں نے صدقہ دیا ہے۔ آپ نے فرمایا: ''جس شخص میں یہ سب باتیں جمع ہو جائیں وہ جنتی شخص ہے۔''❶

صحیحین میں ثابت ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ:

''جو شخص اللہ تعالیٰ کی راہ میں ایک قسم کی دو چیزیں دے اس کو جنت کے دروازوں سے پکارا جائے گا: اللہ کے بندے! خیر یہاں ہے۔ پس جو شخص نمازیوں میں سے ہو گا وہ نماز کے دروازے سے پکارا جائے گا۔ اور جو جہاد کرنے والوں سے ہو گا وہ جہاد کے دروازے سے بلایا جائے گا۔ اور جو شخص صدقہ کرنے والوں میں سے ہو گا اس کو صدقہ کے دروازہ سے بلایا جائے گا۔ اور جو شخص روزہ داروں میں سے ہو گا اس کو روزے کے دروازہ باب الریان سے پکارا جائے گا۔''

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: اور جو شخص ان سب دروازوں سے بلایا جائے گا اس کو پھر کوئی اندیشہ نہ ہو گا۔ اور دریافت کیا: یا رسول اللہ ﷺ! کیا کوئی شخص ان سب دروازوں سے پکارا جائے گا؟

آپ نے فرمایا: ''اور میں امید رکھتا ہوں کہ اے ابوبکر تم ان ہی میں سے ہو۔'' [صحیح بخاری: ج دوم: ح ۸۸۳]

بخاری و مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

''ایک شخص ایک بیل کو ہانکنے لیے جا رہا تھا اور اس پر بوجھ لاد رکھا تھا۔ بیل اس کی طرف متوجہ ہوا اور کہا: ''مجھے اس لیے نہیں پیدا کیا گیا۔ بلکہ میں کھیتی باڑی کے لیے پیدا کیا گیا ہوں۔''

لوگوں نے گھبرا کر کہا: سبحان اللہ! حیرت ہے کہ بیل کس طرح بات چیت کرنے لگ گیا۔'' نبی ﷺ نے فرمایا: ''میں

❶ صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابۃ، باب من فضائل ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہ (حدیث: ۱۲/ ۱۰۲۸)۔

اور ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما اس بات کو تسلیم کرتے ہیں۔'' حالانکہ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما وہاں موجود نہ تھے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

''ایک چرواہا اپنی بکریوں میں تھا کہ ایک بھیڑیئے نے اس پر حملہ کیا اور ایک بکری کو اٹھا کر لے گیا چرواہے نے اس بکری کو بھیڑیئے سے چھڑا لیا تو بھیڑیئے نے اس کی طرف متوجہ ہو کر کہا سبع کے دن (پھاڑنے والے) بکری کا کون محافظ ہوگا؟ جس دن کہ میرے سوا بکری چرانے والا کوئی نظر نہ آئے گا؟ لوگوں نے یہ واقعہ سن کر سبحان اللہ کہا تو رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں اور ابوبکر و عمر بن خطاب رضی اللہ عنہما اس پر ایمان لائے ہیں۔'' [صحیح بخاری:ج:۲:ح۸۸۰]

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ابوبکر رضی اللہ عنہ کے مال سے مجھے جس قدر فائدہ پہنچا دوسرے کسی کے مال سے نہیں پہنچا۔'' ❶

یہ روایت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے خصائص میں انتہائی واضح اور صریح ہے۔ اس میں کوئی بھی دوسرا آپ کا شریک نہیں؛ نہ ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ اور نہ ہی کوئی دوسرا۔ بخاری و مسلم میں روایت کیا گیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''صحبت و رفاقت اور انفاق مال کے اعتبار سے ابوبکر رضی اللہ عنہ میرے سب سے بڑے محسن ہیں اور اگر میں کسی کو گہرا دوست بنانے والا ہوتا تو ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بناتا۔ البتہ اسلامی اخوت و مودّت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مسجد نبوی کی طرف کھلنے والی سب کھڑکیاں بند کر دی جائیں مگر ابوبکر رضی اللہ عنہ کی کھڑکی کھلی رہے۔'' ❷

سنن ابی داؤد میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو مخاطب کر کے فرمایا:

''اے ابوبکر! آپ میری امت میں سے سب سے پہلے جنت میں جائیں گے۔'' ❸

ترمذی و ابوداؤد میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں صدقہ کرنے کا حکم دیا۔ میرے پاس ان دنوں مال تھا۔ میں نے کہا آج میں ابوبکر رضی اللہ عنہ سے سبقت لے جاؤں گا۔ چنانچہ میں گھر میں گیا اور آدھا مال لا کر آپ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ نبی کریم نے دریافت کیا: ''بال بچوں کے لیے کیا باقی چھوڑا؟ میں نے کہا: اس کے برابر۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ گھر کا تمام اثاثہ لے آئے۔ آپ نے فرمایا: ''ابوبکر رضی اللہ عنہ! گھر میں کیا باقی چھوڑا۔'' عرض کیا:

''اللہ اور اس کے رسول کو باقی چھوڑ آیا ہوں۔''

[پروانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس
صدیق کے لیے ہے اللہ و رسول بس]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''میں نے کہا اس کے بعد میں کبھی ابوبکر رضی اللہ عنہ کا مقابلہ نہیں کروں گا۔'' ❹

صحیح بخاری میں حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ:

''میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنی چادر کا کنارہ اٹھائے ہوئے آئے

---

❶ سنن ترمذی، کتاب المناقب۔ (ح:۳٦٦۱)، سنن ابن ماجۃ۔ باب فضل ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہ (ح:۹٤)

❷ صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار (ح:۳۹۰٤) مسلم۔ باب من فضائل ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہ (ح:۲۳۸۲)

❸ سنن ابی داود۔ کتاب السنۃ، باب فی الخلفاء (حدیث:٤٦٥۲)، و سندہ ضعیف۔

❹ سنن ابی داؤد۔ کتاب الزکاۃ (ح:۱٦۷۸)، سنن ترمذی کتاب المناقب، باب (۱٦/ ٤۳)، (حدیث:۳٦۷۵)۔

ان کا گھٹنا کھل گیا تھا؛ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:''تمہارے یہ دوست لڑ کر آ رہے ہیں۔''
حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آ کر سلام کیا اور کہا:''میرے اور ابن خطاب کے درمیان کچھ جھگڑا ہو گیا؛ میں نے بے ساختہ انہیں کچھ کہہ دیا؛ اس کے بعد میں شرمندہ ہوا اور میں نے ان سے معاف کر دینے کی درخواست کی؛ لیکن انہوں نے معافی دینے سے انکار کر دیا۔لہٰذا میں آپ کے پاس التجا لایا ہوں۔
آپ نے تین مرتبہ فرمایا:''اے ابوبکر رضی اللہ عنہ! اللہ تمہیں معاف کر دے۔''
پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ شرمندہ ہوئے؛ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کے مکان پر گئے؛ اور دریافت کیا: ابوبکر رضی اللہ عنہ یہاں ہیں؟ لوگوں نے کہا: نہیں۔ پھر وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئے۔ آپ کو سلام کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ متغیر ہونے لگا؛ حتی کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ڈر گئے؛ اور دونوں گھٹنوں کے بل ہو کر عرض کیا کہ:''میں نے ہی ظلم کیا تھا۔
تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:''اللہ تعالیٰ نے مجھے تمہاری طرف بھیجا؛ تو تم لوگوں نے کہا جھوٹا ہے۔اور ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: آپ سچ فرماتے ہیں۔ اور انہوں نے اپنے مال و جان سے میری خدمت کی۔ پس کیا تم میرے لئے میرے دوست کو چھوڑ دو گے یا نہیں دو مرتبہ (یہی فرمایا)۔ اس کے بعد ابوبکر رضی اللہ عنہ کو کسی نے نہیں ستایا۔''❀
ترمذی میں مرفوعاً روایت کیا گیا ہے کہ:
جس قوم میں ابوبکر رضی اللہ عنہ موجود ہوں ان کو چاہیے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے سوا اور کسی کو امام مقرر نہ کریں۔ [1]
حضرت عثمان کا ایک ہزار اونٹ کو جنگ کے لیے تیار کرنا۔ [2] سرگوشی کے صدقہ سے کئی گنا بڑھ کر ہے۔ بخاری و مسلم میں حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے کہ ایک انصاری کے ہاں ایک مہمان آیا۔ گھر میں صرف بچوں کی خوراک تھی۔ بیوی کو کہا، بچوں کو سلا کر دیا گل کر دو اور جو کچھ ہے مہمان کو پیش کر دو۔ بیوی نے یونہی کیا۔ تب یہ آیت نازل ہوئی:
﴿وَ یُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ وَ لَوْ کَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ﴾(حشر: ۹/۵۹) [3]
''وہ اپنے آپ پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں اگرچہ خود سخت ضرورت ہی کیوں نہ ہو۔''
[یہ نجوی کی نسبت بہت بڑا کام ہے]۔
خلاصہ کلام! انفاق فی سبیل اللہ؛ اور دوسرے ابواب میں بہت سارے مہاجرین و انصار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے لیے ایسے فضائل ثابت ہیں جو کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حصہ میں نہیں آئے۔ اس لیے کہ عہد رسالت مآب میں آپ کے پاس کوئی مال نہیں تھا جسے خرچ کر کے یہ مقام حاصل کرتے۔

---

[1] سنن ابی داؤد۔ کتاب الزکاۃ(ح:۱۶۷۸)، سنن ترمذی کتاب المناقب، باب(۱۶/ ۴۳)، (حدیث:۳۶۷۵)
[2] الترمذی، کتاب المناقب (ح:۳۶۷۳)، و سندہ ضعیف اس کی سند میں عیسیٰ بن میمون راوی ضعیف ہے۔
[3] صحیح بخاری ۔کتاب مناقب الانصار۔ باب قول اللہ عزوجل ﴿ وَ یُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ ......﴾(حدیث:۳۷۹۸)، صحیح مسلم، کتاب الأشربۃ۔ باب اکرام الضیف (حدیث: ۲۰۵۴)۔
❀ صحیح بخاری: جلد دوم: حدیث نمبر ۸۷۸۔

امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی انیسویں دلیل:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:''امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی انیسویں دلیل یہ آیت ہے:

﴿وَ اسْئَلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَا﴾ (الزخرف۴۵)

''اور ہمارے ان نبیوں سے پوچھو! جنہیں ہم نے آپ سے پہلے بھیجا تھا۔''

ابن عبدالبر و ابونعیم نے روایت کیا ہے کہ شب معراج میں اللہ تعالیٰ نے سب انبیاء علیہم السلام کو جمع کر کے فرمایا: اے محمد! ان سے پوچھیں کہ تمہاری بعثت کس بات پر عمل میں آئی تھی؟ انھوں نے کہا، اس بات کی شہادت پر کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں نیز آپ سچے نبی ہیں اور علی آپ کے امام و خلیفہ ہیں۔اس روایت سے صراحۃً حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امامت کا اثبات ہوتا ہے۔'' [شیعہ کا بیان ختم ہوا]۔

[جواب]: اس کا جواب کئی طرح سے دیا جا سکتا ہے:

❀ پہلی وجہ: ہم رافضی سے اس روایت اور اس جیسی دیگر روایات کی صحت کا مطالبہ کرتے ہیں۔ہم کہتے ہیں: بلاشبہ یہ روایت اور اسکے نظائر و امثال سب کذب ہیں۔ہمیں اس بات میں کوئی ادنی سا شک و شبہ نہیں کہ یہ روایات انتہائی قبیح قسم کا جھوٹ ہیں۔لیکن ہم بطور مناظرہ کہتے ہیں کہ: اگر یہ روایت کذب نہ بھی ہوتی؛ تب بھی اثبات صحت سے قبل استدلال کرنا ناروا تھا۔کیونکہ جس روایت کی صحت کا علم نہ ہو اس سے استدلال کرنا بالکل جائز نہیں ہے'اس پر تمام لوگوں کا اتفاق ہے۔کیونکہ اس کا قول بغیر علم کے ہے؛ اور بغیر علم کے بات کہنا کتاب و سنت اور اجماع کی روشنی میں حرام ہے۔

❀ دوسری وجہ: اس روایت کے موضوع اور من گھڑت ہونے پر تمام اہل علم کا اتفاق ہے۔

❀ تیسری وجہ: اہل علم و عقل جانتے ہیں کہ یہ روایات ایسا باطل جھوٹ ہیں جن کی تصدیق صرف وہی انسان کر سکتا ہے جسے نہ ہی عقل ہو اور نہ ہی دین۔ بلکہ اس کا کام ہی ایسی روایات گھڑنا اور بیباکی سے جھوٹ بولنا ہو۔سخت حیرت تو یہ ہے کہ جو چیز اصل ایمان میں داخل نہیں اس کے بارے میں انبیاء سے کیوں کر پوچھا جائے گا؟

اس بات پر مسلمانوں کا اجماع ہے کہ اگر ایک شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھتا اور آپ کی اطاعت کرتا ہو؛ وہ مر جائے اور اسے علم نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ نے ابوبکر و عمر اور عثمان و علی رضی اللہ عنہم اجمعین کو پیدا کیا تھا تو عدم علم سے اسکے ایمان کو کچھ نقصان نہیں پہنچے گا؛ اور نہ ہی یہ بات اس کے جنت میں داخل ہونے کی راہ میں رکاوٹ بن سکتی ہے۔اگر یہ حال امت کا ہے تو پھر یہ کہنا کس حد تک درست ہے کہ صحابہ میں سے ایک (حضرت علی) پر ایمان لانا انبیاء کیلئے ناگزیر ہے۔حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ان سے صرف یہ عہد لیا تھا کہ اگر انکی زندگی میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہو کر آ جائیں تو ان پر ایمان لانا اور ان کی مدد کرنا ہوگی؛ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّ حِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَ لَتَنْصُرُنَّهٗ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَ اَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا قَالَ فَاشْهَدُوْا وَ اَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ﴾ [آل عمران ۸۱]

''جب اللہ تعالیٰ نے نبیوں سے عہد لیا کہ جو کچھ میں تمہیں کتاب و حکمت سے دوں پھر تمہارے پاس وہ رسول آئے جو

تمہارے پاس کی چیز کو سچ بتائے تو تمہارے لئے اس پر ایمان لانا اور اس کی مدد کرنا ضروری ہے۔فرمایا کہ تم اس کے اقراری ہو اور اس پر میرا ذمہ لے رہے ہو؟ سب نے کہا کہ ہمیں اقرار ہے۔فرمایا تو اب گواہ رہو اور خود میں بھی تمہارے ساتھ گواہوں میں ہوں۔''

حضرت ابن عباس نے ﴿ثُمَّ جَآءَ كُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ﴾ کی تفسیر میں یہ بات کہی ہے۔[1]

انبیاء کرام علیہم السلام سے رسالت و بعثت محمدی کے تفصیلی امور پر ایمان لانے کا ذکر نہیں کیا گیا۔تو پھر باقی اہل ایمان کو چھوڑ کر کسی ایک صحابی کی موالات کا عہد انبیاء کرام سے کیسے لیا جا سکتا ہے؟

❀ چوتھی وجہ: اس آیت کے الفاظ: ﴿وَاسْاَلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُسُلِنَا اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ آلِهَةً يُّعْبَدُوْنَ﴾ [الزخرف۴۵]

''اور ہمارے ان نبیوں سے پوچھو! جنہیں ہم نے آپ سے پہلے بھیجا تھا کہ کیا ہم نے سوائے رحمٰن کے اور معبود مقرر کیے تھے جن کی عبادت کی جائے۔''

اس آیت میں یہ سوال نہیں کیا گیا کہ ان سے پوچھا جائے کہ انہیں کس چیز کے ساتھ مبعوث کیا گیا تھا؟ [بخلاف ازیں آیت میں انبیاء سے یہ بات دریافت کرنے کا حکم دیا گیا ہے کہ ہم نے کچھ اور بھی معبود مقرر کیے ہیں جن کی پرستش کی جائے؟]

❀ پانچویں وجہ: اعتراض کرنے والے کا قول کہ: انبیاء کو ان تین باتوں کا حکم دیکر مبعوث کیا گیا تھا؛ اگر اس کی مراد یہ ہو کہ ان تین باتوں کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں تھی تو یہ رسولوں پر جھوٹ ہے۔اور اگر کہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ انبیاء کرام کی بعثت کے اصول یہی تھے تو بھی یہ انبیاء کرام علیہم السلام پر جھوٹ ہے۔اس لیے کہ جن اصول دین کو دیکر اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام علیہم السلام کو مبعوث کیا تھا؛ ان میں: اللہ تعالیٰ پر ایمان؛ آخرت پر ایمان اور اصول شرائع شامل ہیں۔

ان کے ہاں کسی نبی کے کسی صحابی پر ایمان لانے سے بڑھ کر اہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا اقرار ہے۔ان لوگوں پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اجمالی ایمان رکھنا واجب تھا؛ جیسا کہ ہم پر سابقہ انبیاء کرام علیہم السلام پر اجمالی ایمان رکھنا واجب ہے۔لیکن اگر ان میں سے کوئی ایک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ پالیتا تو اس پر آپ کی شریعت پر ایسے ہی تفصیلی ایمان لانا واجب ہوتا جیسے ہم پر تفصیلی ایمان لانا واجب ہے۔جب کہ باقی انبیاء کرام علیہم السلام کی شریعتوں پر تفصیلی ایمان ان امتوں کے لوگوں پر واجب تھا۔تو پھر یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ جو چیز امت پر واجب ہے اسکے بیان کو چھوڑ دیا جائے اور جس چیز پر ایمان لانا واجب نہیں ہے اسے بیان کیا جائے؟

❀ چھٹی وجہ: لیلۃ الاسراء کا واقعہ ہجرت سے پہلے مکہ مکرمہ میں پیش آیا۔کہا جاتا ہے کہ: یہ ہجرت سے ڈیڑھ سال پہلے کا واقعہ ہے؛ اور کہا گیا ہے کہ: پانچ سال پہلے کا واقعہ ہے۔اس کے علاوہ دیگر اقوال بھی ہیں۔معراج کی رات حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عمر چھوٹی تھی۔اس وقت تک آپ نے ہجرت بھی نہیں کی تھی اور نہ ہی جہاد کیا؛ اور نہ ہی کوئی دیگر ایسا کام ہوا جس کی وجہ سے انبیاء کرام علیہم السلام کے سامنے آپ کا ذکر کیا جاتا۔حقیقت میں انبیاء کرام علیہم السلام کی کتابوں میں حضرت

[1] اور یہی تفسیر سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے، دیکھیں تفسیر ابن جریر۔۵/۶۶)۔

علی رضی اللہ عنہ کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ انبیاء کرام علیہم السلام کی کتابیں موجود ہیں۔ ان میں سے لوگوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بشارات ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالی ہیں۔ ان میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا کوئی تذکرہ نہیں۔ بلکہ ذکر کیا جاتا ہے کہ وہ تابوت جس میں انبیاء کرام علیہم السلام کی تصویریں تھیں؛ اور وہ تابوت مصر کے بادشاہ مقوقس کے پاس موجود تھا۔ اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کی تصاویر بھی موجود تھیں۔ اور مقوقس ان کے مطابق ہی حکم الٰہی کو قائم کرتا تھا۔ اور آج تک جو اہل کتاب مسلمان ہوئے ہیں ان میں سے کسی ایک نے یہ ذکر تک نہیں کیا کہ ان کی کتابوں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بھی کوئی ذکر ملتا ہے۔ تو پھر یہ کہنا کیونکر جائز ہوسکتا ہے کہ تمام انبیاء کرام علیہم السلام کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ولایت کے اقرار پر مبعوث کیا گیا تھا؛ حالانکہ انہوں نے نہ ہی اپنی امتوں کے سامنے کچھ ایسا ذکر کیا اور نہ ہی ان میں سے کسی ایک سے کوئی ایسی بات نقل کی گئی؟۔

امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیسویں دلیل:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ''امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیسویں دلیل یہ آیت کریمہ ہے:

﴿وَ تَعِيَهَا اُذُنٌ وَّاعِيَةٌ﴾ (الحاقۃ: ۱۲) ''تاکہ یاد رکھنے والے کان اسے یاد رکھیں۔''

''ثعلبی کی تفسیر میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے علی! میں نے اللہ سے یہ دعا کی تھی کہ وہ تیرے کانوں کو ایسا بنا دے۔ اسی طرح ثعلبی نے بطریق ابونعیم ذکر کیا ہے: اے علی! اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمہارے قریب ہو جاؤں اور تمہیں علم سکھاؤں۔ تاکہ تم اسے یاد رکھو اور مجھ پر یہ آیت نازل ہوئی ہے: ﴿وَ تَعِيَهَا اُذُنٌ وَّاعِيَةٌ﴾ (الحاقۃ: ۱۲) ''تاکہ یاد رکھنے والے کان اسے یاد رکھیں۔'' پس تم ہی یاد رکھنے والے کان ہو۔'' یہ ایک ایسی فضیلت ہے جس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ منفرد تھے۔ لہٰذا وہی امام ہوں گے۔'' [شیعہ کا بیان ختم ہوا]۔

[جواب]: اس کا جواب کئی طرح سے دیا جا سکتا ہے:

- اول: ہم اس روایت کی صحت کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اس لیے کہ ابونعیم اور ثعلبی ایسی روایات بھی نقل کرتے ہیں جن سے استدلال کرنا بالاجماع جائز نہیں۔
- دوم: اس کا جواب یہ ہے کہ یہ روایت موضوع ہے۔ اس پر تمام اہل علم کا اتفاق ہے۔
- سوم: اللہ تعالیٰ کا فرمان:

﴿اِنَّا لَمَّا طَغَى الْمَآءُ حَمَلْنٰكُمْ فِي الْجَارِيَةِ ۞ لِنَجْعَلَهَا لَكُمْ تَذْكِرَةً وَّتَعِيَهَآ اُذُنٌ وَّاعِيَةٌ﴾

[الحاقہ ۱۱۔۱۲]

''جب پانی میں طغیانی آ گئی تو اس وقت ہم نے تمہیں کشتی میں چڑھا لیا۔ تاکہ اسے تمہارے لئے نصیحت اور یادگار بنا دیں اور (تاکہ) یاد رکھنے والے کان اسے یاد رکھیں۔''

جہاں تک زیر نظر آیت کا تعلق اس میں جملہ بنی آدم سے خطاب کیا گیا ہے ایک شخص سے خطاب نہیں ہے۔ اس لیے کہ حضرت نوح اور ان کی قوم کو کشتی میں سوار کرنا عظیم ترین نشانی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَاٰيَةٌ لَّهُمْ اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ☆ وَخَلَقْنَا لَهُمْ مِّنْ مِّثْلِهٖ مَا يَرْكَبُوْنَ﴾ [یس]

''ان کے لئے ایک نشانی (یہ بھی) ہے کہ ہم نے ان کی نسل کو بھری ہوئی کشتی میں سوار کیا۔ اور ان کے لئے اسی جیسی اور چیزیں پیدا کیں جن پر یہ سوار ہوتے ہیں۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اَلَمْ تَرَ اَنَّ الْفُلْكَ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِنِعْمَتِ اللّٰهِ لِيُرِيَكُمْ مِّنْ اٰيٰتِهٖ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ﴾ [لقمان ۳۱]

''کیا تم اس پر غور نہیں کرتے کہ دریا میں کشتیاں اللہ کے فضل سے چل رہی ہیں اس لئے کہ وہ تمہیں اپنی نشانیاں دکھا دے، یقیناً اس میں ہر ایک صبر و شکر کرنے والے کے لئے بہت سی نشانیاں ہیں۔''

بے شک حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گوش حق نیوش حضرت ابو بکر و عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم اور امت کے باقی لوگوں کے کانوں کی مانند تھے۔ تو اس صورت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کوئی خاص خصوصیت نہ ہوئی۔ یہ بات اضطراری طور پر معلوم ہے کہ صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کان ہی حق سننے والے نہیں ہیں۔ اس بات کو کون تسلیم کر سکتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم حسن و حسین اور عمار و ابو ذر؛ سلیمان الفارسی؛ اور مقداد اور سہل بن حنیف رضی اللہ عنہم جن کی فضیلت پر شیعہ ہمارے موافق ہیں' کیا ان کے کان آواز حق کو سننے والے نہ تھے؟ اگر یہی سننے اور یاد رکھنے والے کان دوسرے لوگوں کے بھی تھے تو پھر یہ کہنا جائز نہ ہوا کہ یہ فضیلت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علاوہ کسی دوسرے کو حاصل نہ ہو سکی تھی؟

بتایئے اب تفرد و افضلیت کی کونسی بات رہی؟ اس میں کوئی شک و شبہ والی بات نہیں کہ ظالم و جاہل شیعہ کے بیان کردہ مقدمات اسی طرح بے بنیاد ہوتے ہیں۔ اہل بدعت میں سے کسی ایسے گروہ کے متعلق علم نہیں ہو سکتا جن کے دلائل رافضیوں کے دلائل سے بڑھ کر بودے اور کمزور ہوں۔ بخلاف معتزلہ اور دوسرے لوگوں کے۔ اس لیے کہ ان کے پاس ایسے دلائل و براہین ہیں جن کی وجہ سے بڑے بڑے اہل علم و عقل بعض اوقات شبہ میں پڑ جاتے ہیں۔ جب کہ شیعہ کے براہین و دلائل بے حقیقت اور بودے ہوتے ہیں، ایسے دلائل کو وہی شخص تسلیم کر سکے گا جو ظالم اور جاہل ہو یا پھر جو ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کر چکا ہو یا صاحب بدعت و عصبیت ہو؛ اور جو چیز بھی اس کی خواہشات کے موافق ہو اسے قبول کرتا ہو خواہ وہ حق ہو یا باطل۔ اسی لیے یہ مقولہ زبان زد خاص و عام ہے کہ شیعہ عقل و نقل اور دین و مذہب سے بے گانہ اور حکومت و سلطنت سے عاری ہیں۔

پھر رافضیوں کی علمی تہی دامنی کا یہ عالم ہے کہ کسی چیز کے متعلق حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت ہونے کا دعوی کرتے ہیں؛ حالانکہ وہ ایسا ہوتا نہیں۔ پھر یہ دعوی کرتے ہیں کہ یہ فضیلت کسی اور کو حاصل نہیں ہو سکی۔ حالانکہ بسا اوقات وہ صحابہ کرام کے مشترکہ فضائل میں سے ہوتی ہے۔ اس لیے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے ثابت شدہ فضائل عام ہیں جن میں دوسرے صحابہ بھی آپ کے ساتھ شریک ہیں۔ بخلاف حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے۔ ان دونوں حضرات کے ایسے فضائل اور خصوصیات ہیں جن میں کوئی دوسرا ان کے ساتھ شریک نہیں ہے۔ پھر دوسرا دعوی کرتا ہے کہ اس فضیلت کی وجہ سے آپ کی امامت واجب ہوتی ہے۔ یہ بات معلوم ہونی چاہیے کہ کسی چیز میں جزوی فضیلت سے نہ ہی مطلق فضیلت لازم آتی ہے اور نہ ہی امامت۔ اور

ہی ایسی فضیلتیں امام کے لیے خاص ہوتی ہیں ۔ بلکہ امام اور دوسرے لوگوں کے لیے بھی ایسے فضائل ثابت ہوتے ہیں ۔ فاضل مطلق کے لیے بھی اور دوسروں کے لیے بھی۔

اس رافضی نے اپنے دعوی کو تین مقدمات پر قائم کیا تھا۔ یہ تینوں باطل ہوئے ؛ پھر چوتھا دعوی کیا ؛ اس میں بھی نزاع ہے ۔لیکن ہم اس میں ان سے کوئی اختلاف نہیں کرتے ۔ بلکہ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ جو افضل ہو وہی امامت کا مستحق ہے ۔لیکن اس مسئلہ میں رافضی کے پاس کوئی حجت نہیں ہے۔

امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اکیسویں دلیل:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:'' حضرت علی رضی اللہ عنہ کے امام ہونے کی اکیسویں دلیل آیت قرآنی: ﴿هَلْ أَتٰى﴾ ہے۔مفسر ثعلبی نے متعدد طرق سے روایت کیا ہے کہ حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما بیمار پڑ گئے ۔تو ان کے نانا اور عام عرب لوگ بیمار پرسی کے لیے آئے ۔لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا، ابوالحسن ! اپنے بچوں کے لیے نذر مانیے ۔آپ نے تین دن روزہ کی منت مانی۔اسی طرح ان کی والدہ نے بھی نذر مانی۔اور فضہ نامی ان کی لونڈی نے بھی ایسے ہی نذر مانی۔ چنانچہ بچے تندرست ہو گئے ۔گھر میں کھانے کو کچھ بھی نہ تھا۔حضرت علی رضی اللہ عنہ نے تین صاع جو قرض لیے ۔سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے انہیں پیسا اور اس سے پانچ روٹیاں پکائیں ۔ان میں سے ہر ایک کے لیے ایک روٹی ۔حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مغرب کی نماز پڑھی اور گھر آئے ۔آپ کے سامنے کھانا رکھا گیا تو ایک مسکین آ کر کھانا طلب کرنے لگا؛ اس نے کہا: السلام علیکم اے اہل بیت محمد ! مسکین مسلمانوں میں سے ایک مسکین ہوں؛ مجھے بھی کھانا کھلا دو ؛ اللہ تعالیٰ تمہیں جنت کے دستر خوانوں سے کھلائے گا ۔حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ آواز سن لی ؛ اور مسکین کو کھانا دینے کا حکم دیا۔ چنانچہ کھانا مسکین کو دے دیا اور شب و روز پانی کے سوا کچھ نہ کھایا۔

جب دوسرا روز ہوا تو سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے کھانا پکایا۔حضرت علی رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کیساتھ نماز پڑھ کر گھر تشریف لائے ۔آپ کے سامنے کھانا لاکر رکھا گیا؛ اتنے میں ایک یتیم آ کر دروازہ پر کھڑا ہوگیا اور کھانا طلب کرنے لگا اس نے کہا: السلام علیکم اے اہل بیت محمد ! '' اے محمد کے گھر والو! میں مہاجرین کی اولاد میں سے یتیم ہوں۔ میرے والد یوم العقبہ کو شہید ہوئے تھے، مجھے کھانا کھلاؤ، اللہ تعالیٰ تمہیں جنت کے دستر خوان پر سے کھانا کھلائے گا۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ آواز سن لی ؛ اور اسے کھانا دینے کا حکم دیا۔تو وہ کھانا اسے دیدیا گیا۔اور خود حضرت علی رضی اللہ عنہ [اور ان کے اہل خانہ] نے دو دن اور دو راتیں پانی کے سوا کچھ نہ کھایا۔

اس طرح جب تیسرا دن ہوا تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے تیسرا صاع جو کا پیسا ' اور اس سے روٹیں پکائیں؛ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مغرب کی نماز پڑھی اور گھر آئے ۔آپ کے سامنے کھانا رکھا گیا تو ایک قیدی آ کر کھانا طلب کرنے لگا؛ اس نے کہا: کیا آپ ہمیں قیدی بناتے ہیں اور پھر ہمیں بھگاتے ہیں ؛ اور ہمیں کھانا نہیں کھلاتے ۔ میں اسیر محمد ہوں' مجھے کھانا کھلاؤ، اللہ تعالیٰ تمہیں جنت کے دستر خوان پر سے کھانا کھلائے گا۔'' حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ آواز سن لی ؛ اور اسے کھانا دینے کا حکم دیا۔تو وہ کھانا اسے دیدیا گیا۔اور خود حضرت علی رضی اللہ عنہ [اور ان کے

اہل خانہ] نے تین دن اور تین راتیں پانی کے سوا کچھ نہ کھایا۔

چوتھے روز جب آپ نے اپنی نذر پوری کردی ؛ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت حسن کو اپنے دائیں ہاتھ میں اور حضرت حسین کو اپنے بائیں ہاتھ میں پکڑا ؛ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے ۔ بھوک کی شدت سے ایسے کانپ رہے تھے جیسے چھوٹے چوزے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں دیکھا تو فرمایا: ''اے ابوالحسن ! تمہاری اس حالت نے مجھے بہت پریشان کردیا۔ میرے ساتھ میری بیٹی فاطمہ کے گھر چلو۔'' آپ ان کے پاس چلے گئے ۔اس وقت حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اپنے حجرہ میں تھیں ۔اور بھوک کی شدت کی وجہ سے آپ کا پیٹ پیٹھ سے لگ رہا تھا۔اور آپ کی آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں ۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو دیکھا تو چلائے : ہائے غوث ! اللہ کی قسم ! کیا اہل بیت محمد ایسے ہی بھوک سے مرجائیں گے ۔ اس وقت جبرائیل نازل ہوئے' اور فرمایا: ''اے محمد ! اللہ تعالیٰ نے آپ کو آپ کے اہل بیت کے بارے میں خوشخبری دی ہے ۔آپ نے پوچھا : اے جبریل کیا لیکر آئے ہو؟ تو آپ نے یہ آیت پڑھی: ﴿هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ﴾ ''کیا انسان پر ایسا وقت نہیں آیا۔''

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ گوناگوں اوصاف کے حامل تھے؛ جو آپ سے پہلے کسی اور کو نہیں ملے ۔اور نہ ہی کوئی آنے والا یہ اوصاف پاسکے گا؛ تو اس لحاظ سے آپ باقی لوگوں سے افضل ہوئے ۔پس یہ ان کے امام ہونے کی دلیل ہے۔'' [شیعہ کا بیان ختم ہوا]۔

[جواب]: اس کا جواب کئی طرح سے دیا جاسکتا ہے:

❀ **پہلی بات** : ہم شیعہ مصنف سے مطالبہ کرتے ہیں کہ اس کی صحت ثابت کرے ۔ جیسا کہ اس سے پہلے بھی ہم یہ مطالبہ کر چکے ہیں ۔کسی بات کو صرف واحدی' ثعلبی یا ان جیسے لوگوں کا روایت کرلینا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ یہ روایت بھی صحیح اور قابل حجت ہے ۔اس پر تمام اہل سنت اور شیعہ کا اتفاق ہے ۔ اگر دو فریقین کے مابین احکام و فضائل کے مسائل میں سے کسی ایک مسئلہ پر اختلاف ہوجائے ؛ اور ان میں سے ایک کوئی ایسی حدیث پیش کرے جس کی صحت کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہ ہو' سوائے اس کے کہ ان جیسے مفسرین نے اسے نقل کیا ہے۔تو یہ اس روایت کے صحیح ہونے کی دلیل نہ ہوگی ۔اور نہ ہی اس سے فریق مخالف پر حجت قائم ہوگی ۔اس پر تمام علماء کا اتفاق ہے۔

شیعہ کی عادت ہے کہ ایسی روایت پیش کرتے ہیں جو کسی دوسرے نے نقل کی ہو۔ان میں سے اکثر کو یہ علم نہیں ہوتا کہ کیا یہ روایت صحیح ہے یا ضعیف؟ اور ایسی حکایات اور اسرائیلی روایات نقل کرتے ہیں جن کے متعلق باقی لوگ جانتے ہیں کہ اصل میں یہ پوری کہانی ہی باطل ہے ۔اس کی وجہ ہے کہ شیعہ کا کام ہی فقط نقل کو نقل کرنا ہے ۔ یا لوگوں کے اقوال کو آگے چلانا ہے؛ بھلے اس میں بہت ساری چیزیں سرے سے ہی باطل ہوں ۔ بسا اوقات بعض منقولات کی صحت اور ضعف پر کلام کرتے ہیں مگر یہ ان کے ہاں کوئی پکا اصول نہیں اور نہ ہی اس کا التزام کرتے ہیں ۔

❀ **دوسری بات** : یہ روایت بہ اتفاق محدثین موضوع ہے ۔ جو لوگ اس فن کے امام ہیں وہ اس کے موضوع ہونے میں ذرہ بھر شک و شبہ نہیں کرتے ۔اس باب میں ان ہی لوگوں کی بات مانی جاتی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ یہ روایت کسی بھی ایسی

قابلِ اعتبار مستند کتاب حدیث میں موجود نہیں جس کی طرف رجوع کیا جاتا ہو۔ یہ روایت نہ ہی صحاح میں منقول ہے' نہ ہی مسانید میں ؛ نہ ہی جوامع میں اور نہ ہی سنن میں۔ اور نہ ہی مصنفین نے اسے فضائل صحابہ کی کتابوں میں نقل کیا ہے۔ اگر چہ یہ لوگ ضعیف روایات بھی نقل کر دیتے ہیں۔[مگر اس روایت کا نام و نشان تک نہیں ملتا]۔ جیسے کہ امام نسائی کی جمع کردہ کتاب ''خصائص علی'' میں صحیح و ضعیف ہر قسم کی روایتیں فضائل علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں جمع کی گئی ہیں۔ مگر یہ روایت اس میں بھی مذکور نہیں۔ اسی طرح ابو نعیم کی کتاب الخصائص؛ خیثمہ بن سلیمان اور امام ترمذی نے اپنی ''الجامع '' میں فضائل علی کی ضعیف احادیث نقل کی ہیں، مگر ان کتب میں سابق الذکر روایت کا کوئی نشان نہیں ملتا؛ جس سے اس کا موضوع ہونا ظاہر ہو جاتا ہے۔[اصحاب السِیَر مثلاً ابن اسحاق نے بھی فضائل علی پر مشتمل احادیث ضعیفہ ذکر کی ہیں مگر یہ روایت بیان نہیں کی جو بہ اتفاق اہل نقل موضوع ہے]۔

❀ **تیسری بات**: اس روایت کے جھوٹ ہونے پر بہت سے دلائل موجود ہیں۔ ان میں سے ایک یہ کہ:

یہ تاریخ کی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ و فاطمہ کا نکاح مدینہ میں ہوا؛ اور غزوہ بدر کے بعد آپ کی رخصتی ہوئی۔ جیسا کہ صحیح احادیث میں ثابت ہے۔ اور حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما اس کے بعد پیدا ہوئے۔ ان کی تاریخ پیدائش سن تین اور چار ہجری ہے۔ لوگوں کا اتفاق ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مدینہ میں شادی کی ؛ اور آپ کے بچے مدینہ میں پیدا ہوئے۔ یہ عام اور متواتر علم ہے۔ جسے ہر وہ انسان جانتا ہے جسے علم سے کوئی ادنیٰ شغف بھی ہو۔

[نیز یہ کہ] سورۃ الدہر باتفاق مفسرین مکی ہے۔[اس سے سابق الذکر روایت کا کذب ظاہر ہو گیا]۔ کسی ایک مفسر نے بھی یہ نہیں کہا کہ: یہ سورت مدنی ہے۔ انبیاء کرام علیہم السلام کے مابین مشترکہ اصول دین کے بیان کے لحاظ سے بھی یہ سورت مکی سورتوں کے ڈھب پر ہے۔ جیسا کہ ایمان باللہ؛ آخرت پر ایمان ؛ پیدائش اور بعث کا ذکر [اس سورت کے موضوع ہیں]۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم الم تنزیل کے ساتھ جمعہ کے دن فجر کی نماز میں یہ سورت بھی پڑھا کرتے تھے۔ اس لیے کہ اس دن آدم کی پیدائش ہوئی' اسی دن جنت میں داخل ہوئے' اور اسی دن قیامت قائم ہوگی۔[البخاری ۲/ ٥، ومسلم ۲/ ٥٩٩]۔

یہ دونوں سورتیں آسمان، زمین کی پیدائش' آدم کی پیدائش اور ایک گروہ کے جنت میں اور دوسرے گروہ کے جہنم میں جانے کے ذکر کو شامل ہیں۔ جب یہ سورت ہی مکہ مکرمہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شادی سے پہلے نازل ہوئی ہے تو پھر واضح ہو گیا کہ یہ کہنا کہ یہ سورت حضرت حسن اور حسین رضی اللہ عنہما کے بیمار ہونے کے بعد نازل ہوئی' سراسر کھلا ہوا جھوٹ ہے۔

❀ **چوتھی بات**: اس حدیث کا سیاق اور اس کے الفاظ دلالت کرتے ہیں کہ روایت دجالوں نے اپنی طرف سے گھڑی ہوئی ہے۔ ان میں سے پہلا کلمہ ہے کہ:'' فعادهما جدهما و عامة العرب۔''

اس لیے کہ عام عرب لوگ مدینہ میں مقیم نہ تھے۔ اور نہ ہی کفار عرب ان کے پاس آتے اور ان کی عیادت کرتے تھے۔

پھر اس روایت میں دوسرا کلمہ ہے کہ:'' فقالوا: يا ابا الحسن! لو نذرت على ولديك......الخ۔''

''اے ابو الحسن اگر آپ اپنے بیٹوں پر نذر مانیں۔'' اگر ایسا ہوتا تو پھر آپ عرب لوگوں سے دین نہ لیتے بلکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے لیتے۔ اس لیے کہ اگر نذر ماننا اطاعت کا کام تھا؛ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس بات کے زیادہ حق دار تھے کہ آپ

انہیں اس کا حکم دیتے ؛ عام عرب لوگ اس کا نہ کہتے ۔ اور اگر یہ اطاعت کا کام نہیں تھا تو پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ان عام عرب لوگوں کی بات ماننے کی کوئی ضرورت نہ تھی ۔ پھر یہ کہ نبی کریم ﷺ سے رجوع کیے بغیر عام لوگوں کی بات کیسے مان لی ؟ ۔

❀ **پانچویں بات** : صحیحین میں ثابت ہے کہ نبی ﷺ نے نذر ماننے سے منع کیا ہے اور فرمایا ہے:

''اس سے کچھ فائدہ نہیں پہنچتا ۔ البتہ بخیل کا مال ضرور نکل جاتا ہے ۔'' [1]

اور ایک دوسری روایت میں ہے :

'' بیشک نذر ابن آدم کو تقدیر کی طرف ہی لوٹاتی ہے ۔ پس وہ نذر پر وہ کچھ دیتا ہے جو کسی دوسری چیز پر نہیں دیتا ۔''

نبی کریم ﷺ نذر ماننے سے منع فرمایا کرتے تھے ۔ آپ فرمایا کرتے تھے : نذر کسی خیر کو نہیں لاتی ؛ بلکہ نذر ابن آدم کو تقدیر کی طرف ہی لوٹاتی ہے ۔ اگر حضرت علی اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہما اور ان کے اہل خانہ جیسے لوگ اس جیسی حدیث کو نہیں جان سکے جسے عام مسلمان بھی جانتے ہیں ' تو پھر یہ ان کے علم پر قدح وتنقید ہے تو ان کا معصوم ہونا کہاں گیا ؟

اگر انہیں اس کا پتہ تھا مگر پھر بھی انہوں نے ایسا کام کیا جس میں نہ ہی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت ؛ اور نہ ہی ان کے لیے کوئی فائدہ ۔ بلکہ اس سے منع کیا گیا تھا ۔ اور نہی یا تو تحریم کے لیے ہوتی ہے یا پھر تنزیہ کے لیے ۔ تو ہر دو طرح سے یہ یا تو ان کے دین پر قدح وارد ہوتی ہے یا پھر عقل اور علم پر ۔

اور جو انسان اس قسم کے فضائل نقل کرتا ہے ' حقیقت وہ چٹا جاہل ہے ۔ وہ مدح کے روپ میں ان کی مذمت بیان کرتا ہے ۔ اور انہیں بلند کرنے کے انداز میں نیچے گراتا ہے ۔ اور ان کی تعریف کی الفاظ میں مذمت بیان کرتا ہے ۔

اللہ تعالیٰ نے ایفاء نذر کی تعریف کی ہے ، مگر نذر ماننے کو قابل تعریف فعل قرار نہیں دیا ۔ جس طرح ظہار (بیوی سے یوں کہنا کہ تو میرے لیے اسی طرح ہے جیسے میری ماں کی پیٹھ) کوئی قابل تعریف فعل نہیں ہے ، مگر کوئی شخص جب ظہار کرتا ہے تو اس پر ظہار کا کفارہ واجب ہو جاتا ہے ۔ اور جب اس کا مرتکب ہو اور کفارہ ادا کر دے تو واجب کی ادائیگی پر یہ ایک ممدوح فعل ہے ۔ نہ کہ ظہار کا ارتکاب کرنے پر ممدوح ہے ؛ اس لیے کہ ظہار حرام ہے ۔ ایسے ہی جب انسان اپنی بیوی کو طلاق دیدے اور پھر اسے اچھے طریقے سے رخصت کر دے ؛ تو طلاق کی وجہ سے واجب ہونے والے فریضہ کی ادائیگی پر وہ ممدوح ٹھہرے گا ۔ بذات خود طلاق کوئی اچھی چیز نہیں ہے ' بلکہ مکروہ امور میں سے ہے ۔

ایسے ہی جو انسان خرید وفروخت کرے اپنے ذمہ کی ادائیگی کرے تو اس عقد خرید وفروخت کی وجہ سے اس پر جو کچھ واجب ہوا تھا اس کی ادائیگی پر وہ قابل تعریف ٹھہریگا ۔ صرف عقد پر اس کی کوئی تعریف نہیں ہوگی ۔ اس کی مثالیں بہت زیادہ ہیں ۔

❀ **چھٹی بات** : حضرت علی رضی اللہ عنہ یا سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی کوئی لونڈی فضہ نامی نہیں تھی ۔ بلکہ نبی کریم ﷺ کے اقارب میں سے کسی کے پاس کوئی لونڈی نہیں تھی ۔ بلکہ مدینہ بھر میں اس نام کی کوئی کنیز نہ تھی ۔ اور اہل علم میں سے جن لوگوں نے چھوٹے بڑے ہر قسم کے احوال جمع کیے ہیں ؛ ان میں سے کسی ایک نے ایسی کسی لونڈی کا ذکر تک نہیں کیا ۔

---

[1] صحیح بخاری ، کتاب الأیمان والنذور ۔ باب الوفاء بالنذر ، (حدیث:٦٦٩٣) ، صحیح مسلم ، کتاب النذر ۔ باب النهي عن النذر (حدیث:١٦٣٩) ۔

یہ فضہ بالکل ویسے ہی ہے جیسے ''ابن عقب'' ایک فرضی نام وضع کیا گیا ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ حضرت حسن وحسین رضی اللہ عنہما کا استاد تھا؛ اور اسے ایک سیب دیا گیا تھا جس میں مستقبل میں پیش آنے والے حوادث کا علم تھا۔[حالانکہ اس نام کا کوئی آدمی نہ تھا]۔اس کے علاوہ بھی اس طرح کی جھوٹی کہانیاں گھڑلی گئی جنہیں جاہل لوگوں میں پھیلایا جارہا ہے ۔اہل علم کا اجماع ہے کہ حسن وحسین رضی اللہ عنہما کا کوئی استاذ و مدرس نہیں تھا۔اور صحابہ کرام میں ابن عقب نامی کوئی آدمی نہیں تھا۔

جو جنگی مرثیے ابن عقب کی طرف منسوب ہیں'انہیں بہت بعد کے بعض جہال [ودجال] روافض نے نظم کیا ہے۔جو کہ صلاح الدین ایوبی اور نورالدین کے زمانے کے لوگ تھے۔جس وقت شام کا بہت بڑا حصہ عیسائیوں کے ہاتھوں میں تھا؛ اور مصر بنوعبید کے بقایا ملحدین قرامطی شیعہ کے زیر دست تھا۔ان مرثیوں میں وہ کچھ بیان کیا ہے جو اس وقت کے حساب سے مناسب تھا؛ ایسی نظم کوئی عام آدمی بھی لکھ سکتا ہے۔

یہی حال اس فضہ نامی لونڈی کا ہے۔بخاری و مسلم میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک خادم طلب کیا۔آپ نے فرمایا کہ:

((سوتے وقت سومرتبہ سبحان اللہ و الحمد للہ اور اللہ اکبر پڑھ لیا کرو۔ یہ خادم سے بہتر ہے۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں : جب سے میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سنا ہے تب سے یہ وظیفہ ترک نہیں کیا ۔آپ سے پوچھا گیا:صفین کی رات بھی؟ آپ نے فرمایا صفین کی رات بھی نہیں چھوڑا ۔))[صحیح بخاری:ج۱،ح 1345۔]

اس روایت کے صحیح ہونے پر اہل علم کا اتفاق ہے ۔اس حدیث کی روشنی میں پتہ چلتا ہے کہ حضرت فاطمہ کو کوئی خادم نہیں دیا گیا۔اگر اس کے بعد کہیں سے کوئی خادم آ گیا ہو تو ممکن ہے ایسا ہو سکتا ہے ۔مگر فضہ نام کی کوئی باندی نہیں تھی۔

❀ **ساتویں بات** : صحیح حدیث میں ثابت ہے کہ ایک انصاری گھرانے نے اپنے مہمان کو رات کے کھانے میں ترجیح دی ۔انہوں نے اپنے بچوں کو بھی بھوکا سلا دیا اور خود میاں بیوی بھی بھوکے پیٹ سو گئے ۔ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ﴾ [الحشر ۹]

''بلکہ خود اپنے اوپر انہیں ترجیح دیتے ہیں گو خود کتنی ہی سخت حاجت ہو۔''

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ﴾ [الإنسان ۸]

''اور اللہ تعالی کی محبت میں کھانا کھلاتے ہیں مسکین یتیم اور قیدیوں کو۔''

یہ آیت اس دوسری آیت کی طرح ہے جس میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ اٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنَ ﴾ [البقرة ۱۷۷]

''اور وہ دیتا ہے مال اللہ کی محبت میں قریبی رشتہ داروں کو یتیموں کو اور مساکین کو۔''

صحیح بخاری میں ہے کہ: ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کون سا صدقہ اجر کے اعتبار سے زیادہ بڑا ہے؟ آپ نے فرمایا: اگر تو صدقہ کرے اس حال میں کہ تندرست ہے، بخیل ہے اور فقر سے ڈرتا ہے اور مال داری کی امید کرتا ہے اور نہ توقف کرا تا کہ جان حلق تک آجائے اور تو کہے کہ اتنا مال فلاں شخص کے لئے ہے

اور اتنا مال فلاں شخص کو دے دیا جائے حالانکہ اب تو وہ مال فلاں کا ہو ہی چکا ہے۔'' ❶

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾ [آل عمران ۹۲]

''جب تم اپنی پسندیدہ چیز سے اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ نہ کرو گے ہرگز بھلائی نہ پا گے۔''

پس جس چیز کو انسان پسند کرتا ہے اس جنس کے تحت صدقہ کرنے کی کوئی انواع و اقسام ہیں۔مگر اپنی انتہائی سخت ضرورت کے باوجود اپنے پر دوسرے کو ترجیح دینا؛ یہ صرف محبت میں صدقہ کرنے سے زیادہ افضل اور اجر و ثواب میں بڑھ کر ہے۔اس لیے کہ ہر ایک صدقہ کرنے والا محبت کرنے والا اور ذاتی ضرورت پر ترجیح دینے والا نہیں ہوسکتا۔اور نہ ہی ہر صدقہ دینے والے کو خود انتہائی سخت ضرورت ہوتی ہے۔ بلکہ ایسا ہوسکتا ہے کہ انسان اپنی پسندیدہ چیز میں سے کچھ صدقہ بھی کرے اور کچھ اپنی ضرورت کے لیے بچا کر بھی رکھ لے۔حالانکہ اس کی محبت انتہائی سخت ضرورت کو نہیں پہنچی ہوتی۔

پس جب اللہ تعالیٰ نے اس رات میں مہمان کو ترجیح دینے پر انصاری گھرانے کی ان الفاظ میں مدح کی ہے؛ تو پھر اس قصہ میں اہل بیت کا جو ایثار نقل کیا گیا ہے یہ انصاری کے ایثار سے بہت بڑھ کر ہے؛ اگر ایسا کرنا ہر حال میں قابل مدح ہے تو مناسب تھا کہ اس پر بہت زیادہ مدح کی جاتی اور اگر یہ فعل قابل مدح و تعریف نہیں تو پھر اسے مناقب میں ذکر نہیں کیا جاسکتا۔

❀ **آٹھویں بات**: یہ ایسا قصہ ہے کہ اس کا حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی طرف منسوب نہ کرنا ہی بہتر ہے۔اس لیے کہ یہ شرعی حکم کے خلاف ہے۔کیونکہ تین شب و روز تک بچوں کو کھانا نہ کھلانا خلاف شرع ہے۔
[اور ہلاکت کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ پہلے اپنے اہل و عیال کو کھلاؤ۔''] ❷

تین دن تک انہیں مسلسل بھوکا رکھنے سے بدنی و عقلی کمزوری کے ساتھ صحت کی خرابی اور دین میں فساد کا سبب بن سکتی ہے۔یہ اس انصاری کے قصہ کی طرح ہرگز نہیں ہے جس میں انہوں نے بچوں کو صرف ایک رات کے لیے بھوکا سلایا تھا۔اس لیے کہ بچے اتنا تو برداشت کرسکتے ہیں؛ مگر تین دن اور تین رات تک ایسا نہیں کرسکتے۔

❀ **نویں بات**: پھر اس یتیم بچے کا قصہ جس کا یہ قول ہے کہ: ''میرے والد یوم العقبہ شہید ہوگئے تھے۔'' صاف اور کھلا ہوا جھوٹ ہے، اس لیے کہ عقبہ کی رات صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کی گئی تھی لڑائی نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ اس رات انصار نے بیعت کی تھی ۔ یہ ہجرت سے پہلے کا واقعہ ہے۔اس وقت تک جہاد کا حکم نازل ہی نہیں ہوا تھا۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ روایت تو جھوٹی ہے' یہ معاملہ اپنی جگہ پر؛ مگر اس قصہ کو نقل کرنے والا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال سے انتہائی بیگانہ اور جاہل انسان ہے۔[اسے یہ بھی پتہ نہیں کہ عقبہ کی رات کیا ہوا تھا] اس کے بجائے اگر یوں کہہ دیتا کہ ''احد کے دن میرے والد شہید ہوگئے تھے'' تو پھر بھی کوئی بات بنتی تھی۔

❀ **دسویں بات**: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خود شہداء کے یتیم بچوں کی کفالت فرمایا کرتے تھے۔اسی لیے جب حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے خادم مانگا تو آپ نے فرمایا: ''میں شہدائے بدر کے بچوں کو چھوڑ کر تمہیں نہیں دے سکتا۔''

اب اگر کوئی یہ کہے کہ: وہ شہداء مجاہدین کے یتیموں میں سے تھا؛ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کی کفالت نہیں کیا کرتے تھے تو

❶ البخاري، كتاب الدعوات (ح:٦٣١٨)، صحيح مسلم، كتاب الذكر والدعاء باب التسبيح...... (ح:٢٧٢٧)۔
❷ صحيح بخاري، كتاب الزكاة، باب لا صدقة الا عن ظهر غنى (حديث: ١٤٢٦، ١٤٢٧)۔

یہ انتہائی بڑا جھوٹ اور دروغ گوئی ہوگی۔

❀ **گیارھویں بات** : مدینہ میں قیدی بھیک نہیں مانگا کرتے تھے۔ بلکہ مسلمان ہر طرح ان کی ضروریات کی کفالت کیا کرتے تھے۔ لہٰذا یہ کہنا کہ ایک قیدی مدینہ میں بھیک مانگا کرتا تھا، صحابہ کرام پر جھوٹ اور ان کی شان میں قدح ہے۔ قیدیوں کی بڑی تعداد بدر کے دن آئی تھی۔ یہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی شادی سے پہلے کا واقعہ ہے۔ اس کے بعد تو قیدی انتہائی کم تعداد میں ہوا کرتے تھے۔

❀ **بارھویں بات** : اگر مان لیا جائے کہ یہ قصہ صحیح ہے۔ اور اس کا شمار فضائل میں ہوتا ہے۔ تو پھر بھی اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس قصہ والا لوگوں میں سب سے افضل ہو۔ اور نہ ہی یہ لازم آتا ہے کہ باقی لوگوں کو چھوڑ کر آپ ہی امام ہوں۔ حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سب لوگوں کی نسبت غرباء کو زیادہ کھانا کھلایا کرتے تھے۔ [1] یہاں تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی شان میں فرمایا تھا: ''آپ کی سیرت وصورت میرے جیسی ہے۔'' [2]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مساکین اور فقراء کے ساتھ لطف و احسان کے سلسلہ میں کوئی شخص حضرت جعفر رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش قدم پر نہیں چلا۔ [3] اس کے علاوہ بھی آپ کے فضائل ہیں' تاہم ان فضائل کی بنا پر حضرت جعفر رضی اللہ عنہ علی رضی اللہ عنہ یا دوسرے صحابہ کی نسبت افضل نہیں تھے۔ چہ جائے کہ ان فضائل کی بنا پر کوئی ان کے لیے امامت کا دعوی کرنے لگے۔

❀ **تیرھویں بات** : یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا انفاق فی سبیل اللہ عام طور سے معروف اور اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو محبوب تھا۔ بیشک بھوکے کو کھانا کھلانا بھی صدقات کی جنس میں سے ہے۔ قیامت تک کوئی بھی انسان صدقہ کرسکتا ہے۔ بلکہ تمام امت کے لوگ بھوکوں اور مساکین کو کھانا کھلاتے ہیں' خواہ وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم۔ بھلے بعض لوگ اس سے تقرب الی اللہ نہ بھی چاہتے ہوں۔ جب کہ مسلمانوں کا مقصود اللہ تعالیٰ کی رضامندی کا حصول ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے وہ دوسرے لوگوں میں امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا﴾ [الإنسان ۹]

''ہم تمہیں صرف اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے لئے کھلاتے ہیں نہ تم سے بدلہ چاہتے ہیں نہ شکر گزاری۔''

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا انفاق انتہائی رشک کے قابل ہے۔ آپ اسلام کے ابتدائی دور میں اہل ایمان غلاموں کو آزاد کرانے ؛ قیدیوں کو چھڑانے کے لیے اللہ کی راہ میں خرچ کرتے۔ کفار آپ کو اس پر اذیت دیتے' اور آپ کے قتل کے درپے رہتے۔ آپ نے اپنے مال سے سات غلام خرید کر آزاد کیے جنہیں اللہ کی راہ میں عذاب دیا جاتا تھا۔ انہی میں سے ایک بلال بھی ہیں۔ حتی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے : أبو بکر رضی اللہ عنہ ہمارے سردار ہیں' اور آپ نے ہمارے سردار کو آزاد کیا ہے۔'' اس سے مراد حضرت بلال رضی اللہ عنہ ہوا کرتے تھے۔

---

[1] صحیح بخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ باب مناقب جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ (حدیث:۳۷۰۸)

[2] صحیح بخاری، کتاب الصلح ، باب کیف یکتب هذا ما صالح فلان..... (حدیث: ۲۶۹۹) مطولاً۔

[3] سنن ترمذی، باب مناقب جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ (ح: ۳۷٦٤) ، ومستدرك حاكم(۳/ ۲۱۱) بمعناه۔

اہل ایمان محتاجین اور اسلام کی نصرت کے لیے آپ کا انفاق فی سبیل اللہ ایک علیحدہ باب ہے۔آپ اس وقت اس راہ میں خرچ کرتے تھے جب تمام روئے ارض کے باسی اسلام کے دشمن تھے۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے انفاق جیسا انفاق آج کل ممکن ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''میرے صحابہ کو برا نہ کہو مجھے اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اگر تم میں سے کوئی شخص احد پہاڑ کے برابر سونا خرچ کرے تو صحابہ کے عشر عشیر کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔''❶

اس طرح کا انفاق آپ کے ساتھ ہی خاص ہے۔ باقی رہ گیا مطلق طور پر بھوکوں کو کھانا کھلانا؛ یہ مشترکہ قدر ہے؛ قیامت تک اس پر عمل کیا جانا ممکن ہے۔

فصل:

امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بائیسویں دلیل

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:''امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بائیسویں دلیل یہ آیت ہے:

﴿وَالَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَ صَدَّقَ بِهٖ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ﴾ (الزمر:۳۳)

''اور جو سچے دین کو لائے اور جس نے اس کی تصدیق کی یہی لوگ پارسا ہیں۔''

ابونعیم مجاہد سے روایت کرتے ہیں کہ ﴿وَالَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ﴾ اس سے مراد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں' اور ﴿وَ صَدَّقَ بِهٖ﴾ سے مراد حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔اور فقیہ شافعی نے مجاہد سے نقل کیا ہے کہ:﴿وَالَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَ صَدَّقَ بِهٖ﴾ سچائی لانے والے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور سچائی کی تصدیق کرنے والے حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عظیم خصوصیت ہے لہٰذا آپ امام وخلیفہ ہوں گے۔'' [شیعہ کا بیان ختم ہوا]۔

[جواب]: ہم اس کا جواب کئی طرح سے دے سکتے ہیں:

❀ **پہلی بات:** یہ تفسیر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول نہیں ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ اس ضمن میں صرف اکیلے حضرت مجاہد کا قول اگر ثابت ہو جائے تو بھی ایسی حجت نہیں کہ تمام مسلمانوں پر اس کی اتباع واجب ہو۔ حالانکہ مجاہد سے یہ روایت ثابت ہی نہیں بلکہ اس کے خلاف ثابت ہے۔اس لیے کہ مجاہد سے نقل کردہ روایات میں جھوٹ کی کثرت ہے۔[آپ سے نقل کرنے والا جھوٹ بولتا ہے]۔

مجاہد کا قول ہے کہ صدق سے قرآن مراد ہے۔اور ''صَدَّقَ بِهٖ'' سے مراد وہ مؤمن ہے جو اس پر عمل کرے۔اس لحاظ سے یہ حکم عام ہے۔ امام طبری رحمہ اللہ اور دوسرے مفسرین نے حضرت مجاہد رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے آپ فرماتے ہیں: اس سے مراد وہ اہل قرآن ہیں جنہیں قیامت کے دن پیش کیا جائے گا۔اور وہ[اللہ تعالیٰ سے قرآن کے بارے میں] کہیں گے: یہی وہ چیز ہے جو آپ نے ہمیں دی تھی اور ہم اس پر عمل کرتے رہے۔

❶ صحیح بخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم ، "لوکنت متخذا خلیلا" (ح:۳۶۷۳)، صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابۃ ۔ باب تحریم سب الصحابۃ (ح:۲۵۴۱)۔

ابوسعید الاشج نے روایت کیا ہے؛ فرمایا: ہم سے ادریس نے بیان کیا؛ وہ لیث اور وہ مجاہد۔رحمہ اللہ۔ سے یہی تفسیر روایت کرتے ہیں۔ نیز [دوسری سند سے اس کی تفسیر بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں] ہم سے محاربی نے بیان کیا؛ وہ جویبر سے وہ ضحاک سے نقل کرتے ہیں: آپ فرماتے ہیں: "صَدَّقَ بِہٖ" سے مراد تمام مؤمن ہیں۔

مفسر ابن ابی حاتم رحمہ اللہ اپنی سند سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کرتے ہیں' وہ فرماتے ہیں: "صَدَّقَ بِہٖ" سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

❀ دوسری بات: شیعہ کا قول جمہور مفسرین کے ہاں مشہور تفسیر کے خلاف ہے جو کہتے ہیں کہ: اس آیت میں: "جَـــــاءَ بِالصدق" سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور "صَدَّقَ بِہٖ" سے مراد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں۔ مفسرین کی ایک جماعت نے یہی تفسیر بیان کی ہے۔

ابن جریر طبری، اور دیگر مفسرین نے اپنی اسناد سے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہ تفسیر نقل کی ہے کہ آپ فرماتے ہیں:

"جَاءَ بِالصدق" سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور "صَدَّقَ بِہٖ" سے مراد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں۔

یہ بات بعض مفسرین نے ابوبکر بن عبد العزیز بن جعفر الفقیہ ؛ جو کہ حضرت ابوبکر الخلال رحمہ اللہ کے غلام ہیں ؛ سے اس آیت کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انھوں نے فرمایا: "یہ آیت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی شان میں نازل ہوئی۔

معترض نے کہا: یہ آیت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ یہ سن کر ابوبکر الفقیہ نے کہا: "اس آیت سے آگے تلاوت کیجیے: ﴿اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُتَّقُوْنَ﴾ سے لے کر آگے تک: ﴿فَکَفَّرَ اللّٰہُ اَسْوَاَ الَّذِیْ عَمِلُوْا﴾(الزمر ۳۵)

"تاکہ اللہ تعالیٰ ان سے ان کے برے عملوں کو دور کر دے۔"

[اس نے جب یہ آیت پڑھی تو ابوبکر الفقیہ نے کہا: "حضرت علی رضی اللہ عنہ تمہارے نزدیک معصوم ہیں، پھر ان سے کون سے گناہ دور کیے جائیں گے]۔ معترض لاجواب ہوگیا۔

❀ تیسری بات: جہاں تک آیت کے الفاظ کا تعلق ہے وہ عام اور مطلق ہیں ان میں نہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی کوئی تخصیص ہے اور نہ ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی؛ بلکہ جو بھی اس کے عموم میں شامل ہوں وہ اس حکم میں داخل ہو سکتے ہیں۔ اس بات میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ حضرت ابوبکر وعمر اور عثمان وعلی رضی اللہ عنہم اجمعین اس امت میں سے اس آیت کے حکم میں داخل ہونے کے سب سے زیادہ حق دار ہیں؛ لیکن پھر بھی یہ آیت ان کے ساتھ خاص نہیں۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ کَذَبَ عَلَی اللّٰہِ وَکَذَّبَ بِالصِّدْقِ اِذْ جَآءَہٗ اَلَیْسَ فِیْ جَھَنَّمَ مَثْوًی لِّلْکٰفِرِیْنَ ☆ وَالَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِہٖ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴾ [الزمر ۳۲۔۳۳]

"پھر اس شخص سے بڑا ظالم کون ہوگا جس نے اللہ پر جھوٹ باندھا اور جب سچائی اس کے سامنے آئی تو اسے جھٹلا دیا۔ کیا ایسے لوگوں کے لیے جہنم میں کوئی ٹھکانا نہیں ہے؟ اور جو شخص سچائی لے کر آیا اور جنہوں نے اس کو سچ مانا، وہی عذاب سے بچنے والے ہیں۔"

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اللہ پر جھوٹ بولنے والوں اور حق بات جھٹلانے والوں کی مذمت کی ہے۔ اور یہ ایک عام حکم

ہے ۔ رافضی سب سے بڑے اہل بدعت ہیں جو اس مذموم وصف میں داخل ہیں ۔اس لیے کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ پر سب سے زیادہ بہتان گھڑنے والے ہیں ۔اور جب سچ بات ان تک پہنچتی ہے تو اسے سب سے زیادہ جھٹلانے والے ہوتے ہیں ۔ اور سچائی کی تصدیق کرنے میں سب سے زیادہ دور رہنے والوں میں سے ہیں ۔

خالص اہل سنت اس آیت کے مصداق ہونے کے سب سے بڑے حق دار ہیں ۔اس لیے کہ وہ سچ بولتے ہیں ؛ اور جب کہیں سے بھی حق بات انہیں مل جاتی ہے تو اس کی تصدیق کرتے ہیں ۔ ان کی تمام تر خواہشات حق کے ساتھ ہوتی ہیں ۔ اللہ تعالیٰ نے سچائی کا پیغام لانے والے اور اس کی تصدیق کرنے والے کی مدح و توصیف بیان کی ہے ۔ یہ تعریف نبی کریم ﷺ کے لیے بھی ہے اور آپ پر ایمان لانے والے ہر انسان کے لیے ۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا:

وہ جو کہ سچ کا پیغام لے کر آیا اور وہ خاص کہ جس نے اس کی تصدیق کی ۔ اللہ تعالیٰ نے یہ دو علیحدہ علیحدہ اقسام نہیں بنائیں ۔ بلکہ ان دونوں کو ایک ہی قسم بتایا ہے ۔اس لیے کہ اس سے مراد سچائی کی تعریف کرنا ہے ' بھلے وہ پیغام لانے کے اعتبار سے ہو یا اس کی تصدیق کرنے کے اعتبار سے ۔ یہ دونوں اوصاف کے اعتبار سے قابل تعریف ہے ۔

✿ (جاء بالصدق)اسم جنس ہے ۔ جو کہ ہر قسم کی سچائی کو شامل ہے ۔قرآن اس سچائی میں داخل ہونے میں پہلے درجہ پر ہے ۔ اسی لیے فرمایا کہ : اور اس جنس سچائی کی تصدیق کی ۔ اس لیے کہ کبھی ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ تصدیق کرنے والا ایسی چیز کی تصدیق کرتا ہے جو اصل میں سچائی نہیں ہوتی ۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے : فلاں انسان حق بات کہتا ہے ' اور حق بات سنتا ہے ' اور اسے قبول کرتا ہے ؛ عدل و انصاف کا حکم دیتا ہے اور اس پر عمل کرتا ہے ۔یعنی وہ دوسروں کے لیے حق کہنے اور دوسروں سے حق بات قبول کرنے کے ساتھ موصوف ہے ۔ اور اس میں دو وصف پائے جاتے ہیں عدل کرنے کا حکم دیتا ہے اور خود اس پر عمل کرتا ہے ۔ اگر چہ بہت سارا عدل جس کا وہ حکم دیتا ہے ؛ وہ حقیقت میں وہ چیز نہیں ہوتی جس پر وہ عمل کرتا ہے ۔

رافضی اللہ تعالیٰ پر ؛ اس کے رسول پر اور صحابہ کرام اور ذوی القربی رضی اللہ عنہم اجمعین پر سب سے زیادہ جھوٹ بولنے والے اور حق بات کو جھٹلانے والے ہیں ۔ وہ ایسے سچ کو جھٹلاتے ہیں جو منقول صحیح اور معقول صریح کی روشنی میں ثابت اور معلوم شدہ ہے ۔ اس آیت کریمہ میں وارد ہونے والی مدح ان تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو شامل ہے جن پر رافضی اپنی طرف سے بہتان گھڑتے اور ظلم کرتے ہیں ۔اس لیے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے پاس حق کا پیغام پہنچا ؛ انہوں نے اس کی تصدیق کی ۔ روئے زمین پر اس آیت کے سب سے بڑے مصداق صحابہ کرام ہیں ؛ حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی ان ہی صحابہ میں سے ایک فرد ہیں ۔ اس میں رافضیوں کی مذمت ہے ؛ اور یہ آیت خود ان کے خلاف حجت ہے ۔اس آیت میں خلفاء ثلاثہ کو چھوڑ کر صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کسی خصوصیت کی کوئی دلیل نہیں ۔ یہ آیت ہر حال میں رافضیوں کے خلاف حجت ہے ان کے حق میں حجت نہیں ۔

امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تیسویں دلیل :

[اشکال] : شیعہ مصنف لکھتا ہے :'' حضرت علی رضی اللہ عنہ کے امام ہونے کی تیسویں دلیل یہ آیت ہے :

﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (الانفال: ۶۲)

''اسی نے اپنی مدد سے اور مومنوں سے تیری تائید کی ہے۔''

ابونعیم حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ عرش پر لکھا ہے: ''اللہ کے علاوہ کوئی معبود برحق نہیں' وہ اکیلا ہے اس کا کوئی شریک نہیں۔ محمد میرے بندے اور رسول ہیں۔ میں نے علی سے ان کی تائید کی۔'' یہی اس آیت کا مطلب ہے۔ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عظیم فضیلت ہے جو کہ آپ کے علاوہ کسی دوسرے صحابی کو حاصل نہیں ہو سکی۔ لہٰذا آپ ہی امام تھے۔'' [شیعہ کا بیان ختم ہوا]۔

[جواب]:

❀ پہلی بات: ہم اس روایت کی صحیح سند پیش کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں؟ کسی روایت کے صرف ابونعیم کی طرف منسوب کر لینے وہ قابل حجت نہیں ٹھہرتی؛ اس پر تمام لوگوں کا اتفاق ہے۔ ابونعیم کی مشہور کتاب ''فضائل الصحابہ'' ہے۔ اس میں سے کچھ چیزیں اس نے اپنی کتاب ''الحلیہ'' کے شروع میں بیان کی ہیں۔ اگر شیعہ ان کتابوں کی ہر روایت کو قابل حجت سمجھتے ہیں تو پھر ان میں حضرت ابو بکر و عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین کے فضائل میں ایسی روایات بیان کی گئی ہیں جن سے شیعیت کی پوری عمارت زمین بوس ہو سکتی ہے؛ اور ارکان شیعیت منہدم ہو سکتے ہیں۔ اور اگر اس کی ہر روایت کو حجت نہیں سمجھتے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی روایات ان کے ہاں نا قابل اعتماد ہیں۔ جب کہ ہم اہل سنت روایات کے مسئلہ میں - خواہ وہ ابونعیم کی روایت ہو یا پھر کسی دوسرے کی - اہل علم کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اور ان اسناد کی جانچ پرکھ کرتے ہیں جن کے راویوں کے احوال کی معرفت سے روایت کا سچ یا جھوٹ واضح ہو سکے۔ کیا اس کے سارے راوی ثقہ ہیں یا نہیں؟ پھر ہم حدیث کے دوسرے شواہد تلاش کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا کسی دوسرے کے فضائل میں کوئی فرق نہیں ہے۔ جو چیز ثابت ہوتی ہے ہم اس کی تصدیق کرتے ہیں' اور جو جھوٹ ہوتی ہے؛ ہم اسے رد کر دیتے ہیں۔ ہم سچ بات لے کر آتے ہیں اور سچائی کی تصدیق کرتے ہیں۔ نہ ہی جھوٹ بولتے ہیں اور نہ ہی سچے کو جھوٹا کہتے ہیں۔ ائمہ اہل سنت کے ہاں یہ قاعدہ معروف ہے۔

پس جو کوئی اللہ تعالیٰ پر جھوٹے بہتان گھڑے؛ اور حق بات کو جھٹلائے؛ تو ہم پر واجب ہوتا ہے کہ ہم اسے جھٹلائیں؛ اور اس کی حق بات کی نفی کو رد کریں۔ جیسا کہ ہم مسیلمہ کذاب اور دوسرے جھوٹے لوگوں اور انبیاء کرام کی تکذیب کرنے والوں کو جھٹلاتے ہیں؛ اور رسولوں پر ایمان لانے والوں اور ان کی تصدیق کرنے والوں کی تصدیق کرتے ہیں۔

❀ دوسری بات: محدثین اور اہل علم کا - شیعہ مصنف کی پیش کردہ - اس روایت کے جھوٹ ہونے پر اتفاق ہے۔ مذکورہ بالا روایت اور اس کے علاوہ دیگر جن روایات کے بارے میں ہم کہہ چکے ہیں کہ یہ روایات موضوع ہیں؛ ان کے بارے میں ہمارا دوٹوک مؤقف یہی ہے کہ یہ روایات من گھڑت ہیں۔

ہم اس اللہ کی قسم اُٹھاتے ہیں جس کے علاوہ کوئی معبود برحق نہیں! ہم یقینی طور پر بغیر کسی شک وشبہ کے یہ جانتے ہیں اور ہمارے پاس اس کا واضح علم موجود ہے جس کو شیعہ ہمارے دلوں سے زائل نہیں کر سکتے؛ یہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ پر بہتان باندھا گیا ہے، یہی حال اس طرح کی دوسری روایات کا بھی ہے۔ جو شخص علم الآثار سے بے گانہ ہے وہ ہمارے زمرہ میں داخل

نہیں ۔ ہم ضعیف اقوال و آثار کو اسی طرح پہچان لیتے ہیں جس طرح ایک ماہر نقاد قسم اٹھا کر یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ سکہ کھوٹا ہے۔ اور جس کسی کو سکوں کی کوئی پہچان نہ ہو وہ ایسا نہیں کر سکتا۔

❀ تیسری بات: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ هُوَ الَّذِیْٓ اَیَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ ۝ وَ اَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَیْنَهُمْ ﴾ [الأنفال ۶۲۔۶۳]

''اگر وہ تجھ سے دغا بازی کرنا چاہیں گے تو اللہ تجھے کافی ہے، اسی نے اپنی مدد سے اور مومنوں سے تیری تائید کی ہے۔ان کے دلوں میں باہمی الفت بھی اسی نے ڈالی ہے، زمین میں جو کچھ ہے تو اگر سارا کا سارا بھی خرچ کر ڈالتا تو بھی ان کے دل آپس میں نہ ملا سکتا۔ یہ تو اللہ ہی نے ان میں الفت ڈال دی ہے۔''

یہ آیت اس بات پر نص قاطع کی حیثیت رکھتی ہے کہ اہل ایمان کے دلوں میں الفت ڈال دی گئی تھی۔حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی ان اہل ایمان میں سے ایک تھے۔آپ کے بہت سارے دل نہیں تھے کہ ان میں الفت ڈالی گئی ہوتی۔مؤمنون مؤمن کی جمع ہے۔یہ صریح نص ہے؛اس میں یہ احتمال تک نہیں ہے کہ اس سے مراد کوئی ایک متعین شخص ہوگا۔تو پھر یہ کہنا کیسے جائز ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں؟

❀ چوتھی بات: شیعہ سے کہا جائے گا کہ: یہ ایک بدیہی بات تواتر کے ساتھ معلوم ہے کہ دین اسلام کا قیام صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اعانت کا رہین منت نہ تھا۔ بیشک حضرت علی رضی اللہ عنہ شروع میں اسلام لائے؛ اس وقت اسلام بہت کمزور تھا؛ اگر لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت اور ہجرت و نصرت نہ ہوتی تو صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تائید سے کچھ بھی نہ بنتا۔لوگ نہ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر اسلام لائے تھے؛ اور نہ ہی آپ کی وجہ سے ہجرت و نصرت کی تھی۔اور نہ ہی مکہ یا مدینہ میں دعوت اسلامی کی نشر و اشاعت کی کوئی ذمہ داری حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کندھوں پر تھی۔اور نہ ہی کسی نے یہ نقل کیا ہے کہ سابقین اولین میں سے کسی ایک نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں پر اسلام قبول کیا ہو؛ نہ ہی مہاجرین میں سے اور نہ ہی انصار میں سے ۔ بلکہ صحابہ کرام سے کسی بھی [قابل ذکر] انسان نے آپ کے ہاتھ پر اسلام قبول نہیں کیا۔لیکن جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو یمن میں مبعوث کیا تو پھر جن لوگوں کے مقدر میں ہدایت تھی انہوں نے آپ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ وہاں پر جن لوگوں نے بھی اسلام قبول کیا؛ وہ صحابہ نہیں ہیں ۔ جب کہ بڑے بڑے اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں پر اسلام لائے ۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نہ ہی مشرکین کو دعوت دیتے تھے اور نہ ہی ان سے مناظرہ کرتے تھے؛ جیسا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ انہیں دعوت دیتے اور ان سے مناظرے کرتے ۔ اور مشرکین آپ سے ایسے نہیں ڈرتے تھے جیسے ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما سے ڈرتے تھے۔

بلکہ حدیث کی تمام کتب ؛صحاح ؛ مسانید؛ اور مغازی میں ثابت ہے؛ اور لوگوں کا اس پر اتفاق ہے کہ غزوہ احد کے موقع پر جب مسلمان منہ پھیر کر بھاگ گئے تو اس وقت ؛ تو ابوسفیان نے ایک بلند جگہ پر چڑھ کر پکارا:

''اے مسلمانو! کیا محمد زندہ ہیں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خاموش رہو؛ جواب نہ دو۔

پھر کہنے لگا: اچھا ابوقحافہ کے بیٹے ابوبکر زندہ ہیں؟ آپ نے فرمایا: چپ رہو جواب مت دو۔
پھر کہا: اچھا خطاب کے بیٹے عمر زندہ ہیں؟ پھر کہنے لگا کہ معلوم ہوتا ہے کہ سب مارے گئے؛ اگر زندہ ہوتے تو جواب دیتے یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ضبط نہ ہو سکا؛ اور کہنے لگے: او دشمن خدا! تو جھوٹا ہے اللہ نے تجھے ذلیل کرنے کے لئے ان کو قائم رکھا ہے۔ ابوسفیان نے نعرہ لگایا: اے ہبل! تو بلند اور اونچا ہے؛ ہماری مدد کر۔
رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم بھی جواب دو؛ پوچھا: کیا جواب دیں؟ فرمایا: کہو اللہ بلند و بالا اور بزرگ ہے۔''
ابوسفیان نے کہا: ہمارا مددگار عزی ہے اور تمہارے پاس کوئی عزی نہیں ہے۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس کو جواب دو۔ پوچھا: کیا جواب دیں؟ فرمایا: کہو: ''اللہ ہمارا مددگار ہے، تمہارا مددگار کوئی نہیں۔''

ابوسفیان نے کہا: بدر کا بدلہ ہو گیا لڑائی ڈول کی طرح ہے ہار جیت رہتی ہے۔ کہا تم کو میدان میں بہت سی لاشیں ملیں گی جن کے ناک کان کٹے ہوں گے میں نے یہ حکم نہیں دیا تھا اور نہ مجھے اس کا افسوس ہے۔[البخاري:ج: دوم:ح۱۲۳۶]
یہ اس وقت میں مشرکین کے لشکر کا قائد ہے؛ یہ صرف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں پوچھ رہا ہے۔ اگر ان لوگوں کو ان تین حضرات کے علاوہ کسی اور کا خوف ہوتا؛ جیسے حضرت عثمان و علی اور طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہم؛ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید ان لوگوں سے ہوئی ہوتی جیسے ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما سے ہوئی ہے؛ تو پھر ضرور ان کے بارے میں بھی ایسے ہی سوال کرتے جیسے ان حضرات کے بارے میں سوال کیا تھا۔ کیونکہ سوال کرنے کا مقتضی اپنی جگہ پر باقی ہوتا۔ اور سوال کرنے میں کوئی مانع بھی موجود نہیں تھا۔ اس لیے کہ قدرت اور داعی کی موجودگی میں جب صارف بھی منتفی ہو تو پھر فعل کا بجالانا واجب ہو جاتا ہے۔

❀ پانچویں وجہ: اسلام کی نشرواشاعت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا کوئی خاطر خواہ اثر نہیں تھا؛ مگر جتنا اثر آپ کا تھا اتنا ہی آپ جیسے دوسرے صحابہ کرام کا بھی اثر و کردار تھا۔ جب کہ بعض صحابہ کے اثرات حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اثرات سے بہت زیادہ اور بلیغ تھے۔ جن لوگوں کو صحیح تاریخ سیرت سے معرفت ہے؛ وہ اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں۔
ہاں جو لوگ جھوٹ بولنے کے عادی ہیں' اور اہل طریقت کے راستے پر چلتے ہیں تو [پھر ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ] جھوٹ کا دروازہ کھلا ہے۔ یہ جھوٹ ایسے ہی ہوگا جیسے اللہ تعالیٰ پر جھوٹ بولنا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهٗ﴾ [العنکبوت۶۸]

''اور اس سے بڑا ظالم کون ہوگا؟ جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھے یا جب حق اس کے پاس آ جائے وہ اسے جھٹلائے۔''
مجموعی طور پر وہ مغازی جن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قتال کی نوبت پیش آئی ان کی تعداد نو ہے۔ اور تمام غزوات کی مجموعی تعداد ستائیس ہے۔ جب کہ سرایا کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ ان کی تعداد ستر (۷۰) تک پہنچتی ہے۔
اتنے غزوات اور سرایا میں مجموعی طور پر قتل کیے جانے والے کفار کی کل تعداد ایک ہزار سے کچھ کم و بیش بنتی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کا دسواں یا بیسواں حصہ کفار کو بھی قتل نہیں کیا۔ جب کہ اکثر سرایا میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نہیں جایا کرتے تھے۔

جب کہ نبی کریم ﷺ کے بعد کی فتوحات میں بھی آپ نے بہت کم ہی حصہ لیا ہے۔ نہ آپ نہ عثمان ؛ نہ طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہم ؛ ہاں جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ شام کی طرف نکلتے تو آپ بھی ان کے ساتھ نکلا کرتے تھے۔ البتہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے مصر کی فتح میں حصہ لیا تھا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے قادسیہ کی فتح میں حصہ لیا تھا؛ اور حضرت ابوعبیدہ نے شام کا علاقہ فتح کیا تھا۔

تو پھر یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی تائید صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین میں سے کسی ایک شخص کے ساتھ کی گئی تھی ؛ جب کہ حقیقت حال یہ ہے۔ تو پھر اہل ایمان سابقین اولین اور مہاجرین وانصار کے ذریعہ ملنے والی تائید کہاں گئی؟ اور وہ تائید کہاں گئی جن لوگوں نے ببول کے درخت کے نیچے آپ کے ہاتھوں پر بیعت رضوان کی تھی؟

بدر کے موقع پر مسلمانوں کی تعداد تین سو تیرہ تھی۔ جب کہ احد کے موقع پر سات سو کے قریب تھے۔ خندق کے موقع پر ہزار سے زیادہ تھے ؛ بیعت رضوان کے دن چودہ سو کے لگ بھگ تھے۔ یہی صحابہ کرام تھے جنہوں نے خیبر فتح کیا۔ فتح مکہ کے موقع پر دس ہزار کے قریب صحابہ کرام تھے؛ غزوہ حنین میں بارہ ہزار تھے ؛ دس ہزار کا مدنی لشکر اور دو ہزار آزاد کردہ اہل مکہ [طلقاء]۔ جب کہ تبوک کے موقع پر یہ شمار ممکن نہ رہا؛ کہا جاتا ہے کہ اس وقت تیس ہزار سے زیادہ صحابہ تھے۔ جب کہ حجۃ الوداع کے موقع پر ان کو شمار کرنا ممکن نہ رہا۔ آپ کے زمانے میں ہی بہت سارے لوگ ایسے تھے جو ایمان لائے اور نبی کریم ﷺ کے دیدار سے شرفیاب ہوئے ؛ اور ان کا شمار بھی صحابہ میں ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی زندگی میں ہی ان لوگوں کے ذریعہ یمن اور دوسری جگہوں میں آپ کی مدد فرمائی۔ یہ تمام لوگ وہ اہل ایمان تھے جن کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی تائید کی۔ بلکہ قیامت تک جو بھی ایمان لائے گا اور اللہ کی راہ میں جہاد کرے گا' وہ اس حکم میں داخل شمار ہوگا۔

امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی چوبیسویں دلیل:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:''امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی چوبیسویں دلیل یہ آیت قرآنی ہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَ مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ﴾ (الانفال:۶۴)

''اے نبی! آپ کو اللہ کافی ہے اور ان مومنوں کو جو تیری پیروی کر رہے ہیں۔''

ابونعیم کا قول ہے کہ: یہ آیت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی؛ یہ فضیلت صحابہ میں سے کسی اور کو حاصل نہیں ہوئی لہٰذا وہی امام برحق ہوں گے۔'' [شیعہ کا بیان ختم ہوا]

جواب: اس کا جواب کئی طرح سے دیا جاسکتا ہے:

پہلی بات: یہ روایت صحیح نہیں ہے۔

دوسری بات: بیشک یہ قول حجت نہیں ہے۔

تیسری بات: یہ کلام اور اس کے رسول ﷺ پر بہت بڑا بہتان ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿حَسْبُكَ اللّٰهُ وَ مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ﴾ (الانفال:۶۴)

اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے لیے کافی ہے' اور ان اہل ایمان کے لیے بھی کافی ہے جو آپ پر ایمان لائے ہیں۔ وہ اکیلا اللہ ہی آپ کے لیے بھی کافی ہے اور آپ کے ماننے والے اہل ایمان کے لیے بھی کافی ہے۔ عرب اپنے کلام

میں ایسے ہی جملے استعمال کرتے ہیں ۔ مثال کے طور پر کہا جاتا ہے: فَحَسْبُكَ وَزَيداً درهمٌ .
آپ کے لیے اور زید کے لیے ایک درہم ہی کافی ہے ۔ اور جیسے شاعر کا قول ہے:

فَحَسْبُكَ وَالضُّحَّاكَ سَيْفٌ مُهَنَّدٌ

''تمہارے اور ضحاک کے لیے صرف شمشیر براں کافی ہے۔'' یعنی آپ کے لیے اور ضحاک کے لیے کافی ہے۔''

[اس کی وجہ یہ ہے کہ ''حَسْبُ'' مصدر ہے۔ مضاف ہونے کی صورت میں مستحسن یہ ہے کہ اعادہ جار کے ساتھ اس پر عطف ڈالا جائے ۔ اعادہ جار کے بغیر شاذ و نادر ہی اس پر عطف ڈالا جاتا ہے]۔ بعض لوگوں نے آیت کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ اے نبی! اللہ تعالیٰ اور مومن آپ کے لیے کافی ہیں۔'' اس صورت میں ﴿مَنِ اتَّبَعَكَ﴾ رفعی حالت میں ہوگا اور اس کا عطف لفظ اللہ پر ہوگا۔''

یہ اتنی بڑی غلطی ہے کہ اس سے کفر لازم آتا ہے۔ اس لیے کہ صرف اللہ تعالیٰ ساری مخلوقات کے لیے کافی ہے۔
اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا وَّ قَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ﴾ (آل عمران: ۱۷۳)

''وہ لوگ جب ان سے لوگوں نے کہا کہ کافروں نے تمہارے مقابلے میں لشکر جمع کر لئے ہیں۔ تم ان سے خوف کھا تو اس بات نے انہیں ایمان میں اور بڑھا دیا اور کہنے لگے ہمیں اللہ کافی ہے اور وہ بہت اچھا کارساز ہے۔''
یعنی صرف اکیلا اللہ تعالیٰ ہم سب کے لیے کافی ہے۔

صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے' آپ فرماتے ہیں: ''یہ کلمہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس وقت کہا جب انہیں آگ میں ڈالا گیا' اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت کہا جب لوگ آپ سے [ڈرانے کے لیے] کہنے لگے: بیشک لشکر تمہارے لیے جمع ہو گئے ہیں' ان سے ڈرو؛ تو ان کا ایمان مزید بڑھ گیا' اور کہنے لگے: ''حسبنا اللہ ونعم الوکیل ۔'' ہمیں اللہ تعالیٰ ہی کافی ہے' اور وہ بہترین کارساز ہے۔''

تمام انبیاء کرام علیہم السلام یہی کہتے گئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہی ہمارے لیے کافی ہے۔ اور ان میں سے کسی نے بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرایا کہ کوئی اور بھی اللہ کے علاوہ ان کے لیے کفایت کرتا۔ جب یہ جائز نہیں ہے کہ اللہ اور اس کا رسول مؤمنین کے لیے کفایت کر جائیں تو پھر یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور مؤمنین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کفایت کر جائیں؟

مؤمنین اللہ تعالیٰ کے محتاج ہیں ۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے محتاج ہیں ۔ پس ان کے لیے کفایت کا ہونا ضروری ہے۔ یہ جائز نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت مؤمنین سے ہو' اور مؤمنین کی قوت و کفایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہو۔ اس لیے کہ اس سے دور لازم آتا ہے۔ بلکہ تمام تر قوتیں اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے' وہی اللہ وحدہ لاشریک ہی جو تمام تر قوتوں کا پیدا کرنے والا ہے وہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت کا بھی پیدا کرنے والا ہے۔

جب یہ بات واضح ہوگئی تو پتہ چلا کہ رافضی جہالت پر جہالت مرتب کرتے چلے جاتے ہیں ۔ پھر ایسے اندھیروں کا شکار ہوگئے کہ یہ اندھیرے آپس میں اوپر نیچے ہورہے تھے ۔اس طرح وہ گمان کرنے لگے کہ: اللہ تعالیٰ کا فرمان: ﴿حَسْبُكَ اللّٰهُ وَ مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور آپ کی اتباع کرنے والے مؤمنین آپ کے لیے کافی ہیں اور پھر آپ کے متبعین مؤمنین میں سے صرف ایک حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ہی مؤمن مانتے ہیں ۔ان کی یہ جہالت پہلی جہالت سے بھی زیادہ بڑھ کر اور واضح ہے ۔ اس لیے کہ پہلی جہالت تو بعض لوگوں پر مشتبہ ہوسکتی ہے؛ مگر یہ جہالت کسی بھی عاقل پر مخفی نہیں رہ سکتی ۔[[اگر ہم فرض بھی کرلیں کہ ﴿مَنِ اتَّبَعَكَ﴾ فاعل ہے اور اللہ پر معطوف ہے تو بھی یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ مختص نہیں ہوسکتا۔ اس لیے کہ نزول آیت کے وقت آپ کی پیروی کرنے والے بے شمار مومن موجود تھے ۔کوئی دانش مند آدمی یہ نہیں کہہ سکتا کہ جہاد کفار میں نبی کریم کے لیے صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی کافی تھے]]

اس لیے کہ تمام مخلوق میں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کافی نہیں تھے ۔ خدانخواستہ آپ کی اعانت کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سوا اگر دیگر صحابہ موجود نہ ہوتے تو اسلام کا بول بالا نہ ہوتا ۔[[مکہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علاوہ چند صحابہ موجود تھے ۔ تاہم دین کا بول بالا نہ ہوسکا، بلکہ دین کو غلبہ اسی وقت حاصل ہوا جب آپ نے مدینہ میں ہجرت فرمائی]]

غور کیجیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امداد کے لیے لشکر جرار موجود تھا ۔ تاہم آپ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے شام کا ملک چھین نہ سکے ۔ بلکہ معاویہ رضی اللہ عنہ کو ہی غلبہ حاصل رہا ۔ بھلے یہ غلبہ قوت و قتال کے لحاظ سے ہو یا تدابیر اور چالوں کے لحاظ سے ۔ اس لیے کہ جنگ دھوکہ دہی کا نام ہے ۔

جب حضرت علی رضی اللہ عنہ اسلام کے غالب آنے کے بعد اور اپنے پیروکاروں کی اکثریت کی باوجود خود اپنی ذات کے کام نہ آسکے؛ تو پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس وقت میں کیسے کام آسکتے تھے جب تمام دنیا والے آپ کے دشمن تھے ۔

اگر یہ کہا جائے کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ پر اس لیے غالب نہیں آئے کہ آپ کا لشکر آپ کی اتباع نہیں کرتا تھا' بلکہ وہ ہمیشہ آپس میں اختلاف کا شکار رہتے تھے ۔ تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ: جب آپ کے ساتھ مسلمان ہونے کے باوجود آپ کی اطاعت نہیں کررہے تو پھر یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ کافر لوگ آپ کی اطاعت کریں حالانکہ نہ ہی وہ آپ کو مانتے ہیں اور نہ ہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ۔

شیعہ کے جہل و ظلم کا اندازہ لگائیے کہ یہ دو متضاد باتوں کو جمع کردیتے ہیں ۔ ایک جانب حضرت علی رضی اللہ عنہ کو قدرت و شجاعت کے اعتبار سے اکمل البشر قرار دیتے اور کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے محتاج تھے ۔ دین اسلام کی توسیع و اشاعت بھی روافض کے خیال میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رہین منت تھی ۔ ایسا کفر کہتے ہیں اور آپ کو دین محمدی کے قائم کرنے میں اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہراتے ہیں تو دوسری جانب یہ کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ظہور اسلام کے بعد عجز و نیاز کا زندہ پیکر بن گئے تھے ۔ اور آپ نے تقیہ کررکھا تھا یہ بات کس قدر عجوبہ روزگار ہے کہ جو شخص اسلام کی کمزوری اور قلت افراد کے زمانہ میں مشرکین بلکہ جن و انس سب پر غالب تھا، لوگ فوج در فوج اسلام میں داخل ہوچکے تھے ۔ تو وہ ایک باغی گروہ کے مقابلہ میں کیوں کر عاجز آگئے اور اس کو زیر نہ کرسکے ۔[اس سے یہ بات واضح ہوئی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ تنہا مشرکین کو زیر نہیں کرسکتے

تھے؛ جب تک کہ آپ کے ساتھ دوسرے صحابہ کرام موجود نہ ہوتے]۔

یہ بات یقینی طور پر سبھی لوگ جانتے ہیں کہ لوگ اسلام میں داخل ہونے کے بعد حق کے سب سے بڑے اتباع کار تھے۔ یہی لوگ تھے جنہوں نے اللہ کا نازل کردہ دین محمد قائم کرنے میں اپنا کردار ادا کیا۔ یہاں تک کہ کفار کو مغلوب کیا؛ اور لوگ مسلمان ہوئے۔تو پھر یہ ایک چھوٹے سے گروہ کو مغلوب کیوں نہ کر سکے جنہوں نے سرکشی اور بغاوت کی تھی۔حالانکہ ان کی تعداد بھی بعثت محمدی کے وقت موجود کفار کی تعداد سے بہت کم تھی۔ان کی شان وشوکت بھی بہت کم تھی؛ اور ان کی نسبت یہ لوگ حق کے بھی زیادہ قریب تھے؟

جب اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ کو مبعوث فرمایا تو اس وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جھگڑا کرنے والے کفار تعداد میں بہت زیادہ اور حق سے بہت ہی دور تھے۔اس وقت میں اہل حجاز' اہل شام' اہل یمن ؛ اہل مصر اہل عراق ؛ اہل خراسان او راہل مغرب تمام کے تمام کفار تھے۔ان میں مشرکین بھی تھے' اہل کتاب بھی ؛ مجوسی بھی تھے اور صابی بھی۔ جب رسول اللہ ﷺ کا انتقال ہوا تو اس وقت جزیرہ عرب پر اسلام غالب ہو چکا تھا۔اور جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کیے جانے کا واقعہ پیش آیا اس وقت تک اسلام مصر؛ شام ؛ عراق ؛ خراسان اور مغرب تک غالب آ چکا تھا۔

نبی کریم ﷺ کی وفات کے وقت دشمنان تعداد میں بہت کم اور قوت کے لحاظ سے بہت کمزور رہ گئے تھے۔اور دشمنی بھی اس وقت کی نسبت بہت کم تھی جس وقت میں آپ کو مبعوث کیا گیا تھا۔ایسے ہی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے وقت یہ لوگ بالکل ہی کم اور کمزور ہو گئے تھے۔اور پہلے کی نسبت دشمنی میں بھی کمی آ گئی تھی۔ وہ حق جس کی وجہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ برسرپیکار تھے؛ وہ اس حق کا ایک جزء تھا جس کی وجہ سے نبی کریم ﷺ قتال و جہاد کرتے تھے۔ پس جو کوئی اس حق کو جھٹلائے جو محمد ﷺ لیکر آئے ہیں' اور اس پر قتال کرے؛ یقیناً وہ انسان اس حق کو بھی جھٹلانے والا ہے جس پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے قتال کیا تھا۔ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ اس حالت میں حق کی نصرت اور باطل سے دفاع میں عاجز آ گئے تھے ؛ تو پھر جب نبی کریم ﷺ مبعوث ہوئے تھے تو اس وقت آپ کا کیا حال ہوگا؟ اس وقت تو آپ بالکل ہی عاجز اور کمزور ہوں گے۔کیونکہ اس وقت دشمنان بھی تعداد میں بہت زیادہ اور قوت وشوکت سے لیس تھے۔

روافض کے اس فعل کی نظیر نصاریٰ کا یہ طرز عمل ہے کہ وہ ایک طرف حضرت عیسیٰ کو الٰہ قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں آپ ہر چیز کے رب ہیں اور ہر چیز پر قادر ہیں۔اور اس کے ساتھ ساتھ یہ عقیدہ بھی رکھتے ہیں کہ ان کے دشمنوں نے ان کی تذلیل کی ان کے سر پر کانٹے رکھے اور انھیں سولی پر چڑھایا۔حضرت مسیح واویلا کرتے رہے، مگر انھوں نے ایک نہ سنی۔نہ ہی وہ حضرت مسیح۔کے لیے قدرت قاہرہ کے ثابت کرنے میں کامیاب ہوسکے اور نہ ہی اس کمزوری کے ثابت کرنے میں۔

اگر وہ کہیں کہ حضرت مسیح کو یہ تکلیف اللہ کی مرضی سے دی جا رہی تھی۔

تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ تو اس بات پر راضی ہوتا ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے اور نافرمانی نہ کی جائے۔اگر آپ کو قتل کرنا اور پھانسی دینا یہ ایک طاعت وعبادت تھی تو پھر جو یہود یہ کام کررہے تھے وہ عبادت بجالا رہے تھے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت کر رہے تھے۔ بنابریں وہ مدح وستائش کے مستحق تھے نہ کہ مذمت کے۔ یہ عظیم ترین کفر و جہالت

ہے۔ عام شیوخ وفقراء بھی اسی قسم کے تضاد میں مبتلا ہیں، ایک طرف وہ بلند بانگ دعوے کرتے نہیں تھکتے اور دوسری طرف ضعف و عجز کا مظاہرہ بھی کرتے رہتے ہیں۔ حدیث میں آیا ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''تین آدمی ایسے ہیں کہ جن سے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن نہ بات کریں گے اور نہ ہی انہیں پاک وصاف کریں گے اور ابومعاویہ فرماتے ہیں کہ اور نہ ان کی طرف نظر رحمت سے دیکھیں گے اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے بوڑھا زانی، جھوٹا بادشاہ اور مفلس تکبر کرنے والا۔'' ایک روایت میں عیال دار متکبر کے الفاظ ہیں۔''[1]

ایک مفلس و قلاش آدمی کے اظہار فخر وغرور کا طرز و انداز یہ ہے کہ جب وہ کبر وغرور پر اترے تو اپنے آپ کو اللہ کا جانشین قرار دے اور یہ کہے کہ میرے سوا کوئی رب ہے نہ رسول۔ اس کا انجام یہ ہو کہ وہ بھیک مانگنے پر اتر آئے اور لوگوں سے روٹی کے ٹکڑے طلب کرتا پھرے؛ یا ظالم کے ظلم سے نجات حاصل کرنے کے لیے اس کے خلاف مدد طلب کرتا پھرے؛ اور ایک لقمہ تک کا محتاج ہو؛ ایک لفظ زبان پر لانے سے ڈرتا ہو۔ تو پھر کہاں یہ فقر و ذلت اور رسوائی اور کہاں وہ رب ہونے کا دعویٰ جو کہ عزت وغلبہ اور تونگری کو متضمن ہے۔ یہ ان مشرکین کا حال ہوتا ہے جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ﴾

''اور جو کوئی اللہ کے ساتھ شرک کرے تو گویا وہ آسمان سے گر گیا، اب یا تو اسے پرندے اچک لے جائیں گے یا ہوا اس کو ایسی جگہ لے جا کر پھینک دے گی جہاں اس کے چیتھڑے اڑ جائیں گے۔''[الحج ۳۱]

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ اِتَّخَذَتْ بَيْتًا وَ اِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ﴾ (العنکبوت: ۴۱)

''جن لوگوں نے اللہ کے سوا دوسروں کو اپنا کارساز بنایا ان کی مثال ایک مکڑی جیسی ہے جس نے ایک گھر بنایا ہو اور سب سے کمزور ترین گھر مکڑی ہی کا ہوتا ہے، اے کاش! کہ انھیں معلوم ہوتا۔''

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿سَنُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَآ اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا﴾[آل عمران ۱۵۱]

''عنقریب ہم منکرینِ حق کے دلوں میں رعب بٹھا دیں گے، اس لیے کہ انہوں نے اللہ کے ساتھ ان کو خدائی میں شریک ٹھہرایا ہے جن کے شریک ہونے پر اللہ نے کوئی سند نازل نہیں کی۔''

عیسائیوں میں شرک واضح طور پر پایا جاتا ہے؛ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَ مَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا

[1] سنن نسائی۔ کتاب الزکاۃ، باب الفقیر المختال(ح:۲۵۷۶) وصحیح مسلم، کتاب الایمان۔ باب بیان غلظ تحریم اسبال الازار (ح:۱۰۷)۔

اِلٰهًا وَّاحِدًا لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ﴾ [التوبة ۳۱]

''انہوں نے اپنے علماء اور درویشوں کو اللہ کے سوا اپنا رب بنا لیا ہے۔ اور اسی طرح مسیح ابن مریم کو بھی۔ حالانکہ ان کو ایک معبود کے سوا کسی کی بندگی کرنے کا حکم نہیں دیا گیا تھا، وہ جس کے سوا کوئی مستحق عبادت نہیں، پاک ہے وہ ان مشرکانہ باتوں سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔''

یہی حال ان کی مشابہت اختیار کرنے والے نساک اور غالی شیعہ کا بھی ہے۔ان میں انتہائی درجہ کا شرک اور غلو پایا جاتا ہے۔ بالکل ویسے ہی جیسے نصاری میں شرک اور غلو پایا جاتا ہے۔ جب کہ یہودیوں میں تکبر پایا جاتا ہے۔ متکبر آخر کار ہمیشہ ذلت ورسوائی سے دوچار ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ حَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَ بَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ يَقْتُلُوْنَ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا يَعْتَدُوْنَ﴾ (آل عمران: ۱۱۲)

''ان پر ذلت ورسوائی چھا گئی تھی وہ جہاں بھی ہوں مگر یہ کہ وہ اللہ کی پناہ میں ہوں یا لوگوں کی پناہ میں آ جائیں۔ وہ مورد غضب الٰہی ہوئے اور ان پر مسکینی چھا گئی تھی۔اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ آیات الٰہی کے ساتھ کفر کرتے انبیاء کو بلاوجہ تہہ تیغ کرتے اللہ کے نافرمان اور حد سے تجاوز کرنے والے تھے۔''

پس روافض میں ایک وجہ سے یہود کی مشابہت پائی جاتی ہے اور ایک وجہ سے نصاری کی مشابہت پائی جاتی ہے۔ان لوگوں میں شرک' غلو اور باطل کی تصدیق میں نصاری کی مشابہت پائی جاتی ہے؛ جب کہ دوسری طرف بزدلی؛ تکبر؛ حسد اور حق کی تکذیب کرنے میں یہودیوں کی مشابہت پائی جاتی ہے۔ یہی حال رافضیوں کے علاوہ دوسرے گمراہ اہل بدعت فرقوں کا ہے۔ان میں گمراہی بھی پائی جاتی ہے اور سرکشی و بغاوت بھی' اور دوسری جانب شرک و تکبر بھی ان میں موجود ہوتا ہے۔

لیکن رافضی اس میں سب سے بڑھے ہوئے ہیں۔ اسی وجہ سے آپ دیکھ سکتے ہیں کہ یہ لوگ سب سے بڑھ چڑھ کر اللہ کے گھروں کو ویران کرنے والے ہیں۔ان کے ہاں مسجدوں میں نماز جمعہ اور باجماعت نماز کا اہتمام نہیں کیا جاتا۔ حالانکہ باجماعت نماز کا اجتماع اللہ تعالیٰ کا محبوب ترین اجتماع ہوتا ہے۔

ایسے ہی رافضی کفار اور مشرکین اعداء دین سے جہاد بھی نہیں کرتے۔ بلکہ آپ اکثر دیکھ سکتے ہیں کہ یہ لوگ مسلمانوں کے خلاف کفار کی مدد کرتے ہیں' اور ان سے مدد لیتے ہیں۔اہل ایمان اولیاء اللہ سے دشمنی رکھتے ہیں۔اور اللہ تعالیٰ کے دشمنوں مشرکین اور اہل کتاب سے دوستیاں پالتے ہیں۔اور اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے سب سے بہتر لوگوں مہاجرین و انصار اور تابعین کرام رحمہم اللہ سے دشمنی و عداوت رکھتے ہیں۔اور مخلوق میں سب سے بڑے کفار اسماعیلیہ اور نصیریہ اور ملحدین سے محبت اور دوستی رکھتے ہیں۔اگرچہ انہیں کافر بھی کہتے ہیں۔مگر ان کے دل اور ان کے بدن مہاجرین و انصار اور تابعین کرام رحمہم اللہ جیسے سچے مسلمانوں اور جمہور اہل اسلام کی نسبت ان کافروں کی طرف زیادہ مائل رہتے ہیں۔

اہل ہوی و اہل بدعت فرقوں میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہے؛ حتی کہ وہ لوگ جو اپنے آپ کو علم کلام' فقہ' حدیث اور

تصوف کی طرف منسوب کرتے ہیں؛ مگر ان میں اس کا ایک شعبہ پایا جاتا ہے۔
مگر رافضیوں میں تمام بدعتی فرقوں سے بڑھ کر گمراہی و سرکشی اور جہالت پائی جاتی ہے۔

امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی پچیسویں دلیل:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:''امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی پچیسویں دلیل یہ آیت قرآنی ہے:
﴿فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَ يُحِبُّوْنَهٗ﴾ (المائدة:۵۴)
''اللہ تعالیٰ ایسی قوم کو لے آئے گا جو اس سے محبت کرتے ہوں گے' اور اللہ ان سے محبت کرتا ہوگا۔''
ثعلبی کہتے ہیں کہ یہ آیت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ دیگر صحابہ سے افضل تھے۔لہٰذا وہی امام و خلیفہ ہوں گے۔'' [شیعہ کا بیان ختم ہوا]

[جواب]: اس کا جواب کئی لحاظ سے دیا جا سکتا ہے:

❀ **پہلی بات**: ہم کہتے ہیں کہ یہ ثعلبی پر افتراء ہے، ثعلبی اس آیت کی تفسیر میں لکھتا ہے:''علی بن ابی طالب وقتادہ وحسن رضی اللہ عنہم کا قول ہے کہ اس سے ابوبکر رضی اللہ عنہ اور ان کے رفقاء مراد ہیں۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے اس سے اہل یمن مراد لیا ہے۔''

انہوں نے حضرت عیاض بن غنم رضی اللہ عنہ والی حدیث کو بطور دلیل پیش کیا ہے؛ کہ اس سے مراد اہل یمن ہیں۔اور حدیث میں آتا ہے:''تمہارے پاس اہل یمن آئیں گے۔'' [رواہ البخاری ؛ کتاب المغازی]

ثعلبی نے تو یہ نقل کیا ہے کہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اس سے ابوبکر رضی اللہ عنہ اور ان کے رفقاء مراد لیتے ہیں۔

جب کہ باقی ائمہ تفسیر میں سے امام طبری رحمۃ اللہ علیہ نے مثنی سے روایت کیا ہے؛ وہ کہتے ہیں: ہم سے عبد اللہ بن ہاشم نے بیان کیا؛ وہ سیف بن عمر سے؛ وہ ابی روق سے؛ وہ ضحاک سے' وہ ابو ایوب سے اور آپ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اس آیت: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ﴾''اے ایمان والو! تم میں سے جو کوئی اپنے دین سے مرتد ہو جائے گا'' کی تفسیر میں روایت کرتے ہیں: آپ فرماتے ہیں:''اللہ تعالیٰ کو مؤمنین کا علم تھا؛ اور یہ برے معانی منافقین کی مذمت میں ہیں؛ اللہ تعالیٰ کو ان کے بارے میں معلوم تھا کہ یہ اپنے دین سے پھر جائیں گے؛ اس لیے فرمایا: ﴿مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ﴾ یعنی اگر تم اپنے دین سے پھر جاؤ گے تو اللہ تعالیٰ کسی دوسری قوم کو لے آئے گا؛ جو مرتدین کے ٹھکانوں پر آدھمکیں گے؛ [وہ ایسے لوگ ہوں گے کہ] ﴿بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَ يُحِبُّوْنَهٗ﴾''اللہ تعالیٰ ان سے محبت کرتا ہوگا اور وہ اس سے محبت کرتے ہوں گے۔'' یہ ابوبکر رضی اللہ عنہ اور ان کے رفقاء واصحاب ہیں۔''

نیز امام طبری نے اپنی سند سے یہی قول ضحاک؛ قتادہ؛ حسن اور ابن جریج رحمہم اللہ سے بھی روایت کیا ہے؛ ان کے کہنا ہے کہ: قوم سے مراد انصار ہیں۔ اور کچھ دوسرے لوگوں نے کہا ہے:''قوم سے مراد اہل یمن ہیں۔''

اور بعض لوگوں نے اس آخری معنی کو ترجیح دی ہے' اور کہا ہے کہ اس سے مراد حضرت ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہ کی قوم کے لوگ ہیں۔امام طبری فرماتے ہیں:''اگر اس بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح سند کے ساتھ حدیث ثابت نہ ہوتی تو میں بھی وہی بات کہتا جو دوسرے لوگوں نے کہی ہے کہ اس سے مراد ابوبکر رضی اللہ عنہ اور ان کے رفقاء ہیں۔

نیز آپ فرماتے ہیں: ''جب اہل ارتداد اپنے دین سے پھر گئے تو اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں لے آیا۔'' [تفسیر الطبری ۱۰/ ۴۱۱]

❀ دوسری بات: شیعہ مصنف کے پاس اپنے دعوی کی کوئی دلیل نہیں۔ پس اس کو مان لینا کوئی ضروری نہیں۔

❀ تیسری بات: یہ قول مشہور و معروف تفسیر کے منافی ہے۔ مشہور تفسیر یہ ہے کہ اس سے مراد حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور ان کے رفقاء کرام ہیں۔ جنہوں نے آپ کے ساتھ اہل ارتداد سے جنگیں لڑیں۔ یہ تفسیر لوگوں کے ہاں معروف ہے؛ جیسا کہ اس سے پہلے بھی ہم بیان کر چکے ہیں۔ لیکن شیعہ کذاب یہ چاہتے ہیں کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے فضائل میں وارد ہونے والی آیات و احادیث کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضائل کے قالب میں ڈھال دیں؛ لیکن یہ بری اور بدنیتی پر مبنی تدبیریں خود ان کے گلے کا طوق بنیں گی؛ [ان شاء اللہ]۔

میرے ایک قابل اعتماد ساتھی نے مجھے بتایا کہ میں ایک شیخ کے پاس گیا؛ جسے میں بھی جانتا ہوں؛ اس شیخ میں دین و زہد تھا اور اس کے احوال معروف تھے؛ اس میں شیعیت کا عنصر پایا جاتا تھا۔ [میرا دوست] کہتا ہے: اس (شیخ) کے پاس ایک کتاب تھی؛ جس کی وہ بہت زیادہ تعظیم کرتا تھا؛ اور اس کا دعوی تھا کہ اس میں راز داری کی باتیں درج ہیں' اور اس نے یہ کتاب خلفاء کے خزانوں سے حاصل کی ہے۔ اس نے کتاب کی مدح سرائی میں خوب مبالغہ کیا؛ جب وہ کتاب سامنے لا کر رکھی گئی تو اس میں بخاری و مسلم کی وہ روایات تھیں جو حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے فضائل میں ہیں؛ اور انہیں رخ موڑ کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضائل میں شمار کیا گیا تھا۔

شائد کہ یہ کتاب بنو عبید کے خزانوں میں سے حاصل کی گئی ہو؛ اس لیے کہ ان کے قریبی لوگ ملحد اور زندیق تھے جو اسلامی حقائق کو موڑ توڑ کر رکھنا چاہتے تھے۔ انہوں نے دین کے نقض پر ایسی احادیث گھڑی ہیں جن کے بارے میں صحیح معنوں میں اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ جاہل لوگ انہیں دیکھ کر گمان کرتے ہیں یہ روایات بھی بخاری و مسلم سے لی گئی ہیں۔ جب کہ وہ لوگوں میں جان بوجھ کر جھوٹ بولتے ہوئے غلط بات کو رواج دے رہے ہیں۔

انہیں اس بات کا علم نہیں کہ جب ہم کہتے ہیں: بخاری و مسلم [نے یہ روایت ذکر کی ہے] تو ہمارے پاس ایسی نشانیاں موجود ہیں جو اس کی صحت پر دلالت کرتی ہیں۔ اس سے مراد ہرگز یہ نہیں ہوتی کہ صرف بخاری اور مسلم کے روایت کر لینے سے وہ صحیح ثابت ہو جاتی ہے۔ بلکہ بخاری و مسلم کی روایات ان کے علاوہ اتنے علماء نے روایت کی ہیں جن کی صحیح تعداد کو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ ان میں سے کوئی بھی روایت کرنے میں یہ دونوں امام منفرد نہیں ہیں؛ بلکہ ان سے پہلے اور ان کے زمانے میں اور ان کے بعد بھی لوگوں کی جماعتوں نے انہیں روایت کیا ہے۔ اگر امام بخاری و مسلم نہ بھی پیدا ہوتے تب بھی اللہ کے دین میں کوئی کمی واقع نہ ہوتی۔ اور یہ احادیث اپنی اسانید کے ساتھ موجود تھیں؛ جس سے مقصد حاصل ہو سکتا تھا۔

جب ہم کہتے ہیں کہ بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے تو یہ بالکل اس قول کی طرح ہوتا ہے جب ہم کہتے ہیں: قرأت سبعہ میں یوں ہے۔ قرآن تواتر کے ساتھ منقول ہے۔ ان ساتوں قراء کے ساتھ اس میں سے کوئی بھی چیز خاص نہیں ہے۔ ایسے ہی حدیث کی تصحیح کا مسئلہ بھی ہے۔ ائمہ حدیث نے اس بارے میں بخاری و مسلم کی تقلید نہیں کی۔ بلکہ وہ جمہور روایات جن

کو ان دونوں حضرات نے صحیح کہا ہے؛ وہ ان سے پہلے ائمہ حدیث کے صحیح اور قابل قبول تھیں ۔ درایسے ہی ان کے زمانے میں بھی اوران کے بعد بھی اس فن کے ائمہ نے ان کی کتابوں کا مطالعہ کیا: اوران کی تصحیح پر موافقت کا اظہار کیا؛ سوائے چند ایک مواقع کے؛ جو کہ تقریباً بیس احادیث ہیں: ان میں سے بھی زیادہ مسلم شریف میں ہیں۔

مقصود یہ ہے کہ ان حضرات کی روایت کردہ احادیث کو ان سے پہلے بھی اوران کے بعد بھی اس فن کے ماہرین نے جانچ پرکھ کے میزان سے گزارا ہے؛ اوران پر تنقید و بحث کی ہے۔اوران احادیث کو اتنی خلقت نے روایت کیا ہے جن کی تعداد کو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔پس یہ ائمہ نہ حدیث کے روایت کرنے میں منفرد ہیں' اور نہ ہی اس کو صحیح کہنے میں۔

خلاصہ کلام! اللہ تعالیٰ ہی اس دین کی حفاظت کا ذمہ دار ہے؛ فرمانِ الٰہی ہے:

﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾

''بیشک ہم نے ہی اس قرآن کو نازل کیا ہے' اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔''

❀ چوتھی بات: لوگوں میں تواتر کے ساتھ یہ بات مشہور و معروف ہے کہ مرتدین کے ساتھ قتال کرنے والے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں۔آپ نے ہی مسیلمہ کذاب اوراس کے اتباع کار قبیلہ بنوحنیفہ اوراہل یمامہ سے جنگ کی تھی؛ مسیلمہ نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔کہا جاتا ہے کہ ان لوگوں کی تعداد ایک لاکھ یا اس سے بھی زیادہ تھی۔اورآپ نے ہی طلیحہ اسدی سے جنگ کی جس نے نجد کے علاقہ میں نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔بنوتمیم؛ بنواسد اور بنوغطفان نے اس کی اطاعت گزاری شروع کردی تھی۔ایسے ہی سجاح نامی ایک عورت نے بھی نبوت کا دعویٰ کیا تھا؛ پھر اس نے مسیلمہ کذاب کے ساتھ شادی کرلی؛ یوں جھوٹا اور جھوٹی شادی کے بندھن میں بندھ گئے۔

مرتدین سے جنگ کرنے والے ہی وہ لوگ تھے جن سے اللہ تعالیٰ محبت کرتے تھے اور وہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے تھے۔وہ اس آیت کی تفسیر میں داخل ہونے کے سب سے زیادہ حق دار ہیں۔

ایسے ہی وہ تمام لوگ جنہوں نے اہل روم و فارس سے قتال کیا؛ وہ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما اوران کے رفقاء اوراہل یمن اور دوسرے لوگ ہیں۔یہی وجہ ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان لوگوں کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی طرف اشارہ کرکے فرمایا: ''اس کی قوم کے لوگ ہیں۔'' [تفسیر الطبری ۱۰/ ۴۱۱]

یہ بات تواتر کے ساتھ مشہور اور یقینی طور پر معلوم شدہ ہے کہ جو لوگ فتنہ ارتداد کے وقت دین اسلام پر ثابت قدم رہے؛ اور جنہوں نے کفار و مرتدین سے قتال کیا وہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں شامل ہیں: [فرمان الٰہی ہے]:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَ يُحِبُّوْنَهٗۤ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ لَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ﴾ [آل عمران ۵۴]

''اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اگر تم میں سے کوئی اپنے دین سے پھرتا ہے (تو پھر جائے) اللہ اور بہت سے لوگ ایسے پیدا کردے گا جو اللہ کو محبوب ہوں گے اور اللہ ان کو محبوب ہوگا، جو مومنوں پر نرم اور کفار پر سخت ہوں گے، جو اللہ کی راہ میں جدوجہد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں گے۔''

اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ان لوگوں میں سے جو اللہ سے محبت کرتے ہیں' اور اللہ ان سے محبت کرتا ہے؛ لیکن آپ میں یہ صفت حضرت ابوبکر وعمر اور عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین سے زیادہ نہیں پائی جاتی ۔اور نہ ہی آپ کا کفار و مرتدین کے ساتھ جہاد ان حضرات کے جہاد سے بڑھ کر تھا؛ اور نہ ہی آپ کی وجہ سے دین کے لیے کوئی ایسی مصلحت حاصل ہوئی جو ان تینوں خلفاء کے ذریعہ حاصل ہونے والی مصلحت سے بڑھ کر ہو۔ بلکہ ان میں سے ہر ایک کی کوششیں قابل صد شکر گزاری ہیں ۔ان کے نیک اعمال کے اچھے اثرات اسلام میں موجود ہیں ۔اور اللہ تعالیٰ انہیں ان اعمال پر جزائے خیر عطا فرمائے۔

یہ حضرات خلفاء راشدین اور ائمہ رشد و ہدایت ہیں ۔جو حق کے مطابق چلتے تھے اور عدل وانصاف سے کام لیتے تھے۔

اس کے برعکس اگر کوئی ائمہ اہل سنت والجماعت جن کی وجہ سے دین و دنیا میں بہت بڑا فائدہ حاصل ہوا؛ ان کو کافر و فاسق اور ظالم کہے ؛اور پھر ایسے انسان کی طرف آئے ؛ جس کی وجہ سے دین و دنیا کا کوئی ایسا فائدہ حاصل نہیں ہوا جیسا ان سابقہ تین حضرات سے ہوا ہے؛ اور اس صحابی کو اللہ تعالیٰ کا شریک بنائے ؛ یا رسول اللہ ﷺ کا شریک بنائے ؛ یا ایسا امام معصوم قرار دے؛[اور یہ کہے کہ] :ایمان والے صرف وہی لوگ ہوں گے جو اسے امام معصوم اور منصوص علیہ مانتے ہوں گے ؛ اور جو اس دائرے سے خارج ہو' اسے کافر کہیں ۔ اور جن کفار او رمرتدین سے ان خلفاء نے قتال کیا تھا ؛ انہیں مسلمان قرار دے ؛ اور جو اہل ایمان پانچ نمازیں پڑھتے ؛ رمضان کے روزے رکھتے ؛ بیت اللہ کا حج کرتے ؛اور قرآن پر ایمان رکھتے تھے ؛ انہیں ان منافقین و مرتدین سے جنگ لڑنے کی وجہ سے کافر قرار دے ۔ یہ کام صرف وہی انسان کرسکتا ہے جو انتہائی جھوٹا ؛ کذاب ؛ جاہل اور ظالم ہو ؛ اور دین اسلام میں الحاد کو فروغ دینا چاہتا ہو۔ یہ ایسا انسان ہی ہوسکتا ہے جس کا نہ ہی کوئی دین و ایمان ہو اور نہ ہی علم و عقل ۔

علماء کرام رحمہم اللہ ہمیشہ سے کہتے چلے آئے ہیں کہ: رافضیت کی بنیاد رکھنے والا زندیق اور ملحد تھا۔جس کا مقصد دین کو خراب کرنا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ رافضیت کو زنادقہ ؛ملحدین ؛ غالیہ معطلہ نصیریہ اور اسماعیلیہ [اور ان جیسے دوسرے کافر فرقوں] کی پناہ گاہ سمجھا جاتا رہا ہے۔

یہ پہلی سوچ اور آخری کام تھا۔رافضیت کا موجد دین اسلام میں فساد پیدا کرنا اور اس کی رسیوں کو توڑنا ؛ اور اس کو جڑوں سے اکھاڑنا چاہتا تھا۔آخر کار اس کے دل کے وہ بھید ظاہر ہوگئے جنہیں وہ چھپائے رکھنا چاہتا تھا۔مگر اللہ تعالیٰ کا ارادہ یہ تھا کہ اس کا دین پورا رہے بھلے کافروں کو یہ بات ناگوار ہی کیوں نہ گزرتی ہو۔ یہ باتیں عبداللہ بن سباء اور اس کے متبعین کے بارے میں مشہور ہیں ۔اسی نے سب سے پہلے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں امام منصوص ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔اور آپ کے بارے میں معصوم ہونے کا قول ایجاد کیا۔ پس اس سے ثابت ہوا کہ امامی شیعہ حقیقت میں مرتدین کے پیروکار اور ملحدین کے غلام اور منافقین کے وارث ہیں ۔اگرچہ یہ خود بڑے ملحد [ومنافق] اور مرتد نہ بھی ہوں۔

❀ پانچویں بات : ان سے کہا جائے گا: تصور کیجیے یہ آیت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے؛ تو پھر بھی کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ خاص ہے : جب کہ اس کے الفاظ میں تصریح موجود ہے کہ وہ لوگ جماعت ہیں ؛[کوئی فرد واحد نہیں] جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے :

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَنْ یَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِیْنِهٖ فَسَوْفَ یَاْتِی اللّٰهُ بِقَوْمٍ یُّحِبُّهُمْ وَ یُحِبُّوْنَهٗۤ اَذِلَّةٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اَعِزَّةٍ عَلَی الْكٰفِرِیْنَ یُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ لَا یَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآىِٕمٍ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَآءُ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ﴾

''اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اگر تم میں سے کوئی اپنے دین سے پھرتا ہے (تو پھر جائے) اللہ اور بہت سے لوگ ایسے پیدا کر دے گا جو اللہ کو محبوب ہوں گے اور اللہ ان کو محبوب ہوگا، جو مومنوں پر نرم اور کفار پر سخت ہوں گے، جو اللہ کی راہ میں جدوجہد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں گے۔ یہ اللہ کا فضل ہے، جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔ اللہ وسیع ذرائع کا مالک ہے اور سب کچھ جانتا ہے۔''

''کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں گے'' کے الفاظ تک صاف صراحت موجود ہے کہ یہ حضرات کوئی ایک آدمی نہیں؛ اس لیے کہ عرب لغت میں ایک آدمی کو کسی بھی صورت میں حقیقتاً یا مجازاً قوم نہیں کہا جاتا۔

اگر کوئی یہ کہے کہ: اس سے مراد آپ کے شیعہ ہیں۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ: جب آیت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علاوہ دوسرے لوگ بھی شامل ہیں؛ اور اس میں کوئی شک بھی نہیں کہ جن لوگوں نے کفار و مرتدین کے ساتھ جنگیں لڑیں وہ اس آیت کی تفسیر میں داخل ہونے کے اس انسان کی نسبت بڑے حق دار ہیں جس نے اہل قبلہ کے علاوہ کسی سے بھی قتال نہ کیا ہو۔ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ اہل یمن جنہوں نے حضرت ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین کے ساتھ مل کر جہاد کیا؛ وہ ان رافضیوں کی نسبت اس آیت میں داخل ہونے کے زیادہ حق دار ہیں؛ جو [رافضی] یہود و نصاریٰ اور مشرکین سے دوستی رکھتے ہیں؛ اور سابقین اولین اہل اسلام سے دشمنی کرتے ہیں۔

اگر یہ کہا جائے کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ لڑنے والوں میں بہت سارے لوگ اہل یمن تھے۔

تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ: جن لوگوں نے آپ سے جنگ کی؛ ان میں بھی بہت سارے لوگ اہل یمن تھے۔ دونوں لشکر میں اہل یمن اور قبیلہ قیس کے بہت زیادہ لوگ موجود تھے۔ یمن کے اکثر لوگ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے۔ جیسے ذی الکلاع کے لوگ؛ ذی عمرو؛ ذی رعین؛ اور دوسرے لوگ جنہیں ''الذوین'' کہا جاتا ہے۔

❀ چھٹی بات: اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿فَسَوْفَ یَاْتِی اللّٰهُ بِقَوْمٍ یُّحِبُّهُمْ وَ یُحِبُّوْنَهٗ﴾ ''اللہ تعالیٰ بہت سے لوگ ایسے پیدا کر دے گا جو اللہ کو محبوب ہوں گے اور اللہ ان کو محبوب ہوگا'' یہ لفظ مطلق ہے؛ اس میں کسی کو بھی متعین نہیں کیا گیا۔ یہ لفظ ان تمام لوگوں کو شامل ہوگا جو ان صفات سے بہرہ ور ہونگے؛ بھلے وہ کوئی بھی ہوں۔ یہ الفاظ نہ ہی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ خاص ہیں اور نہ ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ۔ جب کسی ایک کے ساتھ خاص نہیں تو ان کا شمار کسی کے خصائص میں سے نہیں ہوگا۔ تو اس سے یہ نظریہ باطل ہوگیا کہ جو لوگ آپ کے ساتھ ان اوصاف میں شریک ہیں آپ ان سے افضل ہوئے؛ کجا کہ اس سے امامت کو واجب سمجھا جائے۔

بلکہ یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ قیامت تک کوئی بھی انسان اس دین سے مرتد نہیں ہوگا؛ مگر اللہ تعالیٰ اس کی جگہ ایسی قوم کو لے آئیں گے جو اس سے محبت کرتی ہوگی؛ اور وہ ان سے محبت کرتا ہوگا؛ اس قوم کے لوگ اہل ایمان پر بڑے نرم اور کفار

پر بڑے سخت ہوں گے۔ وہ اللہ کی راہ میں مرتدین سے جہاد کریں گے۔

ارتداد کبھی اصلِ اسلام سے ہوتا ہے: جیسے غالیہ نصیریہ اور اسماعیلیہ کی حالت ہے؛ اہل سنت اور شیعہ کا ان کے مرتد [اور کافر] ہونے پر اتفاق ہے۔ اور جیسے العباسیہ۔

اور کبھی ارتداد دین کے بعض امور سے ہوتا ہے؛ جیسا کہ اہل بدعت رافضہ اور دوسرے لوگوں کا حال ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کسی ایسی قوم کو کھڑا کردے گا جن سے وہ محبت کرتا ہوگا؛ اور وہ اس سے محبت کریں گے۔ وہ لوگ دین سے پھر جانے والوں؛ یا دین کے کچھ حصے کو ترک کردینے والوں سے جہاد کریں گے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو کھڑا کیا ہے جو ہر زمانے میں مرتد رافضیوں کے خلاف برسر پیکار رہے ہیں۔ اور انہیں کسی کا کوئی بھی خوف نہیں ہوگا۔

ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ ہمیں ان لوگوں میں سے بنادے جن سے وہ محبت کرتا ہے اور وہ اس سے محبت کرتے ہیں اور وہ اس کی راہ میں کسی بھی خوف و ملامت کے بغیر جہاد کرتے ہیں۔ آمین۔

امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی چھبیسویں دلیل:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ''امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی چھبیسویں دلیل یہ آیت ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ وَالشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ (الحدید: ۱۹)

''اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہیں وہی لوگ اپنے رب کے نزدیک صدیق اور شہید ہیں۔''

امام احمد بن حنبل ابن ابی لیلیٰ سے روایت کرتے ہیں اور وہ اپنے باپ سے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''صدیق تین ہیں: حبیب بن موسیٰ نجار مومن آل یاسین، جس نے کہا تھا: ''اے میری قوم کے لوگو! رسولوں کی بات مان لو۔'' حزقیل مومن آل فرعون؛ جس نے کہا تھا: ''کیا تم کسی آدمی کو اس وجہ سے قتل کرتے ہو کہ وہ کہتا ہے میرا رب اللہ ہے۔'' اور تیسرا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور یہ تینوں میں سے افضل ہیں۔''

ایسی ہی روایت ابن مغازلی شافعی نے اور کتاب ''الفردوس'' کے مصنف نے بھی روایت کی ہے۔ یہ ایسی فضیلت ہے جو آپ کی امامت پر دلالت کرتی ہے۔'' [شیعہ کا بیان ختم ہوا]

[جواب]:

❀ پہلی بات: ہم شیعہ مصنف سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ اس کی صحت ثابت کرے۔ اس لیے کہ امام احمد کی تمام مرویات صحیح نہیں ہیں۔ کسی روایت کے آپ کی کتاب " الفضائل " کی طرف منسوب ہونے سے اس کی صحت ثابت نہیں ہوجاتی؛ اس پر اہل علم کا اتفاق ہے۔ اہل علم جانتے ہیں کہ ''الفضائل'' کی ہر روایت کو صحیح نہیں کہا جاسکتا۔ کیونکہ [اس کتاب میں] آپ وہی روایات نقل کرتے ہیں جو لوگ روایت کررہے ہوں؛ بھلے ان کی صحت ثابت نہ ہو۔ بلکہ ''المسند'' میں بھی جمع کردہ آپ کی ہر روایت کو صحیح نہیں کہا جاسکتا۔ بلکہ آپ کی مسند کی احادیث لوگ دوسرے معروف راویوں سے نقل کرتے ہیں؛ جب تک کہ ان میں کوئی ایسی قدح کی علامت ظاہر نہ ہو۔ اس لیے کہ بعض احادیث میں ایسی

علت موجود ہے جس کی وجہ سے وہ حدیث ضعیف ہی نہیں بلکہ باطل ہوجاتی ہے۔لیکن اس کی اکثر احادیث صحیح اور قابل حجت ہیں۔اور سنن ابی داؤد کی احادیث سے زیادہ عمدہ ہیں۔ جب کہ ''الفضائل'' میں جمع کردہ احادیث کا معاملہ ایسے نہیں ہے۔

محدث کے ہاں کبھی حدیث میں غلطی ثابت ہوتی ہے؛ یا راوی کے علم کے بغیر دوسرے دلائل کی وجہ سے اس حدیث میں جھوٹ کے آثار کا پتہ چل جاتا ہے۔

اہل کوفہ کے ہاں سچ اور جھوٹ آپس میں مل گیا تھا۔متاخرین پر بسا اوقات ان میں سے کسی ایک کی غلطی یا اس کا جھوٹ مخفی رہ جاتا ہے۔لیکن کسی دوسری دلیل سے اس کی معرفت حاصل ہوجاتی ہے۔اس پر مزید یہ کہ یہ روایت امام احمد نے اپنی ''المسند'' میں ذکر کی ہے نہ ''الفضائل'' میں۔ بلکہ القطیعی نے محمد بن یونس القرشی سے روایت کرتے ہوئے اس کا اضافہ کیا ہے ؛وہ عبدالرحمٰن بن ابی لیلی سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا؛اور پھر مذکورہ حدیث بیان کی۔

القطیعی نے اسے ایک دوسری سند سے بھی نقل کیا ہے؛ وہ کہتے ہیں: ہماری طرف عبداللہ بن غنام کوفی نے لکھا کہ ہم نے حسن بن عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ نابینا سے سنا اس نے عمرو بن جمیع سے سنا۔

عمرو بن جمیع نا قابل اعتماد انسان ہے؛ اس کی روایات سے استدلال نہیں کیا جاسکتا۔محدث ابن عدی رحمہ اللہ عمرو بن جمیع کے بارے میں فرماتے ہیں کہ یہ وضاع ہے[اپنی طرف سے روایات گھڑتا رہتا ہے]۔

یحییٰ بن معین رحمہ اللہ فرماتے ہیں: انتہائی خبیث اور جھوٹا ہے۔

امام نسائی اور دارقطنی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: متروک الحدیث ہے۔

ابن حبان رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جھوٹی روایات کو ثقہ راویوں کی طرف منسوب کرکے روایت کرتا ہے۔اور منکر احادیث کو مشہور لوگوں کی طرف منسوب کرتا ہے۔اس کی روایت کو لکھنا حلال نہیں ہے؛ صرف عبرت کے لیے لکھا جائے تو ٹھیک ہے۔

❀ دوسری بات: یہ حدیث رسول اللہ ﷺ پر جھوٹ گھڑا گیا ہے۔

❀ تیسری بات: علاوہ ازیں صحیح احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سوا کچھ اور لوگ بھی صدیق کے لقب سے ملقب تھے جیسا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو صدیق کہا جاتا تھا؛ تو پھر یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ صدیق صرف تین ہیں؟ بخاری و مسلم میں ہے کہ نبی کریم ﷺ کوہ احد پر چڑھے۔ آپ کے ہمراہ حضرت ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین بھی تھے۔پہاڑ کانپا تو آپ نے فرمایا:''احد (کے پہاڑ) ٹھہر! تجھ پر تو صرف ایک نبی ہے ایک صدیق اور دو شہید۔''[1]

اسے امام احمد نے یحی بن سعید؛ انہوں نے قتادہ سے ؛ اور انہوں نے حضرت انس سے روایت کیا ہے۔

اور ایک روایت میں ہے کہ احد کے پہاڑ پر زلزلہ آگیا۔[مسند ۳/ ۱۱۲]

---

[1] صحیح بخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ۔ باب قول النبی ﷺ" لوکنت متخذا خلیلا" (ح: ۳٦۷۵)، صحیح مسلم ۔ کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل طلحة والزبیر رضی اللہ عنہما (حدیث:۲٤۱۷)۔

صحیحین میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''تم پر سچ بولنا واجب ہے۔ سچ نیکی کا راستہ دکھاتا ہے اور نیکی جنت کی طرف لے کر جاتی ہے۔ اور انسان سچ بولتا رہتا ہے اور سچائی کی تلاش میں رہتا ہے یہاں تک کہ وہ سچا لکھ دیا جاتا ہے۔ اپنے آپ کو جھوٹ سے بچاؤ؛ بیشک جھوٹ برائی کا راستہ دکھاتا ہے اور برائی دوزخ کی طرف لے جاتی ہے۔ اور انسان جھوٹ بولتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ جھوٹا لکھ دیا جاتا ہے۔''❶

❀ چوتھی بات: اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم رضی اللہ عنہا کو بھی صدیقہ کے لقب سے ملقب کیا ہے۔ تو پھر کیسے کہا جاسکتا ہے کہ صدیق صرف تین ہی ہیں؟

❀ پانچویں بات: قائل کا یہ کہنا کہ: ''صدیق صرف تین ہیں'' اگر اس سے مراد یہ ہے کہ ان کے علاوہ کوئی صدیق نہیں تو پھر یہ سراسر جھوٹ اور کتاب وسنت اور مسلمانوں کے اجماع کے خلاف ہے۔ اور اس اگر سے مراد یہ ہو کہ اپنی صدیقیت میں یہ تین لوگ کامل تھے؛ تب بھی یہ خطاء ہے۔ اس لیے کہ ہماری امت سب امتوں میں سے بہترین امت ہے جسے اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے لیے پیدا کیا ہے؛ تو پھر حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کی تصدیق کرنے والے محمد ﷺ کی تصدیق کرنے والوں سے افضل کیوں کر ہوسکتے ہیں؟

اللہ تعالیٰ نے آل فرعون کے مؤمن کو صدیق نہیں کہا؛ اور نہ ہی آل یاسین کے فرد کو صدیق کہا ہے؛ لیکن یہ حقیقت ہے کہ انہوں نے انبیاء کرام علیہم السلام کی تصدیق کی تھی۔ لیکن محمد ﷺ کی تصدیق کرنے والے ان سے زیادہ افضل ہیں۔

قرآن کریم میں بعض انبیاء کو بھی صدیق کہا گیا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شان میں فرمایا:

﴿وَ اذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا﴾ (مریم: ۴۱)

''اس کتاب میں ابراہیم (علیہ السلام) کا قصہ بیان کر، بیشک وہ بڑی سچائی والے پیغمبر تھے۔''

[اور حضرت ادریس علیہ السلام کے بارے میں فرمایا:]

﴿وَ اذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا﴾ (مریم: ۵۶)

''اور اس کتاب میں ادریس (علیہ السلام) کا بھی ذکر کر، وہ بھی نیک کردار پیغمبر تھے۔''

[اور حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں فرمایا:] ﴿يُوْسُفُ اَيُّهَا الصِّدِّيْقُ﴾ [یوسف ۴۶]

''یوسف! اے دوست۔''

❀ چھٹی بات: عام لوگوں کے حق میں فرمایا: ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖۤ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ﴾ (الحدید: ۱۹)

''جو لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے وہ صدیق ہیں۔''

یہ آیت اس امر کی مقتضی ہے کہ ہر وہ شخص جو اللہ تعالیٰ اور رسولوں پر ایمان رکھتا ہے وہ صدیق ہے۔

❀ ساتویں بات: اگر صدیق ہی امامت کا مستحق ہوسکتا ہے؛ تو پھر اس مقام کے سب سے زیادہ حق دار حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ

---

❶ صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب قبح الکذب وحسن الصدق، (حدیث: ۱۰۵/ ۲۶۰۷)، واللفظ له. صحیح بخاری، کتاب الادب، باب قول الله تعالیٰ ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ......﴾ (حدیث: ۶۰۹۴).

تھے۔اس لیے کہ بہت سارے دلائل کی روشنی میں خواص وعوام میں تواتر کے ساتھ یہ نام آپ کے لیے ثابت ہے۔ یہاں تک اسلام کے دشمن بھی اس کا اعتراف کرتے ہیں۔ پس اس لیے امامت وخلافت کے سب سے زیادہ مستحق آپ ہی ہوئے۔اور اگر صدیق ہونے سے امامت وخلافت لازم نہیں آتی تو پھر رافضی کی دلیل باطل ٹھہری۔

امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ستائیسویں دلیل:

[اشکال]: شیعہ مصنف رقم طراز ہے:''امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ستائیسویں دلیل درج ذیل آیت ہے:

﴿اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ بِالَّیْلِ وَالنَّھَارِ سِرًّا وَّ عَلَانِیَۃً﴾ (البقرہ:۲۷۴)

''جولوگ اپنے مالوں کو رات دن میں چھپ کر اور کھلے عام خرچ کرتے ہیں۔''

ابونعیم حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ:''یہ آیت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ان کے پاس چار درہم تھے۔ایک درہم رات کے وقت خرچ کیا ایک دن کے وقت ایک خفیہ اور ایک علانیہ۔ایسی روایت ثعلبی نے بھی ذکر کی ہے۔چونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس فضیلت میں منفرد ہیں،لہٰذا امام بھی وہی ہیں۔''[شیعہ کا بیان ختم ہوا]۔

[جواب]: اس کے جواب میں کئی باتیں ہیں:

- پہلی بات: ہم اس نقل کا ثبوت طلب کرتے ہیں؛ اس لیے کہ ثعلبی اور ابونعیم کی روایات اس [واقعہ] کے صحیح ہونے پر دلالت نہیں کرتیں۔
- دوسری بات: ہم دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ روایت صریح کذب ہے۔اس کی کوئی بھی صحیح سند ثابت نہیں۔
- تیسری بات: یہ آیت ہر خرچ کرنے والے کے بارے میں عام ہے جو رات اور دن کو؛ اور اعلانیہ اور چپکے سے خرچ کریں۔جو بھی اس پر عمل کرے؛ وہ اس کے حکم میں داخل ہوگا؛ خواہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہوں یا پھر کوئی دوسرا۔یہ بات ممتنع ہے کہ اس میں شخص واحد کے علاوہ کوئی دوسرا انسان داخل نہ ہوسکتا ہو۔
- چوتھی بات: مصنف نے جو دلیل ذکر کی ہے؛ وہ آیت کے مدلول سے متناقض ہے۔اس لیے کہ آیت ان دو زمانوں میں خرچ کرنے کا بیان کررہی ہے جن سے کوئی بھی وقت خالی نہیں ہوسکتا؛ اور ان دو حالتوں کا بیان کررہے ہیں کہ کوئی بھی فعل ان دو حالتوں سے خالی نہیں ہوسکتا۔کسی بھی کام کے کرنے کے لیے کوئی زمانہ ہونا چاہیے؛ اور زمانہ یا تو رات ہے؛ اور یا پھر دن ہے۔جب کوئی انسان رات کو خرچ کرتا ہے؛ تو یقیناً وہ خفیہ طور پر خرچ کرنے والا ہے؛ اور جب دن کو خرچ کرتا ہے تو اعلانیہ خرچ کرنے والا ہے؛ اس لیے کہ سراً و علانیۃً خرچ کرنے اور شب و روز کرنے میں تضاد نہیں پایا جاتا بلکہ جو شخص ظاہر و پوشیدہ خرچ کرتا ہے وہ شب و روز بھی خرچ کرتا ہے۔اور جو شب و روز بھی خرچ کرتا ہے وہ سراً و علانیۃً بھی خرچ کرتا ہے۔

پس جس نے یہ کہا کہ اس سے مراد ایک درہم خفیہ طور پر اور ایک درھم اعلانیہ طور پر اور ایک درھم رات کو اور ایک درھم دن کو خرچ کرنا مراد ہے؛ وہ بڑا جاہل انسان ہے۔اس لیے کہ خرچ کرنے والا کبھی رات کو بھی اعلانیہ خرچ کرسکتا ہے' اور کبھی دن کو بھی چھپا کر خرچ کرسکتا ہے۔نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ ایک درہم کو دو نصف درہم میں بھی تقسیم کرسکتے ہیں۔لہٰذا یہ ضروری

نہیں کہ آپ کے پاس چار درہم ہوں؛ خواہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہوں یا کوئی دوسرا ہو۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِي الَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّ عَلَانِيَةً ﴾ (البقرہ: ۲۷۴)

''جولوگ اپنے مالوں کو رات دن میں چھپ کر اور کھلے عام خرچ کرتے ہیں۔''

یہاں پر [النهار سرا] میں حرف عطف واؤ نہیں لایا گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ رافضی قرآنی اندازِ دلالت سے بالکل جاہل ہے۔ اور رافضیوں میں اس قسم کی جہالت کا پایا جانا کوئی اچھوتی بات نہیں ہے۔

اس آیت کے معانی سے جاہل انسان اس وہم کا شکار ہو گیا کہ جو خفیہ طور پر اور اعلانیہ خرچ کرتا ہے وہ اس آدمی کی طرح نہیں ہے جو دن و رات میں خرچ کرتا ہے؛ اس لیے وہ کہتا ہے کہ: یہ آیت ان لوگوں کے حق میں نازل ہوئی جن کے پاس چار درھم ہوں۔ بلکہ سرّ واعلانیہ دونوں لیل ونہار (شب و روز) میں بھی داخل ہیں خواہ سراً و علانیہ مصدر ہونے کی بنا پر منصوب ہوں یا حال ہونے کی وجہ سے۔

❀ پانچویں بات: اگر مان لیا جائے کہ یہ آیت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی؛ اور آپ نے ایسا کیا بھی تھا؛ تو کیا چار دراہم کے چار احوال میں خرچ کرنے کے علاوہ اللہ کی راہ میں کوئی خرچہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ عمل تو ایسا ہے کہ ہر شخص کے لیے خرچ کرنے کا دروازہ کھلا ہے اور تا قیامت کوئی ممانعت نہیں۔ اور اس پر عمل کرنے والے بلکہ اس سے کئی گنا بڑھ چڑھ کر خرچ کرنے والے اتنے زیادہ ہیں کہ ان کا اعداد و شمار ممکن نہیں؛ اور ان میں سے ہر ایک میں خیر و بھلائی کا عنصر پایا جاتا ہے۔ اس میں نہ ہی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کوئی خصوصیت ہے اور نہ ہی اس سے فضیلت اور امامت ثابت ہوتی ہے۔

امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اٹھائیسویں دلیل:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:

''امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اٹھائیسویں دلیل امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی وہ روایت ہے جو انھوں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کی ہے کہ قرآن کریم میں جہاں کہیں بھی: ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ ''اے ایمان والو'' آیا ہے حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کے رئیس و امیر ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اصحاب رسول کو معتوب کیا ہے، مگر علی رضی اللہ عنہ کا ذکر ہمیشہ مدحیہ انداز میں کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سب سے افضل ہیں۔ لہٰذا آپ ہی امام ہوئے۔'' [شیعہ کا بیان ختم ہوا]۔

[جواب]: ہم شیعہ سے زیر تبصرہ روایت کی صحت ثابت کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں، یہ روایت امام احمد نے نقل نہیں کی، اور اگر بالفرض امام صاحب نے ''الفضائل'' وغیرہ میں نقل بھی کی ہو تو صرف نقل کرنے سے روایت کی صحت و صداقت ثابت نہیں ہوتی؛ تو پھر کیسے کوئی بات کہہ سکتے ہیں جب کہ آپ نے یہ روایت نہ ہی مسند میں نقل کی ہے اور نہ ہی الفضائل میں۔ بلکہ یہ روایت ''فضائل صحابہ'' میں القطیعی کے اضافات میں سے ہے۔ اس کی سند یہ ہے:

عن ابراهيم عن شريك الكوفي؛ حدثنا ذكريا بن يحي الكسائي حدثنا عيسى عن علي بن بذيمه عن عكرمه عن ابن عباس۔

اہل علم کا اتفاق ہے کہ ایسی سند قابل حجت نہیں ہوسکتی۔[دراصل یہ ابن عباس پر افتراء ہے]۔اس روایت کی سند میں زکریا بن یحی الکسائی نامی راوی ہے۔اس کے متعلق یحی بن معین رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''انتہائی برا آدمی تھا؛ اپنی طرف سے حدیثیں گھڑا کرتا تھا؛ اس بات کا مستحق تھا کہ اس کے لیے کنواں کھود کر اس میں گرا دیا جائے۔''

امام دار قطنی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''متروک الحدیث ہے۔''

ابن عدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''صحابہ کرام پر طعنہ زنی کے لیے روایات گھڑا کرتا تھا۔''

❀ دوسری بات: یہ بات حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما پر جھوٹ گھڑی گئی ہے۔بخلاف ازیں ابن عباس سے بتواتر منقول ہے کہ آپ شیخین کو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے افضل قرار دیتے تھے۔ابن عباس نے کئی دفعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو معتوب کیا اور ان کی مخالفت کی۔کئی امور میں آپ پر تنقید کیا کرتے تھے۔جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان زنادقہ کو نذر آتش کیا تھا جنہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو رب ماننا شروع کر دیا تھا؛ تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اگر علی رضی اللہ عنہ کی جگہ میں ہوتا تو زنادقہ کو جلانے کی بجائے ان کو قتل کر دیتا، کیوں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ:''کسی کو عذاب الٰہی میں مبتلا نہ کرو۔''❶

نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:''جو کوئی اپنے دین کو بدل ڈالے؛ اسے قتل کر دو۔'' [صحیح بخاری]

جب اس بات کی خبر حضرت علی رضی اللہ عنہ تک پہنچی تو آپ نے فرمایا:''ابن عباس رضی اللہ عنہ کے لیے افسوس ہے۔''

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ثابت ہے کہ آپ کتاب اللہ کے مطابق فتوی دیا کرتے تھے؛ جب آپ کے پاس کتاب وسنت سے دلیل موجود نہ ہوتی تو حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے قول کے مطابق فتوی دیا کرتے تھے۔یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی جناب ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کی اتباع اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مخالفت کی ایک مثال ہے۔

کئی ایک علماء؛- جن میں زبیر ابن بکار رحمہ اللہ بھی شامل ہیں- نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نام آپ کے جواب کا بھی ذکر کیا ہے کہ؛ جب آپ بصرہ کا مال لے گئے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انہیں سخت قسم کا خط لکھا۔تو آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جو جواب دیا؛ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ:''جو کچھ میں نے کیا ہے؛ وہ اس سے بہت کم ہے جو تم نے کیا ہے؛ تم نے اپنی امارت میں مسلمانوں کا خون ناحق بہایا ہے۔''

❀ تیسری بات: علاوہ ازیں صرف ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ میں مدح کا کوئی پہلو موجود نہیں۔اس لیے کہ کئی ایک مواقع پر اللہ تعالیٰ یہی الفاظ استعمال کرتے ہوئے اہل ایمان کو معتوب کرتے ہیں۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ٭ کَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ﴾

''اے ایمان والو! تم وہ بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو۔تم جو کرتے نہیں اس کا کہنا اللہ تعالیٰ کو سخت ناپسند ہے۔''

❶ صحیح بخاری، کتاب استتابة المرتدین، باب حکم المرتد(حدیث:٦٩٢٢)۔

اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ اس آیت کے رئیس و امیر ہیں تو آپ اس عتاب میں بھی داخل ہیں جس پر اللہ تعالیٰ نے انکار و مذمت کی ہے۔[لہٰذا اس سے تمہاری وہ روایت غلط ٹھہری کہ علی کا ذکر ہمیشہ مدحیہ انداز میں کیا ہے]۔

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّیْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِیَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَیْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ﴾ (الممتحنة: ۱)

''اے ایمان والو! میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ؛ تم دوستی سے ان کی طرف پیغام بھیجتے ہو۔''

یہ صحاح ستہ میں ثابت شدہ بات ہے کہ یہ آیت حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں اس وقت نازل ہوئی۔ جب آپ نے مشرکین مکہ کو خط لکھا۔ [1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما کو بھیجا کہ اس عورت کو پکڑ لائیں جس کے پاس یہ خط موجود ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت حاطب رضی اللہ عنہ کی غلطی سے بری ہیں۔تو پھر آپ اس میں مخاطب ان لوگوں کا سردار کیسے کہا جاسکتا ہے جن کی غلطی پر اللہ تعالیٰ نے انہیں ملامت کی تھی۔

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَتَبَیَّنُوْا وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰۤی اِلَیْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا﴾

''اے ایمان والو! جب تم اللہ کی راہ میں جارہے ہو تو تحقیق کر لیا کرو اور جو تم سے سلام علیک کرے تم اسے یہ نہ کہہ دو کہ تو ایمان والا نہیں؛ تم دنیاوی زندگی کے اسباب کی تلاش میں ہو......''

یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جنہوں نے مال غنیمت کے ساتھ ایک آدمی کو پایا؛ اس نے کہا: میں مسلمان ہوں؛ ان لوگوں نے اس کی بات کو سچا نہ مانا؛ اور اس سے مال غنیمت چھین لیا۔تو اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم دیا کہ بات کو واضح اور ثابت ہوجانے دیا کریں۔اور انہیں دنیاوی مال کی وجہ سے کسی بھی اسلام کے مدعی کی تکذیب کرنے سے منع کیا۔حضرت علی رضی اللہ عنہ ان لوگوں کی غلطی سے بری ہیں۔تو پھر کیسے کہا جاسکتا ہے کہ آپ ان کے سردار ہیں۔اس کے امثال و نظائر بہت ہیں۔

❀ چوتھی بات: اس قسم کے الفاظ میں سب اہل ایمان شامل ہیں یہ علیحدہ بات ہے کہ کوئی اس خطاب کا سبب ہوسکتا ہے۔تو اس میں کوئی شک نہیں کہ لفظ اسکو بھی ایسے ہی شامل ہوتا ہے جیسے اس کے علاوہ دوسرے لوگوں کو شامل ہوتا ہے۔اس آیت کے الفاظ میں کوئی بھی ایسی چیز نہیں ہے جس کی بنا پر اہل ایمان کے مابین فرق کیا جاسکے۔

❀ پانچویں بات: بعض لوگوں کا بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں یہ کہنا کہ: آپ اس آیت کے سردار ہے؛ یا اس آیت کے امیر ہیں یا اس طرح کے دیگر کلمات کہنا؛ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔اگر اس سے مراد یہ ہو کہ وہ صحابی اس آیت کا پہلا مخاطب ہے تو پھر یہ ایک دوسری بات ہے۔اس لیے کہ آیت میں خطاب تمام مخاطبین کو یکساں طور پر شامل

[1] صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ الفتح(حدیث:۴۲۷۴)، صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل حاطب بن ابی بلتعة، رضی اللہ عنہ (حدیث: ۲۴۹۴)۔

ہوتا ہے۔ان میں سے بعض کو بعض پر شمول خطاب کی وجہ سے ترجیح نہیں دی جاسکتی۔

اگر یہ کہا جائے کہ: آپ [یعنی حضرت علی] نے سب سے پہلے اس آیت پر عمل کیا ہے۔تو پھر بھی معاملہ ایسے نہیں ہے۔ بعض آیات ایسی ہیں جن پر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پہلے دوسرے لوگوں نے عمل کیا اور بعض ایسی بھی ہیں جن پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو عمل کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ اس آیت کا دوسرے لوگوں کو شامل ہونا؛ یا کسی دوسرے کا اس پر عمل کرنا آپ کے ساتھ مشروط ہے ۔جیسا کہ جمعہ میں امام ہوتا ہے۔تو پھر بھی بات ایسے نہیں ہے۔اس لیے کہ خطاب کے بعض افراد کو شامل ہونے میں دوسرے لوگوں کو شامل ہونے کی شرط نہیں ہوتی۔اور نہ ہی لوگوں پر آیت کے مطابق عمل کرنا کے وجوب دوسرے لوگوں پر واجب ہونے کے ساتھ مشروط ہوتا ہے۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ آپ ان لوگوں میں سب سے افضل ہیں جو آیت سے مراد ہیں؛ تو اس کی بنیاد اس پر ہو سکتی ہے کہ آپ سب لوگوں سے افضل ہیں۔اگر آپ افضل ہونا ثابت ہو جائے تو پھر اس آیت سے استدلال کرنے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔اور اگر ایسا کچھ ثابت نہ ہو؛ تو پھر اس آیت سے استدلال کرنا جائز نہیں رہتا۔پس دونوں لحاظ سے اس آیت سے استدلال کرنا باطل ٹھہرا۔

آپ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما حضرت علی رضی اللہ عنہ کو افضل سمجھتے تھے؛ حالانکہ یہ بات بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما پر جھوٹ ہے؛ اور آپ سے معلوم شدہ باتوں کے خلاف ہے۔پھر اگر مان لیا جائے کہ آپ نے ایسا کچھ کہا تھا تو پھر بھی جب جمہور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس کی مخالفت کر رہے ہیں تو پھر کسی ایک صحابی کا قول حجت نہیں ہو سکتا۔

❀ چھٹی بات: شیعہ کا یہ قول کہ: اللہ تعالیٰ نے قرآن میں صحابہ کو معتوب کیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ہمیشہ مدح فرمائی''صریح کذب ہے۔اس لیے کہ قرآن کریم میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو کہیں بھی معتوب نہیں کیا گیا؛ اور نہ ہی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی کوئی تکلیف پہنچی۔بلکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ میں فرمایا تھا: ارے لوگو! ابوبکر رضی اللہ عنہ کا حق پہچانو، اس نے مجھے کبھی تکلیف نہیں پہنچائی۔''[1]

احادیث میں یہ بھی ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی نصرت فرمایا کرتے تھے۔اور لوگوں کے آپ کے ساتھ تعارض اور اختلاف کرنے سے باز رکھا کرتے تھے۔اور یہ بات کسی نے بھی نقل نہیں کی کہ آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی کوئی تکلیف پہنچائی ہو۔جیسا کہ بعض دوسرے لوگوں کے بارے میں نقل کیا گیا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ خطبہ آپ کے اس خطبہ کے بالکل برعکس ہے جو آپ نے اس وقت دیا جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ابوجہل کی بیٹی کے ساتھ نکاح کرنے کا ارادہ کیا تھا۔[2] ایسا خطبہ آپ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بارے میں کبھی نہیں دیا تھا۔

یہ امر بھی قابل غور ہے کہ جس طرح حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بڑے بڑے عام کاموں میں حصہ لیا

---

[1] مختصر تاریخ دمشق لابن عساکر (٦/ ١٢٩)۔

[2] صحیح بخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ باب ذکر اصهار النبی صلی اللہ علیہ وسلم (حدیث: ٣٧٢٩، ٥٢٣٠)، صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل فاطمة رضی اللہ عنہا (حدیث: ٢٤٤٩)۔

کرتے تھے، جیسے ولایت؛ جنگ اور بخشش کے سلسلہ میں مشاورت وغیرہ دیگر امور۔
حضرت علی رضی اللہ عنہ ایسے کاموں میں مداخلت نہیں کیا کرتے تھے۔ یہ دونوں بزرگ آپ کے وزیر کی حیثیت رکھتے تھے [اور حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کے بچوں کی طرح صغیر السن تھے]۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے بدر کے قیدیوں کے بارے میں مشورہ کیا؛ بنی تمیم کے بارے میں مشورہ کیا کہ ان پر کس کو متولی بنایا جائے؟ اور ان کے علاوہ دیگر امور جن میں مشاورت کی ضرورت ہوتی تھی؛ آپ سے مشورہ کیا کرتے تھے۔

صحیحین میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شہادت پائی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ آئے اور فرمایا:
''مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو آپ کے دونوں ساتھیوں کے ساتھ اٹھائیں گے۔ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اکثر سنا کرتا تھا: '' میں اور ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما داخل ہوئے۔ میں اور ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما نکلے، میں اور ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما گئے۔'' [سبق تخریجه]

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ذاتی امور میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مشورہ لیا کرتے تھے۔ واقعہ افک کے بارے میں جب آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مشورہ لیا۔ حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ سے ان کی رائے پوچھی۔ اور حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا سے بھی آپ نے مشورہ کیا۔ یہ آپ کے ذاتی امور تھے۔ اس لیے کہ جب آپ کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں ایسی خبر پہنچی جس کی وجہ سے آپ شک میں مبتلا ہوگئے کہ کیا آپ کو طلاق دیدیں یا اپنے نکاح میں باقی رکھیں؟ تو کبھی آپ حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا سے سوال کرتے تا کہ اندر کی کوئی خبر مل سکے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی مشورہ لیا کہ کیا انہیں روکے رکھیں یا طلاق دے دیں؟

تو انھوں نے کہا: '' آپ پر کوئی تنگی نہیں۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے سوا عورتیں اور بھی بہت ہیں۔ لونڈی سے پوچھیے وہ آپ کی تصدیق کرے گی۔'' [نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اس ضمن میں حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ سے مشورہ لیا تو انھوں نے کہا: ''سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا آپ کی بیوی ہیں ہمیں ان کے متعلق بھلائی ہی کا علم ہے]۔ [سبق تخریجه]

چنانچہ قرآن کریم میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی براءت نازل ہوئی اور آپ کو حکم دیا گیا کہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو اپنے گھر میں آباد رکھیں جیسا کہ محبوب رسول حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے مشورہ دیا تھا۔ اس واقعہ میں علی رضی اللہ عنہ کے مشورہ کو ٹھکرا کر حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے مشورہ کو صحیح قرار دیا گیا ہے۔ [حالانکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مرتبہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ سے یقیناً بڑا ہے]۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی اس مشورہ میں شریک ہوا کرتے تھے' اور آپ کی ازواج مطہرات سے بات چیت کرتے۔ یہاں تک کہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: '' اے عمر! تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی بیویوں کے مابین ہر چیز میں دخل دینا شروع کر دیا ہے۔''

اور وہ کلی اور عام امور جو تمام مسلمانوں کو شامل ہوا کرتے تھے؛ جب ان کے بارے میں کوئی خاص وحی نہ ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما سے مشورہ لیا کرتے؛ اگرچہ ان کے علاوہ دوسرے لوگ بھی اس مشورہ میں شامل ہوا کرتے تھے۔ مگر شوریٰ میں اصل کردار ان دو حضرات کا ہوا کرتا تھا۔ اور بیشتر اوقات حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی موافقت میں قرآن نازل ہوا کرتا؛ اور کبھی آپ کے خلاف حق واضح ہوتا تو آپ اپنی رائے رجوع کر لیتے۔

جب کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ علم نہیں ہوسکا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کی کسی بات پر انکار کیا ہو۔ اور نہ ہی

آپ پر کسی دوسری چیز کو متقدم رکھا کرتے۔سوائے اس کے بنی تمیم پر متولی مقرر کرنے کے مسئلہ ان دونوں حضرات میں اختلاف ہوا؛حتی کہ دونوں کی آوازیں بلند ہوگئیں۔تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ﴾ [الحجرات ۲]

''اے ایمان والو! اپنی آوازیں نبی کی آواز سے اوپر نہ کرو اور نہ ان سے اونچی آواز سے بات کرو۔''

اس واقعہ میں نبی کریم ﷺ کے لیے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا والے واقعہ سے بڑھ کر اذیت نہیں ہے۔

نیز اللہ تعالیٰ یہ بھی فرماتے ہیں: ﴿وَمَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ﴾ [الأحزاب ۵۳]

''اور تمہارے لیے ہرگز یہ مناسب نہیں کہ تم رسول اللہ ﷺ کو کوئی تکلیف دو۔''

جب کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰی حَتّٰی تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ﴾ [النساء ۴۳]

''اے ایمان والو! جب تم نشے میں مست ہو نماز کے قریب نہ جاؤ جب تک کہ اپنی بات کو سمجھنے نہ لگو۔''

یہ اس وقت ہوا جب نشہ کی حالت میں نماز پڑھی اور اس کی قرأت میں خلط ملط ہوگیا تھا۔

ایک مرتبہ سرور کائنات ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دروازہ پر دستک دے کر دریافت فرمایا:

''کیا تم نماز (تہجد) نہیں پڑھ رہے؟''

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا، ہماری جانیں اللہ کے قبضہ میں ہیں جب چاہتا ہے جگا دیتا ہے، رسول اللہ ﷺ یہ سن کر افسوس کے عالم میں اپنی ران پر ہاتھ مارتے ہوئے چل دیے، زبان مبارک پر بے ساختہ یہ الفاظ جاری تھے:

﴿وَكَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَیْءٍ جَدَلًا﴾

''انسان جھگڑا کرنے میں سب چیزوں سے بڑھا ہوا ہے۔'' [اس کی تخریج گزر چکی ہے]۔

امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی انتیسویں دلیل:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:

''امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی انتیسویں دلیل یہ آیت ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا﴾ [الأحزاب ۵۶]

''بیشک اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے نبی کریم ﷺ پر درود بھیجتے ہیں۔اے ایمان والو! تم (بھی) ان پر درود بھیجو اور خوب سلام (بھی) بھیجتے رہا کرو۔''

صحیح بخاری میں حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم نے عرض کیا، اے اللہ کے رسول! ہم اہل بیت پر صلوٰۃ کیسے بھیجیں؟ بیشک اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ بتا دیا ہے کہ ہم سلام کیسے بھیجیں؟ فرمایا، یوں کہو: ''اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ''[1] ''اے اللہ درود بھیج محمد ﷺ اور محمد کی آل پر۔'' صحیح مسلم میں ہے ہم نے عرض کیا:

---

[1] صحیح بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، (ح:۳۳۷۰)، مسلم ۔ کتاب الصلاۃ، (ح:۴۰۶)۔

یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! ہمیں آپ پر سلام بھیجنا تو معلوم ہوگیا؛ اب ہم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود کیسے بھیجیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کہو:

((اللھم صلِ علی محمد وعلی آل محمد کما صلیت علی آلِ ابراھیم و آل ابراھیم))۔

''اے اللہ درود بھیج محمد ﷺ پر اور آپ ﷺ کی آل پر جیسا کہ تو نے درود بھیجا ابراہیم پر آل ابراہیم پر''

اور بلاشبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سب آل محمد میں افضل ہیں لہٰذا آپ اولیٰ بالامامت ہوں گے۔'' [شیعہ کا بیان ختم ہوا]۔

[جواب]: ہم کہتے ہیں: اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ صحیح اور متفق علیہ ہے۔اور بیشک حضرت علی آل محمد میں سے ہیں جو اس درود میں شامل ہیں: ''اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ .'' مگر یہ آپ کی خصوصیت نہیں۔ بلکہ جمیع بنی ہاشم اس میں داخل ہیں۔ مثلاً حضرت عباس رضی اللہ عنہ اور ان کی اولاد نیز حارث بن عبدالمطلب اور اس کی اولاد؛ اور نبی ﷺ کی بیٹیاں سیدہ رقیہ و ام کلثوم رضی اللہ عنہما جو یکے بعد دیگرے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے نکاح میں آئیں؛ اور آپ کی بیٹی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا؛ علاوہ ازیں آپ کی ازواج مطہرات بھی آل میں شامل ہیں۔ جیسا کہ بخاری و مسلم میں ہے:

''اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اَزْوَاجِهٖ وَ ذُرِّيَّتِهٖ۔'' [بخاری، (ح:۳۳۶۹)، مسلم، (ح: ۴۰۷)]

''اے اللہ رحمتیں نازل فرما محمد ﷺ پر اور آپ کی ازواج پر اور آپ کی اولاد پر۔''

بلکہ قیامت تک آنے والے اہل بیت اس میں شامل ہیں۔ اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بھائی حضرت جعفر بن ابی طالب اور عقیل بن ابی طالب رضی اللہ عنہم بھی شامل ہیں۔

[مذکورہ بالا روایت سے معلوم ہوا کہ الصلوٰۃ علی الآل عام ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ مختص نہیں، بلکہ اس میں عقیل بن ابی طالب اور ابوسفیان بن حارث بھی شامل ہیں]۔ ظاہر ہے کہ مذکورہ حضرات کے صلوٰۃ و سلام میں داخل ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ نہ داخل ہونے والوں کی نسبت افضل ہیں اور نہ یہ کہ وہ امامت کے اہل ہیں۔ امامت کے ساتھ مختص ہونا ایک جداگانہ بات ہے۔

یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ حضرت عمار، مقداد اور ابوذر رضی اللہ عنہم اجمعین کی فضیلت اہل سنت اور شیعہ کے نزدیک ایک طے شدہ بات ہے۔ حالانکہ صلوٰۃ علی الآل میں وہ شامل نہیں ہیں۔ بخلاف ازیں حضرت عقیل و عباس اور ان کی اولاد آل میں داخل ہے، حالانکہ سابق الذکر باتفاق اہل سنت و شیعہ متاخر الذکر کی نسبت افضل ہیں۔ علاوہ ازیں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اور دیگر ازواج بھی اس میں داخل ہیں۔ حالانکہ خواتین امامت و خلافت کی صلاحیت سے محروم ہیں اور باتفاق اہل سنت و شیعہ باقی لوگوں سے افضل بھی نہیں۔

بنابریں یہ ایک ایسی فضیلت ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ میں بھی پائی جاتی ہے اور دوسرے لوگوں میں بھی۔ نیز یہ کہ جو لوگ اس سے متصف ہیں وہ ان لوگوں کے مقابلہ میں افضل نہیں ہیں جو اس صفت سے موصوف نہیں۔

صحیح حدیث میں ثابت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''بہترین زمانہ میرا زمانہ ہے جس میں مجھے مبعوث کیا گیا؛ پھر وہ لوگ ہیں جو ان کے بعد آئیں گے۔'' [البخاری]

تیسرے قرن کے بہترین لوگ تابعین ہیں۔

جملہ کی جملہ پر فضیلت سے افراد کی افراد پر فضیلت لازم نہیں آتی۔ اس میں کوئی شک نہیں تیسرے اور چوتھے قرن میں

بہت سارے ایسے لوگ موجود تھے جو ان بعض حضرات سے افضل تھے جنہوں نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کا زمانہ پایا تھا؛ جیسے اشتر نخعی؛ اور اس کے امثال فتنہ وفساد مچانے والے لوگ؛ اور مختار بن ابو عبید اور اس کے امثال جھوٹے بہتان تراش؛ حجاج بن یوسف اور اس کے امثال ظالم اور اہل شر وفتنہ۔

مزید برآں حضرت علی رضی اللہ عنہ تمام اہل بیت سے افضل نہیں ہیں ۔ بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اہل بیت میں داخل ہیں ؛ اور آپ تمام لوگوں سے افضل ہیں ۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا:

''کیا تم نہیں جانتے کہ ہم اہل بیت ہیں' ہم صدقہ نہیں کھاتے ۔'' [البخاری ٤/ ٧٤؛ مسلم ٢/ ٧٥١]

یہ کلام متکلم اور جو لوگ اس کے ساتھ ہیں سب کو شامل ہے ۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اہل بیت میں سے افضل تھے ۔اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ کوئی دوسرا آپ سے افضل نہ ہو ۔لیکن اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ بنی ہاشم دوسرے لوگوں کی نسبت افضل ہیں ۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان ہی میں سے ہیں ۔ جب بات ان سے باہر ہوجائے تو پھر اس سے لازم نہیں آتا کہ جو اہل بیت میں سے آپ کے بعد افضل ہو وہ باقی تمام لوگوں میں سے بھی افضل ہو ۔

امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تیسویں دلیل:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:''امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تیسویں دلیل یہ آیت ہے:

﴿مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ یَلْتَقِیَانِ☆بَیْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَا یَبْغِیَانِ﴾ (الرحمن: ١٩۔٢٠)

''اس نے دو دریا جاری کردیے جو ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں ۔ان دونوں کے درمیان ایک پردہ ہے (جس سے) وہ آگے نہیں بڑھتے ۔''

ثعلبی اور ابونعیم حضرت ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ ﴿مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ یَلْتَقِیَانِ ﴾سے حضرت علی رضی اللہ عنہ و فاطمہ مراد ہیں ۔﴿ بَیْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَا یَبْغِیَانِ ﴾یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم ﴿یَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ﴾لولو اور مرجان سے حضرت حسن وحسین رضی اللہ عنہما مراد ہیں ۔ یہ فضیلت صحابہ میں سے اور کسی کے حصہ میں نہیں آئی ، لہٰذا حضرت علی رضی اللہ عنہ اولیٰ بالامامت ہوں گے ۔'' [شیعہ کا بیان ختم ہوا]۔

جواب: جواباً گزارش ہے کہ یہ تفسیر قرآن نہیں بلکہ تحریف وہذیان ہے جسے ملاحدہ اور باطنی قرامطہ نے وضع کیا ہے۔ بلکہ یہ قول بہت سے قرامطہ کے قول سے بھی بڑھ کر خطرناک ہے۔تفسیر کا یہ طریقہ ان ملحدین کا طریقہ ہے جو کہ قرآن پر طعنہ زنی کرنا چاہتے ہیں ۔بلکہ قرآن کے بارے میں ایسی باتیں کہنا سب سے بڑی قدح وتشنیع کا موجب ہیں ۔حقیقت میں یہ رافضیوں کا الحاد ہے ۔جیسا کہ وہ کہتے ہیں :

۱۔﴿وَكُلَّ شَیْءٍ اَحْصَیْنٰهُ فِیْٓ اِمَامٍ مُّبِیْنٍ﴾ اس سے مراد حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں ۔

۲۔﴿وَاِنَّهٗ فِیْٓ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَیْنَا لَعَلِیٌّ حَكِیْمٌ﴾ اس سے مراد حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں ۔

۳۔﴿اَلشَّجَرَةُ الْمَلْعُوْنَةُ﴾ اس سے مراد بنو امیہ ہیں۔

اس طرح کی دیگر من گھڑت تفسیریں اور باتیں جو کوئی بھی ایسا انسان نہیں کہہ سکتا جسے اللہ تعالیٰ کے وقار کا کچھ ذرا بھر بھی خیال ہو۔اور نہ ہی اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھنے والا کوئی بھی انسان ایسی بات کہہ سکتا ہے۔

یہ وہ تفسیری اقوال ہیں جو ثعلبی نے اپنی تفسیر میں نقل کیے ہیں۔جنہیں اس نے مجہول راویوں والی اسناد سے نقل کیا ہے؛ جن کا کوئی تعارف ہی نہیں۔[نیز اس کی اسناد میں جھوٹے راویوں کی بھر مار ہے]۔مثال کے طور پر راوی کہتا ہے: مجھے سفیان ثوری نے خبر دی - حالانکہ سفیان ثوری کے بارے میں ایسا کہنا جھوٹ ہے-؛ وہ کہتے ہیں: مجھے ثعلبی نے خبر دی؛ وہ کہتا ہے: مجھے حسن بن محمد دینوری نے خبر دی؛ وہ کہتا ہے: ہم سے موسیٰ بن محمد بن علی بن عبداللہ نے بیان کیا؛ وہ کہتا ہے: میرے والد نے ابو محمد بن حسن بن علویہ القطان پر اس کی کتاب پڑھ کر سنائی اور میں سن رہا تھا؛ وہ کہتا ہے: ہم سے ہمارے بعض ساتھیوں نے بیان کیا؛ وہ کہتے ہیں: ہم سے مصر کے ایک آدمی نے بیان کیا؛ اسے طسم کہا جاتا ہے' وہ کہتا ہے: ہم سے ابو حذیفہ نے بیان کیا؛ وہ کہتے ہیں: ہم سے سفیان ثوری نے بیان کیا کہ:

﴿مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ﴾ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ و فاطمہ مراد ہیں۔﴿بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَا يَبْغِيَانِ﴾ یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم ﴿يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ﴾ لؤلؤ اور مرجان سے حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما مراد ہیں۔

اس سند میں ایک سے بڑھ کر ایک اندھیر ہے۔ایسی اسناد سے بھی کوئی دلیل ثابت ہو سکتی ہے؟[شیعہ مصنف کا یہ بیان از سر تا پا دروغ ہے اور حضرت ابن عباس نے یہ بات یقیناً نہیں کہی۔]

جس چیز سے اس دعویٰ کا جھوٹا ہونا ثابت ہوتا ہے' اس میں کئی امور ہیں:

- پہلی وجہ: سورت الرحمن مفسرین کے اجماع کے مطابق مکی سورت ہے؛ حضرت حسن اور حسین مدینہ میں پیدا ہوئے۔
- دوسری وجہ: ان [والدین حضرت علی اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہما] کے نام بحرین رکھنا؛ اور بچوں کے اولاد لؤلؤ اور مرجان رکھنا اور نکاح کو مرج کہنا لغت عرب ان معانی کی متحمل نہیں ہو سکتی جو بیان کیے گئے ہیں۔نہ ہی حقیقتاً اور نہ ہی مجازاً۔بلکہ جیسے اس شیعہ مصنف نے اللہ تعالیٰ پر اور قرآن پر جھوٹ بولا ہے ایسے ہی اس عرب لغت پر بھی دروغ گوئی سے کام لیا ہے۔
- تیسری وجہ: ان میں کوئی ایسی چیز زائد نہیں ہے جو سارے بنی آدم میں نہ ہو۔اس لیے کہ ہر وہ انسان جو کسی عورت سے شادی کرتا ہے اور پھر اس سے دو بچے پیدا ہو جائیں تو وہ بھی اسی جنس سے شمار ہوں گے۔اس طرح کا ذکر کرنے میں کوئی ایسی چیز نہیں جسے اللہ تعالیٰ کی قدرت و نشانیوں میں عظمت والا سمجھا جائے۔ جو چیز باقی سارے بنی آدم میں بھی پائی جاتی ہے؛ اس کو یہاں پر خاص کرنے کے لیے کوئی سبب نہیں پایا جا رہا۔ اگر میاں بیوی اور دو بچوں کی وجہ ہی فضیلت کا سبب ہے' تو پھر حضرت ابراہیم اور حضرت یعقوب و حضرت اسحق علیہم السلام علی رضی اللہ عنہ سے بہت بہتر اور افضل ہیں۔

صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا گیا: سب سے زیادہ معزز اور بزرگ کون ہے؟

''آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:''جو سب سے زیادہ خدا کا خوف رکھتا ہو۔لوگوں نے کہا:''ہم یہ بات نہیں پوچھتے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:''سب سے زیادہ معزز یوسف نبی اللہ ابن نبی اللہ ابن نبی اللہ ابن خلیل اللہ ہیں۔''[صحیح بخاری:ح:۵۸۸]

- چوتھی وجہ: ﴿مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ﴾ کے الفاظ سورۂ فرقان میں بھی مذکور ہیں۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّ هٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا﴾ (الفرقان: ۵۳)

''یہ ہے میٹھا اور مزیدار اور یہ ہے کھاری کڑوا ان دونوں کے درمیان ایک حجاب ہے۔''

اگر مرج البحرین سے مراد حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی ہیں۔تو پھر اس سے حضرت علی اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہما دونوں میں سے ایک کی مذمت لازم آتی ہے۔ یہ بات اہل سنت واہل تشیع کے اجماع سے باطل ہے۔

❀ پانچویں وجہ: ہم شیعہ سے پوچھتے ہیں کہ ﴿بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيَانِ﴾ سے وہ کیا مراد لیتے ہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ یا سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا؟ علاوہ ازیں ''يَبْغِيَانِ'' کے لفظ سے مستفاد ہوتا ہے کہ برزخ ایک دوسرے پر ظلم کرنے سے مانع ہے ۔اگر اس سے مراد یہی دونوں ہیں تو پھر برزخ سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہوں گے۔ جیسا کہ ان لوگوں کا خیال ہے۔ یا پھر اگر کوئی دوسرا امر مراد لیا جائے تو ظاہر ہے کہ یہ مدح نہیں بلکہ مذمت ہے۔

❀ چھٹی وجہ: ائمہ تفسیر کا اس ذکر کردہ تفسیر کے خلاف پر اجماع ہے۔جیسا کہ ابن جریر وغیرہ نے ذکر کیا ہے۔

امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اکتیسویں دلیل:

[اشکال]: شیعہ مصنف رقم طراز ہے:

''امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اکتیسویں دلیل یہ آیت ہے:

﴿وَ مَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتَابِ﴾ (الرعد: ۴۳) ''اور جس کے پاس کتاب کا علم ہے۔''

ابونعیم سے روایت کیا گیا ہے کہ: ابن الحنفیہ کہتے ہیں کہ اس سے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ مراد ہے۔ثعلبی حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا:''علم الکتاب کس کے پاس ہے؟'' فرمایا علی رضی اللہ عنہ کے پاس۔روایت یہ دلالت کرتی ہے کہ آپ افضل ہیں؛ لہٰذا آپ ہی امام ہوں گے۔''[شیعہ کا بیان ختم ہوا]۔

جواب: اس کا جواب کئی طرح سے دیا جا سکتا ہے:

۱۔ پہلی وجہ: ہم شیعہ سے عبداللہ بن سلام اور محمد بن حنفیہ سے روایت کی صحت نقل کا مطالبہ کرتے ہیں۔

۲۔ دوسری وجہ: نیز یہ کہ علماء کی مخالفت کے باوصف یہ روایت کیوں کر حجت ہو سکتی ہے؟ جب کہ جمہور علماء کرام رضی اللہ عنہ ان دونوں کی [اس تفسیر میں] مخالفت کر رہے ہیں۔

۳۔ تیسری وجہ: ہمارا دعویٰ ہے کہ یہ روایت دروغ اور بے بنیاد بات ہے،اور ان دونوں حضرات پر جھوٹ بولا گیا ہے۔

۴۔ چوتھی وجہ: یہ تفسیر قطعی طور پر باطل ہے۔اس لیے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا بَيْنِيْ وَ بَيْنَكُمْ وَ مَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ﴾ [الرعد ۴۳]

''آپ جواب دیجیے کہ مجھ میں اور تم میں اللہ گواہی دینے والا کافی ہے اور وہ جس کے پاس کتاب کا علم ہے۔''

اگر اس سے حضرت علی رضی اللہ عنہ مراد ہوتے تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کفار کے خلاف اپنے چچا زاد بھائی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے استشہاد کر رہے تھے۔ حالانکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اگر آپ کی رسالت کی شہادت دیتے بھی تو یہ کفار کے حق

میں حجت نہ ہوتی اور نہ وہ اس دلیل کے سامنے گردن جھکانے کے لیے تیار تھے۔ وہ بڑی آسانی سے کہہ سکتے تھے کہ علی جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ آپ ہی نے سکھایا ہے یا وہ آپ ہی زبان سے بول رہے ہیں اور اس طرح آپ خود ہی اپنے حق میں شاہد بن گئے۔ کفار یہ بھی کہتے کہ علی نے آپ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے یہ بات کہی ہے۔ محل شاہد یہ ہے کہ اگر گواہی دینے والا جس چیز کی گواہی دے رہا ہے وہ اس باب میں تہمت سے بری نہ ہو تو اس کی گواہی کے مطابق فیصلہ نہیں کیا جائے گا۔ اور نہ ہی اس سے مشہود علیہ پر کوئی حجت قائم ہوگی۔ تو پھر اس وقت کیا عالم ہوگا جب گواہی دینے والے کے لیے مشہود علیہ کے علاوہ علم کا کوئی ذریعہ ہی نہیں ہے۔ [تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس اس تہمت کا کیا جواب تھا؟]

اس کے برعکس اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دعویٰ کی صداقت پر ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما گواہی دیتے تو یہ زیادہ نفع بخش ہوتی۔ اس لیے کہ یہ لوگ تہمت سے بہت دور تھے۔ اور اس لیے ان کے بارے میں بھی کہا جاسکتا ہے کہ یہ لوگ اس وقت جوانمرد تھے۔ شاید انہوں نے اہل کتاب یا کاہنوں وغیرہ سے کچھ خبریں سن رکھی ہوں، جن کا محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی تعلق نہ ہو۔ بخلاف حضرت علی رضی اللہ عنہ کے؛ اس لیے کہ آپ چھوٹی عمر کے تھے۔ اس لیے فریق مخالف کہہ سکتا تھا کہ آپ بھی وہی کچھ گواہی دے رہے ہیں جو آپ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھا ہے۔

البتہ اگر اہل علم، اہل کتاب اپنے انبیاء علیہم السلام کی متواتر روایات کی بنا پر شہادت دیں تو ان کی شہادت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں نفع بخش ہوگی۔ یہ شہادت اسی طرح ہے جیسے حضرات انبیاء علیہم السلام بذات خود شہادت دیں اس لیے کہ جو بات انبیاء علیہم السلام سے بتواتر منقول ہو وہ ان کی ذاتی شہادت سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم وحی کے ذریعہ حاصل کردہ معلومات کی بنا پر امم سابقہ کے حق میں شہادت دیں گے، جیسا کہ سورت بقرہ [۱۴۳] میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا﴾

''ہم نے اسی طرح تمہیں عادل امت بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو جا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم تم پر گواہ ہو جائیں۔''

اس جاہل شیعہ نے جس چیز کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت گردانا؛ اس کی وجہ سے خود حضرت علی رضی اللہ عنہ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہستی پر بھی قدح وارد ہوئی جن کی وجہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ اہل ایمان میں سے شمار ہونے لگے تھے۔ ایسا کلام کسی زندیق سے ہی صادر ہوسکتا ہے یا پھر کسی انتہائی درجہ کے جاہل انسان سے۔

''اگر تم کچھ نہیں جانتے تو یہ بھی مصیبت ہے۔ اور اگر جانتے ہو تو پھر مصیبت اس سے بھی بڑی ہے۔''

۵۔ پانچویں وجہ: علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ نے کے متعدد مقامات پر اہل کتاب کی شہادت کا ذکر کیا ہے۔ قرآن میں فرمایا:

﴿قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَ كَفَرْتُمْ بِهٖ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى مِثْلِهٖ﴾

آپ کہہ دیجئے! اگر یہ (قرآن) اللہ ہی کی طرف سے ہو اور تم نے اسے نہ مانا ہو اور بنی اسرائیل کا ایک گواہ اس جیسی کی گواہی بھی دے چکا ہو۔'' [الأحقاف ۱۰]

اس رافضی سے پوچھا جائے گا کہ: کیا تم حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بنی اسرائیل میں سے شمار کرتے ہو؟ نیز اللہ کا فرمان ہے:

﴿فَاِنْ كُنْتَ فِيْ شَكٍّ مِّمَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ فَسْئَلِ الَّذِيْنَ يَقْرَءُوْنَ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكَ﴾ (یونس: ۹۴)

''اگر آپ کو قرآن کے بارے میں کوئی شبہ لاحق ہو تو ان لوگوں سے پوچھ لیجیے جو آپ سے پہلے کتاب پڑھتے ہیں۔''

اس سے پوچھا جائے کہ: کیا حضرت علی رضی اللہ عنہ ان لوگوں میں سے ہیں جو پہلے سے کتاب پڑھ رہے تھے؟

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾

''آپ سے پہلے بھی ہم مردوں کو ہی بھیجتے رہے، جن کی جانب وحی اتارا کرتے تھے پس اگر تم نہیں جانتے تو اہل علم سے دریافت کرلو۔''

کیا حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی وہ اہل ذکر ہیں جن سے پوچھنے کا کہا گیا ہے یا آپ ان رجال میں سے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے مبعوث کیا تھا؟

۶۔ چھٹی وجہ: فرض کیجیے شاہد سے مراد حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔تو پھر بھی اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آپ افضل الصحابہ ہیں۔ جیسا کہ اہل کتاب بھی اس کی گواہی دیتے ہیں؛ گواہی دینے والوں میں حضرت عبداللہ بن سلام، سلمان و کعب الاحبار وغیرہ لوگ شامل تھے، حالانکہ یہ باقی صحابہ سابقین اولین ' مہاجرین و انصار جیسے حضرات ابو بکر و عمر و عثمان اور علی و جعفر رضی اللہ عنہم اجمعین وغیرہ سے افضل نہ تھے۔

امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بتیسویں دلیل:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:''امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بتیسویں دلیل یہ آیت ہے:

﴿يَوْمَ لَا يُخْزِي اللّٰهُ النَّبِيَّ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ﴾ (التحریم: ۸)

''جس دن اللہ تعالیٰ نبی کو اور ایمان داروں کو جو ان کے ساتھ ہیں رسوا نہ کرے گا۔''

ابونعیم نے مرفوعاً نقل کیا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: جو شخص سب سے پہلے جنتی لباس پہنے گا وہ حضرت ابراہیم ہیں کیوں کہ آپ خلیل ہیں؛ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس لیے کہ آپ اللہ کے برگزیدہ ہیں؛ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ دونوں کے درمیان جنت کی سیر کریں گے۔'' پھر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ آیت تلاوت کی: ﴿يَوْمَ لَا يُخْزِي اللّٰهُ النَّبِيَّ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ﴾ اور فرمایا: اس سے مراد حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی ہیں۔یہ دلیل ہے کہ آپ دوسروں سے افضل ہیں؛ لہٰذا آپ ہی امام ہوں گے۔'' [شیعہ کا بیان ختم ہوا]

[جواب]: اس کا جواب کئی طرح سے ہے:

- پہلی بات: ہم اس روایت کی صحت نقل کا مطالبہ کرتے ہیں خصوصاً ایسی روایت کے لیے کہ جس کی کوئی اصل ہی نہیں۔
- دوسری بات: یہ روایت باتفاق محدثین و علماء کرام جھوٹ ہے۔
- تیسری بات: یہ دعویٰ قطعی طور پر باطل ہے۔اس لیے کہ اس کا تقاضا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے افضل ہوں۔اس لیے کہ آپ وسط ہیں؛ اور دونوں نبی دونوں جوانب ہیں۔مخلوق میں سے افضل ہستی ابراہیم علیہ السلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جو کوئی ان پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فضیلت دے وہ یہود و نصاریٰ سے بڑا کافر ہے۔

❀ چوتھی بات: صحیحین میں ثابت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''قیامت والے دن سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام لباس پہنیں گے۔'' [صحیح بخاری:٤/ ١٣٩، مسلم ٤/ ٢١٩٤]

اس روایت میں کہیں پر بھی محمد ﷺ یا حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ذکر تک بھی نہیں ۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو لباس پہننے میں تقدیم حاصل ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ مطلق طور پر حضرت محمد ﷺ سے افضل ہیں۔ جیسا کہ دوسری حدیث میں ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''قیامت کے دن سب لوگ بیہوش ہو جائیں گے۔ اور میں سب سے پہلے ہوش میں آؤں گا تو میں موسیٰ علیہ السلام کو دیکھوں گا کہ وہ عرش کا پایہ پکڑے ہوئے ہیں۔ تو مجھے معلوم نہیں کہ وہ مجھ سے پہلے ہوش میں آ جائیں گے یا آپ ان لوگوں میں سے تھے جنہیں اللہ تعالیٰ نے اس سے مستثنیٰ رکھا تھا۔'' [صحیح بخاری:ح ٦٣٣]

پس پہلے ہوش میں آنے کی وجہ سے یا پھر مطلق طور پر بیہوش نہ ہونے کی وجہ سے یہ لازم نہیں آتا کہ موسیٰ علیہ السلام محمد ﷺ سے افضل ہیں۔

❀ پانچویں بات: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿یَوْمَ لَا یُخْزِی اللّٰهُ النَّبِیَّ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ نُوْرُهُمْ یَسْعٰی بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَبِاَیْمَانِهِمْ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا اِنَّكَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ﴾ [التحریم ٨]

''جس دن اللہ تعالیٰ نبی کو اور ایمان داروں کو جو ان کے ساتھ ہیں رسوا نہ کرے گا ان کا نور ان کے سامنے اور ان کے دائیں دوڑ رہا ہوگا۔ یہ دعائیں کرتے ہوں گے اے ہمارے رب ہمیں کامل نور عطا فرما اور ہمیں بخش دے یقیناً تو ہر چیز پر قادر ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿یَوْمَ تَرَی الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ یَسْعٰی نُوْرُهُمْ بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَبِاَیْمَانِهِمْ بُشْرٰكُمُ الْیَوْمَ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ﴾ [الحدید ١٢]

''جس دن تو دیکھے گا کہ ایماندار مردوں اور عورتوں کا نور ان کے آگے آگے اور ان کے دائیں دوڑ رہا ہوگا آج تمہیں ان جنتوں کی خوشخبری ہے جن کے نیچے نہریں جاری ہیں جن میں ہمیشہ کی رہائش ہے۔ یہ ہے بڑی کامیابی۔''

یہ نص ان تمام مؤمنین کے بارے میں عام ہے جو نبی کریم ﷺ کے ساتھ ہوں گے۔ سیاق کلام اس کے عموم پر دلالت کرتا ہے۔ اور اس بارے میں مروی آثار بھی اس کے عموم پر دلالت کرتے ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

''ہر مؤمن کو قیامت کے دن نور دیا جائے گا۔ منافق کا نور بروزِ قیامت بجھا دیا جائے گا۔ جب مؤمنین منافقین کا نور بجھتے ہوئے دیکھیں گے تو انہیں اپنے بارے میں ڈر محسوس ہوگا تو وہ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں گے: ''یا اللہ! ہمارے لیے ہمارا نور پورا کر دے۔''

اس روایت میں عموم قطعی اور یقینی ہے۔اس لیے کہ اس سے کوئی ایک شخص مراد نہیں ہے۔تو پھر یہ کہنا کیسے جائز ہوسکتا ہے کہ اس سے مراد صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں ۔اگر کوئی کہنے والا یوں کہے کہ:

''ہر وہ بات جسے شیعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے قرار دیتے ہیں' اس سے مراد ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین ہیں ؛ تو پھر ان دونوں گروہوں کے درمیان محض دعوی اور جھوٹ کے علاوہ کون سا فرق ہوگا ؟

بلکہ ایسا ممکن ہے کہ جو لوگ اسے حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے لیے خاص کرتے ہیں' ان کا شبہ رافضیوں کے شبہ سے بڑھ کر ہو جو اس کے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ خاص ہونے کا دعوی کرتے ہیں ۔تو اس وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی اس آیت میں ایسے ہی داخل ہوں گے جیسے پہلے تین اصحاب ۔ بلکہ وہ تینوں اس آیت کے مصداق ہونے کے زیادہ حق دار ہیں۔تو پھر اس آیت سے نہ ہی افضلیت ثابت ہوئی اور نہ ہی امامت ۔

امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تینتیسویں دلیل:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:

''امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تینتیسویں دلیل یہ آیت قرآنی ہے:

﴿ إِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا وَ عَمِلُوا الصَّالِحَاتِ اُوْلٰئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ﴾ (البینہ:۷)

''بیشک جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیے یہ لوگ بہترین خلائق ہیں ۔''

ابو نعیم حضرت ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مخاطب کر کے فرمایا:''اس آیت میں تم اور تمہارے شیعہ کا ذکر کیا گیا ہے، جو بروز قیامت شاداں و فرحاں آئیں گے اور تمہارے دشمن غصہ سے بھرے ہوئے ہوں گے، جب حضرت علی رضی اللہ عنہ خیر البریۃ (مخلوقات میں سے بہتر) ہوئے تو امام بھی وہی ہوں گے ۔'' [شیعہ کا بیان ختم ہوا]۔

[جواب]:

❀ پہلی بات : ہم شیعہ سے اس کی صحت کے اثبات کا مطالبہ کرتے اور پورے جزم و وثوق سے کہتے ہیں کہ یہ روایت موضوع ہے۔لیکن مدعی سے سند کی صحت پیش کرنے کے مطالبہ کا انکار صرف معاند اور سرکش ہی کرسکتا ہے۔مسلمانوں کے تمام گروہوں کا اتفاق ہے کہ ابو نعیم کے روایت کر لینے سے کوئی روایت حجت و اور قابل استدلال نہیں ہو جاتی [جب تک کہ اس کی صحت ثابت نہ ہو جائے]۔

❀ دوسری بات: یہ روایت ایسا جھوٹ ہے جو کہ کسی بھی اہل علم اور محدث پر مخفی نہیں۔اہل علم کا اس روایت کے جھوٹا ہونے پر اتفاق ہے۔

❀ تیسری بات: علاوہ ازیں یہ ان لوگوں کے قول سے متصادم ہے جو کہتے ہیں:﴿إِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصَّالِحَاتِ ﴾ ''بیشک جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے'' سے خارجی و ناصبی لوگ مراد ہیں۔وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ حضرت

علی رضی اللہ عنہ سے دوستی لگانے والا کافر ہے وہ اس کی دلیل میں یہ آیت پیش کرتے ہیں:

﴿وَ مَنْ لَّمْ يَحْكُم بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكَافِرُوْنَ﴾ (المائدۃ: ۴۴)

''جو اللہ کے نازل کردہ حکم کے مطابق فیصلہ نہ کرے وہ کافر ہے۔''

وہ کہتے ہیں جو شخص اللہ کے دین میں اشخاص و رجال کو حکم بناتا ہے وہ اللہ کے نازل کردہ حکم کے بغیر فیصلہ کرتا ہے، لہٰذا وہ کافر ہوگا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَ مَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ﴾ (المائدۃ: ۵۱)

''تم میں سے جو کفار کے ساتھ دوستی لگائے گا وہ انہی میں سے ہوگا۔''

ان کا قول ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور ان کے ہم نوا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی درج ذیل حدیث کے مطابق مرتد ہو چکے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''بہت سے آدمیوں کو میرے حوض سے دور کر دیا جائے گا، جس طرح اجنبی اونٹ کو دور کر دیا جاتا ہے، میں کہوں گا بار خدایا! یہ میرے صحابی ہیں یہ میرے صحابی ہیں اس کے جواب میں کہا جائے گا، آپ نہیں جانتے کہ انھوں نے آپ کے بعد کون سی باتیں ایجاد کر لی تھیں۔ اور جب سے آپ ان سے جدا ہوئے یہ مرتد ہی چلے آئے ہیں۔''[1]

خوارج و نواصب کہتے ہیں: یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے مسلمانوں کے خون اور اموال میں اللہ کے حکم سے ہٹ کر فیصلے کیے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''میرے بعد کافر نہ ہو جاؤ کہ ایک دوسرے کو قتل کرنے لگو۔''[2]

ان کا کہنا ہے:

جن لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپس میں ایک دوسرے کو قتل کیا وہ پھر پلٹ کر کافر ہو چکے تھے۔

اگرچہ خوارج کے یہ دلائل باطل ہیں، لیکن اس میں بھی کوئی شک و شبہ نہیں کہ روافض کے براہین و دلائل ان سے بڑھ کر لغو بے بنیاد ہیں۔ خوارج روافض کی نسبت بڑے عقلمند؛ سچے؛ اور حق کے پیروکار ہوتے ہیں۔ وہ سچائی کا بہت اہتمام کرتے ہیں' جھوٹ نہیں بولتے۔ ظاہر و باطن میں دین دار ہوتے ہیں۔ لیکن گمراہ اور جاہل ہیں' دین سے نکل چکے ہیں۔ اسلام سے ایسے نکل گئے ہیں جیسے تیر کمان سے نکل جاتا ہے۔ جب کہ روافض کی یہ حالت ہے کہ ان پر جہالت؛ گمراہی اور جھوٹ کا غلبہ ہے۔ ان کے بہت سارے ائمہ اور عوام الناس زندیق اور ملحد ہیں۔ انہیں علم اور دین سے کوئی غرض نہیں؛ بلکہ ان کی حالت تو بالکل اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے عین مطابق ہے:

﴿اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى﴾ [النجم ۲۳]

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب فی الحوض (حدیث: ٦٥٧٦-٦٥٨٦)، صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب اثبات حوض نبینا ﷺ (حدیث: ٢٢٩٠-٢٢٩٧)۔

[2] صحیح بخاری۔ کتاب العلم، باب الانصات للعلماء (حدیث: ١٢١، ٧٠٨٠)، صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان معنی قول النبی ﷺ "لا ترجعوا بعدی کفارا" (حدیث: ٦٥)۔

''یہ لوگ صرف اٹکل کے اور اپنی نفسانی خواہشوں کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں اور یقیناً ان کے رب کی طرف سے ان کے پاس ہدایت آ چکی ہے۔''

مروانیہ جنہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جنگ کی تھی؛ اگر چہ وہ آپ کو کافر تو نہیں کہتے؛ لیکن ان کے دلائل رافضیوں کے دلائل کی نسبت بہت زیادہ مضبوط ہیں۔ مشہور ادیب جاحظ نے مروانیہ کے لیے ایک کتاب تحریر کی تھی اس میں ایسے دلائل پیش کیے ہیں جن کو رافضہ کبھی بھی توڑ نہیں سکتے، رافضیوں کی بات تو چھوڑیے زیدیہ بھی ان دلائل پر رد نہیں کر سکتے۔ البتہ اہل سنت والجماعت [اللہ انہیں تا قیامت سلامت رکھے] چونکہ معتدل اور متوسط لوگ ہیں [وہ ان دلائل کا تارو پود بکھیر سکتے ہیں]؛ یہی وجہ ہے کہ شیعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حق میں [مروانیہ اور خوارج کے خلاف] حق بات کے لیے ان سے مدد لیتے ہیں۔ لیکن اہل سنت والجماعت ایسے دلائل پیش کرتے ہیں جن سے چاروں خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم اجمعین اور دیگر صحابہ کرام کی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ اہل سنت والجماعت یا کسی بھی دوسرے کے پاس کوئی ایسی دلیل نہیں ہے جو کہ مدح میں صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہی خاص ہو اور؛ یا صرف دوسروں پر قدح وارد کرتی ہو؛ یہ بات بالکل محال اور ممتنع ہے۔ انتہائی محال قسم کا جھوٹ بولنے کے بغیر ایسا کرنا ممکن نہیں۔ میدان مناظرہ و مجادلہ میں مقبول حق کے ساتھ ایسا ممکن نہیں۔

چوتھی بات: ان سے کہا جائے گا کہ: اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان: ﴿ إِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ﴾ [البینۃ ۷]

''بیشک جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے۔''

یہ عام خطاب ہے؛ جو کہ اس انسان کو شامل ہے جو ان صفات سے موصوف ہو۔ تو پھر اس کو شیعہ کے ساتھ خاص کرنے کی کیا دلیل ہے؟

اگر شیعہ کہیں کہ: [اس لیے کہ] ان کے سوا جتنے بھی لوگ ہیں' وہ کافر ہیں۔

تو ان سے کہا جائے گا کہ: اگر دوسرے لوگوں کا کفر کسی دلیل سے ثابت ہوتا تو تمہیں اتنے لمبے پاپڑ بیلنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ اور اگر ایسا ثابت نہیں ہو سکتا تو پھر تمہیں تمہاری دلیل کسی کام نہ آئی۔ اس لیے کہ نقل کے اعتبار سے یہ ثابت نہیں ہے۔ اور اگر کسی دوسری علیحدہ و جداگانہ دلیل سے ایسا ثابت بھی ہو جائے تو وہ اس آیت سے ثابت تصور نہیں ہوگا۔ پھر اسی پر اعتماد کیا جائے گا۔

پانچویں بات: یہ بات تواتر کے ساتھ معلوم ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما شیعان علی رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر دوسرے لوگوں سے محبت اور دوستی رکھتے تھے۔ حتی کہ آپ خوارج کے ساتھ بیٹھتے اور انہیں فتوی دیا کرتے تھے؛ اور ان سے مناظرہ بھی کیا کرتے تھے۔ اگر آپ کا اعتقاد یہ ہوتا کہ بیشک جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے؛ یہ صرف شیعہ ہی ہیں؛ اور ان کے علاوہ جتنے بھی لوگ ہیں؛ سب کافر ہیں۔ تو پھر آپ کبھی بھی ایسا نہ کرتے۔ اور ایسے ہی بنو امیہ کے ساتھ آپ کا برتاؤ اور سلوک ایک کھلی ہوئی دلیل ہے کہ آپ انہیں کافر نہیں سمجھتے تھے۔

اگر شیعہ کہیں کہ: ہم شیعہ کے علاوہ باقی لوگوں کو کافر تو نہیں کہتے؛ لیکن ہم کہتے ہیں: شیعہ خیر البریہ ہیں۔

[جواب]: یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ بیشک جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے وہی خیر البریہ ہیں۔ اگر تم یہ

کہتے ہو کہ شیعہ کے علاوہ کوئی دوسرا اس آیت کے حکم میں داخل نہیں؛ پھر دو ہی صورتیں ہوسکتی ہیں: یا تو تم کہو کہ وہ کافر ہیں ۔ یا پھر کہو کہ وہ فاسق ہیں ۔اس لیے کہ ان کا شمار ان لوگوں میں نہیں ہوتا ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے؛ اگرچہ ان کا نام اہل ایمان میں داخل ہے۔وگرنہ جو کوئی اہل ایمان میں سے ہو،اور وہ فاسق بھی نہ ہو تو وہ ان لوگوں میں شامل ہے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے۔''

اگر تم کہو کہ: وہ فاسق ہیں۔ تو جواب میں کہا جائے گا کہ: اگر ان کا فسق ثابت ہوجائے تو پھر تمہارے لیے حجت کافی ہوگئی۔اور اگر ان کا فسق ثابت نہیں ؛ تو پھر تمہیں اس استدلال سے کوئی فائدہ نہیں۔تم تمام گروہوں میں سے جس کے بارے میں بھی فاسق ہونے کا کہو گے تو وہ ثابت کریں گے کہ آپ کئی ایک وجوہ کے اعتبار سے فسق میں ان سے کئی درجے آگے ہو۔ پھر تمہارے پاس اپنے دفاع میں کوئی ایک بھی صحیح دلیل موجود نہ ہوگی۔

فسق تمہارے بہت زیادہ جھوٹ بولنے؛ فحاشی کا ارتکاب کرنے اور ظلم وستم کرنے کی وجہ سے تم پر غالب ہے۔تمہارے مخالفین خوارج اور دوسرے لوگوں کی نسبت تم میں بہت زیادہ فسق پایا جاتا ہے۔بنوامیہ میں شیعہ کی نسبت جھوٹ؛ فحاشی اور ظلم بہت ہی کم پایا جاتا ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض شیعہ میں زھد ؛ صداقت اور دینداری پائی جاتی ہے؛ یہی حال سارے فرقوں کا ہے۔اور اگر اور کچھ بھی نہ ہوتا تو خوارج کی یہی خوبی کافی تھی کہ نبی کریم ﷺ نے ان کے بارے میں خبر دی تھی:

'' تم میں سے کوئی ایک ان کی نماز کے مقابلہ میں اپنی نماز کو اور ان کے روزہ کے مقابلہ میں اپنے روزہ کو حقیر سمجھے گا۔''

[یہ حدیث پہلے گزر چکی ہے]۔[تو پھر روافض کو خوارج سے کیا نسبت؟]

چھٹی بات: اللہ تعالیٰ نے اس [تمہاری مذکورہ بالا استدلال والی آیت] سے پہلے فرمایا ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِينَ فِي نَارِ جَهَنَّمَ خٰلِدِينَ فِيهَا أُولٰٓئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ﴾

''بیشک جو لوگ اہل کتاب میں سے کافر ہوئے اور مشرکین سب دوزخ کی آگ میں جائیں گے جہاں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے یہ لوگ بدترین خلائق ہیں۔''

پھر اس کے بعد فرمایا: ﴿إِنَّ الَّذِينَ اٰمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ أُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ﴾

''بیشک جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیے یہ لوگ بہترین خلائق ہیں۔''

اس سے ظاہر ہوا کہ یہ لوگ مشرکین اور کفار اہل کتاب سے ہٹ کر کوئی دوسرے لوگ ہیں۔قرآن میں بہت سارے مقامات پر ایمان لانے والوں اور نیک اعمال کرنے والوں کا ذکر کیا گیا ہے۔یہ تمام مقامات عام ہیں۔تو پھر اس طرح کی باقی آیات کو چھوڑ صرف خاص طور پر اس آیت سے استدلال کرنے کی کیا وجہ ہے؟

روافض یا ان کے علاوہ دوسرے اہل ہوی اور کافر لوگوں کا اور ان کے علاوہ بہت سارے گمراہ فرقوں جیسے خوارج اور معتزلہ کا بھی یہی دعویٰ ہے کہ وہ ایمان لائے ہیں اور نیک عمل کررہے ہیں۔جیسا کہ یہود ونصاریٰ کا دعویٰ ہے:

﴿وَقَالُوا لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ كَانَ هُودًا أَوْ نَصٰرٰى تِلْكَ أَمَانِيُّهُمْ قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِينَ ۞ بَلٰى مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرُهُ عِنْدَ رَبِّهِ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا

هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾ [البقرة ۱۱۱-۱۱۲]

''یہ کہتے ہیں کہ جنت میں یہود ونصاری کے سوا اور کوئی نہ جائے گا، یہ صرف ان کی آرزوئیں ہیں، ان سے کہو کہ اگر تم سچے ہو تو کوئی دلیل تو پیش کرو۔ سنو جو بھی اپنے آپ کو خلوص کے ساتھ اللہ کے سامنے جھکا دے۔ بیشک اسے اس کا رب پورا بدلہ دے گا، اس پر نہ تو کوئی خوف ہوگا، نہ غم اور اداسی۔''

پس یہ حکم عام ہے؛ جو کوئی بھی اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق اس کی رضا کے لیے عمل کرے گا [وہ اس آیت کے حکم میں داخل ہوگا] عمل صالح وہی ہوتا ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہو۔ اور اسلام اپنے ارادہ وقصد میں اخلاص اور اپنے آپ کو اللہ کے لیے کر لینے کا نام ہے۔

امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی چونتیسویں دلیل:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:

''امام علی کی چونتیسویں دلیل یہ آیت قرآنی ہے:

﴿وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهْرًا﴾ (الفرقان:۵۴)

''وہ جس نے پانی سے انسان کو پیدا کیا، پھر اسے نسب والا اور سسرالی رشتوں والا کر دیا۔''

ثعلبی ابن سیرین سے نقل کرتے ہیں کہ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدہ فاطمہ کا نکاح حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کر دیا: ''وہ جس نے پانی سے انسان کو پیدا کیا، پھر اسے نسب والا اور سسرالی رشتوں والا کر دیا۔'' چونکہ یہ فضیلت کسی اور کے حصہ میں نہیں آئی۔ لہٰذا حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی امام وخلیفہ ہوں گے۔'' [شیعہ کا بیان ختم ہوا]۔

[جواب]:

- پہلی بات: ہم شیعہ سے اس کی صحیح سند پیش کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔
- دوسری بات: ہم بغیر کسی شک وشبہ کے کہتے ہیں یہ ابن سیرین پر جھوٹ باندھا گیا ہے۔
- تیسری بات: صرف ابن سیرین کا قول حجت نہیں ہو سکتا؛ اس لیے کہ دوسرے علماء نے اس کی مخالفت کی ہے۔
- چوتھی بات: یہ آیت سورت فرقان کی ہے۔ سورۂ فرقان مکی ہے۔ یہ آیات باتفاق علماء مکہ میں سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی شادی سے عرصہ دراز قبل نازل ہو چکی تھی۔ تو پھر اس سے حضرت علی اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہما کیسے مراد ہو سکتے ہیں؟
- پانچویں بات: آیت کے الفاظ ہر سسرالی اور نسبی رشتہ میں عام ہیں، اس میں کسی ایک فرد کی کوئی تخصیص نہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ آیت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سسرالی تعلق کو بھی شامل ہے جس طرح کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو دوبارا اور حضرت ابو العاص رضی اللہ عنہ کی شادی کو بھی بالاولیٰ شامل ہے۔

علاوہ ازیں یہ آیت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ وعمر رضی اللہ عنہ کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رشتہ مصاہرت پر بھی مشتمل ہے۔ نیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دو بیٹیاں ام کلثوم اور رقیہ رضی اللہ عنہما یکے بعد دیگرے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے نکاح میں آئی تھیں۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے کر دی ان پر دوسری شادی کرنے سے منع فرما دیا تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو یہاں تک

فرما دیا تھا: ''اگر میرے پاس تیسری بیٹی ہوتی تو میں وہ بھی عثمان کو دیدیتا۔''[رواہ أحمد في الفضائل ۱/ ۴۸۱]۔

جب آپ کا رشتہ مصاہرت چاروں خلفاء کے ساتھ ثابت ہوگیا تو پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خصوصیت منتفی ہوگئی۔تو پھر کجا کہ اس سے افضلیت یا امامت کا وجوب ثابت ہوتا ہو۔

❀ چھٹی وجہ: فرض کیجیے !اس سے مراد حضرت علی رضی اللہ عنہ کا سسرالی تعلق ہے ۔تو صرف سسرالی رشتہ ہونے کی بنا پر نہ ہی افضلیت ثابت ہوتی ہے اور نہ ہی امامت ۔اس پر شیعہ اور اہل سنت کا اتفاق ہے۔اس لیے کہ سسرالی تعلق تو ان چاروں کے لیے ثابت ہے؛ اور یہ کہ ان میں سے بعض دوسروں سے افضل ہیں ۔اگر سسرالیت کے فضیلت ثابت ہوتی تو تناقض لازم آتا۔

امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی پینتیسویں دلیل:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:

''امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی پینتیسویں دلیل یہ آیت ہے:

﴿ اِتَّقُوا اللّٰهَ وَ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ﴾ (التوبة:۱۱۹)

''اے ایمان والو!اللہ تعالی سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ رہو۔''

اس آیت میں ان لوگوں کی معیت و رفاقت کو واجب قرار دیا گیا ہے جن کا صادق ہونا واضح ہو۔ظاہر ہے کہ ایک معصوم ہی صحیح معنی میں صادق ہوسکتا ہے؛ اس لیے کے دوسروں سے جھوٹ کا صادر ہونا جائز ہے۔اور معصوم خلفائے اربعہ میں سے صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی تھے ۔ابونعیم نے ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے کہ یہ آیت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی۔''[شیعہ کا بیان ختم ہوا]۔

[جواب]:

❀ پہلی بات: صدّیق؛ صادق سے صیغہ مبالغہ ہے۔پس ہر صادق صدّیق نہیں ہوسکتا۔حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کثیر دلائل کی بنا پر صدیق تھے، لہٰذا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اس آیت کے اوّلیں مصداق ہیں۔ بنا بریں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی معیت و رفاقت ہمارے لیے ضروری ہوئی ؛ اس لیے کہ باقی صحابہ کرام نے آپ کے حق میں تنازل کرلیا تھا؛ اور اس کے ساتھ ہی آپ کی خلافت کا بھی اقرار کرتے تھے۔اب یہ ممتنع ہے کہ ہم حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو چھوڑ کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امامت کا اقرار کریں۔یہ آیت ان کے مطلوب کے نقیض پر دلالت کرتی ہے۔

❀ دوسری بات: ان سے کہا جائے گا کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ یا تو صدیق تھے ؛ یا نہیں تھے۔اگر آپ صدیق نہیں تھے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ صدیق ہیں۔تو پھر صادق اور صدیق کے ساتھ ہونا اس سے زیادہ اولی ہے جو صرف صادق ہو صدیق نہ ہو۔ اور اگر آپ صدیق تھے تو پھر حضرت عمر و عثمان رضی اللہ عنہما بھی صدیق تھے۔پس جب خلفائے اربعہ کو صدیق قرار دیا جائے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کوئی خصوصیت باقی نہیں رہے گی۔اور نہ ہی صداقت آپ کے ساتھ خاص رہی۔تو پھر تین کو چھوڑ کر ایک کا ساتھ دینا متعین نہیں ہوتا۔بلکہ اگر ٹکراؤ کی صورت پیش آئے تو پھر تین کا ساتھ دینا ایک کی نسبت زیادہ اولی

ہے۔اس لیے کہ ان کی تعداد زیادہ ہے؛اور پھر خصوصاً وہ صدق میں بھی زیادہ کامل ہیں۔

❀ تیسری بات: حقیقت میں یہ آیت کریمہ اس وقت نازل ہوئی جب حضرت کعب بن مالک غزوۂ تبوک میں شرکت نہ کر سکے؛ اور آپ نے نبی کریم ﷺ کے سامنے سچ کہہ دیا کہ ان کا کوئی عذر نہیں تھا۔اور راست بیانی کی وجہ سے ان کی توبہ قبولیت سے مشرف ہوئی تھی۔ کچھ لوگوں نے آپ کو مشورہ دیا تھا کہ آپ کوئی جھوٹا عذر پیش کر دیں۔جیسا کہ منافقین نے جھوٹ بول کر اپنا عذر پیش کیا تھا۔ یہ واقعہ صحاح ستہ؛ سنن اور مسانید و تفسیر اور سیرت کی کتابوں میں مذکور ہے۔ [1]

یہ معلوم ہو گیا کہ اس قصہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کوئی خصوصیت نہیں۔ بلکہ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ میرے استقبال کے لیے کھڑے ہو کر دوڑے ۔ اور مجھ سے معانقہ کیا۔ اللہ کی قسم ! مہاجرین میں سے کوئی دوسرا میرے استقبال کے لیے کھڑا نہیں ہوا۔'' حضرت رضی اللہ عنہ کعب کبھی بھی اس واقعہ کو نہیں بھولتے تھے۔ جب یہ ثابت ہو گیا تو اب اس آیت کو صرف اکیلے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر محمول کرنا باطل ہوا۔

❀ چوتھی بات: یہ آیت اس قصہ کے متعلق نازل ہوئی۔لیکن کسی ایک نے بھی یہ نہیں کہا کہ آپ معصوم ہیں ۔ نہ ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ اور نہ ہی کوئی دوسرا۔معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی مراد سچے لوگ ہیں' اس کے لیے معصوم ہونے کی شرط نہیں لگائی۔

❀ پانچویں بات: علاوہ ازیں آیت کے الفاظ ہیں:﴿وَ كُوْنُوا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ﴾ نہ کہ ''كُوْنُوا مَعَ الصَّادِقِ''جمع کا صیغہ ہے؛ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ مراد ہوتے تو واحد کا صیغہ چاہیے تھا۔

❀ چھٹی بات: آیت﴿وَ كُوْنُوا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ راست باز لوگوں کی طرح راست گفتاری کے عادی بنو۔ جھوٹوں کی رفاقت اختیار نہ کرو۔فرمان الٰہی ہے:﴿وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ﴾ (البقرة:۴۳)''تم رکوع کرو رکوع کرنے والوں کیساتھ۔''اور ایسے ہی اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَ الصِّدِّيْقِيْنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَ الصّٰلِحِيْنَ وَ حَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا﴾ [النساء ۶۹]

''اور جو بھی اللہ تعالیٰ کی اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمانبرداری کرے، وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوگا جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام کیا، جیسے نبی اور صدیق اور شہید اور نیک لوگ، یہ بہترین رفیق ہیں۔''

اور ایسے ہی ارشاد فرمایا ہے:

﴿فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ سَوْفَ يُؤْتِ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا﴾ [النساء ۱۴۶]

''تو یہ لوگ مومنوں کے ساتھ ہیں اور عنقریب اللہ تعالیٰ مومنوں کو بہت بڑا اجر دے گا۔''

اس سے مراد یا تو یہ ہو سکتی ہے کہ ہر چیز میں صادقین (سچے لوگوں) کا ساتھ دو؛ اگر چہ اس کا تعلق صداقت سے نہ بھی ہو۔مگر یہ دوسرا معنی باطل ہے۔اس لیے کہ کسی انسان پر واجب نہیں ہے کہ وہ مباح چیزوں میں کسی کا ساتھ دے۔جیسے کھانا

[1] صحيح بخاري- كتاب المغازي- باب حديث كعب بن مالك (حديث:٤٤١٨)، صحيح مسلم، كتاب التوبة- باب حديث توبة كعب بن مالك......" (حديث:٢٧٦٩)-

پینا؛لباس وغیرہ کے معاملات ۔ جب پہلی بات ہی صحیح ہے تو اس میں کسی متعین شخص کا کوئی حکم نہیں ہے۔ بلکہ مقصود یہ ہے کہ سچ بولو اور جھوٹ سے بچ کر رہو۔ صحیحین میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''تم پر سچ بولنا واجب ہے۔ سچ نیکی کا راستہ دکھاتا ہے اور نیکی جنت کی طرف لے کر جاتی ہے۔ اور انسان سچ بولتا رہتا ہے اور سچائی کی تلاش میں رہتا ہے یہاں تک کہ وہ سچا لکھ دیا جاتا ہے۔ اپنے آپ کو جھوٹ سے بچاؤ؛ بیشک جھوٹ برائی کا راستہ دکھاتا ہے اور برائی دوزخ کی طرف لے جاتی ہے۔ اور انسان جھوٹ بولتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ جھوٹا لکھ دیا جاتا ہے۔'' [اس کی تخریج گزر چکی ہے۔]

ایسی آیات میں معیت سے یہ مراد نہیں لیا گیا کہ ہر بات میں ان کا انداز اختیار کرو یہاں تک کہ مباحات و ملبوسات میں بھی ان کی رفاقت کے دائرہ سے باہر نہ نکلو۔ جیسے کہا جاتا ہے:﴿كُنْ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ ''ایمان والوں کے ساتھ ہو جاؤ۔'' ﴿كُنْ مَعَ الْاَبْرَارِ﴾ ''نیکوکاروں کے ساتھ ہو جاؤ۔'' یعنی اس وصف میں ان کے شریک و سہیم بن جاؤ۔ اس سے مراد یہ نہیں کہ آپ پر ہر چیز میں ان کی اتباع واجب ہوگئی ہے۔

❀ ساتویں بات: اس سے کہا جائیگا: جب اس سے مراد یہ ہے کہ مطلق طور پر سچوں کیساتھ ہو جاؤ؛ اس کی وجہ یہ ہے کہ سچائی تمام نیکیوں کی طرف راہ دکھاتی ہے ۔ جیسا کہ حدیث میں ہے :''تم پر سچ بولنا واجب ہے۔ سچ نیکی کا راستہ دکھاتا ہے۔'' پس اس صورت میں یہ وصف ہر اس انسان کے لیے ثابت ہوگا جو ان صفات سے موصوف ہو۔

❀ آٹھویں بات: ان سے کہا جائے گا کہ: اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم صادقین کا ساتھ دیں۔ اللہ نے یہ نہیں فرمایا کہ جن کا سچا ہونا تمہیں معلوم ہو۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے :

﴿وَّاَشْهِدُوْا ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ وَاَقِيْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ﴾ [الطلاق ۲]

''اور آپس میں سے دو عادل شخصوں کو گواہ کرلو؛ اور اللہ کی رضامندی کے لئے ٹھیک ٹھیک گواہی دو۔''

اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ جن کو تم جانتے ہو کہ وہ تم میں سے عدل والے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤى اَهْلِهَا﴾ [النساء ۵۸]

''اللہ تعالیٰ تمہیں تاکیدی حکم دیتا ہے کہ امانت والوں کی امانتیں انہیں پہنچاؤ۔''

یہ نہیں فرمایا کہ تم جنہیں جانتے ہوں کہ وہ امانت کے اہل ہیں ۔ نیز ارشاد فرمایا:

﴿وَ اِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ﴾ [النساء ۵۸]

''جب لوگوں کا فیصلہ کرو تو عدل اور انصاف سے فیصلہ کرو۔''

اللہ نے یہ نہیں فرمایا کہ جس کو تم عدل سمجھتے ہو۔ لیکن اس حکم کو وصف کے ساتھ معلق کیا ہے۔

ہم پر واجب ہوتا ہے کہ حسب امکان صدق و عدالت اور اہل امانت اور عدل کی معرفت میں اجتہاد کریں۔ ہمیں اس بارے میں علم الغیب کا مکلف نہیں ٹھہرایا گیا۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ کو بھی انصاف کرنے کا حکم دیا گیا تھا؛ آپ نے فرمایا:

''تم اپنا جھگڑا میرے پاس لاتے ہو اور ہو سکتا ہے کہ تم میں سے کوئی اپنی دلیل کو دوسرے سے عمدہ طریقے سے بیان

کرنے والا ہو اور میں اس کیلئے فیصلہ کر دوں۔اس بات پر جو میں نے اس سے سنی پھر میں جس کے لیے اس کے بھائی کا حق دلا دوں تو اسے نہ لے کیونکہ میں اس کے لیے جہنم کا ایک ٹکڑا کاٹ کر دے رہا ہوں۔''

[صحیح مسلم:ج: دوم:ح۱۹۸۱]

❀ نویں بات: تصور کیجیے: اس سے مراد وہ لوگ ہوں؛ جن کے سچا ہونے کا علم ہو۔لیکن یہ علم بھی اس علم کی طرح ہوگا جیسے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿فَإِنْ عَلِمْتُمُوْهُنَّ مُؤْمِنَاتٍ﴾ [الممتحنة ۱۰] ''اگر تم انہیں مؤمنات جان لو۔''
ایمان سچائی سے زیادہ مخفی ہوتا ہے۔جب یہاں پر علم کی شرط رکھی گئی ہے؛ تو پھر جیسے یہاں پر یہ بات کہنا ممتنع ہے کہ معصوم کے علاوہ کسی کو یہ علم حاصل نہیں ہوسکتا؛ ایسے ہی یہ بات کہنا بھی جائز نہیں کہ امام معصوم کے علاوہ کسی کا سچا ہونا معلوم نہیں ہوسکتا۔

❀ دسویں بات: تصور کیجیے: اس سے مراد: صدق کا علم ہمیں حاصل ہوگیا؛ لیکن یہ کہا جائے گا کہ: بیشک ابو بکر و عمر اور عثمان اور ان کے علاوہ دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین جن کی صداقت معلوم ہے: اور جو عمداً جان بوجھ کر جھوٹ نہیں بولتے؛ اگر ان سے خطاء یا بعض گناہوں کا سرزد ہونا جائز ہوسکتا ہے؛ جب کہ جھوٹ تو بلا ریب بہت بری چیز ہے؛ اس لیے کہ علماء کرام رحمہم اللہ کے ایک قول کے مطابق صرف ایک جھوٹ بولنے کی وجہ سے گواہی رد کی جاسکتی ہے: اور امام احمد سے بھی دو روایتوں میں سے ایک یہی ہے۔اس بارے میں ایک مرسل حدیث بھی روایت کی گئی ہے۔تو ہم یقینی طور پر اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ ان میں سے کوئی ایک بھی جان بوجھ کر کسی حال میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ نہیں بولتا تھا۔اور ہم یہ بات تسلیم نہیں کرتے کہ ہم جھوٹ کا منفی ہونا صرف اس کے بارے میں جان سکتے ہیں جس کے بارے میں ہمیں یقینی طور پر علم ہو کہ معصوم مطلق ہے۔ بلکہ بہت سارے لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کو اگر آپ پرکھیں گے تو پتہ چلے گا کہ وہ جھوٹ نہیں بولتے۔اگر چہ اس سے غلطیاں بھی ہوتی ہوں: اور بعض دوسرے گناہ بھی سرزد ہوتے ہوں۔
اور ہم یہ بات بھی تسلیم نہیں کرتے کہ جو کوئی معصوم نہیں وہ جان بوجھ کر جھوٹ بولتا ہے۔یہ بات خلاف واقع ہے۔اس لیے کہ عمداً جھوٹ صرف وہی انسان بول سکتا ہے جو لوگوں میں سب سے زیادہ برا ہو۔ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین میں کوئی ایک بھی ایسا نہیں تھا جو جان بوجھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ بولتا ہو۔
اہل علم حضرات جیسے: مالک؛ شعبہ؛ یحییٰ بن سعید؛ ثوری؛ شافعی؛ اور احمد بن حنبل رحمہم اللہ جیسے لوگ یقینی طور پر جان بوجھ کر کبھی بھی جھوٹ نہیں بولتے تھے؛ نہ ہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اور نہ ہی کسی دوسرے پر۔تو پھر ابن عمر؛ ابن عباس اور ابو سعید رضی اللہ عنہم اجمعین جیسے لوگوں کے متعلق ہم کیا کہہ سکتے ہیں؟

❀ گیارھویں بات: اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ اس سے مراد معصوم ہی ہے؛ تو پھر بھی ہم حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علاوہ دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے عصمت کی نفی پر اجماع کو تسلیم نہیں کرتے۔جیسا کہ اس سے پہلے بیان کیا جاچکا ہے۔بیشک بہت سارے وہ لوگ جو کہ رافضہ سے درجہا بہتر ہیں؛ وہ اپنے شیوخ کے متعلق بھی اسی قسم کے دعوے کرتے ہیں؛ اگر چہ انہوں نے اس عبارت میں تھوڑی سی تبدیلی کردی ہے۔ہم ان کی عصمت کو بھی باقی لوگوں سے عصمت کی نفی کے ساتھ

تسلیم نہیں کرتے ۔ اگر عصمت ہوگی تو سب کے لیے اور اگر اس کی نفی کی جائے گی تو سب سے نفی کی جائے گی۔

امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی چھتیسویں دلیل:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:

''امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی چھتیسویں دلیل یہ آیت قرآنی ہے:

﴿وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ﴾ (البقرۃ:۴۳) ''تم رکوع کرو رکوع کرنے والوں کے ساتھ۔''

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں یہ آیت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی، کیوں کہ ان دونوں نے سب سے پہلے نماز پڑھی اور رکوع کیا تھا۔'' یہ آپ کی فضیلت کی دلیل ہے؛ اور آپ کی امامت پر بھی دلالت کرتی ہے۔'' [شیعہ کا بیان ختم ہوا]۔

[جواب]: اس کا جواب کئی امور پر مشتمل ہے:

- پہلی بات: ہم اس کی صحت کو تسلیم نہیں کرتے۔ اور نہ ہی اس نے اس روایت کی صحت پر کوئی دلیل ذکر کی ہے۔
- دوسری بات: اہل علم محدثین کا اس روایت کے جھوٹ ہونے پر اتفاق ہے۔
- تیسری بات: مزید براں یہ آیت سورت بقرہ میں ہے جو مدنی ہے؛ اس پر مسلمانوں کا اتفاق ہے۔ اس آیت کے سیاق و سباق میں بنی اسرائیل سے متعلق خطاب ہے، خواہ یہ خطاب براہ راست صرف بنی اسرائیل سے ہو یا بنی اسرائیل اور مسلمانوں دونوں سے ہو۔ یہ آیت ہجرت کے بعد نازل ہوئی۔ نزول آیت کے وقت تک رکوع کرنے والے بے شمار لوگ ہوگئے تھے۔ یہ شروع اسلام میں نازل ہونے والی سورت نہیں جو ہم کہہ سکیں کہ یہ ان لوگوں کے ساتھ خاص ہے جنہوں نے پہلے رکوع کیا اور پہلے نماز پڑھی۔
- چوتھی بات: ﴿مَعَ الرّٰكِعِيْنَ﴾ جمع کا صیغہ ہے۔ اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علی رضی اللہ عنہ دونوں مراد ہوتے تو یہ لفظ ﴿مَعَ الرّٰكِعَيْنِ﴾ تثنیہ کے وزن پر ہوتے۔ تمام اہل علم کا اتفاق ہے کہ جمع کے صیغہ سے صرف تثنیہ مراد نہیں لیا جاسکتا ۔ بلکہ اس سے مراد تین یا اس سے زیادہ یا پھر دو سے زیادہ مراد ہونگے۔ جمع بول کر تثنیہ مراد لینا اجماع کے خلاف ہے۔
- پانچویں بات: اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم رضی اللہ عنہا کو حکم دیا تھا: ﴿اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ وَ اسْجُدِيْ وَ ارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ﴾ ''اے مریم تم اپنے رب کی اطاعت کرو اور سجدہ کرو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کر۔''

حضرت مریم رضی اللہ عنہا اسلام سے پہلے گزر چکی ہیں۔ اس سے پتہ چلا کہ اسلام سے پہلے بھی رکوع کرنے والے تھے؛ جب کہ ان میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کہیں بھی نہیں تھے۔ تو پھر اسلام کے شروع میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علاوہ رکوع کرنے والے کیوں نہیں ہوسکتے۔ جب کہ تثنیہ کا صیغہ ایک ہی ہے۔

- چھٹی بات: یہ آیت مطلق ہے؛ کسی متعین شخص کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ بلکہ مؤمن مرد کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ نماز پڑھنے والوں کے ساتھ نماز پڑھ لے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد باجماعت نماز ادا کرنا ہے۔ اس لیے کہ رکوع کے حاصل کیے بغیر رکعت نہیں پائی جاسکتی۔

❀ ساتویں بات: نیز یہ کہ اگر نبی ﷺ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ رکوع کرنا مراد ہوتا تو یہ حکم دونوں کی وفات کے ساتھ ختم ہوتا۔ پھر کسی کو یہ حکم نہ دیا جاتا کہ وہ رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرے۔

❀ آٹھویں بات: شیعہ کا یہ کہنا کہ: سب سے پہلے نبی کریم ﷺ کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نماز پڑھی۔ یہ بالکل غلط بات ہے۔ بلکہ اکثر علماء اس کے خلاف کہتے ہیں۔ علماء کرام کا قول ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ مل کر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پہلے نماز ادا کی تھی۔

❀ نویں بات: اگرچہ یہ آپ ﷺ کے ساتھ رکوع کرنے کا حکم ہے؛ لیکن اس میں کوئی دلیل نہیں ہے کہ جس نے آپ کے ساتھ مل کر رکوع کیا وہ امام بن جائے گا۔ اس لیے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ امام نہیں بن گئے تھے' بلکہ آپ کے پیچھے نماز پڑھا کرتے تھے۔

امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی سینتیسویں دلیل:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ''حضرت علی رضی اللہ عنہ کے منصب امامت پر فائز ہونے کی سینتیسویں دلیل یہ آیت ہے:

﴿ وَاجْعَلْ لِّیْ وَزِیْرًا مِّنْ اَهْلِیْ ﴾ (طٰہ: ۲۹) ''اور میرے گھر والوں میں سے میرا وزیر بنا دے۔''

ابونعیم حضرت ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے مکہ میں میرا اور علی کا ہاتھ پکڑا اور چار رکعت نماز ادا کی۔ پھر آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر یہ دعا مانگی: ''اے اللہ! حضرت موسیٰ بن عمران علیہ السلام نے بھی تجھ سے دعا کی تھی اور میں تیرا نبی محمد بھی تجھ سے دعا کرتا ہوں: ''اے میرے رب! میرے لیے میرا سینہ کھول دے۔ اور میری زبان کی گرہ کھول دے تاکہ وہ میری بات سمجھ لیں۔ اور میرے لیے میرے گھر والوں میں سے ایک وزیر بنا دے۔ میرے کنبہ میں سے علی رضی اللہ عنہ کو میرا وزیر مقرر کر دے اس کے ساتھ میری کمر کو مضبوط کر دے اور اسے میرے کام میں شریک کر دے۔''
ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں میں نے ایک پکارنے والے کو سنا وہ پکارتا تھا: ''اے احمد! آپ کی دعا قبول ہوئی۔'' یہ روایت اپنے باب میں نص صریح ہے۔'' [شیعہ کا بیان ختم ہوا]۔

[جواب]: پہلی بات: ہم اس حدیث کی صحیح سند پیش کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ جیسا کہ پہلے بھی گزر چکا۔

❀ دوسری بات: ہم کہتے ہیں: محدثین کے نزدیک بالاتفاق اس حدیث کا موضوع ہونا ایک کھلی ہوئی بات ہے۔ بلکہ وہ جانتے ہیں کہ یہ رسول اللہ ﷺ پر بدترین جھوٹ ہے۔

❀ تیسری بات: پھر یہ امر بھی قابل غور ہے کہ جب نبی کریم ﷺ مکہ مکرمہ میں تھے؛ تو پہلے کا ایک عرصہ تو وہ پیدا ہی نہیں ہوئے تھے۔ ابن عباس کی پیدائش اس وقت ہوئی جب بنو ہاشم شعب ابی طالب میں محصور تھے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما ہجرت سے قبل مکہ میں ایک شیرخوار بچہ سے زیادہ نہ تھے۔ ابھی آپ اس قابل نہیں تھے کہ وضوء کرتے اور پھر رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھتے۔ [پھر وہ اس واقعہ میں کیوں کر شریک ہو سکتے ہیں؟]۔

نبی کریم ﷺ کا انتقال ہوا تو ابن عباس ابھی بلوغت کی عمر کو نہیں پہنچے تھے۔ ہجرت کے وقت آپ کی زیادہ سے زیادہ عمر پانچ سال سے بھی کم تھی۔ ایسے بچے کو نہ ہی وضوء کرنے کا حکم دیا جاتا ہے اور نہ ہی نماز پڑھنے کا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''اپنے بچوں کو سات سال کی عمر میں نماز پڑھنے کا حکم دو۔اور دس سال کی عمر میں نماز نہ پڑھنے کی وجہ سے سزا دو۔ اور ان کے بستر علیحدہ علیحدہ کردو۔''[سنن أبي داؤد ١/ ١٩٣]۔

جو بچہ اس عمر کا ہو؛ وہ نماز کی سمجھ نہیں رکھتا؛ اور نہ ہی تلقین کے بغیر اس طرح کی دعا حفظ کرسکتا ہے۔صرف ایک بار سن لینے کی وجہ سے ایسی چیزیں حفظ نہیں ہوجاتی۔

❀ چوتھی بات: انہوں نے اس سے پہلے اس آیت: ﴿اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ﴾ [المائدة ٥٥]

''(مسلمانوں) تمہارا دوست خود اللہ ہے اور اسکا رسول ہے۔'' کی تفسیر میں نماز میں انگوٹھی صدقہ کرنے کا واقعہ پیش کیا تھا؛ اس روایت میں بھی یہی تھا کہ نبی کریم ﷺ نے یہ دعا فرمائی۔اور یہاں پر کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے یہ دعا مکہ میں اس واقعہ سے کئی سال پہلے کی تھی۔اس لیے کہ پہلی دعا سورت مائدہ کی تفسیر میں ہے۔ جو کہ مدینہ میں نازل ہونے والی آخری سورت ہے۔جب کہ پچھلا واقعہ مکہ مکرمہ کا ہے۔جب آپ نے یہ دعا مکہ میں کی تھی اور اسے شرف قبولیت بھی مل گیا تھا تو پھر اتنے سالوں بعد دوبارہ مدینہ طیبہ میں یہی دعا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔❀

❀ پانچویں بات: قبل ازیں ہم اس دعوی کے بطلان پر دلائل دے چکے ہیں۔ بلا شبہ یہ کلام کئی اعتبار سے رسول اللہ ﷺ پر بہت بڑا جھوٹ باندھا گیا ہے۔لیکن یہاں پر انہوں نے کچھ چیزیں ایسی زیادہ کی ہیں جو پچھلے گزری ہوئی دعا میں نہیں تھیں۔یہاں پر انہوں نے دعا میں یہ الفاظ زیادہ کیے ہیں: ''اسے میرے کام میں شریک کردے۔'' یہ صراحت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی رسول اللہ ﷺ کیساتھ اس کام میں شریک تھے۔جیسے ہارون حضرت موسیٰ کیساتھ شریک تھے، یہ ان لوگوں کا قول ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو نبی مانتے ہیں۔یہ صریح کفر ہے؛ یہ امامیہ کا قول نہیں؛ بلکہ غالیہ کا قول ہے۔ کسی معاملہ میں شریک وہ نہیں ہوتا جو کہ بعد میں خلیفہ بنے۔اس لیے کہ شیعہ آپ کے لیے نبی کریم ﷺ کے بعد امامت کے دعویدار ہیں۔جب کہ اس کا مطلب آپ کے ساتھ زندگی میں آپ کے امور میں شراکت ہے۔امامیہ اگرچہ نبوت میں آپ کے ساتھ کسی کی شراکت کا کہنے والوں کو کافر کہتے ہیں؛ لیکن اس کے باوجود اہل سنت والجماعت کی مخالفت؛ اولیاء اللہ سے بغض و عداوت اور ان کے بارے میں کافر اور مرتد ہونے کا عقیدہ رکھنے کی وجہ سے؛ انہی لوگوں کا ساتھ دیتے ہیں جو کفر و گمراہی کا عقیدہ رکھتے ہیں۔اور انہوں نے اصل دین کو پس پشت ڈال دیا ہے۔یہ ان ہی گمراہوں اور کفار کے مقال و رجال میں اضافہ کرتے ہیں۔گویا وہ اس مثل کے مصداق ہیں: '' رَمَتْنِــیْ بِدَائِهَــا وَانْسَلَّتْ۔'' ''وہ اپنی بیماری مجھ پر پھینک کر کھسک گئی۔''

❀ اس رافضی کذاب نے یہ دعوی کیا ہے کہ: ''یہ روایت اس باب میں نص کا درجہ رکھتی ہے۔''

❀ تو اس رافضی شیطان سے پوچھا جائے گا: اے احمق انسان! کیا یہ نص اس بات پر ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ کے امور میں آپ کی زندگانی میں شریک تھے؛ جیسے ہارون علیہ السلام موسی علیہ السلام کے ساتھ شریک تھے؛ کیا تم اس نص کے بموجب یہی عقیدہ رکھتے ہو؟ یا پھر تم بھی جھوٹی روایات اور باطل حکایات کا سہارا لیکر کوئی نئی چیز گڑھ رہے ہو؟

❀[اہل منطق کی اصطلاح میں اسے تحصیل حاصل کہتے ہیں؛ جو کہ عام انسان کے حق میں بھی ممنوع ہے تو پھر رسول اللہ ﷺ حق میں اسے کیسے تصور کیا جاسکتا ہے۔[دراوی کشمیری]

امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اڑتیسویں دلیل:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:

''امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اڑتیسویں دلیل یہ آیت کریمہ ہے:

﴿اِخْوَانًا عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقَابِلِیْنَ﴾ (الحجر:۴۷)

''وہ بھائی بھائی بنے ہوئے ایک دوسرے کے آمنے سامنے تختوں پر بیٹھے ہوں گے۔''

مسند احمد میں حضرت زید بن ابی اوفیٰ سے مروی ہے کہ میں مسجد نبوی میں پہنچ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔اس میں انھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مواخات کا واقعہ بیان کیا۔حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''میری روح چلی گئی؛ اور میری کمر ٹوٹ گئی؛ جب آپ نے اپنے اصحاب کے ساتھ یہ سلوک کیا۔ بیشک یہ مجھ پر اللہ کی ناراضگی کے سبب سے ہے۔اور آپ کے لیے آخرت میں عزت و کرامت ہے۔تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:'' مجھے اس ذات کی قسم جس نے مجھے حق کے ساتھ نبی بنا کر مبعوث کیا! میں نے تجھے (حضرت علی رضی اللہ عنہ کو) اپنے لیے منتخب کیا ہے آپ کو مجھ سے وہی تعلق ہے جو ہارون کو موسیٰ سے تھا' البتہ میرے بعد کوئی نبی مبعوث نہیں کیا جائے گا۔''

آپ میرے بھائی اور وارث ہیں آپ جنت کے محل میں میرے ہم راہ ہوں گے۔اور وہاں میری بیٹی فاطمہ بھی ہوگی۔ تم میرے بھائی اور میرے دوست ہو، پھر آپ نے یہ آیت پڑھی:﴿اِخْوَانًا عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقَابِلِیْنَ﴾ آپ کی وجہ سے محبت کرنے والے ایک دوسرے کی طرف دیکھیں گے۔مؤاخات مناسبت اور مجانست کو چاہتی ہے۔اس روایت سے معلوم ہوا کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کو آپ نے مواخات (بھائی چارہ) کے لیے مختص کیا تھا۔لہٰذا آپ ہی امام ہوں گے۔'' [شیعہ کا بیان ختم ہوا]۔

[جواب]:

❀ پہلی بات: ہم اس روایت کی صحیح سند پیش کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔

ہم کہتے ہیں کہ مسند احمد میں ذکر نہیں کی گئی۔اور نہ ہی امام احمد نے اسے روایت کیا ہے۔ن ہی مسند میں اور نہ ہی الفضائل میں۔اور نہ ہی آپ کے بیٹے نے یہ روایت نقل کی ہے۔رافضی مصنف کا یہ کہنا کہ یہ روایت مسند احمد میں ہے' امام احمد بن حنبل پر ایک کھلا ہوا جھوٹ اور بہتان ہے۔

بلکہ یہ القطیعی کے اضافات سے ہے جس میں باتفاق اہل علم جھوٹ اور موضوعات کی بھرمار ہے۔القطیعی نے اپنی سند سے زید بن ابی اوفیٰ سے روایت کیا ہے۔

نیز اس رافضی نے اس روایت کے پورے الفاظ بھی ذکر نہیں کیے۔اس میں یہ الفاظ بھی ہیں جو رافضی نے قصداً حذف کردیے ہیں۔جب آپ نے فرمایا:''آپ میرے بھائی اور وارث ہیں'' تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کیا میں آپ سے ورثہ پاؤں گا؟ آپ نے فرمایا:''وہی ورثہ جو انبیاء سابقین دوسروں کو دیا کرتے تھے۔آپ سے پوچھا گیا: پہلے کے انبیاء دوسروں کو کیا ورثہ دیتے تھے؟ تو آپ نے فرمایا:''کتاب اللہ اور سنت رسول۔''

یہ اسناد ظلم و جہالت پر مشتمل ہے۔اس کے روایت کرنے میں عبدالمؤمن بن عباد راوی ہے جو کہ مجروحین میں سے ایک ہے۔ابو حاتم نے اسے یزید بن معن سے روایت کرنے میں ضعیف قرار دیا ہے۔اسے پتہ بھی نہیں تھا کہ یزید بن معن کون ہے۔شائد کہ جس نے عبداللہ بن شرحبیل کی زبان پر اسے روات کو ایجاد کر لیا ہو وہ کوئی مجہول ہو۔جو کہ قریش میں سے ایک آدمی سے روایت کرتا ہے؛ اور وہ زید بن ابی اوفی سے روایت کرتا ہے۔

❀ دوسری بات: یہ روایت باتفاق محدثین واہل علم کذب ہے۔

❀ تیسری بات: مہاجرین ومہاجرین اور انصار وانصار کے مابین مؤاخات کی تمام روایات جھوٹ ہیں۔نبی کریم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ مؤاخات قائم نہیں کی تھی؛ اور نہ ہی ابوبکر رضی اللہ عنہ کو عمر رضی اللہ عنہ کا بھائی بنایا تھا۔یہ مواخات آپ ﷺ نے مہاجرین کے درمیان قائم نہیں کی تھی، بلکہ مہاجر وانصار کے درمیان تھی۔جیسا کہ آپ نے عبدالرحمن بن عوف اور سعد بن ربیع کے مابین بھائی چارہ قائم کیا تھا۔اور حضرت سلیمان الفارسی اور حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہم اجمعین کے مابین بھائی چارہ قائم کیا تھا۔ایسے ہی حضرت علی اور حضرت سہل بن حنیف رضی اللہ عنہما کے مابین بھائی چارہ قائم کیا تھا۔

مؤاخات کا واقعہ بنی نجار کے محلے میں پیش آیا تھا۔جیسا کہ صحیح حدیث میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے۔مسجد نبوی میں ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا جیسے بعض جاہل لوگ موضوع روایت میں بیان کرتے ہیں۔بلکہ یہ واقعہ بنی نجار کے محلے میں ان میں سے ایک آدمی کے گھر پر پیش آیا تھا۔یہی وہ مؤاخات ہے جس کے بارے میں حضرت انس رضی اللہ عنہ خبر دے رہے ہیں۔

عاصم بن سلیمان الاحول کہتے ہیں: میں نے انس سے کہا: میں آپ کو ایک بات بتانا چاہتا ہوں' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ''اسلام میں کوئی حلف [اتحاد] نہیں ہے۔''تو حضرت انس نے فرمایا:''رسول اللہ ﷺ نے ہمارے گھر میں قریش اور انصار کے درمیان اتحاد (یعنی بھائی چارہ) قائم کیا تھا۔'' [رواہ البخاری ۳/ ۹٦ومسلم ٤/ ۱۹٦۰]

❀ چوتھی بات: اس روایت کے یہ الفاظ آپ میرے بھائی اور میرے وارث ہیں۔درست نہیں۔اہل سنت اور شیعہ کے قول کے مطابق یہ الفاظ باطل ہیں۔کیونکہ اگر اس سے مالی وراثت مراد لی جائے تو ان کا یہ قول باطل ٹھہرے گا کہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا آپ کی وارث ہوئی تھیں۔ظاہر ہے کہ جب نبی کریم ﷺ کے چچا عباس رضی اللہ عنہ موجود تھے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ چچا زاد بھائی ہونے کی صورت میں کیوں کر وارث ہو سکتے تھے؟ پھر یہ کہ جب نبی کریم ﷺ کے چچا زاد اور بھی موجود تھے تو ان میں سے صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کس طرح وارث قرار پا سکتے تھے؟ جب کہ یہ سارے ایک ہی درجہ میں ہیں۔

اور اگر علمی وراثت یا امامت وخلافت مراد ہے تو شیعہ کا احتجاج آیت کریمہ: ﴿وَ وَرِثَ سُلَیۡمٰنُ دَاوٗدَ﴾ (النمل ۱٦)

''اور سلیمان علیہ السلام داود علیہ السلام کے وارث بنے۔'' اور آیت: ﴿یَّرِثُنِیۡ وَ یَرِثُ مِنۡ اٰلِ یَعۡقُوۡبَ﴾ (مریم:٦)

''جو میرا وارث اور آل یعقوب کا وارث بنے۔'' سے باطل ٹھہرا۔

جب لفظ وراثت میں دونوں چیزوں کا احتمال موجود ہے؛ تو ممکن ہے کہ ان انبیاء کرام علیہم السلام سے بھی ایسے ہی وراثت ملی ہو جیسے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو نبی کریم ﷺ سے وراثت ملی۔

اہل سنت والجماعت یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے جو علمی ورثہ عطا کیا تھا اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کوئی تخصیص نہیں بلکہ نبی کریم ﷺ کا یہ فیض سب صحابہ رضی اللہ عنہم کے لیے عام تھا۔حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ

نے نبی کریم ﷺ سے سن کر ستر سورتیں یاد کی تھیں۔ ❶ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ علم مال کی طرح کسی فرد بشر کے ساتھ مختص نہیں ہوتا بلکہ ایک کے حصہ میں جو ورثہ آتا ہے، دوسرا بھی اس سے فیض یاب ہوسکتا ہے۔ دونوں میں تزاحم و تصادم کا کوئی امکان نہیں۔ مال کا معاملہ اس سے یک سر مختلف ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ مال کی ایک ہی چیز دو آدمی برابر لے لیں۔

❀ پانچویں بات: نبی کریم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علاوہ دوسرے لوگوں کو بھی بھائی کہا ہے۔ بخاری و مسلم میں نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ نے اپنے آزاد کردہ غلام زید سے کہا: ''آپ میرے بھائی اور مولیٰ ہیں۔'' ❷

جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ان کی بیٹی کا رشتہ طلب کیا تھا تو اسے مخاطب کر کے کہا: ''میں آپ کا بھائی ضرور ہوں مگر تمہاری بیٹی میرے لیے حلال ہے۔ ❸

روایات صحیحہ میں آیا ہے کہ آپ نے حضرت ابوبکر کے بارے میں فرمایا: ''اسلامی برادری سب سے بہتر ہے۔'' ❹

احادیث صحیحہ میں مذکور ہے کہ آپ نے فرمایا: ''میری خواہش ہے کہ میں اپنے بھائیوں کو دیکھ لیتا۔''

صحابہ نے عرض کیا: کیا ہم آپ کے بھائی نہیں؟'' فرمایا: نہیں، تم میرے صحابہ ہو، میرے بھائی وہ ہیں جو میرے بعد پیدا ہوں گے۔ وہ بلا دیکھے مجھ پر ایمان لائیں گے۔ ❺

مراد یہ ہے کہ تمہارے ساتھ ایک بھائی چارے سے بھی بڑھ کر مخصوص چیز ہے یعنی صحبت۔ اور ان کے لیے صحبت کے بغیر بھائی چارہ ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتے ہیں: ﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ﴾ (الحجرات: ۱۰)

''بیشک سب مومن بھائی بھائی ہیں۔''

نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((لا تقاطعوا ؛ولا تدابروا ، ولا تباغضوا ، ولا تحاسدوا ، وكونوا عباد الله إخواناً))۔متفق علیہ۔

'' آپس میں قطع رحمی نہ کرو۔ اور نہ ہی آپس میں حسد کرو، اور نہ ہی بغض رکھو، اور نہ ہی ایک دوسرے کے خلاف سازشیں کرو، اللہ کے بندو! آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ۔'' ❻

نیز نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''ایک مسلم دوسرے مسلم کا بھائی ہوتا ہے۔'' ❼

---

❶ صحیح بخاری ، کتاب فضائل القرآن ، باب القراء من اصحاب رسول الله ﷺ (ح ۵۰۰۰)، صحیح مسلم ، کتاب فضائل الصحابة ، باب من فضائل عبد الله بن مسعود و امه رضی اللہ عنہما (حدیث:۲۴۶۲)

❷ صحیح بخاری ، کتاب الصلح ، باب کیف یکتب هذا ما صالح فلان......" (حدیث: ۲۶۹۹)، مطولاً۔

❸ صحیح بخاری ، کتاب النکاح ، باب تزویج الصغار من الکبار (حدیث:۵۰۸۱)، یہ مکالمہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ اور رسول اللہ ﷺ کے مابین ہے۔ واللہ اعلم۔

❹ صحیح بخاری ، کتاب الصلاة ، باب الخوخة والممر فی المسجد (حدیث: ۴۶۷ ، ۳۶۵۷)۔

❺ صحیح مسلم ، کتاب الطهارة ، باب استحباب اطالة الغرة (حدیث:۲۴۹)۔

❻ صحیح بخاری ، کتاب الادب ، باب ما ینهی عن التحاسد والتدابر (حدیث:۶۰۶۴)، صحیح مسلم ، کتاب البر والصلة باب تحریم الظن (حدیث:۲۵۶۳)

❼ صحیح بخاری باب لا یظلم المسلم المسلم....."(ح:۲۴۴۲)، صحیح مسلم ، باب تحریم الظلم (ح:۲۵۸۰)۔

نیز نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((والذي نفسي بيده ! لا يؤمن أحدكم حتى يحب لأخيه من الخير ما يحب لنفسه))۔

''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک کامل مومن نہیں ہوسکتا جب تک وہ اپنے بھائی کے لئے بھی وہی خیر نہ پسند کرے جسے وہ اپنے نفس کے لئے پسند کرتا ہے۔'' [بخاری ۱۳]

مطلق مواخات کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ بھائی چارہ قائم کرنے والوں میں کامل تماثل وتشابہ پایا جاتا ہے۔ بنابریں اگر یہ بات تسلیم کر لی جائے کہ نبی کریم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنا بھائی بنایا تھا تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آپ سب سے افضل ہوں گے اور امام بھی۔''

جب یہ بات صحیح ثابت ہوگئی؛ تو پھر یہ کیوں کہا گیا کہ: اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مؤاخات والی حدیث اگر صحیح ثابت ہو جائے تو اس کا مقتضی امامت اور افضلیت ہوتا ہے؟ حالانکہ مؤاخات مشترکہ ہوتی ہے۔ نبی کریم ﷺ سے کئی سندوں کے ساتھ یہ ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا:

''اگر میں زمین والوں میں سے کسی کو گہرا دوست بنانا چاہتا تو ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بناتا؛ مگر تمہارا یہ ساتھی اللہ کا گہرا دوست ہے۔ مسجد نبوی کی طرف کھلنے والی سب کھڑکیاں بند کردی جائیں مگر ابوبکر رضی اللہ عنہ کی کھڑکی کھلی رہے۔ صحبت ورفاقت اور انفاق مال کے اعتبار سے ابوبکر رضی اللہ عنہ میرے سب سے بڑے محسن ہیں۔''[1]

حدیث صحیح میں منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ سے دریافت کیا گیا تھا:

''اے اللہ کے رسول! لوگوں میں سے کون آپ کو عزیز تر ہے؟ فرمایا:''عائشہ رضی اللہ عنہا۔''

پھر پوچھا گیا: مردوں میں سے کون عزیز تر ہے؟ آپ نے فرمایا: اس کا باپ یعنی حضرت''ابوبکر رضی اللہ عنہ۔''

صحیحین میں ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ کو مخاطب کرکے فرمایا تھا:

''بلکہ آپ ہمارے سردار ہیں اور ہم میں سب سے بہتر ہیں، نبی ﷺ بھی سب سے زیادہ آپ کو چاہتے تھے۔''

یہ وہ احادیث ہیں جن کی صحت اور قبولیت پر اہل علم کا اتفاق ہے۔ اہل علم میں سے کسی ایک نے بھی ان احادیث پر تنقید نہیں کی۔ اس سے واضح ہوا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے سب سے چہیتے اور تمام لوگوں میں سے اونچی شان کے مالک تھے۔ لیکن اس کے باوجود اگر مؤاخات کا درجہ اس سے کم ہے؛ تو بھی ان کا آپس میں کوئی تعارض نہیں۔ اور اگر اس کا مرتبہ اس سے اعلی ہے؛ تو یہ صحیح احادیث اس قسم کی مؤاخات کو جھٹلا رہی ہیں۔ ہمیں اس تعارض کے بغیر بھی اس مؤاخات کی روایت کے جھوٹا ہونے کا علم تھا۔

یہاں پر یہ بتانا مقصود ہے کہ صحیح احادیث سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے نزدیک حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر محبوب تھے۔ اور باقی لوگوں کی نسبت آپ کا مقام ومرتبہ بھی زیادہ تھا؛ اس کے شواہد بہت زیادہ ہیں۔

---

[1] صحیح بخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ، باب قول النبی ﷺ "لو کنت متخذا خلیلا" (ح۳۶۵۸)، صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہ (حدیث: ۲۳۸۲، ۶/ ۲۳۸۳)۔

اسی سے زیادہ افراد نے تواتر کیساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ آپ نے [کوفہ کے منبر پر تقریر کرتے ہوئے] فرمایا:

''امت محمدی میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے افضل ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں، پھر عمر رضی اللہ عنہ۔''❶

یہی بات حضرت علی رضی اللہ عنہ کے شایان شان تھی کیونکہ آپ حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کے حق کا باقی صحابہ سے زیادہ علم رکھتے تھے۔اوراسلام میں ان کی قدر ومنزلت اور دین میں حسن تاثیر سے خوب شناسا تھے؛یہاں تک کہ آپ تمنا فرمایا کرتے تھے کہ:

''وہ اللہ سے اس حال میں ملیں کہ ان کے اعمال حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرح ہوں۔'' رضی اللہ عنہم اجمعین۔

امام ترمذی اور دوسرے محدثین نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے؛ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''[یہ دونوں انبیاء ومرسلین کے علاوہ] جنت کے تمام ادھیڑ عمر لوگوں کے سردار ہیں۔اے علی! تم انہیں اس کی خبر نہ دینا۔''❷

اگر ان صحیح احادیث کا مقابلہ پرندے والی روایت؛ یا مؤاخات والی روایت سے کیا جائے تو بلا شک وشبہ یہ احادیث باتفاق مسلمین ان کی نسبت صحیح تر ہوں گی۔تو پھر جب ان کے ساتھ دوسری صحیح احادیث بھی ملادی جائیں جن کے صحیح ہونے میں کسی کو بھی شک نہیں؛ تو ان کا کیا کہنا۔کثرت کے ساتھ متعدد دلائل کی روشنی میں ان کا علم رکھنے والے کے لیے لازمی علم حاصل ہوجاتا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ صحابہ کرام میں سے سب سے بڑھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو محبوب؛ اور عمر وعثمان وعلی اور دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کی نسبت سے افضل تھے۔جو بھی انسان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور آپ کے احوال کی معرفت رکھتا ہو اسے ضرور اس بات کا اعتراف رہے گا۔مذکورہ صدر نصوص احادیث صحیحہ کے بارے میں وہی شخص شک وشبہ کا شکار ہوسکتا ہے جسے صحیح اور ضعیف میں کوئی تمیز نہ ہو؛[یا جو جاہل ہو یا جس پر بدعت کا غلبہ ہو]۔وہ یا تو تمام احادیث کی تصدیق کرتا ہے یا پھر تمام احادیث میں توقف کرتا ہے۔

جب کہ محدثین اور فقہاء بہت اچھی طرح سے [یہ بات] جانتے ہیں؛ ان کو بھی چھوڑیے؛اس میں کوئی شک نہیں کہ امت کا ہر ایک سچا عالم وعابد اور زاہد حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کو باقی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر تقدیم دینے میں یک زبان ہیں۔

امام بیہقی رحمہ اللہ اپنی سند کے ساتھ امام شافعی رحمہ اللہ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

''صحابہ وتابعین میں سے کسی نے بھی حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کو افضل الصحابہ قرار دینے میں اختلاف نہیں کیا۔''❀

ایسے ہی دیگر علماء اسلام نے بھی اس مسئلہ میں کوئی اختلاف نہیں کیا۔جیسا کہ حضرت امام مالک اور ان کے اصحاب، امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب، امام احمد اور ان کے اصحاب، ثوری اور ان کے اصحاب، لیث اور ان کے اصحاب، اوزاعی اور ان کے اصحاب، اسحاق اور ان کے اصحاب، داؤد اور ان کے اصحاب اور ابن جریر اور ان کے اصحاب؛ ابوثور اور ان کے اصحاب اور دیگر تمام مشہور ائمہ سلف وخلف رحمہم اللہ سب یہی نظریہ رکھتے ہیں۔اگر کسی نے اختلاف کیا بھی ہوگا تو کوئی ایسا ہوگا جس کے قول کی دو ٹکے کی اہمیت نہ ہوگی؛ اور نہ ہی کوئی اس کی بات سنتا و مانتا ہوگا۔

ہمیں اس بارے میں اہل فتوی میں سے کسی ایک کا بھی اختلاف معلوم نہیں ہوسکا۔سوائے حسن بن صالح بن حی کے؛

---

❶ صحیح بخاری، حوالہ سابق، (حدیث:٣٦٦٢)، صحیح مسلم، حوالہ سابق، (حدیث: ٢٣٨٤)۔
❷ [جامع ترمذی:جلد دوم:ح ١٦٣١ ؛یہ حدیث اس سند سے حسن غریب ہے]۔
❀ مناقب الشافعي للبيهقي ١/ ٤٣٤۔

ان کے بارے میں نقل کیا گیا ہے کہ آپ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فضیلت دیتے تھے ۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آپ پر جھوٹ باندھا گیا ہے۔ اگر یہ بات صحیح بھی ثابت ہو جائے ؛ تب بھی امام شافعی رحمہ اللہ کے نقل کردہ اجماع پر کوئی قدح وارد نہیں ہو سکتی۔ اس لیے کہ حسن بن صالح نہ ہی صحابہ میں سے تھے اور نہ ہی تابعین میں سے ۔ جب کہ امام شافعی رحمہ اللہ نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی تقدیم پر اجماع نقل کیا ہے۔ اگر حسن بن صالح نے ایسی کوئی بات کہی بھی ہو گی تو لاکھوں ائمہ میں سے کسی ایک کا غلطی کر جانا کوئی اچھوتی بات نہیں ہے۔

روافض میں کوئی ایسا عالم نہیں ہے جو علوم اسلامیہ میں سے کسی چیز میں امام ہو' نہ ہی علم حدیث میں نہ فقہ میں ؛ نہ تفسیر میں ؛ نہ ہی قرآن میں ۔ بلکہ رافضیوں کے مشائخ یا تو بالکل جاہل ہوتے ہیں یا پھر زندیق ہوتے ہیں جیسے اہل کتاب کے مشائخ ۔

سابقین اولین ائمہ اہل سنت والحدیث حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو تقدیم دینے پر متفق ہیں۔ ان کا یہ اجماع و اتفاق کسی رغبت یا لالچ کی وجہ سے یا کسی خوف و ڈر کی بنا پر نہ تھا۔ حالانکہ ان حضرات کی آراء و افکار اور مقاصد و علوم مختلف تھے ؛ اور دوسرے علم مسائل میں ان کے مابین کثرت کے ساتھ اختلاف بھی پایا جاتا ہے۔ مگر اس کے باوجود صحابہ اور تابعین میں ائمہ اس نظریہ و عقیدہ پر متفق ہیں ۔ پھر ان کے بعد حضرت امام مالک بن انس ؛ اور ابن ابی ذئب ؛ اور عبد العزیز بن الماجشون اور دوسرے علماء مدینہ طیبہ کا اس پر اتفاق ہے۔

امام مالک رحمہ اللہ نے اپنے مشائخ و اساتذہ سے حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کی افضلیت پر اجماع نقل کیا اور فرمایا کہ اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔ ابن جریج ؛ سعد بن سالم ؛ مسلم بن خالد زنجی ؛ ابن عیینہ اور علماء مکہ رحمہم اللہ کی بھی یہی رائے ہے۔ علاوہ ازیں امام ابو حنیفہ' ثوری ؛ شریک بن عبد اللہ ؛ ابن ابی لیلی ؛ اور دیگر علماء بصرہ اور شیعہ کے مرکز کوفہ کے علماء رحمہم اللہ بھی اسی کے قائل ہیں ۔ یہاں تک کہ امام ثوری رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے :

''جو کوئی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ پر فضیلت دیتا ہے ؛ میں نہیں سمجھتا کہ اس کا کوئی عمل اللہ کی بارگاہ میں قبول ہوتا ہوگا ۔'' [سنن ابی داؤد ۴/ ۲۸۸ ۔]

مزید برآں حماد بن زید ؛ حماد بن سلمہ ؛ سعید بن ابی عروبہ ؛ اور ان کے امثال علماء بصرہ ؛ اوزاعی ؛ سعید بن عبد العزیز جیسے علماء شام ؛ اور مصری علماء میں سے عمر بن حارث ولیث بن سعد و ابن وہب ؛ پھر ان کے بعد عبد اللہ بن مبارک ؛ وکیع ابن الجراح ؛ عبد الرحمن بن مہدی ؛ ابو یوسف ؛ محمد بن الحسن ؛ اور امام شافعی ؛ احمد بن حنبل ؛ اسحاق بن ابراہیم ؛ ابی عبید ؛ امام بخاری ؛ ابو داؤد ؛ ابراہیم الحربی ؛ اور فضیل بن عیاض ؛ ابو سلیمان الدارانی ؛ معروف الکرخی ؛ سری السقطی ؛ جنید ؛ سہیل بن عبد اللہ التستری ؛ اور لا تعداد علماء رحمہم اللہ جن کی صحیح تعداد اللہ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا ؛ اسلام میں جن کی سچائیوں کے چرچے ہیں ؛ یہ تمام حضرات حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کی تقدیم و فضیلت کا دوٹوک اور قطعی عقیدہ رکھتے تھے ۔ اور ان دونوں اصحاب کو ائمہ برحق مانتے تھے۔ ان حضرات کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت اور سنت پر عمل کی مشکورانہ کوششیں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان حضرات کو پتہ تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی حضرات ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کو تقدیم بخشتے تھے ۔ اور محبت و ثناء اور مشاورت میں ان کو فضیلت دیتے تھے۔ ان کے علاوہ بھی فضیلت کے کئی اسباب تھے۔

امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی انتالیسویں دلیل:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:

''امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی انتالیسویں دلیل یہ آیت ہے:

﴿اِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِیْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ وَ اَشْهَدَهُمْ عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰی شَهِدْنَا اَنْ تَقُوْلُوْا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِیْنَ﴾ (الاعراف:۱۷۲)

''اور جب آپ کے رب نے اولاد آدم کی پشت سے ان کی اولاد کو نکالا اور ان سے ان ہی کے متعلق اقرار لیا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ سب نے جواب دیا کیوں نہیں! ہم سب گواہ بنتے ہیں۔ تاکہ تم لوگ قیامت کے روز یوں نہ کہو کہ ہم تو اس سے محض بیخبر تھے۔''

کتاب الفردوس میں حضرت حذیفہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر لوگوں کو معلوم ہوتا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو امیر المومنین کے لقب سے کب ملقب کیا تھا تو ان کی فضیلت کا انکار نہ کرتے۔ آپ اس وقت اس لقب سے نوازے گئے تھے۔ جب آدم کی تخلیق ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِیْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ وَ اَشْهَدَهُمْ عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُم﴾

''فرشتوں نے اللہ کی ربوبیت کا اقرار کیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں تمہارا رب ہوں۔ محمد تمہارے نبی ہیں اور علی تمہارے امیر ہیں۔ یہ روایت اظہار مدعا میں بالکل صریح ہے۔'' [شیعہ کا بیان ختم ہوا]۔

جواب: اس کا جواب کئی طرح سے دیا جا سکتا ہے:

- **پہلی وجہ** : اس روایت کی صحیح سند پیش کرو۔ تمام محدثین کا اجماع ہے کہ صرف صاحب فردوس کا کسی روایت کو ذکر کر لینا حدیث کے صحیح ہونے کے لیے کافی نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ ابن شیرویہ الدیلمی الہمذانی نے اپنی اس کتاب میں بہت ساری صحیح احادیث صحیح بھی نقل کی ہیں' حسن بھی اور موضوع بھی۔ یہ انسان اگرچہ اہل علم میں سے اور دیندار آدمی تھا۔ اور ان لوگوں میں سے نہیں تھا جو جان بوجھ کر جھوٹ گھڑ لیتے ہیں۔ لیکن اس نے وہ روایات نقل کر لی ہیں جو لوگوں کی کتابوں میں موجود تھیں۔ کتابوں میں سچ اور جھوٹ ہر طرح کی باتیں ہوتی ہیں۔ تو اس نے بھی ویسے ہی کیا جیسے بہت سارے دوسرے لوگ احادیث جمع کرتے وقت کیا کرتے ہیں۔ یا تو سند کے ساتھ روایت ذکر کرتے ہیں یا پھر سند کو حذف کر دیتے ہیں۔
- **دوسری وجہ** : یہ روایت سب محدثین کے نزدیک جھوٹی ہے۔ اس پر اہل علم کا اتفاق ہے۔
- **تیسری وجہ** : قرآن کریم کی ذکر کردہ آیت میں صرف یہ الفاظ ہیں: ﴿اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰی﴾ ''کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ کہنے لگے: کیوں نہیں' [ضرور آپ ہمارے رب ہیں]۔'' اس میں نہ ہی کسی نبی کا ذکر ہے؛ اور نہ ہی کسی امیر کا۔ بلکہ اس سے اگلی آیت میں ہے:

﴿اَوْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اَشْرَكَ اٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَ كُنَّا ذُرِّیَّةً مِّنْ بَعْدِهِمْ﴾

''یا یہ کہو کہ شرک تو ہم سے پہلے ہمارے باپ دادا ہی نے کیا تھا اور ہم تو ان کے بعد ایک نسل تھے۔''
اس سے معلوم ہوا کہ یہ آیت صرف خاص طور پر میثاق توحید پر مشتمل ہے۔ اس میں میثاق نبوت کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا، باقی امور تو الگ رہے۔

❀ **چوتھی وجہ** : اس بارے میں احادیث بڑی معروف ہیں۔ جو کہ مسند' سنن؛ موطأ اور کتب تفسیر وغیرہ میں منقول ہیں۔ ان میں ایسی کوئی بات ذکر نہیں کی گئی۔ اگر اس بات کی کوئی حقیقت ہوتی تو پھر سارے لوگ اس کے بیان کرنے کو ترک نہ کرتے؛ بلکہ کوئی نہ کوئی ضرور اسے ذکر کرتا۔ بلکہ ایک ایسا مصنف اسے ذکر کررہا ہے جس کی سچائی کا کوئی پتہ ہی نہیں' بلکہ اس کا جھوٹا ہونا معروف ہے۔

❀ **پانچویں وجہ** : علاوہ ازیں چونکہ یہ عہد سب لوگوں سے لیا گیا تھا۔ لہٰذا اس سے یہ لازم آتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ جملہ انبیاء از نوح تا محمد علیہم السلام کے بھی امیر ہیں؛ ظاہر ہے کہ یہ ایک احمقانہ بات ہے۔ اس لیے کہ یہ انبیاء علیہم السلام حضرت علی رضی اللہ عنہ کی پیدائش سے پہلے وفات پا چکے تھے، ان کے امیر کیوں کر قرار پا سکتے تھے؟ زیادہ سے زیادہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے اہل زمانہ کے امیر ہو سکتے ہیں۔ باقی رہی یہ بات کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ پہلے لوگوں کے بھی امیر تھے اور ان لوگوں کے بھی جو آپ کے بعد پیدا ہوئے تو کوئی شخص بقائمی ہوش و حواس اس کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ اور نہ ہی اسے ایسی بے ڈھنگ باتیں کرتے ہوئے کوئی حیاء آتی ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ یہ احمق رافضی عقلاءِ یہود سے بھی گیا گزرا ہے جن کے متعلق قرآن نے فرمایا تھا:

﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا﴾ (الجمعۃ ۵)

''جن لوگوں کو تورات پر عمل کرنے کا حکم دیا گیا پھر انہوں نے اس پر عمل نہیں کیا ان کی مثال اس گدھے کی سی ہے جو بہت سی کتابیں لادے ہو۔''

عام لوگ اپنے اس کلام میں معذور ہیں کہ: رافضی یہودیوں کا گدھا ہے۔ اس لیے کہ ایک یہود کے اہل خرد و دانش سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ شیعہ کے یہ دلائل عقلاً و شرعاً بے کار ہیں۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے کسی نے کہا ہے: ان پر ان کے نیچے سے چھت گر گئی۔ [کیا چھت بھی کبھی نیچے سے گرتی ہے؟] ایسے لوگوں کو نہ ہی عقل کام آتی ہے اور نہ ہی قرآن۔ یہی حال ان کے اس عقیدہ کا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ تمام اولاد آدم کے امیر ہیں۔ آپ تو حضرت آدم علیہ السلام کی موت کے ہزاروں سال بعد پیدا ہوئے۔ اور آپ کا گزرے ہوئے انبیاء کرام علیہم السلام پر امیر ہونا؛ جو کہ آپ سے مقام و مرتبہ اور زمانے کے لحاظ سے متقدم ہیں؛ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے ملحد صوفی ابن عربی الطائی اور اس کے امثال کا یہ قول ہے کہ:

''انبیاء کرام معرفت الٰہی کا علم خاتم الاولیاء (ابن عربی اپنی کتاب ''الفصوص'' میں لکھتے ہیں کہ میں خاتم الاولیاء ہوں) کے سینے سے اخذ کیا کرتے تھے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے چھ سو سال کی مدت بعد پیدا ہوا تھا۔''

ابن عربی کے ہم نوا اولیاء کے بارے میں اسی طرح غلو سے کام لیتے ہیں، جیسے شیعہ اماموں کے بارے میں۔ یہ دونوں دعوے جھوٹ؛ غلو؛ شرک اور باطل پروپیگنڈے کی بنیاد پر قائم کیے گئے ہیں۔ اور یہ دعوے کتاب و سنت اور اجماع سلف امت

سے ٹکراتے ہیں۔

حیرت بالائے حیرت ہے کہ شیعہ مصنف ایسے دلائل کو ''صریح فی الباب'' قرار دیتا ہے۔ بھلا ایسے دلائل کو کوئی عقلمند شخص تسلیم کر سکتا ہے؟ یا ایسی باتوں سے کوئی بھی دانش مند انسان دلیل اخذ کر سکتا ہے؟ چہ جائے کہ اس کو بنیاد بنا کر امت کے بہترین لوگوں کو فاسق و فاجر قرار دیا جائے۔ اور انہیں کافر و جاہل اور گمراہ کہا جائے؟

اگر چہ ایسے دعووں کی بنیاد پر یہ سرکش ظالم اولیاء اللہ پر ظلم و تعدی نہ بھی کرتا ہو؛ اور اہل ارض کے سادات کو برا بھلا نہ بھی کہتا ہو اور انبیاء کرام علیہ السلام کے بعد اللہ تعالیٰ کے ہاں سب سے معزز و مکرم مخلوق پر اور دین پر قدح نہ بھی کرتا ہو اور کافروں کو مسلمانوں پر مسلط کرنے کی کوشش نہ بھی کرتا ہو تب بھی کیا یہ کم جرم ہے کہ ایسی باتوں سے وہ عام سادہ لوح مسلمانوں کے دلوں میں اسلام اور اہل اسلام کے متعلق شکوک و شبہات ڈال رہا ہے۔ ہمیں ایسے اسرار کے حقائق معلوم کرنے اور ایسے رازوں سے پردہ اٹھانے کی ہرگز کوئی ضرورت نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہی اس انسان اور اس جیسے دوسرے لوگوں کے لیے کافی ہے۔

امامت علی رضی اللہ عنہ کی چالیسویں دلیل:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:

''امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی چالیسویں دلیل یہ آیت ہے:

﴿فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلَاهُ وَ جِبْرِيْلُ وَ صَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (التحریم: ۴)

''پس یقیناً اس کا کارساز اللہ ہے اور جبرائیل ہیں اور نیک ایماندار اور ان کے علاوہ فرشتے بھی مدد کرنے والے ہیں۔''

مفسرین کا اجماع ہے کہ ''صالح المومنین'' سے حضرت علی رضی اللہ عنہ مراد ہیں۔ ابو نعیم حضرت اسماء بنت عمیس سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ آیت پڑھتے سنا: ﴿وَاِنْ تَظٰهَرَا عَلَيْهِ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰهُ وَجِبْرِيْلُ وَ صَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾، آپ نے فرمایا۔ نیک ایماندار سے حضرت علی رضی اللہ عنہ مراد ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اس خصوصیت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ افضل ہیں لہٰذا آپ ہی امام ہوں گے۔'' اس معنی میں اور بھی بہت ساری آیات وارد ہوئی ہیں۔ ہم نے جو کچھ ذکر کیا ہے وہ اختصار کے پیش نظر ہے۔ [شیعہ کا بیان ختم ہوا]۔

❀ **جواب: پہلی بات:** اس کا جواب یہ ہے کہ اس ضمن میں اس اجماع کا دعویٰ افترا پر مبنی ہے کہ ''تمام مفسرین کا ایماندار سے مؤمن سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مراد ہونے پر اتفاق ہے'' یہ ایک کھلا ہوا جھوٹ ہے۔ نہ ہی اس تفسیر پر کوئی اجماع ہے اور نہ ہی کسی مفسر یا محدث نے ایسا کوئی اجماع نقل کیا ہے۔ ہم شیعہ سے اس منقول کی صحیح سند کا مطالبہ کرتے ہیں۔ یہ اجماع کس نے نقل کیا ہے؟

❀ **دوسری بات:** حقیقت یہ ہے کہ اس روایت پر اجماع تو کجا کتب تفسیر میں اس کے برعکس مذکور ہے، چنانچہ مجاہد اور دیگر علماء اس سے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ مراد لیتے ہیں۔ مفسرین کی ایک جماعت نے ایسے ہی نقل کیا ہے۔ جیسے ابن جریر رحمہ اللہ وغیرہ۔ [اس کے علاوہ بھی اس کی کئی ایک تفاسیر ہیں:

۱۔ اس سے مراد ابو بکر رضی اللہ عنہ ہیں۔ یہ مکحول نے ابو امامہ رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے۔
۲۔ اس سے مراد حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہیں۔ سعید بن جبیر اور مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔
۳۔ اس سے مراد نیکو کار مؤمنین ہیں۔ یہ ربیع بن انس رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔
۴۔ بعض علماء اس سے انبیاء مراد لیتے ہیں۔ یہ قتادہ؛ زیاد بن علاء اور سفیان رحمۃ اللہ علیہم کا قول ہے۔
۵۔ اس سے حضرت علی رضی اللہ عنہ مراد ہیں۔ یہ حکایت ماوردی رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کی ہے' اور اس قول کے کہنے والے کا نام نہیں لیا' شائد اس کا کہنے والا کوئی شیعہ ہوگا۔

❀ **تیسری بات:** اس سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کوئی خصوصیت ثابت نہیں ہوتی۔ علاوہ ازیں یہ حدیث یقیناً کذب ہے۔ مصنف نے اس حدیث کے صحیح ہونے پر کوئی دلیل ذکر نہیں کی۔ صرف ابو نعیم کا روایت کر لینا حدیث کے صحیح ہونے پر دلالت نہیں کرتا۔

❀ **چوتھی بات:** مزید براں ''وصالح المؤمنین'' کے الفاظ عام ہیں۔ بخاری و مسلم میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''فلاں گھر والے میرے دوست نہیں ہیں۔ میرا دوست صرف اللہ تعالیٰ اور نیکو کار مومن ہیں۔'' ❶

❀ **پانچویں بات:** نیز یہ کہ مذکورہ صدر آیت میں نیک نہاد اہل ایمان کو رسول اللہ کا ''مولیٰ'' قرار دیا گیا ہے۔ جیسے یہ خبر بھی دی ہے کہ اللہ بھی ان کا مولی ہے۔ ظاہر ہے کہ مولیٰ سے موالی مراد ہے۔ لہٰذا جو شخص بھی نیک دل مومن ہوگا وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قطعی طور پر موالی (دوست) ہوگا، اگر وہ آپ سے دوستی نہ لگاتا ہوتو وہ صالح مومنین میں سے نہیں ہو سکتا۔ ایسے ہی کبھی کوئی مؤمن دوستی تو رکھتا ہے؛ مگر وہ کامل نیکو کار نہیں ہوتا' اسی وجہ سے اس کی دوستی کامل نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس جو کوئی کامل ایمان والا نیک انسان ہوتا ہے اس کی دوستی بھی کامل و مکمل ہوتی ہے۔ اس لیے کہ ایمان دار انسان اس چیز سے محبت کرتا ہے جس سے اللہ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم محبت کرتے ہیں۔ اور اس چیز سے بغض رکھتا ہے جس سے اللہ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم بغض رکھتے ہیں۔ وہ ہر اس چیز کا حکم دیتا ہے جس کا حکم اللہ اور اس کے رسول نے دیا ہے' اور ہر اس چیز سے منع کرتا ہے جس سے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے منع کیا ہے۔ دوستی کا تقاضا یہی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا:

''عبداللہ بہترین نیک انسان تھا اگر یہ رات کو نماز [تہجد] بھی پڑھتا۔'' اس کے بعد حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے تہجد کی نماز کبھی بھی نہیں چھوڑی۔'' [البخاری۹/ ٤٠؛ مسلم ٤/ ١٩٢٨]

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا:

''یہ تمہارے نیکو کار مردوں میں سے ہے' اس کے ساتھ بہترین خیر خواہی کا سلوک کیا کرو۔'' [مسلم ٤/ ١٨٨٤]

❶ صحیح بخاری، کتاب الأدب، باب تبل الرحم ببلالها(ح:۵۹۹۰)، صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب موالاۃ المومنین(ح:۲۱۵)۔

❀ شیعہ کا یہ قول کہ ''وَالْآیَاتُ فِیْ هٰذَا الْمَعْنٰی کَثِیْرَۃٌ.'' ''اس معنی میں بہت ساری آیات ہیں۔''

جواب : ہم کہتے ہیں کہ شیعہ کے دلائل اسی طرح متروک روایات' کمزور اور بودے ہوں گے جس طرح ان کے ذکر کردہ دلائل بے کار ہیں۔ جو کچھ اس نے ذکر کیا ہے' وہ ان کے ہاں مذہب کے دلائل کا خلاصہ ہے۔ آخر جھوٹ کی کیا کمی ہے؟ یہ دروازہ تو کبھی بند نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا مقابلہ کرنے والے لوگ [نواصب اور مروانیہ] بھی جو ان سے بن سکتا تھا' وہ اس طرح کے جھوٹ گھڑ لیتے تھے۔ مگر بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حق کو باطل پر پھینک مارتا ہے اور وہ مغلوب ہو کر دب جاتا ہے۔ اور جھوٹ بولنے والوں کے لیے ان کے جھوٹ پر ہلاکت اور تباہی ہے۔

[اشکال]: شیعہ کا قول: [اس آیت سے] مراد حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔''

[جواب] :اگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا جائے کہ اس سے مراد ابوبکر یا عمر یا عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین ہیں؛ تو ان کے قول کی نسبت یہ قول تفسیر سے کچھ دور نہیں ہوگا۔ بلکہ یہ قول ان کے قول پر راجح ہوگا۔ خصوصی طور پر کئی ایک مواقع پر۔

اگر شیعہ اعتراض کریں کہ: ہمارے قول کے برعکس اس طرح کی تفسیر کسی نے نہیں کی؟ تو اس کا جواب دو طرح سے ہے:

❀ پہلی وجہ: [آپ کی تفسیر بھی] ممنوع ہے۔ بلکہ لوگوں میں سے کچھ ایسے بھی گزرے ہیں' جو اس آیت سے اور اس طرح کی بعض دوسری آیات سے خاص ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو مراد لیتے ہیں۔

❀ دوسری وجہ: کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس آیت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین میں سے کسی ایک کو خاص کر دیا گیا ہے۔ جب کہ کسی دوسرے کے لیے یہ بھی ممکن ہے کہ وہ کسی اور کو اس آیت کی تفسیر کے ساتھ خاص کر دیں۔ تو یہ دونوں دلائل ایک ہی جنس سے ہوں گے۔ یہ بات شیعہ کی دلیل کے فاسد ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ اگرچہ اس طرح کی بات پہلے کسی نے نہ بھی کہی ہو۔ اس لیے کہ جب کوئی انسان جھوٹ بولتا ہے تو کسی دوسرے کے لیے اس جیسے جھوٹ کے ساتھ مقابلہ کرنا ممکن ہوتا ہے۔ تو اس دلیل کا توڑ اس جیسی ہی دلیل سے ہو سکتا ہے۔ تو پھر اس صورت میں واجب ہوتا ہے یا تو دونوں کی تصدیق کی جائے یا پھر دونوں کی تکذیب کی جائے۔

قاسم بن زکریا کی حکایت مشہور ہے؛ وہ عباد بن یعقوب اسدی رافضی کے پاس گیا۔ [وہ کہتا ہے] اس [رافضی] نے مجھ سے کہا: ''دریا کس نے کھودا؟''

میں نے کہا: ''اللہ تعالیٰ نے۔''

اس نے کہا: ''تم سچ کہتے ہو، مگر یہ بتاؤ دریا کس نے کھودا؟''

میں نے کہا: پھر آپ ہی ارشاد فرمائیں۔''

عباد نے کہا: حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کھودا تھا۔''

پھر اس نے پوچھا: ''دریا کو کس نے جاری کیا؟''

میں نے کہا: ''اللہ تعالیٰ نے۔''

تم سچ کہتے ہو، مگر یہ بتاؤ دریا کس نے جاری کیا تھا؟''

میں نے کہا: آپ ہی فرمائیں۔

عباد نے کہا: ''حسین نے جاری کیا۔''

[[عباد نابینا تھا۔ جب میں نے اٹھنے کا ارادہ کیا تو؛ میں نے اس کے پاس ایک تلوار اور ڈھال دیکھی تو پوچھا یہ کس کی ہے؟ عباد کہنے لگا: میں نے مہدی کے ساتھ لڑنے کے لیے یہ تلوار رکھی ہے۔ میں اس کی باتیں سن کر فارغ ہوا اور]] جب جانے کے ارادہ سے کھڑا ہونا چاہا تو اس نے پھر پوچھا: ''دریا کس نے کھودا؟''

میں نے کہا: ''حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے۔'' پھر اس نے پوچھا اس میں پانی کس نے جاری کیا: میں نے کہا: یزید نے۔ اس پر وہ بہت غصہ ہوا اور کھڑا ہو گیا۔ [1]

قاسم کی غرض یہ تھی کہ وہ بھی اس پر ایسی ہی بات سے رد کرے جیسے بات وہ کہہ رہا ہے۔ جب کہ تم اس بات کو ناپسند کرتے ہو اور اس کو رد کرتے ہو؛ پس جس دلیل سے یہ قول رد ہوگا' اس سے آپ کی دلیل بھی رد ہو جائے گی۔

ایسے ہی یہی حال رافضیوں اور قرامطہ کی ان تاویلات کا ہے جو لوگوں کی زبان پر ہیں؛ جیسے ان کا یہ قول:

﴿ فَقَاتِلُوْٓا اَئِمَّةَ الْكُفْرِ ﴾ [التوبة ۱۲]

''پس کفر کے ائمہ کو قتل کرو۔''

[اس سے مراد] طلحہ وزبیر؛ ابوبکر وعمر اور معاویہ رضی اللہ عنہم اجمعین ہیں۔ اس کے مقابلہ میں خوارج کا قول ہے جو کہتے ہیں: اس سے مراد حضرت علی' حضرت حسن اور حسین رضی اللہ عنہم اجمعین ہیں۔ یہ دونوں تفسیریں باطل ہیں۔ یہاں پر بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ لوگ جھوٹی دلیل کے مقابلہ میں ایسی ہی جھوٹی دلیل لے آتے ہیں۔ اور جس دلیل سے اس قسم کی تفسیر کا باطل ہونا ثابت ہوتا ہے وہ دونوں کے لیے عام ہے۔ اس سے ان تمام دلائل کا باطل ہونا ثابت ہوا۔

❁❁❁❁

[1] [[حافظ ذہبی فرماتے ہیں یہ حکایت صحیح ہے، اسے ابن مظفر نے قاسم سے روایت کیا ہے۔ محمد بن جریر کہتے ہیں، میں نے عباد بن یعقوب کو یہ کہتے سنا۔ جو نماز میں ہر روز اعداء اہل بیت پر تبرانہ بھیجے اس کا حشر انہی کے ساتھ ہوگا]]۔

امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ پر احادیث نبویہ سے استدلال

[سلسلہ اشکالات]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:

''تیسرے باب میں ان احادیث نبویہ سے استدلال کیا جائے گا جو کہ مستند ہیں؛ اور نبی کریم ﷺ سے روایت کی گئی ہیں۔ان دلائل کی تعداد بارہ ہے:

ا۔**پہلی حدیث**: ان میں سے ایک وہ حدیث ہے جو سب لوگوں نے بیان کی ہے کہ جب یہ آیت کریمہ: ﴿وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ﴾ ''اور اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈرایئے'' نازل ہوئی تو نبی کریم ﷺ نے تمام بنی عبد المطلب کو ابو طالب کے گھر میں جمع کیا۔[ان میں دو عورتیں اور] چالیس مرد تھے۔آپ نے ان کے لیے بھیڑ کی ایک ٹانگ ایک مٹھی بھر جو کے ساتھ پکانے اور ایک صاع دودھ تیار کرنے کا حکم دیا۔[کا کھانا پکایا گیا]۔ان میں سے ایک آدمی ایک وقت میں ایک بکرا کھا سکتا تھا؛ اور اسی مجلس میں ایک مشک پانی کی بھی پی سکتا تھا[یہ کھاؤ پیو آدمی تھے]۔ان تمام لوگوں نے یہ تھوڑا سا کھانے کھایا اور اس سے سیر ہو گئے۔اور انھیں پتہ نہ چل سکا کہ انھوں نے کیا کھایا ہے؛ آپ کی اس اعجاز نمائی سے ان پر واضح ہو گیا کہ آپ سچے نبی ہیں۔آپ نے فرمایا: اے بنی عبد المطلب! یوں تو مجھے اللہ تعالیٰ نے سب لوگوں کی طرف مبعوث کیا ہے، مگر خاص طور سے مجھے تمہاری طرف بھیجا ہے۔اللہ تعالیٰ نے مجھے مامور فرمایا ہے: ﴿وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ﴾ ''اور اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈرایئے۔''

میں تمھیں دو ہلکے پھلکے کلمات کی طرف دعوت دیتا ہوں۔جن کا زبان پر جاری کرنا بڑا آسان ہے اور جو میزان اعمال میں بڑے بوجھل ہوں گے۔تم ان دونوں کلمات کی برکت سے عرب و عجم کے مالک بن جاؤ گے اور جملہ اقوام عالم تمہارے زیر نگیں ہو جائیں گی۔ان کلمات کی بنا پر تم جنت میں جاؤ گے اور جہنم سے رہائی پاؤ گے۔وہ کلمات یہ ہیں:

''اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۔''

جو شخص میری اس دعوت کو قبول کرے گا اور میری مدد کرے گا وہ میرا بھائی میرا وصی میرا وزیر اور میرے بعد میرا خلیفہ اور وارث ہوگا۔ نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد گرامی سن کر باقی لوگوں میں سے کسی ایک نے بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ جب کہ امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: اے اللہ کے رسول! میں اس کے لیے تیار ہوں۔ میں اس مسئلہ میں آپ کی مدد کروں گا۔آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''بیٹھ جاؤ۔'' آپ نے اس قوم میں پھر یہی اعلان دھرایا؛ مگر تمام لوگ خاموش رہے۔حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں دوبارہ کھڑا ہو گیا؛ اور وہی پہلے والی بات دھرائی۔آپ ﷺ نے فرمایا: بیٹھ جایئے۔آپ نے پھر تیسری بار لوگوں میں یہی اعلان کیا۔مگر لوگ خاموش رہے۔ان میں سے کسی ایک نے اپنی زبان سے ایک کلمہ تک نہ کہا۔میں کھڑا ہو گیا اور عرض کی: یارسول اللہ ﷺ! میں اس مسئلہ میں آپ کی مدد

کروں گا۔ آپ نے فرمایا: بیٹھ جایئے! تم ہی میرے بھائی اور میرے وزیر ہو؛ اور میرے وصی اور وارث ہو۔ لوگ کھڑے ہوگئے اور وہ ابو طالب سے کہہ رہے تھے: تمہیں مبارک ہو' کہ آج تم اپنے بھتیجے کے دین میں داخل ہوگئے؛ اور اس نے تمہارے بیٹے کو تم پر امیر بنادیا۔''

[جوابات]: اس [اشکال] کا جواب کئی نکات پر مشتمل ہے:

اول: ہم شیعہ سے مذکورہ بالا روایت کی صحت کا مطالبہ کرتے ہیں۔ شیعہ مصنف کا دعوی کرنا کہ یہ روایت تمام اہل علم نے روایت کی ہے؛ صریح اور کھلا ہوا کذب اور دروغ گوئی ہے۔ اہل اسلام حدیث نقل کرنے میں جن کتابوں سے استفادہ کرتے ہیں؛ ان میں اس طرح کی کوئی روایت موجود نہیں۔ یہ روایت نہ ہی صحاح میں ہے اور نہ ہی سنن میں؛ نہ ہی مغازی میں؛ اور نہ ہی ان تفسیر کی کتابوں میں جن میں سند ذکر کرنے کا اہتمام کیا جاتا ہے؛ اور نہ مسانید میں۔ ہاں اگر بعض ان کتابوں میں ہو جن میں [بغیر کسی تمیز کے] صحیح اور ضعیف ہر قسم کی روایات جمع کردی جاتی ہیں؛ جیسے ثعلبی؛ واحدی؛ اور بغوی وغیرہ؛ تو یہ ایک علیحدہ بات ہے۔ بلکہ ابن جریر اور ابن حاتم رحمہما اللہ بھی اگر کوئی روایت نقل کریں تو صرف ان کے نقل کرنے سے روایت قابل حجت نہیں ہو جاتی؛ اس پر تمام اہل علم کا اتفاق ہے۔ اس لیے کہ جب یہ بات معلوم ہے کہ روایات میں صحیح بھی ہوتی ہیں اور ضعیف بھی؛ تو پھر یہ بیان کرنا بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ یہ روایت صحیح احادیث میں سے ہے؛ ضعیف میں سے نہیں۔

دوم ہم اس روایت کو قبول کرنے کے لیے دو شرطوں کے ساتھ راضی ہیں:

- پہلی شرط: یہ روایت ایسی سند کے ساتھ ذکر کی جائے جو اہل علم کے ہاں اختلافی مسائل میں قابل حجت ہو۔
- دوسری شرط: یا پھر کسی ایسے محدث کا قول ہو جن کی تصحیح پر لوگ اعتماد کرتے ہوں۔

اس لیے کہ اگر دو فقیہ فروعات میں سے کسی ایک فروع میں باہم جھگڑ پڑیں؛ تو مناظرہ میں حجت اس وقت تک قائم نہیں ہوسکتی جب تک وہ ایسی صحیح حدیث پیش نہ کردے جس سے حجت قائم ہوسکتی ہو۔ یہ وہ اس قول کو صحیح قرار دے جو اس کی طرف لوٹایا جارہا ہے۔

اس کے برعکس اگر اس روایت کی سند ہی معلوم نہ ہو۔ اور ائمہ محدثین سے اس حدیث کا منقول ہونا ثابت ہی نہ ہو؛ تو پھر یہ حدیث کیسے معلوم کی جاسکتی ہے؟ پھر خاص کر ان اصولی مسائل میں [اس روایت پر کیسے اعتماد کیا جاسکتا ہے] جن میں جمہور امت اور سلف صالحین پر طعن کیا جاتا ہو؟ اور ان کے ذریعہ سے ملت کے قواعد کو منہدم کرنے تک کا وسیلہ اختیار کیا جاتا ہو۔ [غور کیجیے] ایسی روایت جس کی سند ثابت نہ ہو؛ ائمہ و محدثین نے اسے نقل نہ کیا ہو؛ اور کسی ایک عالم نے بھی اسے صحیح نہ کہا ہو تو پھر ایسی روایت کو کیسے قبول کیا جاسکتا ہے؟

سوم: یہ روایت اہل علم اور محدثین کے نزدیک من گھڑت اور جھوٹ ہے۔ کوئی بھی محدث ایسا نہیں ہے جسے حدیث کے بارے میں علم ہو اور وہ اس روایت کے من گھڑت ہونے کو نہ جانتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اس روایت کو کسی بھی اہل علم نے ایسی کسی کتاب میں روایت نہیں کیا جس کی طرف رجوع کیا جاتا ہو۔ اس لیے کہ ادنی علم رکھنے والا انسان بھی جانتا ہے کہ یہ روایت موضوع اور جھوٹ ہے۔ اس روایت کو ابن جریر اور بغوی نے اپنی اپنی اسناد سے نقل تو کیا ہے' مگر اس کی سند میں

عبدالغفار بن قاسم بن فہد؛ ابومریم الکوفی نامی ایک راوی ہے؛ اسکی روایت کے مردود ہونے پر تمام اہل علم کا اتفاق ہے۔
سماک بن حرب اور ابوداؤد رحمہما اللہ نے اسے جھوٹا کہا ہے۔
امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ناقابل اعتماد انسان ہے۔ عام طور پر اس کی روایات اباطیل پر مشتمل ہوتی ہیں۔
یحی بن معین رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ناقابل ذکر انسان ہے۔
علی المدینی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ اپنی طرف سے احادیث گھڑا کرتا تھا۔
امام نسائی اور ابوحاتم رحمہما اللہ فرماتے ہیں: اس کی حدیث قبول نہیں کی جاتی [متروک الحدیث ہے]۔
ابن حبان البستی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: عبدالغفار بن قاسم اتنی شراب پیا کرتا تھا کہ مست ہوجاتا [یعنی نشہ میں سرشار رہتا تھا]؛ اور اس کے ساتھ ہی احادیث میں اپنی طرف سے تبدیلیاں کیا کرتا تھا۔ اس کی روایات سے استدلال کرنا جائز نہیں۔ اسے امام احمد اور یحی بن معین نے ترک کیا ہے۔"
اس روایت کو ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے بھی نقل کیا ہے۔ اس کی سند میں عبداللہ بن عبدالقدوس ہے۔ یہ راوی بھی ناقابل اعتماد ہے۔
امام یحیی بن معین رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ناقابل اعتماد ہے؛ یہ خبیث انسان رافضی تھا۔
امام نسائی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: کچھ بھی نہیں ہے۔
امام دارقطنی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "ضعیف راوی ہے۔"
ثعلبی کی ذکر کردہ سند اس سے بھی زیادہ ضعیف ہے۔ اس لیے کہ اس سند میں ایسے راوی بھی پائے جاتے ہیں جن کے بارے میں سرے سے کوئی خبر ہی نہیں۔ اور ضعیف راویوں کے علاوہ ایسے راوی بھی ہیں جن پر جھوٹ بولنے کی تہمت ہے۔
[اب غور کیجیے: شیعہ کا یہ قول کس حد تک صحیح ہے کہ "یہ روایت سب لوگوں نے بیان کی ہے" بہ خلاف ازیں یہ موضوع و من گھڑت روایت ہے]۔

چہارم: بنی عبدالمطلب کی تعداد نزول آیت کے وقت چالیس نہ تھی۔ اس لیے کہ یہ آیت بعثت کے ابتدائی ایام میں مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی۔ نیز آپ ﷺ کی زندگی میں بھی وہ [بنوعبدالمطلب] اس تعداد کو نہ پہنچ سکے۔ علماء کرام کا اتفاق ہے کہ بنو عبدالمطلب کی تمام اولاد صرف ان چار حضرات: عباس و ابو طالب و حارث و ابولہب میں سے تھی۔ رسول اللہ ﷺ کے چچاؤں میں سے نبوت کا زمانہ صرف چار نے پایا۔ عباس؛ حمزہ؛ ابو طالب؛ ابولہب۔ ان میں سے دو ایمان لائے یعنی حضرت عباس اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہما؛ اور دو اس نعمت سے محروم رہے۔ ان میں سے ایک ابو طالب؛ جس نے رسول اللہ ﷺ کی مدد و نصرت کی۔ جب کہ دوسرے نے آپ سے دشمنی کی؛ اور آپ کے خلاف دشمنوں کی مدد کرتا رہا؛ یعنی ابولہب۔

آپ کے چچا اور چچازادوں کی تفصیل کچھ اس طرح سے ہے:
ابوطالب کے چار بیٹے تھے۔ علی، جعفر، عقیل، طالب۔ آخرالذکر نے اسلام کا زمانہ نہیں پایا تھا۔ جب کہ حضرت علی اور حضرت جعفر رضی اللہ عنہما نے شروع کے ایام میں ہی اسلام قبول کرلیا تھا۔ اور جعفر رضی اللہ عنہ نے حبشہ کی طرف ہجرت بھی کی تھی؛ جہاں سے آپ غزوہ خیبر کے موقع پر واپس تشریف لائے۔ جب کہ عقیل باقی بنی ہاشم کے ہجرت کر جانے کے بعد ان کے مال و اسباب

پر قابض ہو گئے تھے۔ان کا انتظام وانصرام اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب حجۃ الوداع کے موقع پر آپ ﷺ سے کہا گیا کہ کیا کل آپ اپنے گھر تشریف لے جائیں گے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا:

''کیا عقیل نے ہمارے لیے [کوئی] گھر چھوڑا بھی ہے؟''❶

جب کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے سبھی بچے ابھی شیر خوار تھے [یا پیدا ہی نہیں ہوئے تھے]۔اس لیے اس وقت میں مکہ مکرمہ میں ان میں سے کوئی ایک بھی نہیں تھا۔اور اگر مان لیجیے کہ یہ لوگ موجود بھی تھے تو تب بھی یہ حضرات عبداللہ؛ عبیداللہ اور فضل تھے۔اس لیے کہ قُثم بن عباس کی پیدائش بعد میں ہوئی ہے۔ان بھائیوں میں سب سے بڑے حضرت فضل رضی اللہ عنہ ہیں ۔اور ان ہی کے نام پر حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی کنیت بھی رکھی گئی تھی۔جب کہ عبداللہ کی پیدائش شعب ابی طالب میں اس آیت کے نزول کے بعد ہوئی ہے: ﴿وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ﴾ ''اور اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈرائیے۔''

ہجرت کے وقت ان کی عمر بمشکل تین یا چار سال تھی۔ نبی کریم ﷺ کی حیات مبارک میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے ہاں صرف فضل؛ عبداللہ اور عبیداللہ پیدا ہوئے تھے۔ باقی ساری نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد پیدا ہوئی ہے۔

جب کہ حارث اور ابولہب کے بیٹوں کی تعداد کم تھی۔ حارث کے دو بیٹے تھے: ابوسفیان، ربیعہ۔ان دونوں نے بہت بعد میں اسلام قبول کیا۔ان کا شمار فتح مکہ کے موقع پر اسلام قبول کرنے والوں میں ہوتا ہے۔

ایسے ہی ابولہب کے بیٹوں نے بھی فتح مکہ کے موقع پر اسلام قبول کیا تھا۔ابولہب کے بھی تین بیٹے تھے۔ان میں سے دو نے اسلام قبول کیا تھا؛ عتبہ اور مغیث نے۔جب کہ عتیبہ پر رسول اللہ ﷺ نے بددعا کی تھی کہ اسے کتا کھا جائے۔تو اسے بلادِ شام میں ''زرقاء'' کے علاقہ میں ایک درندے نے پھاڑ ڈالا تھا۔

یہ تمام بنوعبدالمطلب کی تفصیل ہے جو کہ اس اس وقت میں بیس سے کچھ زیادہ تھے۔تو پھر چالیس کیسے ہو گئے؟

پنجم: شیعہ کا یہ قول کہ ''[بنو ہاشم بڑے پیٹو تھے]ان میں سے ایک آدمی پورا بکرا کھا جاتا اور لسی کا پورا مشکیزہ پی جاتا۔'' یہ ان لوگوں پر صاف جھوٹ ہے۔ بنو ہاشم بسیار خوری کے مرض کا شکار نہ تھے بلکہ ان میں ایک آدمی بھی ایسا نہ تھا جو پورا بکرا کھالیتا ہو اور ایک مشکیزہ [دودھ یا لسی] پی لیتا ہو۔

ششم :[اس روایت کے الفاظ رکیک ہیں، جن کی بنا پر دل اس کے باطل ہونے کی شہادت دیتا ہے]۔اس میں مذکور ہے کہ آپ نے پوری جماعت [چالیس آدمیوں] کو یہ پیش کش کی تھی کہ جو کوئی میری اس دعوت کو قبول کرے گا اور اس کی دعوت وتبلیغ میں میری مدد کرے گا وہ میرا بھائی اور میرا وزیر؛ میرا وصی اور میرے بعد میرا خلیفہ ہوگا۔'' [فرض کیجیے کہ اگر وہ سب آدمی اس دعوت کو قبول کر لیتے تو ان میں سے خلیفہ کون قرار پاتا؟]

یہ روایت نبی کریم ﷺ پر محض ایک جھوٹ باندھا گیا ہے۔ایسی روایات کو نبی کریم ﷺ کی طرف منسوب کرنا کسی طرح بھی جائز نہیں۔اور نہ ہی صرف کلمہ طیبہ کا اقرار کرنے اور مددگار بننے سے کوئی خلیفہ بننے کا مستحق ہو جاتا ہے۔اس لیے کہ

---

❶ البخاری ۲/ ۱٤۷؛ مسلم ۲/ ۹۸٤۔

تمام وہ لوگ جنہوں نے اسلام قبول کیا انہوں نے اس کلمہ کا اقرار کیا اور پھر اس کی اشاعت و تبلیغ کی خاطر قربانیاں دیں۔ اور اس کی خاطر اپنی جانوں اور اموال کا نذرانہ پیش کیا۔ اپنا گھر بار چھوڑا؛ اپنے سگے بھائیوں [اور رشتہ داروں] سے دشمنی مول لی؛ اور جدائی و ہجر کے صدموں پر صبر کیا۔ غلبہ و عزت کے بعد اس کلمہ کی خاطر ذلت برداشت کی۔ مالدار ہونے کے باوجود تنگ دستی اور غربت کو برداشت کیا۔ وسعتوں کے بعد تنگی و پریشانی کو قبول کیا۔ اس بارے میں ان حضرات کرام کے واقعات بڑے ہی مشہور و معروف ہیں۔ مگر اس کے باوجود ان میں سے کوئی آپ کا خلیفہ بننے کا دعویدار نہ ہوا۔

نیز یہ بھی ہے کہ فرض کیجیے: اگر وہ سب آدمی یا ان کی ایک بڑی اکثریت اس دعوت کو قبول کر لیتے تو ان میں سے خلیفہ کون قرار پاتا؟ کیا بغیر کسی سبب [و موجب] کے کسی ایک کو خلیفہ مقرر کیا جا سکتا تھا؟ ۔ یا پھر ان تمام کو ایک ہی وقت میں خلفاء مقرر کر دیا جاتا؟ اس لیے کہ وصیت و خلافت اور بھائی چارگی اور مدد تو ایک انتہائی آسان کام کے ساتھ مشروط کی گئی ہے یعنی شہادتین کا اقرار کرنا؛ اور اس کلمہ کی بنیاد پر نصرت و تعاون کرنا۔

کوئی بھی مؤمن ایسا نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ پر؛ اس کے رسول پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو؛ مگر اس کا اس کلمہ طیبہ میں وافر حصہ موجود ہوتا ہے؛ اور جس کے لیے کلمہ طیبہ میں کوئی حصہ نہیں وہ منافق ہے۔ [جب معاملہ ایسے ہی ہے] تو پھر اس قسم کے کلام کو نبی کریم ﷺ کی طرف کیوں کر منسوب کیا جا سکتا ہے؟

ھفتم: حضرت حمزۃ؛ عبیدۃ بن حارث اور جعفر رضی اللہ عنہم اجمعین نے بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرح اسلام قبول کیا تھا؛ انہوں نے شہادتین کا اقرار کیا اور اس کلمہ طیبہ کی نشر و اشاعت میں معاون و مددگار رہے۔ ان کا شمار بھی ان سابقین اولین میں ہوتا ہے جو شروع شروع میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لائے۔ بلکہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اس وقت اسلام لائے جب اہل ایمان کی تعداد چالیس کو بھی نہیں پہنچ پائی تھی۔ اس وقت نبی کریم ﷺ دار ارقم بن ارقم میں بیٹھا کرتے تھے۔ اور وہیں پر اپنے صحابہ کرام کے ساتھ جمع ہوتے۔ نبی کریم ﷺ اور سارے بنو عبد المطلب ایک ہی گھر میں جمع نہیں ہوا کرتے تھے۔ اس لیے کہ ابولہب نبی کریم ﷺ سے بہت زیادہ دشمنی کیا کرتا تھا۔ جب شعب ابی طالب میں بنو ہاشم کا محاصرہ کیا گیا تو ابولہب ان لوگوں کے ساتھ اس گھاٹی میں داخل نہیں ہوا تھا۔

ھشتم: یہ کہ بخاری و مسلم میں اس آیت کی شان نزول کچھ اور بیان ہوئی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے جو حدیث مروی ہے اس سے اس کی تردید ہوتی ہے، فرماتے ہیں:

''جب آیت کریمہ ﴿وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ﴾ نازل ہوئی تو نبی کریم ﷺ نے قریش کو جمع کر کے ان سے اجتماعی اور انفرادی طور پر بات چیت کی۔ آپ نے فرمایا:

''اے بنی کعب بن لوئی! اپنی جانیں دوزخ سے بچالو۔

اے بنو مرہ بن کعب! اپنی جانیں دوزخ سے بچالو۔

اے بنی عبد شمس! اپنی جانیں دوزخ سے بچالو۔

اے بنو عبد مناف! اپنی جانیں دوزخ سے بچالو۔

اے بنو ہاشم! اپنی جانیں دوزخ سے بچاؤ۔

اے بنی عبدالمطلب! اپنی جان دوزخ سے بچالو۔

اے فاطمہ بنت محمد! اپنی جان دوزخ سے بچالے۔ میں تم سے عذاب الٰہی کو روک نہیں سکوں گا تاہم قرابت داری کا حق ادا کرتا رہوں گا۔ ❶

بخاری و مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب زیر تبصرہ آیت نازل ہوئی تو آپ نے فرمایا:

''اے گروہ قریش! اپنے آپ کو عذاب الٰہی سے بچالو میں تمہاری کچھ مدد نہیں کر سکوں گا۔ اے بنی عبدالمطلب! میں تمہاری کچھ مدد نہیں کر سکوں گا۔ اے میری پھوپھی صفیہ! میں تمہاری کچھ مدد نہیں کر سکوں گا۔ اور اے میری بیٹی فاطمہ! تم میرا مال جتنا چاہو لے لو، میں تمھیں عذاب الٰہی سے نہیں چھڑا سکوں گا۔'' ❷

امام مسلم نے یہ روایت قبیصہ بن مخارق و زہیر و عائشہ سے نقل کی ہے۔ اس میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کوہ صفا پر کھڑے ہو کر یہ الفاظ ارشاد فرمائے تھے۔'' ❸

فصل:

[امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی دوسری حدیث]

[**اشکال**]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ''امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اثبات میں دوسری حدیث یہ ہے کہ جب آیت کریمہ ﴿ یٰاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ ﴾ (المائدۃ:٦٧)

''اے رسول جو کچھ آپ پر آپ کے رب کی طرف سے نازل ہوا ہے' اسے آگے پہنچا دیجیے۔'' نازل ہوئی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غدیر خم کے مقام پر خطبہ دیتے ہوئے مجمع عام میں اعلان فرمایا: ''اے لوگو! کیا میں تمھیں تمہاری جانوں کی نسبت زیادہ قریب نہیں؟ انھوں نے کہا: کیوں نہیں [ضرور آپ ہمیں اپنی جانوں سے بھی زیادہ محبوب ہیں] آپ نے فرمایا ''جس کا میں مولیٰ ہوں علی بھی اس کے مولیٰ ہیں۔ اے اللہ! جو علی سے دوستی رکھے، اس سے دوستی رکھ اور جو علی سے عداوت رکھتا ہو اس سے عداوت رکھ، جو اس کی مدد کرے تو بھی اس کی مدد کر اور جو اسے تنہا چھوڑ دے تو بھی اسے تنہا چھوڑ دے۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''بڑی خوشی کی بات ہے آپ (حضرت علی) میرے اور سب مومن مردوں اور عورتوں کے مولیٰ ہیں۔''

سابقہ تقریر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پر مولیٰ سے مراد تصرف میں اولویت [یعنی اولیت] رکھنے والا ہے۔ کیونکہ اس سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے پوچھا تھا: کیا میں تمھیں تمہاری جانوں کی نسبت زیادہ قریب نہیں؟''

---

❶ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، سورۃ الشعراء، (حدیث:٤٧٧١)، صحیح مسلم، کتاب الایمان۔ باب فی قوله تعالی ﴿ وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَكَ الْاَقْرَبِیْنَ ﴾ (حدیث:٢٠٤)، واللفظ له ❷ البخاری، کتاب الوصایا، باب هل یدخل النساء والولد فی الاقارب (ح: ٢٧٥٣)، مسلم، حواله سابق(ح:٢٠٦)۔ ❸ [مسلم، حواله سابق(ح:٢٠٥)۔

جواب: ہم قبل ازیں اس کا جواب دے چکے ہیں؛ اور یہ واضح کر چکے ہیں کہ یہ روایت محض جھوٹ ہے۔اس لئے کہ یہ آیت کریمہ ﴿بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ﴾ حجۃ الوداع سے بہت عرصہ پہلے نازل ہوئی ہے۔جب کہ غدیرخم کا واقعہ حجۃ الوداع سے واپس آتے ہوئے ۱۸ ذوالحجہ کو پیش آیا۔اس کے بعد نبی کریم ﷺ تقریباً اڑھائی ماہ کا عرصہ حیات رہے۔اور یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ سورت مائدہ کی آخر میں نازل ہونے والی آیت: ﴿اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ ﴾ ہے۔یہ آیت نو ذوالحجہ کو عرفات کے موقع پر نازل ہوئی۔اس وقت نبی کریم ﷺ میدان عرفات میں وقوف کئے ہوئے تھے۔جیسا کہ صحاح اور سنن میں یہ روایت ثابت ہے۔اور تمام اہل علم مفسرین و محدثین کا اس پر اتفاق ہے۔

غدیرخم کا واقعہ اس آیت کے نزول کے نو دن بعد مدینہ واپس جاتے ہوئے راستہ میں پیش آیا۔تو پھر کیسے یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ آیت اس مذکورہ بالا آیت ﴿بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ﴾ اس کے بعد نازل ہوئی؟ اہل علم کا اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ یہ آیت [اس آیت ﴿ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ .... ﴾] سے پہلے نازل ہوئی ہے۔بلکہ یہ مدینہ طیبہ میں شروع شروع کے ایام میں نازل ہونے والی آیات میں سے ایک ہے۔اس لیے کہ یہ سورت مائدہ کی آیت ہے جس میں شراب کے حرام ہونے کا بھی حکم ہے۔اور شراب کی حرمت غزوہ احد کے بعد ہوئی ہے۔ایسے ہی اس سورت میں اہل کتاب کے مابین حکم اور فیصلہ کرنے کا بیان ہے۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿فَاِنْ جَآءُ وْکَ فَاحْکُمْ بَیْنَھُمْ اَوْ اَعْرِضْ عَنْھُمْ﴾

''اگر وہ آپ کے پاس حاضر ہوں تو ان کے مابین فیصلہ کیجیے؛ یا پھر ان سے منہ موڑ لیجیے۔'' [المائدۃ ۴۲]

یہ آیت یا تو اس وقت نازل ہوئی جب دو یہودیوں کو [زنا کے جرم میں] رجم کیا گیا تھا؛ یا پھر بنوقریظہ اور بنونضیر میں خون کے جھگڑے کے بارے میں نازل ہوئی۔

یہودیوں کے رجم کا واقعہ مدینہ طیبہ کے شروع شروع کے ایام میں پیش آیا۔ایسے ہی بنی نضیر اور بنوقریظہ کا واقعہ بھی شروع ایام مدینہ کا ہے۔اس لیے کہ بنونضیر کو غزوہ خندق سے قبل جلا وطن کر دیا گیا تھا؛ اور بنوقریظہ کو غزوہ خندق کے بعد قتل کر دیا گیا۔اور اس بات پر تمام اہل علم کا اتفاق ہے کہ غزوہ خندق کا واقعہ صلح حدیبیہ اور غزوہ خیبر سے پہلے پیش آیا تھا۔یہ تمام تر واقعات فتح مکہ اور غزوہ حنین سے پہلے کے ہیں۔اور غزوہ حنین اور فتح مکہ حجۃ الوداع سے پہلے ہے؛ اور حجۃ الوداع غدیرخم سے پہلے ہے۔پس اب جو کوئی انسان کہے کہ سورت مائدہ کی کوئی آیت غدیرخم کے بارے میں نازل ہوئی ہے' تو ایسا انسان باتفاق اہل علم جھوٹا اور دروغ گو ہے۔

ایسے ہی اس آیت کے سیاق میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:[1]

﴿یٰٓاَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ وَ اللّٰهُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ﴾ [المائدۃ ۶۷]

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب زیادۃ الایمان ونقصانه (حدیث:۴۵)، صحیح مسلم، کتاب التفسیر، باب فی تفسیر آیات متفرقة، (حدیث:۳۰۱۷)۔

''اے رسول! پہنچا دیجیے جو کچھ آپ کی طرف آپ کے رب کی جانب سے نازل کیا گیا ہے اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو آپ نے اس کا پیغام نہیں پہنچایا اور اللہ آپ کو لوگوں سے بچائے گا۔''

اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو تبلیغ رسالت پر لوگوں کے شر سے محفوظ رکھنے کی ضمانت دی ہے؛ تا کہ آپ دشمنوں کے خطرات سے پر امن ہوکر اپنا فریضہ سرانجام دے سکیں۔

روایات میں آیا ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے سے قبل رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کی جاتی تھی۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو محافظین ہٹا لیے گئے۔[الترمذی ٤/ ٣١٧]

یہ واقعہ یقینی طور پر فریضہ تبلیغ کے مکمل ہونے سے پہلے کا ہے۔ حجۃ الوداع کے موقع پر تبلیغ کا فریضہ مکمل ہوگیا تھا۔

حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے یہ اعلان فرمایا تھا:

''اے لوگو! کیا میں نے تم تک اللہ تعالیٰ کا دین پہنچا دیا؟ کیا میں نے رسالت کا حق ادا کر دیا؟ تو سب لوگوں نے یک زبان ہوکر کہا: ہاں۔ پھر آپ نے فرمایا: اے اللہ! اس پر گواہ رہنا۔ اور لوگوں سے مخاطب ہوکر فرمایا:

''اے لوگو! میں تم میں دو چیزیں چھوڑ کر جارہا ہوں؛ اگر تم ان دونوں کو مضبوطی سے پکڑے رہو گے تو کبھی گمراہ نہیں ہو گے۔ ان میں سے ایک چیز ہے' اللہ تعالیٰ کی کتاب۔ اے لوگو! تم سے میرے بارے میں سوال کیا جائے گا پس تم اس کا کیا جواب دو گے؟ لوگوں نے عرض کیا: ''ہم گواہی دیں گے کہ آپ نے اللہ کا پیغام پہنچا دیا' اور اس کی امانت ادا کر دی اور امت کی خیر خواہی کا حق ادا کر دیا۔'' پس رسول اللہ ﷺ اپنی انگشت شہادت کو کبھی آسمان کی طرف اٹھاتے اور پھر کبھی زمین کی طرف موڑ لیتے اور فرماتے: ''اے اللہ گواہ رہنا؛ اے اللہ گواہ رہنا۔''

یہ الفاظ صحیح مسلم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت سے منقول ہیں۔[مسلم ٢/ ٨٩٠]

نیز آپ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ: ''پس چاہیے کہ حاضرین غائبین تک یہ پیغام پہنچائیں۔ پس بہت سارے وہ لوگ جن تک پیغام پہنچایا جاتا ہے وہ سننے والے سے زیادہ یاد کرنے والے ہوتے ہیں۔''[البخاری ٢/ ١٧٦]

پس اس سے ظاہر ہوا کہ جس عصمت و حفاظت کی ضمانت آیت کریمہ میں ہے' وہ اس دعوت و تبلیغ کے وقت موجود تھی۔ تو پھر ایسا نہیں ہوسکتا کہ یہ آیت حجۃ الوداع کے بعد نازل ہوئی ہو۔ اس لیے کہ آپ ﷺ نے اس سے پہلے اپنی تبلیغ کو مکمل کر دیا تھا۔ اور اس لیے بھی کہ حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کو کسی بشر کی جانب سے کسی طرح کا خوف و اندیشہ باقی نہیں رہا تھا جس کی وجہ سے آپ کو عصمت و حفاظت کی ضرورت ہو۔ بلکہ فتح مکہ کے بعد اہل مکہ؛ اہل مدینہ اور ان کے اردگرد کے لوگ اور [باقی گروہ] مسلمان ہوکر آپ کی اطاعت میں داخل ہو چکے تھے؛ ان میں کوئی ایک بھی کافر باقی نہیں بچا تھا۔ منافق انتہائی ذلت و رسوائی کا شکار اور اپنے نفاق کو چھپائے ہوئے تھے [انہیں کھل کر بات کرنے کی بھی ہمت نہیں ہوتی تھی]۔ ان میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں تھا جس میں جنگ و جدال اور مقابلہ کی ہمت باقی ہو۔ اور نہ ہی ان میں سے کسی ایک سے رسول اللہ ﷺ کو کسی قسم کا کوئی خوف و اندیشہ باقی تھا۔ تو اس حالت میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ:

﴿يَآيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَ اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ وَ اللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ

النَّاسِ﴾ [المائدة ٦٧]

''اے رسول! پہنچا دیجیے جو کچھ آپ کی طرف آپ کے رب کی جانب سے نازل کیا گیا ہے اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو آپ نے اس کا پیغام نہیں پہنچایا اور اللہ آپ کو لوگوں سے بچائے گا۔''

اس سے یہ بات تو ثابت ہوگئی کہ جو کچھ یوم غدیر خم کے موقع پر پیش آیا وہ ان امور میں سے نہیں تھا جن کی تبلیغ کا آپ ﷺ کو حکم دیا گیا ہو۔ جیسا کہ آپ نے حجۃ الوداع کے موقع پر تبلیغ کو پایہ تکمیل تک پہنچایا تھا۔ اس لیے کہ جن لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ حج کیا تھا ان کی ایک بڑی تعداد بلکہ اکثریت رسول اللہ ﷺ کے ساتھ واپس مدینہ نہیں پلٹی۔ بلکہ اہل مکہ مکہ میں ہی رہ گئے؛ اہل طائف طائف واپس چلے گئے؛ اہل یمن یمن چلے گئے؛ قریب کے دیہاتوں کے لوگ اپنے دیہاتوں کو واپس پلٹ گئے۔ آپ کے ساتھ وہی لوگ پلٹے جن کا تعلق مدینہ سے تھا یا پھر مدینہ کے قرب و جوار کے دیہاتوں کے رہنے والے تھے۔

اگر واقعی ایسے ہی ہوتا کہ جو کچھ غدیر خم کے موقع پر پیش آیا؛ رسول اللہ ﷺ اس کی تبلیغ کے لیے مامور تھے؛ جیسا کہ آپ نے حجۃ الوداع کے موقع پر دعوت و تبلیغ کا فریضہ سرانجام دیا؛ تو آپ اس انمول موقعہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان امور کی تبلیغ بھی ضرور کرتے جیسے دوسرے امور کی تبلیغ کی تھی۔ جب آپ نے حجۃ الوداع کے موقع پر امامت یا اس سے متعلقہ امور کا سرے سے ذکر تک ہی نہیں کیا؛ اور نہ ہی کسی ایک عالم نے کسی صحیح یا ضعیف سند سے حجۃ الوداع کے موقع پر امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ذکر کے بارے میں کچھ ذکر کیا؛ بلکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے نقل کردہ خطبہ میں بھی امامت کا کہیں بھی کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ حالانکہ یہ وہ عام مجمع تھا جس میں آپ ﷺ کو تبلیغ کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کا معاملہ ان امور میں سے نہیں تھا جن کی تبلیغ کا عام حکم ہو۔ بلکہ اس حوالے سے حدیث موالات اور حدیث ثقلین کی بھی کوئی خاص اہمیت نہیں؛ اس لیے کہ ان میں کہیں بھی امامت کا ذکر نہیں ہے۔

وہ حدیث جسے امام مسلم رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے غدیر خم کے موقع پر خطبہ دیتے ہوئے فرمایا:

''میں تم میں دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں؛ ایک ہے کتاب اللہ۔ پھر آپ نے کتاب اللہ کا ذکر کیا اور اس کی خوب ترغیب دلائی؛ پھر آپ نے فرمایا: ''(دوسری چیز) میرے اہل بیت ہیں، میں تم لوگوں کو اپنے اہل بیت کے بارے میں اللہ یاد دلاتا ہوں، (آپ نے یہ کلمات تین بار ارشاد فرمائے)۔''

یہ روایت امام مسلم رحمہ اللہ کے تفردات میں سے ہے جسے امام بخاری رحمہ اللہ نے روایت نہیں کیا۔ سنن ترمذی کی روایت میں یہ الفاظ بھی زیادہ ہیں: ''یہ دونوں اس وقت تک جدا نہیں ہو سکتے جب یہ میرے پاس حوض پر وارد نہ ہو جائیں۔''[1]

ان الفاظ کی زیادتی پر کئی ایک نقاد و حفاظ محدثین نے طعن و تنقید کی ہے۔ اور انہوں نے یہ فرمایا ہے: ''یہ الفاظ حدیث کے نہیں ہیں۔'' لیکن جو لوگ اس روایت کے صحیح ہونے کا اعتقاد رکھتے ہیں وہ کہتے ہیں: اس سے مراد مجموع اہل بیت ہیں جو کہ تمام بنی ہاشم پر مشتمل ہیں؛ ان تمام لوگوں کا گمراہی پر جمع ہونا محال ہے۔ اہل سنت والجماعت میں سے ایک جماعت کا یہی قول

[1] مسلم ٤/ ١٨٧٣؛ الترمذي ٥/ ٣٢٨۔

ہے۔قاضی ابو یعلی رحمہ اللہ نے بھی اس روایت کا یہی جواب دیا ہے۔

مسلم کی روایت کردہ حدیث میں اگر یہ الفاظ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد بھی فرمائے ہوں؛ تو بھی اس میں صرف کتاب اللہ کی اتباع کی وصیت ہے' تو یہ ایسا معاملہ ہے جس کے بارے میں وصیت میں اس سے پہلے حجۃ الوداع کے موقع پر گزر چکی تھی۔آپ ﷺ نے اپنے اہل بیت کی اتباع کرنے کا حکم نہیں دیا۔لیکن آپ نے یہ ضرور ارشاد فرمایا:

((أُذکِرکم اللہ فِی أھلِ بیتی))۔

''میں تم لوگوں کو اپنے اہل بیت کے بارے میں اللہ یاد دلاتا ہوں۔''

اس یاددھانی کا تقاضا ہے کہ اس سے پہلے اہل بیت کے جو حقوق بیان کئے جا چکے ہیں' انہیں ادا کیا جائے' اور ان پر کسی بھی قسم کا ظلم کرنے سے اجتناب کیا جائے۔اس کا بیان غدیر خم سے پہلے ہو چکا تھا۔

اس سے معلوم ہوا کیا غدیر خم کے موقع پر شریعت کا کوئی نیا حکم نازل نہیں ہوا' نہ ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حق میں اور نہ ہی کسی دوسرے کے حق میں۔نہ ہی آپ کی امامت کے بارے میں اور نہ ہی کسی دوسری چیز کے بارے میں۔

رہ گئی حدیث موالات؛ تو امام ترمذی اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"من کنت مولاہ فھذا علي مولاہ۔"''جس کا میں مولا ہوں علی بھی اس کا مولا ہے۔''[1]

روایت کے یہ زیادہ الفاظ "اللّٰھم! وَالِ مَنْ وَّالَاہُ وَعَادِ مَنْ عَادَاہٗ۔" بلاشبہ جھوٹ ہیں۔اثرم نے سنن میں امام احمد رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ عباس نے امام احمد رحمہ اللہ سے دریافت کیا کہ حسین الاشقر[2] نے دو حدیثیں روایت کی ہیں۔ان میں سے ایک یہ کہ نبی ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

:''آپ کو مجھ سے اظہار بیزاری کرنے پر مجبور کیا جائے گا،مگر آپ مجھ سے بیزار نہ ہونا۔''

اور دوسری مذکورہ صدر روایت:"اللّٰھم! وَالِ مَنْ وَّالَاہُ وَعَادِ مَنْ عَادَاہٗ۔"یہ سن کر امام احمد رحمہ اللہ نے ان حدیثوں کو تسلیم نہ کیا اور فرمایا کہ:''ان دونوں روایات کے جھوٹ ہونے میں کوئی شک نہیں۔''

ایسے ہی یہ روایت کہ نبی ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا:" أنت أولی بکل مؤمن و مؤمنة۔"''آپ ہر مؤمن مرد اور مؤمن عورت کے لیے اس کی جان سے بھی زیادہ محبوب ہیں۔''محض جھوٹی روایت ہے۔

رہ گئی یہ حدیث کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" من کنت مولاہ فھذا علي مولاہ۔"''جس کا میں مولا ہوں علی بھی اس کا مولا ہے۔''

یہ روایت صحاح میں سے نہیں۔لیکن یہ ان روایات میں سے ہے جو بعض علماء نے نقل کی ہے؛ مگر اس کے صحیح ہونے میں اختلاف ہے۔امام بخاری اور امام ابراہیم الحربی اور دوسرے اہل علم محدثین رحمہم اللہ سے نقل کیا گیا ہے کہ انہوں نے اس روایت پر تنقید کی ہے' اور اسے ضعیف قرار دیا ہے۔اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے نقل کیا گیا ہے کہ آپ اس حدیث کو حسن کا

[1] سنن الترمذي ٥/ ٢٩٧۔ والمسند ١٤/ ٢١٤۔ اور دوسرے مقامات پر۔

[2] اس کا نام حسین بن حسن اشقر کوفی ہے اس کا ترجمہ میزان الاعتدال (۱/۲۴۹) پر مذکور ہے بخاری فرماتے ہیں:''فیہ نظر'' ابو زرعہ کہتے ہیں یہ منکر الحدیث ہے،ابو حاتم کہتے ہیں یہ ضعیف راوی ہے جوزجانی فرماتے ہیں یہ صحابہ کو گالیاں دیا کرتا تھا۔یہ ۲۰۸ھ میں فوت ہوا۔"

درجہ دیتے ہیں۔ جیسا کہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے بھی اسے حسن کہا ہے۔ ابو العباس بن عقدہ نے اس حدیث کی اسناد پر ایک کتاب بھی لکھی ہے۔

امام ابن حزم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: فضائل حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں مندرجہ ذیل حدیثیں صحیح ہیں:

۱۔ آپ کو مجھ سے وہی نسبت ہے جو کہ حضرت ہارون کو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہے بس یہ کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں۔❶

۲۔ غزوۂ خیبر کے موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ کل میں ایک شخص کو جھنڈا دوں گا جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرتا ہوگا' اور جس سے اللہ اور اس کا رسول محبت کرتے ہوں گے۔''❷

اور یہ صفت جو کہ ہر مؤمن اور مسلمان کے لیے واجب اور باعث فضیلت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عہد ہے کہ:

۳۔ ''صرف مومن حضرت علی رضی اللہ عنہ سے محبت کریں گے اور صرف منافق آپ سے بغض رکھیں گے۔''❸

آخر الذکر حدیث انصار مدینہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے بارے میں بھی وارد ہوئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

''اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھنے والا کوئی بھی انسان انصار سے بغض نہیں رکھے گا۔''❀

باقی رہی حدیث کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:" من كنت مولاه فهذا علي مولاه ۔" ''جس کا میں مولا ہوں علی بھی اس کا مولا ہے۔'' تو یہ صحیح نہیں ہے؛ اس کی کوئی بھی سند ثقہ راویوں پر مشتمل نہیں۔ اس کے علاوہ روافض جو احادیث حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضائل و مناقب کے بارے میں بیان کرتے ہیں وہ سب موضوع ہیں، جیسا کہ علم حدیث سے معمولی واقفیت رکھنے والا شخص بھی جانتا ہے۔

اگر سوال کیا جائے کہ محدث ابن حزم رحمہ اللہ نے مذکورہ صدر قول میں حدیث ''اَنْتَ مِنِّی وَ اَنَا مِنْكَ'' نیز ''حدیث مباہلہ'' اور حدیث ''الکساء'' ذکر نہیں کیں؛ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ابن حزم رحمہ اللہ کے نزدیک یہ احادیث بھی ضعیف ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ابن حزم رحمہ اللہ نے احادیث صحیحہ سے وہ حدیثیں مراد لی ہیں جن میں صرف علی رضی اللہ عنہ کی مدح وستائش کی گئی ہے اور کسی کا ذکر نہیں کیا گیا۔ جب کہ ان روایات میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علاوہ دوسرے لوگوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ آپ نے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ سے یہ بھی فرمایا تھا کہ: ''تم شکل وصورت میں اور اخلاق میں مجھ سے مشابہت رکھتے ہو۔''

اور حضرت زید رضی اللہ عنہ سے آپ نے فرمایا تھا: ''أنت أخونا و مولانا ۔'' ''آپ ہمارے بھائی اور ہمارے سردار ہیں۔''

جب کہ حدیث مباہلہ اور حدیث کساء میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علاوہ حضرت فاطمہ اور حسنین کریمین رضی اللہ عنہم کا بھی ذکر ہے' اس لیے ابن حزم رحمہ اللہ پر اعتراض وارد نہیں ہوسکتا۔

اس کے علاوہ بھی ہم ایک مرکب جواب دیتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں: ''اگر یہ الفاظ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے [غدیر خم کے مقام پر]

---

❶ البخاری، باب مناقب علی رضی اللہ عنہ (ح:۳۷۰۶)، مسلم، باب من فضائل علی بن ابی طالب (ح ۲٤٠٤)۔

❷ صحیح بخاری، حوالہ سابق، (حدیث:۳۷۰۱)، صحیح مسلم۔حوالہ سابق (حدیث:۲٤٠۹)۔

❸ صحیح مسلم، کتاب الایمان باب الدلیل علی ان حب الانصار وعلی رضی اللہ عنہ (حدیث:۷۸)۔

❀ صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب حب الانصار من الایمان (حدیث:۱۷)، صحیح مسلم، حوالہ سابق (حدیث:۷٤، ۷۵)۔

ارشاد فرمائے بھی تھے؛ تو ان پر کوئی کلام نہیں ہوسکتا؛ اس لیے کہ اس سے تو آپ کی مراد آپ کے بعد امامت و خلافت ہرگز نہ تھی۔ اس لیے کہ ظاہری الفاظ سے یہ مفہوم نہیں نکلتا۔ ایسی اہم بات بڑے واضح انداز میں بیان کرنا چاہیے تھی نہ کہ مجمل و مبہم الفاظ میں۔ اس لیے کہ ان الفاظ میں کہیں بھی کوئی ایسی دلیل نہیں پائی جاتی جس سے مراد خلافت لی جاسکتی ہو۔ [مولیٰ کا لفظ عربی زبان میں وَلی کا مترادف ہے]۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا﴾ (المائدۃ:۵۵)

''بیشک تمہارا دوست اللہ ہے اور اس کا رسول اور وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں۔''

نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿وَإِنْ تَظٰهَرَا عَلَيْهِ فَإِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰهُ وَجِبْرِيْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِيْرٌ﴾

''اور اگر تم اس کے خلاف ایک دوسرے کی مدد کرو تو یقیناً اللہ خود اس کا مددگار ہے اور جبریل اور صالح مومن اور اس کے بعد تمام فرشتے مددگار ہیں۔'' [التحریم ۴]

اس آیت سے مستفاد ہوتا ہے کہ رسول اللہ سب مومنین کے دوست ہیں۔ اور یہ مؤمن آپ ﷺ کے دوست ہیں۔ جیسا کہ اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اہل ایمان کا دوست ہے' اور اہل ایمان اللہ تعالیٰ کے دوست ہیں۔ اور اہل ایمان آپس میں بھی ایک دوسرے کے دوست ہیں۔

موالات (دوستی لگانا) معادات (دشمن رکھنا) کی ضد ہے۔ یہ جانبین سے استوار کی جاتی ہے۔ ضروری نہیں کہ دوستی لگانے والے دونوں فریق مرتبہ و مقام کے لحاظ سے برابر ہوں۔ بلکہ اس بات کا بھی امکان ہے کہ ایک فریق عالی منصب ہو اور اس کا دوسرے سے دوستی لگانا اس کے فضل و احسان پر مبنی ہو۔ اس کے مقابلہ میں ایک فریق فروتر درجہ رکھتا ہو اور اس کا فریق اعلیٰ سے دوستی لگانا اطاعت و عبادت کا درجہ رکھتا ہو۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ اہل ایمان سے محبت رکھتا ہے' اور اہل ایمان اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہیں۔ تو ثابت ہوا کہ موالات کا معنی دوستی لگانا ہے جو کہ دشمنی کرنے' دھوکہ بازی کرنے اور لڑنے جھگڑنے کی ضد ہے۔ کفار اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت نہیں رکھتے۔ بلکہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کرتے ہیں' اور ان کے ساتھ دشمنی کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ﴾ [الممتحنۃ ۱]

''میرے اور اپنے دشمن کو اپنا دوست مت بناؤ۔''

اللہ تعالیٰ ایسا کرنے پر بدلہ سے نوازتے ہیں۔ جیسا کہ دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا:

﴿فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَأْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ [البقرۃ ۲۷۹]

''اگر تم ایسا نہ کرو تو پھر تم اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے جنگ کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔''

بیشک اللہ تعالیٰ اہل ایمان کا دوست ہے' اور وہ انہیں کفر و گمراہی کے اندھیروں سے اسلام کی روشنی کی طرف نکالتا ہے۔

بنابریں اللہ و رسول ﷺ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مولیٰ ہونے کے یہ معنی ہیں کہ یہ سب مومنوں سے دوستی رکھتے ہیں،

گویا مولی کا لفظ اندریں صورت موالات سے ہوگا جو معادات کی ضد ہے۔مومن جو اللہ و رسول کے ساتھ موالات قائم کرتے ہیں، وہ بھی معادات کی ضد ہے۔ دوستی لگانے کا یہ حکم سب مومنوں کے لیے ہے۔ بلا شبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ایک بلند پایہ مومن ہیں اور وہ باقی مومنوں سے دوستی رکھتے ہیں۔[اور اہل ایمان ان سے دوستی رکھتے ہیں]۔

اس حدیث میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے باطنی ایمان کا اثبات و اقرار ہے۔اور اس بات کی گواہی موجود ہے کہ آپ ظاہری و باطنی طور پر دوستی کے مستحق ہیں۔ بنا بریں اس حدیث میں آپ رضی اللہ عنہ کے دشمنان خوارج و نواصب کی تردید پائی جاتی ہے۔ حدیث میں یہ کہیں مذکور نہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سوا کوئی دوسرا مومنوں کا کوئی دوست ہی نہیں۔اور ایسا کیسے ہوسکتا ہے جب کہ رسول اللہ ﷺ کے بہت سارے دوست ہیں۔ جن میں نیک و کار اہل ایمان شامل ہیں۔ ان میں حضرت علی رضی اللہ عنہ بدرجہ اولی شامل ہیں۔اور تمام اہل ایمان آپ سے محبت رکھتے ہیں۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''قبیلہ مسلم وغفار و جہینہ و مزنیہ اور قریش و انصار یہ سب میرے دوست ہیں۔ اللہ و رسول کے سوا ان کا کوئی دوست نہیں۔''[1]

فی الجملہ ولی؛ مولی اور والی کے مابین فرق پایا جاتا ہے۔ پس وہ ولایت جس کا معنی دوستی کا ہے[اور جس کا الٹ دشمنی ہوتی ہے] وہ ایک علیحدہ چیز ہوتی ہے؛ جب کہ وہ ولایت جس کا معنی حکومت و امارت ہے وہ ایک علیحدہ چیز ہے۔

اس حدیث میں وارد ولایت پہلے معنی یعنی دوستی کے مفہوم میں ہے؛ دوسرا معنی مراد نہیں۔ اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ نہیں ارشاد فرمایا کہ:'' من كنت واليه فعلي واليه ۔''جس کا میں والی ہوں علی بھی اس کا والی ہے۔'' رسول اللہ اکرم ﷺ کے فرمان مبارک:: '' من كنت مولاه فهذا علي مولاه ۔''جس کا میں مولا ہوں علی بھی اس کا مولا ہے'' سے یہی مراد ہے۔ اس مولی سے والی مراد لینا باطل ہے۔ اس لیے کہ ولایت دونوں اطراف سے ثابت ہوتی ہے؛ جیسے کہ مومنین اللہ تعالیٰ کے ولی اور اس کے دوست ہیں' اور اللہ تعالیٰ ان کا ولی اور دوست ہے۔

رہا مسئلہ اپنے نفوس سے بڑھ کر عزیز ہونا تو یہ صرف رسول اللہ ﷺ کے لیے ثابت ہے۔ اور آپ ﷺ کا ہر اہل ایمان کے لیے اس کی جان و مال سے بڑھ کر محبوب ہونا یہ نبوت کے خصائص میں سے ہے۔ اگر یہ ثابت ہوجائے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے بعد کسی کو بذریعہ نص خلیفہ متعین کیا تھا؛ تو اس سے بھی یہ لازم نہیں آتا کہ خلیفہ اہل ایمان کو ان کی جانوں سے بڑھ کر محبوب ہو۔ یہ بات کسی ایک نے بھی نہیں کہی۔ اور نہ ہی کسی ایک سے منقول ہے۔ اور اس کا معنی بھی یقینی طور پر باطل ہے۔ اس لیے کہ نبی کریم ﷺ کا اہل ایمان کے لیے ان کی جانوں سے بڑھ کر محبوب ہونا آپ ﷺ کی زندگی میں اور موت کے بعد بھی ثابت ہے۔ اور اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو پھر بھی یہ نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد کی بات ہے۔ آپ کی زندگی میں ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کیلئے جائز نہیں تھا کہ آپ ﷺ کی حیات مبارک میں خلیفہ بنتے۔ تو اس وقت آپ ہر مؤمن کے لیے اس کی جان و مال سے بڑھ کر محبوب و مقدم نہیں تھے۔ اور اگر مولی

---

[1] صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب مناقب قریش(حدیث:٣٥٠٤)، صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل غفار و اسلم......''(حدیث: ٢٥٢٠)۔

کے لفظ سے مراد خلافت لی جائے تو اس وقت آپ کسی ایک مؤمن پر بھی خلیفہ نہیں تھے۔

اس سے ظاہر ہوگیا کہ ان الفاظ سے خلافت مراد نہیں ہے۔ اپنی جانوں سے بڑھ کر محبوب ہونا ایسا وصف ہے جو کہ رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں ہی ثابت ہے؛ جس کے لیے موت کے بعد تک کا کوئی انتظار نہیں کیا گیا۔ جب کہ خلافت کا معاملہ اس سے مختلف ہے ؛ نبی کریم ﷺ کی وفات تک کوئی بھی خلیفہ نہیں تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ مذکورہ بالا حدیث سے جو معنی شیعہ مراد لیتے ہیں' وہ کہیں بھی ثابت نہیں ہے۔

نبی کریم ﷺ اپنی زندگی میں اور موت کے بعد بھی قیامت تک کے لیے اہل ایمان کے لیے ان کی جان و مال سے بڑھ کر محبوب و قریب ہیں۔ جب آپ کی حیات مبارک میں ہی کوئی انسان بعض امور پر نائب بنایا جائے' یا تسلیم کرلیا جائے کہ کوئی انسان بعض امور میں آپ کی حیات مبارک میں ہی خلیفہ یا نائب بن جائے اور اسے اجماع اور نص کی روشنی میں خلیفہ تسلیم کرلیا جائے۔ تو وہ اس خلافت کا [آپ کے بعد بھی] زیادہ حق دار ہوگا' اور اہل ایمان کے لیے ان کی جانوں سے بھی بڑھ کر مقدم ہوگا' تو پھر کوئی دوسرا انسان اس کو چھوڑ کر اہل ایمان کے لیے ان کی جانوں سے بڑھ کر محبوب نہیں ہوگا۔ خصوصاً آپ کی حیات مبارک میں۔

رہ گیا حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ کرام کا ہر اہل ایمان کا ولی اور دوست ہونا؛ یہ ایسا وصف ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ [یا دیگر صحابہ کرام] کے لیے نبی کریم ﷺ کی حیات مبارک میں بھی ثابت ہے؛ اور وفات کے بعد بھی۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد بھی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ آج بھی ہر مومن کے دوست اور محبوب ہیں' جب کہ آج آپ کسی پر بھی والی یا حاکم نہیں ہیں۔ یہی حال باقی تمام اہل ایمان کا ہے۔ وہ اپنی زندگیوں میں بھی اور موت کے بعد بھی اہل ایمان کے دوست ہیں۔

فصل:

امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تیسری حدیث

[اشکال] : شیعہ مصنف لکھتا ہے: ''امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اثبات میں تیسری حدیث یہ ہے:

" اَنْتَ مِنِّیْ بِمَنْزِلَةِ هَارُوْنَ مِنْ مُوْسٰی اِلَّا اَنَّهٗ لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ۔"

''تم میرے لیے بلحاظ منزلت ایسے ہی ہو جیسے ہارون حضرت موسیٰ کے ساتھ؛ مگر میرے بعد کوئی نبی نہیں۔''

اللہ تعالیٰ نے حضرت ہارون علیہ السلام کو یہ مرتبہ عطا کیا تھا کہ وہ تمام مراتب میں بغیر کسی استثنیٰ کے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قائم مقام تھے۔ اور اگر ان کے بعد زندہ رہتے تو ان کے خلیفہ ہوتے۔ اگر ایسا نہ ہو تو اس سے نقص لازم آتا ہے۔ اور نیز اس لیے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی موجودگی میں اور آپ کی غیوبت کے مختصر سے عرصہ میں آپ کے قائم مقام رہ چکے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کی صورت میں جب آپ کی غیوبت طوالت اختیار کر لیتی تو آپ کا خلیفہ ہونا زیادہ قرین عقل و قیاس تھا۔''

[جواب]: اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ مذکورہ بالا حدیث بخاری و مسلم میں موجود ہے۔ نبی کریم ﷺ نے یہ الفاظ غزوۂ

تبوک کو جاتے وقت ارشاد فرمائے تھے۔ ❶ نبی کریم ﷺ کی عادت تھی کہ جب بھی آپ کسی غزوہ پر یا عمرہ پر یا حج پر مدینہ سے باہر جاتے؛ تو مدینہ میں کسی صحابی کو اپنا نائب مقرر کر دیا کرتے تھے۔ جیسا کہ آپ نے :

۱۔ غزوہ ذی امر پر جاتے ہوئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اپنا نائب مقرر فرمایا۔

۲۔ غزوہ بنی قینقاع میں حضرت بشیر بن عبدالمنذر رضی اللہ عنہ کو اپنا نائب مقرر فرمایا۔

۳۔ جب قریش کے ساتھ غزوہ پیش آیا اور آپ مقام قرع تک پہنچے تو ابن ام مکتوم کو نائب مقرر فرمایا۔ جیسا کہ محمد بن سعد نے ذکر کیا ہے۔

جملہ طور پر یہ بات معلوم شدہ ہے کہ اس وقت تک آپ مدینہ سے باہر تشریف نہیں لے جایا کرتے تھے جب تک کسی کو اپنا نائب مقرر نہ فرما دیتے۔ مسلمان مؤرخین نے ان حضرات کے نام ذکر کیے ہیں جنہیں رسول ﷺ نے نائب مقرر کیا تھا۔ مدینہ طیبہ سے آپ ﷺ نے دو بار عمرہ کا سفر کا کیا۔ ایک بار عمرہ حدیبیہ؛ اور دوسری بار عمرہ قضا۔ اور حجۃ الوداع کا سفر؛ اس کے علاوہ تقریباً بیس سے زیادہ مغازی کے سفر۔ ان میں سے ہر ایک سفر میں رسول اللہ ﷺ نے کسی نہ کسی کو مدینہ طیبہ میں اپنا نائب مقرر کیا تھا۔ اس وقت مدینہ میں بہت سارے لوگ بھی ہوا کرتے تھے جن پر آپ کسی کو اپنا نائب مقرر فرماتے۔ لیکن غزوۂ تبوک کو جاتے وقت کسی کو پیچھے رہنے کی اجازت نہیں دی۔ یہ آپ ﷺ کا آخری غزوہ ہے۔ اور کسی اور غزوہ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی اتنی بڑی جمعیت آپ کے ساتھ شریک سفر نہیں ہوئی جتنی بڑی جمعیت اس غزوہ میں تھی۔ اس غزوہ میں صرف بچے اور خواتین ہی پیچھے رہ گئے تھے؛ یا پھر وہ لوگ تھے جو اپنی معذوری کی وجہ سے غزوہ پر نہیں جا سکے۔ یا پھر منافق۔ تین صحابہ بھی آپ کے ہمراہ نہ جا سکے تھے؛ جن کی توبہ قبول کر لی گئی۔ [فتح مکہ اور حجۃ الوداع کو جاتے وقت بھی آپ نے اپنا نائب مقرر کیا تھا۔ مگر] غزوۂ تبوک کے موقع پر مدینہ میں مسلمانوں کی کوئی جماعت بھی باقی نہیں رہی تھی۔ اس لیے یہ استخلاف اپنی نوعیت میں نرالا تھا؛ اور باقی استخلاف کی طرح نہیں تھا جیسا کہ ہر بار مدینہ سے باہر جاتے ہوئے مقرر فرمایا کرتے تھے۔ بلکہ یہ استخلاف بقیہ استخلافات کی نسبت کمزور تھا۔ اس لیے کہ مدینہ میں ہر بار ایسے لوگ موجود ہوا کرتے تھے جو کہ غزوہ تبوک سے پیچھے رہ جانے والوں کی نسبت بہت افضل ہوا کرتے تھے۔ اس لیے اس سے قبل کا استخلاف ان لوگوں سے افضل لوگوں پر ہوا کرتا تھا جن پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو نائب بنایا گیا تھا۔ اسی لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کی طرف روتے ہوئے آئے اور عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول ﷺ! آپ مجھے بچوں اور عورتوں میں چھوڑ کر جا رہے ہیں؟

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ منافقین نے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر طعن و تنقید کرتے ہوئے یہ خبر اڑائی تھی کہ: ''محمد ﷺ علی رضی اللہ عنہ سے بغض رکھتے ہیں اس لیے ان کو جہاد میں ہمراہ نہیں لے جا رہے۔''

نبی ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بتایا کہ میں نے آپ کو امین سمجھ کر اپنا نائب مقرر کیا ہے؛ بغض کی بنا پر نہیں۔ اس لیے کہ نائب بنائے جانے سے شان میں کوئی کمی نہیں آتی؛ اور نہ ہی اس میں کسی کے لیے کوئی حسد و بغض ہے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت ہارون علیہ السلام کو اپنا نائب بنا رہے ہیں تو پھر یہ فعل نقص کس طرح سے ہو سکتا ہے؟ [جس طرح موسیٰ علیہ السلام نے اپنی

❶ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوة تبوك (حدیث:٤٤١٦)، صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ (حدیث ٢٤٠٤)۔

عدم موجودگی میں حضرت ہارون کو اپنا نائب مقرر کیا تھا۔ اسی طرح میں بھی تمہیں نائب مقرر کررہا ہوں]۔اس طرح نبی ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مطمئن کر دیا۔آپ نے یہ تسلی دی کہ کسی کو نائب بنایا جانا اس کے امین اور صاحب مرتبت ہونے کی دلیل ہے ۔اس میں کسی کی اہانت یا خیانت نہیں ۔اس لیے کہ نائب نبی کریم ﷺ کی عدم موجودگی میں تمام امور پر امین و نگہبان ہوگا؛ چونکہ باقی تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جہاد میں نکل چکے تھے۔

بادشاہوں کی عادت ہوتی ہے کہ جب وہ کسی جنگ کے لیے نکلتے ہیں تو ان لوگوں کو اپنے ساتھ لیتے ہیں جن سے زیادہ مدد حاصل ہوسکتی ہو۔ یا پھر جن کی ہمراہی کا فائدہ زیادہ ہو۔جن کے مشورہ کی ضرورت زیادہ ہو' اور جن کی زبان اور ہاتھ اور تلوار سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل ہوسکتا ہو۔

پس پیچھے رہ جانے والوں کے لیے کسی بڑی سیاست کی ضرورت نہیں تھی۔اس لیے ان ساری باتوں کی چنداں حاجت نہیں تھی۔اس وجہ سے بعض لوگوں نے اسے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں نقص اور کمی شمار کیا؛ اور آپ کو آپ کی منزلت سے کم جانا۔اس لیے کہ ان اہم ترین موقع پر رسول اللہ ﷺ آپ کو اپنے ساتھ لیکر نہیں گئے جن میں سعی و اجتہاد کی بہت زیادہ ضرورت تھی؛ بلکہ آپ کو ان مواقع پر چھوڑ دیا جن پر کسی بڑی سعی و اجتہاد کی ضرورت نہ تھی۔

نبی کریم ﷺ نے واضح فرمادیا کہ آپ کو بطور نائب بنا کر پیچھے چھوڑنے سے آپ کی شان میں کوئی کمی نہیں آتی۔اس لیے کہ اگر ایسا کرنا نقص یا عیب ہوتا تو حضرت موسی علیہ السلام اپنے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کے ساتھ کبھی بھی ایسا نہ کرتے ۔مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا استخلاف حضرت ہارون علیہ السلام کی خلافت و نیابت کی مانند نہ تھا۔اس لیے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب مناجات باری تعالیٰ کے لیے کوہ طور پر گئے تھے تو آپ اکیلے گئے تھے' اور اپنی عدم موجودگی میں ہارون علیہ السلام کو اپنا نائب مقرر کیا تھا۔اور پورا لشکر حضرت ہارون علیہ السلام کے ساتھ تھا۔حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس وقت مدینہ کا نائب مقرر کیا گیا تھا جب کہ تمام اہل اسلام کا لشکر نبی کریم ﷺ کی رفاقت میں جنگ کے لیے جارہے تھے۔اور مدینہ میں سوائے خواتین' بچوں اور معذوروں کے علاوہ صرف وہ لوگ باقی رہ گئے تھے جو نبی کریم ﷺ کی نافرمانی کرتے ہوئے پیچھے رہ گئے تھے۔

کسی کا یہ کہنا کہ:'' یہ چیز فلاں چیز کی منزلت پر ہے۔'' یا یہ کہنا کہ:'' فلاں چیز فلاں دوسری چیز کی مانند ہے۔'' تو کسی چیز کی دوسری چیز سے تشبیہ سیاق کی دلالت کے اعتبار سے ہوتی ہے۔اس کا تقاضا ہرگز یہ نہیں ہوتا کہ یہ دونوں چیزیں ہر لحاظ سے اور ہر چیز میں مساوی ہیں ۔[باقی رہا یہ کہ نبی کریم ﷺ کے الفاظ تھے:''اَنْتَ مِنِّیْ بِمَنْزِلَةِ هَارُوْنَ مِنْ مُوْسٰی '' تو یاد رہے کہ ایسے الفاظ میں تشبیہ ہر لحاظ سے مقصود نہیں ہوتی اور یہ مطلب نہیں ؛ کہ مُشَبَّہ اور مُشَبَّہ بِہ دونوں بالکل مساوی ہیں ۔]

[حدیث استخلاف کی توضیح]:

کیا آپ دیکھتے نہیں ہے کہ صحیحین میں بدر کے قیدیوں والی روایت موجود ہے ۔اس میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب ان کے بارے میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے مشورہ کیا تو آپ فدیہ لیکر رہا کردینے کا مشورہ دیا۔اور جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مشورہ لیا تو آپ نے ان سب کو قتل کردینے کا مشورہ دیا۔اس روایت میں ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں ابھی تمہیں

تمہارے دونوں ساتھیوں کے بارے میں بتاؤں گا۔

اے ابوبکر رضی اللہ عنہ! آپ کی مثال حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح ہے جنہوں نے فرمایا تھا:

﴿ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَإِنَّهُ مِنِّيْ وَ مَنْ عَصَانِيْ فَإِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ [ابراهيم ٣٦]

''پس جو کوئی میری اتباع کرے وہ مجھ سے ہے' اور جو کوئی میری نافرمانی کرے بیشک تو بخشنے والا مہربان ہے۔''

اور حضرت عیسی علیہ السلام کی طرح ہے جنہوں نے فرمایا تھا:

﴿إِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَ إِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴾ [المائدة ١١٨]

''اگر تو ان کو سزا دے تو یہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو معاف فرما دے تو تو زبردست ہے حکمت والا ہے۔''

اور اے عمر رضی اللہ عنہ! آپ کی مثال حضرت نوح علیہ السلام کی طرح ہے جنہوں نے فرمایا تھا:

﴿ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ﴾ [نوح ٢٦]

''کہ اے میرے پالنے والے! تو روئے زمین پر کسی کافر کو رہنے سہنے والا نہ چھوڑ۔''❶

اور حضرت موسی علیہ السلام کی طرح ہے جنہوں نے فرمایا تھا:

﴿رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰى أَمْوَالِهِمْ وَ اشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْأَلِيْمَ﴾ [یونس]

''اے ہمارے رب! انکے مالوں کو نیست و نابود کر دے اور ان کے دلوں کو سخت کر دے سو یہ ایمان نہ لانے پائیں یہاں تک کہ دردناک عذاب کو دیکھ لیں۔''

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے لیے یہ فرمانا کہ آپ کی مثال ایسے ہی ہے جیسے حضرت ابراہیم اور حضرت عیسی علیہما السلام کی مثال ۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لیے یہ فرمانا کہ آپ کی مثال ایسے ہی ہے جیسے حضرت نوح اور حضرت موسی علیہما السلام کی مثال ۔ یہ بات اس سے بہت بڑھ کر ہے جس میں کہا گیا ہے کہ میری نسبت سے آپ کی وہی منزلت ہے جو حضرت موسی علیہ السلام کی نسبت سے حضرت ہارون علیہ السلام کی منزلت ۔ اس لیے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت ابراہیم' حضرت نوح ؛ حضرت موسی اور حضرت عیسی علیہم السلام یقیناً حضرت ہارون علیہ السلام کی نسبت بڑے مقام و مرتبہ والے انبیاء کرام علیہم السلام ہیں۔ اس حدیث میں ان دونوں صحابہ کرام حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کو ان چار جلیل القدر انبیاء کرام علیہم السلام کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ تشبیہ ہر لحاظ سے ہے۔ بلکہ سیاق کلام کی دلالت کے اعتبار سے مقصود صرف یہ ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ لطافت طبع اور نرم مزاجی میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے طبعی تشدد میں حضرت نوح علیہ السلام کی مانند تھے۔

ایسے ہی یہاں پر [حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ہارون علیہ السلام کے ساتھ تشبیہ صرف اس اعتبار سے دی گئی ہے] جس پر سیاق کلام دلالت کرتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ جس طرح ہارون موسیٰ علیہ السلام کی عدم موجودگی میں ان کے قائم مقام قرار پائے تھے۔ اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عدم موجودگی میں آپ کے نائب و خلیفہ تھے۔

❶ مسند احمد(١/ ٣٨٣۔٣٨٤) ، مستدرك حاكم(٣/ ٢١۔٢٢)، و اسناده ضعيف۔ ابوعبیدہ کا اپنے والد عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے سماع نہیں ہے۔

یہ استخلاف حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خصوصیت نہیں ہے اور نہ ہی آپ کے دیگر استخلافات کی مانند ہے؛ چہ جائے کہ آپ کے بقیہ استخلافات سے افضل ہو۔کئی بار غزوات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے لوگوں کو اپنا نائب اور خلیفہ مقرر کیا جن سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کئی گنا زیادہ افضل و بڑھ کر تھے۔ایسی صورت میں وہ لوگ جو دیگر مواقع پر خلیفہ بنائے گئے' ان کی حضرت علی رضی اللہ عنہ پر تقدیم یا افضلیت ثابت نہیں ہوتی۔تو پھر یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ایسی نیابت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت کا موجب ہو۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف مواقع پر مدینہ طیبہ میں مختلف لوگوں کو اپنا نائب بنایا۔آپ کے مقرر کردہ نائبین اس طرح تھے جیسے حضرت ہارون حضرت موسیٰ علیہما السلام کے خلیفہ تھے؛یہ اسی استخلاف کی جنس سے ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حاصل ہوا تھا۔ بلکہ باقی استخلافات اس لیے اس سے افضل تھے کہ عام استخلافات میں غزوہ تبوک میں پیچھے رہ جانے والوں کی نسبت زیادہ اور افضل لوگ ہوا کرتے تھے۔اوراس وقت میں مدینہ میں کسی کو نائب بنانے کی ضرورت بھی بہت زیادہ ہوا کرتی تھی۔اس لیے کہ مدینہ پر دشمن کی یورش[حملہ] کا خوف ہوا کرتا تھا۔

تبوک والے سال تمام حجاز کے عرب مسلمان ہو چکے تھے۔مکہ مکرمہ فتح ہو چکا تھا؛اسلام کوغلبہ اورقوت حاصل ہوچکی تھی۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کوحکم دیا کہ ملک شام کے اہل کتاب کے ساتھ جہاد کیا جائے۔اس وقت مدینہ میں دشمن سے مقابلہ کرنے والے مجاہدین کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔یہی وجہ تھی کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس کسی ایک مجاہد کو بھی باقی نہ چھوڑا تھا۔جیسا کہ باقی تمام غزوات آپ کی عادت مبارکہ تھی کہ کچھ مجاہدین کو مدینہ میں باقی چھوڑا کرتے تھے؛اس بار آپ نے تمام مجاہدین کواپنے ساتھ لے لیا تھا' کسی ایک کوبھی مدینہ میں باقی نہیں چھوڑا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تخصیص بالذکر لقب کے مفہوم سے ظاہر ہورہی ہے۔لقب دوقسم کا ہوتا ہے:

۱۔ وہ لقب جوجنس کی حیثیت رکھتا ہے۔

۲۔ وہ لقب جوعَلَم کا قائم مقام ہوتا ہے۔مثلاً زید؛ وأنت۔یہ مفہوم نہایت کمزور ہے۔

اسی لیے تمام فقہاء اور علمائے اصول کا نظریہ یہ ہے کہ اس روایت سے احتجاج نہیں کیا جاسکتا۔مثال کے طور پر جب یہ کہا جائے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں' تو اس سے باقی رسولوں کی نفی نہیں ہوتی۔لیکن اگر سیاق کلام میں کوئی ایسی چیز ہو جس کا تقاضا تخصیص کا ہوتو پھر صحیح مذہب کے مطابق ایسی روایت سے استدلال کرنا جائز ہوتا ہے۔اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:﴿ فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ ﴾ [الانبیاء ۷۹]

''اور ہم نے سلیمان علیہ السلام کوخوب سمجھ عطا کی۔''

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:﴿ كَلَّا إِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ ﴾ [مطففین ۱۵]

''ہرگز نہیں' بیشک اس دن وہ اپنے رب سے پردہ میں ہوں گے۔''

ہاں جب تخصیص کی مقتضی سبب کی بنیاد پر ہوتو باتفاق الناس ایسی روایت سے استدلال نہیں کیا جائے گا۔یہ روایت بھی اسی ضمن کی روایات میں سے ایک ہے۔اس روایت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بطور خاص ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ آپ روتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے تھے کہ آپ مجھے بچوں اورعورتوں کے ساتھ چھوڑے جارہے ہیں؟

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علاوہ جتنے لوگوں کو خلیفہ یا نائب بنایا گیا تھا؛ ان میں سے کسی ایک کے بھی ذہن میں یہ بات نہیں آئی کہ نائب بنائے جانے سے ان کی شان میں کوئی کمی واقع ہوگی؛ تو [نہ ہی انہوں نے کوئی اعتراض کیا' اور] نہ ہی رسول اللہ ﷺ کو ضرورت پیش آئی کہ وہ دوسرے لوگوں کو اس طرح کی کوئی بات بتائیں۔ پس جب یہاں پر بطور خاص آپ کا تذکرہ کرنے کی وجہ وہ سبب ہے جس کا تقاضا یہ تھا کہ یہ جملہ بطور خاص آپ کے لیے ذکر کیا جائے۔ پس اس حدیث میں کہیں بھی اس بات کی کوئی دلیل نہیں ہے کہ کوئی دوسرا آپ کے لیے موسی علیہ السلام کے لیے ہارون علیہ السلام کی منزلت پر نہیں ہوسکتا۔ جیسے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس شخص پر؛ جسے شراب پینے کے جرم میں مارا جارہا تھا؛ لعنت کرنے سے منع کرتے ہوئے فرمایا:

''اس پر لعنت مت کرو؛ اس لیے کہ یہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت کرتا ہے۔'' [تخریج گزر چکی ہے]

یہ حدیث اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ اس کے علاوہ کوئی دوسرا اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت نہیں کرتا۔ بلکہ آپ نے اس کا تذکرہ بوجہ ضرورت کے کیا تاکہ اس پر لعنت کرنے سے روکا جائے۔

ایسے ہی جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے کی اجازت چاہی تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اسے رہنے دو' اس لیے کہ اس نے غزوہ بدر میں شرکت کی ہے۔'' [تخریج گزر چکی ہے]۔

اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آپ کے علاوہ کوئی دوسرا بدر میں شریک نہیں ہوا؛ بلکہ اس کا تذکرہ اس وجہ سے کیا کہ اس کی غلطی سے درگزر کر لیا جائے۔

ایسے جب رسول اللہ ﷺ نے عشرہ مبشرہ کا نام لیکر انہیں جنت کی ضمانت دی؛ تو اس سے کہیں بھی یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ ان کے علاوہ کوئی دوسرا جنت میں داخل نہیں ہوگا؛ بس اس موقع کا تقاضا یہی تھا اس لیے آپ نے خصوصی تذکرہ فرمایا۔

ایسے ہی جب رسول اللہ ﷺ نے حضرت حسن اور حضرت اسامہ رضی اللہ عنہما کے لیے فرمایا:

''اے اللہ! میں ان دونوں سے محبت کرتا ہوں تو بھی ان دونوں سے محبت کر؛ اور جو کوئی ان دونوں سے محبت کرے' اس سے بھی محبت کر۔'' [تخریج گزر چکی ہے]

اس سے کہیں بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آپ ان دونوں کے علاوہ کسی اور سے محبت نہیں کرتے تھے' بلکہ دوسرے لوگوں میں ایسے لوگ بھی تھے؛ جن سے رسول اللہ ﷺ ان دونوں سے بڑھ کر محبت کرتے تھے۔

ایسے ہی جب آپ ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا:

''جنہوں نے درخت کے نیچے بیعت کی ان میں سے کوئی بھی جہنم میں داخل نہیں ہوگا۔'' [تخریج گزر چکی ہے]

تو اس حدیث کا تقاضا یہ نہیں ہے کہ ان کے علاوہ باقی سبھی لوگ جہنم میں داخل ہوں گے۔

اسی طرح جب آپ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو حضرت ابراہیم اور حضرت عیسی علیہما السلام سے تشبیہ دی؛ تو یہ اس بات میں مانع نہیں ہے کہ آپ کی امت میں کوئی دوسرا بھی ان دونوں انبیاء کرام علیہم السلام سے مشابہت رکھتا ہو۔ اور ایسے ہی جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حضرت نوح اور حضرت موسی علیہما السلام سے تشبیہ دی تو اس سے کہیں بھی یہ ممانعت ثابت نہیں ہوتی کہ امت میں کوئی دوسرا ان دونوں انبیاء کرام علیہم السلام کے مشابہ نہیں ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ: آپ کی امت میں سے جو لوگ انبیاء کرام سے مشابہت رکھتے ہیں' ان میں سے یہ دو حضرات افضل ترین لوگ ہیں؟

تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ: اختصاص میں کمال اصل تشبیہ میں مشارکت سے مانع نہیں ہوسکتا۔

ایسے ہی جب آپ ﷺ نے حضرت عروہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا: ''آپ صاحب لیس کی طرح ہیں۔''

ایسے ہی آپ نے قبیلہ اشعری کے بارے میں فرمایا: ''وہ مجھ سے ہیں اور میں ان میں سے ہوں۔'' یہ صرف اس قبیلہ کے ساتھ ہی خاص نہیں؛ بلکہ آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ''تو مجھ سے ہے اور میں تجھ سے ہوں۔''

اور حضرت زید رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ''آپ ہمارے بھائی اور ہمارے مولا [دوست] ہیں۔'' یہ بات صرف حضرت زید رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہی خاص نہیں تھی؛ بلکہ آپ نے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں بھی ایسے ہی فرمایا تھا۔

جملہ طور پر اس باب میں امثال اور تشبیہات بہت زیادہ ہیں۔ ان سے کہیں بھی ہر لحاظ سے تماثل کا وجوب ثابت نہیں ہوتا۔ بلکہ ان کا اعتبار سیاق کلام کے لحاظ سے ہوتا ہے۔ اور نہ ہی اس کا تقاضا مشبہ کے لیے تشبیہ میں تخصیص کا ہوتا ہے۔ بلکہ اس میں کسی دوسرے کی شراکت بھی ممکن ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِیْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ﴾ [البقرة ۲٦۱]

''جو لوگ اپنا مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اس کی مثال اس دانے جیسی ہے جس میں سے سات بالیاں نکلیں اور ہر بالی میں سے سو دانے ہوں۔''

نیز فرمان الٰہی ہے: ﴿وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا اَصْحٰبَ الْقَرْيَةِ اِذْ جَآءَ هَا الْمُرْسَلُوْنَ﴾ [یس ۱۳]

''اور آپ ان کے سامنے ایک مثال (یعنی ایک) بستی والوں کی مثال (اس وقت کا) بیان کیجئے [جبکہ اس بستی میں (کئی) رسول آئے]۔''

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿مَثَلُ مَا یُنْفِقُوْنَ فِیْ هٰذِهِ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا كَمَثَلِ رِیْحٍ فِیْهَا صِرٌّ﴾ [آل عمران]

''یہ کفار جو خرچ کریں اس کی مثال یہ ہے ایک تند ہوا چلی جس میں پالا تھا۔''

یہ بھی کہا گیا ہے کہ قرآن میں بیالیس مثالیں بیان کی گئی ہیں۔

اب کہنے والے کا یہ دعویٰ کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ کو نبوت کے سوا باقی ہر بات میں ہارون علیہ السلام کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔ یہ محض باطل کلام ہے۔ نبی کریم ﷺ کے ارشاد گرامی ''اَمَا تَرْضٰی اَنْ تَكُوْنَ مِنِّیْ بِمَنْزِلَةِ هَارُوْنَ مِنْ مُّوْسٰی'' سے واضح ہوتا ہے کہ آپ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو راضی کرنا چاہتے تھے۔ اور آپ کا دل خوش کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے کہ آپ کو یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ ان کو پیچھے چھوڑ کر جانے سے ان کے درجہ میں کوئی کمی واقع ہوئی ہے۔ تو آپ کے لیے آپ ﷺ نے اس غلط فہمی کا ازالہ کرنے کے لیے یہ جملہ ارشاد فرمایا۔

آپ کا یہ فرمان کہ: ''بِمَنْزِلَةِ هَارُوْنَ مِنْ مُوْسٰی '' اس سے آپ کا مقصد یہ تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرت ہارون علیہ السلام جیسا مرتبہ حاصل ہے۔ اس لیے کہ بالکل وہی مرتبہ جو حضرت ہارون کو حضرت موسیٰ علیہما السلام سے تھا وہ کسی بھی دوسرے کے لیے نہیں ہوسکتا۔ دوسرے کے لیے اس کے مشابہ مقام و مرتبہ ہوسکتا ہے۔ یہ قول ایسے ہی جیسے مثال کے بیان میں ہوتا ہے ؛ اور جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے لیے فرمایا: ''اس کی مثال ابراہیم اور عیسیٰ علیہما السلام کی ہے۔''

اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لیے فرمایا: ''اس کی مثال حضرت موسیٰ اور نوح علیہما السلام کی ہے۔''

اس کی مزید وضاحت اس بات سے ہوتی ہے کہ آپ نے یہ جملے تبوک والے سال ارشاد فرمائے۔ پھر تبوک سے واپسی پر آپ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو امیر حج بنا کر بھیجا؛ اور ان کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کو آپ کے پیچھے بھیجا؛ تو آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا: امیر بن کر آئے ہو یا مامور؟ تو انہوں نے کہا: نہیں بلکہ مأمور بن کر آیا ہوں۔'' اس وقت تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی آپ پر امیر تھے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی آپ کے ساتھ بالکل ایسے ہی تھے جیسے کوئی مامور اپنے امیر کیساتھ ہوتا ہے۔ [اور اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ بالکل حضرت ہارون علیہ السلام کے مشابہ ہوتے تو ۹ھ میں [سفر حج میں] نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو امیر مقرر نہ کرتے]۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اقتداء میں نماز پڑھتے اور ان کی اطاعت کیا کرتے تھے۔ اور آپ کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے مشاعر مقدسہ میں لوگوں میں اعلان کرتے جاتے:

''لوگو! سن لو۔ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہیں کریگا' اور نہ ہی کوئی ننگا ہو کر بیت اللہ کا طواف کرے گا۔''❶

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خاص طور پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پیچھے کفار کے عہد واپس کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ عربوں کے ہاں رسم تھی کہ عہد باندھنے اور توڑنے کے لیے معاہدہ کرنے والا سردار اور بڑا خود جایا کرتا تھا یا اپنے کنبہ کا کوئی آدمی بھیجا کرتا تھا۔ تو پھر ایسے نہیں ہوسکتا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت کے علاوہ کسی اور کی زبانی وہ اس عہد کی واپسی کو قبول کر لیتے۔

اس کی وضاحت اس چیز سے بھی ہوتی ہے کہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا خیال یہ ہوتا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی آپ کے بعد خلیفہ ہوں تو پھر یہ کوئی ایسا معاملہ نہیں تھا کہ اس میں دو افراد سرگوشی کر لیتے۔ اور نہ ہی پھر اس میں تاخیر کی جاتی حتی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ضرورت پیش آئی کہ وہ روتے ہوئے اور شکایت کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچ گئے۔ بلکہ پھر یہ ایسا حکم تھا جس کا بیان کرنا اور ایسے کھلے الفاظ میں لوگوں تک پہنچانا واجب تھا جس سے مقصود حاصل ہو سکے۔

پھر رافضیوں کی جہالت کی انتہاء یہ ہے کہ ان کے کلام میں تناقض پایا جاتا ہے۔ اس لیے کہ یہ حدیث بغیر کسی شک و شبہ کے دلالت کرتی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہ کلمات صرف غزوہ تبوک کے موقع پر کہے تھے۔ [اگر آپ نے اس سے پہلے بھی کبھی یہ ارشاد فرمایا ہوتا] اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس کا علم ہوتا تو آپ کا دل بالکل مطمئن ہوتا کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

---

❶ صحیح بخاری: ح ۳۶۲۔ پوری روایت یوں ہے: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں: مجھے ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے امیر حج ہونے کے دن بزمرہ موذنین بھیجا تا کہ ہم منیٰ میں یہ اعلان کریں کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہ کرے اور نہ کوئی برہنہ ہو کر طواف کرے، حمید بن عبدالرحمٰن (جو ابو ہریرہ سے اس حدیث کو روایت کرتے ہیں) کہتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر کے پیچھے علی کو بھیجا تھا اور ان کو حکم دیا کہ وہ سورت برات کا اعلان کریں، علی نے قربانی کے دن ہمارے ساتھ منیٰ میں لوگوں میں اعلان کیا کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہ کرے اور نہ کوئی برہنہ (ہو کر) کعبہ کا طواف کرے۔

کی زندگی میں اور اس کے بعد بھی ہارون علیہ السلام کی منزلت پر ہیں۔تو پھر آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس روتے ہوئے حاضر نہ ہوتے۔اور آپ یہ بالکل نہ فرماتے کہ: آپ مجھے عورتوں اور بچوں پر خلیفہ بنا رہے ہیں؟

اور اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ مطلق طور پر تو کبھی بھی آپ پر کسی دوسرے کو خلیفہ نہ بناتے ۔ ایسا بھی ہوا کرتا تھا کہ آپ مدینہ میں موجود ہوتے مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی دوسرے کو یہاں پر خلیفہ مقرر کرتے ۔ جیسا کہ خیبر کے موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ مدینہ میں موجود تھے ؛ آپ کی آنکھوں میں تکلیف تھی ۔اور یہاں پر امیر کوئی دوسرا صحابی تھا۔پھر آپ خیبر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جا ملے ؛ اور جب آپ تشریف لے گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو جھنڈا عطا کیا ؛ اس سے پہلے یہ جھنڈا کسی اور کے سپرد تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کل میں یہ جھنڈا ایسے آدمی کو دوں گا جو اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے اور اللہ اور اس کا رسول اس سے محبت کرتے ہیں ۔''[تخریج گزر چکی ہے]۔

❀ **شیعہ مصنف کا یہ کہنا کہ:''چونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں اور بہت تھوڑے وقت کی غیوبت میں آپ کے خلیفہ تھے۔لہٰذا علی رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اور لمبی مدت کی غیوبت میں بھی آپ کے قائم مقام ہونے کے زیادہ حق دار ہیں۔''**

جواب: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی موجودگی کے باوجود اپنی غیوبت میں کئی بار حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علاوہ دوسرے کئی لوگوں کو اپنا نائب مقرر فرمایا۔ان کی نیابت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نیابت سے کہیں بڑھ کر اور عظیم الشان تھی ۔ اور جن لوگوں پر انہیں نائب بنایا گیا وہ لوگ بھی ان سے افضل تھے جن پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو نائب بنایا گیا تھا۔ غزوہ تبوک کے بعد حجۃ الوداع کے موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علاوہ کسی دوسرے صحابی کو مدینہ میں نائب بنایا گیا تھا۔ پس حضرت علی رضی اللہ عنہ کو نائب بنانے سے آپ خلافت کے ان لوگوں سے زیادہ حقدار نہیں بن جاتے جنہیں کئی دوسرے مواقع پر مدینہ طیبہ میں نائب بنایا گیا تھا۔مدینہ میں آپ کی سب سے بڑی اور آخری نیابت حجۃ الوداع کے موقع پر تھی۔اس وقت جناب حضرت علی رضی اللہ عنہ یمن میں تھے۔اور حج میں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک ہوئے۔لیکن حجۃ الوداع میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نائب تو نہیں تھے کوئی دوسرے صحابی تھے۔

اگر نائب کا خلیفہ بننا ہی اصل ہے ؛ تو پھر جس انسان کو حجۃ الوداع کے آخری موقع پر نائب بنایا گیا تھا ؛ اسے خلیفہ بننا چاہیے۔وہ اپنے سے پہلے نائبین کی نسبت خلیفہ بننے کا زیادہ حق دار ہے۔

خلاصہ کلام ! مدینہ پر نائب بنایا جانا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کوئی خصوصیت نہیں ہے۔اور نہ ہی یہ افضلیت اور امامت پر دلالت کرتا ہے ۔ بلکہ آپ کے علاوہ بھی کئی دوسرے لوگوں کو مدینہ میں نائب بنایا گیا۔لیکن رافضیوں کی جہالت کی حد یہ ہے کہ وہ فضائل جو حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ کرام کے مابین مشترک ہیں انہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خصائص شمار کرتے ہیں۔اگر چہ کوئی دوسرا ان فضائل میں آپ سے زیادہ کامل ہی کیوں نہ ہو۔جیسا کہ انہوں نے نصوص اور وقائع میں کیا ہے۔

عیسائیوں نے بھی تو ایسے ہی کیا تھا۔اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جو معجزے عطا کئے تھے: عیسائی انہیں صرف آپ کے ساتھ ہی خاص شمار کرنے لگے ؛ حالانکہ ان معجزات میں دوسرے انبیاء کرام علیہم السلام بھی شریک ہیں ۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام

کو جو معجزات عطا ہوئے تھے وہ حضرت مسیح علیہ السلام کے معجزات سے بڑھ کر تھے۔ اور پھر کوئی ایسا سبب بھی نہیں پایا جاتا جو ان معجزات کو ابراہیم و موسی علیہما السلام کو چھوڑ کر حضرت مسیح علیہ السلام کے ساتھ بطور خاص واجب کرتا ہو۔ نہ ہی حلول اور نہ ہی اتحاد ایسی کوئی بھی چیز نہیں۔ بلکہ اگر یہ ساری چیزیں ممتنع ہیں' تو اس میں کوئی شک نہیں کہ تمام [انبیاء کرام] میں حلول اور اتحاد ممتنع ہے۔ اور اگر اس کی تفسیر کی ممکن بات سے کی جائے جیسے کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت کا حصول اور اس پر ایمان؛ اور پھر اس ایمان سے حاصل ہونے والے انوار اور دیگر امور۔ تو یہ مشترکہ قدر اور ممکن بات ہے۔

یہی معاملہ شیعہ کے ساتھ ہے۔ جو معاملات حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ کرام کے مابین مشترک اور ان سب کو شامل ہیں' انہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہی خاص قرار دیتے ہیں۔ اور پھر اسی پر عصمت' امامت اور افضلیت کو مرتب کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ ساری باتیں ممنوع و منتفی ہیں۔

جس انسان کو سیرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم؛ احوال صحابہ رضی اللہ عنہم معانی القرآن والحدیث کی معرفت ہو؛ وہ یہ بات اچھی طرح جانتا ہے کہ یہاں پر کوئی ایسی خصوصیت نہیں ہے جس کی وجہ سے آپ کی امامت یا افضلیت کا وجوب ثابت ہوتا ہو۔ بلکہ یہ مشترکہ فضائل ہیں۔ ان سے حاصل ہونے والا فائدہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ایمان و ولایت کا ثبوت ہے؛ اور ان ناصبی لوگوں پر رد ہے جو آپ کو گالی دیتے؛ فاسق کہتے؛ اور کافر قرار دیتے ہیں۔ اور آپ کی شان میں ایسے ہی نازیبا کلمات کہتے ہیں جو رافضی خلفاء ثلاثہ کی شان میں کہتے ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضائل کے ثابت ہونے میں نواصب پر ویسے ہی رد ہے جیسے خلفاء ثلاثہ کے فضائل کے اثبات میں روافض پر رد ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر روافض اور خوارج دونوں ہی تنقید کرتے ہیں۔ جب کہ شیعان عثمان آپ کے امام برحق ہونے کا اعتقاد رکھتے ہیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امامت پر جرح کرتے ہیں۔ یہ لوگ اپنی بدعت میں شیعان علی سے بہتر ہیں جو آپ کے علاوہ دوسرے لوگوں پر جرح کرتے ہیں۔ جب کہ زیدیہ جو کہ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما سے دوستی رکھتے ہیں' اس معاملہ میں اضطراب کا شکار ہیں۔

پس اپنی زندگی میں نائب مقرر کرنا جانشینی کی ایک قسم ہے۔ ہر حکمران کے لیے ایسا کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اور یہ ضروری نہیں کہ ہر وہ انسان جو زندگی میں امت کے بعض امور پر جانشین بننے کے قابل ہو؛ وہ موت کے بعد بھی خلیفہ بننے کی صلاحیت کا مالک ہو۔ اس لیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں کئی لوگوں کو اپنا جانشین مقرر فرمایا تھا؛ مگر یہ لوگ آپ کے بعد خلیفہ بننے کے قابل نہیں تھے جیسے بشیر بن عبدالمنذر وغیرہ۔

نیز اس لیے بھی کہ آپ کی زندگی میں لوگوں کے حقوق کی ادائیگی آپ سے مطلوب ہے۔ جیسے کہ یہ چیز حکمرانوں سے مطلوب ہوتی ہے۔ جب کہ موت کے بعد آپ سے کوئی بھی ایسی چیز مطلوب نہیں۔ اس لیے کہ آپ نے تبلیغ رسالت کا فریضہ پورا کر دیا' اور امانت کا حق ادا کر دیا؛ امت کی خیر خواہی کی؛ اور اس وقت تک اللہ کی بندگی کرتے رہے یہاں تک کہ آپ کو اللہ کا پیغام آ پہنچا۔ آپ کی زندگی دشمنوں سے جہاد کرنا؛ مال فئے تقسیم کرنا؛ شرعی حدود کا قیام؛ عمال کا تعین آپ پر واجب تھا؛ اور ان کے علاوہ دوسرے امور جو کہ آپ کے بعد کے حکمرانوں پر واجب تھے۔ مگر موت کے بعد تو ان میں سے کوئی ایک چیز بھی آپ

پر واجب نہیں تھی۔

پس اپنی زندگی میں نائب مقرر ایسا نہیں ہے جیسے موت کے بعد کے لیے نائب مقرر کرنا ہے۔اس لیے کہ انسان جب کسی کو اپنی زندگی میں اپنی اولاد پر بھلائی کا حکم دینے کے لیے اپنا نائب مقرر کرتا ہے؛ تو اس نائب کی حیثیت محض ایک ایجنٹ [وکیل] کی ہوتی ہے ؛ یہ صرف وہی کچھ کریگا موکل نے جس کا حکم دیا ہے۔اور اگر کوئی اپنی مرنے کے بعد اپنی اولاد پر کسی کو اپنا نائب مقرر کریگا تو اس کی حیثیت مستقل نائب [وولی] کی ہوگی ۔ یہ ان لوگوں کی مصلحت کے مطابق ہی ایسے کام کرے گا جن کا حکم اللہ اور اس کے رسول نے دیا ہے۔اس کی حیثیت محض میت کے ایجنٹ کی نہیں ہوگی ۔

یہی حال حکمرانوں کا بھی ہے ۔ جب ان میں سے کوئی ایک کسی کو اپنا نائب مقرر کریگا تو وہ نائب بعض متعین امور میں ویسے ہی کریگا جیسے اس کو حکم ملے گا۔ ہاں اگر اسے موت کے بعد نائب مقرر کیا جائے تو وہ اپنی ولایت میں اللہ اور اس کے رسول کے احکام کے مطابق ہی تصرف کرے گا۔اس تصرف کی نسبت اسی کی طرف ہوگی میت کی طرف نہیں ہوگی ۔ بخلاف اس کے کہ اگر اس کی زندگی میں اس کے حکم سے کوئی کام کرے تو اس کی نسبت نائب بنانے والے پر ہوگی ۔تو دونوں باتوں کے درمیان کتنا بڑا فرق موجود ہے۔

کسی بھی عقلمند نے یہ بات نہیں کہی کہ اگر کسی شخص نے بعض امور پر کسی کو اپنا نائب مقرر کیا ؛ اور یہ نیابت مکمل بھی ہوگئی تو پھر بھی وہ انسان اس اصل خلیفہ کی موت کے بعد اس کا جانشین قرار پائے گا۔لیکن کیا کریں کہ رافضی معقول ومنقول میں ہر لحاظ سے لوگوں میں سے سب سے بڑے اور پرلے درجے کے جاہل ہیں۔

امامت علی رضی اللہ عنہ کی چوتھی حدیث:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:''امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی چوتھی دلیل یہ حدیث ہے کہ:'' نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مدینہ میں اپنا نائب مقرر کیا تھا، حالانکہ آپ کی غیوبت کا زمانہ نہایت محدود تھا۔لہٰذا واجب ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی آپ کی وفات کے بعد بھی آپ کے قائم مقام ہوں گے۔ کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سوا کوئی دوسرا بالاجماع اس کا اہل نہیں ہوسکتا۔ نیز اس لیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مدینہ میں اپنی نیابت سے معزول نہیں کیا تھا۔لہٰذا حضرت علی رضی اللہ عنہ آپ کے بعد بھی اس منصب پر فائز ہوں گے۔ جب مدینہ میں آپ کے نائب ہوں گے تو دیگر بلاد وامصار میں بھی یقیناً بالاجماع آپ کے خلیفہ ٹھہریں گے۔''

[جواب]: ہم جواباً کہتے ہیں کہ:'' شیعہ کے دیگر دلائل کی طرح یہ دلیل بھی نہایت بودی اور تار عنکبوت کی طرح بے جان ہے،اور اس کے متعدد جوابات ہیں:

- پہلا جواب: یہ ہے کہ علماء کی ایک جماعت کے ایک قول کے مطابق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ مقرر کیا تھا؛ جیسا کہ اس سے پہلے تفصیلی بیان گزر چکا۔اور اگر رافضی کہیں کہ آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنایا تھا۔تو ہم کہیں گے کہ پھر فرقہ راوندیہ کا قول بھی صحیح ہونا چاہیے۔ جو کہتے ہیں کہ: آپ نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنایا تھا۔ جو شخص بھی کما حقہ نقلی دلائل سے آگاہ ہے وہ جانتا ہے کہ اگر احادیث صحیحہ سے آپ کی

موت کے بعد کسی کا استخلاف ثابت ہوتا ہے تو وہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا استخلاف ہے نہ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ یا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا۔ بلکہ آپ نے اپنے بعد کسی کو بھی دوٹوک الفاظ میں اپنا جانشین نہیں مقرر کیا تھا۔ پس اس صورت میں کہا جائے گا کہ: اگر آپ نے کسی کو بھی خلیفہ مقرر نہیں کیا نہ ہی ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اور نہ ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو۔[تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ امام کا تقرر آپ نے امت کی رائے عامہ پر چھوڑ دیا تھا کہ جس کو چاہیں مقرر کرلیں]۔

اور اگر مان لیا جائے کہ آپ ﷺ پر اپنا جانشین مقرر کرنا واجب تھا تو پھر آپ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کے علاوہ کسی کو بھی اپنا جانشین مقرر نہیں کیا۔ اس لیے کہ تمام اہل علم محدثین اور اصحاب السیر کا اتفاق ہے کہ صحیح اور ثابت احادیث حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے علاوہ کسی اور کے جانشین یا خلیفہ ہونے پر دلالت نہیں کرتیں۔ ان میں سے جو بھی احادیث نیابت کے تقرر پر دلالت کرتی ہیں تو ان سے ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت ہی ثابت ہوتی ہے۔ ثبوت وصحت حدیث کا علم رکھنے والا ہر انسان یہ بات جانتا ہے۔

❀ دوسرا جواب: آپ لوگ تو قیاس کو تسلیم نہیں کرتے؛ جب کہ یہاں پر قیاس سے دلیل لے رہے ہیں۔ اس لیے کہ آپ نے مرنے کے بعد کی خلافت کو زندگی میں دوران غیوبت میں خلافت پر قیاس کیا ہے۔ جب کہ ہم دو اقوال میں سے جب کسی ایک قول کو فرض کرلیتے ہیں؛ تو ہم کہتے ہیں: ''ان دونوں کے مابین فرق وہی ہے جس پر ہم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اپنے عہد میں دوسرے استخلاف پر اور بعد از وفات شخص متعین کے انتخاب سے توقف میں آگاہ وتنبیہ کرچکے ہیں۔ نبی کریم ﷺ اپنی زندگی میں خود یا بذریعہ اپنے نائبین کے' اس امت پر شاہد اور اس کی سیاست پر مامور تھے۔[یعنی زندگی میں کسی کو اپنا قائم مقام بنانا تو یہ ایک قسم کی نیابت ہے اس کے لیے ہر امام کے عزم وقصد کا ہونا ضروری ہے] اور موت کے بعد آپ خلیفہ بنانے کے مکلف ہی نہیں رہے۔ جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ارشاد ہے:

﴿وَ كُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ﴾ (المائدۃ: ۱۱۷)

''اور میں ان پر گواہ رہا جب تک ان میں رہا۔''

آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ میرا خلیفہ ان پر شاہد تھا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کسی کو بھی اپنا خلیفہ نہیں بنایا تھا۔ ایسے ہی نبی کریم ﷺ یہ بھی ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا: میں بھی ایسے ہی کہوں گا جیسے اللہ کے نیک بندے نے کہا تھا:

﴿وَ كُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ﴾ (المائدۃ: ۱۱۷)

''اور میں ان پر گواہ رہا جب تک ان میں رہا۔''

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ وَ مَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا وَ سَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ﴾ [آل عمران ۱۴۴]

''محمد صلی اللہ علیہ وسلم صرف رسول ہی ہیں آپ سے پہلے بہت سے رسول ہو چکے؛ کیا اگر آپ کا انتقال ہو جائے یا شہید ہو جائیں تو تم اسلام سے اپنی ایڑیوں کے بل پھر جاؤ گے اور جو کوئی پھر جائے اپنی ایڑیوں پر تو اللہ تعالیٰ کا کچھ نہ

بگاڑے گا عنقریب اللہ تعالیٰ شکر گزاروں کو نیک بدلہ دے گا۔''

رسول اللہ ﷺ سے وفات کے بعد تکلیف ختم ہوگئی تھی۔ اور آپ اگر اپنی زندگی میں بھی کسی کو خلیفہ مقرر کرتے تو آپ پر یہ واجب نہیں تھا کہ وہ خلیفہ معصوم ہو۔ بلکہ ایسا بھی ہوا کرتا کہ آپ کسی کو اپنا نائب بنا کر کہیں روانہ فرماتے؛ اور پھر اس انسان کا جھوٹ سامنے آجاتا تو آپ اسے معزول کر دیتے۔ جیسا کہ آپ نے ولید بن عقبہ بن ابی معیط کو عامل مقرر کیا تھا۔ ایسے ہی آپ اگر اپنی موت کے بعد بھی کسی کو خلیفہ مقرر کرتے تو یہ واجب نہیں تھا کہ وہ معصوم ہو۔ اس لیے کہ آپ موت کے بعد ان پر نگہبان نہیں ہیں۔ اور نہ ہی ان کے افعال پر رد کرنے کے مکلف ہیں۔ بخلاف اپنی زندگی میں نائب مقرر کرنے کے۔

❀ تیسرا جواب: یہ کہ اپنی زندگی میں نائب مقرر کرنا ہر ولی امر پر واجب ہوتا ہے؛- خواہ وہ رسول ہو یا امام ہو- اس پر واجب ہو جاتا ہے کہ جو کام خود سرانجام نہ دے سکے' ان میں کسی کو اپنا نائب مقرر کر دے۔ پس نظام کا قائم رہنا ہر صورت میں ضروری ہے؛ خواہ وہ یہ خدمت خود انجام دے یا پھر کسی کو اپنا نائب مقرر کرے۔ پس جس کام کو ولی امر خود انجام دے اس کے لیے ممکن ہوتا ہے کہ وہ خود اس کی دیکھ بھال و اصلاح کرے؛ اور جو کام اس کی پہنچ سے دور ہے' تو اس کے لیے ممکن ہوتا ہے کہ وہ کسی کو اپنا نائب مقرر کر کے ان امور کو پایہ تکمیل تک پہنچائے جو اس کی براہ راست پہنچ سے دور ہیں۔ جیسے کہ دور کے لوگوں میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر؛ ان کے حقوق کی ادائیگی؛ ان میں حدود شریعت کا قیام۔ اور ان کے مابین حکم و فیصلہ میں عدل کا قیام۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ اپنی زندگی ان تمام لوگوں کیساتھ کیا کرتے تھے جو براہ راست آپ کی پہنچ سے دور ہوا کرتے تھے۔ آپ سرایا پر امیر مقرر فرمایا کرتے؛ جو انہیں نمازیں پڑھایا کرتے؛ اور ان لوگوں کے ساتھ جہاد کرتے؛ اور ان کی سیاست کی دیکھ بھال کرتے۔ اور ایسے ہی آپ شہروں پر اپنے عمال مقرر فرمایا کرتے۔ جیسا کہ آپ نے عتاب بن اسید کو مکہ مکرمہ پر امیر مقرر فرمایا۔ ایسے ہی آپ کے امراء میں خالد بن سعید بن عاص؛ ابان بن سعید بن العاص' ابوسفیان بن حرب' معاذ؛ ابوموسیٰ رضی اللہ عنہم کے نام آتے ہیں۔ انہیں عرینہ کی بستیوں پر' نجران پر' اور یمن پر عامل مقرر کیا گیا تھا۔ یہ لوگ وہاں پر ان لوگوں سے زکوٰۃ وصول کرتے جن پر زکوٰۃ فرض ہو چکی؛ اور پھر ان لوگوں میں اس کو تقسیم کر دیتے جن کے لیے یہ مال زکوٰۃ لینا حلال ہوتا۔ ایسے ہی دوسرے لوگوں کو بھی آپ نے عمال مقرر فرمایا تھا۔

ایسے ہی آپ ﷺ حدود قائم کرنے میں بھی اپنا نائب مقرر فرمایا کرتے تھے؛ جیسا کہ آپ نے حضرت انیس رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا: ''اے انیس! اس انسان کی عورت کے پاس جاؤ' اگر وہ زنا کا اقرار کر لے تو اسے رجم کر دینا۔''

آپ اس عورت کے پاس چلے گئے' اس نے زنا کا اعتراف کر لیا' اور آپ نے اسے رجم کر دیا۔'' [مسلم]

ایسے ہی آپ حج میں بھی نائب مقرر کیا کرتے تھے۔ جیسا کہ آپ نے غزوہ تبوک کے بعد سن نو ہجری میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو امیر حج بنایا؛ اس حج میں حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی آپ کی جملہ رعیت میں سے تھے۔ آپ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پیچھے نمازیں پڑھتے؛ اور آپ کے احکام کی پیروی کرتے تھے؛ یہ سب باتیں غزوہ تبوک کے بعد ہوئیں۔

ایسے ہی آپ نے کئی بار مدینہ میں اپنے جانشین مقرر فرمائے۔ اس لیے کہ آپ ﷺ جب بھی کسی غزوہ میں نکلتے تو اپنا

نائب مقرر کرتے ؛ اور جب بھی حج یا عمرہ کے لیے نکلتے تو اپنا جانشین مقرر کرتے ۔ ایسے ہی غزوہ بدر؛ غزوہ بنی مصطلق ؛ غزوہ خیبر' غزوہ فتح مکہ؛ اور غزوہ حدیبیہ؛ عمرہ قضاء' اور حجۃ الوداع کے علاوہ دیگر مواقع پر اپنے جانشین مقرر فرمائے۔

اپنی زندگی میں نائب مقرر کرنا ولی امر پر واجب ہوتا ہے؛ بھلے وہ نبی نہ ہو۔ حالانکہ موت کے بعد اس پر اپنا جانشین مقرر کرنا واجب نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ زندگی میں جانشین مقرر کرنا تو انتہائی لازمی وضروری ہے : اس کے بغیر واجبات کی ادائیگی ممکن نہیں ہوسکتی۔ جب کے وفات کے بعد ایسا نہیں ہوسکتا۔ اس لیے کہ آپ نے امت میں تبلیغ کا فریضہ ادا کردیا۔ اب امت پر واجب ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کریں' اور آپ کی وفات کے بعد کسی ایسے کو متعین کریں جسے وہ اپنا امیر بنائیں۔ اور جیسا کہ تمام فروض کفایہ میں ہوتا ہے کہ کسی ایک واحد متعین کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اپنی زندگی میں نائب مقرر کرنے سے وفات کے بعد نائب مقرر کرنے کا وجوب لازم نہیں آتا۔

❀ چوتھا جواب : ولایت کی مختلف اقسام میں اپنی زندگی میں جانشین مقرر کرنا واجب ہے۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے دور کے لوگوں پر اپنے جانشین مقرر کیے جو کہ ان میں واجب قائم کرتے تھے۔ ایسے ہی آپ نے حج میں اپنا جانشین مقرر کیا؛ اور لوگوں سے زکوٰۃ وصول کرنے اور اموال فیئے کی حفاظت؛ اقامت حدود اور غزوات میں اپنے جانشین مقرر کیے۔

❀ اہل عقل کا اتفاق ہے کہ یہ جانشین مقرر موت کے بعد واجب نہیں ہوتا۔ اور نہ ہی ایسا کرنا ممکن ہوتا ہے۔ اس لیے کہ ہر جزئی معاملہ پر موت کے بعد جانشین مقرر کرنا ممکن نہیں : اس لیے کہ لوگوں کو ایک کے بعد ایک جانشین کی حاجت ہوتی ہے۔ اس صورت میں کسی کو متعین کرنا بڑا مشکل کام ہے۔ اس لیے کہ اپنے بعد کسی کو متعین کیا گیا تو کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس کے احوال بدل جاتے ہیں' اور اسے معزول کرنا واجب ہوجاتا ہے۔ آپ اپنی زندگی میں جن لوگوں کو متعین کیا کرتے تھے ؛ ان میں سے کسی ایک کے متعلق شکایت وصول ہوتی تو آپ اسے معزول کردیتے۔ جیسا کہ آپ ﷺ نے ولید بن عقبہ کو معزول کیا؛ اور فتح مکہ والے سال سعد بن عبادہ کو معزول کیا؛ اور ان کی جگہ ان کے بیٹے قیس کو ولایت سونپی۔ اور ایک قوم کے ایسے امام کو معزول کیا جس نے قبلہ کی طرف تھوک دیا تھا۔

❀ ایک بار آپ نے ایک آدمی کو کوئی ذمہ داری سونپی؛ لیکن اس نے اپنے واجبات ادا نہیں کیے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کیا تم اس بات سے عاجز آ گئے ہو کہ جو انسان میرے احکام پورے نہ کرتا ہو؛ اسے معزول کرکے کسی ایسے کو ذمہ داری سونپ دو جو میرے احکام کو پورا کرے۔'' اس حدیث مبارک میں رسول اللہ ﷺ نے واجبات پورے نہ کرنے والے کو معزول کرنا ان ہی لوگوں کے سپرد کردیا۔ تو پھر شروع سے ہی ایسے امیر مقرر کرنا جو واجبات ادا کرسکے کیسے آپ عوام کے سپرد نہیں کرسکتے تھے۔

❀ جب آپ ﷺ کی زندگی میں یہ سنت تھی کہ جب آپ کسی ایسے کو والی مقرر کیا جاتا جو واجبات ادا نہ کرسکتا تو اسے معزول کردیا جاتا؛ یا پھر آپ اسے معزول کرنے کا حکم دیتے۔ تو پھر یہ بھی ممکن تھا کہ آپ اگر اپنے بعد کسی کو جانشین مقرر فرماتے ؛ مگر وہ واجبات ادا نہ کرپاتا؛ اس لیے اسے معزول کرنے کی ضرورت پیش آتی۔ اس صورت میں اگر امت خود ہی کسی کو جانشین مقرر کرے ؛ اور معزول کرے یہ اس بات سے بہت آسان ہے کہ نبی کریم ﷺ کسی کو امیر متعین

کریں؛ اور امت اسے معزول کردے۔ اس سے جانشین کو متعین نہ کرنے کی حکمت واضح ہوتی ہے۔ لہٰذا ہم کہتے ہیں:

❀ پانچواں جواب: آپ ﷺ کا اپنی موت کے بعد کسی کو جانشین مقرر نہ کرنا؛ مقرر کرنے سے زیادہ بہتر تھا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کے لیے جو بھی انتخاب کیا' وہ افضل ترین امور کا ہی انتخاب تھا[ایسے ہی اب بھی آپ کا جانشین افضل ہی مقرر ہوگا]۔ اور اس کی وجہ یہ ہے: یا تو یہ کہا جائے کہ: ''آپ پر واجب تھا کہ اپنی زندگی میں صرف معصوم کو ہی اپنا جانشین بنائیں۔ جب کہ آپ کے بعض جانشینوں سے نا مناسب کام بھی ہوگئے جس پر آپ نے سخت انکار کیا۔ اور ان میں سے بعض کو معزول بھی کیا۔ جیسا کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بنو جذیمہ کے قتال کے لیے بھیجا اور آپ نے ان لوگوں کو قتل کردیا۔ تو نبی کریم ﷺ نے ان لوگوں کو نصف دیت ادا کی؛ ان کے پاس حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھیجا؛ انہوں نے کتے کے برتن تک کا تاوان ادا کیا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے اور فرمایا: ''یا اللہ! میں برأت کا اظہار کرتا ہوں اس کام سے جو خالد نے کیا۔''

❀ حضرت خالد بن ولید اور حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہما کے مابین جھگڑا ہوگیا؛ یہاں تک کہ بات نبی کریم ﷺ تک پہنچ گئی۔ تو آپ نے فرمایا:

"لا تسبوا أصحابی فلو أن أحدکم أنفق مثل أحد ذهبا ما بلغ مد أحدهم ولا نصيفه۔"

''میرے صحابہ کو برا نہ کہو اس لئے کہ اگر کوئی تم میں سے احد پہاڑ کے برابر سونا اللہ کی راہ میں خرچ کرے تو میرے اصحاب کے ایک مد (سیر بھر وزن) یا آدھے کے برابر بھی (ثواب کو) نہیں پہنچ سکتا۔'' [البخاری:ح ۸۸۷]

مگر اس کے باوجود رسول اللہ ﷺ نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو معزول نہیں کیا۔

❀ آپ ﷺ نے حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کو ایک قوم میں زکوٰۃ وصول کرنے کے لیے عامل مقرر کیا' آپ واپس آئے اور عرض کی: وہ لوگ زکوٰۃ ادا نہیں کررہے؛ بلکہ وہ جنگ کے لیے تیار ہیں۔ آپ چاہتے تھے کہ ان لوگوں کے خلاف فوج بھیجی جائے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

﴿إِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوٓا أَنْ تُصِيبُوا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ﴾ [الحجرات ٦]

''اگر تمہیں کوئی فاسق خبر دے تو تم اس کی اچھی طرح تحقیق کرلیا کرو ایسا نہ ہو کہ نادانی میں کسی قوم کو ایذا پہنچا دو۔''

ایسے ہی رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے موقع پر [انصاری لشکر پر] حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کو والی بنایا تھا۔ جب آپ کو معلوم ہوا کہ حضرت سعد نے یوں کہا ہے: ''آج کا دن خونریز جنگ کا دن ہے؛ آج حرمتیں پامال کرنے کا دن ہے۔''

تو آپ ﷺ نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو معزول کرکے ان کی جگہ ان کے بیٹے قیس کو والی بنایا؛ اور نشانی کے طور پر اپنا عمامہ شریف ارسال فرمایا؛ تاکہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو معلوم ہو جائے کہ انہیں رسول اللہ ﷺ نے معزول کیا ہے۔

❀ آپ ﷺ کے پاس آپ کے بعض نائبین کی شکایات پہنچائی جاتی تھیں۔ تو آپ اسی چیز کا حکم دیتے جو حکم اللہ تعالیٰ نے آپ کو دیا ہوتا۔ جیسا کہ اہل قباء نے آپ کے پاس شکایت کی کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ بہت لمبی نماز پڑھاتے ہیں۔ یہ اس وقت ہوا جب آپ نے نماز عشاء میں سورت بقرہ کی تلاوت کی۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اے معاذ! کیا تم

فتنہ گر بننا چاہتے ہو؟ آپ سبح اسم ربك الاعلی اور والليل إذا يغشى اوران جیسی سورتیں پڑھا کرو۔''

❀ صحیح بخاری میں ہے: ''ایک آدمی نے آپ سے عرض کی: ''فلاں انسان ہمیں نماز فجر بہت لمبی پڑھاتا ہے' اس لیے میں نماز سے پیچھے رہ جاتا ہوں۔'' تو آپ نے فرمایا:

((إِذا أَمَّ أحدكم لِلناسِ فليخفِف؛ فإن من ورائه الضعِيف والكبير و ذا الحاجة۔ وإذا صلى لنفسه فليطول ما شاء)). [صحيح مسلم:كتاب الصلاة'ح١٠٤٣]

''جب تم میں سے کوئی لوگوں کو نماز پڑھائے تو ہلکی پڑھائے کیونکہ اس کے پیچھے لوگوں میں کمزور بیمار اور حاجت مند اور بڑی عمر کے لوگ ہوتے ہیں۔ اور جب اپنے لئے نماز پڑھے تو پھر جتنا مرضی لمبا کر لے۔''

❀ جس امام نے مسجد میں قبلہ رخ تھوکا تھا اور آپ ﷺ نے اسے معزول کر دیا؛ اور فرمایا: ''بیشک تم نے اللہ اور اس کے رسول کو اذیت دی ہے۔'' [سنن أبي داؤد' كتاب الصلاة' باب كراهية البزاق في المسجد١/ ١٨٩]

اور آپ کے جانشینوں میں سے کسی ایک کو جب کسی مسئلہ میں کوئی مشکل درپیش آتی تو وہ آپ کے پاس کسی آدمی کو بھیج کر اس کا حل دریافت کر لیا کرتے تھے۔

سو رسول اللہ ﷺ اپنے جانشین کو ان باتوں کی تعلیم دیا کرتے جن کا انہیں علم نہ ہوتا۔ اور اگر کسی سے غلطی ہو جاتی تو اس کی اصلاح کرتے۔ اور اگر وہ اپنی اصلاح نہ کرتے تو انہیں معزول کر دیا جاتا۔ ان تمام باتوں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ لوگ معصوم نہ تھے۔ پس معلوم ہوا کہ آپ پر واجب نہیں تھا کہ معصوم کو ہی ولایت تفویض کرتے۔ نیز یہ ایسی چیز جس کا مکلف بنایا جانا ممکن نہیں۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم ﷺ کے علاوہ کسی کو بھی معصوم پیدا ہی نہیں کیا۔ اگر آپ کو اس بات کا مکلف ٹھہرایا جاتا کہ صرف معصوم کو ہی اپنا جانشین مقرر کریں تو یہ ایسی تکلیف ہوتی جو آپ کے مقدور سے باہر ہے۔ اور اس طرح مقصود ولایت فوت ہو جاتا؛ اور لوگوں کی دنیا اور دین میں خرابی پیدا ہو جاتی۔

جب یہ معلوم ہو گیا کہ آپ کے لیے اپنی زندگی میں جائز ہی نہیں بلکہ واجب تھا کہ ایسے لوگوں کو اپنا جانشین مقرر کریں جو کہ معصوم نہیں؛ ایسے ہی اگر اپنی موت کے بعد کسی کو جانشین مقرر کریں تو ان کے لیے معصوم ہونا ضروری نہیں۔ اور نہ ہی موت کے بعد آپ کے لیے یہ ممکن ہے کہ آپ انہیں تعلیم دیں یا ان کی اصلاح کریں؛ جیسا کہ آپ اپنی زندگی میں کیا کرتے تھے۔ تو اس لیے آپ کا اپنا جانشین مقرر نہ کرنا جانشین مقرر کرنے سے زیادہ بہتر تھا۔

آپ ﷺ نے امت تک اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی پہنچا دیئے۔ اور امت کو ان چیزوں کی تعلیم دیدی جن کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اور جن سے منع کیا ہے۔ پس وہی خود ایسے انسان کو اپنے اوپر خلیفہ مقرر کر لیں گے جو ان میں اللہ اور اس کے رسول کے احکام قائم کرے۔ اور وہ لوگ اس خلیفہ کے ساتھ قیام شریعت کے امور میں مدد کریں گے۔ اور کسی کے لیے ان امور کو قائم کرنا اس کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ پس جو کوئی علم کی بات اس [خلیفہ] سے رہ گئی ہو تو جاننے والے اسے تعلیم دیں گے؛ اور جہاں پر ان کی مدد کی ضرورت ہوگی تو مدد کریں گے۔ اور جو کوئی حق سے روگردانی کرے' اسے حسب امکان اپنے قول و عمل سے واپس حق پر لائیں گے۔ چنانچہ ان کی کسی بات کا حساب رسول اللہ ﷺ پر نہیں ہوگا۔ جیسے رسول اللہ ﷺ کی طرف

سے امت کی کوئی جواب دہی نہیں ہوتی۔اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کا اپنی موت کے بعد جانشین مقرر نہ کرنا جانشین مقرر کرنے سے زیادہ بہتر اور آپ کے حق میں زیادہ اکمل ہے۔پس جو کوئی موت کے بعد جانشین مقرر کرنے کو زندگی میں جانشین مقرر کرنے پر قیاس کرتا ہے؛ وہ لوگوں میں سب سے بڑا جاہل انسان ہے۔

جب رسول اللہ ﷺ کو اس بات کا بھی علم ہو کہ امت میں کوئی ایک خلافت کا زیادہ حقدار ہے۔اور آپ کو یہ علم تھا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ دوسرے لوگوں سے زیادہ خلافت کے حقدار تھے؛ تو پھر آپ کے لیے اس کے حقدار ہونے کی طرف اشارہ ورہنمائی کرنا؛ حالانکہ آپ جانتے تھے کہ امت آپ کے بعد ان کو ہی جانشین مقرر کرے گی؛ یہ خود آپ کے جانشین مقرر کرنے سے بے نیاز کردیتا ہے تاکہ امت خود ہی اس واجب کو پورا کرے۔اور اس کا ثواب بھی امت کے لیے زیادہ ہوگا کیونکہ اس سے مقصود رسالت حاصل ہورہا ہے۔

ایسے ہی جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو یہ علم تھا کہ امت میں اب حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسا کوئی دوسرا نہیں؛ اور آپ کو یہ اندیشہ تھا کہ اگر میں انہیں اپنا جانشین مقرر نہیں کروں گا تو ان کی سختی کی وجہ سے شائد لوگ آپ کو خلیفہ نہ بنائیں؛ تو آپ نے خود ہی انہیں اپنا جانشین مقرر کردیا۔آپ کا یہ اقدام امت کے حق میں بہت بہتر تھا۔

نبی کریم ﷺ کو علم تھا کہ آپ کی امت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ہی خلیفہ مقرر کرے گی؛ تو اس علم نے آپ کو متعین خلیفہ مقرر کرنے سے بے نیاز کردیا۔اس کے ساتھ ہی آپ نے اشارہ بھی کردیا کہ اس امت میں خلافت کے سب سے زیادہ حق دار حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی ہیں ۔ جب کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو یہ علم نہیں تھا کہ اگر انہوں نے عمر رضی اللہ عنہ کو اپنا جانشین مقرر نہ کیا تو اُمت آپ کو خلیفہ بنائے گی [لہٰذا آپ نے خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو نامزد کردیا]۔پس جو کچھ رسول اللہ ﷺ نے کیا؛ وہ آپ کے علم و فضل کے شایان شان تھا۔اور جو کچھ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کیا' وہ آپ کے لائق تھا؛ اس لیے کہ جس چیز کا علم رسول اللہ ﷺ کو تھا؛ اس کا علم آپ کو حاصل نہیں تھا۔

❀ چھٹا جواب: ان سے کہا جائے گا: تصور کیجیے! جانشین مقرر کرنا واجب تھا؛ تو پھر نبی کریم ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اپنا جانشین مقرر کیا تھا؛ جیسا کہ تعیین استخلاف والوں کا کہنا ہے۔اور اس پر دیگر اقوال بھی دلالت کرتے ہیں ۔

[اعتراض]: شیعہ مصنف کا یہ قول کہ ''حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مدینہ کی امارت سے معزول نہیں کیا تھا۔''❶

[جواب]: ہم کہتے ہیں: ایک غلط بات ہے۔اس لیے کہ جونہی نبی کریم ﷺ مدینہ واپس وارد ہوئے ،حضرت علی رضی اللہ عنہ آپ کے واپس آنے سے خود بخود ہی معزول ہوگئے۔جس طرح آپ کے دیگر نائبین آپ کی تشریف آوری سے از خود اُس منصب سے الگ ہو جایا کرتے تھے جس پر آپ ان کو اپنی عدم موجودگی میں مقرر فرمایا کرتے تھے۔[آپ نے اس کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کفار سے اظہار براءت کرنے کے لیے مکہ بھیجا تھا]۔نیز آپ کو یمن میں عامل مقرر کیا[تھا جہاں سے] آپ حجۃ الوداع کے موقع پر [واپس آکر] رسول اللہ ﷺ سے ملے؛ اس وقت مدینہ پر آپ کے علاوہ کوئی دوسرا خلیفہ تھا۔

❶ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے امارت مدینہ سے معزول نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ غزوۂ تبوک سے واپس آنے کے بعد نبی کریم ﷺ مدینہ میں سیدنا علی کے محکوم ہوں گے۔ممکن ہے شیعہ مصنف الوہیت علی کا قائل ہو اور اس کے نزدیک سرور کائنات کا سیدنا علی کے زیر فرمان ہونا چنداں قابل اعتراض نہ ہو جیسا کہ اس کے پیش رو ابن ابی الحدید شارح نہج البلاغہ کا قول ہے۔

کیا آپ یہی سمجھتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ یمن میں تھے اور رسول اللہ ﷺ مدینہ میں تھے؛ مگر پھر بھی مدینہ میں خلیفہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی تھے؟[ایں چہ بوالعجمی است؟]۔

❀ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایسی بات کوئی ایسا جاہل ہی کہہ سکتا ہے جسے نبی کریم ﷺ کے احوال کا کچھ پتہ نہ ہو۔گویا کہ اس کا خیال یہ ہو کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ برابر مدینہ میں خلیفہ رہے یہاں تک نبی کریم ﷺ کا انتقال ہوگیا۔مگر انہیں اس بات کا علم نہ ہوسکا کہ اسکے بعد رسول اللہ ﷺ نے سن ۹ھ میں آپ کو اپنا نمائندہ بنا کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کیساتھ بھیجا تا کہ اہل مکہ کے عہد انہیں واپس کریں۔اس وقت آپ پر امیر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تھے۔پھر ابوبکر رضی اللہ عنہ کیساتھ واپس آنے کے بعد آپ کو یمن روانہ فرمایا۔آپ کے علاوہ حضرت معاذ اور حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہما کو بھی یمن بھیجا تھا۔

❀ پھر جب نبی کریم ﷺ نے حجۃ الوداع والے سال حج کیا؛ تو اس وقت مدینہ پر اپنا جانشین حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علاوہ کسی دوسرے صحابی کو بنایا تھا۔حضرت علی رضی اللہ عنہ واپس مکہ میں آکر آپ سے ملے۔اس وقت رسول اللہ ﷺ نے سو اونٹوں کی قربانی دی؛ جن میں سے سڑسٹھ اونٹ خود رسول اللہ ﷺ نے نحر کئے؛ جب تینتیس اونٹوں کی قربانی کرنے کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ذمہ داری تفویض فرمائی۔

یہ تمام باتیں اہل علم کے ہاں معلوم شدہ اور متفق علیہ ہیں۔اور متواتر اسناد کیساتھ ایسے منقول ہیں گویا کہ آپ اپنی آنکھوں کے سامنے یہ ساری چیزیں دیکھ رہے ہوں۔اور جس انسان کو رسول اللہ ﷺ کے احوال کے بارے میں علم نہ ہو؛ اس کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ ایسے بنیادی اور اصولی مسائل میں گفتگو کرے۔

خلیفہ اسی وقت خلیفہ ہوسکتا ہے جب تک مستخلِف [جس کی جگہ خلیفہ بنایا جانا ہو] غائب نہ ہو؛ یا اس کا انتقال نہ ہو چکا ہو۔جب نبی کریم ﷺ خود مدینہ طیبہ میں موجود تھے تو پھر وہاں پر آپ کے جانشین کا ہونا بھی ممتنع ہے۔جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے اس کے علاوہ دیگر مواقع پر اپنی عدم موجودگی میں جتنے بھی لوگوں کو مدینہ پر اپنا جانشین مقرر کیا؛ آپ کے واپس آتے ہی ان کی جانشینی ختم ہوگئی۔یہی حال تمام ولاۃ الامور کا ہوتا ہے؛ جب وہ اپنی عدم موجودگی میں اپنے شہر پر کسی کو جانشین مقرر کرتے ہیں تو جب بھی جانشین مقرر کرنے والا خود واپس آجائے تو اس کی جانشینی کی حیثیت ختم ہوجاتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ یوں کہنا درست نہیں ہے کہ:''بیشک فلاں کو اللہ تعالیٰ نے اپنا جانشین بنایا۔'' سو بلاشک و شبہ اللہ تعالیٰ زندہ و قائم؛ اور اپنے بندوں کے امور کا مدبر ہے۔وہ موت؛ نیند اور غائب ہونے سے مبرا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جب لوگوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہا:''یا خلیفۃ اللہ!'' تو آپ نے فرمایا:''میں خلیفۃ اللہ نہیں ہوں؛ بلکہ میرے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ کا خلیفہ ہوں۔''

ہاں اللہ تعالیٰ کے لیے یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے کہ وہ بندے کا خلیفہ ہے۔جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"اللہم أنت الصاحب في السفر و الخلیفة في الأھل۔"

''اے اللہ! تو ہی سفر کا ساتھی ہے اور گھر والوں میں خلیفہ ہے۔''

اور حدیث دجال میں آتا ہے:''واللہ خلیفتي علی کل مسلم۔''

''اللہ تعالیٰ ہر مسلمان پر میرا خلیفہ ہے۔'' پس ہر وہ جسے اللہ تعالیٰ نے قرآن میں خلیفہ کہا ہے' وہ اپنے سے پہلی مخلوق کا جانشین وخلیفہ ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ﴾ [یونس ۱۴]

''پھر ان کے بعد ہم نے دنیا میں بجائے ان کے تم کو جانشین کیا۔''

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَ اذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ﴾ [الاعراف ۶۹]

''پھر یہ حالت یاد کرو کہ اللہ نے تم کو قوم نوح کے بعد جانشین بنایا۔''

اور ارشاد الٰہی ہے:

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾ [النور ۵۵]

''وعدہ کر لیا اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں سے جو تم میں سے ایمان لائے ہیں اور نیک کام کیے، وہ انہیں ضرور حاکم کر دے گا جیسے ان لوگوں کو حاکم کیا تھا جو ان سے پہلے گزر چکے۔''

جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا:

﴿وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً﴾ [البقرۃ ۳۰]

''اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں۔''

یعنی اس مخلوق کا جانشین بنانے والا ہوں جو تم سے پہلے زمین پر تھے؛ جیسا کہ مفسرین نے ذکر کیا ہے۔ رہ گیا فرقہ اتحادیہ کا نظریہ؛ جو یہ خیال کرتے ہیں کہ انسان اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہے تو یہ محض جہالت اور گمراہی ہے۔

فصل:

امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی پانچویں حدیث

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:

''امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اثبات میں پانچویں حدیث وہ ہے جو جمہور علماء نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے: کہ نبی کریم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مخاطب کر کے فرمایا: ''آپ میرے بھائی، میرے وصی، میرے خلیفہ اور میرے بعد میرے قرض کو ادا کرنے والے ہیں۔'' یہ روایت اس باب میں نص کی حیثیت رکھتی ہے۔'' [انتھی کلام الرافضی]

[جواب]: اس کا جواب کئی وجوہ سے دیا گیا ہے:

❀ پہلا جواب: یہ ہے کہ ہم شیعہ سے اس روایت کی صحت ثابت کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ حدیث ان کتب میں موجود نہیں ہے کہ جن کی طرف حدیث کو منسوب کرنا ہی حجت ہو۔ اور نہ ہی ائمہ حدیث میں سے کسی ایک نے اسے صحیح کہا ہے۔

❀ شیعہ مصنف کا یہ قول کہ: ''جمہور علماء نے یہ روایت ذکر کی ہے۔'' [یہ مبالغہ پر مبنی ہے؛ اس لیے کہ]۔ اگر شیعہ مصنف کی اس سے مراد وہ علماء حدیث ہیں جن کا اپنی کتب میں روایت کرنا حجت سمجھا جاتا ہے؛ جیسے امام بخاری؛ مسلم وغیرہ؛ اور انہوں نے اس روایت کو صحیح کہا ہے؛ تو یہ محض ایک جھوٹ اور کھلا ہوا افتراء ہے۔ اور اگر وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ ابونعیم نے ''الفضائل'' میں اور مغازلی یا خطیب خوارزمی اور ان جیسے دوسرے لوگوں نے اسے روایت کیا ہے؛ یا اسے فضائل کی کتابوں میں روایت کیا گیا ہے۔ تو محض [ان کے روایت کرنے سے] یہ روایت باتفاق اہل علم فروعی مسائل میں بھی حجت نہیں [ہوسکتی] تو پھر امامت کے مسئلہ میں کیسے حجت ہوسکتی ہے؟ جس کی وجہ سے تم نے قیامت کھڑی کر رکھی ہے۔ [پس اس کا باطل ہونا واضح ہے]۔

❀ دوسرا جواب : تمام اہل علم محدثین کا اس روایت کے جھوٹ ہونے پر اتفاق ہے۔ اس سے پہلے ابن حزم رحمہ اللہ کی وضاحت گزر چکی ہے جس میں آپ فرماتے ہیں: ان ساری من گھڑی روایات کو ہر وہ انسان جانتا ہے جسے علم حدیث اور راویوں کے احوال کے ساتھ کوئی ادنی شغف بھی ہو۔ آپ نے یہ بات بالکل سچ ارشاد فرمائی ہے۔ اس لیے کہ جس انسان کو صحیح اور ضعیف حدیث کی ادنی سی معرفت بھی ہو وہ جانتا ہے کہ مذکورہ بالا اور اس کی مانند دوسری روایات ضعیف ہیں۔ بلکہ اکثر جھوٹ اور من گھڑت ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایسی کوئی روایت کسی ایسے محدث نے اپنی ان کتابوں میں روایت نہیں کی جنہیں حجت سمجھا جاتا ہے۔ ایسی روایات ان لوگوں نے نقل کی ہیں جو اپنی کتابوں میں موٹی اور پتلی [صحیح اور ضعیف] ہر قسم کی روایات جمع کرتے ہیں۔ جن کے بارے میں اہل علم جانتے ہیں کہ ان میں بہت زیادہ باتیں جھوٹ ہیں۔ جیسے کتب تفاسیر میں سے :تفسیر ثعلبی؛ تفسیر واحدی اور ان جیسی دیگر تفاسیر۔ اور فضائل کی کتابوں میں سے جو ہر قسم کی روایات جمع کرتا ہے ان میں خصوصی طور پر خطیب خوارزمی قابل ذکر ہے ۔ جھوٹی روایات ذکر کرنے میں خطیب صاحب لوگوں میں سب سے زیادہ مشہور ہے۔ خطیب صاحب اور مغازلی کو علوم حدیث میں مہارت نہیں ہے [اسی وجہ سے وہ ہر قسم کی روایات جمع کرتے رہتے ہیں]۔

محدث ابن الجوزی رحمہ اللہ نے کتاب الموضوعات میں یہ روایت ابو حاتم بستی سے نقل کی ہے؛ وہ کہتا ہے: ہم سے محمد بن سہل بن ایوب نے حدیث بیان کی اور کہا: ہم سے عمار بن رجاء نے بیان کیا اور کہا: ہم سے عبید اللہ بن موسی نے حدیث بیان کی اور کہا: ہم سے مطر بن میمون نے روایت بیان کی وہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''بیشک علی بن ابی طالب میرا بھائی، میرا وزیر، میرے کنبہ میں جانشین ؛ میرے بعد بہترین انسان جسے میں چھوڑے جا رہا ہوں؛ میرے بعد میرے قرض کو ادا کرنے والا اور میرے وعدوں کو پورا کرنے والا ہے۔''

[ابن جوزی فرماتے ہیں:] یہ روایت موضوع ہے۔ محدث ابن حبان رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''مطر بن میمون نامی راوی ثقہ لوگوں کے نام لیکر موضوعات روایت کرتا ہے، اس سے روایت کرنا حلال نہیں۔''

ابن عدی کے واسطہ سے بھی یہ روایت اسی طرح بیان کی گئی ہے۔ اس روایت کا مدار مطر نامی راوی پر ہے، اس میں'' خلیفتي و وصیي '' کے الفاظ نہیں ہیں۔ بلکہ ''خلیفتي فی أھلي '' کے الفاظ ہیں۔

اسی طرح کے الفاظ میں یہ روایت احمد بن عدی سے بھی روایت کی گئی ہے۔اس کی سند کا مدار عبیداللہ بن موسی کی مطر بن میمون سے روایت پر ہے۔خود عبید اللہ بن موسی صدوق[سچا]ہے؛ اس سے امام بخاری رحمہ اللہ نے بھی روایت کیا؛ مگر یہ شیعیت میں معروف ہے۔یہ اپنی شیعیت کی وجہ سے غیر ثقہ لوگوں سے بھی ایسی روایات نقل کرتا تھا جو اس کی خواہشات نفس کے مطابق ہوں۔''

جیسا کہ اس نے مطر بن میمون سے یہ روایت نقل کی ہے۔حالانکہ یہ محض جھوٹ ہے۔ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ اسے اس روایت کے جھوٹ ہونے کا علم بھی ہو؛ اور ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ اپنے نفس کی خواہش پر لبیک کہتے ہوئے؛ اس کے جھوٹ سچ پر تحقیق ہی نہ کی ہو۔اگر وہ اس کی تحقیق کرتا تو اس پر اس روایت کا جھوٹ ہونا واضح ہوجاتا۔اس کے باوجود جن لوگوں نے اسے روایت کیا ہے ان کے الفاظ میں:''خـلـيـفة من بعدی ''میرے بعد خلیفہ ہوگا؛ کے الفاظ نہیں ہیں۔بلکہ وہاں پر یہ الفاظ ہیں:'' وخليفتي في أهلي۔''''میرے اہل خانہ میں میرا جانشین ہوگا۔'' یہ ایک خاص استخلاف ہے۔

جب کہ دوسرے الفاظ جو کہ ابن عدی نے روایت کئے ہیں' وہ یوں ہیں: آپ فرماتے ہیں:

"حدثنا ابن ابی سفیان ' حدثنا عدی ابن سهل ؛ حدثنا عبیدالله بن موسی ؛حدثنا مطر عـن أنس قال: قال رسول الله ﷺ: عـلـي أخي وصاحبي و ابن عمي ؛ خير من أترك من بعدي ؛ يقضي ديني و ينجز موعدي ۔"

''بیشک علی میرا بھائی اور میرا دوست اور میرے چچا کا بیٹا ہے۔میرے بعد ان لوگوں میں سے بہترین انسان جنہیں میں چھوڑے جارہا ہوں۔یہ میرا قرض ادا کرے گا اور میرے وعدے پورے کرے گا۔''

اس میں کوئی شک نہیں کہ مطر نامی راوی انتہائی جھوٹا ہے۔اس کے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کرنے کے باوجود اہل کوفہ میں سے کسی ایک نے بھی اس سے حدیث روایت نہیں کی۔نہ ہی اس سے یحی بن سعید القطان نے روایت کیا ہے؛ نہ ہی وکیع نے' نہ ہی ابومعاویہ نے؛ نہ ہی ابونعیم نے؛ نہ ہی یحی بن آدم اور ان کے امثال دوسرے محدثین نے۔حالانکہ اس وقت کوفہ میں کثرت کے ساتھ شیعہ موجود تھے۔اور وہاں کے بہت سارے عوام ایسے بھی تھے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر ترجیح دیتے تھے۔اور ان کی احادیث اصحاب کتب ستہ نے روایت کی ہیں۔یہاں تک کہ ترمذی اور ابن ماجہ ضعفاء تک سے روایت کرتے ہیں؛ مگر انہوں نے اس انسان سے روایت نقل نہیں کی۔بیشک یہ روایت عبیداللہ بن موسیٰ نے اپنی خواہش نفس کی وجہ سے اس لیے نقل کی ہے کہ وہ شیعیت کی طرف میلان ظاہر کرتا تھا۔اور اس طرح کے لوگوں سے ایسی روایات نقل کرلیا کرتا تھا بھلے وہ جھوٹے ہی کیوں نہ ہوں۔

یہی وجہ ہے کہ امام احمد رحمہ اللہ جیسے محدث نے عبیداللہ بن موسی سے روایت نقل نہیں کی؛ بخلاف عبدالرزاق کے۔امام احمد فرماتے ہیں:''بیشک عبیداللہ اپنے پاس موجود چیز کا اظہار کرلیا کرتا تھا بخلاف عبدالرزاق کے۔

ایسے ہی جو روایات اس مطر نامی راوی نے اپنی طرف سے گھڑلی ہیں ان میں سے وہ روایات بھی ہیں جو ابوبکر خطیب نے اپنی تاریخ میں روایت کی ہیں: ان میں عبیداللہ بن موسی کی روایت بھی ہے جسے وہ مطر سے اور وہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے

روایت کرتا ہے آپ فرماتے ہیں: میں رسول اللہ ﷺ کے پاس موجود تھا۔ آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا؛ تو فرمایا: ''میں اور یہ [یعنی علی] بروز قیامت اپنی امت پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے حجت ہوں گے۔''

ابن جوزی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''یہ حدیث موضوع ہے۔'' اس افتراء کا سہرا مطر کے سر ہے؛ اس کے بارے میں ابو حاتم فرماتے ہیں: ''ثقہ راویوں کی طرف من گھڑت روایات منسوب کرتا ہے۔'' اس سے روایت نقل کرنا حلال نہیں۔

❀ تیسری وجہ: رسول اللہ ﷺ کا قرض حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نہیں ادا کیا۔ بلکہ صحیح روایت میں ہے: ''بیشک رسول اللہ ﷺ کا انتقال ہوا تو آپ کی درع تیس وسق **جو** کے بدلے ایک یہودی کے پاس گروی رکھی ہوئی تھی۔ یہ غلہ آپ نے اپنے اہل خانہ کے لیے خریدا تھا۔''

یہ قرض اس گروی سے پورا کیا گیا جو آپ نے اس کے پاس رہن میں رکھی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ نبی کریم ﷺ پر کوئی قرض نہیں تھا۔ صحیح احادیث میں ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''میرے ورثا ایک دینار یا درہم بھی تقسیم نہیں کریں گے۔ جو کچھ میں اپنے بعد چھوڑ دوں' وہ میری ازواج کا خرچہ ہے اور جو کچھ میرے عمال کما لائیں گے وہ صدقہ ہوگا۔''

اگر آپ پر کوئی قرض ہوتا تو اسے آپ کے چھوڑے ہوئے ترکہ سے پورا کر دیا جاتا۔ اس لیے کہ قرض کی ادائیگی صدقہ پر مقدم ہے۔ جیسا کہ صحیح حدیث سے یہ بات ثابت ہے۔

امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی چھٹی حدیث:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:

''امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اثبات میں چھٹی روایت حدیث مواخات ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ مباہلہ والے دن اور جب نبی کریم ﷺ نے مہاجرین و انصار کے درمیان بھائی چارہ قائم کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کھڑے تھے اور آپ کو دیکھ اور جان رہے تھے، آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور کسی شخص کے درمیان بھائی چارہ قائم نہ کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ روتے ہوئے واپس لوٹ گئے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''ابو الحسن کہاں گئے؟'' لوگوں نے کہا: ''روتے اور آنسو بہاتے ہوئے چلے گئے۔'' [آپ نے فرمایا: ''اے بلال! جاؤ' اور انہیں میرے پاس بلا لاؤ۔ آپ ان کے پاس چلے گئے۔ جب آپ ان کے گھر میں داخل ہوئے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے]۔ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے رونے کی وجہ پوچھی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ آپ نے مہاجرین و انصار کے درمیان مواخات قائم کی ہے اور کسی کو میرا بھائی نہیں بنایا۔'' سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: اللہ تعالیٰ آپ کو رسوا نہیں کرے گا، ہوسکتا ہے نبی کریم ﷺ آپ کو اپنا بھائی بنانا چاہتے ہوں۔'' حضرت بلال نے کہا: اے علی! رسول اللہ ﷺ آپ کو بلا رہے ہیں؛ تشریف لائیے۔ جب حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے بلانے پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے رونے کا سبب دریافت کیا: اے ابو الحسن! تمہیں کس چیز نے رلا دیا؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آپ کو رونے کا سبب بتایا تو یہ سن کر نبی ﷺ نے فرمایا: ''بیشک میں نے تجھے اپنے لیے خاص کیا ہے۔ کیا تجھے یہ بات پسند نہیں کہ تو نبی کا

بھائی قرار پائے؟ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: ''کیوں نہیں؟'' نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑا اور منبر کے پاس آ کر کہا: ''علی میرا ہے اور میں اس کا ہوں ۔ ان کو مجھ سے وہی مرتبہ حاصل ہے جو ہارون کو موسیٰ علیہما السلام سے تھا۔ آگاہ ہو جاؤ! جس کا میں مولی ہوں علی اس کا مولیٰ ہے۔'' جب آپ واپس پلٹے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کے پیچھے گئے اور فرمایا: ''اے ابوالحسن! خوشخبری ہو! آپ میرے اور ہر مسلم کے مولیٰ ہو گئے ہیں۔'' نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مواخات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ افضل الصحابہ ہیں ۔ لہٰذا آپ ہی امام و خلیفہ ہوں گے۔'' [شیعہ کا بیان ختم ہوا]

[جواب]: پہلا جواب: سب سے پہلے ہم اس روایت کی صحت پیش کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں ۔ اس لیے کہ مصنف نے اس روایت کو کسی بھی کتاب کی طرف منسوب نہیں کیا۔ جیسا کہ وہ اپنی عادت کے مطابق روایات کو منسوب کرتا ہے۔ اگرچہ اس کی عادت ایسی کتابوں کی طرف منسوب کرنا ہے جن سے حجت قائم نہیں ہوتی ۔ یہاں پر اس نے اپنے اسلاف رافضی شیوخ کی عادت کے مطابق ارسال سے کام لیا ہے؛ جو جھوٹ بولتے ہیں اور جھوٹ کو بغیر کسی سند کے نقل کرتے ہیں۔

ابن مبارک رحمہ اللہ کا فرمان ہے:

''اسناد دین کا حصہ ہیں ۔ اگر اسناد نہ ہوتیں تو جو کوئی اپنی مرضی سے جو کچھ چاہتا کہتا پھرتا۔ اور اگر اس سے سوال کیا جاتا تو وہ حیران و سرگرداں رک جاتا۔''

❀ دوسرا جواب: ہم کہتے ہیں: یہ روایت محدثین کے ہاں صریح جھوٹ ہے۔ حدیث کا ادنی علم رکھنے والا بھی اس کے جھوٹ ہونے میں ذرا بھر بھی شک نہیں کرتا۔ اور اس حدیث کو گھڑنے والا انتہائی بڑا جاہل ہے؛ اس نے ایسا جھوٹ بولا ہے جو صاف صاف اور کھلا ہوا ظاہر ہے۔ حدیث کی ادنی معرفت رکھنے والا بھی اس کے جھوٹ ہونے کو جانتا ہے جیسا کہ اس کا بیان آگے آئے گا۔

❀ تیسرا جواب: مواخات علی رضی اللہ عنہ کی تمام احادیث موضوع اور من گھڑت ہیں ۔ نہ ہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو اپنا بھائی بنایا اور نہ ہی مواخات مہاجرین کے مابین تھی ۔ نہ ہی ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو بھائی بنایا؛ اور نہ ہی انصار کے مابین بھائی چارہ قائم کیا۔ لیکن ایسا ضرور ہوا ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو آپ نے مہاجرین و انصار کے مابین مواخات کا رشتہ آغاز ہجرت میں استوار کیا تھا۔ جب کہ مباہلہ کا واقعہ سن ۹ یا ۱۰ ہجری میں اس وقت پیش آیا جب نجران کا وفد حاضر خدمت ہوا۔

❀ چوتھا جواب: اس حدیث کے جھوٹ ہونے کے دلائل صاف واضح ہیں۔ ان میں سے ایک: شیعہ مصنف کہتا ہے کہ: ''جب مباہلہ کا دن تھا؛ تو آپ نے مہاجرین و انصار کے مابین بھائی چارہ قائم کیا۔'' مباہلہ کا واقعہ وفد نجران کی آمد کے موقعہ پر ہوا تھا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے سورت آل عمران کی آیات نازل فرمائیں ۔ یہ سن نو ہجری کے آخر یا دس ہجری کے شروع کا واقع ہے۔ لوگوں کا اتفاق ہے کہ یہ واقعہ اس سے پہلے پیش نہیں آیا۔ دراصل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نجران کے عیسائیوں کے ساتھ مباہلہ وقوع پذیر نہیں ہوا تھا بلکہ انہیں دعوتِ مباہلہ دی گئی تھی ۔ انھوں نے مشورہ کی مہلت طلب کی ۔ جب خلوت میں مشورہ کیا تو ایک دوسرے سے کہنے لگے: ''آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے نبی ہیں اور جو قوم نبی سے مباہلہ کرتی ہے

برباد ہوجاتی ہے۔'' چنانچہ اہل کتاب میں یہ سب سے پہلے لوگ تھے جنھوں نے جزیہ دینا تسلیم کیا اور چلے گئے۔''❶

لوگوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ مباہلہ کے دن کوئی مؤاخات نہیں ہوئی۔

❀ پانچواں جواب: مہاجرین و انصار کے مابین مؤاخات کا واقعہ پہلی سن ہجری میں دار بنی النجار میں پیش آیا تھا۔ مباہلہ اور مؤاخات کے مابین کئی سال کا فاصلہ ہے۔

❀ چھٹا جواب: نبی کریم ﷺ نے مہاجرین و انصار کے مابین مؤاخات قائم کی تھی۔ نبی کریم ﷺ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ دونوں ہی مہاجر تھے۔ ان کے مابین مؤاخات نہیں قائم ہوئی تھی۔ بلکہ نبی کریم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت سہیل بن حنیف رضی اللہ عنہ کے مابین بھائی چارہ قائم کیا تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ بھائی چارہ رسول اللہ ﷺ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مابین نہیں تھا۔ یہ بات صحیحین کی روایت کے موافق ہے کہ مؤاخات مہاجرین و انصار کے مابین تھی؛ مہاجرین و مہاجرین کے مابین نہیں تھی۔

❀ ساتواں جواب: "أما ترضى أن تكون مِنِّيْ بِمَنْزِلَةِ هَارُوْنَ مِنْ مُوْسٰى۔"

''کیا تم اس بات پر راضی نہیں کہ تمہیں میرے ساتھ وہی منزلت ایسے ہی ہو جیسے ہارون حضرت موسیٰ کے ساتھ۔''

یہ جملہ آپ نے ایک ہی بار غزوہ تبوک کے موقع پر ارشاد فرمایا تھا۔ اس مجلس کے علاوہ آپ نے کسی بھی دوسرے موقع پر آپ نے اصلاً یہ جملہ ارشاد ہی نہیں فرمایا۔ اس پر تمام محدثین اہل علم کا اتفاق ہے۔ جب کہ ان کی روایت کردہ حدیث موالاۃ کے الفاظ بھی غدیر خم کے موقع پر ارشاد فرمائے تھے۔ اس کے علاوہ کسی اور مجلس میں آپ نے یہ جملے ارشاد ہی نہیں فرمائے۔

❀ آٹھواں جواب: اس سے پہلے حدیث مواخات کے بارے میں گفتگو گزر چکی ہے۔ اس حدیث میں علی الاطلاق عموم ہے جس سے نہ ہی کسی افضلیت کا تقاضا ثابت ہوتا ہے اور نہ ہی امامت کا۔ اور جو فضیلت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے لیے ثابت ہے اس میں کوئی دوسرا آپ کا شریک نہیں؛ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

''اگر میں زمین والوں میں سے کسی کو گہرا دوست بنانا چاہتا تو ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بناتا۔''❷

اور نبی کریم ﷺ کا یہ خبر دینا کہ: مردوں میں حضرت ''ابوبکر رضی اللہ عنہ آپ کو عزیز تر ہیں۔''

اور حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کا گواہی دینا کہ: ''نبی ﷺ بھی ہم سب سے زیادہ آپ کو چاہتے تھے۔''

اور ان کے علاوہ دیگر وہ روایات ہیں جن سے دلائل کی روشنی میں نقلی طور پر حدیث مواخات سے ان لوگوں کے استدلال کا بطلان ثابت ہوتا ہے۔

❀ نواں جواب: بعض لوگوں کا یہ خیال کر لینا کہ مواخات کا رشتہ مہاجرین کے مابین قائم ہوا تھا؛ کیونکہ اس طرح کی بعض

---

❶ سیرة ابن هشام(ص:٢٧١۔٢٧٧)، صحيح بخاری، كتاب المغازی، باب قصة اهل نجران(حديث:٤٣٨٠)۔

❷ صحيح بخاری، كتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ، باب قول النبی ﷺ "لو كنت متخذا خليلا" (ح٣٦٥٨)، صحيح مسلم، كتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل ابی بكر الصديق رضی الله عنه (حديث: ٢٣٨٢، ٦/ ٢٣٨٣)۔

روایات نقل کی گئی ہیں ۔مگر یہ بات دوٹوک یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ ایسا بالکل نہیں ہوا تھا۔اور اس طرح کی جتنی بھی روایات ہیں' وہ سب باطل ہیں ۔یہ ان لوگوں کی روایات ہیں جو جان بوجھ کر جھوٹ بولتے ہیں یا پھران لوگوں نے انہیں نقل کیا ہے جن سے نقل کرنے میں خطا واقع ہوئی ہے۔یہی وجہ ہے کہ اصحاب صحاح [ستہ] نے اس طرح کی کوئی روایت نقل نہیں کی۔

❀ صحیح احادیث سے ثابت شدہ بات ہے کہ مؤاخات کا رشتہ مہاجرین و انصار کے مابین قائم ہوا تھا۔ یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ اگر مہاجرین کا ان کے آپس میں اور انصار کا ان کے مابین رشتہ مؤاخات قائم کیا ہوتا تو اسے نقل کرنے اور اتنی اہمیت دینے کی کوئی وجہ یا سبب نہ ہوتا۔اور جہاں دوسرے امور ذکر کئے جاتے ہیں وہاں احادیث مؤاخات میں اس کا ذکر بھی کیا گیا ہوتا۔حالانکہ اس بارے میں کوئی ایک بھی صحیح حدیث نہیں ہے' اور نہ ہی اصحاب صحاح ستہ نے ایسی کوئی روایت نقل کی ہے۔یہ بات ہر وہ انسان جانتا ہے جسے صحیح احادیث اور سیرت کی متواتر روایات؛ رسول اللہ ﷺ کے احوال ؛مؤاخات کے اسباب و فوائد اور مقصود کا علم ہوتا ہے۔وہ اس مؤاخات کی رو سے ایک دوسرے کے وارث بھی بنتے تھے۔سو نبی کریم ﷺ نے مہاجرین وانصار کے مابین مؤاخات کا رشتہ قائم کیا تھا۔جیسا کہ آپ نے حضرت سعد بن ربیع اور عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہما ؛اور حضرت سلیمان فارسی اور حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہما کے مابین مؤاخات قائم کی تھی تاکہ مہاجرین وانصار کے مابین ایک صلہ قائم ہو جائے۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَ اُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ﴾ [الأنفال ۷۵]

''اور رشتے دار اللہ کی کتاب میں ایک دوسرے کے زیادہ حق دار ہیں۔''

یہ وہی حلف ومؤاخات ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَ الَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ ﴾ [النساء ۳۳]

''اور جن لوگوں کو تمھارے عہد و پیمان نے باندھ رکھا ہے انھیں ان کا حصہ دو۔''

فقہاء کے مابین اختلاف ہے کہ: کیا یہ آیت محکم ہے؟ اور اس کے موجب سے نسب نہ ہونے پر میراث دی جائے گی یا نہیں؟ اس میں دو قول ہیں ۔اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے بھی دو روایات ہیں ۔ پہلا مذہب امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا ہے۔اور دوسرا مذہب امام شافعی اور امام مالک رحمہما اللہ کا ہے۔

[حدیث الرایہ: سے اثبات امامت:]

فصل:

[امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ساتویں حدیث]

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:

''اس ضمن میں ساتویں حدیث جسے جمہور نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے۔جب آپ نے انتیس (۲۹) راتوں تک خیبر کا محاصرہ کیا؛ اس وقت تک علمبردار حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے ۔ پھر آپ کو آنکھوں کی بیماری لاحق ہوگئی جس

کی وجہ سے آپ جنگ سے عاجز آ گئے۔اس وقت مرحب جنگ کے لیے چیلنج کرتا ہوا نکلا۔اس وقت رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بلایا؛ اور فرمایا: یہ جھنڈا لے لو[اور حملہ کرو]۔ابوبکر نے جھنڈا لیا اور مہاجرین کے ایک گروہ کے ساتھ مقابلہ کے لیے نکلے۔مگر کوئی فائدہ حاصل نہ ہوا۔شکست خوردہ واپس لوٹے۔اس کے اگلے دن حضرت عمر رضی اللہ عنہ مقابلہ کے لیے نکلے۔آپ تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ واپس لوٹے اور اپنے ساتھیوں کو بھی خبر دی[یعنی انہیں بھی بزدل بنا کر واپس لے آئے]۔اس وقت رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''میرے پاس حضرت علی رضی اللہ عنہ کو لایا جائے۔آپ کو بتایا گیا:''آپ کی آنکھوں میں تکلیف ہے۔'' پھر آپ نے فرمایا: ''اسے لاکر مجھے دکھاؤ؛ مجھے ایسا شخص دکھاؤ جو اللہ و رسول ﷺ سے محبت کرنیوالا ہے اور اللہ اور اس کا رسول اس سے محبت کرتے ہیں۔ جو بھاگنے والا نہیں۔''اس وقت لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو لیکر آئے۔آپ نے اپنا لعاب دہن اپنی ہتھیلی پر لے کر آپ کی آنکھوں میں اور سر پر لگایا۔اس سے آپ تندرست ہوگئے۔سو آپ نے انہیں علم عطا کیا؛ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ہاتھوں پر فتح عطا کی؛ اور مرحب قتل ہوا۔نبی کریم ﷺ کا آپ کے لیے یہ اوصاف بیان کرنا دوسروں سے ان اوصاف کے منفی ہونے کی دلیل ہے۔یہ آپ کی افضلیت کی دلیل ہے؛ پس آپ ہی امام ہوں گے۔''

[جوابات]: پہلا جواب: اس روایت کی صحت پیش کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔رافضی مصنف کا یہ کہنا کہ:''اس روایت کو جمہور نے روایت کیا ہے۔''تو ہم کہتے ہیں کہ: ثقہ علماء نے یہ روایت ان الفاظ میں نقل نہیں کی۔ بلکہ صحیح روایت میں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ خیبر میں موجود نہ تھے؛ بلکہ آپ غائب تھے۔آپ اس غزوہ سے اس لیے پیچھے رہ گئے تھے کہ آپ کی آنکھوں میں تکلیف تھی۔پھر آپ پر نبی کریم ﷺ سے پیچھے رہنا گراں گزرا؛ لہٰذا آپ نبی کریم ﷺ سے جا ملے۔آپ کے خیبر پہنچنے سے قبل رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا:''کل میں یہ جھنڈا ایسے انسان کو دوں گا جو اللہ و رسول ﷺ سے محبت کرنے والا ہے اور اللہ اور اس کا رسول اس سے محبت کرتے ہیں۔اور اللہ تعالیٰ اس کے ہاتھوں پر فتح عطا کرے گا۔''

اس سے قبل یہ جھنڈا نہ ہی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس تھا اور نہ ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس۔اور نہ ہی ان دونوں میں سے کوئی ایک جھنڈے کے قریب تک گیا۔یہی وجہ ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے:''میں نے اس دن کے علاوہ کبھی بھی امیر بننا پسند نہیں کیا۔اور تمام لوگوں نے اس حالت میں رات گزاری کہ ان میں سے ہر ایک اس امید پر تھا کہ شاید یہ جھنڈا اسے ہی مل جائے۔ جب صبح ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو طلب کیا؛ تو آپ کو بتایا گیا: کہ آپ کی آنکھوں میں تکلیف ہے تو آپ نے اپنا لعاب دہن ان کی آنکھوں میں ڈالا؛ جس سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو شفا دیدی اور آپ ﷺ نے انہیں جھنڈا عطا فرمایا۔''

❀ اس موقعہ پر نبی کریم ﷺ کا حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بطور خاص جھنڈا عطا کرنا آپ کی تکلیف کے باوجود تشریف آوری پر جزاء تھی۔ نبی کریم ﷺ کو آپ کے بارے میں علم تھا۔اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اس وقت وہاں پر حاضر نہیں تھے۔ یہ نبی کریم ﷺ کا معجزہ بھی ہے۔اس حدیث میں حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے شان میں کوئی تنقیص ہرگز نہیں۔

❀ دوسرا جواب: رسول اللہ ﷺ کا یہ خبر دینا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتے ہیں' اور اللہ اور اس

کا رسول ان سے محبت کرتے ہیں۔'' اس میں نواصب پر رد ہے۔لیکن اس میں رافضیوں کی کوئی دلیل نہیں ہے جو کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین مرتد ہو گئے تھے۔ اور نہ ہی ان کے لیے اس دلیل سے استدلال کرنا ممکن ہے۔ اس لیے کہ خوارج انہیں یہ جواب دیتے ہیں کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی تو ان لوگوں میں سے تھے جو مرتد ہو گئے تھے۔ جیسا کہ جب جرگہ داروں نے فیصلہ کیا تو خوارج حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہنے لگے: '' آپ اسلام سے ارتداد کا ارتکاب کر چکے ہیں؛ لہٰذا دوبارہ اسلام قبول کیجیے۔''

- امام ابوالحسن اشعری رحمہ اللہ اپنی کتاب '' المقالات'' میں لکھتے ہیں: '' حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کفر پر سب خوارج کا اجماع منعقد ہو چکا ہے۔''
- اس حدیث سے اہل سنت والجماعت کے لیے کئی دلائل کے ساتھ خوراج کے خلاف استدلال کرنا ممکن ہے۔ لیکن یہ دلائل باقی تینوں خلفاء کے ایمان کے بارے میں بھی مشترک ہیں۔ جب کہ رافضی باقی خلفاء کے ایمان پر تنقید کرتے ہیں۔ پس روافض کے لیے ممکن نہیں کہ وہ خوارج کے خلاف دلیل قائم کر سکیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ حالت ایمان میں فوت ہوئے تھے۔ بلکہ رافضی جو بھی ایسی دلیل ذکر کریں گے جس میں قدح ہو؛ اس سے خود ان کے اصل کا بطلان ثابت ہو گا۔ کیونکہ ان کی اصل ہی فاسد ہے۔
- اس وصف میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کسی خصوصیت کو بیان نہیں کیا گیا۔ اس لیے کہ دوسرے صحابہ بھی اللہ اور اس کے رسول کو چاہتے تھے ؛ اور اللہ اور اس کا رسول بھی انہیں چاہتے تھے۔ ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شخصیت کے لیے بطور تعین گواہی موجود ہے۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے دس بڑے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو جنت کی خوشخبری سنائی۔ اور حضرت قیس بن ثابت کے لیے جنتی ہونے کی گواہی دی؛ اور عبداللہ الحمار کے لیے گواہی دی کہ وہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے؛ حالانکہ انہیں کئی بار شراب نوشی پر سزا مل چکی تھی۔
- رافضی مصنف کا یہ کہنا کہ: '' اس سے باقی لوگوں سے اس وصف کا انتفاء ثابت ہوتا ہے۔'' اس میں دو جواب ہیں۔
- پہلا جواب: اگر اس بات کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو پھر بھی دیکھیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: '' کل میں یہ جھنڈا ایسے انسان کو دوں گا جو اللہ و رسول ﷺ سے محبت کرنیوالا ہے اور اللہ اور اس کا رسول اس سے محبت کرتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ اس کے ہاتھوں پر فتح عطا کریگا۔'' سو یہ مجموعہ [صفات] آپ کے ساتھ خاص ہیں اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ہاتھ پر فتح عطا کی۔ جب یہ متعین فتح آپ کے ہاتھوں پر تھی؛ تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آپ دوسروں سے بھی افضل اور امامت کے لیے مختص ہوں۔
- دوسرا جواب: یہ کہا جائے کہ: اس بات کو تسلیم کرنے یا نہ کرنے سے کسی کوئی خصوصیت ثابت نہیں ہوتی ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ میں یہ مال کسی فقیر آدمی یا نیک آدمی کو دوں گا۔ یا آج کے دن میں کسی مریض کو یا نیک انسان کو بلاؤں گا۔ یا میں اپنا جھنڈا کسی بہادر آدمی کو دوں گا۔ یہ اس طرح کے دیگر کلمات کہے۔ تو ان الفاظ میں کوئی ایسی چیز نہیں پائی جاتی کہ جس سے ظاہر ہوتا ہو کہ کسی دوسرے میں یہ صفات نہیں پائی جاتی۔ بلکہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان

صفات کا حامل ایک یہ انسان بھی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ کسی ایک نے اگر کہا ہو کہ وہ ایک ہزار درہم کسی نیک آدمی پر یا فقیر پر صدقہ کرونگا۔ پھر اس نے اپنی یہ نذر پوری کردی' تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس آدمی کے علاوہ کوئی دوسرا نیک یا فقیر نہیں۔ اور ایسے ہی اگر یوں کہا جائے کہ یہ مال اس آدمی کو دیدو' اس نے میری طرف سے حج کیا ہے۔ تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ کسی دوسرے نے اس کی طرف سے حج نہ کیا ہو۔

❀ تیسرا جواب: اگر یہ بات مان لی جائے کہ اس وقت میں آپ ہی افضل تھے؛ تو اس میں کوئی دلیل نہیں پائی جاتی کہ بعد کے کسی دوسرے وقت میں کوئی دوسرا آپ سے افضل نہ ہو۔

❀ چوتھا جواب: اگر آپ کی افضلیت کو مان بھی لیا جائے تو اس سے لازم نہیں آتا کہ آپ ہی امام منصوص علیہ ہیں۔ بلکہ بہت سارے شیعہ زیدیہ؛ اور متاخرین معتزلہ اور دوسرے لوگ آپ کی افضلیت کا اعتقاد رکھتے ہیں' مگر وہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ برحق مانتے ہیں۔ ان کے نزدیک مفضول کی ولایت جائز ہے۔ یہ بات بہت سارے ان دوسرے لوگوں کے ہاں بھی جائز جو خلفاء اربعہ میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دینے میں توقف اختیار کرتے ہیں؛ اور وہ لوگ جن کا خیال ہے کہ یہ ایک ظنی مسئلہ ہے؛ اس میں کسی ایک متعین کی فضیلت پر کوئی دلیل قطعی موجود نہیں ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جس انسان کو صحیح سنت کی معلومات نہ ہوں' وہ اس مسئلہ میں شک کا شکار ہو جائے گا۔

❀ جب کہ باقی تمام مشہور ائمہ کا اتفاق ہے کہ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما حضرت عثمان و حضرت علی رضی اللہ عنہما سے افضل ہیں۔ یہ اجماع کئی لوگوں نے نقل کیا ہے۔ جیسا کہ امام بیہقی رحمہ اللہ نے کتاب ''مناقب الشافعی'' میں اپنی سند کے ساتھ امام شافعی رحمہ اللہ سے نقل کی ہے۔ آپ فرماتے ہیں: حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے باقی تمام صحابہ سے افضل ہونے میں صحابہ کرام اور تابعین رضی اللہ عنہم اجمعین میں سے کسی ایک کا بھی اختلاف نہیں ہے۔''

❀ امام مالک رحمہ اللہ نے نافع سے اور وہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں: آپ فرماتے ہیں: ''ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں صحابہ کرام کو ایک دوسرے پر فضیلت دیا کرتے تھے؛ ہم کہا کرتے تھے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے بہترین انسان ابوبکر اور ان کے بعد عمر ہیں۔ رضی اللہ عنہما۔ اس بارے میں امام بخاری کا کلام گزر چکا ہے۔

❀ اور وہ شیعہ جنہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ وقت گزارا؛ ان کا بھی یہی عقیدہ تھا۔ یہی عقیدہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اسی (۸۰) سے زیادہ اسناد سے نقل ہے۔ یہ ایسی قطعی اور یقینی بات ہے جو کسی بھی ایسے انسان پر مخفی نہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین کے احوال کی معرفت رکھتا ہے۔

[امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حدیث طیر]:

[امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی آٹھویں حدیث]:

[اشکال] : شیعہ مصنف لکھتا ہے: ''تمام جمہور نے روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک پرندہ لایا گیا، تو آپ نے دعا کی: ''اے اللہ! اس پرندے کا گوشت کھانے کے لیے کسی ایسے شخص کو میرے پاس بھیج جو مجھے اور تجھے سب لوگوں میں سے عزیز تر ہو۔ اتنے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ تشریف لائے؛ اور دروازے پر دستک دی۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے کہا: رسول

اللہ ﷺ کسی ضرورت میں مشغول ہیں۔ پس وہ آدمی واپس چلا گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے پھر پہلے کی طرح دعا کی؛ اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ حضرت انس نے پھر کہا: کیا میں نے نہیں کہا کہ: آپ کسی ضرورت میں مشغول ہیں۔ وہ آدمی پھر واپس پلٹ گیا۔ نبی کریم ﷺ نے پھر پہلے کی طرح دعا کی؛ وہ آدمی پھر واپس آیا اور پہلے دو بار کی نسبت بہت سخت دستک دی۔ اس دستک کو رسول اللہ ﷺ نے سن لیا اور فرمایا: اسے اندر آنے کی اجازت دو۔ جب آپ اندر تشریف لائے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم نے اتنی دیر کیوں لگا دی؟ تو انہوں نے عرض کیا: میں ایک بار آیا تو مجھے انس نے واپس کر دیا' پھر دوسری بار آیا تو انس نے واپس کر دیا۔ پھر میں تیسری بار آیا تو انس نے واپس کر دیا۔ آپ نے پوچھا: اے انس! تم نے ایسے کیوں کیا؟ تو انہوں نے عرض کی: میں یہ امید کرتا تھا کہ یہ دعا انصار کے کسی فرد کے لیے ہو۔ تو آپ نے فرمایا: اے انس! کیا انصار میں علی سے بہتر بھی کوئی ہے؟ یا انصار میں علی سے افضل بھی کوئی ہے۔ جب آپ اللہ کے ہاں سب سے محبوب مخلوق تھے تو اس سے واجب ہوا کہ آپ ہی امام بھی ہوں۔''

[جواب]: اس کا جواب کئی طرح سے دیا گیا ہے:

- پہلا جواب: ہم اس حدیث کی صحت پیش کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ مصنف کا یہ کہنا کہ تمام جمہور نے اس روایت کو نقل کیا ہے؛ جمہور پر جھوٹ اور بہتان ہے۔ اسے نہ ہی اصحاب صحاح نے روایت کیا اور نہ ہی محدثین نے اسے صحیح کہا۔ لیکن یہ بعض لوگوں کی نقل کردہ مرویات میں سے ہے۔ جیسا کہ اس جیسی دوسری روایات بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضائل میں نقل کی گئی ہیں۔ بلکہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے فضائل میں بھی بہت ساری روایات نقل کی گئی ہیں۔ اور اس باب میں مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں۔ لیکن محدثین کرام نے ان میں سے کسی ایک کو بھی صحیح نہیں کہا۔
- دوسرا جواب: ہم کہتے ہیں: یہ حدیث سب محدثین؛ اہل علم و معرفت کے نزدیک جھوٹی اور موضوع ہے۔ ابو موسی المدینی کہتے ہیں: کئی معتبر محدثین نے اس [پرندہ والی] روایت کی اسناد جمع کی ہیں۔ جیسے کہ حاکم نیشا پوری؛ ابو نعیم؛ ابن مردویہ اور دوسرے محدثین کرام رحمہم اللہ۔

مشہور محدث امام حاکم سے ''حدیث الطیر'' کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے کہا: ''یہ حدیث صحیح نہیں۔''[1]

حالانکہ حاکم تشیع کی جانب منسوب ہے۔ ان سے یہ بھی کہا گیا تھا کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے فضائل میں کوئی حدیث بیان کرو' تو آپ نے فرمایا: ''ایسی کوئی روایت میرے دل میں نہیں آتی؛ یا میری زبان پر جاری نہیں ہوتی۔ اس بات پر

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے۔ تذکرۃ الحفاظ للذہبی (۳/۱۰۴۲۔۱۰۴۳۔ ترجمۃ للامام الحاکم)، البدایۃ النھایۃ لابن کثیر (۷/ ۳۸۷)، یہ روایت سنن ترمذی (۳۷۲۱)، کتاب المناقب 'باب مناقب علی رضی اللہ عنہ '(۳۸۰۵) میں مختصراً مروی ہے: اس حدیث کے الفاظ یہ ہیں: ''نبی کریم ﷺ کے پاس ایک پرندہ تھا؛ تو آپ نے فرمایا: ''اے اللہ! میرے پاس مخلوق میں اپنے نزدیک سب سے محبوب انسان کو لے آ؛ تاکہ وہ میرے ساتھ یہ پرندہ کھائے؛ اتنے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ تشریف لائے اور انہوں نے آپ کے ساتھ اسے کھایا۔'' امام ترمذی اس حدیث کے نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں: یہ حدیث غریب ہے؛ سدی سے اسے ہم صرف اس سند کے ساتھ جانتے ہیں۔ یہ حدیث ایک اور سند سے بھی حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جسے امام شوکانی رحمہ اللہ نے فوائد مجموعہ میں ص ۳۸۲ پر بھی نقل کیا ہے۔ امام شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''المختصر'' میں کہا گیا ہے کہ اس حدیث کی کئی اسناد ہیں' جو کہ تمام کی تمام ضعیف ہیں۔ اسے ابن جوزی رحمہ اللہ نے موضوعات میں درج کیا ہے۔ جب کہ امام حاکم رحمہ اللہ نے اسے مستدرک حاکم میں نقل کرتے ہوئے صحیح کہا ہے۔ جس پر بہت سارے اہل علم نے اعتراض کیا ہے۔ جو زیادہ تفصیل میں جانا چاہتا ہو اسے چاہیے کہ سیر اعلام النبلاء میں امام حاکم رحمہ اللہ کے حالات زندگی میں دیکھ لے۔ نیز دیکھیے: تحفۃ الاحوذی (۴/۳۲۸)۔

آپ کو مارا بھی گیا؛ مگر آپ نے فضائل معاویہ رضی اللہ عنہ میں کوئی حدیث بیان نہ کی ۔ حالانکہ آپ وہی امام حاکم ہیں جنہوں نے اپنی کتاب اربعین میں صرف ضعیف ہی نہیں بلکہ ائمہ حدیث کے نزدیک موضوع احادیث تک جمع کی ہیں ۔ جیسا کہ آپ وعدہ توڑنے والے اور بیعت توڑنے والے کو قتل کرنے کی روایت ۔ مگر ان کی شیعیت اور ان جیسے دوسرے ائمہ حدیث جیسے امام نسائی' ابن عبد البر اور ان کے امثال کی شیعیت اس درجہ تک نہیں پہنچتی کہ یہ لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرات ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما پر فضیلت دیں ۔ علماء حدیث میں کوئی ایک بھی ایسا نہیں پایا جاتا جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرات شیخین پر فضیلت دیتا ہو ۔ بلکہ ان میں شیعیت کا انتہائی درجہ یہ ہے کہ یہ لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر ترجیح دیتے ہیں ۔ باقی ان ائمہ متقدمین پر زبان درازی کرنا' ان کے محاسن بیان کرنے سے اعراض اور من گھڑت روایات کا بیان ان کے ہاں نہیں تھا ۔ علماء حدیث نے انہیں اس چیز سے بچالیا تھا ۔ اور انہوں نے وہ قواعد مقرر کردیے تھے جس سے ان صحیح احادیث کی پہچان حاصل ہو سکتی تھی جو حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے فضائل پر دلالت کرتی ہیں ۔

بعض معمولی درجہ کے محدثین نے جو اس قسم کی روایات کو رد کیا ہے' جیسا کہ ابن عقدہ وغیرہ ؛ تو ان لوگوں کا مقصود یہ تھا کہ فضائل علی رضی اللہ عنہ میں جھوٹی احادیث تک کو جمع کر لیا جائے ۔ اور موضوع احادیث کے زور پر ان صحیح احادیث کو رد نہیں کیا جاسکتا جو حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے فضائل پر دلالت کرتی ہیں' اور محدثین کے ہاں تواتر کے درجہ تک پہنچی ہوئی ہیں ۔ یہ احادیث حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضائل کی احادیث سے زیادہ کثرت کے ساتھ ہیں ؛ واضح اور دلالت میں صریح ہیں؛ سند کے اعتبار سے صحیح ہیں ۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے یہ نہیں فرمایا کہ: ''انہوں نے فضائل علی میں ان احادیث کو صحیح قرار دیا ہے جنہیں دوسرے محدثین نے صحیح نہیں کہا ۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا مقام و مرتبہ بہت بلند ہے' آپ سے اس قسم کی جھوٹ بات کا صدور ہرگز نہیں ہوسکتا ۔ بلکہ آپ سے نقل کیا گیا ہے کہ آپ نے فرمایا: ان سے وہ روایات نقل کی گئی ہیں' جو دوسرے محدثین سے نقل نہیں کی گئیں ۔'' لیکن آپ کے اس کلام میں کچھ اشکالات ہیں جن کے بیان کا موقع محل یہ نہیں ہے ۔

- تیسرا جواب : پرندے کا گوشت کھانے میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جس کی مناسبت سے اللہ تعالیٰ کا سب سے محبوب انسان حاضر ہو اور وہ اس میں سے کچھ کھائے ۔ اس لیے شریعت ہر نیک اور بدکردار کو کھانا کھلانے کا حکم دیتی ہے ۔ اس میں کھانے والے کے لیے اللہ تعالیٰ کے ہاں زیادہ قربت کی کوئی بات نہیں اور نہ ہی اس میں کوئی دینی یا دنیاوی مصلحت پوشیدہ ہے ۔ تو پھر یہاں کون سی ایسی بڑی بات ہے جس کی وجہ سے یہ کہا جائے کہ یہ کام اللہ کا سب سے محبوب انسان ہی کرسکتا ہے ۔
- چوتھا جواب : اس حدیث میں رافضی مذہب کے مطابق تناقض پایا جاتا ہے ۔ اس لیے کہ ان کا کہنا یہ ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جانتے تھے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اللہ تعالیٰ کے ہاں مخلوق میں سب سے بڑھ کر محبوب ہیں ۔ اور اللہ تعالیٰ نے انہیں آپ کے بعد خلیفہ بھی بنایا ہے ۔ جب کہ اس روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کو پتہ نہیں تھا کہ حضرت علی اللہ تعالیٰ کو تمام مخلوق میں سب سے بڑھ کر محبوب ہیں ۔
- پانچواں جواب : یہاں پر دو ہی صورتیں ممکن ہیں :

۱۔ نبی کریم ﷺ جانتے تھے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اللہ تعالیٰ کو سب مخلوقات کی نسبت عزیز تر ہیں۔
۲۔ آپ کو اس بات کا علم نہ تھا۔

بصورت اوّل آپ کے لیے ممکن تھا کہ آپ کسی کو بھیج کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بلا لیتے؛ پھر آپ نے انہیں کیوں نہیں بلا لیا؟ جیسے کہ آپ دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین میں سے کسی ایک کو بوقت ضرورت بلا لیا کرتے تھے۔ یا پھر آپ نے دعا میں یوں کیوں نہ فرمایا کہ: ''اے اللہ! علی رضی اللہ عنہ کو حاضر کردے؛ بیشک وہ تیرے ہاں مخلوق میں سب سے زیادہ محبوب ہے۔'' اگر آپ ایسے صاف اور صریح الفاظ میں علی رضی اللہ عنہ کا نام لے کر دعا کر دیتے تو حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ایک بھی باطل امید پر نہ رہتے' اور نہ ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی آمد پر دروازہ بند کر دیتے۔

اور اگر رسول اللہ ﷺ یہ بات نہیں جانتے تھے؛ تو رافضیوں کا یہ دعوی باطل ثابت ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کو اس بات کا علم تھا۔ نیز یہ کہ اس روایت کے الفاظ ہیں:

''اَحَبَّ خَلْقِكَ اِلَيْكَ وَاِلَيَّ۔''

''جو تجھے اور مجھے تیری مخلوق میں سب سے زیادہ محبوب ہو۔''

حیرانی کی بات ہے کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ سب مخلوقات سے نبی ﷺ کو عزیز تر تھے تو آپ کو یہ بات کیوں کر معلوم نہ تھی؟

❀ چھٹا جواب: کتب صحاح ستہ میں جو احادیث صحیح' اور ثابت ہیں؛ اور جن کے صحیح ہونے پر محدثین کا اتفاق ہے؛ اور انہیں علماء کرام میں قبول عام حاصل ہے؛ وہ تمام احادیث اس روایت کے خلاف ہیں۔ تو پھر ان کا مقابلہ اس موضوع اور جھوٹی حدیث سے کیوں کر کیا جا سکتا ہے جسے کسی ایک نے بھی صحیح نہیں کہا۔

اس روایت کے ناقابل اعتماد ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ بخاری و مسلم اور دوسری کتب میں وارد فضائل صحابہ کرام کی روایات ہیں۔ بخاری و مسلم میں مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''اگر روئے زمین پر رہنے والوں میں سے کسی کو گہرا دوست بنانے والا ہوتا تو ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بناتا۔''[1]

یہ حدیث مشہور ہی نہیں بلکہ اہل علم کے ہاں متواتر ہے۔ صحاح ستہ میں مختلف طرق سے مروی ہے' اس حدیث کے راویوں میں حضرت ابن مسعود[2]، ابن عباس[3]، ابوسعید[4]، ابن زبیر رضی اللہ عنہم اجمعین[5] جیسے جلیل القدر صحابہ شامل ہیں۔

اور یہ حدیث اس باب میں ایک صریح ثبوت ہے اہل ارض میں سے نبی کریم ﷺ کے ہاں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر محبوب کوئی دوسرا نہیں تھا۔ اس لیے کہ ''خلۃ [یا خلیل]'' کا لفظ محبت کے کمال [و معراج] کے لیے بولا جاتا ہے۔ اور یہ چیز صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہی ہو سکتی ہے۔ اگر یہ اہل دنیا میں سے کسی کے لیے ممکن ہوتی تو پھر اس کے مستحق حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے۔ اس لیے کہ آپ رسول اللہ ﷺ کے لیے لوگوں میں سب سے بڑھ کر محبوب تھے۔

---

[1] صحیح بخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ۔ باب قول النبی ﷺ "لو کنت متخذا خلیلا" (ح:٣٦٥٦)، صحیح مسلم کتاب فضائل الصحابۃ، باب من فضائل ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہ، (ح:٢٣٨٢)

[2] صحیح مسلم (٢٣٨٣)

[3] صحیح بخاری (٣٦٥٦)

[4] صحیح بخاری (٣٦٥٤)، صحیح مسلم (٢٣٨٢)

[5] صحیح بخاری (٣٦٥٨)

حدیث صحیح میں وارد ہوا ہے کہ نبی کریم ﷺ سے دریافت کیا گیا تھا کہ سب لوگوں میں سے آپ کو عزیز تر کون ہے؟ فرمایا: ''عائشہ۔'' عرض کیا گیا مردوں میں سے کون؟ فرمایا: ''ان کے والد ابوبکر رضی اللہ عنہ۔'' ❶

سقیفہ بنی ساعدہ کے روز حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مہاجرین و انصار کے ہجوم میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو مخاطب کر کے کہا تھا:

''آپ ہم میں سب سے بہتر اور رسول اللہ ﷺ کو عزیز تر ہیں۔'' ❷

صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے کسی نے بھی اس کی تردید نہیں کی تھی۔''

نیز یہ کہ نبی کریم ﷺ کی محبت اللہ تعالیٰ کی محبت کے تابع ہے۔ پس ابوبکر رضی اللہ عنہ اللہ تعالیٰ کو مخلوق میں سب سے محبوب تھے اسی لیے رسول اللہ ﷺ کو بھی آپ سے بہت زیادہ پیار تھا۔

ہاں بالکل معاملہ ایسے ہی تھا۔ اس لیے کہ آپ ان سب میں اللہ سے زیادہ ڈرنے والے اور عزت والے تھے۔ اور مخلوق میں اللہ کے ہاں سب سے زیادہ معزز و مکرم اور کتاب و سنت کا تقوی رکھنے والے تھے۔ سب سے بڑے متقی تھے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو متقی قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

﴿وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى ۞الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى ۞ وَ مَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰى ۞اِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ۞وَلَسَوْفَ يَرْضٰى ﴾ (اللیل:۱۷۔۲۱)

''اور اس سے ایسا شخص دور رکھا جائے گا جو بڑا پرہیزگار ہے۔ جو پاکیزہ ہونے کی خاطر اپنا مال دیتا ہے اس پر کسی کا کوئی احسان نہیں ہے جس کا بدلہ اسے دینا ہو۔ بلکہ صرف اپنے پروردگار بزرگ و بلند کی رضا چاہنے کے لیے۔ یقیناً وہ (اللہ بھی) عنقریب رضامند ہو جائے گا۔''

ائمہ تفسیر فرماتے ہیں کہ یہ آیات حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئیں۔ ❸

ہم ائمہ تفسیر کے اس قول کی صحت دلیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں: ''الاتقی'' سے مراد کبھی ایک نوع ہوتی ہے اور کبھی شخص واحد بھی مراد لیا جا سکتا ہے۔ جب اس سے مراد نوع ہو تو پوری جماعت بھی مقصود ہو سکتی ہے۔ اگر یہ کہیں کہ ان میں صرف ایک شخص ہی اتقی ہو سکتا ہے تو یہ قول باطل ہے۔ اس لیے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض افراد بعض سے زیادہ متقی ہوتے ہیں۔ حالانکہ یہ چیز اہل سنت والجماعت اور شیعہ کے اقوال کے خلاف ہے۔ اس لیے کہ اہل سنت والجماعت کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد مخلوق میں سب سے زیادہ متقی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے۔ جب کہ شیعہ کہتے ہیں: نہیں؛ بلکہ وہ شخص حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے۔ بعض لوگوں نے یہ بھی کہا ہے کہ اس سے مراد حضرت عمر رضی اللہ عنہ تھے۔ اور کچھ لوگوں سے اس کے علاوہ بھی تفاسیر منقول ہیں۔ جس انسان کو اس بارے میں پختہ علم ہو [یا شک کی صورت میں بھی؛ تو] وہ کبھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین تقوی میں برابر تھے۔ اگر کوئی ایسی بات کہے گا تو وہ تمام گروہوں کے اجماع کی مخالفت کرے گا۔ پس یہ بات متعین ہو گئی کہ یہ لوگ تقوی میں برابر نہیں [بلکہ ان کے مراتب میں فرق ہے]۔

❶ صحیح بخاری، حوالہ سابق (حدیث:۳۶۶۲)، صحیح مسلم، حوالہ سابق (حدیث: ۲۳۸٤)

❷ صحیح بخاری، حوالہ سابق (حدیث:۳۶۶۸)۔

❸ مستدرك حاكم (۲/ ۵۲۵)، تفسیر درمنثور (۶/ ۶۰۵)۔

اگر اس سے فرد معین مراد لیں تو پھر وہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہوں گے یا حضرت علی رضی اللہ عنہ۔ اس لیے کہ لفظ ''اتقی'' اسم جنس ہے' جو اس جنس میں شامل تمام افراد کے لیے بولا جاسکتا ہے۔ اس صورت میں اس سے مراد پہلی قسم یعنی جماعت ہوگی۔

یا پھر اس سے کوئی ایسا متعین شخص مراد ہو جو ان دو حضرات کے علاوہ ہو؛ تو یہ چیز بھی اہل سنت والجماعت اور شیعہ کے عقیدہ کے خلاف ہے۔

نیز حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس کا مصداق ٹھہرانا اس لیے صحیح نہیں کہ اس میں یہ آیت بھی ہے:

﴿الَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَكّٰی ❀ وَ مَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰۤی ❀ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰی ❀ وَلَسَوْفَ یَرْضٰی ﴾ (اللیل: ۱۸۔۲۱)

''جو پاکیزہ ہونے کی خاطر اپنا مال دیتا ہے اس پر کسی کا کوئی احسان نہیں ہے جس کا بدلہ اسے دینا ہو۔ بلکہ صرف اپنے پروردگار بزرگ و بلند کی رضا چاہنے کے لیے۔ یقیناً وہ (اللہ بھی) عنقریب رضامند ہو جائے گا۔''

یہ وصف کئی وجوہات کی بنا پر حضرت علی رضی اللہ عنہ میں موجود نہ تھا۔

❀ پہلی وجہ: چونکہ یہ سورت بالاتفاق مکی ہے اور علی رضی اللہ عنہ مکہ میں تنگ دست اور عیال محمدی میں شامل تھے ❀۔ آپ کے پاس کوئی مال نہیں جسے آپ خرچ کرتے۔ جب مکہ میں قحط پڑا تھا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اپنے کنبہ میں شامل کرلیا تھا۔

❀ دوسری وجہ: اس آیت میں کہا گیا ہے: ﴿ وَ مَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰۤی ❀﴾

''اس پر کسی کا کوئی احسان نہیں ہے جس کا بدلہ اسے دینا ہو۔''

❀ بنابریں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر دو احسان تھے:

۱۔ [دنیوی احسان] ۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو اپنے عیال کے ساتھ ملا لیا تھا۔ بخلاف حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے۔ اس لیے کہ آپ پر کوئی دنیاوی احسان نہیں تھا؛ سوائے دینی نعمت کے۔ اور اس پر جزاء نہیں دی جاسکتی۔ اس لیے کہ دین کے معاملہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اجر اللہ تعالیٰ پر ہے؛ کوئی بھی انسان اس کا بدلہ نہیں چکا سکتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضرت ابوبکر صدیق پر دینی احسانات ہیں جن کا بدلہ نہیں دیا جاسکتا ہے۔ جب کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر ہر دو طرح کے احسانات ہیں: ۱۔ دنیاوی [جن کا بدلہ دیا جاسکتا ہے]۔ اور ۲۔ اخروی و دینی احسان [جن کا بدلہ ممکن نہیں]۔

پہلا احسان قابل جزاء ہے۔ جب کہ دوسرے احسان کا صلہ اللہ تعالیٰ سے ملے گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ آیت میں ذکر کردہ وصف ''اتقی'' حضرت صدیق رضی اللہ عنہ میں موجود تھا۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ میں نہیں۔ بے شک حضرت علی رضی اللہ عنہ دوسروں سے زیادہ متقی تھے۔ مگر مذکورہ وصف میں حضرت علی رضی اللہ عنہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہم سر نہ تھے۔

اگر یہ کہا جائے کہ آپ نے اللہ کی رضا کے لیے اپنا مال خرچ کیا؛ تو پھر اس میں انعام کرنے والے کے لیے تو کوئی جزاء نہیں۔ اگر یہ بات مان لی جائے کہ کسی انسان نے اپنے ساتھ بھلائی کرنے والے کو اجرت دی؛ اور پھر اس کے بعد کوئی چیز اسے اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے بھی دیدی؛ تو یہ بھی ایسی ہی چیز ہے جس کی جزاء کسی ایک کے پاس نہیں ہے۔

❀ سیرة ابن هشام (ص: ۱۱۵)۔

تو اس کے جواب میں کہا جائے گا: ''تصور کیجیے! معاملہ بالکل ایسے ہی ہے۔ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ خرچ بھی کرتے تو آپ اسی جگہ پر خرچ کرتے جہاں پر خرچ کرنے کا حکم انہیں بارگاہ رسالت سے ملتا۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس نعمت کی جزاء دینے کی گنجائش موجود تھی۔ تو آپ کا خرچ کرنا مجازات سے ایسے خالی نہیں ہوسکتا جیسے ابوبکر رضی اللہ عنہ کا انفاق فی سبیل اللہ مجازات سے خالی ہے۔

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ دوسروں سے بڑھ کر متقی ہیں' مگر اس مذکورہ وصف میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ زیادہ کامل تھے۔ حالانکہ آیت کے الفاظ میں یہ بات واضح ہے مخلوق میں سے کسی ایک کے پاس بھی اس کے احسانات کا بدلہ نہیں۔ یہ وصف اسی انسان کا ہوسکتا ہے جو لوگوں کو ان کے احسانات پر بدلہ دیتا ہو' اور مخلوق میں سے کسی ایک کا کوئی احسان اس پر باقی نہ رہا ہو۔ یہ وصف حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پر یوں پوری طرح سے منطبق ہوتا ہے کہ مہاجرین میں سے کوئی دوسرا انسان آپ کے برابر نہیں ہوسکتا۔ بیشک مہاجرین- حضرت عمر' حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم اجمعین اور دوسرے صحابہ کرام- میں کوئی ایک انسان بھی ایسا نہیں تھا جو اسلام سے قبل اور اسلام کے بعد لوگوں کے ساتھ اپنی جان و مال سے اس قدر احسان کرنے والا ہو جس قدر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ احسان کیا کرتے تھے۔ آپ لوگوں میں مألوف و محبوب تھے؛ لوگوں کی خیر خواہی میں ان کیساتھ مدد کیا کرتے۔ جیسا کہ مکہ سے آپ کی ہجرت کے وقت اس علاقہ کے سردار ابن دغنہ نے کہا تھا: ''اے ابوبکر! آپ جیسے لوگوں کو نہ ہی نکالا جاسکتا ہے' اور نہ ہی وہ خود نکل سکتے ہیں۔ بیشک آپ کمزوروں کی مدد کرتے ہیں؛ مہمان نوازی کرتے ہیں؛ ضرورت مند کی مدد کرتے ہیں اور حق کے کاموں پر لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔''

صلح حدیبیہ کے موقع پر آپ نے حضرت عروۃ بن مسعود ثقفی رضی اللہ عنہ سے کہا تھا: ,,تو لات کی شرمگاہ چوسے! کیا ہم بھاگ جائیں گے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یوں ہی اکیلا چھوڑ دیں گے؟ تو اس نے جواب میں کہا: اگر تمہارا مجھ پر ایک احسان نہ ہوتا جس کا میں بدلہ نہیں دے سکا؛ تو میں ضرور تمہیں اس کا جواب دیتا۔''

اسلام سے قبل اور اس کے بعد کسی ایک بھی ایسے انسان کے بارے میں بھی علم نہیں ہوسکا جس کا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پر کوئی احسان ہو۔ پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین میں سے آپ ہی اس بات کے حق دار تھے کہ ان الفاظ میں آپ کی مدح سرائی کی جائے:

﴿وَ مَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓى﴾

''اس پر کسی کا کوئی احسان نہیں ہے جس کا بدلہ اسے دینا ہو۔''

آپ اس آیت کے مقصود میں داخل ہونے میں لوگوں میں سے سب سے زیادہ حق دار ہیں۔ جب کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیاوی احسانات ہیں۔ مسند احمد بن حنبل میں ہے: ''اگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے کوڑا گر جاتا تو آپ کسی کو نہیں کہتے تھے کہ یہ اٹھا کر مجھے دیدو۔ اور آپ فرمایا کرتے تھے:

''مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے کہ میں کبھی بھی لوگوں سے کسی بھی چیز کا سوال نہ کروں۔''

مسند احمد اور سنن ترمذی اور سنن ابوداؤد میں ہے: حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں صدقہ کرنے کا حکم دیا۔ اس وقت میرے پاس مال موجود تھا۔ میں نے اپنے جی میں کہا: آج میں ابوبکر رضی اللہ عنہ پر سبقت لے جاؤں گا۔ پس

میں اپنے گھر کا آدھا مال لیکر حاضر ہوگیا۔ رسول اللہ ﷺ نے دریافت فرمایا: ''اپنے گھر والوں کے لیے کیا چھوڑا؟ میں نے عرض کیا: اتنا ہی مال اپنے گھر والوں کے لیے چھوڑ آیا ہوں۔ اتنے میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اپنے گھر کا سارا مال لیکر حاضر ہوگئے۔ رسول اللہ ﷺ نے دریافت فرمایا: ''اپنے گھر والوں کے لیے کیا چھوڑا ہے؟ تو آپ نے عرض کیا: اپنے گھر والوں کے لیے اللہ اور اس کے رسول کو چھوڑ آیا ہوں۔'' پس میں نے کہا: میں کبھی بھی آپ پر سبقت حاصل نہیں کرسکتا۔''

ہاں! ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اپنے گھر کا سارا مال پیش کر دیا' مگر اس کے باوجود آپ کسی سے لیکر نہیں کھاتے تھے۔ نہ ہی صدقہ کا مال اور نہ ہی صلہ رحمی کا؛ نہ ہی نذر و نیاز [نہ ہی نذرانہ]۔ بلکہ آپ تجارت کیا کرتے تھے۔ اور اپنے ہاتھوں کی کمائی سے کھایا کرتے تھے۔ جب لوگوں نے آپ کو حکمران بنادیا تو آپ تجارت چھوڑ کر مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے کاموں میں مشغول ہوگئے۔ تو آپ اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ مال اللہ اور اس کے رسول کے حصہ [خمس] سے کھایا کرتے تھے؛ کسی مخلوق کے مال سے کبھی کچھ نہیں کھایا۔

ابو بکر رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ﷺ کبھی بھی مال غنیمت میں سے کوئی چیز بطور خاص نہیں دیا کرتے تھے؛ بلکہ جیسے عام مسلمان مجاہد کو غزوات میں حصہ ملتا ایسے ہی آپ کو بھی ملا کرتا تھا۔ بلکہ آپ سے مال لیکر اسے لوگوں پر خرچ کیا کرتے تھے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ﷺ نے استعمال تو کیا مگر کبھی بھی یہ ثابت نہیں ہے کہ آپ کو رسول اللہ ﷺ نے کوئی چیز بطور خاص دی ہو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو آپ نے عطیہ دیا؛ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مال فئے میں سے دیا' اور ایسے ہی نئے مسلمانوں اور مؤلفۃ القلوب کو اور آزاد کردہ لوگوں کو دیا کرتے تھے۔ اہل نجد کو بھی دیا۔ ایسا بھی ہوتا تھا کہ رسول اللہ ﷺ مہاجرین و انصار میں سے سابقین اولین کو کچھ بھی نہیں دیتے تھے۔ جیسا کہ غزوہ حنین اور بعض دوسرے مواقع پر ہوا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''میں کچھ لوگوں کو دیتا اور کچھ لوگوں کو چھوڑ دیتا ہوں۔ جس انسان کو میں کچھ نہیں دیتا وہ میرے نزدیک ان لوگوں کی نسبت زیادہ محبوب ہے جنہیں میں کچھ دیتا ہوں۔ اور میں ان لوگوں کو دیتا ہوں جن کے دلوں میں کچھ ملال یا کمزوری ہے۔ اور جن کے دلوں میں اللہ تعالیٰ نے تونگری اور خیر رکھی ہے ان کا معاملہ اللہ کے سپرد کر دیتا ہوں۔''

جب آپ کو یہ اطلاع ملی کہ انصار عطیات کے بارے میں کچھ چہ می گوئیاں کررہے ہیں' تو آپ نے ان سے اس بارے میں دریافت کیا؛ تو انہوں نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! ہم میں سے جو لوگ صاحب الرائے انہوں نے تو کچھ بھی نہیں کہا؛ ہاں کچھ نوجوان چھوکروں سے ایسی باتیں ہوئی ہیں۔ انہوں نے کہا تھا: اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو معاف فرمائے' آپ قریش کو دے رہے ہیں اور ہمیں خالی چھوڑ رہے ہیں جب کہ ہماری تلواروں سے ابھی تک ان کا خون ٹپک رہا ہے۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''میں کفر سے نئے مسلمان ہونے والوں کو ان کی تالیف قلبی کے لیے دیتا ہوں۔ کیا آپ اس بات پر راضی نہیں ہیں کہ لوگ مال لے کر واپس جائیں اور تم اپنے گھروں کو رسول اللہ ﷺ کو ساتھ لیکر جاؤ۔ اللہ کی قسم! جو چیز لے کر تم واپس جاؤ گے وہ اس سے بہت بہتر ہے جو وہ لوگ لیکر واپس اپنے گھروں کو جائیں گے۔''

اس پر وہ سبھی کہنے لگے: ''کیوں نہیں اے اللہ کے رسول! ہم اس پر راضی ہیں۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم لوگ میرے بعد بہت زیادہ تونگری دیکھو گے؛ تو تم صبر کرنا یہاں تک کہ اللہ اس کے رسول سے حوض پر ملاقات کرو۔'' انصار نے عرض کیا: ''تو پھر ہم صبر کریں گے۔'' [صحیح مسلم:۲۴۲۹]

نیز آیت کریمہ:

﴿وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى ۞ الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى ۞ وَ مَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰى ۞ اِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ۞ وَلَسَوْفَ يَرْضٰى﴾ (اللیل:۱۷۔۲۱)

''اور اس سے ایسا شخص دور رکھا جائے گا جو بڑا پرہیز گار ہے۔ جو پاکیزہ ہونے کی خاطر اپنا مال دیتا ہے اس پر کسی کا کوئی احسان نہیں ہے جس کا بدلہ اسے دینا ہو۔ وہ تو صرف اپنے رب عالی مقام کی رضا جوئی کے لئے (یہ کرتا ہے)۔ یقیناً وہ (اللہ بھی) عنقریب رضا مند ہو جائے گا۔''

اس میں مستثنیٰ منقطع ہے۔ اس کا معنی یہ ہوا کہ: یہ ''اتقی'' عطیات دینے میں صرف ان لوگوں پر انحصار نہیں کرتا جن کا ان پر کوئی احسان ہے؛ اس لیے کہ لوگوں کا آپس میں ایسا کرنا تو عدلاً واجب ہے جو کہ خرید و فروخت اور اجرت کی منزلت پر ہے۔ ہر انسان کے ساتھ ایسا کرنا ہر ایک پر واجب ہے۔ اور اگر کسی انسان کا کوئی قابل معاوضہ [بدلہ] احسان نہ ہو تو پھر اس قسم کے معادلہ [برابری کے سلوک] کی ضرورت نہیں رہتی۔ پس اس صورت میں عطاء خالص اللہ کی رضا کے لیے ہوگی۔ بخلاف اس شخص کے جس پر کسی کا کوئی احسان ہو تو وہ بدلہ چکانے کا محتاج ہوتا ہے۔ اسے ضرورت ہوتی ہے کہ وہ بھلائی کے بدلہ میں بھلائی کا سلوک کرے۔ لیکن جس شخص پر کسی کا کوئی ایسا احسان نہیں ہے جس کا اسے بدلہ دیا جائے، تو جب یہ شخص اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرے تو یہ صرف اپنے تزکیہ نفس کے لیے ہوگا۔ اس لیے کہ یہ انسان ہمیشہ لوگوں کو ان کے معاملات میں پورا پورا بدلہ دیتا ہے؛ ان کی مدد کرتا اور انہیں جزاء سے نوازتا ہے۔ پس جب اللہ تعالیٰ اسے مال عطا کرتا ہے تو وہ اسے تزکیہ کے لیے خرچ کرتا ہے؛ اس پر کسی کا کوئی احسان نہیں ہوتا جس کا بدلہ دے رہا ہو۔

نیز اس آیت میں ایک پہلو یہ بھی ہے کہ: یہ فضیلت اس انسان کی ہے جو معاوضات میں سے واجبات کی ادائیگی کے بعد خرچ کر رہا ہو۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَ يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ﴾ [البقرۃ ۲۱۹]

''آپ سے بھی دریافت کرتے ہیں کہ کیا کچھ خرچ کریں، تو آپ کہہ دیجئے حاجت سے زیادہ چیز۔''

پس جس پر قرض یا دوسرے فرائض ہوں، پہلے وہ ادا کرے گا، وہ صدقہ کو ان واجبات پر مقدم نہیں کریگا۔ اگر اس نے ایسا کر لیا تو کیا اس کا صدقہ واپس کر دیا جائے گا؟ اس مسئلہ میں فقہاء کرام رحمہم اللہ کے ہاں دو قول معروف ہیں۔

اس آیت سے وہ لوگ استدلال کرتے ہیں جو صدقہ واپس کرنے کا کہتے ہیں۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس انسان کی تعریف کی ہے جو اپنا مال تزکیہ نفس کے لیے خرچ کرتا ہے، اور اس پر کسی کا قابل معاوضہ [یا بدلہ] احسان نہیں ہوتا۔ اگر اس پر کسی انسان کا احسان تو ضروری ہے زکوٰۃ کا مال نکالنے سے پہلے بدلہ چکائے۔ اگر اس نے بدلہ چکانے سے پہلے اس مال کو تزکیہ کے لیے خرچ کر دیا، تو اس کا یہ فعل قابل تعریف نہ ہوگا۔ بلکہ اس کا یہ عمل مردود ہوگا جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

ہے: ''جس کسی نے کوئی ایسا کام کیا جس کا ہم نے حکم نہیں دیا تو اس کا وہ کام مردود ہوگا۔''

❀ تیسری بات: نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''مجھے اور کسی کے مال سے اتنا فائدہ نہیں پہنچا جتنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے مال سے حاصل ہوا۔''[1]

نیز فرمایا: ''ابوبکر رضی اللہ عنہ کی صحبت و رفاقت اور صرف مال کے احسانات مجھ پر سب سے زیادہ ہیں۔''[2]

بخلاف حضرت علی رضی اللہ عنہ کے؛ نبی کریم ﷺ نے ان کے کسی قسم کا انفاق فی سبیل اللہ کا کوئی تذکرہ نہیں تھا۔ اور یہ بات بھی معلوم شدہ ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے شروع اسلام کے ایام میں سات ایسے لوگوں کو خرید کر آزاد کیا تھا جن کو اسلام لانے [اور ایمان قبول کرنے] کے جرم میں ستایا جاتا تھا۔[3] آپ نے یہ کام صرف اللہ رب ذوالجلال کی رضامندی کے حصول کے لیے کیا تھا۔ آپ کا یہ کارنامہ جناب ابو طالب کے کردار کی طرح نہیں تھا جنہوں نے صرف قرابت کی وجہ سے نبی کریم ﷺ کی حمایت کی۔ ان کا مقصود اللہ تعالیٰ کی رضامندی یا اس کی خوشنودی کا حصول نہیں تھا۔

ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ ''الاتقی'' اسم جنس ہے اس میں امت کے سبھی اعلیٰ تقوی رکھنے والے شامل ہیں؛ اور ظاہر ہے کہ حضرات صحابہ کرام جلیل القدر اور خیر القرون کے لوگ ہیں۔ وہی اس امت کے سب سے بڑے متقی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں اور امت کے اہل تقوی کے سرخیل یا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ یا پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کے سرخیل ہیں؛ یا کوئی تیسرا انسان ہے۔ کسی تیسرے انسان کا ہونا بالا جماع منتفی ہے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ آپ بھی اس قسم میں شامل ہیں۔ اس لیے کہ جب آپ کو مال حاصل ہوگیا تھا تو آپ تزکیہ و طہارت کے حصول کیلئے اللہ کی راہ میں خرچ کرتے تھے۔ تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ: حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ شروع اسلام کے ایام میں اس وقت خرچ کیا کرتے تھے جب اس کی بہت سخت ضرورت تھی۔ پس آپ اس وصفِ اتقی میں دوسرے لوگوں سے بڑھ کر کامل و اکمل ہوئے۔

مزید برآں یہ کہ نبی کریم ﷺ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ایسے مواقع پر آگے بڑھاتے تھے جہاں کسی دوسرے کی شراکت ممکن نہیں ہوا کرتی تھی؛ جیسے نماز اور حج میں اپنا نائب بنانا؛ سفر ہجرت میں اپنی ہمراہی کے لیے صرف ان کا انتخاب کرنا؛ رسول اللہ ﷺ کی موجودگی میں آپ کا تقریر کرنا؛ آپ کو تقریر کی اجازت ملنا؛ نیز فتوی دینا اور رسول اللہ ﷺ کا اس پر رضامندی کا اظہار کرنا؛ اور ان کے علاوہ دیگر اتنے خصائص ہیں جن کا یہاں پر بیان طوالت کا موجب ہوگا۔

جو انسان ان اوصاف میں اکمل ہو وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں سب سے زیادہ عزت والا اور محبوب ہوگا۔ یہ بات بے شمار دلائل کی روشنی میں ثابت ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مقام صدیقیت میں تمام صحابہ کرام سے بڑھ کر عزت والے اور مقدم تھے۔ اور آپ انبیاء کرام علیہم السلام کے بعد سب سے افضل ترین ہستی ہیں۔ اور جو ان اوصاف میں کامل ہو وہی افضل ہوگا۔

نیز یہ کہ صحیح سند کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا:

---

[1] الترمذی۔ کتاب المناقب۔ باب١٥/ ٣٤)، (ح:٣٦٦١)، سنن ابن ماجة۔ المقدمة۔ باب فضائل ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہ (ح:٩٤)۔ [2] صحیح بخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ۔ باب قول النبی ﷺ "سدوا الابواب الا باب ابی بکر" (ح:٣٦٥٤)، صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہ (ح:٢٣٨٢)۔ [3] مستدرك حاكم (٣/ ٢٨٤)، سیرة ابن هشام(ص:١٤٧)۔

''نبی کریم ﷺ کے بعد اس امت کے افضل ترین لوگ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما ہیں۔''

یہ بات اتنی مشہور ہے کہ حدِ تواتر کو پہنچی ہوئی ہے۔ اور آپ نے ایسے انسان کو کوڑے لگانے کی وعید سنائی تھی جو افتراء پردازی کرتے ہوئے آپ کو ان حضرات پر فضیلت دے۔ اور یہ بھی روایت کیا گیا ہے کہ آپ نے یہ بات نبی کریم ﷺ سے سنی تھی۔ اور ظاہر بات ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ یہ بات دو ٹوک طور پر اسی صورت میں کہہ سکتے ہیں جب آپ کو اس کا علم حاصل ہو چکا ہو۔

مزید برآں یہ کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو تقدیم دینے پر اجماع ہے' جب کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ آپ سے افضل ہیں اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ان دونوں سے افضل ہیں۔ کئی دوسرے مواقع پر یہ مسئلہ بہت تفصیل کے ساتھ بیان ہو چکا ہے۔ جس کا کچھ حصہ یہاں بھی گزر چکا ہے۔ لیکن یہاں پر اس کا ذکر پرندہ والی حدیث کے جھوٹ کو طشت ازبام کرنے کے لیے کیا گیا ہے۔

فصل:

[امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نویں حدیث (سلام امارت)]

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ''امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اثبات میں نویں حدیث وہ ہے جسے جمہور علماء نے روایت کیا ہے کہ آپ نے صحابہ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ پر امیر المؤمنین ہونے کی وجہ سلام بھیجنے کا حکم دیا اور فرمایا: آپ سید المسلمین امام المتقین اور پانچ کلیانے گروہ کے قائد ہیں؛ اور فرمایا: آپ میرے بعد ہر مؤمن کے ولی ہیں۔ نیز آپ کے حق میں یہ بھی فرمایا کہ: ''بیشک علی مجھ سے ہے اور میں علی سے ہوں' اور آپ ہر مؤمن مرد و عوت کو اس کی جان سے بڑھ کر محبوب و مقدم ہیں۔ پس ان نصوص کی بنا پر حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی خلیفہ و امام ہوں گے۔ یہ روایت اس باب میں واضح ہیں۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جواب]: اس کا جواب کئی وجوہات سے دیا گیا ہے:

❀ پہلا جواب: ہم شیعہ سے مطالبہ کرتے ہیں کہ اس روایت کی اسناد بیان کریں اور اس کی صحت ثابت کریں۔ شیعہ مصنف نے اپنی عادت کے مطابق اس روایت کو کسی بھی کتاب کی طرف منسوب نہیں کیا۔ شیعہ مصنف کا یہ کہنا کہ: ''اسے جمہور نے روایت کیا ہے۔'' سراسر جھوٹ پر مبنی ہے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ یہ روایت حدیث کتب صحاح اور قابل اعتماد مسانید و سنن اور دوسری معتمد کتب میں موجود نہیں۔ اگرچہ اسے بعض اندھیری رات کے مسافروں نے روایت بھی کیا ہے؛ تو اس جیسی اور بھی روایات انہوں نے جمع کی ہیں۔ اس جیسی روایات باتفاق مسلمین حجت نہیں ہو سکتیں کہ لوگوں پر ان کی اتباع واجب ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ہم پر جھوٹ بولنے کو حرام قرار دیا ہے۔ اور ہم اللہ تعالیٰ کے متعلق ایسی بات نہیں کہہ سکتے جو ہم جانتے نہ ہوں۔ نبی کریم ﷺ سے تواتر کے ساتھ ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا:

((من كذب علي متعمداً فليتبوأ مقعده من النار))۔

''جو انسان مجھ پر جان بوجھ کر جھوٹ بولے' اسے چاہیے کہ اپنا ٹھکانہ جہنم کی آگ میں بنا لے۔''

❀ دوسرا جواب: اہل علم محدثین کا اس روایت کے جھوٹ ہونے پر اتفاق ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ ہر وہ انسان جسے علم

حدیث کی معمولی سی بھی معرفت ہو؛ وہ جانتا ہے کہ یہ روایت محض جھوٹ ہے؛ اہل علم محدثین میں سے کسی ایک نے بھی اپنی کسی قابل اعتماد سے روایت نہیں کیا۔ اور نہ ہی صحاح ستہ؛ سنن؛ اور قابل اعتماد مسانید میں اس کا کوئی وجود ہے۔

❀ تیسرا جواب: [اسکی اسناد میں متہم بالکذب راوی پائے جاتے ہیں] ۔ بلکہ علماء حدیث اس سے بڑھ کر اسے موضوع قرار دیتے ہیں اور اسے نبی کریم ﷺ کی طرف منسوب کرنے کو حرام سمجھتے ہیں۔ اس حکایت کا روایت کرنے والا بڑا جھوٹا انسان ہے۔ اور نبی کریم ﷺ جھوٹ سے منزہ اور بری ہیں۔ اس لیے کہ نبی کریم ﷺ کے سوا کوئی شخص سید المسلمین اور امام المتقین نہیں ہوسکتا؛ اس پر تمام مسلمانوں کا اجماع ہے۔

''اگر یہ کہا جائے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے بعد مسلمانوں کے سردار ہوں گے۔''

تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ: ''مذکورہ روایت میں ایسے الفاظ موجود نہیں جو اس تأویل پر دلالت کرتے ہوں کہ علی رضی اللہ عنہ میرے بعد امام المسلمین ہوں گے۔ بلکہ روایت اس تأویل کیخلاف ہے۔ اس لیے کہ خیــر الـمسـلـمیـن و المتقین و قائد غر المحجلین '' قرن اول کے مسلمان تھے۔ اس دور میں تو نبی کریم ﷺ کے علاوہ کوئی بھی دوسرا ان کا قائد و سید اور امام و سردار نہیں تھا۔ تو پھر آپ کیسے ایسی چیز کی خبر دے سکتے ہیں جو ابھی تک موجود نہ ہو۔ اور پھر اس خبر کو بھی ایسے ہی تشنہ لب چھوڑ دیا جائے حالانکہ وضاحت کے ساتھ اس کے بیان کی بہت ہی سخت ضرورت بھی ہو۔

اور نبی کریم ﷺ ہی بروزِ قیامت مسلمانوں کے قائد ہوں گے تو پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کن لوگوں کی قیادت کریں گے؟

نیز یہ کہ جب سب مسلمان شیعہ کی نگاہ میں کافر و فاسق ہیں تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کس کی قیادت کریں گے؟

صحیح احادیث میں ثابت نبی کریم ﷺ نے ایک موقع پر فرمایا:

((وددت أنا قد رأينا إخواننا)). قالوا: أولسنا إخوانك يا رسول اللهِ؟. قال:((أنتم أصحابي؛ وإخواننا الذين لم يأتوا بعد)). فقالوا: كيف تعرف من لم يأتِ بعد مِن أمتِك يا رسول اللهِ؟. فقال: ((أرأيت لو أن رجلا له خيل غرٌّ محجل بين ظهري خيل دهم بهم لا يعرف خيله؟)). قالوا: بلى يا رسول اللهِ!. قال:((فإنهم يأتون غرًّا محجلين مِن الوضوءِ؛ وأنا فرطهم على الحوضِ؛ ألا ليذادن رِجال عن حوضِي؛ كما يُذاد البعير الضال أنادِيهم ألا هلم. فيقال: إنهم قد بدلوا بعدك فأقول سحقا سحقا))

''میں چاہتا ہوں کہ اپنے بھائیوں کو دیکھوں ۔ صحابہ کرام نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ ! کیا ہم آپ کے بھائی نہیں ہیں؟ تو آپ نے فرمایا: '' تم میرے صحابہ ہو؛ میرے بھائی ابھی تک نہیں آئے۔'' کہنے لگے: یا رسول اللہ! آپ اپنی امت کے ان لوگوں کو کیسے پہچانیں گے جو ابھی تک نہیں آئے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: '' بھلا تم دیکھو اگر کسی شخص کی سفید پیشانی والے سفید پاؤں والے گھوڑے سیاہ گھوڑوں میں مل جائیں تو کیا وہ اپنے گھوڑوں کو ان میں سے پہچان نہ لے گا؟ صحابہ کرام نے عرض کیا: کیوں نہیں یا رسول اللہ ﷺ ! آپ ﷺ نے فرمایا کہ: '' وہ لوگ جب آئیں گے تو وضو کے اثرات کی وجہ سے ان کے چہرے؛ ہاتھ اور پاؤں چمکدار اور روشن ہوں گے اور میں ان

سے پہلے حوض پر موجود ہوں گا۔اور سنو بعض لوگ میرے حوض سے اس طرح دور کیے جائیں گے جس طرح بھٹکا ہوا اونٹ دور کر دیا جاتا ہے؛ میں ان کو پکاروں گا ادھر آؤ تو مجھ سے کہا جائیگا کہ: انہوں نے آپ ﷺ کے وصال کے بعد دین کو بدل دیا تھا تب میں کہوں گا دور ہو جاؤ دور ہو جاؤ۔'' ❶

مذکورہ صدر حدیث سے مستفاد ہوتا ہے کہ جو شخص وضو کرتے وقت اپنا منہ اور ہاتھ پاؤں دھوتا ہے وہ بروز قیامت ان لوگوں میں سے ہوگا جن کے ہاتھ پاؤں سفید ہوں گے اور حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما ان جمہور مسلمانوں کے آگے آگے ہوں گے۔ اس کے مصداق شیعہ کے سوا آپ کی جمہور امت ہے، چونکہ شیعہ وضوء کرتے وقت پاؤں نہیں دھوتے۔ لہٰذا ان کے پاؤں سفید نہیں ہوں گے۔اس لیے سرور کائنات ﷺ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ بروز قیامت ان کی قیادت بھی نہیں کریں گے۔ اور نہ ہی انہیں سفید پاؤں والوں کے ساتھ چلایا جائے گا۔اس لیے کہ [حدیث میں مذکور] حجلہ [سفید نشان] پاؤں کی پشت میں ہوتا ہے۔ پاؤں میں یہ نشان ایسے ہی ہوتا ہے جیسے ہاتھ میں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

''ایڑیوں اور پاؤں کی اندرونی جانبوں کو آگ کی وجہ سے بڑی تکلیف کا سامنا ہوگا۔'' ❷

[حدیث کا مطلب یہ ہے کہ وضو کرتے وقت پاؤں کا جو حصہ خشک رہے وہ آگ میں جلے گا]۔

یہ ایک بدیہی بات ہے کہ محجّل گھوڑا وہی ہوتا ہے جس کے ہاتھ پاؤں پر سفیدی کا نشان ہو ورنہ اسے محجل نہیں کہتے۔ ثابت ہوا کہ محجل پاؤں اور ہاتھ کی سفیدی والے کو کہتے ہیں۔ بنا بریں جو شخص اپنے پاؤں کو ٹخنوں تک نہیں دھوتا۔ بروز قیامت اس کے پاؤں سفید نہیں ہوں گے۔ پس سفید نشان والوں کے قائد بھی ان لوگوں سے برأت کا اظہار کریں گے؛ بھلے یہ کوئی بھی لوگ ہوں۔

نیز جس حقیقت واقعی سے اس روایت کا جھوٹ واضح ہوتا ہے وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ﷺ کے بعد مسلمانوں کا امام؛ سردار اور قائد قرار دینا ہے۔ حالانکہ آپ ﷺ اعلانیہ اور واضح طور پر حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے افضل قرار دیا کرتے تھے اس کی حد یہ ہے کہ خاص و عام [اہل ایمان ہی نہیں] بلکہ مشرکین بھی اس سے آگاہ تھے۔

احد کے موقع پر ابوسفیان نے تین مرتبہ کہا کہ: کیا تم لوگوں میں محمد (ﷺ) ہیں؟ کیا تم لوگوں میں محمد (ﷺ) ہیں؟ کیا تم لوگوں میں محمد (ﷺ) ہیں؟ جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اصحاب کو اس کا جواب دینے سے منع کر دیا تھا۔ پھر ابوسفیان نے تین مرتبہ کہا کہ:'' کیا تم میں ابن ابی قحافہ ہیں؟ کیا تم میں ابن ابی قحافہ ہیں؟ کیا تم میں ابن ابی قحافہ ہیں؟(یعنی صدیق اکبر رضی اللہ عنہ)۔ اور پھر تین مرتبہ کہا کہ: کیا تم میں عمر بن الخطاب ہیں؟ کیا تم میں عمر بن الخطاب ہیں؟ کیا تم میں عمر بن الخطاب ہیں؟ اور پھر اس کے بعد اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگا کہ:''یہ تو سب مارے گئے۔'' جس پر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اپنے آپ کو نہ روک سکے اور کہا کہ:''اے اللہ کے دشمن اللہ کی قسم! جن لوگوں کا تو نے نام لیا ہے وہ سب زندہ ہیں۔ اور جس بات سے تم رنجیدہ ہو وہ برقرار ہے۔''

---

❶ مسلم۔ کتاب الطهارة، باب استحباب اطالة الغرة(ح:۲٤۹) سنن نسائی(۱۵۰)، سنن ابن ماجة(٤۳۰٦)۔

❷ مسند احمد (٤/ ۱۹۱)، موقوفاً و مرفوعاً۔ صحیح ابن خزیمة(۱٦۳)، مرفوعاً وعلقه الترمذی فی کتاب الطهارة، باب ما جاء "وَيْلٌ لِلْاَعْقَابِ مِنَ النَّارِ" (تحت الحدیث:٤۱)۔

یہ کفار کا سالار اعلیٰ ہے ؛اس انتہائی خطرناک موقع پر صرف نبی کریم ﷺ ' حضرت ابوبکر وحضرت عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں ہی پوچھتا ہے۔ اس لیے کہ اس کو علم ہے اور ہر خاص و عام جانتا ہے کہ یہی تین شخصیات اس سارے معاملے کا بنیادی کردار ہیں اور یہ معاملہ ان ہی کی وجہ سے قائم ہے۔ اس سے یہ بھی دلیل سامنے آتی ہے کہ کفار کے ہاں بھی یہ بات صاف ظاہر تھی کہ آپ ﷺ کے وزیر یہی دو شخص ہو سکتے ہیں۔ اور اس معاملہ [یعنی دعوت اسلام کی تبلیغ] کو یہی حضرات اس کی آخری حدوں تک لیکر جاسکتے ہیں۔ اور باقی تمام لوگوں میں انہیں ایک خاص مقام حاصل ہے۔ اور اسلام کی نشر و اشاعت میں ان حضرات کی وہ خدمات ہیں جو کسی دوسرے کو حاصل نہیں۔ اتنی بات مسلمان تو کجا' کفار تک بھی جانتے تھے۔ اس طرح کی احادیث بھی بہت زیادہ کثرت کے ساتھ اور تواتر کی حد تک پہنچی ہوئی ہیں۔

بخاری و مسلم میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ:

''جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نعش لوگوں کے سامنے لائی گئی تو جنازہ اٹھانے سے لوگوں نے اس کو گھیر لیا؛ وہ آپ کے حق میں دعا کرنے اور آپ کی مدح و ستائش کرنے لگے۔ میں بھی ان لوگوں میں موجود تھا؛ مجھے کوئی خیال ہی نہیں آرہا تھا کہ اچانک ایک شخص نے میرا کندھا تھام لیا۔ میں نے پیچھے مڑکر دیکھا تو وہ علی رضی اللہ عنہ تھے۔ انھوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حق میں رحمت کی دعا کی اور فرمایا تو نے اپنے پیچھے کسی آدمی کو نہیں چھوڑا کہ جس کے اعمال کو لے کر میں بارگاہ ایزدی میں حاضر ہونا میرے نزدیک زیادہ محبوب ہو۔ ہاں اللہ کی قسم ! میرا یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو دونوں ساتھیوں (نبی کریم ﷺ اور ابوبکر) کے ساتھ ملا دے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں اکثر سرور کائنات کو یہ فرماتے سنا کرتا تھا کہ میں اور ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما آئے، میں اور ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما داخل ہوئے، میں اور ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما نکلے۔'' مجھے امید تھی کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ان دونوں ساتھیوں کی ملاقات نصیب کرے گا۔''❷

اس حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی عظمت وفضیلت کسی سے پوشیدہ نہ تھی یہی وجہ ہے کہ متقدمین شیعہ جنہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا زمانہ پایا؛ وہ آپ کے ساتھ انتہائی الفت و محبت رکھنے کے باوجود حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو ان سے افضل قرار دیا کرتے تھے۔ سوائے چند ایک ملحدین کے کوئی آپ کو شیخین پر فضیلت نہیں دیتا تھا، البتہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مقابلہ میں افضل تصور کرتے تھے۔

[شیعہ کا اشکال]: اسی طرح شیعہ کا یہ قول: ''هُوَ وَلِيُّ كُلِّ مُؤْمِنٍ بَعْدِي۔''

[جواب]: ''حضرت علی رضی اللہ عنہ میرے بعد ہر مومن کے دوست ہیں۔'' نبی کریم ﷺ پر جھوٹ اور بہتان ہے۔ بلکہ نبی ﷺ

---

❶ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ احد (حدیث:٤٠٤٣) امام بخاری اور دوسرے محدثین نے پوری تفصیل کے ساتھ یہ حدیث ذکر کی ہے [صحیح بخاری: ح 293]۔ یہ امر قابل غور ہے کہ ابوسفیان نے صرف تینوں حضرات کے بارے میں سوال کیا تھا اس سے معلوم ہوا کہ کفار صرف انہی تینوں کو اہمیت و وقعت کی نگاہ سے دیکھتے تھے دوسروں کو نہیں۔

❷ صحیح بخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ، باب مناقب عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ (حدیث:٣٦٨٥، ٣٦٧٧)، صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ (حدیث:٢٣٨٩)۔ عبدالرزاق کا قول ہے کہ: ''میرے لیے یہی جرم کافی ہے کہ میں علی سے محبت کا دعویٰ کروں اور ان کے اس قول کی خلاف ورزی کروں کہ نبی ﷺ کے بعد اس امت میں سب سے افضل ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما ہیں۔'' اور اگر میں تیسرے خلیفہ کا نام لینا چاہوں تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نام لوں گا۔''

جب بقید حیات تھے اور بعد از وفات ہر مومن کے دوست ہیں، اسی طرح ہر مومن زندگی میں اور بعد از وفات آپ کا دوست ہے۔ خلاصہ یہ کہ ولایت جو عداوت کی ضد ہے کسی زمانہ کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ رہ گئی ولایت جو امارت کے معنی میں آتی ہے؛ اگر یہ مراد ہوتی تو آپ یوں فرماتے: ''ھُو وَالِیُّ کُلِّ مُؤْمِنٍ بَعْدِیْ '' ''حضرت علی رضی اللہ عنہ میرے بعد ہر مومن کے امیر ہیں۔''

جیسا کہ نماز جنازہ کے بارے میں اختلاف وارد ہوا ہے کہ جب والی اور ولی جمع ہو جائیں تو اس صورت میں نماز جنازہ پڑھانے کے لیے کسے امام بنایا جائے گا؟ یہ بھی کہا گیا ہے کہ: والی [امیر] کو امام بنایا جائے گا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ: میت کے ولی کو امام بنایا جائے گا۔

اور قائل کا یہ قول کہ:: ''ھُو وَلِیُّ کُلِّ مُؤْمِنٍ بَعْدِیْ '' ''حضرت علی رضی اللہ عنہ میرے بعد ہر مومن کے دوست ہیں۔''

یہ ایسا کلام ہے جس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنا ناجائز ہے۔ اس لیے کہ اگر اس سے مراد موالات [دوستی کے معنی میں] ہے' تو پھر میرے بعد کہنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اور اگر اس سے مراد امارت ہے تو پھر آپ کو یوں فرمانا چاہیے تھا کہ:: ''ھُو وَالٍ علی کُلِّ مُؤْمِنٍ '' ''میرے بعد ہر مومن پر امیر ہوں گے۔''

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق: ''اَنْتَ مِنِّیْ وَ اَنَا مِنْكَ '' ''تم مجھ سے ہو اور میں تم سے ہوں'' بالکل صحیح ہے۔ اور اس کے علاوہ بھی کئی احادیث میں ثابت ہے۔ آپ نے یہ کلمات اس وقت فیصلہ کرتے ہوئے فرمائے جب آپ کے سامنے حضرت جعفر' حضرت زید بن حارثہ اور آپ رضی اللہ عنہم اجمعین حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کی بچی کی تربیت کے بارے میں جھگڑا کرتے ہوئے پیش ہوئے۔ آپ نے اس کا فیصلہ اس کی خالہ کے حق میں کیا؛ اور یہ خالہ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کے نکاح میں تھیں۔ آپ نے فرمایا: ''خالہ ماں کی منزلت پر ہوتی ہے۔''

اور حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: تم اخلاق میں اور شکل وصورت میں مجھ سے مشابہت رکھتے ہو۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہو کر فرمایا: ''اَنْتَ مِنِّیْ وَ اَنَا مِنْكَ'' ''تم مجھ سے ہو اور میں تم سے ہوں''

اور حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو مخاطب کر کے فرمایا تھا: ''اَنْتَ اَخُوْنَا وَ مَوْلَانَا''

''تم ہمارے بھائی اور ہمارے دوست ہو۔''[1]

صحیحین میں آپ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا: قبیلہ اشعری [حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کے قبیلہ والوں] کی یہ عادت تھی کہ جب جنگ کے موقع پر زاد راہ ختم ہو جاتا تو جو کچھ ان کے پاس ہوتا اس کو جمع کرتے پھر تقسیم کر لیا کرتے تھے یہ دیکھ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ھُمْ مِنِّیْ وَ اَنَا مِنْھُمْ .''[2] ''وہ مجھ سے ہیں اور میں ان میں سے ہوں۔''

جیسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اشعریین کے لیے فرمایا: ''ھُمْ مِنِّیْ وَ اَنَا مِنْھُمْ .'' اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہو کر فرمایا: ''اَنْتَ مِنِّیْ وَ اَنَا مِنْكَ'' ''تم مجھ سے ہو اور میں تم سے ہوں''۔ حضرت جُلَیْبِب رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا تھا:

[1] صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ احد (حدیث:٤٠٤٣)

[2] صحیح بخاری، کتاب الشرکۃ، باب الشرکۃ فی الطعام والنھد (حدیث: ٢٤٨٦)، صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابۃ، باب من فضائل الاشعریین، (حدیث: ٢٥٠٠)۔

"هٰذَا مِنِّیْ وَ اَنَا مِنْهُ۔"[1] ''یہ مجھ سے ہے اور میں اس سے ہوں۔''

مندرجہ بالا بیانات اس حقیقت کی آئینہ داری کرتے ہیں کہ ان الفاظ سے مدح کرنا مقصود ہوتا ہے۔ یہ الفاظ نہ ہی امامت پر دلالت کرتے ہیں' اور نہ ہی جن اصحاب کے بارے میں یہ کلمات کہے گئے ہیں وہ دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سے افضل ہوسکتے ہیں۔

فصل:

حدیث غدیر خم

[امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی دسویں حدیث]:

[اشکال] : شیعہ مصنف لکھتا ہے:''امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اثبات میں دسویں حدیث جو کہ جمہور علماء نے ذکر کی ہے کہ آپ نے فرمایا:'' میں تم میں وہ چیز چھوڑ چلا ہوں کہ اگر اسے تھامے رکھو گے تو گمراہ نہ ہو گے، یعنی اللہ کی کتاب اور میرے اہل بیت۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے، یہاں تک کہ میرے پاس حوض پر وارد ہوں گے۔''

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:''میرے اہل بیت کشتی نوح کی طرح ہیں کہ جو اس پر سوار ہوا اس نے نجات پائی اور جو پیچھے رہا وہ ڈوب گیا۔''

چونکہ یہ حدیث اہل بیت کے اقوال کے ساتھ تمسک کے وجوب پر دلالت کرتی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اہل بیت کے سردار تھے، لہٰذا سب پر ان کی اطاعت واجب ہوگی اور وہی امام ہوں گے۔'' [انتہی کلام الرافضی]

جواب: اس کے جواب کے کئی پہلو ہیں:

❀ پہلا جواب: صحیح مسلم میں حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے روایت کردہ حدیث کے یہ الفاظ ہیں:

''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ اور مدینہ کے درمیان خُم نامی چشمہ کے مقام پر خطبہ دیتے ہوئے فرمایا: امابعد:''اے لوگو! بیشک میں بھی بشر ہوں؛ ممکن ہے کہ میرے پاس میرے رب کا پیامبر آجائے اور میں اپنے رب کی دعوت قبول کرلوں ؛ اور بیشک میں تمہارے اندر دو چیزیں چھوڑ چلا ہوں: ایک اللہ کی کتاب' اس میں ہدایت اور نور ہے؛ کتاب اللہ کو تھام لو اور اسے مضبوطی سے پکڑ کر رکھو۔'' آپ نے کتاب اللہ پر عمل کرنے کی ترغیب دی؛ اور اس پر ابھارا۔ پھر فرمایا:

''اور میرے اہل بیت؛ میں تمہیں اپنے اہل بیت کے بارے میں اللہ کی یاد دلاتا ہوں۔''[2]

---

[1] صحیح مسلم۔ کتاب فضائل الصحابۃ، باب من فضائل جلیبیب رضی اللہ عنہ (حدیث: ۲۴۷۲)۔

[2] صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابۃ، باب من فضائل علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ (حدیث:۲۴۰۸)۔
پھر آپ نے فرمایا (دوسری چیز) میرے اہل بیت ہیں، میں تم لوگوں کو اپنے اہل بیت کے بارے میں اللہ یاد دلاتا ہوں، میں اپنے اہل بیت کے بارے میں تم لوگوں کو اللہ یاد دلاتا ہوں، حضرت حصین نے حضرت زید رضی اللہ عنہ سے عرض کیا اے زید! آپ کے اہل بیت کون ہیں؟ کیا آپ کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنھن اہل بیت میں سے نہیں ہیں؟ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے فرمایا آپ کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنھن آپ کے اہل بیت میں سے ہیں، اور وہ سب اہل بیت میں سے ہیں کہ جن پر آپ کے بعد صدقہ (زکوٰۃ، صدقہ وخیرات وغیرہ) حرام ہے، حضرت حصین رضی اللہ عنہ نے عرض کیا وہ کون ہیں؟ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے فرمایا حضرت علی رضی اللہ عنہ کا خاندان، حضرت عقیل کا خاندان، آل جعفر، آل عباس، حضرت عباس نے عرض کیا ان سب پر صدقہ وغیرہ حرام ہے؟ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہاں! ان سب پر صدقہ، زکوٰۃ وغیرہ حرام ہے۔

یہ الفاظ دلالت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے جس چیز کو مضبوطی سے پکڑے رکھنے کا حکم دیا' اور اس کیساتھ چمٹے رہنے والے کو گمراہ نہ ہونے کی ضمانت دی؛ وہ اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے۔

اس کے علاوہ بھی کئی احادیث میں اسی طرح کے الفاظ آئے ہیں۔ جیسا کہ صحیح مسلم میں ہی حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے؛ آپ نے خطبہ حجۃ الوداع نقل کیا ہے۔ اس خطبہ میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''اور میں تم میں ایک چیز چھوڑ کر جا رہا ہوں کہ جس کے بعد تم کبھی گمراہ نہیں ہوگے اگر تم اسے مضبوطی سے تھامے رکھو گے۔ وہ ہے: اللہ کی کتاب۔ [قرآن مجید کو مضبوطی سے پکڑے رکھنا] اور تم سے میرے بارے میں پوچھا جائے گا تو تم کیا کہو گے؟ انہوں نے کہا کہ: ''ہم گواہی دیتے ہیں کہ: آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں اللہ کے احکام کی تبلیغ کر دی؛ اپنا فرض ادا کر دیا؛ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خیر خواہی کی۔''

''یہ سن کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شہادت والی انگلی کو آسمان کی طرف بلند کرتے ہوئے اور لوگوں کی طرف منہ موڑتے ہوئے فرمایا: ''اے اللہ! گواہ رہنا، اے اللہ! گواہ رہنا، اے اللہ! گواہ رہنا۔''

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تین مرتبہ یہ کلمات کہے۔''

اور آپ کے یہ الفاظ: ''وَعِتْرَتِي (اهل بيتي) وأنهما لن يفترقا حتّٰى يردا عليَّ الحوض۔''

''اور میرے اہل بیت؛ اور بیشک یہ دونوں اس وقت جدا نہ ہوں گے یہاں تک حوض پر میرے پاس پہنچ جائیں۔''

یہ الفاظ ترمذی کی روایت میں پائے جاتے ہیں۔[1] ان کے بارے میں امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے سوال کیا گیا تو آپ نے اسے ضعیف کہا۔ ایسے ہی آپ کے علاوہ بھی بہت سارے اہل علم محدثین نے ان الفاظ کو ضعیف کہا ہے۔ ان کا کہنا ہے: یہ الفاظ صحیح سند کے ساتھ ثابت نہیں۔ اور بعض لوگوں نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ: تمام اہل بیت کبھی بھی گمراہی پر جمع نہ ہوں گے۔ اور ہم بھی یہی کہتے ہیں؛ جیسا کہ قاضی ابو یعلی سے بھی منقول ہے۔[2]

لیکن الحمد للہ کہ اہل بیت رافضی مذہب کی کسی ایک بات پر بھی کبھی متفق نہیں ہوئے۔ بلکہ وہ ان کے مذہب اور ان کی من گھڑت شریعت سے بالکل بری ہیں۔

رافضی کا کہنا کہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میرے اہل بیت کشتی نوح کی طرح ہیں کہ جو اس پر سوار ہوا اس نے نجات پائی اور جو پیچھے رہا وہ ڈوب گیا۔''

اس حدیث کی کوئی صحیح سند نہیں اور نہ ہی حدیث کی کسی قابل اعتماد کتاب میں موجود ہے۔[3]

---

[1] سنن ترمذی، کتاب المناقب۔باب مناقب اهل بيت النبی ﷺ (حدیث:۳۷۸٦)

[2] سنن ترمذی، حواله سابق (حدیث:۳۷۸۸) عن ابی سعید و زید بن ارقم رضی اللہ عنہما)۔

اس روایت کے نقل کرنے میں زید بن حسن انماطی متفرد ہوا ہے۔ محدث ابو حاتم نے انماطی کو منکر الحدیث کہا ہے۔ ترمذی نے ابوسعید سے روایت کیا ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: میں تم میں وہ چیز چھوڑ کر جا رہا ہوں کہ اگر اسے تھامے رکھو گے تو گمراہ نہ ہو گے ایک چیز دوسری سے بڑھ کر ہے۔ اللہ کی کتاب جو اللہ کی رسی ہے اور آسمان سے زمین تک لٹک رہی ہے۔ اور میرے اہل بیت۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے الگ نہ ہوں گے یہاں تک کہ میرے پاس حوض پر وارد ہوں گے۔ غور کرو کہ تم ان سے کیا سلوک کرتے ہو۔ ترمذی نے اسے حسن کہا ہے۔

[3] مستدرک حاکم (۳/۳۴۳) طبرانی فی الکبیر (۲۶۳۷) والصغیر (۱/۱۳۹)، وسندہ ضعیف۔ اس کی سند میں مفضل بن صالح ضعیف راوی ہے۔

اگر چہ اسے بعض رات کے لکڑ ہاروں نے روایت بھی کیا ہو جو کہ من گھڑت اور ضعیف روایات کا کوئی اہتمام نہیں کرتے' تو ایسے لوگوں کا روایت کرنا الٹا ان کے مذہب کے بودے پن کی نشانی ہے۔

❀ دوسرا جواب[الزامی]: رسول اللہ ﷺ نے اپنے اہل بیت کے بارے میں فرمایا: ''میرے اہل بیت اور کتاب اللہ اس وقت تک جدا نہیں ہوں گے یہاں تک کہ وہ میرے پاس حوض پر آجائیں۔ آپ صادق و مصدوق ہیں۔ آپ ﷺ کا ارشاد ''لَنْ یَتَفَرَّقَا'' اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اہل بیت کا اجماع حجت ہے۔ ہمارے اصحاب میں سے ایک جماعت کی یہی رائے ہے۔ قاضی نے المعتمد میں ذکر کیا ہے کہ عِتْرت سے سب بنو ہاشم؛ مثلاً اولاد علی؛ و اولاد عباس و اولاد حارث بن عبدالمطلب اور تمام بنی ابو طالب مراد ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ صرف اکیلے ہی عترت نہیں ہیں۔ اور اہل بیت کے سردار نبی ﷺ تھے۔

❀ اس سے واضح ہوتا ہے کہ اہل بیت کے علماء جیسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما [اہل بیت میں سے فقیہ تر تھے اور بعض مسائل میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اختلاف کیا کرتے تھے] حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے فتاویٰ کو کسی پر واجب نہیں ٹھہرایا کرتے تھے۔ اور نہ ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے ہر فتوی کو لوگوں پر مسلط کیا کرتے تھے۔ اور نہ ہی ائمہ سلف - بنی ہاشم اور دوسرے اہل بیت - میں سے کسی ایک سے یہ ثابت ہے کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہر قول میں ان کی اطاعت کو واجب کہتے ہوں۔

❀ تیسرا جواب: یہ امر بھی قابل غور ہے کہ اہل بیت نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی افضلیت یا امامت و خلافت پر اجماع منعقد نہیں کیا تھا۔ بلکہ ائمہ اہل بیت جیسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کو امامت و افضلیت میں آپ پر ترجیح دیا کرتے تھے۔ یہی حال تمام بنی ہاشم: عباسیہ' جعفریہ اور اکثر علویہ کا تھا۔ وہ حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کی امامت کا اقرار کرتے تھے۔ اور ان میں سے کئی ایک ایسے بھی ہیں جو امام مالک' ابو حنیفہ شافعی اور احمد رحمہم اللہ کے ساتھی رہے ہیں۔ ان کی تعداد ان لوگوں سے بہت زیادہ ہے جنہوں نے امامیہ مذہب اختیار وایجاد کیا۔

بنی ہاشم کے تمام علماء اہل بیت تابعین اور تبع تابعین جیسے حضرت حسن و حسین نیز علی بن حسین اور دوسرے حضرات بلا شک و شبہ حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما سے محبت کا دم بھرتے تھے اور انہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ پر فضیلت دیا کرتے تھے۔ [حضرت زید بن علی ان کے بیٹے امام باقر اور پوتے جعفر صادق سب یہی عقیدہ رکھتے تھے] ان سے بتواتر نقل ہو کر یہ عقیدہ ہم تک پہنچا ہے۔ امام حافظ ابو الحسن دار قطنی رحمہ اللہ نے اس ضمن میں ایک کتاب ''ثناء الصحابہ علی القرابہ'' و ثناء القرابہ علی الصحابہ'' نامی تصنیف کی ہے۔ جس میں اس کا ایک حصہ نقل کیا ہے۔

ایسے ہی محدثین کرام رحمہم اللہ میں سے جن لوگوں نے بھی عقیدہ پر کتابیں تحریر کی ہیں' جیسے ''السنۃ'' از عبداللہ بن احمد؛ ''السنۃ'' از ابو بکر الخلال؛ ''السنۃ'' از ابن بطہ؛ ''السنۃ'' از علامہ آجری؛ ان کے علاوہ علامہ لالکائی؛ بیہقی؛ ابن ذر الہروی؛ طلمنکی؛ ابن حفص بن شاہین؛ اور ان سے کئی زیادہ کتابیں جن کی طرف نسبت کیا جانا حجت رکھتا ہے' جیسے کتاب ''فضائل الصحابۃ'' از امام احمد بن حنبل؛ اور ابو نعیم؛ تفسیر ثعلبی وغیرہ؛ ان کتابوں میں اصحاب ثلاثہ کے اتنے زیادہ فضائل بیان ہوئے ہیں جو ان پر قائم حجتوں سے کئی گناہ زیادہ ہیں۔ اگر رافضی کے ذکر کردہ دلائل حجت ہیں تو باقی دلائل بھی اس پر اور اس

کے لیے حجت ہونے چاہییے ۔ اور اگر ایسا نہیں تو پھر اسے ان کتابوں سے استدلال نہ کرنا چاہیے ۔

❀ چوتھا جواب: یہ اعتراض اپنے سے قوی ادلہ کے معارض ہے ۔ یہ امر پیش نظر رہے کہ کتاب و سنت اور اجماع کی روشنی میں پوری امت کا اجماع بلانزاع حجت ہے ۔ اہل بیت امت کا ایک حصہ ہیں ۔ امت کے اجماع سے اہل بیت کے اجماع کا ثابت ہونا لازم آتا ہے ۔ اور اہل بیت کا اجماع اس بات پر منعقد ہوا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ افضل الصحابہ تھے ۔ جیسا کہ اس سے پہلے بھی گزر چکا ہے' اور آگے بھی بیان آئے گا ۔ وہ گروہ جس کا اجماع حجت ہے؛ اس میں سے افضل ترین شخص کی اطاعت مطلق طور پر واجب ہے؛ اور اگر وہ [قابل اطاعت انسان] امام نہیں بن سکا [اور اس نے اپنی جگہ اپنے سے افضل کی بیعت کی] تو ثابت ہوا کہ پھر واجب الاطاعت امام حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تھے ۔ اور اگر ایسا نہیں ہے تو امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ پر شیعہ کا استدلال باطل ٹھہرا ۔ اس لیے کہ اس قول کی بنیاد پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو پوری امت میں وہی نسبت حاصل ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اہل بیت میں حاصل ہے ۔

فصل:

[محبت علی رضی اللہ عنہ کا وجوب]

[امامت علی رضی اللہ عنہ کی گیارھویں حدیث]:

[اشکال] : شیعہ مصنف لکھتا ہے: ''امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اثبات میں گیارھویں روایت وہ ہے جو جمہور نے آپ کی محبت اور موالات کے وجوب پر نقل کی ہے ۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے مسند میں ذکر کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا: ''جس نے ان دونوں سے اور ان دونوں کے والد سے اور ان دونوں کی والدہ سے محبت رکھی؛ وہ قیامت والے دن جنت میں میرے درجہ میں ہوگا ۔''

❀ اور ابن خالویہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے؛ آپ فرماتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو شخص یاقوت کی ٹہنی کو پکڑنا چاہتا ہو جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ سے پیدا کیا پھر اسے عالم وجود میں آنے کا حکم دیا اور وہ ظہور پذیر ہوگئی تو اسے چاہیے کہ وہ میرے بعد علی رضی اللہ عنہ سے دوستی لگالے ۔''

❀ ابو سعید سے مرفوعاً مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ''تمہاری محبت علامت ایمان ہے اور تمہارا بغض نفاق کا موجب ہے ۔ تیرے محب سب سے پہلے جنت میں جائیں گے اور تجھ سے عداوت رکھنے والے سب سے پہلے جہنم واصل ہوں گے ۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس قابل بنایا ہے ۔ سو آپ مجھ سے ہیں اور میں آپ سے ہوں ۔ اور میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا'' ۔

❀ حضرت شقیق بن سلمہ حضرت عبداللہ سے روایت کرتے ہیں: انہوں نے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا آپ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھے ۔ اور یہ فرمارہے تھے: ''یہ میرا دوست ہے' اور میں اس کا دوست ہوں'' میں اس سے دشمنی کا اعلان کرتا ہوں جو اس سے دشمنی رکھے؛ اور جو اس سے صلح کرے' اس سے صلح کا اعلان کرتا ہوں ۔''

❀ اور خطیب خوارزمی نے حضرت جابر سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''ابھی ابھی جبریل میرے پاس ایک سبز ورقہ لیکر آئے ؛ جس میں سفید خط کے ساتھ لکھا ہوا تھا:'' بیشک میں نے اپنی مخلوق پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت کو فرض کر دیا ہے؛ آپ ان کو میری طرف سے یہ پیغام پہنچا دیں۔''

اس باب میں احادیث کثرت تعداد کی وجہ سے شمار سے باہر ہیں' ان کی اسناد کثرت کے ساتھ ہیں ۔ اور یہ احادیث آپ کی افضلیت پر اور امامت کے استحقاق پر دلالت کرتی ہیں ۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جواب]: اس کے جواب کے کئی پہلو ہیں:

- پہلا جواب: ہم ان سے ان روایات کی صحیح اسناد کا مطالبہ کرتے ہیں ۔ ہائے افسوس! انہیں یہ اسناد کہاں سے میسر ہونگی؟
- دوسرا جواب: ''شیعہ کا یہ کہنا کہ: امام احمد نے روایت کیا ہے۔'' ہم کہتے ہیں کہ: صرف امام احمد رحمہ اللہ کی کتاب مسند احمد اور فضائل صحابہ مشہور ہیں۔ فضائل صحابہ میں آپ نے وہ احادیث نقل کی ہیں جو مسند میں نہیں لا سکے۔ ان میں ضعیف روایات بھی ہیں؛ اس لیے یہ روایات مسند میں نقل کرنے کے قابل نہیں تھیں ۔ اس لیے کہ یہ روایات یا تو مرسل تھیں' یا پھر مرسل نہیں تھیں مگر بہت ہی ضعیف تھیں ۔ پھر اس کتاب میں آپ کے بیٹے عبد اللہ نے بھی کچھ روایات زیادہ کی ہیں ۔ پھر ان کے بعد ان کے بیٹے کے شاگرد قطیعی نے بھی اس میں کچھ روایات اپنے شیوخ سے زیادہ کی ہیں ۔ اہل معرفت محدثین کا اتفاق ہے کہ اس میں موضوع احادیث بھی موجود ہیں ۔

پس یہ رافضی اور اس کے امثال دوسرے شیوخ الرافضہ جہالت کی انتہاء کو پہنچے ہوئے ہیں ۔ وہ اس کتاب سے روایت کرتے ہوئے یہ تمیز نہیں کر پاتے کہ عبد اللہ اور قطیعی کی روایات کونسی ہیں؟ وہ ان کو بھی امام احمد رحمہ اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ امام احمد اور قطیعی کے شیوخ کے مابین تمیز بھی نہیں کر پاتے ۔ پھر ان کا یہ خیال ہوتا ہے کہ مسند میں جو بھی روایت ہے وہ امام احمد کی ہی روایت ہے۔ میں نے ان کی بہت ساری کتابوں میں دیکھا ہے کہ ایسے روایات امام احمد رحمہ اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں جو امام احمد نے کبھی بھی سنی ہی نہ ہوں گی ۔ جیسا کہ ابن بطریق اور ''الطرائف'' کے مصنف کے علاوہ دوسروں نے بھی کیا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ ان کی جہالت ہے ۔ یہ ان کے من گھڑت جھوٹوں کے علاوہ ہے؛ ان کے جھوٹ تو بے شمار اور لاتعداد ہیں ۔

- اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ اسے امام احمد نے روایت کیا ہے۔ تو امام احمد رحمہ اللہ کے کسی روایت کو نقل کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ صحیح بھی ہے ؛ اور اس پر عمل کرنا واجب ہے۔ بلکہ امام احمد رحمہ اللہ نے ایسی بہت ساری روایات ایسی نقل کی ہیں جن کے جمع کرنے مقصد لوگوں کو ان کی پہچان کروانا اور ضعف بتانا ہوتا ہے۔ آپ کے کلام اور جوابات میں یہ بات اتنی وضاحت کے ساتھ موجود ہے کہ اس میں مزید کسی تفصیل یا بیان کی ہرگز کوئی ضرورت نہیں۔ خصوصاً اس عظیم الشان اصل کے باب میں۔ مگر یہ روایت ہرگز امام احمد رحمہ اللہ نے ذکر نہیں کی، بلکہ القطیعی نے کتاب الفضائل میں اس کا اضافہ کیا ہے۔ اس نے یہ روایت نصر بن علی الجھضمی سے ؛ اس علی بن جعفر سے' اس نے اپنے بھائی موسیٰ بن جعفر سے نقل کیا ۔ دوسری حدیث کو امام ابن جوزی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب'' الموضوعات'' میں موضوع قرار دیا ہے۔ اور یہ ثابت کیا ہے کہ یہ روایت من گھڑت اور جھوٹ ہے۔''

جب کہ اہل علم محدثین کا اتفاق ہے کہ ابن خالویہ کی روایت سے بھی حدیث کا صحیح ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ یہی حال خطیب خوارزمی کی روایات کا ہے۔ اس کی روایات من گھڑت جھوٹ ہوتے ہیں۔ اہل علم کا اتفاق ہے کہ سب سے برے اور ناروا جھوٹ اسی کے ہوتے ہیں۔

❀ دوسری وجہ: ابن خالویہ کی روایات کے جھوٹ اور من گھڑت ہونے پر اہل علم محدثین کا اتفاق ہے۔ وہ علم ضروری کے طور پر یہ بات جانتے ہیں' اور دوٹوک یقین کے ساتھ اس کا اظہار بھی کرتے ہیں کہ یہ رسول اللہ ﷺ پر جھوٹ گھڑا گیا ہے۔ حدیث کی وہ قابل اعتماد کتب جیسے: صحاح؛ مسانید اور سنن اور معجمات اور اس طرح کی دوسری کتب جن پر علماء حدیث کا اعتماد و اتفاق ہے؛ ان میں اس روایت کا نام و نشان تک بھی نہیں۔

❀ تیسری وجہ: جو انسان اس روایت کے الفاظ پر غور کرے گا اس پر واضح ہو جائے گا کہ یہ روایت نبی کریم ﷺ پر جھوٹ گھڑی گئی ہے۔ مثال کے طور پر یہ الفاظ کہ [نبی کریم ﷺ نے فرمایا]: ''جو شخص یاقوت کی ٹہنی کو پکڑنا چاہتا ہو جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ سے پیدا کیا پھر اسے عالم وجود میں آنے کا حکم دیا اور وہ ظہور پذیر ہو گئی۔'' یہ خرافات قسم کا کلام ہے۔ گویا کہ جب انہوں نے یہ بات سن لی کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اپنے ہاتھ سے پیدا کیا' اور پھر اس سے کہا: ہو جا؛ تو وہ ظہور پذیر ہو گیا۔ تو اس یاقوت والی بات کو خلق آدم پر قیاس کر لیا۔ آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کیا گیا' اور پھر کہا گیا: ''ہو جا۔'' تو آپ [زندہ شکل میں] پیدا ہو گئے [ظہور پذیر ہو گئے]۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس میں روح پھونک دی تھی۔ جب کہ یہ ٹہنی صرف پیدا کرنے سے ہی مکمل ہو گئی۔ اس کے بعد کوئی ایسا حال نہیں تھا جس کے لیے کہا جاتا کہ ہو جا؛ اور وہ ہو جاتی۔ اور اہل علم میں سے کسی ایک نے بھی یہ نہیں کہا کہ اللہ تعالیٰ نے یاقوت کو اپنے ہاتھ سے پیدا کیا۔ بلکہ بہت ساری روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ سے صرف تین چیزیں پیدا کی ہیں: ۱۔ آدم۔ ۲۔ قلم ۳۔ جنت عدن۔ پھر باقی ساری مخلوق سے فرمایا: ''ہو جا'' تو وہ ہو گئی۔ اس میں یاقوت کا کہیں پر کوئی تذکرہ نہیں۔ پھر یاقوت کے امساک میں کون سی ایسی چیز ہے جس پر اتنے بڑے انعام کا وعدہ کیا جا رہا ہو؟

[اشکال]: شیعہ مصنف نے نبی کریم ﷺ کی طرف یہ منسوب کیا ہے کہ آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ''تجھ سے بغض رکھنے والے سب سے پہلے جہنم میں جائیں گے۔''

[جواب]: ہم کہتے ہیں کہ یہ صریح جھوٹ ہے، کوئی مسلمان یہ بات کہہ سکتا ہے کہ خوارج و نواصب فرعون و ابو جہل بن ہشام؛ ابولہب اور ان کے امثال دوسرے مشرکین سے پہلے دوزخ میں جائیں گے؟

اور ایسے ہی یہ قول کہ: ''تیرے محب سب سے پہلے جنت میں جائیں گے اور تجھ سے عداوت رکھنے والے سب سے پہلے جہنم واصل ہوں گے۔''

[جواب]: کیا کوئی عقلمند یہ کہہ سکتا ہے کہ انبیاء کرام اور مرسلین علیہم السلام کے سب سے پہلے جنت میں داخل ہونے کا سبب اللہ اور اس کے رسول اور دوسرے تمام انبیاء و مرسلین کی محبت کو چھوڑ کر صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت ہے۔ جب کہ اللہ اور اس کے رسول کی محبت کا اس میں کوئی دخل نہیں۔ اور کیا نیک بختی اور بدبختی میں اللہ اور اس کے رسول کی محبت کو چھوڑ کر صرف

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت کا اتنا ہی کردار نہیں ہے جتنا حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما اور حضرت عثمان و معاویہ رضی اللہ عنہما کی محبت کا ہے؟ اگر کوئی انسان یوں کہے کہ: جو کوئی حضرت عثمان و معاویہ رضی اللہ عنہما سے محبت کرے گا وہ جنت میں داخل ہوگا' اور جو کوئی انسان ان سے بغض رکھے گا وہ جہنم میں داخل ہوگا؛ تو اس کا یہ کلام بھی شیعہ کے کلام کی جنس سے ہی ہوگا۔

[یا کوئی مسلم یہ الفاظ اپنی زبان پر لا سکتا ہے کہ غالی اسماعیلیہ جھوٹے روافض اور فاسق امامیہ حب علی کی بنا پر انبیاء کرام سے پہلے جنت میں داخل ہوں گے؟ یہ بات تو اسی طرح ہے جیسے کوئی ناصبی کہے جو شخص یزید و حجاج سے محبت رکھتا ہو یا خارجی کہے جو ابن ملجم کو چاہتا ہو وہ جنت میں جائے گا اور جو ان سے بغض رکھے گا وہ جہنم میں داخل ہوگا]۔

فصل:

[امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بارھویں حدیث]

[اشکال] : شیعہ مصنف لکھتا ہے:''خطیب خوارزمی نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:''جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کو ناپسند کرتا ہو وہ کافر ہے اور اللہ و رسول کے خلاف جنگ آزمائی کر رہا ہے۔ اور جو کوئی حضرت علی رضی اللہ عنہ میں شک کرتا ہو وہ بھی کافر ہے۔''

❀ حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ: میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھا آپ نے علی رضی اللہ عنہ کو آتے ہوئے دیکھا تو فرمایا:''میں اور علی رضی اللہ عنہ بروز قیامت اپنی امت پر حجت ہوں گے۔''

❀ معاویہ رضی اللہ عنہ بن حَیدہ القُشیری کہتے ہیں کہ:''میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہ کہتے سنا کہ جو شخص آپ سے عداوت رکھتے ہوئے مرجائے تو پرواہ نہ کریں کہ وہ یہودی مرا ہے یا نصرانی۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جواب]: اس کے جواب میں کئی پہلو ہیں:

أولاً: ......ہم شیعہ سے ان روایات کی صحت ثابت کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ یہ بر سبیل تنزل کے۔ اس لیے کہ خطیب خوارزمی کا کسی روایت کو نقل کرنا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ اس کلام کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمودہ ہونا بھی ثابت ہو گیا۔ یہ تو اس صورت میں ہے اگر کسی کو یہ علم نہ ہو کہ اس کی جمع کردہ کتاب میں کتنی ہی جھوٹی اور من گھڑت روایات ہیں۔ کیوں کہ اس کی تصانیف موضوعات کا پلندہ ہیں۔ جن کو دیکھ کر ایک حدیث دان شخص حیرت کا اظہار کرنے لگتا ہے اور بے ساختہ پکار اٹھتا ہے "سبحانك هذا بهتان عظيم۔"

ثانیاً: ...... ہر وہ انسان جسے حدیث سے شغف ہو؛ وہ اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ یہ روایات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ ہیں۔

ثالثاً: ...... وہ حقیقت شناس شخص جو واقعات سے آگاہ ہو اور آثار و اقوال میں مہارت رکھتا ہو اس بات سے بخوبی واقف ہے کہ اس قسم کی احادیث کذاب راویوں نے عصر صحابہ و تابعین کے اختتام کے بعد وضع کر لی تھیں۔ ان روایات میں صحابہ و تابعین کا ذکر کہاں ہے؟ اور کس کتاب میں انہوں نے یہ روایت کیا ہے؟ پس یہ بات اضطراری طور پر معلوم ہوتی ہے کہ یہ روایات خیر القرون کے بعد اپنی طرف سے گھڑ کر [ان کی طرف منسوب کر] لی گئی ہیں۔

رابعاً:......ہم کہتے ہیں کہ ہمیں ان موضوع روایات کی نسبت اس بات کا قطعی و حتمی علم حاصل ہے کہ مہاجرین و انصار اللہ ورسول کو چاہتے تھے اور رسول ﷺ ان کو چاہتے تھے۔ ہم بہ اذعان و ایقان جانتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ باتفاق صحابہ آپ کے بعد امام قرار پائے تھے، پھر ہم ان یقینی اور متواتر روایات کو چھوڑ کر شیعہ کی ان روایات کاذبہ کی بنا پر کس طرح جھٹلا سکتے ہیں جو اس قابل بھی نہیں ہیں کہ انہیں خبر واحد قرار دیا جا سکے۔ خصوصاً جب کہ ہمیں ان روایات کے کاذب ہونے کا بخوبی علم بھی ہے۔ بلکہ اہل علم محدثین کا اتفاق ہے کہ یہ روایات نبی کریم ﷺ پر سب سے بڑا جھوٹ ہیں۔ اس لیے کہ یہ روایات کسی معتمد کتاب میں باسناد صحیح موجود نہیں۔ بلکہ تمام محدثین انہیں جھوٹ کا پلندہ قرار دیتے چلے آئے ہیں۔

[شیعہ مرویات ناقابل اعتماد]:

خامساً:...... اس پر مزید یہ کہ قرآن کریم جگہ جگہ اس بات کی شہادت دے رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مہاجرین و انصار سے رضامندی کا اظہار کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَ الْاَنْصَارِ وَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ﴾ [التوبة ۱۰۰]

’’اور جو مہاجرین اور انصار سابق اور مقدم ہیں اور جتنے لوگ اخلاص کے ساتھ ان کے پیرو ہیں اللہ ان سب سے راضی ہوا اور وہ سب اس سے راضی ہوئے۔‘‘

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿لَا يَسْتَوِي مِنْكُمْ مَنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْ بَعْدُ وَقَاتَلُوْا وَ كُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى﴾ [الحدید ۱۰]

’’تم میں سے جن لوگوں نے فتح سے پہلے فی سبیل اللہ دیا ہے اور قتال کیا ہے وہ (دوسروں کے) برابر نہیں بلکہ ان کے بہت بڑے درجے ہیں جنہوں نے فتح کے بعد خیراتیں دیں اور جہاد کیے، ہاں بھلائی کا وعدہ تو اللہ تعالیٰ کا ان سب سے ہے۔‘‘

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا﴾ [الفتح ۲۹]

’’محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں کافروں پر سخت ہیں آپس میں رحمدل ہیں، تو انہیں دیکھے گا رکوع اور سجدے کر رہے ہیں اللہ تعالی کے فضل اور رضامندی کی جستجو میں ہیں۔‘‘

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ﴾ (الفتح: ۱۸)

’’اللہ تعالیٰ مومنوں سے راضی ہو گیا جب وہ درخت کے نیچے آپ کی بیعت کر رہے تھے۔‘‘

نیز فرمایا:

﴿لِلْفُقَرَآءِ الْمُهَاجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَ اَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانًا﴾ (الحشر: ۸)

''ان تنگدست مہاجرین کے لیے جن کو اپنے گھر بار سے نکالا گیا وہ اللہ کا فضل اور اس کی رضا مندی چاہتے ہیں۔''

اور اس قسم کی دیگر آیات قرآنیہ۔ پس جو چیز ہمیں قرآنی دلائل کی روشنی میں یقینی طور پر معلوم ہے' اسے ہم ان جھوٹی روایات کی وجہ سے کیسے رد کر سکتے ہیں کہ جن روایات کا گھڑنے والا نہ ہی اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونے سے ڈرتا ہے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کے وقار و عزت کا خیال رکھتا ہے۔

سادساً:...... ظاہر ہے کہ ان نصوص قطعیہ کو شیعہ کی جھوٹی روایات کی بنا پر کیوں کر ترک کیا جا سکتا ہے۔ خصوصاً جب کہ شیعہ کی بعض مرویات سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں قدح وارد ہوتی ہے اور ان سے وجوباً معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اللہ و رسول کی تکذیب کرنے والے تھے۔ ان روایات کو درست تسلیم کرنے کی صورت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ کرام کا مجروح ہونا لازم آتا ہے۔

[یعنی] جن لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ادعاء خلافت کی مخالفت کی تھی؛ وہ اس حدیث کی روشنی میں کافر ٹھہرے۔ جب کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان نصوص کے موجب عمل نہیں کیا۔ مثلاً نواصب؛ [جنہیں شیعہ کافر قرار دیتے ہیں جبکہ] حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کو مسلم اور اہل ایمان تصور کرتے تھے۔

خوارج جن سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے قتال کیا؛ وہ آپ کے بدترین دشمن تھے، مگر اس کے باوجود آپ نے ان پر کافر ہونے کا حکم نہیں لگایا۔ بلکہ آپ نے ان کو لونڈی غلام بنانے سے روکا اور ان کے مالوں کو حرام قرار دیا تھا۔ بلکہ آپ ان سے قتال کرنے سے پہلے ان سے یوں فرمایا کرتے تھے: '' تمہارا ہم پر یہ حق ہے کہ ہم تمہیں اپنی مساجد میں آنے سے نہ روکیں۔ اور ہمارے مال فئے میں تمہارا کوئی حق نہیں ہوگا۔ اور جب ابن ملجم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا تو انھوں نے فرمایا: '' اگر میں زندہ رہا تو جیسے چاہوں گا اپنے خون کا فیصلہ کروں گا۔'' آپ نے ابن ملجم کو اپنے اوپر قاتلانہ حملہ کرنے کی وجہ سے فوری مرتد قرار دے کر قتل کا حکم نہیں دیا تھا۔ [اگر وہ مرتد ہوتا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ اسے فی الفور قتل کرنے کا حکم صادر کرتے]۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بتواتر نقل کیا گیا ہے کہ آپ نے اہل جمل کا تعاقب کرنے سے منع کیا تھا۔ نیز اس بات سے بھی روکا تھا کہ ان کے زخمیوں کو قتل کیا جائے یا ان کا مال لوٹا جائے؛ یا ان کے بچوں کو جنگی قیدی بنایا جائے۔ اگر شیعہ کی ذکر کردہ روایات؛ جن کی روشنی میں یہ لوگ کافر تھے؛ ان کو ترک کرنے سے اگر کوئی شخص کافر ہو جاتا ہے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ اولین شخص تھے جنھوں نے ان احادیث کو جھٹلایا اور ان کے مقتضا پر عمل نہ کیا؛ اس سے لازم آتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی کافر ہوئے۔

اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں کا جنازہ پڑھا تھا جنھوں نے جنگ صفین میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا ساتھ دیا۔

آپ فرمایا کرتے تھے: '' ہمارے بھائیوں نے ہمارے خلاف بغاوت کی تھی تلوار نے ان کو پاک کر دیا۔''

اگر یہ لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نزدیک کافر ہوتے تو آپ ان کی نماز جنازہ نہ پڑھتے؛ اور نہ ہی انہیں اپنے بھائی قرار دیتے اور نہ ہی ان کے قتل کیے جانے کو ان کے گناہوں کی طہارت قرار دیتے۔

بالجملہ ہم اضطراری طور پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی سیرت سے یہ بات جانتے ہیں کہ آپ ان لوگوں کو کافر قرار نہیں دیتے تھے جو آپ کے خلاف جنگ آزما ہوئے۔ بلکہ نہ ہی جمہور مسلمین' نہ ہی خلفاء ثلاثہ اور نہ ہی حسن و حسین رضی اللہ عنہم اجمعین نے ان میں سے کسی ایک کو کافر قرار دیا۔ اور نہ ہی علی بن حسین نے اور نہ ہی ابوجعفر نے ایسا کیا۔ اگر یہ لوگ کافر تھے تو ان نصوص کی سب سے پہلے مخالفت کرنے والے خود حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے اہل بیت ہیں۔ ان کے لیے یہ بھی ممکن تھا کہ ایسے کریں جیسے خوارج نے کیا تھا کہ اگر خود ان کے قتال سے عاجز آ گئے ہیں تو دارالاسلام کو چھوڑ کر کہیں پڑاؤ ڈال دیتے۔ اور اہل دارالسلام پر کفر اور ارتداد کا حکم لگا دیتے۔ جیسا کہ بہت سارے رافضی شیوخ کرتے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر واجب ہوتا تھا کہ وہ دیکھ رہے تھے کہ جب کفار ایمان نہیں لا رہے تو پھر اپنے اور اپنے شیعہ کے لیے دار ارتداد و کفر کو چھوڑ کر ایک اور دار قائم کر لیتے۔ اور ان سے ایسے جدا ہو جاتے جیسے مسلمان مسیلمہ کذاب اور اس کے ساتھیوں سے جدا ہو گئے تھے۔

یہ اللہ کے نبی [محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم] ہیں۔ آپ اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین مکہ مکرمہ میں انتہائی کمزور تھے۔ مگر اس کے باوجود کفار سے علیحدہ رہتے تھے۔ اور کفار سے ایسے جدا اور ممتاز رہتے تھے کہ مسلمان اور کافر کی پہچان ہو سکتی تھی۔ ایسے ہی ان لوگوں میں سے کتنے ہی ایسے تھے جنہوں نے کمزور ہونے کے باوجود حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ اور وہ وہاں پر نصاری سے جدا رہتے تھے۔ اور عیسائیوں کے سامنے اپنے دین کا اظہار کیا کرتے تھے۔

یہ دار اسلام ہے جو یہودیوں اور عیسائیوں سے بھرا ہوا ہے؛ مگر اس کے باوجود یہ لوگ مسلمانوں سے جدا رہتے ہیں اور اپنے دین و مذہب کا کھل کر اظہار کرتے ہیں۔

اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت میں شک کرنے والا ہر انسان حضرت علی رضی اللہ عنہ اور اہل بیت رضی اللہ عنہم اجمعین کے نزدیک کافر ہوتا ؛ اور ان کے نزدیک صرف وہی شخص مؤمن ہوتا جو آپ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد امام معصوم ہونے کا عقیدہ رکھنے والا ہوتا ؛ اور جو شخص یہ عقیدہ نہ رکھتا وہ حضرت علی اور اہل بیت رضی اللہ عنہم اجمعین کے نزدیک مرتد ہوتا ؛ تو پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ سب سے پہلے شخص ہیں جنہوں نے دین کو بدل ڈالا ؛ اور کافروں اور مؤمنوں کے درمیان کوئی فرق نہ کیا اور نہ ہی مرتدین اور مسلمانوں کے مابین کوئی تمیز کی۔

مان لیجیے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ان لوگوں سے قتال کرنے سے عاجز آ گئے تھے تو انہیں اپنے حلقہ اطاعت میں داخل نہ کر سکتے تھے ؛ تو آپ کم از کم ان سے جداگانہ حیثیت ثابت کرنے سے تو عاجز نہیں تھے۔ آپ خوارج سے بڑھ کر عاجز تو نہیں تھے جو کہ آپ کے لشکر میں بہت ہی کم تعداد میں تھے ؛ مگر خوارج نے جماعت مسلمین کے دار کو چھوڑ کر اپنے لیے علیحدہ دار بنا لیا تھا ؛ وہ ان سے جدا ہو گئے اور ان پر کفر کا حکم لگایا۔ وہ صرف اپنے ساتھیوں کو ہی مؤمن قرار دیتے تھے۔

اور پھر حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے لیے کیونکر یہ حلال ہوتا کہ وہ مسلمانوں کی زمام کار ایسے مرتد کے سپرد کر دیتے جو یہود و نصاری سے بھی برا ہو؟ جیسا کہ ان لوگوں کا حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں دعوی ہے۔ کیا اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے ایمان پر رکھنے والا کوئی انسان ایسی حرکت کر سکتا ہے؟ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے لیے یہ ممکن تھا کہ آپ کوفہ میں ہی رہتے ؛ اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ آپ سے جنگ نہ کرتے۔ اس لیے کہ انہوں نے آپ سے اپنی مراد طلب کی تھی۔ اگر آپ اپنے باپ کی جگہ پر

رہتے تو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ آپ سے جنگ ہرگز نہ کرتے۔[ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ اگر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے رفقا حضرت حسن کے نزدیک کافر ہوتے تو آپ بخوشی ان کے حق میں سلطنت وحکومت سے دست بردار نہ ہوتے۔خصوصاً جب کہ آپ قوت و شوکت سے بہرہ ور تھے اور لشکر جرار آپ کی پشت پناہی کے لیے بھی موجود تھا]۔اور پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کا کیا بنے گا جو آپ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا تھا:

''بیشک میرا یہ بیٹا سردار ہے،عنقریب اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ مسلمانوں کے دو عظیم گروہوں کے درمیان مصالحت کرائے گا۔''❶

اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ اور اہل بیت-بشمول حضرت حسن رضی اللہ عنہ- یہ کہتے کہ:''اللہ تعالیٰ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے ذریعہ اہل ایمان اور مرتدین کے درمیان صلح کرائی ہے؛تو پھر معاملہ ویسے ہی ہوتا جیسے رافضی کہتے ہیں؛اور یہ حدیث خود شان حسنی اور شان نبوی پر بہت بڑی جرح ہوتی۔[اس حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں جماعتوں کو مسلم قرار دیا ہے،مگر شیعہ کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے رفقاء مومن تھے اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے اعوان وانصار مرتد تھے۔بنابریں یہ مصالحت مومنین ومرتدین کے مابین وقوع پذیر ہوئی تھی]۔

پس اس سے ظاہر ہوا کہ اہل بیت پر سب سے بڑا طعن اور جرح کرنے والے خود رافضی ہیں۔اور یہی وہ لوگ ہیں جو حقیقت میں اہل بیت سے دشمنی رکھتے ہیں؛ اور اہل بیت کی طرف ایسے برائیاں منسوب کرتے ہیں جن کا ارتکاب کرنے والا کافر ہو جاتا ہے۔رافضیوں کی جہالت وحماقت میں یہ کوئی نئی چیز نہیں ہے۔

پھر طرفہ تماشہ یہ کہ: ایک طرف شیعہ کا دعویٰ ہے کہ امام معصوم بندوں پر الٰہی لطف وکرم کا آئینہ دار ہوتا ہے،تاکہ لوگ اس کی اطاعت کریں اور ان پر رحم کیا جائے۔مگر ان کے بیانات سے اس کی تردید ہوتی ہے اور ظاہر ہوتا ہے کہ امام علی رضی اللہ عنہ کے وجود سے بڑھ کر اہل زمین پر الٰہی عذاب کا مظہر کوئی اور نہیں رہا۔اس لیے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مخالفین بقول شیعہ کافر اور مرتد ہوگئے تھے۔اور جو لوگ آپ کے ہم نوا تھے وہ ہر طرح سے ذلیل وخوار اور مقہور رہے ہیں۔جن کے پاس نہ ہی کوئی طاقت تھی اور نہ ان کی بات کی کوئی قدر واہمیت تھی۔[تو پھر اس امام کا فائدہ کیا ہوا؟]

اس کے دوش بدوش شیعہ یہ بھی کہتے ہیں کہ: امام کو پیدا کرنا مصلحت اور مہربانی ہے۔بندوں کے حق میں مفید وسود مند کام انجام دینا اللہ تعالیٰ پر واجب ہے۔اور امام کے بغیر دین ودنیا کی کوئی مصلحت پوری نہیں ہوسکتی۔تو رافضیوں کے قول کے مطابق یہ کون سی صلاح ہے؟

پھر ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ: بیشک اللہ تعالیٰ پر واجب ہے کہ وہ ایسے امور سرانجام دے جو بندوں کے لیے ان کے دین و دنیا کی مصلحت میں ہوں۔حالانکہ اللہ تعالیٰ خوارج کو شیعہ پر مسلط کرتا ہے اور وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تکفیر کرکے آپ کے خلاف صف آراء ہوتے ہیں۔انہیں وہاں پر اپنے دشمن کے خلاف جنگ کیلئے غلبہ اور استحکام نصیب ہوتا ہے۔جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ [اہل بیت اور] شیعہ کے ائمہ معصومین یہود ونصاریٰ اور دوسرے اہل ذمہ سے بڑھ کر خائف وہراساں ہو جاتے ہیں۔]

❶صحیح بخاری، کتاب الصلح، باب قول النبی ﷺ للحسن بن علی رضی اللہ عنہ (حدیث:۲۷۰۴)۔

اور ڈر کے مارے ذمیوں کی طرح تقیہ کر لیتے ہیں] بلکہ اہل ذمہ تو بعض اوقات اپنے مذہب کا اظہار اعلان بھی کرتے ہیں؛ جب کہ یہ ائمہ جن کے بارے میں شیعہ کا دعویٰ ہے کہ یہ بندوں پر اللہ تعالیٰ کی حجت اور شہروں پر اس کا لطف و کرم ہیں۔ ان کے بغیر کوئی ہدایت نہیں مل سکتی۔ اور ان کی اطاعت کے بغیر کوئی نجات نہیں؛ اور ان کی اتباع کے بغیر کوئی سعادت نہیں۔ ان کا آخری امام ساڑھے چار سو سال [اب گیارہ سو سال] سے غائب ہے؛ کوئی بھی اپنے دینی یا دنیاوی امور میں اس سے کوئی فائدہ نہ حاصل کر سکا۔ اور اس کے لیے دین کا اتنا اظہار کرنا بھی ممکن نہیں ہے جتنا یہود و نصاریٰ کے لیے ممکن ہے۔

[اس لیے ہم شیعہ سے پوچھتے ہیں کہ وہ لطف و مصلحت کیا ہوئی جو شیعہ کے نزدیک اللہ پر واجب ہے؟]

یہی وجہ ہے کہ اہل علم ہمیشہ سے کہتے چلے آرہے ہیں کہ: رافضیت زنادقہ اور ملحدین کی ایجاد ہے جو چاہتے ہیں کہ دین اسلام کو خراب کریں؛ [مگر اللہ تعالیٰ کا فیصلہ یہ ہے]: ﴿وَ یَاْبَی اللّٰہُ اِلَّآ اَنْ یُّتِمَّ نُوْرَہٗ وَ لَوْ کَرِہَ الْکٰفِرُوْنَ﴾ [توبہ۳۲]

''اور اللہ تعالیٰ انکار کرتے ہیں مگر اسی بات کا کہ اپنا نور پورا کرے گو کافر ناخوش رہیں۔''

[ائمہ سے متعلق شیعہ کے بلند بانگ دعوے]:

اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی تمام باتوں کا انجام کار جمہور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی تکفیر کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ اور اہل بیت کی تکفیر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ باطنی مذہب کی دعوت ان اصولوں پر قائم ہے۔

[شیعہ اس زعم فاسد میں مبتلا ہیں کہ ائمہ اللہ کے بندوں پر اس کی حجت کا درجہ رکھتے ہیں۔ ہدایت انہی کے ذریعہ حاصل ہو سکتی ہے اور ان کی اطاعت کے بغیر نجات ممکن نہیں ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ آخری امام ہنوز پردۂ غیب میں ہے اور کسی نے بھی ان سے دینی یا دنیوی فائدہ نہیں اٹھایا، اس سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ عقیدہ رفض زنادقہ کا اختراع کردہ ہے، یہی وجہ ہے کہ فرقہ باطنیہ والے] سب سے پہلے اپنے دام میں پھنسنے والوں کو شیعیت کی دعوت دیتے ہیں۔ جب کوئی شخص اس کا قائل ہو جاتا ہے تو پھر وہ یوں کہنے لگتے ہیں کہ علی دیگر خلفاء کی طرح تھے، چنانچہ وہ شخص حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جرح و قدح کا نشانہ بنانے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ جب اس میں پختہ ہو جاتا ہے تو پھر باطنیہ اسے رسول پر اعتراضات وارد کرنا سکھاتے ہیں یہاں تک کہ وہ منکر رسول ہو جاتا ہے پھر اسے باری تعالیٰ کی ہستی کا منکر بناتے ہیں خلاصہ یہ کہ تدریجاً وہ پوری شریعت کا منکر ہو جاتا ہے۔ ان کی کتاب کی یہی ترتیب ہے۔ اس کتاب کا نام ''البلاغ الاکبر'' ہے' اور اسے ''الناموس الاعظم بھی کہتے ہیں۔ اس کے مصنف نے یہ کتاب قرمطی کو بھیجی تھی جس نے بحرین سے خروج کیا تھا؛ اور پھر مکہ پر غلبہ پا کر وہاں حجاج کرام کا قتل عام کیا' اور حجر اسود اکھاڑ کر لے گئے؛ اللہ تعالیٰ کی حرمتوں کو پامال کیا' اور فرائض کو ساقط قرار دیا۔ ان لوگوں کے عقائد و اخلاقیات علماء کرام میں بڑے معروف ہیں۔

پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف یہ بات کیسے منسوب کی جاسکتی ہے کہ آپ یہ فرمادیں کہ: ''جو کوئی علی رضی اللہ عنہ سے بغض رکھتے ہوئے مر جائے؛ وہ یہودی مرے یا عیسائی؛ اس میں کوئی حرج نہیں۔ جب کہ حال یہ ہے کہ تمام خوارج آپ کی تکفیر کرتے اور آپ سے بغض رکھتے ہیں۔ جب کہ خود حضرت علی رضی اللہ عنہ انہیں یہود و نصاریٰ کی طرح نہیں سمجھتے تھے؛ بلکہ انہیں اہل قبلہ میں شمار کرتے تھے۔ اور ان پر یہود و نصاریٰ کے حکم سے ہٹ کر حکم لگایا کرتے تھے۔ اور آپ کا یہی معاملہ بنوامیہ اور ان کے متبعین میں سے ان لوگوں کے ساتھ تھا جو آپ سے بغض رکھتے تھے۔ تو پھر ان لوگوں کو یہود و نصاریٰ کی طرح کیسے قرار دیا جاسکتا ہے

جو نمازیں پڑھتے ہوں؛ رمضان کے روزے رکھتے ہوں' بیت اللہ کا حج کرتے ہوں' اور زکوٰۃ ادا کرتے ہوں؟ اس کی آخری حد یہ ہوسکتی ہے کہ اس انسان پر یا تو آپ کا امام ہونا مخفی رہا یا پھر اس نے معرفت حاصل ہونے کے بعد بھی آپ کی نافرمانی کی۔

ہر صاحب عقل و خرد اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ جمہور اہل اسلام کو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے عداوت ہے نہ کسی اور سے۔ انھیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب اور آپ کے احکام کی خلاف ورزی سے بھی کوئی دلچسپی نہیں۔ نظر بریں اگر مسلمانوں کو معلوم ہوتا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تصریحاً حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ مقرر کیا ہے تو اس کی تصدیق کرنے میں انھیں پس و پیش کی قطعاً ضرورت نہ تھی۔ زیادہ سے زیادہ یہ فرض کیا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حکم کا پتہ نہ چل سکا۔ ظاہر ہے کہ جس شخص کو دین کی کسی بات کا علم نہ ہو وہ یہود و نصاریٰ کی طرح کیوں کر ہوسکتا ہے؟

یہاں پر تکفیر میں کلام کرنا مقصود نہیں' بلکہ اس بات پر تنبیہ کرنا مقصود ہے کہ: یہ وہ جھوٹی احادیث ہیں جن کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ ہونا اضطراری طور پر معلوم ہے' اور یہ روایات دین اسلام کے متناقض ہے۔ اور ان سے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کی مخالفت کرنے والوں کی تکفیر لازم آتی ہے۔ یہ باتیں کوئی ایسا انسان بھی نہیں کہہ سکتا جو اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو؛ چہ جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کچھ فرمایا ہو۔ العیاذ باللہ؛ ایسی باتوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنا بھی آپ کی ذات پر بہت بڑی قدح اور طعن کا موجب ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ اسی ملحد او رزندیق کا فعل ہوسکتا ہے جو دین اسلام میں فساد اور بگاڑ پیدا کرنا چاہتا ہو۔ ایسے لوگوں پر اللہ کی لعنت ہو جو اس کے رسول پر جھوٹ گھڑ لاتے ہیں۔ شیعہ کی روایات موضوعہ کی نسبت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی قابل غور ہے:

آپ فرماتے ہیں: ''جس نے دانستہ مجھ پر جھوٹ باندھا، وہ اپنا گھر دوزخ میں بنا لے۔''[1]

[البتہ ہم یہ کہتے ہیں کہ جو شخص نص رسول کو اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کے نقطۂ خیال سے چھپالے وہ یقیناً جہنمی ہے۔]

[قبول احادیث کا وجوب]:

[اشکال]: شیعہ مصنف کا یہ قول کہ ''جب امامیہ نے دیکھا کہ ہمارے مخالفین ایسی احادیث روایت کر رہے ہیں تو ہم نے اپنے ثقہ راویوں سے نقل کرکے اہل سنت کی ذکر کردہ روایات سے کئی گنا زیادہ احادیث بیان کی ہیں۔ ہم پر واجب ہوتا ہے کہ ان کی طرف رجوع کریں۔ اور ان سے ہٹنا ہم پر حرام ہے۔''

[جواب]: ہم کہتے ہیں کہ: ''اس میں کوئی شک نہیں کہ تمہارے وہ راوی جن کی تم توثیق کرتے ہو' وہ حد سے زیادہ ان راویوں کی جنس سے ہی ہوسکتے ہیں جو جمہور سے روایات نقل کرتے ہیں۔ لیکن [ایسا ہرگز نہیں]؛ اہل علم اضطراری طور پر جانتے ہیں کہ یہ راوی جھوٹے کذاب تھے؛ اور تم ان سے بڑے کذاب اور پرلے درجہ کے جاہل ہو۔ تم پر ان حدیث کے موجب عمل کرنا اور ان کے مطابق فیصلے دینا حرام ہے۔ اس اعتراض پر کئی طرح سے کلام کیا جاسکتا ہے:

[1] صحیح بخاری، کتاب العلم۔باب اثم من کذب علی النبی ﷺ (ح:۱۰۷، ۱۰۸)، صحیح مسلم ۔ المقدمۃ۔ باب تغلیظ الکذب علی رسول اللہ ﷺ (ح:۲،۳)

❀ پہلی وجہ: آپ کو یہ علم کیسے حاصل ہوگیا کہ قدیم زمانے میں جن لوگوں نے یہ روایات نقل کی ہے؛ وہ ثقہ راوی ہیں۔ کیونکہ آپ نے تو ان لوگوں کو نہیں پایا اور نہ ہی ان کے احوال جانتے ہو۔ اور نہ ہی تمہارے پاس کوئی ایسی قابل اعتماد کتابیں ہیں جن پر اعتماد کرتے ہوئے تم ضعیف اور ثقہ کے مابین فرق کر سکو۔ اور نہ ہی تمہارے ہاں اسناد ہیں جن کی بنا پر تم راویوں کی معرفت حاصل کر سکو۔ بلکہ تمہارا بہت سارا وہ علم جو کہ تمہارے سامنے موجود ہے' وہ یہود و نصاری کے ہاں موجود علم سے بھی برا ہے۔ بلکہ یہود کے ہاں تو ہلال اور شاس کی وضع کردہ کتابیں موجود ہیں' مگر شیعہ کے ہاں کوئی ایسی کتاب موجود نہیں ہے جس کی روشنی میں وہ جمہور پر رد کر سکیں۔

جب کہ تمہارا یہ عالم ہے کہ جمہور اہل سنت والجماعت ہمیشہ تمہارے راویوں پر کڑی تنقید کرتے ہیں؛[جس سے شدید تر تنقید کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا]۔ جب کہ تمہیں ان کے احوال کے بارے میں کوئی علم نہیں۔ پھر تواتر کے ساتھ اس بات کا علم بھی حاصل ہے جس کا جھٹلانا کسی طرح بھی ممکن نہیں کہ تمہارے ہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانہ سے لیکر آج تک جھوٹ کی کثرت ہے۔

تمہیں اس بات کا بھی علم ہے کہ محدثین خوارج سے بغض رکھتے ہیں اور ان کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول بہت ساری صحیح احادیث بھی روایت کرتے ہیں۔ جن میں سے بعض احادیث امام بخاری نے نقل کی ہیں۔ دس روایات امام مسلم نے نقل کی ہیں۔ اور محدثین اس چیز کو دین کا حصہ سمجھتے ہیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح سند کے ساتھ ثابت ہو۔ مگر اس کے باوجود خوارج کے ساتھ ان کا بغض انہیں اس بات پر نہیں ابھار سکا کہ یہ لوگ خوارج پر جھوٹ لگائیں۔ بلکہ انہوں نے خوارج کو آزمایا تو انہیں سچا پایا۔ جب کہ تمہارا یہ حال ہے کہ محدثین' فقہاء؛ عام مسلمان؛ تاجر؛ عوام الناس؛ اور لشکری وغیرہ جن لوگوں نے بھی تمہارے ساتھ میل جول رکھا؛ اور تمہیں جدید یا قدیم دور میں آزمایا؛ اس نے تمہارے گروہ کو تمام گروہوں سے بڑا جھوٹا اور کذاب گروہ پایا۔ اگر ان میں کوئی ایک سچا ہو بھی تو دوسرے فرقوں میں ان سے زیادہ سچے موجود ہوتے ہیں۔ اگر دوسرے فرقوں میں کوئی ایک جھوٹا ہو تو شیعہ میں سب سے زیادہ جھوٹے ہوتے ہیں۔ یہ بات کسی بھی عقلمند منصف پر مخفی نہیں ہے۔ ہاں جو کوئی اپنے خواہش نفس کی پیروی کرے تو یقیناً اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کے دلوں کو اندھا کر دیا ہوتا ہے۔ اور جن کو اللہ تعالیٰ گمراہ کر دے انہیں کوئی راہ ہدایت پر لانے والا رہبر نہیں ملتا۔

یہ باتیں جو ہم نے ذکر کی ہیں؛ قدیم و جدید میں اہل علم کے ہاں معروف رہی ہیں۔ جیسا کہ ہم نے اس سلسلہ میں بعض اقوال بھی نقل کئے ہیں۔ یہاں تک کہ امام عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''دین اہل حدیث [محدثین] کے ہاں ہے؛ جھوٹ رافضیوں کے ہاں ہے؛ کلام معتزلہ کے ہاں ہے؛ حیلے اصحاب فلاں اہل رائے کے ہاں ہیں۔ اور سوئے تدبیر آل ابی فلاں کے ہاں ہے۔''

اور یہ بالکل ویسے ہی ہے جیسے کہ انہوں نے فرمایا ہے۔ اس لیے کہ دین وہ چیز ہے جسے دیکر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث کیا تھا۔ آپ کی سنتوں اور احادیث کو سب سے زیادہ جاننے والے محدثین ہیں۔ جب کہ علم کلام میں سب سے زیادہ مشہور گروہ معتزلہ کا ہے۔ اسی لیے خواص کے ہاں معتزلہ بدعات میں بڑے مشہور تھے۔ جب کہ رافضی اپنی بدعات

میں خواص وعوام کے مابین بہت مشہور ومعروف ہیں؛ یہاں تک کہ اکثر عوام الناس انہیں متضاد اقوال کی وجہ سے جانتے ہیں۔ اس لیے کہ ان کے اقوال رسول اللہ ﷺ کی لائی تعلیمات سے متناقض ہیں؛ خواص وعوام کو اس کا علم ہے۔ یہ خود اپنے عمل سے رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات کے خلاف ہونے کی ایک بڑی دلیل ہیں۔ یہاں تک کہ وہ گروہ جنہیں رسول اللہ ﷺ کے دین سے کوئی زیادہ شناسائی نہیں جیسے دوسرے لوگوں کو معرفت حاصل ہے؛ اگر ان لوگوں سے بھی رافضی کہتے ہیں کہ: ہم مسلمان ہیں؛ تو وہ کہتے ہیں: نہیں تم کوئی دوسری جنس ہو؛ [تمہارا اسلام سے کوئی تعلق نہیں]۔ یہی وجہ ہے کہ رافضی لوگ دین سے دشمنی رکھنے والے ہر گروہ سے دوستی رکھتے ہیں؛ جیسے کہ یہود ونصاری اور مشرکین؛ مشرک ترک۔

جب کہ ان اولیاء اللہ سے دشمنی رکھتے ہیں جو اہل دین میں سے بہترین لوگ اور اہل تقوی کے سردار ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اس دین کی تبلیغ کی؛ اسے قائم کیا اور اس کی نصرت کی۔ یہی وجہ ہے کہ کافر تاتاریوں کے بلاد اسلام میں داخل ہونے کا سب سے بڑا سبب رافضی ہی تھے۔ عباسی وزیر ابن علقمی اور اس جیسے دوسرے لوگ جیسے نصیر طوسی کے مسلمانوں کے خلاف کفار سے اتحاد کو خواص وعوام سبھی جانتے ہیں۔ ایسے ہی ان میں جو لوگ شام میں تھے؛ انہوں نے مسلمانوں کے خلاف مشرکین کا ساتھ دیا اور ان کی مدد کی۔ جسے تمام لوگ جانتے ہیں۔

ایسے ہی جب مسلمانوں کا لشکر ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا؛ اور غازان اسلامی ممالک پر حملہ آور تھا؛ تو ان لوگوں نے نصرانی کافروں اور دوسرے مسلمان دشمنوں کا ساتھ دیا۔ اور مسلمانوں کے بچوں اور اموال کو ان کے ہاتھوں بیچ ڈالا۔ اور خوب کھل کر مسلمانوں کے خلاف جنگ کی۔ ان میں سے بعض نے تو صلیبیوں کا جھنڈا بھی اٹھایا ہوا تھا۔ قدیم دور میں بیت المقدس پر نصاری کے قبضہ کا ایک بڑا سبب شیعہ تھے۔ یہاں تک مسلمانوں نے بیت المقدس کو دوبارہ حاصل کرلیا۔

اور رافضی مذہب انہوں نے ہی اختیار کیا ہے جو لوگوں میں سب سے بڑے منافق تھے؛ جیسے: نصیریہ؛ اسماعیلیہ اور دیگر گروہ۔ یہ ایسے لوگ تھے جو باطنی طور پر سب سے بڑے کافر؛ یہود ونصاری سے بڑھ کر اللہ اور اس کے رسول کے دشمن تھے۔

یہ اور اس جیسے دیگر امور جو کہ ظاہر ومعروف ہیں؛ جنہیں عام وخاص سبھی جانتے ہیں۔ ان کے موجب اور ان کی دین سے مفارقت اور کفار ومنافقین کے زمرہ میں داخل ہونے کی وجہ سے ان کو مسلمانوں سے جدا کرنا واجب ہوجاتا ہے۔ یہاں تک کہ ان کے احوال کو دیکھنے والا ہی سمجھ جائے کہ یہ لوگ مسلمانوں سے علیحدہ ایک جنس ہیں۔ اس لیے کہ بلاریب وہ مسلمان جو قدیم وجدید دور میں اسلام کو قائم کرتے چلے آئے ہیں وہ جمہور مسلمان ہیں۔ جب کہ رافضیوں نے تو ہمیشہ دین اسلام کو مٹانے اور اس کی رسی کو توڑنے' اور اس کی بنیادوں کو ڈھانے کی کوشش کی ہے۔ اور جس قدر ان میں اگر دین کا کچھ حصہ باقی ہے' وہ جمہور مسلمانوں کی کوششوں کی وجہ سے ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ان میں قرآن کی تلاوت کرنے والے بہت کم ہیں۔ اور ان میں سے جو لوگ اچھی طرح قرآن پڑھنا جانتے ہیں انہوں نے اہل سنت والجماعت سے اس کی تعلیم حاصل کی ہے۔ یہی حال حدیث میں بھی ہے: حدیث کی معرفت و تصدیق اور اخذ وقبول میں اہل سنت کا قول ہی معتبر ہے۔ ایسے ہی فقہ وعبادت؛ زہد وجہاد اور قتال میں بھی لوگ حقیقت میں اہل سنت والجماعت کے لشکر میں شامل ہیں۔ اور اہل سنت والجماعت ہی وہ لوگ ہیں جن کے علماء ومجاہدین عباد وزھاد کے

ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے اس دین کی علماً اور عملاً حفاظت فرمائی ہے۔

رافضی دین اسلام سے پرلے درجے کے جاہل لوگ ہیں ۔اور انسان کے لیے ان کے پاس کوئی خاص چیز نہیں ہے سوائے اس چیز کے جس سے دشمن خوش ہو اور اہل اسلام کو تکلیف پہنچائے۔ اسلام میں ان لوگوں کے لیل و نہار انتہائی سیاہ ہیں۔ان کے عیوب اور بھلائیوں کو سب سے زیادہ جاننے والے اہل سنت ہیں۔ آپ ہمیشہ ان سے کچھ دیگر اچھنبے امور بھی دیکھتے رہیں گے جن سے ان کی پہچان حاصل ہو جائے گی۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے یہود کے بارے میں فرمایا ہے:

﴿وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰی خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ﴾ [المائدۃ ۱۳]

''اور آپ ہمیشہ ان کی کسی نہ کسی خیانت کی خبر پاتے رہیں گے،سوائے ان کے تھوڑے سے لوگوں کے۔''

اگر میں ان کی بعض ایسی باتیں نقل کرنی شروع کردوں جو میں نے خود دیکھی ہیں اور جو ثقہ لوگوں سے نقل کی ہیں؛ اور جو کچھ ان کی کتابوں میں پڑھا ہے؛ تو اس کے لیے ایک بہت بڑی کتاب چاہیے۔

یہ لوگ انتہائی درجہ کی جہالت اور کم عقلی کا شکار ہیں۔ایسی باتوں سے نفرت کرتے ہیں جن سے نفرت کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ یہ لوگ حق پر ہیں تو پھر بھی ایسے کام کرتے ہیں جن میں ان کے لیے کوئی منفعت نہیں۔مثال کے طور پر مرغی کے پر نوچنا؛ گویا کہ وہ اس سے انتقام لے رہے ہوں۔[وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ] وہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بال نوچ رہے ہیں۔--العیاذ باللہ--۔اور ایسے ہی زین کے نیچے رکھے ہوئے تھڑے کو درمیان سے پھاڑ ڈالنا؛ اور یہ کہنا کہ ہم نے عمر رضی اللہ عنہ کا پیٹ پھاڑ ڈالا۔تو کیا مسلمان فرقوں میں سے کسی ایک نے اپنے مخالفین کے ساتھ ایسا کیا ہے؟

اگر ایسا کرنا مشروع ہوتا تو ابو جہل اور اس جیسے دوسرے لوگ اس کے زیادہ حق دار تھے۔ اور جیسا کہ ان لوگوں کا عشرہ مبشرہ کے بغض کی وجہ سے دس کے عدد سے بغض و نفرت رکھنا۔ جب کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں کئی مقامات پر دس کا ذکر بطور مدح کیا ہے۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَالْفَجْرِ ۝ وَلَيَالٍ عَشْرٍ﴾ [الفجر]

''اور قسم ہے فجر کے وقت کی اور دس راتوں کی۔''

نیز فرمایا: ﴿وَ اَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ﴾ [الاعراف ۱۴۲]

''اور ہم نے مزید دس راتوں سے اسے پورا کر دیا۔''

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ﴾ [البقرۃ ۱۹۶]

''اور وہ ہیں گنتی کے پورے دس۔''

جب کہ نو کے عدد کو بطور مذمت کے ذکر کیا ہے؛ فرمان الٰہی ہے:

﴿وَكَانَ فِی الْمَدِيْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُّفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ﴾ [النمل ۴۸]

''اور شہر میں نو گروہ تھے جو کہ فساد پھیلاتے تھے اور اصلاح نہیں کرتے تھے۔''

تو کیا کبھی بھی ایسا ہوا ہے کہ مسلمانوں نے نو کے عدد کو زبان پر لانے کو ناپسند کیا ہے۔ جب کہ شیعہ کا یہ حال ہے کہ وہ دس کے بجائے نو کے لفظ کو ترجیح کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

اور ایسے ہی شیعہ کا ان اسماء[ناموں] کو ناپسند کرنا جو ان کے ناپسندیدہ لوگوں کے ناموں پر رکھے گئے ہیں۔جب کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین میں ایسے لوگ موجود تھے جن کے نام اسلام دشمنوں کے ناموں پر تھے۔جیسا کہ ولید؛ جسے قرآن نے وحید کے لقب سے ذکر کیا ہے؛اس کا بیٹا بہترین مسلمانوں میں سے تھا؛ اس کا نام بھی ولید رضی اللہ عنہ تھا۔ رسول اللہ ﷺ نماز میں قنوت نازلہ پڑھ کر اس کے لیے دعا فرمایا کرتے تھے:''اے اللہ! ولید بن ولید کو نجات عطاء فرما۔''[متفق علیہ]

اور جیسا کہ ابی بن خلف جسے رسول اللہ ﷺ نے قتل کیا تھا۔ جبکہ مسلمانوں میں اس نام کے کئی افراد موجود تھے جیسے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ وغیرہ۔اور جیسا کہ عمرو بن عبد ود العامری؛اور صحابہ میں بھی اس نام کے لوگ تھے جیسے عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ۔اس کی مثالیں بہت زیادہ ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے ان میں سے کسی ایک کا نام بھی اس وجہ سے تبدیل نہیں کیا کہ اس نام کا کوئی کافر بھی موجود ہے۔

❀ اور اگر اس بات کو تسلیم کرلیا جائے کہ جن لوگوں سے شیعہ نفرت رکھتے ہیں' وہ کافر ہیں؛ پھر بھی ان کا ان ناموں سے ناپسندیدگی کا اظہار کرنا جہالت کی انتہاء ہے؛ کیونکہ نبی کریم ﷺ ان صحابہ کو ان ہی ناموں سے پکارا کرتے تھے۔

❀ ان کے جواب میں کہا جائے گا کہ:''اہل علم و دین میں سے جن لوگوں نے بھی جمہور کا تجربہ کیا ہے؛ وہ جانتے ہیں کہ جمہور کبھی بھی جھوٹ پر راضی نہیں ہوتے؛ بھلے وہ ان کی اغراض کے موافق ہی کیوں نہ ہو۔خلفاء ثلاثہ اور دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے فضائل میں کتنی ہی روایات ایسی ہیں جن کی اسناد شیعہ کی روایات سے زیادہ بہتر ہیں۔مثال کے طور پر ابونعیم اور ثعلبی؛ ابوبکر النقاش اور اُہوازی اور ابن عساکر کی روایات؛ اور ان جیسے دوسرے لوگوں کی مرویات۔مگر علماء حدیث ان میں سے کسی ایک روایت کو بھی ایسے ہی قبول نہیں کر لیتے۔ بلکہ ان کے ہاں جب کسی روایت کا راوی مجہول ہوتا ہے؛ تو اس کی روایت میں توقف اختیار کرتے ہیں۔جب کہ رافضی گروہ کی حالت یہ ہے کہ جو روایت بھی ان کی خواہشات کے اور رائے کے مطابق ہو' اسے قبول کر لیتے ہیں؛ اور اس میں سے صحیح یا غلط کسی بھی چیز کا رد نہیں کرتے۔

❀ جب جمہور کے ہاں وہ صحیح اور معروف احادیث موجود ہیں جن کی صحت و صداقت کا ہر مسلمان کو علم ہے۔اور آپ بھی یہ بات جانتے ہیں کہ ان احادیث کو قبولیت حاصل ہے۔ بلکہ یہ احادیث متواتر کی حد تک پہنچی ہوئی ہیں' جو کہ علم ضروری کا فائدہ دیتی ہیں' اور دل سے ان کا انکار کرنا بھی ممکن نہیں۔اور یہ ان دلائل کے متناقض ہیں جن کو روایت کرنے والا مجہول لوگوں کا ایک گروہ ہے؛ یا پھر وہ لوگ ہیں جو جھوٹ بولنے میں مشہور ہیں خواہ وہ تم میں سے ہوں یا جمہور میں سے۔تو پھر کیا یہ بات ممکن ہے کہ جس چیز کو لوگ ضرورت کے تحت جانتے ہوں' اور جو ایسے ثقہ راویوں کی صحیح اسناد سے ثابت ہو جن کی سچائی اور علم کی پختگی معروف ہے؛ ان کی روایات کو رد کر دیا جائے؟ اور کیا یہ ممکن ہے کہ ان روایات کو ان روایات سے رد کیا جائے جو کہ من گھڑت ہیں اور جن کی کوئی نہ ہی زمام ہے نہ لگام؟اور اگر کوئی انسان یہ روایت کرے کہ نمازیں پانچ سے زیادہ واجب ہیں اور دو ماہ کے روزے واجب ہیں اور مسلمانوں پر دو بار بیت اللہ کا حج کرنا واجب ہے۔پس جس طرح سے ان روایات کا رد کیا جائے گا' اسی طرح سے ان دوسری روایات کا رد بھی کیا جائے گا۔اس رد میں ہم نے ان طرق کی طرف بھی توجہ دلائی ہے جن سے ان لوگوں کا جھوٹ واضح ہو جاتا ہے جو محدثین کے طریقہ سے

ہٹ کر روایات نقل کرتے ہیں۔ اور ہم نے ان لوگوں کا جھوٹ بھی طشت از بام کیا ہے۔ کبھی قرآن سے' کبھی علم متواتر سے اور کبھی لوگوں کے اجماع سے۔ اور یہ بھی طے شدہ بات ہے کہ وہ روایات جو قرآن و متواتر احادیث اور اجماع کے خلاف ہوں' اور عقل کے بھی مخالف ہوں ان کا باطل ہونا معلوم ہو جاتا ہے۔ یہ ان جملہ طریقوں میں سے ایک طریقہ ہے جن سے ان روایات کا علم ہوتا ہے جو اہل سنت والجماعت کے مذہب کی مخالفت میں گھڑ لی گئی ہیں۔ اس لیے کہ یہ لوگ اپنی روایات میں تین چیزوں میں سے کسی ایک پر انحصار کرتے ہیں:

۱۔ یا تو وہ کسی جھوٹے سے روایت نقل کرتے ہیں۔

۲۔ یا پھر ان کی دلیل مجمل اور متشابہ ہوتی ہے۔

۳۔ یا پھر فاسد قیاس ہوتا ہے۔

یہی حال ان تمام لوگوں کا ہے جو فاسد دلائل سے حجت پکڑتے ہیں اور پھر اسے شریعت کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ اس لیے کہ بنیادی چیزیں یا تو نص ہے' یا پھر قیاس۔ نص کے لیے صحیح سند اور دلالت متن کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کیلئے ضروری ہے نص رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہو۔ اور لازمی طور پر اپنے مطلوب پر دلالت کرتی ہو۔ جب کے [ان لوگوں کے] باطل دلائل یا تو سنی سنائی جھوٹی باتیں ہیں۔ یا پھر اگر روایت صحیح بھی ہو تو وہ اپنے مقصود پر دلالت نہیں کرتی۔ یا پھر فاسد قیاس ہوتا ہے۔ رافضہ اور دوسرے اہل باطل کے ہاں جنس کے علاوہ کوئی بھی دوسری دلیل سمعی موجود نہیں۔

❀ جب ہم کہتے ہیں: ''نقل کرتے ہوئے'' تو اس میں کلام اللہ اور کلام رسول اللہ ﷺ دونوں شامل ہوتے ہیں؛ اور اہل اجماع کا کلام بھی ان لوگوں کے ہاں شامل ہوتا ہے جو اسے حجت مانتے ہیں۔ بلاشبہ رافضی اجماع کو حجت ہی نہیں مانتے۔ ایسے ہی افعال و اقرار اور خاموشی بھی اسی طریقہ پر ہے۔

❀❀❀❀

فصل:

احوال حضرت علی رضی اللہ عنہ سے امامت پر استدلال

[اشکال] : شیعہ مصنف لکھتا ہے: ''منہج چہارم: وہ دلائل جو کہ آپ کی امامت پر دلالت کرتے ہیں' اور وہ آپ کے احوال سے مستنبط ہیں' ان کی تعداد بارہ ہے۔''

[پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے احوال سے آپ کی امامت پر استدلال کرتے ہوئے کہتا ہے]: ''آپ بہت بڑے عابد و زاہد اور حد درجہ عالم و شجاع تھے۔ شیعہ مصنف نے اس ضمن میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی چند خوارقِ عادات کا بھی ذکر کیا ہے۔ اور آپ کے کئی فضائل کا ذکر بھی کیا ہے' جن پر رد گزر چکا ہے۔

چنانچہ شیعہ مصنف لکھتا ہے: ''آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے بڑے زاہد تھے۔''

[جواب] : ہم کہتے ہیں: یہ بات بالکل ممتنع ہے۔ جو لوگ حضرات صحابہ کے احوال جانتے ہیں' انہیں علم ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے بڑے زاہد حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما تھے۔ اس لیے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ بڑے مالدار او رتاجر تھے؛ اور آپ نے اپنا تمام تجارتی سرمایہ اللہ کی راہ میں دے دیا تھا۔

جب آپ مسند آرائے خلافت ہوئے تو فروخت کے لیے چادریں اپنے کندھے پر ڈالے بازار جا رہے تھے کہ راستہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ملاقات ہوئی؛ آپ اپنے بازو پر چادریں رکھے جا رہے تھے۔ آپ نے پوچھا: کہاں کا ارادہ ہے؟ تو آپ نے فرمایا: ''تمہارا کیا خیال ہے کہ میں اپنے بچوں کے لیے رزق کمانا چھوڑ دوں؟۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کی خبر حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اور مہاجرین صحابہ کو دی۔ انھوں نے آپ کا وظیفہ مقرر کیا۔ آپ نے حضرت عمر و ابوعبیدہ رضی اللہ عنہما سے قسم لی [کہ کیا ان کے لیے یہ مال لینا حلال ہے؟]۔ تو انہوں نے حلف اٹھا کر بتایا کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ دو درہم یومیہ لینے کے مجاز ہیں۔ [1]

پھر آپ نے اپنا مال بیت المال میں چھوڑ دیا۔ پھر جب آپ کی وفات کا وقت قریب آیا تو آپ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہا کہ: ''ان کا مسلمانوں کے بیت المال سے لیا ہوا مال بیت المال کو واپس کر دیا جائے۔''

بعد میں جب اس کی تحقیق کی گئی تو پتہ چلا کہ ایک مشک تھی جس کی قیمت پانچ درہم بھی نہیں بنتی تھی۔ اور ایک حبشن لونڈی تھی جو کہ اپنے بچے کو دودھ پلا رہی تھی۔ اور ایک حبشی غلام تھا اور ایک اونٹ۔ آپ نے یہ سامان حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس بھیج دیا۔ تو حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے آپ سے کہا: کیا ابو بکر رضی اللہ عنہ کے عیال سے یہ مال بھی واپس لے لیا جائے گا؟

---

[1] ابوداؤد نے بسند صحیح ہشام بن عروہ سے روایت کیا ہے کہ میرے والد نے بتایا جب ابو بکر رضی اللہ عنہ اسلام لائے تھے تو آپ کے پاس چالیس ہزار درہم تھے۔ (طبقات ابن سعد: ۳/۱۷۲، تاریخ الاسلام للذهبی، (عهد الخلفاء، ص: ۱۰۷) عروہ کہتے ہیں مجھے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے بتایا کہ جب سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ فوت ہوئے تو انھوں نے کوئی درہم و دینار پیچھے نہیں چھوڑا تھا۔ (طبقات ابن سعد: ۳/۱۹۵)، اسامہ بن زید بن اسلم اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ تجارت میں مشہور تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت ان کے پاس چالیس ہزار درہم تھے۔ ان میں سے آپ غلام آزاد کرتے اور مسلمانوں کی امداد کیا کرتے تھے۔ جب مدینہ پہنچے تو ان میں سے کل پانچ ہزار درہم بچے تھے۔ آپ یہ سرمایہ نیک کاموں پر صرف کیا کرتے تھے۔ (طبقات ابن سعد (۳/۱۷۲)، من طریق الواقدی)۔

نہیں رب کعبہ کی قسم! ایسا نہیں ہوگا؛ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنی زندگی میں بھی بڑی تکالیف اٹھائی ہیں ۔ اب ان چیزوں کی قیمت میں ادا کردوں گا [اور یہ مال ابوبکر کے گھر واپس بھیج دیا جائے]۔

بعض علماء کرام رحمہم اللہ فرماتے ہیں: حضرت علی رضی اللہ عنہ تو بڑے زاہد تھے؛ مگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آپ سے بڑے زاہد تھے۔ اس لیے کہ اسلام کے شروع میں آپ کا بہت بڑا مال اور بڑی وسیع تجارت تھی؛ جسے آپ نے اللہ کی راہ میں خرچ کردیا؛ اور خلافت کے دوران آپ کی یہ حالت تھی۔ یہاں تک کہ آپ کے پاس جو بیت المال کا مال باقی بچ گیا تھا وہ بھی آپ نے واپس کردیا۔ ابن زنجویہ [ان کا نام حمید بن مخلد ہے یہ بڑے ثقہ راوی اور حافظ حدیث تھے۔ ۲۴۷ھ میں وفات پائی] فرماتے ہیں:

''حضرت علی رضی اللہ عنہ آغاز اسلام میں تنگ دست تھے۔ آپ پر خرچ کیا جاتا تھا؛ آپ کسی پر خرچ نہیں کرسکتے تھے۔ پھر آپ نے مال سے فائدہ اٹھایا؛ زرعی اراضی، مکانات اور کھجور کے باغات اوراوقاف خرید لیے تھے۔ وفات کے وقت آپ کے ہاں چار بیویاں اورانیس لونڈیاں تھیں۔''

یہ تمام چیزیں آپ کے لیے مباح تھیں ۔ وللہ الحمد ۔ اور جو مال آپ نے چھوڑا تھا اسے بیت المال میں واپس کرنے کا حکم بھی نہیں دیا۔ آپ کے بعد حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ: ''حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے بعد کوئی سونا اور چاندی نہیں چھوڑا۔ سوائے سات سو درہم کے جو کہ آپ کے عطایا میں سے باقی بچ گئے ہیں۔''

اسود بن عامر کہتے ہیں: ہم سے شریک نخعی نے حدیث بیان کی؛ اس نے عاصم بن کلیب سے نقل کیا؛ آپ حضرت محمد بن کعب القرظی رحمہ اللہ روایت کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''میں عہد رسالت میں بھوک کی شدت کی وجہ سے پیٹ پر پتھر باندھے رہتا تھا۔ اور آج میری ثروت کا یہ عالم ہے کہ میرے مال کی زکوٰۃ چالیس ہزار تک پہنچتی ہے۔'' [رواہ احمد عن حجاج عن شریك]

ابراہیم بن سعید جوہری روایت کرتے ہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''میرے مال کی زکوٰۃ چار ہزار دینار تک پہنچتی ہے۔''

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بیشک بہت بڑے زاہد تھے؛ مگر ان کے زہد کی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زہد سے نسبت ہی کیا ہے؟ علامہ ابن حزم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''کہنے والے کہتے ہیں کہ: ''حضرت علی رضی اللہ عنہ بہت بڑے زاہد تھے''۔ یہ کسی جاہل نے جھوٹ بولا ہے ۔ زہد کے معنی ہیں: انسان کا دل شہرت و مال؛ لذات وعیش اور خدم وحشم کی خواہش سے رو گردانی کرنا اور اسکے سوا زہد کا اور کوئی مطلب نہیں۔ زہد کا معنی اسی انسان پر صادق آتا ہے جسکے اندر یہ اوصاف موجود ہوں۔ مال کی محبت سے بیگانگی کے بارے میں اگر بات ہو تو ہر انسان جسے صحیح روایت کی ذرا بھر بھی اطلاع ہو تو وہ جانتا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اسلام لانے سے پہلے بہت بڑے مال دار تھے۔ آپ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ: ''آپ کے پاس چالیس ہزار درہم تھے؛ جو سب کے سب اللہ کی راہ میں خرچ کیے۔ اور اللہ کی رضا کے لیے ان مساکین اور کمزور مسلمانوں کو خرید کر آزاد کیا جنہیں ایمان لانے کے جرم میں سزا دی جاتی تھی۔ آپ نے کوئی ایسا سخت کوش غلام آزاد نہیں کیا جو آپ کی حفاظت کرے؛ بلکہ وہ لوگ آزاد کیے جو کمزور تھے اور انہیں اللہ کی راہ میں تکلیف دی جاتی تھی ۔ یہاں تک کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کی تو اس وقت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس صرف چھ ہزار درہم باقی بچ گئے تھے۔ وہ سب آپ نے اپنے ساتھ رکھ لیے [تاکہ

عہدے تفویض نہ کرتے]۔اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ لوگ دنیا اور اس کی ہر قسم کی لذات سے ہر طرح سے بے نیاز وزاہد تھے۔دلائل و براہین سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما آپ سے بڑھ کر زاہد اور تارک دنیا تھے۔ان کے مقابلہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ مباحات سے استفادہ کیا کرتے تھے۔

[حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضائل]

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:''حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دنیا کو تین طلاقیں دے رکھی تھیں۔آپ جَو کا دلیا کھاتے؛ اور اسے ختم کیا کرتے تھے تا کہ آپ کے بیٹے اس میں سالن نہ ڈال دیں۔آپ کھردرا اور چھوٹا لباس پہنا کرتے تھے۔آپ کے کوٹ کو پیوند لگے تھے۔یہاں تک کہ آپ کے بیٹوں کو اس پیوند کی وجہ سے حیاء آتی تھی۔آپ کی تلوار کی پٹی اور نعل کھجور کی چھال سے بنے ہوئے تھے۔یہی حال آپ کے نعلین کا بھی تھا۔

خطیب خوارزمی نے حضرت عمار رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ میں نے سنا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مخاطب کر کے فرما رہے تھے:

''اے علی! اللہ تعالیٰ نے تجھے ایسی زینت سے مزین کیا ہے کہ اس سے بڑھ کر اپنے نزدیک محبوب زینت سے کسی دوسرے انسان کو مزین نہیں کیا۔اللہ تعالیٰ نے تجھے زہد سے نوازا ہے؛ دنیا کو تمہاری نگاہ میں [بے وقعت اور] مبغوض کر دیا ہے۔آپ کے لیے فقراء کو محبوب بنا دیا گیا اور تم ان کے اپنے متبعین پر راضی ہو گئے۔اور وہ تجھے اپنا امام ماننے پر رضامندی ظاہر کرتے ہیں۔اے علی! اس شخص کے لیے بشارت ہو جو تجھ سے محبت رکھے اور تیرے بارے میں سچی بات کہے۔اس شخص کے لیے ہلاکت ہے جو تجھ سے بغض رکھے اور تجھ پر جھوٹ باندھے۔''

سُوَید بن غفلہ کا بیان ہے کہ میں عصر کے وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ بیٹھے ہوئے ہیں اور آپ کے سامنے کھٹا دودھ پڑا ہے جس میں سے کھٹی بُو آ رہی تھی۔آپ کے ہاتھ میں روٹی تھی جس پر جَو کے چھلکے لگے تھے جو میں آپ کے چہرہ پر دیکھ رہا تھا۔کبھی آپ اسے اپنے ہاتھ سے توڑتے اور اگر ایسا نہ کر سکتے تو اپنے گھٹنے سے توڑتے اور پھر اس دودھ میں ڈال دیتے۔آپ نے فرمایا:'' آگے آؤ اور ہمارے ساتھ یہ کھانا کھاؤ۔میں نے کہا: میں روزہ سے ہوں۔تو آپ نے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے آپ فرما رہے تھے:''جس انسان کو روزہ اس کے پسندیدہ کھانے سے روک دے؛ اللہ تعالیٰ اسے جنت سے کھانا کھلائے گا اور پانی پلائے گا۔''

آپ کہتے ہیں: میں نے آپ کی ایک لونڈی سے کہا جو کہ وہاں قریب کھڑی تھی؛ اے فضہ! تمہارے لیے ہلاکت ہو! کیا تم اس شیخ کے بارے میں اللہ سے نہیں ڈرتیں؟ کیا آپ ان کے لیے آٹا چھان نہیں لیتیں؟ تو اس نے جواب دیا: '' آپ نے ہم سے عہد لیا ہے کہ ہم آپ کے لیے آٹا نہ چھانیں۔آپ نے مجھ سے پوچھا: تم نے لونڈی سے کیا کہا؟ تو میں نے آپ کو وہ بات بتا دی۔آپ فرمانے لگے:''میرے ماں باپ اس ہستی پر قربان ہوں جس کے لیے کبھی آٹا نہیں چھانا گیا؛ اور نہ ہی کبھی تین دن تک گندم کی روٹی سے پیٹ بھر کر کھانا کھایا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنے پاس بلا لیا۔

ایسے ہی آپ نے ایک دن دو موٹی قمیصیں خریدیں؛ تو آپ نے اپنے غلام قنبر کو ان میں سے ایک قمیص چن لینے کا اختیار دیا۔ اس نے ایک قمیص اٹھالی اور دوسری آپ نے پہن لی۔آپ نے دیکھا کہ اس کے بازو آپ کی انگلیوں سے آگے تک لمبے ہیں تو آپ نے بازو کاٹ کر چھوٹے کر دیئے۔''

ضرار بن ضمرہ کہتے ہیں: حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو انھوں نے کہا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تعریف بیان کیجیے۔ میں نے کہا: مجھے اس سے معاف رکھیئے۔انہوں نے دوبارہ کہا: آپ کو لازمی ایسا کرنا ہوگا۔میں نے کہا: اگر ایسا کرنا ضروری ہی ہے تو سنو! حضرت علی رضی اللہ عنہ بڑے دور اندیش اور عالی ہمت اور طاقتور تھے۔آپ فیصلہ کن بات کہتے اور عدل وانصاف کی روشنی میں فیصلہ صادر کرتے تھے۔آپکے پہلوؤں سے علم پھوٹتا اور آپ کی ذات سے حکمت کے چشمے ابلتے تھے۔دنیا کی سرسبزی و شادابی سے نفرت کرتے۔رات اور اس کی وحشت انھیں عزیز تھی۔آپ زیادہ روتے اور اکثر سوچ بچار میں مصروف رہا کرتے تھے۔موٹے جھوٹے لباس کو پسند کرتے اور خشک کھانا کھایا کرتے تھے۔ہمارے ساتھ اس طرح بے تکلف ہوا کرتے تھے جیسے ہم میں سے کوئی شخص ہو۔جب ہم آپ سے کوئی سوال کرتے تو اس کا جواب دیتے؛ اور جب ہم دعوت دیتے تو اسے قبول کرتے۔اور اللہ کی قسم! آپ کے ہمارے قریب اور ہمیں اپنے قریب کرنے کے باوجود ہم آپ کی ہیبت وجلال کے باوجود آپ سے بات نہیں کر سکتے تھے۔آپ اہل دین کی تعظیم کرتے اور مسکینوں کو اپنے قریب کرتے۔قوی باطل میں طمع نہ کر سکتا اور کمزور آپ کے ہاں عدل سے مایوس نہ ہوتا۔میں اللہ کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں نے آپ کو دیکھا کہ آپ فرمارہے تھے: ''اے دنیا! میرے علاوہ کسی دوسرے کو دھوکہ دینا۔کیا تم میرے سامنے پیش ہونا چاہتی ہو یا میرا شوق رکھتی ہو۔ہائے ہلاکت ہو' میں نے تجھے تین بار طلاق بائنہ دیدی ہے۔میں تمہاری طرف رجوع نہیں کر سکتا۔ تیری عمر بہت کم ہے' اور تیرا خطرہ بہت بڑا ہے؛ اور تیری زندگی بڑی حقیر ہے۔آہ! سامان سفر کی کمی اور سفر کی دوری؛ اور راستے کی وحشت!۔حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ یہ سن کر رو پڑے اور فرمایا اللہ تعالیٰ ابوالحسن پر رحم فرمائے، اللہ کی قسم! وہ ایسے ہی تھے۔''

پھر پوچھا ضرار! حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت سے تمھیں کس قدر صدمہ ہوا؟

ضرار نے کہا: ''اتنا ہی غم جتنا اس شخص کو ہوتا ہے جو اپنی گود میں اپنے بچے کو ذبح کردے نہ تو اس کے آنسو خشک ہوتے ہیں اور نہ غم ہلکا ہوتا ہے۔'' (شیعہ مصنف کا بیان ختم ہوا)

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا زہد و تقویٰ:

[جواب]: اس کا جواب یہ ہے کہ بلا شک حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زہد میں کوئی کلام نہیں۔تاہم یہ کہنا کہ آپ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما سے بڑھ کر زاہد تھے؛ شیعہ کے پیش کردہ دلائل میں اس کے ثبوت میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے۔ بلکہ رافضی نے زہد علی میں جو دلائل پیش کیے ہیں [وہ جھوٹ کا طومار ہیں] ان میں کوئی ایسی چیز بھی نہیں جو اس حق بات پر دلالت کرے جو حضرت میں موجود تھی۔شیعہ کی روایات یا تو جھوٹ کا پلندہ ہیں یا پھر ان میں مدح علی سے متعلق کوئی بات موجود نہیں۔

❀ دنیا کو طلاق دینے والی روایت کے بارے میں مشہور ہے کہ آپ نے فرمایا تھا:

''اے زرد اور گوری چٹی دنیا! میں نے تجھے طلاق دے دی اب جا کر کسی اور کو بتلائے فریب کر، میں تجھے دوبارہ اپنے گھر میں آباد نہیں کروں گا۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس بیان سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آپ ان لوگوں سے زاہد تر ہیں جنھوں نے یہ بات نہیں کہی تھی۔ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام جیسے انبیاء سے بھی یہ الفاظ منقول نہیں ہیں؛ حالانکہ یہ لوگ بلا ریب حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بڑے زاہد تھے۔ اس لیے کہ جب کوئی انسان زہد اختیار کرے تو اس پر واجب نہیں ہوتا کہ وہ اپنی زبان سے بھی کہے کہ: میں نے زہد اختیار کرلیا ہے۔'' اور زہد کے ہر دعویدار کے لیے ضروری بھی نہیں کہ وہ زاہد ہی ہو۔ اور نہ ہی اس کلام کا نہ ہونا زہد کے نہ ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ اور نہ ہی ان الفاظ کا وجود زہد کے وجود پر دلالت کرتا ہے۔[ایسے الفاظ کہنے کی نسبت خاموش رہنا مناسب تر اور دلیل اخلاص ہے] ۔ اس لیے کہ ان الفاظ میں شیعہ کے دعوی پر کوئی دلیل موجود نہیں۔

[اشکال]: ''شیعہ کا یہ قول کہ: ''حضرت علی رضی اللہ عنہ ہمیشہ سالن کے بغیر جَو کی روٹی کھایا کرتے تھے۔''

[جواب]: ''اس میں مذکورہ دعوی پر کوئی دلیل بھی نہیں۔ اس کی دو وجوہ ہیں:

❀ پہلی وجہ: یہ صاف جھوٹ ہے۔

❀ دوسری وجہ: اس میں مدح کی کوئی بات نہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم امام الزہاد تھے، اس کے باوصف آپ کو جو مل جاتا کھا لیا کرتے تھے؛ اور جو چیز موجود نہ ہوتی آپ اس کی تلاش نہیں کیا کرتے تھے۔ بلکہ احادیث سے ثابت ہے کہ آپ نے بکرے اور مرغ کا گوشت کھایا۔ آپ شیریں کھانے اور شہد کو پسند فرمایا کرتے تھے، پھل کھایا کرتے تھے۔ موجود کھانے کو واپس نہ کرتے، اگر کوئی چیز نہ ملتی تو تکلف نہ کرتے۔ ❀ جب کھانا پیش کیا جاتا تو اگر ضرورت ہوتی کھا لیتے ورنہ چھوڑ دیتے، غیر موجود کی طلب میں تکلف نہ فرماتے۔ بعض اوقات بھوک کی شدت سے شکم پر پتھر بھی باندھ لیا کرتے تھے۔ اور بسا اوقات دو دو مہینے گزر جاتے مگر آپ کے گھر میں آگ تک نہ جلتی۔''

بخاری و مسلم میں مروی ہے کہ مسجد نبوی میں کچھ لوگ جمع تھے۔ ان میں سے ایک صحابی کہنے لگے، میں ہمیشہ روزہ رکھا کروں گا، دوسرے نے کہا، میں قیام میں مشغول رہوں گا اور آرام نہیں کروں گا۔ تیسرے نے کہا میں شادی نہیں کروں گا۔ چوتھے نے کہا میں گوشت کھانا ترک کردوں گا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ باتیں سن کر فرمایا: ''میں تو روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں۔ قیام بھی کرتا ہوں اور سوتا بھی ہوں۔ بیویوں سے نکاح بھی کرتا ہوں اور گوشت بھی کھاتا ہوں جس نے میری سنت سے انحراف کیا اس کا مجھ سے کچھ تعلق نہیں۔'' ❶

❀ دیکھیے صحیح بخاری، کتاب الاطعمة و کتاب الاشربة نیز صحیح مسلم، کتاب الاشربة، وغیرہ۔

❶ البخاری، کتاب النکاح، باب الترغیب فی النکاح (حدیث:٥٠٦٣)، صحیح مسلم، کتاب النکاح، باب استحباب النکاح، (حدیث:١٤٠١)۔

پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ گمان کہاں تک صحیح ہے کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے منحرف ہو گئے تھے؟ اور یہ انحراف آپ کے مناقب میں بھی شمار ہونے لگا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے بے رغبتی کرنے میں مدح کا کون سا پہلو ہے؟ پھر یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ عراق میں تھے؛ اس وقت بھی آپ بغیر سالن کے جو کی خشک روٹی ہی کھایا کرتے تھے؛ گندم کی روٹی یا گوشت نہیں کھایا کرتے تھے۔ جب کہ متواتر نقول اس کے خلاف ہیں۔ پھر کیا دیگر صحابہ کرام میں سے بھی کسی ایک نے ایسے کیا ہے؟ یا ان میں سے کسی ایک نے ایسا کرنے کو مستحب کہا ہے؟[بخلاف ازیں روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ شیعہ کی ذکر کردہ یہ بات غلط ہے]۔

[اشکال] : شیعہ کا یہ قول کہ: ''حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تلوار کی پٹی اور نعل کھجور کی چھال سے بنے ہوئے تھے۔''

[جواب] : یہ بھی صاف جھوٹ ہے، اور اس میں مدح کا کوئی پہلو بھی نہیں ہے۔ پھر یہ امر بھی قابل غور ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نعلین مبارک چمڑے کی؛ اور تلوار کا نیام چاندی کا بنا ہوا تھا؛ جس پر سونے کی زرکاری ہوئی تھی۔ جب اللہ تعالیٰ نے ان کو خوش حالی و فارغ البالی سے نوازا تھا۔ تلوار کے لیے چمڑے کی پٹی بنانے میں کیا مضائقہ تھا۔ خصوصاً جب کہ حجاز میں چمڑے کی فراوانی ہے، یہ بات قابل تعریف تب ہوتی اگر چمڑا نایاب ہوتا۔

جیسے حضرت ابو امامہ الباہلی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''جب مختلف بلاد و امصار کو اس قوم نے فتح کیا تو ان میں ایسے لوگ بھی تھے جن کے گھوڑوں کی باگ ڈور رسیوں سے بنی ہوتی تھی اور جن کی رکابیں پٹھوں سے تیار کی جاتی تھیں۔''[1]

حدیث عمار ایک موضوع روایت ہے؛ جب کہ سوید بن غفلہ کی روایت بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک مرفوع نہیں ہے۔

[اشکال] : شیعہ مصنف لکھتا ہے: ''حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کپڑے خریدے..........۔''

[جواب]: یہ حدیث معروف ہے۔ ایسے ہی ضرار بن ضمرہ والی روایت بھی نقل کی گئی ہے۔ ان میں سے کسی ایک روایت میں بھی کوئی ایک ایسی چیز نہیں ہے جس سے آپ کا حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما سے بڑھ کر زاہد ہونا ثابت ہوتا ہو۔ بلکہ جو انسان حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی منقول سیرت کا جانکار آپ کے زہد و عدل؛ ولایت اپنے اقارب کی دوری؛ اور اپنے بیٹے کا حصہ ان کے ہم مثلوں سے کم رکھنے؛ اور آپ کے خشک و سوکھی روٹی کھانے کے بارے میں بھی جانتا ہے اسے پتہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی وہ ہستی تھے جنہوں نے قیصر و کسریٰ کے خزانے تقسیم کیے۔ جو کچھ حضرت علی رضی اللہ عنہ تقسیم کرتے تھے وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی فتوحات کا ایک جزء تھا۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا تو آپ پر اسی ہزار درہم قرض تھا۔ یہ معلومات رکھنے والا جانتا ہے کہ کئی وجوہات کی بنا پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بڑے زاہد تھے۔ اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بھی بڑے زاہد تھے۔

❀❀❀❀

[1] البخاری، کتاب الجهاد۔ باب ما جاء في حلية السيوف (حديث: ۲۹۰۹)۔

فصل:

حضرت علی رضی اللہ عنہ عدیم المثال تھے

[اشکال] : شیعہ مصنف لکھتا ہے: ''خلاصہ کلام! حضرت علی رضی اللہ عنہ زہد میں عدیم المثال تھے، نہ ہی کوئی آپ کے مقام کو پاسکا اور نہ ہی کوئی آپ سے سبقت حاصل کر سکا؛ جب آپ ہی سب سے بڑے زاہد تھے تو آپ ہی خلیفہ ہوں گے؛ اس لیے کہ مفضول کو تقدیم دینا ممتنع ہے۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جواب] : ہم کہتے ہیں کہ: ''یہ دونوں احتمال باطل ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت ابوبکر و حضرت عمر رضی اللہ عنہما سے بڑھ کر زاہد نہ تھے۔ اور یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ جو کوئی زاہد تر ہو وہ امام و خلیفہ بننے کا زیادہ حق دار ہو۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے اہل خانہ کے پاس اتنا مال اور غلام تھے جو حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے پاس نہیں تھا۔

عبداللہ بن احمد نے روایت کیا ہے' وہ کہتے ہیں: ہم سے علی بن حکیم نے بیان کیا' ان سے شریک نے حدیث بیان کی؛ وہ عاصم بن کلیب سے روایت کرتے ہیں؛ آپ حضرت محمد بن کعب رحمہ اللہ علیہ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ فرماتے سنا: ''میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا؛ اور اپنے پیٹ پر بھوک کی وجہ سے پتھر باندھا کرتا تھا۔ اور آج میرے مال کی زکوٰۃ چالیس ہزار تک پہنچتی ہے۔'' [سبق تخریجه]۔

یہ روایت اگرچہ ضعیف ہے؛ لیکن اس روایت کے مقابلہ میں بہتر ہے جس میں کہا گیا ہے کہ آپ عراق میں بھی جو کی سوکھی روٹی کے علاوہ کچھ بھی نہیں کھایا کرتے تھے۔ اس لیے کہ اس روایت کی تو کوئی سند ہی نہیں ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مال حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے مال سے بہت زیادہ تھا۔ اگر صرف اسی چیز میں مقابلہ کیا جائے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی اولاد کو کیا دیتے اور اہل بیت کو کیا دیتے تھے؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ تمام قریش سے زیادہ حضرات اہل بیت کو دیا کرتے تھے۔ آپ بنی عدی یا بنی تیم یا قریش کی کسی دوسری شاخ میں اتنا مال تقسیم نہیں کرتے تھے جتنا اہل بیت نبوت میں تقسیم کیا کرتے تھے۔ بس صرف یہی ایک بات بھی اس دلیل کے لیے کافی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس وسیع مال موجود تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اوقاف مشہور تھے۔ کیا جس انسان کے پاس کچھ بھی موجود نہ ہو وہ وقف کر سکتا ہے؟ [نیز یہ کہ آپ نے اپنی وفات کے وقت بہت سے غلام لونڈیاں اور کثیر جائداد چھوڑی تھی۔ البتہ نقدی صرف سات سو درہم تھی]۔ دوسری طرف حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی یہ حالت تھی کہ فتح خیبر کے موقع پر مال غنیمت سے جو حصہ ملا تھا وہ اللہ کی راہ میں وقف کر دیا تھا۔ [آپ کی کوئی زرعی اراضی نہیں تھی۔ جب شہادت پائی تو اس وقت اسی ہزار کے مقروض تھے۔] اس کے علاوہ آپ کی کوئی زمین یا جائداد نہیں تھی۔ جب کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زمین و جائداد ینبوع میں بھی تھی۔

❁❁❁❁

فصل :

[حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کثرت عبادت]

[اشکال] : شیعہ مصنف لکھتا ہے:

دوم :''حضرت علی رضی اللہ عنہ لوگوں سے بڑھ کر عبادت گزار تھے۔ دن بھر روزہ رکھتے اور راتوں کو قیام کیا کرتے تھے۔نماز تہجد اور دن کے نوافل لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے سیکھے تھے۔ آپ سارا وقت عبادات و وظائف میں بسر کیا کرتے تھے۔ شب و روز میں آپ ایک ہزار رکعات پڑھا کرتے تھے۔آپ نے انتہائی ٹھنڈی راتوں میں بھی کبھی بھی قیام اللیل ترک نہیں کیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:''میں نے حالت جنگ میں آپ کو دیکھا کہ سورج کا انتظار کر رہے تھے۔ میں نے پوچھا: اے امیر المؤمنین ! کیا ہو رہا ہے؟ آپ نے فرمایا: زوال کا انتظار کر رہا ہوں تا کہ نماز پڑھ لوں۔ میں نے کہا: اس وقت میں نماز؟ تو آپ نے فرمایا:''ہم تو نماز کی وجہ سے ان سے قتال کرتے ہیں۔سو آپ ان سخت اوقات و حالات میں بھی پہلے وقت میں نماز پڑھنے سے غافل نہیں ہوئے۔''اور جب آپ اپنے جسم سے تیر وغیرہ نکالنا چاہتے تو اسے چھوڑ دیتے یہاں تک کہ نماز شروع کرتے ؛ پھر آپ باقی تمام چیزوں سے غافل ہو کر صرف اللہ کی طرف متوجہ ہو جاتے۔اور آپ کو کسی قسم کی تکلیف کا کوئی احساس نہ ہوتا۔ آپ نے نماز اور زکوٰۃ کو جمع کیا۔ آپ نے حالت رکوع میں صدقہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی شان میں قرآن نازل کیا جو قیامت تک پڑھا جاتا رہے گا۔ اور آپ نے تین دن تک اپنی اور اپنے بچوں کی روزی صدقہ میں دی۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنسَانِ ﴾''کیا انسان پر ایسا وقت گزرا ہے۔''[الدھر ۱]

آپ نے دن اور رات میں ؛ خفیہ اور اعلانیہ طور پر صدقہ کیا۔ آپ نے رسول اللہ ﷺ سے سرگوشی کی تو اس سے پہلے صدقہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی شان میں قرآن نازل کیا۔ اور آپ نے اپنے ہاتھ کی کمائی سے ایک ہزار غلام آزاد کیے، آپ مزدوری کر کے جو کچھ کماتے وہ شعب ابی طالب میں نبی ﷺ پر خرچ کیا کرتے تھے۔ جب آپ لوگوں میں سب سے بڑے عابد تھے؛ تو آپ ہی افضل ہوئے ؛ لہٰذا آپ ہی امام بھی ہوں گے۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جواب] : ہم کہتے ہیں: اس کلام میں اتنی من گھڑت اور جھوٹی باتیں ہیں جو صرف اس انسان پر مخفی رہ سکتی ہیں جو ان لوگوں کے احوال سے پرلے درجے کا جاہل ہو۔ حالانکہ یہ سب جھوٹ ہے۔ اور اس میں مدح کا کوئی پہلو بھی نہیں ؛ اور نہ ہی اس طرح کی عام جھوٹی کہانیوں میں کوئی فائدہ ہوتا ہے۔

شیعہ مصنف کا یہ کہنا کہ:'' آپ دن کو روزہ رکھتے اور رات کو قیام کرتے تھے۔'' یہ محض جھوٹ اور آپ پر الزام ہے۔ اس سے پہلے نبی کریم ﷺ کا فرمان گزر چکا ہے کہ آپ نے فرمایا:''لیکن میں تو روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں۔ قیام بھی کرتا ہوں اور سوتا بھی ہوں۔ بیویوں سے نکاح بھی کرتا ہوں ؛ جس نے میری سنت سے انحراف کیا اس کا مجھ سے کچھ تعلق نہیں۔''❶

❶البخاری، کتاب الصوم۔ باب حق الجسم (ح:۱۹۷۵) مسلم کتاب الصیام، باب النھی عن صوم(ح:۱۱۵۹)۔

❀ بخاری و مسلم میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ہمارے دروازے پر دستک دے کر مجھ سے اور فاطمہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کیا تم دونوں بیدار نہیں ہوتے اور نماز نہیں پڑھ رہے؟ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ہماری جانیں اللہ کے ہاتھ میں ہیں، جب وہ جگانا چاہتا ہے تو ہمیں جگا دیتا ہے۔'' یہ سن کر آپ از راہ افسوس اپنی ران پر ہاتھ مارتے اور یہ کہتے ہوئے واپس تشریف لے گئے کہ: ﴿وَ كَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا﴾ ''انسان بڑا جھگڑالو واقع ہوا ہے۔''❶

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ رات کو سویا کرتے تھے۔ نیز یہ کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جگایا؛ اور آپ کے اسلوب کلام کو پسند نہیں فرمایا تھا؛ اور آپ یہ کہتے ہوئے واپس پلٹے:

﴿وَ كَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا﴾ ''انسان بڑا جھگڑالو واقع ہوا ہے۔''

[اشکال] : شیعہ مصنف کا یہ قول ہے کہ ''لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے رات کی نمازیں اور دن کے نوافل سیکھے۔''

[جواب] : اگر شیعہ کی مراد یہ ہے کہ بعض مسلمانوں نے یہ باتیں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے سیکھیں تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ تمام صحابہ نے کچھ نہ کچھ لوگوں کو تعلیم دی ہے۔[لوگ ہمیشہ اپنے اکابر سے اچھی باتیں سیکھتے چلے آئے ہیں] اور اگر شیعہ مصنف یہ کہنا چاہتا ہے کہ اکثر[یا سب] لوگوں نے یہ آداب آپ سے سیکھے تو یہ بڑا مکروہ [اور ٹھنڈا] جھوٹ ہے۔[اس لیے کہ صحابہ نے یہ باتیں نبی کریم ﷺ سے سیکھی تھیں، جہاں تک تابعین کا تعلق ہے] ان میں سے اکثر نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دیکھا تک نہ تھا۔[ان سے آداب عبادت سیکھنا تو درکنار]۔ مگر وہ راتوں کے شب بیدار دن کو نمازیں پڑھنے والے تھے۔ اکثر بلاد اسلامیہ حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کے دور میں فتح ہوئے۔ جیسے شام' مغرب' خراسان'[وغیرہ]۔ ان لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دیکھا بھی نہیں تھا' کچھ سیکھنا تو درکنار رہا۔ نبی کریم ﷺ کی زندگی میں صحابہ کرام کا یہی حال تھا۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے ان چیزوں کی تعلیم پائی۔ اس قسم کے دعوی صرف اہل کوفہ کے متعلق ممکن ہے۔ اور ان کے بارے میں بھی سبھی جانتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کوفہ آنے سے پہلے ان لوگوں نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے تعلیم پائی تھی۔ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کوفہ آمد سے قبل لوگوں میں علم و عمل کے لحاظ سے سب سے کامل لوگ تھے۔ یہی حال باقی صحابہ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے ساتھیوں کا ہے۔

[اشکال] : شیعہ کا یہ قول کہ'' حضرت علی رضی اللہ عنہ کا سب وقت ادعیہ ماثورہ پڑھتے ہوئے گزرتا تھا۔''

[جواب]: ہم کہتے ہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ادعیہ زیادہ تر موضوع ہیں۔ ❷

ہم پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان اور صحابہ کرام کی شان اس سے بہت بلند تھی کہ وہ اس قسم کی دعائیں پڑھا کرتے۔ ان میں سے کسی دعا کی کوئی سند ہی نہیں۔ سب سے افضل دعائیں وہ ہیں جو نبی کریم ﷺ سے منقول اور ثابت ہیں۔ اور اس امت کے اولین و آخرین میں سے بہترین لوگ یہی دعائیں کیا کرتے تھے۔

---

❶ صحیح مسلم۔ کتاب صلاۃ المسافرین باب الحث علی صلاۃ اللیل (حدیث:۷۷۵)۔

❷ محمد باقر اصبہانی (۱۰۳۷۔۱۱۱۰) نے ادعیہ ماثورہ پر مشتمل ایک کتاب ''زاد المعاد'' نامی ۱۱۰۷ھ میں شاہ حسین صفوی کیلئے تصنیف کی تھی۔ یہ کتاب خلاف دین اکاذیب کا مجموعہ ہے۔

[اشکال]: شیعہ کا یہ قول کہ ''حضرت علی رضی اللہ عنہ ایک دن اور رات میں ایک ہزار رکعت پڑھا کرتے تھے۔''

[جواب]: یہ ایسا باطل جھوٹ ہے جس میں مدح کا کوئی پہلو نہیں۔ بیشک شب و روز میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجموعی فرض و نفل نماز چالیس رکعت تھی۔ ایک امیر امت جو لوگوں کے امور متنازعہ فیصلے کرتا اور ان کے سیاسی مسالح میں مشغول رہتا ہو؛ وہ ایک ہزار رکعت ادا کرنے پر اسی صورت میں قادر ہوسکتا ہے جب وہ کوے کی طرح ٹھونگے مارنے والی نماز ادا کرتا ہو۔ یہ منافقین کی نماز ہے؛ ہم سمجھتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دامن ایسی بے کار نماز سے پاک ہے۔

- جہاں تک صفین کی راتوں میں ذکر کا تعلق ہے تو صحیح احادیث میں ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا: ''وہ اذکار جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے لیے سکھائے تھے؛ جب سے میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی سنے ہیں؛ کبھی انہیں ترک نہیں کیا۔'' آپ سے پوچھا گیا: ''صفین کی راتوں میں بھی؟ تو آپ نے فرمایا: ''صفین کی راتوں میں بھی انہیں ترک نہیں کیا؛ سحر کے وقت مجھے یاد آگیا تو میں نے وہ اذکار پڑھ لیے تھے۔'' [مسند احمد ح: ۸۳۸]
- جہاں تک آپ کے جسم سے لوہا نکالنے کی بات ہے تو یہ سفید جھوٹ ہے۔ کبھی آپ کو ایسے لوہا لگا ہو؛ کسی بھی صحیح روایت سے ثابت نہیں۔

[اشکال]: شیعہ کا یہ قول کہ ''حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نماز کے دوران زکوۃ ادا کردی تھی۔'' [یعنی نماز اور زکوۃ کو جمع کیا]۔

[جواب]: یہ بھی صریح جھوٹ ہے، جیسا کہ اس سے پہلے گزر چکا؛ نیز اس میں مدح کی کوئی بات نہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر ایسا کرنا مستحب ہوتا تو اسے مسلمانوں کے لیے مشروع کیا ہوتا۔ اور اگر مسلمان نماز میں صدقہ دینے کو مستحب سمجھ رہے ہوتے تو وہ ضرور ایسا کرتے۔ جب مسلمانوں میں سے کسی ایک نے بھی اس چیز کو مستحب نہیں سمجھا تو پتہ چلا کہ شرعاً نماز میں ایسی حرکت کرنا ناروا [مکروہ] ہے۔

- یہی حال نذر ماننے اور چار درہم صدقہ کرنے والے قصہ کا ہے؛ یہ تمام جھوٹ ہے۔ نیز اس میں مدح کا کوئی پہلو نہیں۔
- شیعہ مصنف کہتا ہے کہ ''حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے ہاتھ کی کمائی سے ایک ہزار غلام آزاد کیے تھے۔''

یہ صریح کذب ہے اور اسے ایک جاہل شخص ہی تسلیم کرسکتا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک ہزار تو کیا ایک سو غلام بھی آزاد نہیں کیے تھے۔ بلکہ اپنی کمائی سے آپ اس کا عشر عشیر بھی انجام نہیں دے سکتے تھے۔ اس لیے کہ آپ کوئی فن نہیں جانتے تھے کہ آپ کمائی کرتے ہوں۔ آپ زیادہ تر یا تو جہاد میں مشغول رہتے تھے یا بعض دوسرے امور میں۔ [آپ کوئی تجارت بھی نہیں کرتے تھے۔ صنعت و حرفت سے ناآشنا تھے، پھر ایک ہزار غلام آزاد کرنا آپ کے لیے کیوں کر ممکن تھا]؟

[اشکال]: شیعہ کا یہ قول کہ ''علی رضی اللہ عنہ مزدوری کرکے شعب ابی طالب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر خرچ کیا کرتے تھے۔''

[جواب]: یہ کئی وجوہات کی بنا پر صریح کذب ہے۔

- پہلی وجہ: اس لیے کہ بنو ہاشم شعب ابی طالب سے باہر نہیں نکلا کرتے تھے۔ اور دوسرے یہ کہ وہاں اندر ایسا کوئی شخص نہ تھا جو اجرت دے کر ان سے کام لیتا۔
- دوسری وجہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ کے والد ابو طالب بھی گھاٹی میں موجود تھے؛ وہ ان پر خرچ کیا کرتے تھے۔

❀ تیسری وجہ: حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا بڑی مال دار خاتون تھیں، وہ اپنا مال خرچ کرتی تھیں۔

❀ چوتھی وجہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ بن ابی طالب نے کبھی بھی مکہ میں مزدوری نہیں کی۔ مزید براں شعب ابی طالب کی محصوری کے زمانہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ چھوٹے تھے؛ اس وقت ان کی عمر پندرہ سال کے لگ بھگ تھی؛ یا تو ابھی بالغ ہوئے تھے؛ یا پھر حد بلوغت کو بھی نہیں پہنچے تھے [اور آپ کسی مزدوری کے قابل نہ تھے] بلکہ وہاں آپ پر خرچ کیا جاتا تھا۔ یہ خرچ یا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کیا کرتے تھے یا پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے والد محترم۔ اس وقت آپ اس مرحلہ میں بھی نہیں پہنچے تھے کہ اپنے آپ پر خرچ کرتے تو پھر کسی دوسرے پر کیسے خرچ کر سکتے تھے۔ اس لیے کہ نقل متواتر سے ثابت ہے کہ شعب ابی طالب میں حصار کا واقعہ ابو طالب کی زندگی میں پیش آیا تھا۔ اور ابو طالب کا انتقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طائف جانے سے پہلے ہوا تھا۔ اس پر تمام لوگوں کا اتفاق ہے۔ ابو طالب اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی موت کے واقعات قریب قریب کے اوقات کے ہیں۔ جب کہ شعب ابی طالب میں دخول شروع اسلام کا واقعہ ہے۔ یہ بات ثابت شدہ ہے کہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی پیدائش شعب ابی طالب میں حصار کے دوران ہوئی۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوا تو ابھی ابن عباس بلوغت کی عمر کو نہیں پہنچے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہجرت کے بعد چالیس سال تک زندہ رہے۔ اس پر تمام لوگوں کا اتفاق ہے۔ بعث نبوی ہجرت سے تیرہ سال پہلے ہوئی تھی۔ بوقت وفات حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زیادہ سے زیادہ عمر تریسٹھ سال تھی۔ پس اسلام کے وقت آپ کی حد سے زیادہ عمر دس سال ہوسکتی ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ اَعْلَمُ النَّاس تھے:

[اشکال] : شیعہ مصنف لکھتا ہے:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ اعلم الناس تھے۔''

[جواب] : ہم کہتے ہیں: اہل سنت والجماعت اس بات کو تسلیم نہیں کرتے۔ اہل سنت والجماعت کے علماء کرام رحمہم اللہ کا اتفاق ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ''اعلم الناس حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما تھے۔'' کئی علماء کرام نے اس پر اجماع نقل کیا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سب سے بڑے عالم تھے۔ اس مسئلہ میں اپنی جگہ پر بڑے وسیع اور مضبوط دلائل ہیں۔ اس لیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے سوا کوئی شخص فیصلہ صادر کرتا نہ فتویٰ دیتا اور نہ وعظ کہہ سکتا تھا۔ جب بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو کسی دینی معاملہ میں شبہ ہوا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس شبہ کا ازالہ کیا۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات لوگوں پر مشتبہ ہوگئی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان کا یہ شبہ دور کیا تھا۔ پھر انھیں آپ کی تدفین میں شبہ لاحق ہوا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس کا ازالہ کیا۔ پھر مانعین زکوٰۃ سے نبرد آزما ہونے کے بارے میں تنازع بپا ہوا تو آپ نے نص کی روشنی میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر اس کی حقیقت واضح کی۔ پھر [عمرہ کے لیے مسجد الحرام داخلے کے بارے میں شبہ ہوا؛ کیونکہ] اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ﴾ (الفتح:۲۷)

''اگر اللہ نے چاہا تو تم خانہ کعبہ میں کامل امن وامان سے داخل ہوگے۔'' [تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس شبہ کو رفع کیا]۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کی اس حدیث کی تشریح کی تھی کہ: ''اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے کو اختیار دیا تھا کہ دنیا و آخرت میں سے جسے چاہو پسند کر لے۔'' ❶

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے صحابہ کو بتایا کہ کلالہ کسے کہتے ہیں؛ پھر اس بارے میں کسی نے کوئی اختلاف نہیں کیا۔ ❷

حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ نے بھی آپ سے [روایت حدیث میں] استفادہ کیا تھا۔ جیسا کہ سنن میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ فرماتے ہیں: ''جب میں نبی کریم ﷺ سے کوئی حدیث سنتا تو جتنا فائدہ اللہ تعالیٰ چاہتے مجھے پہنچاتے؛ اور جب کوئی اور دوسرا شخص مجھے حدیث سناتا تو میں اس سے حلف لیتا؛ جب وہ حلف اٹھاتا تو میں اس کی تصدیق کرتا؛ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مجھے حدیث سنائی اور انھوں نے سچ کہا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''جو شخص بھی گناہ کا ارتکاب کرتا ہے اور پھر وضوء کر کے دو رکعت نماز ادا کرتا اور اللہ سے اپنے گناہ کی مغفرت طلب کرتا ہے تو اسے بخش دیا جاتا ہے۔'' ❸

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کوئی ایک فتویٰ بھی ایسا منقول نہیں جو نص کے خلاف ہو۔ جبکہ حضرت عمر، حضرت علی کے علاوہ دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سے ایسے فتاویٰ منقول ہیں جو نصوص کے خلاف ہیں۔ حتیٰ کہ امام شافعی رحمہ اللہ نے حضرت علی بن ابی طالب اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کے درمیان اختلاف پر ایک مجلد کتاب لکھی ہے۔ اور امام محمد بن نصر المروزی نے ان اختلافات پر ایک بڑی کتاب لکھی ہے۔ صحابہ کرام کا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کیساتھ دادا کی میراث میں اختلاف ہوا ہے، مگر حق بات وہی ہے جو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمائی ہے۔ ہم نے یہ مسئلہ ایک مستقل کتاب میں بیان کر دیا ہے۔ اس میں ہم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے قول کے صحیح ہونے کی دس وجوہات بیان کی ہیں۔ جب کہ جمہور صحابہ میں سے دس سے زائد حضرات اس مسئلہ میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہیں۔ جن لوگوں سے اختلاف نقل کیا گیا ہے، ان میں حضرت زید اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما شامل ہیں اور ان کے اقوال بھی اضطراب کا شکار ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حق بات حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔

[فضائل شیخین]:

بہت سے علماء نے اس بات پر اجماع نقل کیا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بڑے عالم تھے۔ ان اجماع نقل کرنے والوں میں شافعیہ کے ایک بڑے امام منصور بن عبدالجبار سمعانی مروزی کا نام بھی شامل ہے۔ آپ اپنی کتاب ''تقویم الادلہ'' میں کہتے ہیں: ''علماء اہل سنت کا اجماع ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بڑے عالم تھے۔'' اور ایسے ہوتا بھی کیوں نہیں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کی موجودگی میں فتویٰ دیتے؛ لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے؛ برائی سے

---

❶ صحیح بخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ باب قول النبی ﷺ، سدوا الابواب الا باب ابی بکر (ح:۳۶۵٤)، صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہ (ح:۲۳۸۲)

❷ مصنف عبد الرزاق، (۱۹۱۹۰، ۱۹۱۹۱)، سنن الدارمی (۳/ ۳٦۵۔۳٦٦)، سنن کبریٰ بیہقی (٦/ ۲۲٤)

❸ سنن ابی داؤد۔ کتاب الوتر۔ باب فی الاستغفار (ح:۱۵۲۱)، سنن ترمذی کتاب الصلاۃ، ۔ باب ما جاء فی الصلاۃ عند التوبة (ح:٤۰٦)، سنن ابن ماجة۔ کتاب اقامة الصلوات، باب ما جاء فی صلاۃ کفارة (ح:۱۳۹۵)۔

منع کرتے؛ خطبہ ارشاد فرمایا کرتے ۔ آپ ایسا اس وقت کیا کرتے جب آپ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ لوگوں کو اسلام کی دعوت دینے کے لیے نکلتے ۔ اور جب آپ نے ہجرت کی ۔ اور حنین کے موقعہ پر اور دیگر مغازی میں بھی ایسا ہوا۔ نبی کریم ﷺ خاموش رہے اور آپ کے فرمودات کو برقرار رکھا۔ یہ مرتبہ آپ کے علاوہ کسی دوسرے کو نصیب نہیں ہوا۔

نبی کریم ﷺ اہل فقہ و رائے سے مشورہ کرتے وقت شوریٰ میں حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو دوسروں پر مقدم رکھا کرتے تھے ۔ یہی وہ دو شخصیات تھیں جو علمی مسائل میں گفتگو کیا کرتے تھے؛ اور آنحضرت ﷺ ان دونوں کو باقی تمام صحابہ پر مقدم کیا کرتے تھے ۔ مثال کے طور پر بدر کے جنگی قیدیوں کے متعلق اور دیگر امور میں مشورہ۔ نبی کریم ﷺ سے یہ بھی روایت کیا گیا ہے کہ آپ نے ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے حق میں فرمایا:

''جب تم دونوں کسی بات پر متفق ہو جاؤ گے تو میں تمہاری مخالفت نہیں کیا کروں گا۔'' [مسند احمد (٤/ ٢٢٧)]

سنن میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: میرے بعد حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی پیروی کرو۔''[1]

یہ مقام ان دو حضرات کے علاوہ کسی کو نہ مل سکا۔ بلکہ آپ نے فرمایا:

''تم پر میری سنت اور میرے بعد میرے ہدایت یافتہ خلفاء راشدین کی سنت لازم ہے۔'' [تخریج گزر چکی ہے]۔

اس میں خلفاء اربعہ کی اتباع کا حکم دیا گیا ہے' اور ان میں سے حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو اقتداء کے ساتھ بطور خصوص ذکر کیا ہے۔ مسلمانوں کے لیے اقوال و افعال کی سنت میں مقتدی کا مرتبہ متبع کے مرتبہ سے اوپر ہوتا ہے۔

صحیح مسلم میں ہے کہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ دوران سفر بہت سے مسلمان تھے......۔ ایک لمبی حدیث ہے؛ جس میں آپ نے فرمایا۔ ''اگر لوگ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی اطاعت کریں گے تو راہ راست پر قائم رہیں گے۔'' [مسلم ۱/۴۷۲]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ثابت ہے کہ وہ کتاب اللہ سے فتویٰ دیا کرتے؛ جب وہاں کوئی بات نہ ملتی تو سنت میں حل تلاش کرتے؛ اگر وہاں بھی کوئی نص نہ پاتے تو حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے قول کے مطابق فتویٰ دیا کرتے تھے۔ یہ معاملہ حضرت عثمان و علی رضی اللہ عنہما کے ساتھ نہیں کیا کرتے تھے۔ ابن عباس حبر امت تھے؛ اور اپنے زمانہ کے صحابہ میں سب سے بڑے عالم تھے ۔ آپ ترجیحاً حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے قول کے مطابق فتویٰ دیا کرتے تھے۔ یہ بھی ثابت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے حق میں یہ دعا فرمائی تھی:

''اے اللہ! اسے دین کا فہم عطا کر اور قرآن کی تفسیر سکھا دے۔''[2]

حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو باقی تمام صحابہ میں خصوصیت حاصل تھی۔ ان میں بھی زیادہ خصوصیت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی تھی۔ اس لیے کہ آپ عام طور پر رات کو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بیٹھ کر علوم دین اور مصالح مسلمین کے بارے میں گفتگو کیا کرتے تھے۔ جیسا کہ ابوبکر ابن ابی شیبہ نے روایت کیا؛ آپ فرماتے ہیں: ہم سے ابو معاویہ نے حدیث بیان کی؛ ان سے اعمش نے اور ان سے ابراہیم نے؛ ان سے حضرت علقمہ رضی اللہ عنہ نے۔ آپ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ: ''نبی کریم ﷺ

[1] سنن ترمذی ، کتاب المناقب باب (١٦/ ٣٥) (حدیث:٣٦٦٢)، سنن ابن ماجۃ۔ المقدمۃ۔ باب فضل ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہ (حدیث:٩٧)۔

[2] صحیح مسلم ، کتاب المساجد۔ باب قضاء الصلاۃ الفائتۃ (ح:٦٨١)، مطولاً۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ مختلف امور کے سلسلہ میں بات چیت کیا کرتے تھے، میں بھی ان کے ساتھ ہوا کرتا تھا۔‘‘

صحیحین میں حضرت عبدالرحمن بن ابوبکر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ اصحاب صفہ غریب لوگ تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک بار فرمایا:

’’جس کے پاس دو آدمیوں کا کھانا ہو وہ تیسرے کو ان میں سے لے جائے۔ اور اگر چار کا ہو تو پانچواں اور چھٹا ان میں سے لے جائے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تین آدمی لے گئے۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دس لے گئے۔‘‘

حضرت عبدالرحمن کہتے ہیں: ’’...... ابوبکر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے یہاں کھانا کھایا اور وہیں عشاء کی نماز ادا کی اس کے بعد بھی اتنی دیر ٹھہرے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آنکھ لگ گئی۔ اس کے بعد اپنے گھر میں آئے ان سے ان کی بی بی نے کہا کہ تمہیں تمہارے مہمانوں سے کس نے روک لیا؟ یا یہ کہ تمہارے مہمان انتظار کر رہے ہیں۔ وہ بولے: کیا تم نے انہیں کھانا نہیں کھلایا؟ انہوں نے کہا: آپ کے آنے تک ان لوگوں نے کھانے سے انکار کیا؛ کھانا ان کے سامنے پیش کیا گیا تھا مگر انہوں نے نہ مانا......۔‘‘ [صحیح بخاری: حدیث نمبر ٥٧٥]

ایک روایت میں آپ فرماتے ہیں: ’’میرے والد رات کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کیا کرتے تھے۔ اور ایک موقع پر آپ نے فرمایا: ’’ہجرت کے موقع پر میرے ابا جی کے سوا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اور کوئی نہ تھا۔‘‘ اور جنگ بدر میں سائبان کے نیچے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صرف حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی تھے۔‘‘

[نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مرض الموت میں] فرمایا:

’’میں سب لوگوں سے زیادہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے مال اور رفاقت کا ممنون ہوں۔ اگر میں کسی کو گہرا دوست بنانے والا ہوتا تو ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بناتا۔ البتہ اسلامی اخوت و مودّت کسی شخص کے ساتھ مختص نہیں۔‘‘ [بخاری (ح: ٣٦٥٤) مسلم، (ح: ٢٣٨٢)]

یہ سب سے صحیح ترین اور مشہور حدیث ہے جسے کئی صحیح اسناد سے صحاح ستہ میں روایت کیا گیا ہے۔

بخاری و مسلم میں حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: ’’میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھا، اسی دوران ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنے کپڑے کا کنارہ پکڑے ہوئے آئے اور اپنے دونوں زانو ننگے کر دیے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لوگو! تمہارا ساتھی کسی سے جھگڑ پڑا ہے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے سلام کے بعد عرض کیا: میرے اور عمر رضی اللہ عنہ کے درمیان کچھ تنازع تھا۔ میں نے جلد بازی سے کام لیا، پھر مجھے ندامت کا احساس ہوا تو میں نے کہا: ’’معاف کر دیجیے، مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کے لیے تیار نہ ہوئے، میں اس مقصد سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ آپ نے تین مرتبہ فرمایا: اے ابوبکر! اللہ تمھیں معاف فرمائے۔‘‘

پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نادم ہوئے اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کے گھر کو آئے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ کو نہ پا کر وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ یہ دیکھ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ڈر کر دو بار کہا: اے اللہ کے رسول! مجھ سے زیادتی سرزد ہوئی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’اللہ تعالیٰ نے مجھے تمہاری طرف مبعوث کیا تھا۔ تم نے مجھے جھٹلایا، مگر ابوبکر رضی اللہ عنہ نے میری تصدیق کی اور اپنی جان و مال سے میری ہمدردی کی۔ اب کیا تم میرے رفیق کو میرے لیے رہنے دو گے یا نہیں؟‘‘ آپ نے دو مرتبہ یہ الفاظ دہرائے۔ اس کے بعد ابوبکر رضی اللہ عنہ کو کسی نے رنج نہ پہنچایا۔‘‘ [البخاری، (ح: ٣٦٦١)]

امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: آپ خیر کے کام میں سبقت لے گئے تھے۔

اس سے پہلے گزر چکا ہے کہ ابوسفیان نے احد کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ؛ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں سوال کیا تھا؛ اس کے لیے وہ خود اور دیگر تمام لوگ جانتے تھے کہ یہی لوگ اسلام کے اصل سردار ہیں؛ اور اسلام ان لوگوں کے ساتھ قائم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خلیفہ ہارون الرشید نے امام مالک رحمہ اللہ سے حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے منصب و مقام کے بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے فرمایا: ''ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو جو درجہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں حاصل تھا، وہ آپ کی وفات کے بعد بھی اسی مرتبہ پر فائز ہیں۔'' یہ سن کر ہارون نے دو بار کہا: ''اے مالک! آپ نے مجھے تشفی بخش جواب دیدیا۔''

صحبت میں کثرت کے ساتھ اختصاص؛ کمال مودت و الفت و محبت؛ علم اور دین میں مشارکت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ وہ دوسروں لوگوں سے بڑھ کر اس معاملہ کے حق دار تھے۔ جو کوئی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے احوال سے واقف ہے؛ اس کے لیے یہ بات کھلی ہوئی اور واضح ہے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ علم و فقہ کے حصول میں اس طرح سے قائم تھے کہ دوسرے لوگ اس سے عاجز آگئے تھے؛ آپ باقی لوگوں کے لیے مسائل کی وضاحت کرتے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کوئی ایسا قول منقول نہیں جو خلاف نص ہو۔ یہ بات علم میں آپ کے تبحر و مہارت کی نشانی ہے [اس سے ابوبکر رضی اللہ عنہ کی علمی فوقیت کا اظہار ہوتا ہے]۔ جب کہ باقی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سے کئی اقوال نصوص کے خلاف منقول ہیں اس لیے کہ ان لوگوں تک یہ نصوص [شرعی دلائل] نہ پہنچ پائی تھیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نصوص [شرعی دلائل] سے موافقت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی موافقات سے زیادہ ہیں۔ یہ بات ہر وہ انسان جانتا ہے جسے علمی مسائل؛ ان میں علماء کے اقوال اور شرعی ادلہ اور ان کے مراتب کی معرفت ہو۔ اس کی مثال بیوہ کی عدت کو لیجیے۔ اس مسئلہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہی نص کے موافق ہے کسی دوسرے کا نہیں۔ ایسے ہی حرام کا مسئلہ بھی ہے۔ اس مسئلہ میں بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قول کی نسبت حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ کرام کا قول نصوص [شرعی دلائل] کے زیادہ موافق ہے۔ اور ایسے ہی وہ عورت جسے اس کے شوہر نے طلاق کا اختیار دے رکھا ہو؛ اور ایسے ہی وہ عورت جس کا مہر اس کے سپرد کر دیا گیا؛ اور خلیہ؛ بریہ؛ بائین؛ اور طلاق البتہ؛ اور دوسرے بہت سارے فقہی مسائل کا یہی حال ہے۔

بخاری و مسلم میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اُمم سابقہ میں مُلہَم موجود تھے، اگر میری امت میں کوئی ملہم من اللہ ہوا تو وہ عمر رضی اللہ عنہ ہیں۔''❀

بخاری و مسلم میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مجھے خواب میں ایک پیالہ پیش کیا گیا جس میں دودھ تھا، وہ میں نے پی لیا، یہاں تک کہ سیری کا اثر میرے ناخنوں میں ظاہر ہونے لگا، پھر جو بچ گیا میں نے وہ عمر رضی اللہ عنہ کو دے دیا۔ صحابہ نے عرض کیا: ''پھر آپ نے اس کی کیا تعبیر فرمائی؟ فرمایا: ''دودھ سے علم مراد ہے۔''❶

ترمذی کی ایک روایت میں ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر میں مبعوث نہ کیا گیا ہوتا تو عمر مبعوث ہوتے۔''

❀ صحیح بخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم، باب مناقب عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ، (ح:٣٦٨٩)، صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابۃ، باب من فضائل عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ (ح:٢٣٩٨)، عن عائشۃ، رضی اللہ عنہا۔

❶ صحیح بخاری، حوالہ سابق (حدیث:٣٦٨١)، صحیح مسلم، حوالہ سابق (حدیث:٢٣٩١)

ترمذی میں ہی حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو وہ عمر رضی اللہ عنہ ہوتے۔'' ترمذی نے اس حدیث کو حسن کہا ہے۔ ❶

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ﷺ نے نمازیں پڑھانے کے لیے؛ جوکہ اسلام کا اصلی ستون ہے؛ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو اپنا جانشین بنایا۔اور نبی کریم ﷺ کے حج کرنے سے پہلے مناسک حج ادا کرانے کے لیے بھی آپ کو ہی امیر بنایا گیا؛ اور مکہ میں منادی کرائی گئی کہ: اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہ کرے اور نہ ہی کوئی ننگا ہوکر بیت اللہ کا طواف کرے۔

پھر آپ کے پیچھے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھیجا تو آپ نے پوچھا: کیا امیر بن کر آئے ہو یا مامور بن کر؟

تو عرض کی: مامور بن کر۔ پس اس موقع پر نبی کریم ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ پر امیر مقرر کیا۔ آپ کا شمار بھی ان لوگوں میں ہوتا ہے جنہیں نبی کریم ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بات سننے اور حکم ماننے کا حکم دیا تھا۔ یہ اس غزوہ تبوک کے بعد کا واقعہ ہے جس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مدینہ میں جانشین مقرر کیا گیا تھا۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی مرتب کردہ کتاب صدقات سب سے آخری اور صحیح ترین کتاب ہے؛ اسی لیے فقہاء کا اس پر عمل رہا ہے۔اس کے علاوہ جو کتابیں تھیں؛ وہ متقدم اور منسوخ تھیں۔اس سے معلوم ہوا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ناسخ و منسوخ میں بھی دوسروں سے زیادہ علم رکھتے تھے۔

بخاری و مسلم میں ہے کہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے کہا: ''حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تمام صحابہ میں نبی کریم ﷺ کے علم سے زیادہ واقف تھے۔'' ❷

ایسے ہی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین میں کسی بھی مسئلہ میں اختلاف نہیں ہوا مگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس کا فیصلہ کردیا؛ اور جھگڑا ختم ہوگیا۔آپ کے زمانے میں کسی ایک بھی ایسے مسئلہ کا علم نہیں ہوسکا جس میں اختلاف ہوا ہو اور پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وجہ سے وہ جھگڑا اور اختلاف ختم نہ ہوا ہو۔مثال کے طور پر نبی کریم ﷺ کی وفات پر آپ کی تدفین؛ میراث؛لشکر اسامہ کی روانگی؛ مانعین زکوۃ سے جنگ؛ اوران کے علاوہ دوسرے کئی بڑے مسائل بھی ہیں۔

آپ رضی اللہ عنہ صحیح معنوں میں لوگوں میں رسول اللہ ﷺ کے سچے خلیفہ تھے۔انہیں تعلیم دیتے؛ ان کی اصلاح کرتے؛ انہیں آشیرباد دیتے؛ اور مسائل کو ایسے دلائل سے واضح کرتے کہ شبہ اٹھ جاتا اور جھگڑا ختم ہوجاتا۔

آپ کے بعد کوئی دوسرا ایسا نہیں آیا جو علم و کمال میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے علم و کمال کو پہنچ سکتا ہو۔پس وہ لوگ بعض مسائل میں اختلاف کیا کرتے تھے؛ جیسا کہ دادا اور بھائی کی میراث میں؛ حرام میں؛ تین طلاق کے مسئلہ میں؛ متعۃ الحج میں اختلاف؛ طلاق بائین والی عورت کے نان ونفقہ اور رہائش کے بارے میں اختلاف۔اوران کے علاوہ دیگر ایسے بہت سارے مسائل ہیں جن میں عہد ابوبکر رضی اللہ عنہ میں اختلاف نہیں ہوا تھا۔جب کہ حضرت عمر و عثمان اور علی رضی اللہ عنہم اجمعین کے ساتھ ان کے بہت سارے اقوال میں مخالفت کیا کرتے تھے۔لیکن کوئی ایک مسئلہ بھی ایسا نہیں ہے جس میں ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فتوی دیا ہو؛ یا فیصلہ کیا

❶ سنن ترمذی، کتاب المناقب، باب(۱۷/ ۵۲)، (حدیث:۳۶۸۶)

❷ صحیح بخاری۔ کتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ، باب قول النبی ﷺ "سدوا الابواب الا باب ابی بکر" (ح:۳۶۵٤)، صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہ (ح:۲۳۸۲)۔

اورلوگوں نے اس میں آپ کی مخالفت کی ہو۔ یہ آپ کے سب سے بڑے عالم ہونے کی نشانی ہے۔

آپ رسول اللہ ﷺ کے قائم مقام بنے' اور آپ نے صحیح معنوں میں اسلام کو قائم کیا؛ اور کسی چیز میں خلل نہیں ڈالا؛ بلکہ لوگوں کو اسی دروازہ سے واپس اسلام میں داخل کیا جس سے وہ نکل گئے تھے؛ حالانکہ اس وقت بہت بڑی تعداد میں آپ کے مخالفین موجود تھے جو کہ مرتد ہو چکے تھے۔ بہت سارے رسوائی چاہنے والے تھے۔ مگر آپ کی وجہ سے ان لوگوں کا دین و ایمان مکمل ہوا؛ اس باب میں کوئی دوسرا آپ کے برابر نہیں ہوسکتا۔

لوگ آپ کو خلیفہء رسول ﷺ کا خطاب دیا کرتے تھے۔ پھر آپ کی موت سے یہ اتصال لفظی منقطع ہو گیا۔ ابوالقاسم سہیلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس وقت اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے اسرار لفظی اور معنوی طور پر ظاہر ہوئے:

﴿إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا﴾ [التوبة ۴۰]

''جب یہ اپنے ساتھی سے کہہ رہے تھے کہ غم نہ کر اللہ ہمارے ساتھ ہے۔''

اس لیے کہ لوگوں نے آپ کو خلیفہء رسول اللہ ﷺ کا خطاب دیا تھا جو کہ آپ کی موت کے ساتھ ہی منقطع ہو گیا۔

مزید برآں یہ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے بعض سنتوں کی تعلیم پائی۔ جب کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کچھ بھی نہیں سیکھا۔ اس کی وضاحت اس چیز سے ہوتی ہے کہ وہ علمائے کوفہ جنہوں نے حضرت عمر و علی رضی اللہ عنہما کی صحبت پائی؛ جیسے: علقمہ؛ الاسود؛ شریح وغیرہم؛ یہ حضرات حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قول کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قول پر ترجیح دیا کرتے تھے۔ جبکہ مکہ و مدینہ اور بصرہ کے تابعین کے ہاں تو یہ بات اتنی زیادہ ظاہر و مشہور تھی کہ اس کے ذکر کی ضرورت ہی نہیں۔ بلاشبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا علم کوفہ میں آپ کی مدت خلافت کے قیام کے لحاظ سے ظاہر ہوا۔ وہ تمام شیعان علی رضی اللہ عنہ جو آپ کی صحبت سے فیض یاب ہوئے؛ ان میں سے کسی ایک سے بھی یہ ثابت نہیں ہے کہ وہ آپ کو حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما پر علم و عمل؛ فقہ اور دین میں سے کسی ایک چیز میں بھی ترجیح دیتا ہو۔ بلکہ وہ تمام شیعہ جو آپ کے ساتھ ملکر شریک جنگ تھے؛ ان کا عام مسلمانوں کے ساتھ حضرات ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی فضیلت و تقدیم پر اتفاق تھا۔ سوائے ان چند لوگوں کے جو آپ کی بات بھی نہیں مانتے تھے؛ بلکہ آپ کو برا بھلا کہتے؛ حقیر جانتے اور مذمت کرتے تھے۔ اس وقت یہ قلیل تعداد چند ایک حقیر قسم کے اوباش تھے جن کی کوئی اہمیت ہی نہیں تھی۔

یہ تین قسم کے لوگ تھے: ان میں سے ایک گروہ وہ تھا جنہوں نے آپ کی شان میں غلو کیا' اور آپ کے رب ہونے کا دعوی کرنے لگے۔ ان لوگوں کو آپ نے آگ میں جلا ڈالا تھا۔

ان میں سے ایک دوسرا گروہ ایسا بھی تھا جنہوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پر سب و شتم کا اظہار کیا؛ ان کا سرغنہ عبداللہ بن سباء تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اسے قتل کرنا چاہتے تھے؛ مگر وہ مدائن کی طرف بھاگ گیا۔

ایک گروہ آپ کی فضیلت کا قائل تھا؛ جب آپ کو اس کا علم ہوا تو آپ نے فرمایا:

''جس شخص کے متعلق مجھے پتہ چلا کہ وہ مجھے ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما پر فضیلت دیتا ہے تو میں اس پر حد قذف قائم کروں گا۔''[1]

---

[1] المحلی لابن حزم (۱۱/ ۲۸۶)۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے تقریباً اسی مختلف طرق سے مروی ہے کہ انھوں نے کوفہ میں اپنے منبر پر کھڑے ہو کر فرمایا:

''لوگو آگاہ ہو جاؤ! اس امت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے افضل ہستیاں حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما ہیں۔''

امام بخاری اور دوسرے محدثین نے ہمدان کے کچھ لوگوں سے روایت کیا ہے؛ جو کے آپ کے خواص سمجھے جاتے تھے؛ جن کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے:

''اگر میں جنت کا دربان ہوتا تو ہمدانیوں سے کہتا: سلامتی کے ساتھ جنت میں داخل ہو جاؤ۔''

ان لوگوں نے محمد بن حنفیہ سے روایت کیا ہے کہ میں نے اپنے والد حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے افضل کون ہے؟ فرمایا بیٹا! کیا تجھے یہ بات معلوم نہیں؟ میں نے کہا: ''نہیں'' فرمایا: ابوبکر رضی اللہ عنہ'' میں نے عرض کیا ان کے بعد کون؟ فرمایا: عمر۔ میں نے کہا: پھر اسکے بعد آپ ہیں؟ فرمایا: ''بیشک تمہارا باپ تو مسلمانوں میں سے ایک آدمی ہے۔''[1]

امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((حدثنا محمد بن کثیر؛ حدثنا سفیان الثوری، حدثنا جامِع بن شداد، حدثنا أبو یُعلی منذِر الثورِی، عن محمدِ ابنِ الحنفِیةِ، قال: قلت لِأبِی: یا أبتِ من خیر الناسِ بعد رسولِ اللهِ صلی الله علیهِ وسلم؟ فقال: یا بنی! أوما تعرِف؟ فقلت: لا، فقال: أبو بکر، قلت: ثم من؟ قال: ثم عمر))

''محمد بن حنفیہ فرماتے ہیں کہ: ''میں نے اپنے والد حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا: اے میرے اباجی! نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے افضل کون ہے؟ فرمایا بیٹا! کیا تجھے یہ بات معلوم نہیں؟ میں نے کہا: ''نہیں'' فرمایا: ''ابوبکر رضی اللہ عنہ'' میں نے عرض کیا: ان کے بعد کون؟ فرمایا: ''عمر رضی اللہ عنہ۔''

یہ باتیں آپ اپنے بیٹے سے کہہ رہے ہیں جس سے کوئی تقیہ بھی نہیں کر رہے۔ اور اپنے خواص لوگوں کو بتا رہے ہیں۔ اور اس انسان کو سزا دینے کا اعلان کرتے ہیں جو آپ کو حضرات شیخین پر فضیلت دیتا ہے؛ آپ کی نظر میں وہ تہمت باز ہے۔ جب کہ متواضع کے لیے جائز نہیں کہ وہ ان لوگوں کو سزا دے جو آپ کو حضرات شیخین پر فضیلت دیتا ہو؛ اس لیے کہ وہ حق بات کہہ رہا ہے؛ اور نہ ہی اسے مفتری [تہمت باز] کہنا جائز ہوتا۔''

جو کوئی بھی آپ سے افضل تھا؛ خواہ وہ انبیاء علیہم السلام میں سے ہو یا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے؛ وہ آپ سے بڑا عالم بھی ہے۔ اس لیے کہ فضیلت کی اصل بنیاد علم ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ﴾ [الزمر ۹]

''فرما دیجیے: کیا برابر ہیں وہ لوگ جو جانتے ہیں اور وہ جو نہیں جانتے۔''

اس مسئلہ پر دلائل بھی بہت زیادہ ہیں اور علماء کرام کا کلام بھی بہت زیادہ ہے۔

---

[1] البخاری، ...... باب قول النبی ﷺ "لو کنت متخذاً خلیلاً" (ح:۳۶۷۱)۔

[حضرت علی رضی اللہ عنہ سب سے بڑے قاضی؟]:

[**اشکال**]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:''اَقْضَاکُمْ عَلِیٌّ۔''
''سب سے بہتر فیصلہ کرنے والے علی ہیں۔''اور فیصلہ کرنا علم خصومات و دین کو مستلزم ہے۔''

[**جواب**]: ہم کہتے ہیں حدیث:''اَقْضَاکُمْ عَلِیٌّ'' ثابت نہیں ہے۔اور نہ ہی اس کی کوئی اسناد معلوم نہیں تا کہ اس سے احتجاج کیا جا سکے،اس سے یہ حدیث صحیح تر ہے کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ حلال و حرام کے بہت بڑے عالم ہیں۔''❶

حلال و حرام کا علم دین اسلام میں بڑی اہمیت رکھتا ہے؛ یہ علم حلال و حرام سے زیادہ علم قضاء کو شامل ہے۔شیعہ کی ذکر کردہ حدیث سنن مشہورہ اور معروف مسانید میں سے کسی ایک میں بھی صحیح یا ضعیف سند کے ساتھ مندرج ہی نہیں۔یہ جس اسناد کے ساتھ مروی ہے اس میں متہم بالکذب راوی پائے جاتے ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ ''عَلِیٌّ اَقْضَانَا ''علی صحابہ میں ایک بڑے قاضی تھے۔''

بیشک قضاء فصل خصومات کو کہتے ہیں۔یہ ظاہر کے اعتبار سے ہے۔بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ فیصلہ حقیقت حال کے برعکس صادر کیا جاتا ہے،جیسا کہ احادیث صحیحہ میں آیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''تم میرے پاس فصل خصومات کے لیے آتے ہو۔اس بات کا احتمال ہے کہ تم میں سے ایک شخص اپنا نقطہ نظر زیادہ وضاحت سے بیان کر سکتا ہو اور میں جس طرح سنوں اس اعتبار سے اس کے حق میں فیصلہ صادر کر دوں۔پس یاد رکھو جس شخص کے لیے میں نے اس کے مسلمان بھائی کے حق میں سے کچھ فیصلہ کر دیا؛تو وہ اسے نہ لے۔بیشک میں نے اسے آگ کا ایک ٹکڑا کاٹ کر دیا ہے۔''❷

اس حدیث میں سالار رسل صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح کیا کہ آپ کے فیصلہ کر دینے سے حلال چیز حرام ہو جاتی ہے نہ حرام چیز حلال ٹھہرتی ہے۔حلال و حرام کا علم ظاہر و باطن دونوں کو شامل ہے۔جو حلال و حرام کا بڑا عالم ہو وہ دین کا بڑا عالم ہے۔

مزید برآں یہ کہ قضا کی دو اقسام ہیں۔ان میں سے ایک قسم یہ ہے کہ دو فریق جھگڑ رہے ہوں ان میں فیصلہ کیا جائے۔ یعنی ایک انسان کسی چیز کا دعوی کر رہا ہے اور دوسرا اس کا منکر ہے؛تو ان دونوں کے مابین فیصلہ ثبوت کے اعتبار سے ہوگا۔

دوسری قسم یہ ہے کہ:اس میں کسی کو انکار نہیں۔بلکہ ایک دوسرے کے حق کا اعتراف کر رہے ہیں؛لیکن ان کو علم نہیں کہ دوسرے کا کیا استحقاق ہے۔مثلاً وراثت میں جھگڑا؛یا زوجین کا آپس میں حقوق کا جھگڑا یا دو شریک کاروں کا باہمی معاملہ۔

پس یہ علم بھی علم حلال و حرام کا ایک باب ہے۔جب انہیں کوئی ایسا آدمی فتوی دیدے جس کی بات پر دونوں فریق راضی ہوں تو یہ ان کے لیے کافی ہے۔پھر ان کے درمیان فیصلہ کرنے کی نوبت نہیں آتی۔فیصلہ کرنے والے کی ضرورت اس وقت پڑتی ہے جب وہ اس کا انکار کر رہے ہوں۔غالب طور پر یہ فسق و فجور کی وجہ سے ہوتا ہے اور کبھی نسیان کی وجہ سے بھی۔

❶سنن ترمذی، کتاب المناقب، باب مناقب معاذ بن جبل و زید بن ثابت رضی اللہ عنہما(حدیث:۳۷۹۰، ۳۷۹۱)، سنن ابن ماجة، المقدمة۔ باب فضائل خباب رضی اللہ عنہ (حدیث:۱۵٤)۔

❷صحیح بخاری، کتاب الشهادات باب من اقام البينة بعد اليمين(حديث:۲٦۸۰)، صحیح مسلم، کتاب الأقضية، باب بيان ان حكم الحاكم لا يغير الباطن، (حديث: ۱۷۱۳)۔

پس جن لوگوں کا قضاء کے ساتھ تعلق نہیں ہے ؛ انہیں اس علم کی ضرورت بھی نہیں ؛ سوائے چند نیک افراد کے۔ جب کہ حلال و حرام کے علم کی ضرورت تمام لوگوں کو ہوتی ہے خواہ وہ نیک ہوں یا بد۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو فیصلے کرنے کے لیے قاضی بنایا تو ایک سال تک آپ کے پاس دو آدمی بھی اپنا جھگڑا لے کر نہیں آئے۔

اگر اس قسم کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام فیصلوں کو جمع وشمار کیا تو ان کی تعداد دس تک بھی نہیں پہنچتی۔ تو پھر اس کی اُس حلال وحرام کے سامنے کیا اہمیت ہے جو دین اسلام کی اصل بنیاد ہے۔ جب کہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

''حضرت معاذ رضی اللہ عنہ حلال وحرام کے بہت بڑے عالم ہیں۔'' [اس کی تخریج گزر چکی ہے]۔

اس کی سند صحیح تر اور دلالت میں صاف واضح ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ دوسری روایت سے یہ استدلال کرنے والا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے بڑے عالم تھے ؛ جاہل انسان ہے۔ تو پھر حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں کیا کہہ سکتے ہیں جو حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے بھی بڑے عالم تھے۔ حالانکہ وہ حدیث جس میں حضرت معاذ اور حضرت زید رضی اللہ عنہما کا ذکر ہے بعض علماء اسے ضعیف کہتے ہیں اور بعض اسے حسن کہتے ہیں۔ اور جس روایت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ذکر ہے' وہ سرے سے ضعیف اور باطل ہے۔

[حدیث "اَنَا مَدِیْنَۃُ الْعِلْمِ" کی حیثیت]:

شیعہ کی پیش کردہ حدیث "اَنَا مَدِیْنَۃُ الْعِلْمِ وَ عَلِیٌّ بَابُھَا" حد درجہ ضعیف اور واہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ اسے ترمذی رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے کہ تاہم یہ موضوعات میں شمار کی جاتی ہے۔ [1]

ابن الجوزی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اس کے جملہ طرق موضوع ہیں۔'' اس کا متن خود اس کے موضوع ہونے کی شہادت دیتا ہے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات علم کا شہر ہوئی اور اس کا دروازہ صرف ایک (حضرت علی رضی اللہ عنہ) ہوا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و ارشادات کے مبلغ صرف علی رضی اللہ عنہ ہوں گے۔ اس سے دین اسلام کا فساد لازم آتا ہے۔ لہٰذا اس بات پر مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے علم پہنچانے کے لیے صرف ایک شخصیت کا ہونا جائز اور کافی نہیں ؛ بلکہ آپ کے اقوال و ارشادات کو لوگوں تک پہنچانے کیلئے اتنے کثیر التعداد لوگ ہونے چاہئیں کہ جن سے غائب لوگوں تک خبر متواتر حاصل ہو۔ اس لیے کہ خبر واحد سے قرائن کے بغیر علم حاصل نہیں ہوتا۔ اور کبھی خبر واحد اکثر لوگوں سے منتفی یا مخفی ہوتی ہے۔ پس انہیں وہ علم حاصل نہیں ہوتا جو قرآن اور احادیث [وسنن] متواترہ سے حاصل ہوتا ہے۔

اگر شیعہ کہیں کہ علی رضی اللہ عنہ اگرچہ واحد ہیں، مگر معصوم ہیں، اس لیے آپ کی خبر سے یقینی علم حاصل ہوتا ہے۔ تو ہم اس کے جواب میں کہیں گے کہ شیعہ پہلے آپ کا معصوم ہونا ثابت کریں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی معصومیت ان کے قول ہی سے ثابت نہیں ہو جائے گی ؛ اس دعوی سے پہلے عصمت کا معلوم ہونا ضروری ہے۔ اس طرح کرنے سے دور لازم آتا ہے۔

---

[1] سنن ترمذی کتاب المناقب، باب (۲۰/ ۷۳)، (حدیث:۳۷۲۳)، بلفظ "انا دار الحکمۃ و علی بابھا" و سندہ ضعیف ، شریک قاضی راوی مدلس ہے۔ مستدرك حاکم (۳/ ۱۲۶، ۱۲۷) باسناد أخر ضعیفۃ۔

اور اجماع سے بھی آپ کا معصوم ہونا ثابت نہیں ہوتا، اس لیے کہ آپ کی معصومیت پر اجماع منعقد نہیں ہوا۔اگر چہ امامیہ کے ہاں اجماع اس لیے حجت ہے کہ اس میں امام معصوم کی رائے بھی شامل ہے۔مگر بات پھر وہیں پہنچتی ہے کہ صرف اس دعوی کرنے سے کام نہیں بنے گا؛ اس پر معصوم ہونے کے لیے ثبوت بھی چاہیے۔پس معلوم ہوا کہ اگر دعوی عصمت حق ہوتا تو امام معصوم کے خبر دینے کے علاوہ بھی کسی ذریعہ سے اس کا علم ہونا ضروری تھا۔

پھر یہ بھی ہے کہ اگر اس شہر علم کا آپ کے علاوہ کوئی دروازہ نہ بھی ہوتو تب بھی اس سے نہ ہی عصمت ثابت ہوگی اور نہ ہی باقی امور دین۔اس سے معلوم ہوا کہ یہ روایت کسی زندیق نے گھڑ لی ہے؛ جسے جاہل لوگ مدح خیال کرتے ہیں؛ حالانکہ اس سے اسلام میں قدح لازم آتی ہے؛اس لیے کہ دین اسلام صرف ایک فرد واحد سے نہیں پھیلا۔

پھر یہ بات متواتر حقائق کے بھی خلاف ہے۔یہ امر کسی سے پوشیدہ نہیں کہ نبی کریم ﷺ سے کتاب وسنت کا جو علم اکناف عالم پر محیط اسلامی شہروں میں پھیلا تھا اور اس سے سب کرۂ ارضی معمور ہو چکا تھا؛ اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علاوہ دوسرے لوگوں کا بڑا کردار ہے۔اہل مکہ اور اہل مدینہ کے احوال تو صاف ظاہر ہیں[کسی بیان کی ضرورت نہیں] ۔یہی حال بصرہ اور شام کا بھی ہے۔ان شہروں کے علماء کی نبی کریم ﷺ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی منفرد روایات حد درجہ قلیل ہیں ۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علم کی غالب روایات اہل کوفہ کے ہاں ہیں۔

اور اہل کوفہ بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مسند خلافت پر متمکن ہونے سے بھی پہلے قرآن وسنت جانتے تھے۔حضرت علی رضی اللہ عنہ تو بہت بعد میں آئے۔

[پھر یہ بات کیوں کر صحیح ہوسکتی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی نبی کریم ﷺ کے علم کا واحد دروازہ تھے]۔یہ امر بھی قابل غور ہے کہ فقہاء مدینہ [میں اجلہ التابعین وہ تھے] جنہوں خلافت فاروقی میں اکتساب علم کیا۔[جو خلافت عثانی سے بھی پہلے کے تربیت یافتہ تھے نہ کہ علوی خلافت کے۔ایسے ہی] حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے اہل یمن کو جو تعلیم دی وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تعلیمات سے بہت بڑھ کر تھی؛ اور وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے زیادہ عرصہ یمن میں رہے۔یہی وجہ ہے کہ اہل یمن کی حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے روایات حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایات سے بڑھ کر ہیں۔حضرت شریح اور دوسرے اکابر تابعین نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے فقہ کی تعلیم حاصل کی۔ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ وارد کوفہ ہوئے تو[وہاں جلیل القدر تابعین کی خاصی تعداد موجود تھی۔مثلاً] شریح وہاں کے قاضی تھے؛انہوں نے اور عبیدہ سلیمانی [اور دوسرے فقہاء جیسے علقمہ،مسروق اور ان کے نظائر وامثال] نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پہلے دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے ہاتھوں پر تربیت حاصل کی تھی۔حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کوفہ آنے سے پہلے کوفہ اور دوسرے شہروں میں اسلام اور اسلامی تعلیمات پھیل چکے تھے۔

امام محمد بن حزم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''روافض میں سے بہت سارے لوگ یہ کہتے ہیں کہ:'' حضرت علی رضی اللہ عنہ اعلم الناس تھے'' حالانکہ یہ جھوٹ ہے۔کسی صحابی کے علم کا پتہ دو باتوں میں سے کسی ایک بات سے چلتا ہے؛ ان کے علاوہ کوئی تیسری بات نہیں:

پہلی بات:اس کے فتاویٰ وروایات کی تعداد کس قدر ہے۔

دوسری بات: نبی کریم ﷺ نے کس حد تک اسے مختلف کاموں پر مامور کیا۔''

یہ بات انتہائی محال اور باطل ہے کہ نبی کریم ﷺ کسی ایسے انسان کو ذمہ داری سونپیں جسے کوئی علم ہی نہ ہو۔ یہ [حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی] وسعت علم کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ اس لیے کہ جب ہم اس بات کو جانچ پرکھ کر دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اپنی پوری بیماری کے دوران نمازوں کا امام مقرر کیا تھا۔ حالانکہ اس وقت حضرت عمر، علی، ابن مسعود، ابی ابن کعب اور دیگر اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین موجود تھے۔ یہ غزوہ تبوک کو جاتے وقت جب آپ کے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنا نائب مقرر کرنے سے مختلف ہے۔ اس لیے کہ مدینہ میں اس وقت صرف [معذور لوگ اور] بچے اور عورتیں تھیں۔ پس حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو امام مقرر کرنے سے یہ بات ضرورت کے تحت وجوباً معلوم اور واضح ہوتی ہے کہ آپ دیگر صحابہ کی نسبت نماز کے مسائل سے زیادہ واقفیت رکھتے تھے اور نماز دین اسلام کا رکن رکین ہے۔ مزید برآں کہ آپ کو رسول اللہ ﷺ نے زکوٰۃ وصدقات کی وصولی پر بھی مقرر فرمایا تھا؛ تو یہ بھی ضرورت کے تحت وجوباً معلوم ہوگیا کہ آپ کو زکوٰۃ وصدقات کے احکام کا بھی علم تھا۔ جیسے کہ آپ کے علاوہ دوسرے کافی تعداد میں صحابہ اس علم سے بہرہ ور تھے۔ ان صحابہ سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا علم زیادہ ہی ہوسکتا ہے کم نہیں۔ اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے دوسرے لوگوں کو بھی زکوٰۃ کی وصولی پر عامل مقرر کیا تھا۔ اور نبی کریم ﷺ صرف اسی انسان کو ذمہ داری تفویض کرتے تھے جسے اپنی ذمہ داری سے متعلق شرعی مسائل کا علم ہوتا تھا۔ زکوٰۃ نماز کے بعد اسلام کا ایک اور بڑا رکن ہے۔

ہمارے اس دعوی پر کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو زکوٰۃ کے مسائل کا پورا پورا علم تھا؛ دلیل یہ ہے کہ زکوٰۃ کے بارے میں وارد صحیح احادیث جن کے خلاف کرنا جائز نہیں' وہ حضرت ابوبکر اور پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی روایات ہیں۔ جبکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی سند سے منقول روایات میں اضطراب پایا جاتا ہے۔ اور ان میں ایسی چیزیں بھی ہیں جنہیں جملہ طور پر فقہاء نے ترک کردیا ہے۔ ان میں سے ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ پچیس اونٹوں پر ایک بکری زکوٰۃ ہے۔

علاوہ ازیں نبی کریم ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو امیر حج مقرر کیا تھا۔ اس سے ضرورت کے تحت وجوباً یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ حج کے مسائل کو دیگر صحابہ کی نسبت بہتر طور پر اور زیادہ جانتے تھے۔ حج بھی اسلام کا ایک رکن ہے۔

علاوہ ازیں نبی کریم ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو لشکر کا سپہ سالار بھی بنایا تھا۔ اس سے صحت کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ دیگر تمام سالار مجاہدین کی طرح جہاد کے احکام ومسائل سے بھی آگاہ تھے۔ اس لیے کہ نبی کریم ﷺ ذمہ داری صرف اہل علم کو تفویض فرمایا کرتے تھے۔ اور اس ضمن میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا پایہ حضرت علی رضی اللہ عنہ یا دیگر سالاران لشکر سے کسی طرح بھی فروتر نہ تھا۔ جب علمی مسائل صلوٰۃ وزکوٰۃ اور حج کے احکام میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا حضرت علی رضی اللہ عنہ پر تفوق ثابت ہوگیا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ جہاد کے مسائل جاننے میں آپ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پیچھے نہ تھے تو اس سے آپ کا علمی پایہ واضح ہوجاتا ہے۔

[خلفاء اربعہ کے مسائل وفتاوی میں موازنہ]:

پھر یہ بھی معلوم ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سفر وحضر میں؛ نشست وبرخاست گفت وشنید وقیام میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت ورفاقت میں رہا کرتے تھے۔اور اس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فتاوی واحکام سے بذات خود حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نسبت زیادہ آگاہ تھے۔تو صحت کے ساتھ بطور ضرورت معلوم ہوا کہ آپ احکام ومسائل میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے زیادہ واقفیت رکھتے تھے۔علم کا کوئی شعبہ ایسا نہ تھا جس میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ دوسروں پر فائق نہ ہوں یا کم از کم اس میں دوسروں کے برابر نہ ہوں۔اس سے روافض کا یہ دعوی باطل ثابت ہوگیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ تمام لوگوں سے بڑے عالم تھے۔ وللہ الحمد۔

[نیوش بر گوش علی رضی اللہ عنہ]:

[اشکال] : شیعہ مصنف لکھتا ہے:''حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

﴿وَتَعِيَهَآ أُذُنٌ وَّاعِيَةٌ﴾ (الحاقۃ ۱۲ 12)

''اور یاد رکھنے والا کان اسے یاد رکھے۔''

[جواب]: ہم کہتے ہیں: یہ حدیث اہل علم کے ہاں بالاتفاق موضوع ہے۔اور یہ بات بھی اضطراری طور پر معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مراد ہرگز یہ نہیں ہے کہ صرف ایک کان کے علاوہ کوئی دوسرا اسے یاد نہ رکھے؛ اور نہ ہی اس سے کسی متعین شخص کے کان مراد ہیں۔ یہاں پر مقصود صرف نوع ہے۔اس میں ہر یاد رکھنے والا کان شامل وداخل ہے۔

[فطانتِ علی رضی اللہ عنہ]:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:''حضرت علی رضی اللہ عنہ نہایت ذہین وفطین اور علم کے بہت بڑے حریص تھے؛ آپ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہے؛ دن رات میں ہر وقت آپ کی صحبت میں رہتے۔ بچپن سے لے کر تا وفات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے زیادہ کامل صحبت کا شرف حاصل ہوا۔''

[جواب]: ہم کہتے ہیں: یہ بات کیسے ثابت ہوئی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما سے زیادہ ذہین اور ان سے زیادہ شائق علم تھے؟ اور آپ نے ان دونوں حضرات سے بڑھ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے استفادہ کیا۔ بخاری ومسلم میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:''اُمم سابقہ میں مُلہَم موجود تھے،اگر میری امت میں کوئی ملہم من اللہ ہوا تو وہ عمر رضی اللہ عنہ ہیں۔''

ملہم یا محدث وہ ہے جس پر اللہ تعالیٰ کی طرف الہام ہو؛ یہ بشری تعلیم سے زائد ایک قسم ہے۔

[بخاری ومسلم کی متعدد احادیث سے بھی حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کے علم وفضل پر روشنی پڑتی ہے۔مثلاً] متفق علیہ روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:''مجھے خواب میں ایک پیالہ پیش کیا گیا جس میں دودھ تھا، وہ میں نے پی لیا، یہاں تک کہ سیری کا اثر میرے ناخنوں میں ظاہر ہونے لگا، پھر جو بچ گیا میں نے وہ عمر رضی اللہ عنہ کو دے دیا۔صحابہ نے عرض کیا:'' پھر آپ نے اس کی کیا تعبیر فرمائی؟ فرمایا:'' دودھ سے علم مراد ہے۔''

ایسی کوئی روایت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حق میں نہیں ہے۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

''میں نے خواب میں دیکھا کہ لوگوں کو میرے سامنے پیش کیا جا رہا ہے۔ انھوں نے قمیصیں پہن رکھی ہیں، بعض کی قمیص سینہ تک پہنچتی ہے اور بعض کی اس سے نیچے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب پیش کیے گئے تو وہ قمیص کا دامن کھینچتے ہوئے گزرے۔ لوگوں نے پوچھا: ''پھر آپ نے اس کی کیا تعبیر کی؟ فرمایا۔ قمیص سے دین مراد ہے۔'' ❶

یہ دونوں احادیث صحیح ہیں جو کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لیے علم و دین کی شہادت دیتی ہیں۔ ایسی کوئی روایت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے منقول نہیں ہے۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شہادت پائی تو حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا:

''علم کے نو حصے رخصت ہو گئے اور ایک حصہ باقی رہا، جس میں سب لوگ شریک ہیں۔'' ❷

اور اس میں کوئی شک وشبہ والی بات نہیں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دیگر تمام صحابہ سے بڑھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کا التزام کیا کرتے تھے۔ ان کے بعد پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا درجہ آتا ہے۔ آپ دیگر تمام صحابہ کی بہ نسبت بشمول حضرت علی رضی اللہ عنہ کے؛ زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں بیٹھا کرتے۔ [اور مسلمانوں کے معاملات میں مشاورت کرتے]۔

صحیحین میں ہے: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ:

''جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی نعش کو چارپائی پر رکھا گیا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی ایک جماعت نے اس کا احاطہ کر لیا اور آپ کے لیے دعائے خیر کرنے اور توصیفی کلمات کہنے لگے۔ اتنے میں ایک شخص نے اچانک آ کر میرا کندھا تھام لیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے۔ انھوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لیے رحم کی دعا فرمائی اور کہا:'' اے عمر! تو نے اپنے پیچھے کوئی آدمی نہیں چھوڑا جس کے اعمال کو لے کر اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرنا مجھے تجھ سے عزیز تر ہو۔'' ہاں اللہ کی قسم! میرا یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو دونوں ساتھیوں (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر) کے ساتھ ملا دیگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں اکثر سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کرتا تھا کہ میں اور ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما آئے، میں اور ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما داخل ہوئے؛ میں اور ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما نکلے۔'' مجھے امید تھی کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ان دونوں ساتھیوں کی ملاقات نصیب کرے گا۔'' ❀

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ رات کو بیٹھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مسلمانوں کے مسائل میں گفتگو کیا کرتے تھے۔

اور جن مسائل میں حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کا اختلاف ہوا ہے؛ اکثر طور پر ان میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہی راجح ہوا کرتا تھا۔ مثلاً حاملہ عورت کا خاوند فوت ہو جائے اس کی عدت کا مسئلہ (عدتِ وفات اور وضع حمل میں سے جس کی مدت بعید تر ہو)؛ اور حرام کا مسئلہ۔ جیسا کہ اس سے پہلے گزر چکا ہے۔

اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اہل مدینہ کا مذہب اہل عراق کے مذہب کی نسبت زیادہ راجح ہے۔

---

❶ صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب تفاضل اهل الایمان فی الاعمال (ح:۲۳)، صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ (ح:۲۳۹۰)۔ ❷ اسد الغابة (۴/ ۱۶۶)۔

❀ یہ روایت بھی صحیح ہے۔ اس کی تفصیل کے لیے دیکھیں: البخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم باب مناقب عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ (ح:۳۶۷۷۔۳۶۸۵) صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة۔ باب من فضائل عمر رضی اللہ عنہ (ح:۲۳۸۹)۔

اہل مدینہ غالب طور پر حضرت عمر اور حضرت زید رضی اللہ عنہما کی اتباع کرتے ہیں جبکہ اہل عراق حضرت ابن مسعود اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کی اتباع کرتے ہیں۔صورت حال یہ تھی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جو بات بھی کہتے تو اس میں حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہما اور دیگر صحابہ سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا جوفتوی ان لوگوں کیساتھ تھا؛ وہ ان کے انفرادی فتوی سے زیادہ قوی ہے۔

جیسا قاضی عبیدہ سلمانی رحمہ اللہ نے آپ سے کہا تھا:

''حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ متفقہ رائے آپ کے انفرادی قول سے ہمیں زیادہ عزیز ہے۔''[تخریج گزر چکی ہے]

حضرت عبد اللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہمارے لیے دروازہ کھول دیتے تو ہم اندر داخل ہوجاتے۔ہم آپ کو سہل و نرم پاتے۔آپ کے پاس ایک مسئلہ پیش ہوا کہ:ایک آدمی اپنے والدین اور بیوی اور اس کے والدین کو چھوڑ کر مرگیا ہے(اس کی میراث کا کیا حکم ہے؟)۔تو آپ نے فرمایا:''لِـلأمِ ثلث الباقِي۔''''ماں کے لیے باقی کا تیسرا حصہ ہے۔'' پھر حضرت عثمان و علی و ابن مسعود و زید رضی اللہ عنہم اجمعین نے بھی [اس مسئلہ میں] آپ کی اتباع کی۔''

مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ حضرت سعید بن المسیب رحمہ اللہ تابعین میں سب سے بڑے عالم تھے۔آپ کے فقہ کی اصل بنیاد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فیصلے تھے۔ابن عمر رضی اللہ عنہما بھی ان سے اس بارے میں سوال کیا کرتے تھے۔

ترمذی میں [ہی حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے مروی] ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو وہ عمر رضی اللہ عنہ ہوتے۔'' ترمذی نے اس حدیث کو حسن کہا ہے۔[سبق تخریجه]۔

یہ بھی جان لیجیے کہ اہل کوفہ اور صحاب ابن مسعود، جیسے کہ علقمہ، الاسود، شریح، والحارث بن قیس، وعبیدہ السلمانی، ومسروق، وزِر بن حبیش، ابی وائل،اور ان کے علاوہ دیگر بہت سارے علما ایسے تھے جو عبداللہ بن مسعود اور حضرت عمر کے علم کو حضرت علی کے علم پر فضیلت دیتے تھے۔اور ہمیشہ حضرت علی کے قول کے برعکس حضرت عمر اور عبداللہ بن مسعود کے قول کے مطابق فتوی دیا کرتے تھے۔

فصل:

[بچپن کا علم]

[اشکال] : شیعہ مصنف لکھتا ہے:''بچپن میں جو علم حاصل کیا جائے وہ پتھر پر لکیر ہوتا ہے۔ بنابریں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علوم دوسروں کے علوم سے بڑھ کر ہوں گے۔ نیز اس لیے کہ آپ کے استاد(نبی) ہر لحاظ سے کامل تھے اور شاگرد(علی) میں قبول علم کی استعداد موجود تھی۔''[انتہی کلام الرافضی]

[جواب] : ہم کہتے ہیں:یہ رافضی کے حدیث سے جاہل ہونے کی نشانی ہے۔یہ ایک عامیانہ کلام ہے،اور حدیث رسول نہیں ہے۔اس حکایت کے عین برخلاف اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی تائید فرمائی تھی؛انہوں نے امور ایمان کتاب و سنت کا علم [بڑی عمر میں] سیکھا تھا، تاہم اللہ تعالیٰ نے ان پر اس کی تحصیل آسان کردی تھی۔حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بھی یہی حال ہے۔ابھی وحی تکمیل پذیر نہیں ہوئی تھی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عمر تیس سال کو پہنچ گئی۔آپ نے قرآن بڑی عمر میں یاد کیا تھا۔اس میں اختلاف ہے کہ آیا حضرت علی رضی اللہ عنہ کو پورا قرآن یاد تھا یا نہیں؟ اس میں دو قول ہیں۔

❀ انبیاء کرام علیہم السلام اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سب سے بڑے عالم ہوتے ہیں؛ لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے علاوہ کسی بھی نبی کو چالیس سال کی عمر سے پہلے مبعوث نہیں کیا۔[یہ علمی و عقلی پختگی کا دور ہوتا ہے]۔

❀ دوسری طرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم سب کے لیے عام ہوا کرتی تھی۔اس مقصد کے لیے آپ نے کسی کو خاص نہیں کیا ۔حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو دیکھیے انھوں نے صرف تین سال کے عرصہ میں وہ کچھ یاد کر لیا تھا جو دوسرے صحابہ طویل عرصہ میں بھی یاد نہ کر سکے تھے۔اور آپ دوسرے تمام صحابہ کی نسبت حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ زیادہ بیٹھا کرتے تھے۔

فصل:

[علوم علی رضی اللہ عنہ سے استفادہ]

[اشکال] : شیعہ مصنف لکھتا ہے:''لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علوم سے استفادہ کیا۔''

[جواب]: ہم کہتے ہیں: یہ باطل ہے۔اس لیے کہ کوفہ جو کہ آپ کا گڑھ تھا وہاں کے لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کوفہ آنے سے پہلے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ایمان' قرآن' تفسیر' فقہ' اور سنت سیکھے۔ جب [روایت حدیث میں] کہا جائے کہ :ابو عبدالرحمٰن نے انہیں پر پڑھا''اس کا معنیٰ ہے کہ انہیں حدیث پیش کی [اور سکھائی]۔حضرت ابو عبدالرحمٰن نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کوفہ آنے سے پہلے قرآن حفظ کر لیا تھا۔ [1]

یہ ابو عبدالرحمٰن اور دوسرے علماء اہل کوفہ جیسے کہ علقمہ، الاسود، شریح، والحارث[بن قیس]التیمی ، وزر بن حبیش، عاصم بن ابی نجود رحمہم اللہ ۔جس پر قرآن پڑھا گیا۔ان لوگوں نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے قرآن سیکھا۔ یہ لوگ مدینہ جاتے تو حضرت عمر اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے علم سیکھا کرتے تھے۔حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ان لوگوں نے ایسے اکتساب علم نہیں کیا جیسے حضرت عمر اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کیا تھا۔

❀ شریح رحمہ اللہ آپ کے دور کے قاضی تھے جنہوں نے یمن میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے تعلیم حاصل کی۔آپ فقہی مسائل میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مناظرہ کیا کرتے تھے' آپ کی تقلید نہیں کرتے تھے۔یہی حال قاضی عبیدہ سلمانی کا بھی تھا؛ وہ فرمایا کرتے تھے:''حضرت عمر رضی اللہ عنہ کیساتھ آپ کی اجتماعی رائے آپ کی انفرادی رائے سے زیادہ محبوب ہے۔

❀ اہل مکہ و مدینہ نے بھی آپ سے علم حاصل نہیں کیا۔یہی حال اہل شام اور بصرہ کا ہے۔یہ پانچ بڑے شہر دونوں حجاز؛ دو عراقی شہر اور شام یہیں سے علوم نبوت پھوٹا ہے۔ایمان و قرآن اور شریعت کے علوم یہاں سے نکلے ہیں۔ان شہروں کے باسیوں نے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اکتساب فیض نہیں کیا۔اس لیے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان شہروں میں ایسے لوگ بھیج دیئے تھے جو انہیں قرآن و سنت کی تعلیم دیتے۔اہل شام کے پاس معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ اور حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کو روانہ فرمایا۔اور اہل عراق کی طرف حضرت عبداللہ بن مسعود اور حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہما اور دیگر صحابہ کو روانہ کیا۔

[1] ابو عبدالرحمٰن بن حبیب بن ربیعہ السلمی الکوفی القاری ۔ابن سعد نے طبقات ۶/۱۷۲ میں لکھا ہے: آپ نے حضرت علی حضرت عبداللہ اور عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین سے روایات نقل کی ہیں۔سن بہتر ہجری میں نوے سال کی عمر میں کوفہ میں انتقال ہوا۔آپ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے شاگرد تھے۔

فصل:

[حضرت علی رضی اللہ عنہ اور علم نحو]

[اشکال] : شیعہ مصنف لکھتا ہے: ''حضرت علی رضی اللہ عنہ علم نحو کے واضع تھے۔آپ نے ابوالاسود سے کہا تھا۔کلام کی تین قسمیں ہیں۔اسم،فعل،حرف۔حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ابوالاسود کواعراب کے اقسام بھی بتائے تھے۔''

[جواب] : ہم کہتے ہیں: ''علم نحو،علوم نبوت میں شمار نہیں ہوتا، بلکہ یہ ایک استنباطی علم ہے۔جو کہ قوانین زبان کی حفاظت کا ایک وسیلہ ہے۔اس زبان میں قرآن نازل ہوا۔خلفاء ثلاثہ کے زمانہ میں لوگ اعراب پڑھنے میں غلطی کا ارتکاب نہیں کرتے تھے۔اس لیے اس کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کوفہ میں سکونت پذیر ہوئے تو وہاں عجمی لوگ بودوباش رکھتے تھے جو اکثر اعراب میں غلطیاں کیا کرتے تھے اس لیے آپ نے علم نحو کی ضرورت محسوس کی۔نقل کیا گیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ابوالاسود سے کہا تھا:اُنحُ ھٰذَا النَّحوَ'' (اسی طریقہ پر چلیے)۔بنابریں اس علم کونحو کے نام سے موسوم کیا گیا۔جس طرح دوسرے لوگوں (حجاج بن یوسف ثقفی) نے ضرورت کے پیش نظر نقطے' خط نیز مدّ وشدّ وغیرہ علامات ایجاد کیں؛اوراس طرح کے دیگر علوم بنا برضرورت ایجاد کیے۔پھر اہل کوفہ و بصرہ نے علم نحو کی آبیاری کی۔اور خلیل نے علم عروض وضع کیا۔

فصل:

[فقہاء کی مراجعت اور حضرت علی رضی اللہ عنہ]

[اشکال] : شیعہ مصنف لکھتا ہے:''فقہ میں سب فقہاء حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جواب]: ہم کہتے ہیں: ''یہ صاف جھوٹ ہے،ائمہ اربعہ اور دیگر فقہاء میں سے کوئی بھی فقہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف رجوع نہیں کرتا تھا۔ جہاں تک امام مالک رحمہ اللہ کا تعلق ہے آپ اہل مدینہ سے اخذ کرتے ہیں اور اہل مدینہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قول سے احتجاج نہیں کرتے، بلکہ وہ فقہاء سبعہ کے اکتساب فیض کرتے تھے جیسے: حضرت عمر رضی اللہ عنہ و زید و ابن عمر رضی اللہ عنہم اجمعین اور ان کے امثال۔[ان کے اقوال اہل مدینہ کے ہاں سند کا درجہ رکھتے ہیں]۔

امام شافعی رحمہ اللہ نے آغاز کار میں اہل مکہ مثلاً اصحاب ابن جریج رحمہ اللہ ؛سعید بن سالم القداح ؛مسلم بن خالد الزنجی وغیرہ سے استفادہ کیا۔اور ابن جریج رحمہ اللہ اصحاب ابن عباس رضی اللہ عنہما جیسے عطاء رحمہ اللہ اور دوسرے اصحاب سے اخذ و استفادہ کیا کرتے تھے۔ابن عباس رضی اللہ عنہ مجتہد مطلق تھے۔اور جب آپ صحابہ کرام میں سے کسی کے قول کے مطابق فتوی دیتے تو وہ حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کے اقوال ہوا کرتے تھے؛ نہ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قول کے مطابق۔ بلکہ آپ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بہت ساری باتوں پر رد کیا کرتے تھے۔

پھر امام شافعی رحمہ اللہ نے مدینہ پہنچ کر امام مالک رحمہ اللہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور بعد میں اہل عراق کی تصانیف سے فائدہ اٹھایا۔پھر مذہب محدثین کی تعلیم پائی اور اسے ہی اپنے لیے اختیار کرلیا۔جب کہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے

استاذ خاص ابراہیم نخعی رحمہ اللہ کے شاگرد حماد بن ابی سلیمان رحمہ اللہ ہیں ۔نخعی علقمہ رضی اللہ عنہ کے تربیت یافتہ تھے اور علقمہ رحمہ اللہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے ساختہ پرداختہ تھے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے مکہ میں عطاء[ابن ابی رباح] رحمہ اللہ سے بھی استفادہ کیا تھا۔امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ محدثین کے مسلک پر گامزن تھے۔آپ نے [سفیان]ابن عیینہ سے تعلیم پائی ۔ابن عیینہ عمرو بن دینار کے شاگرد تھے۔ وہ ابن عباس اور ابن عمر رضی اللہ عنہما کے پروردہ و تربیت یافتہ تھے۔ نیز آپ نے ہشام بن بشیر سے بھی اکتساب فیض کیا تھا۔ ہشام کا شمار حسن بصری اور ابراہیم نخعی کے اصحاب میں ہوتا ہے۔نیز آپ کے اساتذہ میں سے عبدالرحمن بن مہدی؛، وکیع بن جراح ؛ اوران کے امثال بھی ہیں؛رحمہم اللہ ۔امام شافعی رحمہ اللہ کیساتھ بھی مجلس میں بیٹھا کرتے تھے۔امام ابو یوسف رحمہ اللہ سے بھی اکتساب علم کیا ؛ اور ان کے قول کو پسند فرمایا کرتے تھے۔ ایسے ہی محدث اسحق بن راہویہ اور ابوعُبَید رحمہم اللہ بھی اسی شاہ راہ پر گامزن رہے۔

یہی حال امام لیث اوراوزاعی رحمہما اللہ کا بھی ہے؛ ان کی فقہ وعلوم اہل مدینہ سے ماخوذ تھے اہل کوفہ سے نہیں۔

فصل:

[امام مالک اور علوم علی رضی اللہ عنہ]

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:''مالکیہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ اوران کی اولاد سے استفادہ کیا۔''[انتہی کلام الرافضی]

[جواب] : ہم کہتے ہیں: یہ صریح جھوٹ ہے۔ ❶ یہ موطا امام مالک موجود ہے۔اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اوران کی اولاد سے معدودے روایات نقل کی گئی ہیں۔اس میں زیادہ غیر اہل بیت راویوں کی مرویات پائی جاتی ہیں۔اس میں حضرت جعفر سے صرف نو احادیث منقول ہیں ۔اورامام مالک نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے امام جعفر کے علاوہ کسی سے بھی حدیث روایت نہیں کی۔اسی طرح کتب حدیث وسنن ومسانید میں زیادہ تر غیر اہل بیت راویوں کی مرویات پائی جاتی ہیں۔

فصل:

[امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور جعفر صاق رحمہ اللہ کی شاگردی]

[اشکال] : شیعہ مصنف کا یہ قول کہ:''امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے جعفرصادق رحمہ اللہ کی شاگردی اختیار کی تھی۔''

[جواب]: یہ ایسا صاف جھوٹ ہے جسے ادنی علم رکھنے والا انسان بھی جانتا ہے۔اس لیے کہ یہ دونوں حضرات معاصر تھے۔ امام جعفر رحمہ اللہ نے [امام صاحب رحمہ اللہ سے دو سال پہلے]ایک سو اڑتالیس ہجری میں وفات پائی۔ جب کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے ایک سو پچاس ہجری میں وفات پائی۔[البتہ ان کا سن ولادت ایک ہی ہے]۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے

❶ اہل بیت کی مرویات میں چونکہ جھوٹ کا عمل دخل ہوگیا تھا، اس لیے روایت حدیث میں عدالت وضبط کا لحاظ رکھنے والے محدثین اہل بیت علماء سے روایات اخذ کرنے میں احتیاط کیا کرتے تھے۔ اہل بیت کے متعصب شیعہ اپنے علماء سے جھوٹی روایات بیان کرنے میں عام طور سے بدنام تھے۔ جو احادیث اس عیب سے پاک ہوں ان کے ذکر و بیان میں محدثین کوئی باک نہیں سمجھتے تھے۔اسماء الرجال کے فن کا طالب جوراویان حدیث کے کوائف و احوال معلوم کرنے کا خواہاں ہوں۔علم حدیث کے علماء وائمہ کے عدل وانصاف سے بخوبی آگاہ ہے۔اس مسئلہ کی تحقیق کے لیے دیکھیے ہمارا مقالہ جس کا عنوان ہے۔"تسامح اهل السنة فی الروایة عمن یخالفونهم فی العقیدة"(مجلة الازهر، مجلد: ٢٤، ص: ٣٠٦۔ ٣١٢)

جعفر صادق رحمہ اللہ کے والد کی زندگی میں فتوی دیا کرتے تھے۔آپ نے حضرت جعفر اور ان کے والد سے ایک مسئلہ بھی نہیں سیکھا تھا۔ البتہ ان سے زیادہ معمر لوگوں سے آپ نے استفادہ کیا تھا۔ مثلاً عطاء بن ابی رباح،اور ان کے شیخ حماد بن ابی سلیمان اور جعفر بن محمد؛ جو کہ مدینہ میں تھے۔

فصل:

[امام شافعی رحمہ اللہ اور محمد بن حسن شیبانی رحمہ اللہ کی شاگردی]

[اشکال] : شیعہ مصنف کا یہ قول کہ امام شافعی رحمہ اللہ نے محمد بن حسن شیبانی رحمہ اللہ سے استفادہ کیا تھا۔''

[جواب] : یہ غلط ہے،ایسا بالکل نہیں؛ بلکہ امام شافعی رحمہ اللہ محمد بن حسن رحمہ اللہ کی صحبت میں رہے؛ان کے طرز فکر و نظر کو جانچا۔ ان سے مناظرے کیے [اور ان کی تردید میں کتابیں لکھیں]۔آپ پہلے انسان تھے جنہوں نے محمد بن حسن کے ساتھ کھل کر اختلاف کیا۔اس لیے کہ محمد بن حسن رحمہ اللہ نے امام مالک رحمہ اللہ اور اہل مدینہ پر رد کیا تھا[اور الحجة علی أهل المدنية کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی] ۔محمد بن حسن رحمہ اللہ نے سب سے پہلے اپنے مخالفین پر رد لکھا۔سو امام شافعی رحمہ اللہ نے ان کی باتوں کو اچھی طرح دیکھا۔ اور جو چیز آپ کے سامنے حق تھی کہ اہل مدینہ کا مذہب حق پر ہے' آپ نے اس کی نصرت کی ۔آپ اکثر طور پر اہل حجاز اور محدثین کے مذہب کی تائید کیا کرتے تھے۔ پھر عیسی بن ابان نے امام شافعی رحمہ اللہ کے رد پر ایک کتاب لکھی؛ اور ابن سریج نے عیسی بن ابان پر رد لکھا۔

ایسے ہی امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے امام شافعی رحمہ اللہ سے تعلیم نہیں پائی۔لیکن آپ کی مجلس میں بیٹھا کرتے تھے۔جس طرح کہ امام شافعی رحمہ اللہ محمد بن حسن رحمہ اللہ کی مجلس میں بیٹھا کرتے تھے۔ان میں سے ہر ایک نے دوسرے سے استفادہ بھی کیا ہے۔

امام شافعی اور احمد بن حنبل رحمہما اللہ اصول میں متفق تھے۔یہ اتفاق محمد بن حسن رحمہ اللہ کے ساتھ اتفاق سے زیادہ تھا۔امام شافعی احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے دس سال سے زیادہ بڑے تھے۔امام شافعی پہلی بار ۱۸۰ھ کے کچھ عرصہ بعد امام ابو یوسف کی موت کے بعد اور محمد بن حسن کی زندگی میں بغداد تشریف لائے ۔پھر دوسری بار ۱۹۰ھ کے بعد تشریف لائے۔اس بار آمد کے موقع پر امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے ملاقات ہوئی۔

بہر کیف ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک نے بھی امام جعفر رحمہ اللہ سے مسائل و اصول اخذ نہیں کیے تھے۔ مانا کہ انھوں نے امام جعفر رحمہ اللہ سے چند روایات نقل کی ہیں تو اس سے کئی گنا روایات انھوں نے غیر اہل بیت راویوں سے بھی اخذ کی ہیں۔ امام زہری رحمہ اللہ اور امام جعفر رحمہ اللہ کی مرویات کے درمیان کوئی نسبت ہی نہیں؛ نہ ہی قوت حدیث کے اعتبار سے اور نہ ہی کثرت تعداد کے اعتبار سے۔

امام بخاری رحمہ اللہ کو بعض احادیث میں اس وقت شک گزرا جب انہیں یہ بات پتہ چلی کہ یحی بن سعید القطان کو ان روایات میں کلام ہے؛ پھر آپ نے وہ احادیث اپنی کتاب ''صحیح بخاری'' میں نقل نہیں کیں۔

یہ حقیقت ہے کہ امام جعفر صادق پر جس قدر بہتان طرازی کی گئی ہے اور کسی پر نہیں کی گئی۔ تاہم ان کا دامن ان اتہامات سے پاک ہے۔ [1] چنانچہ شیعہ نے یہ علوم امام جعفر صادق کی طرف منسوب کیے ہیں:

(۱) علم البطاقہ۔ (۲) علم الهفت۔ (۳) الجدول۔ (۴) اختلاج الاعضاء۔ (۵) علم الجفر۔ (۶) منافع القرآن۔ (۷) الرعود والبروق۔ (۸) احکام النجوم۔ (۹) القرعہ۔ (۱۰) استقسام بالازلام۔ (۱۱) ملاحم۔ کلام علی الحوادث؛ اور تفسیر قرآن میں کئی قسم کے اشارات؛ اور خواب میں سورت پڑھنے کی تعبیر۔ یہ تمام کتابیں آپ کی طرف جھوٹ سے منسوب کی گئی ہیں۔

امام جعفر الصادق نے اپنے والد اور دوسرں لوگوں سے اکتساب فیض کیا تھا؛ جیسا کہ پہلے گزر چکا۔ آپ کے والد نے علی بن الحسین سے علم حاصل کیا تھا۔ علی بن حسین نے اپنے والد حسین سے اور ان سے زیادہ دوسرے علماء کرام سے اکتساب فیض کیا تھا۔ اس لیے کہ امام حسین رضی اللہ عنہ سن ۶۱ھ میں شہید کردیے گئے تھے؛ اس وقت حضرت علی رحمہ اللہ چھوٹے تھے۔ جب آپ واپس مدینہ تشریف لائے تو وہاں کے علماء کرام سے علم حاصل کیا۔ نیز آپ نے امہات المؤمنین حضرت عائشہ؛ ام سلمہ؛ صفیہ؛ اور حضرت ابن عباس؛ مسور بن مخرمہ؛ اور ابو رافع مولی النبی؛ رضی اللہ عنہم؛ مروان بن الحکم اور سعید بن مسیب رحمہما اللہ وغیرہ سے بھی علم حاصل کیا تھا۔ ایسے ہی حضرت حسن رضی اللہ عنہ اپنے والد کے علاوہ دوسرے صحابہ اور تابعین تک سے علم حاصل کیا کرتے تھے۔ یہ آپ کا علم و دین تھا۔ رضی اللہ عنہ۔

علماء کرام رحمہم اللہ نے حضرت علی بن حسین رحمہ اللہ کی بہت تعریف کی ہے اور بڑے مناقب بیان کیے ہیں۔

امام زہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''میں نے علی بن حسین رحمہ اللہ سے افضل مدینہ میں کسی کو نہیں پایا۔''

یحی بن سعید انصاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''مدینہ میں سب سے افضل ہاشمی میں نے آپ کو ہی دیکھا ہے۔''

حماد بن زید رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''مدینہ میں میں نے سب سے افضل ہاشمی آپ کو ہی پایا۔ آپ فرمایا کرتے تھے: اے لوگو! ہم سے اسلام کی محبت کرو۔ تم ہم سے محبت کا مسلسل دعوی کرتے رہے یہاں تک کہ تمہاری محبت ہمارے لیے عار ہو گئی۔'' یہ کلام محمد بن سعد نے طبقات میں نقل کیا ہے۔ [۲۱۴/۵]۔

ابن سعد لکھتے ہیں: [علماء نے] کہا ہے: ''علی بن حسین رحمہ اللہ ثقہ اور مامون تھے؛ کثرت احادیث والے رفیع الشان اور عالی منزلت کے انسان تھے۔ آپ نے شیبہ بن نعامہ سے روایت نقل کی ہے۔ آپ فرماتے ہیں: علی بن حسین رحمہ اللہ بخل کیا کرتے تھے۔ جب آپ کا انتقال ہوا تو پتہ چلا کہ چپکے سے اہل مدینہ کے ایک سو گھرانوں کی کفالت کیا کرتے تھے۔

---

[1] امام جعفر صادق کے بارے میں شیعہ نے جو جھوٹ تصنیف کیے ہیں، ان میں سے مضحکہ خیز جھوٹ وہ ہے جسے شیعہ کے فخر العلماء محمد بن محمد نعمان المفید نے اپنی کتاب ''الارشاد فی تاریخ حجج اللہ علی العباد'' مطبوعہ ایران، ص:۱۰۴، پر جعفر بن محمد کے ترجمہ میں لکھا ہے کہ ''امام جعفر صادق نے فرمایا: میرے پاس سیدنا موسیٰ کی تختیاں ہیں، جن پر تورات مکتوب تھی۔ میرے پاس عصائے موسیٰ اور خاتم سلیمان بھی ہے۔ نیز میرے پاس وہ طشتری بھی ہے جس میں موسیٰ علیہ السلام قربانی دیا کرتے تھے۔'' ہم پورے وثوق سے کہتے ہیں کہ امام جعفر فی الواقع صادق تھے، مگر شیعہ آپ پر جھوٹ باندھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ محدثین ان کی روایات پر اعتماد نہیں کرتے۔ ہمارے دوست سید محمد بن عقیل امام بخاری پر طعن کرتے ہیں کہ وہ اہل بیت سے بہت تھوڑی روایات نقل کرتے ہیں کیا صاحب ممدوح یہ چاہتے ہیں کہ امام بخاری اس بات پر مہر تصدیق ثبت کریں کہ عصائے موسیٰ اور قربانی کی طشتری فی الواقع امام جعفر کے پاس موجود تھی۔ اللہ تعالیٰ ایسے عقائد سے بچائے۔''

فصل:

[حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور کلام رافضی]

[اشکال] : شیعہ مصنف لکھتا ہے:''امام مالک سے منقول ہے کہ انھوں نے ربیعہ سے پڑھا۔ ربیعہ نے عکرمہ سے عکرمہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اور ابن عباس حضرت علی رضی اللہ عنہ کے شاگرد تھے۔''

[جواب] : ہم کہتے ہیں: یہ جھوٹ ہے۔ ربیعہ نے عکرمہ سے کچھ نہیں پڑھا تھا؛ بلکہ امام مالک نے اپنی کتاب میں عکرمہ سے ایک دو روایات کے علاوہ کوئی بھی روایت نقل نہیں کی۔ اور نہ ہی اپنی کتاب میں عکرمہ کا کوئی ذکر کیا ہے۔ اس لیے کہ آپ کو یہ بات پتہ چلی تھی کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما اور سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ کو عکرمہ پر کچھ کلام تھا؛ اس لیے آپ نے ان سے روایت نقل کرنا ترک کر دیا تھا۔ ایسے ہی امام مسلم نے بھی ان سے کوئی روایت نقل نہیں کی۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ عکرمہ سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے امثال فقہاء اہل مدینہ کے شاگرد ہیں ۔ سعید رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عمر، زید بن ثابت اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم اجمعین سے استفادہ کیا تھا۔ اور قضایا میں آپ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اقوال تلاش کرتے تھے۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بھی آپ سے سوال کیا کرتے تھے۔

اسی لیے کہا جاتا ہے کہ موطا امام مالک کے اصول امام ربیعہ کی سند سے سعید ابن مسیب سے اور انہوں نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے لیے ہیں۔ خلیفہ رشید نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے کہا تھا:'' آپ نے موطا میں ابن عمر رضی اللہ عنہ سے بہت زیادہ روایات لی ہیں اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بہت کم ہیں۔'' تو آپ نے جواب میں فرمایا:''اے امیر المؤمنین آپ ان دونوں میں سے زیادہ صاحب ورع تھے۔'' [یعنی عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما]۔

یہ موطا پکار پکار کر بتا رہا ہے کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق اس قسم کی من گھڑت روایات کھلا ہوا جھوٹ ہیں۔

[ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت علی کی شاگردی رضی اللہ عنہ]:

[اشکال] : شیعہ مصنف لکھتا ہے:''ابن عباس رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے علم حاصل کیا تھا۔''

[جواب] : یہ بات بھی غلط ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے شاگرد ہیں۔ اس لیے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بہت کم روایات نقل کی ہیں۔ ان کی اکثر روایات حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور زید رضی اللہ عنہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہیں ۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما اکثر امور میں حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے قول کے مطابق فتوی دیا کرتے تھے اور بہت سے مسائل میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف تھے۔ جیسا کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں نقل کیا ہے کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس زنادقہ کی ایک جماعت لائی گئی۔ آپ نے انہیں جلا دیا۔ جب یہ بات حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ تک پہنچی تو آپ نے فرمایا:''اگر ان کی جگہ میں ہوتا تو میں کبھی بھی انہیں نہ جلاتا۔ اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے عذاب سے عذاب دینے سے منع فرمایا ہے۔ میں انہیں صرف قتل کر دیتا۔ اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:'' جو اپنے دین کو بدل ڈالے' اسے قتل کر ڈالو۔'' جب اس بات کی خبر حضرت علی رضی اللہ عنہ تک پہنچی تو آپ نے فرمایا:''ابن عباس رضی اللہ عنہ کے لیے افسوس ہے۔'' [تخریج گزر چکی ہے]

فصل:

[حضرت علی رضی اللہ عنہ اور علم کلام]

[اشکال] : شیعہ مصنف لکھتا ہے:''حضرت علی رضی اللہ عنہ علم الکلام کی اصل واساس ہیں۔آپ کے خطبات سے لوگوں نے علم الکلام حاصل کیا۔لہٰذا لوگ اس فن میں آپ کے شاگرد ہیں۔''

[جواب] :ہم کہتے ہیں: یہ جھوٹ ہے؛ علاوہ ازیں اس میں فخر کی کوئی بات نہیں۔اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس علم الکلام سے پاک رکھا تھا جو کہ کتاب وسنت کی تصریحات کے منافی ہے۔صحابہ وتابعین کے زمانہ میں ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جو حدوثِ اجسام سے حدوث عالم پر استدلال کرتا ہو۔ نیز حدوثِ اجسام کو اعراض اور حرکت وسکون کی دلیل سے ثابت کرتا اور کہتا ہو کہ اجسام اس کو مستلزم ہیں۔اس سے علیحدہ نہیں ہوسکتے۔اور جس سے پہلے کوئی حوادث نہ گزر ہوں وہ خود حادث ہے۔اور اس پر ان حوادث کی بنیاد رکھتے ہیں جن کی کوئی انتہاء ہی نہیں۔بخلاف ازیں پہلی مرتبہ اس کا اظہار پہلی صدی کے بعد جعد بن درہم اور جہم بن صفوان کی طرف سے ہوا۔ پھر عمرو بن عبید اور[واصل بن عطاء]ابوہذیل العلاف اور ان کے امثال نے اس میں حصہ لیا۔عمرو بن عبید اور واصل بن عطاء ان دونوں نے جب انفاذ وعید میں علم کلام کا اظہار کیا کرتے تھے۔ان کا کہنا تھا کہ جو انسان جہنم میں داخل ہوگیا تو پھر وہ وہاں سے کبھی بھی نہیں نکلے گا۔ اور تقدیر کا انکار کرنے لگے۔ان سب باتوں سے اللہ تعالیٰ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو پاک رکھا تھا۔

جو خطبات حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ثابت ہیں، ان میں معتزلہ کے اصول خمسہ کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔اس بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جو بھی باتیں منقول ہیں' وہ سب آپ پر جھوٹ ہیں۔متقدمین معتزلہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تعظیم نہیں کیا کرتے تھے، بلکہ ان میں بعض لوگ ایسے بھی تھے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عدالت وثقاہت کے بارے میں شکوک وشبہات کا اظہار کرتے تھے۔ جنگ جمل کے لڑنے والوں کے بارے میں وہ کہا کرتے تھے:

''فریقین میں سے ایک فاسق ہے،مگر متعین طور پر یہ نہیں معلوم کہ وہ کون ہے۔''یا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں یا پھر حضرت طلحہ وزبیر رضی اللہ عنہما۔اور جب ان میں سے کوئی ایک گواہی دے تو اس کی گواہی قبول نہیں کی جائے گی ۔ جب کہ اکیلے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی گواہی کے بارے میں ان کے دو قول ہیں ۔ یہ قول عمرو بن عبید اور ان جیسے دوسرے معتزلہ کے ہاں معروف ہے۔[1]

متاخرین شیعہ کے برعکس متقدمین شیعہ ہاشمی اور دوسرے لوگ ؛صفات الٰہی اور مسئلہ تقدیر کے قائل تھے۔متاخرین شیعہ نے صراحت کے ساتھ تجسیم کے عقیدہ کا اظہار کیا تھا؛اور اس بارے میں ان سے انتہائی برے اقوال نقل کیے گئے ہیں۔جب

[1] ابن طاہر البغدادی اپنی کتاب ''اصول الدین'' ص ۲۹۰ میں فرماتے ہیں: واصل بن عطاء' عمرو بن عبید اور نظام اور اکثر قدریہ کہتے ہیں کہ: ہم انفرادی طور پر حضرت علی رضی اللہ عنہ اور انکے اصحاب سے محبت کرتے ہیں؛ اور طلحہ وزبیر اور ان کے متبعین سے بھی انفرادی طور پر ولاء کا اظہار کرتے ہیں۔اور اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کیساتھ انکی جماعت کا ایک آدمی گواہی دے تو اس کی گواہی مان لیں گے'اور ایسے ہی طلحہ وزبیر کے ساتھ بھی اگر ان کی جماعت کا کوئی آدمی گواہی دیدے تو ہم مان لیں گے۔لیکن اگر طلحہ اور علی رضی اللہ عنہما اکیلے ہا گلے کی ایک بالی پر بھی گواہی دیں تو تب بھی اسے نہیں مانیں گے۔اس لیے کہ ان دونوں میں سے کوئی ایک فاسق ہے۔فاسق دائمی جہنمی ہوتا ہے' وہ نہ ہی مومن ہے اور نہ ہی کافر۔دیکھیں: مقالات اسلامیین ۲/ ۱٤٥۔

کہ ان کا دعوی ہے کہ انہوں نے یہ عقیدہ اہل بیت سے اخذ کیا ہے۔ [1]

امام جعفر صادق رحمہ اللہ سے جب پوچھا گیا کہ قرآن مخلوق ہے یا غیر مخلوق؟ تو انھوں نے فرمایا: ''وہ نہ ہی خالق ہے اور نہ ہی مخلوق؛ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ وہ اللہ کا کلام ہے۔

رہا رافضی کا یہ قول کہ: '' واصل بن عطاء نے ابو ہاشم بن محمد بن الحنفیہ سے علم حاصل کیا تھا۔''

[اس کا جواب یہ ہے کہ]: اس میں کوئی شک نہیں کہ حسن بن محمد بن الحنفیہ [2] نے معتزلہ کے قول کے برعکس ''ارجاء'' کے مسئلہ پر ایک کتاب تالیف کی تھی۔ کئی اہل علم نے اس کتاب کا ذکر کیا ہے۔ یہ اس معتزلی مذہب سے متناقض ہے؛ جس کا اظہار واصل بن عطاء کیا کرتا تھا۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ: اس نے ابو ہاشم سے علم حاصل کیا تھا۔

اس ابو ہاشم کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اس نے ایک کتاب تصنیف کی تھی جس پر انکار کیا گیا؛ نہ ہی اس کے بھائیوں نے اس پر موافقت کی اور نہ ہی اہل بیت نے۔ اور نہ ہی اس نے اپنے والد سے علم حاصل کیا تھا۔

خواہ کچھ بھی ہو' وہ کتاب جو حسن کی طرف منسوب کی گئی ہے وہ اس کتاب کے متناقض ہے جو ابو ہاشم کی طرف منسوب کی گئی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ: اس نے اس کتاب سے رجوع کر لیا تھا۔ اور یہ بات ممتنع ہے کہ ان دونوں نے یہ متناقض علوم اپنے والد محمد بن الحنفیہ سے حاصل کیے ہوں۔ محمد کی طرف ان دو میں سے ایک کتاب کی نسب زیادہ مناسب ہے۔ پس اس سے قطعی طور پر یہ باطل ثابت ہو گیا محمد بن حنفیہ ایک ہی وقت میں دو مختلف عقائد کے قائل نہیں ہو سکتے۔ بلکہ یہ بات دو ٹوک اور قطعی یقینی ہے کہ محمد مرجئہ کے عقیدہ سے برأت کے ساتھ ساتھ معتزلہ کے عقیدہ سے بھی اس سے بڑھ کر بری ہیں۔ اور ان کے والد حضرت علی رضی اللہ عنہ مرجئہ اور معتزلہ سے اس سے بڑھ کر بری ہیں۔

فصل:

[حضرت علی رضی اللہ عنہ اور علم تفسیر]

[**اشکال**]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ''علم تفسیر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہے۔ اس لیے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما آپ کے شاگرد تھے، ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ نے '' بسم اللہ '' کی ''با'' کی تفسیر پوری رات بھر میں بیان کی۔''

[**جواب**]: پہلی بات: [ہم کہتے ہیں: یہ صاف جھوٹ ہے]۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کے ثبوت کی سند کہاں ہے؟ منقولات سے استدلال کرنے والے پر واجب ہوتا ہے کہ وہ کم از کم اس سند کا ذکر کرے جس سے منقول کی صحت کا علم

[1] علامہ اشعری نے اپنی کتاب ''مقالات الاسلامیین'' ۱/۱۰۶ میں مسئلہ تجسیم میں روافض کے عقائد ذکر کیے ہیں اور انہیں چھ اقسام میں تقسیم کیا ہے۔ پھر ان کے بارے میں کہا ہے: ''توحید میں یہ لوگ معتزلہ اور خوارج کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ یہ ان کے متاخرین شیعہ کا عقیدہ ہے۔ جب کہ ان کے اولین تشبیہ کا عقیدہ رکھتے تھے۔ جب کہ اعمال العباد کے بارے میں ایک گروہ ہشام بن حکم کا عقیدہ رکھتا ہے کہ انسان کی افعال ایک طرح سے اختیاری ہیں اور ایک طرح سے اضطراری۔ اور دوسرا گروہ جہمیہ کا عقیدہ رکھتا ہے کہ: اعمال میں کوئی جبر نہیں؛ اور نہ ہی تفویض ہے جیسے کہ معتزلہ کا عقیدہ ہے۔ جب کہ تیسرے گروہ کا عقیدہ ہے کہ اعمال اللہ تعالیٰ کی مخلوق نہیں ہیں۔ یہ لوگ معتزلی بھی ہیں اور امامت کا عقیدہ بھی رکھتے ہیں۔

[2] حسن بن محمد بن حنفیہ نے سب سے پہلے مسئلہ ارجاء پر کتاب لکھ کر قدریہ وغیرہ کا رد کیا ہے۔

ہو سکے ۔ وگرنہ کتابوں میں منقولات میں سے جو کچھ خالی ذکر کیا گیا ہوتا ہے' اس سے استدلال کرنا جائز نہیں؛ کیونکہ یہ بات معلوم شدہ ہے کہ ایسی روایات میں بہت ساری جھوٹی روایات بھی ہیں ۔

دوسری بات: محدثین کرام جانتے ہیں کہ یہ روایت جھوٹ ہے؛ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول یہ اثر آپ پر جھوٹ ہے۔ اس کی کوئی معروف سند نہیں ۔ اس قسم کی حکایات بلا اسناد ہی ذکر کی جاتی ہیں ۔ اور ان کو روایت کرنے والے بھی مجہولات کے دلدادہ لوگ ہوتے ہیں؛ جو ایسا کلام کرتے ہیں جس کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی ۔ اور پھر اسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما یا حضرت علی رضی اللہ عنہ کا کلام قرار دیتے ہیں۔ یہ بھی اسی جنس سے ہے۔ [اس قسم کی روایات بیان کرنا جاہل صوفیا کا کام ہے۔ جیسے صوفیاء روایت کرتے ہیں کہ]: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر رضی اللہ عنہ صدیق باتیں کیا کرتے تھے اور میں ان کے پاس یوں بیٹھا رہتا جیسے کوئی حبشی ہو۔ اس روایت کے حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر جھوٹ ہونے پر تمام اہل علم کا اتفاق ہے۔

تفسیری اقوال آپ نے حضرت ابن مسعود اور صحابہ و تابعین کی ایک کثیر جماعت سے اخذ کیے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نقل کردہ تفسیری اقوال کسی کتاب میں موجود نہیں ۔ آپ سے بہت کم تفسیری اقوال نقل کیے گئے ہیں، ابو عبدالرحمٰن سلمی حقائق التفسیر میں جو اقوال جعفر صادق رحمہ اللہ سے نقل کرتے ہیں وہ بالکل جھوٹ ہیں؛ جیسا کہ دوسرے لوگوں نے بھی حضرت جعفر رحمہ اللہ پر جھوٹ بولا ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے یہ بیان کر چکے ہیں ۔

[حضرت علی رضی اللہ عنہ اور علم تصوف]:

[**اشکال**] : شیعہ مصنف لکھتا ہے: ''علم طریقت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہے۔ تمام صوفیہ خرقہ کو بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔''

[**جواب**] : پہلا جواب: ہم کہتے ہیں: تمام اہل معرفت اور حقائق ایمان کے جانکار جو کہ امت میں سچائی و امانت کے ساتھ مشہور ہیں؛ وہ تمام حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی حضرت علی رضی اللہ عنہ پر تقدیم پر متفق ہیں۔ اور یہ کہ آپ اس امت میں حقائق ایمان اور احوال عرفان کو سب سے زیادہ جانتے تھے۔ تو پھر وہ ان حقائق سے -جنہیں شیعہ بھی افضل امور میں سے مانتے ہیں- کتنے دور ہیں جو آپ کی طرف لوگوں کے منسوب کردہ ایک لباس کی وجہ سے آپ کو تقدیم [اور فضیلت] دیتے ہیں۔

❀ صحیحین میں مروی ہے کہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((إِن اللهَ لا ينظر إِلى صورِكم وأموالِكم ، وإِنما ينظر إِلى قلوبِكم وأعمالِكم))

''بیشک اللہ تعالیٰ نہ ہی تمہاری صورتوں کو دیکھتے ہیں اور نہ ہی تمہارے اموال کو دیکھتے ہیں ۔ بیشک اللہ تعالیٰ تمہارے دلوں کو اور اعمال کو دیکھتے ہیں۔''

دوسری بات: خرقہ جات کی تعداد بہت ہے، مگر مشہور دو خرقے ہیں:

۱۔ ایک خرقہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی جانب منسوب ہے۔

۲۔ دوسرے خرقہ کی نسبت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف کی جاتی ہے۔

جو خرقہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی جانب منسوب ہے اس کی دو اسناد ہیں ایک اُویس قرنی تک اور دوسری سند ابو مسلم خولانی تک

پہنچتی ہے۔

جس خرقہ کی نسبت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف کی جاتی ہے اس کی اسناد حضرت حسن بصری رحمہ اللہ تک پہنچتی ہے۔ متاخرین اسے معروف کرخی رحمہ اللہ تک پہنچاتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جنید سری سقطی کی صحبت میں رہے ہیں۔ اور سری سقطی بلا ریب معروف کرخی کی صحبت میں رہے ہیں۔ اس سے آگے سند کا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے۔ بعض اوقات وہ کہنے لگتے ہیں کہ معروف کرخی رحمہ اللہ علی بن موسیٰ رضا رحمہ اللہ کی صحبت میں رہے تھے۔ یہ بات قطعی طور پر باطل ہے۔ وجہ بطلان یہ ہے کہ معروف کرخی کے حالات نقل کرنے والے مصنفین اس کی کوئی متصل سند ذکر نہیں کرتے۔

صوفیاء کا قول ہے کہ حسن بصری رحمہ اللہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی صحبت سے فائدہ اٹھایا تھا۔ یہ باتفاق اہل معرفت باطل ہے۔ کیونکہ اہل علم کا اجماع ہے کہ حضرت حسن رحمہ اللہ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ہم نشینی کا شرف حاصل نہیں ہوا۔ بلکہ آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھیوں سے علم حاصل کیا تھا۔ آپ نے احنف بن قیس' قیس بن عباد اور دوسرے لوگوں سے استفادہ کیا تھا۔ اہل صحیح نے ایسے ہی روایت کیا ہے۔

باقی رہی یہ روایت کہ علی جب بصرہ میں داخل ہوئے تھے تو وہاں جتنے افسانہ گو تھے سب کو نکال دیا صرف حسن کو رہنے دیا۔ تو اس کے صریح جھوٹ ہونے پر اہل علم کا اتفاق ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ جب مسجد میں داخل ہوئے تو وہاں پر ایک قصہ گو کو پایا جو قصہ بیان کر رہا تھا۔ ابو حاتم نے اپنی کتاب ''الناسخ والمنسوخ'' میں نقل کیا ہے:

''حدثنا الفضل ابن دکین ' حدثنا سفیان 'عن ابی حصین 'عن ابی عبد الرحمن السلمی ' قال:إنتهی عليٌ إلی قاص و هو يقص؛ فقال: أعلمت الناسخ والمنسوخ ؟ قال :لا۔ قال: هلكت و أهلكت ۔''

'' حضرت علی رضی اللہ عنہ ایک قصہ گو کے پاس پہنچے جو کہ قصہ بیان کر رہا تھا۔ آپ نے پوچھا: کیا تم ناسخ اور منسوخ بھی جانتے ہو؟ کہنے لگا نہیں۔ فرمایا: خود بھی ہلاک ہوئے اور لوگوں کو بھی ہلاک کر دیا۔

[حسن بصری نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد تحصیل علم کا آغاز کیا تھا، حالانکہ انھوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو خطبہ دیتے ہوئے دیکھا تھا]۔ ابن الجوزی نے حسن بصری کے فضائل و مناقب کے بارے میں ایک مستقل کتاب تصنیف کی ہے۔ اور ابو عبداللہ محمد بن عبدالواحد المقدسی نے بھی ایک کتاب ان لوگوں کے بارے میں لکھی ہے جن کی صحابہ کرام سے ملاقات ہوئی ہے۔ حضرت حسن رحمہ اللہ کے متعلق اخبار تاریخ البخاری' اور اسانید خرقہ کی کتابوں میں موجود ہیں۔ چونکہ ہمارے پاس بھی اس کی کچھ اسناد ثابت ہیں تو میں نے ان کو بیان کر دیا تاکہ حق اور باطل واضح ہو جائے۔

صحابہ کرام میں سے ہر ایک سے؛ جو کہ مختلف شہروں میں جا کر آباد ہو گئے تھے؛ لوگوں نے دین و ایمان اخذ کیا۔ مشرق و مغرب کے اکثر مسلمانوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کچھ بھی استفادہ نہیں کیا۔ اس لیے کہ آپ مدینہ میں سکونت پذیر تھے۔

اسلامی شہروں کے عباد و زہاد نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سے علوم حاصل کیے جن کو انہوں نے دیکھا تھا۔ پھر ان بیانات کی روشنی میں یہ بات کہنا کس حد تک درست ہے کہ اہل زہد و تصوف کا طریقہ دیگر صحابہ کو چھوڑ کر صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ماخوذ

ہے؟ زہد کے بارے میں متعدد کتب تصنیف کی گئی ہیں ۔ چند کتب کے نام ملاحظہ ہوں ۔

۱۔امام احمد کی کتاب الزہد ۲۔ابن المبارک کی کتاب الزہد

۳۔کتاب الزہد وکیع بن جراح ۴۔کتاب الزہد ہناد بن السری

اور وہ کتابیں جن میں زہاد وعباد کے حالات وواقعات ہیں'ان میں:

۵۔حلیۃ الاولیاء ۶۔صفۃ الصفوۃ۔اور دیگر کتابیں۔

مذکوہ بالا کتب میں مہاجرین و انصار صحابہ نیز تابعین کے بہت سارے اقوال مذکور ہیں۔ان کتب میں زہد سے متعلق حضرت علی رضی اللہ عنہ کے جو اقوال واحوال مذکور ہیں وہ کسی طرح بھی حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما ومعاذ وابن مسعود وابی بن کعب وابوذر و ابوامامہ ودیگر صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے اقوال سے زیادہ نہیں ہیں۔

فصل:

[حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فصاحت و بلاغت]

[اشکال] : شیعہ مصنف لکھتا ہے:''حضرت علی رضی اللہ عنہ فصاحت کا سر چشمہ تھے۔ یہاں تک کہا گیا ہے کہ:''آپ کا کلام مخلوقات کے کلام سے بہتر اور کلام خالق سے کم تر تھا۔خطباء نے آپ سے ہی خطابت سیکھی تھی۔''

[جواب] : ہم کہتے ہیں: بلاشبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ صحابہ میں بہت بڑے خطیب تھے۔ علاوہ ازیں حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما و ثابت بن قیس بن شماس رضی اللہ عنہ بھی فن خطابت میں مہارت رکھتے تھے؛ آپ خطیب رسالت کے لقب سے معروف تھے۔ جیسا کہ حضرت حسان بن ثابت' کعب بن مالک اور عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہم اجمعین آپ کے شعراء تھے۔حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے رو برو اور آپ کی عدم موجودگی دونوں حالات میں خطبہ دیا کرتے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب موسم حج میں لوگوں کو اسلام کی دعوت دینے کے لیے نکلتے تو ابوبکر رضی اللہ عنہ آپ کیساتھ ہوتے؛اور تقریر کیا کرتے۔آپ اپنے خطاب میں لوگوں کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کی دعوت دیا کرتے تھے؛ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہ کر سنتے اور اس طرح حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی تائید فرمایا کرتے تھے۔آپ کا کلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام سے پہلے تمہید اور مقدمہ کے ہوا کرتا تھا؛ جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد [اور لوگوں میں آپ کا تعارف]مقصود ہوتا تھا۔ نہ کہ آپ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے سبقت لیتے۔

جس طرح حضرت شماس بن قیس رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف خطبہ دیا کرتے ؛اسی لئے آپ کو خطیب رسول کا لقب ملا۔ ایسے ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ لوگوں میں بڑے خطیب تھے۔مگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آپ سے بڑے خطیب تھے جیسا کہ خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس بات کا اعتراف تھا۔آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر ایسا بلیغ خطبہ دیا تھا 'جس سے مسلمانوں کے دل اسلام پر ثابت رہے ۔حالانکہ اس سے پہلے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی وجہ سے لوگوں میں سخت اضطراب پایا جاتا تھا۔اس لیے کہ یہ مصیبت ہی اتنی بڑی تھی جس نے انہیں گھیر لیا تھا۔

جب رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو رسول اللہ ﷺ بیٹھے ہوئے تھے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہوکر لوگوں میں خطبہ دینا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ بعض لوگوں کو یہ خیال گزرا کہ آپ ہی اللہ کے رسول ہیں؛ یہاں تک کہ بعد میں معلوم ہوگیا کہ بیٹھی ہوئی ہستی رسول اللہ ﷺ ہیں۔

آپ رسول اللہ ﷺ کے وفود کی ملاقات کے لیے نکلتے؛ اور ان سے خطاب کرتے؛ اور رسول اللہ ﷺ کی عدم موجودگی میں بھی خطاب کیا کرتے تھے۔ جب رسول اللہ ﷺ کی وفات ہوگئی تو آپ نے اس وقت بھی ایک خطبہ دیا۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے سقیفہ بنی ساعدہ کے دن بڑا بلیغ خطبہ دیا تھا جس سے تمام حاضرین کو فائدہ ہوا۔ یہاں تک کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے سقیفہ کے دن بڑا عمدہ خطبہ تیار کیا تھا۔ مگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جب گفتگو کی تو وہ مجھ سے زیادہ حلیم اور باوقار ثابت ہوئے۔ اللہ کی قسم! آپ نے میرے تیار کردہ خطبہ کا ایک بھی پسندیدہ جملہ باقی نہ چھوڑا بلکہ وہ فی البدیہہ کہہ سنایا اور اس سے کچھ بہتر ہی کہا ہوگا۔ [1]

حضرت زیادہ بن ابی لوگوں میں سب سے زیادہ فصیح و بلیغ خطیب تھے۔ لوگوں نے حضرت زیاد کے خطبات لکھے ہوئے ہیں۔ ایسے ہی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بھی خطیب تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا لوگوں میں سب سے بڑی خطیب تھیں۔ یہاں تک کہ احنف بن قیس نے کہا ہے کہ: ''میں نے ابوبکر و عمر اور عثمانِ و علی رضی اللہ عنہم کے خطبات سنے؛ لیکن میں مخلوق میں سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بڑھ کر کسی کا مسکت اور دل اندوز خطاب نہیں سنا۔'' [2]

اسلام سے پہلے بھی اور اسلام کے بعد بھی عربوں میں بہت سارے خطباء اور فصحاء تھے۔ ان میں سے اکثر تعداد نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کوئی خطابت نہیں سیکھی۔ نہ انھوں نے اس باب میں ان سے کچھ استفادہ کیا تھا۔

پھر کسی کی یہ بات کہ'' آپ فصاحت کا منبع تھے'' جھوٹ کے سوا اور کیا ہوسکتی ہے۔ اور اگر رسول اللہ ﷺ کے علاوہ کوئی بھی نہ ہوتا تو بھی آپ لوگوں میں سب سے بڑے خطیب تھے؛ آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایک لفظ تک نہیں سیکھا۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ نہج البلاغۃ کے اکثر خطبے من گھڑت ہیں [3] وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا کلام نہیں ہوسکتے۔ بلکہ آپ پر جھوٹ گھڑا گیا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان و منزلت اور قدر اس سے بہت بلند ہے کہ وہ اس قسم کا کلام کریں۔ مگر شیعہ نے مدح گوئی کے نقطہ خیال سے ان کو وضع کیا تھا حالانکہ ان میں صداقت و مدح دونوں کا کوئی عنصر شامل نہیں ہے۔

[اشکال]: شیعہ مصنف کا یہ قول کہ ''حضرت علی رضی اللہ عنہ کا کلام کلام مخلوق سے بالا ہے۔''

[جواب]: یہ قول [نبی کریم ﷺ کی گستاخی پر مشتمل ہے اور] بہت بڑی غلط بیانی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا کلام ہر کلام سے بلند و بالا ہے۔ اور یہ دونوں کلام مخلوق ہیں۔ یہ اسی طرح ہے جیسے ابن سبعین نے کہا تھا: یہ کلام ایک لحاظ سے انسانی کلام سے ملتا جلتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسانی کلام کو کلام الٰہی کے مماثل قرار دیا جائے، ظاہر ہے کہ ایک مسلم اس طرح

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الحدود۔ باب رجم الحبلی فی الزنا (حدیث:٦٨٣٠)۔

[2] مستدرك حاکم(٤/ ١١)

[3] ان خطبات کا جامع محمد بن حسین رضی المتوفی ٤٠٦ھ ہے۔ یہ قطعی بات ہے کہ رضی نے اپنے بھائی علی بن حسین مرتضیٰ المتوفی ٤٢٦ھ کے اشتراک سے ان خطبات میں اضافہ کیا تھا۔ خصوصاً وہ جملے جو صحابہ کبار رضی اللہ عنہم کی گستاخی سے متعلق ہیں وہ یقیناً بے اصل اور من گھڑت ہیں۔

نہیں کہہ سکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کلام میں جو باتیں صحیح ہیں، وہ دوسروں کے کلام میں بھی پائی جاتی ہیں۔مگر صاحب نہج البلاغۃ کی ستم ظریفی پر ہے کہ اس نے بہت سارے دوسرے لوگوں کے کلام کو آپ کی طرف منسوب کردیا ہے۔بعض باتیں جو آپ کی طرف منسوب ہیں وہ درست ہیں۔ نہج البلاغۃ میں مندرج بعض باتیں بجائے خود صحیح ہیں؛ مگر دراصل وہ آپ کی فرمودہ نہیں ہیں، بلکہ دوسروں کا کلام ہے۔مشہور ادیب جاحظ کی کتاب ''البیان والتبیین'' میں کثرت سے دوسرے ادباء کا کلام نقل کیا گیا ہے۔مگر صاحب نہج البلاغۃ اسے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ نہج البلاغۃ کے خطبات اگر فی الواقع حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فرمودہ ہوتے تو نہج البلاغۃ کے مصنف سے پہلے ان کا بااسناد یا بے اسناد پایا جانا ضروری تھا۔ حالانکہ ان میں سے اکثر کا نہج البلاغۃ کے مصنف سے قبل کہیں پتہ نہیں ملتا۔اس سے ان خطبات کا جھوٹا ہونا واضح ہوتا ہے۔

فصل:

[حضرت علی رضی اللہ عنہ اور آسمانی راستہ کا علم]

[اشکال] : شیعہ مصنف لکھتا ہے:'' حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میرے گم ہوجانے سے پہلے جو پوچھنا چاہو، پوچھ لو، مجھ سے آسمان کے راستوں کے بارے میں پوچھو مجھے زمین کے راستوں سے ان کا زیادہ علم ہے۔''

[جواب] : ہم کہتے ہیں: حضرت علی رضی اللہ عنہ یقیناً یہ بات مدینہ میں نہیں کہا کرتے تھے جہاں ان کی طرح اور بھی مہاجر و انصار اہل علم صحابہ موجود تھے جنہوں نے ویسے ہی علم حاصل کیا تھا جیسے آپ نے علم حاصل کیا تھا۔اور ویسے ہی معرفت حاصل کی جس طرح آپ نے معرفت حاصل کی تھی۔ بلکہ آپ نے یہ الفاظ اس وقت فرمائے جب آپ عراق چلے گئے۔وہاں بہت سارے لوگ اسلام میں داخل ہوئے تھے جو دین کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔آپ میں ان لوگوں کے درمیان اقامت گزیں تھے جو علم دین سے بے بہرہ تھے، آپ وہاں ایک امام کی حیثیت رکھتے تھے جس پر رعایا کی تعلیم و تربیت اور فتوی دینا واجب ہوتا ہے۔آپ یہ بات ان لوگوں سے اس لیے فرمایا کرتے تھے کہ :لوگ علم حاصل کریں' اور فتوی پوچھیں ۔جس طرح وہ صحابہ کرام جو بہت بعد تک زندہ رہے؛ اور لوگ ان کے علوم کی طرف محتاج ہوئے۔انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ احادیث روایت کی ہیں جو خلفاء اربعہ یا دوسرے اکابر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے روایت نہیں کیں۔اس لیے کہ پہلے کے لوگ ان کو نقل کرنے سے مستغنی تھے۔اس لیے کہ اس دور میں تمام لوگوں نے ایک ہی مصدر سے تعلیم پائی تھی۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت ابن عمر؛ ابن عباس' عائشہ' انس و جابر' ابوسعید رضی اللہ عنہم اجمعین اور اس طرح کے دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے وہ روایات نقل کی گئی ہیں وہ جو حضرت علی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما سے منقول نہیں ہیں۔جب کہ حضرت عمر و حضرت علی رضی اللہ عنہما ان بقیہ صحابہ کرام سے زیادہ بڑے عالم تھے۔لیکن لوگوں کو ان کے علوم کی ضرورت محسوس ہوئی ؛ اور اس لیے بھی کہ ان کی تاریخ وفات متاخر ہے۔انہیں ان تابعین نے پایا جو ان سے پہلے لوگوں کو نہیں پاسکے تھے۔پس انہیں سوال کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔اور وہ لوگ یہ سمجھے کہ انہیں سمجھائیں اور حدیث بیان کریں۔

پس حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ فرمانا:'' مجھ سے پوچھ لو۔'' یہ بھی اسی باب سے تعلق رکھتا۔ یہ بات ابن مسعود' معاذ' ابی بن کعب'

ابو درداء، اور سلمان اور ان کے امثال رضی اللہ عنہم نے ارشاد نہیں فرمائی کہا کہ حضرت عمر و عثمان رضی اللہ عنہما ایسی بات ارشاد فرماتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ ایسے نہ تھے جو بلا وجہ سوال کرتے پھریں۔ پس حضرت معاذ، ابی بن کعب اور ابن مسعود رضی اللہ عنہم اور ان سے کم مرتبہ کے صحابہ بھی کبھی سوال ایسے سوال نہیں کیا کرتے تھے۔ ہاں جب آپ سے کسی بارے میں فتویٰ پوچھا جاتا تو جس طرح دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جواب دیا کرتے تھے ایسے آپ بھی جواب دیا کرتے تھے۔

[باقی رہا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب] یہ قول کہ: ''اَنَا اَعْلَمُ بِطُرُقِ السَّمَآءِ۔''

[جواب]: یہ ایک باطل بات ہے جو کہ کوئی عاقل انسان نہیں کہہ سکتا۔ اور نہ ہی صحابہ و تابعین میں سے کوئی ایک اپنے بدن کیساتھ آسمانوں پر چڑھا ہے۔ [اور نہ ہی کسی نے اس قسم کا کوئی دعویٰ کیا]۔

[اگر فی الواقع حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ الفاظ فرمائے تھے کہ ''اَنَا اَعْلَمُ بِطُرُقِ السَّمَآءِ'' تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ میں جانتا ہوں کہ آسمان والے کن اوامر و نواہی پر عمل کر کے تقرب حاصل کرتے ہیں۔ نیز یہ معنی کہ میں عبادت کرنے کے طریقے اور جنت و ملائکہ سے بخوبی آگاہ ہوں، جب کہ زمین پر مجھے ان چیزوں کا علم حاصل نہیں۔ یہ مراد نہیں کہ آپ بجسد عنصری آسمان پر چڑھ گئے ہیں۔ کوئی مسلم یہ بات نہیں کہتا۔ یہ روایت موضوع ہے اور اس کے اسناد کا کچھ پتہ نہیں۔ ایسی روایات ان غالی شیعہ کی گمراہی کا سبب بنتی ہیں جو ان سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نبوت پر احتجاج کرتے ہیں اس سے بڑھ کر بہت سے عوام اور عابد و زاہد اپنے شیوخ کے بارے میں بھی اس قسم کے اعتقادات رکھتے ہیں]۔

فصل:

[حضرت علی رضی اللہ عنہ مرجع صحابہ؟]

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ''صحابہ مشکل ترین دینی مسائل میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف رجوع کیا کرتے تھے؛ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بہت سے فیصلے مسترد کر دیے تھے۔ یہ دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا اگر علی نہ ہوتے تو عمر رضی اللہ عنہ ہلاک ہو جاتا۔''

[جواب]: ہم کہتے ہیں: صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین مشکل ترین یا واضح کسی طرح کے بھی مسائل میں کبھی صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف رجوع نہیں کیا کرتے تھے اور نہ ہی کسی دوسرے فرد واحد کی طرف رجوع کرتے۔ جب کوئی نیا مسئلہ پیش آتا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مشورہ کیا کرتے تھے؛ آپ حضرت علی، عثمان، ابن عوف، ابن مسعود، زید بن ثابت اور ابو موسیٰ رضی اللہ عنہم اجمعین کیساتھ مشورہ فرمایا کرتے تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کیکم عمر ہونے کے باوجود ان سے بھی مشورہ فرماتے۔ اور سوال کرنے والے کبھی حضرت علی سے سوال کرتے تو کبھی ابی بن کعب سے اور کبھی حضرت عمر سے۔ رضی اللہ عنہم اجمعین۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نسبت زیادہ سوال کیے گئے، اور آپ نے جس قدر مشکل مسائل حل کیے تھے حضرت علی رضی اللہ عنہ طویل عرصہ میں بھی اس قدر مسائل کی گرہ کشائی نہ کر سکے تھے۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بڑے عالم تھے؛ بلکہ بلا شک و شبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ آپ سے بڑے عالم تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان مسائل کے پوچھنے کی ضرورت ان لوگوں کو پیش آئی جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کا زمانہ نہیں پا سکے۔

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے بارے میں کسی ایک نے بھی یہ نہیں لکھا کہ آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علوم سے استفادہ کیا ہو؛ بلکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آپ کے علوم سے استفادہ کیا ہے؛ جیسا کہ حدیث نماز توبہ کا مسئلہ اور دیگر مسائل۔

[حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فیصلے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا رد]:

شیعہ مصنف کا یہ قول کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بہت سے فیصلے مسترد کر دیے تھے۔ یہ دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا اگر علی نہ ہوتے تو عمر رضی اللہ عنہ ہلاک ہو جاتا۔''

[جواب]: بشرطیکہ اس قول کی صحت ثابت بھی ہو جائے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ فاروق نے صرف ایک مسئلہ میں یہ فرمایا تھا کہ اگر علی نہ ہوتے تو عمر رضی اللہ عنہ ہلاک ہو جاتا۔'' اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس قسم کے الفاظ ان لوگوں کے حق میں بھی کہہ دیا کرتے تھے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فروتر درجہ کے لوگ ہوا کرتے تھے۔ جس عورت نے مہر کے مسئلہ میں آپ سے تکرار کی تھی اس کے بارے میں آپ نے فرمایا تھا: ''مرد نے غلطی کھائی اور عورت کی بات صحیح نکلی۔''❀

اس کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حق میں علم و دین کے الہام کی خبر دی تھی؛ ایسی خبر حضرت عثمان، علی، طلحہ زبیر رضی اللہ عنہم اجمعین میں سے کسی ایک کے بھی حق میں وارد نہیں ہوئی۔

سنن ترمذی میں حضرتِ ابن عمر سے روایت ہے: بیشک نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''إِن اللّٰہ جعل الحق علی لِسانِ عمر و قلبِهِ۔''

''بیشک اللہ تعالیٰ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دل و زبان پر حق کو جاری کر دیا ہے۔''

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''لوگوں کو کوئی بھی مسئلہ ایسا پیش نہیں آیا جس کے بارے میں لوگوں نے بھی کوئی بات کی ہو اور حضرت عمر نے بھی اپنی رائے کا اظہار کیا ہو' مگر قرآن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے کے مطابق نازل ہوا۔''

سننِ أبي داود میں حضرت ابوذر سے مروی ہے آپ فرماتے ہیں: ''میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا:'' بیشک اللہ تعالیٰ نے حق عمر کی زبان پر رکھ دیا ہے' اور آپ وہی حق بولتے ہیں۔''

صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اُمم سابقہ جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں' ان میں مُلہم من اللہ ہوا کرتے تھے؛ جو کہ انبیاء نہیں ہوا کرتے تھے، اگر میری امت میں ایسا کوئی شخص ہوا تو وہ عمر رضی اللہ عنہ ہیں۔'' [سبق تخریجه]

ابن وہب محدثون کی تفسیر میں فرماتے ہیں: ملہمون؛ یعنی جن کی طرف الہام کیا جاتا ہو۔

صحیحین میں ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اے ابن خطاب! اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! جب بھی شیطان تمہیں کسی وادی میں ملتا ہے تو وہ تمہارا راستہ چھوڑ کر دوسری وادی میں بھاگ جاتا ہے۔'' [ایسا حضرت عمر کی حق گوئی و حق شناسی کی وجہ سے تھا]۔

[بہر حال حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بڑے عالم ہونے کے باوجود عدل وانصاف کی بنیاد پر یہی توقع ہے کہ حق کسی کے بھی ساتھ ہو' آپ اس کی طرف رجوع کرنے والے تھے۔ اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کوئی تخصیص نہیں]

❀ تفسیر ابن کثیر ۲/ ۲۱۲۔ مسند احمد برقم ۲۸۵۔ اس کی سند جید اور قوی ہے۔ نیز دیکھیں: سنن الترمذی' ابن ماجه اور ابو داؤد اور سنن کبری۔

فصل:

[حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بہادری]

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ''حضرت علی رضی اللہ عنہ سب لوگوں سے زیادہ شجاع تھے۔ آپ کی تلوار سے اسلام کے قواعد وارکان ایمان میں پختگی آئی۔ آپ کبھی بھی کسی بھی موقع پر پسپا نہیں ہوئے۔ اور نہ ہی کبھی اپنے کسی قرابت دار کو تلوار سے قتل کیا۔ اور تلوار ہی سے آپ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے تکالیف کو دور کیا۔ آپ دوسرے لوگوں کی طرح جنگ سے کبھی نہیں بھاگے تھے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بستر پر رات گزاری تو اپنی جان پر کھیل کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت فرمائی۔ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر لپیٹ کر سو گئے۔ مشرکین نے آپ کو ہی محمد صلی اللہ علیہ وسلم گمان کیا۔ حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے پر تمام مشرکین کا اتفاق ہو گیا تھا؛ اور انہوں نے مسلح ہو کر آپ کا گھیراؤ کر لیا تھا۔ وہ [نماز] فجر کا انتظار کر رہے تھے تا کہ آپ کو کھلے عام قتل کریں۔ اور آپ کا خون قبائل میں بٹ جائے۔ اور بن ہاشم دیکھ لیں کہ قاتلین میں ہر قبیلہ کے لوگ موجود ہیں؛ اور ان کے لیے اتنی بڑی تعداد کے قتل میں شریک ہونے کی وجہ سے خون کا بدلہ لینا ممکن نہ رہے۔ اور ہر قبیلہ اپنے افراد کی حفاظت کے لیے مستعد رہے۔ یہ [تدبیر] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خون کی حفاظت کا سبب بن گئی۔ سلامتی پوری ہوئی۔ اس غرض نے ان کو ایک ملت کی لڑی میں پرو دیا تھا۔ لیکن جب لوگوں نے صبح کی اور انہوں نے آپ کی یہ بہادری دیکھی تو انہیں اپنے آپ پر غصہ آیا' اور آپ کو پہچان لینے کے بعد وہ لوگ بکھر گئے۔ وہ اس حالت میں پلٹے کہ ان کے تمام حیلے ناکام ہو چکے تھے اور ان کی تدبیریں ٹوٹ چکی تھیں۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جواب]: اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بہادر ترین صحابہ میں سے تھے۔ جن کی شجاعت سے اللہ تعالیٰ نے نصرت اسلام کی خدمت لی ہے۔ آپ کا شمار مہاجرین و انصار کے بڑے بزرگ سابقین اولین میں سے ہوتا ہے۔ آپ ان لوگوں کے سردار ہیں جو اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان لائے اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا؛ اور اپنی تلوار سے کئی کفار کو قتل کیا۔ مگر یہ آپ کی خصوصیت نہیں، بلکہ متعدد صحابہ اس میں آپ کے سہیم و شریک تھے۔ اس وجہ سے دوسرے بہت سارے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر آپ کی فضیلت ثابت نہیں ہو سکتی۔ تو پھر چہ جائے کہ باقی خلفاء راشدین پر آپ کی فضیلت ثابت ہو جائے' خلیفہ کیلئے متعین ہونا تو دور کی بات ہے۔

[اشکال]: ''شیعہ مصنف کا یہ کہنا کہ: ''حضرت علی رضی اللہ عنہ تمام لوگوں میں سب سے زیادہ بہادر تھے۔''

[جواب]: یہ بات جھوٹ ہے۔ بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اشجع الناس [تمام لوگوں سے بہادر] تھے۔ جیسا کہ صحیحین میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے آپ فرماتے ہیں کہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں میں سب سے زیادہ خوبصورت سب سے زیادہ سخی؛ اور سب سے زیادہ بہادر تھے۔ ایک روز اہل مدینہ گھبرا کر جدھر سے آواز آرہی تھی ادھر کو چل پڑے، کیا دیکھتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ابوطلحہ کے گھوڑے پر سوار تلوار گلے میں ڈالے اس طرف سے واپس آتے ہوئے ملے؛ آپ پہلے ہی اس آواز کی سمت چل پڑے تھے۔ آپ فرما رہے تھے ''مت گھبراؤ'' [صحیح بخاری (ح:۲۹۰۸)؛ مسلم (ح:۲۳۰۷)]

امام بخاری فرماتے ہیں: آپ واقعہ کی خبر لیکر واپس آرہے تھے کہ لوگوں سے ملاقات ہوئی۔

مسند میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ:

''جب سخت خطرہ کا موقع ہوتا تو آپ سب سے آگے آگے دشمن کے قریب تر ہوا کرتے تھے۔'' [مسند احمد(۱/ ۸۶)]

شجاعت [بہادری] کی تفسیر دو چیزوں سے کی جاسکتی ہے:

۱۔ قوت قلب اور خطرات میں ثابت قدم رہنے کا نام۔

۲۔ جسمانی طور پر سخت جنگ وقتال کرنا' بہت سارے لوگوں کو قتل کرنا؛ تا کہ ایک عظیم مقتل سجا دیا جائے۔

پہلی چیز شجاعت ہے۔ جب کہ دوسری چیز جسمانی قوت پر دلالت کرتی ہے۔ اور ایسا ہرگز نہیں ہوتا کہ جس کا بدن قوی ہو اس کا دل بھی قوی ہے' یا اس کے برعکس معاملہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ آپ مشاہدہ کر سکتے ہیں کہ کوئی انسان بہت سخت جنگ وجدال کرتا ہے اور بہت سارے لوگوں کو قتل کرتا ہے؛ لیکن یہ اس وقت جب کوئی اسے حفاظت فراہم کرنے والا ہو۔ اور اگر اسے خوف محسوس ہوجائے تو پھر اس پر بزدلی چھا جاتی ہے۔ اور اس کا دل ٹوٹ جاتا ہے۔ اور آپ کسی ایسے انسان کو بھی دیکھ سکتے ہیں جو ثابت القلب ہو' مگر اس نے اپنے ہاتھ سے بہت سارے لوگوں کو قتل نہ کیا ہو۔ ایسا انسان خوف کے اوقات میں ثابت قدم رہنے والا اور انتہائی خطرناک موڑ پر پیش قدمی کرنے والا ہوتا ہے۔ جنگی سالاروں اور قیادت میں اور ہراول دستہ کے لوگوں میں اس خصلت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے کہ پیش قدمی کرنے والا جب بہادر اور ثابتِ قلب ہو؛ تو وہ آگے ہی بڑھتا رہتا ہے؛ پیچھے نہیں ہٹتا۔ پس اس کے ساتھی بھی جنگ وقتال کرتے ہیں ۔ اور اگر بزدل اور کمزور ڈرپوک ہو تو وہ پسپا ہوجاتا ہے' آگے نہیں بڑھ سکتا' اور نہ ہی ثابت قدم رہ سکتا ہے۔ بھلے اس کا بدن کتنا ہی طاقتور کیوں نہ ہو۔ [شدید گرفت اور جنگی مہارت بھی شجاعت میں داخل ہے]۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شجاعت ہر لحاظ سے کامل تھی؛ وہ شجاعت جو میدان جنگ میں سالار لشکر سے مطلوب ہوتی ہے۔ اس انتہائی شجاعت کے باوجود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابی بن خلف کے سوا کسی کو قتل نہیں کیا تھا۔ اسے غزوۃ احد میں قتل کیا تھا۔ اس سے پہلے یا بعد آپ نے اپنے ہاتھ سے کسی کو قتل نہیں کیا۔ [سیرۃ ابن ھشام(ص:۳۸۹)]

حالانکہ آپ کی شجاعت کا یہ عالم تھا کہ آپ تمام صحابہ سے زیادہ بہادر تھے۔ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جنگ حنین میں منتشر ہو گئے تھے۔ مگر آپ خچر پر سوار ہوکر بدستور دشمن کی طرف بڑھے جارہے تھے۔ آپ کی خچر نہ بھاگتی تھی اور نہ ہی پیچھے ہٹتی تھی۔ اور اس کیساتھ ساتھ آپ فرماتے جارہے تھے:

" اَنَا النَّبِیُّ لَا کَذِبْ ......اَنَا ابْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبْ . "

''میں نبی ہوں اس میں کوئی جھوٹ نہیں...... میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں۔ [1]

پس آپ اپنا نام لے کر آگے بڑھ رہے تھے' جب کہ صحابہ کرام بکھر چکے تھے۔ اور دشمن مسلسل آپ کی طرف بڑھ رہا تھا۔

---

[1] صحیح بخاری۔ کتاب المغازی۔ باب قول اللہ تعالی ﴿ وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ ...... ﴾ (ح:۴۳۱۵۔۴۳۱۷)۔ صحیح مسلم ، کتاب الجهاد۔ باب غزوة حنین (حدیث:۱۷۷۶)۔

اور آپ اپنی خچر پر سوار دشمن کی طرف بڑھ رہے تھے؛ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے آپ کی خچر کی لگام تھامی ہوئی تھی۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دوسرے لوگ رسول اللہ ﷺ کی اوٹ لیا کرتے تھے' اس لیے کہ آپ ان سب سے زیادہ بہادر تھے؛ اگر چہ لوگوں میں ایسے بھی تھے جنہوں نے اپنے ہاتھوں سے آپ ﷺ سے زیادہ لوگوں کو قتل کیا تھا۔

جب امام میں قلبی شجاعت کی ضرورت ہوتی ہے تو اس میں شبہ نہیں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بھی زیادہ دلیر و بہادر تھے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت عثمان و علی' طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہم اجمعین سے بڑھ کر بہادر تھے۔ جو انسان بھی صحابہ کرام کے حالات و واقعات جانتا ہے' اسے ان باتوں کا علم ہے۔

اس لیے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ آغاز اسلام ہی سے ان خطرات میں گھرے رہے جن میں نبی ﷺ مبتلا تھے۔ مگر کبھی بزدلی دکھائی نہ بے قراری کا اظہار کیا اور نہ ہی پیچھے ہٹے۔ بلکہ خطرات و مہالک میں کود کر اپنی جان پر کھیل کر نبی کریم ﷺ کی حفاظت کرتے۔ مشرکین سے مال و جان اور زبان سے جہاد میں حصہ لیتے۔ یہ تمام باتیں گزر چکی ہیں۔

جنگ بدر میں سائبان کے نیچے نبی کریم ﷺ کے ہم راہ تھے؛ حالانکہ سب یہ بات جانتے تھے کہ مشرکین کا اصل ہدف رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی ہے۔ مگر آپ بالکل ثابت قلب تھے' نبی کریم ﷺ کی مدد و نصرت کر رہے تھے۔ جب نبی کریم ﷺ کھڑے ہوکر اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرنے لگے تو آپ فرما رہے تھے:

" اللهم أنجزلي ما وعدتني ؛ اللهم إن تهلك هذه العصابة ' لا تعبد؛ اللهم اللهم . "

''اے اللہ! جو وعدہ مجھ سے کیا ہے اس کو پورا کر۔ اے اللہ! اگر یہ مختصر سی جماعت ہلاک ہوگئی تو دنیا میں تیری عبادت کرنے والا کوئی نہ ہوگا؛ اے اللہ! اے اللہ! ......۔'' [صحيح مسلم (ح: ١٧٦٣)]

ابوبکر رضی اللہ عنہ برابر کہتے جا رہے تھے: ''اے اللہ کے رسول! آپ کی یہ دعا کافی ہے، اللہ تعالیٰ آپ سے کیے ہوئے وعدوں کو پورا کریں گے۔ اس سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے یقین کامل؛ اللہ تعالیٰ کے وعدہ پر اعتماد اور عزم و ثبات؛ شجاعت و بہادری پر روشنی پڑتی ہے؛ اور قدرتی بہادری پر ایمانی شجاعت و بہادری زیادہ تھی۔

رسول اللہ ﷺ کی حالت آپ سے زیادہ کامل تھی' اور آپ کا مقام ابوبکر رضی اللہ عنہ کے مقام سے اعلی تھا۔ اور معاملہ ایسے نہیں جیسا کہ بعض جاہل لوگ گمان کرتے ہیں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا مقام رسول اللہ ﷺ کے مقام سے اعلی ہے۔ نعوذ باللہ من ذلک۔۔ اس موقعہ پر دعا کرنے سے نبی کریم ﷺ کی شان میں کوئی قدح وارد نہیں ہوتی۔ جیسا کہ بعض لوگوں نے اس بارے میں گفتگو کی ہے۔ اس میں ابن عقیل اور دوسرے لوگوں نے بھی بحث کی ہے۔ [اس موقعہ پر دعا کرنا] یہ آپ کے کمال اور جامعیت کی دلیل ہے۔ آپ ہر مقام پر عظمت و رفعت کی انتہائی بلندیوں پر فائز ہیں۔

یہاں پر مقصود یہ بیان کرنا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے بعد تمام لوگوں میں سب سے بہادر تھے۔

[وفاتِ رسول ﷺ اور حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے کارنامے]:

جب سالار رسل ﷺ نے رحلت فرمائی تو مسلمانوں پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ ہر شخص اپنی جگہ بے چین تھا اور ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا؛ عقلیں کام نہیں کر رہی تھیں۔ ہر طرف اضطراب ہی اضطراب تھا۔ کوئی آپ کی موت کا انکار کر رہا تھا۔ اور

کوئی اپنی جگہ پر بیٹھ کر رہ گیا تھا۔ اور کوئی اوسان باختہ ہو چکا تھا اسے کسی گزرنے والے یا سلام کرنے والے کا کوئی پتہ نہیں چل رہا تھا۔ کوئی رو رہا تھا اور اس کی ہچکی بندھ گئی تھی۔ گویا کہ قیامت تھی۔ قیامت صغریٰ بپا ہو گئی۔ اکثر بدو عرب دین اسلام سے منحرف ہو گئے۔ اس مشکل ترین وقت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ صدیق صبر و یقین کی دولت سے بہرہ ور ہو کر کامل استقلال اور ثابت قلبی و بہادری کے ساتھ کھڑے ہو گئے؛ نہ آپ نے گریہ کیا؛ نہ ہی گھبرائے؛ آپ نے اور صحابہ کو بتایا کہ رسول اللہ ﷺ وفات پا چکے ہیں؛ اور اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے اپنے پاس موجود نعمتوں کا انتخاب کر لیا ہے۔ نیز آپ نے فرمایا:

''جو شخص محمد (ﷺ) کا پرستار تھا، اسے معلوم ہونا چاہیے کہ آپ وفات پا چکے ہیں اور جو اللہ کی عبادت کرتا تھا، اسے واضح ہو کہ اللہ تعالیٰ زندہ ہے اور اسے موت نہیں آئے گی۔'' پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے یہ آیت پڑھی:

﴿وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰی اَعْقَابِكُمْ وَ مَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰی عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا وَ سَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ﴾ (آل عمران ۱۴۴)

''اور محمد (ﷺ) تو صرف ایک رسول ہیں، آپ سے پہلے بہت سے رسول گزر گئے، اگر آپ وفات پا جائیں یا قتل کیے جائیں تو کیا تم دین اسلام سے منحرف ہو جاؤ گے اور جو شخص اپنی ایڑیوں کے بل پھر جائے گا تو اللہ کو کچھ بھی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔''

لوگوں نے جب یہ آیت سنی تو یوں لگتا تھا کہ انہوں نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کی تلاوت سے پہلے کبھی یہ سنی ہی نہ تھی۔ پھر کوئی بھی ایسا نہیں رہ گیا تھا جو اس آیت کی تلاوت نہ کر رہا ہو۔ پھر آپ نے ایک خطبہ کے ذریعہ ان کی ڈھارس بندھائی اور ان میں جرأت و جلادت کے جذبات پیدا کیے۔ [1]

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جب ہمیں خطاب کیا تو ہم لومڑی کی طرح بزدل تھے' آپ کی مسلسل حوصلہ افزائی نے ہمیں شیر بنا دیا۔''

نیز جیش اسامہ رضی اللہ عنہ کو روانہ کیا۔ حالانکہ لوگوں نے اس لشکر کو روکنے کا مشورہ دیا تھا۔ پھر جلد مرتدین کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔ لوگ ان کے ساتھ جنگ کی بجائے نرمی سے کام لینے اور انتظار کرنے کا مشورہ دے رہے تھے۔

پھر اس کے بعد آپ نے مانعین زکوۃ سے جنگ چھیڑ دی۔ اس کے ساتھ ہی اگر کوئی صحابی کسی مسئلہ سے لاعلم ہوتا تو آپ اسے تعلیم دیتے' اور جب کوئی کمزوری دکھاتا تو آپ اسے آشیر باد کے ذریعہ طاقتور بناتے۔ اگر لوگ تھک جاتے تو آپ انہیں ترغیب دلاتے۔ پس آپ کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ اپنے دین' علم اور وقت کو تقویت بخشی۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ انتہائی شجاعت اور کمال قوت کے باوجود حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہا کرتے تھے: ''اے خلیفہ رسول! لوگوں سے الفت و محبت کا سلوک کیجیے۔'' تو آپ فرماتے: کس بات پر ان کے ساتھ الفت کا سلوک کروں؟ کیا اپنی طرف سے گھڑے ہوئے دین پر؟ یا بے ڈھب شعروں پر؟ یہ باب بہت وسیع ہے۔ [یہاں اس کی گنجائش نہیں]۔

---

[1] صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب مرض النبی ﷺ ووفاته (حدیث: ٤٤٥٣، ٤٤٥٤)۔

امام سے مطلوب شجاعت نبی کریم ﷺ کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے زیادہ کامل کسی میں نہ تھی۔ ان کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا درجہ آتا ہے۔ جہاں تک قتل اور کفار کو تہ تیغ کرنے کا تعلق ہے، بلاشبہ اس ضمن میں دیگر صحابہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے سبقت لے گئے تھے۔ اگر ہر قتل کرنے والا ہی بہادر ہوتا ہے تو پھر دوسرے بہت سارے ایسے صحابہ بھی ہیں جنھوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے زیادہ لوگوں کو قتل کیا؛ تو وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے زیادہ بہادر ہوں گے۔ [جو شخص سیر و مغازی کے احوال و واقعات بہ امعان نظر پڑھتا ہے، وہ اس حقیقت کا اعتراف کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے۔]

حضرت انس رضی اللہ عنہ کے بھائی براء بن مالک رضی اللہ عنہ نے مبارزت طلبی کرکے سو کافروں کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ جن کے خون میں ان کے ساتھ اور لوگ بھی شریک تھے وہ اس پر مزید ہیں۔ [1]

خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں جو کفار واصل جہنم ہوئے ان کا شمار تو اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ غزوۂ موتہ میں ان کے ہاتھ میں نو تلواریں ٹوٹی تھیں۔'' [2]

اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نسبت کئی گنا زیادہ لوگوں کو قتل کیا تھا۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے اندر طبعی شجاعت کے ساتھ ساتھ دینی شجاعت بھی کمال درجہ کی تھی۔ یہ اللہ تعالیٰ پر یقین کی قوت' اور مؤمنین کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی نصرت پر ثقہ اعتماد۔ یہ شجاعت تو ہر قوت قلب والے کو حاصل نہیں ہوتی۔ یہ قوت ایمان و یقین کے زیادہ ہونے سے بڑھ جاتی ہے اور اس کے کم ہونے سے کم ہو جاتی ہے۔ جس انسان کو یقین ہو کہ وہ دشمن پر غالب آئے گا تو وہ یقیناً ایسی پیش قدمی کرتا ہے جو عام پیش قدمی کی طرح نہیں ہوتی۔ یہ بات مسلمانوں کی اپنے دشمن کے خلاف پیش قدمی اور ان کی شجاعت کے بڑے اسباب میں سے ایک تھی۔ وہ بلاشبہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی بتائی ہوئی خبر پر پختہ یقین رکھتے تھے کہ آخر کار ان لوگوں کو کامیابی ملے گی اور اللہ تعالیٰ انکے ہاتھوں پر دنیا کے شہروں کو فتح کرے گا۔

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی شجاعت کی ایک اور مثال جسے صحیحین میں حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا گیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں: میں نے عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا وہ سخت ترین بات کون سی تھی جو مشرکین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کی؟ انہوں نے فرمایا میں نے عقبہ بن ابی معیط کو دیکھا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا آپ اس وقت نماز پڑھ رہے تھے اس نے اپنی چادر آپ کی گردن مبارک میں ڈال کر آپ کا گلا بہت زور سے گھونٹنا شروع کیا اتنے میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آ گئے اور آ کر اس کو آپ سے ہٹایا اور کہا:

﴿اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ وَقَدْ جَآءَكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ مِنْ رَّبِّكُمْ﴾ [غافر ۲۸]

''کیا تم ایک آدمی کو اس لیے قتل کرتے ہو کہ وہ کہتا ہے ''میرا رب اللہ ہے'' حالانکہ یقیناً وہ تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے واضح دلیلیں لے کر آیا ہے۔'' [صحیح بخاری:ح ۸۹۲]

---

[1] مصنف عبد الرزاق، ۹٤٦۹) ، طبرانی(۱۱۷۸، ۱۱۷۹)، مستدرك حاکم(۳/ ۲۹۱)

[2] صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوة موتة من ارض الشام(حدیث:٤٢٦٦)

فصل:

[حقیقت شجاعت]

اس چیز کا جاننا ضروری ہے کہ دین میں شجاعت کی فضیلت و اہمیت جہاد فی سبیل اللہ کی وجہ سے ہے۔ وگرنہ وہ بہادری وشجاعت جس سے جہاد فی سبیل اللہ کا کام نہ لیا جائے ؛ وہ یا تو خود انسان پر وبال ہے جب وہ اس بہادری سے شیطان کی اطاعت میں مدد لے گا۔ اور یا پھر اگر اسے اللہ تعالیٰ کی قربت و اطاعت کے کاموں میں نہ صرف کرے تو اس کے لیے غیر نفع بخش ہے۔ پس حضرت علی' حضرت زبیر، حضرت خالد اور ابو دجانہ' اور براء بن مالک (رضی اللہ عنہم اجمعین) بڑے بہادر مجاہد صحابہ کرام میں سے تھے۔ اور یہ بہادری ان کے فضائل میں شمار ہونے لگی۔ اس لیے کہ انہوں نے اس بہادری سے اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد میں مدد لی ؛ اور اس وجہ سے وہ اس حمد وثنا کے مستحق ٹھہرے جو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں مجاہدین کی ثنا بیان کی ہے۔

جب یہ بات معلوم ہوگئی تو یہ بات بھی جان لینی چاہیے کہ جہاد کی ایک قسم ہاتھ سے قتال کرنا ہے۔ اور دوسری قسم دلیل و بیان اور دعوت ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَلَوْ شِئْنَا لَبَعَثْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ نَذِيرًا ۞ فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا﴾

''اور اگر ہم چاہتے تو ضرور ہر بستی میں ایک ڈرانے والا بھیج دیتے۔ پس تو کافروں کا کہنا مت مان اور اس کے ساتھ ان سے جہاد کر، بہت بڑا جہاد۔'' [الفرقان ۵۱۔ ۵۲]

اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ کفار کو قرآن سنا کر ان کے ساتھ بڑا جہاد کیا جائے۔ یہ مکی سورت کی آیات ہیں جو کہ نبی کریم ﷺ کی ہجرت سے پہلے مکہ مکرمہ میں نازل ہوئیں۔ اس وقت تک ابھی قتال کرنے کا حکم نہیں ملا تھا۔ اور نہ ہی اس کی اجازت دی گئی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں رہتا کہ یہ جہاد علم وقلب' اور بیان و دعوت کے ساتھ تھا قتال نہیں تھا۔ اس لیے کہ قتال میں رائے اور تدبیر کے ساتھ شجاعت قلب اور زور بازو کی ضرورت ہوتی ہے۔ قوت بدن کی نسبت سے شجاعت قلب اور رائے وتدبیر کی عام مجاہد سے بڑھ کر قائد اور سالار میں بہت زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ سو حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما جسمانی قتال کے علاوہ بھی جہاد کی جملہ اقسام میں دوسرے صحابہ کرام پر مقدم تھے۔ [بلاشبہ اس جہاد میں حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما نے بھی شرکت کی تھی، اگرچہ وہ اس ضمن میں ان مجاہدین تک نہ پہنچ سکے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں مشغول رہا کرتے تھے۔ نبی کریم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نسبت زیادہ مرتبہ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو اطراف ملک میں امیر لشکر بنا کر بھیجا تھا۔ البتہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خیبر کے بعض قلعے یقیناً فتح کیے تھے]۔

امام ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''شیعہ کا قول ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ جہاد و قتال' کفار پر ضرب و کرب میں دیگر صحابہ پر فائق تھے۔ اور جہاد افضل الاعمال ہے۔'' یہ غلط بات ہے۔ اس لیے کہ جہاد کی تین قسمیں ہیں:

۱۔ جہاد کی پہلی قسم دین اسلام کی طرف زبان کے ساتھ دعوت دینا ہے [یہ جہاد کی سب سے اعلیٰ قسم ہے]۔

۲۔ جہاد کی دوسری قسم یہ ہے کہ لڑائی کے وقت رائے وتدبیر سے کام لیا جائے۔

۳۔ تیسری قسم کا جہاد جہاد بالید [ہاتھ کا جہاد] ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ جہاد کی قسم اوّل [یعنی دعوت الی اللہ] میں نبی کریم ﷺ کے بعد کوئی شخص حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کا ہم پلہ نہیں۔ اکابر صحابہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دست حق پرست پر بیعت اسلام کی تھی۔ یہ افضل اعمال میں سے ہے۔اس میدان میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اتنا بڑا کردار نہیں۔ باقی رہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ تو جس دن آپ اسلام لائے اس دن اوراس وقت سے اسلام زور پکڑ گیا؛ اور اعلانیہ اللہ تعالیٰ کی عبادت ہونے لگی۔ یہ سب سے بڑا جہاد ہے۔[حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ہے:'' جب سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسلام لائے ہم معزز ہو گئے۔'' ❶]

خلاصہ کلام! حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما جہاد کی ان دونوں اقسام میں عدیم النظیر تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اس میں بڑا حصہ نہیں تھا۔

دوسری قسم کا جہاد جس میں رائے و مشورہ سے کام لیا جاتا ہے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ مختص ہے۔

تیسری قسم کا جہاد: طعن و ضرب و مبارزت ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ دلیل و برھان ضروری کے بیان کے بعد اس کا درجہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی شخصیت میں کوئی مسلمان شک نہیں کرسکتا کہ ہر فضیلت و خوبی آپ کے ساتھ مخصوص تھی۔ مگر سرور کائنات کا اکثر جہاد پہلی دو اقسام سے تعلق رکھتا تھا۔ جس میں دعوت الی اللہ' تدبیر و ارادہ شامل ہیں۔ تیسری قسم یعنی مبارزت اور مار و قتال میں آپ نے بہت کم حصہ لیا۔ مگر اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ آپ بزدل تھے۔ بلکہ آپ تمام روئے زمین کے باشندوں سے بہادر و طاقتور تھے' جسمانی لحاظ سے بھی اور قلبی لحاظ سے بھی۔ آپ کی بسالت سب سے اعلیٰ و کامل تھی۔ لیکن آپ اعمال میں سے افضل تر کو زیادہ ترجیح دیتے؛ اسے مقدم رکھتے اور اس میں مشغول رہتے تھے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ بدر کے موقع پر- اور دیگر مواقع پر- حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ ہیں کبھی آپ سے جدا نہیں ہوتے تھے۔ اس لیے کہ نبی کریم ﷺ آپ کی ہمراہی ترجیح دیتے تھے؛ اور آپ کی رائے طلب کیا کرتے تھے۔ اور آپ کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کو خصوصی انس بھی تھا۔ پھر بسا اوقات حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس سعادت میں آپ کے شریک ہوتے۔ اس منزلت میں بھی ابوبکر رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دوسرے سارے صحابہ سے منفرد ہیں۔ مگر نادر طور پر۔

ہم دیکھتے ہیں کہ جہاد کی اس قسم یعنی ضرب و کرب اور مبارزت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ منفرد شمشیر زن نہ تھے۔ بلکہ دیگر صحابہ اس میں برابر آپ کے سہیم و شریک تھے۔ مثلاً ان صحابہ کرام میں: حضرت طلحہ، زبیر، سعد رضی اللہ عنہم، اور شروع اسلام میں شہید ہونے والے حضرت حمزہ، عبیدہ بن حارث بن عبد المطلب، مصعب بن عمیر، سعد بن معاذ اور سماک بن خرشہ یعنی ابو دجانہ (رضی اللہ عنہم اجمعین) بڑے مجاہد تھے۔ بلا شبہ اس جہاد میں حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما نے بھی بھر پور شرکت کی تھی، اگر چہ وہ اس ضمن میں ان مجاہدین تک نہ پہنچ سکے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ عموماً میدان جنگ میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں مشغول رہا کرتے تھے۔ نبی کریم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نسبت زیادہ مرتبہ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو اطراف ملک میں امیر لشکر بنا کر بھیجا تھا۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بنی فزارہ اور دیگر قبائل کی طرف امیر لشکر بنا کر بھیجا۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بھی کئی قبائل کی طرف قائد بنا کر روانہ فرمایا۔ مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو صرف خیبر کے بعض قلعوں کی طرف بھیجا تھا جو کہ آپ نے یقیناً فتح کیے تھے۔ تو معلوم ہوا کہ جہاد کی بھی سب سے افضل انواع میں حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو بھر پور حصہ حاصل تھا۔ جب کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا جہاد میں مقام و مرتبہ ان حضرات سے کم ہے' اور اس میں بھی دوسرے لوگ آپ کے برابر کے سہیم و شریک ہیں۔

❶ صحیح بخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ، باب مناقب عمر بن الخطاب (ح:٣٦٨٤)۔

فصل:

[شمشیر علی رضی اللہ عنہ اور ارکان اسلام کی مضبوطی]

[اشکال]: شیعہ مصنف کا یہ قول کہ شمشیر علی رضی اللہ عنہ سے قواعدِ اسلام وارکان ایمان مضبوط ہوئے۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جواب]: ''یہ صاف اور کھلا ہوا جھوٹ ہے۔[اسلامی غزوات سے واقفیت رکھنے والا ہر شخص اس کذب سے آشنا ہے]۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ آپ کی تلوار بھی دوسری بیش تعداد تلواروں کا ایک حصہ تھی۔ اور قواعدِ اسلام کی پختگی کے اسباب میں سے ایک سبب تھی۔ لیکن بہت سے مواقع ایسے ہیں جن سے اسلام کو تقویت ملی مگر ان میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تلوار کا کوئی خصوصی کردار نہ تھا۔ جس طرح بدر میں بہت سی تلواریں آپ کی تلوار کے علاوہ اور بھی تھیں۔

- ہم کئی بار بیان کر چکے ہیں کہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ غزوات جن میں قتال کی نوبت آئی تھی کل نو تھے۔ سرور کائنات کی وفات کے بعد فارس و روم کی خطرناک لڑائیوں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مطلقاً حصہ نہیں لیا تھا۔ عہد رسالت کی لڑائیوں میں جو غلبہ حاصل کیا تھا وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کامیابی نہ تھی بلکہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کامیابی کے تابع اور آپ کے فیض کی رہین منت تھی۔
- وہ بڑی لڑائیاں جن میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد امارت میں حصہ لیا وہ تین ہیں: جمل وصفین اور نہروان کی لڑائیاں۔ جمل اور نہروان میں آپ نے جو غلبہ حاصل کیا تھا اس کی وجہ مخالفین کی نسبت ان کے لشکر کی کثرت تعداد تھی۔ اس کے باوصف آپ نے اہل شام کے خلاف کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہیں کی تھی بلکہ فریقین برابر غالب آرہے تھے۔ یہاں تک کہ آپ کو شہید کر دیا گیا' اور آپ اس حال میں اللہ تعالیٰ کی رحمت کو سدھار گئے کہ آپ کا لشکر روز بروز کمزور تر ہوتا جارہا تھا؛ اور آپ کے مخالفین قوت پکڑتے جارہے تھے۔

اس سے معلوم ہوا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں آپ کو جو کامیابی حاصل ہوئی تھی؛ وہ حقیقت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھ اہل ایمان کی نصرت و مدد تھی۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿إِنَّا لَنَنصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُومُ الْأَشْهَادُ﴾ [غافر ۵۱]

''بے شک ہم اپنے رسولوں کی اور ان لوگوں کی جو ایمان لائے ضرور مدد کرتے ہیں دنیا کی زندگی میں اور اس دن بھی جب گواہ کھڑے ہوں گے۔''

یہی حال حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علاوہ دوسرے حضرات جیسے ابوبکر و عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین کو حاصل ہونے والی نصرت کا تھا۔ حقیقت میں یہ اللہ کی طرف سے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ نصرت تھی جس کا وعدہ اس نے اپنی کتاب میں کیا تھا۔

فصل:

[عدمِ فرارِ علی رضی اللہ عنہ]

[**اشکال**]: شیعہ مصنف کا یہ قول کہ'' حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جنگ سے کبھی فرار اختیار نہیں کیا تھا۔''

[**جواب**]: ہم کہتے ہیں: یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خصوصیت نہیں، بلکہ حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما اور دیگر صحابہ بھی اس وصف میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے برابر شریک ہیں۔ یہ کہنا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کبھی فرار نہیں ہوئے بالکل اسی دعوی کی طرح ہے کہ یہ حضرات بھی کبھی فرار نہیں ہوئے۔ اور نہ ہی ان میں سے کسی ایک کو کبھی شکست ہوئی ہے۔ اور اگر اس قسم کی کوئی معمولی چیز وقوع میں آئی بھی ہے تو وہ پوشیدہ ہے اور نقل ہو کر ہم تک نہیں پہنچی۔ اس بات کا احتمال ہے کہ احد وحنین میں ایسی لغزش حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی سرزد ہوئی ہو مگر ہم اس سے آگاہ نہ ہو سکے۔ مسلمانوں کو دوبار پسپائی اختیار کرنا پڑی تھی۔ ایک بار احد کے موقعہ پر اور دوسری بار حنین میں۔ اور یہ بات منقول نہیں ہے کہ ان مذکورہ بالا صحابہ کرام میں سے کوئی ایک پسپا ہوا ہو۔ بلکہ سیرت اور مغازی کی کتابوں میں مذکور ہے کہ حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما غزوہ احد وحنین میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ فرار ہونے والوں کے ساتھ فرار نہیں ہوئے تھے۔ جس نے یہ دعوی کیا ہے کہ یہ حضرات حنین کے موقعہ پر فرار ہو گئے تھے' تو اس کا جھوٹ صاف ظاہر اور ہر ایک کو معلوم ہے۔ احد کے موقعہ پر پسپا ہونے والوں میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شامل تھے؛ [اس لغزش کو] اللہ تعالیٰ نے معاف کر دیا۔ جو کچھ حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کے متعلق نقل کیا جاتا ہے کہ آپ حنین کے موقعہ پر جھنڈا لیکر فرار ہو گئے تھے؛ یہ محض جھوٹ ہے جو ان لوگوں نے گھڑ لیا ہے جنہیں افتراء پردازی کی عادت اور لت پڑی ہوئی ہے۔

❀ شیعہ مصنف کا دعوی کہ:'' آپ نے اپنی تلوار سے کبھی کسی قریبی رشتہ دار کو قتل نہیں کیا۔''

جواب: اس کے سچ یا جھوٹ ہونے کے ثبوت معلوم نہیں ہو سکے۔ اور اس مسئلہ میں ہمارے پاس کوئی قابل اعتماد روایت بھی موجود نہیں ہے۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے کوئی انسان حضرت خالد بن ولید' حضرت زبیر' براء بن مالک' ابو دجانہ اور ابوطلحہ وغیرہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں ایسا دعوی کرے کہ انہوں نے کبھی اپنے کسی خونی رشتہ دار کو قتل نہیں کیا۔ یہ بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق دعوی جیسا دعوی ہے۔ بلکہ یہ مثال حضرت خالد اور براء بن مالک رضی اللہ عنہما پر زیادہ صادق آتی ہے۔

اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے متعلق فرمایا تھا:'' آپ مشرکین پر اللہ کی تلواروں میں سے ایک لٹکتی ہوئی تلوار ہیں۔'' پس اگر یہ کہا جائے کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی تلوار بنایا ہو وہ کبھی اپنے کسی قریبی خونی رشتہ دار کو قتل نہیں کرے گا تو یہ بات سچائی کے زیادہ قریب ہوگی۔ حالانکہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے متعلق معلوم ہے کہ آپ نے جنگوں میں کس کثرت سے لوگوں کو قتل کیا۔ اور آپ ہمیشہ کامیاب ہی ہوتے رہے۔

[**اشکال**]: شیعہ کا یہ قول کہ:'' حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مشکلات کا ازالہ کیا۔''

[**جواب**]: یہ بھی ایک کھلا ہوا جھوٹ [اور دعویٰ بلا دلیل] اور سابقہ من گھڑت اقوال کی طرح کا ایک خودساختہ قول ہے۔ اس لیے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آپ کی ایک تکلیف کو بھی دور نہیں کیا تھا۔ بلکہ حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما نے بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی تکلیف کو دور نہیں کیا۔ حالانکہ یہ دونوں حضرات حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بڑے مجاہد تھے۔ اس کے برعکس نبی

کریم ﷺ ان لوگوں کی تکلیف اور پریشانیوں کو دور کیا کرتے تھے۔

البتہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس وقت آپ کا دفاع کیا تھا جب مشرکین نے مکہ میں آپ کو پیٹنا اور قتل کرنا چاہا تھا۔ آپ ان سے کہہ رہے تھے: ﴿اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ یَّقُوْلَ رَبِّیَ اللّٰهُ﴾ (غافر: ۲۸) ''کیا تم اس لیے ایک شخص کو قتل کرنا چاہتے ہو کہ وہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے۔'' مشرکین نے اس جرم میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو پیٹا تھا۔ [1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں معلوم نہیں کہ کبھی انہوں نے ایسا کیا ہو۔ اور ایسا بھی نہیں ہوا کہ مشرکین نے تلواریں لیکر نبی کریم ﷺ کا گھیراؤ کرلیا ہو تو ابوبکر یا علی رضی اللہ عنہما نے آکر آپ کو بچایا ہو۔ ایسا کہیں بھی معلوم نہیں ہوا۔ نہ ہی اہل علم نے کوئی ایسا واقعہ نقل کیا ہے اور نہ ہی اس کی کوئی حقیقت ہے۔ مگر یہ رافضی مصنف اور اس طرح کے دوسرے شیعہ مصنفین کا سیرت ومغازی کے بارے میں مبلغ علم ان جھوٹے اور کذاب راویوں کی روایات تک محدود ہے۔ غالباً شیعہ مصنف کا ماخذ قصہ کہانی کی کتابیں ہیں جو افسانہ گو قسم کے لوگوں نے تصنیف کی ہیں۔ ''تنقلات الانوار'' کا مصنف بکری کذاب اور اسکے امثال۔ سیرۃ البطال؛ عنترہ بن شداد نے ہارون اور اس کے وزیر کی کہانی' اور بطال اور دلہمہ' عیار اور احمد الدنف' اور الزیبق مصری وہ کتابیں جن میں انہوں نے مختلف کہانیاں گھڑ لی ہیں۔ [جو کہ سکول کے طالب علم پڑھائی میں مہارت حاصل کرنے کے لیے کرایہ پر لے کر پڑھتے ہیں اور ان بے ہودہ کہانیوں کو پڑھ کر وہ رات بھر سو نہیں سکتے]۔

بعض جھوٹوں نے رسول اللہ ﷺ کے مغازی کے بارے میں بھی اس قسم کی جھوٹی کہانیاں گھڑ لی ہیں۔ اور وہ لوگ ان کی تصدیق کرنے لگ گئے جو انتہائی جاہل تھے اور جنہیں سیرت کے بارے میں اہل علم کی روایت کردہ صحیح احادیث کا علم نہ تھا۔ جب کہ اہل علم ان کے بارے میں جانتے ہیں کہ یہ صاف جھوٹ ہے۔

شیعہ مصنف نے جو آپ ﷺ کے بستر پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے رات گزارنے کا ذکر کیا ہے' ہم اس سے پہلے بیان کر چکے ہیں کہ یہاں پر اصل میں حضرت علی رضی اللہ عنہ پر خوف والی کوئی بات نہیں تھی۔

اہل ایمان کی جانب سے نبی کریم ﷺ کے دفاع کا جو سب سے مشہور واقعہ ومعرکہ ہے وہ احد کے دن کا ہے۔ جس دن مسلمان پیٹھ پھیر کر بھاگ گئے تھے۔ تو دشمن نبی کریم ﷺ کو قتل کرنے کی بھرپور کوشش کرنے لگا۔ امیہ بن خلف آپ کو قتل کرنے کی کوشش میں آگے بڑھنے لگا۔ اسے نبی کریم ﷺ نے اپنے دست مبارک سے قتل کیا۔ اس موقعہ پر مشرکین نے نبی کریم ﷺ کا چہرہ زخمی کردیا؛ آپ کے سر پر خود تھا جس پر وار کیا گیا؛ آپ کے سامنے کے دو اوپر والے دو دانت ٹوٹ گئے۔ اس وقت جو صحابہ کرام آپ کے اردگرد باقی رہ گئے تھے وہ بھرپور دفاع کرنے لگے۔ جیسا کہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ تیر چلاتے جارہے تھے اور نبی کریم ﷺ فرمارہے تھے:

''میرے ماں باپ تجھ پہ قربان! خوب تیر چلاؤ۔'' [البخاری ٤/ ٣٩]

حضرت طلحہ نے غزوۂ احد میں نبی کریم ﷺ کی حفاظت کی تھی۔ [2] اسی دوران آپ کا ایک ہاتھ کٹ گیا تھا۔ [3]

---

[1] صحیح بخاری، کتاب التفسیر۔ سورۃ المؤمن (حدیث: ٤٨١٥، ٣٦٧٨)،

[2] صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب ﴿اِذْ ھَمَّتْ طَآئِفَتَانِ مِنْکُمْ......﴾ (حدیث: ٤٠٦٣)

[3] صحیح بخاری، حوالہ سابق (حدیث: ٤٠٦٤)، صحیح مسلم۔ کتاب الجھاد۔ باب غزوۃ النساء مع الرجال (حدیث: ١٨١١)، اس میں ہے کہ یہ کہنے والا ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ تھے۔ واللہ اعلم۔

آپ کے اردگرد مسلمانوں کی ایک جماعت آپ کا دفاع کرتے ہوئے مقام شہادت پر سرفراز ہوگئی۔

[حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کہہ رہے تھے: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! میں آپ کے دفاع کے لیے آپ کے سامنے سینہ تانے کھڑا ہوں۔ یہ بات غلط ہے کہ مشرکین نے احد میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو گھیر لیا تھا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ یا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے تلوار کے ساتھ چھڑایا تھا]۔

حدیث میں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یوم احد کے موقع پر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو اپنی تلوار دھونے کو کہا' اور فرمایا: ''اسے دھونا' اس پر کوئی مذمت نہیں ہے۔'' اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر تم نے کوئی اچھا کام کیا ہے تو فلاں فلاں نے بھی بھی اچھا کام کیا ہے۔'' اور آپ نے صحابہ کرام کی ایک جماعت کے نام گنوائے۔ [سیرۃ ابن ہشام ۳/۱۰۶؛ البدایہ والنہایۃ ۴/۴۷]

فصل:

[حضرت علی رضی اللہ عنہ اور مقتولین بدر]

[اشکال] : شیعہ مصنف لکھتا ہے: ''غزوہ بدر کے موقع پر؛ جو کہ پہلا غزوہ ہے؛ اور مدینہ طیبہ ہجرت کر کے آنے کے اٹھارہ ماہ بعد پیش آیا؛ اس وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عمر صرف ستائیس برس کی تھی آپ نے تنہا چھتیس آدمیوں کو قتل کیا تھا۔ جس قدر کفار کو غزوۂ بدر میں قتل کیا گیا تھا یہ تعداد اس کے نصف سے بھی زیادہ ہے، اس کے علاوہ آپ دیگر کفار کے قتل میں بھی شریک ہوئے تھے۔''

[جواب] : ہم کہتے ہیں: باتفاق اہل علم و عارفین اہل سیرت و مغازی یہ صریح جھوٹ اور من گھڑت بہتان ہے۔ یہ بات کسی بھی ایسے راوی نے نقل نہیں کی جس کی روایت پر اعتماد کیا جاتا ہو۔ بلکہ یہ جھوٹے اور جاہل لوگوں کی خود ساختہ بات ہے۔ بلکہ روایات صحیحہ سے بہت سے [بہت سے ایسے] کفار کا بدر میں قتل کیا جانا ثابت ہے جن [کے قتل] میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے شرکت نہیں کی تھی۔ مثلاً ابوجہل و عقبہ و عتبہ بن ربیعہ [یا شیبہ بن ربیعہ] و ابی بن خلف وغیرہ۔

❀ یہ واقعہ ایسے ہے کہ جب مشرکین کی طرف سے تین آدمی: عتبہ' شیبہ اور ولید نکلے' اور انہوں نے مبارزت طلب کی تو ان کے مقابلہ میں تین انصاری نکلے۔ انہوں نے پوچھا: تم کون ہو؟ تو انہوں نے نام لیکر اپنا تعارف کروایا۔ تو مشرکین نے کہا: آپ عزت والے ہم پلہ لوگ ہیں؛ مگر ہم اپنے چچازادوں سے لڑنا چاہتے ہیں۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اقارب کو نکلنے کا حکم دیا۔ اور فرمایا: اے حمزہ! کھڑے ہو جاؤ۔ اے عبیدہ! کھڑے ہو جاؤ۔ اے علی! کھڑے ہو جاؤ۔''

اس وقت مشرکین میں سب سے چھوٹا ولید تھا اور مسلمانوں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ ؛ تو ان دونوں میں مقابلہ ہوا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے فریق مخالف کو قتل کیا؛ اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے اپنے فریق مخالف عتبہ کو۔ جب کہ حضرت عبیدہ رضی اللہ عنہ کو ان کے دشمن نے زخمی کر دیا۔ حضرت علی اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہما نے جا کر کی ان کی مدد کی اور تیسرے کافر کو بھی قتل کر دیا۔

نقل کیا گیا ہے کہ جنگ بدر میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دس؛ یا اس سے بھی کم یا اس سے کچھ زیادہ کافروں کو قتل کیا تھا۔

جو کچھ ابن ہشام' اور اس سے پہلے موسیٰ بن عقبہ' اور اموی نے ذکر کیا ہے؛ ان تمام نے زیادہ سے زیادہ آپ کے ہاتھوں سے گیارہ کفار کا قتل ہونا بتایا ہے۔ جب کہ چھ کفار کے بارے میں اختلاف ہے کہ ان کا قتل کرنے والا کون تھا۔ تین کفار کے قتل میں آپ نے شراکت کی ہے۔ اہل صدق و امانت نے یہی نقل کیا ہے۔

[غزوۂ احد اور شیعہ کی افتراء پردازی]:

[الــــزام] : شیعہ مصنف لکھتا ہے: ''احد کے دن حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سوا سب لوگ بھاگ گئے تھے، بعد ازاں چند صحابہ لوٹ آئے سب سے پہلے عاصم بن ثابت و ابو دجانہ و سہل بن حنیف رضی اللہ عنہم آئے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تین دن کے بعد آئے، تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''آپ نے بہت دیر لگا دی۔'' فرشتوں نے جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ثبات و استقلال پر تعجب کا اظہار کیا تو جبرائیل نے آسمان پر چڑھتے ہوئے کہا: ''تلوار ہے تو ذوالفقار اور جوان ہے تو علی۔''

اس جنگ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اکثر مشرکین کو قتل کیا تھا اور آپ کی وجہ سے مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی۔ قیس بن سعد نے روایت کرتے ہوئے کہا ہے: ''میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے سنا آپ فرما رہے تھے: ''احد کے دن مجھے سولہ زخم پہنچے۔ ان میں سے چار زخم کھا کر میں زمین پر گر گیا تھا۔ تو میرے پاس ایک خوبصورت چہرہ والا خوبصورت زلفوں والا' اور پاکیزہ خوشبو والا ایک آدمی آیا۔ اس نے مجھے پکڑ کر کھڑا کر دیا۔ اور پھر کہا: آگے بڑھو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت میں قتال کرو۔ یہ دونوں تم سے راضی ہیں۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''پھر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور اس واقعہ کی خبر دی۔ تو آپ نے فرمایا: اے علی! کیا تم اسے نہیں جانتے؟ میں نے کہا نہیں؛ لیکن دحیہ کلبی سے مشابہت رکھتا تھا۔'' آپ نے پھر فرمایا: ''اے علی! اللہ تیری آنکھوں کو ٹھنڈی کر دے! وہ جبرائیل امین تھے۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جــــواب]: یہ بھی ان بڑی جھوٹی روایات میں سے ہے جو صرف ان لوگوں کو جچتی ہیں جنہیں اسلام کی کوئی معرفت نہیں۔ [شیعہ مصنف شرم و حیاء کے جذبات کو بالائے طاق رکھ کر ایسے اکاذیب نقل کرتا چلا آ رہا ہے جن کو چوپائے تو تسلیم کر سکتے ہیں، مگر ایک سلیم العقل انسان کبھی ماننے کے لیے تیار نہیں]۔ گویا کہ وہ یہ باتیں ایسے لوگوں کو بتا رہا ہے جنہیں غزوات کے واقعات کے بارے میں کچھ بھی علم ہی نہ ہو۔''

جیسا کہ وہ کہتا ہے: ''حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کارہائے نمایاں کی وجہ سے غزوۂ احد میں مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی۔''

اس سے کہا جائے گا کہ: جھوٹ کی اصل بنیادی آفت جہالت ہوتی ہے۔ کیا اس جنگ میں مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی تھی؟ شروع میں تو مسلمانوں نے دشمن کو پسپا کیا تھا؛ مگر جبل الرماۃ پر متعین دستہ جنہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر حال میں اپنی جگہ پر ثابت قدم رہنے کی تاکید کی تھی؛ اور فرمایا تھا: خواہ انہیں فتح ہو یا شکست مگر یہ لوگ اپنی جگہ نہ چھوڑیں۔ پس جب مشرکین پسپا ہوئے تو بعض لوگ چیخ کر آواز لگانے لگے: لوگو! مال غنیمت!۔ انہیں ان کے امیر عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ نے منع کیا [کہ پہاڑ چھوڑ کر نیچے نہ اتریں؛ مگر انہوں نے اس پر توجہ نہ دی اور پہاڑ چھوڑ کر نیچے اتر گئے] دشمن نے پلٹ کر اس پہاڑی درّے سے حملہ کر دیا۔ اس وقت مشرکین کے رہنما و قائد خالد بن ولید [جو ابھی تک مسلمان نہیں ہوئے] تھے۔ انہوں نے پشت کی طرف سے پلٹ کر حملہ کر دیا۔ اس وقت شیطان نے چیخ لگائی کہ: ''محمد صلی اللہ علیہ وسلم قتل ہو گئے ہیں۔''[1]

---

[1] نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا سر مبارک زخمی ہو گیا اور اگلے دانت ٹوٹ گئے۔ خود آپ کے سر میں دھنس گیا اور اس کی کڑیاں آپ کے [......حاشیہ جاری ہے]

اس دن تقریباً ستر مسلمان شہید ہوئے؛ اس دن رسول اللہ ﷺ کے ساتھ صرف بارہ افراد ثابت قدم رہے جن میں حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما بھی شریک تھے۔ ❶

ابوسفیان نے ان لوگوں کے احوال جاننے کے لیے کہا: ''کیا تم میں محمد ہیں' کیا تم میں محمد ہیں؟'' یہ الفاظ پہلے گزر چکے ہیں؛ اور یہ حدیث صحیحین میں ہے۔ یہ دن سخت آزمائش و ابتلاء وفتنہ کا دن تھا۔ اس دن دشمن کامیاب لوٹا تھا؛ اور راستہ میں انہوں نے دوبارہ پلٹ کر مدینہ پر حملہ کرنے کا پروگرام بنایا؛ مگر اس سے پہلے ہی رسول اللہ ﷺ ان کا پیچھا کرتے ہوئے چل پڑے۔[بڑا تفصیلی واقعہ ہے]۔ کہا جاتا ہے کہ ان ہی کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اَلَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ﴾ (آل عمران: ۱۷۲)

''وہ جنھوں نے اللہ اور رسول کا حکم مانا، اس کے بعد کہ انھیں زخم پہنچا۔''

[اس موقع پر] اللہ اور اس کے رسول کا حکم ماننے والوں میں حضرت ابوبکر حضرت زبیر رضی اللہ عنہما بھی شامل تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ابن زبیر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کرتی تھیں یہ آیت تمہارے باپ اور دادا کے بارے میں نازل ہوئی ہے:

﴿اَلَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ﴾ (آل عمران: ۱۷۲)

غزوہ احد میں مشرکین کے صرف چند آدمی قتل کیے گئے تھے۔ اس دن مشرکین نے نبی کریم ﷺ کو قتل کرنے کی کوششوں میں سردھڑ کی بازی لگا دی تھی۔ اس دن حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ آپ کے دفاع میں ثابت قدم تیر چلاتے جا رہے تھے اور نبی کریم ﷺ فرما رہے تھے: ''میرے ماں باپ تجھ پہ قربان! خوب تیر چلاؤ۔'' [البخاری ٤/ ٣٩]

صحیحین میں ہے حضرت سعد بن ابی وقاص فرمایا کرتے تھے: ''اُحد کے دن رسول اللہ ﷺ نے میرے لیے اپنے ماں اور باپ کو جمع کیا۔'' حضرت سعد مستجاب الدعاء اور پختہ تیر انداز تھے۔

ان [ثابت قدم رہنے والوں] میں حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ بھی تھے جو انتہائی سخت جنگجو اور تیر انداز تھے۔ اور طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ تھے؛ جو اپنے ہاتھ پر وار روک کر رسول اللہ ﷺ کی حفاظت فرما رہے تھے۔ اور آپ کا یہ ہاتھ شل ہو گیا تھا۔ نبی کریم ﷺ نے دو زرعیں پہن رکھی تھیں۔ نبی کریم ﷺ کے اردگرد بہت سے صحابہ رضی اللہ عنہم نے شہادت پائی۔

ابن اسحق رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''سیرت'' میں ان لوگوں کے بارے میں لکھا ہے جو رسول اللہ ﷺ کے سامنے ڈٹ کر کھڑے ہو گئے تھے؛ ان میں ابودجانہ تھے' جنہوں نے اپنی جان پر کھیل کر رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کی؛ آپ کی پیٹھ پر دشمن کی طرف سے تیر لگتے؛ مگر آپ رسول اللہ ﷺ پر جھک کر آپ کو بچا رہے تھے۔ آپ کو تیروں کے کئی زخم آئے۔ حضرت

[سابقہ حاشیہ]: سر مبارک میں پھنس گئیں۔ اسی حالت میں آپ فرمانے لگے: ''وہ قوم کیسے نجات پائے گی جس نے اپنے نبی کے ساتھ یہ سلوک کیا۔'' تب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی: ﴿لَیْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ﴾ ''اس امر میں آپ کا کوئی اختیار نہیں ہے۔'' البخاری۔ کتاب المغازی باب ﴿لَیْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ......﴾ تعلیقاً قبل ح(٤٠٦٩)، صحیح مسلم، کتاب الجهاد' باب غزوة احد، (ح:١٧٩١)۔

❶ سیرۃ ابن ہشام (ص:٣٨٨)۔ نبی کریم ﷺ کے اردگرد بہت سے صحابہ نے شہادت پائی۔ رئیس المشرکین نے کہا: ''ہُبل کی جے! آج کا دن بدر کے دن کا جواب ہے۔'' [البخاری۔ کتاب المغازی - باب غزوة احد، (ح:٤٠٤٣)۔] یہ غلط ہے کہ علی غزوۂ احد میں زخمی ہوئے تھے۔ اور جبریل نے آپ کو اٹھایا تھا۔ ہم رافضی مصنف سے پوچھتے ہیں کہ اس کی اسناد کہاں ہے اور اس کا ماخذ موضوعات کی کون سی کتاب ہے؟

سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ آپ کے سامنے کھڑے تیر چلا رہے تھے: رسول اللہ ﷺ خود تیر اٹھا کر انہیں دیتے اور فرماتے جاتے:

''میرے ماں باپ تجھ پہ قربان! خوب تیر چلاؤ۔''

یہاں تک کہ آپ انہیں ایسا تیر بھی تھما دیتے جس کا پھل نہ ہوتا۔ اور فرماتے: ''یہ تیر بھی چلاؤ۔''

جب دشمنوں نے آپ پر ہلہ بول دیا تو آپ نے فرمایا: ''کون ہے جو ہمارے لیے اپنی جان قربان کرے گا؟۔''

یہ سن کر حضرت زیاد بن سکن انصاری رضی اللہ عنہم اجمعین پانچ انصاری صحابہ کے ایک گروہ کے ساتھ کھڑے ہوئے؛ بعض نے ان کا نام عمارہ بن زید بن سکن بتایا ہے؛ یہ ایک ایک کر کے رسول اللہ ﷺ کے سامنے آکر لڑتے؛ اور شہید ہوتے جاتے۔ یہاں تک کہ سب سے آخر میں زیاد یا عمارہ رضی اللہ عنہ آئے؛ اور انہیں زخموں نے بہت بری طرح چور کر دیا تھا؛ مگر آپ ثابت قدم رہے یہاں تک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی ایک جماعت لوٹ کر آ گئی؛ اور آپ کی حفاظت میں لڑنے لگی۔ اس موقعہ پر رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمارہ رضی اللہ عنہ کو اپنے قریب کرنے کا حکم دیا۔ آپ نے ان کے سر کو اپنے قدم مبارک پر رکھ کر سہارا دیا۔ اور ان کا انتقال اس حال میں ہوا کہ ان کے گال رسول اللہ ﷺ کے پاؤں پر تھے۔'' [مختصر السیرۃ لابن ہشام ۳/ ۸۷]

[آپ فرماتے ہیں]: ہم سے عاصم بن عمر بن قتادہ نے حدیث بیان کی: بیشک رسول اللہ ﷺ نے اپنی کمان سے احد کے دن تیر چلائے' یہاں تک کہ وہ کمان ٹوٹ گئی۔ پھر وہ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے لے لی؛ جو کہ پھر آپ ہی کے پاس رہی۔ اس دن حضرت قتادۃ بن نعمان کی آنکھ نکل گئی تھی۔ یہاں تک کہ وہ آپ کے گالوں پر لٹک رہی تھی۔ عاصم بن عمر فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے اپنے دست مبارک سے وہ آنکھ واپس اپنی جگہ پر رکھ دی؛ تو وہ دوسری آنکھ سے بھی خوبصورت لگتی تھی۔''

حضرت علی اور ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہم بھی اس وقت دوسرے لوگوں کے ساتھ جنگ و قتال میں مصروف تھے' ان میں سے کوئی ایک بھی اس وقت نبی کریم ﷺ کے دفاع کے مقام پر موجود نہیں تھا؛ اس موقعہ پر آپ ﷺ کی پیشانی پر زخم آئے؛ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی پیشانی تو زخمی نہیں ہوئی۔

❀ ''شیعہ مصنف کا یہ دعوی کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''احد کے دن مجھے سولہ زخم پہنچے۔ ان میں سے چار زخم کھا کر میں زمین پر گر گیا تھا۔''

❀ یہ ایک کھلا ہوا جھوٹ ہے۔ اس طرح کی کوئی روایت اہل علم کے ہاں ان کی معروف کتابوں میں موجود نہیں ہے۔ اس روایت کی سند کہاں ہے؟ اور اہل علم میں سے کس نے اسے صحیح کہا ہے؟ اور جن قابل اعتماد کتابوں سے روایات نقل کی جاتی ہیں ان میں سے کس کتاب میں یہ روایت موجود ہے؟ حقیقت تو یہ ہے کہ اس موقعہ پر خود رسول اللہ ﷺ اور بہت سارے دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم زخمی ہوئے تھے۔

❀ ابن اسحق رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''جب رسول اللہ ﷺ غار کے منہ پر پہنچ گئے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نکلے اور مہراس نامی چشمہ سے پانی لے کر آئے تا کہ رسول اللہ ﷺ کو پلا سکیں۔ لیکن اس پانی سے کچھ بو آ رہی تھی؛ اس لیے رسول اللہ ﷺ نے نہیں پیا۔ پھر اس پانی سے آپ کا خون دھویا گیا۔ اور آپ کے سر کے زخم دھوئے گئے۔ اسی حالت میں آپ فرمانے لگے: ''اس قوم پر اللہ تعالیٰ کا سخت غضب ہوا جس نے اپنے نبی کے چہرہ کو خون آلود کیا۔''

❀ شیعہ مصنف کا یہ قول کہ: ''پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تین دن کے بعد آئے۔'' یہ ایک اور جھوٹ ہے۔

❀ شیعہ مصنف کا یہ قول کہ: 'جبرائیل نے آسمان پر چڑھتے ہوئے کہا تھا:''لَا سَیْفَ اِلَّا ذُو الْفَقَارِ لا فتی إلا علي.''

شیعہ کے اس قول کے جھوٹ ہونے پر تمام لوگوں کا اتفاق ہے؛اس لیے کہ ذوالفقار حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تلوار کا نام نہیں ہے، بلکہ ابوجہل کی تلوار کا نام تھا۔مسلمانوں نے جنگ بدر میں یہ تلوار مال غنیمت میں پائی تھی۔امام احمد' ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے کہ:'' حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوجہل کی ذوالفقار نامی تلوار بدر کے دن نفل (وہ حصہ جو امیر لشکر باقی مجاہدین کی نسبت زائد وصول کرتا ہے) کے طور پر خود لے لی تھی۔اسی تلوار کے بارے میں آپ نے احد کے روز خواب دیکھا تھا کہ اس میں دندانے پڑ گئے ہیں۔''[1]

اس کی تعبیر آپ نے مسلمانوں کی شکست سے فرمائی۔نیز فرمایا کہ میں نے دیکھا میں اپنے پیچھے ایک مینڈھے کو سوار کیے ہوں، اس سے میں نے سالار لشکر مراد لیا۔پھر میں نے دیکھا کہ میں ایک مستحکم قلعہ میں ہوں، میں نے اس کی تعبیر مدینہ سے کی۔پھر میں نے دیکھا کہ ایک بیل کو ذبح کیا جا رہا ہے۔اللہ کی قسم!بیل اچھا ہے۔آپ نے یہ الفاظ دہرائے۔

[مسند احمد(۱/ ۲۷۱)]

[غزوۂ احزاب اور شجاعت حضرت علی رضی اللہ عنہ]:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:''غزوہ احزاب میں؛ اسے غزوہ خندق بھی کہا جاتا ہے؛ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خندق کھودنے سے فارغ ہوگئے؛ تو قریش ابوسفیان کی قیادت میں؛ کنانہ اور اہل تہامہ کے دس ہزار کے لشکر کفار نے مدینہ کا محاصرہ کرلیا۔ایسے ہی غطفان اور ان کے تابعین بھی اہل نجد بھی چڑھ آئے تھے؛ مدینہ کی بالائی اور زریں جانب سے دشمن اللہ پڑے تھے بالکل جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا نقشہ کھینچا ہے:﴿اِذْ جَآءُ وْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَ مِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ﴾

''جب وہ تم پر تمھارے اوپر سے اور تمھارے نیچے سے آ گئے۔''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم تین ہزار صحابہ کے ساتھ مقابلہ کے لیے نکلے اور خندق کو اپنے اور کفار کے درمیان حائل کردیا۔مشرکین نے یہود کے ساتھ معاہدہ کرلیا۔یہودیوں سے معاہدہ اور کفار کی کثرت کے پیش نظر ان لوگوں کی طمع اور بڑھ گئی۔کفار میں سے عمرو بن عبدوُد اور عکرمہ بن ابی جہل نے خندق کے ایک تنگ شگاف میں سے داخل ہوکر مقابلہ کے لیے للکارا۔حضرت علی رضی اللہ عنہ مقابلہ کے لیے کھڑے ہوئے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:''یہ عمرو ہے'' علی رضی اللہ عنہ چپ رہے۔

پھر عمرو نے دوسری اور تیسری مرتبہ للکارا۔جب ہر بار حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی مقابلہ کے لیے کھڑے ہوئے تو چوتھی بار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دے دی۔

جب عمرو بن عبدود سے سامنا ہوا تو اس نے کہا:''اے میرے بھتیجے!تم واپس چلے جاؤ میں تمہارے خون سے اپنی تلوار کو

---

[1] مسند احمد(۱/ ۲۷۱)، الترمذی، کتاب السیر، باب فی النفل (حدیث: ۱۵٦۱) سنن ابن ماجة، ۔ کتاب الجهاد، باب السلاح(حدیث:۲۸۰۸)۔

رنگین نہیں کرنا چاہتا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: ''میں نے اللہ تعالیٰ سے عہد کیا ہے کہ جب میں مشرکین سے ٹکراؤں گا تو قریش میں سے جو بھی انسان دو میں سے ایک بات قبول کرے گا؛ میں اس کی وہ بات مان لوں گا۔ میں تمہیں اسلام کی دعوت دیتا ہوں۔ عمرو نے کہا: ''مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں۔''

پھر آپ نے فرمایا: میں تمہیں مقابلہ کی دعوت دیتا ہوں۔''

عمرو نے کہا: میں تمہیں قتل نہیں کرنا چاہتا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''لیکن میں تو تجھے قتل کرنا چاہتا ہوں۔

اس پر عمرو کو تپ چڑھ گئی [یعنی وہ گرم ہو گیا اور غصہ میں آ گیا]۔ اس نے گھوڑے سے نیچے چھلانگ لگائی اور داؤ کھیلنے لگا۔ آخر کار حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عمرو کو قتل کر دیا؛ اور عکرمہ پیٹھ پھیر کر بھاگ گیا۔ پھر باقی مشرکین اور یہود بھی شکست کھا کر بھاگ گئے۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''علی رضی اللہ عنہ کا عمرو بن عبد ود کو قتل کرنا جن و انس کی عبادت سے افضل ہے۔''[1]

[جواب]: ہم کہتے ہیں: پہلی بات: اس واقعہ کی سند اور صحت کہاں ہے؟

❀ دوسری بات: اس نے غزوہ کے واقعہ میں چند در چند جھوٹ جمع کر دیے ہیں۔

پہلا جھوٹ کہ: قریش و کنانہ اور اہل تہامہ دس ہزار کی تعداد میں تھے۔ جب کہ احزاب کی تمام جماعتیں: قریش، کنانہ، اہل نجد، تمیم، اسد، غطفان، اور یہود سب ملا کر دس ہزار کے قریب تھے۔

❀ احزاب تین قسم کے لوگ تھے: ۱۔ قریش اور ان کے حلیف۔ یہ اہل مکہ اور اس کے گرد و نواح کی بستیوں کے لوگ تھے۔ ۲۔ اہل نجد: تمیم، غطفان، اور ان کے ساتھ شامل باقی کے لوگ۔ ۳۔ یہود بنی قریظہ۔

❀ شیعہ مصنف کا یہ قول کہ: ''جب علی رضی اللہ عنہ نے عمرو کو قتل کر دیا تو باقی مشرکین اور یہود بھاگ نکلے۔''

[جواب]: یہ صاف ٹھنڈا جھوٹ ہے؛ کفار بھاگے نہیں تھے، بلکہ انھوں نے یہود کے ساتھ مل کر مسلمانوں کا محاصرہ جاری رکھا تھا۔ یہاں تک کہ نعیم بن مسعود غطفانی رضی اللہ عنہ نے ان میں پھوٹ ڈال دی۔ اور اللہ تعالیٰ نے آندھی اور فرشتے بھیج کر کفار کو منتشر کر دیا اور وہ واپس لوٹنے پر مجبور ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَآءَ تْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا وَّ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَ كَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا ❀ اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَ مِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَ اِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَ بَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَ تَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا ❀ هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ زُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا ❀ وَ اِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اِلَّا غُرُوْرًا ❀ (....إلى ....) وَ رَدَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِغَيْظِهِمْ لَمْ يَنَالُوْا خَيْرًا وَ كَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ وَ كَانَ اللّٰهُ قَوِيًّا عَزِيْزًا﴾ (الاحزاب: ۲۵)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اپنے آپ پر اللہ کی نعمت یاد کرو، جب تم پر کئی لشکر چڑھ آئے تو ہم نے ان پر آندھی

---

[1] مسند احمد (۱/ ۲۷۱)۔

بھیج دی اور ایسے لشکر جنھیں تم نے نہیں دیکھا اور جو کچھ تم کر رہے تھے اللہ اسے خوب دیکھنے والا تھا۔ جب وہ تم پر تمھارے اوپر سے اور تمھارے نیچے سے آ گئے اور جب آنکھیں پھر گئیں اور دل گلوں تک پہنچ گئے اور تم اللہ کے بارے میں گمان کرتے تھے، کئی طرح کے گمان۔ اس موقع پر ایمان والے آزمائے گئے اور ہلائے گئے، سخت ہلایا جانا اور جب منافق لوگ اور وہ لوگ جن کے دلوں میں بیماری ہے، کہتے تھے کہ اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے محض دھوکا دینے کیلئے وعدہ کیا تھا۔ (......آگے تک......) اور اللہ تعالیٰ نے کفار کو غصہ کی حالت میں لوٹا دیا اور وہ اپنا مقصد حاصل نہ کر سکے۔ اور اللہ مومنوں کو لڑائی سے کافی ہو گیا اور اللہ ہمیشہ سے بے حد قوت والا، سب پر غالب ہے۔''

اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مشرکین کو لڑائی کے ذریعہ واپس نہیں لوٹایا تھا [اور نہ مسلمانوں نے انھیں شکست دی تھی]۔ یہ بات اہل علم محدثین و مفسرین؛ مؤرخین اور سیرت نگاروں کے ہاں تواتر کے ساتھ معروف و معلوم ہے۔ تو پھر یہ کہنا کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور عمرو بن عبدود کی لڑائی اور عمرو کے قتل ہو جانے سے مشرکین شکست کھا گئے۔

❀ شیعہ نے جو روایت بیان کی ہے کہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''علی رضی اللہ عنہ کا عمرو بن عبدود کو قتل کرنا جن و انس کی عبادت سے افضل ہے۔''

❀ یہ الفاظ یقیناً جھوٹ ہیں۔ [رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ایسی مبالغہ آمیزی سے پاک ہے]۔ یہی وجہ ہے کہ علماء اسلام میں سے کسی ایک نے بھی یہ روایت اپنی ان قابل اعتماد کتابوں میں نقل نہیں کی جن سے احادیث روایت کی جاتی ہیں۔ اور نہ ہی اس کی کوئی صحیح سند معروف ہے اور نہ ہی ضعیف۔ اس جھوٹ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنا جائز نہیں۔ بھلا ایک آدمی کا قتل جن و انس کی عبادت سے افضل کیسے ہو سکتا ہے؟ کیونکہ انسانوں کی عبادت میں تو انبیاء کرام علیہم السلام کی عبادت بھی داخل ہے۔ اگر اس روایت کو درست تسلیم کیا جائے تو پھر [نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیت پہنچانے والے] ایسے کفار بھی قتل ہوئے جن کا قتل ہونا عمرو بن عبدود کے قتل سے بڑھ کر تھا۔ اس لیے کہ اس عمرو سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو اتنی تکلیف نہیں پہنچی جتنی دوسرے قریشی سرداروں سے پہنچی تھی؛ یعنی وہ صنادید قریش جو کہ بدر کے موقع پر قتل ہوئے تھے؛ مثلاً ابوجہل؛ عقبہ بن ابی معیط؛ شیبہ بن ربیعہ؛ نضر ابن حارث؛ اور دیگران کے امثال جن کے بارے میں قرآن بھی نازل ہوا۔ جب کہ اس عمرو کے بارے میں کوئی آیت نازل نہیں ہوئی۔ اور نہ ہی اس کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل ایمان سے کوئی انفرادی دشمنی معروف تھی۔

اس پر طرہ یہ کہ کسی [بھی صحیح] روایت میں مذکور نہیں کہ عمرو بن عبدود نے غزوہ بدر یا احد میں حصہ لیا ہو۔ اور نہ ہی ان کے علاوہ دیگر مغازی و سرایا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پیش آئے تھے؛ ان میں اس کا کوئی ذکر ملتا ہے۔ اس کا قصہ صرف غزوہ خندق میں مشہور ہوا ہے۔ حالانکہ یہ قصہ صحاح ستہ اور اس طرح کی دوسری کتابوں میں مذکور نہیں ہے۔ جیسا کہ بدر کے موقعہ پر تین افراد کی مبارزت طلبی کا ذکر روایت کیا گیا ہے کہ حضرت حمزہ' عبیدہ اور علی رضی اللہ عنہم عتبہ' شیبہ اور ولید کے مقابلہ میں نکلے تھے۔ احادیث و تفسیر کی کتابیں ان مشرکین کے تذکرہ سے بھری پڑی ہیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا دیا کرتے تھے' مثلاً ابو جہل' عقبہ بن ابی معیط؛ نضر بن الحارث؛ وغیرہ اور سرداران کفار جیسے: ولید بن مغیرہ وغیرہ۔ لیکن ان میں سے کسی ایک نے بھی

کسی بھی گروہ میں عمرو بن عبدود کا تذکرہ تک نہیں کیا۔ اور نہ ہی یہ جنگ میں پیش پیش رہنے والوں میں سے تھا۔ تو پھر اس کو قتل کرنا جن وانس کی عبادت سے کیسے افضل ہوسکتا ہے؟ اور پھر اس پر مستزاد یہ کہ یہ خبر تواتر کیساتھ منقول ہے کہ اس کے قتل سے مشرکین شکست کھا کر نہیں بھاگے تھے؛ بلکہ وہ اپنی جگہ پر محاصرہ کئے رہے جیسا کہ اس سے پہلے تھے۔

فصل:

[غزوہ بنی نضیر اور حضرت علی رضی اللہ عنہ]

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ''غزوہ بنی نضیر کے موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس یہودی کو قتل کر دیا تھا جس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دانتوں پر پتھر مارا تھا۔ اس کے بعد انھوں نے مزید دس یہودیوں کو قتل کر دیا، باقی یہودی بھاگ نکلے۔''

[جواب]: ہم کہتے ہیں کہ: ''اس غزوہ یا دیگر غزوات کے بارے میں جو کوئی بات نقل کی جاتی ہو تو سب سے پہلے اس کے لیے سند کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ وگرنہ انسان اگر یہ چاہے کہ مولی کی ایک جڑ پر بغیر کسی سند کے دلیل پیش کرے تو اس کی بات نہیں مانی جائے گی۔ تو پھر اصولی مسائل میں ان سے استدلال کیسے ممکن ہوسکتا ہے؟

دوسری بات: ان سے یہ بھی کہا جائے گا کہ: یہ قصہ بالکل واضح جھوٹ ہے۔ سورۂ حشر بالاتفاق بنی نضیر کے بارے میں نازل ہوئی تھی؛ یہ لوگ یہودی تھے۔ یہ واقعہ غزوۂ خندق واحد سے قبل پیش آیا تھا۔ ❶

اس میں نہ ہی مصاف کا ذکر ہے اور نہ ہی شکست کا۔ اور نہ ہی کسی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دانتوں پر پتھر مارا۔ پتھر مارنے کا واقعہ غزوہ احد کا ہے۔ جب کہ مسلمانوں نے بنی نضیر کا بہت سخت محاصرہ کر کے ان کے کھجوروں کے درخت کاٹ ڈالے تھے۔ ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں:

﴿مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَآئِمَةً عَلٰٓى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيُخْزِيَ الْفَاسِقِيْنَ﴾ [الحشر ۵]

''جو بھی کھجور کا درخت تم نے کاٹا، یا اسے اس کی جڑوں پر کھڑا چھوڑا تو وہ اللہ کی اجازت سے تھا اور تا کہ وہ نافرمانوں کو ذلیل کرے۔''

وہ قتال کے لیے اس وقت تک نہیں نکلتے تھے جب تک ان میں سے کوئی ایک شکست کھا کر بھاگ نہ جاتا۔ وہ پشت کی جانب پر واقع ایک قلعہ سے جنگ لڑ رہے تھے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا نقشہ بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿لَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ جَمِيْعًا اِلَّا فِيْ قُرًى مُّحَصَّنَةٍ اَوْ مِنْ وَّرَآءِ جُدُرٍ بَاْسُهُمْ بَيْنَهُمْ شَدِيْدٌ تَحْسَبُهُمْ جَمِيْعًا وَّقُلُوْبُهُمْ شَتّٰى ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ﴾ [الحشر ۱۴]

''وہ اکٹھے ہو کر تم سے نہیں لڑیں گے مگر قلعہ بند بستیوں میں، یا دیواروں کے پیچھے سے، ان کی لڑائی آپس میں بہت سخت ہے۔ تو خیال کرے گا کہ وہ اکٹھے ہیں، حالانکہ ان کے دل الگ الگ ہیں، یہ اس لیے کہ بے شک وہ ایسے لوگ ہیں جو عقل نہیں رکھتے۔''

---

❶ منہاج کے معتمد ترین نسخہ میں اور اس کے اختصارات میں یوں ہی آیا ہے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ غزوہ بنی نضیر غزوہ احد کے بعد اور غزوہ خندق سے پہلے کے درمیانی عرصہ میں پیش آیا تھا۔ دیکھیں: سیرت ابن ھشام؛ الرحیق المختوم و کتب السیرۃ المعتبرۃ۔ [آغا دلدار]

پھر یہ کہ نبی کریم ﷺ نے انہیں جلاوطن کردیا تھا' ان میں سے کسی ایک کو بھی قتل نہیں کیا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿هُوَ الَّذِيْ اَخْرَجَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ دِيَارِهِمْ لِاَوَّلِ الْحَشْرِ مَا ظَنَنْتُمْ اَنْ يَّخْرُجُوْا وَظَنُّوْا اَنَّهُمْ مَانِعَتُهُمْ حُصُوْنُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَاَتَاهُمُ اللّٰهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوْا ....إلىَ.... فَاعْتَبِرُوْا يَاُولِي الْاَبْصَارِ﴾ [الحشر ۲]

''وہی ہے جس نے اہل کتاب میں سے ان لوگوں کو جنھوں نے کفر کیا پہلے اکٹھ ہی میں ان کے گھروں سے نکال باہر کیا۔ تم نے گمان نہ کیا تھا کہ وہ نکل جائیں گے اور انھوں نے سمجھ رکھا تھا کہ یقیناً ان کے قلعے انھیں اللہ سے بچانے والے ہیں۔ تو اللہ ان کے پاس آیا جہاں سے انھوں نے گمان نہیں کیا تھا ....، پس عبرت حاصل کرو اے آنکھوں والو!۔''

ابن اسحق رحمہ اللہ نے ان کے نقض عہد کا ذکر کیا ہے ۔ یہ لوگ رسول اللہ ﷺ کو اس وقت قتل کرنا چاہتے تھے جب آپ [حسب معاہدہ] عمرو بن امیہ کے ہاتھوں قتل ہونے والے دو مقتولین کی دیت ادا کرنے میں تعاون کیلئے ان کے پاس گئے ۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے ان لوگوں کے طرف نکلنے اور ان کے ساتھ جنگ کی تیاری کرنے کا حکم دیا۔ مدینہ پر آپ نے حضرت عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کو اپنا جانشین مقرر فرمایا۔ ابن ہشام نے ایسے ہی ذکر کیا ہے ۔ اسی دوران حرمت شراب نازل ہوئی ۔

ابن اسحق رحمہ اللہ لکھتے ہیں: بنی نضیر قلعہ بند ہو گئے تھے ۔ پس رسول اللہ ﷺ نے ان کے کھجور کے درخت کاٹنے اور انہیں آگ لگانے کا حکم دیا۔ انہوں نے آواز لگائی: اے محمد! آپ تو فساد پھیلانے سے منع کرتے تھے؛ اور فسادی انسان پر اس کے فساد کو عیب شمار کرتے تھے؛ تو پھر آپ کو کیا ہوگیا کہ آپ کھجوریں کاٹتے اور انہیں جلاتے ہیں؟۔''

آپ فرماتے ہیں: بنی عوف بن خزرج میں سے ایک جماعت نے کچھ لوگ بنی نضیر کے پاس بھیجے تھے اور ان سے کہا تھا: تم ہرگز ہتھیار نہ ڈالنا؛ بلکہ آپ قلعہ بند اور ثابت قدم رہو۔ ہم تمہیں ہرگز مسلمانوں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑیں گے ۔ اگر وہ تمہارے ساتھ جنگ کریں گے تو ہم بھی تمہارے ساتھ مل کر جنگ کریں گے ۔ اور اگر تم یہاں سے نکلے تو ہم بھی تمہارے ساتھ یہاں سے نکلیں گے ۔ یہ لوگ اپنی نصرت کا انتظار کرنے لگے ۔ مگر بنی عوف نے کچھ بھی نہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا۔ آخر کار انہوں نے خود یہ پیش کش کی کہ انہیں قتل نہ کیا جائے ؛ بلکہ اس بات پر مصالحت ہوگئی کہ ان کو جلا وطن کردیا جائے گا۔ اور انہیں وہ سامان ساتھ لیکر جانے کی اجازت ہوگی جو ان کے اونٹ اٹھا سکیں؛ سوائے حلقات کے ۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ انہوں نے اپنا وہ تمام سامان ساتھ لے لیا جو ان کے اونٹ اٹھا سکتے تھے ۔ جنگی ساز و سامان کے سوا اپنا تمام سامان اونٹوں پر لاد کر لے گئے ۔ یہاں تک کہ ان میں سے کوئی آدمی اپنے ہاتھ سے اپنے مکان کو گراتا اور اس کا ملبہ بھی اونٹوں پر لاد کر لے جاتا۔ یہ یہودی خیبر و شام کی طرف نکل گئے ۔ [1]

---

[1] سيرة ابن هشام(ص:٤٦٠ـ٤٦١)، طبقات ابن سعد(٢/ ٦٩)، مصنف عبد الرزاق (٥/ ٣٦٨ـ٣٦٩)، دلائل النبوة (٣/ ٤٠٤ـ٤٠٥)۔

فصل:

[غزوہ سلسلہ]

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:''غزوۂ سلسلہ میں ایک اعرابی نے نبی کریم ﷺ کو بتایا کہ کفار مدینہ میں آپ پر حملہ کرنا چاہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: کون شخص جو میرا جھنڈا لیکر چلے گا؟'' ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: یارسول اللہ! میں حاضر ہوں۔'' نانچہ آپ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو سات سو صحابہ کی معیت میں جھنڈا دے کر روانہ کیا۔ جب آپ دشمنوں کی طرف پہنچے تو انھوں نے کہا: اپنے ساتھی کے پاس لوٹ جایئے، ہماری تعداد بہت ہے۔ آپ واپس چلے گئے۔ دوسرے روز آپ نے فرمایا: کون شخص جو میرا جھنڈا لے کر چلے گا؟'' چنانچہ آپ نے جھنڈا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو تھما دیا' ان کے ساتھ بھی یہی واقعہ پیش آیا۔ تیسرے روز آپ نے فرمایا: علی کہاں ہیں؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! میں یہ موجود ہوں۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جھنڈا دے کر رخصت کیا۔ آپ ان لوگوں کی طرف روانہ ہوئے؛ صبح کی نماز کے بعد آپ وہاں پر پہنچے۔ آپ نے دشمن کے چھ سات آدمی ہلاک کر دیے۔ اور باقی بھاگ گئے اللہ تعالیٰ نے امیر المؤمنین کے فعل کی قسم اٹھاتے ہوئے یہ آیت کریمہ نازل کی: ﴿وَالْعَادِيَاتِ ضَبْحًا﴾ (العادیات: ۱) ''اور قسم ہے سرپٹ دوڑتے گھوڑوں کی!'' [انتہی کلام الرافضی]

[جواب]: ہم کہتے ہیں کہ: جاہل ترین انسان بھی آپ سے پوچھ سکتا ہے کہ اس واقعہ کی سند بیان کیجیے تاکہ اس واقعہ کا صحیح ہونا ثابت ہوجائے۔ جب کہ اہل علم آپ سے یہ کہہ سکتے ہیں: [ایسا کوئی غزوہ سرے سے وقوع پذیر ہی نہیں ہوا]۔ یہ غزوہ -اور جو کچھ تم نے اس کی حکایات بیان کی ہیں- اسی قسم کا جھوٹ ہے جو طرقیہ بیان کرتے ہیں۔ جو کہ کثرت کے ساتھ افسانہ گوئی میں جھوٹ بولتے ہیں جیسے عنترہ اور بطال کے لایعنی افسانے لوگوں میں مشہور ہیں۔ اگرچہ عنترہ کے کچھ مختصر واقعات ہیں بھی۔ اور ایسے ہی بطال کی کچھ سوانح حیات موجود ہے۔ یہ وہ واقعات ہیں جو بنوامیہ کی حکومت میں اہل روم کے ساتھ غزوات میں پیش آئے۔ لیکن ان کے ساتھ جھوٹوں نے اتنے واقعات ملا لیے کہ ان کی کئی مجلد تیار کر لیں۔ اور ایسے ہی شطار کی حکایات' احمد دنف' زیبق مصری جو کہ ایسی حکایات بیان کرتے ہیں جنہیں وہ اپنی طرف گھڑ کر ہارون اور جعفر کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ پس ان غزوات کی کہانیاں بھی اسی جنس کی کہانیوں سے ہیں۔ مندرجہ ذیل علماء نے سیر و مغازی کے فن میں بڑی مہارت حاصل کی تھی، مگر ان میں سے کسی نے بھی یہ واقعہ بیان نہیں کیا:

مغازی کے مشہور علماء کے اسماء یہ ہیں: عروہ، زہری، ابن اسحاق، موسیٰ بن عقبہ، ابومعشر سندھی، لیث بن سعد، ابواسحاق فزاری، ولید بن مسلم، واقدی، یونس بن بکیر، ابن عائذ اور ان کے نظائر و امثال وغیرہ۔ نہ ہی ان کا ذکر حدیث میں ہے اور نہ ہی اس بارے میں قرآن نازل ہوا ہے۔

خلاصہء کلام! رسول اللہ ﷺ کے مغازی؛ خصوصاً جن میں قتال کی نوبت پیش آئی؛ بہت ہی مشہور و معروف ہیں۔ اور اہل علم کے ہاں ان کے احوال کو تواتر کے ساتھ ضبط بھی کیا گیا ہے؛ اور تفسیر و حدیث' فقہ و سیرت اور مغازی کی کتابوں میں ان

کا تذکرہ بھی موجود ہے۔ یہ وہ واقعات ہیں جن کو نقل کرنے کے دواعی و اسباب موجود تھے۔ یہ بات عادت و شریعت میں ممتنع ہے کہ نبی کریم ﷺ کا کوئی ایسا غزوہ ہوا ہو؛ جس میں اتنا بڑا واقعہ پیش آیا ہو' مگر پھر بھی اہل علم میں سے کوئی ایک بھی اسے نقل نہ کرے۔ بالکل اسی طرح ممتنع ہے جیسے کوئی دن اور رات میں پانچ نمازوں سے زیادہ کو فرض قرار دیدے۔ یا سال میں ایک ماہ سے زیادہ کے روزوں کو فرض قرار دے' جب کہ ایسی کوئی بات منقول نہیں ہے۔ اور جیسا کہ یہ بات ممتنع ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اہل فارس کے ساتھ عراق میں غزوات کیے ہوں' یا پھر آپ یمن گئے ہوں۔ کسی ایک نے بھی یہ بات نقل نہیں کی۔ اس طرح کی کئی دیگر باتیں بھی ہیں جو اگر رونما ہوئی ہوتیں تو انہیں نقل کرنے کے اسباب موجود تھے۔

مذکورہ صدر سورت کریمہ ﴿اَلْعَادِيَاتِ﴾ کے نزول کے متعلق دو قول ہیں۔

❀ ایک قول یہ ہے کہ: یہ سورت مکہ میں اتری ہے۔ یہ قول ابن مسعود' عطاء اور عکرمہ اور دوسرے مفسرین کا ہے۔ اس قول کی بنیاد پر شیعہ مصنف کا بیان کردہ واقعہ صاف ظاہر طور پر جھوٹا ہے۔

❀ دوسرا قول یہ ہے کہ: یہ سورت مدینہ میں نازل ہوئی۔ یہ حضرت ابن عباس اور حضرت قتادہ سے مروی ہے۔ یہ قول ان لوگوں کے قول کے ساتھ مناسب ہے جو کہ ﴿اَلْعَادِيَاتِ﴾ کی تفسیر مجاہدین کے گھوڑوں سے کرتے ہیں۔

لیکن اس آیت کی تفسیر میں مشہور اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ ﴿اَلْعَادِيَاتِ﴾ سے حاجیوں کے اونٹ مراد ہیں جو مزدلفہ اور منیٰ کے درمیان بھاگتے ہیں۔ یہ تفسیر پہلے قول کے موافق ہے۔ اس کی رو سے حضرت علی کا فرمان خود شیعی دعوی کو جھٹلا رہا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور اکثر مفسرین اس سے مجاہدین کے گھوڑے مراد لیتے ہیں۔

❀ اس روایت کی روشنی میں ثابت ہوتا ہے کہ کفار نے مسلمانوں کی خیر خواہی سے کام لیا۔ اور ابو بکر رضی اللہ عنہ سے کہا: آپ اپنے ساتھی کے پاس واپس چلے جائیے چونکہ ہم بہت بڑی تعداد میں ہیں۔ یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ بات جنگجو [یا پیش معرکہ] کفار کی عادت کے خلاف ہے۔ اور پھر یہ بھی ہے کہ حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کبھی بھی پسپا نہیں ہوئے۔ بعض دروغ گو اپنی طرف یہ بات گھڑ لیتے ہیں کہ حنین کے موقع پر یہ حضرات فرار ہو گئے تھے؛ حقیقت میں یہ حضرات شیخین پر جھوٹا الزام ہے۔

❀ نیز یہ کہ احد اور خندق کے علاوہ کسی بھی موقع پر کسی ایک نے بھی مدینہ پر حملہ کا ارادہ نہیں کیا۔ اور نہ ہی ان دو غزوات کے علاوہ کبھی کفار مدینہ کے اتنے قریب پہنچے ہیں۔ غزوہ غابہ میں بعض لوگوں نے مدینہ کی چراگاہوں پر حملہ کیا تھا۔ جو کچھ غزوہ سلسلہ کے بارے میں نقل کیا گیا ہے' وہ ایسا کھلا ہوا جھوٹ ہے کہ جس کا ذکر جہلاء اور کذابین ہی کر سکتے ہیں۔

❀ جب کہ ذات سلاسل ایک سریہ تھا جس پر رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو روانہ کیا تھا۔ اس لیے کہ یہاں پر ہدف بنو عذرہ کے لوگ تھے۔ حضرت عمرو رضی اللہ عنہ اور بنو عذرہ کے مابین قرابت تھی۔ تو آپ نے انہیں اس لیے روانہ فرمایا کہ شاید یہ لوگ اسلام لے آئیں۔ پھر ان کے پیچھے حضرت ابو عبیدہ بن جراح کو روانہ فرمایا۔ اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ذکر تک نہیں۔ یہ جگہ شام کے قریب اور مدینہ سے بہت دور تھی۔

[غزوۂ بنی مصطلق اور شجاعت حضرت علی رضی اللہ عنہ]

[اشکال] :شیعہ مصنف لکھتا ہے:''حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بنی مصطلق میں سے مالک اور اس کے بیٹے کو قتل کر دیا اور بہت سے لوگوں کو قیدی بنا لیا تھا۔ان جملہ قیدیوں میں حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا بنت الحارث بن ابی ضرار بھی تھیں۔جنہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لیے اختیار کرلیا۔آپ کا والد اس دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور عرض گزار ہوا: یارسول اللہ! میری بیٹی انتہائی شریف خاتون ہے؛ اسے قیدی نہیں بنایا جاسکتا۔پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیدیا کہ اسے اختیار دیا جائے۔ اس کے والد نے کہا: آپ نے بہت اچھی اور خوبصورت بات کہی ہے۔پھر اس نے کہا: اے میری بیٹی اپنی قوم کو رسوا نہ کرنا۔ اس پر حضرت جویریہ نے کہا:''میں اللہ اور اس کے رسول کو اختیار کرتی ہوں۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جواب] :ہم کہتے ہیں کہ:سب سے پہلے جس بھی منقول سے احتجاج کیا جائے' اس کی سند بیان کرنی ضروری ہوتی ہے۔یا پھر اسے ایسی کتاب کی طرف منسوب کیا جائے جس سے حجت قائم ہوسکتی ہو۔وگرنہ اس واقعہ کا علم کیسے ہوگا۔

❀ پھر یہ بھی کہتے ہیں: یہ واقعہ روافض کی بے اصل و بے اسناد من گھڑت مرویات میں شامل ہے۔[شیعہ کی بیان کردہ روایات یا تو بلا اسناد ہوتی ہیں یا ان کے راوی مجہول، کذاب اور متہم بالکذب ہوتے ہیں]۔یہ واقعہ کسی سیرت نویس نے نہیں لکھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے غزوۂ بنی مصطلق میں یہ کارنامہ سرانجام دیا؛ اور نہ ہی حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا کو قیدی بنایا تھا۔جویریہ رضی اللہ عنہا کو جب قیدی بنایا گیا تو انھوں نے بدل کتابت ادا کر کے آزاد ہونے کی خواہش کا اظہار کیا۔نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ رقم ادا کر کے ان کو آزاد کرالیا اور پھر ان کے ساتھ عقد نکاح باندھا۔نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتۂ مصاہرت کے احترام میں سب لوگوں نے اپنے اپنے قیدی رہا کر دیے۔اور کہنے لگے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سسرال ہیں۔[1]

نہ ہی ان کا والد آیا اور نہ ہی کسی چیز میں کوئی اختیار دیا۔

سنن ابوداؤد میں ہے: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جویریہ رضی اللہ عنہا بنت حارث بن المصطلق (جنگ میں پکڑنے کے بعد مال غنیمت کی تقسیم میں) حضرت ثابت بن قیس بن شماس رضی اللہ عنہ یا انکے چچازاد بھائی کے حصہ میں آئیں۔انہوں نے اپنے نفس (کو آزاد کرانے پر) بدل کتابت دینے کا معاہدہ کرلیا۔اور وہ ایک خوبصورت ملاحت والی عورت تھیں جن پر نظریں پڑتی تو نظروں میں بھا جاتی تھیں۔حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ:'' وہ رسول رضی اللہ عنہ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس بدل کتابت کے بارے میں سوال کرتی ہوئی آئیں۔جب وہ دروازہ میں کھڑی ہوگئیں تو میں نے انہیں دیکھا اور ان کے کھڑے ہونے کو ناپسند کیا۔اور مجھے معلوم تھا کہ ابھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کو ویسے ہی دیکھیں گے جیسے میں نے دیکھا ہے۔حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا کہنے لگی: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! میں جویریہ بنت الحارث ہوں اور جو میرا پہلے حال تھا، وہ آپ پر مخفی نہیں ہے۔اور میں ثابت بن قیس بن شماس کے حصہ میں آئی ہوں؛ اور میں نے اسے اپنے نفس (کی آزادی پر) معاہدہ کتابت کرلیا ہے۔پس میں آپ کے پاس اپنے بدل کتابت کے بارے میں سوال کرنے آئی ہوں۔رسول

[1] سنن ابی داؤد، کتاب الخراج۔ باب فی خبر بنی نضیر(ح:۳۰۰۴، ۳۰۰۵)، مصنف عبد الرزاق(۹۷۳۳)۔

اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: کیا تمہارے لیے اس سے بہتر کچھ اور نہیں ہے؟ وہ کہنے لگیں کہ: وہ کیا ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرمایا کہ:'' میں تمہارا بدل کتابت ادا کردوں اور تم سے نکاح کرلوں۔'' وہ کہنے لگی میں نے بیشک کرلیا (یعنی میں بخوشی راضی ہوں)۔حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب لوگوں نے یہ سنا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جویریہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کرلیا تو انہوں نے وہ تمام قیدی (بنی مصطلق کے) جوان کے قبضہ میں تھے،انہیں چھوڑ دیا اور انہیں آزاد کردیا۔اور کہنے لگے کہ:''یہ تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سسرال والے ہیں۔''

[حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں]: ہم نے کوئی عورت اتنی برکت والی نہیں دیکھی اپنی قوم پر جویریہ رضی اللہ عنہا سے زیادہ کہ ان کے سبب سے سو قیدی بنی المصطلق کے آزاد ہوگئے۔''[سنن ابوداود: ح5402]

فصل:

[غزوہ خیبر اور حضرت علی رضی اللہ عنہ]

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:''غزوۂ خیبر میں اللہ تعالیٰ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں مسلمانوں کو فتح عنایت فرمائی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے باری باری ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کو جھنڈا عنایت فرمایا مگر دونوں نے شکست کھائی۔پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو علم عطا کیا؛ آپ کی آنکھوں میں تکلیف تھی؛ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا لعاب ان کی آنکھوں میں لگایا۔آپ جب نکلے تو مرحب کو قتل کیا؛ باقی لوگ شکست کھا کر بھاگ گئے۔انہوں نے قلعہ کا دروازہ بند کردیا۔امیر المؤمنین نے قلعہ کا دروازہ اکھاڑ کر اس کا پل بنالیا۔اس دروازہ کو بیس آدمی بند کیا کرتے تھے۔مسلمان قلعہ میں داخل ہوگئے اور مال غنیمت حاصل کیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:''اللہ کی قسم! علی رضی اللہ عنہ نے یہ دروازہ جو پانچ سو افراد کی قوت سے نہیں اکھاڑا جاسکتا تھا یہ صرف تائید ربانی سے اکھاڑا گیا ہے۔فتح مکہ بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شجاعت و بسالت کی رہین منت تھی۔''[آہ رافضی]

[جواب]: ہم کہتے ہیں: سب سے پہلے تو جھوٹوں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو۔ان سے پوچھا جائے کہ علماء میں سے کس نے یہ واقعہ نقل کیا ہے؟ اور اس کی سند اور صحت کہاں ہے؟ یہ ایک صریح جھوٹ ہے۔اس لیے کہ خیبر کی فتح ایک ہی دن میں حاصل نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ خیبر کے متعدد قلعے تھے؛ بعض جنگ سے فتح ہوئے تھے اور بعض مصالحت سے۔ یہود نے مصالحت کے بعد صلح کی چیزوں میں سے کچھ چیزیں چھپا دیں اور پھر جنگ چھیڑ دی۔حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما نے ہزیمت نہیں اٹھائی تھی۔حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دروازہ اکھاڑا تھا؛ مگر شیعہ کا یہ بیان کہ اسے پل بنالیا تھا جھوٹ ہے۔[یہ بھی بے اصل ہے کہ بیس آدمی اسے بند کیا کرتے تھے]۔

- شیعہ کا دعوی کہ:''فتح مکہ آپ کی ہی رہین منت ہے۔''
- یہ ایک کھلا ہوا جھوٹ ہے۔حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اتنا ہی حصہ لیا تھا جتنا دیگر صحابہ نے۔ فتح مکہ کی بہت ساری روایات متواترہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے۔آپ نے اپنی بہن ام ہانی کے دو دامادوں کو قتل کرنے کی کوشش تھی؛ جنہیں ام ہانی رضی اللہ عنہا نے پناہ دے رکھی تھی۔پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پناہ کو برقرار رکھا؛[اور فرمایا: جسے ام ہانی نے پناہ دی ہے ہم بھی اسے پناہ دیتے ہیں]۔اور پھر آپ نے ابوجہل کی بیٹی سے شادی کرنے کا ارادہ کیا تھا ؛ جس پر رسول

اللہ ﷺ غضبناک ہوئے تو آپ نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''ہم فتح مکہ کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کیساتھ تھے۔ سرور کائنات ﷺ نے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو دائیں بازو پر اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہم اجمعین کو بائیں بازو اور ابوعبیدہ رضی اللہ عنہم اجمعین کو لشکر کے پچھلے حصہ اور بطن وادی پر متعین کیا تھا۔ پھر آپ نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم اجمعین کو بلا کر انصار کو حاضر کرنے کا حکم دیا۔ انصار بھاگتے ہوئے آئے۔ فرمایا: اے انصار کی جماعت! کیا تم قریش کے کمینوں کو دیکھ رہے ہو؟

عرض کیا:''ہاں۔''

فرمایا: جب میدان جنگ میں کل ان سے ملو تو انھیں تہس نہس کر دو۔''

آپ نے اپنا دایاں ہاتھ بائیں پر رکھ کر بتایا کہ یوں انھیں ملیا میٹ کر دو۔ اور فرمایا کوہ صفا کے قریب یہ مقابلہ ہو گا۔ اگلے روز جو شخص بھی نظر آیا انصار نے اسے موت کی نیند سلا دیا۔ نبی کریم ﷺ کوہِ صفا پر چڑھ گئے۔ انصار کوہ صفا کے اردگرد گھومنے لگے۔ اسی دوران ابوسفیان آئے اور کہا: یارسول اللہ! قریش کا نام ونشان مٹ گیا۔ آج کے بعد قریش کہیں نظر نہیں آئیں گے۔ یہ سن کر نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''جو شخص ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو گا وہ باامن رہے گا، جو ہتھیار ڈال دے اس سے بھی تعرض نہیں کیا جائے گا۔ جو اپنا دروازہ بند کر لے گا ہم اس سے بھی کچھ نہیں کہیں گے۔'' [صحیح مسلم(ح:۱۷۸۰)، سنن ابی داؤد(ح:۳۰۲٤)]

صحیحین میں حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

''جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فتح مکہ کے سال روانہ ہوئے تو قریش کو اس کی خبر پہنچ گئی ابوسفیان بن حرب، حکیم بن حزام اور بدیل بن ورقاء (قریش کی جانب سے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خبر لینے کے لئے نکلے یہ تینوں چلتے چلتے (مقام) مرالظہر ان تک پہنچے۔ وہاں بکثرت آگ اس طرح روشن دیکھی جس طرح عرفہ میں ہوتی ہے ۔ابوسفیان نے کہا یہ آگ کیسی ہے؟ جیسے عرفہ میں ہوتی ہے۔ بدیل بن ورقاء نے جواب دیا: بنوعمرو کی آگ ہوگی۔ ابوسفیان نے کہا: بنوعمرو کی تعداد اس سے بہت کم ہے۔ ان تینوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے محافظوں نے دیکھ کر پکڑ لیا اور انہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا ابوسفیان تو مسلمان ہو گئے۔ پھر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم روانہ ہوئے تو آپ نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ: ابوسفیان کو لشکر اسلام کی تنگ گزرگاہ کے پاس ٹھہراؤ، تاکہ یہ لشکر اسلام کا نظارہ کر سکیں۔

انہیں حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے وہاں کھڑا کر دیا۔ اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ قبائل گزرنے شروع ہوئے تو لشکر کا ایک ایک دستہ ابوسفیان کے پاس سے گزرنے لگا۔ چنانچہ جب ایک دستہ گزرا تو ابوسفیان نے پوچھا اے عباس! یہ کون سا دستہ ہے؟ انہوں نے کہا یہ قبیلہ غفار ہے۔

ابوسفیان نے کہا کہ:''میری اور قبیلہ غفار کی تو لڑائی نہ تھی۔ پھر قبیلہ جہینہ گزرا تو اسی طرح کہا۔ پھر سعد بن ہذیم گزرا تو

اسی طرح کہا۔ پھر سلیم گزرا تو اسی طرح کہا۔ پھر ایک دستہ گزرا کہ اس جیسا دیکھا ہی نہ تھا؛ ابوسفیان نے کہا: یہ کون ہے؟ عباس رضی اللہ عنہ نے کہا: ''یہ انصار ہیں ان کے سپہ سالار سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ ہیں۔ جن کے پاس پرچم ہے۔

سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے کہا: اے ابوسفیان! آج کا دن جنگ کا دن ہے؛ آج کعبہ (میں کافروں کا کشت وخون) حلال ہو جائے گا۔ ابوسفیان نے کہا: اے عباس! ہلاکت کا دن کتنا اچھا ہے؟ پھر ایک سب سے چھوٹا دستہ آیا جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے (مہاجر) اصحاب رضی اللہ عنہ تھے۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پرچم حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کے پاس تھا۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ابوسفیان کے پاس سے گزرے تو ابوسفیان نے کہا:

''آپ کو معلوم ہے کہ سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے کیا کہا ہے؟

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کیا کہا ہے؟ ابوسفیان نے کہا: ایسا ایسا کہا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سعد نے صحیح نہیں کہا؛ لیکن آج کا دن تو وہ دن ہے جس میں اللہ تعالی کعبہ کو عظمت و بزرگی عطا فرمائے گا۔ اور کعبہ کو آج غلاف پہنایا جائے گا۔ عروہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے پرچم کو (مقام) حجون میں نصب کرنے کا حکم دیا۔'' [صحیح بخاری: حدیث نمبر ١٤٤٨]

فصل:

[غزوۂ حنین اور بسالتِ حضرت علی رضی اللہ عنہ]

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ''غزوہ حنین میں آپ دس ہزار کا لشکر لے کر نکلے تو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انہیں نظر لگائی اور فخریہ انداز میں کہا: آج ہماری کثرت کی وجہ سے ہم پر کون غالب آ سکتا ہے؟ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صحابہ بھاگ کھڑے ہوئے اور آپ کے ساتھ صرف نو ہاشمی اور ایمن بن ام ایمن باقی رہ گئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ آپ کے سامنے تلوار چلا رہے تھے؛ آپ نے مشرکین کے چالیس آدمی قتل کر دیے، باقی مشرک بھاگ گئے۔''

[جواب]: ہم کہتے ہیں: اس واقعہ کی کوئی صحیح سند دکھاؤ۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے نظر لگانے کا قصہ بھی خودساختہ جھوٹ ہے۔ ہمارے سامنے کتب مسانید اور سِیَر اور تفاسیر پڑی ہیں، کسی ایک کتاب میں بھی یہ مذکور نہیں کہ مسلمانوں کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی نظر لگ گئی تھی۔ جب کہ ماثور الفاظ جو بعض مسلمانوں نے کہے تھے وہ یہ ہیں کہ:

''آج ہم قلت تعداد کی وجہ سے مغلوب نہیں ہو سکتے۔''[1]

❀ ایسے ہی یہ بات بھی جھوٹ ہے کہ: ''آپ کے ساتھ بنی ہاشم کے نو آدمی باقی رہ گئے تھے۔''

ابن اسحاق رحمہ اللہ کا قول ہے کہ مہاجرین و انصار اور آپ کے اہل بیت کی ایک جماعت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ باقی رہی تھی۔ مہاجرین میں سے حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما؛ اہل بیت میں سے حضرت علی و عباس رضی اللہ عنہما و ابوسفیان بن الحارث اور اس کا بیٹا؛ فضل بن عباس؛ ربیعہ بن الحارث؛ اُسامہ بن زید ایمن بن ام ایمن رضی اللہ عنہم اجمعین کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت میں ثابت قدم رہے تھے۔ [مسند احمد ١/ ٤٥٣]

---

[1] سیرۃ ابن ھشام (ص: ٥٦٥)، طبقات ابن سعد (٢/ ١٥٠) مجمع الزوائد (٦/ ١٧٨)، دلائل النبوۃ (٥/ ١٢٣)۔

بعض لوگوں نے قثم بن عباس کو ان میں شمار کیا ہے' ابن ابی سفیان کو شمار نہیں کیا۔ یہ علامہ ابن اسحق رحمہ اللہ کا کلام ہے۔

[اشکال]: شیعہ کا قول کہ: ''علی رضی اللہ عنہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تلوار چلاتے ہوئے چالیس آدمیوں کو قتل کیا تھا۔''

[جواب]: یہ صریح کذب ہے۔ اور اس کے جھوٹ ہونے پر تمام اہل معرفت محدثین سیرت نگاران اور اصحاب المغازی کا اتفاق ہے۔ [کسی قابل اعتماد شخص نے یہ بات نہیں کہی]۔ اس قصہ میں اتنی بات ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمان بوقت فجر وادی حنین میں پہنچے تو یہ لوگ بڑے تیر انداز تھے؛ انہوں نے یکبارگی تیروں کی برسات کر دی۔ اس وجہ سے لوگ پیٹھ پھیر کر بھاگ گئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم آپ کیساتھ آپ کے چچا عباس اور ابوسفیان بن الحارث ثابت قدم رہے۔ یہ شاعر تھے؛ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو کیا کرتے تھے؛ مگر پھر بعد میں مسلمان ہوئے اور بہترین مسلمان ثابت ہوئے؛ اس دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ثابت قدم رہے۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں اور ابوسفیان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چپک گئے تھے' ہم نے آپ کا ساتھ نہیں چھوڑا۔

❀ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ آپ لوگوں کو آواز دیکر جمع کریں۔ آپ بلند آواز والے تھے۔ آپ نے آواز لگائی: اے اہل شجرہ! اے اہل سورت بقرہ! یعنی ایسے لوگو جنہوں نے درخت کے نیچے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کی تھی۔ آپ نے انہیں بیعت یاد دلائی جس میں انہوں نے پیچھے نہ ہٹنے اور جانیں نثار کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ پھر اس کے ساتھ ہی بقرہ کا تذکرہ کیا کیونکہ گائے اپنے بچے پر بڑی مہربان ہوتی ہے۔ پھر ان لوگوں نے قتال کیا یہاں تک مشرکین کو شکست ہوئی۔'' اس وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ریت کی ایک مٹھی بھر کر مشرکین کے مونہوں پر دے ماری تھی اور فرمایا تھا: ''رب کعبہ کی قسم! یہ لوگ شکست پا گئے۔''

بخاری و مسلم میں حضرت براء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خچر پر تھے اور یہ شعر پڑھ رہے تھے:

" اَنَا النَّبِیُّ لَا کَذِبْ۔ اَنَا ابْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبْ۔"

''میں نبی ہوں اس میں کوئی جھوٹ نہیں۔ میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں۔''

صحیحین میں حضرت براء سے روایت ہے؛ ان سے ایک شخص نے کہا: اے ابوعمارہ! کیا تم لوگ حنین کے دن بھاگ گئے تھے؟ انہوں نے کہا نہیں اللہ کی قسم! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہیں بھاگے۔ [بلکہ آپ کے نوعمر اصحاب جن کے پاس ہتھیار نہ تھے وہ چلے گئے تھے]۔ اور وجہ یہ ہوئی کہ ان کا واسطہ قبیلہ ہوازن کے تیر اندازوں سے پڑا۔ وہ ایسے مشاق تھے کہ ان کا کوئی تیر خالی نہیں جاتا تھا۔ انہوں نے ان کو تیروں پر رکھ لیا اس وجہ سے وہ ہٹ گئے۔ اس کے بعد وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے اس وقت آپ اپنے سفید خچر پر سوار تھے، جس کو آپ کے چچا کے بیٹے، ابوسفیان بن حارث بن عبدالمطلب ہانک رہے تھے۔ پس آپ اترے اور آپ نے ارحم الراحمین سے مدد مانگی اس کے بعد فرمایا:

" اَنَا النَّبِیُّ لَا کَذِبْ۔ اَنَا ابْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبْ۔"

''میں نبی ہوں اس میں کوئی جھوٹ نہیں۔ میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں۔''

حضرت براء فرماتے ہیں شدید جنگ کی حالت میں ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اوٹ میں بچاؤ حاصل کیا کرتے تھے۔ ہم اس

شخص کو بہادر سمجھا کرتے تھے جو آپ کے برابر ہوا کرتا تھا۔ ❶

صحیح مسلم میں حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ غزوۂ حنین میں جب کفار نے آپ کو گھیر لیا تو آپ نے سواری سے اتر کر مٹی کی ایک مٹھی لی ؛ پھر کفار کی طرف متوجہ ہوئے [اور ان پر مٹی پھینکتے ہوئے] فرمایا:''شَاهَتِ الْوُجُوْه'' اللہ کرے یہ چہرے ذلیل ہوں ۔'' ان میں کوئی بھی انسان اللہ تعالیٰ نے ایسا نہیں پیدا کیا تھا مگر ان سب کی آنکھیں اس ایک مٹی سے بھر گئیں اور وہ پیٹھ پھیر کر چل دیے؛ اللہ تعالیٰ نے ان کو شکست دی؛ اور رسول اللہ ﷺ نے ان کے مال غنیمت مسلمانوں میں تقسیم کیے ۔''❀

فصل:

[غیبی خبریں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ]

[اشکال] : شیعہ مصنف لکھتا ہے:'' حضرت علی رضی اللہ عنہ غیب کے اور وقوع پذیر ہونے والے واقعات سے قبل از وقت آگاہ کر دیا کرتے تھے ۔حضرت طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما نے جب عمرہ کرنے کی اجازت طلب کی تھی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا کہ:''اللہ کی قسم ! آپ کا مقصد عمرہ کرنا نہیں، بلکہ بیشک آپ بصرہ جانا چاہتے ہیں ۔ آپ کا ارشاد بجا تھا ۔حضرت علی رضی اللہ عنہ ذی قار کے مقام پر بیعت لے رہے تھے تو آپ نے فرمایا تھا: کوفہ کی طرف سے ایک ہزار آدمی آئیں گے ۔نہ کم ہوں گے نہ زیادہ؛ وہ موت پر میری بیعت کریں گے ۔ چنانچہ اسی طرح ہوا ۔ان میں سے آخری شخص اُوَیس قرنی تھے ۔ آپ نے پستان والے خارجی کے قتل کی خبر دی تھی ۔ چنانچہ ویسے ہی ہوا ۔نہروان کے قصہ میں ایک شخص نے قوم کے نہر کو عبور کر جانے کی خبر دی ۔تو آپ نے فرمایا:'' وہ ہرگز اسے عبور نہیں کر سکیں گے ۔'' پھر ایک دوسرے نے آکر یہی خبر دی تو آپ نے فرمایا:'' وہ ہرگز عبور نہیں کر سکیں گے ؛ بلکہ یہی جگہ ان کے موت کا گھاٹ ثابت ہوگی'' پس ویسے ہی ہوا ۔''

آپ نے قبل از وقت اپنے قتل سے آگاہ کر دیا تھا ۔آپ نے ابن شہر یار ملعون کے بارے میں فرمایا تھا کہ اس کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیے جائیں گے ؛ اور اسے سولی دی جائے گی ۔ چنانچہ معاویہ رضی اللہ عنہ نے اسے سولی چڑھا دیا ۔ آپ نے میثم کھجور فروش سے کہا تھا کہ دارِ باب عمرو پر دس آدمیوں کو پھانسی دی جائیگی، ان میں دسواں شخص میثم ہوگا ۔'' اور وہ ان کے تختہ سے چھوٹا ہوگا ۔ آپ نے اسے وہ کھجور کا درخت بھی دکھایا تھا جس پر اسے پھانسی دی جانے والی تھی اور اسی طرح وقوع میں آیا ۔

❀ آپ نے رُشید الہجری کو بتایا تھا کہ اس کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیے جائیں گے اور اسے پھانسی دی جائے گی ؛ اور اس کی زبان کاٹ دی جائے گی ۔ چنانچہ ایسے ہی ہوا ۔ آپ نے خبر دی تھی کہ حجاج کُمیل بن زیاد کو قتل کرے گا ؛ اور قنبر کو ذبح کرے گا ۔ چنانچہ اسی طرح ہوا ۔

❀ '' حضرت علی رضی اللہ عنہ نے براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے کہا تھا کہ:'' میرے بیٹے حسین رضی اللہ عنہ کو قتل کیا جائے گا اور تم اس کی مدد

---

❶ صحیح بخاری ، کتاب الجهاد ، باب من قاد دابة غيره فی الحرب (ح:٢٨٦٤) ، صحیح مسلم ، کتاب الجهاد ۔ باب غزوة حنين (ح:١٧٧٦) ۔ ❀صحیح مسلم ۔ کتاب الجهاد ، باب غزوة حنين (حديث:١٧٧٧) ۔

نہیں کرو گے؛ اور اسی طرح ہوا۔ اور آپ نے اپنے بیٹے کی قتل گاہ کے بارے میں خبر دی تھی۔

❀ نیز آپ نے فرمایا تھا کہ: ''بنو عباس آسانی سے اقتدار سنبھال لیں گے۔ اور پھر ترک ان سے ملک چھینیں گے۔ آپ نے فرمایا: ''بنی عباس کی شاہی آسان ہوگی؛ اس میں کوئی سختی نہیں ہوگی۔ اور اگر ترک و دَیلم اور ہند و سندھ؛ بربر [افریقہ] اور طیلسان [فارس] کے لوگ مل کر ان کی سلطنت چھیننا چاہیں تو اس پر قادر نہ ہوں گے؛ جب تک کہ ان کے موالی اور ارباب دولت ان سے الگ نہ ہو جائیں۔ ترک کا ایک بادشاہ ان پر مسلط ہوگا وہ اس جگہ سے آئے گا جہاں سے ان کی سلطنت کا آغاز ہوا تھا۔ جس شہر پر سے اس کا گزر ہوگا اسے فتح کریگا۔ اس کے مقابلہ کے لیے جو جھنڈا بلند کیا جائے گا وہ اسے سرنگوں کر دے گا، جو اس کی مخالفت کرے گا اس کے لیے ہلاکت و تباہی ہے۔ وہ برابر ان سب پر کامیابی حاصل کرتا رہے گا۔ پھر یہ کامیابی میرے اہل بیت کے ایک شخص کو سونپ دیگا۔ [یعنی اس کی کامیابی کا انحصار میرے اہل بیت کے ایک شخص پر ہوگا] جو حق کی بات کہے گا اور حق پر عمل پیرا ہوگا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جس طرح فرمایا تھا اسی طرح ہوا اور ہلاکو خان خراسان کے علاقہ سے نکل کر حملہ آور ہوا۔'' اور آپ سے ہی بنی عباس کے اقتدار کی ابتداء ہوئی۔ یہاں تک کہ ابو مسلم خراسانی نے ان کی بیعت کر لی۔'' (شیعہ مصنف کا بیان ختم ہوا۔)

[جواب]: ہم کہتے ہیں: ''بعض غیبی امور کی خبریں دینا تو جو لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کم درجہ کے صلحاء بھی اس طرح کی خبریں دیا کرتے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان تو اس سے بہت زیادہ بلند و ارفع ہے۔ حضرت ابوبکر و عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین کے اتباع کاروں میں ایسے لوگ تھے جو اس سے بڑھ کر خبریں دیا کرتے تھے۔ مگر اس کے باوجود یہ لوگ امامت و خلافت کے اہل نہ تھے۔ اور نہ ہی وہ اپنے زمانہ کے باقی لوگوں سے افضل تھے۔ اسی کی مثالیں ہمارے اس دور میں بھی موجود ہیں' اور دیگر ادوار میں بھی ہوتی رہی ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ و حذیفہ رضی اللہ عنہما و دیگر صحابہ سے اس سے کئی گنا زیادہ خبریں نقل کی گئی ہیں۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ مرفوعاً ایسی روایات بیان کرتے اور حذیفہ رضی اللہ عنہ کبھی مرفوع کرتے اور کبھی موقوف روایت کرتے ہیں۔ مگر اس کا حکم مسند کا ہوتا ہے۔ جن باتوں کی آپ نے خبر دی ہے' یا دوسری اس قسم کی باتیں یا تو انھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر بیان کی ہیں یا وہ ان کے کشف پر مبنی ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی اس طرح کی کئی خبریں دی ہیں۔

کرامات اولیاء اور ایسی خبروں کے بارے میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں؛ ان میں: امام احمد کی کتاب الزہد۔ ابو نُعیم کی حِلیۃ الاولیاء؛ ابن جوزی کی ''صفوۃ الصفوۃ'' اور ابن ابی الدنیا، ابو بکر بن خلال اور لالکائی کی کتابوں میں کرامات الاولیاء کا بیان ہے۔ ان میں حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے پیروکاروں کے قصے بھی ہیں جیسے حضرت علاء بن حضرمی رضی اللہ عنہ جو کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے نائب تھے؛ اور ابو مسلم خولانی؛ اور اس کے بعض اتباع کار۔ اور ابی صہباء؛ عامر بن عبد قیس؛ اور ان میں دیگر لوگوں کے قصے ہیں جن سے حضرت علی رضی اللہ عنہ ہزار درجہ افضل ہیں۔ ان میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کی وجہ سے یہ کہہ سکیں کہ یہ انسان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے افضل ہے؛ پھر خلفاء راشدین کی تو شان ہی نرالی ہے۔

شیعہ مصنف نے غیبی خبروں سے متعلق حضرت علی رضی اللہ عنہ کے جو یہ واقعات تحریر کیے ہیں؛ ان میں سے کسی ایک واقعہ کی بھی کوئی سند ذکر نہیں کی جس کی وجہ سے اس کی صحت کا پتہ چل سکے۔ ان میں کچھ چیزیں ایسی ہیں جن کا صحیح ہونا معلوم ہے:

اور کچھ چیزوں کا جھوٹ ہونا صاف ظاہر اور واضح ہے۔ اور کچھ باتوں کے سچ یا جھوٹ ہونے کا کوئی پتہ نہیں چل رہا۔

ترک بادشاہ کے بارے میں جو خبر ذکر کی ہے' وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر جھوٹا الزام ہے۔ اس لیے کہ آپ نے اپنی کامیابی اہل بیت کے کسی شخص کو نہیں سونپی تھی؛ یہ جھوٹ بعد میں آنے والے شیعہ نے گھڑ لیا ہے۔ [ہلاکو نے کسی علوی کو ضرر نہیں پہنچایا تھا]۔

غیب کی خبروں پر مشتمل کتب جو کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ یا اہل بیت کی طرف منسوب ہیں' یہ تمام جھوٹ ہیں؛ جیسے کتاب ''الجفر ؛ کتاب البطاقہ وغیرہ دیگر کتابیں۔ اور ایسے ہی جو علوم حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں کہ یہ علم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے باقی صحابہ کرام کو چھوڑ کر بطور خاص آپ کو بتایا تھا؛ [یہ بھی جھوٹی باتیں ہیں]۔

ایسے ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علاوہ جس کسی دوسرے صحابی کے بارہ میں کہا جاتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے باقی صحابہ کرام کو چھوڑ کر انہیں کوئی خاص علم سکھایا تھا: تو یہ سب باتیں جھوٹ ہیں۔

صحیح بخاری میں حضرت ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا:

''کیا آپ کے پاس کوئی چیز ہے جو قرآن میں نہیں۔ اور بعض دفعہ اس طرح کہا گیا کہ جو لوگوں کے پاس نہیں؟ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ قسم ہے اس ذات کی جس نے دانے کو اگایا اور جان کو پیدا کیا! ہمارے پاس وہی چیز ہے جو قرآن میں ہے سوائے فہم کتاب کے جو کسی شخص کو دیا جاتا ہے اور اسکے جو صحیفہ میں ہے میں نے پوچھا صحیفہ میں کیا ہے، انہوں نے کہا کہ دیت اور قیدی کو آزاد کرنے کے متعلق احکام ہیں اور یہ کہ مسلم کافر کے عوض قتل نہ کیا جائے گا۔ [صحیح بخاری: ج ۳ :ح ۱۸۱۱]

اور ایسے ہی وہ تمام روایات جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علاوہ دیگر صحابہ کے بارے میں روایت کی جاتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں کوئی خاص علم باطن سکھایا تھا؛ یہ تمام باتیں باطل ہیں۔

یہ اس روایت کے منافی نہیں ہے جسے صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا گیا ہے آپ فرماتے ہیں:

((حفظت من رسول الله صلى الله عليه وسلم وعاء ين فأما أحدهما فبثثته وأما الآخر فلو بثثته قطع هذا البلعوم))

''میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دو ظرف (علم کے) یاد کر لئے ہیں، ان میں سے ایک کو تو میں نے ظاہر کر دیا، اور دوسرے کو اگر ظاہر کروں تو کھانے کی رگ کاٹ لی جائے۔''

بلا ریب یہ حدیث صحیح ہے۔ اور اس میں کوئی ایسی چیز بھی نہیں ہے جس سے ظاہر ہوتا ہو کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو کوئی خاص علم سکھایا تھا۔ بلکہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ دوسرے صحابہ سے زیادہ یاد رکھنے والے تھے۔ اس لیے آپ نے وہ چیزیں یاد رکھیں جو دوسرے صحابہ یاد نہ رکھ سکے۔

اور ایسے ہی صحیحین میں ہے کہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

'' اللہ کی قسم! میں لوگوں میں سب سے زیادہ ان فتنوں کو جانتا ہوں جو میرے اور قیامت کے درمیان پیش آنے والے ہیں۔ اور مجھے ان فتنوں کے بتانے سے صرف یہی بات مانع ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض راز کی

باتیں مجھے بتائی ہیں جنہیں میرے علاوہ کسی سے بھی ذکر نہیں کیا۔لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتنوں کے بارے میں فرمایا اس حال میں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مجلس میں تھے جس میں میں بھی موجود تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتنوں کو شمار کرتے ہوئے ...... حذیفہ نے کہا:''میرے علاوہ باقی سب قوم مجلس اب اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔''[صحیح مسلم:حدیث نمبر ۲۷٦۳]

صحیحین میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ ہمارے درمیان کھڑے ہوئے؛ اور اس کھڑے ہونے کے وقت سے لے کر قیام قیامت تک کے تمام حالات کو بیان کر دیا پس جس نے انہیں یاد رکھا اس نے انہیں یاد رکھا؛ اور جو بھول گیا سو بھول گیا۔''[صحیح مسلم: حدیث نمبر ۲۷٦٤]

حضرت ابوزید عمرو بن اخطب سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں نماز فجر پڑھائی اور منبر پر چڑھے تو ہمیں خطبہ دیا یہاں تک کہ نماز کا وقت آ گیا؛ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اترے اور نماز پڑھائی پھر منبر پر چڑھے اور ہمیں خطبہ دیا؛ یہاں تک کہ عصر کی نماز کا وقت آ گیا۔ پھر اترے اور نماز پڑھائی پھر منبر پر چڑھے اور ہمیں خطبہ دیا۔ یہاں تک کہ سورج غروب ہو گیا تو ہمیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام باتوں کی خبر دی جو پہلے ہو چکی ہیں اور جو آئندہ پیش آنے والی تھیں پس ہم میں سے سب بڑا عالم وہی ہے جس نے ہم میں سے ان باتوں کو زیادہ یاد رکھا۔''[صحیح مسلم:ح۲۷٦۸]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فتح خیبر والے سال اسلام قبول کیا۔آپ کو چار سال سے بھی کم عرصہ نبی کریم ﷺ کی صحبت میسر آئی۔ان کی اس تھیلی میں علم دین' ایمان ؛ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں سے کوئی بھی چیز نہیں تھی۔اس میں مستقبل کے امور کی خبریں تھیں۔مثال کے طور پر وہ فتنے جو مسلمانوں کے مابین پیش آئے ؛ جیسے جنگ جمل اور صفین کا فتنہ؛ ابن زبیر کا فتنہ؛ مقتل حسین رضی اللہ عنہ اور اس طرح کی دیگر خبریں تھیں۔ اسی لیے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ دوسرے لوگوں کے ساتھ فتنوں میں شریک نہیں ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:''اگر ابو ہریرہ تم سے یہ حدیث بیان کرتے کہ تم اپنے خلیفہ کو قتل کرو گے' اور تم ایسے ایسے کام کرو گے تو تم لوگ کہتے:''ابو ہریرہ جھوٹ بول رہا ہے۔''

اور وہ حدیث جسے رازدان نبوت حضرت ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا گیا ہے' جسے ان کے علاوہ کوئی بھی نہیں جانتا؛ صحیح بخاری میں ابراہیم نخعی سے روایت ہے: حضرت علقمہ شام گئے ؛جب آپ وہاں پہنچے تو ایک مسجد میں آئے اور دو رکعت نماز پڑھی اور دعا کی کہ یا اللہ ہمیں کوئی اچھا ہم نشین عطا کر۔پھر حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کے پاس بیٹھ گئے۔

حضرت ابودرداء نے پوچھا کہ تم کہاں کے رہنے والے ہو؟

انہوں نے کہا کہ: کوفہ کا رہنے والا ہوں۔علقمہ نے کہا: کیا تم میں وہ شخص نہیں ہے جو اس راز کا جاننے والا ہے کہ اس کے سوا کوئی نہیں جانتا؟ یعنی حذیفہ رضی اللہ عنہ۔کیا تم میں وہ شخص نہیں ہے؟ یا یہ کہا کہ کیا تم میں وہ شخص نہیں تھا جس کو اللہ تعالی نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان پر شیطان سے پناہ دیدی ہے یعنی عمار رضی اللہ عنہ ؟ میں نے کہا: کیوں نہیں! ضرور ہیں ......

[یہ ایک لمبی حدیث کا حصہ ہے۔ [صحیح بخاری:حدیث نمبر ۱۲۱۵]

یہ راز بعض ان منافقین کی شخصیات کا تعین تھا جو غزوہ تبوک میں شریک تھے۔انہوں نے ارادہ کیا تھا کہ رات کے

اندھیرے میں رسول اللہ ﷺ کی اونٹنی کی رسی کھول کر آپ کو گرادیں ۔مگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو خبردار کردیا۔ اس وقت حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ قریب تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے انہیں ان لوگوں کے نام بتادیئے ۔ پس جب کوئی مجہول الحال انسان مرجاتا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس وقت تک اس کا جنازہ نہ پڑھتے جب تک حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ اس جنازہ میں شریک نہ ہوں ۔ اس لیے کہ آپ کو اندیشہ رہتا تھا کہ کہیں منافقین کا جنازہ نہ پڑھادیں۔

پس بعض صحابہ اور صالحین کا مستقبل کے بعض امور کو جان لینا اس بات کو واجب نہیں کرتا کہ وہ ان تمام امور کا عالم ہے۔ وہ غالی شیعہ جو مطلق طور پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عالم الغیب ہونے کا دعوی کرتے ہیں؛ یہ دعوی صاف جھوٹ ہے ۔ جب کہ بعض باتوں کا علم ہونے میں آپ کی کوئی خصوصیت نہیں ۔تمام چیزوں کا علم پوری طرح نہ ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو تھا اور نہ ہی کسی دوسرے کو۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے امور مستقبل کے کلی عالم نہ ہونے کی تصدیق اس امر سے ہوتی ہے کہ آپ کی خلافت کے زمانہ میں کئی جنگیں پیش آئیں ۔ آپ کے ذہن میں بہت ساری چیزیں ایسی ہوتی تھیں کہ حقائق ان کے خلاف ظاہر ہوتے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ بعض اوقات اپنی لڑائیوں اور دیگر معاملات کے بارے میں ایک رائے قائم کرتے اور وہ غلط ثابت ہوا کرتی تھی ۔ اگر آپ کو یہ علم ہوتا کہ لڑائیوں میں لا تعداد جانیں ضائع ہونگی اور مقصد بھی حاصل نہ ہوگا تو آپ لڑائی میں حصہ نہ لیتے ۔ جنگ آزمائی سے کنارہ کش ہونے کی صورت میں آپ زیادہ کامیاب و کامران ثابت ہوتے ۔اس لیے کہ اکثر لوگ بھی آپ کے ساتھ تھے اور اکثر شہر بھی آپ کے ماتحت تھے۔ جب آپ نے جنگ کی تو کمزور ہوگئے ۔ یہاں تک کہ بہت سارے وہ شہر جو آپ کی خلافت میں شامل تھے ؛ جیسے مصر ؛ یمن اور حجاز ؛ وہ آہستہ آہستہ خودمختاری کے خواب دیکھنے لگے۔ اگر آپ جانتے ہوتے کہ میرے مقرر کردہ حکم یہ فیصلہ صادر کریں گے تو آپ تحکیم پر راضی نہ ہوتے ۔ اور اگر آپ کو علم ہوتا کہ ان میں سے ایک دوسرے کے ساتھ وہی سلوک کرے گا جو کہ بعد میں دیکھا گیا؛ یہاں تک انہیں معزول کر دیا گیا؛ تو آپ اپنی معزولی پر موافقت نہ کرتے ۔شروع میں آپ کے خیر خواہوں نے آپ کو مشورہ دیا تھا کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو ان کی امارت پر باقی رہنے دیا جائے یہاں تک کہ معاملات صحیح ڈگر پر آجاتے ۔ آپ کے محبین اور خیر خواہان کے ہاں یہ رائے زیادہ درست تھی۔

یہ بھی سبھی جانتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے والد ابوسفیان کو نجران کا والی بنایا تھا۔ وہ وہاں کے والی ہی تھے کہ نبی کریم ﷺ کا انتقال ہوگیا۔ اس بات پر اتفاق ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اپنے والد کی نسبت زیادہ اچھے مسلمان تھے۔ صحابہ اور تابعین میں سے کسی ایک نے بھی معاویہ رضی اللہ عنہ پر منافق ہونے کی تہمت نہیں لگائی ؛ جب کہ ان کے والد کے بارے میں اختلاف ہے۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ان کے بھائی یزید بن ابی سفیان کو شام کی فتح کے لیے حضرت خالد بن ولید اور ابوعبیدہ رضی اللہ عنہما کے ساتھ امیر لشکر مقرر کیا تھا۔ آپ اپنی امارت پر باقی رہے یہاں تک کہ شام میں ہی آپ کا انتقال ہوگیا۔ آپ کا شمار فاضل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں ہوتا تھا۔ آپ بہت نیک انسان تھے؛ اپنے بھائی اور والد سے زیادہ اچھے تھے۔ یہ وہ یزید نہیں ہے جو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے انتقال کے بعد جانشین [وخلیفہ] ہوئے تھے۔ اس ثانی الذکر یزید کی پیدائش ہی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں ہوئی تھی ۔ اس کا نام اپنے چچا کے نام پر رکھا گیا تھا۔ جہلاء کا ایک گروہ اس یزید کو صحابی سمجھتا ہے؛ اور بعض غالی لوگ

اسے نبی تک کا درجہ دیتے ہیں۔ اور ان کے برعکس ایک دوسرا گروہ اسے کافر و مرتد قرار دیتا ہے۔ یہ دونوں باتیں باطل ہیں۔ اس کا صرف اتنا ہی مقام ہے کہ وہ بنی امیہ کا ایک خلیفہ ہے۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ ۔ ان کے قاتلوں پر اللہ کی لعنت ہو۔ اس کی خلافت کے دور میں بعض اختلافات کی بنا پر مظلوم شہید ہوئے۔ لیکن یزید نے انہیں قتل کرنے کا حکم نہیں دیا۔ اور نہ ہی اس پر رضامندی کا اظہار کیا؛ اور نہ ہی ان لوگوں کی مدد کی جنہوں نے آپ کو قتل کیا تھا۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا سر جب عبیداللہ بن زیاد کے سامنے پیش کیا تو اس نے آپ کے دانتوں پر لاٹھی سے مارا تھا؛ یہ بات صحیح سند کے ساتھ ثابت ہے۔ جب کہ سر کو یزید کے سامنے لے جا کر پیش کرنے کا واقعہ باطل ہے؛ اور اس کی سند منقطع ہے۔ ❀

اس کے چچا یزید رضی اللہ عنہ کا شمار نیکوکار صحابہ کرام میں سے تھا۔ اس کا انتقال حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت میں ہوا۔ اس کی وفات کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کی جگہ دوسرے بھائی معاویہ کو تعینات کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لوگوں سے زیادہ اہل لوگوں کے احوال جانتے تھے۔ اور سیاست میں بڑے ماہر تھے۔ خواہشات نفس سے بڑے دور تھے۔ آپ نے اپنی خلافت میں کسی ایک بھی قریبی رشتہ دار کو کوئی منصب تفویض نہیں کیا۔ آپ ولایت و امارت کے لیے صرف اسی انسان کا انتخاب فرمایا کرتے تھے جسے اس کا اہل سمجھتے تھے۔ آپ نے معاویہ رضی اللہ عنہ کو بھی اسی لیے امیر بنایا تھا کہ ان کے نزدیک آپ اس منصب کے اہل تھے۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا انتقال ہو گیا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے آپ کی ولایت میں وسعت دیدی۔ یہاں تک کہ سارا شام آپ کے زیر نگین ہو گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت میں شام کے چار حصے تھے: فلسطین، دمشق، حمص اور اردن۔ پھر اس کے بعد قنسرین اور دوسرے دار الحکومت کو ربع حمص سے علیحدہ کر دیا گیا۔ پھر اس کے بعد حلب آباد ہو گیا اور قنسرین ویران ہو گیا۔ اور یہ دار الحکومت مسلمانوں اور اہل کتاب کے مابین حکومتیں بن گئیں۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کی طرف سے بیس سال تک اس علاقہ میں نائب رہے۔ پھر بیس سال تک امام و خلیفہ رہے۔ آپ کی رعیت آپ کے احسانات اور حسن سلوک کی شکر گزار اور آپ پر راضی رہی تھی۔ یہاں تک کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ جنگ جیسے معاملہ میں انہوں نے آپ کی اطاعت کی۔

اور یہ بھی معلوم شدہ بات ہے کہ آپ اپنے والد سے بہتر تھے؛ اور والد سے بڑھ کر ولایت کے جواز کے حق دار تھے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ: آپ کو والی بنایا جانا حلال نہیں تھا۔ اگر یہ بات بھی مان لی جائے کہ کوئی دوسرا آپ سے زیادہ ولایت کا حق دار تھا؛ یا آپ ان لوگوں میں سے تھے جن کی وجہ سے ظلم کے کاموں پر تعاون ہوا تھا؛ تو پھر بھی آپ کی ولایت سے جس شر کا

❀ یہ اثر حضرت انس بن مالک سے مروی ہے۔ البخاری ٥/ ٢٦ کتاب فضائل اصحاب النبي ﷺ، باب مناقب الحسن و الحسین ؛ وسنن الترمذي ٥/ ٣٢٥، کتاب المناقب، باب مناقب الحسن و الحسین۔ البداية والنهاية ٨/ ١٩٠۔ علامہ ابن کثیر البدایہ والنہایہ ٨/ ١٩٢ پر لکھتے ہیں: اس کے بعد حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے سر کے بارے میں علماء کرام کے دو قول ہیں۔ کیا ابن زیاد نے یہ سر یزید کے پاس بھیج دیا تھا یا نہیں؟ زیادہ ظاہر قول یہ ہے کہ اس نے آپ کا سر یزید کے پاس بھیج دیا تھا۔ اس بارے میں بہت سارے آثار وارد ہوئے ہیں۔ حقیقت کو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

خاتمہ ہوا وہ آپ کے عہد میں حاصل ہونے والے شر سے بہت زیادہ ہے۔

مال لینا اور بعض لوگوں کو مناصب تفویض کرنا کہاں ہے؟ اور پھر صفین میں قتل ہونے والوں کو کس نے قتل کیا؟ اس میں نہ ہی کسی کو کوئی کامیابی حاصل ہوئی اور نہ ہی غلبہ ملا۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مشورہ دینے والے لوگ بڑے پکے لوگ تھے، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی امام اور مجتہد تھے، آپ وہی کرتے تھے جس میں مصلحت سمجھتے تھے۔

یہاں پر یہ بتانا مقصود ہے کہ اگر آپ مستقبل کی خبریں جانتے ہوتے تو آپ کو علم ہوتا کہ جنگ صفین کی نسبت حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو اس امارت پر باقی رکھنا ہی زیادہ مصلحت پر مبنی تھا۔ کیونکہ اس جنگ کی وجہ سے شر اور برائی کے زیادہ ہونے کے علاوہ تو کچھ بھی نہیں ملا؛ اور نہ ہی کوئی مصلحت حاصل ہوئی۔ جب کہ آپ کی ولایت میں خیر کی کثرت تھی اور آپ سے جنگ کی نسبت شر بہت کم تھا۔ جو انسان بھی یہ گمان کرتا ہے کہ آپ کی ولایت میں شر تھا؛ اسے جاننا چاہیے کہ آپ کے ساتھ جنگ کرنے میں شر اس سے زیادہ اور بڑا تھا۔

یہ مثال اور اس جیسی دیگر مثالوں سے ان لوگوں کی جہالت واضح ہوجاتی ہے جو یہ دعوی کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ غیبی امور جانتے تھے۔ بلکہ رافضی کا یہ دعوی متناقض ہے۔ ان منفی امور کے باوجود آپ کے بارے میں علم الغیب کا دعوی کرتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی آپ کے لیے انتہائی شجاعت کے دعویدار ہیں؛ اور ان کا خیال ہے کہ آپ نے ہی غزوات میں نبی کریم ﷺ کی مدد کی تھی۔ اور شروع اسلام میں کمزوری کے ایام میں آپ کی تلوار کی وجہ سے اسلام کے قواعد پختہ ہوئے اور پھر اس کے ساتھ ہی رسول اللہ ﷺ کی موت کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے مقابلہ میں عاجزی و درماندگی اور کمزوری بیان کرتے ہیں۔ یہ متناقض بیانات ہیں۔ اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس اتنا مال نہیں تھا کہ لوگوں کو دیکر ان کے دل موہ لیتے؛ نہ ہی آپ کا قبیلہ بہت بڑا تھا اور نہ ہی آپ کے موالین تھے جو آپ کی مدد کرتے اور نہ ہی آپ نے لوگوں کو اپنی بیعت کرنے کو کہا؛ نہ ہی کسی کو ڈرایا دھمکایا اور نہ ہی کوئی لالچ دی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ آپ سے دفاع پر ان کفار پر قادر ہونے کی نسبت زیادہ قادر تھے جنہوں نے مختلف مواقع پر رسول اللہ ﷺ سے جنگیں لڑیں اور آپ کو اذیتیں پہنچائی تھیں۔ اگر آپ ہی کفار سے رسول اللہ ﷺ کا دفاع کیا کرتے تھے؛ اور آپ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے بھی دفاع کرنا چاہتے تھے تو آپ اس بات پر زیادہ قادر تھے۔ لیکن شیعہ جمع بین نقیضین ہی کرتے ہیں۔

یہی حال حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے آپ کی جنگ کا ہے۔ اس وقت آپ غالب بھی تھے آپ کے پاس بہت بڑا لشکر بھی تھا۔ اور آپ کے لشکر میں ایسے لوگ موجود تھے جو ان لوگوں سے بدرجہا افضل تھے جو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے لشکر میں تھے اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے لشکر کو مغلوب کرنا چاہتے تھے۔ پس اگر آپ ہی نے مسلمانوں کی کمزوری اور قتل کے وقت کفار کی کثرت کے باوجود نبی کریم ﷺ کی مدد و نصرت کی تھی تو پھر آپ کے لشکر کی کثرت اور لشکر معاویہ رضی اللہ عنہ کی قلت کے ساتھ آپ معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے لشکر کو مغلوب کرنے پر ان کفار کو مغلوب کرنے کی نسبت زیادہ قادر تھے جنہوں نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ جنگیں کیں۔ [اہل عقل کے لیے غور کی بات یہ ہے کہ] اس بہادری و شجاعت اور قوت اور اس عاجزی و کمزوری کے مابین کسی جاہل کے علاوہ کوئی دوسرا بھی جمع کرسکتا ہے؟ بلکہ یہ اس

بات کی دلیل ہے کہ یہ تمام نصرت اللہ کے رسول ﷺ کے لیے تھی؛ اور اللہ تعالیٰ نے اپنی نصرت سے اور اہل ایمان سے آپ کی تائید و نصرت فرمائی تھی۔ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے سب مومنین سے نبی کریم ﷺ کی تائید فرمائی تھی اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دیگر اہل ایمان سب شامل ہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس شعر سے ان کے علم غیب کی نفی ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں:

لَقَدْ عَجَزْتُ عَجْزَۃً لَا اَعْتَذِر　　سَوْفَ اَكِيْسُ بَعْدَهَا وَ اَسْتَمِرّ

وَ اَجْمَعُ الرَّأْیَ الشَّتِيْتَ الْمُنْتَشِرْ

''میں معذرت نہیں کر رہا، بلکہ یہ سچ ہے کہ میں عاجز آ گیا ہوں۔ اس کے بعد میں غور و فکر سے کام لوں گا اور (سیدھی راہ پر) چلتا رہوں گا۔ نیز بکھری ہوئی پراگندہ رائے یک جا کروں گا۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ جنگ صفین کی راتوں میں فرمایا کرتے تھے:

''اے حسن! اے حسن! تیرے باپ کا یہ خیال نہ تھا کہ معاملہ یہاں تک پہنچے گا۔ اللہ کے لیے ہی سعد بن مالک اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی عظمت ہے' انہوں نے فتنہ سے الگ رہ کر کتنا اچھا موقف اختیار کیا تھا۔ اگر وہ نیک تھے تو انھیں بڑا اجر ملے گا اور اگر گناہ گار تھے تو اس میں چنداں خطرہ نہیں ہے۔''

مصنفین نے آپ سے یہ کلام ایسے ہی نقل کیا ہے۔

[حضرت علی رضی اللہ عنہ مستجاب الدعوات]:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:'' حضرت علی رضی اللہ عنہ مستجاب الدعوات تھے۔ آپ نے بسر بن ارطاۃ کے حق میں بددعا کی کہ اللہ اسے پاگل کر دے۔'' چنانچہ اسی طرح ہوا اس کا دماغ خراب ہو گیا۔ عیزار کے حق میں اندھا ہونے کی بددعا کی تو وہ اندھا ہو گیا۔ اور انس نے جب شہادت چھپائی تو اس کے حق میں برص کا عارضہ لاحق ہونے کی دعا کی؛ اور اسے برص کا مرض لاحق ہو گیا۔ اور ایسے ہی آپ نے زید بن ارقم کے حق میں اندھا ہونے کی بددعا کی جو مقبول ہوئی اور وہ اندھا ہو گیا۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جواب]: ہم کہتے ہیں کہ: یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خصوصیت نہیں، بلکہ صحابہ و ان دیگر صلحاء میں یہ وصف زیادہ کثرت کے ساتھ موجود تھا۔ اور جب تک اہل ایمان موجود رہیں گے یہ وصف بھی باقی رہے گا۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی دعاء کبھی خالی نہیں جاتی تھی۔ صحیحین میں ہے کہ ان کے حق میں نبی کریم ﷺ نے دعا فرمائی تھی کہ:''اے اللہ! ان کا ہر تیر نشانہ پر پڑے' اور ان کی ہر دعا مقبول ہو۔''[1] چنانچہ آپ کی کوئی دعا مسترد نہیں کی جاتی تھی۔

❀ صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کوفہ میں لوگوں کو بھیجا کرتے؛ جو حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے بارے میں دریافت کرتے۔ لوگ ان کے بارے میں خیر کی بات کے علاوہ کچھ بھی نہ کہتے۔ یہاں تک کہ جب بنی عبس کے ایک آدمی سے پوچھا گیا تو اس نے کہا:''جب آپ ہمیں سعد کے بارے میں حلفیہ پوچھنا ہی چاہتے ہیں تو پھر سنیں: وہ نہ ہی جہاد کے لیے نکلتے

[1] سنن ترمذی، کتاب المناقب، باب مناقب ابی اسحاق سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ (حدیث:۳۷۵۱)

ہیں'اور نہ ہی اپنی رعیت میں عدل کرتے ہیں اور نہ ہی برابری کیا تھ تقسیم کرتے ہیں ۔حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے یہ دعا کی:

''اے اللہ! اگر یہ جھوٹا ہے تو ریا کاری اور شہرت کے لیے کھڑا ہوا ہے' تو اس کی عمر کو لمبا کر؛ اور اس کی تنگدستی کو زیادہ کر اور اسے کسی فتنہ میں مبتلا کر دے۔''

تو اس آدمی کی یہ حالت ہوگئی تھی کہ اس کی عمر بہت بڑی ہوگئی تھی؛ بڑھاپے کی وجہ سے اس کی پلکیں لٹک گئی تھیں؛لیکن وہ گلیوں میں چھوکریوں کو چھیڑتا اور ان سے آنکھیں لڑایا کرتا تھا۔ اور اپنے بارے میں کہا کرتا تھا:

''بڑی عمر کا بڈھا ہوں جو فتنہ میں مبتلا ہوگیا ہوں'اور مجھے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی بددعا لگ گئی ہے۔''[1]

❀ یہی حال حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ کا تھا۔آپ مستجاب الدعوات تھے۔حماد بن زید سے روایت کیا گیا ہے وہ ہشام بن عروہ سے وہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ: اروی بنت اوس نے مروان کے پاس حضرت سعید رضی اللہ عنہ کے خلاف دعوی کیا کہ:''انہوں نے میری زمین کا ٹکڑا ناجائز قبضہ کر کے اپنی زمین کے ساتھ ملا لیا ہے۔''تو حضرت سعید رضی اللہ عنہ نے اس پر ان الفاظ میں بددعا کی:''اے اللہ! اگر یہ عورت جھوٹی ہے'تو اسے اندھا کر دے'اور اسے اس کی زمین میں قتل کر دے۔'' چنانچہ ایسا ہی ہوا؛ وہ اندھی بھی ہوگئی؛ اور اپنی ہی زمین میں مردار مرگئی۔''[2]

❀ حضرت براء بن مالک رضی اللہ عنہ جب کسی بات پر اللہ کا نام لیکر حلف اٹھا لیتے تو اللہ تعالیٰ ان کی قسم کو پورا کر دیتے۔جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اللہ کے بعض بندے ایسے بھی ہیں کہ اگر وہ کسی بات پر حلف اٹھالیں تو اللہ تعالیٰ ان کی قسم کو پورا کر دیتے ہیں۔''[3]

❀ حضرت علاء بن حضرمی رضی اللہ عنہ جو پہلے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور بعد ازاں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی طرف سے بحرین کے عامل تھے۔قبولیت دعا میں مشہور تھے۔

ابن ابی دنیا رحمہ اللہ نے اپنی سند سے نقل کیا ہے کہ سہم بن منجاب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:''ہم نے حضرت علاء بن حضرمی رضی اللہ عنہ کے ساتھ جہاد میں حصہ لیا۔اس وقت آپ نے تین دعائیں فرمائیں۔اللہ تعالیٰ نے آپ کی یہ تینوں دعائیں قبول فرمائیں۔آپ فرماتے ہیں:''ہم آپ کے ساتھ سفر میں تھے؛ اور ہم نے ایک منزل پر پڑاؤ ڈالا۔ہم نے وضوء کے لیے پانی تلاش کیا؛ بسیار تلاش کے باوجود نہ پاسکے۔تو آپ کھڑے ہوگئے اور دو رکعت نماز پڑھی؛ پھر آپ نے دعا کی:

"اللّٰـه ! يا عليم يا حكيم يا علي العظيم ! إنا عبيدك'وفي سبيلك نقاتل عدوك ؛ فاسقنا غيثاً نشرب منه ونتوضأ من الإحداث . وإذا تركناه فلاتجعل فيه نصيباً لأحد غيرنا ۔"

''اے اللہ! اے علیم و حکیم! اے عالیشان اور عظمت والے رب! ہم تیرے بندے ہیں؛ اور تیری راہ میں تیرے دشمنوں سے جہاد کرتے ہیں'ہم پر بارش برسادے جس سے ہم پئیں بھی اور ناپاکی سے طہارت بھی حاصل کریں۔اور

---

[1] عن جابر بن سمرة؛ البخاري ١/ ١٤٧ ـ كتاب الآذان باب وجوب القرأة للإمام و المأموم ـ مسلم ١/ ٣٣٤؛ كتاب الصلاة' باب القرأة في الظهر والعصر ـ سنن النسائي ٢/ ١٣٥؛ كتاب الافتتاح' باب الركود بين الركعتين الأوليين.

[2] مسلم ٣/ ١٢٣٠'كتاب المساقاة' باب تحريم الظلم وغصب الأرض وغيرها.

[3] البداية والنهاية(٦/ ٣٢٨)، طبقات ابن سعد(٤/ ٧٨).

جب ہم اس پانی کو چھوڑ دیں تو اسے کسی بھی دوسرے کے لیے حصہ نہ بنانا۔''

آپ فرماتے ہیں: ابھی ہم تھوڑی ہی دور چلے تھے کہ ہم نے بارش کے پانی سے بھرا ہوا ایک تالاب دیکھا جس سے پانی اچھل کر بہہ رہا تھا۔ ہم نے وہاں پر پڑاؤ ڈالا؛ خوب سیر ہو کر پیا اور میں نے اپنے برتن بھی بھر لیے۔ اور پھر انہیں تالاب پر ہی چھوڑ دیا۔ میں نے کہا: میں ضرور دیکھوں گا کہ کیا آپ کی دعاء قبول ہوئی ہے؟ جب ہم وہاں سے چل کر ایک میل یا اس کے قریب فاصلے تک پہنچ گئے تو میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا: ''میں اپنے برتن بھول گیا ہوں۔''

جب میں واپس وہاں پر پہنچا تو وہ جگہ ایسے تھی جیسے یہاں پر کبھی بھی پانی نہیں تھا۔ میں نے اپنے برتن اٹھا لیے۔ جب میں دارین پہنچا تو ہمارے اور ان کے درمیان سمندر حائل تھا۔ تو آپ نے دعا کی:

"اللّٰه ! یا علیم یا حکیم یا علي العظیم ! إناعبیدك'وفي سبیلك نقاتل عدوك ؛ فاجعل لنا سبیلاً إلی عدوك ۔"

''اے اللہ! اے علیم و حکیم! اے عالیشان اور عظمت والے رب! ہم تیرے بندے ہیں؛ اور تیری راہ میں تیرے دشمنوں سے جہاد کرتے ہیں' ہمارے لیے اپنے دشمن تک پہنچنے کے راستے بنا دے۔''

آپ فرماتے ہیں: پھر حضرت علاء رضی اللہ عنہ ہمیں لیکر سمندر میں داخل ہو گئے۔ اللہ کی قسم! ہماری سواریوں کی کاٹھیاں تک گیلی نہیں ہوئیں۔ پھر ہم دشمن کی طرف جا نکلے۔ پھر جب ہم واپس ہوئے تو آپ کو پیٹ میں تکلیف ہوئی؛ اور اسی حالت میں ان کا انتقال ہو گیا۔ آپ کو غسل دینے کے لیے ہمیں پانی نہیں ملا۔ ہم نے آپ کو آپ کے کپڑوں میں لپیٹ کر دفن کر دیا۔ جب ہم تھوڑی دور چلے تو ہمیں بہت زیادہ پانی ملا۔ ہمارے بعض ساتھی آپس میں کہنے لگے: چلو واپس چلتے ہیں اور آپ کو نکال کر غسل دیتے اور پھر دفن کرتے ہیں۔ چنانچہ ہم واپس پلٹے تو ہمیں تلاش بسیار کے باوجود آپ کی قبر نہیں ملی۔ پھر ہمارے ایک ساتھی نے بتایا کہ میں نے آپ کو یہ دعا کرتے ہوئے سنا ہے:

"اللّٰه ! یا علیم یا حکیم یا علي العظیم ! اخف حُفرتي و لا تطلع علی عورتي أحداً۔"

''یا اللہ! اے علیم و حکیم! اے عالیشان اور عظمت والے رب! میری قبر کو خفیہ رکھنا؛ اور کسی کو میرے ستر پر مطلع نہ کرنا۔''

تو پھر ہم آپ کو ایسے ہی چھوڑ کر واپس آ گئے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی بہت ساری دعائیں کیں جو کہ قبول ہوئیں۔ آپ بلال اور اس کے گروہ سے زمین کی تقسیم کے بارے میں تنازعہ ہو گیا تو آپ نے دعا کی: ''اے اللہ بلال اور اس کے گروہ کے لیے کافی ہو جا۔''

ابھی ایک سال کا عرصہ بھی اس دعا کو نہیں گزرا تھا کہ اس گروہ میں سے ایک آنکھ بھی کھلی نہیں رہی۔

اور آپ نے یہ دعا بھی کی تھی: ''اے اللہ! میری عمر بڑی ہو گئی ہے؛ اور میری رعایا پھیل چکی ہے۔ مجھے حقوق کے ضائع ہونے اور فتنہ میں مبتلا ہونے سے پہلے اپنی طرف بلا لے۔'' تو پھر اسی سال آپ کو شہید کر دیا گیا۔

اس کی مثالیں بہت زیادہ ہیں۔ ابن ابی دنیا نے مستجاب الدعوات لوگوں کے بارے میں ایک مکمل کتاب لکھی ہے۔
حالانکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں جو قصے مذکور ہیں؛ ان کی کوئی ایسی سند نہیں ذکر کی گئی جس کی وجہ سے ان کا صحیح ہونا

معلوم ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان میں سے بعض باتیں جھوٹی بھی ہیں جیسے حضرت انس کے لیے برص کی اور حضرت زید بن ارقم کے لیے اندھا ہونے کی بد دعا۔

فصل :

[جنگ صفین]

[اشکال]: رافضی نے کہا ہے: ساتواں واقعہ: جب آپ صفین کی طرف نکلے تو آپ کے ساتھیوں کو بہت سخت پیاس لگ گئی۔ آپ وہاں سے تھوڑا آگے نکلے تو آپ کو ایک ڈیرہ [گرجا] نظر آیا۔ آپ نے صاحب خانہ کو آواز دیکر پانی مانگا۔ اس نے جواب دیا: میرے اور پانی کے درمیان چھ میل سے زیادہ کا فاصلہ ہے۔ اور اگر مجھے ہر مہینے بقدر کفایت چند قطرے نہ دیے جاتے تو میں پیاس سے مر جاتا۔ امیر المؤمنین نے اس ڈیرہ کے قریب ایک جگہ کی طرف اشارہ کیا۔ اور اس جگہ کو کھودنے کا حکم دیا۔ (جب کھدائی شروع ہوئی تو) وہاں پر بہت بڑی چٹان نکل آئی۔ لوگ اس چٹان کو ہٹانے سے عاجز آ گئے۔ تو آپ نے اکیلے ہی اس چٹان کو ہٹا دیا۔ پھر لوگوں نے وہاں سے پانی پیا۔ تو وہ راہب اتر کر ان کے پاس آ گیا اور کہا: آپ نبی رسول ہیں یا کوئی مقرب فرشتہ ؟ آپ نے فرمایا: نہیں میں رسول اللہ ﷺ کا وصی ہوں۔ تو وہ راہب آپ کے ہاتھ پر مسلمان ہو گیا۔ اور کہا: یہ ڈیرہ (گرجا گھر) اس چٹان کے طلب گار پر بنایا گیا ہے۔ اس کے نیچے سے پانی کا راستہ ہے۔ مجھ سے پہلے ایک جماعت گزر چکی ہے۔ مگر وہ اس کو نہیں پا سکے۔ یہ راہب بھی ان لوگوں میں سے ہے جو آپ کے ساتھ شہید کیے گئے تھے۔ اس قصہ کو سید حمیری نے اپنے قصیدہ میں نظم بند کیا ہے۔ [انتہی کلام الرافضی]

[جواب]: یہ قصہ بھی اپنے سے ماقبل کے ان جھوٹے واقعات کی جنس سے ہے جنہیں جاہل لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بڑے مناقب میں سے شمار کرتے ہیں۔ حالانکہ معاملہ ایسے نہیں ہے۔ بلکہ جس انسان نے یہ قصہ گھڑا ہے وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضائل اور مستحق مدح سرائی سے جاہل ہے۔ اس نے جو منقبت کی بات بنائی ہے کہ آپ نے ایک چٹان کی طرف اشارہ کیا اور اس کے نیچے پانی مل گیا اور آپ نے اکیلے ہی وہ چٹان وہاں سے ہٹا دی۔ ایسا تو باقی مخلوق میں سے بہت سارے لوگوں کے ساتھ پیش آ جاتا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ تو ان سے بہت افضل ہیں۔ بلکہ حضرت ابوبکر و عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے محبین میں ہزاروں لوگ ایسے ہیں جن کے لیے اس قسم کے کئی گنا زیادہ واقعات پیش آئے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک سے حضرت علی رضی اللہ عنہ افضل ہیں۔ اگر ایسے واقعات بعض صالحین کے ہاتھوں پر پیش آتے ہیں تو یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نعمت اور ان کے لیے کرامت ہے۔ اور اس طرح کے واقعات ان لوگوں کے ہاتھوں بھی پیش آ جاتے ہیں جو صالحین میں سے بھی نہیں ہیں۔

باقی جو اس نے یہ گرجا بنانے کا قصہ لکھا ہے کہ: اس چٹان کے طالب پر بنایا گیا ہے اور اس کے نیچے پانی کا راستہ ہے۔ سو یہ چیز مسلمانوں کے دین میں نہیں۔ گرجے کنیسے صومعات اور معبد اپنے پیش رو لوگوں کے نام پر بنانا نصاریٰ کا طریق کار ہے۔ جب کہ مسلمان اپنی مساجد جن کو بلند کرنے اور ان میں اللہ کے نام کا ذکر کرنے کا حکم اللہ نے دیا ہے صرف اللہ کے نام پر بناتے ہیں مخلوق میں سے کسی ایک کے نام پر نہیں بناتے۔

راہب کا یہ کہنا: آپ ''نبی مرسل ہیں یا ملک مقرب'' اس کی جہالت پر دلالت کرتا ہے نیز یہ کہ وہ اللہ کی مخلوق میں سب سے جاہل اور گمراہ انسان تھا۔(اس کو اتنا علم نہیں تھا کہ) فرشتے پانی نہیں پیتے اور نہ ہی اسے چٹان کے نیچے سے پانی نکالنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اور یہ کہ محمد کے بعد کوئی بھی نبی نہیں۔ اور یہ بھی معلوم شدہ بات ہے کہ اس راہب تک مسلمانوں کی خبر اس علاقے کے فاتحین کے ذریعہ پہنچ چکی ہوگی۔ اگر یہ پادری عیسی علیہ السلام کے بعد کسی رسول کے آنے کو جائز سمجھتا ہوتا تو پھر محمد ہی اللہ کے رسول تھے۔ اور آپ کے معجزات ظاہری و باطنی موجود تھے۔ اگر وہ ان کی تصدیق کرتا تو اسے علم ہوتا کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔ اور اگر وہ اس کی تصدیق نہیں کرتا تو پھر کسی دوسرے کے متعلق صرف چٹان کے نیچے پانی نکالنے کی بنا پر یہ اعتقاد کیسے رکھ سکتا ہے کہ وہ نبی مرسل ہے۔ یا یہ گرجا اسی کے نام پر بنایا گیا ہے۔ جب کہ وہ اپنے گرجا گھر بہت سارے ایسے لوگوں کے ناموں پر بناتے ہیں جو نہ ہی نبی ہیں اور نہ ہی رسول۔

نیز اس میں جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول درج ہے کہ: نہیں؛ لیکن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصی ہوں۔ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر کھلا ہوا جھوٹ اور بہتان ہے۔ اس لیے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کبھی بھی اس طرح کا کوئی دعوی نہیں کیا۔ نہ ہی خلفاء ثلاثہ کی خلافت میں اور نہ ہی صفین کے لیل و نہار میں۔ بلکہ آپ اپنے مخالفین کے ساتھ مناظرے کیا کرتے تھے ان کے الزامات کا جواب دیتے۔ مگر آپ نے کبھی خود یہ دعوی کیا اور نہ ہی کسی نے آپ کے لیے یہ دعوی کیا۔ جب حکمین کو قاضی اور فیصل بنایا گیا اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کو خوارج کیساتھ مناظرہ کے لیے بھیجا تو وہاں پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضائل و مناقب اور سبقت اسلامی بیان کی گئی مگر کسی نے یہ نہیں کہا کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصی ہیں۔

یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ اس وقت ہمت اور اسباب اس روایت کو بیان کرنے کے موجود تھے۔ اور اگر ان اسباب کے بغیر بھی اسے روایت کیا جاتا تو بھی حق تھا۔ تو پھر ان اسباب کی موجودگی اس کے بیان کا فائدہ ہی کچھ اور تھا۔

محدثین کرام رحمہم اللہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضائل و مناقب نقل کئے ہیں۔ مثلاً: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان کہ:

" لأعطين الراية غداً رجلاً يحب الله و رسوله و يحبه الله و رسوله ۔"[رواه البخاري ۵/۱۸]

''کل میں یہ جھنڈا ایسے آدمی کو دوں گا جو اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے' اور اللہ اور اس کا رسول اس سے محبت کرتے ہیں۔''

اور تبوک کے موقعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

((ألا ترضى أن تكون مِنِّيْ بِمَنْزِلَةِ هَارُوْنَ مِنْ مُوْسىٰ إلا أنه لا نبي بعدي))

کیا آپ کو یہ بات پسند نہیں کہ آپ کو مجھ سے وہی نسبت ہو جو ہارون کو موسیٰ علیہ السلام سے تھی؛ سوائے اس کے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں۔''

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مخاطب کر کے فرمایا: ''تم مجھ سے ہو' اور میں تجھ سے ہوں۔'' [سبق تخریجه]

ان کے علاوہ دیگر بھی فضائل ہیں؛ مگر انہیں انتہائی ضرورت کے باوجود یہاں پر نقل نہیں کیا گیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منسوب جو دعوی ذکر کیا گیا ہے' اس کے بارے میں طے شدہ بات ہے کہ وہ سراسر جھوٹ پر مبنی ہے۔

فصل:

[حضرت علی رضی اللہ عنہ اور جنات سے جنگ]

[اشکال] :شیعہ مصنف لکھتا ہے:''جمہور سے مروی ہے کہ نبی ﷺ جب بنی المصطلق کی طرف روانہ ہوئے تو ایک دشوار گزار وادی میں سے گزرے۔وادی وعر کے قریب انہیں رات ہوگئی۔ جبرائیل نے آ کر اطلاع دی کہ اس وادی میں جنات کا ایک ٹولہ پوشیدہ ہے اور وہ آپ پر حملہ کرنا اور آپ کے اصحاب میں شر پھیلانا چاہتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بلا کران پر تعوذ پڑھی؛ اس وادی میں اترنے کا حکم دیا اور آپ نے ان کو تہہ تیغ کر دیا۔'' [آہ رافضی]

[جــــواب] ہم کہتے ہیں: پہلی بات تو یہ ہے کہ: جنوں کو ہلاک کرنا اتنا بڑا کارنامہ نہیں، ہمارے خیال میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مقام اس سے کہیں بلند تھا؛ اس قسم کے کام وہ لوگ بھی کر لیتے ہیں جو بہت ادنی درجہ کے ہوتے ہیں۔مگر حقیقت یہ ہے جسے تمام اہل علم و محدثین جانتے ہیں کہ یہ واقعہ خودساختہ اور جھوٹ ہے جو کہ رسول اللہ ﷺ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ پر جھوٹ بولا گیا ہے۔غزوہ بنی مصطلق میں اس قسم کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔

- شیعہ مصنف کا یہ دعوی کہ:''اسے جمہور نے روایت کیا ہے۔''اگر اس سے مراد یہ ہے کہ ثابت شدہ اسناد کے ساتھ مروی ہے' یا پھر کسی ایسی کتاب میں ہے جس میں نقل شدہ روایات پر اعتماد کیا جاتا ہے؛ یا پھر کسی ایسے عالم نے اسے صحیح کہا ہو جس کی تصحیح قبول کی جاتی ہو' تو پھر ایسا ہرگز نہیں ہے۔اور اگر اس سے مراد یہ ہو کہ جمہور علماء نے اسے روایت کیا ہے تو پھر ایسا کہنا کورا جھوٹ ہے۔اور اگر مراد یہ ہے کہ ایسے لوگوں نے روایت کیا ہے جن کی روایت سے حجت قائم نہیں ہو سکتی؛ تو پھر اس روایت کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔
- یہ اسی قسم کا من گھڑت واقعہ ہے جیسے شیعہ کا ساختہ پرداختہ یہ قصہ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے چاہ ذات العلم میں جنوں سے لڑائی کی تھی۔''اہل علم کے ہاں یہ قصہ من گھڑت ہے۔[اس قسم کے خودساختہ واقعات ہمارے نزدیک قبول نہیں ہو سکتے۔ ہوسکتا ہے کہ شیعہ انھیں تسلیم کرلیں]۔

ہماری نگاہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا منصب و مقام اس سے کہیں بلند تر تھا کہ جنات آپ کے مقابلہ میں ٹھہر سکتے۔کسی انسان نے کبھی جنوں سے مقابلہ نہیں کیا۔ بلکہ اہل ایمان جنات کفار جنات سے قتال کیا کرتے تھے۔

کسی شیعہ نے مشہور محدث ابو البقاء خالد بن یوسف نابلسی سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جنوں سے لڑائی کے بارے میں دریافت کیا؛ تو انھوں نے کہا گروہ شیعہ عقل و خرد سے کس قدر بے گانہ ہے۔ تمھیں اتنی بھی عقل نہیں؟ اچھا یہ بتاؤ، عمر رضی اللہ عنہ افضل تھے یا علی رضی اللہ عنہ؟ شیعہ نے جواباً کہا''علی'' وہ کہنے لگے، جب نبی کریم ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا تھا کہ جب عمر رضی اللہ عنہ ایک راہ پر چلتے ہیں تو شیطان وہ راستہ چھوڑ کر دوسری راہ اختیار کرتا ہے۔'' جب شیطان عمر رضی اللہ عنہ سے دم دبا کر بھاگتا تھا تو اس کی اولاد حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کیوں کر لڑ سکے گی؟

فصل:

[حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے رجوع آفتاب اور اس پر رد]

[اشکال] : شیعہ مصنف لکھتا ہے: نوواں واقعہ: ''دو مرتبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے سورج کو لوٹایا گیا تھا۔ ایک مرتبہ رجوع آفتاب کا واقعہ عہد رسالت میں پیش آیا۔ اور دوسری بار اس کے بعد۔

❀ پہلی بار: حضرت جابر و ابو سعید رضی اللہ عنہما نے روایت کیا ہے کہ ایک دفعہ جبرائیل نازل ہو کر اللہ کی طرف سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بات چیت میں مصروف تھے۔ جب وحی نے آپ کو ڈھانک لیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ران پر سر رکھے لیٹے رہے، یہاں تک کہ آفتاب غروب ہوگیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اشارہ سے عصر کی نماز ادا کی۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بیدار ہوئے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ سورج کو لوٹا دے تاکہ آپ کھڑے ہو کر عصر کی نماز پڑھ سکیں۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا سے آفتاب واپس آ گیا اور آپ نے عصر کی نماز پڑھی۔

❀ دوسری مرتبہ رجوع آفتاب کا واقعہ اس وقت پیش آیا جب آپ بابل کے مقام پر دریائے فرات کو عبور کرنا چاہتے تھے۔ آپ کے رفقا اپنے مویشیوں کے ساتھ مصروف ہو گئے۔ اسی دوران آپ نے چند ساتھیوں کے ساتھ نماز عصر ادا کر لی، جو ساتھی نماز ادا نہ کر سکے تھے جب انھوں نے شکوہ کیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے رجوع آفتاب کے لیے دعا کی۔ چنانچہ سورج لوٹ آیا۔ سعید حمیری نے یہ واقعہ نظم میں بیان کیا ہے:

رُدَّتْ عَلَیْهِ الشَّمْسُ لَمَّا فَاتَهٗ ... وَقْتُ الصَّلٰوةِ وَ قَدْ دَنَتْ لِلْمَغْرِبِ
حَتّٰی تَبَلَّجَ نُوْرُهَا فِیْ وَقْتِهَا ... لِلْعَصْرِ ثُمَّ هَوَتْ هُوِیَّ الْکَوْکَبِ
وَ عَلَیْهِ قَدْ رُدَّتْ بِبَابِلَ مَرَّةً ... أُخْرٰی وَ مَا رُدَّتْ لِخَلْقٍ مَغْرَبِ

''جب آپ کی نماز عصر کا وقت فوت ہوگیا اور مغرب کا وقت قریب آ گیا۔ یہاں تک کہ سورج کا نور اپنے وقت عصر کے مطابق چمک گیا۔ پھر ستاروں کی طرح اتر گیا۔ اور آپ کے لیے ہی شہر بابل میں ایک بار پھر سورج کو لوٹایا گیا تھا؛ حالانکہ غروب ہونے کے بعد کسی پر سورج کو لوٹایا نہیں جاتا۔''

[جواب] : ہم کہتے ہیں کہ: اللہ تعالیٰ کے ہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضل و کمال پر جو یقین ہمیں حاصل ہے، وللہ الحمد اور یہ فضل و منزلت ایسی اسناد کے ساتھ ثابت ہے جو علم یقینی کا فائدہ دیتی ہیں۔ ان اسناد کی موجودگی میں کوئی اس دروغ گوئی کا محتاج نہیں۔ عہد رسالت میں رجوع آفتاب کا واقعہ طحاوی رحمہ اللہ اور قاضی عیاض رحمہ اللہ نے بالفاظ دیگر نقل کیا ہے اور اسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ شمار کیا ہے۔ مگر محققین اہل علم اور ماہرین فن جانتے ہیں کہ یہ واقعہ صحیح نہیں۔ یہ روایت ابن الجوزی رحمہ اللہ نے موضوعات نقل کی ہے اس نے ابو جعفر العقیلی کی کتاب الضعفاء سے عبید اللہ بن موسیٰ کی سند روایت کی ہے۔ اس نے فضیل بن مرزوق سے اور اس نے ابراہیم بن الحسن بن حسن سے اس نے فاطمہ بنت حسین سے اس نے اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا سے نقل کیا ہے کہ:

''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل کی جا رہی تھی اور آپ کا سر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی گود میں تھا۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے

غروب آفتاب تک عصر کی نماز ادا نہ کی۔ نبی ﷺ نے پوچھا: ''اے علی! کیا نماز پڑھ لی ہے؟''
تو انہوں نے عرض کی: نہیں۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے دعا فرمائی اے اللہ! بیشک علی تیری اور تیرے رسول کی اطاعت میں مشغول تھا تو اس کے لیے سورج کو لوٹا دے۔'' حضرت اسماء کا بیان ہے کہ: میں نے دیکھا کہ آفتاب غروب ہو چکا تھا، پھر میں نے دیکھا کہ وہ غروب ہونے کے بعد دوبارہ طلوع ہو گیا۔''

ابن الجوزی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ: ''یہ روایت بلاشبہ موضوع ہے۔ اس کی سند کے راویوں میں اضطراب ہے۔

دوسری بار: بابل میں [سورج کی واپسی]۔ اس روایت کے جھوٹ ہونے میں کوئی شک نہیں۔ حمیری کے شعر کہنے میں کوئی دلیل نہیں۔ اس لیے کہ اس نے خود اس کا مشاہدہ نہیں کیا۔ جھوٹ بہت پرانا ہے۔ اس نے بھی کسی سے یہ [جھوٹ] سن لیا ہوگا اور پر شعر کہہ دیے ہوں گے۔ غالی لوگ مدح و ذم میں ایسی چیزوں کو شعری شکل میں پرو دیتے ہیں کہ ان کی صحت تحقیق کے ساتھ ثابت نہیں ہوتی۔ خصوصاً جب کہ حمیری غلو کرنے میں معروف ہے۔ ❀

امت محمدیہ میں اس چیز کی کوئی ضرورت نہیں تھی، اور نہ ہی ایسا کرنے میں کوئی فائدہ ہے۔ اس لیے کہ سہل انگاری کی بنا پر جس کی نماز عصر فوت ہو جائے تو اس کا یہ گناہ توبہ سے معاف ہو جائے گا۔ اور توبہ کے لیے سورج کے واپس کیے جانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اور اگر اس میں وہ بے قصور ہے مثلاً سویا رہا یا بھول گیا تو وہ بڑی آسانی سے بعد از غروب فوت شدہ عصر ادا کر سکتا ہے۔

پھر یہ امر بھی قابل غور ہے کہ غروب آفتاب کے ساتھ عصر کا وقت جاتا رہتا ہے بالفرض اگر سورج لوٹ آئے اور کوئی شخص رجوع آفتاب کے بعد نماز عصر ادا کرے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوگا کہ اس نے عصر کی نماز اصلی وقت پر ادا کی۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿ وَ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَ قَبْلَ غُرُوْبِهَا ﴾ [طه ۱۳۰]

''اور اپنے پروردگار کی تسبیح اور تعریف بیان کرتا رہ، سورج نکلنے سے پہلے اور اس کے ڈوبنے سے پہلے، رات کے مختلف وقتوں میں بھی اور دن کے حصوں میں بھی تسبیح کرتا رہ۔''

اس میں مغرب کا مشہور وقت مراد ہے۔ انسان پر لازم ہے کہ اس غروب آفتاب سے پہلے مغرب کی نماز پڑھ لے۔ جب سورج طلوع ہوا اور پھر غروب ہو۔ اسی طرح غروب آفتاب کے ساتھ روزہ کا افطار کرنا اور نماز مغرب ادا کرنا درست ہوتا ہے۔ اب بار ثانی آفتاب کے طلوع پذیر ہونے سے افطار کرنے والے کا روزہ فاسد نہیں ہوگا [اور اس کی نماز باطل نہیں ہو جائے گی] یہ ایک فرضی بات ہے جو کبھی وقوع پذیر نہیں ہوئی اور نہ ہی کبھی ہوگی۔ پھر اس کو مقدر ماننا ایسی چیز کو مقدر ماننا ہے جس کا کوئی وجود ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فروعات میں کلام کرنے والے علماء کے ہاں اس جیسی مثالوں کے بارے میں کوئی

❀ حمیری: اسماعیل بن محمد بن یزید بن ربیعہ حمیری رافضی شاعر تھا' ۱۰۵ ہجری میں پیدا ہوا اور ۱۷۹ ہجری میں وفات پائی۔ ابن حجر کہتے ہیں: انتہائی خبیث رافضی تھا۔ دار قطنی کہتے ہیں: اپنے شعروں میں صحابہ کرام پر طعن کرتا اور حضرت علی کی مدح کیا کرتا تھا۔ شہرستانی نے اسے مختار یہ کیسانیہ میں سے شمار کیا ہے۔ یہ مختار بن ابو عبید ثقفی کے وہ ساتھی ہیں جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد محمد بن حنفیہ کی امامت کے قائل ہیں۔ اس کے حالات زندگی جاننے کے لیے دیکھیں: لسان المیزان ۱/ ۴۳۶۔ البدایة والنهایة ۱۰/ ۱۷۳۔ الملل والنحل ۱/ ۱۳۳۔

حکم نہیں ملتا۔

نیز غزوۂ خندق میں نبی کریم ﷺ کی نماز عصر فوت ہوگئی تھی۔ آپ نے کثیر صحابہ کی معیت میں بصورت قضاء ادا کی تھی۔ اور رجوع آفتاب کی دعا نہ فرمائی؛ [حالانکہ آپ کو اس سے بڑا دکھ ہوا، اور آپ نے اس سے روکنے والے کفار کے حق میں بددعا بھی فرمائی تھی۔ ❶ اس بات کا احتمال ہے کہ آفتاب بادل کے نیچے چھپا ہوا ہو اور پھر نمودار ہو گیا ہو تو انھوں نے سمجھا کہ دوبارہ طلوع ہوا ہے]۔

صحیح بخاری میں ہے نبی کریم ﷺ نے جب غزوہ خندق کے بعد صحابہ کرام کو بنی قریظہ کی طرف بھیجا تو فرمایا:

''تم میں ہر کوئی نماز عصر بنی قریظہ کے پاس پہنچ کر پڑھے؛ مگر نماز کا وقت راستہ ہی میں آ گیا۔ کچھ لوگوں نے کہا:''ہم تو وہیں پہنچ کر نماز پڑھیں گے۔'' بعض نے کہا کہ:''ہم تو پڑھ لیتے ہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مطلب یہ نہیں تھا کہ نماز قضا کر دی جائے۔'' جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ واقعہ بتایا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی سے کچھ نہیں فرمایا۔'' [سبق تخریجه]۔

پس یہ لوگ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے جنہوں نے سورج غروب ہونے کے بعد نماز عصر ادا کی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے افضل تو نہیں ہیں۔ جب رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ نے غروب آفتاب کے بعد نماز عصر پڑھی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی ایسا کرنے کے زیادہ مستحق تھے۔

اور اگر غروب آفتاب کے نماز جائز نہیں تھی یا ناقص تھی تو رسول اللہ ﷺ اس بات کے زیادہ حق دار تھے کہ آپ کے لیے سورج کو واپس لایا جاتا۔ اور اگر نماز کامل اور جائز تھی تو پھر سورج کی واپسی کی ضرورت نہیں تھی۔

مزید برآں اس جیسے خارج از عادات قضایا اور امور عظیمہ' جن کو نقل کرنے کے اسباب اور ہمتیں موجود ہوں' اگر پیش آئے ہوتے تو لوگ ضرور اسے نقل کرتے۔ جب ایک دو افراد کے علاوہ کسی نے بھی اس کو نقل نہیں کیا تو اس سے اس روایت کا جھوٹ ہونا معلوم ہو گیا۔

فصل:

[کوفہ کا سیلاب اور حضرت علی رضی اللہ عنہ]

[اشکال]: دسواں واقعہ: شیعہ مصنف لکھتا ہے:''کوفہ میں ایک دفعہ اتنا سیلاب آیا کہ ڈوبنے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کے خچر پر سوار ہوئے، لوگ بھی آپ کے ہم راہ تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ ساحل فرات پر اترے، نماز پڑھی اور دعا کی۔ پھر ایک ٹہنی لے کر پانی کی سطح پر دے ماری۔ چنانچہ پانی خشک ہو گیا۔ بہت ساری مچھلیاں آپ کو سلام کرنے لگیں، مگر دو خاص قسم کی مچھلیاں [جری اور مرماہی] خاموش رہیں، جب آپ سے اس کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا جو مچھلیاں پاک تھیں، ان میں اللہ تعالیٰ نے قوت گویائی پیدا کر دی اور جو نجس تھیں انہیں گونگا اور خاموش کر دیا۔'' [انتہی کلام الرافضی]

❶ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوة الخندق (حدیث: ٤١١١، ٤١١٢)، صحیح مسلم، کتاب المساجد، باب الدلیل لمن قال الصلاة الوسطی...... (حدیث: ٦٢٧۔٦٣١)۔

[جواب]: اس کا جواب کئی طرح سے ہے:

پہلی بات: ہم شیعہ سے اس کی صحیح اسناد اور ثبوت پیش کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ بلا اسناد تو ایسی کہانیاں ہر شخص بیان کر سکتا ہے، مگر ان سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔

دوسری بات: نبی کریم ﷺ کی خچر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس نہ تھی۔

تیسری بات: [ہمارا دعویٰ ہے کہ یہ واقعہ جھوٹا ہے؛ کیونکہ] اسے کسی بھی قابل اعتماد اہل علم نے اپنی کتابوں میں نقل نہیں کیا، ایسا قصہ اگر صحیح ہوتا تو لوگ کثرت سے اسے بیان کرتے؛ کیونکہ اسے نقل کرنے کے دواعی اور اسباب موجود تھے۔ اس کے نقل کرنے والے نے واقعہ کی کوئی سند بیان ہی نہیں کی تو پھر محض کہانی کیسے قبول کی جا سکتی ہے۔

چوتھی بات: مزید براں سب قسم کی مچھلیاں اجماعاً حلال ہیں، رسول اللہ ﷺ سے صحیح سند کے ساتھ ثابت ہے آپ نے سمندر کے بارے میں فرمایا: ''سمندر کا پانی پاک ہے اور اس کا مردار بھی حلال ہے۔''

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿اُحِلَّ لَکُمْ صَیْدُ الْبَحْرِ وَ طَعَامُهٗ مَتَاعًا لَّکُمْ وَ لِلسَّیَّارَةِ﴾ [المائدة ۹۶]

''تمھارے لیے سمندر کا شکار حلال کر دیا گیا اور اس کا کھانا تمھارے لیے سامان زندگی ہے اور قافلے کے لیے۔''

ائمہ امت اور سلف کا اجماع ہے کہ تمام اقسام کی مچھلیاں حلال ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی دیگر تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ جب اسے حلال سمجھتے ہیں تو پھر نجس کیسے قرار دے سکتے ہیں۔ مگر رافضی جہالت کی یہ انتہاء ہے کہ ایسی بے بنیاد روایتوں سے اللہ کی حلال کردہ چیزوں کو حرام قرار دیتے ہیں۔

پانچویں بات: مچھلیوں میں قوت گویائی کا پیدا ہونا عادت کے مطابق ان کے بس میں نہیں ہے' مگر یہ ایک خارق عادت چیز ہے، جس چیز میں بھی اللہ تعالیٰ نے یہ قدرت پیدا کر دی وہ ناطق ہوگئی اور جس میں یہ قوت پیدا نہ کی؛ اسے خاموش رکھنا چاہا تو وہ حسب معمول خاموش رہی۔ یہ بھی اس صورت میں کہہ سکتے ہیں جب یہ واقعہ پیش آیا ہو۔ اس میں مچھلی کا کیا گناہ ہے؟ کہ ہم اسے نجس قرار دیں۔ [ہم قبل ازیں بیان کر چکے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عظمت وفضیلت ان موضوعات سے بے نیاز ہے]۔ جو کوئی بے زبان جانوروں کو اس وجہ سے گنہگار قرار دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں قوت گویائی نہیں بخشی تو حقیقت میں وہ ان جانوروں پر ظلم کر رہا ہے۔

اور اگر کوئی کہنے والا یہ بات کہے کہ: اللہ تعالیٰ نے اسے قوت گویائی عطا کی تھی مگر وہ خاموش رہی؛ تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ: اگر یہ واقعہ حقیقت میں پیش آیا ہے تو یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کرامت اور آپ کی تعظیم وقدر کی ہے۔ کرامت تو آپ کو سلام کرنے سے ظاہر ہوگئی تھی؛ قدرت حاصل ہونے کے باوجود کلام نہ کرنے میں کوئی کرامت نہیں ہے۔ جب مچھلی نے آپ کو قدرت ہونے کے باوجود سلام نہیں کیا تو اس میں پھر کیا کرامت ہوئی۔ بلکہ اس میں تو پاکیزہ چیزوں کو حرام کرنے والی بات ہے۔ اس لیے کہ مچھلی پاکیزہ اور حلال چیز ہے' مگر اس قصہ کی رو سے اسے حرام قرار دیا گیا ہے؛ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے لیے عقوبت ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِیْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَیْهِمْ طَیِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ وَ بِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ کَثِیْرًا﴾

''تو جولوگ یہودی بن گئے، ان کے بڑے ظلم ہی کی وجہ سے ہم نے ان پر کئی پاکیزہ چیزیں حرام کر دیں، جو ان کے لیے حلال کی گئی تھیں اور ان کے اللہ کے راستے سے بہت زیادہ روکنے کی وجہ سے۔'' [النساء ۱۶۰]

یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس مچھلی کو حرام سمجھنا یہودیوں کے اخلاقیات میں سے ہے۔ اور رافضی چونکہ ان کے بھائی ہیں' اس لیے ان سے اس قسم کی باتیں بعید نہیں ہیں۔

چھٹی بات: ان سے کہا جائے گا کہ: ''یہاں پر مقصود تو پانی کے خشک ہونے سے حاصل ہو گیا تھا۔ تو پھر مچھلی کے آپ کو سلام کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اور نہ ہی کوئی ایسا سبب موجود تھا جس کا تقاضا ہو کہ ایمان کی مضبوطی کے لیے کوئی خارق عادت واقعہ [یا کرامت] ظاہر ہو جائے۔ اس لیے کہ پہلی بات سے حجت قائم ہو گئی اور ضرورت پوری ہو گئی؛ جب کہ دوسری بات میں نہ ہی حجت تھی اور نہ ہی ضرورت۔

کیا آپ دیکھتے نہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے سمندر کے پھٹ جانے میں پانی کے خشک ہو جانے سے بڑا معجزہ تھا۔ لیکن پھر بھی مچھلیوں نے آپ پر سلام نہیں کیا۔ اور جب آپ خضر علیہ السلام کے پاس گئے تو آپ کے پاس توشہ دان میں نمک لگی ہوئی مچھلی تھی؛ اللہ تعالیٰ نے اسے زندہ کیا' اور وہ ڈبے سے نکل کر پانی میں چلی گئی' اور اس کے جاتے ہوئے یوں لگتا تھا جیسا کہ سمندر میں سرنگ بن گئی ہو۔ مگر اس نے نہ ہی موسیٰ علیہ السلام کو سلام کیا اور نہ ہی یوشع علیہ السلام کو۔ سمندر میں ہمیشہ مدو جزر رہتا ہے مگر اس کے بارے میں کہیں بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ کبھی کسی مچھلی نے صحابہ یا تابعین رضی اللہ عنہم اجمعین میں سے کسی ایک کو سلام کیا ہو۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان اس سے بہت بلند ہے کہ اس جیسی حکایات سے ان کے فضائل و مناقب ثابت کیے جائیں؛ جن کے جھوٹ ہونے کے بارے میں سبھی اہل علم و عقل جانتے ہیں۔

فصل:

[سانپ کا واقعہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ]

[اشکال]: گیارہواں واقعہ: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ''علماء کی ایک جماعت نے روایت کیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کوفہ کے منبر پر خطبہ دے رہے تھے کہ ایک سانپ نکلا اور منبر پر چڑھ آیا۔ لوگوں نے ڈر کر اسے مارنا چاہا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس سے روکا، اس کے ساتھ کچھ بات چیت کی تو وہ منبر پر سے اتر گیا۔ جب لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا تو فرمایا وہ جنوں کا حاکم تھا اور ایک پیچیدہ مسئلہ دریافت کرنے آیا تھا۔ میں نے وہ مسئلہ بتا دیا جس دروازے سے وہ سانپ داخل ہوا تھا اہل کوفہ اسے باب ثعبان (سانپ والا دروازہ) کہا کرتے تھے۔ بنو امیہ نے یہ نام مٹانے کے لیے اس دروازہ پر عرصہ تک بہت سے مقتولوں کو لٹکائے رکھا، اب لوگ اسے ''باب قتلیٰ (مقتولوں کا دروازہ) کہہ کر پکارنے لگے ہیں۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جواب]: ہم کہتے ہیں: ''اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جنات تو ان دوسرے علماء کے پاس بھی مسائل دریافت کرنے کے لیے آتے ہیں جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ہزار درجہ کم مرتبہ کے ہیں؛ قدیم و جدید دور میں یہ بات ثابت ہے [اور یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے، پھر اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کیا خصوصیت ہے]؟ اگر یہ واقعہ صحیح بھی ہے تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں، اس لیے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مقام اس سے بہت بلند تھا، اور یہ آپ کے ادنیٰ فضائل میں سے ایک ہوگا۔ اور اگر یہ

واقعہ ظہور پذیر نہیں ہوا تو اس سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عظمت و جلالت میں کوئی قدح وارد نہیں ہوتی۔ ایسی کہانیوں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضائل وہی لوگ ثابت کرنا چاہتے ہیں جو آپ سے [اور علم سے] بہت دور ہیں۔ رہ گئے وہ لوگ جنہیں اہل علم ودین کی صحبت نصیب ہوئی ہے وہ جانتے ہیں کہ دیگر اہل علم کے اس سے بھی بڑے بڑے واقعات ہیں۔ یا انہوں نے اس سے بھی بڑی بڑی کرامات ملاحظہ کی ہوتی ہیں۔ ایسی روایت سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت ثابت نہیں ہوتی۔

❀ ہم جانتے ہیں کہ وہ صحابہ جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بہت کم درجہ کے ہیں' لیکن ہم سے وہ درجہ ہا بہتر اور اعلیٰ مقام رکھتے ہیں۔ جب ایسے واقعات سے ہم جیسے کسی ایک انسان پر بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت ثابت نہیں کی جاسکتی تو پھر حضرت ابو بکر وعمر رضی اللہ عنہما پر آپ کی فضیلت کیسے ثابت ہوسکتی ہے۔

مگر اس کا کیا علاج کہ شیعہ کی جہالت' ظلم اور اولیاء اللہ متقین سے دوری کی وجہ سے ان کے پاس کوئی قابل اعتماد کرامت موجود نہیں ہے۔ بلکہ ان کے علمی افلاس کی حالت یہ ہے کہ جب کسی خارق عادت واقعہ کا سنتے ہیں تو اس کی اس طرح تعظیم کرتے ہیں جیسے کسی قلاش انسان کو چند ٹکے مل جائیں تو ان کی تعظیم کرتا ہے۔ اور بھوکے کو روٹی کے ٹکڑے مل جائیں تو وہ انہیں بہت بڑا جانتا ہے۔

رافضی اپنی جہالت اور اولیاء اللہ متقین کی راہ اور تقویٰ الٰہی سے دوری کی وجہ سے کرامات اولیاء میں اپنا کوئی حصہ ومقام نہیں رکھتے۔ اسی لیے جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں اس قسم کی من گھڑت کہانیاں سنتے ہیں تو یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ بات صرف انسان میں ہوسکتی ہے جو ساری مخلوق میں سب سے افضل ہو۔ بلکہ مذکورہ بالا خوارق ہی نہیں بلکہ اس سے بڑی بڑی خرق عادات امت محمدیہ کے بہت سارے ایسے لوگوں کو حاصل ہیں جن سے ابو بکر وعمر وعثمان وعلی رضی اللہ عنہم اجمعین ہزار درجہ افضل ہیں۔ جو کہ ان تمام صحابہ کرام سے محبت کرتے اور دوستی رکھتے ہیں۔ اور جن کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے تقدیم بخشی ہے وہ ان کو مقدم جانتے ہیں۔ خصوصاً وہ حضرت ابو بکر صدیق کے مقام ومرتبہ سے اچھی طرح واقف ہیں؛ اور انہیں باقی تمام صحابہ پر مقدم سمجھتے ہیں۔ اس لیے کہ اس امت میں آپ کو تقویٰ اور ولایت الٰہی میں بہت خاص مقام حاصل تھا۔

فصل چہارم :

ائمہ اثنا عشرہ کی امامت کا اثبات

[اشکال] : شیعہ مصنف لکھتا ہے:''ہم کئی طریقوں سے بارہ ائمہ کی امامت ثابت کرتے ہیں ۔اس کا پہلا طریق نص ہے ۔ چنانچہ شیعہ تمام بلاد و امصار میں خلفاً عن سلفٍ نقل کرتے چلے آئے ہیں کہ نبی ﷺ نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے کہا تھا:''یہ خود امام، امام کا بھائی اور امام کا بیٹا ہے اس کی نسل سے نو امام ہوں گے ،امام قائم کا نام میرا نام اور کنیت بھی میرے جیسی ہوگی ۔ وہ زمین کو اسی طرح عدل و انصاف سے بھر دے گا جس طرح وہ جور و استبداد سے بھر چکی ہوگی ۔''

[جواب]:اس کا جواب کئی طرح سے ہے:

پہلا جواب یہ ہے کہ: یہ شیعہ پر بہتان ہے ۔ تمام شیعہ نے یہ بات نہیں کہی، بلکہ یہ مختلف شیعہ گروہوں میں سے بعض شیعہ کا قول ہے ۔ اکثر شیعہ خصوصاً تمام زیدیہ اس کو اسی طرح جھوٹا سمجھتے ہیں جیسے اہل سنت ۔ زیدیہ کا فرقہ تمام شیعہ فرقوں میں زیادہ دانش مند صاحب علم اور مقابلۃً بہتر ہے ۔تمام اسماعیلیہ کے نزدیک بھی یہ جھوٹ ہے ۔ شیعہ کے تقریباً ستر فرقے ہیں جو سب اس روایت کو جھٹلاتے ہیں ۔ یہ روایت اور مذکورہ بالا نظریہ متاخرین شیعہ اثنی عشریہ کی اختراع ہے ۔

❀ جملہ طور پر شیعہ کے متعدد فرقے ہیں؛ ان میں سے ان کی بڑی اقسام بیس ہیں ؛ایک فرقہ کے علاوہ باقی تمام لوگ اس کا انکار کرتے ہیں ؛ تو پھر شیعہ کے تواتر کا دعوی کرنا کیا معانی رکھتا ہے ۔

دوسرا جواب:یہ روایت شیعہ اثنا عشریہ کے علاوہ باقی شیعہ فرقوں کی نقل کردہ روایت کے معارض و متناقض ہے ۔مثلاً جو لوگ بارہ ائمہ کو نہیں مانتے ؛ اور راوندیہ کی نقول بھی اسی طرح کی ہیں ۔ اس لیے کہ ان میں سے ہر ایک کا دعوی اثنا عشری شیعہ کے دعوی کے برعکس ہے ۔

تیسرا جواب : متقدمین شیعہ علماء کرام نے اس نص کو اس طرح نہیں سمجھا' اور نہ ہی انہوں نے اپنی کتابوں میں کوئی ایسا ذکر کیا ہے اور نہ ہی انہوں نے اس روایت سے استدلال کیا ہے ۔ جب کہ ان کے واقعات متواتر اور مشہور ہیں ۔اس سے معلوم ہوا کہ متاخرین شیعہ کی اختراع ہے ۔ یہ روایت اس وقت گھڑلی گئی جب حسن بن علی عسکری (بلا وارث) کا انتقال ہوگیا ۔ اور پھر یہ دعوی کیا جانے لگا کہ : امام عسکری کا بیٹا محمد روپوش ہوگیا ہے ۔اس وقت یہ نص بھی ظہور میں آئی ۔ یعنی نبی کریم ﷺ کی وفات سے تقریباً دو سو پچاس سال کے بعد کا واقعہ ہے ۔

چوتھا جواب : دوسری جانب اہل سنت اور علماء اہل سنت اور ناقلین آثار جو شیعہ سے [ہر لحاظ سے] کئی گنا زیادہ ہیں؛ وہ سبھی بغیر کسی شک و شبہ اور تردد کے علم یقینی کے طور پر جانتے ہیں کہ یہ رسول کریم ﷺ پر عظیم بہتان ہے ۔ بلکہ اس پر مباہلہ کرنے کے لیے تیار ہیں ۔ اگر شیعہ علماء یہ دعوی کریں کہ وہ اس کے متواتر ہونے کا علم رکھتے ہیں ۔ یہ بھی بالکل ایسے ہی ہے جیسے علماء اہل سنت اس روایت کے جھوٹ ہونے کا دعوی کرتے ہیں ۔

پانچواں جواب: تواتر کی شرط یہ ہے کہ کسی روایت کے ناقلین کی تعداد اتنی زیادہ ہو کہ طرفین اور وسط کے لوگوں کو یقینی علم حاصل ہو جائے۔ حسن عسکری کی موت سے پہلے کوئی بھی شخص امام منتظر کا قائل نہ تھا۔ اور نہ ہی حضرت علی اور بنو امیہ کے دور میں کسی ایسے انسان کے بارے میں علم ہو سکا ہے جس نے بارہ ائمہ اور امام غائب کے عقیدہ کا اعلان یا دعوی کیا ہو۔ اس وقت تو دعوی کرنے والے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلیفہ منصوص ہونے کا دعوی کرتے تھے۔ [البتہ شیعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور بعد میں آنے والے ائمہ کی امامت کے دعوے دار تھے]۔ بارہ اماموں کی امامت کا دعویٰ جن کا آخری امام ہنوز معدوم ہے؛ متقدمین میں سے کسی نے نہیں کہا تھا اور نہ کسی ناقل نے اسے نقل کیا۔ [پھر تواتر کا دعویٰ کس حد تک صحیح ہے؟]۔

چھٹا جواب: اصل میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں کوئی ایک بھی رافضی نہیں تھا۔ اگرچہ بعض دعوی کرنے والوں نے چند ایک صحابہ کے بارے میں ایسا دعوی کیا بھی ہے' لیکن یہ صحابہ کرام پر محض جھوٹ ہے۔ اس صورت حال میں تو کوئی تواتر ثابت نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ اگر ایک تھوڑی سی تعداد ایک مذہب پر متفق ہو بھی جائے تو ان کا جھوٹ پر جمع ہونا ممکن ہوتا ہے' [اس لیے تواتر ثابت نہیں ہوسکتا]۔ رافضہ جب جمہور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر جھوٹ بولنا جائز سمجھتے ہیں تو پھر اس روایت کے ناقلین پر قلت تعداد کے باوجود جھوٹ کو کیسے جائز نہیں سمجھ سکتے؟ اگر ان میں سے کسی ایک نے نقل بھی کیا ہو تو۔ پھر اگر صحابہ کرام کے دور میں اتنی تعداد نہیں پائی جاتی جس سے تواتر ثابت ہو سکے تو پھر یہ دعوی شروع سے اپنی جڑوں سے ہی کٹ گیا۔

ساتواں جواب: رافضی دعوی کرتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں چند ایک کے علاوہ جن کی تعداد دس تک بڑی مشکل سے پہنچتی ہے؛ یا اس سے بھی کم رہتی ہے؛ باقی سارے لوگ مرتد ہو گئے تھے۔ یہ ثابت علی الاسلام رہنے والے صحابہ: سلیمان' عمار؛ ابوذر اور مقداد تھے۔ یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ باقی جمہور صحابہ کرام نے تو یہ نص نقل نہیں کی۔ شیعہ کے نزدیک ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے یہ نص چھپالی تھی۔ تو پھر شیعہ کے لیے یہ ممکن نہیں رہتا کہ وہ اس نص کی روایت کو ان صحابہ کرام کی طرف منسوب کریں۔ جب کہ دوسرے لوگوں کے بارے میں شیعہ کا خیال ہے کہ ان سب کا موالات علی پر اجماع تھا۔ پس اس صورت میں وہ چھوٹی جماعت جن کا ایک بات پر جمع ہونا ممکن ہو' ان کے نقل کرنے سے تواتر حاصل نہیں ہوسکتا۔ اس لیے کہ ان کا جھوٹ پر جمع ہونا ممکن اور جائز ہوتا ہے۔

- جب رافضی جمہور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر- ان کی کثرت کے باوجود- جھوٹ بولنے کو جائز سمجھتے ہیں' اور انہیں اسلام سے مرتد قرار دیتے ہیں۔ اور ایسی باتیں چھپانے کا الزام لگاتے ہیں جن کا عادت کے مطابق چھپایا جانا ممکن نہیں؛ تو پھر ایک چھوٹے سے گروہ پر جھوٹا ہونے کا الزام زیادہ آسان اور اولیٰ ہے۔ جب یہ لوگ اپنی خواہشات کے خلاف کوئی چیز نقل کرتے ہیں تو پھر کھل کر صحابہ کرام کو جھوٹے کہتے ہیں۔ تو پھر ایسے مسئلہ میں ان کی تصدیق کیسے ممکن ہو سکتی ہے؟ [جب کہ وہ صحابہ کو سچے نہیں مانتے]۔ جب روایت کے نقل کرنے والے ہی اپنی خواہشات کے مطابق نقل کر رہے ہوں۔
- یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ شیعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نصرت میں اتباع ہوی سے کام لیتے ہیں۔ تو پھر آپ کے بارے میں نص نقل کرنے میں کیسے ان لوگوں کی تصدیق کی جا سکتی ہے؟ جب کہ تمام اہل علم و عقل جانتے ہیں کہ مسلمانوں کے فرقوں میں شیعہ سے بڑھ کر عمداً جھوٹ بولنے اور حق بات کو جھٹلانے والا کوئی دوسرا فرقہ نہیں۔ جب باقی فرقوں کا معاملہ

ان کے برعکس ہے۔خوارج اگر چہ دین سے نکل چکے ہیں؛ مگر وہ عمداً جھوٹ نہیں بولتے۔معتزلہ سچائی کو دین سمجھتے ہیں۔لیکن شیعہ پر ان کے ظہور کے وقت سے ہی جھوٹ غالب ہے۔

آٹھواں جواب: کہا گیا ہے کہ شیعہ امامیہ نے پہلی مرتبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امامت کے اثبات میں بالنص کا دعویٰ خلافت راشدہ کے آخری دَور میں کیا۔عبد اللہ بن سباء [1] اور اس کے ہم نواء کذابین کے ایک گروہ نے اس عقیدہ کا اختراع کیا تھا۔اس بارے میں ہم حتمی طور پر جانتے ہیں کہ وہ اس سے پہلے اس دعوی اوران لوگوں کا کوئی وجود نہیں تھا۔تو پھر تواتر کا دعوی کہاں سے آگیا؟ [اوراس کی کیا حقیقت باقی رہ جاتی ہے]۔

نوواں جواب: وہ احادیث مبارکہ جو حضرات ابوبکر وعمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے فضائل پر دلالت کرتی ہیں؛ وہ عوام وخواص میں زیادہ اور اعظم تواتر کیساتھ پائی جاتی ہیں۔اگر یہ بات جائز ہے کہ ان فضائل کے نقل کرنے کی وجہ سے جمہور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر تنقید کی جائے؛ تو پھر شیعہ کے اس تواتر پر تنقید کرنا زیادہ اولیٰ ہے۔اور اگر اس تواتر پر تنقید ممکن نہیں ہے تو پھر پہلے قسم کی روایات پر بدرجہ اولی ممکن نہیں۔جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے فضائل ان نصوص کثیرہ متواترہ کی روشنی میں ثابت ہوتے ہیں ؛تو پھر ان لوگوں کا اس نص کی مخالفت پر اجتماع و اتفاق محال ہے۔اس لیے کہ اگر مخالفت کو سچ تسلیم کر لیا جائے تو یہ سب سے بڑا گناہ اور اللہ کی نافرمانی وسرکشی ہوگی۔

دسواں جواب: شیعہ امامیہ میں سے کوئی ایک بھی متصل سند کے ساتھ اس روایت کو ثابت نہیں کرسکتا' اس کے تواتر کا دعوی کرنا تو بہت دور کی بات ہے۔یہ الفاظ تکرار کے محتاج ہیں۔جب ان الفاظ کے نقل کرنے والوں نے انہیں پڑھا سنا نہیں ہوگا تو وہ انہیں یاد بھی نہیں رکھ سکیں گے۔حالانکہ اس وقت میں قوی حافظہ والے لوگ موجود تھے جنہوں نے قرآن یاد کیا؛ [احادیث حفظ کیں] تشہد اور اذان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نسل در نسل نقل کرتے چلے آرہے ہیں۔[تو اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ الفاظ ارشاد فرمائے ہوتے جیسا کہ شیعہ کا دعوی ہے تو صحابہ کرام اور تابعین انہیں ضرور نقل کرتے ؛ان کا اس روایت کو نقل نہ کرنا اس کے جھوٹ اور من گھڑت ہونے کی ایک نشانی ہے]۔

❀ جب ہم فضائل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے بارے میں تواتر کا دعوی کرتے ہیں تو کبھی یہ دعوی تواتر معنوی کے لحاظ سے ہوتا ہے جیسے خلفاء اربعہ کی خلافت؛ جمل اور صفین کے واقعات؛ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے شادی کرنا۔ اوراس طرح کے دیگر واقعات جن کے نقل کرنے کے لیے متعین الفاظ کی ضرورت نہیں ہوتی' بلکہ واقعہ کا مشہور ومعروف ہونا ضروری ہوتا ہے۔جیسا کہ صحابہ کرام کی مسابقت اوران کے اعمال کے بارے میں تواتر۔اور کبھی یہ تواتر لفظی ہوتا ہے؛ یعنی راویانِ حدیث ایک ہی جیسے ایسے الفاظ میں روایت نقل کریں جن سے علم ضروری حاصل ہو۔

[1] بارہ اماموں کی امامت کو نص کے ساتھ ثابت کرنے میں شیعہ کا دعویٰ کو تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں: (۱) سیدنا علی کی امامت و ولایت کی نص۔ امام ابن تیمیہ نے منہاج السنہ میں اس کے ابطال کا کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔باقی رہی یہ بات کہ سیدنا علی نے نص صریح کے مطابق اپنے بیٹے حسن کو امام مقرر کیا تھا ہم قبل ازیں اس کا بطلان ثابت کر چکے ہیں۔ (۲) شیعہ کا دوسرا دعویٰ یہ ہے کہ سیدنا علی کا وصی ہونا نص سے ثابت ہے، مشہور شیعہ عالم الکشی نے اعتراف کیا ہے کہ اس عقیدہ کا موجد عبد اللہ بن سباء تھا ہم قبل ازیں یہ حوالہ نقل کر چکے ہیں۔

گیارھویں وجہ: اہل بیت [مثلاً امام جعفر صادق، ان کے والد اور ان کے دادا امام زین العابدین علی بن حسین بن علی رضی اللہ عنہ] سے منقول تواتر خود اس روایت کو جھٹلا رہا ہے؛ اس لیے کہ یہ لوگ اپنی امامت کو بھی برنص نہیں قرار دیتے تھے۔ بلکہ ایسا دعوی کرنے والوں کو جھٹلایا کرتے تھے۔ چہ جائے کہ وہ ایسی نصوص سے بارہ ائمہ کی امامت ثابت کریں۔

بارھویں وجہ: بارہ ائمہ کے متعلق وارد صحیح حدیث کو شیخین نے روایت کیا ہے۔ حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے آپ فرماتے ہیں: میں اپنے والد کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا؛ میں نے سنا کہ آپ فرما رہے تھے:

,,لوگ اس وقت تک امن وچین اور عزت سے زندگی بسر کرتے رہیں گے جب تک بارہ آدمی ان کے حاکم و امام رہیں گے۔ پھر آہستہ آواز سے ایک بات کہی جو مجھ سے پوشیدہ رہی۔ جب میں نے اپنے والد سے پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ وہ بارہ اشخاص سب کے سب قریش میں سے ہوں گے۔'' [متفق علیه]۔

ایک روایت میں ہے: آپ ﷺ نے فرمایا: ''اسلام اس وقت تک غالب رہے گا؛ یہاں تک کہ بارہ خلیفہ ہوگزریں۔''

ایک روایت میں ہے: آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ دین اس وقت تک غالب رہے گا؛ یہاں تک کہ بارہ خلیفہ ہو گزریں۔ پھر آپ نے آہستہ آواز سے ایک بات کہی جو مجھ سے پوشیدہ رہی۔ جب میں نے اپنے والد سے پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ وہ بارہ خلفاء سب کے سب قریش میں سے ہوں گے۔'' [متفق علیه۔البخاری ۹/ ۸۱؛ مسلم ۳/ ۱۴۵۲]

تورات کی عبارات اس کی تصدیق کرتی ہیں۔ظاہر ہے کہ اس حدیث سے اثناءعشریہ کے بارہ امام مراد نہیں لیے جا سکتے۔ اس لیے کہ حدیث کے واضح الفاظ ہیں کہ: ''اسلام اس وقت تک غالب رہے گا؛ یا فرمایا: ''یہ دین اس وقت تک غالب رہے گا۔'' یا فرمایا کہ: ''لوگ اس وقت تک خوشحال رہیں گے۔''

یہ تمام روایات دلالت کرتی ہیں کہ ان ائمہ کی ولایت کے عہد میں اسلام کو قائم اور غالب ہونا چاہیے۔ اور جب ان کی مدت ولایت ختم ہو جائے گی تو اسلام کا بھی وہ غلبہ اور استحکام نہیں رہے گا۔

شیعہ خود اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ان میں سے کسی ایک امام کے زمانہ میں بھی امت کا شیرازہ متحد نہ رہا بلکہ امت تفرق و انتشار کا شکار رہی، اور سرکش باغی ظالموں اور کافروں نے انھیں ظلم وستم کا نشانہ بنائے رکھا؛ منافق اور کافر ان پر غالب رہے۔ اور اہل حق ان کے عہد امارت میں یہود سے بھی زیادہ ذلیل رہے۔ مزید براں امام منتظر کی امامت شیعہ کے نزدیک تا قیام قیامت باقی رہے گی۔ تو پھر اس صورت میں اثناعشریہ کے نزدیک کوئی زمانہ بھی ان کے امام سے خالی نہیں رہے گا۔ اگر ایسا ہوا تو پھر زمانہ دو طرح کا نہیں رہے گا؛ ایک وہ زمانہ جس میں دین اسلام کا معاملہ غالب و قائم و دائم ہو اور دوسرا وہ زمانہ جب اسلام کو غلبہ و استحکام نصیب نہ ہو۔ بلکہ یہ ہر زمانہ میں ایک ہی جیسا رہے گا۔ یہ بات صحیح حدیث کے خلاف ہے۔ نیز یہ اسلام مہدی کے قیام کے بعد راہ راست پر قائم ہوگا۔ یہ مہدی اہل سنت والجماعت کا مہدی ہے۔ جب کہ رافضیوں کے مہدی کی مدت بہت قلیل ہے؛ اس میں اس امت کے معاملات کی شیرازہ بندی ممکن نہیں۔

نیز یہ کہ حدیث میں آتا ہے: ''یہ تمام ائمہ قریش میں سے ہوں گے۔''

اگر یہ صرف اولاد علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ خاص ہوتے تو پھر حدیث میں ضرور کوئی ایسا ذکر بھی ہوتا جس سے ان میں باہم تمیز

ممکن ہو جاتی ۔ کیا آپ غور نہیں کررہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ یہ ائمہ اولاد اسماعیل میں سے ہوں گے ۔ اور نہ ہی عربوں کو خاص کیا ہے ۔ اگر چہ یہ اولاد اسماعیل ہی میں سے ہیں ۔ بلکہ آپ ﷺ نے صرف اس قبیلہ کا بیان کیا جس کی وجہ سے یہ لوگ ممتاز ہوں گے ۔ اگر یہ لوگ ہاشمی ہونے کی وجہ سے ممتاز ہوتے یا پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اولاد ہونے کی وجہ سے خاص ہوتے تو پھر اس کا ضرور ذکر بھی کیا جاتا ۔ جب آپ نے اس خلافت و امامت کو مطلق طور پر قریش کے ساتھ رکھا ہے کسی ایک قبیلہ کے ساتھ خاص نہیں کیا تو پھر یہ بھی علم ہونا چاہیے کہ بنوعدی؛ بنوتیم؛ بنوعبد شمس اور بنو ہاشم وغیرہ تمام ہی قریش میں سے ہیں اور خلفاء راشدین کا تعلق ان ہی قبائل سے ہے ۔

فصل:

[خروج مہدی]

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ''ابن عمر رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے بیان کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: ''آخری زمانہ میں میری اولاد میں سے ایک شخص نکلے گا، جس کا نام میرا نام اور جس کی کنیت میری کنیت ہوگی، وہ زمین کو اسی طرح عدل و انصاف سے بھر دیگا جیسے وہ ظلم و استبداد سے بھر چکی تھی؛ یہ مہدی ہوگا ۔''

[جواب]: ہم کہتے ہیں: ''وہ احادیث جن سے خروج مہدی پر استدلال کیا جاتا ہے؛ وہ صحیح ہیں ۔ ان کو احمد و ابوداؤد و ترمذی نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے آپ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''اگر دنیا میں ایک دن بھی باقی رہا تو اللہ تعالیٰ اس دن کو لمبا کردیں گے یہاں تک کہ میرے اہل بیت میں سے ۔ یا فرمایا: ہم میں سے ۔ ایک شخص نکلے گا جس کا نام میرے نام پر اور اس کے والد کا نام میرے والد کے نام پر ہوگا، وہ زمین کو عدل وانصاف سے بھر دے گا، جیسے وہ ظلم و جور سے بھر چکی ہوگی ۔''❶

ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں یہ الفاظ ہیں: ''مہدی میری عترت میں سے اولاد فاطمہ رضی اللہ عنہا میں سے ہوگا ۔''❷

ابوداؤد نے یہ روایت ابوسعید رضی اللہ عنہ سے ان الفاظ میں ذکر کی ہے: ''وہ سات سال تک زمین میں بادشاہی کرے گا ۔''❸

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی طرف دیکھ کر فرمایا: ''بیشک میرا یہ بیٹا سردار ہے؛ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کا نام رکھا ہے ۔ عنقریب اس کی نسل سے ایک شخص پیدا ہوگا، جو ہمارے نبی ﷺ کا ہم نام ہوگا، وہ سیرت و کردار میں ان جیسا ہوگا ۔ مگر شکل وصورت مختلف ہوگی ۔ وہ زمین کو عدل سے معمور کردے گا ۔''❹

ان احادیث کے بارے میں کئی ایک گروہ غلط فہمی کا شکار ہوئے ہیں ۔ بعض لوگوں نے تو احادیث مہدی کا بالکل ہی انکار کردیا ۔

---

❶ سنن ابی داؤد، کتاب المهدی (ح:٤٢٨٢، سنن ترمذی کتاب الفتن، باب ما جاء فی المهدی (ح:٢٢٣٠)

❷ یہ حدیث ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے ۔ سنن ابی داؤد، کتاب المهدی؛ الباب الأول (ح:٤٢٨٤)، سنن ابن ماجة مختصراً، کتاب الفتن، باب خروج المهدی (ح:٤٠٨٦)؛ اس روایت کے الفاظ ہیں: "المهدي من ولد فاطمة ۔" مہدی فاطمہ کی اولاد میں سے ہوگا ۔ صصحه الألباني في السلسلة الضعيفة ١/ ١٠٨ ۔

❸ عن أبي سعيد الخدري رضي الله عنه؛ سنن أبي داؤد، كتاب المهدى؛ الباب الأول (حديث:٤٢٨٥) ۔ وحسنه الألباني في صحيح الجامع الصغير ٦/ ٢٢ ۔ ❹ سنن ابی داؤد، کتاب المهدی (حدیث:٤٢٨٣، ٤٢٩٠) ۔ یہ حدیث الفاظ میں معمولی سے اختلاف کیساتھ شعیب بن خالد نے ابواسحاق سے روایت کیا ہے ۔ یہ حدیث منقطع ہے ۔ ابواسحٰق سبیعی کی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ثابت نہیں ہے ۔

اور وہ ابن ماجہ کی اس حدیث سے دلیل پیش کرتے ہیں:

''لَا مَهْدِیْ اِلَّا عِیْسٰی بن مریم.'' ''عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کے علاوہ کوئی مہدی نہیں۔''❀

❀ ایک تو یہ روایت ضعیف ہے۔ محمد بن ولید بغدادی اور کچھ دوسرے ایسے لوگوں نے اس روایت پر اعتماد کیا جو خود قابل اعتماد نہیں ہیں۔ نیز اس روایت کو ابن ماجہ نے یونس سے؛ انہوں نے شافعی سے اور وہ اہل یمن کے ایک آدمی سے روایت کرتے ہیں۔ اس آدمی کا نام محمد بن خالد جندی تھا۔ اس کی روایات سے استدلال نہیں کیا جاسکتا۔ اور نہ ہی یہ روایت مسند امام شافعی میں موجود ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ: امام شافعی کا جندی سے سماع ثابت نہیں۔ اور یونس کا امام شافعی سے سماع ثابت نہیں۔

دوسری وجہ: جو شیعہ اس مہدی کو اپنا امام کہتے ہیں ان کے نزدیک امام منتظر کا نام محمد بن حسن ہے۔ احادیث مبارکہ میں جس مہدی کی صفات وارد ہوئی ہیں؛ ان کی رو سے اس کا نام محمد بن عبداللہ ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک گروہ نے تو حدیث مبارک سے والد کے نام کا تذکرہ تک مٹا دیا تاکہ روایت ان کے جھوٹ سے متناقض نہ رہے۔ اور ایک گروہ نے اس میں تحریف کی۔ اور وہ کہنے لگے: اس کا دادا حسین ہوگا' اور اس کی کنیت ابوعبداللہ ہوگی۔ تو اس صورت میں معنی ہوگا: ''محمد بن ابو عبداللہ'' اس طرح سے کنیت کو اسم علم بنا دیا۔

❀ گمراہی کی اس ڈگر پر چلنے والا ابن طلحہ بھی ہے جس نے اپنی کتاب ''غایۃ السول فی مناقب الرسول'' میں یہی مسلک اختیار کیا ہے۔ جس انسان کو ان احادیث کی ادنیٰ سی بھی معرفت ہوگی تو وہ جان لے گا کہ یہ تحریف ہے اور رسول اللہ ﷺ پر کھلا ہوا جھوٹ ہے۔ کیا ایسا بھی ہے کوئی انسان رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان: ''جس کا نام میرے نام پر اور اس کے والد کا نام میرے والد کے نام پر ہوگا'' سے آپ کے والد کا نام عبداللہ کے سوا کچھ اور سمجھتا ہو؟ کیا کوئی انسان اس سے یہ بھی سمجھتا ہے کہ آپ کے دادا کی کنیت ابوعبداللہ ہوگی؟ [ہرگز نہیں]۔

❀ پھر اس میں کونسی امتیازیت پائی جاتی ہے۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی اولاد میں کتنے ہی لوگ ایسے ہیں جن کے بیٹوں کے نام محمد ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کے دادا کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ: محمد بن ابوعبداللہ؛ جس طرح اس مہدی کے دادا کے بارے میں دعوی کرتے ہیں۔ اور پھر جو کوئی لوگوں میں اس بات کو بیان کرنا چاہتا ہو تو وہ کیسے محمد بن حسن کو محمد بن عبداللہ بنائے گا اور کہے گا کہ: اس سے مراد آپ کے دادا ابوعبداللہ ہیں۔

❀ اور یہ وصف ایسے بھی بیان ہوسکتا ہے: محمد بن الحسن' یا ابن ابی الحسن؛ اس لیے کہ آپ کے جد اعلی حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔ اور آپ کی کنیت ابوالحسن ہے۔ یہ پہلے الفاظ سے زیادہ بہتر ہے اور ہدایت بیان چاہنے والوں کیلئے زیادہ واضح ہے۔

❀ اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ امام مہدی حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے ہوگا۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے نہیں۔ جیسا کہ اس سے پہلے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ گزر چکے ہیں۔ [1]

❀ [ابن ماجة ٢/ ١٣٤٠ ـ كتاب الفتن' باب شدة الزمان۔ السلسلة الضعيفة برقم ٧٧؛ ج ١/ ص ١٠٣ ۔ أبو داؤد ٤/ ١٥٣]۔

[1] سنن ابی داؤد، کتاب المهدی، (حدیث: ٤٢٩٠)

تیسری وجہ: بہت سارے طوائف میں سے ہر ایک نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ وہی وہ مہدی ہے احادیث مبارکہ میں جس کی بشارت دی گئی ہے۔مثلاً: قرامطہ باطنیہ کا دعویٰ ہے کہ ان کا امام ہی مہدویت کا بانی تھا۔ان لوگوں کی دعوت مغرب میں پھیلی۔

❀ [حالانکہ اس کا دعویٰ مبنی بر کذب و دروغ ہے]۔حقیقت یہ ہے کہ وہ میمون القداح کی اولاد میں سے تھا۔ پھر باطنیہ نے یہ دعویٰ کیا کہ میمون محمد بن اسماعیل بن جعفر کا بیٹا ہے، جس کی طرف اسماعیلیہ منسوب ہیں ۔حقیقت میں یہ لوگ باطن میں ملحد اور تمام ملتوں سے خارج ہیں ۔اور غالیہ اور نصیریہ سے بڑے کافر ہیں ۔ان کا مذہب مجوسیت فلسفہ اور صابی مذہب کا معجون مرکب ہے۔لیکن یہ لوگ اپنے آپ کو شیعہ ظاہر کرتے ہیں ۔اور ان کا اصل دادا یہودی تھا جو کہ ایک مجوسی کالے پالک اور پروردہ تھا۔ان لوگوں نے اپنی حکومت قائم کر لی تھی' اور بہت سارے لوگ ان کے ماننے والے تھے۔ مختلف علماء مثلاً ابو بکر باقلانی و قاضی عبد الجبار ہمدانی اور امام غزالی نے ان کے نقائص و معائب پر کتابیں تصنیف کی ہیں جن میں ان کے اسراروں کا پردہ چاک کیا گیا ہے۔

ایسے ہی دعویداروں میں سے ایک محمد بن عبد اللہ بن تومرت بربری تھا ؛ اس نے مغرب سے خروج کیا تھا۔اس کے اصحاب کو موحدین کہا جاتا تھا۔خطبات میں اس کا نام یوں لیا جاتا تھا:

''امام معصوم اور مہدی معلوم ۔'' وہ جوزمین کو عدل وانصاف سے ایسے بھر دے گا، جیسے وہ ظلم و جور سے بھر چکی ہوگی ۔''

جس نے اپنے شجرہ نسب کو حسن بن علی رضی اللہ عنہما سے ملا لیا تھا۔ یہ محض رافضی نہیں تھا؛ بلکہ اسے احادیث کے بارے میں بھی کچھ علم تھا جس کی بنیاد پر اس نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو چھوڑ کر حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے ہونے کا دعویٰ کیا۔ جو کہ حدیث میں وارد مواصفات کے مطابق تھا۔لیکن یہ بات اضطراری طور پر معلوم ہے کہ یہ وہ مہدی نہیں تھا جس کی بشارت رسول اللہ ﷺ نے دی ہے۔

اور جیسا کہ دوسرے بہت سارے لوگوں نے ایسے دعوے کیے ہیں ۔ان میں سے بعض قتل کر دیے گئے ۔اور بعض لوگوں کے چاہنے والوں نے ان کے متعلق ایسے دعوے کیے ہیں ۔ان کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ انہیں صحیح معنوں میں اللہ ہی جانتا ہے اور بسا اوقات ان میں سے کسی ایک وجہ سے لوگوں کو فائدہ بھی حاصل ہوا ہوگا۔ اگر چہ کچھ دوسرے لوگوں کو نقصان بھی پہنچا ہو جیسا کہ مغرب میں ظہور کرنے والے مہدی کی وجہ سے ہوا۔اس سے بہت سارے لوگوں کو فائدہ حاصل ہوا۔اور بہت سارے گروہوں کو نقصان پہنچا۔اس میں کئی قابل مذمت باتوں کے باوجود کئی ایک قابل مدح وتوصیف باتیں بھی تھیں۔

بہر حال یہ مہدی اور اس جیسے دوسرے مہدی رافضیوں کے اس مہدی سے بہت بہتر تھے۔جس کی نہ ہی کوئی شخصیت اور نہ ہی نام ونشان کا کوئی پتہ ہے۔نہ ہی اس کا احساس ہے نہ ہی خبر۔نہ ہی اس سے کسی کو کوئی دنیا کا فائدہ ملا نہ ہی دین کا۔ بلکہ اس کے موجود ہونے کے اعتقاد کی وجہ سے اتنا بڑا شر وفساد پیدا ہوا جس کو صحیح معنوں میں اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔

فصل:

[امام معصوم کا وجوب]

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:''ہم بیان کر چکے ہیں کہ ہر زمانہ میں امام معصوم کا وجود ضروری[واجب] ہے۔ظاہر ہے کہ ان ائمہ کے بغیر اور کوئی معصوم نہیں ہوسکتا؛ اس پر اجماع ہے۔''[انتہی کلام الرافضی]

[جواب]: اس کے جواب میں کئی نکات ہیں:

پہلا جواب: یہ ہے کہ ہمارے نزدیک امام معصوم کا وجود ہر زمانہ میں ضروری نہیں۔

دوسرا جواب: خود شیعہ کے کئی گروہ ان پر ایمان نہیں رکھتے۔[یعنی بارہ اماموں کو نہیں مانتے]۔

تیسرا جواب: اگر شیعہ کے دعویٰ کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو ہمارے زمانہ میں شیعہ جس امام معصوم کے دعویٰ دار ہیں، وہ اپنی پیدائش کے وقت سے[آج تک]؛ چار سو پچاس سال[آج کل ہمارے دور میں تقریباً گیارہ سو اسی سال] سے زائد عرصہ سے گم ہے[اس کا کوئی نشان ظاہر نہیں ہے]۔ان کے نزدیک یہ امام دوسو ساٹھ ہجری میں سامراء کے غار میں گھس گیا تھا۔اس وقت اس کی عمر پانچ سال تھی۔اور بعض کے نزدیک اس سے بھی کم عمر تھی۔مزید برآں کہ امام غائب سے کوئی ایسا اثر ظاہر نہیں ہوا جو کسی ادنی انسان سے بھی ظاہر ہوسکتا ہے۔اس سے بڑھ کر کہ کسی ایک دوسرے حاکم' والی یا قاضی کے آثار ظہور پذیر ہور ہے ہیں۔چہ جائے کہ وہ امام معصوم والے کام کرے۔ بنا بریں ہم کہتے ہیں کہ ایسے امام کے وجود سے کون سا فائدہ حاصل ہوا؟ اس کا وجود اور عدم برابر ہیں اس سے بڑھ کر یہ کہ وہ معدوم ہے۔جو لوگ اس معصوم پر ایمان لائے ہیں؛ انہیں ان کے دین یا دنیا میں کونسی مہربانی یا لطف اس امام کی وجہ سے حاصل ہوا۔[ہم شیعہ سے دریافت کرتے ہیں کہ ایسے امام سے انھیں قدیم وجدید زمانہ میں کیا مصلحت حاصل ہوئی؟]

❀ اور کیا یہ نظریہ[جہلاء]عوام الناس کے اس نظریہ سے بھی زیادہ فاسد نہیں ہے'جس کے تحت وہ نام نہاد قطب وغوث وغیرہ فقط ناموں کی تعظیم کرتے ہیں۔اور ان ناموں کے متعلق ایسے دعوے کرتے ہیں جو کہ نبوت کے رتبہ سے بھی اعلی تر ہوتے ہیں۔جس میں کسی متعین شخص کو خاص نہیں کیا جاتا جس سے وہ فائدہ حاصل ہونا ممکن ہو جس کے متعلق ان ناموں کے تحت یہ لوگ دعوی کرتے ہیں۔جیسا کہ بہت سارے لوگ حضرت خضر علیہ السلام کی حیات کا دعوی کرتے ہیں' مگر اس دعوی کی وجہ سے انہیں دین یا دنیا میں کوئی بھی فائدہ حاصل نہیں ہوا۔ان کے دعوی کا منتہی یہ دوسرا دعوی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے ہاتھ پر بعض واقعات ظاہر کرتے ہیں جو کہ اس کی قدرت سے ان کیلئے مقدر ہوتے ہیں۔مگر اس کے باوجود انہیں اسکی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔انہ ہی ان کی معرفت کی کوئی ضرورت ہے۔اور اگر یہ سب باتیں حق بھی ہوں تب بھی انہیں اس سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوا۔تو پھر اس وقت کیا عالم ہوگا جب کہ ان کا دعوی ہی باطل پر مبنی ہو۔

❀ ان میں سے بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے سامنے کوئی جن انسانی شکل میں آتا ہے اور کہتا ہے: میں خضر ہوں۔ حالانکہ وہ جھوٹا ہوتا ہے۔اور ایسے ہی بعض لوگ رجال غیب کے دیدار کا ذکر کرتے ہیں' حالانکہ انہوں نے جنات کو دیکھا

ہوتا ہے۔

❀ جس امام کا دعوی رافضی کرتے ہیں؛ وہ یا تو ان کے نزدیک مفقود ہے یا پھر عقلاء کے نزدیک معدوم ہے۔ دونوں صورتوں میں اس سے کسی ایک انسان کو بھی دین یا دنیا کا کوئی بھی فائدہ حاصل نہیں ہوا۔ پھر جو کوئی اپنے دین کو ایسی مجہولات کیساتھ معلق کردے جن کا کوئی ثبوت ہی نہ ہو تو وہ دین کے معاملہ میں بڑا ہی گمراہ ہوگا۔ اس لیے کہ جس چیز کے ساتھ اس نے اپنے دین کو معلق کیا ہے اس کے درست ہونے کا کوئی علم ہی نہیں۔ اور نہ ہی اس سے کوئی منفعت حاصل ہوئی۔ تو کیا کسی بڑے جاہل کے علاوہ بھی کوئی انسان ایسے کرسکتا ہے؟

حالانکہ جو لوگ حیات خضر کا عقیدہ رکھتے ہیں وہ لوگوں پر ان کی اطاعت کو واجب نہیں کرتے۔ حالانکہ خضر تو [ایک وقت میں] زندہ اور موجود بھی تھے۔

فصل:

[فضائل سے امامت پر استدلال]

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ''تیسری چیز: وہ تمام فضائل جو آپ کی ذات میں پائے جاتے ہیں وہ آپ کی امامت کو واجب کرتے ہیں۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جواب]: ''اس کا جواب کئی نکات پر مشتمل ہے:

پہلی بات: ان فضائل کی انتہاء یہ ہوسکتی ہے کہ یہ انسان اس بات کا اہل ہے کہ اس کے لیے عقد امامت باندھا جائے۔ لیکن صرف اہلیت کی بنا پر کوئی امام نہیں بن جاتا۔ جیسا کہ کوئی انسان اگر قاضی بننے کا اہل ہو تو وہ صرف اہل ہونے کی بنا پر قاضی نہیں بن جاتا۔

دوسری بات: امامت کی اہلیت قریش کے دوسرے لوگوں کے لیے بھی ایسے ہی ثابت ہے جیسے ان حضرات کے لیے۔ اور وہ اس بات کے اہل تھے کہ انہیں ولایت تفویض کی جائے۔ مگر ان کی تخصیص کا کوئی موجب نہیں پایا جاتا۔ مگر اس اہلیت کی بنا پر وہ امام نہیں بن گئے۔

تیسری بات: ان کا بارہواں امام عقلاء کے نزدیک معدوم ہے۔ تو پھر یہ بات ممتنع ہے کہ وہ امام بھی ہو۔

چوتھی بات: عسکرین اور ان جیسے دوسرے ان کے طبقہ کے لوگوں میں علم اور دین کا کوئی ایسا نام و نشان نہیں جیسا کہ حضرت علی بن حسین؛ ابوجعفر، اور جعفر بن محمد کے پاس تھا۔

فصل پنجم:

شیعہ کی دروغ گوئی اور اصحاب ثلاثہ

اصحاب ثلاثہ کے بارے میں شیعہ کی دروغ گوئی:

[اعتراض] : شیعہ مصنف لکھتا ہے: ''متعدد وجوہ کی بنا پر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پہلے کے خلفاء ائمہ [برحق] نہ تھے۔ اس پر بہت سارے دلائل موجود ہیں۔'' [انتھی کلام الرافضی]

[جواب] : میں کہتا ہوں: [شیعہ مصنف کا یہ بیان غلط ہے؛ بلکہ خلفاء ثلاثہ امام تھے]۔ اگر مذکورہ کلام سے مراد یہ ہے کہ باقی تینوں خلفاء مسلمانوں کے امیر مقرر نہیں ہوئے' اور نہ ہی مسلمانوں نے ان کی بیعت کی ہے؛ اور نہ ہی انہیں ایسا اقتدار حاصل تھا جس کے ذریعہ وہ شرعی حدود کو قائم کرسکیں؛ اور لوگوں کے حقوق ادا کرسکیں؛ اور دشمن سے جہاد کرسکیں؛ اور مسلمانوں کو جمعہ اور عیدین کی نمازیں پڑھائیں۔ اور نہ ہی وہ ان امور پر قدرت رکھتے تھے جو امامت و خلافت کے ذیل میں آتے ہیں؛ تو یہ سراسر جھوٹ اور حق سے روگردانی ہے۔ کیونکہ یہ بات تواتر کے ساتھ ثابت ہے جسے روافض اور دوسرے لوگ بھی جانتے ہیں۔ اگر وہ امامت کے مرتبہ پر فائز نہ ہوتے تو روافض ان پر یوں طعن و تشنیع بھی نہ کرتے۔

[حقیقت میں سابقہ خلفاء ثلاثہ ہر لحاظ سے منصب امامت کی اہلیت و صلاحیت سے بہرہ ور تھے۔ ان کی وجہ سے اسلام اکناف ارضی میں پھیلا اور مسلمانوں نے بلاد و اقالیم کو فتح کیا۔ یہ صحیح معنی میں خلفائے راشدین تھے۔ شیعہ کے سوا اس میں مسلمانوں کے سب فرقے متحد الخیال ہیں۔ وہ بہمہ وجوہ اس کے اہل اور حق دار تھے، ہمارا یہ حتمی و قطعی نقطہ نظر ہے، کوئی قطعی یا ظنی دلیل اس کی مخالف نہیں ہے جہاں تک قطعی دلائل و نصوص کا تعلق ہے ان میں تناقض کا احتمال نہیں ہے باقی رہے ظنی دلائل تو وہ قطعیات کا معارضہ نہیں کرسکتے]۔

لیکن روافض امامت کے اثبات و نفی مطلقاً ذکر کرتے ہیں' اور یہ تفصیل بیان نہیں کرتے کہ ان کی مراد امامت اور اس کے متعلقہ امور کا ثبوت ہے یا پھر امامت کے استحقاق کا ثبوت۔ وہ لفظ ''امام'' کا اطلاق دوسری صورت پر کرتے ہیں اور ظاہر یہ کرتے ہیں کہ یہ لفظ دونوں صورتوں کو شامل ہے۔ تو اگر ان کی مراد یہ ہے کہ خلفاء ثلاثہ امامت و خلافت کے لائق نہیں تھے' اور حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی اس کے سب سے زیادہ حق دار تھے؛ یا پھر آپ ان سے بڑھ کر خلافت کے حق دار تھے؛ تو یہ بات کھلا ہوا جھوٹ ہے۔ اور یہی نکتہ مورد نزاع بھی ہے۔

ہم اس بارے میں ایک ضابطہ بیان کرتے ہیں جو کہ قاعدہ کلیہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ پھر اسے تفصیل سے بیان کریں گے۔ کلی جواب تو یہ ہے کہ یہ بات تو ہم بخوبی جانتے ہیں کہ خلفاء ثلاثہ خلافت و امامت کے لائق تھے۔ یہ بات ہمیں قطعی طور پر معلوم ہے۔ اس مسئلہ میں روافض کے علاوہ کوئی بھی دوسرا فرقہ مسلمانوں سے اختلاف نہیں کرتا۔ بلکہ امت کے ائمہ اور جمہور سے یہ منقول ہے کہ وہ لوگ امامت کے زیادہ حق دار تھے اور یہ بھی منقول ہے کہ وہ اس امت کے سب سے زیادہ افضل لوگ تھے۔ جو بات ہمیں قطعی طور پر معلوم ہوئی ہے۔ اسے کسی قطعی یا ظنی دلیل سے رد نہیں کیا جاسکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ادلہ قطعیہ

کے مابین اختلاف نہیں ہوتا۔ اور ادلہ قطعیہ کو ادلہ ظنیہ سے رد نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی وہ اس کے معارض ہو سکتی ہیں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ قادحین خلفائے ثلاثہ کے مخالف جو دلائل پیش کرتے ہیں وہ دو حال سے خالی نہیں ہیں۔

۱۔ یا تو وہ ایسے نقلی دلائل ہیں جن کی صحت کا کچھ پتہ نہیں۔

۲۔ یا وہ دلائل بجائے خود صحیح ہیں، مگر ان سے خلفائے ثلاثہ کی خلافت کا ابطال نہیں ہوتا۔ دلیل کے دونوں مقدمات میں سے جو مقدمہ بھی معلوم نہ ہو وہ دلائل و مقدمات معلومہ قطعیہ کا معارض نہیں ہو سکتا۔ جب ہم اعتراض کے متعلق ثابت کر دیں کہ واضح اور قطعی نہیں ہے تو پھر کسی گمراہ کرنے والے شبہ کا جواب دینا ہمارے لیے ضروری نہ ہوگا۔ جیسے کوئی شخص اگر بدیہی طور پر معلوم ہونے والے حقائق کا انکار کر دے تو ہم پر اس کے احمقانہ فعل کا جواب دینا ضروری نہیں ہوتی۔

اسی طرح ہم کسی کو اس بات کا پابند نہیں بنا سکتے کہ جو بات دلائل قطعیہ سے ثابت ہو؛ اسے دلائل ظنیہ سے رد کرے؛ خواہ وہ محقق ہو یا مناظر۔ بلکہ اگر اس پر اس شبہ کا فاسد ہونا ظاہر ہو جائے اور اسے دوسروں کے سامنے بیان کر دے تو اس سے علم و معرفت اور حق کو تقویت ملے گی۔ تحقیق اور مناظرہ کے میدان میں اگر شبہ ظاہر نہ ہو تو یقین کو شک کی بنیاد پر رد نہیں کیا جا سکتا۔ [اگر ہم شیعہ کے شکوک و شبہات کی وجہ فساد و بطلان بھی واضح کر دیں تو یہ علمی اضافہ کا موجب ہے اور مناظرہ کے دوران اس سے حق کی تائید بھی ہو جاتی ہے]۔

ہم ائمہ ثلاثہ کے استحقاق امامت کے متعلق بہت سے دلائل عنقریب ذکر کریں گے۔ اور یہ ثابت کریں گے وہ امامت کے سب سے زیادہ مستحق تھے۔

فصل:

[قول حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور استدلال باطل]

[اعتراض]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ''سبب اول: ابو بکر رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ: بسا اوقات میرا اور شیطان کا سامنا ہوتا ہے، اگر میں سیدھا رہوں تو میری مدد کیجیے؛ اور اگر ٹیڑھا ہو جاؤں تو مجھے سیدھا کیجیے۔ خلیفہ و امام کا اصلی کام رعیت کی تکمیل ہے بنا بریں وہ ان سے اپنے کمال کا مطالبہ کیوں کر سکتا ہے؟۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جواب]: ہم کہتے ہیں: اس کا جواب کئی طرح سے ہے:

[پہلا جواب]: حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے الفاظ یہ ہیں: ''مجھے ایک شیطان کا سامنا ہوتا ہے اور وہ غصہ ہے، جب میں اس میں گرفتار ہو جاؤں تو مجھ سے اجتناب کرنا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں تم سے خندہ پیشانی سے پیش نہ آ سکوں۔ اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''جب تک میں اللہ کا مطیع رہوں، میری اطاعت کرتے رہو، جب اللہ کی نافرمانی کرنے لگوں تو میری اطاعت تم پر واجب نہیں۔'' ❶

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ صدیق کا یہ قول لائق صد مدح و ستائش ہے۔ ہم آگے چل کر اس کی تفصیل بیان کریں گے۔

❶ سیرۃ ابن ھشام (ص: ۶۷۱)

[دوسرا جواب]: آپ رضی اللہ عنہ نے جس شیطان کا ذکر کیا ہے کہ وہ مجھے مغلوب کر دیتا ہے؛ اس سے مراد وہ شیطان ہے جو غصہ کے وقت لاحق ہوتا ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اس بات کا اندیشہ تھا کہ کہیں وہ غصہ کی حالت میں اپنی رعایا کے ساتھ کوئی زیادتی نہ کر بیٹھیں۔ پس آپ نے لوگوں کو حکم دیا کہ وہ غصہ کی حالت میں ان سے دور رہیں۔

آپ کا یہ فعل تو حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بالکل مطابق ہے۔ احادیث صحیحہ میں آیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جب قاضی پر غصہ طاری ہو تو وہ دو آدمیوں کے درمیان فیصلہ صادر نہ کرے۔''[1]

سو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غصہ کے وقت دو افراد کے مابین فیصلہ کرنے سے منع کیا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی مراد بھی یہی تھی۔ اسی لیے اس حالت میں رعایا کو متنبہ رہنے کا حکم دیا۔ اور سمجھایا کہ وہ غصہ کی حالت میں کسی فیصلہ کی طلب نہ کریں؛ اور نہ ہی اس حالت میں کوئی مقدمہ لے کر آئیں۔ یہ بات سراسر اللہ تعالیٰ اور اس رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت پر مبنی ہے۔

[تیسرا جواب]: غصہ سب بنی نوع انسان کو لاحق ہوتا ہے۔ حتی کہ خود سید البشر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''یا اللہ! میں ایک بشر ہوں؛ اور مجھے بھی اسی طرح غصہ آتا ہے جیسے دوسرے انسانوں کو؛ اور میں آپ سے عہد لیتا ہوں جس کے خلاف آپ نہیں کریں گے؛ میں جس مؤمن کو ایذا دوں' یا برا کہوں یا ماروں؛ تو آپ اسے اس کے گناہوں کا کفارہ بنا دیں' اور قیامت کے دن اسے اپنی نزدیک ہونے کا سبب بنا دیں۔''[2]

صحیح مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ:

''دو آدمی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کو ناراض کیا، جس کے نتیجہ میں آپ نے ان پر لعنت بھیجی اور سخت سست الفاظ کہے۔ جب وہ باہر نکلے تو میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! ان دونوں کو کوئی خیر نہ ملی۔ آپ نے فرمایا: ''کیوں۔'' میں نے عرض کیا: ''اس لیے کہ آپ نے ان پر لعنت کی اور انہیں برا بھلا کہا۔'' تو آپ نے فرمایا: ''کیا تمہیں معلوم نہیں میں نے اپنے پروردگار سے جو شرط رکھی ہے۔ میں نے یہ دعا کی ہے: ''[اے اللہ!] میں بھی ایک آدمی ہوں' جس مسلمان پر بھی میں لعنت کروں یا اسے برا بھلا کہوں تو تو اسے پاک کر دے' اور اجر عطا فرما۔''[3]

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں نے اپنے پروردگار سے شرط رکھی ہے کہ میں بھی ایک آدمی ہوں' ایسے خوش ہوتا ہوں' جیسے کوئی بھی آدمی خوش ہوتا ہے' اور غصہ بھی ہوتا ہوں' جیسے کوئی بھی انسان غصہ ہوتا ہے۔ پس اپنی امت میں سے جس کسی پر میں بددعا کروں؛ اور وہ اس کا مستحق نہ ہو تو اس بددعا کو طہارت پاکیزگی اور قربت کا ذریعہ بنا دے۔''❀

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الاحکام، باب هل یقضی القاضی او یفتی و هو غضبان (حدیث: ۷۱۵۸)، صحیح مسلم، کتاب الأقضیة۔ باب کراهة قضاء القاضی و هو غضبان(حدیث:۱۷۱۷)

[2] صحیح البخاری ۸/ ۷۷؛ کتاب الدعوات' باب: قول النبي ﷺ من آذيته فاجعله له زكاة و رحمة۔ صحیح مسلم۔ کتاب البر والصلة، باب من لعنه النبی ﷺ......" (حدیث:۹۱/ ۲۶۰۱، ۲۶۰۳)۔سنن أبي داؤد ٤/ ۲۹۸۔

[3] صحیح مسلم، کتاب البر و الصلة، باب من لعنه النبی ﷺ (حدیث:۲۶۰۰)۔

❀ صحیح مسلم، کتاب البر و الصلة، باب من لعنه النبی ﷺ

حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ رسول ہیں اور انکے غصہ کا ذکر بھی اللہ تعالیٰ نے قرآن میں کیا ہے۔ الاعراف [154]
جب غصہ کا واقع ہونا انبیاء کرام علیہم السلام میں عیب نہیں سمجھا جاتا تو امامت میں کیسے عیب ہوسکتا ہے؟ جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ان کی نرمی اور بردباری میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مشابہ قرار دیا تھا۔ جب کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دینی امور میں ان کی سختی کے لحاظ سے حضرت موسیٰ اور حضرت نوح علیہما السلام کے مشابہ قرار دیا تھا۔ جب یہ سختی امامت کے منافی نہیں تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی سختی امامت کے منافی کیونکر ہوسکتی ہے۔

چوتھی بات: اس اجتناب کے حکم سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی غرض یہ تھی کہ ان سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے۔ تو اب بتائیں کہ کامل کون ہوا؟ وہ جو اپنی نافرمانی کرنے والے پر غیض وغضب کا اظہار کرے' اس سے برسر پیکار جنگ ہو اور قتال بالسیف کرے؟ [یا پھر وہ انسان جو اپنی نافرمانی کرنے والے کو آرام سے سمجھا دے کہ مجھ سے دور رہو تا کہ غصہ میں کسی تکلیف کا ارتکاب نہ ہوجائے]۔ پس اگر کہا جائے کہ امام کی نافرمانی اور اس کو غصہ دلانے کے سبب وہ اس بات کے مستحق ہوگئے تھے کہ ان سے قتال کیا جائے تو ہم بھی یہ کہہ سکتے ہیں کہ: جو شخص حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی نافرمانی کرے یا آپ کو تکلیف دے تو آپ اس کی سرزنش کرسکتے ہیں جس طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے مخالف کی تادیب و سرزنش کے مجاز ہیں۔ [لیکن حضرت ابوبکر نے ایسا نہیں کیا]۔ اور اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ اس کے مستحق ہیں تو یہ کہنا درست نہیں کہ جو شخص حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نافرمانی کرے اور انہیں غصہ دلائے اس سے تو قتال جائز ہے' مگر جو شخص حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی نافرمانی کرے تو اس کی تأدیب و تربیت جائز نہیں۔''

پس یہ اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا فعل حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فعل کی نسبت زیادہ کامل ہے۔ مسند احمد میں حضرت ابوبرزہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

,,میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر تھا، آپ کسی شخص سے ناراض ہوئے، تو وہ شخص درشت کلامی پر اتر آیا۔ میں نے کہا: اے خلیفہ رسول! آپ مجھے اجازت دیں میں اس کی گردن اڑا دوں؟ میرے ان الفاظ سے ان کا سارا غصہ جاتا رہا، وہ وہاں سے اٹھ کر چلے گئے اور مجھے بلا لیا؛ ...... اور فرمایا: ,,اگر میں تمہیں اجازت دیتا تو تم یہ کر گزرتے؟ میں نے کہا: کیوں نہیں؟ ضرور کرتا؛ آپ نے فرمایا: ,,اللہ کی قسم یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی اور کے لیے نہیں۔ یعنی محض اپنی نافرمانی کی وجہ سے کسی مسلمان کو قتل کر دیا جائے۔'' (1)

علماء کرام رحمہم اللہ کے اس حدیث کی شرح میں دو قول ہیں:

پہلا قول یہ ہے کہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی دوسرے انسان کو گالی دینے والے کو قتل کرنے کا اختیار کسی کو بھی نہیں۔
دوسرا قول یہ ہے کہ: ''کسی انسان کے لیے حلال نہیں ہے کہ وہ اپنے علم و اجتہاد سے لوگوں کے خون کے فیصلے کرے سوائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے۔

حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے آپ کی بیعت نہ کی تو آپ نے اپنے ہاتھ سے تو درکنار؛ اپنی زبان سے بھی انہیں تکلیف نہیں دی۔ اور دوسرے لوگ جیسے حضرت علی وغیرہ رضی اللہ عنہم اجمعین نے بھی چھ ماہ تک آپ کی بیعت نہ کی تھی۔ مگر آپ نے ان میں

(1) الصارم المسلول ۲۰۵۔ ابوداؤد ۲/ ۲۵۲۔

سے کسی ایک کو بھی ذرا بھر بھی تکلیف نہیں دی۔ اور نہ ہی ان میں سے کسی ایک کو اپنی بیعت پر مجبور کیا۔ یہ سب ان کے کمال عدل اور معراج تقوی کی وجہ سے تھا۔ اور کمال احتیاط تھی کہ کہیں پر امت کو کوئی ذرہ بھر بھی تکلیف نہ پہنچے۔ بلکہ یہاں تک فرمادیا کہ جب مجھے غصہ لاحق ہو تو مجھ سے دور رہا کرو۔

پانچویں بات: صحیح حدیث میں حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''تم میں سے ہر شخص کے ساتھ اس کے ساتھی جن [شیطان] کو مسلط کیا گیا ہے۔''

صحابہ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کیا آپ کے ساتھ بھی جن ہے؟ تو آپ نے فرمایا: ''ہاں! مگر میں بتوفیق الٰہی اس سے محفوظ رہتا ہوں، اور وہ مجھے اچھی بات ہی کا حکم دیتا ہے۔'' [مسلم ٢١٦٧]

حدیث صحیح میں حضرت سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے آپ نے پوچھا: یارسول اللہ ﷺ! کیا میرے ساتھ بھی شیطان ہے؟ تو آپ نے فرمایا: ہاں! حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پھر عرض کی: کیا وہ ہر انسان کے ساتھ ہے؟ تو آپ نے فرمایا: ہاں! تو انہیں نے پھر عرض کی: کیا وہ آپ کے ساتھ بھی ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں! مگر میرے رب نے اسے میرے لیے مسخر کر دیا ہے؛ اور وہ مسلمان ہو گیا ہے۔''❶

علماء کرام رحمہم اللہ کے دو اقوال میں سے صحیح ترین قول کے مطابق اس سے مراد یہ ہے کہ وہ میرا مطیع و فرمانبردار ہو گیا ہے۔ بعض علماء کرام نے یہ لکھ دیا کہ: اس سے مراد یہ ہے کہ: یہاں تک کہ میں مسلمان ہو گیا۔ اس طرح انہوں نے معنی بدل دیا۔ اور بعض علماء کرام نے لکھ دیا کہ: وہ شیطان مؤمن ہو گیا؛ تو انہیں نے لفظ کو بدل دیا۔

ایسے ہی جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قبطی کو قتل کر دیا تو آپ نے فرمایا:

﴿ هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِيْنٌ ﴾ [القصص ١٥]

''یہ تو شیطانی کام ہے یقیناً شیطان دشمن اور کھلے طور پر بہکانے والا ہے۔''

اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خادم نے کہا تھا: ﴿ وَ مَآ اَنْسٰنِيْهُ اِلَّا الشَّيْطٰنُ اَنْ اَذْكُرَهٗ ﴾ [الکھف ٦٣]

''اور مجھے تو شیطان نے ہی بھلا دیا کہ میں اسے یاد رکھتا۔''

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام اور حوا علیہا السلام کے قصہ میں فرمایا ہے:

﴿فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ﴾ [البقرۃ ٣٦]

''شیطان نے آدم و حوا دونوں کو ورغلا دیا۔ اور جس حالت میں وہ تھے انہیں وہاں سے نکلوا کر ہی دم لیا۔''

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَاوٗرِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا ﴾ [اعراف ٢٠]

''پھر شیطان نے ان کے دلوں میں وسوسہ ڈالا تا کہ ان کی شرمگاہیں جو ان سے چھپائی گئی تھی انہیں کھول دکھائے۔''

پس جب شیطان کا لاحق ہونا انبیاء کرام علیہم السلام کی نبوت میں عیب شمار نہیں ہوتا؛ تو خلفاء کرام کی خلافت میں کیسے عیب شمار ہو

❶ صحیح مسلم 'کتاب صفات المنافقین' باب: تحریش الشیطان ٤/ ٢١٦٨۔

سکتا ہے؟

اور اگر کوئی انسان یہ دعویٰ کرے کہ مذکورہ نصوص میں تاؤیل کی گئی ہے [یعنی وہ اپنے ظاہر پر نہیں]؟

تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ: ''پھر کسی دوسرے کے لیے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے قول میں تاؤیل کرنا بھی درست ہے۔اس لیے کہ آپ کے ایمان وعلم وعمل ؛تقوی وطہارت پر بہت سارے دلائل موجود ہیں ۔اور جب کوئی ایسا مجمل لفظ وارد ہو جو کہ معلوم شدہ حقیقت کے خلاف ہو تو اس کی تاویل کرنا واجب ہو جاتا ہے۔

رہا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد کہ: ''اگر میں راہ استقامت پر قائم رہوں تو میری مدد کرنا اور اگر میں ٹیڑھا ہو جاؤں تو مجھے سیدھا کردینا۔'' آپ کے کمال عدل وانصاف اور تقویٰ کی دلیل ہے۔اور ہر حاکم پر واجب ہوتا ہے کہ وہ اس مسئلہ میں آپ کی اقتداء کرے۔اور رعایا پر بھی واجب ہوتا ہے کہ وہ اپنے ائمہ وحکام کے ساتھ اسی کی روشنی میں سلوک کریں۔یعنی اگر حاکم اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر قائم ہو تو ان کی مدد کریں'اور اگر ان سے کوئی غلطی ہو رہی ہو اور وہ راہِ حق سے ڈگمگا رہے ہوں تو ان کی رہنمائی واصلاح کا کام کریں۔اگر وہ ظلم کا ارادہ کرے تو جہاں تک ہو سکے تو اسے روکیں۔اگر حاکم حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جیسا حق کا پیروکار ہو گا تو عوام پر ترکِ نصیحت کے لیے کوئی عذر نہ ہو گا۔اور اگر ظلم کو روکنا کسی بڑے فساد کے بغیر ممکن نہ ہو تو پھر اس صورت میں چھوٹی برائی کو ختم کرنے کے لیے بڑی برائی کو اختیار نہ کیا جائے۔پس چھوٹے اور کم شر کو بڑے شر سے ختم نہ کیا جائے۔

[اشکال]:رہا شیعہ کا یہ قول کہ ''امام کا کام رعیت کو کمال تک پہنچانا ہے۔تو پھر امام رعایا سے طلب کمال کیسے کر سکتا ہے''؟

[جواب]:اس کے متعدد جواب ہیں:

پہلا جواب: ہم اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ امام کا کام رعایا کی تکمیل کرنا ہے' اور رعایا اس کی تکمیل نہیں کر سکتی۔یہ درست نہیں اس لیے کہ امام و رعیت دونوں باہم ایک دوسرے کی تکمیل کرتے اور برّ وتقویٰ میں ایک دوسرے کے معاون ہوا کرتے ہیں۔اور گناہ اور نافرمانی کے کام میں ایک دوسرے کی مدد نہیں کرتے ؛ جیسے لشکر کا سالار؛ قافلہ کا امیر؛ نماز کا امام؛ حج کا امیر۔دین کی معرفت تو رسول اللہ ﷺ سے حاصل کی گئی ہے۔لہٰذا امام کا کوئی الگ دین نہیں ہوتا جو اس کیلئے خاص ہو۔ البتہ جزئیات میں اجتہاد کے بغیر کوئی چارہ نہیں۔لیکن جب حق بالکل واضح ہو' تو پھر اس کے مطابق کا حکم بھی کرے۔اور اگر یہ حکم صرف امام کے لیے واضح ہو تو اسے چاہیے کہ لوگوں کے سامنے بھی اسے واضح اور بیان کرے۔اور لوگوں پر واجب ہوتا ہے کہ وہ اس کی اطاعت بھی کریں۔اور اگر حکم مشتبہ ہو تو ان پر واجب ہوتا ہے کہ آپس میں مشاورت کریں یہاں تک کہ حق ان کے سامنے واضح ہو جائے۔اور اگر اجتہادی فیصلہ رعایا میں سے کسی ایک کا ہو تو اسے چاہیے کہ وہ امام وحاکم کو بتادے۔اور اگر سب کا اجتہاد مختلف ہو تو اس صورت میں امام کے اجتہاد کی اتباع کی جائے گی۔کیونکہ امام کی رائے کو ترجیح دینا ضروری ہے' اور اس کے برعکس کرنا ممتنع ہے۔

یہ اسی طرح ہے جیسے روافض میں سے امامیہ کا قول امام معصوم کے نائبین کے بارے میں ہے کہ انہیں کلیات معلوم ہو چکے ہیں تو ان پر ضروری ہوتا ہے کہ وہ اجتہاد کے ذریعہ جزئیات معلوم کریں۔اور اسی طرح ہر امام رسول اللہ ﷺ کا نائب

ہوتا ہے جس کی عصمت و پاکدامنی پر کسی قسم کا کوئی شک نہیں ۔ کسی اور کے نائب کی نسبت رسول اللہ ﷺ کے نائب اتباع کے زیادہ حق دار ہیں ۔ اور آپ کے نائب ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس ذمہ داری کو نبھائیں جو ذمہ داری رسول اللہ ﷺ نے نبھائی تھی؛ یہاں پر خلیفہ بننا مراد نہیں ۔ پس آپ ﷺ کی اطاعت ہر والی پر واجب ہوتی ہے ۔ خواہ اس کو والی رسول اللہ ﷺ نے بنایا ہو یا کسی اور نے ۔ آپ ﷺ کی وفات کے بعد بھی آپ کی اطاعت اسی طرح واجب ہے جیسے آپ کی زندگی میں واجب تھی ۔ پس جس کسی کو رسول اللہ ﷺ نے یا دیگر کسی نے والی بنایا ہو تو اس پر وہی ذمہ داری عائد ہوتی ہے جو دیگر حکام و امراء پر واجب ہوتی ہے ۔

دوسرا جواب: مخلوق کا ہر فرد اپنی تکمیل کے لیے دوسرے کا محتاج ہوتا ہے ۔ جیسے علمی بحث و مباحثہ کرنے والے؛ باہم مشورہ کرنے والے؛ اور دینی یا دنیاوی مصلحتوں میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون اور مشورہ کرنے والے [ایک دوسرے کے محتاج ہوتے ہیں] ۔ لیکن خالق سبحانہ وتعالیٰ کے بارے میں یہ بات ممتنع ہے ۔ اس لیے کہ ہر ممکن چیز اپنے وجود کے لیے کسی ایسے موجد کی محتاج ہوتی ہے جو اپنی ذات میں بے نیاز ہو اور اسے کسی دوسرے کی کوئی ضرورت نہ ہو ۔ تاکہ اس سے دور اور تسلسل لازم نہ آئے ۔ جب کہ مخلوق کے ہر دو افراد میں ہر ایک فرد اپنی قوت و طاقت اللہ تعالیٰ سے حاصل کرتا ہے؛ نہ ہی وہ اپنی ذات سے قوت حاصل کرتا ہے اور نہ ہی اللہ کے سوا کسی دوسرے سے؛ پس اس میں کوئی دور و تسلسل والی بات نہیں ۔

تیسرا جواب: یہ سلسلہ چلا آرہا ہے کہ ہمیشہ سے شاگرد بعض باتوں میں اساتذہ کو آگاہ کرتے ہیں ۔ اور اساتذہ ان کی معلومات سے استفادہ کرتے ہیں ۔ حالانکہ شاگرد جن اصولوں کے ذریعہ یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے؛ وہ اس نے اساتذہ سے ہی حاصل کئے تھے ۔ یہی حال صنعت کاروں اور دوسرے لوگوں کا بھی ہے ۔

چوتھا جواب: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت خضر علیہ السلام سے افضل ہونے کے باوجود ان سے تین مسائل کا علم حاصل کیا ۔

ہدہد نے حضرت سلیمان علیہ السلام سے کہا تھا: ﴿ اَحَطتُ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ ﴾ [النمل ۲۲]

''میں ایسی بات معلوم کر کے آیا ہوں جس کا علم آپ کو نہیں ہے ۔''

اب کہاں [اللہ کے نبی] حضرت سلیمان علیہ السلام اور کہاں میاں ہدہد [ایک پرندہ] ۔

ہمارے نبی کریم ﷺ اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سے مشورہ کیا کرتے تھے ۔ اور بعض اوقات ان کی رائے کے مطابق رجوع کیا کرتے اور عمل بھی کیا کرتے تھے ۔ جیسا کہ غزوہ بدر کے موقع پر حضرت حباب بن منذر رضی اللہ عنہ نے آپ سے عرض کیا: یارسول اللہ! اس جگہ پڑاؤ ڈالنے کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایسا کرنے کا حکم دیا ہے؟ تو پھر ہم یہاں سے تجاوز نہیں کر سکتے؛ یا پھر یہاں پر پڑاؤ ڈالنا محض جنگی تدبیر اور ایک چال ہے؟

تو آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں بلکہ یہ محض رائے؛ جنگی تدبیر اور ایک چال ہے ۔'' اس پر حباب بن منذر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: تو پھر یہ جگہ جنگی پڑاؤ کے قابل نہیں ہے ۔'' رسول اللہ ﷺ نے ان کی رائے کے مطابق رجوع کیا ۔

اسی طرح غزوہ خندق کے موقع پر آپ کی رائے یہ تھی کہ قبیلہ غطفان سے مدینہ کی آدھی کھجوروں کے بدلہ میں صلح کرلیں؛ اور لڑائی سے پیچھے ہٹ جائیں ۔ تو حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! اگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایسا

کرنے کا حکم دیا ہے تو ہم نے سن لیا [اور مان لیا] ہم اطاعت کے لیے حاضر ہیں۔ اور اگر آپ نے فقط ہماری مصلحت کی خاطر ایسا کیا ہے تو پھر وہ لوگ جاہلیت میں بھی ایک کھجور بھی خریدے یا اجرت پر لیے بغیر نہیں لے سکتے تھے؛ اور جس وقت اللہ تعالیٰ نے ہمیں اسلام سے عزت بخشی تو پھر کیا ہم انہیں اپنی کھجوریں دیں گے؟ اللہ کی قسم ہم انہیں اپنی تلواروں کے علاوہ کچھ بھی نہیں دیں گے۔'' اور اس طرح کی دیگر باتیں بھی ہوئیں: جنہیں رسول اللہ ﷺ نے قبول کر لیا۔''

غزوہ تبوک کے موقع پر [راستہ میں] جب آپ ﷺ نے سواری کے اونٹ ذبح کرنے کو کہا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مشورہ دیا کہ اس کے بجائے ایسا کیا جائے کہ: سب لوگوں کا توشہ جمع کیا جائے' اور آپ ﷺ اس میں برکت کے لیے دعا کر دیں تو آپ ﷺ نے یہ مشورہ قبول فرما لیا۔

اور جب آپ ﷺ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو اپنی جوتی دیکر بھیجا کہ جو بھی اس دیوار کے پیچھے ملے اور وہ لا إلہ إلا اللہ کی گواہی بھی دیتا ہو' تو اسے جنت کی خوشخبری سنا دو۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس بات کا اندیشہ ہوا کہ پھر لوگ اسی پر بھروسہ کر بیٹھیں گے [اور عمل نہیں کریں گے] تو آپ نے نبی کریم ﷺ کو مشورہ دیا کہ انہیں منع کریں کہ ایسا اعلان نہ کیا جائے' تو آپ نے یہ مشورہ بھی قبول فرما لیا۔

اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہر اس معاملہ میں ان کی رائے قبول نہیں کیا کرتے تھے جس میں اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے کوئی منصوص حکم نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ جب ان پر حکم واضح ہو جاتا تھا تو پھر مخالفت کرنے والے کی پرواہ نہیں کیا کرتے تھے۔

کیا آپ دیکھتے نہیں کہ جب آپ نے مرتدین سے قتال کا ارادہ کیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ مسلمانوں کو تکلیف پہنچنے کے خوف و اندیشہ سے ایسا کرنے سے منع کیا؛ اور ان لوگوں سے قتال کرنے سے بھی منع کیا جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد زکوۃ کی ادائیگی روک لی تھی۔ اور ایسے ہی حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے لشکر کو روانہ کرنے سے بھی منع کیا تھا؛ مگر آپ نے کوئی بات نہیں مانی؛ اور دلائل سے اپنے فعل کو درست ثابت کیا۔

اور جزئی امور میں جن کا منصوص ہونا ضروری نہیں ہوتا' بلکہ اس سے محض علت یا مصلحت مراد ہوتی ہے؛ تو ان میں وہ بہر حال انبیاء کرام علیہم السلام کے درجہ سے بلند نہیں ہو سکتے۔

پانچویں بات: حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے اس کلام نے امت کی نظروں میں آپ کی عزت اور مقام و مرتبہ کو بڑھایا ہے۔ اور امت نے نبی کریم ﷺ کے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جیسی تعظیم کسی کی بھی نہیں کی۔ اور نہ ہی کسی کی اس طرح اطاعت کی جس طرح آپ کی اطاعت کی۔ اس میں انہیں نہ ہی کسی چیز میں کوئی رغبت تھی اور نہ ہی کسی بات کا کوئی خوف تھا۔ بلکہ جن لوگوں نے بیعت رضوان کے موقع پر درخت کے نیچے رسول اللہ ﷺ کی بیعت کی تھی؛ انہوں نے خوشی خوشی بیعت کی تھی۔ وہ آپ کی فضیلت اور استحقاق کا اقرار کرتے تھے۔ پھر یہ کہ کسی ایک بھی ایسے مسئلہ کا علم نہیں ہو سکا کہ آپ کے عہد میں لوگوں کے مابین اس مسئلہ میں اختلاف ہوا ہو اور آپ کی وضاحت اور بیان سے؛ آپ کی طرف رجوع کرنے سے وہ مسئلہ حل نہ ہوا ہو۔ اس معاملہ میں کوئی دوسرا آپ کا شریک نہیں ہے؛ البتہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس میں آپ کے قریب تر تھے؛ اور ان کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا نمبر آتا ہے۔

جبکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان سے جنگ کی اور انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جنگ کی ؛ نہ تو رعایا نے ان کو تقویت پہنچائی اور نہ ہی آپ رعایا کی اصلاح کر سکے۔[اب انصاف کے ساتھ فیصلہ کیجیے کہ] ان دونوں میں سے کس حاکم کے ذریعہ مقصود امامت و حاکیت حاصل ہوا؟ اور دونوں میں سے کس نے دین کو زیادہ قائم کیا؛ مرتدوں کی راہ میں بند باندھا؛ کفار سے قتال کیا ؛ اور تمام اہل ایمان لوگ بھی آپ کے عہد مسعود میں متفق اور یکجا ہی رہے۔اب ان دونوں انسانوں کو برابر وہی کہہ سکتا ہے جو انتہائی درجہ کا احمق اور جاہل [و متعصب] اور بد دین ہو۔[چہ جائے کہ مفضول کو افضل سمجھے]۔

[جہاں تک کامل بنانے کا تعلق ہے تو وہ اللہ غنی کا کام ہے، جو کسی کا دست نگر نہیں ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی صحابہ سے مشورہ کرتے اور ان کی رائے پر عمل کیا کرتے تھے ۔]

فصل:

[بیعت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور شیعہ اعتراض]

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: سبب دوم: اور ''عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے: ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت ایک عاجلانہ اقدام تھا، جس کی برائی سے اللہ نے بچا لیا۔ اگر کوئی شخص پھر ایسا کام کرے تو اسے قتل کر دو۔اس کا عاجلانہ [جلد بازی میں] ہونا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہ بیعت کسی صحیح رائے سے وجود میں نہیں آئی ۔ پھر انہوں نے اللہ تعالیٰ سے اس کے شر سے پناہ مانگی۔اور پھر اس کا اعادہ کرنے والے کو قتل کرنے کا حکم دیا۔ یہ قول ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت پر طعن کے مترادف ہے۔''

[جواب]: ہم کہتے ہیں: بخاری و مسلم میں منقول ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

'' مجھے پتہ چلا ہے کہ تم میں سے بعض لوگ کہتے ہیں، اگر عمر رضی اللہ عنہ فوت ہو چکے ہوتے تو میں فلاں شخص کی بیعت کرتا۔ کوئی شخص دھوکہ میں آ کر یوں نہ کہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت ایک عاجلانہ اقدام تھا، جو پایہ انجام کو پہنچا۔ بے شک بات یونہی تھی مگر اللہ نے اس کی برائی سے بچا لیا۔تم میں سے ایک شخص بھی ابوبکر رضی اللہ عنہ جیسا نہیں، جس کی خاطر گردنیں کٹوائی جائیں جیسا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے لیے کیا جا سکتا تھا۔جس شخص نے کسی کے ہاتھ پر مسلمانوں سے مشورہ کئے بغیر بیعت کر لی تو اس کی بیعت نہ کی جائے۔اس خوف سے کہ وہ قتل کر دیے جائیں گے جس وقت اللہ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وفات دے دی تو اس وقت وہ ہم سب سے بہتر تھے۔''

پھر وہ روایت ذکر کی جس میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے یہ الفاظ تھے:

'' میں تمہارے لئے ان دو آدمیوں میں سے ایک پر راضی ہوں ان دونوں میں کسی کی بیعت کر لو۔'' چنانچہ انہوں نے میرا اور ابوعبیدہ بن جراح کا ہاتھ پکڑا۔ آپ اس وقت ہم دونوں کے درمیان بیٹھے ہوئے تھے۔

[عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:] مجھے اس کے علاوہ انکی کوئی بات ناگوار نہ ہوئی؛ اللہ کی قسم! میں اس جماعت کی سرداری پر جس میں ابوبکر ہوں اپنی گردن اڑائے جانے کو ترجیح دیتا تھا۔مگر یہ کہ میرا یہ نفس موت کے وقت مجھے اس چیز کو اچھا کر دکھائے جس کو میں اب نہیں پاتا ہوں۔[یہ مکمل حدیث پہلے گزر چکی ہے]۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ بیعت اچانک ہوگئی تھی؛ اس کے لیے ہم نے کوئی تیاری نہیں کی تھی۔ کیونکہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اس کے لیے متعین تھے؛ اس لیے انہیں لوگ جمع کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی ۔ اس لیے کہ یہ بھی لوگ جانتے تھے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی اس کے سب سے زیادہ مستحق ہیں ۔ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بعد کوئی شخص ایسا نہیں تھا جس کی ترجیح اور استحقاق پر لوگوں کا ایسا اجماع ہو جیسا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بارے میں تھا۔ پس جو شخص مسلمانوں کی جماعت سے علیحدہ ہوکر کسی کی بیعت کرنا چاہے تو اسے قتل کردو۔ اورانہوں نے اس کے شر سے پناہ نہیں مانگی' بلکہ یہ بتایا ہے کہ اجماع کی بدولت اللہ تعالیٰ نے فتنہ کے شر سے بچالیا۔

فصل:

[خلفاء ثلاثہ پر کم علمی کا بہتان]

[اشــکــــال]: رافضی کا کہنا ہے کہ: سبب سوم: خلفاء ثلاثہ کا علم میں کم تر ہونا اور اکثر واقعات میں ان کا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف رجوع کرنا ہے۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جواب]: یہ بہت بڑا بہتان ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بارے میں تو یہ بات ہرگز ثابت نہیں ہے کہ انہوں نے کبھی بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کچھ علم حاصل کیا ہو۔ البتہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان سے روایات اخذ کیں؛ ان کی پیروی کی؛ اور ان کی سیرت کی اتباع کی ۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کچھ استفادہ کیا ہے؛ لیکن اس کی مقدار اس سے بہت کم ہے جو استفادہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اگر چہ علم میں حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما سے کم تھے؛ لیکن اس کے باوجود حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علم کے محتاج نہ تھے۔ حتی کے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زکوٰۃ وصول کرنے والے کارندوں کی شکایت بعض لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس کی؛ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ [زکوٰۃ] اور صدقات کے مسائل پر مشتمل ایک کتاب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خدمت میں بھیج دی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''ہمیں اس کی کوئی ضرورت نہیں۔''

انہوں نے سچ کہا تھا' اس لیے کہ زکوٰۃ کے نصابوں اور مقررہ مقدار مال جو زکوٰۃ میں ادا کیا جائے' یہ سب آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے توقیفاً ثابت ہے۔ جس میں کسی رائے کو کوئی دخل نہیں۔ اور یہ چار مأخذ سے حاصل کیا گیا ہے۔

پہلا مأخذ: اور اس میں علماء مسلمین کی نظر میں سب سے زیادہ صحیح حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی کتاب ہے جسے انہوں نے انس بن مالک کے لیے لکھا تھا۔ اور اسی کو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت بھی کیا ہے۔ اور اکثر ائمہ کے ہاں اسی پر عمل ہے۔

دوسرا مأخذ: اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی کتاب کا نمبر آتا ہے۔

تیسرا مأخذ: جو کتاب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے لکھی تھی اس میں بعض چیزیں ایسی بھی ہیں جن پر علماء کرام رحمہم اللہ میں سے کسی ایک کا بھی عمل ثابت نہیں۔ مثلاً: ''ہر پچیس میں بکری کا پانچواں حصہ واجب ہے۔''

یہ قول آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی متواتر دلائل کے خلاف ہے۔ اس لیے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جو مروی ہے' یا تو وہ منسوخ

ہو گیا تھا یا پھر اس کے نقل کرنے میں غلطی ہو گئی ہے۔

چوتھا مأخذ: حضرت عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کی کتاب ہے۔ جو انہوں نے اس وقت لکھی تھی جب انہیں نجران بھیجا گیا تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی کتاب ان سب کے آخر میں لکھی گئی۔ تو کوئی عقلمند یہ نہیں کہہ سکتا کہ آپ اکثر احکام میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف رجوع کیا کرتے تھے۔ جب کہ آپ کے دور کے قاضی بھی آپ کی طرف رجوع نہیں کیا کرتے تھے۔ بلکہ قاضی شریح' عبیدہ سلیمانی رحمہ اللہ اور آپ کے عہد کے دوسرے قاضی اس علم کے مطابق فیصلہ کیا کرتے تھے جو انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علاوہ دوسرے صحابہ کرام سے سیکھا تھا۔

قاضی شریح رحمہ اللہ نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سے علم حاصل کیا تھا۔ ایسے ہی عبیدہ سلیمانی رحمہ اللہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ سے علم حاصل کیا تھا۔ یہ حضرات اپنے عام قضایا میں آپ سے مشورہ تک بھی نہیں کیا کرتے تھے۔ اس لیے کہ ان کے پاس موجود علم کی وجہ سے وہ اس چیز سے بے نیاز تھے۔ تو پھر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما اپنے اکثر مسائل میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف رجوع کیا کرتے تھے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''میری اور عمر رضی اللہ عنہ کی رائے یہ تھی کہ ام الولد کو نہ بیچا جائے؛ لیکن اب میں سمجھتا ہوں کہ ان کے بیچنے میں کوئی قباحت نہیں۔'' اس پر عبیدہ سلیمانی رحمہ اللہ نے کہا:

''آپ کی رائے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور باقی جماعت کیساتھ ہو وہ ہمارے نزدیک آپ کی انفرادی رائے سے بہتر ہے۔''

یہ تو آپ کے قاضی ہیں جو اس مسئلہ میں آپ کی رائے کی طرف رجوع نہیں کرتے۔ حالانکہ اکثر لوگ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اتباع میں ام الولد کی فروخت سے منع کرتے ہیں' اس لیے کہ اس بارے میں کوئی صریح نص موجود نہیں۔ پس جب وہ اس جیسے مسئلہ میں آپ کی طرف رجوع نہیں کرتے تھے؛ پھر کیسے کہہ سکتے ہیں کہ وہ ان باقی امور میں آپ کی طرف رجوع کرتے ہوں گے جن میں کافی وشافی نصوص وارد ہوئی ہوں۔

آپ کے قاضی فیصلہ کرتے وقت بھی آپ سے مشورہ نہیں کیا کرتے تھے۔ اور بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ یہ قضاۃ کوئی فیصلہ کرتے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ اس کی تردید کر دیتے۔ کیونکہ وہ فیصلہ جمہور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے قول کے مخالف ہوتا۔ جیسے: جب دو چچا زاد بھائی اور دو سگے بھائی؛ ان میں جب ایک دوسرے کا ماں شریک بھائی ہو تو انہوں نے اس کے لیے سارے مال کا فیصلہ دیدیا۔ مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس کی تردید کی اور فرمایا: ''اسے چھٹا حصہ ملے گا' اور باقی مال میں وہ دونوں برابر کے شریک ہوں گے۔ حضرت زید وغیرہ دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کا یہی قول ہے۔ اس وقت میں لوگ کسی ایک کے قول کے مقلد نہیں ہوا کرتے تھے۔

دادا کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا جو فیصلہ ہے' حضرات علماء کرام رحمہم اللہ میں سے کوئی ایک بھی اس کا قائل نہیں ہے؛ سوائے ابن ابی لیلیٰ کے۔ لیکن حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ان کے کوفی شاگردوں نے لیا ہے۔ اسی طرح حضرت زید کا قول بھی علماء کرام کی ایک جماعت نے قبول کیا ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا قول جمہور صحابہ کرام نے لیا ہے۔ امام شافعی اور امام محمد بن نصر المروزی رحمہ اللہ نے ایک بڑی کتاب تحریر کی جس میں انہوں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے وہ اقوال جمع کیے ہیں

جنہیں مسلمانوں میں سے کسی ایک نے بھی اختیار نہیں کیا۔ اس لیے کہ دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کا قول اس مسئلہ میں کتاب وسنت کے زیادہ قریب تر ہوتا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مرجوح اقوال کی تعداد حضرات خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کے اقوال کی نسبت زیادہ ہے؛ ان کے راجح اقوال زیادہ ہیں۔تو پھر یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ یہ حضرات اکثر مسائل میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف رجوع کرتے ہوں۔

فصل:

اصحاب ثلاثہ کے واقعات

[اشکال]: رافضی مصنف نے لکھا ہے:''سبب چہارم:''اصحاب ثلاثہ سے صادر ہونے والے واقعات ہیں؛ان میں سے اکثر کی تفصیل گزر چکی ہے۔'' [انتھی کلام الرافضی]

[جواب]: ہم ان واقعات کے متعلق اجمال اور تفصیل سے جواب دے چکے ہیں۔نیز یہ کہ حضرات خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم پر کیے جانے والے اعتراضات کا جواب دینا حضرت علی رضی اللہ عنہ پر کیے جانے والے اعتراضات کے جوابات کی نسبت بہت آسان ہے۔کسی بھی عادل عالم کے لیے یہ بات ممکن نہیں کہ وہ اصحاب ثلاثہ پر جرح کرے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی صفائی پیش کرے۔ بلکہ اگر کوئی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی صفائی پیش کرتا ہے تو خلفاء ثلاثہ بطریق اولیٰ اس کے حق دار ہیں کہ ان کی صفائی بھی پیش کی جائے۔اور اگر وہ حضرات خلفاء ثلاثہ پر جرح کرتے ہیں تو حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی اس کے نشتر سے محفوظ و مامون نہیں رہ سکتے۔

اگر رافضہ اپنے قول کی وضاحت کریں تو اس پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جرح اصحابہ ثلاثہ کی جرح سے زیادہ وارد ہوتی ہے' اور اگر واضح نہ کریں تو اس کا تناقض اور فساد ثابت ہوجاتا ہے؛حقیقت میں یہی بات تو صحیح بھی ہے۔اور اسی طرح کی صورتحال یہودیوں اور عیسائیوں کے ساتھ بھی پیش آتی ہے۔ جب وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر تو عیب جوئی کرتے ہیں' مگر موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کے بارے میں نہیں کرتے۔تو جب بھی وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر اشکال پیش کرتے ہیں اس سے بڑا اشکال حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کی نبوت پر خود بخود وارد ہوجاتا ہے۔یہی حال رافضی کا ہے۔اس کا جو اشکال حضرات خلفاء ثلاثہ کی خلافت پر ہوتا ہے؛تو اس سے بڑا اشکال حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت پر وارد ہوجاتا ہے۔اور اسی طرح جب کوئی فلسفی اہل مذہب پر اعتراض کرتا ہے تو اس پر بذات خود اشکال وارد ہوجاتے ہیں۔اسی طرح ہر اس شخص کا معاملہ ہے جو حق بات سے دور ہو۔جب وہ اس شخص پر اشکال وارد کرے جو حق سے قریب تر ہو تو خود اس پر اشکال وارد ہوجاتے ہیں۔

اس مناظرہ کا سب سے بہترین طریقہ یہ ہے کہ اہل باطل کی طرف سے اہل حق پر جس نوعیت کا اعتراض وارد کیا جائے تو جواب میں اسی نوعیت کا اعتراض اہل باطل پر کردیا جائے ؛یا اس سے بھی مضبوط تر اعتراض۔کیونکہ معارضہ مفید ہوتا ہے۔ اور اس طرح اگر ٹھیک جواب معلوم ہوجائے تو یہ جواب اس اشکال کا جواب بھی بن جائے گا جو اہل حق پر وارد کیا گیا ہے۔اگر وہ گروہ حیرت اور پریشانی میں پڑ جاتا ہے تو ... کافی جواب ہوگا' اور کہا جائے گا جو اس

بارے میں تمہارا جواب ہے' وہی ہمارا اس بارے میں جواب ہے۔

فصل:

[شیعہ کا اعتراض: خلفائے ثلاثہ کافر تھے......]

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: پانچواں سبب: ''اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ﴾ (البقرۃ: ۲۴) ''میرے عہد کو ظالم نہ پاسکیں گے۔'' اس آیت میں بتایا کہ امامت کا عہد ظالم تک نہیں پہنچ سکتا؛ اور ظالم کافر ہوتا ہے جیسا کہ قرآن میں فرمایا: ﴿اَلْكَافِرُوْنَ هُمُ الظَّالِمُوْنَ﴾ (البقرۃ: ۲۵۴) ''کافر ہی ظالم ہوتے ہیں۔'' آپ کی بعثت سے پہلے بلاشبہ اصحاب ثلاثہ بتوں کی پرستش کرنے والے اور کافر تھے۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جواب]: اس کا جواب متعدد طرق سے دیا گیا ہے:

پہلا جواب یہ ہے کہ کفر کے بعد جب کوئی شخص صحیح طور پر مشرف بہ اسلام ہو جائے تو وہ قابل مذمت نہیں ہوتا۔ یہ بات نہ صرف دین اسلام بلکہ تمام انبیاء کرام علیہم السلام کے ادیان سے معلوم ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ﴾ [الانفال ۳۸]

''ان لوگوں سے کہہ دیجیے جنھوں نے کفر کیا' اگر وہ باز آ جائیں تو ان کے سابقہ گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔''

صحیح حدیث میں ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اسلام لانے سے پہلے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔''

ایک اور روایت میں ہے: اسلام اپنے سے پہلے کے گناہوں کو مٹا دیتا ہے' اور ہجرت اپنے سے پہلے کے گناہوں کو مٹا دیتی ہے۔ اور حج اپنے سے پہلے کے گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔''

دوسرا جواب: یہ ایک مسلمہ بات ہے یہ ضروری نہیں کہ ہر مسلم پیدا ہونے والا شخص کفر کے بعد اسلام قبول کرنے والے سے افضل ہو۔ [ورنہ اس کا صحابہ سے افضل ہونا لازم آئے گا]۔ یہ بات بہت سارے دلائل کی روشنی میں ثابت ہو چکی ہے کہ: ''سب زمانوں سے بہتر قرن اوّل ہے۔ [جس میں نبی کریم ﷺ مبعوث کیے گئے تھے] حالانکہ وہ سب بعد از کفر اسلام لائے تھے۔ مگر اس کے باوجود قرن اول کے لوگ قرن ثانی کے [مسلم پیدا ہونے والے] لوگوں سے افضل تھے۔

لیکن روافض کا یہ حال ہے کہ اس مسئلہ میں کتاب اللہ' سنت رسول اللہ' اجماع امت اور دلائل عقلیہ کی مخالفت کرتے ہیں؛ اور پھر ایسے قول کو اپنے لیے لازم کر لیتے ہیں جس کا باطل ہونا صاف ظاہر ہوتا ہے۔ جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد آزر کے ایمان کا دعوی کرنا؛ اور رسول اللہ ﷺ کے والدین اور چچا ابو طالب کے ایمان کا دعوی کرنا'

تیسرا جواب: جب نبی کریم ﷺ مبعوث ہوئے تھے تو قریش میں سے چھوٹا بڑا کوئی بھی مومن نہ تھا، نہ ہی کوئی مرد' نہ ہی کوئی عورت اور بچہ؛ نہ ہی اصحاب ثلاثہ اور نہ ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ۔ جب بڑے مردوں کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ بتوں کی پوجا کیا کرتے تھے تو بچے بھی تو ویسے ہی کیا کرتے تھے' [یعنی ان کے بچے بھی بتوں کے پرستار ہوں گے] جن میں علی رضی اللہ عنہ بھی شامل ہیں اور دوسرے بچے بھی۔

اگر کہا جائے کہ بچے کا کفر ضرر رساں نہیں ہے، تو ہم کہیں گے کہ بچے کا ایمان بھی مرد بالغ کے ایمان جیسا نہیں ہے۔ اگر اصحاب ثلاثہ کے لیے ایمان اور کفر کا حکم بلوغت میں ثابت ہے تو پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے بھی ایمان اور کفر کا حکم بھی بلوغت سے پہلے کا ثابت ہے۔ اور بچہ جب کافر ماں باپ کے ہاں پیدا ہوتو اس پر دنیا میں کفر کا حکم ہی لگتا ہے۔ مسلمانوں کا اجماع ہے کہ اگر وہ بلوغت سے پہلے اسلام قبول کر لے تو کیا اس کے لیے اسلام کا حکم ثابت ہو جائے گا؟ اس بارے میں علماء کرام رحمہم اللہ کے دو اقوال ہیں۔ البتہ اگر بالغ انسان اسلام قبول کرلے تو امت مسلمہ کا اس بات پر اجماع ہے کہ وہ مسلمان ہو جائے گا۔

پس اصحاب ثلاثہ کے اسلام پر تو تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ یہ اسلام انہیں کفر سے نکالنے والا تھا؛ مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ایمان کے بارے میں دو اقوال میں اختلاف ہے کہ کیا یہ اسلام انہیں کفر سے نکالنے والا تھا یا نہیں؟ اس بارے میں دو قول مشہور ہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ کا فرمان ہے کہ: نابالغ بچے کا اسلام قبول کرنا اسے کفر سے نہیں نکال سکتا۔

البتہ کسی بچے کا نبوت سے پہلے کسی بت کو سجدہ کرنا یا نہ کرنا معلوم نہیں۔ یہ بات تو قطعی طور پر نہیں کہی جاسکتی کہ حضرت زبیر اور علی رضی اللہ عنہما نے کبھی کسی بت کو سجدہ نہیں کیا۔ اور اس بات کا بھی کوئی ثبوت نہیں کہ انہوں نے کبھی بتوں کو سجدہ کیا۔ بلکہ ایسی کوئی روایت اصحاب ثلاثہ میں سے کسی ایک کے متعلق بھی منقول نہیں کہ انہوں نے کبھی کسی بت کو سجدہ کیا ہو۔ ہاں صرف یہ کہا جاسکتا ہے کہ چونکہ زمانہ جاہلیت میں قریش بتوں کو سجدہ کیا کرتے تھے' تو ممکن ہے یہ بات بچوں میں بھی پائی جاتی ہو جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے۔

چوتھا جواب: مذمت کے وہ القاب قرآن میں مذکور ہیں' جیسے کفر' ظلم' فسق وغیرہ؛ یہ اسی انسان پر صادق آتے ہیں' جو ان پر قائم ہو' البتہ جو شخص کفر کے بعد اسلام قبول کرلے؛ اور ظلم کے بعد عدل و انصاف کرنے والا بن جائے' فسق و فجور کے بعد نیک و صالح بن جائے تو باجماع امت اسلامیہ اس پر مذمت کے اسماء صادق نہیں آئیں گے۔ [اسلام لانے کے بعد] ان پر مدح کے الفاظ صادق آئیں گے نہ کہ مذمت کے۔

پس اللہ تعالیٰ کا فرمان: ﴿لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ﴾ (البقرۃ: ۱۲۴)

''میرے عہد کو ظالم نہ پاسکیں گے۔'' کا مطلب یہ ہے کہ میرا عہد [امامت کا منصب] عادل کو ملے گا ظالم کو نہیں ملے گا۔

پس یہ معلوم ہوا کہ جب کوئی شخص ظلم و تعدی کا مرتکب ہو اور پھر وہ توبہ کرلے اور عادل بن جائے تو اسے یہ عہد مل جائے گا [اور وہ امامت کا اہل ہوسکتا ہے]، جیسا کہ وہ آیات مدح و ستائش کا سزاوار ہوگا۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿إِنَّ الْأَبْرَارَ لَفِي نَعِيمٍ﴾ [المطففین ۲۲]

''نیک لوگ نعمتوں سے لذت اندوز ہوں گے۔''

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي مَقَامٍ أَمِينٍ﴾ (الدخان: ۵۱)

''اللہ سے ڈرنے والے پرامن جگہ میں ہوں گے۔''

پانچواں جواب: جو شخص یہ کہے کہ: ایک شخص ایمان لانے کے بعد بھی کافر ہی رہتا ہے وہ باجماع مسلمین خود کافر ہے۔ تو پھر مخلوق میں سب سے افضل ایمان رکھنے والوں کے بارے میں یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ وہ کافر ہیں۔ جیسا کہ گزر چکا۔

چھٹا جواب: یہ کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا:

﴿ إِنِّي لَا يَخَافُ لَدَيَّ الْمُرْسَلُونَ ۞ إِلَّا مَنْ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًا بَعْدَ سُوْءٍ فَإِنِّي غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴾

''بیشک ہمارے پاس پیغمبر ڈرا نہیں کرتے۔ لیکن جو لوگ ظلم کریں پھر اس کے عوض نیکی کریں تو اس برائی کے پیچھے تو میں بھی بخشنے والا مہربان ہوں۔''

ساتواں جواب: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَ الْأَرْضِ وَ الْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَ أَشْفَقْنَ مِنْهَا وَ حَمَلَهَا الْإِنْسَانُ إِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ☆ لِيُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَ الْمُشْرِكٰتِ وَ يَتُوْبَ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ﴾ [الأحزاب ۷۲۔۷۳]

''ہم نے اپنی امانت کو آسمانوں اور زمین پر پہاڑوں پر پیش کیا لیکن سب نے اس کے اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے (مگر) انسان نے اٹھا لیا وہ بڑا ہی ظالم جاہل ہے۔ (یہ اس لئے) کہ اللہ تعالیٰ منافق مردوں عورتوں اور مشرک مردوں عورتوں کو سزا دے اور مومن مردوں عورتوں کی توبہ قبول فرمائے۔''

پس انسان کی جنس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ وہ ظالم اور جاہل ہے۔ اور اس میں سے توبہ کرنے والوں کا استثناء فرمادیا۔ اور کتاب اللہ کی صریح آیات بتاتی ہیں کہ تمام بنی آدم پر توبہ کرنا لازم ہے۔ اور یہ مسئلہ مسئلہ عصمت کی مانند ہے کہ کیا انبیاء علیہم السلام گناہوں سے معصوم ہوتے ہیں یا نہیں ہوتے اور انہیں توبہ کی ضرورت ہوتی ہے [یا نہیں]؟ اس بارے میں کلام بہت طویل ہے جیسا کہ پہلے بھی گزر چکا ہے۔

فصل:

[قول ابوبکر رضی اللہ عنہ سے غلط استدلال]

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: چھٹا سبب: ''ابوبکر رضی اللہ عنہ کا قول ہے: میری بیعت واپس کر دو، میں تم میں سب سے بہتر نہیں ہوں، اگر آپ سچے امام ہوتے [اور آپ میں امامت کی اہلیت ہوتی] تو یوں نہ کہتے۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جوابات]: [پہلا جواب]: ہم اس روایت کی صحت ثابت کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ جو بات نقل کی جائے وہ صحیح بھی ہو [ورنہ ہر قسم کی روایت کو صحیح ماننا پڑے گا]۔ بغیر صحت استدلال کے اعتراض کرنا صحیح نہیں ہے۔''

دوسرا جواب: بالفرض اگر اس سند کو صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے کہ یہ واقعی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا ہی قول ہے؛ تب بھی اعتراض کرنے والے کے محض اس قول کی بنا پر کہ: ''امام کے لیے اپنے فیصلہ کو رد کرنے کا اختیار دینا درست نہیں'' اس کی مخالفت درست نہیں؛ اس لیے کہ یہ محض ایک ایسا قول ہے جس کی کوئی دلیل نہیں۔ اگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے واقعی ہی ایسا کہا تھا تو ہم پوچھتے ہیں کہ آپ کا یہ کہنا کیونکر جائز نہیں؟ اگر آپ نے ایسا کہا بھی ہے تو اس کے خلاف نہ ہی کوئی نص پائی جاتی ہے اور نہ ہی کوئی اجماع ہے؛ لہٰذا یقین کے ساتھ [دوٹوک طور پر] ہم اسے باطل نہیں کہہ سکتے۔ اور اگر آپ نے یہ کہا ہی نہیں تو پھر اس قول کے ممنوع ہونے کا کوئی نقصان بھی نہیں۔

رہا مسئلہ اس کو ثابت کرنے کا کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے یہ بات ارشاد فرمائی ہے؛ اور پھر صرف محض اس دعوی کی بنیاد پر اس پر جرح کرنا؛ یہ ایسے لوگوں کا کلام ہے جسے اس بات کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔

اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ: کہ آپ کہ یہ قول حکومت سے آپ کی بے رغبتی اور آپ کے ورع وتقوی پر دلالت کرتا ہے۔ اور آپ کے خوف خدا کی علامت ہے کہ کہیں آپ سے رعیت کے حقوق میں کوتاہی نہ ہو جائے۔

یہ [قول] خود روافض کے قول کی نقیض ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ:

''حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ حکومت کے طلب گار تھے؛ اور آپ کو ولایت کے حصول میں دلچسپی تھی۔''

فصل:

[خلافت میں انصار کا حصہ]

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ساتواں سبب: ''حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اپنی موت کے وقت کہا تھا: اے کاش کہ! میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کر لیتا کہ انصار کا بھی خلافت میں حق ہے؟ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ بذات خود اپنی خلافت کو مشکوک تصور کرتے تھے۔ حالانکہ انھوں نے ثقیفہ بنی ساعدہ میں خود ہی انصار کے مطالبہ کو ٹھکرا دیا تھا جب انہوں نے یہ مطالبہ کیا تھا کہ: ''ایک امیر ہم میں سے ہوگا اور ایک امیر آپ میں سے ہوگا'' اور آپ نے انہیں یہ حدیث بیان کی تھی: ''اَلْاَئِمَّةُ مِنْ قُرَيْشٍ۔'' خلفاء قریش میں سے ہوں گے۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جواب]: ہم کہتے ہیں کہ: ''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ''اَلْاَئِمَّةُ مِنْ قُرَيْشٍ'' خلفاء قریش میں سے ہوں گے'' یہ برحق ہے۔ اور جس نے یہ کہا کہ: حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اس حدیث کو یا پھر اپنی خلافت کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتے تھے؛ یقیناً اس نے جھوٹ بولا۔ اور جس نے یہ کہا کہ: حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا تھا کہ: اے کاش! میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کر لیتا کہ کیا انصار کا بھی خلافت میں کوئی حق ہے؟ یقیناً یہ روایت صریح کذب ہے۔ یہ بات صحابہ کے نزدیک واضح اور شک سے بری تھی کہ امامت قریش کے ساتھ مختص ہے۔ اس لیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں کثرت کے ساتھ روایات منقول ہیں۔

اگر فرض کر لیا جائے کہ یہ بات صحیح ہے تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے اس قول سے ان کی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ گویا آپ کو حدیث نبوی ''اَلْاَئِمَّةُ مِنْ قُرَيْشٍ'' خلفاء قریش میں سے ہوں گے'' کا علم نہ تھا۔ آپ نے اجتہاد کیا اور آپ کا اجتہاد موافق نص ثابت ہوا۔ پھر اس کے باوجود آپ تمنا کرتے تھے کہ اس اجتہاد کے ساتھ نص بھی موجود ہوتی تو اس موقف کو مزید تقویت ملتی۔ یہ آپ کے کمال علم کی دلیل ہے کہ آپ کا اجتہاد نص کے بالکل موافق ٹھہرا۔ اور اس میں آپ کے ورع کی دلیل ہے کہ آپ کو نصوص کی خلاف ورزی سے ڈرتے تھے' اسی لیے آپ کو یہ خوف تھا۔ پس اس میں قدح یا اعتراض کی کون سی بات ہے؟ [بلکہ اس قول سے یہ بھی واضح ہوا کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی نص موجود نہ تھی]۔

فصل:

[سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی خانہ تلاشی کا واقعہ]

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: آٹھواں سبب: ''ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنی وفات کے وقت حسرت بھرے الفاظ میں کہا تھا کہ اے کاش! میں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے گھر کی تلاشی نہ لیتا۔اور اے کاش! میں ثقیفہ بنی ساعدہ میں دونوں میں سے ایک کی بیعت کر لیتا،وہ امیر ہوتا اور میں وزیر۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی و زبیر رضی اللہ عنہما کی موجودگی میں سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے گھر کی تلاشی لی تھی اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ دوسروں کو اپنے سے افضل سمجھتے تھے۔'' [انتھی کلام الرافضی]

[جــــواب]: ہم شیعہ مصنف سے کہتے ہیں: قدح اس وقت تک قبول نہیں کی جاتی جب تک اس کے الفاظ ایسی صحیح روایت سے ثابت نہ ہوں' جو کہ واضح طور پر موجب قدح ہوں۔جب ان میں سے کوئی ایک چیز بھی منتفی ہو گی تو پھر قدح کا وارد ہونا خود بخود منتفی ہو جائے گا۔تو اس وقت کیا کہہ سکتے ہیں کہ جب دونوں باتوں کا ہی کوئی بھی ثبوت ہی نہ ہو[لٰہذا پہلے وہ اس روایت کی صحت ثابت کرے]۔

❀ ہمیں قطعی طور پر معلوم ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ و زبیر کو کسی قسم کا الم و رنج نہیں پہنچایا تھا۔اس سے بڑھ کر یہ کہ آپ نے حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ سے بھی کچھ تعرض نہیں کیا تھا جو آپ کی بیعت کیے بغیر فوت ہو گئے تھے۔ بفرض محال یہ کہہ سکتے ہیں کہ:'' حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے یہ معلوم کرنے کے لیے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی خانہ تلاشی لی تھی کہ اس میں بیت المال کی کوئی چیز موجود نہ ہو جس کی تقسیم کرنے کا حکم آپ کو دیا گیا تھا۔وفات کے وقت یہ خیال آیا کہ اگر ایسا نہ کرتے تو اچھا ہوتا۔رہ گیا ایذاء رسانی کا معاملہ؛تو اس پر تمام اہل دین و اہل علم کا اتفاق ہے کہ کوئی ایسا واقعہ سرے سے پیش ہی نہیں آیا۔ جہلاء بیان کرتے ہیں کہ:'' صحابہ نے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کا گھر منہدم کر دیا اور آپ کو اس قدر پیٹا اور پیٹ پر مارا تھا کہ آپ کا حمل ساقط ہو گیا۔'' اور جہاں بھر کے حمقاء[بیوقوف لوگ] اس کی تصدیق کرتے ہیں۔[کیا کوئی سلیم العقل انسان باور کر سکتا ہے کہ امت کے چیدہ و برگزیدہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے ایک معمولی بات کی وجہ سے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی کے ساتھ یہ سلوک کیا؟] یہ دعوی جھوٹ گھڑنے والے کذابین کی کارروائیوں کا شاخسانہ ہے اور اس کے جھوٹ اور من گھڑت ہونے پر تمام اہل اسلام کا اتفاق ہے۔ یہ قصہ ان لوگوں میں ہی پذیرائی اور مقبولیت پا سکتا ہے جو جانوروں کی جنس سے تعلق رکھتے ہوں۔[اللہ اس واقعہ کو گھڑنے والے پر اور اس پر جس نے رفض کا عقیدہ ایجاد کیا لعنت بھیجے]۔

❀ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب یہ قول کہ:''ہائے افسوس کہ! میں ان دونوں میں سے ایک کی بیعت کر لیتا،وہ امیر ہوتا اور میں وزیر۔''

ہم سب سے پہلے کہتے ہیں: مصنف نے اس قول کی کوئی سند ذکر نہیں کی اور نہ ہی اس کی صحت بیان کی ہے۔ بالفرض مان لیجیے کہ اگر آپ نے یہ کہا بھی ہے تو یہ آپ کے زہد و ورع اور خوف الٰہی کی نشانی ہے۔

فصل:

[جیش اسامہ رضی اللہ عنہ کا واقعہ]

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: نواں سبب: ''نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جیش اسامہ کو تیار کرنے کا حکم دیا تھا؛ اور بار بار اس لشکر کو روانہ کرنے کا حکم دیا۔ ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین بھی اس لشکر میں شامل تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس لشکر میں اس لیے روانہ نہ کیا تا کہ آپ کے بعد کوئی اور شخص خلافت پر قابض نہ ہو جائے؛ مگر صحابہ رضی اللہ عنہم نے یہ بات قبول نہ کی۔''

[جواب]: اس کے جواب میں کئی پہلو ہیں:

پہلی بات: ہم شیعہ مصنف سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ اس کی صحت ثابت کرے، یہ روایت صاف جھوٹ ہے۔ یہ واقعہ نہ ہی کسی معروف سند سے روایت کیا گیا ہے' اور نہ ہی علماء کرام میں سے کسی ایک نے اسے صحیح کہا ہے۔ یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ کسی نقلی دلیل سے احتجاج اسی صورت میں درست ہوتا ہے جب اس کی صحت معلوم ہو جائے، وگرنہ جس کی مرضی جو چاہے کہتا پھرے۔

دوسری بات: اس روایت کے جھوٹ ہونے پر تمام علماء کرام کا اجماع ہے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ یا عثمان رضی اللہ عنہ جیش اسامہ میں ہر گز شامل نہ تھے، البتہ ایک قول کے مطابق حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس میں موجود تھے۔ روایات متواترہ سے ثابت ہے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے مرض الموت میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو امام صلوٰۃ مقرر کیا تھا؛ وقت انتقال تک آپ ہی امامت کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ جس روز آپ کی وفات ہوئی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے صحابہ کو صبح کی نماز پڑھائی تھی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجرہ کا پردہ اٹھا کر دیکھا تو صحابہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اقتداء میں نماز ادا کر رہے تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ منظر دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ ❶ پھر یہ بات کیسے صحیح ہو سکتی ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جیش اسامہ میں شامل تھے۔؟

تیسری بات: اگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنانا چاہتے تو صحابہ آپ کی مخالفت نہیں کر سکتے تھے۔ صحابہ کرام اللہ و رسول کے سچے اطاعت گزار تھے اور وہ ایسا کبھی نہیں کر سکتے تھے کہ بصراحت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرر کردہ خلیفہ کی جگہ از خود کسی اور کو مقرر کر دیں، اور ان لوگوں کو چھوڑ دیں کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی مخالفت کریں۔ حالانکہ یہ بات معلوم ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ مل کر دو تہائی مسلمانوں نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے جنگ لڑی؛ مگر ان میں سے کسی کو بھی یہ علم نہیں تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس ان کے خلیفہ ہونے کی نص موجود ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو سارے صحابہ آپ کے ساتھ مل کر جنگ کرتے۔

چوتھی بات: پھر یہ امر بھی قابل غور ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو نمازیں پڑھانے کا حکم دیا؛ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ حکم نہیں دیا۔ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنانا مقصود ہوتا تو آپ مرض الموت میں ان کو امام صلوٰۃ مقرر فرماتے اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کو نماز پڑھانے کی اجازت نہ دیتے۔ اور ایسے ہو بھی کیسے سکتا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پر امیر مقرر نہیں کیا۔

---

❶ صحیح بخاری، کتاب الاذان۔ باب اھل العلم والفضل احق بالامامۃ، (حدیث: ٦٨٠)، صحیح مسلم، کتاب الصلاۃ، باب استخلاف الامام اذا عرض لہ عذر (حدیث: ٤١٩)۔

❀ بلکہ صحیحین کی روایت میں ہے: جب رسول اللہ ﷺ بنی عمرو بن عوف کے مابین صلح کرانے کے لیے تشریف لے گئے تو آپ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ''جب نماز کا وقت ہو جائے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہنا کہ لوگوں کو نماز پڑھا دیں۔ اور ایسے ہی اپنی بیماری کے دن میں بھی اور جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو امیر حج بنا کر بھیجا تب بھی۔ پھر ان کے پیچھے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھیجا۔ یہ تابع بن کر آئے۔ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی امام تھے جو لوگوں کو نماز پڑھاتے تھے۔ ان میں حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ آپ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دوسرے لوگوں کو حکم دیتے اور وہ آپ کی اطاعت کرتے۔ سن نو ہجری کے حج میں حضرت علی رضی اللہ عنہ پر امیر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بنایا گیا تھا۔ باقی لوگوں پر بھی امیر آپ ہی تھے۔ اور آپ ہی انہیں نمازیں بھی پڑھاتے تھے۔

فصل:

[حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور ولایت منصب]

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: دسواں سبب: ''نبی کریم ﷺ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو کوئی منصب عطا نہیں کیا تھا، اس کے برعکس حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ابوبکر رضی اللہ عنہ پر امیر مقرر کر کے بھیجا تھا۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جواب]: ہم کہتے ہیں کہ: شیعہ کا قول کئی وجوہات کی بنا پر باطل ہے:

پہلی وجہ: معاملہ اس دعوی کے برعکس ہے۔ جو ولایت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو تفویض کی گئی تھی؛ اس میں کوئی دوسرا آپ کا سہیم و شریک نہیں۔ یہ ولایت حج ہے۔ یہ منصب عالی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو تفویض کیا گیا تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے سوا بہت سے لوگوں کو مختلف علاقوں کی امارت عطا کی گئی تھی۔

دوسری وجہ: اس بات پر شیعہ اور اہل سنت سب کا اتفاق ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ان لوگوں کو بھی ولایت تفویض کی جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی نسبت بہت ہی فروتر تھے؛ مثلاً: عمرو بن عاص و ولید بن عقبہ اور ابوسفیان بن حرب رضی اللہ عنہم اجمعین۔ تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ لوگ ابوبکر رضی اللہ عنہ سے افضل تھے اور ولایت و امارت نہ ملنے کی وجہ سے ابوبکر رضی اللہ عنہ ان سے فروتر درجہ کے تھے۔

تیسری وجہ: امارت کا نہ ملنا نقص پر دلالت نہیں کرتا۔ اس لیے کہ کبھی ولایت اس لیے بھی ترک کر دی جاتی ہے کہ اس کے لیے جو دوسرا مقام ہے؛ وہ اس ولایت سے زیادہ نفع بخش و سود مند ہے۔ اور انہیں اپنے پاس رکھنے کی ضرورت بہت زیادہ تھی۔ اور مسلمان دوسرے لوگوں کی وجہ سے ان سے بے نیاز ہو سکتے تھے۔ ولایت نہ دینے کی وجہ وجیہ یہ تھی کہ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما آپ کے وزیروں کے مقام پر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ اکثر فرمایا کرتے تھے: میں اور ابوبکر و عمر داخل ہوئے۔ میں اور ابوبکر و عمر باہر نکلے۔'' اکثر و بیشتر راتوں میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آپ کے ساتھ بیٹھ کر مسلمانوں کے امور میں گفت و شنید کیا کرتے تھے۔ [اور آپ مہمات امور میں ان سے بے نیاز نہیں ہوا کرتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مرتبہ بھی اس سے قریب قریب تھا]۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اہل شوری جیسے: حضرت عثمان، طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہم اجمعین کو کوئی ولایت تفویض نہیں کرتے تھے۔ اور یہ آپ کے نزدیک ان لوگوں سے زیادہ افضل تھے جنہیں ولایت تفویض کی جاتی تھی؛ مثلاً حضرت عمرو بن العاص، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما اور دیگر صحابہ

کرام۔ اس لیے کہ ان لوگوں کو اپنے پاس رکھنے میں اس سے زیادہ فائدہ تھا کہ ان میں سے کسی ایک کو ولایت تفویض کر دی جاتی ؛ جب کہ دوسرے ایسے لوگ موجود تھے جو ان کی جگہ کفایت کر سکتے تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہی داخل ہوتے تھے۔ اور پھر ان کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کیساتھ ملے ہوتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں حضرات سے فرمایا تھا: ''اگر تم دونوں ایک بات پر متفق ہو جاؤ تو میں تمہاری مخالفت نہیں کروں گا۔''

جب کوئی وفد آتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان دونوں سے مشورہ کرتے۔ ان میں سے ایک کوئی مشورہ دیتا اور دوسرا کوئی مشورہ۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے بدر کے قیدیوں کے بارہ میں بھی مشورہ کیا تھا۔ اس میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا مشورہ غالب رہا۔ اور آپ ان کے ساتھ ہی اکثر بیٹھا کرتے تھے۔ یہ بات ہر اس انسان پر عیاں ہے جو صحیح احادیث میں تدبر کرے۔ اِن کی تفصیل بیان کرنے کا یہ موقع نہیں۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی امارت حج کا واقعہ:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: گیارھواں سبب: ''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو سورۂ توبہ دے کر روانہ کیا۔ پھر ان کے پیچھے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو روانہ کیا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کو واپس مدینہ بھیج دیں، اور خود یہ ذمہ داری ادا کریں۔ جو شخص ایک سورت یا اس کا کچھ حصہ پہنچانے کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا وہ خلافت و امارت کا اہل کیسے ہوگا جس میں تمام احکام پوری امت تک پہنچانے کی ذمہ داری ہوتی ہے؟۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جواب]: شیعہ کا یہ قول بھی کئی وجوہات کی بنا پر باطل ہے:

پہلی وجہ: اس پر تمام اہل علم کا اتفاق ہے کہ یہ بات افتراء محض ہے اور روایات متواترہ کے خلاف ہے۔ اس لیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ۹ ھ میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو امیر حج بنا کر مکہ بھیجا تھا۔ [یہ غلط ہے کہ آپ واپس بلا لیے گئے تھے؛] نہ ہی آپ کو واپس بلایا گیا اور نہ ہی خود واپس آئے۔ اس سال دورانِ حج آپ ہی امیر حج تھے، علی رضی اللہ عنہ ان کی رعیت کے ایک فرد۔ [1]

---

[1] اس میں دوسری مصلحت یہ تھی کہ سورۂ توبہ سیدنا صدیق رضی اللہ عنہ کی مدح و ستائش پر متضمن ہے نبی کریم چاہتے تھے کہ اس ثناء کا اظہار حج کے موقع پر علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی زبان سے ہوتا کہ اللہ کے دشمن ہمیشہ کے لیے شرم سار ہوں اور جب بھی اس پر غور و فکر کریں ان کا مصنوعی دین دھڑام سے نیچے گر پڑے۔ متقدمین شیعہ میں سے اللہ کے دشمن شیطان الطاق نے بدحواسی کے عالم میں کہا کہ یہ الفاظ ﴿ ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ ﴾ اللہ کے فرمودہ نہیں ہیں۔ جیسا کہ مشہور ادیب جاحظ نے اپنے استاد ابراہیم نظام و بشر بن خالد سے سن کر بیان کیا۔ (دیکھیے الفصل امام ابن حزم: ٤ / ١٨١) ۔ متاخرین شیعہ میں سے طاغوت الکاظمیہ نے حواس باختہ ہو کر کہا کہ آیت قرآنی ﴿ لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ ﴾ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو شامل نہیں، بلکہ یہ خالص الایمان لوگوں کے لیے مختص ہے۔ (دیکھیے کاظمی کی کتاب احیاء الشریعة فی کتب الشیعة ، ص:۶۳۔۶۴)۔ سیدنا علی کو سورۂ توبہ دے کر مکہ بھیجنے کے واقعہ سے واضح ہوتا ہے کہ نبی کریم اور ابوبکر رضی اللہ عنہ و علی ایک صف میں تھے اور اعداء صحابہ ان کے مدمقابل دوسری جانب، ان دونوں کا اتصال دین و دنیا میں کسی طرح ممکن نہیں۔ (علامہ خطیب) درحقیقت سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ صدیق کو جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امیر الحج بنا کر روانہ فرمایا تھا اس وقت ابھی سورہ توبہ کی یہ آیات نازل نہیں ہوئی تھیں سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ ابھی اثنائے سفر میں ہی تھے کہ سورہ توبہ کی چالیس آیتیں نازل ہوئیں جس کا اعلان براءت حج میں ہونا ضروری تھا، اس لیے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو ان کے پیچھے ہی روانہ کر دیا تا کہ اعلان بروقت ہو سکے، لیکن سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی امارت کو توڑا نہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو ان پر امیر مقرر کیا، بلکہ امارت حج بدستور سیدنا صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس رہی اور سیدنا علی کو ان کے ماتحت رہنے دیا۔

اوران کی اقتداء میں نمازیں پڑھا کرتے تھے۔آپ جہاں جاتے وہ آپ کے ساتھ جاتے اور جس بات کا حکم دیتے آپ اس کی تعمیل کرتے۔جیسا کہ آپ کے ساتھ موجود باقی تمام لوگ کرتے تھے۔یہ ایک تاریخی حقیقت ہے جس سے کسی کو مجال انکار نہیں؛ اور نہ ہی اس میں کسی دو نے اختلاف کیا ہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ہی سن ۹ ھجری کا حج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے کروایا۔ پھر شیعہ کا یہ کہنا کہاں تک درست ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو واپس بلا لیا تھا؟ البتہ مشرکین سے کیے ہوئے معاہدوں کے اختتام کا اعلان کرنے کیلئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو روانہ کیا تھا۔اس لیے کہ عربوں کے یہاں رسم تھی کہ عہد باندھنے یا توڑنے کا کام حاکم خود کرتا یا اس کے اہل بیت میں سے کوئی شخص یہ کام انجام دیتا۔ہر ایک سے اس کی بات قبول نہیں کر لیتے تھے۔[بنابریں اعلان براءت کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھیجا گیا تھا]۔

❀ صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ مجھے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے امیر حج ہونے کے دن بزمرہ موذنین بھیجا تا کہ ہم منیٰ میں یہ اعلان کریں کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہ کرے اور نہ کوئی برہنہ (ہوکر) طواف کرے۔'' اور ایک روایت میں ہے:'' پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پیچھے علی رضی اللہ عنہ کو بھیجا اور ان کو حکم دیا کہ وہ سورت برات کا اعلان کریں،علی رضی اللہ عنہ نے قربانی کے دن ہمارے ساتھ منیٰ میں لوگوں میں اعلان کیا کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہ کرے اور نہ کوئی برہنہ (ہوکر) کعبہ کا طواف کرے۔''[صحیح بخاری: ح362]

❀ آپ فرماتے ہیں: پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں کا عہد اس سال واپس کر دیا۔ حجۃ الوداع کے سال جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کیا' تو اس سال کسی بھی مشرک نے حج نہیں کیا۔

ابو محمد ابن حزم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:'' حج میں جو کچھ ہوا اس میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے بہت بڑے فضائل ہیں۔ اس لیے کہ اس سال اس عظیم الشان اجتماع سے آپ نے ہی خطاب کیا۔اورلوگ خاموشی سے آپ کا خطبہ سنتے رہے۔آپ کے پیچھے نمازیں پڑھتے رہے۔حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی آپ کی جملہ رعیت میں سے ایک تھے۔اس سورت میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی فضیلت کا بیان اور غار کا ذکر ہے۔سو یہ سورت حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پڑھ کر لوگوں کو سنائی۔ یہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے فضائل میں انتہائی حد اور قطعی حجت ہے۔

❀ مزیدار بات یہ ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ پر امیر بنانے کا واقعہ اس فرمان کے بعد کا ہے:

" أما ترضی اَنْ تکون مِنِّیْ بِمَنْزِلَةِ هَارُوْنَ مِنْ مُّوْسٰی۔"

'' کیا تم اس بات پر راضی نہیں کہ میرے لیے بلحاظ منزلت ایسے ہی ہو جیسے ہارون حضرت موسیٰ کے ساتھ۔''

❀ مقام حیرت ہے کہ شیعہ مصنف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سیرت وسوانح اور عصر وعہد کے واقعات سے نابلد محض ہونیکے باوجود علم وفضل کا دعوے دار ہے۔اور یہ ان متواتر واقعات سے بھی جاہل اور لاعلم ہے جنہیں وہ لوگ بھی جانتے ہیں جنہیں علوم سیرت سے ادنیٰ سی شناسائی ہوتی ہے۔مگر یہ ایسے واقعات تلاش کرتے ہیں اور پھر ان میں اپنی مرضی سے کمی بیشی کرتے ہیں۔اس قسم کے لوگوں کو خاموش رہنا زبان سخن دراز کرنے سے بہتر ہوتا ہے۔مگر کیا کریں اس رافضی مصنف نے بھی وہی کچھ کیا ہے جو کہ اس کے ان اسلاف نے کیا ہے جن کا یہ مقلد ہے۔اس نے ان کے کلام کی کوئی تحقیق نہیں کی۔اور نہ ہی

ان چیزوں کا مراجعہ کیا ہے جو اہل علم کے ہاں صرف معلوم ہی نہیں بلکہ متواتر کی حد تک معروف ہیں۔ اور خاص و عام انہیں جانتے ہیں۔ [لیکن جب اللہ تعالیٰ نے اس کے دل کو اندھا کر دیا ہو اور اس کی نیت خراب ہو تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟ تاہم اس میں شبہ نہیں کہ وہ مصنف کٹر شیعہ ہے؛ اور اپنے اسلاف کی راہ پر گامزن ہے جو کہ تقیہ اور کذب و افتراء سے عبارت ہے]۔

[امام کی ذمہ داری اور شیعیت]:

[دوسری وجہ]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ''امام جملہ احکام شرعی امت کی طرف پہنچانے کا ذمہ دار ہوتا ہے۔''

[جواب]: ہم کہتے ہیں: یہ قول باطل ہے۔ نبی کریم ﷺ نے تمام شرعی احکام امت کو سکھا دیے تھے۔ اس لیے امت اس ضمن میں امام کی اتنی ہی دست نگر ہے جتنی اس جیسے دوسرے علماء کی۔ البتہ امام رسول سے حاصل کردہ احکام کو امت تک پہنچانے کا ایک ذریعہ ہوتا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ عام شرعی مسائل و احکام سے آگاہ تھے۔ جو مسئلہ معلوم نہ ہوتا وہ صحابہ سے دریافت کر لیتے، مثلاً آپ نے میراث جدہ کا مسئلہ صحابہ سے دریافت کیا تھا۔ صحابہ نے بتایا کہ آپ نے جدہ کو ۱/۶ حصہ دیا تھا۔ ❀

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا کوئی قول [فتوی] ایسا نہ تھا جو نص سے ٹکراتا ہو۔ البتہ حضرت عمر و عثمان رضی اللہ عنہما کے بعض اقوال مخالف نص تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مخالف نص اقوال کی تعداد عمر و عثمان رضی اللہ عنہما کے اقوال کی نسبت زیادہ ہے۔ مثلاً حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ قول کہ جس حاملہ عورت کا خاوند فوت ہو جائے اس کی عدت أبعد الاجلین (عدت وفات اور وضع حمل میں سے جس کی مدت بعیدتر ہو) ہے[1] حالانکہ سُبیعہ الأسلمیۃ کی روایت کردہ حدیث صحیحین میں موجود ہے کہ جب انہوں نے اپنے پہلے خاوند کی وفات کے تین دن بعد وضع حمل کیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''اب تم حلال ہو چکی ہو؛ جس سے چاہے نکاح کر لو۔''

یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب اس عورت نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ: ''ابوسنابل نے کہا ہے: ''تم اس وقت تک نکاح نہیں کر سکتیں جب تک زیادہ لمبی مدت کی عدت پوری نہ کر لو۔'' اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ابوسنابل نے جھوٹ بولا۔''[2] [یوں نبی کریم ﷺ نے اسے نکاح کی اجازت دے دی تھی۔]

امام شافعی رحمہ اللہ نے حضرت علی و ابن مسعود رضی اللہ عنہما کے اختلافات کے بارے میں ایک کتاب تصنیف کی تھی۔ اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے وہ اقوال بھی تھے جن کو لوگوں نے نص یا معنی نص کے مخالف ہونے کی وجہ سے ترک کر دیا تھا۔

ان کے بعد محمد بن نصر مروزی رحمہ اللہ نے اس سے زیادہ اختلافات جمع کیے۔ جب کوفہ کے لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مناظرہ کرتے تو آپ نصوص سے احتجاج کیا کرتے تھے۔ وہ لوگ کہتے تھے: ''ہم نے علی و ابن مسعود رضی اللہ عنہما کے قول پر عمل کیا

❀ سنن ابی داؤد، کتاب الفرائض، باب فی الجدۃ، (ح:۲۸۹٤)، سنن ترمذی کتاب الفرائض باب ما جاء فی میراث الجدۃ، (ح:۲۱۰۰، ۲۱۰۱)، سنن ابن ماجۃ، کتاب الفرائض۔ باب میراث الجدۃ(حدیث:۲۷۲٤)۔

[1] کتاب الام، للامام الشافعی(۷/ ۱۷۳)، سنن کبری، بیہقی(۷/ ٤۳۰)، المغنی لابن قدامۃ(۱۱/ ۲۸۹)۔

[2] صحیح بخاری، کتاب الطلاق، باب ﴿وَاُولَاتِ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ......﴾ (حدیث:۵۳۱۸۔۵۳۲۰)، صحیح مسلم، کتاب الطلاق، باب انقضاء عدۃ المتوفی عنہا زوجہا(حدیث:۱٤۸٤، ۱٤۸۵)۔

ہے، چنانچہ ان کے لیے حضرت علی و ابن مسعود رضی اللہ عنہما کے وہ اقوال جمع کیے گئے تھے جن کو انہوں نے خود یا لوگوں نے ترک کر رکھا تھا۔اور کہا کرتے تھے:''جب ان مسائل میں تم دونوں سے اختلاف کرنے کو اس لیے جائز سمجھتے ہو کہ ان کے خلاف حجت قائم ہو چکی ہے تو باقی تمام مسائل میں بھی یہی رویہ اختیار کرنا چاہیے۔مگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے لیے کوئی ایسی بات معروف نہیں۔

تیسری وجہ: علاوہ ازیں سب صحابہ نے قرآن کریم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر لوگوں تک پہنچا دیا تھا، لہٰذا یوں کہنا ممتنع ہو جاتا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تبلیغ قرآن کے اہل نہیں تھے۔

چوتھی وجہ: یوں کہنا درست نہیں کہ تبلیغ قرآن حضرت علی رضی اللہ عنہ کا خاصہ ہے۔اس لیے کہ قرآن خبر واحد کے ساتھ ثابت نہیں ہوتا۔بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ نقل متواتر سے ثابت ہو۔

پانچویں وجہ: اس سال [سن نوہجری میں] حج کے موسم میں مسلمین اور مشرکین سبھی نے حج کیا تھا۔اس وقت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا تھا کہ آپ اس حج میں اعلان کر دیں کہ:''آج کے بعد کوئی مشرک حج نہ کرے اور نہ ہی کوئی ننگا ہو کر بیت اللہ کا طواف کرے۔'' جیسا کہ صحیحین میں ثابت ہے۔تو پھر مشرکین کو قرآن پہنچانے کی کونسی حاجت تھی۔

فصل:

[حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال نہیں ہوا]

[اعتراض]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: بارھواں سبب:''عمر نے کہا تھا کہ محمد فوت نہیں ہوئے، یہ بات ان کے قلیل العلم ہونے پر دلالت کرتی ہے۔عمر رضی اللہ عنہ نے ایک حاملہ عورت کو سنگ سار کرنے کا حکم دیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس سے منع کیا، تب عمر رضی اللہ عنہ نے کہا:''اگر علی نہ ہوتے تو عمر رضی اللہ عنہ ہلاک ہو جاتا۔ان کے علاوہ دیگر کئی احکام و مسائل ہیں جن میں آپ نے غلطی کی اور کئی رنگ بدلے۔''

[جواب]: پہلی بات: صحیحین میں ثابت ہے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اُمَمِ سابقہ میں کچھ لوگ مُلہم ہوا کرتے تھے۔میری امت میں اگر کوئی ایسا شخص ہے تو وہ عمر رضی اللہ عنہ ہے۔''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی کوئی بات حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حق میں ارشاد نہیں فرمائی۔اور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

''حالت خواب میں مجھے دودھ کا ایک پیالہ پیش کیا گیا میں نے خوب سیر ہو کر پیا یہاں تک کہ سیری کا اثر میرے ناخنوں میں ظاہر ہونے لگا جو دودھ بچ گیا وہ میں نے عمر رضی اللہ عنہ کو دے دیا۔صحابہ نے دریافت کیا۔پھر آپ نے اس خواب کی کیا تعبیر فرمائی؟ فرمایا:''دودھ سے علم مراد ہے۔'' [البخاری (ح:٣٦٨١)، صحیح مسلم (ح:٣٦٩١)]

[قبل ازیں بھی دلائل و براہین کی روشنی میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا علمی مقام واضح کر چکے ہیں کہ] حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بعد اَعلم الناس تھے۔باقی رہا یہ کہ انھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ گمان کیا کہ آپ فوت نہیں ہوئے، تو یہ ایک لمحہ کے لیے تھا۔ پھر ان پر منکشف ہو گیا تھا کہ آپ فوت ہو چکے ہیں۔ ایسے واقعات حضرت علی رضی اللہ عنہ

کو بھی پیش آئے تھے کہ انھوں نے ایک رائے قائم کی اور وہ غلط نکلی؛ بلکہ آپ کے بہت سارے قصے ایسے ہیں جو خلاف واقعہ نکلے؛ اور آپ کا انتقال اسی حال میں ہوگیا۔ اس سے ان کی امامت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ مثال کے طور پر مفوضہ کے مہر کے مسئلہ میں آپ کا فتوی کہ اگر مفوضہ مر جائے اور اس کا مہر مقرر نہ ہوا ہو۔ اور اس طرح کے دیگر مسائل جو کہ اہل علم کے ہاں معروف ہیں۔

جب کہ حامل کا مسئلہ بہت آسان ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو معلوم نہ تھا کہ وہ عورت حاملہ ہے۔ اس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی کوئی غلطی نہیں، ہوسکتا ہے کہ جب آپ نے رجم کرنے کا حکم دیا ہو تو آپ کو اس کے حامل ہونے کا علم نہ ہو؛ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس سے آگاہ کر دیا ہو۔ تو آپ نے یہ بھی ارشاد فرمایا؛ جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ نہ ہوتے تو میں اس کو رجم کر دیتا اور اس کا جنین بھی قتل ہو جاتا۔ اس چیز کا آپ کو خوف محسوس ہوا۔

اگر یہ بات مان لی جائے کہ آپ حامل کو رجم کرنا جائز سمجھتے تھے؛ تو یہ ایسا حکم ہے جو مخفی بھی رہ سکتا ہے۔ شریعت میں تو زانیہ کے قتل کرنے کا حکم ہے۔ حمل تو اس عورت کے تابع ہے۔ جیسا کہ اگر کفار کا محاصرہ کرلیا جائے [تو پھر اس میں بچے بھی قتل ہو جاتے ہیں] جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے طائف کا محاصرہ کرکے ان پر منجنیق سے پتھر برسائے تھے۔ جس میں عورتیں اور بچے بھی قتل ہوئے۔

صحیح حدیث میں یہ بھی ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا: ''اگر کافروں کی بستی پر شبخون مارا جائے' اور ان کی عورتیں اور بچے قتل ہو جائیں تو؟ آپ نے فرمایا: ''وہ انہی میں سے ہیں۔''

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بھی ثابت ہے کہ آپ خواتین اور بچوں کو قتل کرنے سے منع فرمایا کرتے تھے۔

یہ بات علماء کرام کی ایک جماعت پر مشتبہ ہوگئی؛ اس لیے انہوں نے شبخون مارنے سے منع کر دیا؛ اس خوف سے کہ کہیں عورتیں اور بچے قتل نہ ہو جائیں۔

ایسے ہی یہ بات بعض ان لوگوں پر بھی مشتبہ رہتی ہے جو اسے جائز سمجھتے ہیں۔ مثلاً وہ کہتے ہیں: رجم ایسی حد ہے جسے فوراً نافذ کرنا چاہیے؛ اس میں تاخیر کرنا جائز نہیں۔ لیکن سنت نے ان دونوں چیزوں میں تفریق کی ہے؛ جس میں تاخیر ممکن ہے جیسے حد؛ اور جسے فوری طور پر کر گزرنا چاہیے جیسے محاصرہ اور شبخون وغیرہ۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ تو عام لوگوں کی طرف بھی رجوع کرلیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ مہر کے مسئلہ میں جب ایک عورت نے کہا: کیا ہم آپ کی بات سنیں یا اللہ تعالیٰ کی بات سنیں؟ آپ نے فرمایا نہیں: اللہ تعالیٰ کی بات سنو؛ تو اس عورت نے کہا: پھر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَّ اٰتَیْتُمْ اِحْدٰلهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَیْئًا ﴾ [النساء ۲۰]

''اور ان میں کسی کو تم نے خزانے کا خزانہ دے رکھا ہو تو بھی اس میں سے کچھ نہ لو۔''

تو آپ نے فرمایا: ''مرد سے خطا ہوگئی اور عورت حق کو پہنچ گئی۔''

ایسے ہی آپ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی طرف بھی رجوع کیا کرتے تھے؛ حالانکہ آپ خود

ان سب سے بڑے عالم تھے۔ سو جب کوئی بڑا اور علم والا انسان اگر اپنے سے کم درجہ کے لوگوں کی طرف کسی چیز میں رجوع کرے تو اس سے اس کی شان میں اور بڑا عالم ہونے میں قدح واقع نہیں ہوتی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت خضر سے تین مسائل سیکھے تھے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو ہدہد نے بلقیس کی خبر دی تھی۔

صحابہ کرام میں کتنے ہی ایسے لوگ تھے جو نبی کریم ﷺ کو بہت سارے معاملات میں مشورہ دیا کرتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ صحابہ میں سب سے زیادہ نبی کریم ﷺ کی طرف مراجعہ کیا کرتے تھے۔ یہ ایک مسلمہ بات ہے کہ قرآن کریم کی متعدد آیات حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تائید و موافقت میں نازل ہوئیں؛ جیسے کہ پردہ' بدر کے قیدیوں کا مسئلہ؛ اور مقام ابراہیم کو مصلی بنانے کا ارادہ؛ اور ﴿عسى ربه إن طلقكن﴾ اور اس طرح کے دیگر مسائل میں موافقت۔

یہ مقام و شرف نہ ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حاصل تھا اور نہ ہی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو۔

سنن ترمذی کی روایت میں ہے: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اگر میں تم لوگوں میں مبعوث نہ ہوتا تو عمر مبعوث ہوتا۔''

نیز سرور کائنات ﷺ نے فرمایا: ''اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو وہ عمر رضی اللہ عنہ ہوتے۔''[1]

[شہادت پانے کے بعد جب عمر رضی اللہ عنہ کو چارپائی پر رکھا گیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کی تعریف فرمائی اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ اے کاش! آخری وقت میں مجھے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اعمال کیساتھ بارگاہ ربانی میں پیش کیا جائے۔''[2]]

شیعہ کے نزدیک نماز تراویح بدعت:

[اعتراض]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: تیرھواں سبب: ''عمر رضی اللہ عنہ نے تراویح کی بدعت جاری کی۔ حالانکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا تھا، لوگو! رمضان کی راتوں میں نفل نماز باجماعت بدعت ہے۔ چاشت کی نماز بھی بدعت ہے۔ سنت میں سے بہت تھوڑی سی چیز بہت بڑی بدعت سے بہت بہتر ہے۔ آگاہ ہو جاؤ! ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی کا راستہ جہنم کو جاتا ہے۔ عمر رضی اللہ عنہ رمضان میں رات کو نکلے تو مساجد میں چراغ جلتے دیکھ کر پوچھا یہ کیا ہے؟ لوگوں نے کہا ہم نفلی نماز کے لیے جمع ہوئے ہیں، فرمایا: یہ ہے تو بدعت مگر بہت اچھی بدعت ہے۔ آپ نے اس کے بدعت ہونے کا اعتراف کیا۔''

[جواب]: ہم کہتے ہیں: تمام گمراہ اور بدعتی فرقوں میں شیعہ رسول اللہ ﷺ پر کذب بیانی اور افتراء پردازی کرتے ہوئے نہیں جھجکتے اور انتہائی جرأت کے ساتھ شرم و حیاء کے جذبات کو بالائے طاق رکھ دیتے ہیں۔ اور ایسی ایسی باتیں گھڑ لاتے ہیں جو کہ آپ ﷺ نے ارشاد نہیں فرمائیں۔ اور انتہائی ڈھٹائی کے ساتھ جھوٹ بولتے ہیں۔ اگرچہ ان میں بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں ان روایات کے جھوٹ ہونے کا علم ہوتا ہے۔ اور جس کو اتنا بھی علم نہ ہو' وہ انتہائی پرلے درجہ کا جاہل ہوتا ہے۔ جیسا کہ کہا گیا ہے:

إن كنت لا تدرى فتلك مصيبة | و إن كنت تدرى فالمصيبة أعظم

---

[1] سنن ترمذی، کتاب المناقب، باب (۱۷/ ۵۲)، (ح:۳۶۸۶)۔

[2] صحیح بخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ، باب مناقب عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ (ح:۳۶۸۵)، صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابۃ، باب من فضائل عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ (ح:۲۳۸۹)۔

''اگر آپ نہیں جانتے تو یہ بھی ایک مصیبت ہے۔ اور اگر جانتے ہیں تو پھر مصیبت اس سے بھی بڑی ہے۔''

اس اعتراض کا جواب کئی زاویوں سے دیا جاسکتا ہے:

پہلا جواب: ہم اس روایت کی صحیح سند پیش کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اس حدیث کے صحیح ہونے کی دلیل کیا ہے؟ اس کی سند کہاں ہے؟ اور مسلمانوں کی کتابوں میں سے کس کتاب میں اس کو روایت کیا گیا ہے؟ اور اہل علم میں سے کس نے کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے؟

دوسرا جواب: تمام اہل علم محدثین کا اتفاق ہے' اور وہ علم ضروری کے طور پر جانتے ہیں کہ یہ روایت رسول اللہ ﷺ پر من گھڑت جھوٹ ہے۔ جس انسان کو حدیث کا ادنیٰ سا بھی علم ہو وہ اس حدیث کے جھوٹ ہونے کو جانتا ہے۔ مسلمانوں میں سے کسی ایک نے بھی اپنی کسی ایک کتاب میں بھی اس روایت کو نقل نہیں کیا۔ نہ ہی صحاح میں؛ نہ ہی سنن میں؛ نہ ہی مسانید اور معجمات میں اور نہ ہی اجزاء میں۔ اور نہ ہی اس کی کوئی سند معروف ہے۔ نہ ہی ضعیف سند نہ ہی صحیح۔ بلکہ یہ ایک کھلا ہوا جھوٹ ہے۔

تیسرا جواب: احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ عہد رسالت میں لوگ رمضان کی راتوں میں نماز تراویح ادا کیا کرتے تھے۔ [1] احادیث سے ثابت ہے کہ آپ نے دو یا تین راتوں میں لوگوں کو باجماعت تراویح کی نماز پڑھائی تھی۔

صحیحین میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (رمضان کی) ایک رات آدھے حصہ میں نکلے۔ آپ نے مسجد میں نماز پڑھی اور لوگوں نے بھی آپ کے پیچھے نماز پڑھی۔ صبح کو لوگوں نے اس کا ایک دوسرے پر چرچا کیا۔ دوسرے دن اس سے زیادہ لوگ جمع ہوئے۔ اور آپ کے ساتھ نماز پڑھی پھر صبح ہوئی تو اس کو لوگوں نے ایک دوسرے سے بیان کیا۔ تیسری رات میں اس سے زیادہ آدمی جمع ہوئے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے۔ آپ نے نماز پڑھی تو لوگوں نے بھی آپ کے ساتھ نماز پڑھی۔ جب چوتھی رات آئی تو مسجد میں لوگوں کا اس میں سمانا دشوار ہوگیا لیکن آپ صبح کی نماز کے لئے نکلے جب صبح کی نماز ادا کی تو لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: ''امابعد! مجھ سے تم لوگوں کی موجودگی پوشیدہ نہیں تھی، لیکن مجھے خوف ہوا کہ کہیں تم پر فرض نہ ہو جائے، اور تم اس کے ادا کرنے سے عاجز آ جاؤ۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی اور حالت یہی رہی۔'' [2]

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:

''ہم نے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ رمضان بھر روزے رکھے۔ آپ ہمارے ساتھ ایک بھی تراویح میں کھڑے نہ ہوئے۔ یہاں تک کہ رمضان کی سات راتیں باقی رہ گئیں۔ ساتوں شب کو آپ نے ہمارے ساتھ قیام فرمایا حتی کہ رات کا تہائی گزر گیا۔ اس کے بعد چھٹی رات قیام نہ فرمایا۔ پھر اسکے بعد پانچویں شب آدھی رات تک

---

[1] معرفة السنن والآثار للبيهقي (٢/ ٣٠٣، ح:١٣٦٣)۔ [2] صحيح بخاري، كتاب صلاة التراويح، باب فضل من قام رمضان(ح:٢٠١٢)، صحيح مسلم، كتاب صلاة المسافرين، باب الترغيب في قيام رمضان (ح:٧٦١)۔

قیام کیا۔ میں نے کہا: یارسول اللہ! اگر آپ ہمارے ساتھ نفل پڑھیں (تو کیا خوب ہو)۔

آپ فرمایا: ''جس نے فارغ ہونے تک امام کے ساتھ قیام کیا تو اس کا یہ قیام رات بھر کے قیام کے برابر (موجب اجر وثواب) ہے۔ پھر اسکے بعد چوتھی قیام نہ فرمایا پھر اسکے بعد والی یعنی شب کو آپ نے ازواج اور گھر والوں کو جمع فرمایا اور لوگ بھی جمع ہو گئے۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمارے ساتھ قیام فرمایا یہاں تک کہ ہمیں فلاح فوت ہو جانے کا اندیشہ ہونے لگا۔ عرض کیا فلاح کیا چیز ہے؟ فرمایا: ''سحری کا کھانا۔ فرماتے ہیں پھر آپ نے باقی مہینہ ایک رات بھی قیام نہ فرمایا۔''❶

اسے امام احمد' ترمذی' نسائی اور ابوداؤد نے بھی نقل کیا ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رمضان میں قیام کی ترغیب دیا کرتے تھے سوائے اس کے کہ اس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بہت تاکیدی حکم فرماتے ہوں۔ اور فرماتے کہ جو آدمی رمضان میں ایمان اور ثواب سمجھ کر قیام کرے تو اس کے پچھلے سارے گناہ معاف کر دیئے جائیں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وصال فرما گئے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ حکم اسی طرح باقی رہا۔ پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے آغاز میں اسی طرح یہ حکم باقی رہا۔''❷

امام بخاری نے عبدالرحمٰن بن عبد القاری سے روایت کیا ہے کہ میں رمضان کی ایک رات میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ مسجد گیا۔ تو دیکھا لوگ ادھر ادھر منتشر تھے۔ کچھ لوگ انفرادی طور پر نماز میں مشغول تھے۔ چند آدمی نماز باجماعت ادا کر رہے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا، میرا خیال ہے کہ میں ایک قاری کو مقرر کردوں، جس کی اقتداء میں سب لوگ مل کر نماز ادا کیا کریں تو یہ بہتر ہوگا۔ چنانچہ آپ نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کو اس خدمت پر مامور فرمایا۔ پھر میں ان کے ساتھ دوسری رات نکلا تو لوگ قاری کی اقتداء میں نماز پڑھ رہے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ دیکھ کر فرمایا: ''یہ بڑی اچھی بدعت ہے، جس نماز سے تم سورہتے ہو وہ اس سے بہتر ہے جو تم ادا کرتے ہو، آپ کا مطلب یہ تھا کہ رات کے آخری حصہ میں نماز پڑھنا افضل ہے۔❸

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قیام رمضان کو بدعت قرار دیا؛ اجتماع اس سے پہلے اس طرح سے نہیں ہوا کرتا تھا۔ کیونکہ جو کام شروع میں کیا جائے لغت کے اعتبار سے اسے بدعت کہتے ہیں۔ یہ شرعی بدعت نہیں ہے۔ اس لیے کہ شرعی بدعت جو کہ گمراہی ہے؛ وہ بدعت ہے جس کی کوئی شرعی دلیل موجود نہ ہو۔ جیسا کہ کسی ایسی چیز کو مستحب قرار دیا جائے جسے اللہ تعالیٰ پسند نہ کرتے ہوں۔ اور ایسی چیز کو واجب کہنا جو اللہ تعالیٰ نے واجب نہ کی ہو۔ اور ایسی چیز کو حرام قرار دینا جسے اللہ تعالیٰ نے حرام نہ ٹھہرایا ہو

❶ سنن أبي داؤد ٢/ ٦٨۔ کتاب تفریع أبواب شهر رمضان' باب في قيام في شهر رمضان۔ سنن الترمذي ٢/ ١٥٠؛ کتاب الصوم' باب: ماجاء في قيام شهر رمضان۔ وقال الترمذي: حسن صحيح۔ سنن النسائي ٣/ ٢٠٢؛ کتاب قيام الليل' باب: قيام شهر رمضان۔[سنن ابن ماجه: ح ١٣٢٧] ❷صحيح مسلم:ح:1774؛ کتاب صلاة المسافرين وقصرها؛ باب: الترغيب في قيام رمضان هو التراويح]۔البخاري کتاب التراويح' باب: فضل من قام رمضان ٣/ ٤٤۔

❸صحيح بخاري ، حواله سابق(حديث:٢٠١٠)۔ اسد الغابة(٤/ ١٨٣)۔

اس لیے کہ ان افعال کے بجالانے کے لیے خلاف شریعت اعتقاد کا ہونا لازمی ہے۔ ورنہ اگر کوئی انسان کوئی حرام کام کر رہا ہو اور اس کے حرام ہونے کا اعتقاد بھی رکھتا ہو تو اس کے اس فعل کو بدعت نہیں کہا جا سکتا۔

چوتھا جواب: اگر قیام رمضان با جماعت کوئی مذموم اور قبیح فعل ہوتا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ جب امیر المؤمنین بن گئے تھے؛ اور کوفہ آپ کا دار الخلافہ تھا تو کم از کم آپ کوفہ میں اسے بند کر دیتے۔ جب کوفہ میں بھی یہ فعل حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور کی طرح ہی جاری رہا تو یہ اس کے مستحب ہونے کی دلیل ہے۔ بلکہ یہ بھی روایت کیا گیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا:

''اللہ تعالیٰ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی قبر کو ایسے منور کرے جیسے آپ نے ہماری مسجدوں کو روشن کر دیا۔'' ❶

ابو عبد الرحمن السلمی سے روایت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے رمضان میں قاریوں کو بلا کر ان میں سے ایک قاری کو حکم دیا کہ وہ انھیں بیس رکعات پڑھائے۔ وہ کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ انھیں وتر پڑھایا کرتے تھے۔ ❷

عرفجہ ثقفی کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ قیام رمضان کا حکم دیا کرتے تھے، ایک امام آدمیوں کے لیے مقرر کرتے اور ایک عورتوں کے لیے، میں عورتوں کا امام ہوا کرتا تھا ❀۔ امام بیہقی نے یہ دونوں روایتیں سنن میں نقل کی ہیں۔

قیام رمضان کے متعلق علماء کرام میں اختلاف ہے؛ کیا یہ نماز مسجد میں با جماعت ادا کرنا افضل ہے؟ یا اس کا گھر میں پڑھنا افضل ہے؟ اس میں دو قول مشہور ہیں۔ امام شافعی اور امام احمد رحمہ اللہ سے بھی یہی دو قول منقول ہیں۔ ایک گروہ مسجد میں با جماعت تراویح پڑھنے کو ترجیح دیتا ہے۔ ان میں امام لیث رحمہ اللہ بھی ہیں۔ امام مالک رحمہ اللہ اور فقہاء کا ایک گروہ گھر میں یہ نماز پڑھنے کو ترجیح دیتا ہے۔ ان کی دلیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان مبارک ہے:

''فرائض کے علاوہ مرد کی افضل ترین نماز وہ ہے جو گھر پر ادا کی جائے۔'' ❸

امام احمد اور دیگر علماء کرام رحمہم اللہ کی دلیل حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے جس میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جس نے فارغ ہونے تک امام کیساتھ قیام کیا تو اس کا یہ قیام رات بھر کے قیام کے برابر [موجب اجر وثواب] ہے۔''

پہلی حدیث: ''فرائض کے علاوہ مرد کی افضل ترین نماز وہ ہے جو گھر پر ادا کی جائے'' اس سے مراد یہ ہے کہ جب تک اس نماز کے لیے جماعت مشروع نہ ہو' مگر جب جماعت مشروع ہو جائے جیسے: نماز کسوف' وغیرہ۔ تو پھر اس نماز کا مسجد میں ادا کرنا افضل ہے۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت متواترہ اور اجماع امت سے ثابت ہے۔

نیز ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو اس خوف کے تحت جمع نہ کیا تھا کہ کہیں یہ نماز با جماعت ادا کرنا فرض نہ ہو جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اب اس قسم کا کوئی احتمال باقی نہ رہا۔ تو اب یہ بھی ایسے ہی ہے جیسے قرآن کا جمع کرنا وغیرہ [اس طرح کے دیگر امور]۔

جب اس نماز میں جماعت اصل میں مشروعیت کا ثبوت رکھتی ہے تو پھر اسے با جماعت ادا کرنا ہی افضل ہے۔

---

❶ اسد الغابۃ (٤/ ١٨٣)۔ ❷ سنن کبریٰ بیہقی (٢/ ٤٩٦)، وسندہ ضعیف۔ اس کی سند میں حماد بن شعیب راوی ضعیف و منکر الحدیث ہے۔ دیکھئے: لسان المیزان (٢/ ٣٤٨)۔ ❀ سنن کبری بیہقی (٢/ ٤٩٤)، مصنف عبد الرزاق (٥١٢٥)۔

❸ البخاری کتاب الأذان' باب صلاۃ اللیل۔ صحیح مسلم: کتاب صلاۃ المسافرین وقصرھا؛ باب: استحباب صلاۃ النافلۃ في بیتہ و جوازھا فی المسجد۔

رہا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ قول کہ: ''جو لوگ اس نماز سے سو جاتے ہیں وہ افضل ہیں'' اس سے مراد آخری رات ہے۔ کیونکہ لوگ پہلے وقت میں نماز پڑھ لیا کرتے تھے۔ یہ کلام بالکل درست اور صحیح ہے۔اس لیے کہ اس نماز کے لیے رات کا آخری حصہ افضل ہے جیسے عشاء کی نماز کے لیے پہلا وقت افضل ہے۔ اور مفضول وقت کے ساتھ کبھی کوئی ایسا عمل خاص ہو سکتا ہے جس کا دوسرے وقت کی نسبت اسی وقت میں کرنا افضل ہو۔ جیسا کہ عرفات اور مزدلفہ میں دو دو نمازیں جمع کرکے پڑھنا ہی افضل ہے؛ کیونکہ اس کے سبب نے ایسا کرنا واجب کر دیا ہے۔ اگرچہ اصل یہ تھا کہ ظہر کو اس کے پہلے وقت میں ادا کرنا ہی افضل ہے لیکن گرمیوں کی شدت کی صورت میں اسے ٹھنڈا کرکے پڑھنا افضل ہے۔

جب کہ جمعہ کے دن زوال کے بعد نماز جمعہ پڑھ لینا افضل ہے۔ جمعہ کے دن ٹھنڈی ہونے تک کا انتظار کرنا افضل نہیں۔اس لیے کہ ایسا کرنے میں لوگوں پر مشقت ہے۔عشاء کی نماز میں ایک تہائی رات تک تأخیر کرنا افضل ہے۔ ہاں اگر لوگ جمع ہو جائیں اور ان پر انتظار کرنا شاق گزر رہا ہو تو پھر اس سے پہلے وقت میں ادا کر لینا افضل ہے۔ایسے ہی اگر رمضان کے نصف کے بعد لوگوں کے اجتماع کا مسئلہ بھی ہے۔

سنن میں حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''دو آدمیوں کا مل کر نماز ادا کرنا اکیلے ادا کرنے کی نسبت زیادہ پاکیزہ ہے۔'' اور تین آدمیوں کا ملکر نماز پڑھنا اس سے زیادہ بہتر ہے۔ اور جتنا ہی یہ تعداد زیادہ ہوگی اللہ کے ہاں اتنی زیادہ محبوب ہے۔''[1]

یہی وجہ ہے کہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ جب صبح کی نماز پڑھاتے تو اسے خوب روشنی تک جاری رکھتے ؛ تاکہ لوگوں کی زیادہ تعداد جمع ہو جائے ؛ اگرچہ افضل اندھیرے میں ہی نماز پڑھا لینا تھا۔

یہ بات نص اور اجماع سے کہ کبھی مفضول وقت کسی ایسے فعل کے ساتھ خاص ہوتا جس کا کرنا اسی وقت میں افضل ہوتا ہے۔

جب کہ نماز چاشت کے بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی کوئی خصوصیت نہیں۔ بلکہ صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے کہ: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے وصیت کی کہ میں ہر ماہ تین دن کے روزے رکھا کروں' اور چاشت کی دو رکعت نماز پڑھا کروں' اور سونے سے پہلے وتر پڑھ لیا کروں۔''[2]

صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ جیسی روایت حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ نیز حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''ہر صبح تم میں سے ہر ایک کے ہر جوڑ پر صدقہ ہوتا ہے۔ ہر تسبیح کہنا صدقہ ہے؛ اللہ کی حمد بیان کرنا صدقہ ہے؛ لا إلہ إلا اللہ کہنا صدقہ ہے؛ اللہ اکبر کہنا صدقہ ہے؛ نیکی کا حکم دینا صدقہ ہے؛ برائی سے منع کرنا صدقہ ہے۔اور ان تمام کی جگہ چاشت کی دو رکعت نماز کفایت کر جاتی ہیں۔''[3]

---

[1] سنن أبي داؤد 'كتاب الصلاة' باب فضل صلاة الجماعة ١/ ١٥١۔ وسنن النسائي كتاب الإمامة باب: الجماعة إذا كانوا اثنين ٢/ ١٠٤۔ وصححه الألبانى في صحيح الجامع الصغير ٢/ ٢٥٤۔ [2] البخارى 'كتاب الصوم' باب صيام أيام البيض ٢/ ٥٧۔ ومسلم 'كتاب صلاة المسافرين و قصرها' باب استحباب صلاة الضحى ؛ ١/ ٤٩٩۔ سنن أبي داؤد ٢/ ٨٩۔ كتاب الوتر ' باب في الوتر قبل النوم۔ [3] مسلم 'كتاب صلاة المسافرين و قصرها' باب استحباب صلاة الضحى ؛ ١/ ٤٩٩۔ سنن أبي داؤد ٢/ ٨٩۔ كتاب الوتر ' باب في الوتر قبل النوم۔

فصل:

[حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر اعتراضات]

[اعتراض] :شیعہ مصنف لکھتا ہے: چودھواں سبب: ''عثمان رضی اللہ عنہ نے بہت سے ناروا کام کیے تھے،ان کا کرنا ہرگز جائز نہ تھا۔ یہاں تک کہ سب مسلمان آپ پر اعتراض کرنے لگے اور آپ کو قتل کرنے پر متفق ہو گئے۔آپ کے قتل کرنے پر یہ اجماع آپ کی امامت اور صحابیت کے اجماع سے زیادہ تھا۔'' [انتہی کلام الرافضی]۔

[جواب]:اس کے جواب میں کئی نکات ہیں:

اول : یہ دعوی ایک کھلا ہوا جھوٹ[شیعہ کے جہل و افتراء کی کرشمہ سازی] ہے۔اس لیے کہ تمام لوگوں نے مدینہ میں اور باقی شہروں میں کامل اِتحاد اور یگانگت کے ساتھ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بیعت کی تھی۔آپ کی بیعت پر کسی نے کوئی اختلاف نہیں کیا؛ اور کوئی شخص بھی آپ کی بیعت سے پیچھے نہیں رہا تھا۔امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: کہ آپ کی بیعت دوسروں کی نسبت زیادہ پختہ اور مؤکدتھی۔ اس لیے کہ تمام لوگوں کا آپ پر اتفاق تھا۔[بخلاف ازیں بہت سے لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت میں شرکت نہیں کی تھی]۔

[یہ جھوٹ ہے کہ لوگ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے کے بارے میں متحد الخیال تھے]،آپ کو قتل کرنے والے چند باغی اور ظالم لوگ تھے۔یہی وجہ ہے کہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ پر لعنت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''وہ چوروں کی طرح بستی کی پچھلی جانب سے داخل ہوئے۔اللہ ان کو ہر طرح سے غارت کرے۔ان میں سے وہی لوگ بھاگنے میں کامیاب ہوئے جو راتوں رات بھاگ گئے تھے[اور مسلمانوں کو خبر بھی نہ تھی]۔''

یہ بات تو تواتر کے ساتھ معلوم ہے کہ شہروں کے رہنے والے آپ کے قتل میں شریک نہ تھے۔اور جتنے لوگوں نے آپ کی بیعت کی تھی؛ انہوں نے تو آپ کو قتل نہیں کیا تھا۔اور سابقین اوّلین صحابہ میں سے کوئی بھی قتل عثمان رضی اللہ عنہ میں شریک نہ تھا۔ حالانکہ یہ سبھی لوگ آپ کی بیعت میں شریک ہوئے تھے۔بلکہ آپ کو قتل کرنے والوں کی تعداد بیعت کرنے والوں کی تعداد کا سوواں حصہ بھی نہ تھی۔تو پھر یہ بات کیسے کہی جاسکتی ہے کہ آپ کو قتل کرنے پر بیعت سے زیادہ بڑا اجماع ہوا تھا۔یہ بات صرف وہی انسان کہہ سکتا ہے جو تاریخی حقیقت سے بالکل جاہل ہو اور سب سے بڑا جھوٹا اور مکار ہو۔

دوم :حضرت علی رضی اللہ عنہ سے لڑنے اور ان پر طعن و تشنیع کرنے والوں کی تعداد قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ سے کئی گنا زیادہ تھی۔اور جن لوگوں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جنگیں لڑیں،ان کی تعداد بھی قاتلین عثمان سے کئی گنا زیادہ تھی۔آپ کے لشکر کے ہزاروں آدمی ان ہی لوگوں میں سے تھے جنہوں نے آپ کو کافر قرار دیا اور آپ کے خلاف خروج کیا تھا۔اور کہنے لگے: آپ اسلام سے مرتد ہو چکے ہیں۔ہم اس وقت تک آپ کی اطاعت نہیں کریں گے جب تک آپ دوبارہ اسلام میں داخل نہ ہوں۔آخر کار ان ہی لوگوں میں سے آپ کو قتل کرنے کی حلت کا اعتقاد رکھتے ہوئے؛ اور اس قتل سے اللہ تعالیٰ کی قربت کے حصول کی امید پر آپ کو قتل کیا۔[چنانچہ آپ بھی اپنے پھوپھی زاد بھائی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرح شہادت حاصل کی۔اللہ ان کے قاتل کو غارت کرے]۔آپ کے قاتل کا عقیدہ قاتلین عثمان کے عقیدہ سے بھی زیادہ برا تھا۔

جن لوگوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف خروج کیا تھا' وہ آپ کے کفر کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ بلکہ وہ ظلم کا دعوی [اور شکایت] کرتے تھے۔ جب کہ خوارج علی الاعلان حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کافر کہتے تھے۔ ان کی تعداد بھی ان لوگوں کی نسبت بہت زیادہ تھی جن لوگوں نے آ کر مدینہ کا محاصرہ کرلیا تھا یہاں تک کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کر دیا گیا۔

اگر یہ بات حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر قدح کرنے میں حجت ہوسکتی ہے؛ تو خوارج کا دعوی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قتل میں بطریق اولیٰ حجت ہوسکتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ دونوں باطل دعوے ہیں۔ لیکن قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کی حجت قاتلین علی رضی اللہ عنہ کی حجت سے زیادہ بودی اور بے کار ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مخالفین اور آپ سے لڑنے والے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مخالفین و قاتلین سے کئی گنا زیادہ تھے۔ بلکہ جن لوگوں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جنگ لڑی وہ باتفاق مسلمین قاتلین ومحاصرین عثمان سے کئی درجہ افضل تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جنگ لڑنے والوں میں عابد و زاہد لوگ بھی تھے۔ قاتلین عثمان میں نہ ہی دیندار لوگ تھے اور نہ ہی وہ مقاتلین علی رضی اللہ عنہ کی طرح تکفیر کا اظہار کرتے تھے۔ حالانکہ ہمارا ایمان ہے کہ حضرت خلیفہ راشد ہیں' اور ان کے خون کو حلال جاننے والے ظالم وسرکش باغی تھی۔ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلین ان سے بڑے ظالم وسرکش تھے۔

سوم: یہ کہ: یہ بات تواتر کیساتھ معلوم ہے کہ تمام مسلمانوں نے اتفاق کیساتھ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی تھی۔ اور کوئی ایک بھی آپ کی بیعت سے پیچھے نہیں رہا۔ حالانکہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت سے حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ پیچھے رہ گئے تھے۔ انہوں نے نہ ہی آپ کی اور نہ ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بیعت کی۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کا تخلف آپ کی خلافت میں قادح نہیں ہوسکتا؛ اس لیے کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے خود ان پر کوئی تنقید نہیں کی؛ اور نہ ہی آپ کے افضل المہاجرین ہونے کا انکار کیا ہے۔ بلکہ یہ ساری چیزیں وہ لوگ جانتے تھے؛ مگر ان کا مطالبہ تھا کہ ایک امیر انصار میں سے ہو۔ یہ بات نصوص متواترہ سے ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: "الأئمة من قریش ۔" "ائمہ قریش میں سے ہوں گے۔"

اس معلوم شدہ نص کی بنا پر حضرت سعد رضی اللہ عنہ کا گمان غلط تھا۔ تو نص سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ آپ کا بیعت سے پیچھے رہنا غلطی تھا۔ اور جب نص سے غلطی ثابت ہوجائے تو پھر اجماع میں اس سے حجت نہیں لی جاسکتی۔

جب کہ حضرت عثمان کے دور میں خلافت اسلامیہ کے افریقہ سے لیکر خراسان تک؛ اور شام کے ساحلوں سے لیکر یمن کی آخری حدوں تک پھیلے ہوئے ہونے کے باوجود کوئی ایک بھی آپ کی بیعت سے پیچھے نہیں رہا۔ اس وقت مسلمان اپنے اہل کتاب ومشرکین پر غالب تھے اور ان سے جنگیں بھی لڑ رہے تھے۔ اس سے فتح ونصرف میں اضافہ ہوا۔ ملک کو دوام ملا۔ اور چھ سال یعنی خلافت کے نصف عرصہ تک مسلمان آپ کی بیعت پر قائم رہے؛ آپ کی مدح اور ثنا کرتے اور تعظیم سے پیش آتے تھے۔ اس دوران کسی ایک نے بھی آپ کی شان میں کوئی ایک کلمہ تک بھی نہیں کہا۔

پھر اس کے بعد کچھ لوگ آپ پر باتیں کرنے لگے۔ جب کہ جمہور مسلمین خیر کے علاوہ کچھ بھی نہیں کہتے تھے۔ آپ کی امارت کا عرصہ لوگوں پر طویل ہوگیا تھا۔ اس لیے کہ آپ بارہ سال تک امیر المؤمنین رہے۔ خلفاء اربعہ میں سے کسی ایک کو بھی اتنا عرصہ خلافت کرنے کا موقع نہیں ملا جتنا لمبا عرصہ آپ کو موقع ملا تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت دو سال چار ماہ تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت دس سال اور کچھ ماہ رہی ۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت چار سال اور کچھ عرصہ رہی۔ آپ کے عہد

خلافت میں وہ لوگ بھی پروان چڑھے جو مجبوراً اسلام کا اظہار کر رہے تھے؛ مگر حقیقت میں وہ منافق تھے۔ جیسا کہ عبداللہ بن سباء؛ اور اس کے امثال وہمنوا۔ اور یہی وہ لوگ تھے جو آپ کے قتل کی سازش کے پیچھے بطور محرک کام کر رہے تھے۔ ادھر اہل ایمان میں ایسے لوگ بھی موجود تھے [جو بغیر کسی تحقیق] منافقین کی باتیں سن لیا کرتے تھے۔ جیسا کہ فرمان الٰہی ہے:

﴿لَوْ خَرَجُوْا فِيْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا وَّ لَاَاوْضَعُوْا خِلٰلَكُمْ يَبْغُوْنَكُمُ الْفِتْنَةَ وَ فِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ﴾ [التوبة ۴۷]

''اگر وہ تم میں نکلتے تو خرابی کے سوا تم میں کسی چیز کا اضافہ نہ کرتے اور ضرور تمھارے درمیان (گھوڑے) دوڑاتے، اس حال میں کہ تم میں فتنہ تلاش کرتے، اور تم میں کچھ ان کی باتیں کان لگا کر سننے والے ہیں۔''

یعنی تم میں ایسے لوگ بھی ہیں جو ان کی باتیں سنتے ہیں اور پھر ان کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ اور ان کی باتیں مان لیتے ہیں۔ حالانکہ وہ ان پر کلام کو ملتبس کر دیتے ہیں۔

یہ منافقین کا کردار رہا ہے کہ انہوں نے محبین عثمان رضی اللہ عنہ پر معاملہ ملتبس کر دیا۔ اور بغض رکھنے والے بغض میں بڑھ گئے؛ یہاں تک کہ لوگ آپ کی نصرت کرنے کے لیے کما حقہ کھڑے نہ ہو سکے۔

جو لوگ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے کے لیے جمع ہوئے تھے' وہ بعض قبائل کے اوباش نوجوان تھے۔ جن کا اسلام میں کوئی ذکر خیر تک نہیں تھا۔ اگر یہ فتنہ پیش نہ آیا ہوتا تو شاید لوگ ان کے نام سے بھی واقف نہ ہوتے۔

جب کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ جب سے مسند خلافت پر متمکن ہوئے تو آپ کی بیعت سے آدھے سے زیادہ مسلمان سابقین اولین مہاجرین و انصار اور دوسرے لوگ پیچھے رہے۔ جو لوگ بالکل بیٹھ گئے تھے اور انہوں نے آپ سے جنگ نہیں اور نہ ہی آپ کے ساتھ مل کر جنگ کی' ان میں حضرت اسامہ بن زید؛ حضرت عبداللہ بن عمر؛ حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہم وغیرہ شامل ہیں۔ اور ان میں سے بعض نے آپ سے جنگ لڑی۔

پھر آپ کی بیعت کرنے والے لوگوں میں سے بھی بہت سارے لوگوں نے اس بیعت سے رجوع کر لیا۔ اور ان میں سے بعض نے آپ کی تکفیر شروع کر دی؛ اور آپ کو حلال الدم کہنے لگے۔ اور ان میں سے بعض حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس چلے گئے جیسے آپ کے بھائی حضرت عقیل رضی اللہ عنہ اور اس طرح کے دوسرے لوگ۔ اور شیعان عثمان ہمیشہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر تنقید کرتے رہے۔ اور اس سے وہ دلیل لیتے رہے کہ آپ خلیفہ راشد نہیں ہیں۔ ان کی حجت بھی رافضیوں کی حجت سے بڑھ کر نہیں تھی۔ اگر ان لوگوں کی دلیل بودی اور بیکار ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ مظلوم شہید کیے گئے ہیں تو حضرت عثمان بطریق اولی مظلوم شہید ہوئے ہیں۔

فصل ششم:

امامت وخلافت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ

[اعتــــراض]: شیعہ مصنف رقم طراز ہے: چھٹی فصل: ابوبکر کی امامت کے دلائل فسخ ہونے کے بارے میں: انہوں [اہل سنت] نے کئی طرح سے استدلال کیا ہے۔

[اجماع پر رد؟]:

سب سے پہلی دلیل اجماع ہے۔اس کا جواب یہ ہے کہ: ہم اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت پر اجماع منعقد ہوا تھا؛ اس لیے کہ بنو ہاشم کی ایک جماعت ان کو خلیفہ تسلیم نہیں کرتی تھی۔ اکابر صحابہ میں سے حضرت سلمان، ابو ذر، مقداد، عمار، حذیفہ، سعد بن عبادہ، زید بن ارقم، اُسامہ، اور خالد بن سعید العاص رضی اللہ عنہم اجمعین ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ نہیں مانتے تھے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ کا والد بھی آپ کی خلافت کا منکر تھا۔ اس نے پوچھا: لوگوں نے کس کو خلیفہ منتخب کیا؟ لوگوں نے کہا:''تیرے بیٹے کو۔'' اس نے پوچھا:''ان دونوں کمزوروں کو کیا ہوا؟'' یہ حضرت علی اور عباس رضی اللہ عنہما کی طرف اشارہ تھا۔لوگوں نے بتایا کہ: وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تجہیز و تکفین میں مشغول ہو گئے تھے، ابوبکر رضی اللہ عنہ کو عمر میں بڑا سمجھ کر لوگوں نے امام بنالیا۔تو اس نے کہا: میں عمر میں اس سے بھی بڑا ہوں۔ بنو حنیفہ کا قبیلہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کا منکر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے آپ کو زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ یہاں تک ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان کو مرتد قرار دے کر ان کو قتل کیا اور قیدی بنایا۔ عمر رضی اللہ عنہ نے اس کی مخالفت کی اور اپنی خلافت کے زمانہ میں ان لونڈی غلاموں کو آزاد کر دیا تھا۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جــــواب]: ہم کہتے ہیں: الحمد للہ کہ اس ذات نے ان مرتدین کے بھائیوں کی حقیقت کو بھی آشکار کر دیا۔اب عوام وخواص میں یہ بات ظاہر ہوگئی ہے کہ یہ لوگ ان ہی مرتدین کے سچے بھائی ہیں۔اوران کی زبان سے ہی ان کے اسرار چاک کر کے انہیں رسوا کیا۔ بیشک اللہ تعالیٰ ان خائنوں کے چھپے رازوں سے آگاہ ہے؛ اور اللہ اور اس کے رسول ؛ اور اللہ کے نیک بندوں ؛ اہل اللہ ؛ متقین سے ان کی عداوت کو وہ آشکار کرتا رہتا ہے۔[جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے]:

﴿ وَمَنْ يُرِدِ اللّٰهُ فِتنته فَلَنْ تَمْلِكَ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا ﴾ [المائدۃ ۴۱]

''جس کا خراب کرنا اللہ کو منظور ہو تو آپ اس کے لئے خدائی ہدایت میں سے کسی چیز کے مختار نہیں۔''

ہم کہتے ہیں: سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے معمولی واقفیت رکھنے والا شخص بھی جب ایسی بات سنے گا تو وہ کہے گا: اس کلام کا کہنے والا یا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے احوال سے جاہل مطلق ہے یا پھر لوگوں میں سب سے زیادہ بہتان طرازی کا مرتکب ہے۔ میرا خیال ہے کہ: یہ مصنف اور اس کے امثال دیگر روافض جاہل اور اندھے ہیں، جو اپنے اسلاف کی کتابوں سے بغیر کسی تحقیق و اعتبار کے کلام نقل کر دیتے ہیں۔ان کی اسلامی تاریخ پر کوئی نظر نہیں ہوتی۔ اور نہ ہی اس موضوع پر لکھی ہوئی کتابوں

کے متعلق انہیں صحیح معنوں میں کوئی آ گاہی ہوتی ہے۔ پس یہ مصنف اور اس کے امثال جاہل کے جاہل ہی ہیں ۔نہ ہی انہیں معقول کا علم ہوتا ہے اور نہ ہی منقول کا۔اس میں کوئی شک نہیں کہ روافض کے شیوخ بہت زیادہ ہیں ۔ان میں سے اکثر لوگ خواہش پرست اور جاہل ہوتے ہیں ۔پس ان کی خواہشات کے مطابق جو کوئی بھی بات کہے وہ اسے مان لیتے ہیں اور اس کی تصدیق کرنے لگ جاتے ہیں۔[خواہ کہنے والا دجال ہی کیوں نہ ہو]۔اس کے سچ اور جھوٹ ہونے کی تحقیق نہیں کرتے۔ بخلاف ازیں جو ان کے افکار و معتقدات کے خلاف کوئی بات کہے وہ اس کی تکذیب کرتے ہیں خواہ وہ کتنا ہی حق گو کیوں نہ ہو،مگر انہیں سچ اور جھوٹ کی تحقیق سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔[ایسے لوگ کیوں کر فلاح پائیں گے اور جو اس مرض کا شکار ہو اس کی عافیت کی کیا امید کی جاسکتی ہے؟]۔شیعہ اس آیت کے مصداق ہیں:

﴿وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهٗ﴾ (العنکبوت:۶۸)

''اس شخص سے بڑا ظالم اور کون ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھے یا جب اسکے پاس حق آئے تو اس کی تکذیب کرے۔''

اہل علم و دین [اہل سنت] بحمد اللہ اس آیت کے مصداق ہیں:

﴿وَالَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَ صَدَّقَ بِهٖۤ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ﴾ (الزمر:۳۳)

''جو شخص حق کو لایا اور اس کی تصدیق کی وہی متقی ہیں۔''

❀ مصنف کی سب سے بڑی جہالت اور گمراہی یہ ہے کہ وہ کفر پر بنی حنیفہ اتفاق کو اجماع قرار دے رہا ہے۔اور کہتا ہے: بنو حنیفہ کو قتل کرنے اور قیدی بنانے اور مرتد قرار دینے کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کرنے اور زکوۃ دینے سے انکار کر دیا تھا۔اس سے پہلے بھی مصنف کا اس قسم کا کلام گزر چکا ہے۔

❀ ہر خاص و عام صاحب علم اس بات سے آگاہ ہے کہ بنو حنیفہ کافر تھے اور یمامہ سے نبوت کا دعوی کرنے والے مسیلمہ کذاب کی پیروی کرتے تھے۔اس مسیلمہ کذاب نے اپنے ایک خط میں دعوی کیا تھا کہ وہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ نبوت میں برابر کا شریک ہے۔اس نے نبی کریم ﷺ کی نبوت کے آخری ایام میں نبوت کا دعوی کیا تھا۔پس یہ مسیلمہ اور یمن کے شہر صنعاء میں اسود عنسی جس کا اصل نام عبہلہ تھا اور خلق کثیر نے اسود عنسی کی اتباع کر لی تھی؛ یہ لوگ قتل کئے گئے۔اسود عنسی کو اللہ تعالیٰ نے حضرت فیروز دیلمی کے ہاتھ پر قتل کیا۔اور اس کے اعوان و انصار بھی قتل ہوئے۔اس کے قتل کا واقعہ نبی کریم ﷺ کی زندگی کے آخری ایان میں پیش آیا۔اس قتل کی رات ہی نبی کریم ﷺ نے اس کے قتل ہونے کی خبر دیدی تھی اور فرمایا تھا:''اسے نیک گھر والوں میں سے ایک نیک انسان نے قتل کیا ہے۔''[1]

اسود عنسی نے علیحدہ سے نبی ہونے کا دعوی کیا تھا؛ اس نے صرف شراکت داری پر اکتفاء نہیں کیا تھا۔اور یمن پر غلبہ پاکر وہاں سے رسول اللہ ﷺ کے عمال کو نکال دیا تھا۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اسے قتل کیا' اور مسلمانوں کو کئی معرکوں کے بعد

[1] اس کا ذکر ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''الاستعیاب'' میں کیا ہے؛ علی ہامش الاصابۃ ۳/۲۰۲۔ابن عمر سے روایت ہے: جس رات اسود عنسی قتل ہوا' رسول اللہ ﷺ کے پاس آسمانوں سے خبر پہنچ گئی۔آپ ہمیں بشارت سنانے کے لیے باہر نکلے ۔آپ ﷺ نے فرمایا ہے:''آج رات اسود قتل ہوگیا اور اسے ایک مبارک گھرانے کے مبارک انسان نے قتل کیا ہے۔'' صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا: یارسول اللہ ﷺ! اسے کس نے قتل کیا؟ آپ نے فرمایا: فیروز الدیلمی نے۔''

اس پر فتح عطا فرمائی ۔ یہ واقعات اہل علم کے ہاں مشہور و معروف ہیں۔
جب کہ مسیلمہ کذاب نے نبوت میں شراکت کا دعویٰ کیا تھا۔اور یہ انسان حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ایام تک زندہ رہا۔صحیح بخاری میں ہے: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے خبر دی ہے کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
''میں سو رہا تھا تو میں نے اپنے ہاتھ میں سونے کے دو کنگن دیکھے تو مجھے فکر ہوئی اور خواب میں وحی آئی کہ آپ ان کو پھونک دیجئے، میں نے ان کو پھونک دیا تو وہ اڑ گئے میں نے اس کی تعبیر ان دو کذابوں سے لی جو میرے بعد ظاہر ہوں گے پس ان میں سے ایک صنعاء [کا اسود عنسی] اور دوسرا یمامہ کا [رہنے والا مسیلمہ کذاب] تھا۔'' [بخاری:ح ٨٤١]
مسیلمہ کے واقعات؛ اس کا نبوت کا دعویٰ کرنا' بنی حنیفہ کا اس کا اتباع کرنا اتنی مشہور خبریں ہیں جو صرف ایسے انسان سے مخفی رہ سکتی ہیں جو علم و معرفت سے انتہائی دور اور بیگانہ ہو۔
مسیلمہ کذاب کی خبریں مسلمان تو مسلمان یہود و نصاریٰ تک جانتے ہیں۔اور اس نے اپنا جو قرآن پیش کیا تھا اس کی کئی سورتیں آج تک لوگوں کو یاد ہیں۔مثال کے طور پر وہ کہتا ہے:
جس میں یہ کہتا ہے:
١ ...... "یَا ضِفْدَعُ بِنْتُ ضِفْدَعَ عَنِّیْ نَقِّیْ کَمْ تَنَقِّیْنَ ، لا الْمَاءَ تُکَدِّرِیْنَ وَ لا الشَّارِبَ تَمْنَعِیْنَ ، رَاسُكِ فِی الْمَاءِ وَ ذَنْبُكِ فِی الطِّیْنِ۔
''اے مینڈک کی دو مینڈکوں کی بیٹی! تم چلاؤ کتنا چلاؤ گی۔نہ ہی تم پانی کو گدلا کرتی ہو اور نہ ہی پینے والے کو روکتی ہو تمہارا سر پانی میں ہے اور دم مٹی میں ہے۔''
اس کی جھوٹی وحی میں یہ بھی تھا:
٢ ...... "اَلْفِیْلُ مَا الْفِیْلُ وَ مَا اَدْرَاكَ مَا الْفِیْلُ ، لَهٗ زَلُوْمٌ طَوِیْلٌ ، اِنَّ ذَالِكَ مِنْ خَلْقِ رَبِّنَا لقلیل"
''ہاتھی؛ ہاتھی کیا ہے اور تمہیں کیا پتہ ہاتھی کیا ہے' اس کی ایک لمبی سونڈ ہے۔بیشک یہ ہمارے رب کی تخلیق میں بہت کم ہے۔
٣ ...... "إنا أعطیناك الجماهر فصل لربك و هاجر و لا تطع كل ساحر وكافر۔"
''بیشک ہم نے آپ کو جواہر عطا کیے ہیں۔آپ اپنے رب کی نماز پڑھو اور ہجرت کرو؛ کسی بھی جادوگر اور کافر کی بات مت مانو۔''
٤ ......" والطاحنات طحناً فالعاجنات عجناً فالخابزات خبزاً إهالة و سمناً إن الأرض بیننا و بین قریش نصفین ، ولكن قریشاً قوم لا یعدلون ."
''اور قسم ہے چکی پینے والیوں کی جب وہ چکی پیسیں؛ اور آٹا گوندھنے والیوں کی جب وہ آٹا گوندھیں۔اور روٹیاں پکانے والوں کی جب وہ روٹیاں پکائیں؛ اور پھر ان پر گھی اور سالن ڈالیں۔بیشک زمین ہمارے اور قریش کے مابین آدھی آدھی ہے؛ مگر قریش کے لوگ انصاف نہیں کرتے۔''

مسیلمہ نے جو قرآن مرتب کیا تھا، وہ حد درجہ مضحکہ انگیز اور اس کی حماقت و سفاہت کا آئینہ دار تھا۔ جب مسیلمہ کے قتل کے بعد بنو حنیفہ کا وفد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں پیش ہوا تو آپ نے ان سے مسیلمہ کا کچھ کلام سنانے کو کہا۔ جس پر انہوں نے یہ کلام سنایا تو آپ نے فرمایا:

''تمہارے لیے ہلاکت ہو! مسیلمہ تمہاری عقلوں کو کہاں لیے جا رہا ہے، یہ کلام اللہ کا نازل کردہ نہیں۔''

اس مسیلمہ کذاب نے نبی کریم ﷺ کو آپ کی زندگی میں یہ خط بھی لکھا تھا:

''مسیلمہ رسول اللہ کی طرف سے محمد رسول اللہ کی طرف؛ امابعد:

''بیشک میں اس امر [نبوت و رسالت] میں آپ کا شریک ہو چکا ہوں۔''

رسول اللہ ﷺ نے اس کا جواب دیتے ہوئے یہ خط تحریر فرمایا:

''محمد رسول اللہ کی طرف سے مسیلمہ کذاب کی جانب۔''

جب مسیلمہ کذاب کا نمائندہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے فرمایا: کیا تم بھی یہ گواہی دیتے ہو کہ مسیلمہ اللہ کا رسول ہے؟ اس نے کہا: ہاں۔ تو آپ نے فرمایا: اگر ایسا نہ ہوتا کہ سفیروں کو قتل نہیں کیا جاتا تو میں تمہاری گردن مار دیتا۔ پھر ان دو سفیروں میں سے ایک کوفہ میں ملا' جسے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کے اس قول کی بنیاد پر قتل کر دیا۔ [1]

مسیلمہ کذاب اس سے پہلے بنو حنیفہ کے وفد کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام کا اظہار کر چکا تھا۔ پھر جب واپس اپنے علاقہ میں چلا گیا تو اپنی قوم کے لوگوں سے کہنے لگا: ''مجھے محمد نے اپنے ساتھ نبوت میں شریک کر لیا ہے۔'' اور اس پر دو آدمی گواہ بھی پیش کیے۔ ان میں سے ایک رحال بن عنفوۃ تھا۔ اس نے اس بات کی گواہی دی۔ یہ بھی روایت کیا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے تین آدمیوں سے جن میں ایک ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور دوسرا یہی رحال بن عنفوۃ تھا؛ فرمایا تھا: ''تم میں سے ایک آدمی کی داڑھیں جہنم میں فلاں اور فلاں سے بڑی ہیں۔'' [2]

ان میں سے ایک کو اللہ کی راہ میں شہادت نصیب ہوگئی۔ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اسی طرح لرزاں و ترساں رہے یہاں تک کہ مسیلمہ کذاب نے نبوت کا دعوی کیا تو اس رحال نے اس کے نبی ہونے کی گواہی دی اور اس کی اتباع اختیار کر لی۔ اب اس میں کوئی شک باقی نہ رہا ہے فرمان نبوت سے مراد یہی رحال بن عنفوہ تھا۔

---

[1] اس کی تفصیل کے لیے دیکھیں: سیرت نبوی از ابن کثیر ٤/ ٩٧۔ سیرت ابن ھشام ٤/ ٢٤٧۔ إمتاع الأسماع ٥٠٨۔ زاد المعاد ٣/ ٦١٠۔

[2] علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے سیرت نبویہ ۴/ ۹۷ پر لکھا ہے: ''امام سہیلی اور دوسرے سیرت نگاروں نے ذکر کیا ہے کہ: اس رحال بنو عنفوہ کا اصل نام نہار تھا۔ اس نے اسلام قبول کیا' اور کچھ قرآن بھی سیکھا؛ اور ایک مدت تک رسول اللہ ﷺ کی صحبت میں بھی رہا۔ نبی کریم ﷺ کا ان پر گزر ہوا تو یہ تین افراد بیٹھے ہوئے تھے: فرات بن حیان' ابو ہریرہ اور رحال بن عنفوہ۔ اس وقت رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم میں سے ایک آدمی کی داڑھیں جہنم میں فلاں اور فلاں سے بڑی ہیں۔'' پس یہ دونوں مخلص صحابی ڈرنے لگ گئے۔ یہاں تک کہ رحال بھی مسیلمہ کذاب کے ساتھ مرتد ہو گیا۔ اور نبی کریم ﷺ پر جھوٹی گواہی دی کہ آپ نے مسیلمہ کو اپنے ساتھ نبوت میں شریک کر لیا ہے۔ اور جو کچھ قرآن اسے یاد تھا اسے لوگوں میں سنا کر مسیلمہ کی طرف منسوب کرنے لگا۔ اس طرح بنی حنیفہ میں بہت بڑا فتنہ پیدا ہوا۔ جنگ یمامہ کے موقع پر زید بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اسے قتل کیا۔

مسیلمہ کا مؤذن جب اذان دیتا تو کہتا: ''أشهد أن محمداً و مسیلمه رسولا الله۔''
''میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد اور مسیلمہ دونوں اللہ کے رسول ہیں۔''

[بنو حنیفہ کا ارتداد اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ]:

امت کے اولین و آخرین کے نزدیک بنو حنیفہ کا قتل اور ان کا قیدی بنانا حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کا عظیم کارنامہ ہے۔اس لیے کہ لوگوں میں سب سے بڑے مرتد بنی حنیفہ تھے۔آپ نے عدم ادائیگی زکوٰۃ کی بنا پر ان کو قتل نہیں کیا تھا، بلکہ اس لیے قتل کیا تھا کہ وہ مسیلمہ کذاب پر ایمان لائے تھے۔ان کی تعداد ایک لاکھ کے لگ بھگ تھی۔حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بیٹے محمد بن حنفیہ کی ماں بنو حنیفہ ہی میں سے آپ کی باندی تھی۔اس سے ان لوگوں نے استدلال کیا ہے جو کہ مرتد خواتین کو قیدی بنانے کو جائز کہتے ہیں؛ جب کہ مرتدین اہل حرب میں سے ہوں۔اگر یہ لوگ مسلمان اور معصوم الدم تھے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے کیسے یہ جائز ہوگیا کہ ان کی عورتوں کو قیدی بھی بنائیں اور پھر ان سے ہم بستری بھی کریں۔

جن قبائل کے خلاف حضرت صدیق عدم ادائیگی زکوٰۃ کی بنا پر نبرد آزما ہوئے تھے وہ بنو حنیفہ کے علاوہ دیگر قبائل تھے۔ انھوں نے بالکل ترک زکوٰۃ کو مباح قرار دیا تھا؛ اور کلیۃً زکوٰۃ کی ادائیگی کا انکار کردیا تھا؛ اس لیے ان کے خلاف اس بات پر جنگ آزمائی کی نوبت آئی۔جنگ کی وجہ یہ نہیں تھی کہ زکوٰۃ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تک پہنچائی جائے۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے اتباع کار جیسے حضرت امام ابوحنیفہ و احمد بن حنبل اور دیگر ائمہ رحمہم اللہ کا خیال ہے کہ جب کوئی قوم یہ کہے کہ ہم زکوٰۃ دینے کے لیے تیار ہیں، مگر ہم فلاں امام کو نہیں دیں گے،تو ان کے خلاف صف آرائی جائز نہیں۔

اور یہ بھی علم میں ہونا چاہیے کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے جنگ کرنے کی وجہ زکوٰۃ کی ادائیگی کا بالکل انکار تھا۔یہ وجہ نہیں تھی کہ وہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو زکوٰۃ ادا نہیں کررہے۔

بلکہ اگر یہ شیعہ مصنف حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت نہ کرنے والوں کو یہود و مجوس اور نصاریٰ کے برابر کرتا؛ تو یہ بھی ایسا ہی ہوتا جیسے وہ بنو حنیفہ کو شمار کررہا ہے۔بلکہ بنو حنیفہ بعض وجوہات کی بنا پر یہود و نصاریٰ اور مجوس سے بڑے کافر تھے۔اس لیے کہ وہ پیدائشی کافر ہیں اور یہ مرتد کافر تھے۔پیدائشی کافر کو جزیہ پر برقرار رکھا جاسکتا ہے؛ جب کہ انہیں جزیہ پر برقرار نہیں رکھا جاسکتا۔اور ان لوگوں کے پاس کتاب یا شبہ کتاب موجود ہے' اور ان کے پاس کوئی کتاب نہیں۔یہ لوگ ایک جھوٹے مفتری کے پیروکار تھے؛ لیکن ان کا مؤذن یہ نداء لگایا کرتا تھا:: ''أشهد أن محمداً و مسیلمه رسولا الله۔''
''میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد اور مسیلمہ دونوں اللہ کے رسول ہیں۔''
اس طرح یہ لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اور مسیلمہ کذاب کو برابر کردیتے تھے۔

مسیلمہ کذاب کا معاملہ تمام ان کتابوں میں مشہور و معروف ہے جن میں ایسے واقعات ذکر کئے جاتے ہیں؛ مثلاً کتب تفسیر؛ حدیث؛ مغازی؛ فتوح؛ فقہ اور اصول اور علم کلام وغیرہ۔حتی کہ تاریخ اسلام میں یہ واقعہ اس قدر مشہور ہے کہ پردہ نشینان حرم بھی اس سے آگاہ ہیں۔[پھر شیعہ مصنف کی اس واقعہ سے بے خبری بڑی حیرت کی موجب ہے]۔تاریخی واقعات جمع کرنے والوں نے اس مسئلہ پر مستقل کتابیں لکھی ہیں: سیف بن عمر رضی اللہ عنہ کی کتاب الرِدۃ اور الواقدی کی کتاب الردۃ؛ اور

دوسرے مصنفین کی کتابیں جن سے سب لوگ واقف ہیں، جن میں اہل ارتداد کے ساتھ جنگوں اور ان واقعات کا ذکر ہے۔ ایسے واقعات مغازی رسول اور فتوح شام جیسی کتابوں میں بھی موجود ہیں۔[مگر یہ شیعہ ان کتب سے بھی نابلد ہے، ورنہ بنو حنیفہ کے ارتداد سے جاہل نہ رہتا]۔

ان میں سے بعض واقعات ایسے ہیں جو کہ خواص وعوام کے ہاں تواتر کے ساتھ مشہور ہیں ؛ اور بعض واقعات ثقہ راویوں نے نقل کئے ہیں۔ اور بعض ایسی مراسیل اور منقطع اخبار ہیں جن کے سچ یا جھوٹ ہونے کا احتمال ہے؛ اور بعض روایات کے متعلق صاف واضح طور پر معلوم ہے کہ یہ جھوٹے اور من گھڑت واقعات ہیں۔

لیکن حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا مسیلمہ کذاب سے قتال اور جنگیں ایسے مشہور ہیں جیسے ہرقل' قیصر اور کسری اور دیگر ان اقوام کے ساتھ جنگوں کے واقعات مشہور ہیں جن سے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ عمر فاروق یا حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہم اجمعین نے جنگیں کیں اور جیسے ان مشرکین و یہود لوگوں کے کفر کا تواتر کیساتھ مشہور ہے جن سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگیں لڑیں مثلاً : عتبہ؛ ابی بن خلف ؛ حیی بن اخطب وغیرہ۔ اور جیسے عبداللہ بن ابی ابن سلول اور دیگر کے نفاق کا تواتر کے ساتھ مشہور ہے۔

بلکہ مسیلمہ کے ارتدار اور حضرت صدیق اکبر کے اس کے ساتھ قتال کا تواتر لوگوں میں جمل اور صفین ؛ اور طلحہ وزبیر کے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ قتال ؛ اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ اور دیگر لوگوں کے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت سے پیچھے رہ جانے کے تواتر سے بڑھ کر مشہور ہے۔

صحیحین میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں مسیلمہ کذاب نے آ کر عرض کیا کہ:'' اگر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے بعد مجھے خلافت عطا کر دیں تو میں ان کا تابع ہو جاتا ہوں اور وہ اپنی قوم کے بہت لوگوں کو اپنے ساتھ لایا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی طرف چلے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ حضرت ثابت بن قیس بن شماس رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک میں ایک لکڑی کا ٹکڑا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسیلمہ کذاب کے پاس معہ اصحاب جا کر کھڑے ہو گئے اور فرمایا:

''اگر تو مجھ سے بقدر اس لکڑی کے ٹکڑے کے طلب کرے تو میں تجھ کو نہ دوں گا اور خدا تعالیٰ کا جو حکم تیرے بارے میں ہو چکا ہے تو اس سے تجاوز نہیں کر سکتا۔ اور اگر تو کچھ روز زندہ رہا تو خدا تجھ کو ہلاک کر دے اور یقیناً میں تجھ کو وہی شخص سمجھتا ہوں جس کی نسبت میں نے خواب میں دیکھا ہے۔ اور یہ ثابت رضی اللہ عنہ ہے جو تمہیں میری طرف سے جواب دے گا۔

پھر آپ وہاں سے پلٹ گئے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان:

''اور یقیناً میں تجھ کو وہی شخص سمجھتا ہوں جس کی نسبت میں نے خواب میں دیکھا ہے'' کے بارے میں پوچھا؛ تو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے مجھے خبر دی کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ:

''میں سو رہا تھا تو میں نے اپنے ہاتھ میں سونے کے دو کنگن دیکھے تو مجھے فکر ہوئی اور خواب میں وحی آئی کہ آپ ان کو پھونک دیجئے، میں نے ان کو پھونک دیا تو وہ اڑ گئے میں نے اس کی تعبیر ان دو کذابوں سے لی جو میرے بعد ظاہر ہوں گے پس ان میں سے ایک عنسی اور دوسرا یمامہ کا رہنے والا مسیلمہ کذاب تھا۔'' [صحیح بخاری:حدیث نمبر ۸٤١]

[مرتدین کے خلاف جنگ اور موقف فاروقی]:

[اشکال]: شیعہ مصنف کا یہ قول کہ: ''عمر رضی اللہ عنہ نے مرتدین کے خلاف جنگ آزما ہونے پر اعتراض کیا تھا۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جواب]: یہ بہت بڑا جھوٹ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر صریح بہتان ہے۔ بلکہ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کا [مرتدین] مسیلمہ اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ جنگ پر اتفاق تھا۔لیکن ایک دوسرا گروہ تھا جو اسلام کا اقرار کرتے تھے ؛ مگر زکوٰۃ ادا کرنے کا انکار کرتے تھے' ان کے بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بلاشبہ توقف کیا تھا۔اس لیے کہ شروع میں آپ کے دل میں شبہ تھا مگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے تبادلہ افکار کرنے پر حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں سے قتال کے واجب ہونے کو واضح کیا؛ تو بعد میں آپ نے اپنے زاویۂ نگاہ سے رجوع کر لیا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ متفق ہو گئے تھے۔ یہ قصہ بڑا مشہور ہے۔

صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' آپ فرماتے ہیں: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے کہا:

((كيف تقاتل الناس وقد قال رسول الله صلى الله عليه وسلم:" أمرت أن أقاتل الناس حتى يقولوا لا إله إلا الله؛ فإذا قالوا عصموا منى دمائهم و أموالهم إلا بحقها وحسابهم على الله .)) قال أبوبكر رضي الله عنه: ألم يقل بحقها؟ فإن الزكوٰة من حقها۔ والله لو منعوني عناقا كانوا يؤدونها إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم لقاتلتهم على منعها))۔ قال عمر رضي الله عنه فوالله ما هو إلا أن رأيت الله قد شرح اللهصدر أبي بكر رضي الله عنه: فعرفت أنه الحق))

''آپ ان لوگوں سے کس طرح جنگ کریں گے حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:''میں حکم دیا گیا ہوں کہ لوگوں سے جہاد کروں یہاں تک کہ وہ لا الہ الا اللہ کہیں ؛ جب وہ یہ کلمہ کہہ دیں تو مجھ سے اپنا جان و مال بچالیں گے مگر اس کے حق کے عوض اور ان کا حساب اللہ کے ذمہ ہے۔'' حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:'' کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا:'' مگر اس کلمہ کے حق کے ساتھ۔'' بیشک زکوٰۃ بھی اس کلمہ کا حق ہے۔ واللہ اگر انہوں نے ایک رسی بھی روکی جو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں دیتے تھے تو اس کے نہ دینے پر میں ان سے جنگ کروں گا۔ عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ کی قسم! اللہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا سینہ کھول دیا تھا۔ تو میں نے جان لیا کہ یہی حق ہے۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس حدیث سے استدلال کیا جو آپ تک پہنچی تھی یا آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی تھی۔ تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے یہ واضح کر دیا ''کلمہ طیبہ کا حق'' زکوٰۃ کو بھی شامل ہے' اس لیے کہ مالی حق ہے۔''

صحیحین میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((أمِرت أن أقاتِل الناس حتى يقولوا: ألا إله إلا الله وأني رسول اللهِ، ويقِيموا الصلاة، ويؤتوا الزكاة، فإذا فعلوا ذلكِ عصموا مِني دِمائهم وأموالهم إلا بِحقِها))

''مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے اس وقت تک جنگ کروں یہاں تک کہ وہ کہہ دیں اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی معبود برحق نہیں' اور بیشک میں اللہ کا رسول ہوں۔ اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں۔ جب وہ ایسا کریں تو مجھ سے

اپنے خون اور اموال محفوظ کر لیں گے مگر اسلام کے حق کے ساتھ۔''

یہ دوسرا لفظ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی فقہ پر دلالت کرتا ہے۔ جو کہ مانعین زکوٰۃ سے قتل کے بارے میں صریح اور قرآنی تعلیمات کے عین مطابق ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ﴾ [التوبة ۵]

''تم قتل کرو ان مشرکوں کو جہاں بھی انہیں پاؤ انہیں پکڑو، ان کا گھیراؤ کرو، اور ان (کی خبر لینے) کیلئے بیٹھ جاؤ ہر گھات میں، پھر بھی اگر یہ لوگ توبہ کر لیں اور (اسلام لا کر) نماز قائم کریں، اور زکوٰۃ ادا کریں، تو تم خالی کر دو ان کا راستہ۔''

یہاں راستہ خالی کرنے کو ایمان؛ قیام نماز اور ادائیگی زکوٰۃ کے ساتھ معلق کر دیا گیا ہے۔

ان لوگوں کے بارے میں کئی واقعات مشہور ہیں۔ ان میں سے بعض لوگ ایسے تھے جنہوں نے زکوٰۃ وصول کر لی تھی؛ مگر جب انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر پہنچی تو انہوں نے لوگوں کو وصول کردہ زکوٰۃ واپس کر دی۔ اور بعض لوگ حالات کے منتظر تھے۔ پھر ان میں سے جن لوگوں کے ساتھ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جنگ کی تو پھر سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک کے عاملین زکوٰۃ ویسے ہی زکوٰۃ وصول اور خرچ کرنے لگ گئے جیسے آپ کے عہد میں کیا کرتے تھے۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے عاملین زکوٰۃ کے نام ایک خط لکھا تھا' جس میں انہوں نے لکھا تھا:

''بسم اللہ الرحمن الرحیم.

''زکوٰۃ وہ فریضہ ہے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرض کیا ہے اور اس کی ادائیگی کا حکم دیا ہے۔''

یہ خط اور اس جیسی دوسری دستاویز سے تمام علماء اسلام مسائل اخذ کرتے ہیں۔ آپ نے اپنی ذات کے لیے کچھ بھی نہیں لیا اور نہ ہی اپنے کسی قریبی کو کوئی عہدہ تفویض کیا؛ اور نہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایسی کوئی بات کی؛ بخلاف حضرت عثمان و علی رضی اللہ عنہما؛ ان دونوں حضرات نے اپنے قریبی رشتہ داروں کو بڑے بڑے منصب تفویض کئے تھے۔

اگر یہ جائز ہو سکتا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق اور عمر فاروق رضی اللہ عنہما پر اعتراض کیا جائے کہ انہوں نے مال لینے کے لیے ان سے قتال کیا تھا تو پھر کسی بھی دوسرے پر اس کی بہ نسبت بہت آسانی سے اعتراضات کئے جا سکتے ہیں۔ اور اگر حضرت عثمان و علی رضی اللہ عنہما کا دفاع واجب ہے تو پھر حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کا دفاع اس سے بھی بڑا واجب ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس لیے جنگ و قتال کیا کہ لوگ آپ کی اطاعت کریں' اور آپ ان کے جانوں اور اموال کے بارے میں فیصلے کر سکیں۔ پھر اس قتال کو کیسے دین پر قتال کہا جا سکتا ہے؟ جب ابوبکر رضی اللہ عنہ نے تو ان لوگوں سے جنگیں لڑی تھیں جو اسلام چھوڑ کر مرتد ہو چکے تھے؛ اور اللہ تعالیٰ کا ایک فریضہ ترک کر رہے تھے۔ آپ کی جنگ کا مقصد یہ تھا کہ لوگ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرنے لگ جائیں۔ تو پھر کیا یہ دین پر قتال نہیں ہو سکتا؟

شیعہ مصنف نے جن اکابر صحابہ کا نام لیکر بتایا ہے کہ انھوں نے حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت میں شرکت نہیں کی تھی؛ یہ ان لوگوں پر بہتان ہے؛ ان لوگوں کا بیعت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما میں شرکت کرنا اظہر من الشمس ہے، البتہ سعد بن عبادہ نے حضرت

ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت نہیں کی تھی۔ اس پر تمام سیرت نگاروں؛ مؤرخین؛ محدثین اور دیگر اہل علم کے سلف و خلف کا اتفاق ہے۔

حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ لشکر کے ساتھ اس وقت روانہ ہوئے تھے جب آپ نے حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی تھی۔ اسی لیے آپ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو یا خلیفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہہ کر مخاطب کر رہے تھے۔

باقی جن لوگوں کا ذکر رافضی مصنف نے کیا ہے؛ انہوں نے بیعت کر لی تھی سوائے حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہ کے۔ آپ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب تھے۔ جب آپ نے وفات پائی تو خالد رضی اللہ عنہ نے کہا: ''میں اور کسی کا نائب نہیں بننا چاہتا۔''

یہ کہہ کر آپ نے ولایت چھوڑ دی؛ ورنہ آپ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت کا اقرار کرتے تھے۔ یہ بات تواتر کے ساتھ معلوم ہے کہ سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے سوا سب صحابہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی تھی۔

جہاں تک حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دیگر بنو ہاشم کا تعلق ہے، ان میں سے کوئی بھی حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت کیے بغیر فوت نہیں ہوا تھا۔ البتہ ایک قول کے مطابق حضرت علی رضی اللہ عنہ نے چھ ماہ بعد آپ کی بیعت کی تھی۔ جبکہ دوسرے قول کے مطابق انھوں نے آپ کے انتخاب کے دوسرے دن بخوشی بغیر کسی سختی کے آپ کی بیعت کر لی تھی۔ پھر حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے سوا سب صحابہ نے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی بیعت میں شرکت کی تھی۔ بنو ہاشم یا کوئی دوسرا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بیعت سے پیچھے نہیں رہا۔ جب کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بیعت پر تمام لوگوں کا اتفاق ہو گیا تھا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ خلافت فاروقی میں فوت ہوئے تھے۔ اس لیے بیعت عثمانی کے دور کو نہیں پا سکے۔ بیعت سے پیچھے رہنے کا سبب معروف ہے۔ آپ چاہتے تھے کہ ایک امیر انصار میں سے ہو [اور وہ امیر منتخب ہو جائیں] اور ایک امیر مہاجرین میں سے ہو۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کا مطالبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نص اور اجماع امت کی روشنی میں صحیح نہیں تھا۔ جب اجماع کے خلاف ان میں سے کسی ایک کی غلطی ثابت ہو گئی تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ اجماع حق اور درست تھا۔ اور یہ فرد واحد جس کی غلطی کتاب و سنت کی روشنی میں معلوم ہو جائے اس کی غلطی شاذ ہوتی ہے؛ اس کا کوئی اعتبار نہیں کیا جاتا۔ بخلاف اس شخص کے جو کتاب و سنت سے اپنی حجت کا اظہار کرے۔ اس انسان کا خلاف معتبر ہوتا ہے۔ کبھی حق اسی کے پاس ہوتا جس کی طرف دوسروں کو بھی رجوع کرنا پڑتا ہے۔

جیسا کہ جیش اسامہ کی تنفیذ؛ مانعین زکوٰۃ سے قتال اور اس طرح کے دیگر امور کے بارے میں حق حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھا۔ یہاں تک کہ آپ کی رائے کا درست ہونا بعد میں واضح ہو گیا۔

شیعہ مصنف نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے والد ابو قحافہ رضی اللہ عنہ کا جو واقعہ بیان کیا ہے؛ اس کے باطل اور جھوٹ ہونے پر سب کا اتفاق ہے۔ حضرت ابو قحافہ رضی اللہ عنہ مکہ مکرمہ میں تھے۔ آپ ایک عمر رسیدہ انسان تھے۔ آپ نے فتح مکہ کے سال اسلام قبول کیا تھا۔ آپ کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ لیکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش ہوئے؛ آپ کی داڑھی اور سر کے بال بالکل سفید ہو چکے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر آپ اس بزرگ کو اپنی جگہ پر ہی چھوڑ دیتے تو ہم خود اس کے پاس چلے جاتے۔'' آپ نے ایسا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے اکرام کی وجہ سے فرمایا۔

صحابہ کرام میں کوئی دوسرا ایسا نہیں ہے جس کی والدہ؛ والد اور اولاد سب نے اسلام قبول کر لیا ہو۔ ان سب نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ پایا۔ بلکہ آپ کے نواسوں نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ پایا۔ آپ کے علاوہ مردوں اور عورتوں میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہے جس کی چار نسلوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دور پایا ہو اور وہ سب اہل ایمان بھی ہو گئے

ہوں۔ محمد بن عبدالرحمٰن بن ابی بکر بن ابی قحافہ رضی اللہ عنہم اجمعین؛ اور عبد اللہ بن زبیر [اسماء بنت ابی بکر کے بیٹے] یہ چار نسلیں سبھی رسول اللہ ﷺ پر ایمان لے آئے تھے۔ اور انہیں شرف صحابیت حاصل تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی والدہ حضرت ام خیر رضی اللہ عنہا بھی اسلام لے آئی تھیں۔ یہ ایمان والوں کا گھرانہ تھا۔ ان میں سے کوئی ایک بھی منافق نہیں تھا۔ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین میں کسی اور کا گھر اس گھر جیسا نہیں تھا۔

ضرب المثل ہے کہ ایمان کے لیے کچھ گھر ہوتے ہیں اور نفاق کے لیے کچھ گھر ہوتے ہیں۔ مہاجرین میں سے ابوبکر کا گھر ایمان کا گھر تھا۔ اور انصار میں سے بنونجار کا گھرانہ ایمان کا گھر تھا۔

رافضی کا یہ کہنا کہ: ''لوگوں نے ابوقحافہ سے کہا: ''تیرا بیٹا ابوبکر عمر میں سب لوگوں سے بڑا تھا۔''

یہ ایک کھلا ہوا جھوٹ ہے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ عمر میں سب صحابہ سے بڑے نہ تھے۔ بلکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں بہت سارے لوگ عمر میں آپ سے بھی بڑے تھے۔ مثلاً حضرت عباس۔ آپ نبی کریم ﷺ سے تین سال بڑے تھے۔ اور رسول اللہ ﷺ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے بھی بڑے تھے۔

ابوعمر بن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ وفات کے وقت تریسٹھ سال کے تھے۔ یہی عمر [بوقت وفات] رسول اللہ ﷺ کی بھی تھی۔ بعض آثار میں حضرت ابوقحافہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ جب سالار انبیاء ﷺ کا انتقال ہوا تو مکہ کے شہر پر لرزہ طاری ہوگیا۔ ابوقحافہ رضی اللہ عنہ نے جب یہ آواز سنی تو لوگوں سے دریافت کیا: کیا بات ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ آنحضرت ﷺ فوت ہو گئے۔ ابوقحافہ رضی اللہ عنہ بولے: ''بہت بڑا واقعہ پیش آیا۔''

ان کے بعد کون شخص خلیفہ قرار پایا۔'' لوگوں نے کہا: ''تیرا بیٹا'' ابوقحافہ رضی اللہ عنہ بولے: کیا بنوعبد مناف اور بنومغیرہ اس پر راضی ہو گئے؟ لوگوں نے کہا: ''ہاں'' ابوقحافہ رضی اللہ عنہ نے یہ سن کر کہا، جس کو اللہ دے اس کو کوئی روکنے والا نہیں ہے؛ اور جس سے وہ روک لے اسے کوئی دینے والا نہیں۔'' [طبقات ابن سعد (۳/ ۱۸٤)]

پس دریں صورت امتناع اجماع کا جواب کئی وجوہ سے دیا جاسکتا ہے:

پہلی وجہ: جن لوگوں کا رافضی مصنف نے ذکر کیا ہے' ان میں سے سوائے حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کوئی بھی بیعت سے پیچھے نہیں رہا۔ وگرنہ باتفاق اہل نقل تمام لوگوں نے بیعت کر لی تھی۔ بنو ہاشم کے ایک گروہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ شروع میں یہ لوگ بیعت سے پیچھے رہ گئے تھے مگر چھ ماہ کے بعد ان لوگوں نے بھی بغیر کسی لالچ اور بغیر کسی خوف کے بیعت کر لی۔

❀ وہ خط جس کا ذکر بعض اہل نقل کرتے ہیں کہ آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نام لکھا تھا؛ اہل علم کے ہاں وہ سراسر من گھڑت جھوٹ ہے۔ بلکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے نام خط لکھ کر انہیں اپنے پاس آنے کی دعوت دی تھی۔ آپ ان کے پاس تشریف لے گئے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بیعت سے پیچھے رہنے کے متعلق اپنا موقف پیش کیا' اور پھر بیعت کر لی۔

[حضرت علی رضی اللہ عنہ اور بیعت ابوبکر رضی اللہ عنہ]:

[حضرت علی رضی اللہ عنہ نے وفات فاطمہ رضی اللہ عنہا کے بعد ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی تھی]:

بخاری و مسلم میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے مطالبہ کیا کہ مدینہ میں

جو مال غنیمت نبی ﷺ کے پاس موجود تھا، نیز خیبر اور فدک کے خمس میں سے جو مال باقی ہے وہ آپ کی میراث کے طور پر مجھے دے دیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ: ''ہم کسی کو وارث نہیں بناتے، جو کچھ ہم چھوڑ جائیں وہ صدقہ ہوتا ہے۔''

یہ درست ہے کہ نبی کریم ﷺ کے اہل بیت بسر اوقات کیلئے اس میں سے کھا سکتے ہیں، اللہ کی قسم! میں صدقہ کی تقسیم میں کوئی تبدیلی نہیں کروں گا، بلکہ اسے اسی حالت پر رہنے دوں گا جس پر وہ عہد رسالت میں تھا۔ نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں جس بات پر عمل کیا جاتا تھا میں اسے کسی قیمت پر ترک نہیں کروں گا، ورنہ اندیشہ ہے کہ میں راہ حق سے منحرف ہو جاؤں گا۔''

سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا اس بات سے حقیقت کو پا گئیں؛ اور اس مسئلہ میں گفتگو کرنا چھوڑ دی۔ اور تا وفات پھر دوبارہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے اس مسئلہ میں گفتگو نہ کی، آپ کی وفات کے بعد وہ چھ ماہ بقید حیات رہیں۔ جب فوت ہوگئیں تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کو راتوں رات دفن کر دیا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اطلاع نہ دی؛ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خود ہی ان کا جنازہ پڑھایا۔

جب سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا بقید حیات تھیں تو لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا احترام کرتے تھے۔ آپ کی وفات کے بعد وہ بات نہ رہی۔ آخر کار آپ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے مصالحت و مبایعت کی سلسلہ جنبانی شروع کی۔ ہنوز آپ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت نہیں کی تھی۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو کہلا بھیجا کہ آپ تنہا میرے گھر آئیں۔ آپ کا مقصد یہ تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ آپ کے ہم راہ نہ ہوں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہا: ''آپ کا تنہا جانا مناسب نہیں۔''

ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: وہ میرے ساتھ کیا سلوک کریں گے اللہ کی قسم! میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاں ضرور جاؤں گا۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کلمہ شہادت پڑھ کر کہا کہ: ابوبکر رضی اللہ عنہ! ہم آپ کی اللہ داد صلاحیتوں سے آگاہ ہیں اور آپ کی امامت و خلافت پر شک نہیں کرتے۔ مگر آپ نے ہم پر زیادتی کی۔ ہم قرابت رسول ﷺ کی بنا پر اپنے آپ کو خلافت کا حق دار قرار دیتے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ مصروف گفتگو رہے۔ یہاں تک کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

''مجھے اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! قرابت رسول ﷺ کا مجھے اپنے رشتہ داروں کی نسبت زیادہ پاس ہے۔ جہاں تک ہمارے مابین مالی تنازعات کا تعلق ہے میں نے ان میں حق سے انحراف نہیں کیا، بلکہ نبی کریم ﷺ کو اس ضمن میں جو کچھ کرتے دیکھا وہی کیا۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''میں آج بعد دو پہر آپ کی بیعت کروں گا۔''

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ظہر کی نماز پڑھ کر منبر پر کھڑے ہوئے۔ مسنون خطبہ کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عظمت و فضیلت اور بیعت نہ کرنے کی وجہ بیان کی۔ اور جو عذر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پیش کئے تھے وہ لوگوں کے سامنے پیش کئے' حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے استغفار کی' اور ان کے لیے عظمت و فضیلت کی گواہی دی۔

پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خطبہ مسنونہ کے بعد تقریر کرتے ہوئے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے فضائل و مناقب پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ رشک کی وجہ سے میں نے بیعت میں تاخیر نہیں کی تھی۔ نہ میں آپ کے اللہ داد فضائل کا منکر ہوں۔ بات یہ تھی کہ میں

اپنے کو خلافت کا اہل خیال کرتا تھا؛ جب ابوبکر رضی اللہ عنہ خلافت پر فائز ہو گئے تو ہم سمجھے کہ آپ نے ہمارا حق مارا ہے؛ یہ بات ہمارے دلوں میں تھی؛ اس لیے ہم آپ سے ناراض ہو گئے۔ مسلمان یہ سن کر بہت خوش ہوئے اور انھوں نے کہا: ''آپ نے ٹھیک کیا'' جب آپ نے امر بالمعروف کی طرف رجوع کر لیا تو اس بات سے مسلمان حضرت علی رضی اللہ عنہ سے قریب تر ہوتے چلے گئے۔ ❀

[انفرادی اختلاف اور خلافت]:

[ایک یا دو اشخاص کی مخالفت انعقاد خلافت کے لیے مضر نہیں]:

اس میں شبہ نہیں کہ امامت کے لیے جو اجماع معتبر ہے اس میں ایک یا دو آدمیوں کا یا کسی چھوٹے گروہ کا تخلف ضرر رساں نہیں ہے۔ اور اگر ایسا ہوتا تو کسی خلیفہ کی امامت و خلافت کبھی منعقد نہ ہوتی۔ امامت ایک امر معین ہے۔ کبھی ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی انسان ایسی کسی خواہش کی وجہ سے بھی پیچھے رہ سکتا ہے جس کے بارے میں کسی کو کوئی علم نہ ہو۔ جیسا کہ حضرت سعد نے بیعت نہ کی تھی۔ اس لیے کہ آپ کی خواہش یہ تھی کہ انصار کے امیر آپ ہوں۔ مگر ایسا نہ ہو سکا؛ تو یہ بات آپ کے دل میں رہ گئی۔

جو انسان خواہش نفس کی وجہ سے کوئی چیز چھوڑ دے؛ تو اس کا یہ فعل کوئی مؤثر نہیں ہوتا۔ بخلاف اجماع عام کے۔

عام شرعی احکام جیسے: واجب' حلال و حرام اور مباح وغیرہ کے بارے میں جو اجماع منعقد ہوتا ہے، اس میں اختلاف ہے کہ آیا ایک یا دو اشخاص کی مخالفت معتبر ہے یا نہیں؟ اس ضمن میں امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے دو قول منقول ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ ایک یا دو آدمیوں کی مخالفت معتبر نہیں ہے، محمد بن جریر طبری وغیرہ کا قول بھی یہی ہے۔

امام احمد کا دوسرا قول یہ ہے کہ احکام میں ایک یا دو شخصوں کی مخالفت معتبر ہے۔ اکثر علماء اسی قول پر ہیں۔

امامت پر اجماع میں اور عام اجماع میں فرق ہے۔ شرعی مسئلہ کا حکم سب کے لیے عام ہوتا ہے۔ جب کہنے والا کسی چیز کے واجب ہونے کا کہتا ہے تو وہ اسے اپنی ذات پر بھی واجب کر رہا ہوتا ہے اور دوسرے پر بھی اور ایسے ہی اسے حرام کہنے والا اسے اپنی ذات کے لیے اور دوسرں سب کے لیے حرام کہہ رہا ہوتا ہے۔ جب کہ اختلاف کرنے والا ان دونوں میں سے نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ: کسی انسان کی روایت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول کسی واقعہ میں قبول کی جاتی ہے بھلے وہ اس کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ اس لیے کہ حدیث نبی تمام لوگوں کو شامل اور ان کے لیے عام ہوتی ہے۔ اگر چہ اس حدیث کو بیان کرنے والے کو آج اس کی روشنی میں فائدہ ہی کیوں نہ ہو رہا ہو؛ کل اسی حدیث کی روشنی میں اس کے خلاف بھی فیصلہ ہو سکتا ہے؟

❀ صحیح بخاری، کتاب المغازی۔ باب غزوۃ خیبر (حدیث:٤٢٤٠، ٤٢٤١)، صحیح مسلم، کتاب الجهاد۔ باب قول النبی ﷺ "لا نورث ما ترکنا ......" (حدیث: ١٧٥٩)۔

اس کے برعکس اگر کوئی انسان اپنی ذات کی حق میں کوئی گواہی دے تو اسے قبول نہیں کیا جاسکتا۔اس لیے کہ وہ خود جھگڑے میں فریق ہے؛اورفریق مشارک کی گواہی اس کی ذات کے حق میں قبول نہیں کی جاتی ۔

پس کسی متعین کی امامت وخلافت پراجماع عام اور کلی حکم نہیں ہے؛ جیسا کہ احکام میں کسی خاص اور متعین مسئلہ پراجماع ہوتا ہے۔

ایسے ہی جب ایک شخص معلوم شدہ نص کی مخالفت کرے تو اس کے قول کو شاذ قرار دیا جائے گا، مثلاً سعید بن مسیّب رحمہ اللہ کا یہ قول کہ جس عورت کو تین طلاقیں دی جائیں، جب وہ دوسرے خاوند سے نکاح کرے تو صرف نکاح کرنے ہی سے وہ پہلے خاوند کے لیے حلال ہو جاتی ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ مسئلہ رسول اللہ ﷺ سے منقول صحیح سنت کے خلاف ہے۔اس لیے اس کا کوئی اعتبار نہیں ۔

امر دوم: اگر ان لوگوں کے اختلاف کو تسلیم بھی کرلیا جائے جن کا تذکرہ رافضی نے کیا؛اوراس سے دو یا تین گنا زیادہ لوگوں کو بھی ان کے ساتھ ملا لیا جائے تو تب بھی خلافت کے اثبات میں قدح واقع نہیں ہوتی ۔اس لیے کہ خلافت کے انعقاد میں اہل شوکت وسطوت اوراس جمہور کا اختلاف معتبر ہوتا ہے جن کی وجہ سے نظام چل رہا ہوتا ہے۔یعنی ان کی اتباع کے بغیر امامت کے مقاصد پورے نہیں ہوسکتے ۔یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے یہ حکم دیا ہے:

''جماعت سے وابستہ رہیے،اس لیے کہ جماعت پر اللہ کا فضل واحسان ہوتا ہے۔''[1]

اور ایک دوسرے مقام پرارشادفرمایا:

''بیشک شیطان ایک کے ساتھ ہوتا ہے' اور دو سے دور ہوتا ہے۔'' [سنن الترمذی ۳/ ۳۱۵]

ایک دوسری حدیث میں ہے:

''بیشک شیطان انسانوں کے لیے ایسے بھیڑیا ہے جیسے بکریوں کے لیے بھیڑیا ہوتا ہے۔اور بھیڑیا اسی بکری کو شکار کرتا ہے جو ریوڑ سے علیحدہ اور دور ہوتی ہے۔'' [مسند أحمد ۱/ ۲۰٤؛ تحقیق أحمد شاکر]

ایک حدیث میں ہے: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''سوادِ اعظم کا دامن نہ چھوڑیے، جو جماعت سے الگ ہوا وہ الگ ہوکر جہنم میں جائے گا۔''[2]

امر سوم: یہ امر بھی قابل غور ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت پر امت کا جو اجماع ہوا تھا وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت پر نہیں ہو سکا تھا۔اس لیے کہ ایک تہائی بلکہ اس سے کم وبیش لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت میں شرکت نہیں کی تھی ۔انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف جنگ لڑی تھی ۔ایک تہائی لوگوں نے علیحدگی اختیار کرلی تھی ۔اور وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ جنگ آزما نہیں ہوئے تھے۔ان میں ایسے لوگ بھی تھے جنہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت نہیں کی تھی ۔اور جن لوگوں نے آپ کی بیعت نہیں کی تھی ان میں سے کچھ آپ سے برسر پیکار ہوئے' اور کچھ نے عزلت نشینی اختیار کرلی۔

---

[1] معجم کبیر طبرانی(۱۲/ ٤٤۷)، الترمذی، کتاب الفتن، باب ما جاء فی لزوم الجماعة(ح:۲۱٦٦)، لیکن اس میں ''جماعت سے وابستہ رہیے'' کے الفاظ نہیں ہیں، وہ دوسری روایت (ح:۲۱٦٥) میں ہیں۔

[2] مستدرك حاكم (۱/ ۱۱٥ـ۱۱٦) [مسند٤/ ۲۷۸]

اگر امت کے چند افراد کی عدم شرکت سے کسی شخص کی خلافت میں قدح وارد ہوتی ہے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی نسبت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت جرح وقدح کی زیادہ مستحق ہوگی۔

❀ اور اگر شیعہ کہیں کہ:''جمہور امت نے آپ سے کوئی جنگ نہیں کی؛ یا جمہور اہل شوکت نے آپ کی بیعت کرلی تھی۔'' تو انہیں کہا جائے گا کہ: یہی بات حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے حق میں کہنا زیادہ مناسب ہے۔

❀ اگر شیعہ کہیں کہ امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ نص سے ثابت ہے، لہٰذا اجماع کی ضرورت نہ تھی۔''

❀ تو ہم کہیں گے کہ قبل ازیں ذکر کردہ نصوص سے صراحۃً حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی افضلیت واضح ہوتی ہے؛ نہ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت۔ جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں [کہ صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین نے اجماعاً آپ کی بیعت کی تھی اور آپ کو خلیفۂ رسول کا لقب بخشا تھا]۔ اور آگے چل کر بھی ہم انشاء اللہ اس چیز کو واضح کریں گے کہ نصوص حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت پر دلالت کرتی تھیں۔ اور یہ کہ خلفاء ثلاثہ کے زمانہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ ہرگز خلیفہ نہ تھے۔ خلافت صدیقی کے لیے کسی اجماع کی ضرورت نہ تھی؛ اس لیے کہ نصوص کی روشنی میں آپ کی خلافت کی صحت ثابت تھی۔ اور اس کے منافی کوئی متناقض چیز بھی نہیں تھی۔

امر سوم: خلافت صدیق رضی اللہ عنہ کے بارے میں دو طرح سے گفتگو کی جا سکتی ہے۔

۱۔ پہلا موضوع کلام یہ ہے کہ فی الواقع حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ منصب خلافت پر فائز ہوئے تھے یا نہیں؟

۲۔ دوسرا یہ کہ آپ خلافت کی صلاحیت و اہلیت استحقاق سے بہرہ ور تھے بھی یا نہیں؟

❀ جہاں تک امر اوّل کا تعلق ہے آپ کا خلیفہ ہونا تواتر اور لوگوں کے اتفاق سے ثابت ہے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نائب رسول تھے؛ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قائم مقام اور خلیفہ بنے۔ آپ نے شرعی حدیں قائم کیں۔ واجب الوصول حقوق وصول کیے۔ کفار و مرتدین کے خلاف جنگ آزما ہوئے، عمال مقرر کیے، مال تقسیم کیا۔ اور امیر و خلیفہ سے متعلق جملہ امور انجام دیے، بلکہ آپ اوّلیں شخص تھے جو امامت پر فائز ہوئے۔

❀ باقی رہا امر دوم یعنی آپ کا مستحق امامت ہونا تو اجماع کے سوا اور بھی کثیر دلائل موجود ہیں۔ شیعہ جس طریقہ سے بھی امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اثبات کرتے ہیں، ہم اسی طریقہ سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا مستحق امامت ہونا ثابت کرتے ہیں۔ بہر کیف اجماع کی حاجت امر اوّل میں ہے امر دوم میں نہیں۔ تاہم امر ثانی پر بھی اجماع منعقد ہو چکا ہے۔

حجیت اجماع کی بحث:

[اعتراض]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:''اجماع کسی مسئلہ پر دلالت کرنے میں اصل شرعی کی حیثیت نہیں رکھتا۔ بلکہ اجماع منعقد کرنے والوں کو اس حکم کے لیے دلیل عقلی یا نقلی کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ اس پر ان کا اتفاق ہو سکے۔ جہاں تک عقلی دلیل کا تعلق ہے کوئی عقلی دلیل ابوبکر رضی اللہ عنہ امامت پر دلالت نہیں کرتی۔ باقی رہی نقلی دلیل تو اہل سنت کے نزدیک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی امام مقرر کیے بغیر وفات پائی تھی۔ اور اس مسئلہ میں کوئی نص بھی موجود نہیں؛ اور قرآن اس کے بیان سے خالی ہے۔ بنا بریں اگر اجماع منعقد ہوا بھی تو غلط ہوگا؛ وہ کسی مسئلہ پر دلالت نہیں کرتا۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جواب]: شیعہ مصنف کا یہ کہنا کہ: ''اجماع دلالت میں اصل شرعی کی حیثیت نہیں رکھتا۔''

تو ہم کہتے ہیں: اگر اس قول سے تمہاری مراد یہ ہے کہ ارباب اجماع کی اطاعت بذات خود واجب نہیں ہے، بلکہ اس لیے ضروری ہے کہ اس کے ذریعہ اللہ و رسول کا حکم معلوم ہوتا ہے تو یہ صحیح ہے۔ مگر اس سے ہمارے نظریہ کو کچھ نقصان نہیں پہنچتا، کیونکہ رسول ﷺ بھی بذات خود مطاع نہیں ہیں، بلکہ آپ کی اطاعت اس لیے ضروری ہے کہ ان کی اطاعت دراصل اللہ کی اطاعت ہوتی ہے، کیوں کہ اسلام میں مُطاع حقیقی صرف اللہ کی ذات ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ﴾ (الاعراف: ۵۴) ''اور اللہ کے لیے ہی ہے پیدا کرنا اور حکم چلانا۔''

نیز فرمایا: ﴿إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ﴾ (الانعام: ۵۷)

''بیشک حکم صرف اللہ کے لیے ہے۔''

اللہ کے علاوہ کسی کا حکم نہیں چلتا۔ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت اس لیے واجب ہے کہ اس کے بغیر اللہ تعالیٰ کی اطاعت ممکن نہیں۔ اور اہل اجتماع اصحاب العلم و الایمان کی اطاعت اس لیے واجب ہے کہ ان کی اطاعت میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت ہے۔

صحیحین میں ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی ۔ اور جس نے میرے امیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی ۔ اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی اور جس نے میرے امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی۔'' [البخاری ۹/ ۶۱ا مسلم ۱٤٦٥]

اور اس پر بہت ساری دلیلیں قائم ہیں کہ یہ امت کبھی بھی گمراہی پر جمع نہیں ہوسکتی۔ بلکہ جس کا حکم یہ امت اجتماعی صورت میں دے، وہ اللہ اور اس کے رسول کا حکم ہوتا ہے۔ امت نے امامت کے متعلق حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اطاعت کا حکم دیا ہے۔ تو اس سے معلوم ہوا اللہ اور اس کے رسول نے بھی اسی چیز کا حکم دیا ہے۔ اور جس نے آپ کی نافرمانی کی؛ اس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی۔

اور اگر تمہارا (شیعہ کا) مقصد یہ ہے کہ اجماع کبھی حق کے موافق ہوتا ہے اور کبھی مخالف۔ تمہاری یہی مراد ہے تو یہ حجیت اجماع پر طعن ہے۔ جس میں اس بات کا دعویٰ ہے کہ پوری امت خطا پر جمع ہوسکتی ہے؛ جیسا کہ روافض اور ان کے ہمنوا نظام کا خیال ہے۔

تو اس صورت میں انہیں کہا جائے گا کہ: ''حضرت علی رضی اللہ عنہ کا امام ہونا اور پھر آپ کا معصوم ہونا اور اس طرح کے دیگر اصول تو خود رافضی اجماع سے ثابت کرتے ہیں۔ اس لیے کہ خود ان کے دعوی کے مطابق ان کے دین کی بنیاد عقلیات اور اجماع پر ہے۔ جیسا کہ ان کے بڑے نقل کرتے چلے آئے ہیں۔ ان کا کہنا ہے: ''عقل سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ لوگوں کے لیے ایک منصوص علیہ امام معصوم کا ہونا بہت ضروری ہے؛ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علاوہ کوئی دوسرا نہ تو معصوم ہے' اور نہ ہی منصوص علیہ۔'' اس کے علاوہ بھی ان کے دیگر مقدمات اور حجتیں اسی طرح کی ہیں۔

پس ان سے کہا جائے گا: ''اگر اجماع حجت نہیں ہے؛ تو تمہاری ساری دلیلیں باطل ہوگئیں۔ پس تمہارے وہ اصول بھی باطل ہوئے جن کی بنیاد اجماع پر رکھی گئی تھی۔ جب ان کے عقیدہ کا بطلان ثابت ہوگیا تو اہل سنت والجماعت کا عقیدہ خود بخود ثابت ہوگیا۔

اور اگر اجماع حق ہے؛ تو پھر بھی اہل سنت والجماعت کا مسلک ثابت شدہ ہے۔ تو پھر بھی ان کے مذہب کا بطلان ثابت ہوتا ہے' خواہ یہ لوگ اجماع کو حجت مانیں یا نہ مانیں۔ جب ان کا عقیدہ باطل ہوا تو اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ثابت ہوگیا' یہی چیز ثابت کرنا مطلوب ہے۔

اور اگر شیعہ کہیں: ''ہم اجماع کا دعوی نہیں کرتے؛ اور نہ ہی اپنے مذہب کا کوئی اصول اجماع سے ثابت کرتے ہیں۔ بیشک ہماری بنیاد عقل اور ائمہ معصومین سے نقل کردہ اقوال ہیں۔''

ان سے کہا جائے گا: ''اگر تم اجماع سے دلیل نہیں لیتے تو تمہارے پاس رسول اللہ ﷺ سے منقول روایات کے علاوہ کوئی بھی سمعی دلیل باقی نہیں رہتی۔ بیشک جو کچھ آپ لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دوسرے ائمہ سے نقل کرتے ہیں وہ اس وقت تک حجت نہیں ہوسکتا یہاں تک کہ ہمیں ان ائمہ میں سے کسی ایک کا معصوم ہونا معلوم نہ ہوجائے۔ اور ان میں سے کسی ایک کا معصوم ہونا بھی کسی معصوم سے منقول روایت کی بنیاد پر ہی ثابت ہوسکتا ہے۔ اور جس کا معصوم ہونا معلوم ہے' وہ رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی ہے۔ جب تک ان کا کوئی دعوی رسول اللہ ﷺ سے مروی حدیث سے ثابت نہ ہو تو ان کے پاس دین کے اصول یا فروع میں کوئی دلیل سمعی باقی ہی نہیں رہتی۔ پس اس صورت میں دوبارہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق خلیفہ منصوص علیہ ہونے کے دعوی کو دیکھنا چاہیے۔ اگر تم نص کو اجماع سے ثابت کرو تو یہ باطل ہے۔ اس لیے کہ آپ خود ہی اجماع کے حجت ہونے کی نفی کرتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو اور تم اپنے بعض لوگوں کے قول کے مطابق نقل خاص سے یہ نص ثابت کرنے کی کوشش کرو تو پھر بھی اس کا باطل ہونا کئی وجوہات کی بنا پر معلوم ہوتا ہے۔ تو واضح ہوا کہ جمہور اور اکثر شیعہ کی نقل کردہ روایات کی روشنی میں علم یقینی حاصل ہوجاتا ہے کہ رافضی مصنف کا یہ دعوی جھوٹ ہے۔

غور و فکر کرنے والوں کے لیے اس سے ایک دوسری بات یہ بھی واضح ہوجاتی ہے کہ شیعہ جن امور میں جمہور اہل اسلام سے علیحدہ ہوئے ہیں' ان میں وہ کسی بھی دلیل کی طرف رجوع ہی نہیں کرتے۔ نہ ہی عقلی دلیل اور نہ ہی سمعی؛ نہ ہی نص اور نہ ہی اجماع۔ بلکہ اس میں ان کا اصل سرمایہ اور بنیادی چیز جھوٹ پر مبنی وہ روایات ہوتی ہیں جن کا کذب و بطلان ہر ایک اہل علم کے لیے واشگاف ہوتا ہے۔ اور یہ دعوی کرنا کہ نص اس چیز پر دلالت کرتی ہے؛ یا قیاس سے معلوم ہوتا ہے؛ تو خود یہ دعوی ہی ایسا ہے جس کا باطل ہونا معلوم شدہ ہے۔

شیعہ کے علاوہ دیگر تمام اہل بدعت جیسے خوارج اور معتزلہ کا بھی یہی حال ہے۔ تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ یہ لوگ کسی بھی صحیح عقلی یا سمعی دلیل کی طرف رجوع ہی نہیں کرتے۔ بلکہ ان کا سارا سرمایہ چند شبہات ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان کے دلائل روافض کے عقلی و سمعی دلائل سے قوی تر ہوتے ہیں۔

سمعی دلائل اس لیے قوی ہوتے ہیں کہ: یہ لوگ جھوٹ پر اعتماد نہیں کرتے؛ جیسا کہ روافض جھوٹ پر ہی اعتماد کرتے ہیں ۔اور صحیح نصوص میں ان کا شبہ روافض کے شبہ سے زیادہ قوی تر ہے۔

مزید برآں کہ تمام اہل بدعت روافض کی نسبت احادیث رسول اور آثار صحابہ کے زیادہ عالم و ماہر ہوتے ہیں ۔آثار و احوال نبی ﷺ روافض سے بڑھ کر کوئی جاہل نہیں ہوتا۔یہی وجہ ہے کہ ان کی کتابوں اور کلام سے جہالت چھلکتی ہے۔اور ان کی روایات میں اتنا زیادہ جھوٹ ہے کہ کسی دوسرے فرقہ کے پاس اتنا زیادہ جھوٹ نہیں ہوگا۔ ایسے ہی باقی اہل بدعت معقولات میں ایسا قیاس کرتے ہیں جو کہ اپنے ضعف وفساد کے باوجود روافض کے قیاس سے زیادہ عمدہ اور بہتر ہوتا ہے۔

مزید برآں ہم کئی مواقع پر تفصیلی دلائل کے ساتھ یہ ثابت کر چکے ہیں کہ اجماع کیسے حجت ہوتا ہے۔اور مقام کے لیے اس کے مناسب حال گفتگو ہوتی ہے۔

ہم امامت صدیق رضی اللہ عنہ کے اثبات میں ایسے دعویٰ کے محتاج نہیں ہیں ،اور ہمیں کسی کی امامت کے لیے یہ شرط لگانے کی بھی ضرورت نہیں ۔ ہم صرف یہ کہتے ہیں کہ:''جب رافضی نے یہ ذکر چھیڑا کہ اہل سنت والجماعت اجماع پر اعتماد کرتے ہیں تو ہم نے اس مسئلہ پر گفتگو کر دی کہ اجماع سے جو حکم ثابت ہوتا ہے اس پر دلالت کرنے والی نص موجود ہوتی ہے، اجماع سے صرف اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ فلاں مسئلہ کے بارے میں نص موجود ہے جو کہ ائمہ کے ہاں معلوم شدہ ہے۔یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کا علم ختم ہو چکا ہو۔

اس بات میں علماء کا اختلاف ہے کہ اجتہاد کی اساس پر اجماع منعقد کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ ہم اسے جائز کہتے ہیں کہ بعض اجماع کرنے والے اپنے اجتہاد سے کوئی بات کہہ دے؛لیکن ایسا نہیں ہوسکتا کہ تمام اہل اجماع پر نص مخفی رہ جائے۔کوئی بھی حکم ایسا نہیں ہوتا جس کے بارے میں اجماع ہو؛مگر بعض لوگوں کو اس کی نص کا علم بھی ہوتا ہے۔پس اس صورت میں اجماع نص پر دلیل ہوتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى﴾ (النساء:۱۱۵)

''جو شخص ہدایت واضح ہونے کے بعد رسول کی مخالفت کرتا اور مومنوں کے علاوہ دوسری راہ پر چل دیتا ہے تو جدھر کا رخ کرتا ہے،ہم اسے اسی جانب پھیر دیتے ہیں۔''

یہاں پر اللہ تعالیٰ نے وعید کو رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی اور مؤمنین کی راہ سے روگردانی کے ساتھ معلق کیا ہے۔ حالانکہ یہ بات بھی معلوم شدہ ہے کہ صرف رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی کرنے سے بھی وعید لاحق ہوسکتی ہے۔لیکن رسول اللہ ﷺ کی اطاعت اور اہل ایمان کے راستہ کی پیروی آپس میں لازم وملزوم ہیں؛ اسی وجہ سے ان دونوں کے ساتھ وعید کو معلق کیا گیا ہے۔جیسا کہ یہی وعید اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی پر معلق کی گئی ہے'اس لیے کہ یہ دونوں امور آپس میں لازم وملزوم ہیں۔

خلافت صدیقی اسی قبیل سے ہے اس کے بارے میں بہت ساری نصوص موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی

امامت و خلافت مبنی برحق وصواب تھی۔ اس میں کسی کا اختلاف نہیں۔ اختلاف کی بنیاد یہ ہے کہ آیا خلافت کا انعقاد نص عہد [خاص] کی بنا پر ہوا ہے؛ جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کا انعقاد ہوا تھا؛ یا پھر اجماع اور اختیار کی اساس پر؟

جہاں تک دلالت نصوص کا تعلق ہے' تو اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ حق اور صواب یہی ہے۔ہمیں علماء اہل سنت والجماعت میں سے کسی ایک کے بارے میں بھی معلوم نہیں ہوسکا جس نے اس میں اختلاف کیا ہو۔سبھی اس کے درست ہونے پر نصوص سے استدلال کرتے ہیں۔ جب ہم یہ واضح کرچکے ہیں کہ جس چیز پر اجماع منعقد ہوجائے وہ منصوص علیہ ہوتی ہے۔پس اس موقع پر اجماع کا ذکر اس لیے ہوتا ہے کہ یہ نص موجود ہونے کی دلیل ہے ؛ یہ کبھی باہم جدا نہیں ہوسکتی۔ ہمارا زاویۂ نگاہ یہ ہے کہ نص واجماع باہم لازم ملزوم ہے۔مگر اس کے باوجود ہم وہ نصوص ذکر کریں گے جن سے مطلقاً اجماع پر دلالت کی جاتی ہے۔اور ان نصوص سے وہ لوگ بھی استدلال کرتے ہیں جو کہتے ہیں کہ کبھی کبھار اجماع نص سے خالی بھی ہوسکتا ہے۔اسکی دلیل یہ آیت ہے:

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ (آل عمران:۱۱۰)

''تم بہترین جماعت ہو، جو لوگوں کیلئے ظاہر کی گئی،تم نیکی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے ہو۔''

اس آیت سے مستفاد ہوتا ہے کہ یہ لوگ ہر نیکی کی بات کا حکم دیتے ہیں' اور برائی کی بات سے منع کرتے ہیں ۔ امر بالمعروف ونہی عن المنکر امت پر واجب ہے اس میں قطعی طور پر سب واجبات ومحرمات شامل ہیں۔اور واجب وہی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے واجب ٹھہرایا ہو؛ اور حرام وہی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے حرام کہا ہو۔لہٰذا امت کو چاہیے کہ تمام ان واجبات کو ضروری ٹھہرائیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے واجب کیا ہے' اور اللہ کی تمام محرمات کو حرام سمجھیں اور ان سے لوگوں کو باز رکھیں۔پس دریں صورت ضرورت کے تحت معلوم ہوتا ہے کہ یہ ممتنع ہے کہ یہ لوگ حرام کو حلال ٹھہرائیں اور حلال کو حرام قرار دیں۔اس لیے کہ ان کے لیے حق بات بیان کرنے سے خاموش جائز نہیں۔ پھر حق کی نقیض باطل کی تائید میں بولنا کیوں کر جائز ہوسکتا ہے؟اگر وہ ایسا کریں گے تو برائی کا حکم دینے والے اور بھلائی سے منع کرنے والے ہوجاتے۔ یہ بات صریح نص کے خلاف ہے۔

نظر بریں اگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت حرام اور آپ کی اطاعت منکر ہوتی تو اس سے لوگوں کو باز رکھنا امت پر واجب اور اس سے خاموش رہنا ناروا ہوتا۔اور اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اطاعت واجب ہوتی تو یہ ایک بہت بڑی نیکی تھی،جس کا حکم دینا نہایت ضروری بلکہ واجب تھا۔ جب ایسا نہیں ہوا تو معلوم ہوا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت واطاعت اس وقت میں نہ واجب تھی اور نہ ہی مستحب۔اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اطاعت میں کوئی برائی نہیں تھی۔ یہی چیز ثابت کرنا مطلوب ہے۔

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ (التوبہ:۷۱)

''مومن مرد اور عورتیں ایک دوسرے کے ہم درد ہیں وہ نیکی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے ہیں۔''

نیز فرمایا:﴿وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ﴾ (البقرۃ:۱۴۳)

''اسی طرح ہم نے تم کو ایک امت وسط بنایا تا کہ تم دوسروں پر نگاہ رکھو۔''

جب اس امت کو شاہد کا درجہ دیا گیا ہے تو ان کو یہ بات معلوم ہونا چاہیے کہ وہ کس بات کی شہادت دیں گے۔ اگر یہ امت اللہ کی حلال کردہ اشیاء کو حرام اور محرمات کو حلال قرار دینے والی ہوتی تو اس کو شاہد نہیں بنایا جا سکتا تھا۔ اسی طرح اگر اس امت کے افراد قابل مدح اشخاص کی مذمت کرتے اور مذموم اشخاص کی مدح میں رطب اللسان ہوتے تب بھی وہ اس منصب پر فائز نہیں کیے جا سکتے تھے۔ بنا بریں جب یہ امت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے استحقاق خلافت کی گواہی دے تو اس کا صادق ہونا ضروری ہے۔ اسی طرح جب یہ بالاتفاق کسی کے نیک یا بد ہونے کی شہادت دیں تو ان کی یہ گواہی قبول کی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ مَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَ يَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَ نُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ۚ وَ سَآءَتْ مَصِيْرًا﴾ (النساء:۱۱۵)

''جو شخص بھی ظہور ہدایت کے بعد رسول کی مخالفت کرے گا، اور مومنین کی راہ کو چھوڑ کر دوسری راہ پر چلے گا تو جدھر کو وہ مڑے گا ہم اس کو اسی طرف موڑ دیں گے اور اسے جہنم رسید کریں گے۔''

اس آیت میں مخالفت رسول اور مومنین کی راہ کو چھوڑ کر دوسرے راستوں پر چلنے کی ممانعت کی گئی ہے، یہ دونوں باتیں مذموم ہیں، جب اس امت کے لوگ کسی چیز کی حلت یا حرمت پر متفق ہوں اور کوئی شخص ان کی مخالفت کرے تو اس نے مومنین کے سوا دوسروں کی راہ اختیار کی۔

قرآن پاک میں فرمایا: ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوْا﴾ (آل عمران:۱۰۳)

''سب مل کر اللہ کی رسی کو تھام لو اور فرقے فرقے نہ بنو۔''

اگر حالتِ اجتماع میں بھی مسلمانوں کے درمیان کامل اتحاد و یگانگت موجود نہ ہو تو پھر اجتماع و انتشار میں کیا فرق ہوا؟

قرآن میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ (المائدۃ:۵۵)

''اللہ تعالیٰ، اس کا رسول اور اہل ایمان تمہارے دوست ہیں۔''

اس آیت میں مومنین کی دوستی کو اللہ و رسول کی دوستی کی طرح قرار دیا گیا ہے یہ ایک مسلمہ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ اس امت کو ضلالت پر جمع نہیں ہونے دیتا، اس کے سب سے زیادہ حق دار صحابہ ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ صحابہ کا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ منتخب کرنا ایک جائز اقدام تھا۔ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جس کی تم مدح بیان کرتے ہو، اس کے لیے جنت واجب ہو جاتی ہے، اور جس کی مذمت کرتے ہو، اس کے لیے دوزخ واجب ہو جاتی ہے۔ تم زمین پر اللہ کے گواہ ہو۔''[1]

---

[1] صحیح بخاری۔ کتاب الجنائز، باب ثناء الناس علی المیت (حدیث:۱۳۶۷)، صحیح مسلم، کتاب الجنائز۔باب فیمن یثنی علیه خیر او شر من الموتیٰ (حدیث: ۹۴۹)۔

اجماع پر شیعہ کے اعتراضات:

[اعتراض] : شیعہ مصنف لکھتا ہے:

''اجماع میں امت کے سب لوگوں کا قول معتبر ہوتا ہے اور یہ بات موجود نہ تھی۔ اور نہ ہی تمام اہل مدینہ یا بعض کا اجماع ہوسکا تھا۔ اکثر لوگ قتل عثمان رضی اللہ عنہ پر متفق تھے۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جواب] : ہم قبل ازیں اس کا جواب دے چکے ہیں۔ جہاں تک امامت پر اجماع کا تعلق ہے؛ اگر اس سے مراد وہ اجماع ہو جس سے امامت و خلافت کا انعقاد ممکن ہوتا ہے، تو ہم نے بیان کیا تھا کہ اس میں ارباب حل و عقد کا اجماع اور موافقت ضروری ہوتی ہے؛ تاکہ امامت کے مقاصد پورے کرنے پر قدرت حاصل ہو جائے۔ بھلے ارباب حل و عقد تعداد میں چند ایک ہوں' اور باقی لوگ ان کے موافق و ہم خیال ہوں؛ جب وہ کسی کی بیعت کرلیں تو امامت منعقد ہو جاتی ہے۔ یہی وہ حق مسئلہ ہے جس پر اہل سنت والجماعت گامزن ہیں۔ ائمہ اہل سنت جیسے امام احمد رحمہ اللہ وغیرہ کا یہی قول ہے۔

جب کہ اہل کلام میں سے ہر ایک نے اس کے لیے کچھ عدد متعین کیا ہے۔ یہ تمام باطل قیاس ہیں۔

اور اگر اس سے مراد خلافت کے استحقاق اور اولویت پر اجماع ہے' تو اس میں یا تو تمام لوگوں کا؛ یا پھر اکثریت کا اجماع معتبر ہوتا ہے۔ یہ تینوں چیزیں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت میں پائی جاتی ہیں۔

جہاں تک حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کی بات ہے؛ تو یہ بات غلط ہے کہ اکثر لوگ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کرنا چاہتے تھے۔ آپ کی قاتل ایک باغی و ظالم جماعت تھی جو کہ کل امت کا ہزارواں حصہ بھی نہیں بنتے۔ یہ بات کوئی عقلمند کیسے کہہ سکتا ہے جب کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر کے اکثر لوگ؛ اور جنہوں نے آپ سے جنگیں لڑیں' اور جو لوگ ان جنگوں میں شریک نہیں ہوئے؛ ان کا شمار قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ میں نہیں ہوتا۔ آپ کو قتل کرنے والے ایک چھوٹے سے گروہ کے لوگ تھے جو کہ [بعد میں جان بچانے کے لیے] حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں شامل ہو گئے تھے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں امت کی تعداد لاکھوں کو پہنچ چکی تھی۔ جب کہ آپ کو قتل کرنے والے ایک ہزار سے کچھ زیادہ لوگ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما فرمایا کرتے تھے:

''اللہ تعالیٰ قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ پر لعنت کرے، وہ چوروں کی طرح بستی کی پچھلی جانب سے داخل ہوئے۔ اللہ ان کو ہر طرح سے غارت کرے۔ ان میں سے وہی لوگ بھاگنے میں کامیاب ہوئے جو راتوں رات تاروں کی روشنی میں؛ بھاگ گئے تھے اور مسلمانوں کو خبر بھی نہ تھی۔''

[اعتراض] : شیعہ مصنف لکھتا ہے: ''جب امت کے ہر شخص سے غلطی کا صدور ممکن ہے تو اجماع میں کذب کے احتمال سے کون سی چیز مانع ہو سکتی ہے؟۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جواب] : ہم کہتے ہیں کہ: جب بھی اجماع ہوتا ہے تو اجماع سے وہ فوائد حاصل ہوتے ہیں جو احاد سے نہیں ہوتے۔ بنابریں فرد واحد کے حکم کو اجماع کا درجہ حاصل نہ ہوگا۔ مثلاً: احاد میں خبر دینے والے ہر ایک سے خطا و کذب کا صدور ممکن ہے۔ مگر جب یہی خبر احاد پہنچانے والے تواتر کی حد کو پہنچ جائیں تو یہ احتمال باقی نہیں رہتا۔ اس کی نظیر یہ ہے کہ جتنے لقمے

کھائے جاتے ہیں؛ پانی کے گھونٹ پیے جائیں؛ ان میں سے کسی ایک لقمہ یا گھونٹ سے بھی سیری حاصل نہیں ہوتی، مگر ان کے مجموعہ سے آدمی سیر ہو جاتا ہے؛ پیاس ختم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح تنہا ایک آدمی دشمن کے مقابلہ سے قاصر ہوتا ہے، لیکن جب افراد جمع ہو جائیں اور ایک گروہ بن جائے تو وہ آسانی سے مقابلہ کر سکتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ کثرت قوت وعلم کی موجب ہوتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ حساب میں کبھی ایک یا دو انسان تو غلطی کر سکتے ہیں؛ مگر جب ان کی تعداد کثرت میں ہو جاتی ہے تو وہی بات جو فرد واحد سے ممکن تھی یہاں پر ممتنع ہو جاتی ہے۔ ہمیں اضطراری طور پر معلوم ہے کہ دو کا علم ایک سے علم سے زیادہ ہوتا ہے؛ جب کہ وہ اکیلا ہو۔ اور دو کی قوت بھی ایک کی قوت سے بڑھ کر ہوتی ہے۔ پس انفرادی حالت میں خطاء کے واقع ہونے سے اجتماعی حالت میں خطاء کا صدور لازم نہیں آتا۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى﴾ (البقرۃ: ۲۸۲)

''اس لیے کہ اگر ایک عورت بھول جائے گی تو دوسری اسے یاد دلا دے گی۔''

پس حساب میں بھولنے والا؛ ایک انسان تو غلطی کر سکتا ہے؛ مگر ایک جماعت سے غلطی نہیں ہو سکتی۔ جیسا کہ ہلال کا مسئلہ ہے۔ ایک انسان تو یہ گمان کر سکتا ہے کہ یہ ہلال ہے؛ جب کہ بہت بڑی تعداد سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ سارے لوگوں کو دھوکہ ہو گیا ہو۔

ہم جانتے ہیں کہ جب مسلمان کثرت کے ساتھ جمع ہو جائیں؛ ان میں فواحش اور ظلم کے دواعی اس کی نسبت کم ہو جاتے ہیں کہ اگر وہ کم تعداد میں ہو۔ اس لیے کہ اجتماع کی صورت میں شریعت اسلام کی مخالفت میں ان لوگوں کا اجماع نہیں ہوتا۔ جیسا کہ ایک یا دو انسانوں سے ممکن ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اجتماع اور تمدن عادلانہ قانون کے بغیر ممکن نہیں۔ کسی شہر کے رہنے والوں سے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ مطلق طور پر ایک دوسرے پر ظلم کرنے پر متفق ہو جائیں۔ کیونکہ اس صورت میں تو زندگی اجیرن ہو جائے گی۔ بلکہ ہم ایسے بھی دیکھتے ہیں کہ جب کوئی حاکم یا امیر اپنی بعض رعیت پر ظلم کرتا ہے تو اس کے بعض ساتھی ایسے بھی ہوتے ہیں جو اس ظلم میں اس کے ساتھ شریک نہیں ہوتے۔ جس چیز میں سارے برابر ہوں اس میں کسی پر کوئی ظلم نہیں ہوتا۔ اور یہ بھی معلوم ہے کہ اجماع کی مخالفت کرنے والے کا حکم افراد اور شاذ کا حکم ہوتا ہے۔ بھلے اس اجماع کی نوعیت کچھ بھی ہو۔

اس کی ایک مثال یوں بیان کی جاتی ہے: یہ ایک بدیہی بات ہے کہ انسان ایک تیر کو بآسانی توڑ سکتا ہے، مگر بہت سے تیروں کو توڑنا مشکل ہے۔ اور ایک انسان پر دشمن غالب آ سکتا ہے'اسے شکست سے دو چار کر سکتا ہے؛ مگر جب یہی لوگ کثرت تعداد میں ہو جاتے ہیں تو پھر وہ بات ممکن نہیں رہتی جو انفرادی حالت میں ممکن تھی۔

ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر اجماع میں خطا کا امکان ہوتا ہے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عصمت ثابت نہیں ہو سکے گی؛ جیسا کہ شیعہ مذہب میں ان کا عقیدہ ہے۔ اس لیے کہ [ان کا کہنا ہے کہ] عصمت علی رضی اللہ عنہ کا اثبات اور غیروں سے عصمت کی نفی بھی [شیعہ عقیدہ کے مطابق] اجماع کے رہین منت ہیں۔ اگر شیعہ اجماع پر معترض ہو کر کہیں گے: اجماع میں خطاء ممکن ہے

؛تو پھر یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سوا دوسرے لوگ بھی معصوم ہوسکیں گے۔اور عصمت صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ تک خاص نہ رہے گی۔تو اس سے معلوم ہوا کہ اجماع پر قدح کرنے سے ان کے عقیدہ کی ان بنیادوں پر وار ہوتی ہے جن پر انہوں امامت معصوم کی عمارت کھڑی کر رکھی ہے۔جب آپ کی عصمت کا بطلان ثابت ہوگیا تو ان کا ایک مذہبی قاعدہ باطل ٹھہرا؛ اور اگر اسے حجت قرار دیکر تسلیم کریں گے [تو اصحاب ثلاثہ کی خلافت پر منعقد شدہ اجماع کو تسلیم کرنا پڑے گا]۔ہر دو لحاظ سے ان کا سارا مذہب باطل ثابت ہوگا۔

[اعتراض] :شیعہ مصنف لکھتا ہے:''ہم وہ نصوص ذکر کر چکے ہیں جن سے امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اثبات ہوتا ہے،لہٰذا اس کے خلاف جو اجماع بھی انعقاد پذیر ہوگا وہ غلط ہوگا۔اس لیے کہ اہل سنت کے نزدیک خلاف نص واقع ہونے والا اجماع غلط ہوتا ہے۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جواب]:

پہلی بات: ہم قبل ازیں خلفاء ثلاثہ سے پہلے امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اثبات میں شیعہ کے دلائل کا ابطال کرکے اس کے خلاف براہین و دلائل قائم کر چکے ہیں۔

دوسری بات: نصوص دلالت کرتی ہیں کہ خلفاء ثلاثہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پہلے خلیفہ بنے تھے۔

تیسری بات: مزید براں ہمارے پیش کردہ دلائل مؤیَّد بالا جماع قطعی ہیں؛ سمعی نہیں۔خصوصاً جب کہ بہت ساری نصوص اس کے موافق بھی ہیں۔بفرض محال اگر کوئی دلیل خلاف اجماع ہوگی تو وہ باطل ہوگی یا اس سے مدّعا کا اثبات نہیں ہوگا۔اس کی دو وجوہات ہیں: یا تو وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان نہیں ہوگا۔یا پھر اس میں سرے سے کوئی دلیل ہی نہیں ہوگی۔

چوتھی بات: نص معلوم اور اجماع معلوم کے مابین تعارض ممتنع ہے،اس لیے کہ یہ دونوں حجت قطعی ہیں اور قطعیات میں تعارض جائز نہیں ہے؛ اس لیے کہ ان کی مدلولات کا موجود ہونا واجب ہوتا ہے؛ ورنہ اجتماع نقیضین لازم آئے گا۔

جو کوئی بھی ایسے اجماع کا دعوی کرتا ہے جو نص کے خلاف ہو تو اس سے دو میں سے ایک بات لازم آتی ہے:

۱۔ یا تو وہ اجماع باطل ہوگا۔ ۲۔ یا پھر وہ نص باطل ہوگی۔

جس نص کی مخالفت پر پوری امت جمع ہو جائے اس کا کسی دوسری نص سے منسوخ ہونا معلوم ہوتا ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ امت میں ایک نص معلوم باقی ہو، وہ منسوخ بھی نہ ہو اور اس کے خلاف اجماع بھی منعقد ہو جائے۔حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت کے بارے میں نص اجماع کے وجود سے ان دلائل کا ابطال ہوتا ہے جو شیعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے بارے میں پیش کرتے ہیں۔اور ہمیں شیعہ کے پیش کردہ دلائل باطل ہونا کثرت نصوص کی روشنی میں معلوم ہے۔

❁❁❁❁

فصل:

[شیعہ اقتداء شیخین رضی اللہ عنہما کے منکر]

[اعتراض] : شیعہ مصنف لکھتا ہے: امر دوم: ''اہل سنت یہ حدیث پیش کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
''ان دو کی پیروی کرو جو میرے بعد ہوں گے' یعنی ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما [کی پیروی کرو]۔'' اس کا جواب یہ ہے کہ ہم اس روایت کو تسلیم نہیں کرتے۔ مزید براں اس حدیث سے ان کی امامت و خلافت ثابت نہیں ہوتی۔ اس حدیث میں ان کی اقتداء کا حکم دیا گیا ہے۔ ہم فقہاء کی بھی اقتداء کرتے ہیں، اس سے ان کا امام ہونا لازم نہیں آتا۔ علاوہ ازیں ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے مابین بہت سارے مسائل و احکام اختلاف پایا جاتا ہے، اس لیے دونوں کی پیروی ممکن ہی نہیں۔ نیز یہ روایت مشہور حدیث ''اَصْحَابِی کَالنُّجُوْمِ'' کے خلاف ہے۔ اس کے علاوہ ان کا ان دونوں کے امامت کے منفی ہونے پر اجماع بھی ہے۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جواب] : ہم کہتے ہیں: اہل علم محدثین کا اجماع ہے کہ یہ روایت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امامت کے متعلق شیعہ کی پیش کردہ نص سے ہر حال میں اقوی ہے۔ محدثین کی معتمد کتابوں میں یہ روایت معروف ہے؛ اسے امام احمد نے مسند میں؛ ابوداؤد نے سنن میں اور ترمذی نے جامع میں نقل کیا ہے۔ [1]

بخلاف ازیں امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اثبات میں پیش کردہ نصوص محدثین کی کسی بھی قابل اعتماد کتاب میں نہیں پائی جاتیں؛ محدثین یک زبان ہیں کہ: یہ سب باطل روایات ہیں۔ حتی کہ محدث ابن حزم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''ہم نے امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نص ایک مجہول راوی سے پائی ہے، جو دوسرے مجہول راوی سے نقل کرتا ہے، اس کی کنیت ابوالحمراء ہے ہمیں نہیں معلوم کہ مخلوق خدا میں وہ کون ہے؟'' [الفصل ٤/ ١٦١]

اب یہ بات ممتنع ہے کہ اس روایت کو تو جھٹلا دیا جائے' اور امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت کی تصدیق کی جائے۔

❀ جہاں تک اس روایت سے دلالت کا تعلق ہے؛ تو اس حدیث میں اپنے بعد دو لوگوں کی اقتداء کا حکم دیا گیا ہے؛ اور یہ بھی بتایا ہے کہ وہ دونوں حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ ظالم و مرتد نہ تھے کیوں کہ ظالم و مرتد دوسروں کا پیشوا نہیں بن سکتا۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

﴿لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ﴾ (البقرۃ: ۱۲۴) ''میرے عہد کو ظالم نہ پاسکیں گے۔''

اس کا مطلب یہ ہے کہ ظالم کی اقتداء نہیں کی جائے گی۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعد ان دو حضرات کی اقتداء کا حکم دیا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ امام و پیشوا ہونگے۔ اور ساتھ یہ بھی خبر دیدی کہ یہ میرے بعد ہونگے۔ تو یہ کھلی ہوئی دلیل ہے کہ یہ دونوں حضرات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اس امت کے امام ہوں گے اور ان کی اتباع و پیروی کرنی ہوگی۔ یہی

[1] سنن ترمذی، کتاب المناقب، باب(١٦/ ٣٥)، (حدیث:٣٦٦٢، ٣٦٦٣)، سنن ابن ماجة۔ المقدمة۔ باب فضل ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہ (حدیث:٩٧)، مسند احمد (٥/ ٣٨٢، ٣٩٩)۔

چیز مطلوب ہے۔

❀ رافضی کا یہ کہنا کہ: ''ان کے مابین بہت سارے مسائل میں اختلاف پایا جاتا ہے۔'' حقیقت میں معاملہ ایسے نہیں ہے۔ بلکہ حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کے مابین اختلاف شاذ و نادر چند ایک مسائل ہی میں پایا جاتا ہے۔ بلکہ غالب طور پر ایسے ہوتا ہے کہ ان میں سے کسی ایک سے ایک مسئلہ میں دو روایتیں منقول ہوتی ہیں۔ مثلاً: اس مسئلہ میں کہ جب میت کا دادا زندہ ہو اور اس کے بھائی بھی بقید حیات ہوں تو ترکہ کس طرح تقسیم کیا جائے گا؟ اس مسئلہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے دو روایتیں منقول ہیں، ایک روایت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی رائے کے موافق ہے۔

❀ نیز یہ مسئلہ کہ مال غنیمت کی تقسیم مساوی طور پر کی جائے گی یا اس میں تفاوت درجات کو ملحوظ رکھا جائے گا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مساوات تو جائز ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مال فئے اور غنیمت کی تقسیم کیا کرتے تھے۔ آپ غنیمت اور فئے کے مستحقین کو برابر دیا کرتے تھے۔ لیکن اختلاف کسی کو فضیلت دینے کے جواز میں ہے۔ اس مسئلہ میں فقہاء کے دو قول ہیں۔ اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے بھی دو روایتیں منقول ہیں۔ صحیح یہ ہے کہ مصلحت کے تحت کسی کو زیادہ دینا جائز ہے۔ اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کبھار مصلحت کے تحت غنیمت اور فئے کی تقسیم میں بعض لوگوں کو فضیلت دیا کرتے تھے۔

❀ حضرت خالد بن ولید کے عزل ونصب میں بھی ان کے مابین اختلاف پیدا ہوا تھا۔ ان میں سے ہر ایک نے وہی کیا جو اس وقت کے لحاظ سے زیادہ مناسب تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دور میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو سپہ سالار مقرر کرنا زیادہ مناسب تھا۔ اس لیے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نسبت بہت نرم مزاج تھے۔ اس لیے ضروری تھا کہ آپ کا نائب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نائب کی نسبت قوی تر ہو۔ جب کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لیے یہی مناسب تھا کہ آپ کا نائب اور سالار حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ جیسا شفیق انسان ہو۔ اس کی مثالیں بہت زیادہ ہیں۔

❀ شرائع کلیہ کے احکام میں ان دونوں حضرات کا اختلاف نادر، بلکہ معدوم ہے۔ یا پھر ان میں سے کسی ایک کے ایک مسئلہ میں دو قول ہیں۔

❀ زیر تبصرہ حدیث میں بتایا گیا ہے کہ ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کی اقتداء کی جانی چاہیے خواہ وہ متحد الخیال ہوں یا مختلف الخیال۔ پس اس صورت میں یہ مسئلہ نکلتا ہے جس مسئلہ میں کسی ایک کے دو قول ہوں تو اس قول کی پیروی کی جائے جس میں دونوں متحد الخیال ہوں۔

❀ باقی رہی حدیث '' اَصْحَابِی کَالنُّجُوْمِ بِأَیِّهِمْ اقْتَدَیْتُمْ اهْتَدَیْتُمْ.''

تو یہ روایت ائمہ حدیث کے نزدیک ضعیف ہے، اس لیے قابل احتجاج نہیں۔ [1]

امام بزار رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''یہ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح سند کے ساتھ ثابت نہیں اور نہ ہی حدیث کی معتمد کتابوں میں اس کا کوئی اتہ پتہ ملتا ہے۔

[1] تفصیل کے لیے دیکھیں۔ سلسلة الاحادیث الضعیفة للشیخ الالبانی رحمه الله (رقم:۵۸)

مزید برآں اس روایت میں: ''بعدی'' یعنی میرے بعد کے الفاظ نہیں ہیں؛ یہاں پر حجت اسی لفظ میں ہے۔نیز اس روایت میں ان کی اقتداء کا حکم نہیں ہے؛ جب کہ دوسری روایت میں شیخین کی اقتداء کا حکم ہے۔

فصل:

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پر رافضی اعتراضات

❀ رافضی مصنف کہتا ہے: امر سوم: '' جو کچھ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے فضائل میں وارد ہوا ہے جیسا کہ آیت غار؛ اور آیت قرآنی ﴿وَ سَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى﴾ [الليل ١٧]؛ اور آیت: ﴿قُلْ لِّلْمُخَلَّفِينَ مِنَ الْاَعْرَابِ سَتُدْعَوْنَ اِلٰى قَوْمٍ اُولِىْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ﴾ [الفتح ١٦] ''دیہاتیوں میں سے پیچھے چھوڑے جانے والوں سے کہہ دیجیے: عنقریب تم ایک سخت لڑنے والی قوم کی طرف بلائے جاؤ گے۔'' یہاں پر داعی سے مراد ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں؛ اور یہ کہ آپ بدر کے دن رسول اللہ ﷺ کے خیمہ میں آپ کے ساتھ تھے۔اور آپ نے نبی کریم ﷺ پر اپنا مال خرچ کیا؛ اور نماز میں آپ کو مقدم کیا گیا۔'' ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں: غار کے قصہ میں کوئی فضیلت نہیں ہے۔ یہ ممکن ہے کہ انہیں اس خوف کے پیش نظر ساتھ لے لیا ہو کہ کہیں وہ آپ کا معاملہ ظاہر نہ کردے۔ نیز یہ کہ یہ آیت اس کے نقیض پر دلالت کرتی ہے۔اس لیے کہ آیت میں: ﴿لَا تَحْزَنْ﴾ کے الفاظ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بے صبری؛ اللہ تعالیٰ پر عدم ایمان؛ نبی کریم ﷺ کے ساتھ مساوات اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے قضاء و تقدیر پر عدم رضامندی؛ ظاہر کررہے ہیں۔اس لیے کہ یہ غم و حزن اگر اطاعت کا کام تھا تو پھر یہ بات محال ہے کہ رسول اللہ ﷺ اس سے منع کردیں۔ اور اگر یہ معصیت کا کام تھا تو پھر جس چیز کو یہ لوگ فضیلت ظاہر کررہے ہیں؛ حقیقت میں وہ ذلت و رسوائی ہے۔''

نیز کہ آیت کریمہ ﴿فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَالْمُؤْمِنِيْنَ﴾ ''پس اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پر اور مؤمنین پر اپنا سکون نازل فرمایا۔'' قرآن میں جب بھی رسول اللہ ﷺ پر سکینہ نازل کرنے کا ذکر ہوا ہے تو واضح طور پر اہل ایمان کو سکون و اطمینان کا مورد [اور اس سکون میں آپ کا شریک] قرار دیا گیا ہے، مگر آیت زیر تبصرہ میں یہ صراحت موجود نہیں۔'' اس سے بڑھ کر کوئی نقص نہیں ہوسکتا۔

❀ نیز یہ کہ آیت قرآنی ﴿وَ سَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى﴾ حضرت ابوالدحداح رضی اللہ عنہ سے متعلق ہے [حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے متعلق نہیں]۔اس لیے کہ آپ نے اپنے پڑوسی کے لیے کھجور کا درخت خرید کر وقف کردیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ اس کھجور کے مالک کو جنت میں کھجور کے ایک درخت کی پیشکش کی تھی؛ مگر وہ نہ مانا۔ یہ بات حضرت ابودحداح رضی اللہ عنہ نے سن لی؛ تو انہوں نے پورا باغ خرید کر اپنے پڑوسی کو ہبہ کردیا۔تو رسول اللہ ﷺ نے اس کے عوض جنت میں ایک باغ کی خوشخبری سنائی۔

❀ رہی یہ آیت: ﴿قُلْ لِّلْمُخَلَّفِينَ مِنَ الْاَعْرَابِ سَتُدْعَوْنَ اِلٰى قَوْمٍ اُولِىْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ﴾؛ یہاں مراد یہ ہے کہ: ہم تمہیں ایک قوم کی طرف بلائیں گے۔ یہاں پر مراد وہ لوگ ہیں جو صلح حدیبیہ سے پیچھے رہ گئے تھے۔ اور یہ لوگ

چاہتے تھے کہ خیبر کا مال غنیمت حاصل کرنے کے لیے جائیں ۔تو اللہ تعالیٰ نے انہیں روک دیا؛ اور فرمایا: ﴿قُلْ لَنْ تَتَّبِعُوْنَا﴾ آپ فرما دیجیے: تم ہرگز ہماری اتباع نہ کرو گے ۔اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے خیبر کے اموال غنیمت کو ان لوگوں کے لیے خاص کر دیا تھا جو صلح حدیبیہ میں شریک ہوئے تھے ۔پھر فرمایا: ﴿قُلْ لِّلْمُخَلَّفِيْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ سَتُدْعَوْنَ﴾ ؛ یہاں پر مراد یہ ہے کہ: ہم عنقریب تمہیں سخت لڑاکا قوم سے جنگ کرنے کے لیے بلائیں گے ۔پس رسول اللہ ﷺ نے انہیں بہت سارے غزوات کی طرف بلایا تھا؛ جن میں غزوہ موتہ؛ غزوہ حنین؛ تبوک اور دوسرے غزوات ۔پس یہ داعی رسول اللہ ﷺ تھے ۔اور یہ بھی جائز ہے کہ: یہ داعی حضرت علی رضی اللہ عنہ ہوں ۔اس لیے کہ آپ نے عہد توڑنے والوں اور نافرمانوں اور دین سے خروج کرنے والوں سے جہاد کیا۔ان لوگوں کا آپ کی اطاعت کی طرف رجوع کرنا ہی اصل اسلام تھا۔اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ''اے علی! تیرے ساتھ جنگ کرنا میرے ساتھ جنگ کرنا ہے ۔'' اور رسول اللہ ﷺ سے جنگ کرنا کفر ہے ۔

- جب کہ بدر کے موقع پر جھونپڑے میں آپ ﷺ کے ساتھ ہونے میں کوئی فضیلت نہیں ۔اس لیے کہ نبی کریم ﷺ کے اللہ تعالیٰ کے ساتھ انس نے آپ کو دیگر ہر مونس و غمخوار سے بے نیاز کر دیا تھا۔لیکن جب رسول اللہ ﷺ نے دیکھا کہ اگر آپ ابوبکر رضی اللہ عنہ کو جنگ لڑنے کا حکم دیں گے تو اس سے فساد پیدا ہوگا؛ اس لیے کہ آپ اس سے پہلے کئی بار غزوات میں بھاگ چکے تھے ۔پس یہ دیکھنا چاہیے کہ کون سا انسان افضل ہے جو جہاد سے بیٹھا رہے یا پھر وہ شخص جو اپنے مال و جان سے جہاد فی سبیل اللہ کرے ۔
- اور یہ جھوٹ ہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ پر خرچ کیا کرتے تھے، اس لیے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ مال دار نہ تھے ۔آپ کا باپ فقیر انسان تھا جو کہ ہر دن چند ٹکڑوں کے عوض عبداللہ بن جدعان کے دستر خوان پر منادی کیا کرتا تھا۔اگر ابوبکر واقعی مال دار ہوتا تو وہ اپنے باپ کی ضرورت پوری کرتا ۔
- اور یہ کہ ''ابوبکر رضی اللہ عنہ عہد جاہلیت میں بچوں کو تعلیم دینے کے لیے ایک پیشہ ور معلم تھے ۔اور اسلام لانے کے بعد درزی کا کام کیا کرتے تھے ۔جب آپ مسلمانوں کے ولی الامر بن گئے تو لوگوں نے آپ کو درزی کا کام کرنے سے روک دیا۔تو آپ کہنے لگے: مجھے تو اپنی روزی کے لیے ضرورت ہے ۔تو اس پر آپ کے لیے بیت المال سے یومیہ تین درہم وظیفہ مقرر کر دیا۔رسول اللہ ﷺ ہجرت سے قبل حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے مال کی وجہ سے غنی تھے' اور اس وقت جنگوں یا لشکروں کی تیاری کے لیے کسی چیز کی ضرورت بھی نہیں تھی ۔ہجرت کے بعد تو کوئی چیز تھی ہی نہیں ۔پھر اگر آپ نے کچھ خرچ کیا ہوتا تو ضرور اس کی تعریف میں قرآن بھی نازل ہوتا؛ جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں یہ آیت نازل ہوئی ہے: ﴿هل أتى علي﴾
- اور یہ بات معلوم شدہ ہے کہ جن لوگوں پر امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ نے خرچ کیا' رسول اللہ ﷺ ان سب سے افضل و اشرف تھے ۔جس مال کے خرچ کا یہ لوگ دعوی کرتے ہیں' وہ بہت زیادہ ہے ۔مگر پھر بھی اس بارے میں قرآن کا نازل نہ ہونا ان کی روایات کے جھوٹ ہونے پر دلالت کرتا ہے ۔

❀ جہاں تک نماز کے لیے امام بنانے کا تعلق ہے؛ یہ بھی غلط ہے۔اس لیے کہ جب بلال رضی اللہ عنہ نے نماز کے لیے اذان دی تو عائشہ رضی اللہ عنہا نے حکم دیا کہ: ابوبکر رضی اللہ عنہ کو نماز کے لیے آگے کیا جائے۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو افاقہ ہوا تو آپ نے تکبیر کی آواز سنی؛ آپ نے پوچھا: نماز کون پڑھا رہا ہے؟ تو لوگ کہنے لگے: ابوبکر رضی اللہ عنہ۔ تو آپ نے فرمایا: مجھے لے چلو؛ تو آپ حضرت عباس اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کے درمیان چلتے ہوئے آئے' اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کو قبلہ سے ہٹا کر نماز سے معزول کر دیا۔ اور خود نماز پڑھائی۔''

❀ [پھر] رافضی نے کہا ہے: ان لوگوں کے دلائل کا یہ عالم ہے۔ عقلمند کو انصاف کی نظر سے دیکھنا چاہیے تاکہ وہ حق کی اتبع کا قصد کر سکے؛ اور خواہشات کے پیچھے نہ پڑا رہے۔ اور اپنے آباء و اجداد کی تقلید کو ترک کر دے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اس سے منع کیا ہے۔ اور انسان کو اس کی دنیا حق دار تک حق پہنچانے سے غافل نہ کر دے۔ اور نہ ہی مستحق کو اس کے حق سے روکے۔ یہ آخری بات ہے جو ہم اس مقدمہ میں ثابت کرنا چاہتے تھے۔'' [انتہی کلام الرافضی]

جوابات:

❁ ہم شیعہ مصنف کے اعتراضات کے جواب میں کہتے ہیں کہ: اس کلام میں اتنا جھوٹ' بہتان اور افتراء پردازی ہے کہ اتنا جھوٹ اسلامی گروہوں میں سے کسی ایک کے ہاں بھی نہیں دیکھا گیا۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ رافضی قوم میں یہودیوں کی بہت زیادہ قوی مشابہت پائی جاتی ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنی پھونکوں سے بجھا دیں' مگر اللہ تعالیٰ ہر حال میں اپنے نور کو پورا کرنا چاہتا ہے بھلے وہ کافروں کو ناگوار ہی کیوں نہ ہو۔

❀ ہر عقلمند انسان کے لیے حضرات شیخین اسلام جناب ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے فضائل کھلے ہوئے اور صاف واضح ہیں۔ اور ان کی فضیلت دوسرے صحابہ کرام پر عیاں راچہ بیاں کے مصداق ہے۔ جب کہ یہ رافضی چاہتے ہیں کہ حقائق کو تبدیل کر ڈالیں۔ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے مصداق چل رہے ہیں:

﴿فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ کَذَبَ عَلَی اللّٰهِ وَ کَذَّبَ بِالصِّدْقِ اِذْ جَآئَهٗ﴾ [الزمر ۳۲]

''پھر اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جس نے اللہ پر جھوٹ باندھا اور جب سچی بات اس کے سامنے آئی تو اسے جھٹلا دیا۔''

نیز اللہ تعالیٰ کہ یہ فرمان بھی ان لوگوں پر صادق آتا ہے:

﴿فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ کَذِبًا اَوْ کَذَّبَ بِاٰیٰتِهٖ اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الْمُجْرِمُوْنَ﴾ [یونس ۱۷]

''پھر اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹ باندھے یا اس کی آیتوں کو جھٹلائے ایسے مجرم کبھی فلاح نہیں پاتے۔''

اس میں کوئی شک نہیں کہ رافضی حق کی تکذیب اور باطل کی تصدیق کرنے میں سب سے آگے بڑھے ہوئے ہیں۔ اس باب میں امت میں کوئی دوسرا ان کے برابر نہیں ہو سکتا۔

[اب جملہ اعتراضات کا تفصیلی جواب ملاحظہ فرمائیں]:

واقعہ غار کی فضیلت:

[پہلا اعتراض]: غار کے واقعہ میں کوئی فضیلت نہیں ہے۔''

❀ غار کے واقعہ سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی فضیلت نص قرآنی سے واضح ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اِذْ یَقُوْلُ لِصَاحِبِہٖ لَاتَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا﴾ [التوبۃ ۴۰]

''جب یہ اپنے ساتھی سے کہہ رہے تھے کہ غم نہ کر اللہ ہمارے ساتھ ہے۔''

یہاں پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی ہے کہ: بیشک اللہ تعالیٰ ان کے اور ابوبکر رضی اللہ عنہ دونوں کے ساتھ ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام سے فرمایا تھا: ﴿اِنَّنِیْ مَعَکُمَآ اَسْمَعُ وَ اَرٰی﴾ (طٰہ ۴۶)

''بیشک میں تم دونوں کے ساتھ ہوں' سنتا ہوں اور دیکھتا ہوں۔'' یہ معیت خاصہ ہے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جب ہم غار میں تھے تو میں نے دیکھا کہ دشمنوں کے پاؤں ہمارے سر کے اوپر تھے۔ میرے جی میں آیا کہ اگر کفار میں سے کوئی اپنے پاؤں پر نظر ڈالے تو ہم کو دیکھ لے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ابوبکر! ان دو آدمیوں کے بارے میں آپ کو کیا خطرہ لاحق ہے جن کا تیسرا اللہ ہو۔''[1]

اس حدیث کے متفق علیہ ہونے کے ساتھ ساتھ تمام اہل محدثین کا اس کی صحت پر اتفاق ہے؛ اور اسے قبول و تصدیق حاصل ہے۔ اور اس میں کبھی بھی دو آدمیوں نے اختلاف نہیں کیا۔ یہ بالکل معنوی لحاظ سے قرآنی دلالت کے عین مطابق ہے۔ جیسا کہ اس آیت میں ہے:

﴿اِذْ یَقُوْلُ لِصَاحِبِہٖ لَاتَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا﴾ [التوبۃ ۴۰]

''جب یہ اپنے ساتھی سے کہہ رہے تھے کہ غم نہ کر اللہ ہمارے ساتھ ہے۔''

کتاب اللہ میں معیت کا استعمال دو طرح سے ہوتا ہے۔ خاص معیت اور عام معیت۔

معیت عامہ' جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ھُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّۃِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ یَعْلَمُ مَا یَلِجُ فِی الْاَرْضِ وَمَا یَخْرُجُ مِنْھَا وَمَا یَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا یَعْرُجُ فِیْھَا وَھُوَ مَعَکُمْ اَیْنَ مَا کُنْتُمْ﴾ (الحدید: ۴)

''اسی نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا پھر عرش پر قائم ہوا۔ جو چیز زمین میں داخل ہوتی، اسے بھی جانتا ہے اور جو نکلتی ہے اسے بھی (اسی طرح) جو چیز آسمان سے اترتی ہے وہ اسے بھی جانتا ہے اور جو کچھ اس میں چڑھتا ہے اسے بھی۔ اور جہاں کہیں بھی تم ہو وہ تمہارے ساتھ ہے۔''

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

---

[1] صحیح بخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ باب مناقب المھاجرین و فضلھم (ح: ۳۶۵۳، ۳۹۲۲)، صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابۃ، باب من فضائل ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہ (ح: ۲۳۸۱)۔

﴿اَلَمْ تَرَى اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مَا يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوَى ثَلَاثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَلَا اَدْنٰى مِنْ ذٰلِكَ وَلَا اَكْثَرَ اِلَّا هُوَ مَعَهُمْ اَيْنَ مَا كَانُوْا ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ﴾ (المجادلة ۷)

''کیا آپ دیکھتے نہیں کہ جو کچھ بھی آسمانوں اور زمین میں موجود ہے اللہ اسے خوب جانتا ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ تین آدمیوں میں مشورہ ہو تو چوتھا وہ (اللہ) نہ ہو یا پانچ آدمیوں میں مشورہ ہو تو ان کا چھٹا وہ نہ ہو۔ (مشورہ کرنے والے) اس سے کم ہوں یا زیادہ، وہ یقیناً ان کے ساتھ ہوتا ہے خواہ وہ کہیں بھی ہوں۔ پھر وہ قیامت کے دن انہیں بتا بھی دے گا جو کچھ وہ کرتے رہے۔ بلاشبہ اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔''

یہاں پر معیت کا لفظ عام ہے جو ہر سرگوشی اور مشورہ کرنے والے کو شامل ہے؛ اور ایسے ہی پہلی آیت میں معیت عام ہے جو تمام خلق کو شامل ہے۔

جب اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ وہ اپنی معیت کے اعتبار سے تین کیساتھ چوتھا ہوتا ہے۔ اور پانچ کیساتھ چھٹا ہوتا ہے۔ تو نبی کریم ﷺ نے بھی یہی فرمایا کہ: ''ان دو آدمیوں کے بارے میں آپ کو کیا خطرہ لاحق ہے جن کا تیسرا اللہ ہو۔'' اس لیے کہ جب اللہ ان کے ساتھ تھا تو وہی تیسرا تھا۔ جیسا کہ قرآن کریم اس حدیث کے معانی پر دلالت کرتا ہے۔ اگر چہ یہ معیت خاص ہے؛ اور آیت میں مذکور معیت عام ہے۔

جب کہ معیت خاصہ ؛ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام سے فرمایا تھا: ﴿اِنَّنِيْ مَعَكُمَا اَسْمَعُ وَ اَرٰى﴾ (طٰہ ۴۶) ''بیشک میں تم دونوں کے ساتھ ہوں' سنتا ہوں اور دیکھتا ہوں۔'' یہ معیت خاصہ ہے۔ جس میں فرعون اور اس کی قوم کو چھوڑ کر ان دو انبیاء کرام علیہما السلام کی تخصیص کی گئی ہے۔ جب کہ پہلی معیت عام ہے۔ یہاں پر حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کی تخصیص ہے۔

ایسے ہی جب رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ﴿لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا﴾ تو اس سے مراد یہ ہوئی کہ: اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے' ان مشرکین کے ساتھ نہیں جو آپ سے دشمنی رکھتے ہیں' اور ان دونوں کی طلب میں لگے ہوئے ہیں جو غار کے منہ تک پہنچ گئے تھے۔ اور اگر ان میں سے کوئی ایک اپنے پاؤں کی طرف دیکھتا تو وہ انہیں دیکھ لیتا۔

یہاں پر رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان: ﴿اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا﴾ سے مقصود خاص معیت ہے۔ جو اس پر دلالت کرتی ہے کہ انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف تائید اور کامیابی حاصل ہوگی؛ اور دشمن کے خلاف نصرت ملے گی۔ گویا کہ رسول اللہ ﷺ یہ بتا رہے ہیں کہ: اے ابوبکر! بیشک اللہ تمہاری میری بھی مدد کرے گا اور تیری بھی مدد کرے گا؛ اور ہمیں ان کے خلاف کامیابی عطاء فرمائے گا۔ پس اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ مدد اکرام و محبت کی مدد ہوگی۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا﴾ [غافر ۵۱]

''یقیناً ہم اپنے رسولوں کی اور ایمان والوں کی مدد زندگانی دنیا میں بھی کریں گے۔''

یہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی مدح کی انتہاء ہے۔ اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے آپ کے لیے صاحب ایمان ہونے کی

گواہی دی ہے۔اور اس حالت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کی اور رسول اللہ ﷺ کی مدد کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو تمام مخلوق سے بے نیاز کر دیا تھا۔جیسا کہ فرمان الٰہی ہے:

﴿إِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ إِذْ أَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ﴾ [التوبة:۴۰]

''اگر تم آپ کی مدد نہیں کرتے ،تو کچھ مضا ئقہ نہیں، اللہ تعالیٰ نے آپ کی مدد کی تھی ۔ جب کافروں نے آپ کو نکال دیا تھا۔ جب آپ دو کے دوسرے تھے۔ جب وہ دونوں غار میں تھے۔''

اسی لیے محدث سفیان ابن عیینہ رحمہ اللہ اور دیگر محدثین فرماتے ہیں:

''نبی ﷺ کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کے سوا سب لوگوں کو معتوب کرتے ہوئے فرمایا ہے۔ اور آپ یہ بھی فرماتے ہیں: جو کوئی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے صحابی ہونے کا انکار کرے' وہ کافر ہے۔''

امام ابوالقاسم سہیلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''یہ معیت خاصہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے سوا کسی اور کے لیے ثابت نہیں ہوئی۔''

ایسے ہی رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمانا کہ:'' ما ظنك بائنين الله ثالثهما ۔'''' ان دو آدمیوں کے بارے میں آپ کو کیا خطرہ لاحق ہے جن کا تیسرا اللہ ہو۔'' یہاں پر اختصاص لفظی اور معنوی طور پر ہر دو طرح سے ظاہر ہوتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے لیے کہا جاتا تھا:'' محمد رسول اللہ۔'' پس آپ کے بعد جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مسند ولایت پر جلوہ افروز ہوئے تو کہا جانے لگا:'' خلیفہ رسول اللہ۔'' پس لوگ خلیفہ کی اضافت رسول اللہ ﷺ کی طرف کیا کرتے تھے۔ جن کی اضافت اللہ تعالیٰ کی طرف تھی۔اور یہی اس کلمہ کی تحقیق ہے: ﴿إِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا﴾ اور اس کلمہ:'' ما ظنك بائنين الله ثالثهما۔'' کی حقیقی تفسیر وتوضیح اسی صورت میں ممکن ہے۔

پھر جب آپ کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے تو کہا جانے لگا:'' امیر المؤمنین۔'' پس وہ اختصاص ختم ہو گیا جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ خاص تھا۔

[صحابی کی تعریف]:

اور مزید اس چیز سے یہ مؤقف واضح ہوتا ہے کہ اس صحبت میں عموم وخصوص پایا جاتا ہے۔کہا جاتا ہے کہ:

''فلاں کو ایک گھڑی کی صحبت نصیب ہوئی ؛ فلاں کو ایک دن کی صحبت نصیب ہوئی ؛ ایک ہفتہ کی ؛ ایک ماہ کی؛ اور سال کی صحبت نصیب ہوئی ۔ اور فلاں نے تمام عمر صحبت میں گزار دی۔''

جب یہ معلوم ہو گیا کہ صحبت کا لفظ عام ہے جو قلیل و کثیر سب کو شامل ہے؛ اس کی سب سے ادنی مقدار یہ ہے کہ کچھ تھوڑا سا زمانہ صحبت حاصل رہے۔ یہ بات معلوم ہے کہ: حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ صحابیت کی اعلی بلندیوں پر ہیں۔ آپ کا مرتبہ سب سے اعلی ہے۔ اس لیے کہ آپ اس وقت صحابی بنے جب اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو مبعوث کیا ؛ اور مرتے دم تک آپ کی صحبت میں رہے۔ اور تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ آزاد مردوں میں سے نبی کریم ﷺ پر سب سے پہلے ایمان لانے والی ہستی جناب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔ جیسا کہ اس بات پر بھی اجماع ہے کہ عورتوں میں سب سے پہلے ایمان لانے والی شخصیت

جناب ام المؤمنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا ہیں ۔ اور بچوں میں سب سے پہلے ایمان لانے والے حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں ۔ اور غلاموں میں سے پہلے مؤمن حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ ہیں ۔ لیکن اس بات میں اختلاف ہے کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بعد سب سے پہلے کلمہ توحید کس نے پڑھا ۔ اگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا اقرار توحید حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پہلے ثابت ہو جائے تو پھر آپ صحبت میں بھی مقدم ہوئے ۔ جیسا کہ آپ کو ایمان میں سبقت حاصل ہے ۔ اور اگر پہلے حضرت علی رضی اللہ عنہ اسلام لائے تھے تو پھر بھی اس بات میں کوئی شک نہیں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صحبت زیادہ کامل اور نفع بخش تھی ۔ کیونکہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ امورِ دعوت میں شریک ہو گئے ۔ آپ کے ہاتھ پر اکابر اہل شوری اسلام لائے ۔ جیسا کہ حضرت عثمان' حضرت طلحہ' حضرت زبیر' حضرت سعد' حضرت عبدالرحمن رضی اللہ عنہم ۔ نیز آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایذاء رسانوں سے دفاع کرتے تھے ۔ اور آپ کے ساتھ قبائل کو اسلام کی دعوت دینے کے لیے نکلتے ؛ اور امور دعوت میں آپ کے معین و مددگار ہوتے ۔

آپ ان لوگوں کو خرید کر آزاد کرتے جنہیں ایمان لانے کی پاداش میں عذاب دیا جا رہا ہوتا ؛ جیسا کہ حضرت بلال' حضرت عمار اور دیگر مظلوم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین ۔ آپ نے سات ایسے لوگوں کو خرید کر آزاد کیا جنہیں اللہ پر ایمان لانے کے جرم میں ستایا جاتا تھا ۔ آپ علی الاطلاق اپنی صحبت میں سب سے زیادہ نفع بخش انسان تھے ۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے احوال جاننے والے اہل علم کے مابین اس مسئلہ میں کوئی اختلاف نہیں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی صحبت کئی وجوہات کی بنا پر باقی تمام صحابہ کرام کی صحبت سے اکمل تھی ۔

❀ ان میں سے ایک وجہ یہ تھی کہ آپ دن اور رات ؛ سفر اور حضر میں ہر وقت سب سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہنے والے تھے ۔ جیسا کہ صحیحین میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے ؛ آپ فرماتی ہیں :

''جب میں نے ہوش سنبھالا اس وقت میرے والدین اسلام لا چکے تھے ؛ ہم پر کوئی دن ایسا نہ گزرتا جب صبح و شام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے گھر میں تشریف نہ لاتے ہوں ۔''

سو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم شروع شروع میں صبح و شام حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے گھر جایا کرتے تھے ۔ اس وقت اسلام بہت کمزور تھا' اور دشمنان دین بہت زیادہ تھے ۔ یہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو انتہاء درجہ کی فضیلت اور صحبت میں خصوصیت کی علامت ہے ۔

[ابوبکر رضی اللہ عنہ اور مشاورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم]:

مزید برآں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عشاء کے بعد بیٹھ کر گفتگو کیا کرتے تھے ؛ اور مسلمانوں کے مختلف امور میں مشاورت اور بات چیت ہوتی ۔ یہ خصوصیت بھی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ہی حاصل ہے کسی دوسرے صحابی کو نہیں ۔

مزید برآں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کرام سے مشورہ کیا کرتے تو شوری میں سب سے پہلے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کلام کرتے ۔ بسا اوقات کوئی دوسرا پہلے بول پڑتا ؛ اور بسا اوقات کوئی بھی آپ کے علاوہ نہیں بولتا ۔ تو پھر صرف آپ کی رائے کے مطابق ہی عمل کیا جاتا ۔ اور جب کسی کی رائے آپ کی رائے کے خلاف ہوتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے مخالف کی رائے کو ترک کر دیتے اور صرف آپ کی رائے کے مطابق عمل کرتے ۔

پہلے واقعہ کی مثال : جیسا کہ صحیحین میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے قیدیوں کے بارے میں مشورہ کیا ؛ تو سب

سے پہلا مشورہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ہی دیا۔

اس کی دوسری مثال یہ ہے کہ: جب حدیبیہ کے موقع پر مشورہ کیا گیا کہ: کیا ان لوگوں کے اہل وعیال پر شبخون مارا جائے جنہوں نے قریش کی مدد کی یا پھر بیت اللہ کی طرف سفر جاری رکھا جائے۔ اور پھر جو کوئی اس راہ میں رکاوٹ بنے' اس سے لڑائی کی جائے۔ اہل علم: اصحاب تفسیر وحدیث' مغازی وسیر وفقہ کے ہاں یہ حدیث معروف ہے۔ اسے امام بخاری واحمد بن حنبل رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔

[حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اطاعت گزاری]:

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے بڑے اطاعت گزار تھے۔ آپ سے کبھی بھی مخالفت نبوت میں کوئی حرکت سرزد نہیں ہوئی۔ بلکہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو کے بعد آپ سے مناظرہ کیا تو آپ نے وہی جواب دیا جو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا تھا۔ حالانکہ آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ جواب نہیں سنا تھا۔

یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موافقت اور مطابقت پر سب سے واضح دلالت ہے۔ اور یہ کہ آپ کا قول وعمل؛ علم اور حال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص تھا۔ اس لیے کہ آپ وہی بات فرمایا کرتے تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات ہوتی۔ اور وہی کام کیا کرتے تھے جو آپ کا کام ہوتا۔ خصوصاً ان مواقع پر جب دوسرے لوگوں پر آپ کی فضیلت ظاہر ہوئی۔ تو کہاں آپ کا مقام ومرتبہ اور کہاں دوسرے لوگوں کا مقام ومرتبہ؟

ایک آپ سے مناظرہ کر رہا ہے تاکہ آپ اپنا فیصلہ واپس لے لیں۔ دوسرے کو حکم دے رہے ہیں کہ آپ کا نام مٹا دے مگر وہ ایسا نہیں کر رہا۔ دوسرا کہہ رہا ہے: اگر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کا فیصلہ واپس کروا سکتا تو ضرور ایسا کروا دیتا۔ آپ لوگوں کو قربانیاں کرنے کا حکم دے رہے ہیں تو لوگ توقف میں پڑے ہوئے ہیں۔

اس میں بھی کوئی شک وشبہ والی بات نہیں کہ جن لوگوں نے ایسے کیا اس کے پیچھے بھی اللہ اور اس کے رسول کی محبت اور کفار سے بغض ونفرت کا عنصر شامل تھا۔ اور انہیں یہ بات محبوب تھی کہ ایمان کفر پر غالب اور سربلند رہے۔ اور یہ کہ اہل ایمان پر اہل کفر کی وجہ سے کوئی بزدلی' کمزوری یا رسوائی داخل نہ ہو۔ اور ان کا نظریہ یہ تھا کہ ان سے لڑ پڑیں تاکہ مسلمانوں کو اس دبی ہوئی صلح کی وجہ سے بزدلی اور دب جانے کی عار لاحق نہ ہو۔

یہ بات تو معلوم شدہ ہے کہ نص کو رائے پر تقدیم حاصل ہوتی ہے؛ اور شریعت کو خواہشات نفس پر۔ وہ بنیادی اصول جس میں انبیاء کرام علیہم السلام پر ایمان لانے والے اور ان کا انکار کرنے والے متفرق ہوگئے؛ وہ اصول یہی تھا کہ نصوص کو آراء پر شریعت کو اُھواء پر تقدیم حاصل ہے۔ اور شر کی اصل بنیاد رائے کو نص؛ اور خواہشات کو شریعت پر مقدم کرنا ہے۔ پس جس کے دل کو اللہ تعالیٰ نے روشن کر دیا ہو' تو اسے نصوص وشریعت میں موجود خیر وبھلائی نظر آنے لگ جاتی ہے۔ اگر ایسا نہ بھی ہو تب بھی نص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حکم شریعت کے سامنے سر تسلیم خم کرنا واجب ہو جاتا ہے۔ اور ان کے ساتھ رائے یا خواہش نفس کی وجہ سے ٹکرایا نہیں جا سکتا۔

لیکن یہاں مطلوب یہ ہے کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ تمام لوگوں سے زیادہ اکمل وافضل اور خیر وبھلائی کے کاموں میں

سبقت لے جانے والے تھے۔ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین میں کوئی دوسرا انسان آپ کا ہم پلہ اور مثیل نہیں تھا۔

یہ بات اتنی واضح ہے کہ اس میں رسول اللہ ﷺ کے احوال سے جاہل کے علاوہ کوئی دوسرا انسان شک نہیں کر سکتا۔ یا پھر کوئی ایسا خواہشات پرست انسان ہو جس کو اس کی خواہشات نے قبول حق سے روک رکھا ہو۔ وگرنہ جس انسان کے پاس علم اور عدل ہو؛ وہ کسی طرح بھی اس معاملہ میں شک کا شکار نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ اس مسئلہ میں اہل علم و ایمان شک نہیں کر سکتے۔ جیسا کہ اس دور کے تمام لوگ باقی صحابہ پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی فضیلت اور تقدیم پر متفق تھے؛ اور بعد میں آنے والے اہل اسلام اور بہترین لوگ صحابہ و تابعین اور تبع تابعین کا بھی اس پر اتفاق تھا۔

جس کسی کا یہ خیال ہو کہ حدیبیہ کے موقع یا پھر دیگر مواقع پر مخالفین کی رسول اللہ ﷺ کی مخالفت؛ ایسا گناہ ہے جو کہ توبہ سے بھی معاف نہیں ہو سکتا' تو یقیناً ایسا انسان غلطی کا شکار ہے۔ جیسا کہ ان لوگوں کی بات بھی غلط ہے جو مخالفت حکم نبوی کے مرتکبین کی طرف سے عذر پیش کرتے ہوئے اور ان سے ملامت کو ختم کرتے ہوئے یہ کہنے لگے کہ: انہوں نے حلق اور قربانی میں تاخیر اس لیے کی کہ یہ لوگ انتظار کر رہے تھے کہ شاید اس کی منسوخی کا حکم آ جائے' یا پھر اس کے خلاف وحی نازل ہو جائے۔

کہنے والے یہ بھی کہتے ہیں کہ: '' آپ کی اطاعت سے پیچھے رہ جانے والے اس وجہ سے پیچھے رہ گئے تھے کہ یا تو آپ ﷺ کے مرتبہ کی تعظیم کا لحاظ تھا' اس لیے آپ کا نام نہیں مٹایا۔ یا پھر مشرکین سے صلح کے مسئلہ پر تکرار کرنے والوں کا مقصد کفر پر اسلام کا غلبہ اور اسلام کے ظہور و پذیرائی کا تھا۔ یہ اس طرح کی دیگر توجیہات تھیں۔

تو جواب میں یہ کہا جائے گا کہ: نبی کریم ﷺ کی طرف سے امر جازم سے مراد ایجاب تھا۔ جو کہ باتفاق اہل ایمان موجب اطاعت تھا۔ اس میں بعض ان لوگوں نے تنازعہ کیا جن کا یہ خیال تھا کہ یہ ایسا حکم جازم نہیں جس کا ماننا واجب ہو۔ اگر اس کا واجب اطاعت ہونا ظاہر ہوتا تو پھر کوئی ایک بھی اس کی تعمیل میں شک تک بھی نہ کر سکتا۔

یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ: آپ ﷺ کی طرف سر منڈوانے اور قربانیاں کرنے کا حکم صادر ہونا حکم جازم تھا؛ جس کا تقاضا یہ تھا کہ فی الفور اس کی اطاعت کی جائے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ آپ نے تین بار ایسا کرنے کا حکم دیا تھا۔ جب ان میں سے کوئی ایک بھی اس حکم کی تعمیل کے لیے نہیں اٹھا تو آپ ﷺ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لے گئے؛ اور ان کے سامنے لوگوں کے اس ردعمل کا ذکر کیا۔ ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ غصہ میں تھے؛ اور فرمایا: '' میں غصہ کیونکر نہ ہوں' جب میں کسی بات کا حکم دیتا ہوں تو اس کی اتباع نہیں کی جاتی۔'' ❶

اور یہ بھی روایت میں آیا ہے کہ یہ جملہ آپ ﷺ نے اس وقت ارشاد فرمایا جب آپ نے حجۃ الوداع کے موقعہ پر لوگوں کو حلال ہونے کا حکم دیا تھا۔ اور یہ بات بھی سبھی جانتے ہیں کہ عمرہ محصورہ سے تحلل کا حکم حج کے موقع پر عمرہ کے بعد تحلل کے حکم سے زیادہ مؤکد تھا۔

مزید برآں یہ کہ آپ کو اس موقع پر تحریر نامہ سے اپنا نام مٹانے کی ضرورت تھی تا کہ صلح اپنی منطقی انجام کو پہنچ سکے۔ اسی لیے آپ نے اپنے دست مبارک سے اسے مٹا دیا۔ اور یہ حکم ایک امر جازم تھا؛ اس حکم کی مخالفت کرنے والا اگر چہ متاول تھا؛

---

❶ صحیح بخاری، کتاب الشروط۔ باب الشروط فی الجهاد، (ح: ۲۷۳۱، ۲۷۳۲)۔

اور اس کا گمان یہ تھا یہ حکم ماننا واجب نہیں؛ اس لیے کہ اس میں رسول اللہ ﷺ کے احترام میں کمی آتی ہے۔ یا پھر اس میں عمرہ کا انتظار اور صلح کا عدم اتمام تھا۔ متاول کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ اپنے اجتہاد میں غلطی پر تھا۔ اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کا پختہ حکم دیا تھا؛ اور بات نہ ماننے والوں کی شکایت بھی کی تھی اور یہ بھی ارشاد فرمایا تھا کہ مجھے کیا ہو گیا ہے کہ میں غصہ نہ ہوں جب کہ میں ایک بات کا حکم دے رہا ہوں اور میری بات نہیں مانی جا رہی۔'' تو ایسے موقع پر آپ کے حکم کی مخالفت کرنے کی گنجائش کسی ایک کے لیے بھی نہ تھی۔ لیکن یہ ایسی لغزش تھی جس سے صحابہ نے توبہ کر لی جیسا کہ دوسرے گناہوں سے توبہ کر لی تھی۔

پس کسی ایک کو یہ اختیار حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی ایسے کو معصوم ثابت کرے جو کہ حقیقت میں معصوم نہیں ہے۔ پھر اس سے حقیقی معصوم ﷺ کی شان میں قدح وارد ہو۔ جیسا کہ ان توبہ کرنے والوں کے متعلق کیا گیا۔ اس گناہ کی وجہ سے انہیں ایک قسم کی سزا ملی؛ اور ان لوگوں سے اس چیز کی نفی کرنے لگ گئے جس کی وجہ سے ان پر ملامت واجب ہوتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے گناہ گاروں کو ملامت کیا ہے [یعنی اس کے بعد پھر ان لوگوں نے توبہ کر لی؛ اور ان سے ملامت ختم ہو گئی] مگر یہ بشریت کی تعظیم میں اتنا آگے نکل گئے کہ اللہ رب العالمین کی شان میں قدح کرنے لگے۔ [یعنی اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی کا اعتبار نہ رہا' اور گنہگار کو غیر گنہگار شمار کرنے لگے]۔

فضائل حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ:

اس سے بڑھ کر یہ کہ محدثین و فقہاء کے سوا جملہ ارباب فنون سے غلطی صادر ہو سکتی ہے۔ محدثین و فقہاء کسی باطل مسئلہ پر جمع ہو سکتے ہیں نہ سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ قرار دے سکتے ہیں۔

خلاصہ کلام! یہ کہ جو شخص بھی زحمت فکر و تامل گوارا کرتا ہے اس پر حضرت صدیق کے فضائل روز روشن کی طرح واضح ہو جاتے ہیں۔ یہ فضائل آپ کی ذات کے ساتھ مختص ہیں۔ مثلاً یہ آیات و احادیث نبویہ:

1. آیت قرآنی: ﴿إِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا﴾ [1]
2. حدیث نبوی: ''إِنَّ صَاحِبَكُمْ خَلِيْلُ اللّٰهِ'' [2]
3. یہ حدیث کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کو سب مردوں سے محبوب تر تھے۔ [3]
4. وہ حدیث جس میں مذکور ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک عورت کو فرمایا کہ: ''اگر مجھے زندہ نہ پاؤ تو ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہونا۔'' [4]
5. وہ حدیث جس میں مذکور ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے لیے عہد نامہ لکھنے کا ارادہ کیا تھا۔ [5]
6. وہ حدیث جس میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے سب سے پہلے ایمان لانے اور اسراء کی تصدیق کرنے کی وجہ سے لقب صدیق کا ذکر کیا گیا ہے۔ [6]

---

[1] صحیح بخاری (۳۶۵۲)، مسلم (الزھد: ۷۵/ ۲۰۰۹)
[2] صحیح مسلم (۷/ ۲۳۸۳)
[3] صحیح بخاری (۳۶۶۲)، صحیح مسلم (۲۳۸٤)
[4] البخاری (۳٦۵۹)، صحیح مسلم (۲۳۸٦)
[5] صحیح بخاری (۵٦٦٦)، صحیح مسلم (۲۳۸۷)
[6] مستدرك (۳/ ٦۲)، مجمع الزوائد (۹/ ٤۱)

⑦ یہ حدیث "فَهَلْ أَنْتُمْ تَارِكُوا لِي صَاحِبِي" [1]

⑧ جس حدیث میں یہ واقعہ مذکور ہے کہ جب عقبہ بن ابی معیط نے نبی ﷺ کے گلے میں چادر ڈالی تھی تو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آپ کو چھڑایا۔اور آپ نے اس وقت فرمایا تھا: ﴿ أَتَقْتُلُونَ رَجُلًا أَنْ يَقُولَ رَبِّيَ اللَّهُ ﴾ [غافر ۲۸]
"کیا تم ایسے آدمی کو قتل کرتے ہو جو کہتا ہے میرا رب اللہ ہے۔" [2]

⑨ جس حدیث میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو امام صلوٰۃ [3] اور امیر حج مقرر کرنے کا واقعہ مذکورہ ہے۔ [4]

⑩ وہ حدیث جس میں وفات رسول کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے صبر وثبات اور استقلال اور امت کی فرماں برداری کا ذکر کیا گیا ہے۔ [5]

⑪ وہ حدیث جس میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ان اعمال صالحہ کا ذکر کیا گیا ہے جو آپ نے ایک دن میں انجام دیے تھے؛ جس بھی انسان میں یہ تمام خصائل پائے جائیں' اس کے لیے جنت واجب ہو جاتی ہے۔ [6]

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے کچھ فضائل ایسے بھی ہیں جن میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ آپ کے سہیم وشریک ہیں، چنانچہ یہ احادیث نبویہ ملاحظہ ہوں:

① حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کردہ یہ حدیث کہ نبی کریم ﷺ فرمایا کرتے تھے:" میں اور ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما آئے میں اور ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما گئے۔" [7]

② وہ حدیث جس میں کنوئیں سے پانی کھینچنے کا ذکر ہے۔ [8]

③ وہ گائے والی حدیث کہ: جس میں رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:" میں اور ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ [9]

ان کی مثالیں اور بھی ہیں۔

صحاح ستہ میں فضائل حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں مندرجہ ذیل حدیثیں صحیح ہیں:

۱۔ آپ کو مجھ سے وہی نسبت ہے جو کہ حضرت ہارون کو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہے۔بس یہ کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں۔

۲۔ غزوۂ خیبر کے موقع پر نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد کہ کل میں ایک شخص کو جھنڈا دوں گا جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت کرتا ہوگا' اور جس سے اللہ اور اس کا رسول محبت کرتے ہوں گے۔"

۳۔ اور یہ صفت جو کہ ہر مؤمن اور مسلمان کے لیے واجب اور باعث فضیلت ہے کہ نبی کریم ﷺ کا یہ عہد ہے کہ:
"صرف مومن حضرت علی رضی اللہ عنہ سے محبت کریں گے اور صرف منافق آپ سے بغض رکھیں گے۔"

۴۔ اور وہ روایت جس میں اراکین شوریٰ کا ذکر ہے۔

---

[1] صحیح بخاری (۳٦٦۱)
[2] صحیح بخاری (۳٦۷۸)
[3] صحیح بخاری (٦۷۸)، صحیح مسلم (٤۱۸)
[4] البخاری (٤۳٦۳)، صحیح مسلم (۱۳٤۱)
[5] صحیح بخاری (۳٦٦۷، ۳٦٦۸)
[6] صحیح مسلم (۱۰۲۸)۔
[7] البخاری، باب مناقب علی رضی اللہ عنہ (ح:۳۷۰٦)، مسلم، باب من فضائل علی بن ابی طالب (ح٤۰٤ ۲)۔
[8] صحیح بخاری، حوالہ سابق، (حدیث:۳۷۰۱)، صحیح مسلم۔حوالہ سابق (حدیث:۲٤۰۹)۔
[9] صحیح مسلم، کتاب الایمان باب الدلیل علی ان حب الانصار وعلی رضی اللہ عنہ (حدیث:۷۸)۔

۵۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ خبر دینا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوا تو وہ حضرت عثمان' حضرت طلحہ' حضرت زبیر' حضرت سعد اور حضرت عبدالرحمن رضی اللہ عنہم اجمعین سے راضی تھے۔ ❶

خاص حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مناقب و فضائل کے متعلق صحاح ستہ میں وارد ہونے والی احادیث کی تعداد دس تک پہنچتی ہے۔ان کے علاوہ بھی دیگر روایات ہیں مگر وہ آپ کے ساتھ مختص نہیں۔صحاح میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے فضائل سے متعلق بیس احادیث مذکور ہیں،ان میں سے اکثر میں آپ کے خصائص بیان کیے گئے ہیں۔

جو انسان یہ کہتا ہے کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے صحیح سند کے ساتھ اتنے فضائل ثابت ہیں جو کسی دوسرے کے لیے نہیں؛ تو وہ جھوٹ بولتا ہے۔ یہ بات امام احمد اور دوسرے ائمہ ومحدثین نے نہیں کہی۔آپ کے حق میں بھی وہی روایات وارد ہوئی ہیں جو کہ آپ جیسے دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کے لیے ہیں۔لیکن ان میں اکثر روایات ایسی ہیں جن کا جھوٹ اور غلط ہونا سب کو معلوم ہے۔ایک ایسی دلیل جو صحیح سند کے ساتھ ثابت ہو؛اور کسی بھی معارض سے خالی ہو' وہ ان بیس دلیلوں سے بہتر ہے جن کے مقدمات باطل پر اور اسناد کمزور ہوں۔اور وہ ایسی صحیح احادیث سے ٹکراتی ہو جو کہ اس کے متناقض ہو۔

یہاں پر یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو صحبت ایمانی میں وہ اختصاص حاصل ہے جس میں مخلوق میں سے کوئی دوسرا شریک نہیں ہے۔ نہ ہی قدر کے اعتبار سے نہ ہی صفت کے اعتبار سے اور نہ ہی نفع مندی کے اعتبار سے۔اس لیے کہ اگر وہ وقت جمع کیا جائے جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ مل بیٹھا کرتے تھے؛ اور پھر حضرت عثمان و علی اور دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے ساتھ اجتماع کا وقت جمع کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو دیا جانے والا وقت ان سب کے اوقات سے دوگنا ہی نہیں بلکہ کئی گنا زیادہ ہے۔

جب کہ ان سب کے مابین مشترکہ اوقات کسی ایک کے ساتھ خاص نہیں ہیں۔

جب کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کمال محبت' معرفت؛ اور ہر معاملہ میں آپ کی تصدیق یہ سب پر ایسے غالب اور ظاہر ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے احوال کی معرفت رکھنے والے کسی بھی انسان پر مخفی نہیں اور جس انسان کو اس قوم کے احوال کی معرفت نہیں ہے تو اس کی گواہی نا قابل قبول اور مردود ہے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دینی امور میں حاصل ہونے والی معاونت اور نفع کا بھی یہی حال ہے۔

ان امور کا شمار صحبت کے ان مقاصد اور محامد میں سے ہوتا ہے جن کی وجہ سے کسی صحابی کو دوسروں پر فضیلت دی جا سکتی ہو۔حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے لیے ہر لحاظ سے وہ اقدار و صفات و خصوصیات ثابت ہیں جن میں کوئی دوسرا آپ کا شریک نہیں۔

اس کی دلیل: بخاری و مسلم میں حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

---

❶ یہ روایت بخاری میں تو نہیں ملی۔مگر دوسری کتابوں میں سہل یوسف بن سہل کی سند سے روایت کی گئی ہے۔ اس روایت میں ہے:'' جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع سے واپس مدینہ تشریف لائے؛ تو آپ منبر پر جلوہ افروز ہوئے؛ اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء بیان کی اور فرمایا:'' اے لوگو! ابوبکر رضی اللہ عنہ کی قدر پہچانو، اللہ کی قسم اس نے کبھی مجھے الم و رنج نہیں پہنچایا۔ اے لوگو! میں ابوبکر وعمر وعثمان اور علی طلحہ و زبیر اور عبدالرحمن بن عوف اور مہاجرین اولین سے رضی اللہ عنہم اجمعین سے راضی ہوں' ان کی قدر پہچانو۔'' معجم الصحابہ لابن قانع؛ ح:۴۹۶۔المعجم الکبیر للطبرانی؛ح:۵۵۰۶۔ معرفة الصحابة لابی نعیم الأصبهانی؛ حدیث:۲۹۳۳۔سیرت نبویہ از ابن کثیر ۴/۴۲۶۔

''میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر تھا، اسی دوران ابو بکر رضی اللہ عنہ اپنے کپڑے کا کنارہ پکڑے ہوئے آئے اور اپنے دونوں زانو ننگے کر دیے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: لوگو! تمہارا ساتھی کسی سے جھگڑ پڑا ہے۔ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے سلام کے بعد عرض کیا: میرے اور عمر رضی اللہ عنہ کے درمیان کچھ تنازع تھا۔ میں نے جلد بازی سے کام لیا، پھر مجھے ندامت کا احساس ہوا تو میں نے کہا: ''معاف کر دیجیے، مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کے لیے تیار نہ ہوئے، میں اس مقصد سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ آپ نے تین مرتبہ فرمایا اے ابو بکر! اللہ تمھیں معاف فرمائے۔''

پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نادم ہوئے اور ابو بکر رضی اللہ عنہ کے گھر کو آئے۔ ابو بکر رضی اللہ عنہ کو نہ پا کر وہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ یہ دیکھ کر آپ ﷺ کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے ڈر کر دو بار کہا: اے اللہ کے رسول! مجھ سے زیادتی سرزد ہوئی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے مجھے تمہاری طرف مبعوث کیا تھا۔ تم نے مجھے جھٹلایا، مگر ابو بکر رضی اللہ عنہ نے میری تصدیق کی اور اپنی جان و مال سے میری ہمدردی کی۔ اب کیا تم میرے رفیق کو میرے لیے رہنے دو گے یا نہیں؟''

آپ نے دو مرتبہ یہ الفاظ دہرائے۔ اس کے بعد ابو بکر رضی اللہ عنہ کو کسی نے رنج نہ پہنچایا۔''[1]

ایک دوسری روایت میں ہے: حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے درمیان لڑائی ہوئی تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر غصہ کیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کے پاس سے چل دیے مگر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ بھی پیچھے ہو لئے اور معافی چاہی مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے معاف نہیں کیا اور دروازہ بند کر لیا۔ ابو بکر رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آئے۔ اس حدیث کے آخر میں ہے: یہ دیکھ کر آپ ﷺ کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے ڈر کر دو بار کہا: اے اللہ کے رسول! مجھ سے زیادتی سرزد ہوئی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے مجھے تمہاری طرف مبعوث کیا تھا۔ تم نے مجھے جھٹلایا، مگر ابو بکر رضی اللہ عنہ نے میری تصدیق کی۔''[بخاری]

یہ صحیح حدیث ہے؛ اس میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی صحبت کی تخصیص ہے۔ جیسا کہ خود فرمان نبوت سے ظاہر ہے:

''اے لوگو! کیا تم میرے لیے میری ساتھی کو نہیں چھوڑو گے۔'' اور پھر اس کا سبب بیان کرتے ہوئے فرمایا:

''جب اللہ تعالیٰ نے مجھے تمام لوگوں کی طرف مبعوث کیا تو میں نے نبوت کا اعلان کہ: ''اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کی طرف سے رسول بن کر آیا ہوں۔'' تم نے مجھے جھٹلایا۔ اور ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا: آپ سچ فرماتے ہیں۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ آپ نے کبھی بھی رسول اللہ ﷺ کی کسی بھی بات کو نہیں جھٹلایا۔ اور جب تمام لوگ آپ ﷺ کو جھٹلا رہے تھے اس وقت حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کی تصدیق کر رہے تھے۔''

یہ تو ایک کھلا ہوا معاملہ ہے۔ آپ نے ان تمام لوگوں سے پہلے رسول اللہ ﷺ کی تصدیق کی جن تک رسالت پہنچی تھی۔ یہ حق بات ہے کہ آپ پہلے انسان ہیں جن تک جب اللہ کا پیغام پہنچا تو فوراً ایمان لے آئے۔ یہ حضرت عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ کی اس روایت کے موافق ہے جسے امام مسلم نے روایت کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں: میں نے پوچھا: یا رسول اللہ! آپ

---

[1] صحیح بخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ، باب قول النبی ﷺ "لو کنت متخذا خلیلاً"(ح:٣٦٦١)

کے ساتھ اس معاملہ میں اور کون ہے؟ تو آپ نے فرمایا: ایک غلام اور ایک آزاد ۔ اس دن آپ کے ساتھ حضرت ابوبکر اور حضرت بلال رضی اللہ عنہما تھے۔'' [مسلم ۱/ ۵۶۹، نسائی ۱/ ۲۸۳]

جہاں تک حضرت خدیجہ' حضرت زید اور حضرت علی رضی اللہ عنہم اجمعین کا تعلق اس حدیث کے حوالے سے ہے' تو ان حضرات کا شمار آپ کے کنبہ کے افراد میں ہوتا تھا۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہوئی تو آپ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو تمام ماجرا سنایا۔ تو آپ نے تبلیغ کا حکم نازل ہونے سے قبل ہی آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کی تھی۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب آپ پر ایمان لانا ابھی واجب نہیں ہوا تھا۔ اس لیے کہ آپ پر ایمان لانا اس وقت سے واجب ہوا ہے جب سے تبلیغ رسالت کا حکم ملا۔ پس تبلیغ رسالت کا حکم ملنے کے بعد آزاد مردوں سب سے پہلے تصدیق کرنے والے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔ اس لیے کہ اس وقت ابھی یہ واجب نہیں ہوا تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ایمان لانے کی دعوت دی جائے۔ اس لیے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس وقت بچے تھے؛ اور بچے پر کوئی حساب و کتاب نہیں ہوتا۔

کسی ایک نے بھی یہ نہیں کہا کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو تبلیغ رسالت اور ایمان کی دعوت سے پہلے کسی کو تبلیغ کی ہو یا پھر ایمان کی دعوت دی ہو۔ لیکن یہ ضرور ہوسکتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں پرورش پا رہے تھے؛ جب آپ کو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے ذریعہ سے اس معاملہ کی خبر ملی ہوگی تو آپ بھی تبلیغ رسالت سے قبل ایمان لے آئے ہوں گے۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان سے بھی ظاہر ہوتا ہے:

''اے لوگو! میں تمہاری طرف مبعوث ہوا؛ میں نے اعلان کیا: ''اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کی طرف سے رسول ہوں ۔ تو تم لوگوں نے مجھے جھٹلایا' ابوبکر صلی اللہ علیہ وسلم نے میری تصدیق کی۔''

صحیحین میں بھی اس طرح کی روایت ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ تبلیغ رسالت پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے علاوہ تمام لوگوں نے شروع میں آپ کی تکذیب کی تھی۔ اور یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اور حضرت زید و علی رضی اللہ عنہما آپ کے گھر میں تھے۔ خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپ کی تکذیب نہیں کی؛ اس لیے آپ کا شمار ان لوگوں میں نہیں ہوتا جن کو تبلیغ کی گئی ہو۔

یہ حضرت عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ کی یہ روایت کہ: یارسول اللہ! آپ کے ساتھ اس معاملہ میں اور کون ہے؟ تو آپ نے فرمایا: ایک غلام اور ایک آزاد۔''

یہ مسلم شریف کی دوسری روایات کے موافق ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ: جن کو دعوت دی گئی اور جن تک تبلیغ رسالت کی گئی ان میں یہ دو حضرات شامل تھے۔ اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذکر کیا: ''اور ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے مال و جان سے میری غمخواری کی۔'' یہ بھی آپ کی خصوصیت ہے' جس میں کوئی دوسرا آپ کا شریک و سہیم نہیں ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح کی دیگر متواتر روایات بھی نقل کی گئی ہیں۔ جیسا کہ صحیحین میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک خطبہ پڑھا، تو فرمایا:

''یقین سمجھو کہ اللہ سبحانہ نے ایک بندہ کو دنیا اور آخرت کے درمیان اختیار دیا (چاہے جس کو پسند کرے) اس نے اس چیز کو اختیار کرلیا، جو اللہ کے ہاں ہے، ابوبکر رضی اللہ عنہ (یہ سن کر) رونے لگے۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ: ایسی کیا

چیز ہے، جو اس بوڑھے کو رلا رہی ہے، اگر اللہ نے کسی بندہ کو دنیا کے اور اس عالم کے درمیان میں، جو اللہ کے ہاں ہے،اس نے اختیار دیا اور اس نے اس عالم کو اختیار کر لیا، جو اللہ کے ہاں ہے(تو اس میں رونے کی کیا بات ہے،مگر آخر میں معلوم ہوا کہ)۔وہ بندہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔اور ابوبکر رضی اللہ عنہ ہم سب میں زیادہ علم رکھتے تھے، پھر آپ نے فرمایا کہ اے ابوبکر تم نہ روؤ کیونکہ یہ بات یقینی ہے سب لوگوں سے زیادہ مجھ پر احسان کرنے والا اپنی صحبت میں اور اپنے مال میں ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں ۔ میں اپنی امت میں اگر کسی کو خلیل بناتا تو وہ ابوبکر رضی اللہ عنہ ہوتے لیکن اسلام کی محبت (کافی ہے) مسجد میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دروازہ کے سوا کسی کے دروازہ کو بے بند نہ چھوڑا جائے۔''[صحیح بخاری: ح ٤٥٢]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مرض میں جس مرض میں آپ نے وفات پائی ہے، اپنا سر ایک پٹی سے باندھے ہوئے باہر نکلے اور منبر پر بیٹھ گئے، پھر اللہ کی حمد وثنا کے بعد فرمایا کہ:

''لوگو!ابوبکر سے زیادہ اپنی جان اور اپنے مال سے مجھ پر احسان کرنے والا کوئی نہیں اور اگر میں لوگوں میں سے کسی کو خلیل بناتا،تو یقیناً ابوبکر کو خلیل بناتا،لیکن اسلام کی دوستی افضل ہے۔''[صحیح بخاری:ج۱: ح۴۵۳]

دوسری روایت میں ہے:''میں اپنی امت میں اگر کسی کو خلیل بناتا تو وہ ابوبکر رضی اللہ عنہ ہوتے لیکن اسلامی بھائی چارہ ہی کافی ہے۔''اور ایک روایت میں ہے:''لیکن آپ میرے بھائی اور میرے صحابی ہیں۔''

ان تمام روایات سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی صحبت کے فضائل واختصاص آپ کے مناقب؛دعوت میں کردار' اور ادائے حقوق میں آپ کی وہ خصوصیات واضح ہوتی ہیں جن میں کوئی دوسرا آپ کا سہیم وشریک نہیں ہے۔حتی کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ گوناگوں اوصاف ومحامد کی بناپر خلیل رسول (آپ کے گہرے دوست) تھے۔ بشرطیکہ بنی نوع انسان میں آپ کا کوئی خلیل موجود ہو۔یہ تمام نصوص صراحت کے ساتھ بیان کررہی ہیں کہ: جناب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تمام مخلوق خدا میں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو زیادہ محبوب اور آپ کے نزدیک سب سے افضل تھے۔جیسا کہ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو غزوہ ذات السلاسل پر بھیجا۔حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے کہا:

''یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم !ازواج مطہرات میں سے آپ کو کون عزیز تر ہے؟ آپ نے جواباً فرمایا:''عائشہ رضی اللہ عنہا۔''
میں نے عرض کیا اور مردوں میں سے آپ کس کے ساتھ زیادہ محبت رکھتے ہیں؟ فرمایا:''ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ۔''
میں نے عرض کیا ان کے بعد اور کس سے؟ فرمایا:''عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ۔''

اس کے بعد عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ دریافت کرتے چلے گئے۔اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے درجہ بدرجہ متعدد صحابہ کا ذکر کیا۔[1] بخاری شریف کی ایک روایت میں ہے:حضرت عمرو رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: پھر میں اس اندیشہ کے تحت خاموش ہوگیا کہ کہیں آپ مجھے سب سے آخر میں نہ کردیں۔''[بخاری ٥/ ٥؛ مسلم ٤/ ١٨٥٦]

---

[1] صحیح بخاری۔ باب غزوۃ ذات السلاسل ،(ح:٤٣٥٨) صحیح مسلم۔ کتاب فضائل الصحابۃ۔ باب من فضائل ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہ (ح:٢٣٨٤)۔

زیر تبصرہ آیت کی مزید توضیح:

❀ اس کی مزید وضاحت اس آیت قرآنی میں غار کے واقعہ سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی فضیلت ظاہر ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بیان کیا ہے کہ اس وقت میں جب کہ باقی تمام مخلوق آپ کی مدد سے عاجز آ گئی؛ اس وقت اس شخصیت نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کی جنہیں اللہ تعالیٰ کی نصرت و تائید حاصل تھی۔ جیسا کہ آیت کریمہ میں ہے:

﴿اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ﴾ [التوبة ۴۰]

''اس وقت جبکہ انہیں کافروں نے (دیس سے) نکال دیا تھا، دو میں سے دوسرا جبکہ وہ دونوں غار میں تھے۔''

یعنی اس حالت میں آپ کو نکالا گیا جب آپ کے ساتھ صرف ایک آدمی کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں تھا۔ اس لیے کہ ایک سب سے آخری کم عدد ہے جو کہ انتہائی قلت پر دلالت کرتا ہے۔ پھر اس کے بعد ارشاد فرمایا:

﴿اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا﴾ [التوبة ۴۰]

''جب آپ اپنے ساتھی سے کہہ رہے تھے کہ غم نہ کر اللہ ہمارے ساتھ ہے۔''

آیت کھل کر دلالت کر رہی ہے کہ آپ کے ساتھی کو آپ کے بارے میں خوف تھا؛ وہ آپ سے سچی محبت کرنے والے اور سچے مددگار تھے؛ اسی لیے آپ کے معاملہ میں غمگین ہو رہے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حالت خوف میں انسان اسی چیز پر غمگین ہوتا ہے جو اسے محبوب ہو۔ جب کہ اگر دشمن کی ہلاکت کے اسباب پیش ہو رہے ہوں تو پھر اس پر کوئی غمگین نہیں ہوتا۔ اگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن ہوتے، جیسا کہ روافض کہتے ہیں، تو وہ دشمن کی آمد پر ہم و غم کی بجائے فرح و سرور کا اظہار کرتے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی آپ سے یہ نہ فرماتے: ''غم نہ کر اللہ ہمارے ساتھ ہے۔'' جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اظہار غم کیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کی حفاظت و نصرت ان کے شامل حال ہے۔''[1]

پس یہ خبر دی جاری ہے کہ:

اللہ تعالیٰ ان دونوں کیساتھ ہے اور ان کی مدد کر رہا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ رسول اللہ اور اہل ایمان کے لیے اس حالت میں نصرت الٰہی کی خبر دیں کہ وہ باطن میں منافق ہوں۔ اس لیے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی جانب سے کوئی بھی خبر دینے میں معصوم ہیں۔ آپ حق کے علاوہ کچھ بھی نہیں کہہ سکتے۔ یہ بات اگرچہ جائز ہے کہ آپ پر بعض لوگوں کا حال مخفی رہ جائے؛ مگر اس سے یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ وہ لوگ منافق ہی ہیں۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿وَ مِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ وَ مِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ لَا تَعْلَمُهُمْ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ﴾ [التوبة ۱۰۱]

''اور کچھ تمہارے گرد و پیش والوں میں اور کچھ مدینے والوں میں ایسے منافق ہیں کہ نفاق پر اڑے ہوئے ہیں، آپ ان کو نہیں جانتے ان کو ہم جانتے ہیں۔''

---

[1] صحیح بخاری (۳٦٥۲)، مسلم (الزھد: ۲۰۰۹)

پس ان لوگوں کے متعلق ایسی خبر دینا جائز نہیں جو ان کے ایمان پر دلالت کرتی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ تبوک والے سال جب پیچھے رہ جانے والے اپنے عذر پیش کرتے ہوئے قسمیں اٹھاتے ہوئے آئے؛ تو رسول اللہ ﷺ ان کی ظاہری باتوں کو قبول فرماتے رہے۔ اور ان کے باطن کو اللہ کے سپرد کرتے رہے۔ لیکن آپ نے ان میں سے کسی ایک کی بھی تصدیق نہیں فرمائی۔ مگر جب حضرت کعب رضی اللہ عنہ پیش خدمت ہوئے اور اپنا معاملہ سچائی کے ساتھ پیش کر دیا تو آپ نے فرمایا:

''اس انسان نے سچ کہا۔'' یا یہ الفاظ ارشاد فرمائے: ''اس نے تم سے سچی بات کہی۔'' [بخاری ٦/ ٧، مسلم ٤/ ٢١٢٠]

تو پھر آپ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے بارے میں کیسے یہ فرما سکتے تھے کہ اللہ ہمارے ساتھ ہے؛ اور اس کا کوئی علم آپ کو نہ ہوتا۔ بغیر علم کے بات کرنا جائز نہیں۔ مزید برآں اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے جو خبر دی ہے اس میں رسول اللہ ﷺ کے کلام کو برقرار رکھا ہے؛ اس کا انکار نہیں کیا۔ پس اس سے معلوم ہوا کہ: یہ فرمانا: ﴿إِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا﴾ ''بیشک اللہ ہمارے ساتھ ہے۔'' وہ سچی خبر ہے جس کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا اور اس پر راضی رہا۔ ان اخبار میں سے نہیں جن کا انکار کیا ہو اور عیب لگایا ہو۔

ایک معمولی عقل کا آدمی بھی سوچ سکتا ہے کہ ایک شخص جو ہر طرف سے دشمنوں کے نرغہ میں ہو، اور تمام لوگ اس کے دشمن ہوں اور اسے قتل کرنا چاہتے ہوں؛ اس انسان کے عزیز و اقارب و رشتہ دار اس کی مدد و نصرت پر قادر نہ ہوں؛ ایسا شخص دوران سفر اپنی رفاقت کے لیے کسی ایسے شخص کا انتخاب کیسے کر سکتا ہے جو باقی لوگوں میں سے اکیلا محبت و دوستی اور غم و پریشانی کا اظہار کر رہا ہو؛ لیکن باطن میں وہ پکا دشمن ہو۔ اور ساتھ لے جانے والا یہ گمان کر رہا ہو کہ وہ میرا دوست اور غمخوار ہے۔ ایسا تو کوئی بیوقوف ترین انسان بھی نہیں کر سکتا۔ ان لوگوں پر اللہ تعالیٰ کی پھٹکار ہو جو اپنے کامل و اکمل باعلم و خبردار و ہوشیار رسول اللہ ﷺ کی طرف ایسی جہالت و حماقت منسوب کرتے ہیں جس کا ارتکاب کوئی ادنی اور جاہل انسان بھی نہیں کر سکتا۔ [یا پھر رسول کریم ﷺ کو جاہل و غبی تصور کرتے ہیں [نعوذ باللہ من ذلك]۔

مغل بادشاہ خدابندہ کا عجیب قصہ:

مجھے مغل بادشاہ خدا بندہ؛ جس کے لیے رافضی مصنف نے یہ کتاب تالیف کی تھی؛ اس کے متعلق یہ اطلاع ملی ہے کہ: جب اس کتاب کے رافضی مصنف نے اس کے سامنے اپنا جھوٹا کلام پیش کیا؛ اور ابو بکر رضی اللہ عنہ پر زبان طعن دراز کی؛ اور کہا: ابو بکر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے دشمن تھے اور آپ سے بغض رکھتے تھے؛ مگر اس کے ساتھ رافضی یہ بھی کہتے تھے: رسول اللہ ﷺ نے اپنے سب سے عظیم سفر سفر ہجرت میں آپ کو خوف کی وجہ سے اپنے ساتھ ہمراہی بنایا۔ تو اس کے جواب میں اس بادشاہ نے ایسی بات کہی جس کے بعد ان روافض کو ایسے بیہودہ جھوٹ گھڑنے اور بولنے سے رک جانا چاہیے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو ایسی باتوں سے مبراء و منزہ رکھا ہے۔ لیکن رافضیوں کے اس من گھڑت جھوٹ نے اسے یہ کلمہ کہنے پر مجبور کیا؛ اس نے کہا: ''پھر تو رسول اللہ ﷺ بہت کم عقل تھے۔'' [معاذ اللہ]۔

اور اس میں کوئی شک نہیں کہ جو کوئی رافضیوں کی بتائی ہوئی باتوں پر چلتا ہے وہ قلیل العقل ہی ہوتا ہے۔ جب کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو ایسی باتوں سے بری رکھا ہے۔

اس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ رافضیوں کے کلام سے رسول اللہ ﷺ کی شان میں قدح لازم آتی ہے۔

رفاقتِ نبوت وصداقت اور رافضی حسد:

[اعتراض] :شیعہ مصنف لکھتا ہے:

''ممکن ہے نبی ﷺ نے اس لیے رفیق سفر بنایا ہو کہ مبادا وہ آپ کے معاملہ کو ظاہر کر دے۔''

[جواب]:ہم کہتے ہیں یہ چند وجوہ کی بنا پر باطل ہے۔

پہلی وجہ: قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے الفت و محبت کا سلوک کرتے تھے۔ ان کے مابین کوئی دشمنی نہیں تھی۔ اس سے رافضی کا [دشمنی اور بغض کا] دعوی باطل ثابت ہوگیا۔

دوسری وجہ: حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا مومن و محبِ رسول ہونا تواتر معنوی کے ساتھ معلوم ہے۔ اور یہ کہ آپ کو تمام مخلوق میں خصوصیت حاصل تھی۔ یہ تواتر اور اس کی شہرت حاتم طائی کی سخاوت اور عنترہ کی شجاعت؛ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت اور موالات کے تواتر سے بھی زیادہ ہے۔ ان کے علاوہ دیگر بھی معنوی تواترات ہیں جن میں تمام اخبار و روایات کا ایک مقصود پر اتفاق ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی محبت میں شک کرنا ایسے ہی ہے جیسے کسی بھی دوسرے کی محبت میں شک کرنا' بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ہے۔

مگر روافض کے تعصب و عناد کا کیا علاج؟ روافض کے عناد کا یہ عالم ہے کہ وہ اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما حجرہ نبویہ میں مدفون ہیں۔ اور بعض آپ کے ساتھ غار میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کے موجود ہونے کا انکار کرتے ہیں۔ مگر رافضی قوم سے اس طرح کی بہتان تراشی کوئی بعید نہیں ہے۔ اس لیے کہ روافض بہتان تراش قوم ہیں جو ایسی چیزوں کا انکار کرتے ہیں جن کا ثابت ہونا ضرورت کے تحت معلوم ہے' اور معقولات و منقولات ایسی چیزوں کو ثابت کرنے کے پیچھے پڑے رہتے ہیں جن کا منفی ہونا ضرورت کے تحت معلوم ہے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ باقی تمام لوگوں سے بڑھ کر رسول اللہ ﷺ سے موالات اور دوستی رکھنے والے تھے۔ یہ بات اتنی مشہور ہے کہ اسے مسلمان اور کافر نیک اور بد ہر کوئی جانتا ہے۔ حتی کہ میں زنادقہ کے ایک ایسے گروہ کو بھی جانتا ہوں جو کہتے ہیں: دین اسلام میں اندرون خانہ رسول اللہ ﷺ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کا اتفاق ہوگیا تھا؛ ان کے ساتھ تیسرے عمر رضی اللہ عنہ بھی مل گئے۔ لیکن انہیں ان دو حضرات کے راز کی پوری طرح خبر نہ تھی۔

شیعہ مصنف نے اس ضمن میں جو کچھ کہا ہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ باطن میں رسول اللہ ﷺ کے دشمن تھے، یہ اس کی جہالت کا بین ثبوت اور انتہائی بڑا بہتان ہے؛ خصوصاً واقعہ ہجرت کے بارے میں اس نے جو ہرزہ سرائی کی ہے وہ بھی اس کی جہالت کا آئینہ دار ہے۔

پھر اس بہتان تراش سے اگر یہی باتیں [الزامی جواب میں] حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق کہی جائیں کہ: رسول اللہ ﷺ کو باطن کا علم تھا کہ آپ رسول اللہ ﷺ سے دشمن رکھتے ہیں۔ اور یہ کہ خلفاء ثلاثہ کے دور حکومت میں آپ اپنی ملت کو بتلائے فساد کرنے سے عاجز تھے۔ جب اکابر صحابہ اس دنیا سے چلے گئے تو انہوں نے ملت میں فساد پیدا کرنا شروع کر دیا۔ امت کو ہلاک کیا' مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد کو قتل کیا۔ اور آپ چاہتے تھے کہ باقی لوگوں کو بھی ہلاک و برباد کر دیں مگر

ایسا نہ کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے بغض رکھنے والے زندیق جیسے: قرامطہ؛ اسماعیلیہ؛ اور نصیریہ آپ کی صفوں میں شامل ہو گئے۔ آپ کوئی بھی اسلام کا دشمن نہیں پائیں گے مگر وہ اپنے عزائم کی تکمیل کے لیے محبت علی رضی اللہ عنہ کی آڑ کا سہارا لیتا ہے۔اس کے لیے ایسا کوئی کام حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی محبت و موالات کا اظہار کرتے ہوئے ممکن نہیں رہتا۔

رسول اللہ ﷺ کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی موالات کا شبہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی دشمنی کے شبہ سے بڑھ کر ہے۔ اور یہ دونوں باتیں باطل ہیں۔ان کا فاسد ہونا اضطراری طور پر معلوم ہے۔لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے متعلق اس قسم کے دعوی کو باطل کرنے والے دلائل موالات علی رضی اللہ عنہ کے دلائل سے زیادہ قوی اور صحیح ہیں۔اور آپ کی دشمنی کے دلائل بھی باطل ہیں۔ ایسے ہی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی دشمنی کے دلائل باطل اور موالات و محبت کے دلائل درست اور صحیح ہیں۔

سفر ہجرت میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی رفاقت:

تیسری وجہ: [**اشکال**]: رافضی کا یہ احتمال کہ: ممکن ہے آپ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اس خوف سے ساتھ لے لیا ہو کہ آپ کا معاملہ ظاہر نہ کر دے۔''

جواب: یہ حالات و واقعات سے بہت بڑے جاہل انسان کا کلام ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا مکہ سے ہجرت کا واقع صاف ظاہر اور واضح ہے۔ ہر شخص اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ نبی ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ غار میں چھپے ہوئے تھے۔ اہل مکہ کو بھی اس کا پتہ چل گیا اور انھوں نے دونوں کو تلاش کرنے کے لیے ہر طرف آدمی بھیج دیے۔اس لیے کہ جس رات رسول اللہ ﷺ نے ہجرت کی اس کی صبح ہی لوگوں کو پتہ چل گیا کہ ابوبکر بھی رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہیں۔لہٰذا قریش مکہ نے اعلان کیا تھا کہ جو شخص دونوں میں سے کسی کو پکڑ لائے گا اسے [دیت کے برابر] انعام دیا جائے گا۔پس انہیں کس چیز کا خوف تھا؟ مشرکین کے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو پکڑ کر لانے پر انعام کے اعلان سے واضح ہوتا ہے کہ وہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی حب رسول سے آگاہ تھے۔ اور یہ بھی جانتے تھے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ظاہری و باطنی طور پر مشرکین سے دشمنی رکھتے تھے۔ اگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ باطن میں آپ مشرکین کے ساتھ اور آپ ﷺ کے دشمن ہوتے تو قریش مکہ آپ کی گرفتاری کے لیے انعام کا اعلان نہ کرتے۔

چوتھی وجہ: مزید براں آپ رات کے وقت نکلے تھے جب کہ کوئی شخص اس سے آگاہ نہ تھا۔ پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ساتھ لے جانے کی کیا ضرورت تھی؟

اگر شیعہ یہ کہیں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو غالباً آپ کے گھر سے نکلنے کا علم ہو گیا تھا۔تو ہم کہیں گے کہ: آپ کے لیے کسی ایسے وقت میں نکلنا ممکن تھا جب کسی کو علم نہ ہو پاتا۔جس طرح مشرکین مکہ کو آپ کے گھر سے نکلنے کا علم نہ تھا اسی طرح آپ ابوبکر رضی اللہ عنہ سے بھی اس ارادہ کو پوشیدہ رکھ سکتے تھے۔اور آپ ﷺ کے لیے بھی ممکن تھا کہ آپ سے کوئی مدد نہ لیتے۔اور یہ کیسے ہو سکتا ہے جب کہ بخاری و مسلم میں ثابت ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جب ہجرت کی اجازت طلب کی تو آپ نے اجازت نہ دی؛ بلکہ فرمایا ذرا صبر کیجیے، آپ میرے ساتھ ہجرت کریں گے۔ پھر ان دونوں حضرات نے اکٹھے ہجرت کی۔ پس نبی کریم ﷺ خلوت کی حالت میں پہلے سے آپ کو ہجرت کی اطلاع دے دی تھی۔

پانچویں وجہ: جب آپ غار میں تھے تو آپ کا بیٹا عبداللہ بن ابوبکر رضی اللہ عنہ آپ تک مشرکین کی خبریں پہنچایا کرتا تھا۔ ❶ اور آپ کے ساتھ ایک غلام عامر بن فہیرہ بھی ہوا کرتا تھا۔ ان کے لیے ممکن تھا کہ قریش کو آپ کے بارے میں خبر دے دیں۔

چھٹی وجہ: اگر معاملہ ایسے ہی تھا جیسے رافضی خبیث کا دعوی ہے، تو پھر ایسا ہوسکتا تھا کہ: جب دشمن غار تک پہنچ گیا، اور غار کے منہ پر ٹہلنے لگا۔ تو اس وقت آپ کے لیے ممکن تھا کہ باہر نکل آتے اور دشمن کو آپ کی خبر کر دیتے۔ پس اس وقت رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کوئی دوسرا فرد و بشر نہیں تھا جو آپ کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے یا دشمن سے بچا سکتا۔ پس اس حالت میں غور کرنا چاہیے کہ اصل دشمن کون ہے وہ جو آپ کو ہلاک کرنا چاہتا ہو، اور ایسے موقع کو غنیمت جانے جب کوئی بھی دشمن اپنے حریف پر قابو پالیتا ہے تو پھر کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتا۔ اس لیے کہ آپ ﷺ غار میں اکیلے تھے۔ اور دشمن غار کے دہانے تک پہنچ چکا تھا۔ اور غار والے کو بچانے والا یا ان کا دفاع کرنے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ اور دشمن بھی معمولی نہ تھے؛ ایسے لوگ تھے جو اس وقت مکہ میں غالب تھے۔ اور اگر وہ آپ کو پکڑ لیتے تو مکہ بھر میں کوئی انہیں آنکھ دکھانے والا بھی نہیں تھا۔ اور اگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ باطن میں مشرکین کے ساتھ ملے ہوئے تھے؛ تو یہاں پر اسباب اور وسائل و حالات اس قدر بھرپور تھے کہ آپ کو پکڑ کر دشمن کے حوالے کر دیا جاتا۔ جب قدرت کامل ہو، اور فعل کے دواعی موجود ہوں تو اس فعل کو پورا کرنا واجب ہو جاتا ہے۔ جب ایسا کچھ ہوا نہیں تو اس سے معلوم ہوا کہ اس کے دواعی موجود نہیں تھے یا پھر اس پر قدرت حاصل نہیں تھی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ قدرت تو موجود تھی؛ تو معلوم ہوا کہ دواعی اور اسباب موجود نہیں تھے۔ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کو کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں دینا چاہتے تھے۔ اس بات کو ہر انسان جانتا ہے۔ سو اللہ کی ذات پاک ہے جس نے روافض کو بصیرت و فراست سے محروم کر دیا۔

❀ ان بہتان تراشوں کا حال یہ ہے کہ: ان میں وہ لوگ بھی ہیں جو کہتے ہیں: ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنی انگلی سے دشمن کی طرف اشارہ کر رہے تھے تو سانپ نے آپ کو ڈس لیا۔ تو آپ نے انگلی پیچھے کھینچ لی۔ اور آپ سے درد ختم ہوگئی۔ تو نبی کریم ﷺ نے آپ سے فرمایا:

''اگر تم نے دوبارہ عہد توڑا تو وہ تمہارا ہاتھ توڑ دے گا۔'' اور آپ نے دوبارہ اس عہد کو توڑا؛ پھر اسی سبب سے آپ کی موت واقع ہوئی۔''

❀ اس بات کا جھوٹ ہونا کئی وجوہات کی بنا پر ظاہر ہے۔ ہم ان میں سے بعض کی تفصیل بیان کر چکے ہیں۔

❀ اور ان میں سے بعض کہتے ہیں کہ: آپ نے اپنا ٹخنہ ظاہر کیا تھا تاکہ دشمن کو پتہ چل سکے؛ تو سانپ نے آپ کو ڈس لیا۔ یہ بھی پہلے جھوٹ کی طرح کا ایک دوسرا جھوٹ ہے۔

❶ صحیح بخاری؛ حوالہ سابق، لیکن اس میں خبریں لانے والے عبداللہ بن ابی بکر رضی اللہ عنہما تھے۔ عبدالرحمن رضی اللہ عنہ تو اس وقت مسلمان ہی نہیں ہوئے تھے۔ انھوں نے حدیبیہ کے موقع پر اسلام قبول کیا۔ واللہ اعلم۔

فصل:

[حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پر بے صبری کی تہمت]

[اعتراض] : شیعہ کا یہ قول کہ: یہ آیت آپ کے نقص پر دلالت کرتی ہے؛ اس لیے کہ آیت میں: ﴿لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا﴾ کے الفاظ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بے صبری؛ اللہ تعالیٰ پر عدمِ ایمان؛ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مساوات اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے قضاء وتقدیر پر عدمِ رضامندی؛ اور بے صبری کو ظاہر کر رہے ہیں۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جواب]:

پہلی بات: ہم کہتے ہیں: شیعہ کے اقوال باہم متناقض ہیں، وہ پہلے کہہ چکا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو غار میں اپنے ساتھ اس لیے رکھا تھا کہ اگر وہ مکہ میں رہا تو آپ کے راز کو واشگاف کر دے گا، اس لیے کہ ابوبکر آپ کے دشمن تھے اور در پردہ ان لوگوں سے ملے ہوئے تھے جو آپ کو تلاش کر رہے تھے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اگر آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بغض رکھتے تھے؛ تو جب آپ کی تلاش میں وہاں پہنچ گیا تھا؛ تو آپ کو خوش و مسرور ہونا چاہیے تھا؛ اور آپ کو اطمینان ملتا۔ نیز یہ کہ دشمن غار کے دہانے تک پہنچا' اور اوپر ادھر ادھر تلاش کرتے رہے؛ تو یہ ایک بہترین موقعہ تھا کہ انہیں خبر کر دی جاتی۔ نیز یہ کہ: آپ کا بیٹا عبداللہ قریش کی خبریں آپ تک پہنچایا کرتا تھا؛ آپ کے لیے یہ بھی ممکن تھا کہ اس کے ذریعہ سے دشمن کو خبر کر دیتے۔

نیز آپ کے غلام عامر بن فہیرہ کے پاس آپ دونوں کی سواریاں تھیں۔ آپ کے لیے یہ بھی ممکن تھا کہ اپنے غلام سے ہی کہہ دیتے کہ دشمن کو خبر کر دو۔

اور اب کہہ رہا ہے کہ وہ ضعیف قلب اور قلیل صبر تھے۔ اس کا یہ قول اس قول سے متناقض ہے جس میں وہ کہتا ہے: کہ ابوبکر منافق تھے۔ اور اب ثابت کر رہا ہے کہ آپ مؤمن تھے۔ [اللہ کی قسم! شیعہ کے کس وصف پر رشک کیا جائے وہ علم وفہم دونوں سے یک سر بے گانہ تھے]۔

جان لینا چاہیے کہ مہاجرین صحابہ میں کوئی بھی منافق نہ تھا۔ [بلکہ یوں کہیے کہ نفاق کا وجود ان میں محال تھا۔ اس لیے کہ مشرکین مکہ قوت و شوکت سے بہرہ ور تھے اور جو شخص مشرف باسلام ہوتا اسے جی بھر کر سزا دیتے۔ اس لیے جو شخص بھی دین اسلام کو قبول کرتا تھا وہ رضائے الٰہی کے لیے یہ خطرہ مول لیتا تھا کسی کے ڈر سے نہیں]۔

نفاق [کا آغاز اسلام میں مدنی زندگی سے ہوا؛ اور مدینہ کے] بعض انصاری قبائل میں تھا۔

کسی بھی مہاجر نے اپنے اختیار کے بغیر ہجرت نہیں کی۔ مکہ کے کفار ہجرت کو اختیار نہیں کرتے تھے۔ نہ ہی وہ اپنا وطن اور اہل وعیال چھوڑ کر اپنے دشمن کی مدد کے لیے کہیں جاتے تھے۔ بلکہ ہجرت کو ان لوگوں نے اختیار کیا تھا جن کا وصف اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے؛ فرمایا:

﴿لِلْفُقَرَاءِ الْمُهَاجِرِينَ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَأَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا

وَيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ﴾ (الحشر: ۸)

''(فئے کا مال) ان مہاجر مسکینوں کیلئے ہے جو اپنے گھروں اور اپنے مالوں سے نکال دیے گئے ہیں وہ اللہ کے فضل اور اس کی رضامندی کے طلب گار ہیں اور اللہ تعالیٰ کی اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں یہی راست باز لوگ ہیں۔''

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرٌ ۝ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ﴾ (الحج ۳۹، ۴۰)

''ان لوگوں کو جن سے لڑائی کی جاتی ہے، اجازت دے دی گئی ہے، اس لیے کہ یقیناً ان پر ظلم کیا گیا اور بے شک اللہ ان کی مدد کرنے پر یقیناً پوری طرح قادر ہے۔ وہ جنھیں ان کے گھروں سے کسی حق کے بغیر نکالا گیا، صرف اس وجہ سے کہ وہ کہتے ہیں ہمارا رب اللہ ہے۔''

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بالاتفاق مہاجرین [وانصار] میں سب سے افضل تھے۔

جب اس کلام کی روشنی میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا صاحب ایمان ہونا لازم آتا ہے۔تو پس یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے انتہائی اہم اور پرخوف و خطر سفر ہجرت؛ وہ سفر جس نے تاریخ کے دھارے کو بدل کر رکھ دیا تھا؛ لوگوں کے دلوں میں آپ کا جلال وقدر گامزن ہوئے' اسلام کا پرچم بلند کیا؛ ایسے سفر کے لیے رسول اللہ ﷺ صرف ایسی ہستی کا ہی انتخاب کر سکتے تھے جو آپ کے خاص الخواص میں سے ہو۔ اور جس پر آپ کو بھر پور اعتماد اور اطمینان و بھروسہ حاصل ہو۔ اس لیے کہ تاریخ اسی چیز کو عزت کے ساتھ جگہ دیتی ہے جو تمام لوگوں کے سامنے عزت کے ساتھ عیاں و بیان ہو۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے فضائل اور دوسرے لوگوں سے امتیازیت کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ یہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی ایسی خصوصیت ہے جس میں کوئی دوسرا آپ کا سہیم و شریک نہیں۔ یہ اس بات کی بھی دلیل ہے کہ آپ رسول اللہ ﷺ کے نزدیک باقی تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سے افضل و اشرف تھے۔

غم و حزن ناقص ایمان نہیں:

[اعتراض]: شیعہ مصنف کا یہ قول ہے کہ ''غم زدہ ہونا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ناقص ہونے پر دلالت کرتا ہے۔''

[جواب]: ہم کہتے ہیں: پہلی بات: ناقص کی دو اقسام ہیں۔[اول]: وہ نقص جو ایمان کے منافی ہو۔

[دوم]: اور وہ نقص جو کامل کی نسبت کم ہو۔

اگر مصنف کی مراد پہلی قسم ہے؛ تو پھر یہ باطل ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نبی ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

﴿وَ لَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَ لَا تَكُ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ﴾ (النحل: ۱۲۷)

''آپ غم نہ کریں اور جو تدبیریں وہ کر رہے ہیں ان سے تنگ دل نہ ہوں۔''

عام اہل ایمان کے حق میں فرمایا: ﴿وَ لَا تَهِنُوْا وَ لَا تَحْزَنُوْا وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ﴾ (آل عمران: ۱۳۹)

''سستی نہ کرو اور غم زدہ نہ ہو اور تم ہی غالب رہو گے۔''

نبی ﷺ کے بارے میں ارشاد فرمایا:

﴿وَ لَقَدْ اٰتَیْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ وَ الْقُرْاٰنَ الْعَظِیْمَ ٭لَا تَمُدَّنَّ عَیْنَیْكَ اِلٰی مَا مَتَّعْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ وَ لَا تَحْزَنْ عَلَیْهِمْ وَ اخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِیْنَ﴾ (الحجر:۸۷۔۸۸)

’’نیز ہم نے آپ کو سات ایسی آیات دی ہیں جو بار بار دھرائی جاتی ہیں اور قرآن عظیم بھی دیا ہے۔لہٰذا ہم نے مختلف قسم کے لوگوں کو جو سامان حیات دے رکھا ہے ادھر نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھیں اور نہ ہی ان کے لئے غمزدہ ہوں اور ایمان لانے والوں سے تواضع سے پیش آیئے۔‘‘

اللہ تعالیٰ نے اپنی نبی کریم ﷺ کو کئی ایک مواقع پر غمزدہ ہونے سے اور حزن و ملال کرنے سے منع کیا ہے۔اور اہل ایمان کو بھی جملہ طور پر حزن و ملال سے منع کیا ہے۔تو معلوم ہوا کہ حزن ایمان کے منافی نہیں ہے۔

اور اگر رافضی مصنف کی مراد یہ ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنے سے اکمل کی نسبت ناقص ہیں ؛ تو پھر اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ رسول اللہ ﷺ سب سے بڑے کامل ہیں ؛ اس میں اہل سنت والجماعت میں سے کسی ایک کا بھی کوئی اختلاف نہیں۔لیکن اس میں کوئی ایسی چیز بھی نہیں ہے جو حضرت علی ‘یا حضرت عثمان یا حضرت عمر رضی اللہ عنہم اجمعین یا پھر کسی دوسرے صحابی کے آپ سے افضل ہونے پر دلالت کرتی ہو۔اس لیے کہ یہ لوگ اس وقت نبی کریم ﷺ کے ساتھ نہیں تھے۔اگر آپ کے ساتھ ہوتے بھی ؛ تو پھر بھی یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ ان لوگوں کا حال حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے حال سے زیادہ اکمل ہوتا۔اس لیے کہ صحابہ کرام کے احوال اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی حالت کے متعلق معروف یہ ہے کہ : خوف وخطرہ کے وقت حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ باقی تمام لوگوں کی نسبت زیادہ کامل ایمان والے‘ یقین والے اور صبر وثبات والے ہوا کرتے تھے۔اور شک وشبہ کے اسباب کے وقت آپ کا ایمان و اطمینان سب سے بڑھ کر ہوا کرتا تھا۔اور جب کبھی اگر نبی کریم ﷺ کو کسی چیز سے کوئی تکلیف پہنچتی تو ابوبکر رضی اللہ عنہ سب سے بڑھ کر رسول اللہ ﷺ کی رضامندی وخوشنودی کے متلاشی ہوتے۔اور آپ کے لیے بھی تکلیف دہ چیز سے سب سے بڑھ کر دور رہنے والے ہوتے۔

یہ بات ہر وہ انسان جانتا ہے جو رسول اللہ ﷺ کی حیات مبارک میں اور وفات کے بعد کے احوال صحابہ کرام سے واقفیت رکھتا ہے۔حتی کہ جب رسول اللہ ﷺ کی وفات ہوئی ؛ تو آپ کی وفات اہل ایمان کے لیے بہت بڑی مصیبت اور آزمائش تھی۔حتی کہ اکثر اعراب مرتد ہوگئے۔پیکر ایمان جناب حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی حواس پر قابو نہ رکھ سکے ؛ حالانکہ آپ قوی ایمان اور یقین محکم رکھنے والے انسان تھے۔مگر ان حالات میں بھی اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ثابت قدم رکھا ؛ جو اس بات کی دلیل ہے کہ آپ ایمان میں دوسروں کی نسبت زیادہ کامل تھے۔آپ کے یقین میں اطمینان ہوا کرتا تھا۔اور آپ کا علم حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ کرام کی نسبت زیادہ کامل تھا۔اس موقع پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا:

’’تم میں سے جو شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کرتا تھا۔تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم وفات پاگئے اور جو اللہ کی عبادت کرتا تھا تو اللہ زندہ ہے،نہیں مرے گا،اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰۤی اَعْقَابِكُمْ وَ

مَنْ یَّنْقَلِبْ عَلٰی عَقِبَیْہِ فَلَنْ یَّضُرَّ اللّٰہَ شَیْئًا﴾ [آل عمران ۱۴۴]

''(حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) صرف رسول ہی ہیں آپ سے پہلے بہت سے رسول ہو چکے کیا اگر ان کا انتقال ہو جائے یا شہید ہو جائیں تو اسلام سے اپنی ایڑیوں کے بل پھر جاؤ گے اور جو کوئی پھر جائے اپنی ایڑیوں پر تو اللہ تعالیٰ کا کچھ نہ بگاڑے گا۔''

بخاری کی روایت میں ہے: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا زوجہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتی ہیں:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مقام سنح پر تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے: ''اللہ کی قسم! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال نہیں ہوا۔ آپ فرماتی ہیں: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے: ''اللہ کی قسم! میرے دل میں یہی بات آئی تھی' کہ اللہ تعالیٰ ضرور آپ کو دوبارہ مبعوث فرمائے گا' اور آپ منافقین کے ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالیں گے۔ پس اتنے میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تشریف لائے۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا قصد کیا۔ آپ کے چہرہ انور سے چادر اٹھائی پھر آپ پر جھکے اور آپ کے چہرے کو بوسہ دیا پھر روئے اور فرمایا اے اللہ کے نبی آپ پر میرے ماں باپ فدا ہوں! آپ نے پاکیزہ زندگی گزاری' اور پاکیزہ موت پائی۔ مجھے اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اللہ آپ پر دو موتوں کو جمع نہیں کرے گا۔''

پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ باہر نکلے [حضرت عمر رضی اللہ عنہ لوگوں سے گفتگو کر رہے تھے]، ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا کہ: اے قسم اٹھانے والے! جلدی نہ کرو۔

چنانچہ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے گفتگو شروع کی تو عمر رضی اللہ عنہ بیٹھ گئے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے تشہد پڑھا؛ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء بیان کی؛ اور فرمایا:

''تم میں سے جو شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کرتا تھا۔ تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا گئے اور جو اللہ کی عبادت کرتا تھا تو اللہ زندہ ہے، نہیں مرے گا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّاِنَّھُمْ مَّیِّتُوْنَ ﴾ [الزمر ۳۰]

''یقیناً خود آپ کو بھی موت آئے گی اور یہ سب بھی مرنے والے ہیں۔''

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِہِ الرُّسُلُ اَفَاْئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓی اَعْقَابِکُمْ وَ مَنْ یَّنْقَلِبْ عَلٰی عَقِبَیْہِ فَلَنْ یَّضُرَّ اللّٰہَ شَیْئًا وَ سَیَجْزِی اللّٰہُ الشّٰکِرِیْنَ ﴾

''(حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) صرف رسول ہی ہیں آپ سے پہلے بہت سے رسول ہو چکے کیا اگر ان کا انتقال ہو جائے یا شہید ہو جائیں تو اسلام سے اپنی ایڑیوں کے بل پھر جاؤ گے اور جو کوئی پھر جائے اپنی ایڑیوں پر تو اللہ تعالیٰ کا کچھ نہ بگاڑے گا عنقریب اللہ تعالیٰ شکر گزاروں کو نیک بدلہ دے گا۔''

سب لوگ (یہ سن کر) بے اختیار رونے لگے۔ [البخاری ۵/ ٦]

مزید برآں یوم بدر میں جھونپڑے کا قصہ؛ اور حدیبیہ کے دن آپ کا اطمینان وسکون معروف قصے ہیں؛ جن کی وجہ سے آپ کی خصوصیت تمام صحابہ سے نمایاں ہوتی ہے۔ پھر آپ کی طرف بزدلی [یا ایمانی کمزوری] کو کیسے منسوب کیا جا سکتا ہے۔

نیز آپ کا مرتدین اور مانعین زکوٰۃ سے جہاد کرنا؛ اہل ایمان کو ثابت قدم رہنے کی تلقین کرنا؛ اور اس کے ساتھ ہی حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے لشکر کو روانہ کرنا؛ ایسے امور ہیں جن سے آپ کا سب سے بڑا اہل ایمان ویقین ہونا واضح ہوتا ہے۔ اور یہ بھی روایت کیا گیا ہے کہ: آپ سے کہا گیا: ''آپ پر وہ مصائب آئے کہ اگر پہاڑ پر آتے تو وہ ریزہ ریزہ ہو جاتا؛ اور سمندر پر آتے تو وہ خشک ہو جاتا؛ لیکن ہم نہیں دیکھتے کہ آپ کمزور ہوئے ہوں۔ تو آپ نے ارشاد فرمایا: ''غار والی رات کے بعد کبھی بھی میرے دل میں رعب داخل نہیں ہوا۔ بیشک جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا حزن و ملال دیکھا تو ارشاد فرمایا: ''اے ابو بکر تم پر کوئی غم نہیں ہونا چاہیے۔ بیشک اللہ تعالیٰ نے اس معاملہ کو پورا کرنے کی ذمہ داری اٹھائی ہوئی ہے۔''

پھر ان سے یہ بھی کہا جائے گا کہ: جو کوئی حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے یقین وصبر کو دوسرے صحابہ کرام جیسے: حضرت عمر' حضرت عثمان یا حضرت علی رضی اللہ عنہم اجمعین سے تشبیہ دے؛ یقیناً وہ بہت بڑا جاہل ہے۔ اہل سنت کے ہاں حضرت عمر و عثمان اور حضرت رضی اللہ عنہم اجمعین پر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی فضیلت کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں۔ لیکن رافضی نے جو یہ دعویٰ کیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ان صفات میں دوسرے تینوں صحابہ کرام سے اکمل وافضل ہیں؛ یہ محض بہتان' جھوٹ اور افتراء پردازی ہے۔ اس لیے کہ جو کوئی بھی حضرت عمر و عثمان رضی اللہ عنہما کی سیرت پر غور کرے گا تو اسے پتہ چلے گا کہ مصائب ومشکلات میں یہ حضرات حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نسبت زیادہ کامل صبر و ثبات اور استقلال واستقامت والے ہوا کرتے تھے۔

لوگوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا گھیراؤ کیا؛ آپ سے مطالبہ کیا کہ یا خلافت چھوڑ دیں یا پھر قتل ہونے کے لیے تیار ہو جائیں اور وہ برابر آپ کا محاصرہ کیے رہے یہاں تک کہ آپ کو قتل کر دیا۔ اس حالت میں بھی آپ لوگوں کو اپنے دفاع میں لڑنے سے منع کرتے رہے۔ یہاں تک کہ آپ مظلومیت کی حالت میں شہید ہو گئے مگر اپنی ذات کا دفاع نہیں کیا۔ تو کیا مصیبت میں اس سے بڑھ کر صبر کی بھی کوئی مثال ہو سکتی ہے۔

یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا صبر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے صبر کی طرح نہیں تھا۔ بلکہ آپ کے اہل لشکر اور آپ سے لڑنے والوں کو آپ کی وجہ سے بعض ایسی تکالیف بھی پہنچیں کہ ایسی تکالیف حضرت ابو بکر' حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین سے نہیں پہنچی تھیں۔ حالانکہ جن لوگوں سے یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم لڑ رہے تھے وہ کافر تھے۔ اور جو لوگ ان کے ساتھ تھے؛ وہ دشمن کی تعداد کے مقابلہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر کی نسبت بہت کم تھے۔ اور ان کا دشمن کئی گنا بڑی تعداد کا تھا۔ جن کفار سے ابو بکر و عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین نے جنگیں لڑیں وہ مسلمانوں سے کئی گنا زیادہ تھے۔ جب کہ معاویہ رضی اللہ عنہ کا لشکر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر کی نسبت بہت کم تھا۔

اور یہ بھی سبھی جانتے ہیں کہ: امام کو درپیش خوف کہ کفار مسلمانوں پر غلبہ نہ حاصل کر لیں' اس خوف سے بڑھ کر ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے گروہ آپس میں ایک دوسرے پر غالب آ جائیں۔ اس لحاظ سے ائمہ ثلاثہ کا دشمن سے خوف حضرت علی رضی اللہ عنہ کے

خوف سے کئی گنا زیادہ تھا۔ اور اس خوف کا مقتضی بھی بہت بڑا تھا۔ مگر اس کے باوجود یہ لوگ اپنے دشمن اور پیش جنگ لوگوں کے ساتھ برتاؤ میں یقین وصبر استقامت اور ثابت قدمی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اپنے دشمن کے ساتھ برتاؤ میں نہ صرف کامل بلکہ اکمل تھے۔ تو پھر کیسے یہ کہا جا سکتا ہے کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ یقین وثبات اور صبر و استقامت میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر اور کامل تھے۔ کیا یہ صرف حماقت و تکبر اور اخبار متواتر سے معلوم حقائق کے علاوہ بھی کوئی چیز ہو سکتی ہے۔

حزن وملال ایمان کے منافی نہیں:

❀ [اعتراض]: رافضی مصنف نے کہا ہے: ''یہ آیت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بے صبری؛ اللہ تعالیٰ پر عدم ایمان؛ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مساوات اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے قضاء وتقدیر پر عدم رضا مندی؛ ظاہر کر رہی ہے۔''

❀ [جواب]: رافضی کی یہ تمام باتیں ایک کھلا ہوا جھوٹ ہیں۔ آیت میں کوئی ایسی چیز نہیں جو اس دعوی پر دلالت کرتی ہو۔ اس کی دو وجوہات ہیں:

پہلی وجہ: کسی چیز سے روکنا اس کے وقوع پذیر ہونے کی دلیل نہیں ہے۔ [یعنی "لَا تَحْزَنْ" سے وقوع حزن لازم نہیں آتا]۔ بلکہ نہی کے الفاظ جہاں کہیں بھی وارد ہوئے ہیں ان سے مراد یہ ہوتی ہے کہ یہ فعل ممنوع ہے تاکہ کہیں بعد میں اس فعل کا وقوع نہ ہو جائے۔ اس کی مثال سمجھنے کے لیے یہ آیات ملاحظہ ہوں:

۱.... ﴿يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللّٰهَ وَلَا تُطِعِ الْكَافِرِيْنَ وَالْمُنَافِقِيْنَ﴾ (الاحزاب: ۱۰)

''اے نبی! اللہ تعالیٰ کا تقوی اختیار کرو؛ کافروں اور منافقوں کی اطاعت نہ کرو۔''

یہاں پر یہ دلیل کہیں بھی نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کافروں کی اطاعت کرتے تھے۔ ایسے ہی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

۲.... ﴿وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ﴾ (القصص: ۸۸)

''اللہ کے سوا کسی اور معبود کو نہ پکارنا۔''

۳.... ﴿وَلَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ﴾ (القصص: ۸۸)

''اللہ کے ساتھ کسی اور کو معبود نہ بنانا۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو کبھی بھی شرک کا ارتکاب نہیں کیا۔ خصوصاً نبوت کے بعد تو شرک سے معصوم ہونے پر تمام امت کا اتفاق ہے۔ اس لیے کہ آپ کو شرکیہ اعمال سے منع کر دیا گیا تھا۔ اس کی مثالیں بہت زیادہ ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ﴿لَا تَحْزَنْ﴾؛ کہیں بھی اس بات پر دلالت نہیں کرتا کہ آپ واقعی غمگین ہوئے بھی تھے۔ لیکن عقلی طور پر یہ ممکن ہے کہ آپ غمگین بھی ہوئے ہوں گے۔ لیکن اس قسم کی نہی اس لیے وارد ہوتی ہے کہ اس فعل کا ارتکاب نہ کیا جائے۔

دوسری بات: اگر فرض کیجیے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ غم زدہ ہوئے بھی تھے تو محض اس لیے کہ کفار کہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل نہ کر دیں۔ آپ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنی جان نثار کرنے کے لیے تیار تھے۔ یہی وجہ ہے کہ: جب آپ ہجرت کے اس سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے تو دوران سفر ابوبکر رضی اللہ عنہ کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے چلنے لگتے کبھی آگے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وجہ پوچھی تو عرض کیا: اے اللہ کے رسول! جب مجھے احساس ہوتا ہے کہ دشمن عقب سے آپ پر حملہ آور ہوگا تو پیچھے چلتا

ہوں اور جب اگلی جانب سے خطرہ محسوس کرتا ہوں تو آپ کے آگے ہو جاتا ہوں۔''، جب غار کے قریب پہنچے تو عرض کیا کہ ٹھہریے! تاکہ میں غار میں داخل ہو کر اس کو صاف کر لوں۔ [1]

امام احمد رحمہ اللہ نے ''مناقب الصحابہ'' میں ذکر کیا ہے: فرماتے ہیں: ہم سے وکیع نے حدیث بیان کی؛ وہ نافع سے اور وہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے ؛ وہ ابن ابی ملیکہ سے روایت کرتے ہیں؛ آپ فرماتے ہیں:

''جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کی تو غار ثور کے راستہ پر چل پڑے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہجرت کے اس سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ دوران سفر ابوبکر رضی اللہ عنہ کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے چلنے لگتے کبھی آگے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وجہ پوچھی تو عرض کیا: اے اللہ کے رسول! جب مجھے احساس ہوتا ہے کہ دشمن عقب سے آپ پر حملہ آور ہو گا تو پیچھے چلتا ہوں اور جب اگلی جانب سے خطرہ محسوس کرتا ہوں تو آپ کے آگے ہو جاتا ہوں۔'' جب غار کے قریب پہنچے تو عرض کیا کہ ٹھہریے! تاکہ میں غار میں داخل ہو کر اس کو صاف کر لوں۔''

امام نافع رحمہ اللہ فرماتے ہیں: مجھ سے ایک آدمی نے بیان کیا کہ: ابن ابی ملیکہ نے یہ بھی کہا ہے: اس موقع پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے غار میں ایک سوراخ دیکھا، اس کے آگے اپنا پاؤں رکھ کر اسے بند کر دیا؛ اور عرض گزار ہوئے: یا رسول اللہ! اس میں اگر سانپ یا بچھو وغیرہ ہو تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بجائے مجھ کو کاٹے۔'' [2]

اس صورت میں واقعی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مساوات پر راضی نہ تھے۔ نہ ہی ان معنوں میں جیسا کہ رافضی خبیث افتراء پرداز نے ذکر کیا ہے؛ اس لیے کہ آپ ہرگز اس بات پر راضی نہ تھے کہ وہ زندہ رہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کر دیا جائے۔ اور نہ ہی اس بات پر راضی تھے کہ ان دونوں کو قتل کر دیا جائے۔ بلکہ آپ چاہتے تھے کہ اپنی جان و مال اور اہل عیال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قربان کر دیں مگر آپ پر آنچ نہ آئے۔ ایسا کرنا ہر مؤمن پر واجب ہے۔ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تمام مؤمنین میں سے پختہ ایمان والے تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ﴾ [الأحزاب٦]

''پیغمبر مومنوں پر خود ان سے بھی زیادہ حق رکھنے والے ہیں۔''

صحیحین میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک اپنے والدین و اولاد اور سب لوگوں سے بڑھ کر مجھے عزیز تر نہ سمجھے۔'' [3]

ابوبکر رضی اللہ عنہ کا غم زدہ ہونا آپ کے کمال ایمان و محبت اور موالات و خیر خواہی؛ آپ کی حفاظت پر حرص آپ کے دفاع؛ اور آپ سے ہر قسم کی تکلیف و پریشانی دور کرنے پر مستعد ہونے کی دلیل ہے۔ اگرچہ اس صورت میں غم کی وجہ سے انسان

---

[1] سیرۃ النبی لابن کثیر(١/ ٤٥٢)، مستدرك حاکم(٣/ ٦)، دلائل النبوۃ(٢/ ٤٧٦)۔
[2] سیرۃ النبی لابن کثیر(١/ ٤٥٢)، مستدرك حاکم(٣/ ٦)، دلائل النبوۃ(٢/ ٤٧٦)[فضائل الصحابۃ ١/ ٦٢]۔
[3] البخاری، کتاب الایمان، باب حب الرسول ﷺ من الایمان (ح:١٤)، صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب وجوب محبۃ رسول اللہ ﷺ(ح:٤٤)۔

پر ایک گونہ کمزوری آ جاتی ہے ۔ پس یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ عدم حزن کے ساتھ ان صفات سے موصوف ہونا ہی آپ کے حق میں مامور بہ تھا۔ ورنہ صرف غم وحزن سے کوئی فائدہ حاصل نہ ہوتا۔ اور اس میں کوئی ایسی دلالت نہیں جس سے اس فعل کا گناہ ہونا لازم آتا ہو جس پر ملامت کی جا سکتی ہو۔ یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ پر غمگین ہونا انسان کی اپنی اولاد پر غمگین ہونے سے بڑھ کر ہے۔ اس لیے کہ کسی بھی انسان کے لیے رسول اللہ ﷺ کی محبت اس کی اولاد کے لیے محبت سے بڑا واجب ہے۔

❀ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارے میں خبر دی ہے کہ آپ اپنے بیٹے حضرت یوسف علیہ السلام پر غمگین ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿یٰاَسَفٰی عَلٰی یُوْسُفَ وَ ابْیَضَّتْ عَیْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِیْمٌ ❀ قَالُوْا تَاللّٰهِ تَفْتَؤُا تَذْكُرُ یُوْسُفَ حَتّٰی تَكُوْنَ حَرَضًا اَوْ تَكُوْنَ مِنَ الْهٰلِكِیْنَ ❀ قَالَ اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّیْ وَ حُزْنِیْٓ اِلَی اللّٰهِ....﴾ [یوسف ۸۴۔۸۶]

''ہائے میرا غم یوسف پر! اور اس کی آنکھیں غم سے سفید ہوگئیں، پس وہ غم سے بھرا ہوا تھا۔ انھوں نے کہا: اللہ کی قسم! تو ہمیشہ یوسف کو یاد کرتا رہے گا، یہاں تک کہ گھل کر مرنے کے قریب ہو جائے، یا ہلاک ہونے والوں سے ہو جائے۔ اس نے کہا میں تو اپنی ظاہر ہو جانے والی بے قراری اور اپنے غم کی شکایت صرف اللہ کی جناب میں کرتا ہوں۔''

یہ اللہ کے نبی حضرت یعقوب علیہ السلام ہیں؛ وہ اپنے بیٹے پر اس قدر غمگین ہیں۔ لیکن یہ کوئی ایسی بات نہیں جس کی وجہ سے آپ پر طعن و تشنیع کی جائے۔ تو پھر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اگر رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی پر قتل کے خوف سے غمگین ہوں؛ تو آپ کو کیسے گالی وطعن تشنیع کی جا سکتی ہے؛ حالانکہ آپ ﷺ کے ساتھ دنیا وآخرت کی سعادت معلق ہے۔

پھر شیعہ خود اعتراف کرتے ہیں کہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے اپنے والد محترم ﷺ کی وفات پر انتہائی غم وہم کا اظہار کیا تھا اور ایک غم خانہ بنایا؛ شب وروز اس ''بیت الاحزان'' (غم خانہ) میں گزارا کرتی تھیں۔ لیکن اس چیز کو قابل مذمت نہیں سمجھتے۔ حالانکہ یہ غم ایک ایسی چیز پر ہے جو گزر چکی ہے؛ اور پھر کبھی واپس آنے والی نہیں۔ جب کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ اس بات پر خوف زدہ اور غمگین تھے کہ کہیں رسول اللہ ﷺ کو قتل نہ کر دیا جائے۔ یہ ایسا غم وحزن ہے جو آپ کی حفاظت و چوکیداری کو متضمن ہے۔ اسی لیے جب رسول اللہ ﷺ کا انتقال ہوا تو آپ اس طرح سے غمگین نہیں ہوئے؛ جیسے پہلے ہوئے تھے؛ اس لیے کہ اب غمگین ہونے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ پس یہ ثابت ہوا کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا غم و ملال حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے غم و ملال سے زیادہ اکمل تھا۔ اگر آپ کا غم زدہ ہونا مذموم فعل تھا تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بھی تو غمگین ہوئی تھیں۔ وگرنہ جن لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کی وفات پر غم واندوہ کا اظہار کیا ان کی نسبت حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اس بات کے سب سے بڑے حق دار ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی حفاظت کے معاملہ میں غم واندوہ میں مبتلا ہونے پر آپ پر کوئی ملامت نہ کی جائے۔ [حقیقت یہ ہے کہ جاہل اپنے طور پر کسی کی مدح کرتا ہے دراصل وہ مذمت ہوتی ہے]

اور اگر شیعہ یہ کہیں کہ: ''ابو بکر رضی اللہ عنہ کو اپنے قتل کیے جانے کا غم تھا۔''

تو ہم کہیں گے: یہ تمہارے اس قول کے متناقض ہے کہ: حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن تھے؛ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لیے انہیں ساتھ لے لیا تھا کہ کہیں آپ کا معاملہ ظاہر نہ کردیں۔''

اور یہ بھی کہا جائے گا کہ: جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان پر واجب کیا ہے؛ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا جو برتاؤ تواتر کے ساتھ معلوم ہے؛ اس کی روشنی میں تمہارا یہ دعوی باطل ہے۔

پھر یہ بھی کہا جائے گا: مان لیجیے! آپ اپنی جان پر اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق غمگین ہوئے تھے؛ تو کیا اس وجہ سے اس بات کے مستحق ہوگئے کہ آپ پر گالم گلوچ کی جائے۔ بالفرض یہ مان بھی لیں کہ آپ کو اپنے قتل کئے جانے کے خوف کی وجہ سے غم و ملال تھا تو پھر بھی یہ کوئی ایسی چیز نہیں جس کی وجہ سے آپ پر سب و شتم کیا جائے۔

❀ پھر اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ غمگین ہونا گناہ کا کام تھا؛ تو تب بھی آپ اس پر مصر نہیں رہے؛ جب اللہ تعالیٰ نے اس سے منع کیا تو آپ رک گئے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء کرام علیہم السلام کو بہت ساری چیزوں سے منع کیا تھا اور وہ ان باتوں سے رک گئے تھے۔ اور اس نہی سے پہلے جو کام انہوں نے کئے ان پر کوئی مذمت نہیں کی گئی۔

❀ مزید برآں روافض کہتے ہیں: حضرت علی اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہما جاگیر فدک اور دوسری میراث کے چھوٹ جانے پر غم سے نڈھال ہوگئے۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ یہ لوگ دنیاوی فوائد کے چھوٹ جانے پر غمگین ہوئے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لِكَيْلَا تَأْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَا آتَاكُمْ﴾ [الحدید ۲۳]

''تا کہ تم نہ اس پر غم کرو جو تمھارے ہاتھ سے نکل جائے اور نہ اس پر پھول جاؤ جو وہ تمھیں عطا فرمائے۔''

اللہ تعالیٰ تو لوگوں کو اس طرف بلا رہے ہیں کہ دنیا کے چھوٹ جانے پر انہیں کوئی افسوس نہیں ہونا چاہیے۔ اور یہ بھی جانتے ہیں کہ دنیا کے چھوٹ جانے پر غم کرنے سے منع کرنا اس بات کا زیادہ حق دار ہے کہ کسی کو دین کے چھوٹ جانے پر غم کرنے سے منع کیا جائے۔

اور اگر اس بات کو تسلیم کرلیا جائے کہ آپ دنیا کے چھوٹ جانے پر غمگین ہوئے تھے؛ تو کسی انسان کا اپنے جان پر قتل کئے جانے کے خوف سے غمگین ہونا اس بات کا زیادہ حق دار ہے بہ نسبت اس کے کہ کوئی انسان ایسی دنیا کے چھوٹ جانے پر غمگین ہو جو اسے ملی بھی نہیں۔

❀ حقیقت یہ ہے کہ رافضی سب سے بڑے جاہل لوگ ہوتے ہیں؛ جن سے محبت کرتے ہیں' ان کی مدح میں اور جن سے بغض رکھتے ہیں ان کی مذمت میں ایسی روایات نقل کرتے ہیں جو حقیقت میں اس کے برعکس ہوتی ہیں۔ پس آپ نہیں دیکھیں گے جب بھی یہ لوگ کسی معاملہ میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی مذمت کرتے ہیں' اگر وہ معاملہ واقعی مذموم ہو تو حضرت علی رضی اللہ عنہ پر زیادہ صادق آتا ہے۔ اور مدح کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہوتا جس سے وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مدح کرنا چاہتے ہوں؛ اور وہ حقیقت میں بھی مدح کا پہلو ہو تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اس کے زیادہ مستحق ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ آپ تمام ممدوح امور میں زیادہ کامل ہیں اور تمام مذموم امور میں سب سے زیادہ بری ہیں' خواہ یہ امور حقیقی ہوں یا خیالی۔

[حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پر بے یقینی کی تہمت]:

[اعتراض]: رافضی مصنف نے کہا ہے: ''یہ آیت آپ کی بے صبری پر دلالت کرتی ہے۔''

[جواب]: رافضی کا یہ قول باطل ہے۔ آیت صبر کے معدوم [یا ناقص] ہونے پر دلالت نہیں کرتی۔ اس لیے کہ مصائب پر صبر کرنا کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کی روشنی میں واجب ہے۔ اور دل کا غمگین ہونا اس کے منافی ہرگز نہیں ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے:

''بیشک اللہ تعالیٰ آنکھوں کے آنسو پر نہیں پکڑتا؛ اور نہ ہی دل کی غمگینی اور حزن و ملال پر پکڑتا ہے؛ لیکن وہ زبان [سے نکلنے والی آہ و بکا] پر پکڑتا ہے؛ یا پھر رحم فرما دیتا ہے۔'' [البخاري ۲/ ۸٤، ومسلم ۲/ ٦۳٦]۔

[اعتراض]: رافضی مصنف نے کہا ہے: ''یہ آیت عدم یقین باللہ پر دلالت کرتی ہے۔''

[جواب]: یہ بات جھوٹ اور بہتان ہے۔ انبیاء کرام علیہم السلام بھی غمگین ہوتے رہے ہیں۔ یہ ان کے عدم یقین باللہ کی دلیل ہرگز نہیں۔ جیسا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارے میں قرآن میں ذکر کیا گیا ہے۔ اور صحیحین میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے لخت جگر ابراہیم رضی اللہ عنہ کی وفات پر فرمایا تھا:

''بیشک آنکھیں بہہ رہی ہیں؛ اور دل غمگین ہے؛ اور ہم صرف وہی بات کہتے ہیں جو رب کو راضی کردے۔ اے ابراہیم! ہمیں تیری جدائی کا صدمہ ہے۔''❶

اور اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو غم کھانے سے منع کیا ہے' ارشاد فرمایا:

﴿وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ﴾ [النحل ۱۲۷] ''اور ان پر غم نہ کھائیے۔''

[اعتراض]: رافضی نے کہا ہے: ''اللہ تعالیٰ کی طرف سے قضاء و تقدیر پر عدمِ رضامندی؛ ظاہر کر رہے ہیں۔''

[جواب]: سابقہ کلام کی طرح یہ بھی جھوٹ اور باطل کلام ہے۔

فصل:

[غم کا محال ہونا؟]

[اعتراض]: رافضی نے کہا ہے: ''یہ غم و حزن اگر اطاعت کا کام تھا تو پھر یہ محال ہے کہ رسول اللہ ﷺ اس سے منع کر دیں اور اگر یہ معصیت کا کام تھا تو پھر جس چیز کو یہ لوگ فضیلت ظاہر کر رہے ہیں؛ حقیقت میں وہ ذلت و رسوائی ہے۔''

[جواب]: پہلی بات: کسی ایک نے بھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ محض غمگین ہونا کوئی فضیلت کا کام تھا۔ بلکہ اصل فضیلت تو اس چیز میں ہے جس پر قرآنی آیت دلالت کر رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

---

❶ سيرة النبى لابن كثير(۱/ ٤٥۲)، مستدرك حاكم(۳/ ٦)، دلائل النبوة(۲/ ٤۷٦)[فضائل الصحابة ۱/ ٦۲]۔

❷ البخاری، كتاب الايمان، باب حب الرسول ﷺ من الايمان (ح:۱٤)، صحيح مسلم، كتاب الايمان، باب وجوب محبة رسول الله ﷺ (ح:٤٤)۔

❸ البخاری، كتاب الجنائز، باب قول النبى ﷺ "انا بك لمحزونون" (حديث:۱۳۰۳)، صحيح مسلم، كتاب الفضائل- باب رحمته ﷺ الصبيان والعيال(حديث:۲۳۱٥)۔

﴿إِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ إِذْ أَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ إِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا﴾ [التوبة ۴۰]

''اگر تم ان (نبی ﷺ) کی مدد نہ کرو تو اللہ ہی نے ان کی مدد کی اس وقت جبکہ انہیں کافروں نے نکال دیا تھا، دو میں سے دوسرا جبکہ وہ دونوں غار میں تھے جب آپ اپنے ساتھی سے فرما رہے تھے غم نہ کر اللہ ہمارے ساتھ ہے۔''

سو فضیلت اس بات میں ہے کہ آپ اس حالت میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سفر پر نکلے۔ اور آپ کی خصوصی صحبت میں رہے۔ آپ کو مطلق طور پر صحبت نبوت میں کمال حاصل تھا۔ رسول اللہ ﷺ کے یہ الفاظ مبارک: ﴿إِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا﴾ نبی کریم ﷺ کے ساتھ کمال موافقت کو متضمن ہیں۔ اس کے ساتھ ہی آپ کی محبت' اطمینان' نبی کریم ﷺ کے ساتھ کمال معاونت و موالات؛ اور اس حالت میں کمال ایمان اور تقوی آپ کی فضیلت کے دلائل میں سے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کے ساتھ آپ کی کمال محبت و نصرت آپ کے لیے حزن و ملال کا موجب تھی؛ اگر آپ نے حزن و ملال کا اظہار کیا ہو۔ حالانکہ قرآن میں اس بات کی کوئی دلیل نہیں ہے کہ آپ غمگین ہوئے بھی تھے۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا۔

❀ دوسری بات: قرآن مجید میں بعینہ یہ بات نبی کریم ﷺ کے لیے بھی موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ﴾ (النحل ۱۲۷)

''اور ان پر غم نہ کر اور نہ کسی تنگی میں مبتلا ہو، اس سے جو وہ تدبیریں کرتے ہیں۔''

اور ارشاد فرمایا:

﴿لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ [وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ]﴾ (الحجر ۸۸)

''اپنی آنکھیں اس چیز کی طرف ہرگز نہ اٹھائیں جس کے ساتھ ہم نے ان کے مختلف قسم کے لوگوں کو فائدہ دیا ہے [اور نہ ان پر غم کریں]۔''

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿خُذْهَا وَلَا تَخَفْ سَنُعِيْدُهَا سِيْرَتَهَا الْأُوْلٰى﴾ (طه ۲۱)

''اسے پکڑ واور ڈرو نہیں، عنقریب ہم اسے اس کی پہلی حالت میں لوٹا دیں گے۔''

اس شیعہ سے کہا جائے گا: اگر یہ خوف اطاعت کا کام تھا؛ تو یقیناً اس سے منع کیا گیا ہے۔ اور اگر [تم شیعہ کے بقول] نافرمانی کا کام تھا تو پھر [پیغمبر کی طرف سے] نافرمانی کی گئی۔

نیز یہ بھی کہا جائے گا کہ: آپ کو حکم دیا گیا تھا کہ مطمئن اور ثابت قدم رہیں۔ اس لیے کہ خوف تو انسان کے اختیار کے بغیر حاصل ہوتا ہے۔ اس لیے کہ جب امن کے اسباب و موجبات نہیں تھے تو خوف لاحق ہوا۔ اور جب امن کے اسباب پیدا ہو گئے تو خوف زائل ہو گیا۔ پس اللہ تعالیٰ کا حضرت موسی علیہ السلام سے یہ فرمانا کہ:

﴿وَلَا تَخَفْ سَنُعِيْدُهَا سِيْرَتَهَا الْأُوْلٰى﴾ (طه ۲۱)

''اور ڈرو نہیں، عنقریب ہم اسے اس کی پہلی حالت میں لوٹا دیں گے۔''

اس حکم میں ساتھ ہی اس چیز کی خبر بھی دی گئی ہے جس سے خوف زائل ہو جائے گا۔

ایسے ہی اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی ہے:

﴿ فَاَوْجَسَ فِیْ نَفْسِہٖ خِیْفَۃً مُّوْسٰی ❀ قُلْنَا لَا تَخَفْ اِنَّکَ اَنْتَ الْاَعْلٰی﴾ (طہ ۶۷۔۶۸)

''تو موسیٰ نے اپنے دل میں ایک خوف محسوس کیا۔ہم نے کہا خوف نہ کر، یقیناً تو ہی غالب ہے۔''

یہاں پر خوف کھانے سے منع کیا گیا اس کے ساتھ ہی خوف ختم ہونے کے موجبات بھی بیان کیے گئے ہیں۔

یہی حال اس آیت میں وارد رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کا بھی ہے: ﴿لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا﴾ ''غم نہ کر اللہ ہمارے ساتھ ہے۔'' یہاں پر غمگین ہونے سے منع کیا گیا ہے' اور اس کے ساتھ ہی غم نہ کرنے کا سبب بھی بیان کیا گیا ہے۔اور وہ سبب ہے: ﴿اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا﴾ ''بیشک اللہ ہمارے ساتھ ہے۔'' جب ایسی بشارت مل جائے جس سے غم وحزن ختم ہوں تو یہ امور ختم ہو جاتے ہیں۔ورنہ انسان کو غم وحزن بغیر اختیار کے لاحق ہوتے ہیں۔

❀ تیسری بات: حزن وملال سے منع کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ واقعی غم وحزن پائے بھی جاتے ہیں؛ جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ بلکہ یہ ممانعت اس لیے بھی وارد ہو سکتی ہے تاکہ جب غم وحزن کے اسباب پیدا ہو جائیں تو اس وقت غم وحزن نہ کیا جائے۔اس صورت میں غم اگر معصیت اور گناہ کا کام بھی ہو تو اس سے کوئی نقصان نہیں ہوتا۔اور اگر غم ہو بھی تو پھر بھی ہم کہتے ہیں: ''اگر منہی عنہ گناہ اور نافرمانی کا کام نہ ہو تو کبھی نہی تسلی وتعزیت اور ثابت قدمی کے لیے آتی ہے؛ اس لیے کہ بیشتر اوقات بعض چیزیں غیر اختیاری طور پر ظاہر ہو جاتی ہیں۔یہ غم وحزن بھی اسی باب سے تعلق رکھتے ہیں۔

پس اس صورت میں ممانعت ایک مستحق ازالہ چیز سے ممانعت ہوگی؛ اگر چہ وہ گناہ کا کام نہ بھی ہو۔جیسا کہ انسان کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ دشمن سے اپنا دفاع کرے' یا نجاست کا ازالہ کرے۔اور اس طرح کی دیگر چیزیں اگر چہ گناہ کا کام نہ بھی ہو' مگر ان کے تکلیف دہ ہونے کی وجہ سے ان سے منع کیا جاتا ہے۔غم وملال سے انسان کے دل کو تکلیف ہوتی ہے۔پس اس لیے ایسی چیز کا حکم دیا گیا جس سے غم کا ازالہ ہو سکے؛ جیسا کہ گندگی دور کرنے کے لیے ایسی چیز کا حکم دیا جاتا ہے جس سے یہ کام ممکن ہو۔یہ غم بھی اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں ملا تھا؛ یہ اطاعت تھی رسول اللہ ﷺ کی محبت اور خیر خواہی۔اس میں کوئی گناہ کا کام نہیں جو کہ قابل مذمت ہو۔ بلکہ اس غم کا سبب اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور دل کی کمزوری تھی جس پر کسی انسان کی مذمت نہیں کی جاسکتی اور اس چیز کا حکم دیا گیا جس سے دل میں استقامت واستقلال پیدا ہو؛ اور اس پر ثواب مل سکے۔

❀ چوتھی بات: اگر مان لیا جائے کہ: غمگین ہونا گناہ کا کام ہے: تو پھر بھی آپ اس کی ممانعت کا حکم آنے سے پہلے غمگین ہوئے تھے۔اور جب اس سے منع کر دیا گیا تو دوبارہ آپ سے ایسی حرکت کا ارتکاب نہیں ہوا۔اور جو کام حرام ہونے سے پہلے ہو گیا' اس پر کوئی گناہ نہیں۔جیسا کہ لوگ شراب کی حرمت کا حکم نازل ہونے سے پہلے شراب پیا کرتے تھے؛ اور جوا بھی کھیلتے تھے؛ مگر جب ان کاموں کی ممانعت کا حکم نازل ہو گیا تو لوگ ان سے رک گئے؛ اور سچی توبہ کر لی۔جیسا کہ اس سے پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔

❀ علامہ ابن حزم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا غمگین ہونا رسول اللہ ﷺ کے منع کرنے سے پہلے تھا۔اور اس سے مقصود اللہ تعالیٰ کی رضامندی کا حصول تھا؛ اس لیے کہ آپ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں غمگین تھے۔یہی وجہ ہے کہ اللہ بھی ان کے ساتھ تھا۔اللہ تعالیٰ کبھی بھی گناہ گاروں کے ساتھ نہیں ہوتا؛ بلکہ ان کے خلاف ہوتا ہے۔جب سے رسول اللہ ﷺ نے آپ کو منع کیا تو اس کے بعد کبھی بھی ابوبکر رضی اللہ عنہ غمگین نہیں ہوئے۔اگر اعتراض کرنے والے ان کمینوں کو کوئی ذرا بھر بھی حیاء ہوتی؛ تو اس قسم کے اعتراض نہ کرتے۔اگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا غمگین ہونا عیب ہے تو یہی عیب محمد رسول اللہ ﷺ اور حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام پر بھی لازم آتا ہے۔کیونکہ اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرماتے ہیں:

﴿قَالَ سَنَشُدُّ عَضُدَكَ بِأَخِيكَ وَ نَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطٰنًا فَلَا يَصِلُوْنَ إِلَيْكُمَا بِاٰيٰتِنَآ اَنْتُمَا وَ مَنِ اتَّبَعَكُمَا الْغٰلِبُوْنَ﴾ (القصص ۳۵)

''کہا ہم تیرے بھائی کے ساتھ تیرا بازو ضرور مضبوط کریں گے اور تم دونوں کے لیے غلبہ رکھیں گے، سو وہ تم تک نہیں پہنچیں گے، ہماری نشانیوں کے ساتھ تم دونوں اور جنھوں نے تمھاری پیروی کی، غالب آنے والے ہو۔''

پھر جادوگروں کا قصہ بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ جب انہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا:

﴿اَنْ تُلْقِيَ وَ اِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَلْقٰى﴾(......آگے تک......) ﴿فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى ❀ قُلْنَا لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى﴾ (طه ۶۵۔۶۸)

انھوں نے کہا اے موسیٰ! یا تو یہ کہ تو پھینکے اور یا یہ کہ ہم پہلے ہوں جو پھینکے۔...... ''تو موسیٰ نے اپنے دل میں ایک خوف محسوس کیا۔ہم نے کہا خوف نہ کر، یقیناً تو ہی غالب ہے۔''

یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ کے رسول اور اس کے کلیم ہیں؛ اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ خبر بھی دی تھی کہ فرعون اور اس کے لشکری آپ تک نہیں پہنچ پائیں گے۔اور آپ ہی غالب رہیں گے۔ پھر اس کے بعد بھی آپ کے دل میں خوف محسوس ہوا۔حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ خوف محسوس کرنا صرف اس وجہ سے تھا کہ اللہ تعالیٰ آپ سے جو وعدہ کیا تھا کہ آپ ہی غالب رہیں گے؛ اس وقت یہ بات آپ کے ذہن سے اوجھل ہوگئی تھی۔اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا غم کرنا اس کی ممانعت کا حکم آنے سے پہلے تھا۔ جب کہ رسول اللہ ﷺ کے متعلق اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَ مَنْ كَفَرَ فَلَا يَحْزُنْكَ كُفْرُهٗ﴾ (لقمان ۲۳)

''اور جو کوئی کفر کرے پس اس کا کفر آپ کو غمگین نہ کرے۔''

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَ لَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَ لَا تَكُ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ﴾ (النحل ۱۲۷)

''اور ان پر غم نہ کر اور نہ کسی تنگی میں مبتلا ہو، اس سے جو وہ تدبیریں کرتے ہیں۔''

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿فَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ﴾ (یس ۷۶)

''ان کی باتیں آپ کو غمگین نہ کریں۔''

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرٰتٍ﴾ (فاطر ۸)

''سو آپ کی جان ان پر حسرتوں کی وجہ سے نہ جاتی رہے۔''

اور ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا یہ بھی فرمان ہے:

﴿قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِيْ يَقُوْلُوْنَ﴾ (الأنعام ۳۳)

''ہم جانتے ہیں بیشک آپ کو وہ بات غمگین کرتی ہے جو وہ کہتے ہیں۔''

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں خبر دی ہے کہ آپ کو کفار و مشرکین کا کلام غمگین کرتا ہے۔اور اس سے منع بھی کیا گیا۔ اگر شیعہ قول کے مطابق دیکھا جائے تو جیسے وہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے غمگین ہونے پر اعتراض اٹھاتے ہیں؛[یہی اعتراض رسول اللہ ﷺ پر بھی وارد ہوتا ہے ؛ مگر ہم کہتے ہیں]:رسول اللہ ﷺ کا ان لوگوں کے کفریہ کلام پر غمگین ہونا اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے کام تھے ؛ اور یہ حزن و ملال کی ممانعت آنے سے پہلے کا واقعہ ہے۔ایسے ہی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا اس ممانعت کا حکم آنے سے پہلے غمگین ہونا اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا کام تھا۔اور جب نبی کریم ﷺ نے اس سے منع کر دیا تو اس کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کبھی بھی غمگین نہیں ہوئے۔پس یہ کیفیت بھی ممکن ہے کہ اس وقت ابوبکر رضی اللہ عنہ غمگین نہ ہوئے ہوں۔مگر رسول اللہ ﷺ نے آپ کو اس لیے منع کیا ہو کہ کہیں آپ غمگین نہ ہو جائیں۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا﴾ (الإنسان ۲۴)

''اور ان میں سے کسی گناہ گار یا بہت ناشکرے کا کہنا مت مان۔''

❀❀❀❀

فصل:

[روافض کی کج فہمی]

[کج فہمی]:بعض روافض کہتے ہیں: کہ ﴿اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا﴾ [التوبة ۴۰]

''جب آپ اپنے ساتھی سے کہہ رہے تھے کہ غم نہ کر اللہ ہمارے ساتھ ہے۔'' کے الفاظ سے ابوبکر رضی اللہ عنہ کا ایمان ثابت نہیں ہوتا۔وہ کہتے ہیں کہ ''صاحب'' رفیق اور ساتھی کو کہتے ہیں۔ساتھی کبھی ایماندار بھی ہوسکتا ہے' اور کبھی کافر بھی۔[یہ ضروری نہیں کہ وہ ایماندار ہو]۔جیسا قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَ اضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِاَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ اَعْنَابٍ وَّ حَفَفْنٰهُمَا بِنَخْلٍ وَّ جَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعًا ❀ كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ اٰتَتْ اُكُلَهَا وَ لَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْئًا وَّ فَجَّرْنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا ❀ وَّ كَانَ لَهٗ ثَمَرٌ فَقَالَ لِصَاحِبِهٖ وَ هُوَ يُحَاوِرُهٗۤ اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَّ اَعَزُّ نَفَرًا ❀ وَ دَخَلَ جَنَّتَهٗ وَ هُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ قَالَ مَاۤ

﴿اَظُنُّ اَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖۤ اَبَدًا﴾ .... آگے تک.... ﴿قَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ وَ هُوَ يُحَاوِرُهٗۤ اَكَفَرْتَ بِالَّذِيْ خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ [ثُمَّ سَوّٰىكَ رَجُلًا]﴾ (الکهف ۳۲۔۳۷)

''اوران کے لیے ایک مثال بیان کیجیے، دوآدمی ہیں،جن میں سے ایک کے لیے ہم نے انگوروں کے دو باغ بنائے اور ہم نے ان دونوں کو کھجور کے درختوں سے گھیر دیا اور دونوں کے درمیان کچھ کھیتی رکھی۔دونوں باغوں نے اپنا پھل دیا اوراس سے کچھ کمی نہ کی اور ہم نے دونوں کے درمیان ایک نہر جاری کر دی۔اوراس کے لیے بہت سا پھل تھاتو اس نے اپنے ساتھی سے، جب اس سے باتیں کرر ہا تھا، کہا میں تجھ سے مال میں زیادہ اورنفری کے لحاظ سے زیادہ باعزت ہوں۔اور وہ اپنے باغ میں اس حال میں داخل ہوا کہ وہ اپنی جان پر ظلم کرنے والا تھا، کہا میں گمان نہیں کرتا کہ یہ کبھی برباد ہوگا'' ....''اس کے ساتھی نے، جب کہ وہ اس سے باتیں کرر ہا تھا، اس سے کہا کیا تو نے اس کے ساتھ کفر کیا جس نے تجھے حقیر مٹی سے پیدا کیا، پھرنطفہ کے ایک قطرے سے،[پھر تجھے ٹھیک ٹھاک آدمی کر دیا]۔''

[جواب]:ان سے کہا جائے گا: یہ بات معلوم شدہ ہے کہ:''صاحب کا لفظ ساتھی اور دوسروں سب کوشامل ہے۔[اس آیت میں صاحب کا لفظ مطلق ساتھی کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے]۔محض اس لفظ کے استعمال میں اس بات کی کوئی دلیل نہیں کہ کوئی دوست ہو یا دشمن ؛ یا پھر کافر ہو یا مؤمن ۔یہ صرف اس صورت میں ہوسکتا ہے جب اس کے ساتھ وصف کو بھی ملا کر بیان کیا جائے۔فرمان الٰہی ہے:﴿وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ وابن السبيل﴾ یہاں پر صاحب کا لفظ بیوی اور رفیق سفر دونوں کے لیے استعمال ہوا ہے؛ اس میں کافر اور مؤمن کی کوئی تمیز نہیں کی گئی ۔اور نہ ہی اس فرق کی کوئی دلیل موجود ہے۔ایسے ہی اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى ۞مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى﴾ [النجم ۱۔۲]

''قسم ہے ستارے کی جب وہ گرے!تمھارا ساتھی نہ راہ بھولا ہے اور نہ غلط راستے پر چلا ہے۔''

اوراللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ ﴾ [التکویر ۲۲]

''اور تمھارا ساتھی ہرگز کوئی دیوانہ نہیں ہے۔''

یہاں پر ساتھی سے مراد رسول اللہ ﷺ ہیں۔اس لیے کہ آپ نے بشر کی مصاحبت کی تھی۔ بیشک جب آپ لوگوں کے ساتھی تھے؛اور آپ کے اور لوگوں کی مابین مشارکت تھی ؛ تو جو وحی آپ لیکر آتے اس کا نقل کرنا ممکن ہوا۔اور ایسے ہی آپ کی جو بات سنتے اس کے معانی سمجھ سکتے ۔بخلاف فرشتہ کے جو کہ ان کے ساتھ نہیں رہا؛ اس لیے کہ لوگوں کے لیے ممکن نہیں تھا کہ براہ راست اس سے تعلیمات اخذ کریں۔

نیز یہ آیت اس بیان کو بھی متضمن ہے کہ یہ نبی ﷺ ان ہی کی جنس سے ایک بشر ہیں۔اوراس سے بھی خاص بات یہ ہے کہ آپ عربی ہیں؛اوراسی قوم کی زبان میں مبعوث ہوئے ہیں۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ﴾ [التوبة ۱۲۸]

''(لوگو) تمہارے پاس تم ہی میں سے ایک پیغمبر آئے ہیں۔ تمہاری تکلیف انکو گراں معلوم ہوتی ہے۔''

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ﴾ [ابراهيم ۴]

''ہم نے ہر نبی کو اس کی قومی زبان میں ہی بھیجا ہے تا کہ ان کے لیے بیان کر دے۔''

جب آپ ان کی صحبت میں رہے تھے تو ان لوگوں کی زبان بھی سیکھی تھی۔ اور آپ کے لیے یہ ممکن تھا کہ ان لوگوں کی زبان میں ان سے بات کر سکیں۔ تو اللہ تعالیٰ آپ کو لوگوں کی طرف ان کی زبان میں ہی رسول بنا کر بھیجا تا کہ لوگ آپ کی بات سمجھ سکیں۔ پس اس لحاظ سے یہاں پر صحبت کا ذکر کرنا ان پر مہربانی اور احسان کے باب سے تھا۔ بخلاف اس کے کہ صحبت کی جو اضافت آپ ﷺ کی طرف کی گئی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے:

﴿لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا﴾ ''گھبرائیے نہیں! بیشک اللہ ہمارے ساتھ ہے۔''

صحیح مسلم میں ہے: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''میرے صحابہ کو گالی نہ دو۔ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے!، اگر تم میں سے کوئی شخص احد پہاڑ کے برابر سونا خرچ کر دے تو ان کے پاسنگ کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔'' [سبق تخريجه]

اور جیسا کہ اس حدیث مبارک میں ہے: ''اے لوگو! کیا تم میرے لیے میری ساتھی کو نہیں چھوڑو گے۔'' اس کی مثالیں بہت زیادہ ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ ﷺ کے خطاب میں یا مسلمانوں کے خطاب میں صحبت کو رسول اللہ ﷺ کی طرف مضاف کرنا آپ ﷺ سے موالات اور دوستی کی صحبت کو متضمن ہے۔ یہ دوستی اور موالات آپ پر ایمان لائے بغیر ممکن نہیں۔ پس صحابی کے لفظ کا اطلاق اس انسان پر نہیں ہو سکتا جو سفر میں آپ کا ساتھی بنا ہو اور وہ حالت کفر پر ہو [جیسا کہ عبداللہ بن اریقط]

قرآن آپ کے بارے میں کہتا ہے: ﴿اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا﴾

''جب وہ اپنے ساتھی سے فرما رہے تھے: گھبرائیے نہیں! بیشک اللہ ہمارے ساتھ ہے۔''

پس رسول اللہ ﷺ خبر دے رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کے اور آپ کے ساتھی کے ساتھ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ ساتھ نصرت اور تائید کو متضمن ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے دشمن پر اور ان حضرات کے دشمن ہر کافر پر کامیابی عطا فرمائیں گے۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ اللہ تعالیٰ نبی کے ساتھ بھی ہو اور اس کے دشمن کے ساتھ بھی۔ اگر اللہ تعالیٰ آپ کے دشمن کے ساتھ ہوتا تو یہ بات موجب حزن و ملال تھی جس کی وجہ سے اطمینان و سکون ختم ہو جاتا۔ پس اس سے معلوم ہوا کہ ''صَاحِبِهٖ'' کا لفظ محبت اور دوستی کی صحبت کو متضمن ہے جس کی وجہ سے نبی کریم ﷺ پر آپ کا ایمان لازم آتا ہے۔

❀ ایسے ہی یہ لفظ: ﴿لَا تَحْزَنْ﴾ دلالت کرتا ہے کہ آپ رسول اللہ ﷺ کے سچے دوست تھے؛ اور یہ کہ آپ ان کے

دشمن سے خوف زدہ ہوئے تھے۔اسی لیے آپ سے کہا گیا:

﴿لَاتَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا﴾ ''گھبرایئے نہیں! بیشک اللہ ہمارے ساتھ ہے۔''

اگر آپ رسول اللہ ﷺ کے دشمن ہوتے تو پھر صرف اسی صورت میں غمگین ہوتے جب رسول اللہ ﷺ کے قہر و جلال کے سامنے مغلوب ہوجاتے ؛ ورنہ نہیں۔تو پھر ہرگز یہ بھی نہ کہا جاتا:

﴿لَاتَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا﴾ ''گھبرایئے نہیں! بیشک اللہ ہمارے ساتھ ہے۔''

اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا نبی کے ساتھ ہونا ایسی بات ہے جس سے نبی کریم ﷺ کو خوشی پہنچتی ہے۔اور آپ کے دشمن کے ساتھ ہونا ایسا معاملہ ہے جس سے آپ کو تکلیف متوقع ہوسکتی تھی۔پس یہ بات ممتنع ہے کہ اللہ ایک ہی وقت میں آپ کے ساتھ بھی اور آپ کے دشمن کے ساتھ بھی۔خصوصاً جب کہ یہ کہا جارہا ہے: ﴿لَا تَحْزَنْ﴾ پھر یہ فرمان:

﴿اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ﴾ [التوبة ۴۰]

''اس وقت جبکہ انہیں کافروں نے نکال دیا تھا،دو میں سے دوسرا جبکہ وہ دونوں غار میں تھے۔''

اللہ تعالیٰ کی مدد اس صورت میں نہیں ہوسکتی تھی کہ آپ کے دشمن کو آپ کے ساتھ ملا دیا جائے۔نصرت و مدد تو اسی صورت میں تھی کہ آپ کے دوست کو آپ کے ساتھ ملایا جائے اور دشمن سے نجات عطا کی جائے۔دشمن پر آپ کی مدد و نصرت اس صورت میں کیسے ممکن ہے کہ دشمن مسلسل آپ کے ساتھ لگا رہے۔دن اور رات میں کسی وقت بھی آپ سے جدا نہ ہوتا ہے؛ خصوصاً جب کہ آپ اتنے اہم ترین اور خطرناک سفر میں تھے۔یہ آیت اس امر کی دلیل ہے کہ کفار نے رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ساتھی کو نکالا تھا۔اور اس میں کوئی شک نہیں کہ کفار اپنے دشمنان کو ہی نکال رہے تھے؛ اپنے کافروں میں سے کسی ایک کو بھی انہوں نے نہیں نکالا۔پس اس سے بھی ظاہر ہوگیا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی صحبت صحبتِ محبت و ایمان موالات و دوستی تھی۔کفر کی صحبت نہیں تھی۔

کسی انسان کے باطن میں اہل ایمان' یا کافر' یا یہودی اور عیسائی یا پھر مشرک ہونے کا علم طویل صحبت کی صورت میں کسی پر مخفی نہیں رہتا۔اس لیے کہ کبھی بھی کوئی انسان اپنی اندر کی بات نہیں چھپاتا مگر اللہ تعالیٰ اس کے چہرے کے آثار اور زبان کی بول چال سے اسے ظاہر کردیتے ہیں۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَلَوْ نَشَاءُ لَاَرَيْنَاكَهُمْ فَلَعَرَفْتَهُمْ بِسِيمَاهُمْ وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِيْ لَحْنِ الْقَوْلِ﴾ [محمد ۳۰]

''اور اگر ہم چاہیں تو آپ کو وہ لوگ دکھادیں،سو یقیناً آپ انھیں ان کی نشانی سے پہچان لیں گے: اور آپ انھیں بات کے انداز سے ضرور ہی پہچان لیں گے۔''

اس میں کوئی شک نہیں کہ کفر چھپانے والا اپنے ٹیڑھے اور کمزور قول کی وجہ سے پہچانا جاتا ہے۔جب کہ چہرہ کے آثار سے کبھی کوئی پہچان سکتا ہے اور کبھی نہیں۔

پہلی بات: نبی کریم ﷺ سے روایت میں جو صحابہ معروف و مذکور ہیں' اور جن کی دینداری کی وجہ سے مسلمان ان کی تعظیم کرتے ہیں؛ یہ تمام رسول اللہ ﷺ پر ایمان رکھنے والے سچے مومن تھے۔الحمد للہ کہ مسلمانوں نے کبھی بھی کسی منافق کی

تعظیم نہیں کی۔ کسی انسان کے ایمان کا بھی ایسے ہی پتہ چل جاتا ہے جیسے اس باقی تمام احوال قلب دشمنی اور دوستی؛ غم و خوشی؛ بھوک و پیاس اور دوسرے امور کا پتہ چل جاتا ہے۔ اس لیے کہ ان امور کے کچھ ظاہری لوازم ہیں۔ اور ظاہری امور باطنی امور کو مستلزم ہوتے ہیں۔ یہ بات وہ تمام لوگ جانتے ہیں جنہوں نے اس کا تجربہ کیا ہو اور اسے آزمایا ہو۔

ہم اضطراری طور پر جانتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر' ابن عباس' انس بن مالک' ابوسعید خدری؛ اور جابر رضی اللہ عنہم اجمعین اور ان کے امثال دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سچا ایمان رکھنے والے؛ آپ کی تعظیم کرنے والے اور آپ سے سچی محبت کرنے والے تھے۔ ان میں کوئی بھی منافق نہیں تھا۔ تو پھر ان خلفاء راشدین کے یہ احوال کیونکر معلوم نہیں ہو سکتے تھے جن کے ایمان بالرسول اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت اور نصرت کی خبریں زمین کے مشرق و مغرب میں معروف ہیں۔

ایسی باتیں تو معروف ہونی چاہیے۔ منافقین کا وجود ان پاکباز لوگوں کے ایمان میں شک و شبہ کا موجب و سبب نہیں بن سکتا جنہیں امت میں صداقت و امانت کے ساتھ قبولیت اور شہرت حاصل ہے۔ بلکہ ہم ضروری طور پر سعید ابن میسب' حسن بصری' علقمہ' اسود' مالک' شافعی' احمد بن حنبل' فضیل اور جنید رحمہم اللہ اور جو لوگ ان سے بھی کم مرتبہ کے ہیں' ان کا مسلمان اور صاحب ایمان ہونا جانتے ہیں۔ تو پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کا اہل ایمان ہونا کیونکر معلوم نہیں ہوسکتا۔ اور ان بہت سے لوگوں کا صاحب ایمان ہونا بھی جانتے ہیں جو ہمارے اصحاب میں سے ہیں اور انکے ساتھ ہمارا اٹھنا بیٹھنا رہا ہے۔

دوسری بات: نیز ان سے یہ بھی کہا جائے گا کہ: امام احمد رحمہ اللہ اور دوسرے علماء کرام نے لکھا ہے: ہمیں اس بارے میں کسی اختلاف کا کوئی علم نہیں ہوسکا کہ مہاجرین میں ایک بھی منافق نہیں تھا۔ اس لیے کہ مہاجرین نے اس وقت اپنے اختیار سے ہجرت کی تھی جب مکہ میں ان پر ایمان لانے کی پاداش میں تکالیف ڈھائی گئیں۔ اس وقت مکہ میں کوئی اپنے اختیار کے بغیر اسلام قبول نہیں کرتا تھا۔ بلکہ وہاں مشکلات اور تکلیف کے احتمال کے باوجود کوئی ایک بھی ایسا نہیں تھا جو ایمان کا اظہار کرتا ہو اور اس کے دل میں کفر پوشیدہ ہو۔ خصوصاً جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ہجرت تک کرنا پڑی۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ ہجرت کی تو وہاں پر آپ کو قوت و طاقت حاصل ہوگئی۔ جب اسلام کو غلبہ حاصل ہوا؛ اور انصاری قبائل میں اسلام پھیل گیا تو بعض وہ لوگ جو کہ صدق دل سے ایمان نہیں لائے تھے وہ اپنی قوم کے ساتھ موافقت کے لیے اسلام کا اظہار کرنے لگے۔ اس لیے کہ اہل ایمان وقوت و سطوت حاصل ہوگئی تھی۔ اور ان کے ہاتھ میں اب تلوار بھی آگئی تھی؛ اور یہ کفر کی وجہ سے لوگوں سے جہاد بھی کرتے تھے۔

تیسری بات: عام طور پر بنی آدم کے اہل خرد و دانش اور اصحاب عقل لوگ جب کچھ عرصہ تک دوسروں کے ساتھ رہتے ہیں تو انہیں دوسرے انسان کی محبت اور دوستی یا نفرت اور دشمنی کا پتہ چل جاتا ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تیرہ برس تک ان کی صحبت میں رہے۔ تو کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ پتہ نہیں چل سکا تھا کہ ابوبکر آپ کے دوست ہیں یا دشمن؟ اور پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر ایک دار خوف میں اکٹھے بھی ہیں۔ کیا یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں قدح نہیں ہے؟

پھر ان سے یہ بھی کہا جائے گا کہ: تمام لوگ جانتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے سے لیکر وقت وفات تک

آپ کا سب سے بڑا دوست اور آزاد مردوں میں سب سے پہلے ایمان لانے والی ہستی جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔ آپ نے دوسرے لوگوں کو بھی یہ دعوت پیش کی حتی کہ وہ بھی ایمان لے آئے۔ آپ نے کمزور مسلمانوں کو مظالم سے نجات دلانے کے لیے اپنا مال خرچ کیا۔ جیسے حضرت بلال رضی اللہ عنہ وغیرہ۔ نیز آپ موسم حج میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکلتے اور مختلف قبائل کو اسلام کی دعوت پیش کرتے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم روزانہ صبح یا شام کو آپ کے گھر تشریف لاتے۔ آپ کو کفار نے ایمان لانے پر مشق ستم بھی بنایا۔ حتی کہ آپ ہجرت کی غرض سے نکلے تو راستہ میں عرب امراء میں سے ایک امیر ابن دغنہ سے ملاقات ہوئی۔ یہ اپنے علاقہ کا بڑا انسان تھا۔ اس نے پوچھا: کہاں کا ارادہ ہے؟...... یہ پوری روایت پہلے گزر چکی ہے۔

تو کیا پھر جس انسان کے پاس ادنیٰ سی عقل بھی ہو؛ وہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی دوستی و محبت جانثاری اور فدائیت میں معمولی سا شک بھی کرسکتا ہے؟ حالانکہ آپ کی محبت کا یہ عالم تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت اور دوستی کی وجہ سے آپ نے اپنی قوم اور خاندانی سے دشمنی مول لے رکھی تھی۔ اور ان کی طرف سے ملنے والی تکلیفوں پر صبر کیا کرتے اور اہل ایمان بھائیوں میں سے ضرورت مند کی ضرورت پوری کرنے کیلئے اپنا مال خرچ کرتے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی طرف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رات یا دن میں یا خلوت یا جلوت میں اجتماعی یا انفرادی حالت میں کبھی بھی کوئی تکلیف نہیں پہنچی۔ حالانکہ۔ معاذ اللہ؛ [جیسے رافضی خباثت بکتے ہیں]۔ اگر آپ چاہتے تو زہر دینا یا قتل کرنا یا کوئی اور چال چل کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف دینا حضرت کے لیے کوئی مشکل نہیں تھا۔

❀ مزید برآں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حفاظت اور تائید حاصل تھی؛ اس کا تقاضا یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کسی بھی برائی کا ارادہ کرنے والے انسان سے آپ کو مطلع کر دیتے؛ اگر کسی کا کوئی برا ارادہ ہوتا۔ جیسا کہ:

۱:...... اللہ تعالیٰ نے ابی عزہ کے ارادہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مطلع کر دیا تھا جب وہ ایمان کا اظہار کرتے ہوئے برے ارادہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب پہنچ گیا تھا۔ اتنا تو ایک ہی مجلس میں ہوگیا۔

۲:...... ایسے ہی حنین کے موقع پر جب مسلمان پسپا ہوگئے تو جمحی برے ارادہ سے آگے بڑھا؛ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے میں خبر دیدی۔

۳:...... فتح مکہ کے موقع پر عمیر بن وہب جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر اچانک حملہ کرنا چاہتا تھا اور وہ اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف آگے بڑھ رہا تھا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو اس سے آگاہ کر دیا۔

۴:...... غزوہ تبوک سے واپسی پر جب منافقین نے چاہا کہ آپ کی اونٹنی کی مہار کاٹ کر آپ پر حملہ کردیں تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان کے ارادہ سے آگاہ کر دیا' [اور ان لوگوں کے نام بھی بتادیے]۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سفر و حضر میں دن و رات ہمیشہ آپ کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ خلوت و جلوت میں آپ کے ساتھی تھے۔ بدر کے دن آپ اکیلے ہی جھونپڑے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کر رہے تھے۔ اگر آپ کے دل میں ذرا بھر بھی کوئی میل ہوتی تو پھر کیسے ممکن تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بارے میں خبر نہ ہوتی۔ جس انسان کو ادنی ذہانت بھی حاصل ہو وہ اس سے بہت کم وقت کی ہمراہی میں ایسی باتوں کا ادراک کر لیتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بارے میں

ایسا گمان صرف وہی انسان کرسکتا ہے جو لوگوں میں سب سے بڑا جاہل اور سب سے بڑا بیوقوف ہو؛ اور نبی کریم ﷺ کی شان میں سب سے بڑا گستاخی کرنے والا اور عیب لگانے والا ہو۔ اس سے بڑا کوئی طعن رسول اللہ ﷺ کی شان میں نہیں ہوسکتا۔ بھلے ایسا کہنے والا محبت رسول اللہ ﷺ کا دعویدار ہو۔ جس انسان کو دین اسلام کے متعلق ادنیٰ سا علم بھی حاصل ہو وہ جانتا ہے کہ رافضی مذہب دین اسلام کے متناقض ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ زندیق لوگ جو دین اسلام میں فساد پیدا کرنا چاہتے تھے وہ اپنے پیروکاروں کو شیعیت کے اظہار کا حکم دیتے تھے۔ اور وہ اپنے مقاصد پورے کرنے کے لیے شیعیت کا راستہ ہی استعمال کرتے تھے۔ جیسا کہ 'بلاغ اکبر' اور ناموس اعظم کے مصنف نے ذکر کیا ہے۔

❀ یہاں پر یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ: اس آیت میں مذکور صحبت:

﴿إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا﴾ [التوبة ۴۰]

''جب وہ اپنے ساتھی سے فرمارہے تھے: گھبرایئے نہیں! بیشک اللہ ہمارے ساتھ ہے۔''

اپنے ساتھی کے ساتھ محبت و الفت اور موالات اور اس کی سچی اتباع کی صحبت ہے۔ جس کا نفاق سے یا محض سفر کے ساتھی کی صحبت سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ وہی صحبت ہے جو کوئی بھی انسان کسی کو اپنا دوست بناتے ہوئے پیش نظر رکھتا ہے۔ جیسا کہ علم ضروری کے طور پر تمام خلائق کے ہاں مشہور و معروف ہے۔ اور کئی امور کی بنا پر اسے تواتر کی حیثیت حاصل ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی رسول اللہ ﷺ کے ساتھ محبت و موالات اور آپ پر صدق ایمان [کمال کی معراج پر تھے]؛ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے ابن عم کی محبت و الفت سے بہت بڑھ کر تھے۔

فصل:

[حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا یقین وثبات]

[اعتراض]: شیعہ مصنف نے کہا ہے کہ: اس آیت کریمہ [﴿فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ ''پس اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پر اور مؤمنین پر اپنا سکون نازل فرمایا''] میں سکینہ نازل کرنے کا ذکر فرمایا تو اس میں واضح طور پر اہل ایمان کو سکون واطمینان کے مورد میں آپ کا شریک قرار دیا ہے، مگر آیت زیر تبصرہ میں یہ صراحت موجود نہیں۔ اس سے بڑھ کر کوئی اور نقص نہیں ہوسکتا۔''

[جواب]: پہلی بات: رافضی مصنف اپنے تئیں یہ تصور کروانا چاہتا ہے کہ سکون نازل ہونے کا ذکر متعدد بار ہوا ہے۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ یہ تذکرہ صرف حنین کے موقعہ پر ہوا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَ يَوْمَ حُنَيْنٍ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْــًٔا وَّ ضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ٭ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَ اَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا﴾ [التوبہ ۲۵۔ ۲۶]

''اور حنین کی لڑائی والے دن بھی جب کہ تمہیں کوئی فائدہ نہ دیا بلکہ زمین باوجود اپنی کشادگی کے تم پر تنگ ہوگئی پھر تم پیٹھ پھیر کر مڑ گئے۔ پھر اللہ نے اپنی طرف کی تسکین اپنے نبی پر اور مومنوں پر اتاری اور اپنے لشکر بھیجے جنہیں تم دیکھ نہیں رہے تھے۔''

یہاں پر اللہ تعالیٰ نے ان کے پیٹھ پھیر کر چلے جانے کے بعد اہل ایمان اور اپنے نبی پر سکینہ نازل کرنے کا ذکر فرمایا ہے۔ پھر دوسرے مقام پر رسول اللہ ﷺ کیساتھ اہل ایمان پر سکینہ نازل کرنے کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

﴿اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ....هُوَ الَّذِيْۤ اَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ فِيْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِيْنَ ....﴾ [الفتح ۱۔۴]

''(اے نبی) بیشک ہم نے آپ کو ایک کھلم کھلا فتح دی ہے...... وہی ہے جس نے مسلمانوں کے دلوں میں سکون اور اطمینان ڈال دیا۔''

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ﴾ [الفتح ۱۸]

''یقیناً اللہ تعالیٰ مومنوں سے خوش ہوگیا جبکہ وہ درخت تلے تجھ سے بیعت کر رہے تھے ان کے دلوں میں جو تھا اسے اس نے معلوم کرلیا اور ان پر اطمینان نازل فرمایا۔''

دوسری بات: علماء کرام رحمہم اللہ کا اختلاف ہے کہ اس آیت: ﴿فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ﴾ میں ضمیر کس کی طرف راجع ہے۔ بعض کہتے ہیں: ضمیر کا مرجع نبی کریم ﷺ کی طرف ہے۔ اور بعض کہتے ہیں: نہیں' بلکہ ضمیر کا مرجع حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔ اس لیے کہ ابوبکر اقرب المذکورین ہیں' اور آپ کو اطمینان وسکون کی ضرورت زیادہ تھی۔ تو آپ پر بھی ایسے

ہی سکون نازل ہوا جیسا کہ بیعت رضوان کے موقع پر درخت کے نیچے اہل ایمان پر سکون و اطمینان نازل ہوا تھا۔
نبی کریم ﷺ اس حال میں اس سے مستغنی تھے؛ اس لیے کہ آپ کو کمال اطمینان حاصل تھا۔ بخلاف یوم حنین کے: اس لیے کہ اس دن آپ کو اس کی ضرورت تھی۔ کیونکہ جمہور صحابہ پسپا ہو چکے تھے؛ اور دشمن آپ کی طرف بڑھ رہا تھا' اور آپ اپنی خچر کو دشمن کی طرف ہانک رہے تھے۔
پہلے قول کی بنیاد پر ضمیر کا مرجع رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی ہے؛ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں بھی ہے:
﴿وَ اَیَّدَہٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْھَا﴾ ''اور ایسے لشکر سے ان کی مدد کی جسے تم نے نہیں دیکھا۔''
اس لیے کہ سیاق کلام میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا ذکر تھا؛ اس لیے جداگانہ طور پر نزول سکینہ کے اظہار کی ضرورت نہیں تھی۔ کیونکہ آپ نبی ﷺ کے تابع و مطیع اور رفیق و مصاحب تھے۔ لیکن یہ کہا جا سکتا ہے کہ: جب آپ نے اپنے ساتھی سے کہا: ﴿اِنَّ اللّٰـهَ مَعَنَا﴾ '' بیشک اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے'' [تو اللہ تعالیٰ کی معیت دونوں کو حاصل تھی]۔ نبی کریم ﷺ متبوع و مطاع تھے۔ اور ابوبکر تابع و مطیع۔ اور یہی آپ کے ساتھی بھی تھے۔ بنابریں جب متبوع کو سکون و اطمینان اور ملائکہ کی تائید و نصرت حاصل ہوگی تو لازماً تابع بھی اس میں شریک ہوگا۔؛ اس لیے یہاں جداگانہ طور پر نزول سکینہ کے اظہار کی ضرورت نہیں تھی۔ کیونکہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کو کمال مصاحبت و ملازمت حاصل تھے' جو کہ اس تائید و سکون میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ آپ کی مشارکت کو واجب کرتے تھے۔
بخلاف حنین کے دن پسپا ہونے والوں کے احوال کے۔ اس لیے کہ اس موقع پر اگر اللہ تعالیٰ اتنا ہی فرماتے کہ: اللہ تعالیٰ نے اپنا سکون اپنے پیغمبر پر نازل کیا' اور اس سے آگے کچھ نہ فرماتے تو یہاں پر کوئی ایسا قرینہ نہیں تھا جس کی وجہ سے ہم کہہ سکتے کہ یہ سکون اہل ایمان پر بھی نازل ہوا ہے۔ اس لیے کہ یہ لوگ جب پسپا ہوئے تو رسول اللہ ﷺ کو چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ اور ان کے لیے ایسی مطلق صحابیت بھی ثابت نہیں تھی جو ابوبکر جیسے کمال صحبت و ملازمت پر دلالت کرتی ہو۔
چونکہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو مطلقاً صاحب کامل کے لقب سے نوازا گیا ہے۔ جس سے عیاں ہوتا ہے کہ آپ ہمیشہ اور ہر حال میں نبی کریم ﷺ کے وابستہ رہا کرتے تھے۔ خصوصاً ایسے نازک وقت اور انتہائی خوف کے حالات میں جب کہ دوستی نباہنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ تو اس سے بطریق دلالۃ النص واضح ہوتا ہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نصرت و تائید ربانی کے وقت بھی نبی کریم ﷺ کے ساتھ شریک و سہیم ہوں گے۔ اس لیے کہ جو کوئی بھی انتہائی سختی اور خوف و شدت کے حالات میں دوستی نبھائے؛ وہ ضروری طور پر نصرت اور تائید و مدد کے احوال میں بھی ساتھ نبھاتا ہے۔ تو پھر اس کے ساتھ کا ذکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی؛ اس لیے کہ احوال کلام خود اس پر دلالت کرتے ہیں۔
جب اس بات کا علم ہو گیا کہ آپ اس حال میں بھی آپ رسول اللہ ﷺ کے ساتھی اور مؤید تھے' تو یہ بات بھی بدیہی طور پر معلوم ہوگئی کہ رسول اللہ ﷺ پر جو سکینہ نازل ہوا' اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسا لشکر اتار کر آپ کی تائید کی گئی؛ جس کو آپ کے مذکورہ ساتھی و دوست نہیں دیکھ سکے؛ اس میں باقی لوگوں کی نسبت بہت بڑی فضیلت ہے؛ اور یہ قرآن کی بلاغت اور حسن بیان کی دلیل ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗٓ اَحَقُّ اَنْ یُّرْضُوْهُ﴾ [التوبۃ ۶۲]

''اللہ اور اس کا رسول رضامند کرنے کے زیادہ مستحق تھے۔''

یہاں پر اس جملہ: ﴿اَحَقُّ اَنْ یُّرْضُوْهُ﴾ میں اگر ضمیر کا مرجع اللہ تعالیٰ کی طرف ہے تو اللہ تعالیٰ کی رضامندی رسول اللہ ﷺ کی رضامندی کے حصول کے بغیر ممکن نہیں۔ اور اگر اس کی ضمیر کا مرجع رسول اللہ ﷺ کی طرف ہے تو رسول اللہ ﷺ کی رضامندی کا حصول اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اللہ تعالیٰ راضی نہ ہو جائے۔ جب ان دونوں میں سے کسی ایک کی رضامندی دوسرے کی رضامندی کے حصول کے بغیر ممکن نہیں؛ تو ان دونوں کی رضامندی ایک ہی چیز سے حاصل کی جاسکتی ہے۔ جب پہلا مقصود اللہ تعالیٰ کی رضامندی ہو تو رسول اللہ ﷺ کی رضامندی اس کی اتباع میں ہو جائے گی۔ جیسے یہاں پر ﴿اَحَقُّ اَنْ یُّرْضُوْهُ﴾ میں اللہ تعالیٰ واحد کی ضمیر لائے ہیں۔ ایسے ہی یہاں پر: ﴿فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ وَ اَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا﴾ میں واحد کی ضمیر لائے ہیں۔ اس لیے کہ یہاں پر کسی ایک پر اطمینان وسکون کا نزول دوسرے کی مشارکت کو مستلزم ہے۔ یہ محال ہے کہ ایک ساتھی پر اطمینان نازل ہو اور ساتھ دینے والے پر نہ ہو یا ساتھ دینے والے پر نازل ہو اور اس ساتھی پر نازل نہ ہو جو کہ ہمیشہ سے جزء لاینفک اور ملازم ہے۔ جب اس سکینہ کا حصول ان دونوں کے ساتھ ہی ممکن تھا تو ضمیر کو واحد لایا گیا۔ اور اس ضمیر کا اصل مرجع رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی ہے' اور آپ کا صاحب و ساتھی آپ کے اتباع میں اس میں شریک ہے۔

اگر کوئی یہ کہے کہ: اللہ تعالیٰ نے ان دونوں پر سکون نازل کیا اور ان کی تائید کی؛ اس سے یہ وہم پیدا ہوتا ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ بھی شریک نبوت ہوں۔ جیسا کہ حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کے متعلق اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿سَنَشُدُّ عَضُدَكَ بِاَخِيْكَ وَ نَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطٰنًا﴾ [القصص ۳۵]

''ہم تیرے بھائی کے ساتھ تیرا بازو مضبوط کر دیں گے اور تم دونوں کو غلبہ دیں گے۔''

اگر یہ کہا جاتا کہ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں پر سکون نازل فرمایا اور ان کی تائید کی؛ تو اس سے شراکت کا وہم پیدا ہوتا ہے۔ [تو اس کا جواب یہ ہے]: بلکہ یہاں پر ضمیر کا مرجع رسول متبوع ہے۔ اور آپ کی تائید و نصرت آپ کے ساتھی کی تائید و نصرت بطور لازم ضرورت کے تحت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس موقع پر بھی نبی کریم ﷺ کو تائید و نصرت سے نوازا گیا نبی کریم ﷺ کے بعد اسی قسم کے حالات میں تائید ربانی حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے شامل حال ہوئی، اسی بنا پر خوف و شدت کے مقامات پر تمام صحابہ میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ یقین و ثبات میں سب سے آگے تھے۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ:

''اگر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے ایمان کو کرۂ ارضی پر بسنے والے سب انسانوں کے ایمان کے ساتھ تولا جائے تو ابو بکر رضی اللہ عنہ کا ایمان بڑھ جائے گا۔''[1]

---

[1] شیخ الاسلام رحمہ اللہ نے اسے حدیث نبوی نہیں، بلکہ بصیغہ تمریض ''قیل'' ذکر کیا ہے۔ نیز احادیث القصاص (ح:۱۸)، میں ان الفاظ کو موضوع قرار دیتے ہوئے معناً درست قرار دیا ہے جیسا کہ اگلی حدیث ہے۔ تاہم یہ روایت مرفوعاً الکامل لابن عدی (۱۵۱۸/٤)، میں بسند ضعیف مروی ہے۔ تاہم سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے موقوفاً ثابت ہے۔ دیکھیے فضائل الصحابة للامام احمد(٦٥٣)، السنة لعبد الله بن احمد(٨٢١)، شعب الایمان(٣٦)، اس معنی کی مرفوعاً روایت مسند احمد (٢/ ٧٦)، الشریعة للآجری(١٣٣٣)، میں ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔

سنن میں حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے صحابہ سے پوچھا:

''کیا تم میں سے کسی نے آج خواب دیکھا ہے؟'' ایک صحابی نے کہا میں نے دیکھا ہے کہ آسمان سے ایک ترازو اترا جس میں آپ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کو تولا گیا تو آپ بڑھ گئے، پھر ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو تولا گیا تو ابوبکر رضی اللہ عنہ والا پلڑا جھک گیا۔ پھر عمر و عثمان رضی اللہ عنہما کو تولا گیا تو عمر رضی اللہ عنہ والا پلڑا جھک گیا۔ پھر ترازو کو آسمانوں میں اٹھالیا گیا۔ پھر نبی کریم ﷺ سے اس بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا: ''یہ خلافت نبوت ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ جس کو چاہے گا اپنا ملک عطا کردے گا۔''[1]

ابوبکر بن عیاش رحمہ اللہ فرماتے ہیں: حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ باقی صحابہ کرام پر روزہ اور نماز کی وجہ سے سبقت نہیں لے گئے تھے' بلکہ آپ کی سبقت کا سبب دل میں موجود ایمان تھا۔

آیت ﴿وَسَيُجَنَّبُهَا الْأَتْقَى﴾ اور شیعہ کا استدلال:

[اعتراض]: شیعہ مصنف کہتا ہے: آیت قرآنی ﴿وَسَيُجَنَّبُهَا الْأَتْقَى﴾ حضرت ابوالدحداح رضی اللہ عنہ سے متعلق ہے۔ آپ نے اپنے ایک پڑوسی کے لیے ایک کھجور کا درخت خریدا تھا۔ نبی کریم ﷺ نے اس انسان کو اس کھجور کے درخت کے بدلہ میں جنت میں ایک درخت کی بشارت سنائی۔ جسے ابودحداح رضی اللہ عنہ نے سن لیا[2] اور ایک پورا باغ خرید کر اپنے پڑوسی کے لیے ہبہ کردیا۔ تو نبی کریم ﷺ نے اس کے بدلہ میں جنت میں ایک باغ کی خوشخبری سنائی۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جواب]: ایسا کہنا جائز نہیں ہے کہ یہ آیت حضرت ابودحداح رضی اللہ عنہ کیساتھ مختص ہے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مفسرین' قرآنی علوم کے ماہرین' اور اسباب نزول جاننے والے تمام علماء کرام کا اتفاق ہے کہ: مذکورہ سورت مکی ہے۔ اور ابوالدحداح رضی اللہ عنہ کا واقعہ بالاتفاق مدینہ منورہ میں پیش آیا۔ کیونکہ آپ انصار میں سے ہیں۔ اور انصار کو شرف صحابیت مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد حاصل ہوا تھا۔ اور باغ و بستان وغیرہ مدینہ میں ہی تھے۔ پھر یہ بات ممتنع ہوجاتی ہے کہ یہ آیت حضرت ابودحداح رضی اللہ عنہ کے قصہ کے بعد نازل ہوئی ہو۔

---

[1] سنن ابی داؤد، کتاب السنۃ، باب فی الخلفاء (حدیث: ٤٦٣٤)، سنن ترمذی، کتاب الرؤیا۔ باب ما جاء فی رؤیا النبی ﷺ، المیزان والدلو (حدیث: ٢٢٨٧)۔

[2] حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے الاصابۃ ٤/ ٥٩ میں حضرت ابودحداح انصاری رضی اللہ عنہ کے حالات زندگی تحریر کئے ہیں۔ امام احمد بن حنبل' امام بغوی اور حاکم نے حماد بن سلمہ کی سند سے حضرت انس سے یوں روایت کیا ہے: ''ایک آدمی آیا اور اس نے عرض کی: یارسول اللہ! فلاں انسان کے پاس کھجور کا ایک درخت ہے' اور میں اپنی دیوار بنانا چاہتا ہوں۔ آپ اسے حکم دیں کے وہ درخت مجھے دیدے۔ تاکہ میں دیوار بنا سکوں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''یہ درخت اسے جنت میں ایک درخت کے بدلہ میں دیدو۔ مگر اس آدمی نے انکار کردیا۔ پھر حضرت ابودحداح رضی اللہ عنہ اس کے پاس چلے گئے اور فرمانے لگے: یہ درخت مجھ پر میری چاردیواری کے بدلہ میں بیچ دو۔ تو وہ اس پر راضی ہوگیا۔ حضرت ابودحداح واپس رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کی: یارسول اللہ! میں نے وہ کھجور اپنی چاردیواری کے بدلہ خرید لی ہے' اور وہ میں آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ تو رسول اللہ ﷺ! نے فرمایا: ''اوہ! ابودحداح کے لیے جنت میں کتنی زیادہ اور میٹھی کھجوریں ہیں۔'' آپ نے یہ کلمہ کئی بار ارشاد فرمایا۔ المستدرك علی الصحیحین للحاکم؛ کتاب البیوع ح ٢١٣٧۔

اگر کسی مفسر نے یہ کہا بھی ہے کہ یہ آیت ابو دحداح رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی تو اس سے مراد یہ ہے کہ یہ آیت ابو دحداح کے واقعہ کو بھی شامل ہے۔بعض صحابہ و تابعین جب کہتے ہیں کہ یہ آیت فلاں واقعہ کے بارے میں نازل ہوئی تو اس سے ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ یہ آیت اس واقعہ کو شامل ہے اور اس کے حکم پر دلالت کرتی ہے،یا یہ واقعہ بھی اس کے عموم حکم میں شامل ہے۔بعض علماء یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ آیت دو مختلف اسباب کی بنا پر دو مرتبہ نازل ہوئی ہے۔ایک مرتبہ اس سبب کی بنا پر اور دوسری بار اس سبب کی بنیاد پر۔

اس قول کی بنیاد پر کہہ سکتے ہیں کہ آیت دو بار نازل ہوئی ہو۔ان میں سے ایک بار حضرت ابو دحداح رضی اللہ عنہ کی شان میں نازل ہوئی ہو۔وگرنہ اہل علم میں اس بات میں کوئی اختلاف نہیں کہ یہ آیت ابو دحداح کے مسلمان ہونے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہجرت کرنے سے پہلے مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی۔

بہت سارے علماء کرام رحمہم اللہ نے یہ بھی کہا ہے کہ: یہ آیت حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی شان میں نازل ہوئی ہے۔امام ابن جریر رحمہ اللہ اپنی سند سے حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ یہ آیت حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ایسے ہی ابن ابی حاتم اور ثعلبی رحمہما اللہ نے بھی حضرت عبداللہ اور سعید بن مسیب رحمہما اللہ سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں ذکر کیا ہے کہ: ہم سے ہمارے والد نے حدیث بیان کی ؛ ان سے محمد بن ابی عمر عدنی نے' وہ محدث ابن عیینہ سے؛ وہ حضرت عروہ رحمہ اللہ کے والد سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے سات ایسے غلاموں کو خرید کر آزاد کیا جن کو اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھنے کے جرم میں ستایا جاتا تھا۔ان کے اسماء گرامی یہ ہیں:

بلال ۔ عامر بن فہیرہ ۔ نہدیہ ۔ بنت نہدیہ ۔ زنیرہ ۔ ام عمیس رضی اللہ عنہم ۔ بنی مؤمل کی ایک لونڈی۔ ❶

محدث سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:''زنیرہ رومی الاصل اور بنی عبد الدار کی مملوکہ تھی۔جب اسلام لائیں تو ان کی بصارت جاتی رہی۔لوگوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ لات و منات نے اسے اندھا کر دیا۔زنیرہ نے کہا میں لات و منات کو معبود نہیں تصور کرتی چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کو دوبارہ قوت بینائی عطا فرمائی۔ ❷

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے جب حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو خریدا تو وہ پتھروں میں دبے ہوئے تھے۔ان کے مالک نے کہا اگر کوئی شخص مجھے ایک اوقیہ بھی دے تو میں بلال رضی اللہ عنہ کو فروخت کر دوں گا۔حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:''اگر آپ ایک سو اوقیہ بھی طلب کریں تو میں دے کر انھیں خرید لوں گا۔فرماتے ہیں اسی ضمن میں مذکورہ صدر آیت:﴿وَ سَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى﴾ آخر سورت تک نازل ہوئی۔

جب حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ ایمان لائے تو اس وقت آپ کے پاس چالیس ہزار درہم تھے،وہ سب آپ نے راہ الٰہی میں صرف کر دیے۔کئی اور وجوہات بھی اس بات کے شاہد ہیں کہ یہ آیت حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی شان میں نازل ہوئی ہے:

پہلی وجہ: فرمان الٰہی ہے:﴿وَ سَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى﴾ ۔اور یہ بھی فرمایا ہے:﴿إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ﴾ بیشک تم میں سے اللہ کے ہاں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہو۔'' تو یہ ضروری ہے کہ امت کا سب

❶ مستدرك حاكم(٣/ ٢٨٤) سيرة ابن هشام(ص:١٤٦۔١٤٧)۔ ❷ سيرة ابن هشام(ص:١٤٧)۔

سے بڑا متقی اس آیت کے ضمن میں داخل ہو؛ اور وہی اللہ تعالیٰ کے ہاں سب سے زیادہ عزت والا بھی ہوگا۔ کوئی شخص اس بات کا قائل نہیں کہ حضرت ابودحداح سابقین اولین مہاجرین ؛حضرت ابوبکر و عمر' عثمان و علی رضی اللہ عنہم اجمعین سے زیادہ افضل اور عزت والے تھے ۔ بلکہ تمام امت کیا اہل سنت اور کیا غیر اہل سنت سب کا اتفاق ہے کہ مذکورہ بالا صحابہ کرام اور ان کے امثال مہاجرین حضرت ابودحداح رضی اللہ عنہ سے افضل ہیں ۔ تو پھر یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ بڑا متقی جس نے زکوٰۃ ادا کر کے تزکیہ نفس کیا ہے' وہ ان ہی میں سے ایک ہو۔

❀ اس بات کا دعویدار کہتا ہے کہ: یہ آیت حضرت ابودحداح رضی اللہ عنہ کی شان میں نازل ہوئی۔ جب کسی مسئلہ میں دو قول ہوں ۔ ایک کہنے والا کہہ رہا ہو کہ یہ ابودحداح رضی اللہ عنہ کی شان میں نازل ہوئی ہے۔ اور دوسرا کہہ رہا ہو: حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی شان میں نازل ہوئی ہے۔ تو یہ دوسرے قول والے کی تائید قرآن سے ہوتی ہے۔ اور اگر اس آیت کو ان دونوں حضرات کے لیے عام سمجھا جائے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اس آیت کی فضیلت میں داخل ہونے کے حضرت ابودحداح رضی اللہ عنہ سے زیادہ حق دار ہیں ۔[لہٰذا ان مفسرین کا قول زیادہ قرین صحت و صواب ہے جو کہتے ہیں کہ یہ آیت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی ۔ اس لیے آپ امت بھر میں اتقیٰ و اکرم تھے ۔[دلدار]]۔

اور یہ کیونکر نہیں ہوسکتا جب کہ احادیث صحیحہ میں وارد ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''کسی شخص کے مال سے مجھے اتنا فائدہ نہیں پہنچا، جتنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے مال سے ہوا۔''[1]

اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے تمام امت کے مال سے ایسا فائدہ حاصل ہونے کی نفی کی ہے جیسا فائدہ آپ کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے مال سے حاصل ہوا تھا۔ تو پھر اصلی اور فائدہ بخش اموال کو چھوڑ کر فاضل اموال کو اس آیت کے عموم میں کیسے داخل کیا جاسکتا ہے؟

❀ دوسری وجہ: جب سب سے بڑا متقی وہی تھا جس نے اپنا مال دیا اور تزکیہ نفس کیا؛ وہ مخلوق میں سب سے بڑا باعزت اور متقی تھا؛ تو وہی لوگوں میں سب سے افضل بھی ہوا۔ اس آیت میں دو قول مشہور ہیں ۔ اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ [رسول اللہ ﷺ کے بعد] مخلوق میں سب سے زیادہ عزت والے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں ۔ اور شیعہ کا یہی عقیدہ ہے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق ہے۔ پس پھر یہ جائز نہیں ہے کہ اللہ کی مخلوق میں ان دو حضرت سے بڑھ کر کوئی متقی اور عزت والا ہو۔ ان دونوں میں سے کوئی ایک ایسا نہیں جو اس آیت کے موجب میں داخل ہو۔ جب یہ ثابت ہوگیا کہ ان دونوں میں سے کوئی ایک ضرور ایسا ہونا چاہیے جو اتقی کے معنی و مفہوم میں داخل ہو تو واجب ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اس آیت کے موجب میں داخل ہوں ۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نسبت آپ اس تعریف و تفسیر کے زیادہ مستحق ہیں ۔ اس کے کئی ایک اسباب ہیں:

❀ پہلا سبب: اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿الَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَكّٰى ﴾ [اللیل ۱۸] ''جو اپنا مال (اس لیے) دیتا ہے کہ

---

[1] سنن ترمذی، کتاب المناقب، باب(۱۵/ ۳٤)، (حدیث:۳٦٦۱)، سنن ابن ماجۃ۔ المقدمۃ۔ باب فضل ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہ (حدیث:۹۷)، من طریق آخر۔

پاک ہو جائے۔''صحاح ستہ اور دوسری کتابوں میں تواتر کے ساتھ ثابت ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کیا۔ اور اس باب میں آپ سب صحابہ سے بڑھ کر پیش پیش رہتے تھے۔ جیسا کہ بخاری شریف میں آیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مرض الموت میں اپنے سر پر ایک کپڑا باندھے ہوئے گھر سے نکلے؛ مسجد میں آئے اور منبر پر بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء بیان کی اور پھر فرمایا:

''کسی شخص نے اپنی جان و مال سے مجھ پر اتنا احسان نہیں کیا جتنا ابوبکر بن ابی قحافہ رضی اللہ عنہما نے کیا ہے۔'' اگر میں کسی کو گہرا دوست بنانے والا ہوتا تو ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بناتا، مگر دین اسلام کی بنا پر جو دوستی استوار کی جائے وہی اچھی ہے۔ مسجد کی جانب کھلنے والی سب کھڑکیاں ابوبکر رضی اللہ عنہ کی کھڑکی کے سوا بند کر دی جائیں۔''[1]

یہ نصوص صحیح ' متواتر اور صریح ہیں' اور اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ : حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اللہ اور اس کی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رضامندی میں اپنا مال خرچ کرنے میں سب لوگوں سے پیش پیش رہتے تھے۔

جب کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا معاملہ ایسا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آپ پر احسانات تھے؛ جب مکہ میں بھوک کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو حضرت ابو طالب سے لیکر اپنی کفالت میں تربیت کی۔ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے شادی تک حضرت علی رضی اللہ عنہ فقیر ہی رہے۔ یہ بات اہل سنت اور شیعہ کے ہاں معروف ہے۔ آپ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عیال میں شمار ہوتے تھے۔ آپ کے پاس اخراجات کے لیے کچھ بھی نہیں ہوا کرتا تھا۔ اگر آپ کے پاس مال ہوتا تو آپ ضرور خرچ کرتے؛ مگر آپ پر مال خرچ کیا جاتا تھا؛ آپ [ابھی تک] انفاق والوں میں سے نہیں تھے۔

❀ دوسرا سبب: اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓى﴾ [اللیل ۱۹] ''حالانکہ اس کے ہاں کسی کا کوئی احسان نہیں ہے کہ اس کا بدلہ دیا جائے۔'' یہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی شان ہے؛ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نہیں۔ اس لیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پر یہ احسان تھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی بدولت انہیں ایمان کی دولت سے نوازا۔ یہ ایسی نعمت ہے جس پر مخلوق میں سے کوئی ایک بھی بدلہ نہیں دے سکتا۔ بلکہ اس نعمت کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اجر صرف اللہ تعالیٰ پر ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿قُلْ مَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ﴾ (ص ۸٦)

''کہہ دیجیے کہ میں تم سے اس پر کوئی بدلہ طلب نہیں کرتا اور نہ میں تکلف کرنے والوں میں سے ہوں۔''

اور ارشاد ہوتا ہے: ﴿قُلْ مَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ اِنْ اَجْرِىَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ﴾ (السباء ٤٧)

''فرما دیجئے: جو بدلہ تم سے مانگوں وہ تمہارے لئے ہے میرا بدلہ تو اللہ ہی کے ذمے ہے۔''

❀ پس رہی وہ نعمت جس پر کوئی بدلہ دے سکتا ہے وہ دنیا کی نعمت و احسان ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی دنیاوی احسان نہیں تھا۔ بلکہ دینی احسان تھا۔ بخلاف حضرت علی رضی اللہ عنہ کے؛ آپ پر [دینی احسان کے ساتھ ساتھ] دنیاوی

---

[1] صحیح بخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم "سدوا الابواب الا باب ابی بکر" (ح:۳٦۵٤)، صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابۃ، باب من فضائل ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہ (ح:۲۳۸۲)۔

احسان بھی تھا؛ جس پر بدلہ دیا جانا ممکن تھا۔

❀ تیسرا سبب: حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور رسول اللہ ﷺ کے مابین کوئی ایسا سبب نہیں تھا جس کی وجہ سے دوستی رکھتے اور پھر اپنا مال خرچ کرتے [جان و مال سے نثار ہوتے] سوائے ایمانی سبب کے۔ آپ نے رسول اللہ ﷺ کی ایسے نصرت نہیں کی جیسے ابو طالب نے قرابت کی وجہ سے نصرت کی تھی۔ بلکہ آپ کا عمل کامل اخلاص کے ساتھ صرف اور صرف اللہ کی رضامندی کے حصول کے لیے ہوا کرتا تھا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے:

﴿اِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ☆وَلَسَوْفَ يَرْضٰى﴾ [اللیل ۲۱.۱۷]

''وہ تو صرف اپنے رب بلند و برتر کی رضامندی کے لیے دیتا ہے۔ اور یقیناً عنقریب وہ راضی ہو جائے گا۔''

ایسا ہی معاملہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا بھی ہے۔ آپ رسول اللہ ﷺ کی بیوی تھیں۔ اور کبھی بیوی کو اپنے شوہر پر خرچ کرنا پڑتا ہے؛ بھلے وہ رسول اللہ ﷺ کے علاوہ کوئی دوسرا بھی ہو۔

اور بالفرض اگر مان بھی لیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ خرچ کیا کرتے تھے؛ کبھی ان اسباب کی طرف فعل کو مضاف کیا جاتا ہے۔ بخلاف حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے؛ اس لیے کہ آپ کے لیے ایمان باللہ کے سواء کوئی دوسرا سبب نہ تھا۔ تو آپ اس فرمان الٰہی کی روشنی میں سب سے بڑے اور سچے متقی تھے۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿اِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى﴾ [اللیل ۲۰]

''وہ تو صرف اپنے رب بلند و برتر کی رضامندی کے لیے دیتا ہے۔''

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقٰى ☆الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى ☆ وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰى☆ اِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ☆﴾ [اللیل ۲۰.۱۷]

''اور عنقریب اس سے وہ بڑا پرہیزگار دور رکھا جائے گا۔ جو اپنا مال (اس لیے) دیتا ہے کہ پاک ہو جائے۔ حالانکہ اس کے ہاں کسی کا کوئی احسان نہیں ہے کہ اس کا بدلہ دیا جائے۔ مگر وہ تو اپنے بزرگ و برتر رب کی رضامندی طلب کرنے کے لیے دیتا ہے۔''

یہاں پر استثناء منقطع ہے۔ اس کا معنی یہ ہے: اس کی عطاء صرف اس انسان تک نہیں جس کا اس پر کوئی احسان ہے کہ اسے کوئی بدلہ دے۔ سو بیشک آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ ایسا کرنا تو لوگوں پر عدل واجب میں سے ہے جو کہ ایجار یا خرید و فروخت میں معاوضہ کی منزلت پر ہے۔ ایسا کرنا ہر ایک کے حق میں دوسرے پر واجب ہے۔ اور جب کسی ایک پر کسی کا کوئی احسان نہ ہو جس کا وہ بدلہ دے رہا ہو؛ تو اس وقت یہ معاوضہ کی صورت باقی نہیں رہتی۔ پس اس صورت میں دینے والے کی عطاء صرف اللہ رب العالمین کی رضامندی کے حصول کے لیے ہوتی ہے۔ بخلاف اس انسان کے جس پر کسی کا احسان ہو تو اسے اس احسان کا بدلہ دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیونکہ باہم بدلہ دینا ضروریات میں سے ہے۔

❀ چوتھا سبب: اگر مان لیا جائے کہ اس آیت کے مصداق میں کئی ایک صحابہ داخل ہیں؛ تو یہ بھی حق ہے کہ حضرت

ابوبکر رضی اللہ عنہ پوری امت میں سے اس آیت کے مصداق میں داخل ہونے کے سب سے پہلے حق دار ہیں۔ آپ ہی اس امت کے سب سے بڑی متقی ہیں۔ پس اس بنا پر آپ ان سب میں سے افضل ہوں گے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ''الاتقی'' ''سب سے بڑے متقی کی جو صفات بیان کی ہیں؛ ابوبکر رضی اللہ عنہ ان میں پوری امت میں سب سے بڑے کامل ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿الَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَکّٰی ☆ وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰی ☆ اِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰی﴾

''جو اپنا مال (اس لیے) دیتا ہے کہ پاک ہو جائے۔ حالانکہ اس کے ہاں کسی کا کوئی احسان نہیں ہے کہ اس کا بدلہ دیا جائے۔ مگر وہ تو اپنے بزرگ و برتر رب کی رضامندی طلب کرنے کے لیے دیتا ہے۔'' [اللیل ۱۸۔ ۲۰]

جہاں تک مال خرچ کرنے کا تعلق ہے؛ تو صحاح ستہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا انفاق فی سبیل اللہ دوسروں کے انفاق سے افضل تھا۔ اور یہ کہ اپنی جان و مال کیساتھ آپ نے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معاونت فرمائی دوسروں کی معاونت سے اکمل و افضل تھی۔

رہا ایسے احسان کی تلاش میں رہنا جس پر بدلہ دیا جائے؛ سو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کبھی بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی قسم کا کوئی دنیاوی مال طلب نہیں کیا۔ اور نہ ہی کسی دنیاوی حاجب کی چاہ میں رہے۔ بلکہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے علم حاصل کرنے کی تلاش میں رہتے تھے؛ جیسا کہ اس حدیث سے واضح ہوتا ہے؛ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہو:

((اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ ظُلْمًا کَثِیْرًا وَّلَا یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ فَاغْفِرْلِیْ مَغْفِرَةً مِّنْ عِنْدِكَ وَ ارْحَمْنِیْ اِنَّكَ اَنْتَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ))

''اے اللہ میں نے اپنی جان پر ظلم کیا بہت زیادہ ظلم؛ اور تیرے سوا گناہوں کو بخشنے والا کوئی نہیں؛ تو مجھے بخش دے بخشش تیرے پاس سے؛ اور مجھ پر رحم فرمایا بے شک تو ہی بخشنے والا مہربان ہے۔'' [بخاری: ۸۳۴۔ مسلم: ۲۷۰۵]

ساری زندگی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو کوئی ایسا مال نہیں دیا جو صرف آپ کے ساتھ خاص ہو۔ بلکہ جب آپ مال غنیمت کی تقسیم کے وقت حاضر ہوتے تو آپ کی بھی وہی حیثیت ہوتی جو کسی بھی غنیمت پانے والے مجاہد کی حیثیت ہوا کرتی تھی۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ سے سارا مال لے لیا تھا۔ جب کہ آپ کے علاوہ جو دوسرے لوگ خرچ کرنے والے ہوا کرتے تھے- خواہ انصار میں سے ہوں یا بنی ہاشم میں سے- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو کچھ ایسے عطیات بھی دیا کرتے تھے جو دوسروں کو نہیں دیتے تھے۔ آپ نے بنی ہاشم اور بنی مطلب کو خمس کے مال میں سے وہ مال دیا جو دوسروں کو نہیں دیا گیا۔ آپ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ذمہ داری لگائی اور اس پر انہیں وظیفہ دیا۔ جب کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کو کبھی بھی کچھ بھی نہیں دیا۔ سو ابوبکر رضی اللہ عنہ بدلے والے احسان سے لوگوں میں سب سے زیادہ دور تھے اور ایسی چیز سے سب سے زیادہ قریب تھے جس پر کوئی بدلہ نہیں دیا جاتا۔

جہاں تک اللہ کی رضامندی کے حصول کے لیے آپ کے اخلاص کا تعلق ہے؛ تو آپ کا اخلاص پوری امت میں سب سے زیادہ کامل و اکمل تھا۔ پس معلوم ہوا کہ آپ ان لوگوں میں سب سے زیادہ کامل ہیں جو ان آیات میں مذکور اوصاف کے

مصداق میں شامل ہیں۔جیسا کہ آپ اس آیت میں شامل ہونے والوں میں سب سے کامل ہیں:

﴿وَالَّذِیْ جَاءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ﴾ (الزمر ۳۳)

''اور وہ شخص جو سچ لے کر آیا اور جس نے اس کی تصدیق کی یہی لوگ پکے متقی ہیں۔''

نیز اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان:

﴿لَا یَسْتَوِیْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِیْنَ اَنْفَقُوْا مِنْ بَعْدُ وَقٰتَلُوْا وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى﴾ [الحدید ۱۰]

''تم میں سے جن لوگوں نے فتح سے پہلے فی سبیل اللہ دیا ہے اور قتال کیا ہے وہ (دوسروں کے) برابر نہیں بلکہ ان کے بہت بڑے درجے ہیں جنھوں نے فتح کے بعد خیراتیں دیں اور جہاد کیے، ہاں بھلائی کا وعدہ تو اللہ تعالیٰ کا ان سب سے ہے۔''

اور اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان:

﴿وَ السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِیْنَ وَ الْاَنْصَارِ﴾ (التوبۃ ۱۰۰)

''اور جو مہاجرین اور انصار میں سے سابق اور مقدم ہیں......۔''

اور ان کی امثال دیگر وہ آیات جن میں اس امت کے اہل ایمان کی تعریف کی گئی ہے؛ سو ابوبکر رضی اللہ عنہ ان صفات میں سب سے زیادہ کامل و اکمل ہیں جن کی وجہ سے اہل ایمان کی تعریف کی گئی۔اور آپ ان آیات کے مصداق میں داخل ہونے کے سب سے زیادہ حق دار ہیں۔اور جو لوگ ان آیات کے مصداق میں داخل ہیں' ان میں سب سے اکمل ہیں۔پس معلوم ہوا کہ اس امت میں سب سے افضل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی ہیں۔

فصل:

آیت ﴿قُلْ لِّلْمُخَلَّفِیْنَ﴾ سے شیعہ کا استدلال

[اعتراض]: رافضی مصنف نے کہا ہے:''رہی یہ آیت: ﴿قُلْ لِّلْمُخَلَّفِیْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ﴾؛ مراد یہ ہے کہ: ہم تمہیں ایک قوم کی طرف بلائیں گے۔ یہاں پر مقصود وہ لوگ ہیں جو صلح حدیبیہ سے پیچھے رہ گئے تھے۔اور یہ لوگ چاہتے تھے کہ خیبر کا مال غنیمت حاصل کرنے کے لیے جائیں۔تو اللہ تعالیٰ نے انہیں روک دیا؛ اور فرمایا: ﴿قُلْ لَّنْ تَتَّبِعُوْنَا﴾ آپ فرما دیجیے: تم ہرگز ہماری اتباع نہ کرو گے۔اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے خیبر کے اموال غنیمت کو ان لوگوں کے لیے خاص کر دیا تھا جو صلح حدیبیہ میں شریک ہوئے تھے۔پھر فرمایا: ﴿قُلْ لِّلْمُخَلَّفِیْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ سَتُدْعَوْنَ اِلٰى قَوْمٍ اُولِیْ بَاْسٍ شَدِیْدٍ﴾ پس رسول اللہ ﷺ نے انہیں بہت سارے غزوات کی طرف بلایا تھا؛ جن میں غزوہ موتہ؛ غزوہ حنین؛ تبوک اور دوسرے غزوات۔پس یہ داعی رسول اللہ ﷺ تھے۔اور یہ بھی جائز ہے کہ: یہ داعی حضرت علی رضی اللہ عنہ ہوں۔اس لیے کہ آپ نے عہد توڑنے والوں اور نافرمانوں اور دین سے خروج کرنے والوں سے جہاد کیا۔ان لوگوں کا آپ کی اطاعت کی طرف رجوع کرنا

ہی اصل اسلام تھا۔اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ''اے علی! تیرے ساتھ جنگ کرنا میرے ساتھ جنگ کرنا ہے۔''اور رسول اللہ ﷺ سے جنگ کرنا کفر ہے۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جواب]: اس آیت سے بعض علماء کرام رحمہم اللہ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت اور آپ کی اطاعت کے وجوب پر استدلال کیا ہے۔ان علماء میں امام شافعی، امام اشعری اور ابن حزم وغیرہ رحمہم اللہ شامل ہیں۔

انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے استدلال کیا ہے:

﴿فَإِنْ رَّجَعَكَ اللّٰهُ إِلٰى طَآئِفَةٍ مِّنْهُمْ فَاسْتَأْذَنُوكَ لِلْخُرُوجِ فَقُلْ لَّنْ تَخْرُجُوا مَعِيَ أَبَدًا وَّلَنْ تُقَاتِلُوا مَعِيَ عَدُوًّا﴾ (التوبۃ:۸۳)

''پھر اگر اللہ آپ کو ان منافقوں کے کسی گروہ کی طرف واپس لائے اور وہ آپ سے جہاد پر نکلنے کی اجازت مانگیں تو ان سے کہیے کہ: تم میرے ساتھ کبھی نہ نکلو گے اور نہ میرے ہمراہ دشمن سے جنگ کرو گے۔''

ان حضرات کا کہنا ہے: ''اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا ہے کہ آپ فرمادیں:

''تم میرے ساتھ کبھی نہ نکلو گے اور نہ کبھی میرے ہمراہ دشمن سے جنگ کرو گے۔''

اس آیت کے مضمون پر غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ قتال کے داعی و محرک نبی کریم ﷺ نہیں ہیں، بلکہ آپ کے بعد آنے والے خلیفہ و نائب ہیں جو ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین ہی ہو سکتے ہیں، جنھوں نے نبی کریم کے بعد فارس و روم اور دوسرے لوگوں کے خلاف جنگیں لڑیں، یا ان کے ساتھ معاہدے کیے؛ جیسا کہ آیت میں ہے: ﴿تُقَاتِلُوْنَهُمْ أَوْ يُسْلِمُوْنَ﴾ ''تمہیں ان سے لڑنا ہوگا یا وہ مطیع ہو جائیں گے۔''

ان کے نزدیک سورۂ الفتح میں جن لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے۔سورۂ توبہ میں بھی انہی سے خطاب کیا گیا ہے، اسی بنا پر یہ دلیل محل نظر و تامل ہے، یہ مسلمہ بات ہے کہ سورۂ الفتح بالاتفاق صلح حدیبیہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

جب یہ معلوم ہو گیا تو اس آیت سے وجہ استدلال صاف ظاہر ہے۔اس لیے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿قُلْ لِّلْمُخَلَّفِينَ مِنَ الْأَعْرَابِ سَتُدْعَوْنَ إِلٰى قَوْمٍ أُولِي بَأْسٍ شَدِيدٍ تُقَاتِلُوْنَهُمْ أَوْ يُسْلِمُوْنَ﴾

''عنقریب تمہیں ایک سخت جنگجو قوم سے مقابلہ کیلئے بلایا جائے گا۔تمہیں ان سے لڑنا ہوگا یا وہ مطیع ہو جائیں گے۔''

یہ دلیل ہے کہ وہ لوگ سخت لڑاکے ہوں گے۔اور یہ کہ وہ جنگ لڑیں گے یا تابع فرماں ہو جائیں گے۔ان علماء کرام کا کہنا ہے: یہ ممکن نہیں کہ آپ نے عام فتح کے فوراً بعد اہل مکہ یا ہوازن کے ساتھ جنگ کرنے کے لیے بلایا ہو۔اس لیے کہ ان لوگوں کی طرف ہی تو صلح حدیبیہ والے سال بلایا گیا تھا۔پس جو کوئی ان میں سے نہ تھا' وہ ان ہی کی جنس میں سے تھا۔وہ ان سے زیادہ سخت جنگجو نہیں ہوسکتا۔یہ تمام عرب اہل حجاز تھے۔ان سے جنگ ایک ہی جنس کی جنگ تھی۔اہل مکہ اور اس کے گردو نواح والے بدر و احد اور خندق' اور دیگر مواقع پر نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام سے اس سے بڑھ کر جنگ و قتال کرنے والے تھے۔

پس یہ ضروری ہے کہ جن لوگوں سے جنگ کرنے کے لیے بلایا جا رہا ہو؛ وہ حدیبیہ والے سال جن لوگوں سے پالا پڑا

تھا؛ ان سے بڑھ کر جنگجو اور قتال کرنے والے ہوں؛ جیسا کہ اللہ تعالیٰ خود فرماتے ہیں:

﴿ اُولِي بَاْسٍ شَدِيْدٍ﴾ ''سخت جنگجو قوم سے مقابلہ کے لئے ۔''

یہ دو گروہ ہی ہو سکتے ہیں:

پہلا گروہ: بنی اصفر: جن سے جنگ کے لیے سن نو ہجری میں تبوک والے سال لوگوں کو بلایا گیا تھا۔ بلاشبہ یہ لوگ سخت جنگجو تھے۔ یہ لوگ اس صفت کے دوسروں سے زیادہ حق دار تھے۔ ان لوگوں سے جنگ کا پہلا واقعہ مؤتہ والے سال پیش آیا۔ یہ تبوک سے پہلے سن آٹھ ہجری کا واقعہ ہے۔ اس معرکہ میں مسلمان امراء: حضرت زید بن حارثہ' حضرت عبداللہ بن رواحہ اور حضرت جعفر رضی اللہ عنہم اجمعین شہید ہو گئے تھے۔ اور مسلمان پسپا ہو کر واپس پلٹے تھے۔

پس ان لوگوں نے واپس آنے پر نبی کریم ﷺ سے عرض کی تھی: ''ہم میدان جنگ سے بھاگنے والے ہیں۔'' تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں بلکہ تم پلٹ کر آنے والے ہو؛ میں تمہاری جماعت ہوں؛ اور ہر مسلمان کی جماعت ہوں۔''

لیکن بعض علماء نے ان الفاظ: ﴿تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْ يُسْلِمُوْنَ﴾ ''تم ان سے جنگ کرتے ہو یا پھر صلح کرتے ہو'' پر اعتراض کیا ہے؛ ان کا کہنا ہے کہ: اہل کتاب سے تو اس وقت تک لڑا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ جزیہ ادا کر دیں۔ لیکن دوسرے گروہ نے اس کی تاویل یہ کی ہے کہ یہ آیت مرتدین کے متعلق ہے۔ جن سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جنگیں لڑیں۔ یہ مرتدین مسیلمہ کذاب کے ساتھی تھے۔ بلاشک وشبہ یہ لوگ انتہائی سخت جنگجو تھے۔ اور ان کے ساتھ معرکوں میں مسلمانوں کو بہت زیادہ سختیاں اور پریشانیاں اٹھانا پڑیں۔ سخت خونریز جنگیں ہوئیں؛ قراء کی ایک جماعت شہید ہو گئی۔ یہ مسلمانوں اور ان کے دشمنوں کے مابین بہت بڑی جنگیں تھیں۔ مرتدین کو یا تو قتل کیا جاتا ہے یا پھر وہ اسلام قبول کر لیتے ہیں۔ ان سے جزیہ قبول نہیں کیا جاتا۔ اور ان سے سب سے پہلے جنگ لڑنے والے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور آپ کے ساتھی تھے۔ پس دلیل سے اس قتال کی طرف بلانے پر آپ کی اطاعت کا وجوب ثابت ہوا۔

قرآن بتا رہا ہے کہ ان لوگوں کو ایسی قوم سے جنگ کرنے کے لیے بلایا جائے گا جس میں دو میں سے ایک صفت پائی جائے گی۔ یا تو وہ لوگ ان سے جنگ کریں گے۔ یا پھر مسلمان ہو جائیں گے۔ ان دو میں سے ایک کام ہونا لازمی ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی وہ قوم سخت جنگجو بھی ہے۔ یہ اس کے خلاف ہے جو کچھ حدیبیہ کے موقع پر پیش آیا۔ اس میں نہ ہی قتال ہوا؛ اور نہ ہی وہ لوگ مسلمان ہوئے۔ بلکہ رسول اللہ ﷺ نے بغیر جنگ کے اور بغیر ان کے اسلام کے ان لوگوں سے صلح کر لی۔ اور واضح کر دیا کہ جن لوگوں سے لڑنے کے لیے انہیں بلایا جائے گا وہ ان کے بعد ہوں گے۔

پس اللہ تعالیٰ کے اس فرمان: ﴿تُقَاتِلُوْنَهُمْ﴾ ''تمہیں ان سے لڑنا ہوگا'' میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو ان کو اسلام پر لانے یا جزیہ ادا کرنے کے لیے لڑنے کے معانی میں مانع ہو۔ لیکن ان سے کہا جائے گا: اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان:

﴿سَتُدْعَوْنَ اِلٰى قَوْمٍ اُولِي بَاْسٍ شَدِيْدٍ﴾

''عنقریب تمہیں ایک سخت جنگجو قوم سے مقابلہ کے لئے بلایا جائے گا۔''

اس کلام سے فاعل حذف کر دیا گیا ہے۔ پس یہاں پر فاعل یعنی جہاد و قتال کی طرف بلانے والے کو متعین نہیں کیا گیا۔

پس قرآنی دلالت کی روشنی میں واضح ہوتا ہے کہ جو بھی [امام و حاکم] کسی سخت قوم سے لڑنے کے لیے بلائے کہ یا تو ان سے قتال کیا جائے یا پھر وہ اسلام قبول کرلیں' تو اس کی اطاعت کرنا واجب ہو جاتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو مرتدین کے ساتھ جنگ و قتال کی طرف بلایا؛ پھر روم اور فارس سے جنگ کی دعوت دی۔ ایسے ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے روم و فارس سے قتال کرنے کی دعوت دی۔ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بربر اور دوسری قوموں سے جہاد کی طرف بلایا۔ یہ آیت ان تمام لوگوں کو شامل ہے۔

لیکن اس دعوت کو صرف حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ خاص کرنا' جیسا کہ آپ کی خلافت استدلال کرنے والے ایک گروہ کا کہنا ہے؛ یہ غلط ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ یہ آیت ان تمام حضرات کو شامل ہے تو یہ بات بہت مناسب ہے۔ اور ممکن ہے کہ آیت سے یہی مراد ہو' اور اس پر استدلال کیا جا سکتا ہو۔ پس اس لیے ہر امیر کے ساتھ جہاد کرنا واجب ہو جاتا ہے جو کفار سے جنگ و قتال کے لیے لوگوں کو بلائے۔ پس اس سے مراد یہ ہوگی کہ آپ کو ایسی قوم سے جنگ کے لیے بلایا جائے گا جو عربوں سے زیادہ سخت جنگجو ہوں گے۔ پس اس وقت دو باتوں میں سے ایک کا ہونا لازمی ہے؛ یا تو وہ اسلام قبول کرلیں یا پھر جنگ کریں [اور قتل کردیئے جائیں]۔ یہ حدیبیہ کے واقعہ کے برعکس ہے۔ اس لیے کہ اہل حدیبیہ کا جنگی زوران جیسا نہیں تھا۔ اور اس موقع پر نہ ہی قتال ہوا اور نہ ہی کافروں نے اسلام قبول کیا؛ [بلکہ ان کے ساتھ صلح کرلی گئی]۔

فتح مکہ والے سال بھی ایسے ہی ہوا۔ شروع میں ان لوگوں نے نہ ہی اسلام قبول کیا اور نہ ہی جنگ کی۔ مگر آخر کار انہوں نے اسلام قبول کرلیا۔

یہ لوگ اہل روم و فارس ہیں۔ اگر یہ لوگ اسلام قبول نہ کریں تو ان سے قتال کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ ان لوگوں کے ساتھ قتال کی پہلی دعوت سریہ موتہ و غزوہ تبوک کے موقع پر دی گئی۔ تبوک والے سال ان لوگوں نے نہ ہی جنگ کی اور نہ ہی اسلام قبول کیا۔ لیکن حضرت ابوبکر صدیق اور عمر فاروق رضی اللہ عنہما کے مبارک زمانے میں دو میں سے ایک کام کا ہونا ضروری تھا؛ یا تو اسلام قبول کریں یا پھر جنگ کے لیے تیار ہو جائیں۔ ان لوگوں نے قتال کے بعد جزیہ ادا کیا۔ انہوں نے شروع میں ایسے صلح نہیں کی جیسے حدیبیہ کے موقع پر مشرکین نے صلح کرلی تھی۔ پس حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کا لوگوں کو ان لوگوں کے خلاف جنگ و قتال کیلئے بلانا اس آیت میں شامل ہے۔ اور یہی ثابت کرنا مقصود ہے۔

یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ اس کا معنی و مفہوم حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قتال کو شامل نہیں۔ کیونکہ جن لوگوں سے آپ نے جنگ لڑی؛ وہ آپ کے ساتھیوں سے زیادہ سخت جنگجو نہیں تھے۔ بلکہ وہ ان کے ہم جنس لوگ ہی تھے۔ اور آپ کیساتھ ان سے زیادہ سخت جنگ لڑنے والے تھے؛ نیز ان پر قتال یا اسلام قبول کرنے کا اطلاق بھی نہیں ہو سکتا اس لیے کہ وہ سبھی مسلمان تھے۔

پس رافضی مصنف نے جو لکھا ہے کہ: ''حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تیری جنگ میری جنگ ہے'' اس کی سند اس نے ذکر نہیں کی۔ پس اسے حجت قائم نہیں ہو سکتی۔ حقیقت میں یہ روایت من گھڑت ہے۔ اور اس کے موضوع ہونے پر اہل علم کا اتفاق ہے۔''

[زیر تبصرہ آیت اور حضرت علی رضی اللہ عنہ]:

[اشکال]: رافضی مصنف نے کہا ہے: اور یہ بھی جائز ہوسکتا ہے کہ: یہ داعی حضرت علی رضی اللہ عنہ ہوں۔ اس لیے کہ آپ نے عہد توڑنے والوں اور نافرمانوں اور دین سے خروج کرنے والوں سے جہاد کیا۔ یعنی اہل جمل و صفین و حروریہ اور خوارج۔ [انتہی کلام الرافضی]

[جواب]: رافضی کا یہ دعوی کئی وجوہات کی بنا پر باطل ہے:

❀ پہلی وجہ: یہ لوگ کسی بھی طرح اپنی ہی جنس کے لوگوں سے زیادہ سخت جنگجو ہرگز نہیں تھے۔ بلکہ یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ جن لوگوں سے جمل کے دن واسطہ پڑا وہ آپ کے لشکر کی نسبت بہت کم تھے۔ اور آپ کا لشکر ان کی نسبت بہت زیادہ تھا۔ ایسے ہی خوارج کی نسبت آپ کا لشکر کئی گنا زیادہ تھا۔ ایسے ہی اہل صفین سے بھی آپ کا لشکر بڑھ کر تھا۔ اور ان لوگوں کا تعلق ان ہی کی ایک ہی جنس سے تھا۔ سخت جنگجو ہونا ان کا وصف ہرگز نہیں ہوسکتا؛ جس کی بنا پر انہیں دوسروں سے جدا کیا جاسکتا ہو۔

❀ یہ بات معلوم شدہ ہے کہ بنو حنیفہ اور اہل فارس و روم ان لوگوں سے کئی درجہ زیادہ سخت جنگجو اور لڑاکے تھے۔ اور اصحاب حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خوارج کی طرف سے وہ مشکلات اور تکلیف نہیں اٹھانی پڑی جو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے اصحاب کو مسیلمہ کذاب کے لشکر کی طرف اٹھانا پڑی تھیں۔ روم اور فارس کے متعلق تو کوئی عاقل شک کرہی نہیں سکتا کہ ان سے جنگ کرنا عرب مسلمانوں کے برسر پیکار ہونے کی نسبت بہت زیادہ سخت تھا۔ اگرچہ شروع میں عرب مسلمانوں نے جو عرب کفار سے جہاد کیا وہ بہت ہی افضل اور عظیم الشان تھا۔ اس لیے کہ اس وقت مسلمان تھوڑی تعداد میں اور کمزور تھے؛ اس لیے نہیں کہ ان کا دشمن اہل فارس و روم کی نسبت بہت سخت جنگجو تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّ اَنْتُمْ اَذِلَّةٌ﴾ [آل عمران ۱۲۳]

''اور بلاشبہ یقیناً اللہ نے بدر میں تمھاری مدد کی، جب کہ تم نہایت کمزور تھے۔''

ان لوگوں کو باہم جمع کرنے والی چیز دعوت اسلام اور مجانست تھی۔ پس ان کے مابین جنگ کی وجہ کوئی ایسی چیز نہیں تھی جیسے اہل فارس و روم اور مجوس عرب اور نصاریٰ کے ساتھ مسلمانوں کی جنگ کی وجہ تھی۔ یہ لوگ عرب مسلمانوں کو اپنے سب سے کمزور پڑوسی اور رعایا گمان کرتے تھے۔ اور انہیں انتہائی حقیر سمجھتے تھے۔ اگر اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو ان لوگوں کے سامنے ایسے ثابت قدم نہ رکھتے اور تائید سے نہ نوازتے جیسا کہ اس سے پہلے انبیاء اور اہل ایمان کی نصرت کی جاتی رہی ہے؛ تو یہ عرب مسلمان ان اہل فارس و روم کے سامنے ٹک نہ پاتے' اور نہ ہی ان کے ملک اور شہر فتح کرسکتے۔ ان کے پاس فوجی تعداد بہت زیادہ تھی' اور بے پناہ اسلحہ اور قوت بھی حاصل تھی۔ لیکن اہل ایمان کے دلوں کو اللہ تعالیٰ نے قوت ایمانی سے نوازا ہوا تھا جو صرف ان لوگوں کے ساتھ ہی خاص تھی۔

❀ دوسری وجہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دور دراز کے لوگوں کو اہل جمل اور خوارج کے ساتھ جنگ کرنے کے لیے نہیں بلایا تھا۔ جب آپ بصرہ تشریف لائے تو آپ کے دل میں کسی سے جنگ کرنے کا کوئی خیال نہیں تھا۔ بلکہ جنگ جمل حضرت

علی رضی اللہ عنہ اور حضرت طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما کے مابین غیر اختیار اور غیر ارادی طور پر پیش آئی۔ جب کہ خوارج کے لیے آپ کے لشکر کا کچھ حصہ ہی کافی تھا۔ آپ نے حجاز کے اعراب میں سے کسی ایک کو ان جنگوں میں شرکت کرنے کے لیے نہیں بلایا۔

❀ تیسری وجہ: اگر اس بات کو مان لیا جائے کہ ان لوگوں سے جنگیں لڑنے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اطاعت واجب تھی؛ تو یہ بات ممتنع ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی ایسے کی اطاعت واجب کر دے جو نمازیوں کو صرف اس بنا پر قتل کر رہا ہو کہ وہ لی امر کی اطاعت میں داخل ہو جائیں؛ اور ایسے لوگوں کی اطاعت کا حکم نہ دے جو کفار سے اس لیے جنگ لڑ رہے ہوں کہ وہ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لے آئیں۔

❀ یہ بات معلوم شدہ ہے کہ: جو انسان حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اطاعت سے نکل جائے وہ اس انسان کی نسبت اللہ اور اس کے رسول پر ایمان سے دور نہیں ہو سکتا جو رسول اللہ ﷺ اور قرآن حکیم کی تکذیب کرتا ہو۔ اور رسول اللہ ﷺ کی لائی ہوئی تعلیمات میں سے کسی بھی چیز کا اقرار نہ کرتا ہو۔ بلکہ ان لوگوں کا گناہ بہت بڑا ہے' اور انہیں اسلام کی دعوت پیش کرنا اور ان سے قتال کرنا افضل ہے۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ جن لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جنگ کی وہ کافر تھے۔

تو اگر یہ کہا جائے کہ: وہ مرتد تھے؛ جیسا کہ روافض کا عقیدہ ہے۔

[جواب]: یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ جو مرتد محمد رسول اللہ ﷺ کو چھوڑ کر کسی دوسرے کو رسول مانتا ہوں جیسے مسیلمہ کذاب اور اس کے ہمنوا؛ تو یہ لوگ ان کی نسبت بڑے مرتد تھے جو امام کی اطاعت کا اقرار نہیں کرتے تھے؛ لیکن رسول اللہ ﷺ پر ایمان رکھتے تھے۔ بہر حال کچھ بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے لڑنے والوں کا کوئی بھی گناہ ذکر نہیں کیا جا سکتا مگر جن لوگوں نے اس سے قبل خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم اجمعین سے قتال کیا ان کا گناہ اس سے بڑھ کر تھا۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہو کر لڑنے والوں کے لیے کوئی فضیلت اور ثواب بھی ذکر کیا جائے تو وہی اجر و ثواب اس سے بڑھ کر ان لوگوں کے لیے ہوگا جنہوں نے حضرات خلفاء ثلاثہ کے ساتھ مل کر جنگیں لڑیں۔

❀ یہ اس صورت میں ہوگا جب یہ فرض کر لیا جائے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جنگ لڑنے والے کافر تھے۔ لیکن سبھی لوگ جانتے ہیں کہ یہ قول باطل ہے۔ یہ بات صرف ردی قسم کے شیعہ ہی کہہ سکتے ہیں [کوئی دوسرا نہیں]؛ ان کے اہل عقل لوگ ایسی بات نہیں کہتے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور اہل بیت سے تواتر کے ساتھ معلوم ہوا ہے کہ آپ ان لوگوں کو کافر نہیں کہتے تھے جنہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جنگیں لڑیں۔ یہ تمام باتیں اس وقت ہو سکتی ہیں جب یہ تسلیم کر لیا جائے کہ یہ قتال مامور بہ تھا۔ اور یہ تسلیم کیا جانا کیسے ممکن ہو سکتا ہے جب کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور ان کے بعد علماء کرام کا اس مسئلہ میں اختلاف مشہور و معروف ہے کہ کیا یہ جنگیں اہل بغاوت کے ساتھ جنگیں تھیں کہ جب ان کی شرائط پائی جائیں تو جنگ لڑنا واجب ہو جاتا ہے۔ یا پھر موجب قتال شروط کے انتفاء کی وجہ سے بغاوت کی جنگیں نہیں تھیں۔ اور یہ کہ ان جنگوں میں داخل ہونے سے بہتر و افضل یہ تھا کہ انسان ان سے بچ کر اور دور رہے۔ اور بعض علماء کرام نے انہیں فتنہ کی جنگیں شمار کیا ہے۔ جمہور محدثین اور جمہور ائمہ و فقہاء رحمہم اللہ کا یہی مذہب ہے۔ اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب یہ ہے کہ: باغیوں سے جنگ کرنا اس وقت تک جائز نہیں ہے جب تک وہ خود جنگ نہ چھیڑ دیں۔ قدوری میں ایسے ہی ذکر کیا گیا ہے۔ اہل صفین نے حضرت

علی رضی اللہ عنہ سے جنگ نہیں چھیڑی تھی۔

ایسے ہی مدینہ؛ شام؛ بصرہ؛ کے بڑے بڑے فقہاء اور بڑے بڑے فقہاء حدیث جیسے امام مالک' ایوب' اوزاعی اور امام احمد رحمہم اللہ کا یہی مذہب ہے کہ یہ جنگیں مامور بہ نہیں تھیں۔ اوران سے ہاتھ کھینچ لینا جنگ لڑنے سے بہتر تھا۔ جمہور ائمہ اہل سنت والجماعت کا یہی قول ہے۔ جیسا کہ احادیث صحیحہ اس پر دلالت کرتی ہیں۔ بخلاف حروریہ اور خوارج اور اہل نہروان کے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مشہور سنت و احادیث کی روشنی میں ان لوگوں سے جنگ کرنا واجب تھا۔ اس پر صحابہ کرام اور ائمہ اہل سنت کا اتفاق ہے۔

❀ صحیحین میں حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ:

''نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ کے قلعوں میں سے ایک قلعہ پر چڑھے پھر ارشاد فرمایا کیا تم وہ دیکھ رہے ہو جو میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے گھروں کی جگہوں میں فتنے ایسے گر رہے ہیں جیسے بارش کے قطرات گرتے ہیں۔''

[صحیح بخاری:ج۱: ح۱۷۷۳]

❀ سنن میں ہے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''عنقریب ایک فتنہ ہوگا جو عرب کو گھیر لے گا، اس کے مقتولین جہنم میں جائیں گے اور اس میں زبان کا استعمال تلوار کے استعمال سے زیادہ سخت ہوگا۔'' [سنن ابو داؤد: ج۳: ح ۸۷۳]

❀ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''عنقریب ایک اندھا، بہرا، گونگا فتنہ ہوگا پس جو اس کی طرف توجہ کرے گا وہ اس کے نزدیک ہو جائے گا اور زبان کو اس کی طرف متوجہ کرنا ایسا ہے جیسے تلوار سے اس میں شریک ہونا۔'' [سنن ابو داؤد:ج۳: ح ۸۷۲]

❀ حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں:

''رات کو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیدار ہوئے تو آپ نے فرمایا کہ: ''سبحان اللہ! آج رات کس قدر فتنے نازل کئے گئے ہیں اور کس قدر خزانے کھولے گئے ہیں۔'' [صحیح بخاری:ج۱: ح۱۱٦]

❀ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے ارشاد فرمایا:

''عنقریب فتنے ہوں گے ان میں بیٹھنے والا کھڑا ہونے والے سے بہتر ہوگا اور کھڑا ہونے والا چلنے والے سے افضل ہوگا اور چلنے والا دوڑنے والے سے بہتر ہوگا اور جو آدمی گردن اٹھا کر انہیں دیکھے گا تو وہ اسے ہلاک کر دیں گے اور جسے ان میں کوئی پناہ کی جگہ مل جائے تو چاہئے کہ وہ پناہ لے لے۔''

[صحیح بخاری:ج۳: ح ۱۹۷٤۔ صحیح مسلم:ج ۳: ح۲۷٤۸ 2748۔]

❀ صحیحین میں حضرت ابو بکرہ رضی اللہ عنہ سے روایت موجود ہے؛ اس میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''[عنقریب فتنے برپا ہوں گے۔ آگاہ رہو پھر فتنے ہوں گے۔ ان میں بیٹھنے والا چلنے والے سے بہتر ہوگا اور چلنے والا ان کی طرف دوڑنے والے سے بہتر ہوگا آگاہ رہو] جب یہ فتنے نازل ہوں یا واقع ہوں تو جس کے پاس اونٹ ہوں وہ اپنے اونٹوں کے ساتھ ہی لگا

رہے اور جس کی زمین ہو وہ اپنی زمین سے ہی چمٹا رہے۔''
ایک آدمی نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ اس بارے میں کیا فرماتے ہیں جس کے پاس نہ اونٹ ہوں اور نہ بکریاں نہ ہی زمین۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
''وہ اپنی تلوار لے کر اس کی دھار پتھر کے ساتھ رگڑ کر کند اور ناکارہ کر دے۔ پھر اگر وہ نجات حاصل کرنے کی طاقت رکھتا ہو تو نجات حاصل کرے۔ اے اللہ میں نے تیرا حکم پہنچا دیا؛ اے اللہ میں نے تیرا حکم پہنچا دیا۔''
ایک آدمی نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ صلی اللہ علیہ وسلم کیا فرماتے ہیں: ''اگر مجھے ناپسندیدگی اور ناگواری کے باوجود ان دونوں صفوں میں سے ایک صف یا ایک گروپ میں کھڑا کر دیا جائے پھر کوئی آدمی اپنی تلوار سے مجھے مار دے یا کوئی تیر میری طرف آ جائے؛ جو مجھے قتل کر ڈالے؟
تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ آدمی اپنے گناہ اور تیرے گناہ کے ساتھ لوٹے گا اور دوزخ والوں میں سے ہوگا۔'' [صحیح مسلم: ج ۳: ح ۲۷۵۱]

- ان احادیث کی طرح دیگر روایات بھی حضرت سعد بن ابی وقاص اور دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سے معروف ہیں۔ اور صحابہ کرام میں رضی اللہ عنہم میں سے جن لوگوں نے یہ احادیث روایت کی ہیں ان میں سعد بن ابی وقاص، حضرت ابوبکرہ؛ اسامہ بن زید؛ محمد بن مسلمہ؛ ابو ہریرہ؛ اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم شامل ہیں۔ یہ حضرات جنگ جمل اور صفین کو فتنہ کی جنگیں قرار دیتے ہیں۔ اور ان کا کہنا ہے: اسلام میں فتنہ کی یہ پہلی جنگیں تھیں۔ یہ لوگ ان لڑائیوں میں شریک نہیں ہوئے اور اپنے ماننے والے دوسرے لوگوں کو بھی جنگ میں شرکت سے منع کرتے رہے۔ یہ روایات مشہور و معروف ہیں۔
- صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے جن لوگوں نے جنگیں لڑیں وہ اپنے حق میں کتاب و سنت سے کوئی ایسی مضبوط دلیل پیش نہیں کر سکے جس کی روشنی میں ان جنگوں میں لڑنا واجب ہو۔ بلکہ انہوں نے اقرار کیا تھا کہ یہ لڑائیاں ان کی رائے تھی۔ جیسا کہ خود حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس کی خبر دی ہے۔ ان دونوں لشکروں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے افضل کوئی دوسرا نہیں تھا۔ اس لحاظ سے جو لوگ آپ سے فروتر مرتبہ کے تھے؛ وہ اتباع کے زیادہ حقدار تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کبھی کبھار ان جنگوں پر اپنی ناپسندیدگی اور نفرت کا اظہار کیا کرتے تھے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ خوارج کے ساتھ جنگوں کے برعکس آپ کے پاس ان لڑائیوں کے حق میں کوئی شرعی دلیل موجود نہیں تھی جس کی بنا پر آپ خوشی و سرور کا اظہار کر سکیں۔ جب کہ خوارج کی جنگوں پر آپ اپنی خوشی و سرور اور رضامندی کا اظہار کرتے تھے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنگیں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی جنگیں تھیں جن سے وہ اللہ تعالیٰ کا قربت حاصل کرتے تھے۔ اس لیے کہ ایسی نصوص نبویہ اور ادلہ شرعیہ موجود ہیں جن کی روشنی میں ان لوگوں سے لڑنا واجب تھا۔
- چوتھی وجہ: یہ آیت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ جنگ لڑنے کو شامل نہیں۔ اس کہ آیت میں فرمایا گیا ہے:
﴿تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْ يُسْلِمُوْنَ﴾ ''تم ان سے جنگ کرتے ہو یا پھر صلح کرتے ہو۔''

یہاں پر دو وصف بیان کیے گئے ہیں جن میں سے کسی ایک کا ہونا ضروری ہے۔اور یہ بات معلوم شدہ ہے کہ جن لوگوں کی طرف حضرت علی رضی اللہ عنہ نے قتال کے لیے بلایا تھا؛ ان میں سے خلقت کی ایک بہت بڑی تعداد ایسی تھی جنہوں نے آپ سے کوئی جنگ نہیں کی۔ بلکہ یہ لوگ جنگ سے دستبردار رہے۔ نہ ہی انہوں نے آپ سے جنگ کی اور نہ ہی آپ کے ساتھ مل کر جنگ کی۔ یہ لوگ ایک تیسرا گروہ تھے۔جنہوں نے نہ ہی آپ کے ساتھ جنگ کی اور نہ ہی آپ سے مل کر۔اور نہ ہی آپ کے حلقہ اطاعت میں داخل ہوئے۔ یہ سبھی لوگ مسلمان تھے۔ ان کے مسلمان ہونے پر کتاب و سنت اور اجماع صحابہ بشمول حضرت علی رضی اللہ عنہ اور باقی لوگوں کے؛ دلائل موجود ہیں۔فرمان الٰہی ہے:

﴿وَاِنْ طَآئِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۞﴾ (الحجرات: ۹)

''اور اگر مسلمانوں کی دو جماعتیں آپس میں لڑ پڑیں تو ان میں میل ملاپ کرا دیا کرو پھر اگر ان دونوں میں سے ایک جماعت دوسری جماعت پر زیادتی کرے تو تم (سب) اس گروہ سے جو زیادتی کرتا ہے لڑو۔ یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹ آئے اگر لوٹ آئے تو پھر انصاف کے ساتھ صلح کرا دو اور عدل کرو بیشک اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کا وصف لڑائی و جنگ وجدال کے باوجود مؤمن ہونا بیان کیا ہے۔اور یہ بھی خبر دی ہے کہ یہ سبھی آپس میں بھائی بھائی ہیں۔یہ بھائی چارہ اہل ایمان کے مابین ہی ہوسکتا ہے؛ مؤمن و کافر کے مابین نہیں۔

صحیح بخاری میں حضرت ابوبکرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسن کے متعلق فرمایا:

''میرا یہ بیٹا سردار ہے اور شاید اللہ اس کے ذریعہ مسلمانوں کی دو بڑی جماعتوں کے درمیان صلح کرا دے گا۔''

پس اللہ تعالیٰ نے آپ کے ہاتھ پر لشکر معاویہ رضی اللہ عنہ اور لشکر علی رضی اللہ عنہ کے مابین صلح کروائی۔ پس یہ حدیث ان سبھی لوگوں کے اہل ایمان ہونے کی دلیل ہے۔اور اس بات کی بھی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ اہل ایمان کے مابین صلح وصفائی کو پسند فرماتے ہیں۔اور یہ کام کرنے والوں کی ثنائے خیر کرتے ہیں۔ پس یہ اس بات کی دلیل ہے کہ جو کام حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے کیا؛ وہ اللہ اور اس کے رسول کی رضامندی کا کام تھا۔

رافضی مصنف اور اس جیسے دوسرے شیعہ کا ان لوگوں کو کافر کہنا؛ اور ان حضرات کے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اطاعت کی طرف رجوع کرنے کو اسلام قرار دینا؛ اس لیے کہ ان کے گمان کے مطابق رسول للہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہے: ''اے علی! تیرے ساتھ جنگ میرے ساتھ جنگ ہے۔''

اس کے جواب میں کہا جائے گا: ''بڑی ہی عجیب بات ہے۔ اور ان پر بہت بڑی مصیبت یہ ہے کہ رافضی مصنف اور جیسے دیگر خسیس لوگ اس عظیم اصول کو ثابت کرسکیں۔اس لیے کہ رافضی کی پیش کردہ حدیث ایک من گھڑت روایت ہے جس کا حدیث کی معتمد کتابوں میں کہیں نام و نشان تک نہیں پایا جاتا۔نہ ہی صحاح میں؛ نہ ہی سنن میں اور نہ ہی مسانید و فوائد

میں ۔اور نہ ہی ان کے علاوہ کسی دوسری ایسی کتاب میں جن سے محدثین روایات نقل کرتے ہیں ۔اور ان کے مابین وہ کتب رائج ہیں ۔اور محدثین کے ہاں یہ روایت نہ ہی صحیح نہ ہی حسن اور نہ ہی ضعیف ۔ بلکہ یہ ایک گروی ہوئی روایت ہے [جسے رافضی ٹولہ نے گھڑلیا ہے]۔ اور اس کا من گھڑت ہونا صاف واضح ہے ۔اس لیے کہ یہ روایت رسول اللہ ﷺ سے منقول اس مشہور و متواتر سنت کے خلاف ہے جس میں آپ نے دونوں گروہوں کو مسلمان قرار دیا تھا۔اور یہ کہ اس فتنہ کے دور میں جنگوں میں شرکت کرنے سے دستبرداری اختیار کرنے کو آپ نے بہتر بتایا تھا۔اور اس صورتحال میں دو گروہوں کے مابین صلح کروانے والے کی تعریف کی تھی ۔اگر ان دو گروہوں میں سے کوئی ایک دین اسلام سے مرتد ہوتا تو یقیناً وہ گروہ یہود و نصاری سے بڑے کافر ہوتے جو کہ کسی قدر اپنے دین پر باقی ہیں ۔اور وہ قتل کیے جانے کے سب سے بڑے مستحق ہوتے ۔جیسا کہ مسیلمہ کذاب کے مرتد ساتھی قتل کئے جانے کے مستحق تھے ؛ جن سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور دیگر سبھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے قتال کیا اور ان کے ساتھ جنگیں لڑنے پر ان کا اتفاق تھا۔ بلکہ انہوں نے ان لوگوں کے بچے اور خواتین قیدی بنائے ۔ان ہی میں سے ایک لونڈی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حصہ میں آئی جس سے آپ کا مشہور نیکوکار بیٹا حضرت محمد بن حنفیہ پیدا ہوا۔

جہاد سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا فرار؟:

[اعتـــراض]: رافضی مصنف نے کہا ہے: ''بدر کے موقع پر جھونپڑے میں آپ ﷺ کے ساتھ ہونے میں کوئی فضیلت نہیں ۔اس لیے کہ نبی کریم ﷺ کے اللہ تعالیٰ کے ساتھ انس نے آپ کو دیگر ہر مونس و غمخوار سے بے نیاز کر دیا تھا۔ لیکن جب رسول اللہ ﷺ نے دیکھا کہ اگر آپ ابوبکر رضی اللہ عنہ کو جنگ لڑنے کا حکم دیں گے تو اس سے فساد پیدا ہوگا ؛ اس لیے کہ آپ اس سے پہلے کئی بار غزوات میں بھاگ چکے تھے ۔پس یہ دیکھنا چاہیے کہ کون سا انسان افضل ہے جو جہاد سے بیٹھا رہے یا پھر وہ شخص جو اپنے مال و جان سے جہاد فی سبیل اللہ کرے ۔'' [انتہیٰ کلام الرافضی]

[جواب]: اس رافضی کا بیان کھلا ہوا جھوٹ اور کئی وجوہات کی بنا پر محض باطل ہے :

پہلی وجہ: شیعہ مصنف کا یہ بیان: ''ابوبکر رضی اللہ عنہ متعدد مرتبہ غزوات سے بھاگ گئے تھے ۔''

ہم کہتے ہیں: [رافضی کا یہ دعوی محض کذب ، دروغ اور فریب دہی پر مبنی ہے]۔اور ایسی بات وہی انسان کہہ سکتا ہے جو رسول اللہ ﷺ کے غزوات و احوال سے سب سے بڑا جاہل ہو۔ روافض کی جہالت کوئی اچھوتی چیز نہیں ۔ بلاشبہ رسول اللہ ﷺ کے احوال سے سب سے بڑے جاہل ؛ جھوٹ کی تصدیق کرنے والے اور حق بات کی تکذیب کرنے والے روافض ہی تو ہوتے ہیں ۔

غزوۂ بدر اسلام کا سب سے پہلا معرکہ ہے ؛اس سے پہلے کفار کے ساتھ نبی کریم ﷺ یا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کوئی لڑائی نہیں لڑی ۔جن غزوات میں رسول اللہ ﷺ نے قتال کیا ؛ ان کی تعداد نو ہے : بدر' اُحد' خندق ؛ بنی مصطلق ؛ غزوہ ذی قرد ؛ خیبر' فتح مکہ ؛ حنین اور طائف ۔ جب کہ وہ غزوات جن میں قتال کی نوبت نہیں آئی ان کی تعداد پندرہ بنتی ہے ۔جب کہ سرایا میں سے بعض ایسے تھے جن میں قتال ہوا اور بعض میں کوئی قتال نہیں ہوا۔

بہر حال جو بھی ہو؛ غزوہ بدر پہلا معرکہ تھا جس میں قتال کی نوبت پیش آئی ؛اس پر تمام لوگوں کا اتفاق ہے ۔یہ ایسا عام

علمی پہلو ہے جسے رسول اللہ ﷺ کے احوال سے باخبر ہر انسان: محدث و مفسر' سیرت نگار و فقیہ ؛ مغازی نگار و مؤرخ ہر ایک جانتا ہے کہ غزوہ بدر وہ پہلا معرکہ تھا جس میں رسول اللہ ﷺ نے قتال کیا۔ اس سے پہلے قتال کی نوبت پیش نہیں آئی۔ اس سے پہلے کسی غزوہ یا سریہ میں قتال کی نوبت نہیں آئی؛ سوائے ابن حضرمی کے قصہ کے۔ اس میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ شریک نہیں تھے۔ تو پھر کیسے کہا جاسکتا ہے کہ: آپ اس سے پہلے کئی بار غزوات سے بھاگ چکے تھے؟

❀ دوسری وجہ: یہ حقیقت ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کسی لڑائی سے نہیں بھاگے تھے۔ غزوۂ احد میں بھی حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما ان لوگوں میں تھے جو ثابت قدم رہے تھے۔ البتہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے جو لغزش ہوئی تھی؛ اسے اللہ تعالیٰ نے معاف کردیا۔[یہ بات بدلیل نص بیان کی جا چکی ہے]۔ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں کسی ایک نے بھی نہیں کہا کہ آپ پسپا ہونے والوں کے ساتھ پسپا ہوگئے تھے۔ بلکہ آپ نبی کریم ﷺ کے ساتھ ثابت قدم رہے۔ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ان لوگوں میں تھے جو غزوۂ حنین میں بھی رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ثابت قدم رہے تھے۔ سیرت نگار حضرات نے ایسے ہی بیان کیا ہے۔ لیکن کذابین نے یہ جھوٹ گھڑ لیا ہے کہ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما نے غزوہ حنین کے موقع پر پرچم اسلام لیا تھا؛ مگر پھر ان کے ہاتھوں پر فتح نہ ہوسکی؛ اس لیے کہ حضرات واپس آ گئے۔ اور بعض نے اس میں اس جھوٹ کا بھی اضافہ کردیا ہے کہ اس موقع پر یہ دونوں حضرات بھی پسپا ہونے والوں کے ساتھ پسپا ہوگئے تھے۔ یہ تمام باتیں من گھڑت جھوٹ ہیں۔

اس سے قبل کہ انسان اس رافضی کے دعوی کا جھوٹ ہونا جان لے' یہ جاننا چاہیے کہ جس نے ان حضرات کے خلاف اس قسم کا دعوی کیا ہے وہ اس کا مدعی ہے' اسے چاہیے صحیح اور سچی روایات کی روشنی میں اپنا دعوی ثابت کرے۔ مگر رافضی اس کی راہ ہرگز نہیں پائے گا۔ کوئی ایک بھی ایسی صحیح اور سچی روایت ثابت کردیں جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کسی ایک غزوہ میں بھی بھاگے تھے؛ کئی ایک غزوات میں بھاگنا تو بہت دور کی بات ہے۔

❀ تیسری وجہ: اگر واقعی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بزدل ہوتے تو نبی کریم ﷺ غزوۂ بدر کے سائبان میں باقی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو چھوڑ کر آپ کو خصوصی شرف رفاقت سے مشرف نہ کرتے۔ بلکہ ایسے لوگوں کو معرکوں میں لیکر جانا ہی جائز نہیں۔ اس لیے کہ امام کے لیے جائز نہیں کہ وہ معرکہ میں ایسے لوگوں کو ساتھ لیکر جائے جو رسوائی کا سبب بننے والے یا پھر جھوٹی خبریں اڑانے والے ہوں۔ چہ جائے کہ انہیں باقی تمام صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین پر تقدیم بخشی جائے اور اپنے ساتھ سائبان میں بطور خاص رکھا جائے۔ [1]

---

[1] امام ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اگر رافضی مصنف یہ کہتا ہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ بزدل تھے، اور لڑائیوں سے بھاگ جایا کرتے تھے۔ علاوہ ازیں وہ مفلس و قلاش تھے۔ وہ درزی تھے، ان کی پشت پناہی کے لیے کوئی قبیلہ نہ تھا۔ ان کا خاندان بنی عبد مناف اور بنو مخزوم کی طرح معزز نہ تھا یا یہ کہ ان کے خدم و حشم نہ تھے۔'' ہم پوچھتے ہیں کہ سابقین اولین صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین نے کس کے سامنے گردن تسلیم خم کی اور اسے خلیفہ رسول کہہ کر پکارا؟ آخر نص شرعی کے سوا کون سی چیز ان کو ابوبکر رضی اللہ عنہ کے سامنے جھکنے پر مجبور کرسکتی تھی۔ اگر ابوبکر رضی اللہ عنہ سب امت میں افضل نہ ہوتے۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ یوں نہ فرماتے: ''اللہ کی قسم! جس قوم میں ابوبکر رضی اللہ عنہ جیسا شخص موجود ہو، مجھے اس کا امیر مقرر کرنے سے بہتر ہے کہ مجھے تہہ تیغ کردیا جائے۔[صحیح بخاری]۔

❀ چوتھی وجہ: بخاری و مسلم میں ثابت شدہ صحیح روایات اس بہتان رافضی کے کذب کو واضح کرتی ہیں اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ایمان و یقین اور ثبات پر روشنی ڈالتی ہیں۔ صحیحین میں حضرت ابن عباس، حضرت عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ بدر کے دن مشرکین کی طرف دیکھا تو وہ ایک ہزار تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ تین سو سترہ تھے۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قبلہ کی طرف منہ فرما کر اپنے ہاتھوں کو اٹھایا اور اپنے رب سے پکار پکار کر دعا مانگنا شروع کر دی: ''اے اللہ! میرے لئے اپنے کئے ہوئے وعدہ کو پورا فرمایا۔ اے اللہ! اپنے وعدہ کے مطابق عطا فرما۔ اے اللہ! اگر اہل اسلام کی یہ جماعت ہلاک ہوگئی تو زمین پر تیری عبادت نہ کی جائے گی۔''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم برابر اپنے رب سے ہاتھ دراز کئے قبلہ کی طرف منہ کر کے دعا مانگتے رہے یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر مبارک آپ کے شانہ سے گر پڑی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آئے؛ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر کو اٹھایا اور اسے آپ کے کندھے پر ڈالا پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے سے آپ سے لپٹ گئے اور عرض کیا: ''اے اللہ کے نبی آپ کی اپنے رب سے دعا کافی ہو چکی عنقریب وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے کئے ہوئے وعدے کو پورا کرے گا۔'' تب اللہ رب العزت نے یہ آیت نازل فرمائی:

﴿إِذْ تَسْتَغِيثُونَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ﴾ [الأنفال ۹]

''جب تم اپنے رب سے فریاد کر رہے تھے تو اس نے تمہاری دعا قبول کی۔''[1] [اور پوری حدیث بیان کی]

❀ پانچویں وجہ: یہ کہا جائے گا: جو انسان بھی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی سیرت سے آگاہ ہے، وہ جانتا ہے کہ آپ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین میں سے مضبوط دل کے مالک تھے۔ ان میں سے کوئی ایک بھی آپ کے قریب بھی نہیں پہنچتا تھا۔ کیونکہ جب سے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا اس وقت سے لے کر دم وفات تک حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ثابت قدم بہادر مجاہد اور پیش پیش رہے۔ کبھی بھی آپ کے بارے میں یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ دشمن کے مقابلہ میں آپ نے کوئی بزدلی یا کمزوری دکھائی ہو۔ بلکہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوا تو اس وقت اکثر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دل کمزور ہو گئے تھے۔ ان حالات میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تھے جو لوگوں کو ثابت قدم رہنے کی تلقین فرما رہے تھے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے خطبہ دیا۔ یہ حقیقت ہے کہ ہم لومڑی کی طرح بزدل ہو گئے تھے آپ کی حوصلہ افزائی نے ہمیں شیر بنا دیا۔''

یہ بھی روایت کیا گیا ہے کہ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ سے کہا تھا: ''اے نائب رسول اللہ! لوگوں پر رحم کیجیے۔''

تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آپ کی داڑھی پکڑ لی اور کہا: اے ابن خطاب! جاہلیت میں تو بڑے سخت اور اسلام میں یہ خواری دکھا رہے ہو۔ اور میں ''کس بات پر رحم کروں آیا کسی جھوٹی بات پر یا کسی خود ساختہ شعر پر۔''

❀ چھٹی وجہ: رافضی کا یہ کہنا کہ: ''کون سا انسان افضل ہے جو جہاد سے بیٹھا رہے یا پھر وہ شخص جو اپنے مال و جان سے جہاد

[1] صحیح مسلم۔ کتاب الجهاد۔ باب الامداد بالملائكة في غزوة بدر (حديث: ١٧٦٣)۔

فی سبیل اللہ کرے۔''

تو اس کا جواب یہ ہے: بلکہ اس حال میں رسول اللہ ﷺ کی حفاظت پر مامور رہنا افضل ترین جہاد ہے۔اس لیے کہ دشمن کا اصل ہدف آپ ﷺ کی ذات گرامی تھی۔لشکر کا ایک تہائی حصہ رسول اللہ ﷺ کے گرد آپ کی حفاظت پر مامور تھا۔اور ایک تہائی حصہ بھاگنے والے دشمنان کا پیچھا کر رہا تھا۔اور ایک تہائی حصہ کے لوگ مال غنیمت جمع کر رہے تھے۔پھر اللہ تعالیٰ کے حکم سے یہ اموال ان تمام لوگوں کے مابین تقسیم کیے گئے۔

❀ ساتویں وجہ: رافضی مصنف کا یہ دعویٰ کہ: ''س لیے کہ نبی کریم ﷺ کے اللہ تعالیٰ کے ساتھ انس نے آپ کو دیگر ہر مونس وغمخوار سے بے نیاز کر دیا تھا۔''

اس کا جواب یہ ہے: کہنے والے کا یہ کہنا: ''حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سائبان میں آپ کے مؤنس وغمخوار تھے''یہ قرآن و حدیث کا کلام نہیں ہے۔اور جس نے یہ کہا ہے وہ جانتا تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔اس سے مقصود یہ ہے کہ آپ اس لحاظ سے مؤنس نہیں تھے کہ آپ کو کوئی وحشت نہ ہو۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ قتال میں آپ کے معاون تھے۔جیسا کہ آپ سے فروتر مرتبہ کے لوگ بھی جہاد میں آپ کی مدد کر رہے تھے۔دیکھیں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿هُوَ الَّذِیْٓ اَیَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ﴾ [الأنفال ٦٢]

''اسی نے اپنی مدد سے اور مومنوں سے تیری تائید کی ہے۔''

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ان تمام اہل ایمان میں سے افضل تھے جن کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے مدد فرمائی۔

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿فَقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ وَ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِیْنَ﴾ [النساء ٨٤]

''اللہ کی راہ میں جہاد کیجئے۔آپ پر صرف اپنی ہی ذمہ داری ہے اور مسلمانوں کو جہاد کی رغبت دلائیے۔''

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو جہاد اور اپنی مدد کی ترغیب تمام امکانیات کی انتہاء تک پہنچی ہوئی تھی۔رسول اللہ ﷺ کی ذمہ داری تھی کہ لوگوں کو جہاد کی ترغیب دیں تاکہ ان کے ساتھ مل کر دشمن سے لڑنا ممکن ہو۔اور ان کی دعاء، رائے، افعال سے اور دیگر جس طرح بھی ممکن ہو سکے دشمن کے خلاف ان سے مدد حاصل کی جائے۔

❀ آٹھویں وجہ: یہ بات کہی جائے گی کہ: تمام اہل عقل کے ہاں یہ بات معلوم ہے کہ جنگ میں اصل مطلوب سربراہ ہوتا ہے جو کہ دشمن کو قتل کرنا اور ان سے لڑنا چاہتا ہے۔ جب یہ قائد سائبان میں؛ یا قبہ میں یہ کسی بھی پناہ کی جگہ پڑاؤ ڈالے اور اپنے ساتھ تمام ساتھیوں میں سے صرف فرد واحد کو ہی اختیار کرے اور باقی تمام لوگ اس سائباں سے باہر ہوں۔تو یہ انسان تمام لوگوں میں سے خاص الخاص ہی ہوسکتا ہے۔اور اس کی دوستی سب سے گہری دوستی اور اس سے حاصل ہونے والا فائدہ بہت بڑا ہوسکتا۔ جہاد میں یہ نفع اسی صورت میں ممکن ہے جب اس کے ساتھ قوت قلب اور ثابت قدمی بھی ہو۔کمزوری اور پسپائی کے ساتھ یہ ممکن نہیں۔

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ان تمام لوگوں میں سب سے بڑے مؤمن و مجاہد تھے۔تمام مخلوق

میں افضل ترین لوگ اہل ایمان اور اہل جہاد ہوتے ہیں۔ پس جو اس میدان میں افضل ہو تو اس کی فضیلت مطلق ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ وَ عِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ جٰهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ ﴾.... آگے تک.... ﴿وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ﴾ [التوبة ۱۹۔۲۰]

''کیا تم نے حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجد حرام کو آباد کرنے کو اس شخص کے کام کے برابر بنا دیا جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لائے اور اللہ کی راہ میں جہاد کرے؟ اللہ کے نزدیک یہ برابر نہیں ہو سکتے۔........ اور ایسے ہی لوگ کامیاب ہیں۔''

ان اہل جہاد کا مقام و مرتبہ اللہ کے ہاں اہل حج و صدقہ و خیرات سے بڑھ کر تھا۔ اور ان میں سب سے اکمل و کامل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے۔

جب کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا جہاد ہاتھ کا جہاد تھا؛ اس میں وہ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین بھی آپ کے ساتھ شریک تھے جو بدر کے دن جہاد میں مصروف تھے۔ اور یہ بات معلوم نہیں ہو سکی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بدر یا احد کے موقع پر یا دیگر کسی موقع پر باقی تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی نسبت زیادہ لڑائی لڑی ہو۔

پس حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی فضیلت ان کے ساتھ خاص ہے' اس میں کوئی دوسرا آپ کا سہیم و شریک نہیں؛ جب کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضائل آپ کے اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے مابین مشترک ہیں۔

❀ نویں وجہ: بلا شبہ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اس سائبان سے باہر نکلے اور مٹھی بھر کر مٹی پھینکی جس کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی:

﴿وَ مَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى﴾ [الأنفال۱۷]

''اور جب آپ نے مٹھی پھینکی تھی تو وہ آپ نے نہیں بلکہ اللہ نے پھینکی تھی۔''

اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں سے قتال کیا تھا؛ یہاں تک کہ آپ کے بیٹے عبدالرحمٰن نے کہا: میں نے آپ کو بدر کے دن دیکھا تھا؛ مگر میں آپ سے منہ موڑ کر چلا گیا۔ تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''لیکن اگر میں تمہیں دیکھ لیتا تو ضرور قتل کر دیتا۔''[1]

فصل:

[احوال ابوبکر رضی اللہ عنہ کے متعلق جھوٹا دعوی]

[اعتراض]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:

❀ اور یہ جھوٹ ہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر خرچ کیا کرتے تھے، اس لیے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ مال دار نہ تھے۔ آپ کا باپ

[1] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ عزم و ثبات وقوت ایمان وایقان کا زندہ پیکر تھے، نیز یہ کہ نبی کریم اور ابوبکر رضی اللہ عنہ اصحاب بدر میں سب سے افضل تھے، حالانکہ دونوں نے لڑائی میں عملی حصہ نہیں لیا تھا۔ یہ ضروری نہیں کہ لڑائی میں عملی حصہ لینے والا نہ لڑنے والے سے افضل ہو۔ [آغا دلدار]

انتہائی درجہ کا فقیر انسان تھا جو کہ ہر دن چند ٹکڑوں کے عوض عبداللہ بن جدعان کے دستر خوان پر منادی کیا کرتا تھا۔ اگر ابوبکر واقعی مال دار ہوتا تو وہ اپنے باپ کی ضرورت پوری کرتا۔

❀ اور یہ کہ ''ابوبکر رضی اللہ عنہ عہد جاہلیت میں بچوں کو تعلیم دینے کے لیے ایک پیشہ ور معلم تھے۔ اور اسلام لانے کے بعد درزی کا کام کیا کرتے تھے۔ جب آپ مسلمانوں کے ولی الامر بن گئے تو لوگوں نے آپ کو درزی کا کام کرنے سے روک دیا۔ تو آپ کہنے لگے: مجھے تو اپنی روزی کے لیے ضرورت ہے۔ تو اس پر آپ کے لیے بیت المال سے یومیہ تین درہم وظیفہ مقرر کر دیا۔[انتہی کلام الرافضی]

[جواب]: ہم کہتے ہیں کہ: کسی انسان کا قطعی و متواتر روایات جو کہ خاص و عام کے درمیان مشہور ہوں؛ اور ان سے کتابیں، جیسے: کتب صحاح، مسانید؛ تفاسیر؛ فقہ اور فضائل و سیرت کی کتب بھری پڑی ہوں؛ کا انکار کرنا ایک عظیم مصیبت ہے۔ اور پھر ایسی روایات کا دعوی کیا جائے جن کا علم محض رافضی دعوی کی بنیاد پر حاصل نہیں ہو سکتا۔ اور نہ ہی اسے کسی معروف سند سے نقل کیا گیا ہے۔ اور نہ ہی اسے کسی معروف اور ثقہ کتاب کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ اور نہ ہی اسے یہ سمجھ آرہی ہے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ اگر ہم یہ فرض کر لیں کہ یہ انسان مخلوق میں سے کسی جاہل ترین انسان سے بھی مناظرہ کرے تو اس کے لیے یہ کہنا بہت آسانی سے ممکن ہوگا کہ تم جھوٹ بولتے ہو۔ [ہم شیعہ مصنف سے پوچھتے ہیں کہ] آخر کس ثقہ یا ضعیف راوی نے کہا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مفلس آدمی تھے؟

پھر اس سے یہ بھی کہا جائے گا کہ: حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اپنا مال خرچ کرنے کے قصے تواتر کے صحیح احادیث میں کئی کئی اسناد سے منقول ہیں۔ حتی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''مجھے کسی شخص کے مال سے مجھے اتنا فائدہ نہیں پہنچا جتنا فائدہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے مال سے۔''[سبق تخریجه]

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا:

''ہم پر اپنی جان و مال سے لوگوں میں سب سے زیادہ احسان کرنے والے حضرت ابوبکر ہیں۔''[سبق تخریجه]

صحیح احادیث میں ثابت ہے کہ اسی مال سے آپ نے حضرت بلال؛ عامر بن فہیرہ اور دیگر سات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو خرید کر آزاد کیا۔

❀ رافضی کا یہ قول کہ: آپ کا باپ ہر دن چند ٹکڑوں کے عوض عبداللہ بن جدعان کے دستر خوان پر منادی کیا کرتا تھا''

[جواب]: رافضی نے اس کی کوئی سند ذکر نہیں کی جس سے اس کی صحت کی معرفت حاصل ہو سکے۔ اور اگر ایسا ثابت بھی ہو جائے تو اس میں کوئی ضرر والی بات نہیں۔ اس لیے کہ ایسا کیا جانا جاہلیت میں تھا اسلام میں نہیں۔ اس لیے کہ ابن جدعان کا انتقال اسلام سے پہلے ہوا ہے۔ جب کہ عہد اسلام میں ابوقحافہ رضی اللہ عنہ کے پاس اتنا مال تھا جو ان کی ضرورت پوری کرتا تھا۔ یہ بات ہرگز معلوم نہیں ہو سکی کہ حضرت ابوقحافہ رضی اللہ عنہ لوگوں کے دست نگر رہتے ہوں۔ اور حضرت ابوقحافہ رضی اللہ عنہ نے لمبی زندگی پائی؛ یہاں تک کہ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا انتقال ہو گیا تو آپ کو ان کی میراث میں سے چھٹا حصہ ملا۔ جو کہ آپ نے اولاد ابوبکر رضی اللہ عنہ کو واپس کر دیا' اس لیے کہ آپ کے پاس بقدر کفایت مال ہونے کی وجہ سے اس کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ بات

معلوم شدہ ہے کہ اگر انہیں کسی چیز کی ضرورت ہوتی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ضرور آپ کی مدد کرتے۔
حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ دور کی قرابت کی وجہ سے حضرت مسطح رضی اللہ عنہ کی مالی امداد کیا کرتے تھے۔ مسطح بھی ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے واقعہ افک میں کلام کیا تھا۔ تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے قسم اٹھالی کہ وہ آئندہ ان کی مالی امداد نہ کریں گے۔ سوتب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی:

﴿وَلَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ أَنْ يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَى وَالْمَسَاكِينَ [وَالْمُهَاجِرِينَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا أَلَا تُحِبُّونَ أَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ] وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ﴾ (النور: ۲۲)

''تم میں سے فارغ البال اشخاص اس بات کی قسم نہ کھالیں کہ وہ اپنے اقارب اور مساکین [ومہاجرین پر خرچ نہیں کریں گے۔ چاہیے کہ وہ معاف کردیں اور درگزر سے کام لیں، کیا تم اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں بخش دے] اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔''

یہ سن کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اللہ کی قسم! میں چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ میری مغفرت فرمائے، چنانچہ پھر مسطح کی مالی امداد شروع کردی۔''[1]

سات اشخاص جو غلام تھے، اسلام کے جرم میں ان کو پیٹا جاتا تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان کو خرید کر آزاد کردیا۔[2]

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ہجرت کی تو [حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس] جتنا مال تھا سب ساتھ لے لیا۔[3]

حضرت ابوقحافہ رضی اللہ عنہ آئے اور پوچھنے لگے: ابوبکر خود تو چلا گیا' کیا اس نے اپنا مال تمہارے لیے چھوڑا ہے یا اسے بھی ساتھ لے گیا؟

حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: میں نے کہا: نہیں آپ مال چھوڑ گئے ہیں۔ اور میں نے ایک کونے میں کوئی چیز رکھ کر ان سے کہا: ان کا مال یہ پڑا ہوا ہے۔'' تاکہ آپ کا دل مطمئن ہوجائے کہ آپ اپنے عیال کے لیے کچھ چھوڑ کر گئے ہیں۔ ابوقحافہ رضی اللہ عنہ نے اس میں سے کسی بھی چیز کا مطالبہ نہیں کیا۔ یہ تمام باتیں دلالت کرتی ہیں کہ آپ مالدار انسان تھے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور پیشہ معلمی؟:

❀ شیعہ مصنف کا یہ قول کہ: ''حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ عہد جاہلیت میں بچوں کو تعلیم دینے کے لیے ایک پیشہ ور معلم تھے۔''

❀ [صاف جھوٹ ہے]۔ اگر فی الواقع ایسا ہوتا بھی تو اس سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی شان میں کچھ فرق نہیں پڑتا تھا۔ بلکہ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ علم و معرفت رکھنے والے انسان تھے۔ مسلمان علماء کرام رحمہم اللہ کی ایک جماعت تھی جو لوگوں کو آداب سکھایا کرتے تھے۔ ان میں: ابوصالح' جو کلبی کے ساتھی تھے؛ بچوں کو تعلیم دیا کرتے تھے۔

---

[1] صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب حدیث الافك (حدیث: ٤١٤١) صحیح مسلم، کتاب التوبة، باب فی حدیث الافك (حدیث: ٢٧٧٠)۔

[2] مستدرك حاکم (۳/ ۲۸٤)، سیرة ابن هشام (ص: ١٤٧)

[3] سیرۃ ابن ہشام (ص: ۲۲۵)۔ ایک قول کے مطابق آپ کے پاس اس وقت چھ ہزار درہم تھے۔ آپ اس مال سے تجارت کیا کرتے تھے۔

اور ابوعبدالرحمن السلمی ان کا شمار حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خواص میں سے ہوتا ہے۔ امام سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:'' ضحاک بن مزاحم اور عبداللہ بن الحارث بچوں کو تعلیم دیا کرتے تھے۔ مگر اس پر کوئی اجرت نہیں لیتے تھے۔''

ان ہی لوگوں میں سے ایک حضرت قیس بن سعد بھی تھے۔ اور عطاء بن ابی رباح؛ عبدالکریم ابوامیہ' حسین المعلم ابو ذکوان' قاسم بن عمیر ہمدانی؛ حبیب المعلم مولیٰ معقل بن یسار بھی تھے۔ نیز حضرت علقمہ بن ابی علقمہ؛ ان سے حضرت مالک بن انس بھی روایت کرتے ہیں' آپ کا ایک مکتب تھا جہاں پر لوگوں کو تعلیم دیا کرتے تھے۔ ان میں سے ابوعبید القاسم بن سلام بھی ہیں۔ جن کی فضیلت و امامت پر اجماع ہے۔

تو پھر جب یہ بات ہی خود ساختہ جھوٹ ہے تو ہم اس کے متعلق کیا کہہ سکتے ہیں۔ [ابوبکر رضی اللہ عنہ اگر پیشہ ور معلم ہوتے تو قریش کے بہت سے لوگ لکھے پڑھے ہوتے۔ حالانکہ لکھنے والوں کی قریش میں بڑی قلت تھی]۔

بلکہ اگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اسلام سے قبل نچلے درجہ کے لوگوں میں سے بھی ہوتے تو پھر بھی یہ بات آپ کی شان میں قدح کا موجب نہیں ہوسکتی تھی۔ اس لیے کہ حضرت سعد' عبداللہ بن مسعود' صہیب ' بلال رضی اللہ عنہم اجمعین اور ان کے علاوہ دیگر کمزور لوگ بھی تھے جن کے متعلق قریش نے رسول اللہ ﷺ سے مطالبہ کیا تھا کہ انہیں اپنی مجلس سے نکال دیا جائے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس سے منع کر دیا۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿وَ لَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَ الْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّ مَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ﴾...... آگے تک...... ﴿اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ﴾ [الانعام ۵۲۔۵۳]

''اور ان لوگوں کو نہ نکالئے جو صبح شام اپنے پروردگار کی عبادت کرتے ہیں، خاص اس کی رضا مندی کا قصد رکھتے ہیں۔ ان کا حساب ذرا بھی آپ کے متعلق نہیں اور آپ کا حساب ذرا بھی ان کے متعلق نہیں .... کیا یہ بات نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ شکر گزاروں کو خوب جانتا ہے۔''

لیکن رافضیوں کا کلام عہد جاہلیت کے مشرکین کے کلام کی جنس سے ہوتا ہے۔ یہ اپنے باپ دادا اور نسب کی وجہ سے تعصب برتتے ہیں دین کی وجہ سے نہیں۔ اور انسان پر کسی ایسی وجہ سے عیب لگاتے ہیں جس سے اس کے ایمان و تقوی میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔ یہ تمام جاہلیت کے افعال ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ روافض پر جاہلیت غالب ہوتی ہے۔ اور خود کئی ایک ان وجوہات کی بنا پر کفار سے مشابہت رکھتے ہیں؛ جن میں انہوں نے اہل ایمان و اسلام کی مخالفت کی ہے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور پیشہ سلائی ؟:

[اعتراض]: رافضی کا یہ کہنا ہے کہ:''حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اسلام لانے کے بعد درزی کا کام کیا کرتے تھے۔ جب آپ مسلمانوں کے ولی الامر بن گئے تو لوگوں نے آپ کو درزی کا کام کرنے سے روک دیا۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جواب]: یہ کھلا ہوا جھوٹ ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ درزی تھے۔ اس دعوی کا جھوٹ ہونا ہر معرفت رکھنے والے انسان پر عیاں ہے۔ اور اگر حقیقت میں ایسا ہوتا بھی تو اس میں کوئی عیب والی بات نہیں تھی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تاجر تھے درزی نہ تھے۔ آپ کبھی اپنا مال تجارت لیکر خود سفر کرتے' اور کبھی خود نہ بھی جاتے۔ آپ نے عہد اسلام میں تجارت کی غرض سے شام

کا سفر کیا۔تجارت قریش کے ہاں افضل ترین ذریعہ آمدن تھا۔ان کے مالداروں میں سے بہترین لوگ تجارت کے پیشہ سے وابستہ تھے۔اور عرب انہیں تاجروں کی حیثیت سے ہی جانتے تھے۔حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جب منصب خلافت پر فائز ہوئے تو اس وقت بھی تجارتی مشاغل جاری رکھنا چاہتے تھے' مگر مسلمانوں نے اس سے روک دیا؛ اور عرض گزار ہوئے کہ: یہ کام آپ کو مسلمانوں کی مصلحت کے کاموں سے روک دے گا۔''

درزی کا یہ پیشہ قریش میں بڑا کم یاب تھا۔اس کی وجہ یہ تھی کہ قریش عام طور سے تہ بند باندھتے اور اوپر چادر اوڑھ لیا کرتے تھے۔[اس لیے کپڑے سینے کی ضرورت ہی لاحق نہیں ہوا کرتی تھی]۔

مدینہ طیبہ میں ایک درزی ہوا کرتا تھا۔اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے گھر پر بھی بلایا تھا۔ [1]

جب کہ مہاجرین میں سے کسی ایک کے متعلق ہمیں یہ بات معلوم نہیں ہوسکی کہ وہ درزی کا کام کرتا ہو۔حالانکہ درزی کا پیشہ بڑا ہی اچھا اور باعزت پیشہ ہے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی راہ میں خرچ کرنا تواتر کے ساتھ ثابت ہے۔اسے ہر خاص و عام جانتا ہے۔اسلام سے قبل آپ بڑے مال دار تھے۔قریش آپ کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے آپ کی تعظیم کرتے اور آپ سے محبت کرتے تھے۔آپ کو عربوں کے نسب اور ان کی لڑائیوں کے بارے میں بہت علم حاصل تھا۔لوگ آپ کے علم و احسان اور تجارتی مقاصد کی وجہ سے آپ کے پاس آتے رہتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ جب آپ مکہ سے نکلے تو ابن دغنہ نے کہا:

''آپ جیسا آدمی نہ نکل سکتا اور نہ نکالا جاسکتا ہے۔''

اور یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ قریش یا کسی دوسرے نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پر کسی قسم کا کوئی عیب لگایا ہو۔نہ ہی کسی نے آپ میں کوئی نقص نکالا اور نہ ہی آپ کو حقیر سمجھا؛ جیسا کہ کمزور مسلمانوں کے ساتھ ان لوگوں کا رویہ رہتا تھا۔ان لوگوں کے نزدیک حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان کے علاوہ کوئی قابل عیب بات نہیں تھی۔جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کے متعلق قریش کے ہاں کسی قسم کی کوئی عیب یا نقص والی بات یا مذموم چیز نہیں پائی جاتی تھی۔بلکہ آپ خاندان اور گھر بار کے لحاظ سے قابل صد تکریم و تعظیم تھے۔آپ کے مکارم اخلاق صدق و وفاء اور امانت داری مشہور تھی۔ایسے ہی حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے متعلق ان کے ہاں کوئی عیب والی بات نہیں تھی۔

ابن دغنہ علاقہ کا سردار اور اپنے قبیلہ کا رئیس تھا۔اسے قریش میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا؛ اس کی عزت و احترام کی وجہ قریش اس کو پناہ دیدیتے تھے جس کو یہ پناہ دیدیتا۔

بخاری و مسلم میں ہے کہ:

''جب قریش مکہ نے مسلمانوں کو ظلم و ستم کا نشانہ بنایا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ حبشہ کی طرف ہجرت کرنے کے لئے نکلے

[1] حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: مدینہ میں ایک درزی تھا اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کھانے کی دعوت دی۔میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیساتھ چلا گیا۔ میں نے دیکھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پلیٹ سے کدو کے ٹکڑے تلاش کر کے کھا رہے تھے۔تو اس وقت سے مجھے کدو سے محبت ہوگئی۔

[صحیح بخاری' کتاب الاطعمہ 'باب من تتبع حوالی القصعہ ۔وکتاب البیوع' باب ذکر الخیاط۔نیز دیکھیں صحیح مسلم' ۳/ ۱٦۱۵]

جب برک غماد پہنچے تو ان سے علاقہ کے سردار ابن دغنہ کی ملاقات ہوئی ۔ اس نے پوچھا: ابوبکر رضی اللہ عنہ ! کہاں کا ارادہ ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ: ''مجھ کو میری قوم نے نکال دیا ہے؛اس لئے میں چاہتا ہوں کہ زمین کی سیر کروں اور اپنے پروردگار کی عبادت کروں۔''

ابن دغنہ نے کہا کہ: ''تم جیسا آدمی نہ تو نکل سکتا ہے اور نہ نکالا جا سکتا ہے؛ اس لئے کہ تم فقراء کے لئے کماتے ہو، صلہ رحمی کرتے ہو اور عاجز و مجبور کا بوجھ اٹھاتے ،مہمان کی ضیافت کرتے ہو اور حق (پر قائم رہنے) کی وجہ سے آنے والی مصیبت پر مدد کرتے ہو؛ میں تمہیں پناہ دیتا ہوں تم لوٹ چلو؛ اور اپنے ملک میں اپنے رب کی عبادت کرو۔''

چنانچہ ابن دغنہ روانہ ہوا تو ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ساتھ لے کر واپس ہوا؛ اور کفار قریش کے سرداروں میں گھوما اور ان سے کہا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ جیسا آدمی نہ تو نکل سکتا ہے نہ نکالا جا سکتا ہے جو تنگدستوں کے لئے کماتا ہے صلہ رحمی کرتا ہے، عاجزوں کا بوجھ اٹھاتا ہے۔مہمان کی مہمان نوازی کرتا ہے۔ راہ حق میں پیش آنے والی مصیبت میں مدد کرتا ہے۔ چنانچہ قریش نے ابن دغنہ کی پناہ منظور کر لی ۔اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کو امان دے کر ابن دغنہ سے کہا: ابوبکر رضی اللہ عنہ کو کہہ دو کہ اپنے رب کی عبادت اپنے گھر میں کریں، نماز پڑھیں، لیکن ہمیں تکلیف نہ دیں اور نہ اس کا اعلان کریں، اس لئے کہ ہمیں خطرہ ہے کہ ہمارے بچے اور عورتیں فتنہ میں مبتلا نہ ہو جائیں۔''

ابن دغنہ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ سے یہ کہہ دیا۔ چنانچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کچھ عرصہ تک اپنے گھر میں اپنے رب کی عبادت کرنے لگے اور نہ تو نماز اعلانیہ پڑھتے اور نہ قرأت اعلانیہ کرتے۔ پھر ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دل میں کچھ خیال پیدا ہوا، تو انہوں نے اپنے گھر کے صحن میں ایک مسجد بنا لی اور باہر نکل کر وہاں نماز اور قرآن پڑھنے لگے، تو مشرکین کی عورتیں اور بچے ان کے پاس جمع ہو جاتے، ان لوگوں کو اچھا معلوم ہوتا اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کو دیکھتے رہتے ۔ابوبکر رضی اللہ عنہ ایسے آدمی تھے کہ بہت روتے اور جب قرآن پڑھتے تو انہیں آنسوں پر اختیار نہیں رہتا تھا۔ مشرکین قریش کے سردار گھبرائے اور ابن دغنہ کو بلا بھیجا وہ ان کے پاس آیا تو انہوں نے ابن دغنہ سے کہا کہ ہم نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اس شرط پر امان دی تھی کہ وہ اپنے گھر میں اپنے پروردگار کی عبادت کریں، لیکن انہوں نے اس سے تجاوز کیا اور اپنے گھر کے صحن میں مسجد بنا لی۔ اعلانیہ نماز اور قرآن پڑھنے لگے اور ہمیں خطرہ ہے کہ ہمارے بچے اور ہماری عورتیں گمراہ نہ ہو جائیں۔ اس لئے ان کے پاس جا کر کہو کہ اگر وہ اپنے گھر کے اندر اپنے رب کی عبادت پر اکتفا کرتے ہیں تو کریں اور اگر اس کو اعلانیہ کرنے سے انکار کریں تو ان سے کہو کہ تمہارا ذمہ واپس کر دیں، اس لئے کہ ہمیں پسند نہیں کہ ہم تمہاری امان کو توڑیں اور نہ ہم ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اعلانیہ عبادت کرنے پر قائم رہنے دے سکتے ہیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ ابن دغنہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور کہا تمہیں معلوم ہے کہ میں نے تمہارا ذمہ ایک شرط پر لیا تھا، یا تو اسی پر اکتفا کرو یا میرا ذمہ مجھے واپس کر دو، اس لئے کہ میں یہ نہیں چاہتا کہ عرب اس بات کو سنیں کہ میں نے ایک شخص کو اپنے ذمہ میں لیا تھا، اور میرا ذمہ توڑا گیا، ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ میں تیرا ذمہ تجھے واپس دیتا ہوں اور اللہ کی پناہ پر راضی ہوں۔''

اس روایت میں ابن دغنہ قبائل قریش کے سرداروں کی موجودگی میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے وہ اوصاف بیان کرتے ہیں؛ جو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف اس وقت بیان کئے تھے کہ جب آپ پر وحی نازل ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کہا: '' مجھے اپنی جان کا خوف محسوس ہونے لگا۔'' تو آپ فرمانے لگیں:

'' اللہ کی قسم! اللہ تعالیٰ ہرگز آپ کو پریشان نہیں کرے گا: آپ صلہ رحمی کرتے ہیں؛ کمزور کا بوجھ اٹھاتے ہیں۔ مہمان کی میزبانی کرتے ہیں؛ بے آسرا کا سہارا بنتے ہیں۔ اور حق کے کاموں پر مدد کرتے ہیں۔''

یہ صفات اس نبی کی صفات ہیں جو افضل الانبیاء ہیں اور اس صدیق کی صفات ہیں جو افضل صدیقین ہے۔

فصل:

[ابوبکر رضی اللہ عنہ پر عدم انفاق کا الزام]

❀ رافضی کا کہنا ہے کہ: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت سے قبل حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے مال کی وجہ سے غنی تھے۔ اس وقت جنگ یا لشکر کی تیاری کی ضرورت نہ تھی۔''

[جواب] : حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایسے نہیں خرچ کرتے تھے کہ آپ کو کھانے پینے کے لیے یا کپڑا پہننے کے لیے دیتے ہوں۔ اس لیے کہ اللہ عزوجل نے اپنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام مخلوق کے مال سے بے نیاز و غنی رکھا ہوا تھا۔ بلکہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی یہ امداد اور تعاون دین و ایمان کے قائم کرنے کے سلسلہ میں تھا۔ آپ اپنا مال ان امور میں خرچ کیا کرتے تھے جو اللہ اور اس کے رسول کے پسندیدہ تھے۔ نہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر خرچہ کرتے تھے۔ آپ نے ان لوگوں کو خرید کر آزاد کیا جنہیں ایمان لانے کی پاداش میں عذاب دیا جاتا تھا جیسے: حضرت بلال؛ عامر بن فہیرہ؛ زنیرہ؛ اور ان کے علاوہ ایک جماعت کو خرید کر آزاد کیا۔ رضی اللہ عنہم اجمعین۔

فصل:

[ابوبکر رضی اللہ عنہ کا افلاس؟]

❀ رافضی کا کہنا ہے کہ: ''اور ہجرت کے بعد تو ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس بالکل کچھ بھی نہیں تھا۔''

[جواب] : یہ ایک کھلا ہوا جھوٹ ہے۔ بلکہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جہاد کے لیے صدقہ کرنے کی ترغیب دی تو آپ اپنے گھر کا سارا مال لیکر آ گئے۔ ایسے ہی اصحابِ صفہ فقراء لوگ تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو کھانا کھلانے کی ترغیب دی تو آپ اپنے ساتھ تین صحابہ کو لیکر چلے گئے۔ جیسا کہ صحیحین میں حضرت عبدالرحمن بن ابوبکر، روایت کرتے ہیں کہ اصحاب صفہ غریب لوگ تھے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرما دیا تھا کہ جس کے پاس دو آدمیوں کا کھانا ہو وہ تیسرے کو اس میں سے لے جائے اور اگر چار کا ہو تو پانچواں یا چھٹا ان میں سے لے جائے ابوبکر تین آدمی لے گئے اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دس لے گئے۔''

[صحیح بخاری: جلد ۱، ص ۵۷۵]

حضرت زید بن اسلم، اپنے والد سے وہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں: آپ فرماتے ہیں:

''ایک مرتبہ نبی اکرم ﷺ نے ہمیں صدقہ دینے کا حکم دیا۔ اتفاق سے ان دنوں میرے پاس مال بھی تھا۔ میں سوچنے لگا کہ آج میں ابوبکر رضی اللہ عنہ سے سبقت لے گیا تو لے گیا۔ چنانچہ میں اپنا آدھا مال لے کر حاضر ہوا۔ آپ ﷺ نے پوچھا کہ گھر والوں کے لئے کیا چھوڑا؟ عرض کیا اتنا ہی جتنا ساتھ لایا ہوں۔ پھر ابوبکر رضی اللہ عنہ آئے تو سب کچھ لے کر حاضر ہوئے۔ آپ ﷺ نے پوچھا کہ گھر والوں کے لئے کیا چھوڑا؟ عرض کیا ان کے لئے اللہ اور اس کا رسول۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ''اس پر میں نے کہا میں کبھی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پر سبقت حاصل نہیں کر سکتا۔'' [جامع ترمذی: ج ۲ : ح ۱٦٤١ ۔ یہ حدیث حسن صحیح ہے]۔

فصل:

[صدقاتِ ابوبکر رضی اللہ عنہ]

[اعتراض]: شیعہ مصنف لکھتا ہے کہ: ''اگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہوتے تو ان کے بارے میں اسی طرح قرآن نازل ہوتا جس طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں آیت ﴿هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ﴾ اتری تھی۔

[جواب]: اس کا جواب یہ ہے کہ: جس حدیث میں مذکورہ آیت: ﴿هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ﴾ کے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق نازل ہونے کا ذکر ہے؛ اس کے موضوع [من گھڑت] ہونے پر اہل علم کا اتفاق ہے۔ اس کا تذکرہ وہی مفسرین کرتے ہیں جن کی عادت ہے کہ وہ موضوع روایات کو بھی [بغیر کسی تحقیق و بیان] کے جمع کر دیتے ہیں۔ اس کے جھوٹ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ: ﴿هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ﴾ کے مکی سورۃ ہونے پر لوگوں کا اتفاق ہے؛ جو کہ ہجرت اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے شادی کرنے سے پہلے نازل ہوئی ہے۔ اس وقت ابھی تک حسن و حسین رضی اللہ عنہما پیدا نہیں ہوئے تھے۔ اس مسئلہ پر ہم کئی ایک مقامات پر تفصیل کے ساتھ گفتگو کر چکے ہیں۔ قرآن کی کوئی ایک آیت بھی خصوصی طور پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے انفاق فی سبیل اللہ کے بارے میں نازل نہیں ہوئی۔ اس لیے کہ اس وقت میں آپ کے پاس کوئی مال نہیں تھا۔ بلکہ ہجرت سے پہلے آپ کا شمار بھی عیال نبوت کے ساتھ ہوتا تھا۔ اور ہجرت کے بعد کبھی کبھار آپ مزدوری بھی کیا کرتے تھے۔ ایک کھجول کے بدلے ایک ڈول پانی نکالا کرتے تھے۔ جب آپ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے شادی کی تو آپ کے پاس مہر دینے کے لیے سوائے ایک درع کے کچھ بھی نہیں تھا۔ آپ نے اپنی شادی پر وہ مال خرچ کیا جو آپ کو غزوہ بدر میں مال غنیمت سے آپ کو ملا تھا۔

صحیحین میں حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: آپ فرماتے ہیں:

''مجھے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بدر کے دن غنیمت میں ایک اونٹنی ملی، اور مجھے رسول اللہ ﷺ نے ایک اونٹنی اور دی۔ جب میں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے شادی کرنا چاہی تو بنی قینقاع کے ایک سنار کے ساتھ وعدہ طے کیا کہ وہ میرے ساتھ چلے گا؛ تاکہ ہم اذخر لا کر سناروں پر بیچیں گے اور اس پیسہ سے فاطمہ رضی اللہ عنہا کے ولیمہ کی دعوت میں مدد لوں گا۔ جب میں اپنی اونٹنیوں کے لیے ساز و سامان تیار کر رہا تھا اور ان دونوں اونٹنیوں کو میں نے ایک انصاری کے

دروازے پر بٹھایا تھا۔اور فرمایا: حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ اسی گھر میں شراب پی رہے تھے؛ ان کیساتھ ایک گانے والی تھی جو گا رہی تھی"ألا یا حمز للشرف النواء "اے حمزہ! آگاہ ہو؛ دوفربہ اونٹیناں لے لو۔"حمزہ ان دونوں اونٹیوں کی طرف تلوار لے کر جھپٹ پڑے ان کی کوہان کاٹ ڈالے اور کولہے کاٹ دیئے ......"پھر پوری حدیث بیان کی۔ یہ شراب کے حرام ہونے سے پہلے کا واقعہ ہے۔"[صحیح بخاری:ح ۲۲۳۷]

جب کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا معاملہ مختلف ہے؛ ہر وہ آیت جو انفاق فی سبیل کرنے والوں کی مدح میں نازل ہوئی ہے؛ تو اس امت میں اس آیت کے سب سے پہلے مقصود حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں۔مثلاً اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿لَا يَسْتَوِي مِنكُم مَّنْ أَنفَقَ مِن قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ أُولَٰئِكَ أَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِينَ أَنفَقُوا مِن بَعْدُ وَقَاتَلُوا﴾ [الحدید۱۰]

"تم میں سے جن لوگوں نے فتح سے پہلے فی سبیل اللہ دیا ہے اور قتال کیا ہے وہ (دوسروں کے) برابر نہیں بلکہ ان کے بہت بڑے درجے ہیں جنہوں نے فتح کے بعد خیراتیں دیں اور جہاد کیے۔"

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:﴿الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ﴾۔"جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت کی اور اللہ کے راستے میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں کیساتھ جہاد کیا۔"[التوبۃ۲۰]

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:﴿وَسَيُجَنَّبُهَا الْأَتْقَى ۞ الَّذِي يُؤْتِي مَالَهُ يَتَزَكَّىٰ﴾ [اللیل۱۷۔۱۸]

"اور عنقریب اس سے وہ بڑا پرہیزگار دور رکھا جائے گا۔جو اپنا مال (اس لیے) دیتا ہے کہ پاک ہو جائے۔"

مشہور مفسرین جیسے ابن جریر الطبری؛ عبدالرحمن بن ابی حاتم؛ اور دوسروں نے اسناد کیساتھ حضرت عبداللہ بن زبیر؛ عروہ بن زبیر اور سعید بن مسیب رحمہم اللہ سے روایت کیا ہے کہ یہ آیت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی شان میں نازل ہوئی۔[طبری/۳۰/۲۲۸]۔

فصل:

[حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر الزام کا جواب]

شیعہ کا یہ قول ہے کہ:"نماز میں آپ کو امامت کے لیے آگے بڑھانے کی بات غلط ہے۔اس لیے کہ جب حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے نماز کے لیے اذان دیدی؛ تو عائشہ رضی اللہ عنہا نے حکم دیا کہ: حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو امام بنایا جائے۔جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ راحت ہوئی تو آپ نے تکبیر کی آواز سنی۔تو آپ نے پوچھا: لوگوں کو نماز کون پڑھا رہا ہے۔کہنے لگے: ابوبکر۔آپ نے فرمایا:"مجھے باہر لے چلو۔" حضرت عباس اور علی رضی اللہ عنہما کے درمیان چلتے ہوئے باہر نکلے۔" آپ نے ابوبکر کو قبلہ سے ہٹا دیا۔اور انہیں امامت سے معزول کر کے خود نماز پڑھانے لگے۔"[شیعہ کا بیان ختم ہوا]۔

[جواب اول]: حد درجہ کی افتراء پردازی پر مبنی ہے۔تمام محدثین کے ہاں اس روایت کا جھوٹ ہونا معلوم ہے۔[علاوہ ازیں یہ مکابرہ اور انکار متواتر کی بدترین قسم ہے]۔ہم شیعہ مصنف سے اس کی صحت ثابت کرنے اور اس کی اسناد ثابت کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔یہ روایت مرسلاً صرف روافض کی کتابوں میں نقل کی گئی ہے جو کہ سب سے بڑے جھوٹے اور رسول

اللہ ﷺ کے احوال سے جاہل ترین لوگ ہیں ۔ یہ واقعہ [ابن المطہر رافضی کے اساتذہ] مثلاً شیخ المفید وکراجکی اور ان کے نظائر وامثال نے بیان کیا ہے جن کی تصانیف جھوٹ کا پلندہ ہیں اور رسول اللہ ﷺ کے احوال واقوال اور اعمال کی معرفت سے سب سے بیگانے وبعید ہیں۔

جواب دوم: یہ ایسے جاہل انسان کا کلام ہے جو یہ گمان کرتا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی امامت صرف ایک نماز سے تعلق رکھتی تھی [جس کے بارے میں ایسا دعویٰ کیا جا سکے]۔ اہل علم اس حقیقت سے کلیۃً آگاہ ہیں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے نبوی کریم ﷺ [کی بیماری کے شروع سے] وفات تک نمازیں پڑھائی تھیں۔ رسول اللہ ﷺ کا انتقال ہوا تو حضرت ابوبکر صدیق آپ کے حکم سے آپ کی نیابت میں لوگوں کو نمازیں پڑھا رہے تھے۔ اس بارے میں حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہما نے آپ سے بات بھی کی تھی۔ آپ نے کئی دن تک نمازیں پڑھائیں۔ اس سے پہلے بھی رسول اللہ ﷺ آپ کو نماز پڑھانے کے لیے اپنا نائب مقرر کر چکے تھے۔ جب آپ ﷺ بنی عمرو بن عوف کے ساتھ صلح کرنے کے لیے گئے تھے تو حضرت ابوبکر کو ہی نماز پڑھانے کے لیے امام مقرر کیا تھا۔ اور نبی کریم ﷺ سے کہیں بھی یہ منقول نہیں ہے کہ سفر کے علاوہ اپنی عدم موجودگی میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے علاوہ کسی کو امامت سونپی ہو۔ ہاں غزوہ تبوک والے سال ایک بار قضاء حاجت کے لیے تشریف لے گئے تھے اور آپ کو دیر ہوگئی تو حضرت عبدالرحمن بن عوف نے لوگوں کو فجر کی نماز پڑھا دی۔ جب رسول اللہ ﷺ واپس تشریف لائے تو آپ کے ساتھ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ آپ ﷺ نے ایک رکعت نماز جماعت کے ساتھ پڑھی؛ اور ایک رکعت جوفوت ہو چکی تھی؛ اسے پورا کیا۔ نماز کے بارے میں لوگوں کا یہ اہتمام آپ کو بہت پسند آیا؛ اور آپ نے اسے برقرار رکھا۔ یہ حضرت عبدالرحمن رضی اللہ عنہ کی تقدیم پر بھی آپ کا اقرار ہے۔ [1]

اور رسول اللہ ﷺ جب مدینہ سے باہر کا سفر کرتے تو مدینہ میں کسی کو اپنا جانشین مقرر فرماتے جو لوگوں کو نمازیں پڑھاتا۔ تو کبھی آپ نے عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کو اپنا نائب مقرر کیا تو کبھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اور کبھی ان دونوں کے علاوہ کسی تیسرے کو اپنا نائب بنایا۔

جب کہ مدینہ میں موجود ہوتے ہوئے اپنی عدم موجودگی میں اور بیماری کی حالت میں صرف حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ہی نماز پڑھانے پر مامور فرمایا تھا حضرت علی رضی اللہ عنہ یا کسی اور کو نہیں۔ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے متعلق یہ بات تواتر سے ثابت ہو چکی ہے کہ آپ نبی کریم ﷺ کی اجازت سے نماز پڑھایا کرتے تھے۔ اس کے اثبات میں صحاح وسنن اور مسانید وغیرہ متعدد نصوص موجود ہیں۔ امام بخاری ومسلم اور ابن خزیمہ وابن حبان نے حضرت ابوموسی اشعری سے روایت کیا ہے:

((مرض النبي ﷺ فاشتد مرضه فقال: مروا أبا بكر فليصل بالناس۔" قالت عائشة:"يارسول الله! أن أبا بكر رجل رقيق متى يقم مقامك لا يستطيع أن يصلي بالناس۔" قال: مري أبا بكر فليصل بالناس۔ فإنكن صواحب يوسف .))

---

[1] الحديث عن المغيرة بن شعبة رواه مسلم كتاب الصلاة باب تقديم الجماعة من يصلي بهم إذا تأخر الإمام۔ اس روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ جب نماز پڑھ کر فارغ ہوئے تو آپ نے فرمایا: تم نے بہت اچھا کیا۔ یا یہ فرمایا کہ: تم نے حق کو پالیا۔

''جب نبی ﷺ بیمار ہوئے اور آپ کا مرض بڑھ گیا تو آپ نے فرمایا: ''ابوبکر سے کہو کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھا دیں۔'' حضرت عائشہ نے کہا: یارسول اللہ! بیشک حضرت ابوبکر نرم دل آدمی ہیں جب آپ کی جگہ کھڑے ہوں گے تو لوگوں کو نماز نہ پڑھا سکیں گے۔'' لیکن پھر بھی آپ نے فرمایا: ''ابوبکر سے کہو کہ لوگوں کو نماز پڑھا دیں'' اور تم تو وہ عورتیں معلوم ہوتی ہو جنہوں نے یوسف کو گھیر رکھا تھا۔''

امام بخاری رحمہ اللہ نے تین بار حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے رسول اللہ ﷺ سے تکرار کا ذکر کیا ہے۔ [1]

اس حدیث میں ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کی بیماری کا پورا عرصہ نمازیں پڑھاتے رہے؛ یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات ہوگئی۔ اس پر تمام اہل علم کا اتفاق ہے۔ اس لیے کہ وفات سے قبل رسول اللہ ﷺ کئی دن بیمار رہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنے پاس بلالیا۔ ان ایام میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے علاوہ کسی ایک نے بھی نمازیں نہیں پڑھائیں۔ رسول اللہ ﷺ کا حجرہ شریفہ مسجد کے پہلو میں تھا۔ جب احوال یہ ہیں تو پھر یہ بات ممتنع ہو جاتی ہے کہ اس عرصہ میں رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوبکر کے علاوہ کسی اور کو نمازیں پڑھانے کا حکم دیا ہو؛ یا کسی نے آپ سے اس بارے میں بات کی ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت عباس اور حضرت علی رضی اللہ عنہما رسول اللہ ﷺ کے گھر میں داخل ہوا کرتے تھے۔ اور ان دنوں میں سے کسی ایک دن میں ان کے ساتھ باہر نکلے بھی تھے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ بیماری کے ابتدائی دنوں میں جمعرات کے دن کی بات ہے۔ اور آپ ﷺ کا انتقال بلا خلاف دوسرے ہفتہ میں پیر کے دن ہوا تھا۔ اس طرح آپ کی بیماری کے کل بارہ دن بنتے ہیں۔

صحیح مسلم میں حضرت عبیداللہ بن عبداللہ سے روایت ہے کہ میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس حاضر ہوا تو میں نے ان سے عرض کیا کہ آپ مجھے رسول اللہ ﷺ کے مرض کے بارے میں نہیں بتائیں گی؟ فرمایا کیوں نہیں:

''نبی کریم ﷺ کو بیماری سے افاقہ ہوا تو فرمایا کیا لوگوں نے نماز ادا کرلی ہے؟ ہم نے عرض کیا: نہیں یا رسول اللہ! وہ تو آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: میرے لئے برتن میں پانی رکھ دو۔ ہم نے ایسا ہی کیا۔ آپ ﷺ نے اس سے غسل فرمایا؛ پھر آپ چلنے لگے تو بے ہوشی طاری ہوگئی۔ پھر افاقہ ہوا تو فرمایا: کیا لوگوں نے نماز ادا کرلی ہے؟

ہم نے عرض کیا: نہیں: بلکہ یا رسول اللہ ﷺ وہ تو آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین مسجد میں بیٹھے رسول اللہ ﷺ کا عشاء کی نماز کے لئے انتظار کر رہے تھے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی کو سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی طرف بھیجا کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں۔ تو اس نے جا کر کہا: رسول اللہ ﷺ آپ کو حکم دے رہے ہیں کہ آپ لوگوں کو نماز پڑھائیں۔ اور ابوبکر نرم دل آدمی تھے اس لئے انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ: ''آپ لوگوں کو نماز پڑھائیں۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: آپ اس کے زیادہ حقدار ہیں۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: ''پھر ان کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان دنوں میں نماز پڑھائی۔''

---

[1] صحیح بخاری:ح ٦٤٥۔ مسلم'کتاب الصلاۃ'باب تقدیم الجماعۃ من یصلی بھم إذا تأخر الإمام ١/ ٣١٧۔

پھر رسول اللہ ﷺ نے اپنی بیماری میں کچھ کمی محسوس کی تو دو آدمیوں کے سہارے ظہر کی نماز کے لئے نکلے؛ ان میں ایک حضرت عباس رضی اللہ عنہ تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ لوگوں کو نماز پڑھا رہے تھے جب ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کو آتے دیکھا تو پیچھے ہٹنے لگے؛ تو نبی کریم ﷺ نے ان کو اشارہ کیا کہ وہ پیچھے نہ ہوں۔ اور آپ ﷺ نے ان دونوں کو فرمایا: '' مجھے ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پہلو میں بٹھا دو؛ تو آپ ﷺ کو ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پہلو میں بٹھا دیا گیا۔ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کھڑے ہوکر نبی ﷺ کی اقتدا میں نماز ادا کرتے رہے؛ اور لوگ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اقتداء کررہے تھے؛ رسول اللہ ﷺ بیٹھے ہوئے تھے۔

عبیداللہ نے کہا میں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس حاضر ہوا تو میں نے عرض کیا: '' کیا میں آپ کی خدمت میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی نبی ﷺ کے مرض کے بارے میں حدیث پیش نہ کروں جو آپ نے مجھ سے بیان کی ہے؟ تو انہوں نے کہا: لے آؤ۔ تو میں نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ان پر پیش کی؛ تو انہوں نے اس میں سے کسی چیز کا انکار نہیں کیا؛ سوائے اس کے کہ انہوں نے فرمایا: '' کیا سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے تجھے عباس رضی اللہ عنہ کے ساتھ جو آدمی تھا اس کا نام بتایا ہے؟ میں نے کہا: نہیں۔ تو ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: '' وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے۔''[1]

یہ حدیث جس پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کا اتفاق ہے؛ اس میں یہ دونوں حضرات نبی کریم ﷺ کی بیماری کے بارے میں خبر دے رہے ہیں؛ اور امامت نماز میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے جانشین رسول اللہ ﷺ ہونے کو بیان کر رہے ہیں۔ اور یہ کہ نبی کریم ﷺ کے باہر نکلنے سے کئی دن پہلے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی لوگوں کو نماز پڑھاتے رہے۔ اور جب آپ ﷺ نماز پڑھانے کے لیے تو آپ کو حکم دیا کہ پیچھے نہ ہٹیں؛ بلکہ اپنی جگہ پر قائم رہیں۔ پھر نبی کریم ﷺ آپ کے پہلو میں بیٹھ گئے؛ لوگ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی نماز کی اقتداء کررہے تھے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی اقتداء۔

تمام علماء کرام کا اس حدیث کی صحت اور قبولیت پر اتفاق ہے۔ یہاں پر مقصود یہ بتانا ہے کہ نماز میں جانشینی کئی دن تک رہی۔ جیسا کہ اس روایت پر صحابہ کرام کا اتفاق ہے؛ اور یہ روایت صحاح ستہ کے مؤلفین نے حضرت ابوموسیٰ؛ حضرت ابن عباس؛ حضرت عائشہ؛ حضرت ابن عمر؛ حضرت انس رضی اللہ عنہم اجمعین سے روایت کیا ہے۔

اور صحیحین میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ [جو رسول اللہ ﷺ کے خادم اور صحابی تھے] سے روایت ہے:

((نبی ﷺ کے مرض وفات میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ لوگوں کو نماز پڑھاتے تھے۔ یہاں تک کہ جب دوشنبہ کا دن ہوا اور لوگ نماز میں صف بستہ تھے تو نبی ﷺ نے حجرہ کا پردہ اٹھایا اور ہم لوگوں کی طرف کھڑے ہوکر دیکھنے لگے اس وقت آپ کا چہرہ مبارک گویا مصحف کا صفحہ تھا پھر آپ بشاشت سے مسکرائے ہم لوگوں نے خوشی کی وجہ سے چاہا کہ نبی ﷺ کے دیکھنے میں مشغول ہوجائیں اور ابوبکر اپنے پچھلے پیروں پیچھے ہٹ آئے تاکہ صف میں مل جائیں۔ وہ سمجھے کہ نبی ﷺ نماز کے لئے آنے والے ہیں لیکن آپ نے ہماری طرف اشارہ کیا کہ اپنی نماز پوری کرلو؛ اور آپ

---

[1] یہ حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بخاری میں مروی ہے۔ ۱/ ۱۳۸ ۔کتاب الأذان، باب إنما جعل الإمام لیؤتم بہ مسلم ۱/ ۳۱۳ ۔کتاب الصلاۃ، باب استخلاف الإمام إذا عرض لہ عذر. [صحیح مسلم: ح ۹۳۱]

نے حجرہ میں داخل ہوکر پردہ ڈال دیا اسی دن آپ نے وفات پائی (ﷺ)۔[صحيح بخاری:ح ٦٤٧]
اور بخاری شریف کی بعض روایات میں ہے:''مسلمانوں نے خوشی کے باعث یہ قصد کیا کہ اپنی نمازوں کو توڑ دیں۔'' [مگر آپ نے انہیں اشارہ فرمایا کہ تم اپنی نمازوں کو پورا کرلو اور آپ نے پردہ ڈال دیا]۔ یہ نماز فجر کا واقعہ ہے۔[صحيح بخاری:ح ٧٢٠]۔
صحیح مسلم میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے : میں نے آخری نظر رسول اللہ ﷺ کو پیر کے روز اس وقت دیکھا جب آپ نے پردہ ہٹایا۔'' [اس کی تخریج گزر چکی ہے]۔
صحیحین میں حضرت انس سے روایت ہے کہ مرض وفات میں نبی ﷺ تین دن باہر نہیں نکلے۔ ایک دن نماز کی اقامت ہوئی اور ابوبکر رضی اللہ عنہ آگے بڑھنے لگے اتنے میں نبی ﷺ نے پردہ کو پکڑا اور اس کو اٹھایا۔ پس نبی ﷺ کا چہرہ نظر آتے ہی ہمارے سامنے ایسا خوش کن منظر آ گیا کہ اس سے زیادہ خوش کن منظر کبھی میسر نہ آیا تھا۔ پھر نبی ﷺ نے اپنے ہاتھ سے ابوبکر کو اشارہ کیا کہ آگے بڑھ جائیں اور نبی ﷺ نے پردہ گرا دیا پھر آپ کو قدرت نہ ہوئی یہاں تک کہ آپ کی وفات ہوگئی۔'' [صحيح بخاری : ح٦٤٨۔ مسلم، ح :٩٨]
اس روایت میں ہے حضرت انس رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے تین روزہ وقفہ کے بعد دوسری بار حجرہ شریفہ سے باہر تشریف لانے کی خبر دے رہے ہیں۔ ان تین دنوں میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی ان لوگوں کو نمازیں پڑھاتے رہے۔ جیسا کہ پہلی بار حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کے ساتھ باہر نکلنے سے پہلے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نمازیں پڑھایا کرتے تھے۔ یعنی اس سے پہلے بھی کئی دن سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی نمازیں پڑھایا کرتے تھے۔ یہ تمام روایات صحیح ہیں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں یہ بھی موجود ہے کہ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے پیچھے ہٹنے کا ارادہ کیا تو رسول اللہ ﷺ نے اپنے ہاتھ کے اشارہ سے انہیں آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ یہ آخری نماز تھی جو رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں مسلمانوں نے ادا کی۔ اس موقع پر آپ ﷺ نے نماز کے دوران یا اس سے پہلے ہاتھ سے اشارہ کیا تھا۔
یہی رسول اللہ ﷺ کا پہلا حکم بھی تھا جس کا پیغام لیکر آپ کا قاصد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر ہوا تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہ حکم نہیں پہنچایا تھا اور نہ ہی اپنے والد سے کہا تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے آپ کو یہ حکم دیا ہے۔ جیسا کہ یہ رافضی جھوٹے اپنی طرف سے افتراء پردازی کرتے ہیں۔
ان جھوٹوں کا یہ کہنا کہ جب حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اذان دی تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے آپ کو حکم دیا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو نماز کے لیے آگے بڑھائیں؛ ایک کھلا ہوا اور واضح ترین جھوٹ ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایسا کوئی حکم نہیں کیا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو آگے کیا جائے۔ اور نہ ہی آپ حکم دیا کرتی تھیں' اور نہ ہی حضرت بلال رضی اللہ عنہ آپ سے احکامات وصول کیا کرتے تھے۔ بلکہ آپ نے خود رسول اللہ ﷺ کو نماز کے وقت کی اطلاع دی تھی تو رسول اللہ ﷺ نے تمام حاضرین بشمول حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے کہا تھا کہ: حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو حکم دو کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں۔ یہ خطاب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ خاص نہیں تھا۔ اور نہ ہی حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے آپ سے کوئی ایسی بات سنی تھی۔

رافضی کا یہ کہنا: ''جب آپ ﷺ کو ہوش آیا تو آپ نے تکبیر سنی' آپ نے پوچھا: ''نماز کون پڑھا رہا ہے؟ تو جواب دیا گیا کہ: حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ۔اس پر آپ نے فرمایا: ''مجھے باہر لے چلو۔''

[جواب]: یہ ایک کھلا ہوا جھوٹ ہے۔وہ مشہور روایات جن کی صحت پر محدثین کا اتفاق ہے'ان سے یہ بات ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے باہر تشریف لانے سے کئی روز قبل بھی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی لوگوں کو نمازیں پڑھایا کرتے تھے۔جیسا کہ آپ کے باہر تشریف لانے کے بعد بھی آپ ہی نمازیں پڑھاتے رہے۔آپ کی بیماری کے دوران کسی ایک دوسرے نے کوئی نماز نہیں پڑھائی۔

❀ پھر ان سے یہ بھی کہا جائے گا کہ: یہ تواتر کے ساتھ معلوم ہے کہ نبی کریم ﷺ کئی دن تک بیمار رہے؛ اور کئی دن تک آپ لوگوں کو نماز نہیں پڑھا سکے۔تو پھر اس دوران حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے علاوہ کون تھا جو لوگوں کو نمازیں پڑھاتا رہا؟ کسی بھی سچے یا جھوٹے نے یہ ہرگز نہیں کہا کہ: حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے علاوہ کسی دوسرے نے نمازیں پڑھائی ہیں' نہ ہی عمر نہ ہی علی اور نہ ہی کوئی دوسرا۔رضی اللہ عنہم اجمعین ۔ اور یہ لوگ باجماعت نماز ادا کیا کرتے تھے' پس معلوم ہوا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی لوگوں کو نمازیں پڑھایا کرتے تھے۔

❀ یہ بات ممتنع ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو اس بات کا علم نہ ہوا ہو۔اور نہ ہی مسلمانوں کو اس کی خبر ہوئی ہو۔ بلکہ یہ بات عادتاً ممتنع ہے۔تو پتہ چلا کہ آپ کی اجازت سے ہی لوگوں کو نماز پڑھائی جارہی تھی۔جیسا کہ صحیح احادیث میں یہ بات ثابت ہے'اور یہ بھی ثابت ہے کہ اس بات پر آپ سے تکرار بھی کیا گیا تھا۔اور کہا گیا: اگر آپ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے علاوہ کسی اور کو نماز پڑھانے کا حکم دیں؟ تو آپ نے اس تکرار کرنے والے کو ملامت کی۔اور اس بات کو ایک برائی شمار کیا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے استحقاق کا علم ہونے کے باوجود اس مسئلہ میں تکرار کیا جارہا ہے ۔ جب کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے علاوہ کوئی اس کا مستحق نہیں۔

امامت ابی بکر رضی اللہ عنہ اور بشارتِ نبوت:

بخاری و مسلم میں مروی ہے کہ نبی ﷺ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا:

''اپنے والد اور بھائی کو بلاؤ تا کہ میں انھیں ایک تحریر لکھ دوں، مجھے ڈر ہے کہ مبادا کوئی خواہش کنندہ اپنی خواہش کا اظہار کرے اور کہنے والا کہے کہ میں خلافت کے لیے موزوں تر ہوں۔مگر واقعہ یہ ہے کہ اللہ اور اس کا رسول اور اہل ایمان ابوبکر (رضی اللہ عنہ) کے سوا کسی کو خلیفہ تسلیم نہیں کر سکتے۔'' [البخاری ٧/ ١١٩؛ مسلم ٤/ ١٨٥٧]

بخاری میں حضرت قاسم بن محمد سے روایت ہے آپ فرماتے ہیں: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: ''ہائے میرا سر۔'' تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اگر تو اسی درد میں مبتلا رہ کر مرگئی تو تیرے لئے دعائے مغفرت کروں گا اور دعا کروں گا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: ''افسوس! اللہ کی قسم! میرا تو خیال ہے کہ آپ میرا مرنا پسند کرتے ہیں۔اگر ایسا ہوا تو اس کے دوسرے ہی دن آپ اپنے دوسری بیویوں کے ساتھ رات گزاریں گے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''نہیں بلکہ میں خود بھی دردسر میں مبتلا ہوں۔اور میں نے چاہا کہ ابوبکر اور ان کے بیٹے کو بلا بھیجوں اور ان کو

وصیت کروں تا کہ کوئی کہنے والا کچھ کہہ نہ سکے اور نہ کوئی آرزو کرنے والا اس کی آرزو کر سکے۔ پھر میں نے سوچا کہ اللہ تعالیٰ دوسرے کی خلافت کو ناپسند کرتا ہے اور مومن بھی اس کو نامنظور ہی کریں گے یا یہ فرمایا کہ:''اللہ تعالیٰ دفع کرے گا اور مسلمان بھی پسند نہ کریں گے۔''[صحیح بخاری:ح ٦٣٢]

یہ صحیح حدیث ہے۔ اس میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارادہ کیا تھا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے لیے ایک تحریر لکھوا دیں۔تا کہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ میں ان سے زیادہ حق دار ہوں۔ پھر فرمایا:''اللہ تعالیٰ اور اہل ایمان اس کا انکار کرتے ہیں۔''

اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ کو جب (بنابر وحی) معلوم ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ اس کام کے لیے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ہی اختیار کریں گے؛ اور اہل ایمان آپ کو بالاتفاق خلیفہ تسلیم کرلیں گے اور آپ کی بیعت پر راضی ہو جائیں گے، تو آپ نے دستاویز لکھنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ سوان لوگوں پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے دوری ہوئی جو اللہ اور اس کے رسول اور اہل ایمان کے اختیار پر راضی نہیں۔[آپ کی یہ پیش گوئی حرف بحرف پوری ہوئی۔]

نبی کریم ﷺ نے اپنی بیماری میں دوبار اس بات کا ارادہ کیا تھا۔اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہا بھی تھا کہ اپنے والد اور بھائی کو بلا لو۔ یہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی شکایت سے پہلے کا معاملہ ہے۔اس وقت تو آپ نے فرمایا تھا: میرا ارادہ تھا کہ میں ابوبکر کے لیے ایک تحریر لکھوا دوں۔''

پھر آپ نے جمعرات کے دن اس چیز کا دوبارہ ارادہ کیا تھا۔ صحیحین میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے: آپ فرماتے ہیں:

''جمعرات کا دن؛ اور آہ! جمعرات کا دن بھی کیسا تھا؟[اور پھر اتنا روئے کہ ان کے آنسوں سے سنگریزے تک بھیگ گئے اور پھر کہنے لگے کہ جمعرات کے دن] رسالت مآب ﷺ کے مرض میں شدت ہوئی تو آپ نے فرمایا:'' لکھنے کے لیے کوئی چیز لاؤ کہ میں تمہیں ایک تحریر لکھ دوں جس کے بعد تم گمراہی میں کبھی نہ پڑسکو گے۔ پھر لوگوں نے اختلاف کیا حالانکہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے اختلاف نہ کرنا چاہیے۔لوگ بولے کہ آپ ہمیں چھوڑ کر جارہے ہیں۔لہٰذا آپ ﷺ سے دوبارہ پوچھو لوگوں نے پوچھنا شروع کر دیا۔[اور رسول اللہ ﷺ کی بات کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگے]۔آپ ﷺ نے فرمایا:''مجھے چھوڑ دو میں جس حالت میں ہوں وہ اس سے بہتر ہے جس کی طرف تم لوگ مجھے بلا رہے ہو۔''اور آپ نے بوقت وفات تین وصیتیں کیں مشرکوں کو جزیرہ عرب سے نکال دینا قاصدوں کو اسی طرح انعام دینا جس طرح میں انعام دیا کرتا تھا اور تیسری وصیت میں خود بھول گیا۔''[صحیح بخاری:ح ٣٠٦]

یہی وجہ ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ہر طرح کی بدبختی اس انسان کے لیے ہے جو رسول اللہ ﷺ کی تحریر میں حائل ہوا؛ اس سے اختلاف ختم ہو جاتا۔ ہاں یہ بدبختی اس انسان کے حق میں ہے جو کوئی حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی خلافت میں شک اور قدح کرے۔ اگر رسول اللہ ﷺ وہ تحریر لکھوا دیتے تو اس کی وجہ سے شک کرنے والوں کا یہ شبہ بھی ختم ہو جاتا۔اور یہ قول حق کے ساتھ کہا جا سکتا کہ: آپ کی خلافت صریح نص جلی سے ثابت ہے۔ جب یہ نص موجود نہیں ہے تو پھر یہ بدبختی بغیر کسی افراط و تفریط کے شک کرنے والے انسان کے حق میں ہے۔رسول اللہ ﷺ نے یہ بات کھل کر

پہنچادی تھی ۔ اور بہت ساری ادلہ کی روشنی میں واضح ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی خلافت کے حق دار اور دوسروں سے افضل تھے۔

یہ بدبختی ان اہل تقوی کے حق میں نہیں ہے جو کتاب وسنت سے ہدایت حاصل کرتے ہیں ۔ بلکہ اس کے لیے بدبختی ہے جس کے دل میں مرض پایا جاتا ہے۔جیسا کہ قرآن کے وہ احکام جو اللہ تعالیٰ نے منسوخ کیے اور قرآن نازل کیا' احد کے دن مسلمانوں کو پسپائی ہوئی ۔ اور اس طرح کے دیگر واقعات اور دنیاوی مصائب ان لوگوں کے حق میں مصیبت ہیں جن کے دل مرض سے بھرے پڑے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَ ابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ﴾ .

''پس جن کے دلوں میں کجی ہے وہ تو اس کی متشابہ آیتوں کے پیچھے لگ جاتے ہیں، فتنے کی طلب اور ان کی مراد کی جستجو کے لئے ۔''[آل عمران ۷]

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ امور ان لوگوں کے حق میں جنہیں اللہ تعالیٰ نے ہدایت دی ہو'ان کے علم وایمان میں اضافہ کا باعث بنتے ہیں ۔ یہ ایسے ہی ہیں جیسے انسانوں اور جنات کے ساتھ شیاطین کا وجود؛ اللہ تعالیٰ ان کی مخالفت کرنے اور ان کے ساتھ مجاہدہ کرنے کی وجہ سے اہل ایمان کے درجات بلند کرتے ہیں ؛ حالانکہ ان شیاطین کا وجود بھی ایک فتنہ اور آزمائش ہوتی ۔ بہت سارے لوگوں کو یہ بہکاتے اور گمراہ کرتے ہیں ۔

فصل:

[خلافت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور ارشاد نبوت]

اس سے پہلے یہ تنبیہ گزر چکی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے امت کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کی طرف رہنمائی کی تھی اور یہ واضح کر دیا تھا کہ آپ دوسروں سے زیادہ اس کے حق دار ہیں ۔مثال کے طور پر صحیحین کی روایت میں ہے حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں :''ایک عورت بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئی؛ اور اس نے کسی چیز کا سوال کیا۔آپ نے اسے دوبارہ حاضر ہونے کیلئے مامور فرمایا۔ وہ بولی:'' اگر میں آؤں اور آپ کو موجود نہ پاؤں[تو] ۔''(یعنی آپ وفات پا جائیں) آپ نے فرمایا:''اگر تو مجھے نہ پائے تو ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضری دیجیے ۔''[اس کی تخریج گزر چکی ہے]

رسول اللہ ﷺ کو جب (بنابر وحی) معلوم ہوگیا تھا کہ اللہ تعالیٰ اس کام کے لیے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ہی اختیار کریں گے؛اور اہل ایمان آپ کو بالاتفاق خلیفہ تسلیم کر لیں گے [کسی دوسرے کو نہیں]؛اسی لیے آپ نے فرمایا:'' اللہ تعالیٰ اور اہل ایمان اس کا انکار کرتے ہیں ۔''

آپ کی اس رہنمائی و دلالت میں شرعی ادلہ موجود ہیں ۔ اور آپ کو جو علم ہوگیا تھا کہ اللہ تعالیٰ خیر کو آپ کی رضا اور چاہت کے مطابق مقدر کر دے گا۔جس سے خلق و امر میں اس کی حکمت قدراً وشرعاً پوری ہو جائے گی ۔

اس سے پہلے ہم ذکر کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا اختیار اس امت کے حق میں کئی وجوہات کی بنا پر بہت بہتر تھا۔ اس لیے

کہ جب امت نے اپنے علم اور اختیار سے آپ کو یہ منصب تفویض کیا؛ اور ان کو علم تھا کہ اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک آپ ہی اس منصب کے اہل ہیں۔تو اس میں اتنی شرعی مصلحتیں تھیں جو اس کے بغیر کسی دوسرے ذریعہ سے حاصل نہیں ہوسکتی تھیں۔

صحیحین میں حضرت سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ بنوعمرو بن عوف کے درمیان صلح کرانے کے لئے تشریف لے گئے ۔جب نماز کا وقت ہوگیا تو موذن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور کہا کیا آپ لوگوں کو نماز پڑھائیں گے تو میں اقامت کہوں؟ فرمایا: ہاں۔حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے نماز پڑھائی۔

پھر جب رسول اللہ ﷺ تشریف لے آئے تو آپ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اشارہ کیا کہ وہ نماز کو پورا کریں۔ابوبکر رضی اللہ عنہ ادب کے راستے پر گامزن ہوتے ہوئے واپس پیچھے ہٹ گئے۔اس لیے کہ آپ جانتے تھے آپ کا یہ حکم حکم عزت و احترام و اکرام ہے؛ اس کا ماننا لازمی یا واجب نہیں۔اور نہ ہی اس کے نہ ماننے میں نافرمانی کا کوئی پہلو ہے۔پس جب رسول اللہ ﷺ اپنی موجودگی میں اور بحالت صحت آپ کو اس نماز کے پورا کرنے کیلئے امام برقرار رکھا جو آپ شروع کر چکے تھے' اور خود رسول اللہ ﷺ نے آپ کے پیچھے نماز پڑھی؛ جیسا کہ غزوہ تبوک کے موقعہ پر فجر کی ایک رکعت حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے پیچھے پڑی؛ اور دوسری رکعت کو پورا کرلیا۔تو پھر یہ کیسے گمان کیا جاسکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنی بیماری کی حالت میں خود آپ کو امامت پر مامور کر کے پھر باہر نکلیں کہ آپ کو لوگوں کی امامت سے منع کریں۔اس سے واضح ہوگیا کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا حال اللہ اور اس کے رسول اور اہل ایمان کے نزدیک اس سے یکسر مختلف ہے جو ان جھوٹے اور کذاب روافض منافقین و مرتدین اور کفار کے بھائیوں نے گھڑ لیے ہیں جو اللہ کے دشمنوں سے تو دوستی رکھتے ہیں؛ مگر اس کے دوستوں سے دشمنی رکھتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور ان کے اعوان و انصار اس میں سب سے زیادہ کفار و منافقین و مرتدین سے جہاد کرنے میں سب سے زیادہ سخت تھے۔ان ہی کی شان بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَنْ یَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِیْنِهٖ فَسَوْفَ یَاْتِی اللّٰهُ بِقَوْمٍ یُّحِبُّهُمْ وَ یُحِبُّوْنَهٗۤ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِیْنَ یُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ لَا یَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآىٕمٍ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَآءُ ﴾ [المائدة ۵۴]

''اے ایمان والو! تم میں سے کوئی اگر اپنے دین سے پھر گیا تو اللہ تعالیٰ بہت جلد ایسی قوم کو لائیگا جو اللہ کی محبوب ہوگی اور وہ بھی اللہ سے محبت رکھتی ہوگی وہ نرم دل ہونگے مسلمانوں پر سخت اور تیز ہونگے کفار پر، اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ بھی نہ کریں گے یہ ہے اللہ تعالیٰ کا فضل جسے چاہے دیدے۔''

آپ کے اعوان و انصار اس امت کے سب سے بہترین اور افضل ترین لوگ تھے۔یہ بات سلف و خلف سب میں معلوم ہے۔مہاجرین و انصار کے بہترین لوگ آپ کو محبت میں دوسروں پر مقدم رکھتے تھے۔اور آپ کے حق کا خیال رکھا کرتے تھے اور آپ کو اذیت دینے والوں سے آپ کا دفاع کرتے تھے۔

قدیم و جدید میں ہمیشہ سے خیار المسلمین حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ رہے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کا ایمان بھی کامل تھا اور آپ کی ذات بھی کامل تھی۔ اور آپ رسول اللہ ﷺ کی قرابت داری اور اہل بیت کا سب سے زیادہ خیال کرنے والے تھے۔ اس لیے کہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ کمال محبت نے آپ کے دل میں اہل بیت کی محبت کوٹ کوٹ کر بھر دی تھی۔ اور اس کی یہ وجہ بھی تھی کہ اہل بیت کی رعایت اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے مامور بہ تھی۔ آپ [لوگوں کو اہل بیت اور آل رسول ﷺ سے محبت رکھنے کی وصیت کیا کرتے اور] فرمایا کرتے تھے: ((اِرْقَبُوْا مُحَمَّداً فِيْ أَهْلِ بَيْتِهِ)) ❶

''حضرت محمد [ﷺ] کو آپ کے اہلِ بیت میں تلاش کرو۔''

[یعنی آپ ﷺ کے اہلِ بیت کا ادب و احترام مدِ نظر رکھا کرو۔]

امام بخاری رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے کہ آپ قسم اٹھا کر فرمایا کرتے تھے:

''اللہ کی قسم! اہل بیت کی قرابت کے ساتھ صلہ رحمی کرنا مجھے میرے اپنے قرابت داروں کے ساتھ صلہ رحمی کرنے سے زیادہ محبوب اور پسندیدہ ہے۔''

[اللہ کرے ہمارا خاتمہ اصحاب اربعہ اور اہل بیت کی الفت و محبت پر ہو۔ اس لیے کہ ''اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ۔'' ❷

''انسان اسی کے ساتھ ہوگا جس سے وہ محبت کرتا ہوگا۔''

''وَاللّٰهُ اَعْلَمُ۔ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلَى الْاِسْلَامِ وَالسُّنَّةِ وَ صَلَّى اللّٰهُ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّ اٰلِهٖ وَ صَحَابَتِهٖ وَ اَزْوَاجِهٖ وَ ذُرِّيَّتِهِ الطَّيِّبِيْنَ الطَّاهِرِيْنَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ۔]

انتهى كتاب الإمام الهمام شيخ الإسلام مجدد أهل السنة والجماعة إمام ابن تيمية الدمشقي الحراني الحنبلي۔[(٦٦١۔٧٢٨هجری)]

يلوح الخط في القرطاس دهراً — وكاتبه رميم في التراب

مترجم

ابو شرحبیل پیرزاده شفیق الرحمن شاه الدراوي

آل عبدالكبير الكشميری

مراجعہ سے فراغت کیم اکتوبر رات دس بجے۔

---

❶ صحيح بخاری، كتاب المرضى، باب ما رخص للمريض ان يقول انی وجع، (حديث: ٥٦٦٦)، صحيح مسلم، كتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل ابی بکر الصديق، رضي الله عنه (حديث: ٢٣٨٧)۔

❷ صحيح بخاری، كتاب الأدب، باب علامة الحب فی الله (حديث: ٦١٦٨، ٦١٦٩)، صحيح مسلم ۔ كتاب البر والصلة، باب المرء مع من احب (حديث: ٢٦٤٠)۔

اس کتاب کو پڑھنے کے بعد اپنے خیالات یہاں درج کیجئے